جنوری [illegible]

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

- امریکی معاشرے کے نئے رجحانات
- اسلام کا معاشرتی نظام

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

تنظیم اسلامی پاکستان

سال ۱۹۹۶ء کے دوران مجوزہ پروگرام

تربیت گاہیں

۱ ۔مبتدی / ملتزم ۵ تا ۱۱ جنوری' کراچی

۲ ۔ملتزم ۸ تا ۱۴ مارچ' لاہور

۳ ۔مبتدی ۱۹ تا ۲۵ اپریل' لاہور

۴ ۔ملتزم ۲۴ تا ۳۰ مئی' پنجاب شمالی

۵ ۔مبتدی ۱۴ تا ۲۰ جون' لاہور

۶ ۔ملتزم ۵ تا ۱۱ جولائی' لاہور

۷ ۔مبتدی / ملتزم ۹ تا ۱۵ / اگست' ملتان

۸ ۔مبتدی ۶ تا ۱۲ / ستمبر' لاہور

خصوصی مشاورتی / تربیتی پروگرام بمقام لاہور

☆ مشاورتی و تربیتی پروگرام برائے ملتزم رفقاء ۵ تا ۹ اپریل

☆ تربیتی پروگرام برائے ذمہ دار رفقاء ۱۰ تا ۱۱ اپریل

علاقائی اجتماعات

☆ ۱۵ مارچ' حلقہ سندھ و بلوچستان

☆ ۲۲ مارچ' حلقہ لاہور ڈویژن

☆ ۲۶ اپریل' حلقہ پنجاب غربی

☆ ۲۴ مئی' حلقہ آزاد کشمیر

☆ ۳۱ مئی' حلقہ پنجاب شمالی

☆ ۶ ستمبر' حلقہ سرحد

اجلاس مرکزی مجلس مشاورت

☆ ۲۰-۲۱ مارچ

☆ ۲۴-۲۵ جولائی

☆ اجلاس توسیعی مشاورت۔لاہور' ۲۱-۲۲ جولائی

☆ سالانہ اجتماع۔۔۔اسلام آباد' ۴ تا ۶ / اکتوبر

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد: ۴۵
شمارہ: ۱
شعبان المعظم ۱۴۱۶ھ
جنوری ۱۹۹۶ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زر تعاون ۱۰۰/-

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، عمان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر 10 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات، قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، [illegible] زی لینڈ 22 امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مقام اشاعت: 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون: 03-02-5869501
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ اے، گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110
پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

عیسوی کیلنڈر کے اعتبار سے سال نو کا آغاز ہو چکا ہے۔ سال ۱۹۹۵ء کے ۳۶۵ دن تمام ہوئے اور آج صبح جب سورج نے اپنی کرنیں بکھیرنی شروع کیں تو یہ ۱۹۹۶ء کا پہلا دن شمار کیا گیا۔ تاہم اہل پاکستان کے لئے زبوں حالی اور ذلت و رسوائی کی سیاہ رات ابھی ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کی تیرگی ہے کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ ہم برس ہا برس سے افراد قوم کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں اور وقت نے اس بات کو اب ثابت بھی کر دیا ہے کہ مملکت خداداد پاکستان کا استحکام صرف اور صرف اسلام کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس ملک کی تقدیر نفاذ اسلام' اور وہ بھی محض دکھاوے کا نہیں' حقیقی معنوں میں اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کے ساتھ مشروط و معلق ہے۔ بحالی جمہوریت کے معاملہ کو بھی ہم نے محض ایک عارضی سہارے سے زیادہ حیثیت کبھی نہیں دی تھی اور اسی اعتبار سے مارشل لاء کے مقابلے میں اس کی تائید ہماری مستقل پالیسی رہی کہ مارشل لاء کا برقرار رہنا ملک کی سالمیت کے لئے سنگین خطرہ تھا۔ اب گزشتہ سات آٹھ برس سے پاکستانی قوم مختلف جمہوری تجربوں کا مشق ستم بنی ہوئی ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ یہ مظلوم قوم ملک کی دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں کی تشکیل کردہ "جمہوری حکومتوں" کی زخم خوردہ ہے۔ اور قوم حیران ہے کہ "اب کسے رہنما کرے کوئی"۔ بظاہر احوال صورت یہ ہے کہ کوئی امید بر نہیں آتی۔ گو ہمیں یقین ہے کہ علامہ اقبال کا یہ خواب سچ ثابت ہو گا کہ "شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے" اور "یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے" لیکن اس کے لئے اللہ اور اس کے دین کے وفاداروں کو جاں گسل انقلابی جدوجہد کرنا ہو گی اور کسی "شارٹ کٹ" کو اختیار کر کے منزل تک جلد پہنچنے کی کوشش کی بجائے پوری یکسوئی کے ساتھ دعوت' تنظیم اور تربیت کے مراحل سے گزرنا ہو گا۔ پھر اگر ہم پیہم جدوجہد اور ایثار و قربانی کے ذریعے سے فضائے بدر پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو قطار اندر قطار فرشتے آج بھی ہماری نصرت کے لئے گردوں سے ضرور اتریں گے۔ اللھم وفقنا لھذا

☆ ☆ ☆

زیر نظر شمارے میں "اسلام کا معاشرتی نظام" کے عنوان سے ایک وقیع مضمون شامل ہے۔ یہ مضمون ہمارے ایک قابل احترام ساتھی ڈاکٹر عبدالسمیع کا تحریر کردہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف قرآن اکیڈمی کے سابق فیلوز میں سے ہیں۔ آج کل مرکزی انجمن خدام القرآن فیصل آباد کے [illegible] ہیں اور تنظیم اسلامی بیرون پاکستان کے نائب ناظم بھی۔ اگرچہ مضمون زیر بحث میں پیش کردہ بنیادی خیالات' اس موضوع پر امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خطبات و تقاریر سے ماخوذ ہیں' تاہم محترم عبدالسمیع صاحب نے مضمون کے بعض گوشوں سے مزید نکھارا ہے اور بعض نئے پہلوؤں کو اجاگر بھی کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ قارئین اس کی افادیت کو بجا طور پر محسوس کریں گے۔ ○○

"ایک عرصہ کے بعد کسی مسلمان عالم کی تعصب سے پاک تحریر پڑھنے کو ملی"

امیر تنظیم اسلامی کے خطاب بعنوان "پاکستانی مسیحیوں کی خدمت میں..." پر مسیحیوں کے ایک جریدے "کلام حق" کا تبصرہ

"ماہنامہ میثاق' اگست ۹۵ء کے شمارے میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک مضمون "پاکستانی مسیحیوں کی خدمت میں چند گزارشات" شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون اپنی طوالت کی وجہ سے شائع تو نہیں کر سکتے۔ مگر جناب ڈاکٹر اسرار احمد نے جس طرح پاکستانی مسیحیوں کو یہودیت کی سازش سے آگاہ کیا ہے اور مسیحیت اور اسلام کی مشترکہ قدروں کی تفصیل بیان کی وہ قابل ستائش ہے۔ ایک عرصہ کے بعد کسی مسلمان عالم کی تعصب کی آلودگی سے پاک تحریر پڑھنے کو ملی۔ گو توہین رسالت کے مقدمے میں ڈاکٹر صاحب اب بھی سلامت مسیح اور رحمت مسیح کو بے گناہ نہیں سمجھتے...."

(ماخوذ از: "کلام حق" گوجرانوالہ' اشاعت ستمبر ۹۵ء)

تذکرہ و تبصرہ

امریکی معاشرے کے نئے رجحانات اور تارکینِ وطن کے لئے لمحۂ فکریہ

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ۱۳/ اکتوبر ۹۵ء کا خطاب جمعہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

انتہائی دائیں بازو کی تنظیمیں اور ان کے عزائم

پال فنڈلے اور لنڈن لاروش کے گروپوں کے علاوہ وہاں پر ایک تیسرا عنصر بھی اس ضمن میں بہت اہمیت اختیار کر رہا ہے۔ اور اس کا معاملہ اس اعتبار سے سب سے زیادہ خطرناک اور خوفناک ہے کہ یہ یہودیوں کے خلاف ہونے کے علاوہ مسلمانوں کے بھی قریبا انتہائی خلاف ہے۔ مزید بر آں یہ عنصر کالے افرو امریکیوں کے بھی خلاف ہے' اگرچہ اس کی شدت کے درجوں میں کچھ فرق ضرور ہے۔ یعنی اس کی شدت سب سے زیادہ یہودیوں کے خلاف' دوسرے نمبر پر مسلمانوں کے خلاف اور تیسرے نمبر پر مقامی افرو امریکن کے خلاف ہے' خواہ وہ عیسائی ہوں یا مسلمان۔ یہ عنصر وہاں کی بعض انتہائی دائیں بازو کی جماعتوں پر مشتمل ہے جس کے لئے وہاں "THE FAR RIGHT" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ ان جماعتوں نے امریکہ کی وفاقی حکومت کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ وہ واضح طور پر کہتے ہیں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی وفاقی حکومت صیہونیوں کے قبضے میں ہے' یہ صرف برائے نام امریکہ کی حکومت ہے' جبکہ حقیقت میں یہ صیہونیوں کی حکومت ہے۔ یہودی اگرچہ پورے امریکہ میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن اس کی بعض ریاستوں' خاص طور پر امریکہ کے شمال مشرق میں یہ سب سے بڑھ کر آباد ہیں۔ اور انہی علاقوں میں مسلمان بھی کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ امریکی دارالحکومت "نیویارک" کو تو وہاں

کہا جاتا ہے "جیو یارک" جاتا ہے۔ گویا یہ تو یہودیوں ہی کا شہر ہے۔ ان علاقوں میں ایک طویل عرصے سے اندر ہی اندر ایک آگ بڑی تیزی سے سلگ رہی تھی، لیکن چند واقعات نے اسے بھڑکا دیا ہے اور اب یہ ایک کھلی جنگ کی صورت اختیار کر رہی ہے۔ اس صورتحال کے بارے میں "یونائیٹڈ سٹیٹس ملیشیا ایسوسی ایشن بلیک فٹ۔ اڈاہو" کے سیموئیل شیرُوڈ نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ خانہ جنگی دور نہیں جس میں اڈاہو کے قانون سازوں کو گولی کا نشانہ بننا ہو گا۔ ان کا اپنا کہنا تو یہ ہے کہ ہمارے پانچ لاکھ تربیت یافتہ گوریلے موجود ہیں، لیکن حکومتی ادارے اگرچہ ان کی موجودگی کا اعتراف کرتے ہیں مگر ان کے نزدیک ان سرپھرے دیوانوں کی تعداد لاکھوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہے۔

سب سے پہلے ۳۱/ اگست ۱۹۹۲ء کو ریاست اڈاہو (Idaho) میں، جو ان لوگوں کا سب سے بڑا مرکز ہے، ان کا اہم لیڈر رینڈی وِیور اپنی بیوی اور چودہ سالہ بیٹے سمیت پولیس کے ساتھ تصادم میں مارا گیا۔ اس واقعے سے یہ آگ کچھ بھڑکی۔ لیکن پھر ۱۹/ اپریل ۹۳ء کو واکو ٹیکساس کا ہولناک واقعہ پیش آیا، جس میں ایف بی آئی نے ڈیوڈ کوریش کے پیروکاروں کے مرکز پر دھاوا بولا۔ ڈیوڈ کوریش دائیں بازو کا بہت نمایاں آدمی تھا جو بہت ابھر کر سامنے آیا تھا اور جس نے ایک مذہبی فرقہ بھی بنا لیا تھا، اس کے خلاف یہودیوں نے تمام ذرائع ابلاغ کے ذریعے زبردست پروپیگنڈہ کیا اور یہ بھی کہا کہ یہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ پھر ان کے خلاف ایسی سنگین خونریز کارروائی کی گئی جس کی امریکہ کی تاریخ میں کسی غیر فوجی مہم میں مثال نہیں ملتی۔ ان کے مرکز کو جلا کر راکھ کر دیا گیا جس سے ستر آدمی موقع پر ہی مارے گئے۔ اس پر وہاں بڑا واویلا مچا تھا۔

اس کے بعد سے یہ لوگ "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق دہشت گردی میں بہت نمایاں ہو گئے۔ چنانچہ "جواب آں غزل" کے طور پر اپریل ۱۹۹۵ء میں اوکلاہاما کے بم دھماکے اور اکتوبر ۱۹۹۵ء میں اریزونا میں ریل گاڑی کو پٹڑی سے اتارنے کے واقعات ہوئے ہیں۔ اول الذکر واقعے کے بارے میں پہلے تو یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ مسلمانوں نے کیا ہے اور اس کے ردعمل کے طور پر مسلمانوں کی املاک پر اکا دکا حملے بھی شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ بہت سی مساجد پر حملے ہوئے اور انہیں جلانے کی کوشش کی گئی۔ چھوٹے

شہروں میں مسلمان خاندانوں کی تعداد بہت کم ہے اور اکثر جگہوں پر صرف چار چار یا پانچ پانچ خاندان رہائش پذیر ہیں۔ چنانچہ ایسی جگہوں پر مسلمانوں کے گھروں پر حملے کئے گئے۔ بڑے شہروں میں خاص طور پر شمال مشرقی علاقے میں تو چونکہ مسلمان بڑی تعداد میں آباد ہیں لہٰذا وہاں آسانی سے ان کے خلاف کوئی اقدام ممکن نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کا بہت بڑا فضل ہے کہ جلد ہی بم دھماکوں کے اصل ملزم کا سراغ مل گیا اور مسلمانوں کو اس سے بریٔ الذمہ قرار دے دیا گیا۔ اس اعتبار سے انہیں کسی درجے میں کریڈٹ دینا چاہئے کہ وہاں قانون اور دستور کی بالادستی ہے۔ اوپر کے پیمانے پر سی آئی اے جو کچھ سازشیں کرتی ہے وہ اپنی جگہ، لیکن نچلی سطح پر ان کا اپنا جو ایک نظام ہے اس میں معاملات صحیح طور پر قانون کے مطابق طے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جیسے ہی اصل آدمی گرفتار ہوا تو اعلان کر دیا گیا کہ یہ کام کرنے والا کوئی مسلمان نہیں بلکہ عیسائی ہے۔ تاہم اوکلاہاما کے واقعے کو اس طرح اچھالا نہیں گیا جس طرح ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے معاملے کو اچھالا گیا تھا، جس میں صرف چند آدمی مرے تھے، لیکن اس پر پوری دنیا میں ایک طوفان کھڑا کر دیا گیا تھا اور اس سلسلے میں عمر عبدالرحمٰن اور ان کے ساتھیوں کو مجرم بھی قرار دے دیا گیا ہے۔ ذرائع ابلاغ میں اس کا بڑے زور شور سے چرچا کیا گیا۔ لیکن اوکلاہاما کے واقعے کو بالکل دبا دیا گیا جبکہ دس بیس دو سو آدمی مرے ہیں اور فیڈرل گورنمنٹ کی ایک بہت بڑی کئی منزلہ بلڈنگ اس طرح تباہ ہوئی ہے کہ اس کی تصاویر دیکھے بغیر اس تباہی کا تصور ممکن نہیں ہے۔ ان جماعتوں کا "جہاد" بھی دراصل امریکہ کی فیڈرل گورنمنٹ کے خلاف ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ Zionist Occupational یعنی صیہونی تسلط میں گرفتار گورنمنٹ ہے۔

مذکورہ بالا حادثات اس بات کو نمایاں کر رہے ہیں کہ وہاں پر حکومت مخالف جذبات کس قدر شدت اختیار کر رہے ہیں۔ سیموئیل شیروڈ کا قول میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ خانہ جنگی شروع ہوا چاہتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

> **The Federal Government is the "beast" and the sinful rider on this beast is the Jew.**

یعنی امریکہ کی وفاقی حکومت خونخوار درندہ ہے اور اس کا گنہگار سوار یہودی ہے۔ یہ بات

لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں پر اب ایک ایسا قانون منظور ہونے والا ہے جسے امریکہ کی تاریخ کا سیاہ ترین قانون کہا جا سکتا ہے۔ انسدادِ دہشت گردی کے اس مسودۂ قانون کو "اومنی بس کاؤنٹر ٹیررازم ایکٹ آف ۱۹۹۵ء" کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں پہلے ہمارا خیال تھا کہ یہ غالباً صرف مسلمانوں کے لئے ہے، لیکن اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہاں پر یہودیوں کے خلاف اور خود فیڈرل گورنمنٹ کے خلاف اٹھنے والے طوفان کو روکنا اس قانون کا فوری محرک بنا ہے۔ اس قانون کے ذریعے حکومت کو جو اختیارات حاصل ہو جائیں گے، ان کا اندازہ کر لیجئے :

۱۔ صدر امریکہ کو اختیار حاصل ہو گا کہ وہ بغیر کسی ثبوت کے اور بغیر مقدمہ چلائے کسی بھی تنظیم کو دہشت گرد قرار دے دیں اور اس بنا پر کسی بھی امریکی شہری کو، صفائی کا موقع دیئے بغیر، اس تنظیم سے تعلق رکھنے کے الزام میں جیل میں بھجوا دیں اور کسی بھی غیر ملکی باشندے کو ملک سے نکال دیں۔ اس فیصلے کے خلاف نہ تو عدالتوں کو اور نہ ہی کانگریس کو صدر سے کسی استفسار کا حق حاصل ہو گا۔ (اب بتایئے کہ اس سے بڑا مارشل لاء اور کیا ہو گا؟)

۲۔ حکومت کو اختیار حاصل ہو گا کہ وہ کسی بھی غیر ملکی باشندے کو اس کا جرم بتائے بغیر ملک سے خارج کر دے۔

۳۔ حکومت کسی بھی شخص کے امریکہ میں داخلے سے متعلق نجی ریکارڈ کی جانچ پڑتال کر سکے گی۔

۴۔ ایف بی آئی کو اجازت ہو گی کہ کسی جرم کے واقع ہونے کی شہادت کے بغیر بھی لوگوں کے خلاف تفتیش شروع کر دے۔

۵۔ تفتیش کے دوران متعلقہ شخص کی ڈاک اور ٹیلیفون پر نظر رکھی جا سکے گی۔

یہ مسودۂ قانون منظوری کا ایک مرحلہ طے کر چکا ہے، اب اسے ایک ۳۵ رکنی کمیٹی کے حوالے کیا گیا ہے اور اس کے بعد یہ جرائم سے متعلق ایک سب کمیٹی کے سپرد کیا جائے گا جہاں اس کا آخری فیصلہ ہو جائے گا۔

اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک بدترین "سیفٹی لاء" ہو گا، جس طرح ہمارے ملک

میں بھی کبھی سیکیورٹی لاز کا نفاذ ہو تا تھا، یا جیسے ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا جائے تو شہریوں کے تمام حقوق ساقط ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے خود وہاں کے لوگوں کا رد عمل اس کے بارے میں یہی آ رہا ہے کہ اس سے تو ہمارے دستوری حقوق ختم ہو کر رہ جائیں گے۔ کچھ عیسائی تنظیموں کی طرف سے بھی اس کے خلاف آواز اٹھ رہی ہے۔ اس قانون کی نوعیت اسی طرح کی ہے جس طرح بھارت میں "ٹاڈا" قانون کی ہے جس کے تحت جس کو چاہیں جیل میں ڈالا جا سکتا ہے۔ اس وقت بھارت میں جتنے کشمیری جیلوں میں ہیں وہ اسی "ٹاڈا" کے تحت قید ہیں۔ حکومت کی سرے سے کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ ان پر مقدمہ چلائے اور ان پر عائد کردہ الزامات کو ثابت کرے۔ چنانچہ وہ جیلوں میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ اسی طرح کا بدترین قانون اب جمہوریت کی سب سے بڑی علمبردار ریاست میں نافذ ہوا چاہتا ہے، جن کے لئے جمہوریت تو گویا مذہب کی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن ان کی کیفیت اب تنگ آمد بجنگ آمد والی ہے اور حالات بڑی تیزی سے ایک خاص رخ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ورنہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ کے لئے ایسا کوئی قانون منظور کرنا ہمارے قرین قیاس ہو ہی نہیں سکتا تھا، کیونکہ وہاں بہرحال آزادی ہے، انسانی حقوق کا بول بالا ہے، لوگوں کو شہری حقوق میسر ہیں، کسی شخص کو مقدمہ چلائے بغیر جیل میں رکھنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن اب وہاں انسدادِ دہشت گردی کا یہ قانون پاس ہو رہا ہے۔ اسے ابتداءً تو ہم نے یہ سمجھا تھا کہ یہ مسلمانوں کے خلاف ہے، کیونکہ اس کا آغاز اس طرح ہوا تھا کہ یہودیوں نے یہ واویلا مچانا شروع کیا تھا کہ فلسطین میں "حماس" وغیرہ اور عالم اسلام کی دیگر احیائی تحریکوں کے لئے امریکہ سے مالی مدد فراہم کی جاتی ہے، امریکہ میں آباد عرب اور دوسرے مسلمان ان تحریکوں کی مالی اعانت کرتے ہیں۔ اگرچہ یہودی خود بھی بڑے پیمانے پر یہ کام کرتے ہیں اور امریکہ سے ارب ہا ارب ڈالر سماجی خدمات اور انسانی بنیادوں کے عنوانات سے اسرائیل کو جاتے ہیں، لیکن اب یہی کام تھوڑے سے پیمانے پر مسلمانوں نے شروع کیا ہے کہ فلسطین، بوسنیا، چیچنیا اور کشمیر وغیرہ میں کچھ مدد پہنچائی جائے تو اس کے حوالے سے یہودیوں نے شور مچایا ہے کہ جن تنظیموں سے ہمیں مشرق وسطیٰ، ایشیا اور یورپ میں نمٹنا پڑ رہا ہے ان کے اڈے تو یہاں امریکہ میں ہیں، لہٰذا ان کے خلاف کوئی

اقدام ہونا چاہئے۔ تو بات اگرچہ مسلمانوں سے شروع ہوئی تھی لیکن اس کی زد میں اب
یہاں کی انتہائی دائیں بازو کی عیسائی تنظیمیں بھی آ جائیں گی' اس لئے کہ ان کے لئے بڑا
[illegible]ف ناموں سے منظم ہونے والے یہ مسلح گروہ بن گئے ہیں' جن کی حیثیت گویا اندر
کے بھیدی کی ہے۔ امریکہ میں مقیم [illegible]لکی اگر رقوم باہر بھیج رہے ہیں تو اس سے امریکہ کی
سالمیت پر تو حرف نہیں آ رہا' امریکہ کی سرزمین پر تو کوئی دہشت گردی نہیں ہو رہی' لیکن
یہ جواب اندر کا ایک اور دشمن جاگ اٹھا ہے تو یہ بجائے خود امریکیوں کے لئے خطرہ ہے۔

مسلمانوں کی ایک مزید خوش نصیبی

میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسلمانوں کی ایک مزید خوش نصیبی ہے کہ اس ایکٹ کا اگر
فوری طور پر اطلاق ہو گا تو دو طرفہ ہو گا۔ اس لئے کہ صدر امریکہ کو جس قدر بھی اختیار
حاصل ہو جائے لیکن یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ مقدمات ہمیشہ نیچے سے بنتے ہیں۔
اور ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ نچلی سطح پر امریکہ میں سارے کے سارے افسر بددیانت
ہیں۔ میں نے ابھی اوکلاہاما بم دھماکے کی مثال پیش کی ہے کہ اگرچہ ابتداً تو اس کا رخ
مسلمانوں کی طرف پھر گیا تھا لیکن جونہی اصل ملزم پکڑا گیا تو فوری طور پر مسلمانوں کی بے
گناہی کا اعلان کر دیا گیا' جس سے بات بگڑتے بگڑتے رک گئی۔ یہ کریڈٹ بہرحال ان کو جاتا
ہے۔ ان کے ہاں بدعنوانی اور رشوت بہت اونچی سطح پر ہے' نچلی سطح پر نہیں ہے۔ اور جو
بھی جنگی سکیمیں بنتی ہیں یا سی آئی اے وغیرہ کی جو سازشیں ہوتی ہیں وہ بھی عام سطح پر نہیں
بلکہ بہت بالائی سطح پر ہوتی ہیں۔ لہٰذا مذکورہ بالا قانون کا اطلاق اگر عوامی سطح سے شروع ہو
گا تو خاص طور پر مسلمان ہی اس کا نشانہ نہیں بنیں گے۔ ظاہر ہے کہ مقدمات کی فائلیں اور
رپورٹیں تو نیچے سے ہی اوپر جاتی ہیں۔ چنانچہ انسدادِ دہشت گردی کا یہ قانون اگر
مسلمانوں کے خلاف استعمال ہو گا تو شدت پسند عیسائیوں کے خلاف بھی استعمال ہو گا۔ اس
طرح توقع ہے کہ مسلمانوں کو عارضی طور پر اس سے بھی کچھ نہ کچھ سہارا مل جائے گا۔ لیکن
اصل بات میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سب سہارے عارضی ہیں۔ جیسا کہ میں نے
شروع میں عرض کیا تھا' یہودی عالمی استعمار اور اس کا آلہ کار امریکہ انتہائی desperate

ہو چکے ہیں۔ اس لئے معاملہ بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور مختلف جگہوں پر اس کے تانے بانے بنے جا رہے ہیں۔

یہود کے خلاف عیسائیوں کے اقدامات

لیکن دوسری طرف امریکہ میں یہودیوں کے خلاف ردعمل میں بھی شدت آتی جا رہی ہے۔ بعض عیسائیوں کی طرف سے یہودیوں کے خلاف ایک دستاویزی فلم بھی تیار ہوئی ہے۔ یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف جہاد کے موضوع پر فلم تیار کروائی تھی تاکہ امریکہ میں مسلمانوں کی مختلف تنظیموں کو بدنام کیا جائے' لیکن عیسائیوں نے یہودیوں کے خلاف "The Other Israel" کے نام سے فلم بنادی ہے جو ویڈیو کی صورت میں دستیاب ہے۔ اس فلم میں "تالمود" کی عبارتوں کے حوالے سے واضح کیا گیا ہے کہ یہودیوں کا اصل مذہب کیا ہے۔ یعنی یہ کہ سوائے یہودیوں کے اور کوئی انسان ہے ہی نہیں۔ یہودی کے سارے اخلاق' ساری دیانت' ساری سچائی' سارا خلوص اور ساری محبت یہودی ہی کے لئے ہیں۔ باقی غیر یہودی جنٹائلز (Gentiles) اور گوئیمز (Goyems) کو جس طرح چاہو لوٹو کھسوٹو' ان کا خون چوسو' انہیں دھوکہ دو' ان کے ساتھ جو چاہو کرو۔ ان کی مذہبی کتاب "تالمود" میں انہیں یہ کھلی چھوٹ دی گئی ہے۔ تالمود دراصل ان کی کتاب فقہ اور ان کا نظام العمل ہے اور یہ تورات (عہد نامۂ قدیم) کے کوئی ایک ہزار برس بعد مرتب ہوئی ہے۔ تو عیسائیوں کی طرف سے بنائی گئی فلم میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہودیوں کا اصل مذہب یہ ہے اور ان لوگوں کے عزائم یہ ہیں۔

اسی طرح ناسٹرے ڈیمس کی پیشینگوئیوں کا تذکرہ بھی آپ نے کچھ عرصہ پہلے سنا ہو گا۔ ان پیشینگوئیوں میں مسیح دجال (Anti-Christ) کے ظہور کی تاریخوں کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ ۹۹-۱۹۹۷ء کے آس پاس کہیں ظاہر ہو گا' جو فائنل اور سب سے بڑا اینٹی کرائسٹ (یعنی دجال اکبر) ہو گا۔ اس ضمن میں اب وہاں عیسائیوں کا ایک باقاعدہ ادارہ بن چکا ہے جو ناسٹرے ڈیمس کی پیشینگوئیوں پر تحقیقات کر رہا ہے۔ پہلے یہودیوں نے جو فلمیں تیار کروائی تھیں ان میں اینٹی کرائسٹ کے بارے میں ناسٹرے ڈیمس

کی پیشینگوئی کو مسلمانوں پر منطبق کر دیا گیا تھا اور اس طرح دہشت پیدا کی گئی تھی کہ وہ دجال جو اٹھ کر ایشی حملے سے امریکہ کا امن و سکون تہ و بالا کر دے گا وہ ایک عرب مسلمان ہو گا۔ لیکن اب عیسائیوں نے ایسی فلمیں بنائی ہیں جن میں وہ یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ اینٹی کرائسٹ دراصل یہودی ہی ہو گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک اہم اور قابل توجہ بات ہے۔

مسیحِ دجال کی پیدائش اور جدید سائنس

اس ضمن میں میں ایک بات مزید عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بعض مواقع پر میں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ دجال سے متعلق بعض احادیث کو میں ابھی تک پورے طور سے سمجھ نہیں پایا۔ یہ حدیثیں سند کے اعتبار سے صحیح ہیں اور میں انہیں رد نہیں کرتا۔ میرے نزدیک جس طرح قرآن کی کوئی بات خواہ سمجھ میں نہ آئے پھر بھی اسے ماننا ضروری ہے کیونکہ ہماری عقل کی حیثیت "حاکم" کی نہیں بلکہ حاکم اللہ کا کلام ہے' اسی طرح حدیث کا معاملہ ہے کہ اس میں حاکم ہماری عقل نہیں بلکہ اللہ کے رسول ﷺ کا کلام ہے۔ البتہ حدیث کی سند میں کوئی ضعف ہو' حدیث ضعیف ہو یا موضوع ثابت ہو جائے تو بات دوسری ہے۔ لیکن اگر حدیث کی سند صحیح ہو تو پھر آپ کو اسے ماننا ہو گا' خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ جہاں تک فتنہ دجال کا تعلق ہے تو ایک تو ہم مغربی تہذیب کو بحیثیتِ مجموعی دجالی فتنہ کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ مغرب میں سائنسی ترقی اتنی تیزی سے ہوتی جارہی ہے اور انسان قوانین فطرت پر اتنی قدرت حاصل کر چکا ہے اور تسخیر کائنات کے حوالے سے انسان طبعی قوتوں کو بھی اس طرح قابو میں لا چکا ہے کہ اب وہ مصنوعی بارش بھی برسا سکتا ہے' چنانچہ اس کے ذریعے صحراؤں کو گل و گلزار بنا لیا گیا ہے' آج انسان کے پاس وہ سواری موجود ہے جس کا ایک قدم مدینہ میں ہوتا ہے تو دوسرا بیت المقدس میں ہوتا ہے' بلکہ ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ راستے میں کہیں رکے بغیر بارہ ہزار میل تک کا سفر طے کر لے۔ دجال کی سواری کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ اس کے دونوں کانوں کا درمیانی فاصلہ چالیس ہاتھ ہو گا۔ آج آپ طیاروں کے بازوؤں کے سروں پر لگے ہوئے راڈارز کا درمیانی فاصلہ ناپیں تو وہ

اس سے بھی کہیں زیادہ بنے گا۔ دجال کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ایک انسان کو آری سے دو ٹکڑے کر کے دوبارہ جوڑ دے گا۔ آج سرجری اس مقام پر پہنچا چاہتی ہے اور یہ کوئی دور کی بات معلوم نہیں ہوتی۔ تو ایک تو یہ مغرب کی ٹیکنالوجی کا معاملہ ہے اور چونکہ انہوں نے اپنے اوپر آسمانی ہدایت کا دروازہ تو بند کر لیا' لہٰذا اس تہذیب کی ایک آنکھ بند ہو گئی۔ فزیکل سائنس اور ٹیکنالوجی ترقی کرتی چلی گئی' لیکن وحی کے ذریعے حاصل ہونے والے علم کی پیروی اور اس کا اتباع ترک کر دیا گیا۔ لہٰذا پوری مغربی تہذیب کی حیثیت ایک آنکھ والے دجال کی ہے۔ تو دجال کا ایک مفہوم تو یہ ہے۔ البتہ مسیح الدجال ایک معین شخص ہو گا جو یہودیوں میں سے کھڑا ہو گا اور مسیح ہونے کا دعویٰ کرے گا۔ اس لئے کہ یہودیوں کے ہاں یہ پیشینگوئیاں موجود تھیں کہ ایک مسیح آئے گا جو انہیں "عظیم تر اسرائیل" بنا کر دے گا۔ لیکن جب حضرت مسیح علیہ السلام ان کے نجات دہندہ کے طور پر آئے تو یہود نے ان کا انکار کر دیا اور انہیں مرتد اور واجب القتل قرار دے کر اپنے بس پڑتے سولی چڑھا دیا۔ چنانچہ ان کے ہاں "مسیح" کا منصب ابھی خالی پڑا ہے۔ ان کے نزدیک مسیح کی آمد کی پیشینگوئی ابھی پوری نہیں ہوئی اور وہ مسیح کے منتظر ہیں۔ تو کوئی یہودی کھڑے ہو کر اعلان کر دے گا کہ میں مسیح ہوں' لیکن وہ مسیح الدجال ہو گا۔ اور اسے خود حضرت مسیح علیہ السلام ہی قتل کریں گے۔

یہ دو چیزیں تو بالکل سمجھ میں آتی ہیں اور انہیں میں اپنی کتاب "سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی' حال اور مستقبل" میں بڑی تفصیل سے واضح کر چکا ہوں۔ لیکن اس معاملے کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس دجال نے خدا ہونے کا دعویٰ کرنا ہے اور اس کے پاس ایسی قوتیں ہوں گی کہ جن کو دیکھ کر ہلکے پھلکے ایمان کا حامل شخص بھی بہہ جائے گا۔ اور جب تک بہت گہرا ایمان موجود نہ ہو کوئی شخص اس کے مقابل نہ ٹھہر سکے گا اور اسے خدا مان کر سجدہ کرے گا۔ اب امریکہ میں ناسٹرے ڈیمس کی پیشینگوئیوں پر تحقیقات کے لئے ادارہ قائم ہوا ہے تو بعض باتیں سامنے آئی ہیں۔ میں نے ایک اخبار میں ناسٹرے ڈیمس کے ڈھانچے کی تصویر بھی دیکھی ہے جو تابوت میں سے نکالا گیا ہے اور اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں کچھ کاغذات ہیں۔ یہ کاغذات جو برآمد ہوئے ہیں ان پر ناسٹرے ڈیمس کے اپنے ہاتھ

کی لکھی ہوئی پیشینگوئیاں ہیں۔ ان میں تذکرہ ہے کہ کسی دور میں ایک نہایت عجیب الخلقت بچہ پیدا ہوگا جس کو نہایت غیر معمولی قوتیں حاصل ہوں گی۔ اس کا تذکرہ احادیث میں بھی ہے۔ لیکن یہ بات آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ کیا ہوگا' اس کو خدا کیسے مان لیا جائے گا؟ اب ایک اعتبار سے تو یہ قرین قیاس محسوس ہوتا ہے کہ آج جینٹک انجینئرنگ کا فن بہت ترقی کر گیا ہے اور اس جینٹک انجینئرنگ میں کہیں غیر ارادی طور پر کوئی ایسی مخلوق پیدا ہو جائے کہ جو بہت ہی غیر معمولی قوتوں کی حامل ہو تو یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں ہے۔ واللہ اعلم!

امریکہ۔ خانہ جنگی کے دہانے پر

میں عرض کر رہا تھا کہ امریکہ میں جو انتہائی دائیں بازو کی شدت پسند عیسائی قوتیں ابھر رہی ہیں تو ان کی طرف سے اول نمبر پر یہودیوں' دوسرے نمبر پر مسلمانوں اور تیسرے نمبر پر افرو امریکیوں کے خلاف بڑی زبردست تحریک اٹھنے والی ہے' جس کی طرف سے یہ اعلان بھی آگیا ہے کہ اب سِول وار آیا چاہتی ہے۔ امریکہ کے مغربی ساحل پر آباد ہمارے بعض ساتھیوں نے بتایا ہے کہ ان کے کچھ مقامی دوست یہ کہتے ہیں کہ بہت جلد ایک بہت بڑی خونریزی ہونے والی ہے جس کے لئے مسلمانوں کو تیار رہنا چاہئے۔ بلکہ جنوب میں ٹیکساس کے علاقے میں تو بعض یہودی تنظیموں نے تہہ خانے بنا کر سامان جمع کرنا شروع کر دیا ہے اور اس طرح لمبی جنگ کی تیاری کا بندوبست شروع ہو چکا ہے۔ مغرب اور جنوب کا علاقہ مل کر ہلال کی سی صورت بنتی ہے جس میں یہ تحریک بڑے زور و شور کے ساتھ اٹھ رہی ہے۔ بہرحال یہ طوفان تو عالمی سطح پر آنے والا ہے اور اس کے آثار اب خاص طور پر امریکہ میں ظاہر ہو رہے ہیں جو بڑا امن کا گہوارہ کہلاتا تھا۔ ہم بھی جا کر دیکھتے تھے کہ وہاں بڑا پرامن ماحول ہے۔ شہروں کے اندر جہاں کہیں افرو امریکیوں نے قبضے کر رکھے ہیں' جیسے ڈاؤن ٹاؤن کا علاقہ' وہاں وہ شرابیں بھی پیتے ہیں اور رات کے وقت وہاں جرائم بہت ہوتے ہیں' لیکن ذرا مضافات میں چلے جائیں تو بڑا سکون و اطمینان ہے' نہ کہیں چوری ہے نہ ڈاکہ۔ وہاں پر معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہاں کوئی حکومت بھی ہے۔ آپ ایک دفعہ جے

ایف سی ایئرپورٹ پر اپنے کاغذات وغیرہ چیک کروانے کے بعد باہر نکل جایئے، تو اس کے بعد مجال ہے جو کہیں آپ کو محسوس ہو کہ یہاں پر حکومت نام کی کوئی شے بھی موجود ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، وہاں تو ٹریفک کانسٹیبل بھی احترام سے بات کرتا ہے۔ کسی نے بڑے سے بڑا جرم بھی کیا ہو تو وہ اس کے پاس آ کر یہی کہے گا کہ "Sir, Can I see your license?" (جناب کیا میں آپ کا لائسنس دیکھ سکتا ہوں؟) یہی وجہ ہے کہ نیویارک میں بروکلین ایریا کے اندر غالباً ہزاروں پاکستانی، جن میں ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی بھی ہیں، کیب ڈرائیورز کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہاں پر کیب ڈرائیونگ کوئی گھٹیا یا پنچ کام نہیں سمجھا جاتا اور کیب ڈرائیور کو ہمارے ہاں کی طرح کے اندیشے نہیں ہوتے کہ پولیس کا سپاہی کیا کر دے گا، یا کیا کہہ دے گا یا رشوتیں دینی ہوں گی۔ لیکن بہرحال امن و سکون کا یہ معاملہ اب وہاں زیادہ دیر رہنے والا نہیں ہے۔ یہ بھٹی بہت جلد دہکنے والی ہے جس کی خبریں احادیث نبویؐ میں "الملحمۃ العظمٰی" کے نام سے آئی ہیں اور جس کا ریہرسل خلیج کی جنگ میں ہمارے سامنے آچکا ہے۔ اس کے بعد سے معاملات جس تیز رفتاری کے ساتھ چل رہے ہیں وہ دنیا کے سامنے ہے۔ عالمی یہودی استعمار اب اس کیفیت میں مبتلا ہو چکا ہے کہ اسے امریکہ جیسے ملک میں بھی انسدادِ دہشت گردی کے قانون کا سہارا لینا پڑ رہا ہے جو میرے نزدیک ایک ناقابل تصور بات تھی۔ میں کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ امریکہ میں یہ بھی ہو سکتا ہے۔ امریکہ کا تو مذہب ہی جمہوریت اور حقوق ہے، ان کا اور کوئی مذہب نہیں ہے۔ وہاں اگر یہ قانون بن رہا ہے تو اس سے آپ کو اندازہ ہونا چاہئے کہ حالات کس رخ پر جا رہے ہیں۔

ہم کہاں کھڑے ہیں؟

اس پس منظر میں اب ہمیں ذرا اپنا جائزہ لینا ہے کہ پاکستان کہاں کھڑا ہے؟ "الملحمۃ العظمٰی" کی یہ بھٹی تو بہرصورت دہکے گی، لیکن اس تناظر میں پاکستان نظام خلافت کا نقطۂ آغاز بنے گا یا عالمی یہودی استعمار کا آلہ کار؟ ہم اس وقت ایک چوراہے پر کھڑے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس چوراہے سے آگے نکل آئے ہیں اور

استعمار کے آلہ کار بننے کی طرف پیش قدمی کر چکے ہیں۔ اندرون خانہ یقینی طور پر کوئی بہت بڑی سودے بازی ہوئی ہے جس کے نتیجے میں براؤن ترمیم منظور ہوئی ہے اور انکل سام ہم پر کچھ مہربان نظر آ رہے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ امریکہ کوئی قیمت لئے بغیر' اپنے کسی مفاد اور مصلحت کے بغیر ہمارے معاملے میں نرمی دکھا رہا ہو۔ ان کے نزدیک تو اخلاق اور وفا کی کوئی حیثیت نہیں۔ امریکہ کے اپنے معاشرے کی کچھ اخلاقی اقدار ہیں جن کی وہ اپنے ہاں قدر کرتے ہیں۔ باقی انٹرنیشنل فورم پر آ کر تو انہیں اپنی مصلحت اور اپنے فائدے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اور پہلے وہ یہ باتیں ڈھکے چھپے انداز میں کرتے تھے' اب برملا کہتے ہیں کہ "امریکہ امریکہ ہے اور پاکستان پاکستان ہے"۔ ڈیڑھ دو برس قبل کراچی میں میر خلیل الرحمٰن صاحب کی برسی کے موقع پر ایک تقریب میں' جہاں میں بھی موجود تھا' بیگم سیدہ عابدہ حسین نے بتایا تھا کہ امریکی وزیر خارجہ سے گفتگو کے دوران جب ان سے پوچھا گیا کہ امریکہ مختلف ملکوں کے معاملات میں مختلف طرز عمل کا مظاہرہ کیوں کرتا ہے' یہ دو عملی آخر کیوں ہے' تو انہوں نے صاف صاف کہا کہ یہ تو ہونا ہی ہے

"America is America and Pakistan is Pakistan"

ہمارے اندرونی حالات جس رخ پر جا رہے ہیں وہ سخت تشویشناک ہے۔ کشمیر کا مسئلہ یہ رخ اختیار کر رہا ہے کہ رفتہ رفتہ کیمپ ڈیوڈ یا PLO والا معاملہ کروا کے کشمیر کو عجمی اسرائیل بنانے کی سازش ہو رہی ہے' جو براعظم ایشیا کے قلب میں ایک بڑا اسرائیل ہو گا۔ اسی طرح کراچی کے حالات خانہ جنگی کے دہانے پر پہنچ چکے ہیں۔ سرکاری دہشت گردی اس انتہا کو پہنچ چکی ہے کہ سب نے تسلیم کر لیا ہے کہ فہیم کمانڈو اور اس کے چار ساتھیوں کو پولیس نے لے جا کر مارا ہے۔ کوئی بھی ماننے کو تیار نہیں ہے کہ وہ خود اپنے ہی ساتھیوں کی فائرنگ کا شکار ہو گئے۔ اگر ان کے ساتھیوں نے انہیں مارا ہوتا تو کوئی چھرہ تو کسی پولیس مین کو بھی لگتا۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ مقتولین کی پشتوں پر بڑے قریب سے گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی ہے۔ اب اس طرح کی چیزیں حالات کو کدھر لے جا رہی ہیں اور ان کے کیا نتائج نکلنے والے ہیں؟ ان معاملات میں ہماری حکومت کی پالیسی کیا ہے؟ خارجہ امور میں اس کی پالیسی کیا ہے؟ ایران اور چین کے ساتھ ہمارے تعلقات کیا رخ اختیار کر رہے ہیں؟

افغانستان میں اب کیا ہو رہا ہے؟ مزید برآں فحاشی کا نیا سیلاب پاکستان میں امڈا چلا آ رہا ہے۔ اور اب وہ "Rock-Drug-Sex" کا طوفان ہماری تہذیبی اقدار اور خاندانی نظام کو برباد کرنے کے لئے پیش قدمی کر رہا ہے۔ اب بینکوں کا وہی نظام پاکستان میں اپنا جال پھیلا رہا ہے جو امریکی معیشت کو تباہ کر چکا ہے۔ سٹی بینک' سٹی ہاؤس' سٹی کار اور سٹی کارڈ جیسے سارے ہتھکنڈے اب اسی طریقے سے پاکستان میں استعمال کئے جا رہے ہیں۔

ان حالات کا تقاضا کیا ہے؟ اس موضوع پر اب ان شاء اللہ اگلے جمعہ (۲۰۔ اکتوبر) کو مینار پاکستان کے سبزہ زار میں لگی لپٹی رکھے بغیر' کھل کر گفتگو ہو گی' جہاں اس خطاب جمعہ سے تنظیم اسلامی کے سہ روزہ سالانہ اجتماع کا آغاز ہو گا۔ وہاں پر میرے خطاب جمعہ کا عنوان ہو گا : "پاکستان۔۔۔ نظام خلافت کا نقطہ آغاز یا عالمی یہودی استعمار کا آلہ کار؟" گویا فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم! اب قوم کو یہ فیصلہ کرنا ہو گا اور عوامی سطح پر کمر ہمت کسنی ہو گی۔ ہمارے سابق چیف جسٹس قوم کو بار بار متنبہ کرتے رہتے ہیں کہ ع "نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے......!" میں تو ان کے بیانات کی سرخیاں پڑھ کر حیران رہ جاتا ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قوم کا کوئی خیر خواہ اسے متنبہ ہی کر سکتا ہے' توجہ ہی دلا سکتا ہے' باقی نوشتہ دیوار تو نظر آ رہا ہے' حالات تو سامنے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حالات کی سنگینی کا احساس کرنے اور اس ضمن میں اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے!!

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات OO

احوال وظروف

موجودہ ملکی وملی حالات پر امیر تنظیم اسلامی کا تبصرہ

۲۲/دسمبر ۹۵ء کے خطاب جمعہ کا پریس کا ریلیز

لاہور (پ ر) اسلام کی علمی اور روحانی وراثت کا مرکز چار سو سال پہلے برعظیم پاک و ہند میں منتقل ہو گیا۔ مجددین امت کی طویل مساعی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے پاکستان کے قیام سے ملت اسلامیہ پاکستان کو دنیا میں عظیم ترین کردار عطا کیا۔ امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے سعودی عرب کے دورہ سے واپسی پر مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں نماز جمعہ سے قبل خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ قائداعظم وہ واحد شخصیت ہیں جن کے فیصلہ کن کردار کی وجہ سے پاکستان معرض وجود میں آیا۔ قائد اعظم پاکستان کو عہد حاضر کی جدید اسلامی ریاست بنا کر دنیا کے سامنے بطور نمونہ پیش کرنا چاہتے تھے۔ پاکستان کا قیام ایک معجزہ کی حیثیت سے مشیت ایزدی کا خصوصی مظہر ہے مگر قیام پاکستان کے بعد ہماری عظیم اکثریت نے نظریہ پاکستان کو عملی جامہ پہنانے سے انحراف کی روش اختیار کر لی۔ پوری قوم ذاتی و گروہی مفادات کے حصول میں لگ گئی جس کے نتیجے میں ہم نفاق باہمی میں مبتلا ہو کر لسانی' علاقائی اور مذہبی قومیتوں میں تقسیم ہو گئے۔ نفاق عملی کے حوالے سے قوم انفرادی اور اجتماعی سطح پر ذلت اور پستی کی آخری انتہا کو پہنچ چکی ہے' چنانچہ جو جتنا "بڑا" ہے وہ اسی قدر بڑا خائن اور بد عنوان ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ملک کے حالات خراب سے خراب تر صورتحال کی عکاسی کر رہے ہیں۔ اقتصادی شعبے میں غیر یقینی صورتحال کی وجہ سے ملک معاشی طور پر تباہی کے کنارے پہنچ چکا ہے۔ ان حالات میں پوری قوم اللہ تعالیٰ کے حضور اجتماعی سطح پر قوم یونس علیہ السلام کی طرح توبہ کرے تو شاید رحمت خداوندی ہماری دستگیری فرمائے اور آیا ہوا عذاب ٹال دے۔

امیر تنظیم اسلامی نے مسلح افواج کے نئے سربراہ کی تقرری کو ملک و قوم کے لئے خوش آئند قرار دیا اور کہا کہ نئے کمانڈر انچیف سنیارٹی اور پیشہ ورانہ صلاحیت کے حامل ہیں۔

انہوں نے توقع ظاہر کی کہ فوج سیاست سے الگ رہ کر دفاع وطن کے صدر درجہ اہم فریضے کو ادا کرنے کی طرف بھرپور توجہ دے گی۔ صدر لغاری کی طرف سے ایم کیو ایم کو مصالحت کی پیشکش اور انہیں حکومت میں شریک کرنے کا بیان کراچی کے مسئلے کے لئے پیش رفت بن سکتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے شیخ رشید احمد کے بارے میں سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کو مستحسن اقدام قرار دیا جس سے عدلیہ کو اپنا گرتا ہوا وقار بحال کرنے میں مدد ملے گی۔ دانشوروں اور اہل صحافت نے قوم کو خوابوں کی دنیا میں مگن رکھا مگر اب حالات کی سنگینی نے حقائق سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ انہوں نے کہا یہی وجہ ہے کہ صدارتی نظام اور چھوٹے صوبوں کی تشکیل جیسے حساس معاملات بھی مقتدر حلقوں سمیت ہر جگہ زیر غور ہیں۔ ملک و قوم کی ترقی و فلاح کے لئے صدارتی نظام کا قیام اور چھوٹے صوبوں کی تشکیل انتہائی ضروری ہے۔ اسی سے کراچی جیسا گمبھیر مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

امیر تنظیم اسلامی نے کہا ہندوستان کے ساتھ دو طرفہ تجارتی تعلقات کی بحالی دونوں ملکوں میں مفاہمت کی بنیاد بن سکتی ہے اور یہی چیز ملک اور قوم کے بہترین مفاد میں ہے۔ ہمارے پاس اسلام کی شکل میں ایک نظریاتی ہتھیار موجود ہے جبکہ ہندوستان اس حوالے سے بالکل تہی دست ہے اور امریکہ کا تابع مہمل ہے۔ انہوں نے کہا ہندوستان اور پاکستان برصغیر کی تقسیم کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے باہم مذاکرات کے ذریعے کشمیر کے مسئلے کے حل کی راہ نکال سکتے ہیں۔ کشمیر کے مسلم اکثریتی علاقے پاکستان کے ساتھ اور ہندو اکثریت کے علاقے ہندوستان کے ساتھ شامل کر لئے جائیں۔ انہوں نے خبردار کرتے ہوئے کہا کہ دونوں ممالک نے کشمیر کا مسئلہ حل نہ کیا تو علاقے میں امریکی سازش کے ذریعے ایک نئی آزاد ریاست قائم کر دی جائے گی جس کے نتیجے میں کشمیر دونوں ممالک کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

پشاور کے حالیہ بم دھماکے پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان کی حکومت کی جانب سے حکومت پاکستان کو اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے باز رکھنے کے لئے یہ سنگین قدم اٹھایا گیا ہے۔ انہوں نے پشاور کے بم دھماکے کو پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا بم دھماکہ قرار دیا۔

○○

استقبال رمضان

روزہ اور تراویح ---غرض وغایت

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے دروس قرآنی سے ماخوذ

سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۱۵۳، قرآن مجید کی ان آیات میں سے ہے جن کا ترجمہ ہر مسلمان کو یاد ہے۔ یعنی: "اے مسلمانو امدد حاصل کرو صبر سے اور نماز سے 'یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔ مراد یہ ہے کہ اللہ کی مدد اور تائید و حمایت صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ورنہ یوں تو اللہ ہر جگہ اور ہر آن موجود ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا: "تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے"۔ یہاں اصل قابل توجہ بات یہ ہے کہ وہ کون سا اہم اور بھاری کام ہے جس کی انجام دہی کے لئے صبر اور نماز سے مدد حاصل کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

انسانی زندگی میں اکثر ایسے مرحلے آتے ہیں جب ایک انسان کے لئے صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا، لیکن یہاں معلوم ہوتا ہے کوئی خاص مقصد پیش نظر ہے جس کے لئے مسلمانوں کو تیار کیا جا رہا ہے۔ اس مقصد کا تعین سورۃ البقرہ ہی کی آیت نمبر ۱۴۳ میں "شہادت علی الناس" کے الفاظ میں ہوا۔ یعنی اپنے قول و عمل سے اللہ کے دین کی گواہی اس طور سے دینا کہ نوع انسانی پر حجت قائم ہو جائے۔ اور سورۂ آل عمران میں اسی مقصد کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا: "تم وہ بہترین امت ہو، جسے لوگوں (پر اتمام حجت) کی خاطر برپا کیا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر پختہ یقین رکھتے ہو"۔ یعنی امت مسلمہ کا مقصد وجود ہی دین کی گواہی دینا، نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک نہایت عظیم مشن ہے جو امت مسلمہ کو سونپا گیا۔ اور یہ عام فہم بات ہے کہ کوئی شے اگر وہ مقصد پورا نہیں کرتی جس کے لئے وہ بنی ہے تو اسے آخر کار کوڑے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کی مثال ہمارے سامنے ہے جس کا قرآن مجید میں ان عظیم الشان

الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے کہ "ہم نے تو تمہیں جہان والوں پر فضیلت عطا کر دی تھی"۔ لیکن جب انہوں نے اپنے عمل سے اللہ کے دین اور شریعت سے انحراف کیا تو از روئے قرآن "ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے"۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو فضیلت عطا کرتا ہے تو اس پر اسی نسبت سے ذمہ داری کا بوجھ بھی ڈال دیتا ہے۔ ع "جن کے رتبے ہیں سوا' ان کی سوا مشکل ہے!" اور وہ قوم اگر غیر ذمہ دارانہ طرز عمل اختیار کرے تو اس کی سزا بھی نہایت سخت ہوتی ہے' خواہ اسے اپنے بارے میں کتنا ہی زعم کیوں نہ ہو کہ "ہم تو اللہ کے بیٹوں کے مانند ہیں اور اس کے چہیتے اور لاڈلے ہیں!" اس لئے کہ اس حیات دنیوی کی اصل غرض وغایت آزمائش اور امتحان وابتلا ہے۔ یعنی "اس نے بنائی موت اور زندگی تاکہ تمہیں آزمائے کہ کون ہے تم میں سے اچھے عمل کرنے والا!" (سورۃ الملک:۲) سب انسان اللہ کی نگاہ میں برابر ہیں' ہاں جو اس آزمائش میں کامیاب نکلا وہ اللہ کی رحمتوں کا امیدوار ہوگا۔

جس طرح امت کی تشکیل ایک خاص مقصد اور مشن کے لئے ہوئی ہے اسی طرح تمام عبادات بھی خاص مقاصد کے لئے تلقین فرمائی گئی ہیں۔ وہ مقصد اگر پیش نظر نہیں ہے اور اس کے حصول کے لئے کوئی جدوجہد نہیں ہو رہی تو ان عبادات کے مفہوم اور معانی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ نماز کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ یہ اسلام کا رکن رکین ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "عماد الدین" قرار دیا اور قرآن مجید میں اس کے اصل مقصد کی تعیین ان الفاظ میں ہوئی کہ : "نماز کو قائم کرو میری (اللہ کی) یاد کے لئے"۔ گویا نماز دراصل اللہ کی یاد اور ایمان کی تقویت کا ذریعہ ہے اور اسی وجہ سے اسے مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے۔ روزے کی عبادت کا مقصد کیا ہے' یہ عبادت مسلمانوں پر کیوں فرض کی گئی' اور اس کا قرآن حکیم سے کیا تعلق ہے' ان باتوں کو بھی اللہ نے مبہم نہیں چھوڑا۔ عجیب بات یہ ہے کہ روزے سے متعلق جملہ مضامین' تمام احکام اور حکمتیں قرآن مجید میں سورۃ البقرہ کے ۲۳ویں رکوع میں' جو چھ آیات پر مشتمل ہے' یکجا ہو کر آ گئے ہیں۔ جبکہ نماز' زکوٰۃ اور حج کا ذکر ہمیں قرآن مجید میں متفرق مقامات پر منتشر طور پر ملتا ہے۔ لہٰذا ان چھ آیات کو اگر سمجھ لیا جائے تو ارکان اسلام میں سے اس ایک رکن کے بارے میں قرآن

حکیم کی ہدایت و رہنمائی واضح انداز میں ہمارے سامنے آ جائے گی۔ تو آیئے براہ راست انہی آیات مبارکہ سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے : "اے ایمان والو تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسا کہ یہ فرض کیا گیا تھا ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے"۔ عرب کے لوگ چونکہ روزے کی عبادت سے واقف نہیں تھے لہٰذا فرمایا گیا کہ یہ کوئی نیا حکم نہیں ہے' پہلی امتوں پر بھی روزہ رکھنا لازم کیا گیا تھا۔ یہاں واضح رہے کہ روزوں کی تعداد اور آداب و شرائط کے اعتبار سے سابقہ انبیاء و رسل کی شرائع میں بھی جزوی فرق رہا ہے اور شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام میں بھی شریعت موسویؑ سے کسی قدر فرق موجود ہے۔ البتہ روزے کی فرضیت ہر امت میں موجود رہی ہے۔ آگے فرمایا "تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے"۔ گویا روزے کی عبادت کا اصل مقصد تقویٰ کا حصول ہے۔ اور تقویٰ وہ شے ہے جو نیکی اور خیر کے تمام کاموں کے لئے جڑ بنیاد ہے۔ انسان کی روحانی ترقی کا تمام تر دارومدار تقویٰ پر ہے۔

آگے بڑھنے سے قبل مناسب ہو گا کہ ایک اہم بحث کا' جس کا بڑا گہرا تعلق نفس مضمون کے ساتھ ہے' اجمالی تذکرہ ہو جائے۔ انسان ایک مرکب وجود کا حامل ہے۔ اس کا ایک جزو' یعنی روحانی وجود "احسن تقویم" کا مظہر ہے تو دوسرا' یعنی حیوانی وجود "اسفل سافلین" کا مصداق کامل۔ ایک کا تعلق "عالم امر" سے ہے تو دوسرے کا "عالم خلق" سے۔ ایک خاکی ہے تو دوسرا نوری۔ ایک "دنی الطبع" ہے اور ہمہ وقت پستی کی جانب مائل تو دوسرا "قدسی الاصل" اور "ہمیشہ رفعت پہ نظر رکھنے والا" ع "قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے"۔ ایک حیوانات کی صف میں ہے --- اور ان میں بھی بہت سوں کے مقابلے میں مختلف اعتبارات سے ہیچ و کمتر اور ضعیف و ناتواں تو دوسرا ملائکہ کا ہم پلہ' بلکہ مقام و مرتبہ میں ان سے بھی کہیں اعلیٰ و افضل --- حتیٰ کہ ان کا مسجود و مخدوم!! ایک عبارت ہے اس کے "وجود حیوانی سے" ---- تو دوسرا مظہر ہے اس "روح ربانی" کا جو اس میں پھونکی گئی اور جس کی بنیاد پر وہ مسجودِ ملائک قرار پایا۔

روح انسانی کی بالیدگی کے لئے ضروری ہے کہ نفس کے اس منہ زور گھوڑے کو لگام دی جائے کہ جو انسان کو گناہوں کی دلدل اور پستی کی طرف دھکیلنے کے لئے ہر دم مستعد رہتا

ہے۔ نفس پر قابو یافتہ ہونے کے لئے تقویٰ شرط لازم ہے۔ روزہ کی عبادت اسی لئے فرض کی گئی ہے تاکہ تقویٰ پیدا ہو۔ تقویٰ کے معنی ہیں 'بچ بچ کر چلنا کہ انسان کا دامن کہیں گناہ سے آلودہ نہ ہو جائے۔ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک جو مشق کرائی جاتی ہے اس کا حاصل ہے ضبط نفس۔ روزے میں انسان کو ایک خاص وقت کے لئے حلال چیزوں کے استعمال سے بھی روک دیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت اللہ کی نافرمانی سے بچنے اور اوامر و نواہی پر استقلال کے لئے اپنے نفس امارہ کو قابو میں رکھنے کی تربیت ہے۔

اگلی آیت کا مفہوم ہے : "گنتی کے چند دن ہی تو ہیں۔ اور جو رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں (پھر نہ رکھیں) تو ان کے ذمے (ایک روزہ کا) فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے۔ اور اگر تم روزہ رکھو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم سمجھ سے کام لو"۔ اس آیت کے ضمن میں مختلف تفسیری آراء ہیں لیکن میرے نزدیک یہ رائے زیادہ صحیح ہے کہ یہ آیت رمضان کے روزے سے متعلق نہیں بلکہ ایام بیض کے تین روزوں سے متعلق ہے جو صیام ماہ رمضان کی فرضیت سے قبل مسلمانوں کے لئے لازم کئے گئے تھے۔

اب تیسری آیت کے مطالعہ کی طرف آیئے جس میں ماہ رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اگلی تین آیات کچھ عرصے کے بعد نازل ہوئیں لیکن مضمون کی مناسبت سے ان تین آیات کو اسی مقام پر شامل کر دیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے :

"رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا' جو لوگوں کے لئے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ پس جو کوئی بھی تم میں سے اس مہینہ میں موجود ہو اس پر لازم ہے کہ وہ اس ماہ کے روزے رکھے"۔ یہ آیت صوم رمضان کی فرضیت کے بارے میں ہے۔

یہاں اس اہم بات پر غور کیجئے کہ روزوں کے لئے سال کے بارہ مہینوں میں سے خواہ کوئی مہینہ بھی مقرر کیا جاتا ضبط نفس کا مقصد حاصل ہو جاتا۔ اس عظیم عبادت کے لئے ماہ رمضان کا انتخاب درحقیقت اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ نزول قرآن کا مہینہ ہے۔ معلوم ہوا کہ روزہ اور قرآن میں باہم بڑا گہرا معنوی ربط ہے۔ روزے کے ذریعے انسان کے روحانی وجود پر سے اس کے حیوانی وجود کی گرفت کمزور پڑتی ہے' روح کو سانس لینے کا موقع ملتا ہے اور

قرآن دراصل روح کی تقویت کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ اس کے انوار کا فیضان جب روح انسانی پر ہوتا ہے تو روح کو گویا حیات تازہ عطا ہوتی ہے اور وہ اپنے رب کی طرف بے تابی کے ساتھ متوجہ ہوتی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ماہ رمضان کو روزے کی عبادت کے ساتھ مخصوص کرنے کا اصل منشا اور مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ دن کا روزہ ہو اور راتیں قرآن مجید کے ساتھ بسر ہوں۔ گویا یہ ایک دو آتشہ پروگرام ہے۔ لیکن ظاہر ہے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں بیس تراویح ختم کر لینے سے قرآن مجید کے ساتھ رفاقت کا مقصد پورے طور پر حاصل نہیں ہو سکتا، جس کا اشارہ صحیحین کی اس حدیث سے ملتا ہے جس کی رو سے صیام اور قیام بالکل ہم وزن اور متوازی و مساوی قرار پاتے ہیں۔ امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے حضرت ابوہریرہؓ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جس نے روزے رکھے رمضان میں ایمان و احتساب کے ساتھ، بخش دیئے گئے اس کے تمام سابقہ گناہ اور جس نے (راتوں کو) قیام کیا رمضان میں ایمان و احتساب کے ساتھ، بخش دیئے گئے اس کے جملہ سابقہ گناہ"۔ (بخاری و مسلم)

اسی آیت میں مزید فرمایا : "اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کرلے"۔ یعنی بیمار اور مسافر کے لئے تو سابقہ رعایت کو برقرار رکھا گیا ہے لیکن ایام بیض کے روزوں کے حکم کے ساتھ فدیہ کی جو رعایت دی گئی تھی کہ طاقت رکھتے ہوئے بھی اگر کوئی روزہ نہ رکھنا چاہے تو بطور فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلائے، اسے اب منسوخ کر دیا گیا۔ تاہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص معاملات میں اس رعایت کو برقرار رکھا، جیسے کوئی شخص بہت بوڑھا ہو گیا ہو یا ایسا کوئی دائمی مریض ہو کہ صحت یاب ہونے کی کوئی امید نہ ہو، تو وہ اس رعایت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

آگے چلئے، ابھی اس آیت کا سلسلہ جاری ہے۔ فرمایا : "اللہ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لئے دشواری و سختی اور تنگی نہیں چاہتا"۔ یعنی بیماری اور سفر میں دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرنے کی جو رعایت بیان ہوئی ہے اس سے اللہ کا مقصود بندوں کے حق میں آسانیاں فراہم کرنا ہے۔ یہاں یہ بات بھی جان لیجئے کہ آیت کے اس حصہ میں "یسر و عسر" کا معاملہ صرف صیام پر ہی موقوف نہیں ہے، اللہ کا ہر حکم درحقیقت

بندوں کے حق میں رحمت اور مصلحت پر مبنی ہے۔ آگے فرمایا : "اور تاکہ تم اپنے رب کی تکبیر کرو اس پر کہ جو اس نے تمہیں راہِ راست دکھائی اور تاکہ تم شکر گزار بن کر رہو۔"

اس مقام پر قرآن مجید کی شان میں "هُدًى لِلنَّاس" کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی یہ قرآن تمام انسانوں کے لئے ہدایت کا روشن چراغ بن کر نازل ہوا ہے۔ تاہم یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے آغاز میں یعنی سورۃ البقرہ کے بالکل شروع میں اسے "هُدًى لِلْمُتَّقِيْنَ" قرار دیا گیا ہے۔ اس اشکال کا حل یہ ہے کہ قرآن مجید میں اگرچہ فی نفسہٖ ہدایت کا مکمل سامان پوری نوعِ انسانی کے لئے موجود ہے لیکن اس چشمہ ہدایت سے بالفعل سیراب وہی ہو سکے گا جس میں تقویٰ کی کچھ نہ کچھ رمق اور تلاشِ حق کی کچھ نہ کچھ طلب موجود ہو گی۔ وہی تقویٰ جس کا ذکر روزہ کی بحث میں بالکل شروع میں آ چکا ہے۔ آپ کو معلوم ہے جب تک پیاس نہ ہو ٹھنڈے پانی کی قدر انسان کو محسوس نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر بھوک ہی نہ ہو تو عمدہ سے عمدہ کھانا سامنے پڑا رہے گا' انسان کا ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھے گا۔ معلوم ہوا کہ جب تک طلب نہ ہو اس وقت تک کسی شے کی قدر و قیمت کا احساس نہیں ہوتا۔ چنانچہ روزے کی عبادت کا مقصد دراصل ہدایت کی طلب پیدا کرنا ہے' اور وہ اس طرح کہ روزے سے "روح" بیدار ہو گی اور تقویٰ کی کچھ پونجی انسان کے ہاتھ آئے گی' اس کیفیت میں رات کو قرآن کے ساتھ جب اللہ کے حضور کھڑے ہوں گے تو یہ قرآن مجید' یہ کلام ربانی' روح کے تغذیہ و تقویت کا باعث بنے گا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا روح کو جب غذا ملے گی تو وہ قوی اور توانا ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہو گی۔ اس کا جو نتیجہ نکلے گا اس کا بڑا پیارا بیان اگلی آیت (۱۸۶) میں ہے۔ فرمایا : "اور اے نبی! جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں (تو آپ کہہ دیجئے) میں قریب ہی ہوں۔ میں تو ہر پکارنے والے کی بات سنتا ہوں جب مجھے پکارے"۔ گویا۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں

اللہ تعالیٰ کے بارے میں خواہ مخواہ یہ تصور قائم کر لیا گیا ہے کہ اس تک رسائی کے لئے کوئی وسیلہ اور واسطہ درکار ہے۔ حالانکہ قرآن صاف صاف بتا رہا ہے کہ اللہ تمہارے

بالکل قریب ہے' جب اور جہاں چاہو اس سے ہمکلام ہو جاؤ۔ اصل مسئلہ طلب کا ہے۔ تاہم آیت کے اگلے حصہ میں دو شرطوں کا بیان ہے۔ یعنی یہ یک طرفہ معاملہ نہیں ہے۔ پہلی شرط ہے : "فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي" کہ "میرے بندوں کو بھی چاہئے کہ میرا حکم مانیں' میری پکار پر لبیک کہیں"۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر یہ بات ملے گی کہ بندے اور اللہ کا معاملہ دو طرفہ بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ جیساکہ سورۃ البقرہ میں فرمایا : "اور تم اس عہد کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا ہے' میں اس عہد کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا ہے"۔ اسی سورہ میں فرمایا : "تم مجھے یاد رکھو' میں تمہیں یاد رکھوں گا"۔ اور سورۂ ابراہیم میں فرمایا : "اگر تم ہمارا شکر کرو گے تو ہم تمہیں اور زیادہ نعمتیں دیں گے اور اگر تم نے ناشکری کی تو پھر ہمارا عذاب بھی بڑا سخت ہو گا"۔ ہم مسلمانان پاکستان نے بھی ایک وعدہ اللہ سے کیا تھا : "پاکستان کا مطلب کیا۔ لاالٰہ الا اللہ"۔ اللہ نے ہمیں پاکستان عطا کر دیا۔ ہمارے لئے سوچنے کی بات ہے کہ اس کے بعد ہم نے کتنا کچھ اللہ کا شکر ادا کیا؟ بہرحال' دوسری شرط ہے "وَلْيُؤْمِنُوا بِي" یعنی "انہیں بھی چاہئے کہ مجھ پر ایمان پختہ رکھیں"۔ اس آیہ مبارکہ کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظ پر "لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ"۔ تاکہ یہ لوگ راہ یاب ہو سکیں' ان پر فوز و فلاح اور رشد و ہدایت کی راہیں کھل جائیں۔

اگلی آیت (۱۸۷) روزے سے متعلق تفصیلی احکام پر مشتمل ہے۔ اس رکوع کی آخری آیت (۱۸۸) میں بڑے جامع انداز میں اس حقیقت کی جانب رہنمائی کی گئی ہے کہ تقویٰ' کہ جو روزے کا اصل حاصل ہے' اس کا عملی ظہور کس طور سے ہو گا۔ نہایت واشگاف الفاظ میں اسے معین کر دیا گیا کہ وہ ہے اکل حلال۔ اگر یہ نہیں تو انسان خواہ شکل و صورت اور وضع قطع کے لحاظ سے کتنا ہی متقی نظر آتا ہو' فی الحقیقت تقویٰ کی دولت اسے حاصل نہیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق دے کہ ہم اس ماہ مبارک کی برکات سے صحیح طور پر مستفید ہو سکیں اور تقویٰ کی دولت کے حصول کے اس بہترین موقع سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔ ورنہ بقول اقبال۔

موسم اچھا' پانی وافر' مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان!

اسلام کا معاشرتی نظام

ڈاکٹر عبدالسمیع

نظام کی اصطلاح اگرچہ نہ قرآن مجید میں ہے نہ حضور ﷺ کے پر حکمت ارشادات میں، لیکن نظام اس order اور دستور کو کہتے ہیں جو متعین افراد کی بجائے عوام الناس کی بھلائی کے لئے ترتیب دیا جاتا ہے اور اس میں ہر شے متعین کر دی جاتی ہے۔

"اسلامی نظامِ حیات" سے مراد کیا ہے

یہ اصطلاح اگرچہ ہم سیاسی اور معاشی معاملات میں بھی استعمال تو کر لیتے ہیں، جیسے "اسلام کا معاشی نظام" یا "اسلام کا سیاسی نظام" لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں میدانوں میں اسلام کی تعلیمات کی حیثیت نظام کی نہیں ہے۔ چونکہ کاروبار کے طریقے بدلتے رہتے ہیں اور سیاسی حالات بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں لہٰذا ان دونوں میدانوں میں کوئی متعین نظام دینا خلافِ مصلحت تھا اور خلافِ واقعہ بھی ہے۔ جہاں تک سیاست کا تعلق ہے پورے قرآن مجید میں گنتی کی ایک دو آیات ایسی ملیں گی جن میں سیاست کے ضمن میں کوئی بنیادی رہنمائی میسر آ جائے۔ ان میں سے ایک آیت سورۃ الحجرات کی پہلی آیت ہے کہ اس میں انسانی اجتماعیات کا بلند اصول کہ حاکم مطلق (sovereign) صرف اللہ ہے اور حکم صرف اسی کا چلے گا، جو اس کے رسول ﷺ کے ذریعے سے ہم تک پہنچا ہے۔ اور دوسرے سورۃ الشوریٰ کی ایک آیت کا جزو "اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" یعنی سورۃ الحجرات میں بیان کردہ اصولِ اطاعت کے اندر اندر تمام معاملاتِ ریاست مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے طے ہوں گے۔ بس اس سے آگے چل کر کوئی تفصیل عطا نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کے دوران مختلف مواقع پر خلافت کے انعقاد میں کوئی یکساں طریق کار اختیار نہیں کیا گیا۔ یعنی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت ایک انداز سے وجود میں آئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت دوسرے طریقے سے اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

کی خلافت ایک تیسرے طریقے سے منعقد ہوئی۔ ہر موقع پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اور حالات کے مطابق باہمی مشورہ کے اصول کو مدِ نظر رکھا گیا۔ اسی طرح جب بھی کوئی اسلامی ریاست وجود میں آئے گی ان بنیادی تعلیمات اور ہدایات کی روشنی میں اسلام کا سیاسی نظام وضع کیا جائے گا۔

اسی طرح معاشیات کے میدان میں قرآن مجید کے تیس پاروں اور نبی اکرم ﷺ کی مبارک احادیث میں ہدایات اور احکام تو ملیں گے لیکن متعین نظام نہیں ملے گا۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا ہے حالات تبدیل ہوتے چلے جاتے ہیں' لہٰذا کوئی متعین طریقِ معیشت رائج نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام کے معاشرتی نظام کا خصوصی معاملہ

لیکن جہاں تک معاشرتی نظام کا تعلق ہے اس پر جب ہم غور کرتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ اس میں وقت گزرنے کے ساتھ نہ تو کوئی بنیادی تبدیلی واقع ہوئی ہے اور نہ ہی کوئی تفصیلی تغیر و تبدل۔ والدین اور اولاد کا رشتہ آج بھی اسی طرح وجود میں آتا ہے جیسے آج سے چودہ سو سال قبل بلکہ اس سے پہلے وجود میں آیا کرتا تھا۔ اور میاں بیوی کے درمیان آج بھی وہی رشتہ ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے تھا۔ اور اسی طرح بہن بھائی آج سے پہلے جس رشتے سے منسلک ہوتے تھے آج بھی اسی رشتے میں منسلک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہمارے خیال کے مطابق تو اہم ترین معاملات سیاسی و معاشی ہیں کہ جن میں رہنمائی درکار ہے' جبکہ معاشرتی معاملات تو خاندانی روایات کے مطابق خود بخود انجام پاتے رہتے ہیں' لیکن قرآن و سنت کی رہنمائی اول الذکر معاملات میں صرف اصولی و بنیادی ہے جبکہ معاشرتی و عائلی معاملات میں یہ رہنمائی تفصیلی بھی ہے اور متعین بھی۔ صرف نارمل ہی نہیں ابنارمل حالات میں بھی مفصل رہنمائی سے نوازا گیا ہے۔ جیسے طلاق کے معاملے میں کہ اگرچہ وہ پسندیدہ چیز نہیں ہے لیکن اس پر کئی کئی رکوع نازل ہوئے ہیں' ایک طلاق ہو تو کیا حکم ہے' دو ہوں تو کیا اور تین ہوں تو کیا ہوگا۔۔ رضاعت' نان' نفقہ' مہر اور اثاثہ جات کا کیا ہوگا۔

رشتوں کا باہمی توازن

معاشرہ بہت سے خاندانوں سے وجود میں آتا ہے اور ایک خاندانی یونٹ ایک مرد اور ایک عورت کے رشتہ نکاح میں منسلک ہونے سے وجود میں آتا ہے۔ لیکن یہ میاں بیوی صرف دو ہی نہیں ہوتے بلکہ اوپر کی سمت میں دونوں کے والدین ہوتے ہیں اور افقی سمت میں دونوں کے بہن بھائی ہوتے ہیں۔ پھر شادی کے نتیجے میں جو نیا گھر وجود میں آتا ہے تو ان میاں بیوی کے ہاں بھی اولاد ہوتی ہے' تو نیچے رشتوں کی چوتھی سمت وجود میں آجاتی ہے۔ ان چاروں جہات میں رشتوں کا توازن ہی اسلام کے سماجی نظام کی پہچان ہے۔ اگر ان رشتوں کے درمیان عدم توازن ہو جائے تو یہ نظام قائم (intact) نہیں رہتا۔

قرآن مجید میں سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے رکوع کی ابتدائی آیات میں والدین کے حقوق کا ذکر ہے اور سورۃ التحریم کی آیت ۶ میں اہل و عیال کے حقوق کا تذکرہ۔ پہلے آیئے سورۃ بنی اسرائیل کی آیات کی طرف۔ ارشاد ہوا:

﴿وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا' اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ اَوْ کِلٰھُمَا فَلَا تَقُلْ لَّھُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْھَرْھُمَا وَقُلْ لَّھُمَا قَوْلًا کَرِیْمًاO وَاخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَۃِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْھُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًاO رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِکُمْ' اِنْ تَکُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ فَاِنَّہٗ کَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًاO﴾

(آیات : ۲۳-۲۵)

"تیرے رب نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اگر پہنچیں تمہارے سامنے ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو تو ان سے اف تک نہ کہو اور انہیں جھڑکو نہیں اور ان سے نرم بات کہو اور اپنے دونوں شانوں کو شفقت اور رحمت کے ساتھ ان کے سامنے جھکائے رکھو اور دعاگو رہو کہ اے میرے رب ان دونوں پر اسی طرح اپنی مہربانی کا سایہ کئے رکھ جیسے (رحمت و شفقت کے سائبان کے نیچے) انہوں نے جب میں چھوٹا تھا میری تربیت کی

تھی۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔ اگر تم نیک بن جاؤ تو یقیناً وہ توبہ کرنے والوں کو بخش دینے والا ہے"۔

پھر سورۃ التحریم کی آیہ مبارکہ میں ارشاد فرمایا :

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا وَّ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ عَلَیْهَا مَلٰٓىٕكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۝ ﴾

"اے ایمان والو! بچاؤ خود کو اور اپنے اہل و عیال کو ایک ایسی آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ اس پر کچھ تند خو اور سخت فرشتے مقرر کئے گئے ہیں جو اللہ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے' بلکہ وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے"۔

مغرب کا معاشرتی نظام

یہ دو اطراف ہیں جن سے ایک شخص کو اپنی معاشرتی زندگی میں بیک وقت واسطہ پڑتا ہے۔ اس کے لئے ایک نظام تو وہ ہے جو مغرب نے وضع کیا ہے۔ اس کے مطابق ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان میاں بیوی کا جو تعلق ایک دفعہ قائم ہو جائے انسان بس اسی کا ہو کر رہ جائے اور والدین کو تو بالکل چھوڑ ہی دیا جائے۔ البتہ اولاد اٹھارہ سال کی عمر تک اپنے والدین سے متعلق رہے' اس کے بعد وہ بھی آزاد شمار ہو' یہاں تک کہ اس کے بعد اگر بچہ والدین کے پاس رہنا چاہے تو "paying guest" کی حیثیت سے رہے۔ اور میاں بیوی کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد اور جملہ اثاثہ جات علیحدگی کی صورت میں نصف نصف تقسیم ہو جائیں اور کسی ایک کے فوت ہونے کی صورت میں دوسرا بلا شرکتِ غیرے اس کا مالک بن جائے۔ اس کے برعکس اسلام میں ہر رشتے کا ایک مقام مقرر کیا گیا ہے اور اس کے حقوق بھی واضح کر دیئے گئے ہیں اور اس پر عائد ہونے والے فرائض بھی۔

والدین کے حقوق

والدین اپنے بچے کی بچپن میں جو پرورش اور نگہداشت کرتے ہیں اس کی بنیاد پر قرآن مجید میں ان کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ اگر زندگی کی کسی سٹیج پر وہ تمہارے سامنے اس

حال میں آئیں جیسے تم ان کے سامنے تھے کہ نہ چل سکتے تھے، نہ بیٹھ سکتے تھے، نہ کھا سکتے تھے، نہ پی سکتے تھے، غرضیکہ اپنی صفائی اور طہارت سے بھی قاصر تھے، تو اب تم پر ازروئے قرض یہ لازم ہے کہ ان کی تمام پہلوؤں سے نگہداشت کرو۔ گویا ان کے لئے معاشی جدوجہد سے لے کر رفع حاجت اور طہارت تک میں ان کے کام آؤ، جیسے انہوں نے، بالخصوص تمہاری والدہ نے تمہارے لئے کیا تھا۔ ازروئے قرآن یہ والدین کے ساتھ کوئی favour نہیں بلکہ ان کا حق ہے۔ اپنے دونوں بازوؤں کو ان کے لئے جھکائے رکھنا استعارہ ہے مرغی کی مانند ان کو اپنے پروں میں پناہ دینے سے اور اسی کا حکم سورۃ بنی اسرائیل کی متذکرہ بالا آیات میں دیا گیا ہے۔

اگرچہ یہ ذمہ داری بالعموم اولاد کی ہے، لیکن زیادہ غور سے دیکھا جائے تو یہ اصلاً بیٹے کی ذمہ داری ہے، کیونکہ بیٹی تو والدین کے گھر سے رخصت ہو جاتی ہے اور کسی اور مرد کا گھر جا کر آباد کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی والدہ اور والد کے ترکے میں سے بھی اس کا حصہ اپنے بھائی کے مقابلے میں نصف ہے، لہٰذا ان کی خدمت کی ذمہ داری بھی اسی نسبت سے کم ہو جائے گی۔ رہی بہو تو وہ نہ تو اپنے سسر اور ساس کی وراثت میں حصے دار ہے اور نہ اس پر ان کی نگہداشت کی کوئی ذمہ داری ہے۔ لیکن عورت اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتے ہوئے اس کو معاشی دوڑ دھوپ کے لئے فارغ کر دے اور اس کے behalf پر گھر میں موجود اس کے والدین کی نگہداشت کرے تو یہ اس عورت کا اپنے شوہر پر ایک بہت بڑا احسان ہے کہ اس طرح وہ اپنے والدین کے حقوق ادا کر سکے گا۔ بالفعل معاملہ یہ ہے کہ ایک گھر کی بیٹی کسی دوسرے گھر میں اور اس گھر کی بیٹی کسی تیسرے گھر میں جاتی ہے تو اگر ہر عورت یہ محسوس کرے کہ جیسے میرے بھائی کی بیوی میرے والدین کی خدمت کر رہی ہے ویسے ہی مجھے اپنے شوہر کے والدین کی خدمت کرنا ہے، اگرچہ یہ میری براہ راست ذمہ داری نہیں، میں یہ کام اپنے شوہر کو اللہ کے عذاب میں مبتلا ہونے سے بچانے کی خاطر کر رہی ہوں تو عورت کو معلوم ہو گا کہ وہ یہ کام کس capasity میں کر رہی ہے اور شوہر بھی اس کا ممنون احسان ہو گا اور اس کی بنیاد پر وہ اس کو اپنی خدمت سے کچھ ریلیف دے گا، گھر میں بچوں کی دیکھ بھال میں اور کبھی بیوی کا ہاتھ بٹانے کی غرض سے حضور ﷺ کی سنت کے

مطابق گھر میں جھاڑو لگانے اور چولہے میں آگ جلانے پر بھی اس کی طبیعت آمادہ ہو گی۔

اولاد کے حقوق

اس کے بعد آتا ہے معاملہ حقوقِ اہل و عیال کا، یعنی انسان پر ازروئے دین بیوی بچوں کے کیا حقوق ہیں۔ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ایک باپ کی اپنی اولاد کی طرف سے اور ایک شوہر کی اپنی بیوی کی جانب سے اصل ذمہ داری تو انہیں جہنم کی آگ سے بچانا ہے۔ اسی لئے ابتداء میں سورۃ التحریم کی آیت نمبر ۶ پیش کی گئی تھی کہ اے ایمان والو بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن بننے والے ہیں انسان اور پتھر۔ باقی ذمہ داریاں جو معلوم و معروف ہیں یعنی ان کے لئے روٹی کپڑا، مکان اور حفاظت کا انتظام بھی اس کی ذمہ داری ہے لیکن جس حد تک ہو سکے، کیونکہ ان تمام کے لئے ایک عنوان ہے معیشت اور رزق کے وسائل کی فراہمی اور رازق بلاشبہ اللہ ہی ہے، انسان کی تمام تر محنت اور دوڑ دھوپ کے بعد بھی انسان کو اتنا ہی ملے گا جتنا اللہ ان کے لئے طے کر دے۔ رہی تعلیم و تربیت تو اس میں بھی تربیتِ اولاد تو والد پر فرض ہے، تعلیم کا نمبر اس کے بعد آتا ہے۔ تربیت کا مقصد ہو گا کہ اولاد کو انسان بنایا جائے۔ انسان بنانے کے لئے جس تعلیم کی ضرورت ہے، دینی یا دنیوی، اولاد کو اپنے وسائل میں رہتے ہوئے تعلیم دلانا بھی فرض ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر ان کو اللہ کی معرفت دلانا اور آخرت میں کامیاب ہونے کے لئے ضروری تعلیم دلانا بھی فرض ہے۔

شوہر اور بیوی --- حقوق و فرائض

اس کے بعد تیسرا اہم ترین رشتہ ہے شوہر اور بیوی کا۔ شوہر اور بیوی کے درمیان حقوق و فرائض کا معاملہ اس وقت کا سب سے حساس معاملہ ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ سمجھ لیجئے کہ اسلام کی رو سے خاندان ایک ادارہ ہے اور ادارہ کی سب سے اہم چیز اس کا ڈسپلن ہوتا ہے۔ کسی ادارے میں کام کرنے والے مختلف افراد انسان ہی ہوتے ہیں، ورکر بھی انسان ہوتا ہے اور ڈائریکٹر بھی۔ اسی طرح قاصد بھی انسان ہوتا ہے اور باس بھی۔ لیکن انسان ہونے کے اعتبار سے دونوں برابر ہونے کے باوجود اس

ادارے کے ڈسپلن کا تقاضا پورا کرتے ہوئے چھوٹا منصب رکھنے والا بڑا منصب رکھنے والے کا حکم مانتا ہے اور جب تک یہ کیفیت برقرار رہتی ہے اس ادارے کا نظام صحیح چلتا ہے۔ مزید یہ کہ ہر ادارے کا ایک ہیڈ ہوتا ہے اور باقی سب اس کے ماتحت۔ کوئی بینک اور مل بغیر مینیجر کوئی کالج بغیر پرنسپل اور کوئی سکول بغیر ہیڈ ماسٹر کے نہیں چلتا۔ ایک دن کے لئے بھی ادارے کے ہیڈ کو چھٹی کرنا ہو تو اس کا انچارج مقرر کیا جاتا ہے۔ گھر کے ادارے کا بھی ایک سربراہ ہے اور وہ مرد ہے' اس کے تمام ماتحت بیوی بچے انسان ہی ہوتے ہیں' لیکن ان کو اس ادارے کے سربراہ کی اطاعت کرنا پڑتی ہے اور دوسرے اداروں کی طرح نہ تو گھر کے ادارے کا سربراہ super human ہوتا ہے اور نہ اس کے ماتحت suh human ہوتے ہیں' بلکہ سب شرفِ انسانیت میں بالکل مساوی ہوتے ہیں۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم ماچس' جوتوں اور کمپیوٹر بنانے والے اداروں میں سربراہ کے مقام اور اس کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں' لیکن انسانوں کی تخلیق کے ادارے کو سربراہ کے بغیر چلانا چاہتے ہیں۔ سکول میں ہیڈ ماسٹر' کالج میں پرنسپل' فرم اور بینک میں مینیجر اور فیکٹری اور مل میں منیجنگ ڈائریکٹر کی ضرورت اس ادارے کے نظام کو ہنگامے اور بے یقینی سے بچانے کے لئے ہوتی ہے کہ کوئی ایک شخص ذمہ دار ہو جو ہر طرف سے معلومات حاصل کر کے بالآخر فیصلہ کرے۔ بالکل یہی ضرورت ایک گھر کے اندر بھی ہے۔ اللہ نے "اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ" (مرد عورتوں پر ذمہ دار ہیں) کا حکم نازل فرما کر گھر کا ذمہ دار مرد کو مقرر کر دیا ہے' لہٰذا گھر کے معاملات میں آخری فیصلہ مرد کا ہو گا۔ عورت ایک انسان ہے' وہ بھی اپنی رائے دے گی' بچے بھی انسان ہیں' ان کی خواہش بھی سامنے آئے گی' لیکن آخری فیصلہ عورت نہیں مرد' اور بچے نہیں باپ یعنی گھر کا سربراہ کرے گا۔ البتہ جیسے ایک اچھا افسر' ایک اچھا باس' ایک اچھا مینیجر' ایک اچھا ڈائریکٹر اور ایک اچھا ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل اپنے رفقائے کار کو ساتھ لے کر چلتا ہے' گھر کے سربراہ کو بھی اپنے اہل خانہ کے اندر روزمرہ کے معاملات میں شمولیت کا احساس پیدا کرنا ہو گا' مختلف پروجیکٹس میں ان کی پیٹھ ٹھونکنا ہو گی اور ان کے اندر یہ احساس پیدا کرنا ہو گا کہ وہ اس گھر میں صرف کسی غلام کی حیثیت سے نہیں رہ رہے بلکہ یہاں ان کا بھی باعزت مقام ہے' ان

کی بات بھی سنی جاتی ہے اور اس کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ جب کسی گھر کے اندر یہ کیفیت پیدا ہو گی تو وہ گھر یقیناً جنتِ ارضی بن جائے گا۔ اور اس کے برعکس اگر گھر میں یہ کیفیت پیدا نہیں ہو گی تو گھر دنیا میں ہی جہنم کا نقشہ پیش کرنے لگے گا۔

خاندان کے سربراہ کے لئے قرآن کی ہدایات

قرآن مجید اس معاملہ میں جو ہدایات ایک مسلمان گھرانے کے سربراہ کو دیتا ہے ان میں سورۃ التغابن کی آیات بہت اہم ہیں۔ ارشاد ہوا :

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

"اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے کچھ تمہارے دشمن ہیں، تو تم ان سے ہوشیار رہو! اور اگر تم ڈھیل دے دو، چشم پوشی کر لو اور (معاملے کو) ڈھانپ دو (بخش دو) تو اللہ تعالیٰ بھی ڈھانپنے والا (بخشنے والا) مہربان ہے"۔

مزید ارشاد فرمایا :

﴿ اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ ﴾

بے شک تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے ایک آزمائش ہیں اور اللہ ہی کے پاس اجرِ عظیم ہے"۔

ان آیاتِ مبارکہ میں مال اور اولاد کی بنیاد پر انسان کی آزمائش کے اصل الاصول کو بیان فرما کر یہ بات واضح کی گئی ہے کہ اللہ نے مال اور اولاد کی بے پناہ محبت انسان کے دل میں ڈال دی ہے اور اس محبت کے جذبے میں گرفتار ہو کر وہ اپنے نفع و نقصان سے غافل ہو سکتا ہے، لہٰذا یہ اس کے لئے ایک مخفی خطرہ ہیں۔ مزید برآں گھر کے اندر اولاد اور بیوی دونوں ہی اس سے بے پناہ محبت بھی رکھتے ہیں اور دونوں جذباتی بھی نسبتاً زیادہ ہیں، لہٰذا ان کی طرف سے آنے والے تقاضے اور خواہشات جذبات پر مبنی ہوتے ہیں اور انسان کے لئے ایک کشش رکھتے ہیں۔ لہٰذا اندیشہ ہے کہ انسان اپنے اہل و عیال کی خواہشات کو اگر بغیر

سوچ سمجھے پورا کرے اس معاملے میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز میں تمیز نہ کرنے کے سبب دنیا اور آخرت کے خسارے سے دوچار ہو جائے۔ لہٰذا مسلمان گھرانے کے سربراہ کو چوکس رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ البتہ چوکس رہنے سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ گھر کو میدان جنگ بنا دیا جائے یا اپنے اہل و عیال کو بار بار ٹوک کر یا ڈانٹ کر یا تو ڈھیٹ بنا دیا جائے یا ان کی زبان بندی کر دی جائے۔ نوٹ کیجئے محولہ بالا آیات میں عفو' صفح اور مغفرت کے الفاظ مبارکہ وارد ہوئے ہیں۔ عفو کے معنی ہیں ڈھیل دینا۔ صفح کے معنی ہیں چشم پوشی یا سنی ان سنی کر دینا اور مغفرت کے معنی ہیں ڈھانپ دینا۔ اس طرح یہ تینوں تقریباً ایک ہی جیسے مفہوم کے الفاظ ہیں۔ ایڈمنسٹریشن کے اندر بھی یہی اصول کار فرما ہے کہ اگر آپ کے کسی ماتحت سے کوئی نامناسب حرکت سرزد ہو تو یہ لازم نہیں ہوتا کہ اس پر کوئی ایکشن ہی لیا جائے' کبھی کبھی جان بوجھ کر نظرانداز کر دیا جائے' کبھی معاملے کو ڈھانپ دیا جائے۔

"اللہ تعالیٰ بھی بخشنے والا اور مہربان ہے"۔ یہ اشارہ بھی بہت اہم ہے کہ عام طور پر انسان جب اپنے ماتحتوں پر برہتا ہے تو دل میں یہ احساس لئے ہوئے ہوتا ہے کہ میں غلطی یا نقص سے پاک آدمی ہوں اور جب اللہ تعالیٰ کے حضور ہاتھ اٹھا کر مغفرت کی دعا مانگتا ہے تو اپنے رب سے کہتا ہے کہ میں بہت گنہگار ہوں' میں کمزور ہوں' مجھ میں یہ خامی اور یہ کوتاہی ہے' تو مجھے معاف فرما۔ تو انسان اپنے معاملے میں عفو و درگزر کا طالب ہوتا ہے جبکہ دوسروں کو معاف کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اس میں مزید غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ درگزر دفتر میں اپنے ماتحتوں سے درگزر کے مقابلے میں کہیں زیادہ مطلوب ہے' اس لئے کہ یہ اپنے ہیں اور سربراہ سے محبت کرنے والے ہیں اور اسے دل کی گہرائیوں سے چاہنے والے ہیں۔

اس طرح اسلام کے نظام معاشرت میں ایک طرف بیوی بچوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے شوہر اور والد کا حکم مانیں اور دوسری طرف اس کو بیلنس کیا گیا ہے مرد کو یہ احساس دلا کر کہ اس کا کام صرف حکم چلانا ہی نہیں ہے بلکہ اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں میں یہ احساس پیدا کرے کہ ان کا باپ واقعی ان سے محبت کرتا ہے اور واقعتاً ان کے مستقبل کی فکر رکھتا ہے اور وہ ان پر واقعی بہت مہربان اور شفیق ہے۔ اس صورت میں کبھی باپ ڈانٹے گا

بھی تو اس کی ڈانٹ سے مثبت اثرات مترتب ہوں گے اور کوئی منفی اثر ظاہر نہ ہو گا۔ اسی طرح بھی ادب سکھانے کے لئے ان کی پٹائی بھی کی جائے گی تو بلاشبہ مفید ہو گی۔ بعینہٖ یہ کیفیت بیوی کے معاملے میں بھی ہو گی۔ اگر کوئی شخص اپنی اہلیہ کو یہ احساس دلا دے کہ وہ اس کا خیر خواہ ہے' اس کے جذبات کی قدر کرنے والا ہے' اس کے ساتھ شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کرنے والا ہے تو اس کی اہلیہ لازماً اپنے اندر اس کی اطاعت کے لئے آمادگی پائے گی اور کسی موقع پر اس کی سرزنش تک پر برا نہیں مانے گی۔

یہاں ایک بات نوٹ کیجئے' بیویوں اور اولاد دونوں کے بارے میں بالخصوص یہ بات کہی گئی ہے کہ ان سے درگزر کا معاملہ کرو اور چشم پوشی اور مغفرت کے ساتھ پیش آؤ' اس لئے کہ ان دونوں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ یہ دونوں نسبتاً زیادہ جذباتی ہیں۔ از راہ محبت ہر بیوی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کا شوہر زیادہ سے زیادہ وقت اس کے پاس گزارے' اسی لئے ہر عورت کو اپنے شوہر کا گھر سے باہر رہنا' خواہ وہ معاش کے لئے ہو' دل سے پسند نہیں ہوتا۔ اسی طرح بچے کی بھی بہت سی خواہشات اس کی جذباتیت اور کم عقلی کا مظہر ہوتی ہیں۔ لیکن ایک سمجھ دار باپ بچے کو الاؤنس دیتا ہے کہ کوئی بات نہیں' بچہ ہے' کم عقل ہے' جذباتی ہے۔ اسی طرح وہ عورت کے نیک جذبے کی بھی قدر کرتا ہے کہ اگر میری بیوی مجھ سے تقاضا کرتی ہے کہ میں زیادہ دیر اس کے پاس رہوں تو وہ صرف مجھ سے محبت کی بنیاد پر ایسا کرتی ہے' ورنہ نہ تو وہ میری معاش کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتی ہے اور نہ میری سوشل لائف اور میرے کسی مشن کو۔ اسی طرح قرآن مجید میں توجہ دلائی گئی ہے کہ تم اپنی بیویوں کو طلاق دینے سے پہلے غور کرو کہ جس کمی کی وجہ سے تم انہیں ناپسند کر رہے ہو اس کے مقابلے میں ضرور تمہیں کوئی بات ان میں ایسی نظر آئے گی جس کی وجہ سے تم انہیں اپنے گھر میں رکھنا چاہو گے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان جب گھر سے باہر نکلتا ہے تو دو ہی ایسی خواتین ہیں جو ہر وقت اس کی خیر خواہی کے لئے دل سے دعاگو رہتی ہیں اور وہ ہیں اس کی ماں اور اس کی بیوی۔ ماں کے اکثر و بیشتر اور بھی بچے ہوتے ہیں تو اس کے جذبات تقسیم ہو جاتے ہیں لیکن بیوی اپنے شوہر کے لئے ہمیشہ فکر مند اور بے چین رہتی ہے' اس کے دل کو ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے' نہ جانے کیا ہو جائے۔ شہروں کے ہنگامے اور ٹریفک

حادثات کو ذہن میں لا کرماں اور بیوی اپنے بیٹے اور شوہر کی خیریت آمد کی طالب رہتی ہیں
--- لہٰذا قرآن مجید ہمیں متوجہ کرتا ہے کہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرو'
بچے تو پھر بھی چھوٹے ہوتے ہیں' لیکن عورت خواہ مرد کی ہم عمر ہی کیوں نہ ہو اور زیادہ
پڑھی لکھی کیوں نہ ہو' جذباتیت میں ایسی باتیں کرتی ہے جس پر مرد کو غصہ آتا ہے' لیکن
حکم دیا جارہا ہے کہ تم اس کو اپنے شعور کی سطح پر نہ جانچو بلکہ اس کی جذباتی سطح پر آکر جائزہ لو
تو دراصل وہ تم سے بے پناہ محبت کی وجہ سے ایسا کر رہی ہوتی ہے' لہٰذا برداشت کرو' تحمل
سے کام لو' بلکہ جواباً اپنے بیوی بچوں کے حق میں دعا کرو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مشکل
کام ہے' لیکن مرد کو اپنی مردانگی ثابت کرنے کے لئے اس عظمت کا مظاہرہ بہرحال کرنا
ہوگا۔

نسبتی رشتے اور اسلام کی تعلیمات

اس کے بعد آتے ہیں دوسرے نسبتی رشتے (IN LAWS) ان میں سسر اور ساس
اور بہو اور داماد (جن پر پہلے بحث ہو چکی) کے بعد اب آیئے شوہر اور بیوی کے بہن بھائیوں
اور پھر بقیہ عزیز و اقارب کی طرف۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ والدین اور اولاد کا رشتہ براہ
راست رشتہ ہوتا ہے' جبکہ بہن بھائی کے ساتھ انسان کا رشتہ والدین کی وساطت سے
استوار ہوتا ہے' لہٰذا بہن بھائی کے رشتے میں والدین کے مقابلے میں دوری ہے۔ ہر شخص
اپنے بہن بھائی تک پہنچنے کے لئے ایک درجہ اوپر چڑھ کر اپنے والدین تک پہنچتا ہے' پھر
ایک درجہ نیچے آکر ان تک پہنچتا ہے' لہٰذا یہاں وہ درجوں کا فصل ہے جبکہ میاں اور بیوی
کے لئے ایک دوسرے کے بہن بھائی ایک درجہ اور دور ہو جاتے ہیں۔

اسلام کے معاشرتی نظام میں یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ اس میں جہاں تمام
رشتوں کے حقوق برابر نہیں ہیں' وہاں ان کے ساتھ میل جول اور اٹھنا بیٹھنا بھی ایک سا
نہیں ہے۔ مثلاً رشتہ جس قدر قریبی ہے اس سے زائد تعلق اس کا حق نہیں ہے' بلکہ بعض
اوقات اس پر پابندی ہے۔ نسبتی بہن بھائیوں سے تعلق اپنے بہن بھائیوں کا سا نہیں ہو
سکتا۔

رشتوں کی تقسیم اور قانون وراثت

رشتوں کی یہ تقسیم اسلام کے قانون وراثت میں بہت نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دائرے ہیں جو کھینچ دیئے گئے ہیں۔ وراثت کے بہت سے معاملات میں نظر آتا ہے کہ انسان کے اصل تعلق تو وہی ہیں' والدین اور اولاد' باقی سب ان کے بعد ہیں۔ مثلاً مرنے والے کے قریب ترین (immediate) رشتہ دار کون ہیں؟ اوپر کی طرف اس کے والدین' نیچے کی طرف اس کی اولاد اور افقی سمت میں بیوی یا شوہر۔ ان میں بیوی یا شوہر کی عدم موجودگی میں تو وراثت IN LAWS کو نہیں جائے گی' البتہ والدین اور اولاد کی عدم موجودگی میں وراثت دادا / دادی اور پوتا / پوتی کو منتقل ہوگی' ورنہ نہیں۔ مثلاً اگر مرنے والے کے والدین موجود ہوں گے تو وہی اپنے حصے کے وارث ہوں گے۔ اگر وہ موجود نہ ہوں تو دادا دادی وراثت میں حقدار ہوں گے۔ اسی طرح اولاد کے دائرے میں اگر کوئی موجود ہو گا تو پوتا پوتی محروم رہیں گے اور اولاد میں سے کوئی بھی موجود نہ ہو گا تو پوتے اور پوتیاں وارث بنیں گے۔"

ستر و حجاب کے احکام

اسی ذوری کی بنیاد پر اسلام میں ایک اور پابندی عائد کی گئی ہے اور وہ ہے ستر و حجاب کی پابندی۔ جہاں تک ستر کا تعلق ہے وہ تو یہ ہے کہ جسم کے کچھ حصے مرد اور عورت پر ہر حال میں ڈھانپنے فرض ہیں' انہیں شریعت کی اصطلاح میں ستر کہتے ہیں۔ اس حکم سے استثناء صرف رشتہ ازدواج ہے یا پھر ایمرجنسی اور طبی یا انصاف کی ضرورت۔ یعنی انسانی جان بچانے کی خاطر کسی بھی مکان میں کود کر انسان کی جان بچائی جا سکتی ہے' طبی ضرورت کے تحت معالجین کے سامنے ستر کھولا جا سکتا ہے اور عدل و انصاف کے تقاضوں میں اگر ضرورت داعی ہو تو اس کی اجازت ہے۔ اس کے بعد معاملہ آتا ہے حجاب کا۔ رشتوں میں ایک خاص حد ہے کہ اس درجے تک رشتے محرم ہیں' ان کے درمیان کسی بھی سٹیج پر نکاح نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد کے درجات محرم نہیں ہیں' ماسوائے عمودی رشتوں کے کہ ان میں حرمت لامحدود ہے' یعنی ماں باپ' دادا دادی' نانا نانی اوپر جہاں تک چلے جائیں اور بیٹا

بیٹی اور پوتا پوتی، نواسہ نواسی جہاں تک چلے جائیں حرمت ہی حرمت ہے۔ لیکن اطراف کے رشتوں میں حرمت صرف دو رشتوں کی ہے، تیسرے رشتے میں حرمت کی قطعیت ختم ہو جائے گی۔ درمیان میں رضاعت آ جائے یا رشتہ ازدواج آ جائے تو بات دوسری ہو گی۔ جہاں تک شادی بیاہ کا تعلق ہے تو جب تک پہلا رشتہ برقرار رہے گا تیسرا رشتہ حرام ہو گا، یعنی بیوی کی بہن، بھانجی، خالہ اور پھوپھی حرام ہوں گی۔ جب پہلا رشتہ منقطع ہو گا (بیوی کی موت یا طلاق کی صورت میں) تو وہ عام عورتوں کی سطح پر آ جائیں گی۔ رشتوں کی اس تقسیم کے ساتھ بندھا ہوا شریعت میں ستر و حجاب کا قانون ہے اور یہ قانون بہت اہم ہے۔ اس کے احکامات کے ساتھ اس کی حکمت کا سمجھنا بھی اس دور کی ایک اہم ضرورت ہے۔

مرد اور عورت کی نفسیاتی ساخت میں فرق

مرد اور عورت کی تخلیق اور نفسیات کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد اور عورت صرف جسم کے چند اعضاء اور داڑھی مونچھ ہی کی بنیاد پر ایک دوسرے سے ممتاز نہیں ہیں، بلکہ یہ دونوں وجود بالکل ہی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ سائنس کی زبان میں تو ہم یوں کہیں گے کہ مرد کے جسم کا ہر ہر خلیہ (Cell) عورت کے جسم کے خلیوں سے مختلف ہے، کیونکہ مرد کے خلیے XY قسم کے کروموسومز (chromosomes) لئے ہوئے ہیں اور عورت کا ہر ہر خلیہ XX قسم کے کروموسومز لئے ہوئے۔ لہٰذا دونوں وجود اپنی تخلیقی ساخت میں بظاہر بہت زیادہ مشابہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ نفسیاتی اعتبار سے جب ہم جذبات اور ان پر قابو پانے کے حوالے سے ان دونوں پر غور کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ عورت نسبتاً زیادہ جذباتی ہے، اور مرد اپنے جذبات پر نسبتاً زیادہ قابو رکھنے والا۔ اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی اس صلاحیت ہی کو عربی زبان میں "عقل" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گویا اگر جذبات انسانی شخصیت میں گاڑی کے accelerator کے مشابہ ہیں تو عقل اس کی بریک ہے۔ جدید عربی میں بریک اور پارکنگ کے لئے لفظ وقوف استعمال ہوتا ہے اور اردو میں بے وقوف بے عقل کو کہا جاتا ہے۔ اس ناچیز کے خیال میں حضور ﷺ کے اس مشہور فرمان میں، جس کے اندر آپ ﷺ

نے عورت کو "ناقص العقل" قرار دیا ہے، عقل کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے نہ کہ ذہانت کے معنوں میں۔ علامہ اقبال کے اشعار میں بھی "عقل و عشق" کے عنوان سے انسان کی انہی دو faculties کے باہمی فرق کو نمایاں کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں سورۃ الحج کی آیت نمبر ۲ میں قیامت کے عظیم زلزلہ کا ذکر کر کے فرمایا کہ

> "تم اس دن دیکھو گے کہ ہر دودھ پلانے والی (اپنے بچے کو) دودھ پلانا بھول جائے گی اور حمل والیوں کے حمل گر جائیں گے اور لوگوں کو دیکھو گے کہ نشے میں ہیں، حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب شدید ہے"۔

شراب کے نشہ میں انسان بے ہوش نہیں ہوتا بلکہ مدہوش ہوتا ہے اور اس میں شراب اس کے دماغ میں جسم کی حرکات کو کنٹرول کرنے والے higher center کو متاثر کر دیتی ہے جس سے ان کا حرکت پیدا کرنے والے Lower center پر کنٹرول ڈھیلا پڑ جاتا ہے، لہٰذا وہ غصہ، محبت اور جنس جیسے جذبات کا بے دھڑک اظہار کرتا ہے۔ سورۃ الحج کی محولہ بالا آیت مبارکہ پر غور کرنے سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں، پہلی تو یہ کہ اس میں پہلی دو باتیں عورتوں سے متعلق ہیں اور اس آیت میں "الناس" (لوگ) سے مراد مرد ہیں، جیسے سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۴ میں "الناس" سے مراد مرد ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس میں مرد اور عورت دونوں کے اعلیٰ ترین اوصاف سے تہی دامن ہو جانے کا تذکرہ ہے۔ مرد کا اعلیٰ ترین وصف عقل اور عورت کی سب سے اہم صفت مامتا ہے، جو کہ مرد کی سب سے اہم "خواہش" بھی نہیں ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۴ میں ارشاد ہوا:

> "لوگوں (مردوں) کے لئے پرکشش بنائی گئیں ان کی ان خواہشات کی محبتیں جو انہیں لاحق ہیں عورتوں، بیٹوں، سونے چاندی کے ڈھیروں (مال و دولت)، نشان زدہ (عمدہ نسل کے) گھوڑوں (عمدہ سواری) اور مویشیوں اور کھیتی سے"۔

مرد کی شخصیت --- آئینہ قرآنی میں

اس آیت مبارکہ میں مرد کی شخصیت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ بہت جامع ہے اور انسان کی ایسی مکمل تصویر تو اس کا خالق ہی کھینچ سکتا ہے۔ اس میں جس ترتیب کے ساتھ مرد کی خواہشات کا تذکرہ ہے وہی ترتیب مرد کی دلچسپی میں کیت کے اعتبار سے بھی نظر آتی ہے

اور ایک شخص کی زندگی میں زمانی ترتیب کی بھی خبر دیتی ہے۔ ایک تو یہ کہ مرد سب سے زیادہ عورت کے پیچھے بھاگتا ہے، پھر وہ اولاد کے مستقبل کی فکر کرتا ہے، پھر بینک بیلنس اور اچھی سواری کی دھن اس پر سوار ہوتی ہے اور زندگی کی آخری سٹیج پر وہ جائیداد اور حویلی کا خواہشمند نظر آتا ہے۔

لیکن بلاشبہ انسان کی سب سے زوردار اور سب سے اہم خواہش جنسی خواہش ہی ہے۔ ہم میں سے ہر مرد اپنے گریبان میں جھانکے تو وہ قرآن کی بیان کردہ اس حقیقت کا اعتراف کرے گا کہ واقعی جنسی خواہش ایک انتہائی زوردار خواہش ہے۔ اس کے جذبات واحساسات ایک مرد سے گفتگو کرتے ہوئے اور ایک عورت سے گفتگو کرتے ہوئے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ وہ سو آدمیوں کی پاؤں کی آہٹ کا نوٹس نہیں لیتا، لیکن ایک عورت کے چلنے کی آواز پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ قرآن مجید اصلاً "کتابِ ہدایت" ہے، اس میں وارد ہونے والے واقعات بھی اصلاً "هُدًى لِّلنَّاس" اور "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" ہیں، لہٰذا سورۂ یوسف میں بیان ہونے والا احسن القصص بھی اصلاً ہدایت ہے۔ یاد رہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام خود بھی نبی یعنی انتہائی متقی انسان تھے، ساتھ ہی آپؑ ایک نبی حضرت یعقوبؑ کے بیٹے ایک دوسرے نبی حضرت اسحٰقؑ کے پوتے اور ابوالانبیاء امام الناس حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پڑپوتے تھے، لیکن آپؑ نے نہ تو اپنی ذاتی حیثیت پر ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا اور نہ اپنی خاندانی پس منظر پر (جیسا کہ ہمیں عام طور پر ہوتا ہے) بلکہ آپؑ نے صاف صاف فرمایا : وَمَآ أُبَرِّئُ نَفْسِىٓ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌۢ بِالسُّوٓءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّىٓ (ترجمہ) : "اور میں بھی اپنے نفس سے مبرا نہیں ہوں، میرا نفس بھی مجھے برائی کا حکم دیتا ہے، سوائے اس کے کہ میرا رب مجھ پر رحم کرے" اور جوں ہی آنجنابؑ نے محسوس فرمایا کہ ان پر جنسی تشویق و ترغیب کا گھیرا تنگ کرنے کی چالبازی کی جا رہی ہے تو فوراً دست بستہ پکار اٹھے کہ : رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَىَّ مِمَّا يَدْعُونَنِىٓ إِلَيْهِ ۖ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّى كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُن مِّنَ الْجَـٰهِلِينَ (ترجمہ) : "اے میرے مالک جدھر مجھے یہ عورتیں بلا رہی ہیں، اس سے مجھے جیل اچھی ہے اور اگر تو نے ان عورتوں کی چالبازی کو

مجھ سے دور نہ ہٹایا تو میں ان کی طرف مائل ہو کر جذباتی ہو جانے والوں میں سے ہو جاؤں گا"۔

عورت کے معاملے میں مرد کی عیاری

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا یہ کہ مرد کے جذبات پر اس کی عقل کی گرفت نسبتاً زیادہ مضبوط ہوتی ہے' لہٰذا وہ اس معاملے میں چالاکی اور عیاری کا راستہ اختیار کرتا ہے اور اپنی خواہش کا عورت کے سامنے براہ راست اظہار نہیں کرتا بلکہ جس طرح عقلمند والدا اپنی اولاد کی تربیت اس طرح کرتا ہے کہ وہ خود ہی اس کی خواہش کے مطابق ڈھلتی چلی جائے' مرد بھی عورت کا محسن بن کر سامنے آتا ہے' اس کو کبھی آزادی کی لوری دیتا ہے' کبھی جدیدیت کی طرف مائل ہونے کی ترغیب دلاتا ہے۔ نتیجتاً یہ جذباتی مخلوق بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ مردوں کی آلہ کار بن جاتی ہے۔ چونکہ خود عورت میں جذبہ جنس مامتا کے مقابلے میں خوابیدہ ہوتا ہے لہٰذا عام طور پر وہ ایسا ہرگز کسی جنسی جذبے سے نہیں کرتی۔ لیکن اس کے غیر مستور اور بے حجاب باہر آنے سے مرد بھرپور لطف اندوز ہوتا ہے۔ غور کیجئے' یورپ اور امریکہ کے سرد مقامات پر جہاں مرد خود تو جرابوں اور فل شوز سے لے کر نیکٹائی اور پھر ہیٹ بھی پہنتا ہے' لیکن عورت کے لئے اس نے جو لباس تجویز کر رکھا ہے اس میں اس بے چاری کی ٹانگیں ننگی اور گریبان کھلا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں پنجاب اور سندھ میں موسم گرما کے اندر دوپہر کے وقت اگر کسی چوراہے میں ٹریفک جام ہو جائے تو چپل یا سینڈل کے ساتھ وہاں موجودگی خاصی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے' لیکن وہیں ہماری بہنیں اور بیٹیاں ننگے بازوؤں اور ننگے سروں کے ساتھ موٹر سائیکل پر سفر کرنے میں خوشی محسوس کر رہی ہوتی ہیں۔ یقیناً وہ بھی سردی اور گرمی کو محسوس کرتی ہیں' لیکن وہ مردوں کی ہوشیاری کا شکار ہو چکی ہیں۔

مرد چاہتا یہ ہے کہ وہ ہر عورت سے مختلف سطحوں پر جنسی لذت تو حاصل کرے لیکن اس کے عوض اسے عورت کو کچھ دینا نہ پڑے' جبکہ اسلام عورت پر یہ پابندی لگاتا ہے کہ

(باقی صفحہ ۸۳ پر)

کتابیات

نفاق کی نشانیاں

تالیف : فضیلۃ الشیخ الاستاذ عائض عبداللہ القرنی

ترجمہ و حواشی : ابو عبدالرحمن شبیر بن نور

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہ الکریم

اللہ تعالٰی کی ذات اقدس' اس کے اسماء حسنٰی و صفاتِ مبارکہ' اس کی طرف سے مبعوث کردہ رسولوں' فرشتوں' کتابوں' یوم آخرت' حساب و میزان اور جنت و دوزخ کو صدق دل سے تسلیم کرنے کا نام ایمان ہے اور ایسے مخلص اہل ایمان کو اللہ تعالٰی نے "حزب اللہ" قرار دیا ہے اور انہیں دنیا میں امن و سکون اور آخرت میں کامیابی و کامرانی کی خوشخبری سنائی ہے۔

اس کے برعکس ان تمام کی تمام ایمانیات یا ان میں سے کسی ایک کے صریح انکار کا نام کفر ہے۔ اہلِ کفر کو اللہ تعالٰی نے "حزب الشیطان" قرار دیا ہے۔ دنیا میں یہ گروہ بدامنی و بے سکونی کا شکار رہے گا اور آخرت میں عذاب الٰہی اور دائمی و ابدی دوزخ ان کا ٹھکانہ ہوگا۔

حقیقت میں کرۂ ارضی پر یہی دو گروہ پائے جاتے ہیں' ایک "حزب اللہ" دوسرا "حزب الشیطان"۔ البتہ دنیا میں بظاہر ایک تیسرا گروہ بھی نظر آتا ہے جو در حقیقت "حزب الشیطان" کا ہی حصہ ہے۔ یہ گروہ بظاہر اہل اسلام والا جامہ پہن لیتا ہے لیکن وہ پکا کافر ہونے کے ساتھ ساتھ بزدل' کینہ پرور' مفاد پرست اور خود غرض ہوتا ہے اور یہ ہے منافقوں کا گروہ۔ یہ لوگ کافر تو ہیں ہی' اس پر مستزاد اللہ تعالٰی اور اہل ایمان کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں' اسی لئے ان کی سزا کافروں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اللہ تعالٰی نے ارشاد فرمایا :

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا ﴾ (النساء : ۱۴۵)

"یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے"۔

اس آیتِ کریمہ کی روشنی میں اگر چشمِ تصور سے جہنم کا نقشہ دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے:

(ا) جہنم کی سب سے اوپر والی سطح پر گناہ گار اہل ایمان ہوں گے جو اپنے اپنے قصور کی سزا پا کر بالآخر جنت میں چلے جائیں گے۔

(ب) ان کے نیچے دوسری تہہ میں وہ کافر ہوں گے جو اعلانیہ کفر کیا کرتے تھے۔

(ج) اور ان کے بھی نیچے تیسری اور سب سے نچلی تہہ میں منافق ہوں گے جو پکے اور حقیقی کافر ہونے کے ساتھ ساتھ بزدل' چالاک و عیار اور مفاد پرست بھی ہیں۔

دنیا میں علی الاعلان کافروں کا معاملہ تو بہت واضح ہے' ان کے معاملے میں کوئی شخص دھوکہ نہیں کھا سکتا' البتہ جو لوگ کافر ہونے کے باوجود اسلام کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں ان کا فیصلہ کرنا انتہائی دشوار ہے' کیونکہ کسی کا دل چیر کر یا اس کے دماغ کا آپریشن کر کے تو اس کے ایمان و کفر کا فیصلہ نہیں جا سکتا۔ البتہ قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں منافقین کی نشانیاں بیان ہوئی ہیں۔ انہی نشانیوں کی روشنی میں کسی کو منافق سمجھا جا سکتا ہے یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ فلاں آدمی میں فلاں علامت منافقوں والی ہے۔ البتہ کسی کے منافق ہونے کا فتویٰ پھر بھی نہیں لگایا جا سکتا' کیونکہ اس کا تعلق علم غیب سے ہے جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ---۔ فضیلت الشیخ العلامہ عائض عبد اللہ القرنی نے اپنے ایک علمی خطاب میں منافقوں میں پائی جانے والی نشانیوں اور علامتوں کی طرف نشاندہی کی ہے جو "ثلاثون علامۃ للمنافقین" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ یہ کتابچہ عرب دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ بہت تھوڑے عرصے میں اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ مفید جان کر میں نے اسے اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ اسے نہ صرف پسند کیا جائے گا بلکہ اس کتابچے میں مذکور ایمان کی بیماریوں کو پہچان کر متاع ایمان کے قدر دان حضرات ان

بیماریوں سے بچنے کی بھی ازحد کوشش کریں گے اور ان کاموں میں احتیاط برتیں گے جو کسی معنی میں نفاق کی نشانی بن سکتے ہوں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ میری اس کوشش کو قبول فرمائے اور سب سے پہلے مجھے اور قارئین کرام کو نفاق اعتقادی اور نفاق عملی سے محفوظ رکھے۔ نیز فضیلت الشیخ عائض عبداللہ القرنی کو جزائے خیر دے جنہوں نے اس اہم اور علمی مضمون کو احسن طریقے سے بیان فرمایا ہے۔

وصلی اللّٰہ علٰی نبینا محمد وّعلٰی آلہٖ وصَحبہٖ اجمعین

ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

(مترجم)

☆ ☆ ☆

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمدللّٰہ ربّ العالمین والصّلاۃ والسلام علٰی اشرف الانبیاءِ والمرسلین وعلٰی آلہٖ وصَحبہٖ اجمعین ومن تبعھم باحسانٍ الٰی یوم الدین --- اما بعد :

برادرانِ اسلام! اس مختصر کتاب میں، میں "منافقین کی تیس (۳۰) نشانیاں" بیان کروں گا اور یہ تمام نشانیاں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ سے معلوم ہوئی ہیں۔

نفاق سے ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اور دعاگو ہیں کہ ہمیں اس مرض سے محفوظ رکھے، اور اس خطرناک بیماری سے ہمارے دلوں کو پاک کر دے۔

قرآن کریم میں منافقوں کا تذکرہ

لفظ نفاق اور اس سے بننے والے الفاظ سینتیس (۳۷) مرتبہ مختلف سورتوں میں بیان ہوئے ہیں۔ ان سورتوں کے نام یہ ہیں : آل عمران، الحشر، التوبۃ،

الاحزاب' الفتح' الحدید' الانفال' المنافقون' النساء' العنکبوت' التحریم - اور بعض سورتوں میں یہ لفظ بار بار استعمال ہوا ہے۔ نفاق کا اس قدر بیان اس بات کی واضح دلیل ہے کہ منافقوں کا وجود اسلامی معاشرے اور [illegible]م کے لئے انتہائی خطرناک ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں کہ ہمیں منافقوں کے شر سے محفوظ رکھے اور خود انہیں برباد کرے بلکہ انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ اللہ ہی ہمارا کارساز ہے اور وہی اس پر قادر ہے۔

نفاق کی قسمیں

اہل سنت والجماعت کے نزدیک نفاق کی دو قسمیں ہیں :

ا ۔ اعتقادی نفاق : پہلی قسم اعتقادی نفاق کی ہے۔ یہ نفاق انسان کو ملتِ اسلامیہ سے خارج کر دیتا ہے اور ایسا منافق آخرت میں آگ کی سب سے نچلی تہہ میں ہوگا۔ اعتقادی منافق اس شخص کو کہیں گے جو بظاہر دین کے تمام اصولوں پر ایمان کا اظہار کرتا ہو لیکن دلی طور پر رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا انکار کرے' یا آسمانی کتابوں کو جھٹلائے یا فرشتوں کے وجود کا انکار کرے یا جن اصول ایمان پر اہل سنت کا متفقہ عقیدہ ہے ان میں سے کسی ایک کا دل سے انکار کرے۔ اس کے منافق ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے :

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝﴾ (البقرہ : ۸-۱۰)

"بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں' مگر دراصل وہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔ ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا اور جو جھوٹ وہ بولتے ہیں اس کی پاداش میں ان کے لئے دردناک سزا ہے۔"

ب ۔ نفاقِ عملی : دوسری قسم نفاق عملی کی ہے۔اس کی دلیل حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان ہے :

((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلاثٌ : اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ)) [1]

"منافق کی تین نشانیاں ہیں : (۱) جب بات کرے جھوٹ بولے (۲) جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے (۳) جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔"

اب میں تفصیل کے ساتھ ان تیس (۳۰) نشانیوں کو ذکر کرتا ہوں جو منافق کی پہچان ہیں :

پہلی نشانی

جھوٹ بولنا

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ جھوٹ کفر کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے۔امام صاحب کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاں کہیں نفاق کا ذکر کیا اس کے ساتھ ہی جھوٹ کا ذکر کیا ہے اور جب جھوٹ کا تذکرہ کیا تو اس کے ساتھ نفاق کو ذکر کیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿ يُخَادِعُونَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا، وَمَا يَخْدَعُونَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۞ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ۞﴾

(البقرہ : ۸۔۱۰)

"وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں، مگر دراصل وہ خود اپنے آپ کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور بڑھا دیا اور جو جھوٹ وہ بولتے ہیں اس کی پاداش میں ان کے لئے دردناک سزا ہے۔"

اور سورت المنافقون میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

﴿وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ۝﴾
(المنافقون : ۱)

"اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔"

یہاں منافقوں کے تذکرے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کذب (جھوٹ) کا تذکرہ کیا ہے۔

قرآن کریم میں جہاں نفاق کا ذکر ہوا اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کو کم یاد کرنے کا بیان ہوا۔ فرمایا :

﴿وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا۝﴾ (النساء : ۱۴۲)

"اور وہ اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔"

اور جہاں ایمان کا تذکرہ ہوا تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنے کا ذکر ہوا۔ فرمایا :

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ﴾ (المنافقون : ۹)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔"

ذکرِ الٰہی کو بنیاد بنا کر اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے خصلتِ نفاق کی نفی کی ہے اور ذکرِ الٰہی میں کمی منافقوں کی پہچان بتائی ہے۔

جھوٹ کو نفاق کی علامت و نشانی قرار دیتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا :

((آیۃ المُنافِقِ ثلاثٌ : اِذا حدَّث کذَب........الخ)) [۲]

"منافق کی تین نشانیاں ہیں : جب بات کرے تو جھوٹ بولے........الخ"

چاہے اس نے مذاق میں جھوٹ بولا، یا سنجیدگی سے جھوٹ بولا، کسی ضرورت کے تحت جھوٹ بولا یا چکر دینے کے لئے جھوٹ بولا، بہرحال اس میں نفاق کا حصہ شامل ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ دل میں موجود نفاق کی وجہ سے ہی اس نے جھوٹ بولا --- وَاللّٰہُ المُستعان

جھوٹ ایک واضح اور روشن نشانی ہے جو جھوٹے کے بارے میں نفاق کی گواہی دے

رہی ہے۔ مذاق مذاق میں جھوٹ بولنے کا بھی یہی حکم ہے اگرچہ کچھ لوگ اس بات کا خیال نہیں رکھتے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا :

((وَيلٌ لِّلَّذِی يُحَدِّثُ فَيَكْذِبُ لِيُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ' وَيلٌ لَّه' وَيلٌ لَّه')) [۷]

"اس آدمی کے لئے تباہی ہے جو باتوں باتوں میں اس لئے جھوٹ بولتا ہے کہ لوگوں کو ہنسائے۔ اس کے لئے ہلاکت ہے' اس کے لئے تباہی ہے"۔

جھوٹا ہر حال میں لعنتی ہے خواہ وہ سنجیدگی سے جھوٹ بولے یا مذاق میں۔ اس مذموم عادت سے بچ کر رہئے' اس لئے کہ نفاق کی ساری عمارت' اس کا مرکزی ستون' اس کا مرکز' اس کی جولان گاہ' اس کی جائے پناہ اور اس کا سہارا جھوٹ ہی پر منحصر ہے۔ منافقین دل میں موجود جھوٹ ہی کے بل بوتے پر نفاق کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ جھوٹ دل میں ایک قطرے سے شروع ہوتا ہے۔ پھر گہرا ہوتا چلا جاتا ہے اور پھیلتا ہے حتیٰ کہ نفاق کے قلعوں میں سے ایک قلعہ بن جاتا ہے۔۔۔۔۔ اور اللہ کی پناہ اس حال سے۔

میرے دینی بھائیو! میں اپنی ذات کو اور اس کے بعد تم کو جھوٹ کے معاملے میں متنبہ کر رہا ہوں۔ جھوٹ کے معاملے میں ہمیشہ محتاط رہو کیونکہ وہ نفاق کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ جھوٹ کو اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی نشانی قرار دیا ہے۔ وہ اپنی گفتگو میں جھوٹے ہیں' اپنے کردار میں جھوٹے ہیں۔۔۔۔ اور ہر معاملے میں جھوٹے ہی جھوٹے ہیں۔

دوسری نشانی

دھوکہ دینا

دھوکہ نفاق کی نشانی ہے اور اس کی دلیل حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان ہے :

((وَ اِذَا عَاهَدَ غَدَرَ)) [۸]

"اور جب معاہدہ کرتا ہے تو دھوکہ دے جاتا ہے"۔

جس نے مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ یا حکمران وقت کے ساتھ یا کسی مسلمان کے ساتھ معاہدہ کیا حتیٰ کہ جنگ میں کسی کافر کے ساتھ معاہدہ کیا اور پھر دھوکہ دیا' اس نے اپنی جان پر

نفاق کی گواہی ' کردار سے ثبت کر دی۔ اس کی دلیل حضرت بریدۃ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ حضور اکرم ﷺ جب کسی کو امیر لشکر مقرر کر کے روانہ کرتے تو یہ ہدایت ضرور کرتے کہ :

"اور جب تم سے اہل قلعہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اترنے کی درخواست کریں تو تم انہیں اپنے ذاتی فیصلے پر اترنے پر آمادہ کرو' اس لئے کہ اگر تم اپنی ذمہ داری کو توڑ دو تو یہ اس کے مقابلے میں کہیں آسان اور ہلکا معاملہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری کو تار تار کر دو۔" ۵

چنانچہ جس نے کسی آدمی سے ' اپنی بیوی سے ' اپنے بچے سے ' اپنے ساتھی یا دوست سے یا حکمران سے معاہدہ کرنے کے بعد کسی شرعی عذر کے بغیر خیانت کی یا اس کی خلاف ورزی کی تو یہ نفاق کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے اور نفاق کی ایک علامت ہے ----- والعیاذ باللہ۔

تیسری نشانی

لڑائی جھگڑے میں بیہودہ گوئی کرنا (گالی دینا)

اس کی دلیل حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان ہے :

((وَ اِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)) ۶

"اور جب جھگڑا کرتا ہے تو گالی بکتا ہے"۔

اہل علم کہتے ہیں جس نے کسی مسلمان سے جھگڑا کیا پھر دوران جھگڑا گالی بکی ' اس نے اللہ کو اپنے دل میں موجود کیفیت پر گواہ بنا لیا کہ وہ فاجر اور منافق ہے۔

البتہ کافروں سے لڑائی کا معاملہ مسلمانوں کی لڑائی سے مختلف ہے۔ کافروں کے بارے میں ایک حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا :

((اَلْحَرْبُ خَدْعَۃٌ)) ۷

"جنگ میں دھوکہ جائز ہے۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پر عمل بھی کیا ہے۔ (اس کی تفصیلات علیحدہ ہیں)۔ چنانچہ

اگر کسی نے کافروں سے خیانت کی تو (چونکہ ان سے جنگ کے دوران دھوکہ کرنا اور حیلہ کرنا جائز ہے) اس پر غدر و خیانت اور فسق کا حکم لاگو نہیں ہوگا۔ یہ تو دھوکہ اور حیلہ ہے' لہٰذا کوئی حرج نہیں۔

چوتھی نشانی
وعدے کی خلاف ورزی کرنا

جس نے اپنے بھائی سے وعدہ کیا' پھر وقت مقررہ پر نہ پہنچا اس نے نفاق کے حصوں میں سے ایک حصہ پر عمل کیا۔

حسن سندوں کے ساتھ سیرت الرسول ﷺ میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک آدمی سے ملنے کا وعدہ کیا۔ آپ ﷺ خود تو مقررہ وقت پر پہنچ گئے البتہ وہ آدمی نہ آیا۔ آپ ﷺ تین دن رات اسی جگہ پر اس کا انتظار کرتے رہے' اس کے بعد اس آدمی کو اپنا وعدہ یاد آیا تو وہ وہاں پہنچا' آپ ﷺ نے اسے کہا : "تو نے مجھے مشقت میں ڈال دیا"۔

جس نے وعدے کی خلاف ورزی کی اور ذمہ داری کا مظاہرہ نہ کیا تو سمجھ لیں کہ اس میں نفاق کی علامت موجود ہے۔ مسلمانوں کے ہاں وعدے کے معاملے میں ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت کا اکثر مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔ جو کوئی تم سے کسی وقت' دن یا جگہ کا وعدہ کرے پھر بغیر معقول عذر کے وعدہ خلافی کرے تو سمجھ لو کہ اس میں نفاق کا حصہ موجود ہے۔ آئندہ کے لئے اس سے ہاتھ جھاڑ لو۔

ایک نیک آدمی کی عادت تھی کہ جب کسی مسلمان بھائی سے وعدہ کرتے تو ان شاء اللہ کہنے کے بعد فرماتے : یہ میرے اور تیرے درمیان کوئی پختہ وعدہ نہیں ہے' اگر ممکن ہوا تو آجاؤں گا اور اگر نہ آسکا تو معذور سمجھ لینا۔ یعنی مبادا خلاف ورزی ہو جائے اور اس کے اعمال نامے میں کہیں نفاق کا کوئی جزو نہ لکھ دیا جائے۔ والعیاذ باللہ۔

یہی عملی نفاق ہے جو کہ اکثر اوقات ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ فی زمانہ اکثر مسلمان کمزوری ایمان کی وجہ سے وعدہ خلافی کرتے ہیں' جھوٹ بولتے ہیں' فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں

اور دھوکہ دیتے ہیں۔

اس کے برعکس جب کوئی آدمی کافر ملکوں کا سفر کرتا ہے تو صرف مادی نفع کی خاطر ان کا ذمہ دارانہ رویہ اور وعدے کی پابندی دیکھ کر پکار اٹھتا ہے کہ بہت خوب! یہاں تو اخلاص' سچائی اور امانت پائی جاتی ہے۔ واپس آکر اللہ کے دشمنوں ملحدوں اور کافروں کی تعریف کے پل باندھنے لگتا ہے اور مسلمانوں کو برا بھلا کہتا ہے۔

ایسے (ظاہر بین) آدمی کو ہمارا جواب ہے کہ اصل بات یہ ہے کہ وہاں تم نے وہ لوگ دیکھے ہیں جو درہم و دینار کی خاطر معاملہ کرتے ہیں اور وہ لوگ مفاد پرست ہیں۔ اور یہاں ایسے لوگ ہیں جن کے پاس حقیقی اور کامل ایمان ہی سرے سے موجود نہیں' یہ اللہ کی مقرر کردہ شریعت و نظام کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ان کا حال تو یہ ہے کہ خود مسلمانوں کی نظروں میں انہوں نے دین کی شکل بگاڑ کر رکھ دی ہے۔ (جاری ہے)

۱۔ صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب علامۃ المنافق۔ صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان خصال المنافق۔

۲۔ تخریج حدیث قریب ہی گزر چکی ہے۔

۳۔ مسند امام احمد ج ۵' ص ۳' ۵' ۶۔ استاذ الالبانی نے حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو صحیح الجامع الصغیر حدیث نمبر ۱۳۶۷

۴۔ صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب علامۃ المنافق۔ صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب خصال المنافق۔

۵۔ صحیح مسلم' کتاب السیر' باب تامیر الامراء علی البعوث

۶۔ صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب علامات المنافق۔ صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان خصال المنافق۔

۷۔ صحیح البخاری' کتاب الجہاد' باب الحرب خدعۃ۔ صحیح مسلم' کتاب الجہاد' باب جواز الخداع فی الحرب

قتل مرتد ـــــ عقلی جواز

مخالفین کے اعتراضات کے جواب میں سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی نگارشات

مرتب : محمد اسماعیل قریشی

ہمارے معاشرے کے اکثر عقلیت پسند' بلکہ عقل گزیدہ افراد قتل مرتد کو بڑے شد و مد کے ساتھ خلاف عقل قرار دیتے ہیں جبکہ قرآن و سنت اور عمل صحابہ' ان سب کو اگر بیک نگاہ سامنے رکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ مرتد کی یہی سزا ہے جو ہمارے دین نے تجویز کی ہے۔ اس مسئلے کو قادیانی حضرات اپنے مذموم مقاصد کے لئے خاص طور پر ہوا دے رہے ہیں اور عام پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں میں جو اساسات دین سے بالعموم ناواقف محض ہوتے ہیں' اس حوالے سے شکوک و شبہات پیدا کرنے میں سرگرم ہیں۔ جناب محمد اسماعیل قریشی نے "ناموس رسولؐ اور قانون توہین رسالت" کے نام سے جو کتاب حال ہی میں مرتب کی ہے اس میں "مسئلہ ارتداد اور مولانا مودودی" کے زیر عنوان ایک باب میں ان تحریروں کو جمع کیا ہے جن میں انہوں نے قتل مرتد پر معترضین کے اعتراضات کا مدلل جواب دیا ہے اور عقلی دلائل سے اس کا جواز ثابت کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس تحریر کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے۔ (ادارہ)

مولانا مودودی نے قرآن و سنت اور عمل صحابہ کے علاوہ عقلی دلائل سے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ مرتد سزائے موت کا مستحق ہے۔ مولانا نے پہلے تو قتل مرتد کے بارے میں جو اعتراضات ہوتے رہے ہیں ان کو یکجا کیا ہے اور پھر ہر اعتراض کا مدلل جواب دیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

"قتل مرتد پر سب سے پہلا اعتراض تو یہ کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے دین و مذہب کو ترک کر دے تو اس کو افہام و تفہیم کے بجائے تلوار کے زور پر ارتداد سے روکا جائے تو یہ بات آزادی ضمیر کے منافی ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بالجبر اسلام ترک نہ کرنے پر مجبور بھی کر دیا جائے تو وہ دل سے اسلام کا قائل نہیں ہو سکتا اور یہ منافقت ہوگی جو خود اسلام کے لیے خطرناک بات ہے۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر اسلام سے پھر جانے کی سزا موت ہے تو دیگر مذاہب سے آنے والوں کے لیے بھی وہی سزا ہونی چاہیے۔ اگر اس پر دوسرے پیروان مذاہب کی حکومتیں عمل درآمد کریں تو اسلامی دعوت و تبلیغ کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ چوتھا اور بظاہر وزنی اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ارتداد کی

سزا اسلام کے اس اعلان کے خلاف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دین میں جبر و اکراہ نہیں۔ اس طرح یہ صاف ذہنی تضاد ہے جسے عقلِ سلیم تسلیم نہیں کرتی۔

مولانا نے ان اعتراضات کا جواب دینے سے قبل ایک غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی ہے جو ان ہی کے الفاظ میں پیش کی جا رہی ہے۔

ایک بنیادی غلط فہمی

حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلام کی حیثیت فی الواقع اسی معنی میں ایک "مذہب" کی ہوتی' جس معنی میں یہ لفظ آج تک بولا جاتا ہے' تو یقیناً اس کا ان لوگوں کے لیے قتل کی سزا تجویز کرنا سخت غیر معقول فعل ہوتا' جو اس کے اصولوں سے غیر مطمئن ہو کر اس کے دائرے سے باہر نکلنا چاہیں۔ مذہب کا موجودہ تصور یہ ہے کہ وہ مابعد الطبیعی مسائل کے متعلق ایک عقیدہ و خیال ہے' جسے آدمی اختیار کرتا ہے اور حیات بعد الموت میں نجات حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے جس پر انسان اپنے عقیدے کے مطابق عمل کرتا ہے۔ رہی سوسائٹی کی تنظیم اور معاملات دنیا کی انجام دہی اور ریاست کی تشکیل' تو وہ ایک خالص دنیوی معاملہ ہے' جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس تصور کے مطابق مذہب کی حیثیت صرف ایک رائے کی ہے اور رائے بھی ایسی جو زندگی کے ایک بالکل ہی دور از کار پہلو سے تعلق رکھتی ہے' جس کے قائم ہونے اور بدلنے کا کوئی قابل لحاظ اثر حیات انسانی کے بڑے اور اہم شعبوں پر نہیں پڑتا۔ ایسی رائے کے معاملے میں آدمی کو آزاد ہونا ہی چاہیے۔ کوئی معقول وجہ نہیں کہ امور مابعد الطبیعت کے بارے میں ایک خاص رائے کو اختیار کرنے میں تو وہ آزاد ہو' مگر جب اس کے سامنے کچھ دوسرے دلائل آئیں' جن کی بنا پر وہ سابق رائے کو غلط محسوس کرنے لگے' تو اس کے بدل دینے میں وہ آزاد نہ ہو اور اسی طرح کوئی وجہ نہیں کہ جب ایک طریقہ کی پیروی میں اسے اپنی نجات اخروی کی توقع ہو' تو اسے اختیار کر سکے اور جب وہ محسوس کرے کہ نجات کی امید اس راستہ میں نہیں' کسی دوسرے راستے میں ہے' تو اسے پچھلے راستے کو چھوڑنے اور نئے راستے کے اختیار کر لینے کا

حق نہ دیا جائے۔ پس اگر اسلام کی حیثیت یہی ہوتی' جو مذہب کی حیثیت آج کل قرار پا گئی ہے' تو اس سے زیادہ نامعقول کوئی بات نہ ہوتی کہ وہ آنے والوں کے لیے تو اپنا دروازہ کھلا رکھے' مگر جانے والوں کے لیے دروازے پر جلاد بٹھا دے۔

لیکن دراصل اسلام کی یہ حیثیت سرے سے ہے ہی نہیں۔ وہ اصطلاح جدید کے مطابق محض ایک "مذہب" نہیں ہے بلکہ ایک پورا نظام زندگی ہے۔ اس کا تعلق صرف مابعد الطبیعات ہی سے نہیں ہے بلکہ طبیعات اور مافی الطبیعات سے بھی ہے۔ وہ محض حیات بعد الموت کی نجات ہی سے بحث نہیں کرتا بلکہ حیات قبل الموت کی فلاح و بہتری اور تشکیل صحیح کے سوال سے بھی بحث کرتا ہے اور نجات بعد موت کو اسی حیات قبل الموت کی تشکیل صحیح پر منحصر قرار دیتا ہے۔ مانا کہ پھر بھی وہ ایک رائے ہی ہے' مگر وہ رائے نہیں جو زندگی کے کسی دور ازکار پہلو سے تعلق رکھتی ہو' بلکہ وہ رائے جس کی بنیاد پر پوری زندگی کا نقشہ قائم ہوتا ہے۔ وہ رائے نہیں جس کے قائم ہونے اور بدلنے کا کوئی قابل لحاظ اثر زندگی کے بڑے اور اہم شعبوں پر نہ پڑتا ہو' بلکہ وہ رائے جس کے قیام پر تمدن اور ریاست کا قیام منحصر ہے اور جس کے بدلنے کے معنی نظام تمدن و ریاست کے بدل جانے کے ہیں۔ وہ رائے نہیں جو صرف انفرادی طور پر ایک شخص اختیار کرتا ہو' بلکہ وہ رائے جس کی بنا پر انسانوں کی ایک جماعت تمدن کے پورے نظام کو ایک خاص شکل پر قائم کرتی ہے اور اسے چلانے کے لیے ایک ریاست وجود میں لاتی ہے۔ ایسی رائے اور ایسے نظریہ کو انفرادی آزادیوں کا کھلونا نہیں بنایا جا سکتا' نہ اس جماعت کو جو اس رائے پر تمدن و ریاست کا نظام قائم کرتی ہے راہ گزر بنایا جا سکتا ہے کہ جب فضائے دماغی میں ایک لہر اٹھے تو اس میں داخل ہو جائے اور جب دوسری لہر اٹھے تو اس سے نکل جائے اور پھر جب جی چاہے اندر آئیے اور جب چاہے باہر چلے جائیے۔ یہ کوئی کھیل اور تفریح نہیں ہے جس سے بالکل ایک غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر دل بہلایا جائے' یہ تو ایک نہایت سنجیدہ اور انتہائی نزاکت رکھنے والا کام ہے جس کے ذرا ذرا سے نشیب و فراز سوسائٹی اور سٹیٹ کے نظام پر اثرانداز ہوتے ہیں' جس کے بننے اور بگڑنے کے ساتھ لاکھوں کروڑوں بندگان

خدا کی زندگیوں کا بناؤ اور بگاڑ وابستہ ہوتا ہے' جس کی انجام دہی میں ایک بہت بڑی جماعت اپنی زندگی و موت کی بازی لگاتی ہے۔ ایسی رائے اور ایسی رائے رکھنے والی جماعت کی رکنیت [illegible] انفرادی آزادیوں کا کھلونا دنیا میں کب بنایا گیا ہے اور کون بتاتا ہے کہ اسلام سے اس کی توقع رکھی جائے۔

منظم سوسائٹی کا فطری اقتضا

ایک منظم سوسائٹی' جو ریاست کی شکل اختیار کر چکی ہو' ایسے لوگوں کے لیے اپنے حدود عمل میں بمشکل ہی گنجائش نکال سکتی ہے' جو بنیادی امور میں اس سے اختلاف رکھتے ہوں۔ فروعی اختلافات تو کم و بیش برداشت کیے جا سکتے ہیں' لیکن جو لوگ سرے سے ان بنیادوں ہی سے اختلاف رکھتے ہوں' جن پر سوسائٹی اور ریاست کا نظام قائم ہوا ہو' ان کو سوسائٹی میں جگہ دینا اور سٹیٹ کا جز بنانا سخت مشکل ہے۔ اس معاملے میں اسلام نے جتنی رواداری برتی ہے' دنیا کی تاریخ میں کبھی کسی دوسرے نظام نے نہیں برتی۔ دوسرے جتنے نظام ہیں وہ اساسی اختلاف رکھنے والوں کو یا تو زبردستی اپنے اصولوں کا پابند بناتے ہیں یا انہیں بالکل فنا کر دیتے ہیں۔ وہ صرف اسلام ہی ہے جو ایسے لوگوں کو ذمی بنا کر اور انہیں زیادہ سے زیادہ ممکن آزادی عمل دے کر اپنے حدود میں جگہ دیتا ہے اور ان کے بہت سے ایسے اعمال کو برداشت کرتا ہے' جو براہ راست اسلامی سوسائٹی اور سٹیٹ کی اساس سے متصادم ہوتے ہیں۔ اس رواداری کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسلام انسانی فطرت سے مایوس نہیں ہے۔ وہ خدا کے بندوں سے آخر وقت تک یہ امید وابستہ رکھتا ہے کہ جب انہیں دین حق کے ماتحت رہ کر اس کی نعمتوں اور برکتوں کے مشاہدہ کا موقع ملے گا' تو بالآخر وہ اس حق کو قبول کرلیں گے' جس کی روشنی فی الحال انہیں نظر نہیں آتی۔ اسی لیے وہ صبر سے کام لیتا ہے اور ان سنگریزوں کو' جو اس کی سوسائٹی اور ریاست میں حل نہیں ہوتے' اس امید پر برداشت کرتا رہتا ہے کہ کبھی نہ کبھی ان کی قلب ماہیئت ہو جائے گی اور وہ تحلیل ہونا قبول کرلیں گے۔ لیکن جو سنگریزہ ایک مرتبہ تحلیل ہونے کے بعد پھر

سنگریزہ بن جائے اور ثابت کر دے کہ وہ سرے سے اس نظام میں حل ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا، اس کا کوئی علاج اس کے سوا نہیں کہ اسے نکال کر پھینک دیا جائے۔ اس کی انفرادی ہستی، خواہ کتنی ہی قیمتی ہو، مگر بہرحال وہ اتنی قیمتی تو نہیں ہو سکتی کہ سوسائٹی کے پورے نظام کی خرابی اس کی خاطر گوارا کر لی جائے۔

اس عام فہم غلطی کو دور کرنے کے بعد مولانا نے قتل مرتد کے ان تمام اعتراضات کا جن کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں جواب دیا ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

اعتراضات کا جواب

قتل مرتد کو جو شخص یہ معنی پہناتا ہے کہ یہ محض ایک رائے کو اختیار کرنے کے بعد اسے بدل دینے کی سزا ہے، وہ دراصل ایک معاملہ کو پہلے خود ہی غلط طریقے سے تعبیر کرتا ہے اور پھر خود ہی اس پر ایک غلط حکم لگاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، مرتد کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ اپنے ارتداد سے اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ سوسائٹی اور سٹیٹ کی تنظیم جس بنیاد پر رکھی گئی ہے، اس کو وہ نہ صرف یہ کہ قبول نہیں کرتا، بلکہ اس سے کبھی آئندہ بھی یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ اسے قبول کرے گا۔ ایسے شخص کے لیے مناسب یہ ہے کہ جب وہ اپنے لیے اس بنیاد کو ناقابل قبول پاتا ہے، جس پر سوسائٹی اور سٹیٹ کی تعمیر ہوئی ہے، تو خود اس کے حدود سے نکل جائے۔ مگر جب وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کے لیے دو ہی علاج ممکن ہیں: یا تو اسے سٹیٹ میں تمام حقوق شہریت سے محروم کر کے زندہ رہنے دیا جائے، یا پھر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ پہلی صورت فی الواقع دوسری صورت سے شدید تر سزا ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ **لا یموت فیھا ولا یحیی** کی حالت میں مبتلا رہے اور اس صورت میں سوسائٹی کے لیے بھی وہ زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی ذات سے ایک مستقل فتنہ لوگوں کے درمیان پھیلتا رہے گا اور دوسرے صحیح و سالم اعضا میں بھی اس کے زہر کے سرایت کر جانے کا اندیشہ ہوگا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسے موت کی سزا دے کر اس کی اور سوسائٹی کی مصیبت کا بیک وقت خاتمہ کر دیا جائے۔

قتل مرتد کو یہ معنی پہنانا بھی غلط ہے کہ ہم ایک شخص کو موت کا خوف دلا کر منافقانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ دراصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہم ایسے لوگوں کے لیے اپنی جماعت کے اندر آنے کا دروازہ بند کر دینا چاہتے ہیں، جو تلوّن کے مرض میں مبتلا ہیں اور نظریات کی تبدیلی کا کھیل تفریح کے طور پر کھیلتے رہتے ہیں اور جن کی رائے اور سیرت میں وہ استحکام سرے سے موجود ہی نہیں ہے، جو ایک نظام زندگی کی تعمیر کے لیے مطلوب ہوتا ہے۔ کسی نظام زندگی کی تعمیر ایک نہایت سنجیدہ کام ہے۔ جو جماعت اس کام کے لیے اٹھے، اس میں لہری طبیعت کے کھلنڈرے لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی، اس کو صرف ان لوگوں سے مرکب ہونا چاہیے جو واقعی سنجیدگی کے ساتھ اس نظام کو قبول کریں اور جب قبول کر لیں تو دل و جان سے اس کے قیام اور اس کی تعمیر میں لگ جائیں۔ لہٰذا یہ عین حکمت و دانش ہے کہ ہر اس شخص کو، جو اس جماعت کے اندر آنا چاہے، پہلے مطلع کر دیا جائے کہ یہاں سے پلٹ کر جانے کی سزا موت ہے، تاکہ وہ داخل ہونے سے پہلے سو مرتبہ سوچ لے کہ آیا اسے ایسی جماعت میں داخل ہونا چاہیے یا نہیں۔ اس طرح جماعت میں آئے گا ہی وہ، جسے کبھی باہر جانا نہ ہو گا۔

تیسرے نمبر پر جو اعتراض ہم نے نقل کیا ہے، اس کی بنیاد بھی غلط ہے۔ معترضین کے پیش نظر دراصل ان "مذاہب" کا اور انہی کے پرچار کا معاملہ ہے جن کی تعریف ہم ابتدا میں کر چکے ہیں۔ ایسے مذاہب کو واقعی اپنا دروازہ آنے اور جانے والوں کے لیے کھلا رکھنا چاہیے۔ وہ اگر جانے والوں کے لیے اسے بند کریں گے تو ایک بے جا حرکت کریں گے۔ لیکن جس مذہب فکر و عمل پر سوسائٹی اور سٹیٹ کی تعمیر کی گئی ہو، اسے کوئی معقول آدمی، جو اجتماعیات میں کچھ بھی بصیرت رکھتا ہو، یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ وہ اپنی تخریب اور اپنے اجزائے تعمیر کے انتشار اور اپنی بندش وجود کی برہمی کا دروازہ خود ہی کھلا رکھے۔ منظم سوسائٹی اور سٹیٹ وہ چیز ہے جس کا بنانا اور بگاڑنا ہمیشہ ہی سے جان جوکھوں کا کام رہا ہے اور اپنی فطرت کے لحاظ سے یہ کام ہمیشہ ایسا ہی رہے گا دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا اور نہ آئندہ کبھی اس کی

امید ہے کہ آگ اور خون کا کھیل کھیلے بغیر کسی نظام زندگی کو تبدیل کر دیا جائے۔ کسی مزاحمت کے بغیر خود تبدیل ہونے کے لیے صرف وہی نظام زندگی تیار ہو سکتا ہے، جس کی جڑیں گل چکی ہوں اور جس کی بنیاد میں اپنے استحقاق وجود کا یقین باقی نہ رہا ہو۔

رہا تناقض کا اعتراض تو اوپر کی بحث کو بغور پڑھنے سے بڑی حد تک وہ خود بخود رفع ہو جاتا ہے۔ **لا اکراہ فی الدین** کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی کو اپنے دین میں آنے کے لیے مجبور نہیں کرتے اور واقعی ہماری روش یہی ہے۔ مگر جسے آ کر واپس جانا ہو، اسے ہم پہلے ہی خبردار کر دیتے ہیں کہ یہ دروازہ آمدورفت کے لیے کھلا ہوا نہیں ہے، لہٰذا اگر آتے ہو تو یہ فیصلہ کر کے آؤ کہ واپس نہیں جانا ہے ورنہ براہ کرم آؤ ہی نہیں۔ کوئی بتائے کہ آخر اس میں تناقض کیا ہے؟ بلاشبہ ہم نفاق کی مذمت کرتے ہیں اور اپنی جماعت میں ہر شخص کو صادق الایمان دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر جس شخص نے اپنی حماقت سے خود اس دروازے میں قدم رکھا، جس کے متعلق اسے معلوم تھا کہ وہ جانے کے لیے کھلا ہوا نہیں ہے، وہ اگر نفاق کی حالت میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔ اس کو اس حالت سے نکالنے کے لیے ہم اپنے نظام کی برہمی کا دروازہ نہیں کھول سکتے۔ وہ اگر ایسا ہی راستی پسند ہے، کہ منافق بن کر نہیں رہنا چاہتا، بلکہ جس چیز پر اب ایمان لایا ہے، اس کی پیروی میں صادق ہونا چاہتا ہے، تو اپنے آپ کو سزائے موت کے لیے کیوں نہیں پیش کرتا؟

ہاں اعتراض بظاہر کچھ وزن رکھتا ہے کہ اسلام جب خود اپنے پیروؤں کو تبدیل مذہب پر سزا دیتا ہے اور اسے قابل مذمت نہیں سمجھتا، تو دوسرے مذاہب کے پیرو اگر اپنے ہم مذہبوں کو اسلام قبول کرنے پر سزا دیتے ہیں، تو وہ ان کی مذمت کیوں کرتا ہے؟ لیکن ان دو رویوں میں بظاہر جو تناقض نظر آتا ہے، فی الواقع وہ نہیں ہے، بلکہ اگر دونوں صورتوں میں ایک ہی رویہ اختیار کیا جاتا تو البتہ تناقض ہوتا۔ اسلام اپنے آپ کو حق کہتا ہے اور بالکل خلوص کے ساتھ حق ہی سمجھتا ہے، اس لیے وہ حق کی طرف آنے والے اور حق سے منہ موڑ کر واپس جانے والے کو مساوی مرتبہ پر ہرگز نہیں رکھ سکتا۔ حق کی طرف آنے والے کے لیے یہ حق ہے کہ اس کی طرف

آئے اور جو اس کی راہ میں مزاحمت کرتا ہے، وہ مذمت کا مستحق ہے اور حق سے واپس جانے والے کے لیے یہ حق نہیں ہے کہ اس سے واپس جائے اور جو اس کی راہ روکتا ہے، وہ مذمت کا مستحق نہیں ہے۔ تناقض اس رویہ میں نہیں ہے، البتہ اگر اسلام اپنے آپ کو حق بھی کہتا اور پھر ساتھ ہی اپنی طرف آنے والے اور اپنے سے منہ موڑ کر جانے والے کو ایک ہی مرتبہ میں رکھتا، تو بلاشبہ یہ ایک متناقض طرز عمل ہوتا۔

مجرد مذہب اور مذہبی ریاست کا بنیادی فرق

اوپر ہم نے قتل مرتد پر اعتراض کرنے والوں کے جو دلائل نقل کیے ہیں اور ان کے جواب میں اپنی طرف سے جو دلائل پیش کیے ہیں، ان کا مقابلہ کرنے سے ایک بات بالکل واضح طور پر نظر کے سامنے آ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ معترضین مرتد کی سزا پر جتنے اعتراض کرتے ہیں، محض ایک "مذہب" کو نگاہ میں رکھ کر کرتے ہیں اور اس کے برعکس ہم اس سزا کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے جو دلائل دیتے ہیں، ان میں ہمارے پیش نظر مجرد "مذہب" نہیں ہوتا، بلکہ ایک ایسا سٹیٹ ہوتا ہے جو کسی خاندان یا طبقہ یا قوم کی حاکمیت کے بجائے ایک دین اور اس کے اصولوں کی حاکمیت پر تعمیر ہوا ہو۔

جہاں تک مجرد مذہب کا تعلق ہے، ہمارے اور معترضین کے درمیان اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ایسا مذہب مرتد کو سزا دینے کا حق نہیں رکھتا، جبکہ سوسائٹی کا نظم و نسق اور ریاست کا وجود عملاً اس کی بنیاد پر قائم نہ ہو۔ جہاں اور جن حالات میں اسلام فی الواقع ویسے ہی ایک مذہب کی حیثیت رکھتا ہے، جیسا کہ معترضین کا تصور مذہب ہے، وہاں ہم خود بھی مرتد کو سزائے موت دینے کے قائل نہیں ہیں۔ فقہ اسلامی کی رو سے محض ارتداد کی سزا ہی نہیں، اسلام کے تعزیری احکام میں سے کوئی حکم بھی ایسے حالات میں قابل نفاذ نہیں رہتا، جب کہ اسلامی ریاست (یا باصطلاح شرح "سلطان") موجود نہ ہو۔ لہٰذا مسئلہ کے اس پہلو میں ہمارے اور معترضین کے درمیان بحث خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

اب قابل بحث صرف دوسرا پہلو رہ جاتا ہے یعنی یہ کہ جہاں مذہب خود حاکم ہو، جہاں مذہبی قانون ہی ملکی قانون ہو اور جہاں مذہب ہی نے امن و انتظام کے برقرار رکھنے کی ذمے داری اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہو، آیا وہاں بھی مذہب ایسے لوگوں کو سزا دینے کا حق رکھتا ہے یا نہیں، جو اس کی اطاعت و وفاداری کا عہد کرنے کے بعد اس سے پھر جائیں؟ ہم اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔ کیا ہمارے معترضین کے پاس اس کا جواب نفی میں ہے؟ اگر نہیں تو اختلاف بالکل ہی دور ہو جاتا ہے اور اگر ہے تو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس پر انہیں کیا اعتراض ہے اور کیا ان کے دلائل ہیں؟

ریاست کا قانونی حق

یہ ایک الگ بحث ہے کہ آیا مذہبی ریاست بجائے خود صحیح ہے یا نہیں۔ چونکہ اہل مغرب کی اور پاپایانِ روم کی ایک المناک تاریخ ہے، جس کے زخم خوردہ ہونے کی وجہ سے وہ مذہبی ریاست کا نام سنتے ہی خوف سے لرز اٹھتے ہیں، اس لیے جب کبھی کسی ایسی چیز کے متعلق انہیں گفتگو کا اتفاق ہوتا ہے، جس پر "مذہبی ریاست" ہونے کا گمان کیا جا سکتا ہو (اگرچہ اس کی نوعیت پاپائی سے بالکل مختلف ہی کیوں نہ ہو) تو جذبات کا ہیجان ان کو اس قابل نہیں رہنے دیتا کہ بے چارے اس پر ٹھنڈے دل سے معقول گفتگو کر سکیں۔ رہے ان کے مشرقی شاگرد، تو اجتماعی و عمرانی مسائل پر ان کا سرمایہ علم جو کچھ بھی ہے، مغرب سے مانگے پر لیا ہوا ہے اور یہ اپنے استادوں سے صرف ان کی معلومات ہی ورثے میں حاصل نہیں کرتے، بلکہ میراث علمی کے ساتھ ساتھ ان کے جذبات، رجحانات اور تعصبات بھی لے لیتے ہیں، اس لیے قتل مرتد اور اس نوعیت کے دوسرے مسائل پر جب بحث کی جاتی ہے، تو خواہ اہل مغرب ہوں یا ان کے مشرقی شاگرد، بالعموم دونوں ہی اپنا توازن کھو دیتے ہیں اور اصل قانونی و دستوری سوال کو ان بحثوں میں الجھانے لگتے ہیں، جو مذہبی ریاست کے بذات خود صحیح یا غلط ہونے کی بحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ حالانکہ اگر بالفرض اسلامی ریاست انہی

معنوں میں ایک "مذہبی ریاست" ہو، جن معنوں میں اہل مغرب اسے لیتے ہیں، تب بھی اس مسئلہ میں یہ بحث بالکل غیر متعلق ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ جو ریاست کسی خطہ زمین پر حاکمیت رکھتی ہو، آیا وہ اپنے وجود کی حفاظت کے لیے ایسے افعال کو جرم قرار دینے کا حق رکھتی ہے یا نہیں، جو اس کے نظام کو درہم برہم کرنے والے ہوں۔ اس پر اگر کوئی معترض ہو تو وہ ہمیں بتائے کہ دنیا میں کب ریاست نے یہ حق استعمال نہیں کیا ہے؟ اور آج کون سی ریاست ایسی ہے جو اس حق کو استعمال نہیں کر رہی ہے؟ اشتراکی اور فاشسٹ ریاستوں کو چھوڑیئے، ان جمہوری ریاستوں ہی کو دیکھ لیجئے، جن کی تاریخ اور جن کے نظریات سے موجودہ زمانے کی دنیا نے جمہوریت کا سبق سیکھا ہے اور جن کو آج جمہوری نظام کی علمبرداری کا شرف حاصل ہے۔ کیا یہ اس حق کو استعمال نہیں کر رہی ہیں؟

انگلستان کی مثال

مثال کے طور پر انگلستان کو لیجئے۔ انگریزی قانون جن لوگوں سے بحث کرتا ہے، وہ دو بڑی قسموں پر تقسیم ہوتے ہیں: ایک برطانوی رعایا (British Subjects) دوسرے اغیار (Aliens) برطانوی رعایا کا اطلاق اولاً ان لوگوں پر ہوتا ہے جو برطانوی حدود کے اندر یا باہر ایسے باپوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہوں، جو شاہ برطانیہ کی اطاعت و وفاداری کے ملتزم ہوں۔ یہ فطرۃً پیدائشی رعایائے برطانیہ (Natural Born British Subjects) کہلاتے ہیں اور ان کو آپ سے آپ اطاعت و وفاداری کا ملتزم قرار دیا جاتا ہے، بغیر اس کے کہ انہوں نے بالارادہ شاہ برطانیہ کی وفاداری کا حلف لیا ہو۔ ثانیاً یہ لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو پہلے اغیار میں سے تھے اور پھر چند قانونی شرائط کی تکمیل کے بعد انہوں نے شاہ برطانیہ کی وفاداری کا حلف لے کر برطانوی رعایا ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا ہو۔ رہے اغیار تو اس سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو کسی دوسری قومیت سے تعلق رکھتے ہوں اور کسی دوسرے سٹیٹ کی وفاداری کے ملتزم ہوں مگر برطانوی مملکت کی حدود میں مقیم ہوں۔

ان مختلف قسم کے اشخاص کے متعلق انگریزی قانون کے حسب ذیل اصول قابل ملاحظہ ہیں:

1 - اغیار میں سے ہر شخص جو برطانوی رعایا ہونے کے لیے ضروری قانونی شرائط کی تکمیل کر چکا ہو، یہ اختیار رکھتا ہے کہ اپنی سابق قومیت ترک کر کے برطانوی قومیت میں داخل ہونے کی درخواست کرے۔ اس صورت میں سیکرٹری آف سٹیٹ اس کے حالات کی تحقیق کرنے کے بعد شاہ برطانیہ کی اطاعت و وفاداری کا حلف لے کر اسے برطانوی قومیت کا سرٹیفکیٹ عطا کر دے گا۔

2 - کوئی شخص خواہ پیدائشی رعایائے برطانیہ ہو، یا باختیار خود برطانوی رعایا میں داخل ہوا ہو، ازروئے قانون یہ حق نہیں رکھتا کہ مملکت برطانویہ کے حدود میں رہتے ہوئے کسی دوسری قومیت کو اختیار کرنے اور کسی دوسرے سٹیٹ کی وفاداری کا حلف اٹھائے، یا جس قومیت سے وہ پہلے تعلق رکھتا تھا، اس کی طرف پھر واپس چلا جائے۔ یہ حق اسے صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جبکہ وہ برطانوی حدود سے باہر مقیم ہو۔ دوہری قومیت کے بارے میں برطانیہ میں اب کچھ معمولی سی ترامیم ہوئی ہیں۔

3 - برطانوی حدود سے باہر مقیم ہونے کی صورت میں بھی رعایائے برطانیہ کا کوئی فرد (خواہ وہ پیدائشی رعیت ہو یا رعیت بن گیا ہو) یہ حق نہیں رکھتا کہ حالت جنگ میں برطانوی قومیت ترک کر کے کسی ایسی قوم کی قومیت اور کسی ایسے سٹیٹ کی وفاداری اختیار کرے، جو شاہ برطانیہ سے برسر جنگ ہو۔ یہ فعل برطانوی قانون کی رو سے غدر کبیر (High Treason) ہے، جس کی سزا موت ہے۔

4 - برطانوی رعایا میں سے جو شخص برطانوی حدود کے اندر یا باہر رہتے ہوئے بادشاہ کے دشمنوں سے تعلق رکھے اور ان کو مدد اور آسائش بہم پہنچائے یا کوئی ایسا فعل کرے جو بادشاہ کے دشمنوں کو تقویت پہنچانے والا یا بادشاہ اور ملک کی قوت حملہ و مدافعت کو کمزور کرنے والا ہو، وہ بھی غدر کبیر کا مرتکب ہے اور

اس کی سزا بھی موت ہے۔

5 - بادشاہ' ملکہ یا ولی عہد کی موت کے درپے ہونا یا اس کا تصور کرنا' بادشاہ کی رفیقہ یا اس کی بڑی بیٹی یا ولی عہد کی بیوی کو بے حرمت کرنا' بادشاہ کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرنا یا نشانہ تاکنا یا ہتھیار اس کے سامنے لانا' جس سے مقصود اس کو نقصان پہنچانا یا خوف زدہ کرنا ہو' سٹیٹ کے مذہب کو تبدیل کرنے یا سٹیٹ کے قوانین کو منسوخ کرنے کے لیے قوت استعمال کرنا' یہ سب افعال بھی غدر کبیر ہیں اور ان کا مرتکب بھی سزائے موت کا مستحق ہے۔

6 - بادشاہ کو اس کے منصب' اعزاز یا القاب سے محروم یا معزول کرنا بھی جرم ہے' جس کی سزا حبس دوام تک ہو سکتی ہے۔

ان سب امور میں بادشاہ سے مراد وہ شخص ہے جو بالفعل (De Facto) بادشاہ ہو' خواہ بالحق (De Jure) بادشاہ ہو یا نہ ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ قوانین کسی جذباتی بنیاد پر مبنی نہیں ہیں' بلکہ اس اصول پر مبنی ہیں کہ قائم شدہ ریاست' جس کے قیام پر ایک خطہ زمین میں سوسائٹی کے نظم کا قیام منحصر ہو' اپنے اجزائے ترکیبی کو انتشار سے بہ جبر روکنے اور اپنے نظام کو خرابی سے بچانے کے لیے طاقت کے استعمال کا حق رکھتی ہے۔

اب دیکھیے کہ برطانوی قانون جنہیں "اغیار" کہتا ہے' ان کی حیثیت تھوڑے سے فرق کے ساتھ وہی ہے جو اسلامی قانون میں ان لوگوں کی حیثیت ہے' جو "ذمی" کہلاتے ہیں۔ جس طرح "برطانوی رعایا" کا اطلاق پیدائشی اور اختیاری رعایا پر ہوتا ہے' اسی طرح اسلام میں بھی "مسلمان" کا اطلاق دو قسم کے لوگوں پر ہوتا ہے: ایک وہ جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے' دوسرے وہ جو غیر مسلموں میں سے باختیار خود اسلام قبول کر لیں۔ "برطانوی قانون" بادشاہ اور شاہی خاندان کو صاحب حاکمیت ہونے کی حیثیت سے جو مقام دیتا ہے' اسلامی قانون وہی حیثیت خدا اور اس کے رسول کو دیتا ہے۔ پھر جس طرح برطانوی قانون' برطانوی رعایا اور اغیار کے حقوق و واجبات میں فرق کرتا ہے' اسی طرح اسلام بھی مسلم اور ذمی کے حقوق و واجبات میں

فرق کرتا ہے۔ جس طرح برطانوی قانون' برطانوی رعایا میں سے کسی شخص کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ حدود مملکت برطانیہ میں رہتے ہوئے کسی دوسری قومیت کو اختیار کرے اور کسی دوسرے سٹیٹ کی وفاداری کا حلف اٹھائے یا اپنی سابق قومیت کی طرف پلٹ جائے' اسی طرح اسلامی قانون بھی کسی مسلم کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ دارالاسلام کے اندر رہتے ہوئے کوئی دوسرا دین اختیار کرے یا اس دین کی طرف پلٹ جائے جسے ترک کر کے وہ دین اسلام میں آیا تھا۔ جس طرح برطانوی قانون کی رو سے برطانوی رعایا کا وہ فرد سزائے موت کا مستحق ہے' جو برطانوی حدود کے باہر رہتے ہوئے شاہ برطانیہ کے دشمنوں کی قومیت اختیار کر لے اور کسی دشمن سلطنت کی وفاداری کا حلف اٹھائے' اسی طرح اسلامی قانون کی رو سے وہ مسلمان بھی سزائے موت کا مستحق ہے' جو دارالاسلام کے باہر رہتے ہوئے حربی کافروں کا دین اختیار کر لے اور جس طرح برطانوی قانون ان لوگوں کو "اغیار" کے سے حقوق دینے کے لیے تیار ہے' جنہوں نے برطانوی قومیت چھوڑ کر کسی برسر صلح قوم کی قومیت اختیار کر لی ہو' اسی طرح اسلامی قانون بھی ایسے مرتدین کے ساتھ معاہد قوم کے کافروں کا سا معاملہ کرتا ہے' جو دارالاسلام سے نکل کر کسی ایسی کافر قوم سے جا ملے ہوں' جس سے اسلامی حکومت کا معاہدہ ہو۔ اب یہ ہمارے لیے ایک ناقابل حل معما ہے کہ جن لوگوں کی سمجھ میں اسلامی قانون کی پوزیشن نہیں آتی' ان کی سمجھ میں برطانوی قانون کی پوزیشن کیسے آ جاتی ہے۔

امریکہ کی مثال

برطانیہ کے بعد اب دنیا کے دوسرے علمبردار جمہوریت ملک امریکہ کو لیجیے۔ اس کے قوانین اگرچہ تفصیلات میں کسی حد تک برطانیہ سے مختلف ہیں' لیکن اصول میں وہ بھی اس کے ساتھ پوری موافقت رکھتے ہیں۔ فرق بس یہ ہے کہ یہاں جو مقام بادشاہ کو دیا گیا ہے' وہاں وہی مقام ممالک متحدہ کی قومی حاکمیت اور وفاقی دستور کو دیا گیا ہے۔ ممالک متحدہ کا پیدائشی شہری ہر وہ شخص ہے' جو شہری کی اولاد سے پیدا ہوا

ہو، خواہ ممالک متحدہ کے حدود میں پیدا ہوا ہو یا ان سے باہر اور اختیار شہری ہر وہ شخص ہو سکتا ہے، جو چند قانونی شرائط کی تکمیل کے بعد دستور ممالک متحدہ کے اصولوں کی وفاداری کا حلف اٹھائے۔ ان دونوں قسم کے شہریوں کے ماسوا باقی سب لوگ امریکی قانون کی نگاہ میں "غیر" ہیں۔ شہری اور اغیار کے حقوق و واجبات کے درمیان امریکی قانون وہی فرق کرتا ہے، جو برطانوی قانون "رعیت" اور "اغیار" کے حقوق و واجبات میں کرتا ہے۔ ایک غیر شخص شہریت کی قانونی شرطیں پوری کرنے کے بعد ممالک متحدہ کا شہری بن جانے میں تو آزاد ہے مگر شہری بن جانے کے بعد پھر اسے یہ آزادی حاصل نہیں رہتی کہ ممالک متحدہ کے حدود میں رہتے ہوئے وہ اس شہریت کو ترک کر کے پھر اپنی سابق قومیت کی طرف پلٹ جائے۔ اسی طرح کسی پیدائشی شہری کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ ممالک متحدہ کے حدود میں کسی دوسری قومیت کو اختیار کرے اور کسی دوسرے سٹیٹ کی وفاداری کا حلف اٹھالے۔ علیٰ ہذا القیاس شہریوں کے لیے غدر اور بغاوت قوانین ممالک متحدہ میں بھی انہی اصولوں پر مبنی ہیں، جن پر برطانوی قوانین غدر و بغاوت کی اساس رکھی گئی ہے۔ (اگرچہ کہ مولانا کے اس مضمون کے بعد امریکہ کے قانون شہریت میں معمولی ترامیم ہوئی ہیں لیکن اسٹیٹ سے غداری کی سزا وہی سزائے موت برقرار ہے۔ (مولف)

اور یہ کچھ انہی دونوں سلطنتوں پر موقوف نہیں ہے بلکہ دنیا کے جس ملک کا قانون بھی آپ اٹھا کر دیکھیں گے، وہاں آپ کو یہی اصول کام کرتا نظر آئے گا کہ ایک سٹیٹ جن عناصر کے اجتماع سے تعمیر ہوتا ہے، ان کو وہ منتشر ہونے سے بزور روکتا ہے اور ہر اس چیز کو طاقت سے دباتا ہے، جو اس کے نظام کو درہم برہم کرنے کا رجحان رکھتی ہو۔

ریاست کا فطری حق

یہ ایک جداگانہ بحث ہے کہ ایک سٹیٹ کا وجود بجائے خود جائز ہے یا نہیں۔ اس معاملہ میں ہمارا اور دنیوی ریاستوں (Secular State) کے حامیوں کا نقطہ نظر

بالکل مختلف ہے۔ ہمارے نزدیک خدا کی حاکمیت کے سوا ہر دوسری حاکمیت پر ریاست کی تعمیر سرے سے ناجائز ہے، اس لیے جو ریاست بجائے خود ناجائز بنیاد پر قائم ہو، اس کے لیے ہم اس بات کو جائز تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ اپنے ناجائز وجود اور غلط نظام کی حفاظت کے لیے قوت استعمال کرے۔ اس کے برعکس ہمارے مخالفین الٰہی ریاست کو ناجائز اور صرف دنیوی ریاست ہی کو جائز سمجھتے ہیں، اس لیے ان کے نزدیک دنیوی ریاست کا اپنے وجود نظام کی حفاظت میں جبر سے کام لینا عین حق اور الٰہی ریاست کا یہی فعل کرنا عین باطل ہے۔ لیکن اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ قاعدہ اپنی جگہ عالمگیر مقبولیت رکھتا ہے کہ ریاست اور حاکمیت کی عین فطرت اس امر کی مقتضی ہے کہ اسے اپنے وجود اور اپنے نظام کی حفاظت کے لیے جبر اور قوت کے استعمال کا حق حاصل ہو۔ یہ حق ریاست من حیث الریاست کا ذاتی حق (Inherent Right) ہے اور اگر کوئی چیز اس حق کو باطل بنا سکتی ہے، تو وہ صرف یہ ہے کہ جو ریاست اس حق سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہو، وہ آپ ہی باطل پر قائم ہوئی ہو۔ اس لیے کہ باطل کا وجود بجائے خود ایک جرم ہے اور اگر وہ اپنے قیام و بقا کے لیے طاقت سے کام لیتا ہے تو یہ شدید تر جرم ہو جاتا ہے۔

کافر اور مرتد کے ساتھ مختلف معاملہ کیوں ہے؟

یہاں پہنچ کر ایک عام آدمی کے ذہن میں یہ سوال الجھن پیدا کرنے لگتا ہے کہ ابتداءً کافر ہونے اور اسلام سے مرتد ہو کر کافر بن جانے میں آخر کیا فرق ہے؟ وہ پوچھتا ہے کہ جو قانون ایک شخص کے ابتداءً کافر ہونے کو برداشت کر لیتا ہے اور اسے اپنے حدود میں امن کی جگہ عطا کرتا ہے، وہ آخر اسی شخص کے اسلام میں داخل ہونے کے بعد پھر کافر ہو جانے کو یا ایک پیدائشی مسلمان کے کفر اختیار کر لینے کو کیوں برداشت نہیں کرتا؟ پہلی قسم کے کافر کا کفر اس دوسری قسم کے کافر کے کفر سے اصولاً کیا اختلاف رکھتا ہے کہ وہ تو قانون کی نگاہ میں مجرم نہ ہو اور یہ مجرم ہو۔ اس کو ذمی بنا کر اس کی جان و مال کی حفاظت کی جائے اور اسے زندگی کے جملہ حقوق

سے محروم کرکے دار پر چڑھا دیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نہ ملنے والے اور مل کر الگ ہو جانے والے کے انسانی فطرت لازماً فرق کرتی ہے۔ نہ ملنا تلخی' نفرت اور عداوت کو مستلزم ہے' مگر مل کر الگ ہو جانا قریب قریب سو فی صدی حالات میں ان جذبات کو مستلزم ہے۔ نہ ملنے والا کبھی ان فتنوں کا موجب نہیں بن سکتا' جن کا موجب مل کر الگ ہو جانے والا بنتا ہے۔ نہ ملنے والے کے ساتھ آپ تعاون' دوستی' وفاداری' لین دین' شادی بیاہ اور بے شمار قسم کے تمدنی و اخلاقی رشتے قائم نہیں کرتے' جو ملنے والے کے ملاپ پر اعتماد کرکے اس کے ساتھ قائم کر لیتے ہیں۔ اس لیے نہ ملنے والا کبھی ان نقصانات کا سبب نہیں بن سکتا' جن کا موجب مل کر الگ ہو جانے والا بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نہ ملنے والوں کی بہ نسبت ان لوگوں کے ساتھ فطرۃً بالکل دوسری ہی قسم کا برتاؤ کرتا ہے' جو مل کر الگ ہو جاتے ہیں۔ انفرادی زندگی میں اتصال کے بعد افتراق کا نتیجہ محدود ہوتا ہے' اس لیے عموماً کشیدگی تک پہنچ کر رہ جاتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں یہ چیز زیادہ بڑے پیمانے پر نقصان کی موجب ہوتی ہے' اس لیے فرد کے خلاف جماعت کی کارروائی بھی زیادہ سخت ہوتی ہے اور جہاں الگ ہونے والا کوئی فرد واحد نہیں بلکہ کوئی بڑا گروہ ہوتا ہے' وہاں نقصان کا پیمانہ بہت بڑھ جاتا ہے' اس لیے اس کا نتیجہ لازماً جنگ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

جو لوگ اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ کافر اور مرتد کے ساتھ اسلام دو مختلف رویے کیوں اختیار کرتا ہے' انہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ دنیا میں کوئی اجتماعی نظام ایسا نہیں ہے جو اپنے اندر شامل نہ ہونے والوں اور شامل ہو کر الگ ہو جانے والوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتا ہو۔ الگ ہونے والوں کو اکثر کسی نہ کسی نوعیت کی سزا ضرور دی جاتی ہے اور بارہا ان کو واپس آنے پر مجبور بھی کیا جاتا ہے۔ خصوصاً جو نظام جتنی زیادہ اہم اجتماعی ذمہ داریوں کا حامل ہو' اس کا رویہ اس معاملہ میں اتنا ہی زیادہ سخت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر فوج کو لیجیے۔ قریب قریب تمام دنیا کے فوجی قوانین میں یہ بات مشترک ہے کہ فوجی ملازمت اختیار کرنے پر تو کسی کو مجبور نہیں کیا

جا سکتا، مگر جو شخص باختیار خود فوجی ملازمت میں داخل ہوچکا ہو، اسے ملازمت میں رہنے پر لازماً مجبور کیا جاتا ہے۔ وہ استعفا دے تو ناقابل قبول ہے، خود چھوڑ جائے تو مجرم ہے۔ جنگ کی عملی خدمت (Active Service) سے فرار ہو تو سزائے موت کا مستحق ہے۔ عام فوجی خدمات سے بھاگے، تو حبس دوام تک سزا پا سکتا ہے اور جو کوئی اس بھاگنے والے کو پناہ دے یا اس کے جرم پر پردہ ڈالے، تو وہ بھی مجرم ٹھہرتا ہے۔ یہی طرز عمل انقلابی پارٹیاں اختیار کرتی ہیں۔ وہ بھی کسی کو اپنے اندر شامل ہونے پر مجبور نہیں کرتیں، مگر جو شامل ہو کر الگ ہو جائے اسے گولی مار دیتی ہیں۔

یہ معاملہ تو فرد اور جماعت کے درمیان ہے اور جہاں جماعت اور جماعت کے درمیان یہ صورت پیش آتی ہے، وہاں اس سے زیادہ شدید معاملہ کیا جاتا ہے۔ وفاق (Federation) اور تحالف (Confederacy) کے متعلق اکثر آپ نے سنا ہوگا کہ جو ریاستیں اس قسم کے اتحاد میں شریک ہوتی ہیں، ان کو شریک ہونے یا نہ ہونے کا اختیار تو دیا جاتا ہے مگر شریک ہوچکنے کے بعد الگ ہو جانے کا دروازہ ازروئے دستور بند کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ جہاں دستور میں اس قسم کی کوئی تصریح نہیں ہوتی، وہاں بھی علیحدگی کے حق کا استعمال اکثر جنگ تک نوبت پہنچا دیتا ہے۔ انیسویں صدی میں دو لڑائیاں اسی مسئلہ پر ہوچکی ہیں۔ پہلی لڑائی سوئزرلینڈ میں ہوئی جبکہ 1847ء میں سات رومن کیتھولک ریاستوں نے کانفیڈریسی سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس پر کانفیڈریسی کے باقی شرکاء ان الگ ہونے والی ریاستوں سے برسرپیکار ہوگئے اور انہوں نے لڑ کر انہیں مجبور کیا کہ پھر ان کی وفاقی ریاست میں شامل ہو جائیں۔ دوسری لڑائی امریکہ کی خانہ جنگی (American Civil War) کے نام سے مشہور ہے۔ 1860ء میں ممالک متحدہ امریکہ کے اتحاد سے سات ریاستیں الگ ہوگئیں اور انہوں نے اپنا علیحدہ تحالف قائم کرلیا۔ بعد میں چار مزید ریاستیں الگ ہو کر اس جتھے میں آ ملیں۔ نیز چھ ریاستوں کی رائے عام یہ تھی کہ اصولاً ہر ریاست کو الگ ہو جانے کا حق حاصل ہے اور وفاقی حکومت کو یہ حق نہیں ہے کہ انہیں زبردستی ممالک متحدہ کے وفاق میں واپس آنے پر مجبور کرے۔ اس پر 1861ء میں وفاقی حکومت نے

ان ریاستوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور تین چار سال کی شدید خونریزی کے بعد انہیں پھر اتحاد میں شریک ہونے پر مجبور کر دیا۔

افتراق بعد اتصال کے خلاف بالعموم تمام اجتماعی نظام اور بالخصوص سیاسی و فوجی نوعیت کے نظام یہ سخت کارروائی کیوں کرتے ہیں؟ اس کے حق میں قوی ترین دلیل یہ ہے کہ جماعتی نظم اپنی کامیابی کے لیے فطرۃً استحکام کا مقتضی ہوتا ہے اور یہ استحکام سراسر اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ جن عناصر کے ملاپ سے یہ نظم وجود میں آیا ہو' ان کے ملاپ پر زیادہ سے زیادہ اعتماد کیا جا سکے۔ ناقابل اعتماد' متزلزل اور انتشار پذیر عناصر کا اجتماع' جس کے قائم رہنے پر بھروسہ نہ کیا جا سکے اور جس کے ثابت قدم رہنے کا تیقن نہ ہو' کبھی کوئی صحیح قسم کی جماعتی زندگی پیدا نہیں کر سکتا۔ خصوصاً جو اجتماعی ادارہ تمدن کی اہم خدمات کا بار اٹھانے والا ہو' وہ تو کبھی اس خطرے کو مول لینے پر آمادہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کی ترکیب ایسے اجزا سے ہو' جو ہر وقت پارہ پارہ ہو سکتے ہوں۔ انتشار پذیر اینٹوں اور پتھروں سے بنی ہوئی عمارت ویسے بھی انسانی سکونت کے لیے کوئی قابل اطمینان چیز نہیں ہوتی' کجا کہ ایک قلعہ' جس پر ایک پورے ملک کے امن کا انحصار ہو' ایسے بکھر جانے والے اجزا سے بنا ڈالا جائے۔ تفریحی انجمنیں' جن کی حیثیت بچوں کے گھروندوں سے زیادہ نہ ہو' افراد کی شخصی آزادی کو اپنے جماعتی وجود کے مقابلے میں ضرور ترجیح دے سکتی ہیں' لیکن کسی بڑے جماعتی مقصد کے لیے جان جوکھوں کا کھیل کھیلنے والے ادارے اس کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ریاست اور فوج اور وہ پارٹیاں' جو سنجیدگی کے ساتھ کسی اہم اجتماعی نصب العین کی خدمت کا پرخطر کام کرنے کے لیے بنی ہوں اور اسی نوعیت کے دوسرے نظام اس امر پر قطعی مجبور ہیں کہ واپس جانے والوں کے لیے اپنے دروازے بند کر دیں اور اپنے اجزائے ترکیبی کو منتشر ہونے سے باز رکھیں۔ مستحکم اور قابل اعتماد اجزاء حاصل کرنے کا اس سے زیادہ کامیاب ذریعہ اور کوئی نہیں ہے کہ آنے والے کو پہلے ہی آگاہ کر دیا جائے کہ یہاں سے جانے کا نتیجہ موت ہے' کیونکہ اس طرح کمزور قوت فیصلہ رکھنے والے لوگ خود ہی اندر آنے سے باز رہیں

گے۔ اسی طرح موجودہ اجزاء کو بکھرنے سے باز رکھنے کا بھی قوی ترین ذریعہ یہی ہے کہ جو اجزاء بکھرنے پر اصرار کریں، انہیں کچل ڈالا جائے تاکہ جہاں جہاں علیحدگی کے میلانات پرورش پا رہے ہوں، وہاں ان کا خودبخود قلع قمع ہو جائے۔

البتہ یہاں اس حقیقت کو پھر ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جماعتی نظم کے لیے اس تدبیر کو صحیح قرار دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر جماعتی نظم کے لیے اس تدبیر کا استعمال برحق ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ بجائے خود صالح ہو یا فاسد۔ یہ چیز حق صرف اس جماعتی نظم کے لیے ہے جو اپنی ذات میں صالح ہو۔ رہا ایک فاسد نظام، تو جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، اس کا وجود بجائے خود ایک ظلم ہے اور اگر وہ اپنے اجزاء کو سمٹائے رکھنے کے لیے جابرانہ قوت استعمال کرے، تو یہ اس سے زیادہ بڑا ظلم ہے۔

بقیہ : اسلام کا معاشرتی نظام

جب تک مرد کم از کم دو گواہوں کی موجودگی میں کسی عورت کے نان نفقہ اور عزت و آبرو کی پوری ذمہ داری قبول کر کے اس کو اپنی وراثت تک میں حقدار تسلیم نہ کر لے عورت اس کو کسی سطح پر جنسی لذت فراہم نہ کرے۔ یہی فرق ہے زنا اور نکاح میں۔ نکاح مرد کو ذمہ دار بناتا ہے جبکہ مرد زنا کے ذریعے ذمہ داری سے فرار چاہتا ہے۔

ان گزارشات کی روشنی میں غور کیا جائے تو صاف معلوم ہو گا کہ ستر و حجاب یعنی پردے کے احکام اصلاً پابندی ہیں مرد پر، لیکن ذریعہ ہیں عورت کی حفاظت کا۔

وَآخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن

☆☆☆☆☆☆☆☆

تذکیر و موعظت

چراغِ طور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے!

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

تخلیقِ آدم علیہ السلام کے وقت سے انسان اور شیطان کے درمیان کشمکش جاری ہے۔ شیطان نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے دھتکارے جانے کے موقع پر اللہ تعالیٰ کے حضور اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ میں تیرے بندوں کو تیری راہ سے بھٹکاؤں گا۔ وہ اُس وقت سے اس کام میں لگا ہوا ہے اور تاقیامِ قیامت لگا رہے گا۔ انسان کے جسدِ خاکی میں روحِ ربانی کے وجود نے اگرچہ انسان کو شیطانی اغواء سے بڑی حد تک محفوظ رکھا ہوا ہے' تاہم اسے قدم قدم پر دنیا کی زیب و زینت سے واسطہ پڑتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے اپنے وجود میں وہ نفس موجود ہے جسے نفسِ امارہ کا نام دیا گیا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی "اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ"۔ یعنی نفسِ امارہ شیطان کے حملوں میں اس کا بڑا ممد و معاون ہے۔ اور کیوں نہ ہو کہ شیطان کو شیطان بنانے میں اس کے نفسِ امارہ ہی کو دخل تھا' جس نے اسے یہ سوچنے پر اکسایا تھا کہ ناری مخلوق خاکی مخلوق کی بالادستی کس طرح قبول کر سکتی ہے۔ قرآن حکیم میں اس کے الفاظ نقل ہوئے ہیں کہ "خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ"۔ گویا کہ شیطان سے بھی بڑا شیطان خود انسان کا اپنا نفس ہے جو اسے برائی پر اکسا کر اس کے قدموں میں لغزش پیدا کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو شیطانی حملوں سے بچانے کا بڑا اہتمام کیا ہوا ہے۔ اس نے انسان کے اندر بھلے اور برے کی تمیز پیدا کر دی ہے۔ بالفاظِ قرآنی "فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا" یعنی ہر نفس کو خوب معلوم ہے کہ اچھائی کیا ہے اور برائی کیا۔ اچھی شے کون سی ہے اور بری شے کون سی۔ لیکن خالق کائنات نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ آسمانی ہدایت کی ترسیل کا اہتمام صحیفوں اور کتابوں کی صورت میں فرمایا' جیسا کہ اس نے

ہبوطِ آدمؑ کے موقع پر فرمایا تھا "فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ"۔ مزید یہ کہ آسمانی ہدایت پر عملی رہنمائی کے لئے رسولوں کو مبعوث فرمایا، جنہوں نے قوانین شریعہ پر عمل کرکے لوگوں پر حجت قائم کردی۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ایک قول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ملتا ہے کہ "كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن"۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ پر نہ صرف نبوت کا اختتام ہوا بلکہ رسالت کی بھی تکمیل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اعلان فرمادیا "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا"۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد اب یہ امتِ مسلمہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس کتاب الہدیٰ پر عمل پیرا ہو کر پوری دنیا پر حجت قائم کرتی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی کے مطابق کہ نبی کی رحلت کے بعد ان کے حواری و اصحاب اپنے نبی کی سنت کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں، خلفاء راشدین و مہدیین، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین و تبع تابعین رحمہم اللہ نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مضبوطی سے تھامے رکھا جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ "خَيْرُ الْقُرُونِ قَرْنِي ثم الذين يَلُونهم ثم الذين يَلُونهم"۔ لیکن بعد میں جیسا کہ ہوتا ہے، ہم جیسے ناخلف لوگ پیدا ہوئے اور ہمارا حال بھی یہی ہے کہ ہم کہتے وہ ہیں جو کرتے نہیں اور کرتے وہ ہیں جس کا ہمیں حکم نہیں دیا گیا۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کو امتِ مسلمہ نے ترک کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بتدریج خیر کی قوتیں کمزور پڑتی گئیں اور معاشرے پر شر کا غلبہ ہوتا چلا گیا۔ حالت یہ ہوگئی ہے کہ دیندار طبقہ میں بھی شر کا نفوذ ہوگیا ہے۔ فرقہ واریت کی "ہُو" نے سب کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ بقول اقبال۔

کیا امامانِ سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہُوا

وطنِ عزیز میں علاقائی، لسانی اور قومیتوں کی بنیاد پر فرقہ واریت کی قیادت اگر "امامانِ سیاست" کے ہاتھوں میں ہے تو مذہبی فرقہ واریت کی باگ ڈور "کلیسا کے شیوخ"

نے تھام رکھی ہے اور کیفیت یہ ہے کہ "نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"۔ یہی تو وجہ ہے کہ مسجدوں اور امام بارگاہوں پر حملوں میں کبھی شرپسندوں کو ملوث پایا جاتا ہے تو کبھی "را" کے ایجنٹوں کو۔ پہلے گلی کوچوں میں لوگوں کا خون بہتا تھا تو اب عبادت گاہوں کی دیواروں پر خونِ مسلم کے چھینٹے پڑ رہے ہیں۔ ہم ہیں کہ رات دن دعاؤں میں مصروف ہیں لیکن ہماری دعاؤں میں کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ اور اثر کیسے باقی رہتا جبکہ الصادق والمصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ اگر تم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ترک کیا تو تمہاری دعاؤں میں کوئی اثر باقی نہیں رہے گا۔ جب حضور ﷺ نے یہ فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ترک کر دو گے تو اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے حیرانی سے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ ہم نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا چھوڑ دیں گے؟ اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا کہ یہی نہیں ہو گا بلکہ ایک وقت ایسا آئے گا جب تم نیکی سے روکو گے اور برائی کا حکم دو گے۔ آج واقعتاً ہم اس انتہا کو پہنچ چکے ہیں، جس کی خبر حضور ﷺ نے دی تھی۔

ایک دوسری حدیث میں حضور ﷺ نے امتِ مسلمہ پر دوسری قوموں کے غلبہ کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ تم میں ایک بیماری پیدا ہو گی جس کا نام "وَھن" ہے۔ صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ "وَھن" کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "وَھن" یہ ہے کہ تمہارے اندر دنیا کی محبت اور موت سے کراہت پیدا ہو جائے گی۔ آج ہم میں حقوق کی جنگ کس وجہ سے برپا ہے؟ اس کی وجہ حُبِ دنیا ہے، جس کے نتیجے میں لوگوں کے حقوق غصب ہوئے۔ یہ رشوتیں، یہ چور بازاریاں، یہ ظلم و ستم آخر حُبِ دنیا ہی کا تو نتیجہ ہیں۔ آج ذرا ہم اپنا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ ہمارے تمام ذرائع ابلاغ بشمول اخبارات، رسائل، ریڈیو اور ٹی وی شر کی تبلیغ میں مصروف ہیں اور ماحول کچھ ایسا بن کر رہ گیا ہے کہ خیر کی بات کرنی دشوار ہے۔ دنیا میں ہم اربوں کی تعداد میں ہیں، لیکن ذلت و رسوائی ہمارا مقدر بن کر رہ گئی ہے۔ مسلمان دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں تو تنگ ہیں ہی غضب تو یہ ہے کہ خود مسلمان مسلمان کی جان و مال اور عزت و آبرو کے درپے ہے۔ دینی غیرت نام کی کوئی شے ہم میں نہیں رہ گئی۔ اگر ہماری بستیوں کو خود ہم پر الٹ نہیں دیا جاتا تو یہ اس ربّ

ذوالجلال کا کرم خاص ہے۔۔ اس نے اپنے لطف و کرم سے ہمیں آزادی کی نعمت اور پاکستان جیسا وطن عطا کیا لیکن ہم ہیں کہ خود اپنے ہاتھوں اس عظیم مملکت کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپے ہیں۔

ہمیں بگڑتے ہوئے حالات سے نبرد آزما ہو کر اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو بحال کرنا پڑے گا اور یہ ناممکن نہیں۔ یہ منزل صرف اس طرح حاصل کی جاسکتی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص یہ طے کرلے کہ کم از کم اپنے دائرۂ اختیار میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کو حتی الامکان ادا کرنے کی کوشش کرے گا۔ البتہ اس کے لئے بڑی عزیمت درکار ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہم دنیوی مقاصد کے حصول کے لئے عزیمت کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ اگر چند روزہ زندگی کی بہار کے لئے عزیمت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں تو سوچئے کہ اُس زندگی کی بہتری کے لئے جو ابد الآباد تک قائم رہنے والی ہے' عزیمت کا مظاہرہ نہیں کر سکتے؟ آیئے ہم آج عہد کریں کہ سب سے پہلے ہم اپنے نفسِ امارہ کے خلاف نہی عن المنکر کا علم بلند کریں گے۔ ہم اس کی کسی بھی برائی کی ترغیب کو خاطر میں نہیں لائیں گے۔ جب تک ہم یہ نہیں کریں گے' ہم اپنے گھر والوں کو اس کی چال سے نہیں بچا سکیں گے۔ اس کے بعد ہم اپنے افرادِ خانہ اور حلقہ احباب میں موجود برائیوں کو اپنا ہدف بنائیں گے اور خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ انہیں اس پر آمادہ کریں گے کہ وہ اپنے نفس کے حملوں سے ہوشیار رہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ "ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ" والا معاملہ ہے لیکن صبر اور نماز کی مدد سے ہم اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن نماز کو اس طرح پڑھنے کے لئے کہ اس کا حق ادا ہو جائے ہمیں قرآن کریم کے حقوق کی ادائیگی کی فکر کرنی پڑے گی۔ قرآن کو محض ایک الہامی اور مقدس کتاب ہی نہیں بلکہ اسے اپنا ہادی و رہنما بنانا پڑے گا۔ اس کی تلاوت اس کے احکامات کی پیروی کی نیت سے کرنی ہوگی۔ اس کا فہم حاصل کرنا پڑے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن کریم کے پیغام کو عام کرنا پڑے گا۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو گئے تو معاشرے میں برائیوں کے خاتمہ کے لئے راہ ہموار ہو سکے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فکر و عمل کو درست کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ OO

(مرسلہ : محمد سمیع' کراچی)

"شاکلہ"

نجیب صدیقی

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ۝ (الاسراء:۸۴)

"(اے نبی ﷺ) کہہ دیجئے' ہر ایک اپنی شاکلہ پر عمل کرتا ہے۔ پھر تیرا رب ہی خوب جانتا ہے کہ کون سیدھی راہ پر ہے"۔

شاکلہ شکل کو کہتے ہیں' اس "پیٹرن" کو کہتے ہیں جسے انسان اپنے تصور' اپنی سوچ اور اپنی فکر کے نتیجے میں بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ایک کا شاکلہ مختلف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی ذہن کو کچھ اس طرح بنایا ہے کہ وہ خود سوچتا ہے اور فیصلے کرتا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اجی میں تو سوچتا ہی نہیں' وہ بھی سوچتے ہیں۔ وہ جو بھی فیصلہ کرتے ہیں وہ کسی نہ کسی سوچ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ انسان کی سوچ میں تغیر آتا رہتا ہے۔ وہ ماحول سے بھی اخذ کرتا ہے۔ تجربہ بھی اسے سکھاتا ہے۔ بعض سچائیاں اسے مجبور کرتی ہیں۔ بعض حادثات اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس طرح سوچ کے ساتھ اس کا شاکلہ بھی بدلتا رہتا ہے۔ یہ تغیّر و تبدّل ہر آن جاری ہے۔ یہ معاملہ بھی ایسا ہی ہے جس پر انسان کو قدرت نہیں۔ وہ یہ چاہے کہ میں نہ سوچوں مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہر آن بدلنے والا زمانہ' وقت کی تیز رفتاری اور خود اس کے اپنے اندر ہر آن تبدیلی' اس کے خیالات کو ادلنے بدلنے پر مجبور کرتی ہے۔

ثبات اِک تغیّر کو ہے زمانے میں
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

ہر انسان ایک شاکلہ بناتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کے الفاظ سے بھی ظاہر ہے اور جس کا مشاہدہ ہم دن رات اپنے اندر اور باہر کر رہے ہیں۔ اکثر گفتگو میں آپ سنتے ہوں گے کہ ہماری زندگی کا "ایم" (aim) یہ ہے' ہماری زندگی کا اصل ہدف

یہ ہے' میں نے تو یہ طے کر رکھا ہے کہ تعلیم حاصل کروں گا اور ڈاکٹر بنوں گا۔ کسی کو انجینئر بننے کی دھن سوار ہے۔ اسی طرح ہر انسان اپنا آئیڈیل مقرر کرتا ہے اور اس کے حصول کی جدّوجہد میں لگ جاتا ہے۔ یہ "ایم"، "ہدف" یا "آئیڈیل" یہی تو شاکلہ ہے۔ انسان اس شاکلہ میں رنگ بھرتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک دن قدرت اسے اس کے شاکلہ سمیت اپنے پاس بلالیتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے ﴿وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ﴾ "اور حاصل کرلیا جائے گا جو کچھ ان کے سینوں میں ہے"۔ اور وہ یہی شاکلہ ہے جو اس کے سینے میں سے حاصل کرلیا گیا۔

یہ تو تھا ہمارا اپنا بنایا ہوا شاکلہ' ہمارا اپنا آئیڈیل' مگر قرآن مجید نے کیا شاکلہ دیا ہے' آیئے ذرا اس پر غور کریں۔ جس رب نے ہمیں پیدا کیا اس سے یہ بعید تر بات تھی کہ وہ ہمیں کوئی شاکلہ دیئے بغیر دنیا میں بھیج دیتا۔ اگر ایسا ہوتا تو جزا و سزا عدل کے خلاف تھی۔ لہٰذا اس نے نوعِ انسانی کو دنیا میں بھیجنے کے ساتھ اس کی ہدایت کا بندوبست کیا۔ گویا کہ اس نے حیات کے ساتھ ایک شاکلہ بھی مرحمت فرمایا۔ سورۃ الحجرات میں ارشاد ہوتا ہے :

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى﴾ یعنی "اے لوگو! ہم نے تم کو ایک نر اور ایک مادہ سے پیدا کیا"۔ دوسرے مقامات پر وہ پیدائش کے مختلف مراحل بیان کرتا ہے تاکہ تمہاری اصل حقیقت تمہارے سامنے رہے۔۔۔۔ پھر وہ کہتا ہے کہ تم محتاج تھے' ہم نے تمہاری احتیاج دور کی' تم ہدایت کے متلاشی تھے' ہم نے وہ ہدایت بھی عطا کی۔ ہدایت کے دو پہلو یا دو رخ ہو سکتے ہیں' ایک نظری ہدایت اور دوسری عملی ہدایت۔ نظری ہدایت میں اصول و قوانین' حدود' عقیدہ جس میں توحید' آخرت وغیرہ تمام تفصیلات ہیں۔ دوسری عملی ہدایت' جس میں بندگی کے اظہار کی شکل' نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' جہاد' قتال' معاملات' صلح و جنگ' بیع و شراء وغیرہ ہے۔ گویا ایک اسکیچ ہے' جس میں رنگ بھرا گیا ہے۔ قرآن مجید کا یہ شاکلہ ہے۔

اگر ہدایت کے لئے صرف کتاب نازل ہو جاتی تو اگرچہ یہ بھی کافی ہوتی اور نوعِ انسانی پر حجت بن سکتی تھی مگر انسانوں کے پاس ایک اعتراض ہوتا کہ اس پر ہم کس طرح عمل کرسکتے تھے۔ ہمیں تو کسی نے عمل کرکے دکھایا ہی نہیں۔ اس ہونے والے اعتراض کا

جواب پہلے ہی دے دیا گیا۔ انسانوں میں ہی سے حضرات انبیاء کرام آتے رہے اور ہدایت پر عمل کر کے دکھاتے رہے تاکہ نوع انسانی پر حجت کی تکمیل ہو سکے۔ دنیا کے لئے آخری ہدایت کے ساتھ آخری پیغمبر بھی انسانوں ہی میں سے مبعوث کیا گیا۔ آپؐ نے وحی سے جو [illegible] کی اسے عملی شکل اختیار کر کے دکھایا۔ گویا کہ آپ نے نظری "اسکیچ" [illegible] عملی ہدایت کا رنگ بھر کر ایک مکمل شاکلہ تیار کر دیا۔ یہی وہ شاکلہ ہے جس کے اتباع کا حکم قرآن نے دیا ہے۔ اگر ہمارا شاکلہ اس شاکلہ کے مشابہ ہے تو گویا کہ ہم نے قرآن مجید کے حکم کی اتباع کی۔ اور جہاں جہاں مشابہت میں فرق آئے گا وہاں شاکلہ بھی بدل جائے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ امتحانی کمرہ میں آپ کو تصویر بنانے کے لئے کہا جائے اور وہ تصویر سامنے بورڈ پر بنی ہوئی ہو تو ویسی ہی تصویر آپ کو بنانی ہے، کل نمبر ۱۰۰ ہیں۔ اب اگر آپ نے اس تصویر کے مطابق تصویر بنائی پھر تو آپ کو نمبر ملیں گے ورنہ آپ فیل کر دیئے جائیں گے۔ تصویر اگر درخت کی ہے اور آپ نے کسی جانور کی بنادی تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کو کتنے نمبر ملیں گے۔ تصویر میں اگر سبز رنگ بھرا ہوا ہے اور آپ نے سرخ بھر دیا تو آپ کو سمجھنے میں دقت نہیں ہونی چاہئے کہ آپ کامیاب قرار پاتے ہیں یا ناکام ----- نبی اکرم ﷺ کی پوری زندگی اور اس کا ایک ایک لمحہ سیرت میں موجود و محفوظ ہے۔ گویا کہ ایک ایسا شاکلہ ہے جس کا ایک ایک جزو واضح ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں۔ اس کا رنگ کہیں سے دھندلا نہیں۔ اس اسکیچ کی ایک ایک لکیر روشن ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ اپنا شاکلہ اس تصویر کے مطابق بنائیں ----- لیکن کیا ایسا ہے؟

ہم اپنی سوچ کے مطابق اپنا شاکلہ بناتے ہیں۔ ہمارا نفس جس طرح کہتا ہے اس طرح کا رنگ اس میں بھرتے ہیں۔ معاشرے کا چلن جس طرح ہو اسی کے خدوخال نمایاں کرتے ہیں۔ پھر سمجھتے ہیں کہ امتحان میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ محض اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ ایک اور ستم یہ ہوتا ہے کہ ہم نے جو شاکلہ بنایا ہے جس میں ہماری خواہشاتِ نفس کا بھرپور رنگ بھرا ہوا ہے، اس شاکلہ کو ہم نبی اکرم ﷺ کے شاکلہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ دوہرا ظلم ہے۔ ایک طرف اس کی سرحد بہتان سے جا ملتی ہے تو دوسری طرف فریب سے۔ ہمیں اس کا شعور جتنی جلد ہو جائے یہ ہمارے لئے بہتر ہے۔ OO

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد: ۴۵
شمارہ: ۱
رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ
فروری ۱۹۹۶ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زر تعاون ۱۰۰/-

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر 10 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات
  قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ 22 امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

نیکیوں کا موسم بہار رمضان المبارک اپنے دامن میں اللہ کی رحمتیں ' برکتیں اور مغفرتیں لئے ہوئے ہم پر سایہ فگن ہے۔ رمضان المبارک نزولِ قرآن کا مہینہ ہے (شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِی اُنْزِلَ فِیهِ الْقُرْاٰنُ) اور اس نسبت سے یہ قرآن حکیم سے تجدیدِ تعلق کا مہینہ ہے۔ چنانچہ اس ماہ مبارک کے لئے ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوگونہ پروگرام عطا کیا گیا ہے ' یعنی دن کا روزہ اور رات کا قیام اور اس میں قراءت واستماعِ قرآن۔ روزے کے ساتھ قرآن حکیم کے خصوصی تعلق کی اہمیت بعض احادیث نبویؐ میں بھی اجاگر کی گئی ہے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا : "روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں گے۔ (یعنی اس بندۂ مومن کی جو دن میں روزے رکھے گا اور رات میں اللہ کے حضور کھڑے ہو کر اس کا پاک کلام قرآن مجید پڑھے گا یا سنے گا) روزہ عرض کرے گا : اے میرے پروردگار! میں نے اس بندے کو کھانے پینے اور نفس کی خواہش کو پورا کرنے سے روکے رکھا تھا ' سو آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما۔ اور قرآن کہے گا : میں نے اسے رات کو سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا ' پس تو آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما! چنانچہ روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش اس بندے کے حق میں قبول کی جائے گی (اور اس کے لئے جنت اور مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جائے گا۔)

روزے کی عبادت کو ماہ رمضان کے ساتھ مخصوص کرنے کی حکمت بھی یہی ہے کہ رمضان نزولِ قرآن کا مہینہ ہے اور روزے اور قرآن کے مابین ایک خصوصی تعلق ہے۔ انسانی وجود روحِ ربانی اور جسدِ حیوانی کا مجموعہ ہے اور ان دونوں کے تقاضے ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں ' متضاد بھی ہیں۔ رمضان المبارک کا پروگرام در حقیقت روح انسانی کو غذا فراہم کرنے اور اسے تقویت پہنچانے کا پروگرام ہے ' اور اس کے ذریعے جسد انسانی کے تقاضوں کو محدود کر کے روح انسانی کے تقاضوں کو پوری طرح آسودگی اور سیرابی کا موقع فراہم کیا جانا مقصود ہے۔ چنانچہ اس دوگونہ پروگرام میں ایک طرف دن کا روزہ جسد انسانی کے ضعف و اضمحلال کا سبب بنتا ہے اور اس طرح روح انسانی پر سے مادی وجود کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑتی ہے تو دوسری طرف رات کو

قرآن کے ساتھ قیام اس روح کی بھوک کی سیری اور پیاس کی آسودگی کا کام کرتا ہے۔ روحِ انسانی اور کلامِ ربانی کا اپنی اصل کے اعتبار سے چونکہ آپس میں گہرا قرب و تعلق ہے لہٰذا روحِ انسانی پر کلامِ ربانی کا یہ "نزول" اس کے لئے بیش بہا خیر و برکت کا موجب بنتا ہے اور فیوض و برکات کی یہ بارش کشتِ قلوب کی آبیاری کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

ماہِ رمضان المبارک کی راتوں کا اکثر و بیشتر حصہ قرآن حکیم کے ساتھ گزارنے اور قرآن کے انوار و اسرار سے بیش از بیش استفادے کی غرض سے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ ' نے آج سے بارہ برس قبل نمازِ تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز فرمایا تھا' جو بحمد اللہ انتہائی مفید ثابت ہوا۔ اس کے بعد سے امیر محترم اپنی گرتی ہوئی صحت کے باوجود' ہر رمضان میں دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کرتے رہے۔ چنانچہ قرآن اکیڈمی لاہور میں متعدد بار اور اس کے علاوہ قرآن اکیڈمی کراچی' قرآن اکیڈمی ملتان اور ابوظہبی میں بھی امیر محترم دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام کروا چکے ہیں۔ گزشتہ سال امریکہ میں مقیم رفقاء و احباب کے شدید اصرار اور اس کام کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے امیر محترم نے نیوجرسی میں بزبانِ انگریزی دورۂ ترجمۂ قرآن کا آغاز کیا تھا' لیکن گھٹنوں کی تکلیف میں شدید اضافہ کے باعث سورۂ آل عمران کی تکمیل کے بعد یہ پروگرام موقوف کرنا پڑا۔ اس سال امیر محترم نے انگریزی میں دورۂ ترجمہ قرآن کا پروگرام حال ہی میں تعمیر ہونے والے مسلم سنٹر آف نیویارک میں شروع کیا ہے' جہاں یہ پروگرام بحمد اللہ کامیابی سے جاری ہے۔

قرآن اکیڈمی لاہور کو' جہاں سے اس کارِ خیر کا آغاز ہوا تھا' یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں ہر سال رمضان کی مبارک راتیں قرآن کی معیت میں بسر کرنے کا یہ پروگرام اہتمام کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ چیز اب یہاں ایک روایت کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اس بار یہاں ڈاکٹر عبدالسمیع دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کر رہے ہیں' جو اس ذمہ داری کو نبھانے کے لئے روزانہ فیصل آباد سے لاہور تشریف لاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک بھر میں دورۂ ترجمہ قرآن کے بیسیوں حلقے قائم ہیں جن میں ہزاروں طالبانِ قرآن رمضان المبارک کی راتوں میں قرآن حکیم کے ساتھ اپنے تعلق کی تجدید میں مصروف ہیں۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ!

عہدِ حاضر میں نظامِ خلافت

کا دستوری' قانونی اور سیاسی ڈھانچہ

اور اس کے نفاذ کا طریق کار

ڈاکٹر اسرار احمد

مینار پاکستان کے سائے میں منعقد ہونے والی عالمی احیاء خلافت کانفرنس کے دوسرے روز (۲۱/ اکتوبر ۱۹۹۵ء) اپنے فکر انگیز خطاب کے آغاز میں داعیٔ تحریک خلافت پاکستان اور امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ العالی نے خطبہ مسنونہ کے بعد موضوع سے متعلق آیاتِ قرآنی کی تلاوت کی اور ایک حدیث نبویؐ بیان کی۔ پھر آنجناب نے اپنے گزشتہ روز کے خطاب کے بعض نکات کی وضاحت کے بعد فرمایا :

عالمی احیاء خلافت کانفرنس کے دوسرے روز آج میری گفتگو اس موضوع پر ہوگی کہ نظام خلافت کا دستوری' قانونی اور سیاسی ڈھانچہ کیا ہوگا؟ اس کے ضمن میں میں تین باتیں عرض کیا کرتا ہوں کہ کسی بھی جمہوری نظام میں آپ یہ تین باتیں شامل کر دیں تو وہ خلافت کا نظام بن جائے گا۔ میں اسلام میں جمہوریت کا قائل ہوں بلکہ دنیا کو جمہوریت اسلام ہی نے دی ہے۔ البتہ "ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں" کے مصداق دنیا نے اس میں گندگی کی آمیزش کر ڈالی ہے۔ اسلام نے دنیا کو جمہوری خلافت (Popular Vicegerency) عطا کی تھی لیکن شیطان نے اسے جمہوری حاکمیت (Popular Sovereignty) بنا دیا۔ گویا۔

> ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
> جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

ورنہ جمہوریت تو حقیقت کے اعتبار سے عطیۂ محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ بہرحال کسی بھی جمہوری نظام میں، چاہے وہ پارلیمانی ہو، چاہے صدارتی ہو، وحدانی (unitary) طرزِ حکومت ہو، وفاقی (Federal) ہو یا نیم وفاقی (Confederal)، اس میں اگر تین چیزیں شامل کر دیجئے تو وہ خلافت بن جائے گی۔

۱۔ اللہ کی حاکمیت

اس کے لئے قرآن حکیم میں متعدد آیات وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً سورۂ یوسف میں دو مرتبہ یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (یوسف: ۴۰ و ۶۷) یعنی "حاکمیت کا اختیار کسی کو نہیں، سوائے اللہ کے"۔ گویا۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت میں الفاظ وارد ہوئے: ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ﴾ (آیت ۱۱۱) یعنی "بادشاہت میں اس کا کوئی ساجھی نہیں"۔ جبکہ سورۃ الکھف میں فرمایا: ﴿وَلَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا﴾ (آیت ۲۶) یعنی "وہ اپنی حاکیت میں کسی کو شریک نہیں کرتا"۔ نوٹ کیجئے کہ سورۂ بنی اسرائیل میں فعل ماضی آیا ہے جبکہ سورۂ کہف میں فعل مضارع ہے۔ اور اس طرح ان دونوں مقامات پر یہ مضمون مکمل ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے قرآن حکیم میں بعض مقامات پر "سَبَّحَ لِلّٰهِ" اور بعض جگہ "يُسَبِّحُ لِلّٰهِ" کے الفاظ آتے ہیں۔ پھر سورۃ الحدید میں دو مرتبہ یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ "اسی کے لئے بادشاہت ہے آسمانوں اور زمین کی" چنانچہ حاکیت (Sovereignty) صرف اللہ کی ہے اور انسان کے لئے خلافت (Vicegerency) ہے۔

اس اعتبار سے ہم انتہائی خوش قسمت ہیں کہ صحیح وقت پر، صحیح تدبیر اور صحیح اقدام کے نتیجے میں اس ملک میں قراردادِ مقاصد پاس ہوئی، جس سے کم از کم یہ پہلی شرط سلطنتِ خداداد پاکستان میں بہت جلد پوری ہو گئی۔

۲۔ قرآن و سُنت کی بالادستی

ہمارے دستور میں قانون سازی کی حدود کا تعین بھی بایں الفاظ کر دیا گیا تھا :

"No legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah"

یعنی قانون سازی کسی سطح پر بھی ہو' خواہ میونسپلٹی کی سطح پر ہو' ریاست کی سطح پر یا وفاق کی سطح پر' اس ملک میں قانون سازی کتاب و سنت کی نصوص کے خلاف نہیں کی جائے گی۔ یہ وہ دفعہ ہے جو ہمارے دستور میں ہمیشہ سے شامل رہی' لیکن اس انداز سے جیسے کسی شراب خانے کے افتتاح کے لئے قرآن مجید کی تلاوت کر لی جائے۔ دستور میں اس کی حیثیت ہمیشہ Directive Principle کی رہی اور اسے Operative Clause نہیں بنایا جا سکا۔ اسے ایک بڑا بھاری پتھر سمجھ کر چوم چوم کر چھوڑ اگیا ہے' کبھی دس سال کے لئے' کبھی بیس سال کے لئے' کبھی یہ وعدہ کر کے کہ نفاذِ شریعت ایکٹ کے بعد دستوری ترمیم بھی بس آیا چاہتی ہے' لیکن پھر وہ کبھی نہیں آئی۔ خدا خدا کر کے ضیاء الحق صاحب کے زمانے میں اسے دستور کی Operative Clause بنایا گیا' لیکن اس طور سے کہ اسے دو ہتھکڑیاں اور دو بیڑیاں پہنا دی گئیں۔ یعنی دستورِ پاکستان کو قرآن و سنت کی بالادستی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا' عدالتی قوانین و ضوابط کو بھی شریعت سے ماوراء سمجھا گیا' اور عائلی قوانین اور مالی قوانین کو بھی شریعت کی پابندیوں سے آزاد رکھا گیا۔ چنانچہ شرعی عدالتوں کا قیام اور اس طرح کے دوسرے اقدام ایک سعیِ لاحاصل (exercise in futility) قرار پائے اور ان سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا' سوائے اس کے کہ کچھ ججوں کو تنخواہیں اور کچھ مفتی حضرات کو بھتے ملتے رہے اور بہت سارے مسودہ ہائے قانون کہ جن کی اصل اہمیت کچھ بھی نہیں ہے' جمع ہوتے چلے گئے۔ نواز شریف کی آئی جے آئی کی حکومت دو تہائی اکثریت کے باوجود اس بھاری پتھر کو نہیں اٹھا سکی۔

سورۃ الحجرات کی پہلی آیت میں ہمیں یہی اصولی ہدایت ملتی ہے :

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾

"اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے آگے پیش قدمی مت کرو!"

یعنی دیکھو مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی حدود سے آگے مت بڑھنا' اس کے اندر رہو' جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا: ﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ﴾ (البقرہ : ۲۲۹) "یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں' پس ان سے تجاوز مت کرو"۔ میرے نزدیک ﴿ لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ کے الفاظ کی دستوری زبان میں بہترین ترجمانی ان الفاظ میں کی گئی ہے :

"No legislation can be done repugnant to the Quran and the Sunnah"

البتہ اس ضمن میں یہ بات بہت اہم ہے کہ اس کی تنفیذ کیسے ہوگی۔ دستور میں لکھ تو دیا گیا کہ قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی نہیں کی جا سکے گی اور کتاب و سنت بالاترین قانون ہے' لیکن یہ ہوگا کیسے؟ اس ضمن میں راہنمائی ہمیں سورۃ النساء کی درج ذیل آیت سے ملتی ہے :

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ ﴾ (آیت ۵۹)

"اے اہل ایمان' اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے مابین کسی معاملے میں نزاع ہو جائے (اختلاف ہو جائے) تو اسے لوٹا دو اللہ اور رسول کی طرف اگر تم واقعتاً ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور یوم آخرت پر۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے"۔

اس آیت مبارکہ میں' جو کہ اسلامی ریاست کے اہم ترین موضوع سے بحث کر رہی ہے' دو خلا موجود ہیں۔ (میری اس بات کو کہیں قرآن مجید کی توہین پر محمول نہ کر لیجئے گا!) پہلا خلا یہ ہے کہ وہ اولوالامر کیسے وجود میں آئیں گے' ان کا نصب کیسے ہوگا۔ اس کا پورے قرآن میں کہیں ذکر نہیں ہے' جبکہ دستور کا سب سے بڑا مسئلہ تو یہی ہے کہ اولوالامر کا

نصب کیسے ہو گا۔ ہمارے فقہاء نے کہا ہے کہ وہ متغلّب بھی ہو سکتا ہے یعنی جس نے از خود غلبہ حاصل کر لیا ہو' اور اگر وہ کتاب و سنت کے خلاف نہیں جا رہا ہے تو اس متغلّب کی اطاعت بھی لازم ہے' جیسے مارشل لاء آ جاتا ہے تو کیا کریں گے' سوائے اس کے کہ جسٹس کیانی مرحوم کی طرح ایک پھبتی چست کر دیں :

"Misfortunes never come alone, but this time they have come in battalions"

یعنی بد قسمتیاں کبھی اکیلے نہیں آیا کرتیں' لیکن اس بار تو وہ لشکروں کے ہمراہ آئی ہیں۔ کوئی عدالت کہہ دے گی اب آپ آ گئے ہیں تو آپ کو "نظریۂ ضرورت" کے تحت برداشت کرتے ہیں' اب آپ نوے دن کے بعد چلے جایئے اور وہ نوے دن نو سو بھی ہو سکتے ہیں' نو ہزار بھی ہو سکتے ہیں۔ قرآن نے اس پورے مضمون سے غضِّ بصر کیا ہے یا صرفِ نظر کیا ہے۔

دوسرا خلا یہ ہے کہ اولوا الامر سے اختلاف کی صورت میں اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ معاملہ قرآن و سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ فرض کریں والیٔ امر ایک حکم دیتا ہے اور میں ریاست کا ایک شہری ہوتے ہوئے یہ سمجھتا ہوں کہ یہ حکم کتاب و سنت کی حدود سے متجاوز ہے۔ اب قرآن تو یہ کہتا ہے کہ اسے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف پھیر دو۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے فیصلہ کرو۔ لیکن اس کا فیصلہ کہاں اور کیسے ہو گا؟ اللہ آسمانوں پر ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی بہرحال انتقال ہو چکا ہے' اب کہاں جائیں' کہاں فریاد کریں' کونسے دروازے کو کھٹکھٹائیں؟ کیا یہ خلا یہاں موجود نہیں ہے؟۔

اب اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ میں نے جن دو باتوں کے لئے "خلا" کا لفظ استعمال کیا ہے ان کی وضاحت حدیثِ نبوی (ﷺ) سے ہو جاتی ہے۔ میں اس کے لئے ایک حدیث پیش کر رہا ہوں جو مرتبے کے لحاظ سے حدیثِ حسن ہے۔ حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوهَا' وَحَدَّ حُدُودًا

فَلَا تَعْتَدُوهَا' وَحَرَّمَ اَشْيَاءَ فَلَا تَنْتَهِكُوهَا' وَسَكَتَ عَنْ اَشْيَاءَ رَحْمَةً لَّكُمْ غَيْرَ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوا عَنْهَا))

(رواہ الدارقطنی)

"اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزیں فرض کردی ہیں ان کو ضائع مت کرنا (ان کی پابندی کرنا)' اور اس نے کچھ حدود مقرر کردی ہیں ان سے تجاوز مت کرنا' اور اس نے کچھ چیزوں کو حرام قرار دے دیا ہے' ان کے قریب نہ پھٹکنا' اور اس نے بہت سی چیزوں سے سکوت اختیار کیا ہے' تمہارے لئے رحمت کی بنیاد پر (تمہاری مصلحت کی خاطر) کسی بھول چوک یا لاعلمی کی وجہ سے نہیں' ایسی چیزوں کے بارے میں کھود کرید مت کرنا"۔

چنانچہ نوٹ کیجئے کہ قرآن حکیم میں جن چیزوں سے سکوت اختیار کیا گیا ہے وہ ہمارے لئے اللہ کی رحمت کے طور پر ہے' یا اس کی حکمت کا مظہر ہے' یا ہمیں تکلیف مالایطاق سے بچانا مقصود ہے۔ اس لئے کہ نوع انسانی کا عمرانی شعور ابھی وہاں تک نہیں پہنچا تھا کہ یہ مباحث چھیڑ دیئے جاتے' لہٰذا ان کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی کہ جب تک نوع انسانی کا عمرانی شعور اس سطح تک نہ پہنچ جائے اور اس کے لئے مناسب ادارے وجود میں نہ آ جائیں اس معاملے کے اندر سکوت بہتر ہے۔

<u>قانون سازی اور عدلیہ کا کردار</u> : اس ضمن میں عدلیہ کا ادارہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور مجھے بڑی خوشی ہے کی یہ بات مولانا گوہر رحمان صاحب نے گزشتہ روز ہماری خلافت کانفرنس میں اپنے خطاب کے دوران کہی کہ عدلیہ کو اس کا حق دیا جانا چاہئے۔ میرے نزدیک ان کا سیاسی فکر بہت پختہ ہے اور جہاں تک اسلامی ریاست کا تصور ہے وہ بہت صحیح ہے۔ البتہ انہوں نے' میرے خیال کے مطابق' جہاں کچھ کمزوری دکھائی ہے اس کا تذکرہ بھی میں بعد میں کروں گا۔ میں نے ابھی سورۃ النساء کی آیت ۵۹ کے مضمون میں جس دوسرے خلا کا تذکرہ کیا ہے اس کے ضمن میں عدلیہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اگر ریاست کے کسی شہری کو کسی مسودۂ قانون پر اعتراض ہو اور وہ اسے کتاب و سنت کے منافی سمجھتا ہو تو یہ اس کا حق ہے کہ اعلیٰ عدالت میں اس کے موقف کو سنا جائے اور موقع دیا جائے کہ وہ علماء

اور دانشوروں کو عدالت میں لا کر اپنے موقف کو ثابت کرے۔

دورِ حاضر میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ریاست کے تین ستون ہیں' مقننہ (Legislature)' انتظامیہ (Executive) اور عدلیہ (Judiciary) اور دستور کی محافظ عدلیہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر دستور میں یہ طے ہے کہ قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون سازی نہیں ہو سکتی تو اس کی بنیاد پر جا کر عدالت کا کنڈا کھٹکھٹانا ریاست کے ہر شہری کا حق ہے۔ یہ ریاستی ادارے رفتہ رفتہ پروان چڑھے ہیں۔ حضرت ابو بکر ؓ کے زمانے میں مقننہ' انتظامیہ اور عدلیہ سب یکجا تھیں۔ حضرت عمر ؓ کے زمانے میں علیحدہ عدالتی نظام بننا شروع ہوا جو حضرت علی ؓ کے زمانے میں یہاں تک پہنچ گیا کہ مناسب شہادتیں موجود نہ ہونے کی بناء پر خلیفہ وقت کا دعویٰ بھی خارج ہو گیا۔ بہرحال ان ریاستی اداروں کے پروان چڑھنے اور مستحکم ہونے میں وقت لگا ہے۔ اور میرے نزدیک جس طرح سائنسی ترقی کے ثمرات ہمارا اثاثہ' ہماری وراثت اور ہمارا ورثہ ہیں' اسی طرح "اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ" کے مصداق ہمیں ان ریاستی اداروں کو بھی اپنانا چاہئے۔ کتاب و سنت کی بالادستی تسلیم شدہ ہو تو اول تو خود مقننہ قانون سازی کرتے ہوئے ہوشیار رہے گی' مجلس ملی یا پارلیمنٹ کے سر پر یہ تلوار لٹک رہی ہو گی کہ وہ کتاب و سنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنا سکتے۔ جب انہیں معلوم ہو کہ ہم محنت کر کے ایک قانون بنائیں' اس کی پہلی خواندگی ہو' دوسری خواندگی ہو' پھر تیسری خواندگی ہو' لیکن اس کے بعد کوئی شخص عدالت میں جا کر اسے کتاب و سنت کے منافی ثابت کر کے کالعدم قرار دلوا سکتا ہے تو وہ پہلے ہی سے اس کے لئے اپنے ماہرین کی خدمات حاصل کریں گے اور اپنی پوری پوری صلاحیت بروئے کار لائیں گے۔ لیکن اگر اس کے بعد بھی کسی کا اطمینان نہ ہو تو اس کا یہ حق ہے کہ وہ جا کر اعلیٰ عدالتوں کے در پر دستک دے۔

البتہ مجھے عرض کرنا ہے کہ مولانا گوہر رحمان صاحب کو بہت بڑی ٹھوکر لگی ہے جو انہوں نے کہا ہے کہ پاکستان کا دستور تو اسلامی ہے۔ میں ان سے یہ توقع نہیں رکھتا تھا۔ ایک اور "بزرگ معصوم" شخصیت میاں طفیل محمد صاحب سے بھی میں نے یہ الفاظ سنے ہیں کہ "اسلامی دستور تو بن گیا' مسئلہ اس حکومت کا ہے"۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ اس

ضمن میں کتنی "معصومانہ" باتیں کہی جا رہی ہیں۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ قراردادِ مقاصد میں صرف "لا الٰہ الا اللہ" ہے، "محمدؐ رسول اللہ" نہیں ہے، جبکہ دین "لا الٰہ الا اللہ" سے مکمل نہیں ہوتا۔ "محمدؐ رسول اللہ" دین کا جزوِ لاینفک ہے۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

اور سب کو معلوم ہے کہ قراردادِ مقاصد میں کہیں نبوت و رسالت کا تذکرہ نہیں ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ قراردادِ مقاصد کی منظوری ایک بہت بڑا انقلابی معاملہ تھا کہ اس میں انسانی حاکمیت کو مسترد کر کے اللہ کی حاکمیت کی بات کی گئی۔ اور اس پر ہمارے حکمرانوں کے سر شرم سے جھک گئے تھے ع "کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!" لیکن یہ بات بہرحال نامکمل بات ہے اور جب تک یہ طے نہ ہو جائے کہ یہاں کوئی قانون سازی کسی مرحلے پر، کسی سطح پر، کسی گوشے میں قرآن و سنت کے منافی نہیں کی جا سکتی اس وقت تک کلمہ طیبہ کا دوسرا جزو مکمل نہیں ہوتا۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے صحیح سمت میں ایک قدم اٹھایا ہے۔ اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کیجئے۔ جن لوگوں نے اس کے لئے محنت کی ہے اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر عطا فرمائے۔ لیکن اس کے بعد جو اصل ہڈی پھنسی ہے وہ نہ آئی جے آئی کے حلق سے نیچے اتری ہے اور نہ ہی ضیاء الحق صاحب کے حلق سے اتر سکی تھی۔ انہوں نے اسے دستور کا حصہ بنایا بھی تو اس انداز سے کہ دو بیڑیاں اور دو ہتھکڑیاں ڈال کر وفاقی شرعی عدالت میں لے آئے۔ میں ان کے اس اقدام کو محض "exercise in futility" اور "window dressing" سے تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک جب تک یہ دفعہ مؤثر دستوری حیثیت اختیار نہیں کرتی کہ "یہاں کتاب و سنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا" اُس وقت تک کلمہ طیبہ کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ اور محض "لا الٰہ الا اللہ" کہنے سے کوئی شخص مسلمان نہیں ہوا کرتا جب تک کہ وہ "محمدؐ رسول اللہ" بھی نہ کہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار نہ کرلے۔

۳۔ غیر مسلموں کی حیثیت کا تعین

موجودہ مغربی جمہوریت جو کہ اس دور کا سب سے بڑا شرک اور سب سے بڑا کفر ہے' تین عناصر پر مشتمل ہے : i) حاکمیتِ جمہور (popular Sovereignty)' ii) سیکولرزم' iii) نیشنلزم ---- گویا اس میں تین بتوں کی پوجا کی جاتی ہے اور تیسرے بت (نیشنلزم) کا تقاضا یہ ہے کہ ایک جغرافیائی حد میں رہنے والے سب ایک قوم ہیں۔ یہ پاکستانی قوم ہے' وہ ہندوستانی قوم ہے' یہ امریکن نیشن ہے' یہ فرنچ نیشن ہے۔ یہ تصور بنیادی طور پر اسلامی ریاست کے منافی ہے اور تحریک پاکستان اس نظریئے کی نفی تھی کیونکہ پاکستان دو قومی نظریئے کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا' اس کی منزل اسلام تھا' نظامِ خلافت تھا۔ "الکفرُ مِلّۃٌ واحِدۃ" کے مصداق ساری غیر مسلم قومیں تو ایک ملت ہو سکتی ہیں' لیکن مسلمان اس ملت کا جزو نہیں بن سکتے۔ چنانچہ اسلامی ریاست میں مکمل شہریت صرف مسلمان کو حاصل ہو گی اور کسی غیر مسلم کو' خواہ وہ ہندو ہو' پارسی ہو' عیسائی ہو' جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا منکر ہو' اسے مکمل اور برابر کی شہریت نہیں مل سکتی۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلم کی حیثیت ذمی کی ہے' لیکن ذمی گالی نہیں ہے۔ ذمی' ذمہ سے بنا ہے' ان کی حفاظت کی ذمہ داری ریاست لیتی ہے۔ انکی جان' مال' عزت و آبرو کی حفاظت' ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت' ان کے کاروبار اور ان کی املاک کی پوری حفاظت اسلامی ریاست کے ذمہ ہے۔ انہیں اپنے عقائد کے مطابق اپنے مذہب پر عمل کرنے' اپنی اولاد کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے اور اس کی تبلیغ و تلقین کا پورا اختیار ہے' اور اپنے پرسنل لاء کے مطابق نکاح طلاق وغیرہ کے معاملات طے کرنے کی پوری آزادی ہے' لیکن وہ اسلامی ریاست میں قانون سازی کے عمل میں شامل نہیں ہو سکتے' اس لئے کہ اسلامی ریاست میں قانون سازی کا دارومدار کتاب و سنّت پر ہے اور جو کتاب کو مانے نہ سنت کو' اللہ کو مانے نہ قرآن کو' اور نہ اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مانے تو اسے قانون سازی میں کیسے شریک کیا جا سکتا ہے؟ کوئی عقل کی بات ہونی چاہئے' کوئی منطق کی بات سامنے آنی چاہئے۔ انہیں پبلک لاء میں اور لاء آف دی لینڈ کے معاملے میں اسلام کی بالادستی قبول کرنی پڑے گی۔ اسلامی

ریاست میں رہتے ہوئے ﴿يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ﴾ کے مطابق انہیں جزیہ بھی دینا ہوگا' جو ایک ٹیکس ہے۔ جس طرح مسلمان شہری زکوٰۃ ادا کریں گے اسی طرح غیر مسلم جزیہ ادا کریں گے۔ یہ اس حفاظت کے بدلے میں ہوگا جو انہیں اسلامی ریاست میں حاصل ہوگی۔ "جزیہ" جزا سے بنا ہے اور "ذمی" ذمے سے۔ یہ الفاظ کوئی گالی نہیں ہیں۔ ٹیکس کیا ہوتا ہے؟ بدل ہوتا ہے۔ آپ کی کارپوریشن سڑکیں بنا رہی ہے' انہیں مرمت کر رہی ہے' اس کے لئے پیسہ آخر کہاں سے لائے؟ ظاہر ہے آپ کو اس کا بدل دینا ہے۔ چنانچہ آپ وہیکل ٹیکس دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ اپنی حکومت کو پراپرٹی ٹیکس' ویلتھ ٹیکس اور نجانے کون کون سے ٹیکس دیتے ہیں۔ آج ہم سب زکوٰۃ نہیں دیتے' جزیہ دیتے ہیں۔ یہ سارے ٹیکس جزیہ ہی تو ہیں۔

مزید بر آں اسلامی ریاست میں کوئی غیر مسلم قانون سازی کے علاوہ اعلیٰ سطح کی پالیسی میکنگ میں بھی شریک نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اسلامی ریاست کا نظام یا خلافت کا نظام جب بھی قائم ہوگا تو اس کی اولین اور بلند ترین ترجیح اس نظام کی تصدیر ہوگی' یعنی اسے درجہ بدرجہ ساری دنیا میں نافذ کرنا۔ چنانچہ اس کی ساری پالیسیاں اس ایک نکتے کے گرد گھومیں گی۔ اس کے سارے وسائل میں ترجیح نمبر ایک یہی ہوگی کہ ہمیں دین کا پیغام پوری دنیا تک پہنچانا ہے۔ اور "شہادت علی الناس" کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی غیر مسلم ہمارے اس مقصد کے اندر شریکِ کار نہیں ہو سکتا' وہ تو رکاوٹیں ڈالے گا' راستے بند کرے گا۔ ان دو امور (قانون سازی اور پالیسی میکنگ) کے سوا غیر مسلموں کے لئے باقی سب راستے کھلے ہوں گے۔ انہیں فنی ملازمتیں اور سرکاری ملازمتیں دی جا سکتی ہیں۔ یہ فوج میں بھی آسکتے ہیں' لیکن بہرحال مذکورہ بالا دو سطحوں پر انہیں شریک نہیں کیا جا سکتا۔

تو یہ تین باتیں دنیا کے کسی بھی جمہوری نظام میں شامل کر لیجئے' چاہے وہ امریکہ کا نظام ہو' برطانیہ کا نظام ہو یا بھارت کا نظام ہو' وہ خلافت کا نظام بن جائے گا۔ یعنی اللہ کی حاکمیت' دستور سازی قرآن و سنت سے منافی نہ ہونے کی شرط اور ریاست کی مکمل شہریت صرف مسلمانوں کے لئے ہونا' جبکہ غیر مسلموں کی حفاظت کا ذمہ لیا جانا۔

چند مغالطے اور ان کی وضاحت

اس ضمن میں ذہنوں میں بڑے بڑے مغالطے اور الجھنیں (confusions) موجود ہیں' لہٰذا مجھے چند امور کی مزید وضاحت کرنی ہے۔

پہلا مغالطہ تو یہ ہے کہ اسلامی قانون تو موجود ہے' بس اسے نافذ کرنا ہے' لہٰذا قانون سازی کی کیا ضرورت ہے؟ میرے نزدیک اس سے بڑا احمقانہ خیال کوئی نہیں ہے۔ مستقبل کی اسلامی ریاست میں قانون سازی کا سکوپ بہت وسیع ہو گا اور قرآن و سنت کے حوالے سے نئی قانون سازی ہو گی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات بدل چکے ہیں اور تمام مسائل کی صورت بدل چکی ہے۔ لہٰذا اب قانون سازی کے لئے اجتہاد کا عمل جاری ہو گا۔ اجتہاد کے میدان کی وسعت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ آج کے دور میں بجٹ سازی بہت بڑا کام ہوتا ہے۔ تو کیا قرآن و سنت میں کہیں لکھا ہوا ہے کہ کس کس مد میں کتنی کتنی رقوم تفویض کی جائیں؟ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کوئی ادارہ چاہئے جو فیصلہ کرے۔ اسی طرح ریاست کے دوسرے شعبے ہیں جن کے لئے قانون سازی کی ضرورت ہے' لہٰذا جدید اسلامی ریاست میں اجتہاد کا عمل مسلسل ہو گا۔

اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ؟

اجتہاد کے بارے میں ایک دوسری غلط فہمی علامہ اقبال کے ان الفاظ کا غلط مفہوم لینے سے پیدا ہوئی ہے کہ "آج کے دور میں اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ ہو گا"۔ میرے نزدیک علامہ اقبال کی یہ بات بالکل درست ہے اگرچہ لوگوں نے اس کا مطلب غلط لیا ہے اور غلط طور پر بیان کیا ہے۔ اور بدقسمتی سے پسرِ اقبال اس غلط نظریئے کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ اس کو سمجھ لیجئے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ جہاں تک اجتہاد کے عمل کا تعلق ہے اس کے لئے ظاہر بات ہے کہ صلاحیت درکار ہے۔ اس کے لئے علم' تقویٰ اور دین کا فہم ضروری ہے' لیکن اس کو آپ ناپ تول نہیں سکتے کہ کس میں کتنا تقویٰ ہے اور کس میں نہیں ہے۔ کسی شخص کے علامہ اور ذہین و فطین ہونے کی علامت صرف سند یافتہ ہو جانا ہی تو نہیں۔

معلوم ہوا کہ اجتہاد ہر شخص کر سکتا ہے' لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس کا اجتہاد نافذ ہو گا۔ فرض کیجئے کسی مسئلے پر میں بھی سوچتا ہوں' قرآن و سنت سے استدلال کرتا ہوں اور کوئی رائے بناتا ہوں کہ یہ مسئلہ جو پیدا ہوا ہے میری دانست میں اس کا حل قرآن و سنت کے مطابق یہ ہے۔ ایک دوسرے صاحب اس مسئلے پر غور و فکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ نہیں' اس کی بجائے یہ شکلیں بہتر ہوں گی۔ کوئی اور صاحب کہتے ہیں کہ نہیں' یہ ایسے ہونا چاہئے۔ اب سوال یہ ہے کہ کس کا اجتہاد نافذ ہو گا؟ قوتِ نافذہ کس کے پاس ہے؟ اسے اس مثال سے سمجھئے کہ امام ابو حنیفہؒ سے کہا گیا کہ ہم آپ کو چیف جسٹس بنا دیتے ہیں' آپ کے اجتہاد از خود نافذ ہو جائیں گے' لیکن انہوں نے کورا جواب دے دیا کہ میں بھی مجتہد ہوں' اور میرے علاوہ بھی مجتہد ہیں' میں اپنے اجتہاد کو ریاست کی قوتِ نافذہ کے ذریعے نافذ نہیں کرنا چاہتا۔ اس پر آپؒ نے ماریں کھائیں' جیل میں گئے' لیکن حکومتی پیشکش کو قبول نہیں کیا۔ امام مالکؒ سے کہا گیا کہ آپ کی کتاب "موطا" کو کتابِ قانون کے طور پر نافذ کر دیتے ہیں' لیکن آپؒ نے اس سے انکار کیا۔ البتہ قاضی ابو یوسفؒ نے عہدۂ قضا قبول کر لیا' جو ظاہر ہے مصلحتِ امت میں کیا ہو گا۔ سوال یہ ہے کہ قاضی ابو یوسف اگر عہدۂ قضا قبول نہ کرتے تو ان کا اجتہاد کیسے نافذ ہوتا؟ ان کے پاس کونسا اختیار تھا؟ قاضی ابو یوسف کی رائے کی تنفیذ تو خلیفۂ عباسی کے اختیار کی مرہونِ منت تھی۔ سلطان تو وہ تھا (السُّلطان ظِلُّ اللّٰہِ فِی الارض) اختیار تو اس کے پاس تھا' اس نے جسے چاہا منتخب کر لیا' جسے پی چاہیں وہ سہاگن۔ اگر وہ قاضی ابو یوسف کو منتخب نہ کرتے تو کسی اور کو کر لیتے۔

دورِ ملوکیت ہی میں اجتہاد کی تنفیذ کی ایک اور مثال ہمیں صرف ۳۰۰ سال پہلے مل جاتی ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر بڑے نیک اور خدا ترس بادشاہ تھے۔ انہوں نے علماء کی ایک باڈی بنائی کہ وہ جدید حالات کے مطابق قانون کی تدوین کریں۔ اس کے نتیجے میں فتاویٰ عالمگیری مرتب ہو گئے۔ اس وقت یہ اہتمام نہیں کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے علاقوں سے تمام علماء کی رائے لی جاتی' مختلف فرقوں سے پوچھا جاتا' ان کے نمائندوں کو جمع کیا جاتا۔ بلکہ جو بھی ذمہ دار بیوروکریسی تھی اس نے معروف علماء کے نام تجویز کر کے بادشاہ کو ارسال کر دیئے اور ان علماء نے فتاویٰ مرتب کر دیئے۔ پھر یہ کہ ان کو مرتب کرنے والے

علماء از خود تو ان فتاویٰ کو نافذ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ تو "فتاویٰ عالمگیری" کہلاتے ہیں' اور جن بے چاروں نے بیٹھ کر خون پسینہ ایک کر کے یہ فتاویٰ مرتب کئے ہوں گے ان کے تو نام بھی کوئی نہیں جانتا۔

تو اجتہاد اور شے ہے' تنفیذِ اجتہاد اور شے ہے۔ میرے نزدیک علامہ اقبال کے مذکورہ بالا قول کا مفہوم یہ ہے کہ کس کا اجتہاد نافذ ہو گا اور کتابِ قانون کا جزو بنے گا' یہ فیصلہ اب پارلیمنٹ کرے گی۔ ورنہ تو سو بکھیڑے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اجتہاد کرنے والے علماء مختلف مکاتبِ فکر سے متعلق ہوں گے۔ وہ حنفی ہوں گے یا شافعی ہوں گے۔ دیوبندی' بریلوی یا اہلحدیث ہوں گے۔ اگر اجتہاد کی تنفید بھی ان کے حوالے کر دی جائے تو وہ "تھیوکریسی" بن جائے گی۔ اور مولانا گوہر رحمان صاحب نے اپنے کل کے خطاب میں بڑی پیاری بات کہی تھی کہ اسلام میں تھیوکریسی یا پاپائیت نہیں ہے۔ آپ ماہرین سے رائے لیجئے' علماء کی خدمات حاصل کیجئے۔ افراد اور سیاسی جماعتیں علماء کی خدمات حاصل کریں اور عدالت بھی ان کی خدمات حاصل کرے۔ لیکن قوتِ نافذہ ان کے ہاتھ میں نہ ہو۔ اگر قوتِ نافذہ اور اتھارٹی ان کے ہاتھ میں آئی تو یہ پاپائیت یا تھیوکریسی بن جائے گی' جو روحِ عصر کے تقاضے کے منافی ہے۔ روحِ عصر کا تقاضا ہے کہ قانون سازی میں عوام کی شرکت ضروری ہے' لہٰذا کونسا اجتہاد قانون کا درجہ حاصل کرے گا' کونسا اجتہاد نافذ ہو گا' اس کا فیصلہ عوامی نمائندوں پر مشتمل پارلیمنٹ کرے گی۔ البتہ اس کے اوپر اعلیٰ عدالت موجود رہے گی۔ اگر کسی کا خیال ہو کہ پارلیمنٹ غلط نتیجے پر پہنچی ہے تو وہ عدالت میں جا کر اسے غلط ثابت کروا لے۔

اجتہاد کا دائرۂ کار

اجتہاد اور قانون سازی کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درج ذیل حدیث بہت اہم ہے' جو بڑی مختصر لیکن بہت جامع حدیث ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بجا طور پر دعویٰ ہے کہ "اُوتِیتُ جَوَامِعُ الْکَلِمِ" (مجھے اللہ تعالیٰ نے بڑے جامع کلمات عطا کئے ہیں)۔ اور یہ حدیث اس کی بہترین مثال ہے۔ حضرت ابو سعید خدری

ﷺ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَمَثَلِ الْفَرَسِ عَلٰى اٰخِيَتِهٖ، يَجُوْلُ ثُمَّ يَرْجِعُ اِلٰى اٰخِيَتِهٖ" (مسند احمد) یعنی "مؤمن کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو کہ ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے' وہ گھومتا پھرتا ہے اور پھر اپنے کھونٹے کی طرف لوٹ آتا ہے"۔ دیکھئے کتنی سادہ حدیث ہے۔ پہلے تو یہ سمجھئے کہ اس سے مراد کیا ہے۔ جو اللہ ہی کو نہیں مانتا وہ مادر پدر آزاد ہے' جو چاہے کھائے پئے' جو چاہے کرے۔ لیکن جس نے اللہ کو مان لیا' قرآن کو مان لیا' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مان لیا اس پر کئی بندشیں عائد ہو گئیں کہ یہ کھا سکتا ہے یہ نہیں کھا سکتا' یہ پی سکتا ہے یہ نہیں پی سکتا' یہاں شادی کر سکتا ہے یہاں نہیں کر سکتا۔ چنانچہ بندۂ مومن بالکل ایک گھوڑے کی طرح بندھا ہوا ہے اور اسے باندھنے والی شے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے' کوئی سلطانی' کوئی ملوکیت یا کوئی جاگیرداری نہیں۔ اس حدیث میں اس حوالے سے بڑی خوبصورت تشریح آئی ہے کہ اسلام میں قانون سازی کا سکوپ کتنا ہے اور جمہوریت اور مذہب کا امتزاج کتنا ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں فرض کیجئے کہ ایک گھوڑے کو آپ ایک وسیع میدان میں چھوڑنا چاہتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ وہ اس میدان میں کچھ بھاگے دوڑے' لیکن اس سے باہر نہ چلا جائے' چنانچہ آپ ایک سو گز لمبی رسی لے کر اسے کھونٹے سے باندھ دیتے ہیں۔ آپ کے اس عمل سے سو گز کے نصف قطر کا ایک دائرہ وجود میں آ جائے گا' جس کے اندر اندر گھوڑا آزاد ہو گا کہ وہ دائیں' بائیں' شمال' جنوب' مشرق یا مغرب جس سمت میں چاہے چلا جائے۔ وہ چاہے تو پچاس گز جائے' ساٹھ گز جائے' سوویں گز تک چلا جائے' لیکن اسے ایک سو ایک واں گز نہیں آئے گا' نہ مشرق میں' نہ مغرب میں' نہ شمال میں' نہ جنوب میں۔ یہ ہے پابندی اور آزادی کا حسین امتزاج۔ گویا بقول اقبال ۔

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے' پا بہ گِل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے!

یہ دائرہ ہے حدود اللہ کا' جس کے بارے میں فرمایا گیا : لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ اس دائرے سے آگے تو بڑھنا نہیں' کیونکہ بندھے ہوئے ہیں' لیکن اس سو

گز نصف قطر کے دائرے میں ہر طرف جانا مباح ہے' ہر قدم اٹھانا مباح ہے۔ چنانچہ اسلام میں مباحات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ حدود تو چند ہیں۔ سود' جوا' خنزیر اور شراب کے علاوہ چند اور چیزیں حرام ہیں۔ چند رشتے حرام قرار دیے گئے ہیں کہ ان سے نکاح نہیں کر سکتے۔ پھر جو عورت کسی کے نکاح میں ہو وہ حرام ہے' باقی جس مسلمان عورت سے چاہو شادی کر سکتے ہو' کروڑوں کے لئے مباح کا راستہ کھلا ہے۔ مباح اس لئے کہ شادی کے امکانات تو کروڑوں ہیں۔ چنانچہ مباحات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور شریعت کا یہ اصول ہے کہ "ہر شے مباح ہے جب تک اس کی حرمت ثابت نہ ہو جائے"۔ یہ نہیں کہ "ہر شے حرام ہے جب تک اس کی حِلّت ثابت نہ ہو جائے"۔

مباحات کے اس دائرے کے اندر اسلام کی حسین ترین جمہوریت ہے' یہاں کثرتِ رائے سے فیصلہ کر لیجئے۔ آپ کو دو مباحوں میں فیصلہ کرنا ہے نہ کہ حلال اور حرام میں۔ آپ کو شراب اور شربت میں فیصلہ نہیں کرنا' روح افزا اور شربت صندل میں فیصلہ کرنا ہے۔ تو گنتی میں کیا حرج ہو گا؟ مباحات کے اس دائرے میں اکیاون فیصد لوگوں کی بات کیوں نہ مان لی جائے؟ اس میں کیا قباحت ہے؟ مباحات کے انتخاب میں جمہوریت کو بروئے کار لانے میں کیا قدغن' کیا خرابی اور کیا برائی ہے؟ البتہ یہ بات طے ہے کہ کسی حرام کو حلال نہیں کر سکتے۔ اکیاون فیصد تو کجا صد فی صد بھی نہیں کر سکتے۔ یہ وہ جمہوریت ہے جسے مولانا مودودی مرحوم نے "تھیوڈیموکریسی" سے تعبیر کیا ہے۔ میرے نزدیک فکرِ اسلامی کے مجدد علامہ اقبال ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی نے ان کے فکر کے بہت سے پہلوؤں' خاص طور پر اسلامی ریاست کے دستور اور اس کی بنیادوں کو بڑے پیمانے پر عام کیا ہے۔ چنانچہ میں مولانا مودودی کو اس دور کا سب سے بڑا مسلم پولیٹیکل سائنٹسٹ مانتا ہوں۔ لیکن میرے نزدیک وہ سیاستدان نہیں تھے کیونکہ سیاست دان ہونا اور ہے' پولیٹیکل سائنس اور سیاسیات کا ماہر ہونا اور ہے۔ مولانا سیاسیات کے بہت بڑے ماہر تھے' لیکن سیاستدان ہونے کی حیثیت سے ان کی صلاحیت بالکل صفر ثابت ہوئی' اس حیثیت سے ان کے اندازے اور ان کی امیدیں بالکل عبث ثابت ہوئیں۔ ۱۹۵۱ء میں جماعت اسلامی نے پہلی مرتبہ پنجاب کے الیکشن میں اپنے پنچائتی نظام کے تحت حصہ لیا' جس میں مولانا مودودی

چالیس سیٹوں کی امید لگائے بیٹھے تھے' جن میں سے ایک بھی ہاتھ نہ آئی۔ معلوم ہوا کہ معاشرے کا رجحان کچھ اور تھا' انہیں اس کا پتہ ہی نہیں تھا۔ وہ تو اپنے سٹڈی روم کے اندر بیٹھے ہوئے پڑھتے تھے' لکھتے تھے' چاروں طرف کتابوں کے انبار تھے۔ اللہ اللہ اور خیر سلّا۔ لیکن پولیٹیکل سائنٹسٹ کی حیثیت سے میں مولانا مودودی کو علامہ اقبال کا سب سے بڑا شارح مانتا ہوں اور مجھے جہاں کہیں بھی سیاسیات پر گفتگو کرنی ہوتی ہے وہاں ان کی وضع کردہ اصطلاحات کا ذکر ضرور کرتا ہوں۔ مولانا مودودی نے بالکل صحیح کہا ہے کہ اسلام نہ ڈیمو کریسی ہے نہ تھیو کریسی ہے' بلکہ یہ تھیو ڈیمو کریسی ہے' یعنی دونوں کا امتزاج ہے۔ لیکن اس میں "تھیو" (theo) کا عنصر مذہبی طبقے پر مشتمل نہیں ہے' بلکہ یہ کتاب و سنت کے دائرے کا ہے اور ڈیمو کریسی کا معاملہ کتاب و سنت کے اس دائرے کے اندر اندر رہے' جس کے لئے ﴿اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَهُمۡ﴾ کا اصول دے دیا گیا ہے۔ اللہ نے کسی شے کو حرام کر دیا تو تم اسے حلال نہیں کر سکتے' کسی کو حلال کر دیا تو تم اسے حرام نہیں کر سکتے' لیکن جن چیزوں کے بارے میں سکوت فرمایا ہے انہیں "اَمۡرُکُمۡ" بنا دیا ہے' کہ ان کے بارے میں باہمی مشورے کرو۔ اور اس میں گنتی کے اندر قطعاً کوئی حرج نہیں۔ مولانا مودودی نے اس کے لئے حاکمیتِ عامہ (Popular Sovereignty) کی بجائے خلافتِ عامہ (Poplulai Vicegerency) کی اصطلاح وضع کی ہے' اگرچہ اس میں بھی تھوڑی سی اصلاح کی ضرورت ہے' کیونکہ اسلام میں خلافت کا تصور عوام کی خلافت کا نہیں' مسلمانوں کی خلافت کا ہے۔

مشاورتِ باہمی کا نظام

اب اس مسئلے کی طرف آیئے کہ نظامِ خلافت میں مشاورتِ باہمی کا نظام کیا ہو گا اور اولی الامر کا انتخاب کیسے عمل میں آئے گا۔ اب وہ قبائلی نظام تو رہا نہیں۔ لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے لئے اب ریفرنڈم اور انتخابات ہوتے ہیں' بیلٹ بکس رکھے جاتے ہیں' سیاسی پارٹیاں بنتی ہیں جو اپنے اپنے انتخابی منشور پیش کرتی ہیں' پھر وہ الیکشن میں جاتی ہیں۔ آخر کوئی نظام تو بنانا پڑے گا۔ خلیفۃ المسلمین آسمان سے تو نازل نہیں ہو گا' وہ مامور من

اللہ تو نہیں ہو گا۔ اولی الامر آسمان سے نہیں ٹپکیں گے' بلکہ انسانوں میں سے ہی چنے جائیں گے۔ اس بارے میں بھی یقیناً بڑے بڑے مغالطے ذہنوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرے نزدیک ہر بالغ مسلمان کو رائے دہی کا حق حاصل ہونا چاہئے' اگرچہ "بلوغت" کی عمر کا تعین جو بھی پارلیمنٹ بنے گی وہ کرے گی۔ میری رائے میں تو حقِ رائے دہی چالیس برس کی عمر میں ملنا چاہئے' جو قرآن کے نقطۂ نظر سے شعور کی عمر ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی ﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً﴾ لیکن بہرحال یہ معاملہ مسلمانوں کے باہمی مشورے اور ان کی آراء سے طے ہو گا۔ اور یہاں نوٹ کر لیجئے کہ ووٹ دینے کا حق ہر مسلمان کو حاصل ہو گا' چاہے متقی ہو چاہے فاسق ہو۔ میں یہ باتیں لگی لپٹی رکھے بغیر کر رہا ہوں تاکہ ذہنوں میں موجود الجھنیں اور مغالطے ختم ہوں۔ اگر میں غلطی پر ہوں تو میری غلطی مجھ پر واضح کی جائے۔ ہر مسلمان کے لئے بلاامتیاز حقِ رائے دہی کے لئے میرے پاس دلیل امام اعظم ابوحنیفہؒ کا یہ فرمان ہے کہ "المُسلم کفوٌ لکلِّ مسلِمٍ" یعنی ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ہم مرتبہ ہے۔ چنانچہ اسلامی ریاست میں تمام مسلمانوں کے دستوری اور قانونی حقوق بالکل برابر ہیں' ان میں کوئی فرق نہیں۔ اگر ایک باپ کے دو بیٹے ہوں' ایک تہجد گزار ہو اور دوسرا فرض نماز بھی نہ پڑھتا ہو تو باپ کی وراثت میں سے دونوں کو برابر حصہ ملے گا' یہ نہیں ہو گا کہ اس متقی اور تہجد گزار کو 6 / 5 دے دو اور دوسرے کو صرف 6 / 1 پر ٹال دو۔ یا تو ثابت کیجئے کہ وہ کافر ہو گیا ہے تو اس کا کوئی حق سرے سے رہا ہی نہیں۔ یہاں تو "All or none law" پر عمل ہو گا' یعنی یا تو اس کے سارے حقوق قائم رہیں گے یا بالکل صفر ہو جائیں گے۔ جب تک وہ مسلمان ہے "المسلمُ کفوٌ لکلِّ مسلِمٍ" کی رو سے اسلامی ریاست میں اسے برابر کے حقوق حاصل رہیں گے۔

امیدواری کا مسئلہ

ایک بہت بڑا مغالطہ امیدواری کے مسئلے میں پیدا کیا گیا ہے اور اس کے پیدا کرنے میں بھی کچھ دخل مولانا مودودی کی انتہاپسندانہ طبیعت کو حاصل ہے۔ اس ضمن میں مغالطہ

یہ پیدا کیا گیا کہ "امیدواری حرام ہے" حالانکہ یہ صرف اخلاقی سطح پر حرام ہے نہ کہ قانونی سطح پر' بشرطیکہ آپ اپنے ذاتی اقتدار کے لئے کوشاں نہ ہوں۔ قرآن حکیم میں الفاظ وارد ہوئے ہیں : ﴿لَا یُرِیۡدُوۡنَ عُلُوًّا فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فَسَادًا﴾ (العنکبوت : ۸۳) تو اگر آپ ذاتی علو و سربلندی کے لئے اقتدار چاہ رہے ہیں تو امیدواری حرام ہے' لیکن اگر یہ بات نہیں ہے تو قانونی سطح پر یہ حرام نہیں ہے۔ اپنے موقف کی تائید کے لئے میرے پاس سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد خلافت کے فیصلے کے لئے ایک باڈی مقرر کر دی تھی جس میں عشرہ مبشرہ میں سے چھ سات افراد شامل تھے۔ ان میں سے سعید بن زید ؓ کو آپ ؓ نے ووٹ کا حق نہیں دیا' اس لئے کہ وہ بہنوئی تھے۔ اسی طرح اپنے بیٹے کو بھی اس میں شامل تو کر دیا لیکن اس کے بارے میں طے کر دیا کہ نہ اس کا ووٹ ہے' نہ وہ امیدوار ہو سکتا ہے اور نہ ہی منتخب ہو سکتا ہے۔ اب جو لوگ باقی رہ گئے ان میں سے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر (رضی اللہ عنہما) دونوں نے کہا کہ ہم اس سے دست بردار ہوتے ہیں۔ ان دونوں حضرات نے جو دستبرداری اختیار کی تو وہ آخر کس شے سے کی؟ ان کی دستبرداری کے بعد باقی تین حضرات رہ گئے۔ یعنی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف' حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم۔ اب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف فرماتے ہیں کہ اگر تم دونوں اپنا معاملہ میرے حوالے کر دو تو میں بھی دستبردار ہوتا ہوں۔ علی اور عثمان (رضی اللہ عنہما) کے مابین آخر وہ کون سا معاملہ تھا؟ وہ یہ تو نہیں کہتے تھے کہ نہیں صاحب' ہمیں نہیں چاہئے' ہمیں نہیں چاہئے' آپ خلیفہ بن جایئے۔ یہ لکھنوی انداز تو ہمیں کہیں ملتا ہی نہیں۔

اگر کوئی شخص دیانتاً یہ سمجھتا ہے کہ اس کے اندر صلاحیت موجود ہے اور وہ امت کی مصلحت اور دین کے مفاد میں کام کر سکتا ہے تو اس کو آگے آنا چاہئے اور اپنی خدمات پیش کرنی چاہئیں۔ البتہ اگر اس کی نیت میں فتور ہے اور وہ ذاتی اقتدار چاہتا ہے تو اللہ کے ہاں پکڑا جائے گا۔ ان دونوں چیزوں کو گڈمڈ نہ کیجئے۔ Confusion اسی کا نام ہوتا ہے کہ دو چیزوں کو خلط مبحث کے انداز میں گڈمڈ کر دیا جائے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے شاہِ مصر سے خود کہا تھا : ﴿اجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ

اَلۡاَرۡضِ اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ ﴾ (یوسف : ۵۵) یعنی "ملک کے خزانے میرے سپرد کیجئے، میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں"۔ مصر کے اندر قحط کی صورت میں جو بہت بڑی آفت آنے والی ہے اس کا انتظام کرنے کی اللہ تعالیٰ نے مجھے صلاحیت دی ہے، لہٰذا مجھے اس کا اختیار دیجئے۔ کسی شے کے اخلاقی اور قانونی پہلو کو گڈمڈ کرنا درست نہیں ہے۔ جیسے مثلاً کسی نے آپ کو تھپڑ مارا تو آپ کے لئے دو راستے کھلے ہیں۔ ایک روحانی راستہ ہے کہ اسے معاف کر دیں۔ دین میں اس کی بڑی ترغیب اور تاکید آئی ہے :

﴿وَاِنۡ تَعۡفُوۡا وَتَصۡفَحُوۡا وَتَغۡفِرُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ﴾
(التغابن : ۱۴)

"اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو اللہ غفور و رحیم ہے"۔

دیکھئے کتنی تاکید ہو گئی، تین ہم معنی الفاظ آ گئے۔ لیکن دوسری جگہ فرمایا :

﴿وَلَكُمۡ فِی الۡقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ﴾ (البقرہ:۱۷۹)

"ہوشمندو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے"۔

آج تم اسے چھوڑ دو گے جس نے تمہارے تھپڑ مارا تھا تو کل یہ کسی اور کو مارے گا۔ چنانچہ برائی کا شروع ہی میں قلع قمع کر دو (Nip the evil in the hud.) اور قصاص لو اتو یہ دونوں چیزیں اگرچہ قرآن میں ہیں لیکن دونوں کی حیثیت اور محل علیحدہ ہے۔ بالکل یہی معاملہ امارت کا ہے۔ اندازہ کیجئے کہ تقویٰ کے اعتبار سے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا کیا مقام ہو گا جن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود فرما رہے ہیں کہ "مَنۡ كَانَ يَسُرُّهٗ اَنۡ يَنۡظُرَ اِلٰی زُهۡدِ عِيۡسٰی فَلۡيَنۡظُرۡ اِلٰی صَاحِبِیۡ اَبِیۡ ذَرٍّ" یعنی جس کسی کی خواہش ہو کہ حضرت عیسیٰؑ کا زہد اپنی آنکھوں سے دیکھے تو وہ میرے دوست ابوذر کو دیکھ لے! تقویٰ کی اس سے بڑی سند کیا ہو گی۔ لیکن حضورؐ اسی دوست ابوذرؓ سے کہہ رہے ہیں کہ تم کمزور ہو، تم اس ذمہ داری کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ اس لئے کہ ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے لئے صرف زہد و تقویٰ ہی نہیں کچھ اور چیزیں بھی درکار ہیں۔ جہاں بینی اور جہاں بانی کے تقاضے ایک جیسے نہیں ہیں۔ زہد و تقویٰ میں فقرائے صحابہؓ سے بڑھ کر کون

ہو گا۔ ابو درداء' ابو ہریرۃ اور ابوذر سے بڑھ کر زہد کس کا ہو گا؟ لیکن فقہائے صحابہؓ اور ہیں۔ وہ ابو بکر و عمر ہیں' عثمان و علی ہیں' معاویہ اور عائشہ ہیں' رضی اللہ عنہم اجمعین۔

تاہم امیدواری کے ضمن میں یہ بات بہت اہم ہے کہ امیدوار کی مکمل طور پر سکریننگ بہت ضروری ہے۔ ایک شخص اس ملک اور ریاست کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے اپنی خدمات آفر کر رہا ہے تو وہ پہلے یہ بتائے کہ اس کے پاس یہ مال و اسباب آیا کہاں سے ہے؟ میرے پاس اس کی دلیل اسلام کے عدالتی نظام میں "تزکیۃ الشہود" کا عمل ہے۔ اسلامی عدالت میں کسی شخص کی گواہی اس وقت تک قبول نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ خود اس سکریننگ میں سے گزر نہ جائے۔ آپ کسی مقدمے میں گواہی دینے کے لئے آئے ہیں تو پہلے اپنا کچا چٹھا بتا دیجئے تا کہ یہ طے ہو جائے کہ آپ قابلِ اعتماد اور ثقہ بھی ہیں یا نہیں؟ آپ کی گواہی قبول ہو گی یا نہیں ہو گی۔ اسی طرح امیدوار سے سارے کھائے پئے کا حساب لیا جا سکتا ہے۔ امیدوار کے طور پر جو بھی آئے وہ اس پوری سکریننگ سے گزر کر آئے۔ پھر مسلمان عوام اس کے بارے میں اپنے ووٹ کا حق استعمال کریں۔

کثیر الجماعتی نظام

ایک اور مغالطہ یہ پیدا کیا جا رہا ہے کہ اسلامی ریاست میں کوئی پارٹی سسٹم نہیں ہو گا۔ حالانکہ قرآن و حدیث کی رو سے کوئی شے ایسی نہیں جو اسے حرام قرار دیتی ہو۔ میرے نزدیک کثیر الجماعتی نظام (Multi-party System) روح عصر کا تقاضا ہے اور اس کا تعلق بھی ان اداروں سے ہے جو مغرب میں عمرانی ارتقاء کے نتیجے میں وجود میں آئے ہیں۔ اس میں ہرگز کوئی قباحت نہیں ہے کہ مختلف پارٹیاں وجود میں آئیں اور وہ اپنا اپنا منشور پیش کریں کہ ہم خارجہ پالیسی میں یہ تبدیلی لانا چاہتے ہیں' ہم ٹیکسیشن کے نظام میں یہ اصلاح کرنا چاہتے ہیں' ہم بجٹ allocations میں یہ چیزیں لانا چاہتے ہیں' ہم تعلیمِ بالغاں پر اتنا خرچ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی کے دستور میں کتاب و سنت کے خلاف کوئی چیز پائی جائے تو اس کی اسی وقت گرفت کی جائے اور اسے عدالت کے روبرو پیش کیا جائے کہ یہ بدمعاش کیا کہہ رہا ہے۔ یہ تو دستور کی خلاف ورزی ہو گئی۔ جس طرح کتاب و سنت کی

حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی میں اجتہاد ہوگا اسی طرح سیاسی جماعتیں اپنے اپنے منشور مرتب کرتے ہوئے اجتہاد کریں اور پھر عوام کے سامنے جائیں۔ جس جماعت کو عوام منتخب کرلیں وہ حکومت بنائے۔ البتہ پارٹی وہپ (Party Whip) صرف ایک درجے میں صحیح ہوگی۔ پارٹی وہپ اسے کہتے ہیں کہ کسی بھی مسئلے میں آپ کی ذاتی رائے دیانتاً چاہے پارٹی کے موقف کے خلاف ہے لیکن پھر بھی آپ اس کے حق میں رائے دینے پر مجبور ہیں۔ میرے نزدیک یہ خیانت ہے' بددیانتی ہے' جھوٹ ہے' جس کی اسلام میں قطعاً اجازت نہیں ہے۔ پارلیمنٹ میں ہر شخص کو اپنی رائے آزادانہ طور پر دینے کا حق حاصل ہونا چاہئے۔ البتہ اگر کوئی مسئلہ جماعتی منشور سے متعلق ہو جس کی بنیاد پر آپ الیکشن لڑ کر آئے ہیں تو اس کا معاملہ جدا ہے۔ اگر اس کے بارے میں آپ کی رائے بدل گئی ہے تو پھر آپ کے لئے مستعفی ہونا لازم ہوگا۔

والیانِ امر کے خلاف الزام تراشی

دورِ جدید کی اسلامی ریاست میں ایک ایسے خودمختار ادارے کا قیام بھی لازمی ولابدی ہے جو والیانِ امر کے خلاف اٹھائے جانے والے اعتراضات اور ان پر عائد کئے جانے والے الزامات (impeachment) کا جائزہ لے اور الزامات ثابت نہ ہو سکنے کی صورت میں الزام تراشی کرنے والے افراد کو سزا دے۔ الزام تراشی کی بدترین مثال ہمیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف عبداللہ بن سبا کی ملتی ہے جس نے پروپیگنڈے کا طوفان کھڑا کر دیا تھا کہ یہ خائن ہیں' انہوں نے سارے مناصب اپنے رشتہ داروں کو دے دیئے ہیں' یہ کنبہ پروری کر رہے ہیں' بیت المال میں خیانت کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ حضرت عثمانؓ اپنی صفائی دے رہے ہیں' لیکن اس کا فیصلہ کون کرے؟ کہاں جائیں؟ حضرت علیؓ نے بھی حضرت عثمانؓ کی طرف سے صفائی دے دی لیکن وہ بھی کوئی ادارہ تو نہیں' یہ ان کی ذاتی رائے ہے۔ حضرت طلحہؓ و زبیرؓ بھی صفائی دے رہے ہیں' لیکن وہ بھی کوئی ادارے کی حیثیت نہیں رکھتے' لہٰذا اس کے لئے ایک ادارہ چاہئے جہاں فیصلہ ہو۔ اگر وہ ادارہ موجود ہو تو "Nip the evil in the bud" کے مصداق فتنہ آغاز ہی میں فرو ہو جائے

اور اگر ایسا کوئی ادارہ نہیں ہے تو فتنے کی آگ کو روکنے کی کوئی شکل موجود نہیں ہے۔ کوفے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو کیا پتہ کہ مصر کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ فتنہ پردازوں نے آکر جو چاہی بکواس بیان کر دی کہ عمرو بن العاص تو ایسا ہے' ایسا ہے۔ نہ کوئی ٹیلی کمیونیکیشن ہے نہ کوئی ریڈیو ہے۔ آج جدید ذرائع ابلاغ کے ہوتے ہوئے ہمارا حال یہ ہے کہ شہر کے ایک علاقے میں کوئی بات ہو جائے تو دوسرے علاقے میں پتہ نہیں چلتا کہ اصل واقعہ کیا ہوا ہو گا۔ صحیح خبر نہیں پہنچتی' افواہیں پھیل جاتی ہیں۔ آج کے دور کا یہ حال ہے تو اس دور کا تصور کیجئے۔ اگر کوئی ادارہ موجود ہوتا تو ساری الزام تراشیوں کی تحقیقات ہوتیں' جن کے نتیجے میں حضرت عثمانؓ کو بری قرار دیا جاتا اور الزام تراشی (impeachment) کرنے والوں کو قرار واقعی سزا دی جاتی' جس طرح کسی پر زنا کا الزام عائد کرنے کے بعد چار عینی گواہ پیش نہ کرنے والے کے لئے قذف کی سزا ۸۰ کوڑے ہیں۔ اسلامی ریاست میں خلیفۂ وقت کو بھی ایک عام شہری کی طرح عدالت میں حاضر ہو کر اپنے خلاف عائد کئے جانے والے الزامات کی جوابدہی کرنا ہو گی۔ اگر بے بنیاد الزام تراشی کرنے والوں کو سزا نہ دی جائے تو خلیفہ تو ہر وقت عدالتوں کے چکر میں ہی رہے گا۔ لہٰذا یہ اہتمام ضروری ہے تاکہ ہر شخص ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے کہ اگر میں الزامات ثابت نہ کر سکا تو شامت میری آجائے گی۔

(جاری ہے)

نکاح، طلاق اور حلالہ

قرآن و حدیث کی روشنی میں

—— پروفیسر عبداللہ شاہین ——

میاں بیوی کا تعلق در حقیقت انسانی زندگی اور تمدن کی جڑ اور بنیاد ہے۔ عورت اور مرد کے تعلق کی درستی پر پورے معاشرے کی درستی کا انحصار ہے اور اس کی خرابی پر پورے انسانی تمدن کی خرابی کا مدار ہے۔ اس لئے وہ شخص بہت بڑا فسادی ہے جو اس جڑ کو کاٹتا اور اس بنیاد کو بگاڑتا ہے اور اس طرح پورے خاندان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ شیطان اپنے مرکز سے زمین کے ہر حصے میں اپنے چیلے بھیجتا ہے جو واپس آکر اپنی کارروائیاں سناتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے میں نے فلاں بگاڑ پیدا کیا، کوئی کہتا ہے میں نے فلاں فساد برپا کیا۔ مگر ابلیس سب سے کہتا ہے تو نے کچھ نہ کیا۔ پھر ایک آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ میں ایک عورت اور اس کے شوہر میں جدائی ڈال آیا ہوں۔ یہ سن کر ابلیس اس کو گلے لگالیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو واقعی کارنامہ کرکے آیا ہے!

قرآن مجید نے ایسے پیروں، فقیروں، جادوگروں، عاملوں اور تعویذ گنڈے کرنے والوں کا ذکر کیا ہے جن کے عملیات، نقوش اور تعویذات پر لوگ ٹوٹے پڑتے تھے اور جو لوگوں کو عموماً ایسی باتیں سکھاتے یا ایسے ٹونے ٹوٹکے فراہم کرتے تھے جن سے وہ شوہر بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ بقولہ تعالیٰ :

﴿فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ﴾

(البقرہ:۲۰۱)

"یہ لوگ وہ چیز سیکھتے تھے جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں"

گویا سب سے زیادہ جس چیز کی مانگ تھی وہ یہ تھی کہ کوئی ایسا عمل یا تعویذ مل جائے جس کے ذریعے شوہر سے بیوی کو الگ کیا جا سکے۔ آج بھی آپ ہمارے معاشرے میں دیکھتے ہیں کہ جوتشیوں' رملیوں' نجومیوں' جوگیوں اور دم کرنے والوں کے پاس اکثر ان عورتوں کا ہجوم ہوتا ہے جو ساس' بہو' نند' بھاوج اور میاں بیوی کو زیر و زبر کرنے کے لئے نقش اور تعویذ حاصل کرتی پھرتی ہیں۔

لیکن اسلام کی تعلیمات کا اصل رخ میاں بیوی کو عمر بھر کے لئے جوڑنا ہے' کیونکہ اسے ختم کرنے کا اثر صرف میاں بیوی پر ہی نہیں پڑتا بلکہ نسل و اولاد کی تباہی و بربادی اور بعض اوقات خاندانوں اور قبیلوں تک میں فساد کی نوبت پہنچتی ہے۔ اس لئے اسلام نے "طلاق" کی حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ جہاں تک ہو سکے اس سے روکا ہے۔ اور انتہائی مجبوری کی حالت میں اس کی اجازت دی ہے۔ حدیث میں ہے :

مَا اَحَلَّ اللّٰہُ شَیْئًا ابغض الیہِ مِنَ الطَّلاق (ابوداؤد)

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال اور جائز چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ طلاق ہے"۔

اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا :

"نکاح کرو اور طلاق نہ دو' کیونکہ طلاق سے عرشِ رحمٰن ہل جاتا ہے"۔

تمام امتِ مسلمہ کا اتفاق ہے کہ نکاح اگرچہ ایک عمرانی' سماجی اور معاشرتی معاہدہ اور ایک مرد و عورت کے باہمی ایجاب و قبول کا نام ہے تاہم اس کی حیثیت ایک سنت اور عبادت کی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے :اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِی (ابن ماجہ) "نکاح کرنا میری سنت ہے"۔ نیز فرمایا ۔ وَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِی فَلَیْسَ مِنِّی (متفق علیہ) "جس نے میری سنت سے منہ موڑا پس وہ میری امت سے ہی نہیں ہے"۔

مزید برآں نکاح کو نصف ایمان قرار دیتے ہوئے فرمایا :

اِذَا تزوَّجَ العبدُ فقد استکمَلَ نِصفَ الدِّینِ فَلْیَتَّقِ اللّٰہَ فِی النِّصفِ البَاقِی (بیہقی)

"جب بندے نے بیاہ کر لیا تو اس نے آدھا دین مکمل کر لیا۔ اب اسے باقی آدھے کے لئے اللہ کا خوف کرتے ہوئے پرہیزگاری اختیار کرنی چاہئے"۔

یعنی شادی کرنے سے انسان کا آدھا ایمان تو خود بخود مکمل ہو جاتا ہے اور شریکِ حیات کے شریکِ آرزو ہونے کے باعث نگاہ کی پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے اور عموی طور پر انسان قلب و نظر کی خیانت سے بچ جاتا ہے۔

نگاہ کی پاکیزگی کے حصول کے لئے طبیبِ قلوب، رب کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نسخہ کیمیا بھی بتایا ہے کہ

یَا معشرَ الشَّباب مَن استَطاع مِنکمُ البَاءَة فَلْیَتزوَّجْ فَاِنَّہ اعضُّ لِلبَصَرِ واحصَنُ لِلفَرجِ ومَن لم یَستطعْ فعَلیہ بالصَّومِ فَانَّہ لہٗ وِجَاءٌ (بخاری و مسلم)

"اے نوجوانو! تم میں سے جو شادی کی استطاعت رکھتا ہو تو اسے شادی کر لینی چاہئے۔ پس نکاح نظروں کو نیچا رکھنے والا اور شرم گاہ کی حفاظت کرنے والا ہے اور جو بیاہ کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے روزہ رکھنا چاہئے۔ پس روزہ اس کی شہوت کو کم کرنے والا ہو گا"۔

پھر یہ خوش خبری ارشاد فرمائی :

مَامِن مسلِم ینظُر الٰی محاسِنِ امرءۃٍ اوّل ثم یغضُّ بصَرَہٗ الّا احدثَ اللّٰہُ عبادۃً تحدُ حَلاوتَہا (احمد)

"جس مسلمان کی نظر کسی مسلمان عورت پر پڑے، پھر وہ اپنی نظر کو جھکا لے تو اللہ تعالیٰ اسے ایسی عبادت کا موقع عطا فرمائے گا جس سے اسے مزہ آئے"۔

اور اگر کبھی بشری تقاضا سے کسی نامحرم عورت کی طرف اٹھنے والی نگاہ سے کسی فتنہ یا لغزش کا احتمال پیدا ہونے لگے تو دنیا کے سب سے بڑے ماہر نفسیات و معالج خاص (Specialist)، نبی عفت مآب ﷺ نے یہ حکیمانہ ارشاد فرمایا :

ایّما رجلٍ رآی امرءۃً تُعجِبہٗ فَلیقُمْ الٰی اھلہٖ فانَّ معَہا مِثلَ الّذی معَہا (دارمی)

"جس شخص کو کوئی عورت اچھی معلوم ہو' وہ فوراً اپنے گھر چلا جائے اور اپنی بیوی سے صحبت کر لے۔ اس لئے کہ اس کے پاس بھی وہی چیز ہے جو اس عورت کے پاس ہے"۔

نیز اس نازک جذباتی مرحلہ پر بیوی کے پاس جانے سے نہ صرف نفسیاتی و جنسی علاج ہوتا ہے بلکہ دنیا کے سب سے سچے اور فطری مذہب "اسلام" کو لانے والی ہستی ﷺ نے یہ بشارت بھی سنادی کہ اس عمل خیر سے جنسی تسکین کے علاوہ انسان عند اللہ محبوب و ماجور بھی ہوتا ہے۔ فرمایا :

"بیوی سے مجامعت کرنا صدقہ ہے"۔ صحابہؓ نے یہ سن کر پوچھا۔ "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) ہم میں سے ایک آدمی اپنی شہوت پوری کرتا ہے اور اس میں بھی ثواب ملتا ہے؟" آپؐ نے فرمایا۔ "یہ تو بتلاؤ کہ اگر وہ حرام کاری سے اپنی شہوت پوری کرتا تو اس پر گناہ ہوتا یا نہیں؟" اسی طرح اس کا حلال طریقہ پر شہوت پوری کرنا موجبِ ثواب ہے"۔ (مسلم)

اسلام کی ان ساری تعلیمات کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ معاشرہ جنسی بے راہ روی اور انتشار کا شکار نہ ہو اور آزادانہ شہوت رانی اور چوری چھپے کی آشنائیوں [1] کی نوبت نہ آئے۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے :

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ (المائدہ:۵)

"پاک دامن مؤمن عورتیں اور پاک دامن اہلِ کتاب عورتیں بھی (حلال ہیں) جبکہ تم ان کا مہر دے دو اور ان سے عفت قائم رکھنی مقصود ہو نہ کہ کھلی بدکاری کرنی اور نہ ہی چھپی دوستی کرنی"۔

پھر فرمایا :

﴿ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ

بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ﴾ (النساء : ۲۵)

"پس ان کے ولی کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کرلو اور معروف طریقہ سے ان کے مہر ادا کر دو' تا کہ وہ شادی شدہ ہونے کے باعث محفوظ ہو کر رہیں' آزاد شہوت رانی نہ کرتی پھریں اور نہ ہی چوری چھپے یاریاں لگاتی پھریں"۔

گویا قرآن و حدیث سے ثابت ہوا کہ اسلام ایک مکمل اور پاکیزہ نظام حیات کا نام ہے' جس میں خالق کائنات کی طرف سے انسانی فطرت میں رکھے ہوئے شہوانی جذبات پر پابندی کی بجائے ان کی تسکین کا بہترین اور عفت مآب سامان موجود ہے۔ یہ ایک عبادت ہونے کے باعث کارِ ثواب بھی ہے اور اس سے انسانی معاشرے کی مضبوط اور صحت مند بنیاد بھی پڑتی ہے۔

البتہ وہ لوگ جو (نعوذ باللہ) خدا اور مذہب سے بیزار یا بے نیاز ہیں' وہ شادی بیاہ کے معاملہ کو بھی عام لین دین اور شراکت داری کی طرح باہمی رضامندی سے طے ہو جانے والا ایک عام معاملہ قرار دیتے ہیں جس کا مقصد شہوت براری کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس نظریئے نے انسانوں کو جنگل کے جانوروں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے' جس سے جنسی بے راہ روی عام ہوئی ہے۔ اسی نظریہ کے باعث مغرب میں لوگ "انسانی حقوق" "آزادیٔ فکر" اور "حریتِ عمل" کے نام نہاد نعرہ پر یہاں تک چلے گئے ہیں کہ باہمی رضامندی سے اگر ایک مرد اور ایک عورت زنا کر رہے ہیں تو یہ کوئی جرم نہیں۔ افسوس کہ ہمارے معاشرے میں بھی کچھ ایسے مغرب زدہ لوگ ہیں جو استعارے اور کنائے کی زبان میں بڑے فخر سے کہتے ہیں : "جب بازار میں دودھ عام ملتا ہو تو گائے کو کون گھر میں باندھے!" اس طرح وہ نکاح کے پاکیزہ عمل سے اعراض کرتے ہوئے آزاد شہوت رانی کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ مگر اسلام نے اس مادر پدر آزادی کے تصور کی مذمت کی ہے اور عفت سامانی و وفاشعاری کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا :

تَزَوَّجُوا وَلَا تُطَلِّقُوا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الذَّوَّاقِيْنَ

وَالذَّوَّاقَاتِ(الحدیث)

"نکاح کرو اور طلاق نہ دو کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو (بھونرے کی طرح پھول پھول کا) مزا چکھتے پھرتے ہیں"۔

غرضیکہ اسلام کا منشا یہ ہے کہ نکاح کا معاملہ عمر بھر کے لئے رہے۔ لیکن اگر میاں بیوی میں ناموافقت کی صورت پیدا ہو جائے تو پہلے سمجھانا بجھانا ہے 'پھر ڈانٹ ڈپٹ' اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو خاندان کے چند افراد کو ثالث بنا کر معاملہ طے کرنا ہے۔ بقولہٖ تعالیٰ

﴿وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا﴾ (النساء : ۳۵)

"اور اگر تم کو معلوم ہو کہ میاں بیوی میں اَن بَن ہے تو ایک منصف مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف عورت کے خاندان میں سے مقرر کرو"۔

اس کی مصلحت یہ ہے کہ اگر معاملہ خاندان سے باہر چلا جائے تو بات بڑھ جانے اور دلوں میں زیادہ رنجش پیدا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات اصلاحِ احوال کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں اور میاں بیوی کا باہم مل کر رہنا ایک عذاب بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں تعلق ختم کر دینا ہی راحت اور سلامتی کی راہ ہو جاتی ہے اور بقول شاعر ع "چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں" کا مصرع ہی صادق آتا ہے۔ لیکن محض غصہ نکالنے اور انتقامی جذبات کا کھیل بنانے کے لئے نہیں بلکہ یہ مرحلہ انتہائی عمدگی اور حسن معاملہ کے ساتھ طے ہونا چاہئے۔ شاعری کی زبان میں یوں کہئے کہ۔

وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اسے اِک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

کیونکہ قرآن مجید میں جہاں بھی طلاق کا ذکر آیا ہے 'احسان کا حکم دیا گیا ہے۔ کہیں فرمایا :

﴿فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ﴾ (البقرہ : ۲۲۹)

"یا تو عورت کو سیدھی طرح رکھ لیا جائے یا بھلے طریقے سے اس کو رخصت کر دیا جائے"۔

کسی مقام پر فرمایا :

﴿فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْفَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾

(الطلاق : ۲)

"پس یا تو ان کو معروف طریقہ سے رکھ لو یا عمدہ طریقہ سے رخصت کر دو"۔

اور کہیں ارشاد ہوا :

﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْسَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ (البقرہ ۲۳۱)

"اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہونے کو آ جائے تو یا تو بھلے طریقے سے انہیں رکھ لو یا عمدہ طریقے سے رخصت کر دو"۔

بہرحال جس طرح شریعت اسلامی نے نکاح کے معاملے اور معاہدے کو ایک عبادت کی حیثیت دے کر عام معاہدات سے بلند سطح پر رکھا ہے' اسی طرح اس معاملہ کا ختم کرنا بھی آزاد نہیں رکھا کہ ع

جب تک چاہا دل سے کھیلا اور جب چاہا توڑ دیا

بلکہ اس کے لئے ایک حکیمانہ قانون اور ضابطہ بنایا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے امتِ مسلمہ کے مَردوں کو فرمایا گیا :

﴿یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾

(الطلاق : ۱)

"اے نبیؐ! جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کی عدت کے مطابق ان کو طلاق دو"۔

گویا قانونِ طلاق کا آغاز اس طرح فرمایا گیا ہے کہ اس کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے جس میں فطرتاً برداشت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن عورت بھی اس حق سے بالکل محروم نہیں کہ وہ کسی ظالم شوہر کے ظلم و ستم سہنے پر مجبور ہو جائے اور علیحدگی اختیار نہ کر سکے۔ بلکہ اس کو حق دیا گیا ہے کہ حاکم وقت کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کر کے طلاق حاصل کر سکے۔ اسے اسلامی اصطلاح میں "خلع" کہتے ہیں۔ ایسی صورت میں اسے صرف حق مہر چھوڑنا پڑتا

ہے۔

لیکن جس طرح مرد کے لئے طلاق کے اختیار کو استعمال کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ ہے اور صرف مجبوری کی حالت میں آخری اقدام کے طور پر اس کی اجازت ہے' اسی طرح جو عورت بلاوجہ اپنے خاوند سے "خلع" طلب کرتی یعنی طلاق مانگتی ہے اس کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

"جو عورت بلاوجہ اپنے شوہر سے طلاق مانگے اس پر جنت کی خوشبو بھی حرام ہے"۔ (احمد' ترمذی' ابوداؤد' ابن ماجہ' دارمی)

قانون طلاق میں دوسری مصلحت یہ اختیار کی گئی ہے کہ غصے کی حالت میں یا کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری میں اس اختیار کو استعمال نہ کیا جائے۔ اسی حکمت کے ماتحت حالتِ حیض میں طلاق دینے سے منع کیا گیا ہے' کیونکہ ان دنوں میاں بیوی میں باہم کشش نہیں ہوتی اور عورت کا مزاج بھی طبی نقطہ نظر سے اعتدال پر نہیں ہوتا۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دے دی۔ حضرت عمرؓ نے رسول اکرم ﷺ سے اس کا ذکر کیا۔ آپؐ سن کر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا "اس کو حکم دو کہ بیوی سے رجوع کرلے اور اسے اپنی زوجیت میں روکے رکھے' یہاں تک کہ وہ حیض سے فارغ ہو کر پاکیزہ ہو جائے۔ اس کے بعد اگر وہ طلاق دینا چاہے تو بغیر مباشرت کے طلاق دے دے"۔

یاد رہے کہ پاکیزگی کی حالت میں بھی اگر ہم بستری ہو چکی ہے تو اس دوران میں طلاق دینے کی ممانعت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ممکن ہے وہ حاملہ ہو چکی ہو۔ اور چونکہ حاملہ عورت کی مدتِ عدت "وضع حمل" یعنی بچے کی پیدائش تک ہے اس طرح اس کی مدت عدت طویل ہو جائے گی جس سے اس کو تکلیف ہوگی۔

یہی حکم باری تعالیٰ مذکورہ بالا آیت مبارکہ "فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ" میں دیا گیا ہے یعنی عورتوں کو ان کی عدت کا خیال رکھ کر طلاق دو۔ پھر حکم ربانی ہوا۔

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ﴾

(البقرہ : ۲۲۹)

"طلاق دو مرتبہ ہے۔ پھر یا تو عورت کو بھلے طریقے سے روک لیا جائے یا (تیسری مرتبہ طلاق دے کر) بھلے طریقے سے رخصت کر دیا جائے"۔

یعنی نکاح کا معاملہ ایک دم ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے تین درجے' تین طلاقوں کی صورت میں رکھے گئے ہیں' جو ہر مہینے ایک طلاق دے کر تین مہینوں میں مکمل ہونے چاہئیں۔ مذکورہ بالا آیت کریمہ کے لفظ "مَرَّتَان" میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ طلاق دینے کا اصل شرعی طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو طلاق تک نوبت پہنچا دی جائے۔ اور وہ بھی بیک وقت اور بیک لفظ نہ ہوں بلکہ دو طُہروں (پاکیزگی کی حالت میں دو مہینوں) میں الگ الگ ہوں۔ پھر تیسرے طہر (مہینے) میں یا تو بیوی کو تیسری طلاق دے کر بھلے طریقے سے رخصت کر دیا جائے یا عمدگی سے صلح و صفائی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے گھر کے اندر رکھ لیا جائے۔

رہی یہ صورت کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے ڈالی جائیں' جیسا کہ آج کل دین سے بے پروائی اور اس کے احکام سے غفلت کی بنا پر جاہلوں کا عام طریقہ ہے' بلکہ عدالتوں میں بعض پڑھے لکھے عرائض نویس بھی تین طلاق سے کم کو گویا طلاق ہی نہیں سمجھتے' تو یہ سخت گناہ ہے۔ حدیث میں امام نسائی نے بروایت محمود بن لبید نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ایک شخص کے متعلق خبر دی گئی جس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دے دی تھیں۔ آپ غصہ میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا :

اَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللّٰهِ وَاَنَا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ

"کیا اللہ کی کتاب سے کھیل کیا جاتا ہے حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں"۔

ایک صحابیؓ نے عرض کیا : حضورؐ میں اس شخص کو قتل نہ کر دوں؟ (یعنی صحابیؓ کو بھی یہاں تک غصہ آیا)

امام طحاوی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کے پاس آیا اور اس نے کہا۔ میرے چچا نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے ڈالی ہیں۔ انہوں نے جواب دیا :

انّ عمّک عصی اللّٰہ فأثم واطاع الشّیطان

"تیرے چچا نے اللہ کی نافرمانی کی اور گناہ کا کام کیا اور شیطان کی پیروی کی"۔

اور حضرت عمرؓ سے یہاں تک ثابت ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دے دیتا تھا آپؓ اس کو دُرے لگاتے تھے۔

گویا طلاق کا صحیح طریقہ جو قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے' یہ ہے کہ عورت کو حالتِ طہر (پاکیزگی) میں' جس میں جماع نہ کیا ہو' ایک طلاق دی جائے' پھر اگر شوہر چاہے تو وہ دوسرے طہر (دوسرے مہینے) میں دوبارہ ایک طلاق دے دے۔ ورنہ بہتر اور پسندیدہ یہی ہے کہ پہلی طلاق پر ہی اکتفا کرے۔ اس صورت میں شوہر کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے کہ عدت (یعنی تین مہینے) گزرنے سے پہلے پہلے جب چاہے رجوع کرلے اور اگر عدت گزر بھی جائے تو موقع باقی رہتا ہے کہ پھر باہمی رضامندی سے دونوں دوبارہ نکاح کرلیں۔ لیکن اگر تیسری طلاق بھی دے دی جائے' تو نہ تو شوہر کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے اور نہ ہی اس کا موقع رہتا ہے کہ دونوں کا پھر نکاح ہو سکے۔

اس صورت میں اکثر و بیشتر تین طلاقیں دینے والے بعد میں پچھتاتے اور مصیبت جھیلتے ہیں' خصوصاً جب کہ صاحبِ اولاد بھی ہوں۔ اب وہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح بیوی ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے انتہائی آسانی کا سامان فراہم کیا تھا کہ وہ ایک ایک کرکے الگ الگ طہر میں طلاق دیں۔ اس دوران میں مصالحت کی راہیں کھلی تھیں اور سوچ بچار کا خوب موقع تھا۔ اگر بیوی کی کچھ عادات ناپسند تھیں تو بیوی سے ملنے والی راحتوں' اولاد کی پرورش اور گھر کے انتظام کی سہولتوں کی طرف ہی توجہ چلی جاتی اور رجوع کا فیصلہ ہو جاتا۔ مگر اب اس نے اپنے سارے اختیارات' شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظرانداز کرکے' ختم کر دیئے۔

اب اگر دونوں میاں بیوی راضی ہو کر آپس میں دوبارہ نکاح کرنا بھی چاہیں تو جب تک بیوی کا نیا نکاح (عدت پوری کرنے کے بعد) کسی دوسرے مرد سے نہ ہو جائے۔ پھر اتفاق سے وہ مرد اپنی مرضی [۲] سے کبھی طلاق دے دے یا فوت ہو جائے تو (عدت پوری کرنے کے بعد) پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے' وگرنہ نہیں۔ کیونکہ شریعت کا حکم یہ ہے :

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا﴾ (البقرہ : ۲۳۰)

"پھر اگر (قطعی) طلاق دے دی جائے تو وہ عورت اس کے لئے حلال نہ ہو گی سوائے اس کے کہ اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو۔ پھر اگر وہ (دوسرا شخص) بھی اسے طلاق دے دے تو ان دونوں (یعنی عورت اور پہلے شوہر) پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ باہم رجوع کر لیں"۔

اس موقع پر تین طلاقیں دینے والے ایک "چور دروازے" کا بندوبست کرتے ہیں۔ یعنی کسی پیشہ ور مولوی سے "حلالہ" کا فتویٰ لیتے ہیں' پھر ایک مرد کو وقتی نکاح کے لئے تیار کرتے ہیں اور سوچی سمجھی سکیم کے تحت عورت کو چند دنوں کے لئے اس کے نکاح میں دے دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ پرلے درجے کی بے حیائی بھی ہے کہ عورت کو محض حلال اور جائز کرنے کے لئے کسی سے اس کی عصمت دری کرائی جائے۔ ایسے شخص کو حضور ﷺ نے "کرائے کا سانڈ" اور لعنتی فرمایا ہے اور ایسے نکاح کو "سازشی نکاح" [۳] قرار دیا ہے۔ حدیث میں حضرت عقبہ بن عامرؓ سے مروی ہے کہ رسول پاکؐ نے صحابہؓ سے پوچھا : اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِالتَّيْسِ الْمُسْتَعَارِ؟ "کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ کرائے کا سانڈ کون ہوتا ہے؟" صحابہؓ نے عرض کیا' ضرور ارشاد فرمائیں۔ فرمایا : هُوَ الْمُحَلِّلُ... "وہ حلالہ کرنے والا ہے" لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ... "اللہ تعالیٰ نے حلالہ کرنے والے اور جس کے لئے حلالہ کیا گیا' دونوں پر لعنت فرمائی ہے"۔ (ابن ماجہ' دار قطنی)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ... "اللہ تعالیٰ نے حلالہ کرنے والے اور جس کے لئے حلالہ کیا گیا' دونوں پر لعنت فرمائی ہے"۔ (ترمذی' نسائی)

ایک روایت میں ہے کہ یہ نکاح ہی نہیں جس میں باطن کچھ ہے اور ظاہر کچھ ہے' جس میں خدا کی کتاب سے مذاق اور ہنسی [۴] ہے۔ نکاح صرف وہی ہے جو رغبت کے ساتھ ہو۔ (ابن کثیر)

مستدرک حاکم میں ہے کہ ایک شخص نے از خود اپنے بھائی کے لئے "حلالہ" کی غرض سے نکاح کیا۔ پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے اس نکاح کے متعلق فتویٰ پوچھا تو حضرت عبداللہؓ نے فرمایا : ہم ایسے نکاح کو حضورؐ کے زمانہ میں "زنا" شمار کرتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہاں تک فرمایا کہ جو ایسا کرے یا کرائے گا تو میں اسے "زنا کی حد" لگاؤں گا۔ (ابن کثیر)

یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ آیا بیک وقت دی ہوئی تین طلاقیں نافذ بھی ہوں گی یا نہیں؟ صحیح مسلم شریف اور اکثر کتب احادیث میں منقول حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانہ میں' حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں طلاق کا طریقہ یہ تھا کہ بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا' لیکن حضرت عمرؓ نے بیک وقت ایک سے زائد طلاق کے رجحان کی حوصلہ شکنی کرنے کے لئے فرمایا : لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے معاملہ جس میں ان کے لئے مہلت تھی۔ تو مناسب رہے گا ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں۔ چنانچہ آپ نے ان پر نافذ کر دیا۔ (صحیح مسلم' جلد اول)

اپنے دورِ خلافت میں حضرت عمرؓ کے اس اقدام کی روشنی میں اہل سنت کے اکثر و بیشتر ائمہ فقہاء بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کو تین ہی قرار دیتے ہیں۔ لیکن حضرت سعید بن مسیب اور بعض دوسرے تابعین کہتے ہیں کہ جو شخص سنت کے خلاف طلاق دے یا بیک وقت تین طلاق دے' اس کی طلاق سرے سے واقع ہی نہیں ہوتی --- یہی رائے امامیہ کی ہے۔ حضرت طاؤس اور عکرمہ کہتے ہیں کہ تین طلاق دی جائیں تو صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے۔ اسی رائے کو امام ابن تیمیہؒ نے اختیار کیا ہے۔۔ آج کل کے دور میں اہل حدیث حضرات کا بھی یہی مسلک ہے۔

اس کے جواب میں دیگر حضرات یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو "طلاق بتہ" دے دی۔ یعنی بیک لفظ "البتۃ" استعمال کرتے ہوئے تین طلاقیں دے دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استفسار کیا تو حضرت رکانہ نے کہا میری نیت تین کی نہیں ایک کی تھی۔ حضورؐ نے قسم لی۔ حضرت رکانہ نے حلف دیا۔ آپؐ نے ایک ہی طلاق قرار

دے دی۔ (مشکوٰۃ 'باب خلع اور طلاق 'فصل دوم 'ترمذی 'ابوداؤد 'ابن ماجہ 'دارمی) گویا یہ طلاق دینے والے کی نیت پر منحصر ہے کہ اس نے تین طلاقیں ہی دی تھیں یا اس کی نیت ایک طلاق کی تھی۔ بہر حال حنفی حضرات تین طلاق کے ہی قائل ہیں۔ اس لئے انہیں تو تین طلاق کا لفظ منہ سے نکالتے ہوئے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے 'کیونکہ ان کے لئے اس کے بعد بیوی کو پاس رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔ رہا "حلالہ" کا طریقہ 'تو یہ حرام اور لعنتی عمل ہے جس کی حقیقت قرآن و حدیث کے ساتھ ہنسی اور مذاق ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے گھروں میں امن و عافیت کی فضا قائم رکھے اور ہمیں قرآن و حدیث کے مطابق عمل کرنے کی توفیق دے 'تاکہ ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی سے بچیں اور عنداللہ مسئول ہونے کی بجائے ماجور ہوں۔ آمین!

حواشی

{۱} اسلام نے چوری چھپے شادیوں کی مذمت اور ممانعت فرمائی ہے۔ آپ خود ہی سوچئے کہ ایک شخص کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے جسے وہ پیار و محبت سے پال پوس کر جوان کرتا ہے۔ اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے لئے تن 'من 'دھن 'نچھاور کرتا ہے۔ اگر وہ جوان ہو کر ایک نوجوان کے ہمراہ راہ فرار اختیار کرے اور عدالت میں ایک بیان دے کر چپکے سے شادی کر لے 'جسے ہمارے یہاں کورٹ میرج یا سول میرج (Civil Marriage) کہتے ہیں تو باپ کے پلے کیا رہ جاتا ہے؟ چنانچہ امت کی عزت و غیرت کے رکھوالے نبیؐ نے نکاح کا قاعدہ 'کلیہ بیان فرما دیا کہ

لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ (احمد 'ترمذی 'ابوداود 'ابن ماجہ 'دارمی)

"ولی (سرپرست) کے بغیر نکاح نہیں ہے"۔

پھر فرمایا:

اَيُّمَا امْرَءَةٍ نَكَحَتْ نَفْسَهَا بِغَيْرِ اِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ

(احمد 'ترمذی 'ابوداود 'ابن ماجہ 'دارمی)

"جس لڑکی نے اپنے سرپرست (باپ 'بھائی وغیرہ) کی اجازت کے بغیر اپنا نکاح کیا اس کا نکاح باطل (غلط) ہے"۔

حتیٰ کہ یہاں تک وعید فرمائی۔

لَا تُزَوِّجِ الْمَرْءَةُ نَفْسَهَا فَاِنَّ الزَّانِيَةَ هِيَ الَّتِي تُزَوِّجُ نَفْسَهَا

(ابن ماجہ)

"کوئی لڑکی اپنا نکاح خود نہ کرے' پس جو خود اپنا نکاح کرے گی وہ زنا کرنے والی ہے"۔

نیز:

اَلْبَغَایَا الّتِی یُنْکِحْنَ اَنْفُسَهُنَّ بِغَیْرِ بَیِّنَةٍ

"جو عورتیں گواہوں کے بغیر نکاح کر لیتی ہیں وہ زنا کرنے والی ہیں"۔

ایک رائے یہ ہے کہ عاقل و بالغ لڑکی اپنا نکاح خود کر سکتی ہے۔ یہ رائے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ بالا واضح حدیث کے باوجود قرآن مجید کی اس آیت سے اخذ کی گئی ہے

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ (البقرہ ۲۳۱)

"جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو پھر اس میں مانع نہ ہو کہ وہ اپنے زیرِ تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں"۔

حالانکہ اس آیت مبارکہ میں "طلاق شدہ" عورت کا ذکر ہے کنواری لڑکی کا نہیں اور مطلقہ عورت یقیناً ازدواجی زندگی کے تجربے سے گزرنے کے بعد پختہ رائے (matured) ہو چکی ہوتی ہے۔ اور اسی کی مثل بیوہ عورت ہے جس کے بارے میں نبی فطرت شناس ﷺ نے فرمایا: "بیوہ عورت اپنے نکاح کے بارے میں اپنے ولی سے زیادہ حقدار ہے"۔ لیکن کنواری لڑکی کے بارے میں فرمایا کہ

اَلْبِكْرُ يُسْتَأْذِنُهَا اَبُوْهَا فِیْ نَفْسِهَا (مسلم)

"کنواری لڑکی سے اس کے نکاح کی اجازت اس کا باپ حاصل کرے"۔

گویا اسلام نے نکاح کا اصول یہ رکھا ہے کہ نکاح گواہوں کی موجودگی میں' اور ولی کی سرپرستی میں عورت کی اجازت سے کیا جائے اور اس کا اعلان عام کیا جائے۔

{۲} زبردستی اور زورِ بازو سے لی ہوئی طلاق جسے (طلاقِ مکرہ) کہتے ہیں' واقع نہیں ہوتی۔ کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: لَا طَلَاقَ فِی اِغْلَاقٍ (ابوداؤد' ابن ماجہ) یعنی "زبردستی کی طلاق نہیں ہے"۔ (ابوداؤد' ابن ماجہ)

{۳} "سازشی نکاح" (جس کو "حلالہ" کہا جاتا ہے) جس میں پہلے سے طے ہو کہ عورت کو سابق شوہر کے لئے حلال کرنے کی خاطر ایک آدمی اس سے نکاح کرے گا اور مباشرت کرنے کے بعد اسے طلاق دے دے گا' تو امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ نکاح فاسد ہے۔ (تفہیم القرآن)

{۴} نئے نکاح کے لئے "عدت" کا پورا ہونا بھی شرط ہے مگر "حلالہ" کی شکل میں نیا نکاح' جو خود فریبی' جھوٹ اور ڈرامہ ہے' اس میں حلالہ کرنے اور کرانے والے چند دنوں کے اندر ہی سارا عمل مکمل کر لیتے ہیں۔ حالانکہ اس نکاح کو اگر صحیح بھی "فرض" کر لیا جائے تو عورت کو پہلے شوہر سے تین طلاق ملنے کے بعد تین طہر (مہینوں) تک انتظار کرنا چاہئے تھا اور دوسرے فرضی شوہر سے جس کو کرائے کا سانڈ کہا گیا ہے' دوبارہ طلاق ملنے کے بعد پھر

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

قتلِ مرتد — عقلی جواز (۲)

مخالفین کے اعتراضات کے جواب میں سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی نگارشات

—— مرتب : محمد اسماعیل قریشی ——

جوابی کارروائی کا خطرہ

پچھلے صفحات میں ہم نے دنیا کے دوسرے نظاموں سے سزائے ارتداد کی جو مثالیں پیش کی ہیں' وہ ایک اور الجھن کو بھی رفع کر دیتی ہیں' جو اس مسئلہ میں اکثر سطحی النظر لوگوں کے دماغ کو پریشان کیا کرتی ہے۔ یہ لوگ سوچتے ہیں کہ اگر دوسرے ادیان بھی اسی طرح اپنے دائرے سے باہر جانے والوں کے لیے سزائے موت کا قانون مقرر کر دیں' جس طرح اسلام نے کیا ہے' تو یہ چیز اسلام کی تبلیغ کے راستے میں بھی ویسی ہی رکاوٹ بن جائے گی' جیسی دوسرے ادیان کی راہ میں بنتی ہے۔ اس کا اصولی جواب اس سے پہلے ہم دے چکے ہیں' مگر یہاں ہمیں اس کا عملی جواب بھی مل جاتا ہے۔ معترضین ناواقفیت کی بنا پر اپنا اعتراض لفظ "اگر" کے ساتھ پیش کرتے ہیں' گویا کہ واقعہ یہ نہیں ہے' حالانکہ دراصل وہ چیز' جس کا یہ اندیشہ ظاہر کرتے ہیں' واقعہ کی صورت میں موجود ہے۔ دنیا میں جو دین بھی اپنی ریاست رکھتا ہے' وہ اپنے حدود اقتدار میں ارتداد کا دروازہ بزور بند کیے ہوئے ہے۔ غلط فہمی صرف اس وجہ سے واقع ہوتی ہے کہ آج کل عیسائی قومیں اپنی مملکتوں میں عیسائیت سے مرتد ہو جانے والوں کو کسی قسم کی سزا نہیں دیتیں اور ہر شخص کو آزادی عطا کر دیتی ہیں کہ جس مذہب کو چاہے اختیار کر لے۔ اس سے لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ان کے قانون میں ارتداد جرم نہیں ہے اور یہ ایک رحمت ہے' جس کی وجہ سے مذہبی تبلیغ تمام رکاوٹوں سے آزاد ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ عیسائیت ان قوموں کے افراد کا

محض ایک شخصی مذہب ہے' ان کا "اجتماعی دین" نہیں ہے' جس پر ان کی سوسائٹی کا نظام اور ان کے سٹیٹ کی عمارت قائم ہو۔ ان کے عیسائیت سے پھر جانے کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتیں کہ اس پر رکاوٹ عاید کرنے کی ضرورت محسوس کریں۔ رہا ان کا "اجتماعی دین" جس پر ان کی سوسائٹی اور ریاست کی بنیاد قائم ہوتی ہے' تو اس سے مرتد ہونے کو وہ بھی اسی طرح جرم قرار دیتی ہیں' جس طرح اسلام اسے جرم قرار دیتا ہے اور اس کو دبانے کے معاملے میں وہ بھی اتنی ہی سخت ہیں جتنی اسلامی ریاست سخت ہے۔ انگریزوں کا اجتماعی دین عیسائیت نہیں ہے بلکہ برطانوی قوم کا اقتدار اور برطانوی دستور و آئین کی فرمانروائی ہے' جس کی نمائندگی تاج برطانیہ کرتا ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ کا اجتماعی دین بھی عیسائیت نہیں بلکہ امریکی قومیت اور وفاقی دستور کا اقتدار ہے' جس پر ان کی سوسائٹی ایک ریاست کی شکل میں منظم ہوئی ہے۔ اسی طرح دوسری عیسائی قوموں کے اجتماعی دین بھی عیسائیت کے بجائے ان کے اپنے قومیت سٹیٹ اور دستور ہیں۔ ان ادیان سے ان کا کوئی پیدائشی یا اختیاری پیرو ذرا مرتد ہو کر دیکھ لے' اسے خود معلوم ہو جائے گا کہ ان کے ہاں ارتداد جرم ہے یا نہیں۔

اس معاملے کو انگریزی قانون کے ایک مصنف نے خوب واضح کر دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> "یہاں ہم تفصیل کے ساتھ ان وجوہ کی تحقیق نہیں کرنا چاہتے' جن کی بنیاد پر ریاست نے مذہب کے خلاف بعض جرائم پر سزا دینے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ تجربے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ بعض خاص افعال یا طرزِ عمل' جو مذہب میں ممنوع ہیں' اجتماعی زندگی کے لیے بھی خرابی اور بدنظمی کے موجب ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ افعال غیر قانونی اور ان کے مرتکب مستلزم سزا قرار دیے گئے ہیں' نہ اس وجہ سے کہ وہ خدا کے قانون کو توڑتے ہیں' بلکہ اس وجہ

سے کہ وہ ملکی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں"۔

آگے چل کر وہ پھر لکھتا ہے:

"ایک زمانہ دراز تک انگریزی قانون میں ارتداد یعنی عیسائیت سے بالکل پھر جانے کی سزا موت تھی۔ بعد میں یہ قانون بنایا گیا کہ اگر کوئی شخص' جس نے عیسائیت کی تعلیم حاصل کی ہو یا عیسائی مذہب کی پیروی کا اقرار کیا ہو' تحریر یا طباعت یا تعلیم یا سوچی سمجھی ہوئی تقریر کے سلسلے میں اس خیال کا اظہار کرے کہ خدا ایک کے بجائے متعدد ہیں' یا عیسائی مذہب کے حق ہونے سے یا کتاب مقدس کے منجانب اللہ ہونے سے انکار کرے' تو پہلی خطا پر وہ ملکی اور فوجی ملازمت میں داخل ہونے سے محروم کیا جائے گا اور دوسری خطا پر اسے تین سال کے لیے قید کی سزا دی جائے گی۔ لیکن یقین کیا جاتا ہے کہ اس قانون کے تحت کبھی کسی شخص پر مقدمہ نہیں چلایا گیا"۔

چند سطور کے بعد پھر لکھتا ہے:

"کہا گیا ہے کہ عیسائیت انگریزی قانون کا ایک جزو ہے اور اس کے خلاف کسی فاش حملہ کے ارتکاب پر ریاست کی طرف سے سزا دی جاتی ہے۔ اس جرم کی حدود میں تحریر یا تقریر کے ذریعہ سے خدا کی ہستی یا اس کی تقدیر کا انکار ہمارے خداوند اور مسیح کی اہانت اور کتب مقدسہ یا ان کے کسی جزو کا استہزاء شامل ہے۔ اس پر صرف اتنا اضافہ کرنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ اس قانون کو شاذ و نادر ہی کبھی استعمال کیا گیا ہے"۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ عیسائیت (یعنی جسے وہ خدا کا "قانون" کہتے ہیں) چونکہ اب ملکی قانون نہیں ہے' اس لیے ریاست اول تو اس کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو سزا دینے کی ذمہ داری اپنے سر لیتی ہی نہیں یا اگر اس بنا پر کہ ابھی

تک یہ عیسائیت حکمراں افراد کا مذہب ہے' وہ برائے نام اس ذمہ داری کو قبول کرتی بھی ہے' تو عملاً اس کو ادا کرنے سے پہلوتہی کرتی ہے۔ لیکن خود ملکی قانون جو دراصل ان کا اجتماعی دین ہے' کیا اس کے معاملے میں بھی ان کا طرزِ عمل یہی ہے؟ اس کا جواب آپ عملاً پا سکتے ہیں اگر ذرا ہمت کر کے برطانوی رعایا کا کوئی فرد برطانوی حدود میں رہتے ہوئے تاجِ برطانیہ کے اقتدارِ اعلیٰ اور سلطنت کے آئین کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔

پس درحقیقت وہ حالت تو عملاً قائم ہے' جس کے متعلق غلط فہمی کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ "اگر" ایسا ہوا تو کیا ہوگا' لیکن اس حالت کے قائم ہونے سے موجودہ زمانے کی مذہبی تبلیغ میں کوئی رکاوٹ اس لیے واقع نہیں ہوتی کہ آج کل دنیا میں جن مختلف مذاہب کی تبلیغ کی جا رہی ہے' ان میں سے کسی مذہب کو چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب میں چلے جانے سے دنیوی مملکتوں کے "اجتماعی دین" میں کوئی رخنہ نہیں پڑتا۔ تمام مذاہب بالفعل اس اجتماعی دین کے تابع بن کر رہتے ہیں اور ان حدود کی پابندی کرتے ہیں' جن میں اس نے انہیں محدود کر دیا ہے' لہٰذا اس کے تابع فرمان اور مطیع امر رہتے ہوئے اگر آپ نے ایک مذہبی عقیدہ و عمل کو چھوڑ کر دوسرا مذہبی عقیدہ و عمل اختیار کر لیا تو اجتماعی دین کے نقطہ نظر سے فی الواقع آپ کے اندر کوئی فرق رونما نہیں ہوا' نہ آپ نے کسی ارتداد کا ارتکاب کیا کہ وہ آپ سے بازپرس کرے۔ ہاں اگر آپ اس اجتماعی دین کے اعتقاداً و عملاً کافر بن جائیں اور کسی دوسرے اجتماعی دین کے اعتقادی مومن بن کر عملی مسلم بننے کی کوشش کریں' تو آج کا ہر حکمران آپ کے ساتھ وہی کچھ کرنے کے لیے تیار ہے' جو آج سے ساڑھے تین ہزار برس پہلے کا حکمران حضرت موسیٰ کے ساتھ کرنے کے لیے تیار ہوا تھا کہ

ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ (المومن ۲۶)

پیدائشی مسلمانوں کا مسئلہ

اس سلسلے میں ایک آخری سوال اور باقی رہ جاتا ہے جو "قتلِ مرتد" کے حکم

بہت سے دماغوں میں تشویش پیدا کرتا ہے۔ وہ یہ کہ جو شخص پہلے غیر مسلم تھا' پھر اس نے باختیار خود اسلام قبول کیا اور اس کے بعد دوبارہ کفر اختیار کر لیا' اس کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے جان بوجھ کر غلطی کی' کیوں نہ وہ ذمی بن کر رہا اور کیوں ایسے اجتماعی دین میں داخل ہوا' جس سے نکلنے کا دروازہ اسے معلوم تھا کہ بند ہے۔ لیکن اس شخص کا معاملہ ذرا مختلف ہے جس نے اسلام کو خود نہ قبول کیا ہو بلکہ مسلمان ماں باپ کے گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے اسلام آپ سے آپ اس کا دین بن گیا ہو۔ ایسا شخص اگر ہوش سنبھالنے کے بعد اسلام سے مطمئن نہ ہو اور اس سے نکل جانا چاہے تو یہ بڑا غضب ہے کہ آپ اسے بھی سزائے موت کی دھمکی دے کر اسلام کے اندر رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف ایک زیادتی معلوم ہوتی ہے بلکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ پیدائشی منافقوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اسلام کے اجتماعی نظام کے اندر پرورش پاتی رہے۔

اس شبہ کا ایک جواب اصولی ہے اور ایک عملی۔ اصولی جواب یہ ہے کہ پیدائشی اور اختیاری پیروؤں کے درمیان احکام میں فرق نہ کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی دین نے کبھی ان کے درمیان فرق کیا ہے۔ ہر دین اپنے پیروؤں کی اولاد کو فطرۃً اپنا پیرو قرار دیتا ہے اور ان پر وہ سب احکام جاری کرتا ہے' جو اختیاری پیروؤں پر جاری کیے جاتے ہیں۔ یہ بات عملاً ناممکن اور عقلاً" بالکل لغو ہے کہ پیروانِ دین' یا سیاسی اصطلاح میں رعایا اور شہریوں کی اولاد کو ابتداء" کفار یا اغیار (Aliens) کی حیثیت سے پرورش کیا جائے اور جب وہ بالغ ہو جائیں تو اس بات کا فیصلہ ان کے اختیار پر چھوڑ دیا جائے کہ آیا وہ اس دین کی پیروی یا اس سٹیٹ کی وفاداری قبول کرتے ہیں یا نہیں جس میں وہ پیدا ہوئے ہیں۔ اس طرح تو کوئی اجتماعی نظام دنیا میں کبھی چل ہی نہیں سکتا۔ اجتماعی نظام کے بقاء و استحکام کا زیادہ تر انحصار اس مستقل آبادی پر ہوتا ہے' جو اس کی پیروی پر ثابت و قائم اور اس کے تسلسل حیات کی ضامن ہو اور ایسی مستقل آبادی صرف اسی طرح بنتی ہے کہ نسل کے بعد نسل آ کر اس نظام کو جاری رکھنے کی ذمہ داری لیتی چلی جائے۔ اگر پیروؤں اور شہریوں کی ہر نسل کے بعد دوسری

نسل کا اس پیروی و شہریت پر قائم رہنا اور اس نظام کو برقرار رکھنا مشتبہ اور غیر یقینی ہو' تو اجتماعی نظام کی بنیاد دائماً" متزلزل رہے گی اور کبھی اس کو استحکام نصیب ہی نہ ہوگا۔ لہٰذا پیدائشی پیروی و شہریت کو اختیاری میں تبدیل کر دینا اور ہر بعد کی نسل کے لیے دین اور دستور و آئین اور تمام وفاداریوں سے انحراف کا دروازہ کھلا رکھنا' ایک ایسی تجویز ہے جو بجائے خود سخت نامعقول ہے اور دنیا میں آج تک کسی دین' کسی اجتماعی نظام اور کسی ریاست نے اس کو اختیار نہیں کیا ہے۔

اس کا عملی جواب یہ ہے کہ جو اندیشہ ہمارے معترضین بیان کرتے ہیں' وہ درحقیقت عملی دنیا میں کبھی رونما نہیں ہوتا۔ ہر اجتماعی نظام' جس میں کچھ بھی زندگی کی طاقت اور خواہش موجود ہو' پوری توجہ کے ساتھ اس کا انتظام کیا کرتا ہے کہ اپنے دائرے میں پیدا ہونے والی نئی نسلوں کی طرف اپنی روایات' اپنی تہذیب' اپنے اصولوں اور اپنی وفاداریوں کو منتقل کرے اور انہیں اپنے لیے زیادہ سے زیادہ قابل اعتماد بنائے۔ اس تعلیم و تربیت کی وجہ سے نئی نسلوں کی بہت بڑی اکثریت' 999 فی ہزار سے بھی زیادہ اکثریت' اس نظام کے اتباع پر راضی اور اس کی وفادار بن کر اٹھتی ہے' جس میں وہ پیدا ہوتی ہے۔ ان حالات میں صرف چند ہی افراد ایسے پیدا ہوسکتے ہیں جو مختلف وجوہ سے انحراف و بغاوت کا میلان لیے ہوئے اٹھیں یا بعد میں اس کا اکتساب کرلیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے چند افراد کی خاطر اصول میں کوئی ایسا تغیر نہیں کیا جاسکتا' جس سے پوری سوسائٹی کی زندگی خطرے اور بے اطمینانی میں مبتلا ہو جائے۔ ایسے چند افراد اگر اجتماعی دین سے انحراف کرنا چاہیں تو ان کے لیے دو دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ یا تو ریاست کے حدود سے باہر جا کر اس سے انحراف کریں' یا اگر وہ اپنے اس انحراف میں راسخ ہیں اور جس دوسرے نظام کو انہوں نے پسند کیا ہے' اس کی پیروی میں صادق الایمان ہیں اور اپنے آبائی دین کی جگہ اسے قائم کرنے کا سچا عزم رکھتے ہیں' تو اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالیں اور جان جوکھوں کا وہ کھیل کھیلیں جس کے بغیر کسی نظام کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔

پس جہاں تک نفس مسئلہ کا تعلق ہے' وہ بہرحال یہی رہے گا کہ مسلمانوں کی

نسل سے پیدا ہونے والی اولاد مسلمان ہی سمجھی جائے گی اور قانون اسلام کی طرف سے ان کے لیے ارتداد کا دروازہ ہرگز نہ کھولا جائے گا' اگر ان میں سے کوئی اسلام سے پھرے گا' تو وہ بھی اسی طرح قتل کا مستحق ہوگا' جس طرح وہ شخص جس نے کفر سے اسلام کی طرف آکر پھر کفر کا راستہ اختیار کیا ہو۔ یہ تمام فقہائے اسلام کا متفق علیہ فیصلہ ہے اور اس باب میں ماہرین شریعت کے درمیان قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اسلامی رویہ کی معقولیت

سائل کا آخری سوال یہ ہے کہ اگر اسلامی حکومت کے دائرے میں تبلیغ کفر کی اجازت نہیں ہے' تو عقلی حیثیت سے اس ممانعت کو کیسے جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس باب میں کوئی بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ جس تبلیغ کفر کی اسلام ممانعت کرتا ہے' اس کی نوعیت واضح طور پر سمجھ لی جائے۔ اسلام اس چیز میں مانع نہیں ہے کہ دارالاسلام کے حدود میں کوئی غیر مسلم اپنی اولاد کو اپنے مذہب کی تعلیم دے' یا اپنے مذہب کے عقائد اور اصول لوگوں کے سامنے تحریر یا تقریر کے ذریعے سے بیان کرے' یا اسلام پر اگر وہ کچھ اعتراضات رکھتا ہو تو انہیں تہذیب کے ساتھ تقریر و تحریر میں پیش کرے۔ نیز اسلام اس میں بھی مانع نہیں ہے کہ کسی غیر مسلم کے خیالات سے متاثر ہو کر دارالاسلام کی ذمی رعایا میں سے کوئی شخص اس کا مذہب قبول کر لے۔ ممانعت دراصل جس چیز کی ہے' وہ یہ ہے کہ کسی مذہب یا نظام فکر و عمل کی تائید میں کوئی ایسی منظم تحریک اٹھائی جائے' جو دارالاسلام کی حدود میں رہنے والوں کو اس مذہب یا نظام کی طرف دعوت دیتی ہو۔ ایسی منظم دعوت' قطع نظر اس سے کہ وہ ذمیوں میں سے اٹھے یا باہر سے آنے والے غیر مسلموں کی طرف سے بہرحال اسلام اپنے حدود میں اس کے ظہور کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

اس کی صاف اور سیدھی وجہ یہ ہے کہ ایک منظم دعوت لامحالہ یا تو سیاسی

نوعیت کی ہوگی یا مذہبی و اخلاقی نوعیت کی۔ اگر وہ سیاسی نوعیت کی ہو اور اس کے پیش نظر نظام زندگی کا تغیر ہو' تو جس طرح دنیا کی ہر ریاست ایسی دعوت کی مزاحمت کرتی ہے' اسی طرح اسلامی ریاست بھی کرتی ہے اور اگر وہ دوسری نوعیت کی دعوت ہو تو خالص دنیوی ریاستوں کے برعکس اسلام اسے اس لیے گوارا نہیں کر سکتا کہ کسی اعتقادی و اخلاقی گمراہی کو اپنی نگرانی و حفاظت میں سر اٹھانے کا موقع دینا قطعی طور پر اس مقصد کی ضد ہے' جس کے لیے اسلام ملک کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ اس معاملہ میں خالص دنیوی حکومتوں کا طرز عمل اسلامی حکومت کے طرز عمل سے یقیناً مختلف ہے' کیونکہ دونوں کے مقاصد حکومت مختلف ہیں۔ دنیوی حکومتیں ہر جھوٹ' ہر اعتقادی فساد اور ہر قسم کی بد عملی و بداخلاقی کو اور اسی طرح ہر مذہبی گمراہی کو بھی' اپنی حدود میں پھیلنے کی اجازت دیتی ہیں اور خوب ڈھیلی رسی چھوڑے رکھتی ہیں' جب تک کہ ان مختلف چیزوں کے پھیلانے والے ان کے وفادار رہیں' ان کو ٹیکس ادا کرتے رہیں اور ایسی کوئی حرکت نہ کریں جس سے ان کے سیاسی اقتدار پر آنچ آتی ہو۔ البتہ جن تحریکوں سے اپنے سیاسی اقتدار پر آنچ آنے کا انہیں ذرا سا بھی خطرہ ہو جاتا ہے' ان کو خلاف قانون قرار دینے اور قوت سے کچل دینے میں وہ ذرہ برابر تامل نہیں کرتیں۔ ان کے اس طرز عمل کی وجہ یہ ہے کہ انہیں بندگان خدا کی اخلاقی و روحانی فلاح سے کوئی دلچسپی نہیں ہے' ان کے لیے تو اپنا سیاسی اقتدار اور اپنی مادی اغراض ہی سب کچھ ہیں۔ مگر اسلام کو اصل دلچسپی خدا کے بندوں کی روحانی و اخلاقی فلاح ہی سے ہے اور اسی کی خاطر وہ انتظام ملکی اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ اس لیے وہ سیاسی فساد یا انقلاب برپا کرنے والی تحریکوں کی طرح ان تحریکوں کو بھی برداشت نہیں کر سکتا' جو اخلاقی فساد یا اعتقادی گمراہی پھیلانے والی ہوں۔

یہاں پھر وہی سوال ہمارے سامنے آتا ہے جو قتل مرتد کے مسئلہ میں آیا کرتا ہے' یعنی یہ کہ اگر غیر مسلم حکومتیں بھی اسی طرح اپنے حدود میں اسلام کی دعوت کو خلاف قانون قرار دے دیں تو کیا ہو؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اسلام اس قیمت پر حق و صداقت کی اشاعت کی آزادی خریدنا نہیں چاہتا کہ اس کے جواب میں اسے

جھوٹ اور باطل کی اشاعت کی آزادی دینی پڑے۔ وہ اپنے پیروؤں سے کہتا ہے کہ

"اگر تم سچے دل سے مجھے حق سمجھتے ہو اور میری پیروی ہی میں اپنی اور انسانیت کی نجات دیکھتے ہو تو میری پیروی کرو' مجھے قائم کرو اور دنیا کو میری طرف دعوت دو' خواہ اس کام میں تم کو گلزار ابراہیمؑ سے سابقہ پیش آئے یا آتش نمرود سے گزرنا پڑے۔ یہ تمہارے اپنے ایمان کا تقاضا ہے اور یہ بات تمہاری خدا پرستی پر منحصر ہے کہ اس کی رضا چاہتے ہو تو اس تقاضے کو پورا کرو ورنہ نہ کرو۔ لیکن میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ تمہیں اس راہ کی خطرناکیوں سے بچانے اور اس کام کو تمہارے حق میں سہل بنانے کی خاطر باطل پرستوں کو یہ جوابی "حق" عطا کروں کہ وہ خدا کے بندوں کو گمراہ کریں اور اپنے راستوں پر انہیں ہانک لے جائیں جن میں مجھے معلوم ہے کہ ان کے لیے تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں"۔

یہ اسلام کا ناقابل تغیر فیصلہ ہے اور اس میں وہ کسی سے مصالحت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اگر غیر مسلم حکومتیں آج یا آئندہ کسی وقت اسلام کی تبلیغ کو اسی طرح جرم قرار دیں' جس طرح وہ پہلے اسے جرم قرار دیتی رہی ہیں' تب بھی اس فیصلہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اسلام کے لیے وہ گھڑی بہت منحوس تھی' جب کفار کی نگاہ میں وہ اتنا بے ضرر بن گیا کہ اس کی دعوت و تبلیغ کو وہ بخوشی گوارا کرنے لگے اور قانون کفر کی حفاظت و نگرانی میں اسے پھیلنے کی پوری سہولتیں بہم پہنچنے لگیں۔ اسلام کے ساتھ کفر کی یہ رعایتیں حقیقت میں خوش آئند نہیں ہیں۔ یہ تو اس بات کی علامت ہیں کہ اسلام کے قالب میں اس کی روح موجود نہیں رہی ہے' ورنہ آج کے کافر کچھ نمرود و فرعون اور ابوجہل و ابولہب سے بڑھ کر نیک دل نہیں ہیں کہ اس مسلم نما قالب میں اسلام کا اصلی جوہر موجود ہو اور پھر بھی وہ اسے اپنی سرپرستی و حمایت سے سرفراز کریں یا کم از کم اسے پھیلنے کی آزادی ہی

عطا کر دیں۔ جب سے ان کی عنایات کی بدولت اسلام کی دعوت محض گلزار ابراہیمؑ کی گلگشت بن کر رہ گئی، اسی وقت سے اسلام کو یہ ذلت نصیب ہوئی کہ وہ ان مذاہب کی صف میں شامل کر دیا گیا جو ہر ظالم نظام تمدّن و سیاست کے ماتحت آرام کی جگہ پا سکتے ہیں۔ بڑی مبارک ہوگی وہ ساعت جب یہ رعایتیں واپس لے لی جائیں گی اور دین حق کی طرف دعوت دینے والوں کی راہ میں پھر آتش نمرود حائل ہو جائے گی۔ اسی وقت اسلام کو وہ سچے پیرو اور داعی ملیں گے، جو طاغوت کا سر نیچا کر کے حق کو اس پر غالب کرنے کے قابل ہوں گے۔"

متذکرہ بالا دلائل و براہین اور حقائق کے بعد کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ توہین رسالت کا جرم ارتداد سے بھی سنگین تر اور ناقابل معافی جرم ہے اور توبہ سے تنقیص رسالت کی حد، جو سزائے موت ہے، وہ ساقط نہیں ہوتی، کیونکہ یہی معاملہ دوسرے حدود کا بھی ہے کہ سارق یا قاذف بہتان تراشی کرنے والے کی سزا حد توبہ سے ساقط نہیں ہوتی۔

بقیہ : نکاح طلاق اور حلالہ

پہلے شوہر سے نکاح کرنے کے لئے مزید تین ماہ تک بطور "عدت" انتظار کرنا چاہئے تھا۔

یہاں ایک اور مشاہدے کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا۔ بیک وقت تین طلاق دینے والے بعض اوقات "حلالہ" کا ڈرامہ رچانے کی بجائے کسی جاہل مذہبی پیشوا سے یہ فتویٰ حاصل کر لیتے ہیں کہ ساٹھ آدمیوں کو کھانا کھلا دو تو بیوی کو بدستور پاس رکھنا جائز ہو جائے گا۔ حالانکہ یہ شریعت اسلام کا ایک اور قانون ہے جسے "ظہار" کہا جاتا ہے اور اسے طلاق سے خلط ملط کرنا درست نہیں کیونکہ اس کا طلاق سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت سے آج تک بعض مرد غصہ کی حالت میں بیوی کو ماں، بہن یا بیٹی کہہ دیتے ہیں۔ اس سے ان پر ان کی بیوی ہمیشہ کے لئے حرام نہیں ہو جاتی بلکہ اس جاہلانہ حرکت کی سزا کے طور پر بطور کفارہ "ایک غلام آزاد کرنا" یا "دو ماہ تک مسلسل روزے رکھنا" یا "ساٹھ مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلانا" لازم ہو جاتا ہے۔ یہ کفارہ ادا کئے بغیر بیوی حلال نہیں ہو سکتی۔ البتہ ایسا کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔

☆☆☆

سرحد سے ایک خط، اور امیر تنظیم کا جواب

جس میں دینی جماعتوں کو یکجا دیکھنے کے خواہشمند حضرات کے لئے رہنمائی کا بہت کچھ سامان موجود ہے

ذیل کا خط اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ مکتوب نگار اسلامی جمعیت طلبہ' صوبہ سرحد کے اہم عہدیدار رہے ہیں اور اگرچہ جماعت اسلامی میں باضابطہ شامل تو نہیں ہوئے تاہم اس کے فعال ہمدردوں میں سے ضرور ہیں۔ خط کے بین السطور اس مقصد اور مشن کے ساتھ ان کی بے پناہ دلی وابستگی جھلکتی دکھائی دیتی ہے جس کیلئے تمام احیائی تحریکیں سرگرم عمل ہیں۔ یہی جذبہ اس کا محرک بنا کہ قبل ازیں وہ امیر تنظیم اسلامی سے ملاقات کیلئے قرآن اکیڈمی تشریف لائے تھے۔ شاید یہی سبب ہے کہ امیر تنظیم اسلامی نے اس خط کو اتنی اہمیت دی کہ اس کا مفصل جواب بھی خود تحریر فرمایا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

انتہائی قابل عزت واحترام ڈاکٹر صاحب السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'

خدا کرے آپ بخیرو عافیت ہوں۔ اس مہینے کی نو تاریخ کو میں اور برادرم ڈاکٹر فضل عظیم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ہمیں قطعاً یقین نہیں تھا کہ آپ اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر ہمیں ملاقات کا موقع دیں گے۔ لیکن ہماری خوشگوار حیرت کی انتہا نہ رہی جب آپ نے نہ صرف ملاقات کی آرزو پوری فرمائی بلکہ خاصا وقت دے کر نہایت مفید گفتگو میں ہم تک قیمتی معلومات پہنچائیں۔ ہم اس احسان پر آپ کے تہہ دل سے ممنون و مشکور ہیں۔ دوران ملاقات جو کتابیں ہمیں عنایت کی گئیں ان میں سے "مولانا مودودی اور میں" تو میں پڑھ چکا' دوسری کتابوں کا مطالعہ ابھی جاری ہے۔ یہاں

سوات پہنچنے کے تین دن بعد مجھے انجمن خدام القرآن کی جانب سے کچھ کتابیں اور مل گئیں۔ امید ہے ان کا مطالعہ کرنے کے بعد ان شاء اللہ میرا تنظیم کے لٹریچر کا مطالعہ مکمل ہو جائے گا۔ تنظیم کے دعوتی لٹریچر کا مطالعہ اگرچہ میں پہلے بھی کر چکا ہوں لیکن ارادہ ہے کہ ان شاء اللہ از سر نو اسے پڑھوں گا۔

آپ سے ملاقات کے نتیجے میں اس خوشگوار تاثر نے ہمیں مزید اطمینان دلایا ہے کہ آپ دینی جماعتوں کے اتحاد کے بارے میں خاصے سنجیدہ ہیں۔ ہمیں یقین ہوا ہے کہ دینی قوتوں کو متحد کرنے کے معاملے میں آپ کا رویہ مثبت اور آپ کا جذبہ تعمیری ہے۔ جماعت اور تنظیم کے ہزاروں کارکنوں اور ملتِ اسلامیہ کے ہزاروں بہی خواہوں کی یہ دلی آرزو ہے کہ نہ صرف مملکت خداداد پاکستان میں بلکہ عالمی سطح پر تمام دینی قوتیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے قرآنی فریضے کو تقاضائے قرآن کے مطابق انجام دیں۔ جماعت اسلامی کی تاریخ' اس میں عزیمتوں کی داستان اور تنظیم اسلامی کے قیام کے اسباب کا اب تک جو مطالعہ میں نے کیا ہے' میں پوری ایمانداری سے اس حقیقت کے اظہار پر مجبور ہوں کہ آپ اور دوسرے اکابرین جماعت جو ماچھی گوٹھ کے اجتماع کے بعد الگ ہونے پر مجبور ہوئے' اگر کسی طرح جماعت سے وابستہ رہتے اور اندر ہی اندر' اصلاح کی کوششیں فرماتے تو ایک نہ ایک دن آپ جماعت کو اپنے انقلابی راستے پر دوبارہ واپس لانے میں کامیاب ہو جاتے۔ ثبوت کے طور پر میں صرف دو مثالیں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

(ا) ایک یہ کہ "مولانا مودودی مرحوم اور میں" میں آپ صفحہ ۶۰ پر لکھتے ہیں :

> "..... مولانا مودودی اس حتمی نتیجے تک بھی پہنچ گئے تھے کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے لئے الیکشن کا طریقہ بالکل ناکام ہو چکا ہے اور ہمیں اپنے سابقہ طریق کار ہی کی طرف رجوع کر لینا چاہئے....."

ممکن ہے آپ کو اس سے اتفاق نہ ہو لیکن جماعت اور تنظیم کے بہت سارے احباب کی رائے یہ ہے کہ اگر اس وقت آپ اور دوسرے اکابرین جماعت' جماعت کے ساتھ ہوتے' اور خصوصاً آپ اپنی توانا آواز کو مولانا مودودیؒ کی تائید میں بلند فرماتے تو کوئی وجہ

نہیں کہ آج ہم جماعت اسلامی کو ایک بار پھر اپنے اصلی انقلابی روپ میں نہ دیکھتے۔

(۲) جماعت کے اندر رہتے ہوئے اصلاح کی کوششوں کی دوسری مثال جماعت اسلامی کا موجودہ بحران ہے۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ محترم قاضی حسین احمد کی قیادت میں جماعت اپنا رہا سہا دینی کردار کھو رہی تھی اور اس کی کوکھ سے پاسبان اور اسلامی فرنٹ جیسے وقتی سیاسی جتھے برآمد ہو رہے تھے۔ لیکن محترم میاں طفیل محمد' مولانا گوہر رحمٰن صاحب اور کچھ دوسرے بزرگوں کی بھرپور مخالفت اور مزاحمت کارگر ثابت ہوئی اور اب پاسبان اور اسلامی فرنٹ دونوں عملاً ختم ہو چکے ہیں۔ محترم نعیم صدیقی صاحب تحریک اسلامی کے نام سے ایک الگ قافلے میں عازم سفر ہوئے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو سب سے زیادہ آپ ہی جانتے ہیں کہ اس پر آشوب دور میں دینی احیاء کی تحریکیں اگر روز اٹھتی ہیں تو نتائج کے اعتبار سے ان کے بار آور ہونے کے امکانات کتنے ہیں۔

محترم ڈاکٹر صاحب! اس گفتگو سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں تنظیم اسلامی کے قیام کو خدانخواستہ غلط سمجھ رہا ہوں یا آپ کی مساعی گراں قدر کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ انسانی بساط کی حد تک آپ نے قرآن عظیم کی بے پناہ خدمت کی ہے' جس کا صلہ آپ کے رب کے پاس محفوظ ہے۔ تنظیم اسلامی کی شکل میں آپ نے ایک خالص اسلامی انقلابی جماعت کا ماڈل دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود ایک منفی رد عمل بھی سامنے آیا ہے جس میں کم از کم دو باتیں ایسی ہیں جن سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔

(۱) تنظیم یا جماعت کا ایک کارکن جب اقامتِ دین کی دعوت دیتا ہے اور دو چار آدمیوں کے مجمع میں اٹھ کر اسلام کا نام لیتا ہے تو دین کا درد رکھنے والے لوگوں ـــ خصوصاً تعلیم یافتہ حضرات کا پہلا سوال ان سے یہ ہوتا ہے کہ کونسا اسلام؟ مودودیؒ کا؟ اسرار کا؟ یا تبلیغ کا؟۔ مصروفیت کے اس مشینی دور میں ہر کسی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ جماعت و تنظیم کا پورا لٹریچر پڑھ سکے یا تبلیغی نصاب اور اس کے چلوں' سہ روزوں میں عمر کھپا کر اس فرق کو معلوم کر سکے کہ حقیقی اسلامی انقلابی راستے پر دعوت دین دینے والی جماعت کونسی ہے۔ بلکہ بدقسمتی یہ ہے کہ اگر کوئی دل دردمند خدمت دین کے لئے تڑپتا بھی ہو اور وہ اقامت دین کے لئے کام کرنا چاہتا بھی ہو تو اسے سب سے پہلے جماعت اور تنظیم کے

اختلافات کے گہرے پانی والے تالاب میں اترنا پڑتا ہے۔ اگر اسے وہ باہوش و حوصلہ "سلامتی" سے پار بھی کرلے تو آگے میدان میں اس کے لئے عملاً کام کرنے کے مواقع بھی بہت کم رہ جاتے ہیں اور اختلافات کی الجھن تو ساری عمر دامن گیر رہتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس راستے پر چلتے ہوئے عزم شکستگی اور مایوسی کے جو مراحل پیش آتے ہیں ان سے بہ سلامت روی نکلنا محال ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے بہت سے ایسے لوگوں کو جماعت اور تنظیم کے لٹریچر کا مطالعہ ادھورا چھوڑ کر "تبلیغ" کی سیدھی اور آسان شاہراہ پر خرامانِ سفر دیکھا ہے۔ تنظیم اور جماعت، جن کا منبع فکر ایک ہے، اگر اشتراک عمل کے کسی فارمولے پر اتفاق کرلیں تو اقامت دین کے ایک داعی کا کام بہت آسان ہو جائے گا۔ میری دانست میں جماعت اسلامی اگر انتخابی سیاست پر مکمل بھروسہ اور تکیہ چھوڑ دے، جماعت کے اندر دینی رنگ غالب کرنے کے لئے سخت دینی تربیتی نظام (جو خود آپ کی تنظیم اسلامی میں موجود ہے) قائم کرے تو ایک درست انتخابی نظام (جو موجودہ انتخابی نظام نہیں) میں پرامن تبدیلی لانے کے لئے کسی انتخابی معرکے میں تمام اخلاقی و قانونی اصولوں کی پابندی کے ساتھ اس حیثیت میں شرکت --- کہ وہ جماعت کے کام کا کُل نہ ہو بلکہ کل کا جز ہو --- چنداں معیوب نہیں۔ دوسری طرف آپ تنظیم کے نظریاتی کردار کی سختی سے حفاظت کا کام جاری رکھیں اور اشتراک عمل کے لئے جماعت کے ساتھ مزید قربت کی کوشش کریں تو بہت ممکن ہے کہ جماعت کے اندر آپ کی توانا آواز پر لبیک کہتے ہوئے ایک ایسی "قوت" وجود میں آجائے جس کے سامنے سب اس بات پر مجبور ہوں کہ اب خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا کام ہوگا تو صرف اور صرف منہاجِ نبویؐ کے اصولوں پر.... محترم ڈاکٹر صاحب! "اشتراک عمل" کیا مجھے تو "انضمام" تک کے امکانات نظر آتے ہیں۔

(۲) منفی رد عمل کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ عام لوگوں میں انقلابی دعوت کا کام جمود کا شکار ہو گیا ہے، چاہے یہ دعوت جماعت کی ہو یا تنظیم کی طرف سے۔ تبلیغی جماعت میں سال بہ سال اضافہ ہوتا ہے۔ میری نظر میں یہ آبادی کے تناسب سے بڑھنے والا اضافہ ہے۔ ساتھ ہی آپ دیکھتے ہیں کہ منکرات و فواحش بھی سال بہ سال بڑھ رہے ہیں۔ اس پر کلام کی کوئی ضرورت نہیں، خود آپ کی تحریریں اس سے بھری پڑی ہیں۔ تبلیغی جماعت کی تمام خوبیوں

کے باوجود نہی عن المنکر کا کوئی پروگرام نہ ہونے کی وجہ سے اقامتِ دین کی آرزو اس جماعت سے وابستہ کرنا بے کار ہے۔ جماعت اسلامی کا جہاں تک تعلق ہے بس ایک نسلی جماعت اسلامی آگے بڑھ رہی ہے جس میں باپ' بیٹوں کو کچھ "سیاسی وابستگیاں" منتقل کر رہے ہیں۔ دینی کردار کا رنگ غائب تو نہیں البتہ روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ صرف ایک امید ہے کہ چونکہ بات سننے کے لئے ایک خاصا وسیع پلیٹ فارم موجود ہے' اگر کوئی صحت مند آواز ان تک اقامت دین کی صحیح فکر پر مبنی دعوت پہنچا دے تو صدیوں کا کام برسوں اور برسوں کا کام مہینوں میں ممکن ہے۔

تنظیم اسلامی کے قیام کو بھی کم و بیش ۲۰ سال ہو گئے ہیں۔ خود آپ کی تحریروں میں نظر سے یہ بات گزری ہے کہ آپ نے فرمایا تھا "اگر تنظیم کی دعوت پر اب تک لوگوں کے رد عمل کی طرف دیکھا جائے تو مجھے بالکل مایوس ہو کر بیٹھ جانا چاہئے لیکن یہ کام میں خالص خدا کے بھروسے پر کر رہا ہوں"۔ آپ کئی بار فرما چکے ہیں کہ جماعت اگر اپنے قبل از تقسیم طریقہ کار پر قائم رہتی تو آٹھ' دس سالوں میں نقشہ ہی تبدیل ہو تا۔ لیکن جب آپ نے خود منہاج نبوی ؑ کی بنیاد پر تنظیم اسلامی قائم فرمائی تو آج بیس سال کے بعد بھی یہ نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ وہ تنظیمی ڈھانچہ اور مطلوبہ قوت فراہم نہ کی جا سکی جو اس ملک میں مثبت تبدیلی لانے کے لئے کارگر ہو۔ سالانہ اجتماعات میں سال بہ سال معمولی کمی بیشی' یا آپ کے بعض پروگرامات میں لوگوں کی کثرت شرکت وغیرہ اس بات کی دلیل نہیں کہ تنظیم کی دعوت میں "غیر معمولی" اضافہ ہوا ہے یا ہو رہا ہے۔ اس قسم کے سوالات آپ کے سامنے ہوئے ہیں اور آپ برملا اعتراف حقیقت کر چکے ہیں۔ میری نظر میں اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں کہ خدانخواستہ آپ کے اخلاص میں کوئی کمی ہے یا آپ کے طریقہ کار میں کوئی غیر اسلامی "ملاوٹ" یا جھول ہے'.... بلکہ جس طرح آپ نے دوران ملاقات فرمایا تھا کہ افغانستان میں موجودہ خون ریزی وہاں کی اسلامی قوتوں کا جہاد کے کام کو منظم نہ کرنے اور ایک امیر کی اطاعت میں جمع نہ ہونے پر خدا کی طرف سے سزا ہے۔ اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے درمیان اتفاق رائے اور اشتراک عمل نہ ہونے پر خدا کی طرف سے سزا یہ ہے کہ دعوتِ دین کے کام پر ایک جمود طاری ہے۔ کفر کی طاقتیں ہمارے درمیان افتراق و انتشار پر خندہ

زن ہیں۔ ایک عام کارکن اور خادم دین تمام تر خلوص اور نیک نیتی کے باوجود بے بس و لاچار کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ اگر دینی جماعتوں کے سربراہوں اور قائدین نے ہوش کے ناخن نہ لئے اور اتحاد و یک جہتی کے لئے کوئی راہ نہ نکالی تو دین کی دعوت دینے والا ایک عام کارکن یا تو مایوس ہو کر بیٹھ جائے گا یا ردعمل کے طور پر کارکنوں میں قائدین کے خلاف شدید نفرت و بغض پیدا ہو گا جو دعوت دین کے کام کے لئے خطرناک ہی نہیں مہلک و تباہ کن ہے۔ رہے "عام لوگ" تو اس بات کو دل سے نکالنا چاہئے کہ انتشار و افتراق کی اس انارکی میں عام آدمی ہماری آواز پر لبیک کہے گا۔ فرض کریں یہ دونوں باتیں نہ بھی ہوں اور اسلامی جماعتوں کا دعوتی کام اس موجودہ نہج پر جاری بھی ہو تو چیونٹی کی چال چلنے والی یہ "حرکت" نہ تو منزل مقصود پر پہنچا سکتی ہے اور نہ یہ کام نتائج کے اعتبار سے کسی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ مجھ سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ مسلمان دین کے کام رضائے الٰہی کی خاطر کرتا ہے اور اس کی اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔ دنیا میں وہ "نتائج" حاصل کرنے کی خاطر اقامت دین کے کام میں سنتِ نبویؐ سے انحراف نہیں کر سکتا۔ لیکن کیا صرف طریقہ کار کے معاملے پر ہر چھوٹے بڑے اختلاف کے نتیجے میں اپنے گرد الگ دائرہ کھینچنا اور ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تعمیر کرنا خدا کے ہاں پسندیدہ عمل ہو سکتا ہے؟ اس پر دنیا و آخرت میں کوئی سزا و باز پرس ہو گی یا نہیں؟

محترم ڈاکٹر صاحب! عمر، فہم و بصیرت، علم اور زہد و تقویٰ میں میرے اور آپ کے درمیان کوئی نسبت نہیں۔ اپنی کم مائیگی کا احساس اتنا غالب ہے کہ اس خط کو آپ کی طرف روانہ کرنے کا حوصلہ بھی اپنے اندر نہیں پاتا۔ میں اس خط میں تحریر شدہ ان تمام باتوں کے لئے آپ سے تہہ دل سے معذرت خواہ ہوں جو یا تو میری لاعلمی سے نوک قلم پر آگئی ہوں یا جن سے کسی طرح آپ کی دل آزاری ہوئی ہو۔ اگر میری آپ سے ملاقات نہ ہوتی، اور ملت اسلامیہ کے لئے آپ کے دردمند دل کی تڑپ کو میں قریب سے محسوس نہ کرتا تو شاید مجھ میں اس خط کے لکھنے کا حوصلہ نہ ہوتا۔ مجھے اس بات پر اصرار ہے کہ آج کل جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی کے درمیان کسی اشتراک عمل کے لئے فضا نہایت سازگار ہے۔ میں مانتا ہوں کہ جماعت کی موجودہ قیادت تو جماعت کو خالص قومی سیاسی جماعت کی راہ پر

ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ جماعت کے اندر ایک نہایت قوی ردعمل بھی پیدا ہو رہا ہے۔ آپ نے پچھلے دو تین سال میں دیکھا کہ جماعت کے اندر انتہائی بڑے قسم کے فیصلے بھی ہوئے اور کچھ بڑے فیصلے منسوخ بھی ہوئے۔ یعنی جماعت پہلے کی طرح صامت و ساکت نہیں' اس پیچ و تاب سے خیر برآمد ہونے کی مجھے قوی امید ہے۔ اگر آپ اخلاص و حکمت کے ساتھ اپنی مساعی جاری رکھیں تو۔

کیا عجب "تیری" نواہائے سحر گاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ "اس" خاک میں ہے

مجھے ایک "حرص" یہ بھی ہے کہ اس اتحاد کے لئے موزوں ترین وقت یہی ہے کہ آپ خود امیر تنظیم اسلامی و سرپرست اعلیٰ کی حیثیت سے خدا کے فضل و کرم سے بقید حیات ہیں۔ فہم و بصیرت اور حکمت و دانش کی جس بلوغت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات گرامی کو نوازا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ مجھے یہ تلخ حقیقت بیان کرنے میں کوئی باک نہیں کہ آپ جیسی نابغہ روزگار شخصیت کے لئے تنظیم بھی برسوں ترستی رہے گی اور ع

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!!

بڑے فیصلے جتنی آسانی سے آپ کر سکتے ہیں آئندہ کسی اور کے لئے ممکن نہیں ہو گا۔ اگر آپ عمر کے اس حصے میں پاکستان کی ان تین دینی تحریکوں (جماعت اسلامی' تنظیم اسلامی اور تحریک اسلامی) کے درمیان اشتراک عمل کا کوئی کامیاب اور قابل عمل فارمولا پیش کر سکیں اور ایک داعیٔ حق کو اعدائے اسلام کی جانب سے ملنے والے انتشار و افتراق کے طعنوں سے نجات دلا سکیں تو مجھے یقین ہے کہ دعوت دین کے کام میں موجود جمود ٹوٹ جائے گا اور بجائے خود یہ کارنامہ مسلمانان پاکستان کے لئے خصوصاً اور ملت اسلامیہ کے لئے عموماً ایک معجزے سے کم نہیں ہو گا۔

خدا ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

خاکسار' محمد فاروق
بیوٹی گفٹ سنٹر' مین بازار' چوک' منگورہ' سوات
۱۸/ نومبر ۱۹۹۵ء

امیر تنظیم کا جواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۳۶۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

۲۱/جنوری ۱۹۹۶ء

محترمی برادرم محمد فاروق صاحب' وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

آپ کے ۱۸/نومبر کے خط کا جواب ۲۱/جنوری کو یقیناً بہت تاخیر سے ہے۔تو اگرچہ یہ تاخیر کسی "باعثِ تاخیر" کے بغیر نہ تھی' تاہم معذرت خواہ ہوں!

آپ نے میرے لئے جن اعلیٰ خیالات اور نیک جذبات و خواہشات کا اظہار کیا ہے ان پر تو ندامت اور شرمندگی کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ادھر خود آپ کے جذبات و خیالات سے میں بہت متاثر ہوا اور میرے اس دیرینہ خیال کو تقویت حاصل ہوئی کہ اسلامی جمعیت طلبہ نے جس جذبہ و فکر کی تخم ریزی کثیرالتعداد نوجوانوں میں کی ہے ان میں سے ان شاءاللہ العزیز معتدبہ تعداد دعوت و اقامتِ دین کی انقلابی جدوجہد کے لئے از سرنو کمربستہ ہو جائے گی۔ وما ذٰلک علی اللّٰہ بعزیز!

آپ نے جو خیال سب سے زیادہ شدومد کے ساتھ پیش فرمایا ہے۔۔۔یعنی یہ کہ اگر وہ لوگ جو ۵۸ء۔۵۷ء میں جماعت سے علیحدہ ہوئے اختلاف رائے کے باوجود جماعت میں شامل رہتے تو جماعت اسلامی موجودہ انجام سے دوچار نہ ہوتی اور وہ لوگ جلد یا بدیر جماعت کو اس کے اصل انقلابی کردار کی طرف لوٹا لے جانے میں کامیاب ہو جاتے۔۔۔اس سے قبل بھی بہت سے مخلص اور دردمند بہی خواہان دین و تحریک کی جانب سے سامنے آیا ہے' لیکن اصلاً یہ ایک بہت بڑے مغالطے پر مبنی ہے!

یہ مغالطہ اب سے چالیس سال قبل (۵۶۔۵۵ء) کی جماعت اسلامی کو آج کی جماعت پر قیاس کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ آج جماعت میں اختلافِ رائے کا اظہار جس مادر پدر

آزاد انداز میں رواج پا گیا ہے اس کا کوئی تصور تک اُس وقت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

چنانچہ ۱۹۵۷ء (فروری) کے اجتماع ماچھی گوٹھ میں جماعت کی موجود الوقت پالیسی سے اختلاف رکھتے ہوئے بھی جماعت میں شامل رہنے کی جو اجازت "بہ اندازِ خسروانہ" عنایت فرمائی گئی تھی وہ اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ وہ اپنے اختلاف کا اظہار تحریر و تقریر تو کجا' نجی گفتگوؤں میں بھی نہیں کر سکتے' خواہ وہ نجی گفتگوئیں ارکان جماعت سے ہوں خواہ غیر ارکان سے --- مزید بر آں اپنے اس اختلاف کا اظہار انہیں ارکان کے بھی نہ مقامی اجتماع میں کرنے کی اجازت ہو گی نہ حلقہ وار اجتماعات میں ---- بلکہ یہ کام صرف "آل پاکستان اجتماع ارکان" میں ہی کیا جا سکے گا۔ (جس کی FREQUENCY اور دورانیہ معلوم ہے۔)

اب آپ خود ہی غور فرمالیں کہ ---۵۷ء سے ۷۱ء تک کے چودہ سالوں کے دوران جب مولانا مودودی مرحوم کو اپنی غلطی کا احساس ہوا' کیا ننانوے فیصد امکان اس کا نہیں تھا کہ اختلاف رکھنے والے لوگوں کے ضمن میں مندرجہ ذیل دو صورتوں میں سے ایک واقع ہو جاتی :

ایک یہ کہ اگر بربنائے طبع بشری اس قدر سخت اور غیر فطری "ڈسپلن" کی پابندی میں کبھی بھولے سے بھی کوئی رخنہ پیدا ہو جاتا تو جماعت کی "بیورو کریسی" فوراً "ڈسپلنری ایکشن" لے کر اخراج کر دیتی' جیسا کہ فی الواقع جماعت کے ایک نہایت پرانے اور اہم کارکن بلکہ رہنما مولانا سید وصی مظہر ندوی صاحب کے ساتھ ہوا۔

دوسرے یہ کہ اتنے شدید "حبس" کے نتیجے میں "گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے!" کے مصداق اختلاف رکھنے والوں کی معنوی موت واقع ہو جاتی اور ان کی شخصیتوں میں ع "خاک ہو جائیں گے ہم ان کو خبر ہونے تک!" والی صورت پیدا ہو جاتی! یعنی یا ان کی ذہنیت ہی نہ صرف تبدیل بلکہ مسخ ہو جاتی یا ان کی قوتِ ارادی اور قوتِ عمل سسک سسک کر دم توڑ دیتی!

اس سلسلے میں آج سے چار پانچ سال قبل کا ایک واقعہ یاد آیا۔ رمضان مبارک کا مہینہ تھا' عصر کی جماعت میں اکیڈمی کی مسجد میں سید اسعد گیلانی مرحوم سمیت کئی اہم ارکان

جماعت لاہور شریک ہوئے۔ نماز کے بعد سب لوگ رخصت ہو گئے' لیکن پھر فوراً ہی ملک محمد اسلم صاحب جو جماعت کے ایک نہایت پرانے اور فعال کارکن ہیں میرے پاس آئے اور انہوں نے بتایا کہ دراصل اس وقت ان کے مکان پر لاہور کی شوریٰ کا اجلاس ہو رہا ہے جو افطار تک ختم ہو جائے گا اور اسعد گیلانی صاحب کی خواہش ہے کہ آپ ہمارے ساتھ افطار کریں۔ میں نے کسی قدر پس و پیش کے بعد دعوت قبول کر لی اور عین افطار کے وقت ملک صاحب کے مکان پر پہنچ گیا۔ افطار کے بعد نشست ہوئی تو متعدد حاضرین نے مجھ سے یہی سوال دریافت کیا کہ آپ اپنے اختلاف کے باوجود جماعت میں شامل کیوں نہ رہے؟ ان مستفسرین میں سے بھی اکثر لوگ ماچھی گوٹھ کے بعد کی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور انہیں متذکرہ بالا پس منظر معلوم نہیں تھا۔ لیکن اسعد صاحب کی موجودگی میں جب میں نے وضاحت کی تو سب حضرات نے خاموشی اختیار کر لی۔

آپ نے اپنے حسن نظر کے مطابق میری "مساعیٔ جمیلہ" کے مثبت پہلوؤں کا تذکرہ کرنے کے بعد دو منفی پہلو گنوائے ہیں۔ ان میں سے پہلا تو بہت عام ہے اور دین کے داعی ہر فرد یا جماعت کو لازماً پیش آتا ہے' اس لئے کہ ہر نئی یا پرانی جماعت اپنی تاسیس کے وقت "حادث" ہوتی ہے اور اس طرح پہلے سے موجود تنظیموں یا جماعتوں کی تعداد میں لامحالہ اضافے کا سبب بنتی ہے۔ گویا یہ تو تمدن انسانی کی ناگزیر مشکل ہے' جسے ذرا آگے بڑھائیں تو اس شکل میں بھی سامنے آتی ہے کہ دنیا میں اتنے ڈھیر سارے مذاہب اور فلسفوں کی موجودگی میں ایک طالب حق اور متلاشی ہدایت کا کام کتنا مشکل اور کٹھن ہے!!

البتہ دوسری بات کے ضمن میں یہ گزارش ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ میری بیس سالہ تنظیمی مساعی اور اس سے بھی قبل لگ بھگ دس سال کی خالص ذاتی مساعی کے نتائج کے بہت کم ہونے' لیکن اس کے مقابلے میں اگر جماعت اسلامی اپنے اصل انقلابی طریق کار پر قائم رہتی تو اس کے ضمن میں میری اس رائے کے اسباب میں "کہ" آٹھ دس سالوں میں نقشہ ہی تبدیل ہو جاتا" جہاں میری اور مولانا مودودی مرحوم کی صلاحیتوں کے مابین زمین

اور آسمان کے فرق کو بھی عمل دخل حاصل ہے' وہاں ایک اہم عامل یہ بھی ہے کہ مولانا مرحوم کو اقامت دین کی جدوجہد کے لئے میدان بالکل صاف ملا تھا۔ اس لئے کہ اس میدان میں ان کے پیش رو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے جب اپنا رخ "حزب اللہ" سے ہندوستان کی نیشنلسٹ سیاست اور جہاد حریت کی جانب موڑا تھا تو حزب اللہ کی بساط بالکل تہہ کردی تھی چنانچہ نہ صرف یہ کہ اختلاف و افتراق کی کوئی صورت اور اس سے پیدا شدہ تلخیوں کا لمبا چوڑا سلسلہ پیدا نہیں ہوا تھا (دیکھئے میری تالیف: "تاریخ جماعت اسلامی کا گمشدہ باب) بلکہ مولانا آزاد کے بہت سے سرپرست اور عقیدت مند فوری طور پر مولانا مودودی مرحوم کے گرد جمع ہو گئے تھے (جیسے مستری محمد صدیق" ' ملک نصر اللہ خان عزیز" ' شیخ قمرالدین مرحوم وغیرہم)۔۔۔ جبکہ اس کے مقابل میں مولانا مودودی مرحوم نے پوری جماعت اسلامی سمیت اپنا رخ پاکستان کی قومی سیاست کی جانب کر لیا تھا۔ گویا بھارت' پاکستان' بنگلہ دیش وغیرہ میں جماعت اسلامی ایسی مضبوط و توانا' اور وسیع حلقہ اثر اور طویل تاریخی پس منظر کی حامل جماعتوں کی موجودگی میں جو اپنی جگہ "اقامتِ دین" ہی کی دعویدار تھیں' اسی مقصد اور اسی اساسی فکر کے ساتھ نئی دعوت اور تنظیم کا پنپنا ہرگز آسان نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بات کے سمجھنے میں لوگوں کو دیر لگی۔ (جبکہ اس الجھن پر مستزاد بعض "کرم فرماؤں" نے میری کردار کشی کے لئے جملہ جدید وسائل تشہیر اور ذرائع ابلاغ کا استعمال بھی بھرپور طریقے پر کیا!)

تاہم اب' آپ کی طرح' میرا بھی خیال یہ ہے کہ فضا صاف ہو رہی ہے اور ایک جانب غلط فہمیوں اور مغالطوں کا گرد و غبار چھٹ رہا ہے' تو دوسری جانب "بعد از خرابیٔ بسیار" ہی سہی بہرحال جماعت کے اکثر ارکان اور کارکنوں پر ۵۱ء سے جاری سیاسی طریق کار کا لاحاصل ہونا واضح ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی چوبیس سالہ اور تنظیم اسلامی کی بیس سالہ تاریخ میں پہلی بار اپنے "حقِ استرداد" (VETO) کا استعمال کرتے ہوئے' اگست ۹۵ء میں جماعت اسلامی' تحریک اسلامی' اور

تنظیم اسلامی کے مابین وفاق کے قیام کی تجویز پیش کی۔ (ہماری مرکزی مجلس شوریٰ میں اس کے حق میں ۴۱ ووٹ تھے' جبکہ مخالفت میں ۱۸ تھے۔ اور یہ ایک نہایت واضح مثال ہے اس امر کی کہ عہد حاضر کی جمہوری اور دستوری تنظیمیں کس طرح اپنے اپنے خول میں بند ہو جایا کرتی ہیں۔ اور بیعت کی ٹھیٹھ اسلامی اساس کتنی بابرکت اور انقلابی جدوجہد کے لئے سازگار ہے۔)

میری اس پیشکش پر جماعت یا تحریک کے مراکز واقع لاہور سے تو کوئی سرکاری ردعمل تاحال سامنے نہیں آیا۔ لیکن کچھ مثبت آوازیں شمال اور جنوب سے سنائی دی ہیں۔ چنانچہ کراچی سے جماعت کے ایک اہم رہنما نے اپنے نام کے اخفاء کی تاکید کے ساتھ اپنے ذاتی اتفاق کا اظہار کیا ہے۔ اسی طرح اسلام آباد سے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز کے سرکاری مجلے "دینی صحافت" نے اس پر خلاف توقع بہت مثبت رویہ اختیار کیا ہے۔ مزید شمال سے آپ کا ردعمل بھی سامنے آیا ہے' اور سوات ہی سے خواجہ عبدالباری صاحب کی بھی

امیر تنظیم کے تجزیئے پر ماہنامہ "دینی صحافت" کا ادارتی نوٹ

حالیہ سالوں میں سیاسی جماعتوں میں بوجوہ تقسیم در تقسیم کے عمل میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ ان اسباب میں سے ایک ہے' جن سے عوام میں دینی قوتوں کا اثر و نفوذ کم ہوا اور نفاذ اسلام کے میدان میں پیش رفت تو کجا' انہیں اب اپنے وجود کے تحفظ کا سامنا ہے۔ دینی قوتیں سالہا سال سے جن اختلافات کی لپیٹ میں ہیں' وہ فقہی' مسلکی اور کسی اصولی موقف کے حوالے سے کس حد تک ناگزیر ہیں' تنظیم اسلامی کے راہنما ڈاکٹر اسرار احمد نے ایک جرات مندانہ جائزے میں اسی صورتحال کا جائزہ لیا ہے اور دینی جماعتوں کے اتحاد کے لئے تجاویز پیش کی ہیں۔ ان کے تجزیئے کا انداز علمی' تحقیقی اور تاریخی ہے۔ اس میں شائستہ اور رشتہ زبان استعمال کی گئی ہے اور کسی پر طنزیا چوٹ نہیں کی گئی۔ ریکارڈ کے حوالے سے کئی باتوں میں ان سے اختلاف ممکن ہے' تاہم اس پر ردعمل کا جذباتی (بلکہ ایک دو جرائد میں ناشائستہ) رویہ مناسب نہیں۔ ایسی تحریریں وقت کی ضرورت ہیں۔ دینی جرائد کو اس موضوع پر اب کھل کر اظہار خیال کرنا چاہئے۔ صرف سیاسی جماعتوں میں ہی خلا نہیں ہیں' دینی جماعتوں میں بھی بہت ہیں۔ ان کا سامنا کئے بغیر تو بات نہیں بنے گی اور نہ ان کی پالیسیوں کو زیر بحث لائے بغیر اصلاح احوال کی کوئی صورت بن پائے گی . . . . ."

(ماہنامہ دینی صحافت' جنوری ۹۶ء)

"نیمے دروں نیمے بروں" ہی سہی بہرحال کسی نہ کسی درجہ میں مثبت رائے سامنے آئی ہے۔ فضا کے صاف ہونے اور تعصبات کے پردے ہٹنے کی علامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کچھ عرصہ قبل کراچی میں جماعت کے ادارۂ معارف اسلامی کے انگریزی مجلّہ نے سندھ کے مسئلہ پر نہ صرف یہ کہ میری رائے کی میرا نام لے کر بھرپور تائید کی' بلکہ نام لئے بغیر قاضی حسین احمد صاحب کے موقف کی تردید ہی نہیں تضحیک بھی کی۔ اسی طرح روزنامہ "جسارت" کے ایک مضمون نگار نے بھارت کے ساتھ تعلقات کے ضمن میں وہ ساری باتیں اپنی ایک تحریر میں جمع کر دیں جو میں نے گزشتہ دس سالوں کے دوران وقتاً فوقتاً کہی ہیں!

بہرحال مجھے یقین ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت' مشیت اور تدبیر میں قیامت سے قبل اسلام کے موعودہ عالمی غلبے کے ضمن میں پاکستان کا کوئی رول ہے تو بیسویں صدی عیسوی کی برعظیم پاک و ہند کی تحریک اسلامی کے ان تین تنظیمی سلسلوں سے وابستہ باہمت اور اولو العزم لوگ کسی نہ کسی صورت میں ضرور یکجا ہوں گے۔ اور میرا گمان ہے کہ "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" کے مصداق' احیائے اسلام اور اقامتِ دین کی یہ تدریجی جدوجہد جو اس وقت "اولمپک ٹارچ" کے مانند چوتھی نسل کے ہاتھ میں ہے' ان شاء اللہ العزیز' اگلی نسل میں ضرور کامیابی سے ہمکنار ہو گی! (دیکھئے میری تالیف "برعظیم پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل" کا باب چہارم)

اس ضمن میں جو ذمہ داری آپ ایسے باشعور اور دردمند نوجوانوں پر عائد ہوتی ہے اس کے ضمن میں آپ کو زیادہ سے زیادہ عملی پیش رفت کرنے کی ضرورت ہے۔ میری شدید خواہش تھی کہ آپ سے جلد دوبارہ ملاقات ہو لیکن اس وقت میں پھر بیرون ملک سفر کے لئے پابہ رکاب ہوں' جس کے دوران غالباً میرا گھٹنوں کی REPLACEMENT کا خاصا بڑا آپریشن بھی ہو گا۔ بصورت زندگی واپسی پر ملاقات ہو گی۔ دوسری صورت میں بھی افراد تو اپنی جگہ اہم ہوتے ہوئے بھی غیر اہم ہوتے ہیں' ان سے کہیں اہم تر جماعتیں اور تنظیمیں ہوتی ہیں' اور بہ الفاظ دیگر "جو تجھ سے' مجھ سے عظیم تر ہے!" کے مصداق سب سے بڑھ کر اور اہم ترین شے تحریک ہوتی ہے۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق اپنی زندگی تحریک

اسلامی کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں کھپادی ہے۔ اب یہ آپ جیسے لوگوں کا کام ہے کہ میدان عمل میں آئیں اور تن من دھن کے ساتھ مصروف کار ہو جائیں۔ فقط والسلام مع الاکرام

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

قرآن کالج لاہور کے تدریسی نظام میں تبدیلیاں

☆ قرآن کالج کے نصاب سے بی اے تربیتی سال کو ختم کردیا گیا ہے اور فیصلہ کیا گیا ہے کہ انٹر کے نتیجے کا انتظار کئے بغیر یکم جولائی سے بی اے سال اول میں داخلے کے امیدواروں کی تدریس کا آغاز کر کے انہیں عربی' تجوید اور منتخب نصاب وغیرہ کی تعلیم دی جائے اور تین ماہ بعد قرآن کالج سے انٹر پاس کرنے والے طلبہ کی بی اے سال اول کلاس میں انہیں شامل کردیا جائے۔

☆ رجوع الی القرآن کورس کی تدریس کا آغاز بھی یکم جولائی سے کیا جائے گا۔ اس طرح یہ کورس گیارہ ماہ میں مکمل ہو جایا کرے گا۔

☆ جولائی ۱۹۹۶ء کو رجوع الی القرآن کلاس میں خواتین کو داخلہ نہیں دیا جائے گا۔

المعلن : پرنسپل قرآن کالج لاہور

نفاق کی نشانیاں (۲)

تالیف : فضیلہ الشیخ الاستاذ عائض عبداللہ القرنی
ترجمہ و حواشی : ابو عبدالرحمن شبیر بن نور

پانچویں نشانی

عبادات میں سستی کا مظاہرہ کرنا

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوا كُسَالٰى﴾

(النساء ۱۴۲)

"اور جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو کسمساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں"۔

اور جب تم کسی انسان کو دیکھو کہ وہ نماز سے' یا پہلی صف سے' یا ذکر الٰہی سے' یا دعوت دین سے یا علم سے یا نیکی کی محفلوں سے سستی کرتا ہے تو یقین جانو کہ اس کے دل میں شیطانی وسوسہ موجود ہے اور شیطان اس کے دل میں انڈے بچے دینا چاہتا ہے' لہٰذا اسے خبردار و ہوشیار ہونا چاہئے۔ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ جو نماز پڑھے وہ نفاق سے پاک ہے' کیونکہ منافق بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز ادا کیا کرتے تھے۔ لیکن منافقوں والی نماز کی نشانی کسل و سستی ہے۔ وہ سستی کے ساتھ اور ربو جھل قدموں سے نماز کے لئے اٹھتے ہیں' وہ چستی اور نشاط سے خالی ہوتے ہیں' جبکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ·

﴿يَا يَحْيٰى خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ﴾ (مریم . ۱۲)

"اے یحییٰ کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھام لے"۔

ادھر منافقوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ گھسٹتے پاؤں کے ساتھ مسجد جاتے ہیں گویا کہ ان کے پاؤں

میں بیڑیاں ہیں اور بیڑیوں کے بوجھ سمیت قدموں کو بمشکل ہی گھسیٹ رہے ہیں۔ تم انہیں صف کے کونے میں یا مسجد کے آخر میں دیکھو گے۔ انہیں کچھ خبر نہیں کہ امام نے کیا پڑھا ہے' نہ ہی وہ اس پر غور کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی سمجھ میں آتا ہے۔ شاعر نے ایسے آدمی کے بارے میں سچ کہا ہے :

> ڈری اور گھبرائی ہوئی آنکھوں سے کہہ دو کہ سورج کی بھی آنکھیں ہیں۔ وہ طلوع ہوتے اور غروب ہوتے انہیں بخوبی دیکھ لیتا ہے۔
>
> جن آنکھوں کے نور کو اللہ ختم کر چکا ہے انہیں معاف کر دو' نہ تو وہ ٹھیک ہو سکتی ہیں اور نہ کسی چیز کو صحیح صحیح دیکھ سکتی ہیں۔

حضرت اسود بن یزید العراقی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ حضور اکرم ﷺ تہجد کے لئے کس وقت اٹھتے تھے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتلایا : جب مرغ اذان دیتا تو آپ بیدار ہو جاتے"۔ مزید فرمایا : "آپ اچھل کر اٹھتے تھے"۔ یہ نہیں فرمایا کہ آپ ﷺ تہجد کے لئے اٹھ جاتے تھے بلکہ فرمایا : اچھل کر اٹھتے تھے۔ {۱} آپ کا اس طرح اٹھنا حوصلے' ہمت' چستی' حرارتِ ایمانی اور قوتِ ارادہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ آپ ؐ عبادت کے لئے ہمیشہ قوتِ ایمانی اور جذبۂ اطاعت کے ساتھ تشریف لاتے۔ اسی لئے ہر نیک آدمی کو تم دیکھو گے کہ وہ بار بار اپنی گھڑی پر وقت دیکھتا رہتا ہے کہ کب اذان ہوتی ہے؟ کیا نماز کا وقت قریب تو نہیں ہو گیا؟ پھر وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

حضرت امام احمد نے حضرت عدی بن حاتم ؓ کے بارے میں لکھا ہے' وہ فرماتے ہیں کہ "قسم بخدا' نماز کا وقت ہونے سے پہلے ہی میں بصد شوق تیار بیٹھا ہوتا ہوں"۔ {۲}

حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ اپنے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ : چالیس سال تک معاملہ یہ رہا ہے کہ جب موذن اذان دیتا تو میں اس وقت مسجد نبوی میں موجود ہوتا {۳}۔

{۱} صحیح مسلم - کتاب المسافرین - باب صلاۃ اللیل والوتر

{۲} کتاب الزھد' ترجمہ عدی بن ابی حاتم رضی اللہ عنہ - ص ۲۵۰

{۳} کتاب الزھد' ترجمہ سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ - ص ۲۵۸ - ۲۵۹ - ایک دوسرے موقع پر

قسم بخدا ایمان اسی کا نام ہے۔ جب تم کسی کو پہلی صف اور بالخصوص امام کے قریب والی جگہ پر دیکھو تو اس کے حق میں ایمان کی گواہی دو۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا :

((مَنْ رَأَيْتُمُوهُ يَعْتَادُ الْمَسْجِدَ فَاشْهَدُوا لَهُ بِالْإِيمَانِ))

"جس آدمی کو تم مسجد میں آتا جاتا دیکھو اس کے ایمان کی گواہی دو"۔ {۴}

اگرچہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے لیکن اہل علم کے نزدیک اس کا مفہوم صحیح ہے۔ جو آدمی لگاتار اور مسلسل مسجد میں آتا رہے ان شاء اللہ وہ نفاق اعتقادی سے پاک ہے۔ اب اس کی ذمہ داری ہے کہ اپنے آپ کو نفاق عملی سے بھی پاک رکھے۔

میرے دینی بھائیو! سستی نفاق کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ یہ نشانی نماز' روزہ' ذکر' عبادت' مفید علمی دروس اور دعوت دین کے موقع پر نمایاں ہوتی ہے۔ انسان کو چاہئے اپنے بارے میں چوکنا رہے اور سستی کو اپنے قریب تک نہ پھٹکنے دے۔ اللہ کی قسم یہ بہت خطرناک بیماری ہے۔ اسی سستی کو تو اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی نشانی بتلایا ہے۔ والعیاذ باللہ!

چھٹی نشانی

دکھلاوے کی خاطر عبادت کرنا

اللہ تعالیٰ منافقوں کے بارے میں فرماتا ہے :

﴿يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا ۝﴾ (النساء : ۱۴۲)

"محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر (عبادت کرتے ہیں) اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں"۔

آپ نے فرمایا : "چالیس سال تک کوئی ایک نماز بھی جماعت سے نہیں رہی اور نہ کبھی دوسری صف میں بیٹھا ہوں اور نمازیوں سے مسجد سے نکلتے ہوئے بھی کبھی ملاقات نہیں ہوئی (یعنی ہمیشہ سب کے بعد مسجد سے نکلا ہوں)

{۴} سنن الترمذی' کتاب الایمان' باب ماجاء فی حرمۃ الصلاۃ' حدیث نمبر ۲۶۱۷۔ حدیث ضعیف ہے۔ علامہ الالبانی نے اسے بھی ضعیف قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو ضعیف الجامع الصغیر وزیادہ حدیث نمبر ۵۰۹

اسی سلسلے میں حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهِ --- وَمَنْ يُرَائِي يُرَائِي اللّٰهُ بِهِ))

"جو آدمی شہرت کے لئے نیک کام کرے گا (روز قیامت سب کے سامنے) اللہ تعالیٰ اس کو بدنام اور رسوا کر دیں گے' --- اور جو آدمی دکھلاوے کے لئے نیک کام کرے گا (روز قیامت سب کے سامنے) اللہ تعالیٰ اس کا پردہ فاش کر دیں گے"۔ {۵}

دکھلاوے یا ریا کی کیا شکل ہوتی ہے؟ یہ کہ انسان لوگوں کے سامنے تو بڑے خشوع و خضوع کا مظاہرہ کرے اور تنہائی و خلوت کی نماز میں ٹھونگے مارے۔ اور جب لوگوں کے ساتھ بیٹھے تو اس پر زہد و عبادت کا رنگ نمایاں ہو' مجلس کی گفتگو کے دوران اس کی باتوں میں ادب و احترام کا مظاہرہ ہو اور ادھر تنہائی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام کردہ تمام حدوں کو توڑ ڈالے۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَيَأْتِيَنَّ أَقْوَامٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِحَسَنَاتٍ أَمْثَالِ عَضَاةِ تِهَامَةَ يَجْعَلُهَا اللّٰهُ هَبَاءً مَنْثُورًا)) قَالَ الصَّحَابَةُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَلَيْسُوا بِمُسْلِمِينَ؟ قَالَ: ((بَلٰى' يُصَلُّونَ كَمَا تُصَلُّونَ' وَيَصُومُونَ كَمَا تَصُومُونَ' وَلَهُمْ فُضُولُ أَمْوَالٍ يَتَصَدَّقُونَ بِهَا' وَكَانَ لَهُمْ حَظٌّ مِنَ اللَّيْلِ' لٰكِنْ كَانُوا إِذَا خَلَوْا بِمَحَارِمِ اللّٰهِ انْتَهَكُوهَا)) {۶}

"قیامت کے روز کچھ لوگ تہامہ کے پہاڑوں جیسی نیکیاں لے کر حاضر ہوں گے' اللہ تعالیٰ انہیں راکھ بنا کر اڑا دے گا"۔ صحابہ کرام نے دریافت کیا: یا رسول اللہ ﷺ کیا وہ لوگ مسلمان نہیں ہیں؟ ---- فرمایا "کیوں نہیں! جیسے تم نماز پڑھتے ہو ویسے ہی نماز پڑھتے ہیں اور جس طرح تم روزے رکھتے ہو ویسے ہی وہ روزے رکھتے ہیں اور

{۵} صحیح بخاری' کتاب الرقاق' باب الریاء والسمعة۔ صحیح مسلم' کتاب الزهد' باب تحریم الریاء

{۶} سنن ابن ماجه' کتاب الزهد' باب ذکر الذنوب' حدیث نمبر ۴۲۴۳۔ استاذ الالبانی حفظہ اللہ نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ (واضح رہے کہ سنن ابن ماجہ کے الفاظ تھوڑے مختلف ہیں (مترجم)۔

اپنے اضافی مالوں سے زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں اور رات کو بھی اٹھ اٹھ کر عبادت کرتے ہیں (لیکن اصل بات یہ ہے کہ) جب تنہائی میں ہوتے ہیں تو اللہ کی مقرر کردہ حدود کو توڑ ڈالتے ہیں"۔

تو معلوم ہوا کہ منافق کی نشانی دکھلاوا ہے 'لوگوں کو دکھلانے کی خاطر نیک کام کرتا ہے اور لوگوں کو دکھلانے کی خاطر ہی اچھی گفتگو کرتا ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں دکھلاوے اور شہرت جیسے امراض سے محفوظ رکھے۔ یہ انتہائی خطرناک بیماریاں ہیں۔ جب کوئی انسان ان کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کے تمام نیک اعمال ان بیماریوں کے بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ يَقُولُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: اَنَا اَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ اَشْرَكَ مَعِيَ فِي عَمَلٍ تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ))

"اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائیں گے: حصہ داری کے معاملے میں 'میں سب سے زیادہ بے نیاز ہوں' جس نے کسی کام میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو شریک بنایا تو میں اس کو اس کے شرک سمیت چھوڑ دوں گا"۔ {۷}

اللہ تعالیٰ ایسے ریاکار کا کوئی چھوٹا بڑا عمل قبول نہیں کرے گا' حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَلرِّيَاءُ شِرْكٌ)) {۸} "ریا شرک ہے"

نیک لوگ ریا کے خوف سے رویا کرتے تھے اور اللہ کے حضور گریہ زاری کے ساتھ دعا کرتے تھے کہ وہ انہیں ریا سے محفوظ رکھے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں ریا آسکتا ہے' نماز میں ریا آتا ہے' ذکر الٰہی اور روزے میں ریا ہوتا ہے۔ ریا سے بچنے کا ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں' الا یہ کہ مندرجہ ذیل تین اصولوں کو ہمیشہ ذہن میں تازہ رکھا جائے:

(۱) تم یہ یقین کر لو کہ نفع نقصان صرف اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کے علاوہ نہ کوئی بیماری دے سکتا ہے نہ شفاء' نہ کوئی زندہ کر سکتا ہے نہ مار سکتا ہے' نہ کوئی رزق دے

{۷} صحیح مسلم 'کتاب الزھد' باب تحریم الریاء

{۸} اس مفہوم کی حدیث مسند احمد ج ۵' ص ۴۲۸ اور سنن ابن ماجہ حدیث نمبر ۴۲۰۴ میں مذکور ہے۔

سکتا ہے اور نہ رزق روک سکتا ہے' نہ کوئی جزا دے سکتا ہے اور نہ سزا۔

(۲) تمہیں مخلوق کی حیثیت کا علم رہنا چاہئے کہ وہ بہت کمزور اور لاچار ہے' نہ وہ کسی کے نفع و نقصان کی مالک ہے اور نہ موت و زندگی کی' اور نہ دوبارہ زندہ کرنے کا اختیار رکھتی ہے اور نہ ہی وہ جزا و سزا کی مالک ہے چنانچہ تم ہمیشہ چوکنے اور ہوشیار رہو۔

(۳) بالالتزام اور پابندی سے مندرجہ ذیل دعا پڑھا کرو۔ حضور اکرم ﷺ نے یہ عمدہ دعا اپنے صحابہ کو سکھائی تھی :

اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ اَنْ اُشْرِكَ بِكَ شَيْئًا وَاَنَا اَعْلَمُ وَاَسْتَغْفِرُكَ مِمَّالَااَعْلَمُ

"اے اللہ! میں اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ جانتے بوجھتے کسی چیز کو تیرا شریک ٹھہراؤں اور جس گناہ کا مجھے علم ہی نہیں اس کی میں مغفرت چاہتا ہوں"۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ یوں دعا کیا کرتے تھے : "اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنَ الرِّيَاءِ وَالسُّمْعَةِ" یعنی "اے اللہ میں ریا اور شہرت کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں"۔

آپؒ کے حالات زندگی کے تذکرے میں بعض جگہ دعا کے یہ الفاظ ملتے ہیں :

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ رِيَائِيْ وَسُمْعَتِيْ

"اے اللہ! ریا اور شہرت کی خاطر میں نے جو کام کئے ہیں انہیں معاف فرمادے"۔

ریا و شہرت سے ہمیشہ بچ کر رہنا چاہئے

شہرت سے مراد یہ ہے کہ اپنا نام پیدا کرنے اور دنیا میں شہرت پانے کی خاطر انسان کوئی نیک کام کرے۔ ریاکاروں اور شہرت کے طلب گاروں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز سب کے سامنے ذلیل و رسوا کردے گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں ریا اور شہرت جیسی بیماریوں سے محفوظ رکھے۔

ساتویں نشانی

ذکرِ الٰہی میں کوتاہی

یہ منافق لوگ اللہ کو یاد ضرور کرتے ہیں لیکن تھوڑا تھوڑا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَاءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ (النساء ۱۴۲)

"اور جب نماز کے لئے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے، محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں"۔

قرآن نے یہ نہیں کہا کہ وہ اللہ کا ذکر نہیں کرتے، ذکر ضرور کرتے ہیں، لیکن بہت تھوڑا۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ منافق بھی اللہ کا ذکر کرے، اس کے نام کی تسبیح و تہلیل کرے لیکن بہت کم ہی، کیونکہ اس کی زبان محروم لذت ہے اور اس کا دل بھی مردہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی خاطر اس کی روح میں چستی نہیں ہوتی۔ حضرت ابو الدرداء بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((تِلْكَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ تِلْكَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ تِلْكَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ يَرْقُبُ الشَّمْسَ حَتّٰى تَدْنُوَ مِنَ الْغُرُوْبِ (وَفِي لَفْظٍ حَتّٰى تَصْفَرَّ) ثُمَّ يَقُوْمُ فَيَنْقُرُ اَرْبَعَ رَكَعَاتٍ لَا يَذْكُرُ اللّٰهَ فِيْهَا اِلَّا قَلِيْلًا)) {۹}

"یہ منافق کی نماز ہے، یہ منافق کی نماز ہے، یہ منافق کی نماز ہے۔ وہ سورج کو دیکھتا رہتا ہے جب غروب کے قریب ہو جاتا ہے (دوسری روایت میں ہے : جب پیلا ہو جاتا ہے) تو کھڑے ہو کر چار رکعت کے ٹھونگے مار لیتا ہے، ان میں اللہ کو کم ہی یاد کرتا ہے۔"

سبحان اللہ! وہ نماز پڑھتا ہے، تھوڑا بہت اللہ کا ذکر بھی کرتا ہے، اس کے باوجود منافق قرار

{۹} صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب استحباب التکبیر بالعصر

پاتا ہے۔ {۱۰} ہاں البتہ ایمان کی نشانی کثرت سے اللہ کا ذکر کرنا ہے۔ امام ابن القیم رحمہ اللہ "الوابل الصیب" میں فرماتے ہیں۔ "خواہ ذکر کا اس کے علاوہ کوئی اور فائدہ نہ بھی ہو یہی فائدہ بہت کافی ہے کہ ذکر کرنے والا نفاق سے بری ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا: کیا خارجی منافق ہیں؟ (واضح رہے کہ خارجیوں کے خلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جہاد کیا تھا) آپؓ نے فرمایا: نہیں! یہ اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں اور منافق کی نشانی ہے کہ وہ اللہ کو کم یاد کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝﴾ (الرعد: ۲۸)

"خبردار رہو اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔"

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ (البقرہ: ۱۵۲)

"تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔"

مزید فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِهِمْ﴾

(آل عمران: ۱۹۱)

"جو لوگ اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔"

اور فرمایا:

﴿وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ﴾

(الاحزاب: ۳۵)

"اور جو مرد اور عورتیں اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں۔"

اور فرمایا:

{۱۰} جو دیر سے نماز پڑھے، جلدی جلدی پڑھے اور اللہ تعالیٰ کو کم ہی یاد کرے وہ تو ٹھہرا منافق اور جو بالکل نماز نہ پڑھے، ذکر اذکار کا تو سوال ہی کیا، وہ کون ہے؟ نماز سے غافل حضرات ذرا غور فرمالیں۔۔۔ (مترجم غفرلہ ولوالدیہ)

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ۝﴾ (الاحزاب : ۴۱)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔"

مسلک امام شافعی کے معروف محدث علامہ ابن الصلاح سے دریافت کیا گیا : "اللہ کے زیادہ ذکر کی حد کیا ہے؟" فرمایا : "جو آدمی حضور اکرم ﷺ سے ماثور و مروی اذکار کی پابندی کرتا ہے اس نے اللہ تعالیٰ کو بکثرت یاد کیا۔" چنانچہ جو آدمی صبح و شام نماز کے بعد ماثور اذکار پابندی سے پڑھے۔ کھانے' پینے' سونے' جاگنے' بجلی کے چمکنے' بادل کے گرجنے' بارش برسنے' مسجد میں داخل ہونے اور مسجد سے نکلنے سے متعلق مروی دعائیں پڑھے' تو یقین جانو اس نے اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ آپ نے فرمایا : "جو آدمی اللہ تعالیٰ کو چلتے پھرتے' حالت قیام اور حالت سفر' صحت و بیماری اور ہر وقت یاد کرتا رہے اس نے واقعتاً اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کیا۔ کئی ایک سلف صالحین سے یہ قول مروی ہے کہ "کثرتِ ذکر" سے مراد ہے کہ مسلسل ذکر الٰہی سے تمہاری زبان تر رہے۔ حضرت عبداللہ بن بُسر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ دین کے احکام مجھے بہت زیادہ محسوس ہوتے ہیں بس مجھے کوئی ایک ایسی چیز بتا دیں جسے میں مضبوطی سے تھامے رکھوں۔ تو آپ نے فرمایا : "تیری زبان ہمیشہ ذکر الٰہی سے تر رہے" {۱۱} ۔

ایک موقع پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا :

((لَئِنْ أَقُولُ سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ)) {۱۲}

"اگر میں سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ کہہ لوں تو یہ مجھے ہر اس چیز سے زیادہ عزیز ہے جس پر سورج طلوع ہوتا ہے۔ (یعنی دنیا و مافیہا سے)۔"

{۱۱} سنن الترمذی' کتاب الدعا' باب ماجاء فی فضل الذکر' حدیث نمبر ۳۳۷۵

{۱۲} صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعا' باب فضل التہلیل والتسبیح

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((سَبَقَ الْمُفَرِّدُوْنَ' قَالُوا : وَمَا الْمُفَرِّدُوْنَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ : اَلذَّاكِرُوْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَالذَّاكِرَاتُ)) {۱۳}

"مفردون سب سے آگے رہے۔" صحابہ نے دریافت کیا : اے اللہ کے رسول' مفردون سے آپ' کی کیا مراد ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا : "اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے مرد اور عورتیں"۔

برادرانِ اسلام! میں تمہیں کثرت سے ذکرِ الٰہی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ ذکرِ الٰہی میں کمی کے موجب نفاق کا خطرہ ہے۔ صبح و شام کثرت سے اللہ کا ذکر کیا کرو۔ "سبحان اللہ اور لا الٰہ الا اللہ کی تسبیح' قرآن کی تلاوت' توبہ و استغفار اور حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی پر درود شریف کے ورد پر اپنے دل کو جمالو۔ ذکر و اذکار سے متعلق تین کتابیں بہت عمدہ ہیں {۱۴} (۱) الاذکار تالیف الامام النووی" (۲) الوابل الصیب تالیف الامام ابن القیم الجوزیہ" (۳) الکلم الطیب تالیف الامام ابن تیمیہ رحمھم اللہ جمیعًا۔

{۱۳} صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعا' باب الحث علی ذکر اللہ

{۱۴} ان میں سے جو کتاب تحقیق و تخریج کے ساتھ دستیاب ہو وہ زیادہ بہتر ہے بالخصوص علامہ محمد ناصر الالبانی الاستاذ احمد محمد شاکر یا الاستاذ عبد القادر الارناووط کی تحقیق زیادہ وقیع اور زیادہ قابل اعتماد ہے۔ (مترجم غفرلہ ولوالدیہ ولاساتذتہ)

افکار و آراء

رمضان المبارک اور ہم

میم سین، کراچی

کہتے ہیں ایک مرتبہ مرزا غالب رمضان المبارک کے دوران ایک کمرے میں اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں مشغول تھے کہ ان کے ایک اور دوست وہاں تشریف لائے اور از راہ تمسخر مرزا سے کہنے لگے : مرزا ہم نے تو سنا ہے کہ رمضان میں شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے۔ مرزا نے فوراً کہا : یہ وہی کمرہ تو ہے جہاں شیطان کو قید کیا جاتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں جب یہ لطیفہ ذہن میں آتا ہے تو اپنے ملک پر اس کمرے کا گمان ہوتا ہے جہاں مرزا نوشہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے۔ دیکھئے نا! آج ہی اخبار میں خبر آئی ہے کہ جن اشیاء کی قیمتوں پر حکومت نے رمضان المبارک کے دوران تخفیف کا اعلان کیا تھا وہ یوٹیلٹی اسٹورز سے غائب کر دی گئی ہیں۔ غالباً یہ کام رمضان المبارک کے آغاز سے قبل اس لئے کر لیا گیا ہے کہ رمضان المبارک کے احترام میں فرق نہ پڑے۔ اور یہ رمضان المبارک کا احترام بھی عجیب فریضہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رمضان المبارک کے احترام میں ویڈیو شاپس بھی بند ہو جانی چاہئیں اور سینما ہال بھی۔ گویا کہ رمضان المبارک کے علاوہ بقیہ مہینوں میں یہ کام جائز ہیں۔ اور رہاں رمضان المبارک کے احترام میں روزوں کے ساتھ نمازیں بھی خوب خوب پڑھی جاتی ہیں۔ نمازیوں سے بھری ہوئی مسجدوں کو دیکھ کر دل میں یہ تمنا پیدا ہوتی ہے کہ کاش یہ مناظر سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں نظر آئیں۔ لیکن افسوس کہ جیسے جیسے عید الفطر قریب آتی جاتی ہے نمازیوں کی تعداد میں بتدریج کمی آتی جاتی ہے تا آنکہ شب قدر کی مبارک ساعتیں آجاتی ہیں۔ پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہیں رہتی۔ گویا کہ شب قدر میں چراغ گل ہونے سے قبل بھڑک اٹھتا ہے۔ اس کے بعد یہی رونقیں شاپنگ سینٹرز وغیرہ میں منتقل ہو جاتی ہیں اور کیوں نہ ہوں، عید کی

خریداری بھی تو ضروری ہوتی ہیں۔ ہماری بہنیں انہی راتوں کو نئی چوڑیوں اور اسی قسم کی دیگر اشیاء خریدنے میں مصروف نظر آتی ہیں۔ اور وجود زن سے تصویر کائنات میں رنگ کا سماں ہوتا ہے۔

دیکھئے بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ بات ہو رہی تھی شیطان کے قید کئے جانے کی۔ اور میں نے کہا تھا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسے غالباً ہمارے ملک میں ہی قید کر دیا جاتا ہے۔ جبھی رمضان المبارک کے دوران اشیاء کی قیمتیں' جو عام دنوں میں آسمان پر جا پہنچتی ہیں' اس سے بھی آگے زہرہ اور مریخ کی بلندیوں کو چھونے لگتی ہیں۔ ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری کو رمضان المبارک کی بناء پر تقدس حاصل ہو جاتا ہے۔ اور آپ سے کیا پردہ' ہم بھی کبھی روزوں کو بہلانے کے لئے سینما ہالوں میں منی شو دیکھنے میں مصروف ہو جایا کرتے تھے۔ ہم تو خیر اب اپنی اس حرکت سے باز آگئے ہیں لیکن اب تو لوگوں کو روزہ بہلانے کے لئے نہ تو سینما ہالوں کا رخ کرنا پڑتا ہے اور نہ ہی ٹکٹ کے لئے قطار میں لگنے اور لوگوں کی دھکم پیل کی مشقت برداشت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلے ٹی وی' پھر وی سی آر اور اب ڈش انٹینا۔ آخر یہ چیزیں لوگوں کے فائدے کے لئے بنائی گئی ہیں تو کیوں نہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ خیر یہ تو بہت ہی عام سی باتیں ہیں۔ ان گنہگار آنکھوں نے تو رمضان المبارک کی راتوں میں وہ مناظر بھی دیکھے ہیں کہ مسلمانوں کے دو گروہ ایک دوسرے پر گولیوں کی بوچھاڑ کر رہے ہیں اور دونوں جانب سے گاہے گاہے نعرۂ تکبیر کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ کیا کیا جائے۔ مسلمان اور جہاد و قتال لازم و ملزوم ہیں۔ سقوط بغداد اور سقوط ڈھاکہ کے داغ کو بھی دھونا ہے' اس کے لئے ریہرسل ضروری ہے' سو وہ آپس میں لڑ بھڑ کر کر لیتے ہیں۔ رمضان المبارک کا زمانہ اس ریہرسل کے لئے بہترین ہوتا ہے۔ ایمانی کیفیت پورے عروج پر ہوتی ہے۔ عموماً یہ ریہرسل ۱۷ رمضان المبارک کے بعد کی جاتی ہے۔ اس سے پہلے غزوۂ بدر پر اخبارات ضمیمے شائع کرتے ہیں' سیمینار اور کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔ رمضان المبارک کے دوران نیکیاں کمانے والوں کا ایک گروہ اور ہوتا ہے۔ یہ رمضان المبارک کے پہلے دو عشروں میں تو کم کم دکھائی دیتے ہیں البتہ آخری عشرے میں یہ انتہائی سرگرم نظر آتے ہیں۔ کوئی ڈھول پیٹ رہا ہوتا ہے تو کوئی اپنی خوش آوازی کا

مظاہرہ کر رہا ہوتا ہے۔ فلمی دھنوں پر یہ "مذہبی گویے" (Religious Singers)
لوگوں کو سحری کے لئے بیدار کرنے میں مصروف ہوتے ہیں اور عید الفطر کے فوراً بعد ہی یہ
بن بلائے مہمان بن کر آپ کے دروازے پر یہ یاد دلانے کے لئے حاضر ہو جاتے ہیں کہ ہم
ان میں شامل تھے جن کی بدولت آپ روزہ رکھنے کے قابل ہوئے۔ اگر ہم نہ ہوتے تو یا تو
آپ بغیر سحری کے روزہ رکھتے جس سے دو نقصانات ہوتے۔ اول یہ کہ آپ ایک سنت کی
ادائیگی سے محروم رہ جاتے۔ دوسرے 'دن بھر بھوک کی شدت برداشت کرنی پڑتی۔

قارئین اب ذرا سنجیدگی سے غور فرمائیں کہ یہ اور اس قسم کی دوسری بے شمار
قباحتیں جو ہمیں رمضان المبارک کے دوران نظر آتی ہیں آخر کوئی تو سبب ہو گا ان باتوں
کا۔ میں تو اتنا سمجھ پایا ہوں کہ دین کا وسیع تر تصور ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہو گیا ہے جس
کی بناء پر ہمارا دین مذہب بن کر رہ گیا ہے 'یعنی عقائد' عبادات اور رسومات کا مجموعہ۔
معیشت' معاشرت اور سیاست تو دین سے خارج کر دیئے گئے ہیں' عقائد مسلکی اور فرقہ
وارانہ بنیاد پر استوار ہو گئے ہیں' عبادات کا تصور محدود ہو گیا ہے اور ان رسومات کی بھرمار
ہو گئی ہے جن کا دین سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ معیشت کو حلال و حرام کی بنیادوں پر
استوار کرنا' معاشرتی حقوق کی ادائیگی اور اللہ کی حاکمیت کی بنیاد پر سیاست کا تصور ہمارے
ذہنوں سے محو ہو چکا ہے۔ عوام الناس کو تو یہ باتیں بتائی بھی نہیں جاتیں اور وہ اس آیہ
قرآنی کے مصداق بن گئے ہیں "اور ان میں وہ علم نہ رکھنے والے ہیں جو کتاب کا علم نہیں
رکھتے سوائے اپنی تمناؤں کے"۔ (سورۃ البقرہ' آیت ۷۸) انہیں تو تمناؤں میں الجھا کر
رکھ دیا گیا ہے۔

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

کی کیفیت میں مبتلا عوام الناس جنت میں داخلے کے شارٹ کٹس کی تلاش میں الجھے ہوئے
ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نزول قرآن کے اس مقدس مہینے میں قرآن کا مقصد
نزول' اس کی افادیت' اس کا فہم اور اس پر عمل ان پر واضح کیا جائے۔ جبھی استقبال
رمضان کا حق ادا ہو سکتا ہے۔

☆☆☆☆

گوشہ خواتین

مجھے اکثر خیال آتا ہے

—— طیبہ یاسمین ——

ا۔ ہم اپنی زبان سے کہتے ہیں "میری نماز' میری قربانی' میری زندگی اور میری موت سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے"۔ ہمیں اس حدیث پاک کا بھی علم ہے کہ "اعمال کا اجر نیتوں کے مطابق ہے" (انما الاعمال بالنیات)۔ جب میں ان پر غور کرتی ہوں اور معاشرہ میں ان پر عمل کا مشاہدہ کرتی ہوں تو مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ ہمارے اعمال میں خوشنودی کا بہت سارا حصہ معاشرہ کو حاصل ہو جاتا ہے۔ غیر جانبدار ہو کر ہر عمل کا جائزہ لے کر سوچنا چاہئے کہ ہماری شادیاں' بیاہ' ہماری مہمانداریاں' ہماری نیکیاں' ہمارے حسن سلوک' ہمارے نیک اعمال لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے کے لئے ہوتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے؟۔ عمل تو ایک ہی ہے بات صرف نیت کی ہے۔ اگر کسی عمل میں کسی طور بھی انسانوں اور معاشرہ کی خوشنودی کا جذبہ شامل ہو تو کیا آخرت میں بھی اس کا اجر محفوظ ہو گا؟ ایسا نہ ہو کہ کہیں ہم اپنا اچھا عمل ریاکاری' مصلحت اور دوسروں کو خوش کرنے کی وجہ سے ضائع کر دیں۔ اور اللہ تعالیٰ یہ کہہ دے کہ تم تو بندوں کی خوشنودی کے لئے اچھے انسان بنے تھے' اب مجھ سے اجر کیسا؟

۲۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ اگر کوئی انسان کسی مشکل یا مصیبت میں گرفتار ہو اور اس کی ہم مدد کر دیں تو کیا وہ اس پر احسان ہو گا؟۔ اس کی مدد کرنا تو ہمارا فرض ہوا اور اس کا حق۔ تو کیا اپنا فرض ادا کرنا خود اپنے آپ ہی پر احسان نہیں؟ کیونکہ بصورت دیگر تو ہم اللہ تعالیٰ کے ہاں جوابدہ ہوں گے۔ کیا یہ دوسرے کا احسان نہیں کہ اس نے نیکی کرنے کا موقع فراہم کیا؟ شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ کسی پر احسان کر کے جتلانا اس کا اجر ضائع کر دیتا ہے۔

۳۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ ہمارے معاملات اور تعلقات کی بنیاد میں نفرت اتنی اہم کیوں ہے؟۔ اچھے لوگ بروں سے ہمدردی کی بجائے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ نفرت تو برائی سے کرنی چاہئے نہ کہ اس انسان سے۔ اور اگر ہم کسی کو بھلائی کی طرف بلاتے ہیں اور وہ ہمارے حسب منشا اس کا ردعمل ظاہر نہیں کرتا تو ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ اس شخص کے برے ہونے کا فیصلہ صادر کردیں۔ ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ شاید ہماری ہی کوشش اور طرز عمل میں کوئی کمی یا خامی ہو؟

۴۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ اللہ ہمیں کسی کا محتاج نہ کرے۔ پھر اس بندے کی یہ دعا قبول بھی ہو جاتی ہے اور انسان اس کی مدد کو نہیں آتے لیکن دیر سویر اس کے کام ہو ہی جاتے ہیں تو پھر اس انسان کو یہ دکھ کیوں ہوتا ہے کہ فلاں انسان نے فلاں مشکل وقت میں میری مدد نہ کی۔ شاید اس کے لئے بھی بڑے ظرف اور سمجھ کی ضرورت ہے۔

۵۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ جب ہم کسی طرز عمل اور راہ کو اپنا لیتے ہیں تو پھر دوسروں سے بھی فوراً ہی یہ توقع کیوں کرتے ہیں کہ وہ ہماری بتائی ہوئی راہ اور طے کردہ اصولوں پر چل پڑے۔ ہم کیوں بھول جاتے ہیں کہ ہم خود اس منزل پر بے شمار تجربوں اور مراحل سے گزرنے کے بعد پہنچے ہیں' پھر ہم دوسروں سے فوراً ہی ان سے گزرے بغیر اس منزل پر پہنچنے کی توقع کیوں کرتے ہیں؟

۶۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ ہم اپنی ہر بات اور ہر جذبہ کے لئے' خواہ وہ درست ہو یا غلط' جواز تلاش کر لیتے ہیں' مگر دوسروں کے لئے وہ نرم گوشہ نہیں رکھتے۔ ہم دوسرے کو بھی وہی گنجائش نہیں دیتے جو خامی خود ہم میں موجود ہو۔ ہم اپنی ہر بات کی تعریف چھپے یا واضح انداز میں کرتے ہیں مگر دوسروں کو تنقید کا نشانہ بنائے رکھتے ہیں۔ کیا اس طرح ہم اپنے حقوق سے تجاوز نہیں کرتے؟ کیا جس بے رحمی سے ہم دوسروں کا تجزیہ کرتے ہیں اس سے اپنا تجزیہ بھی کریں تو ہماری شخصیت خوبصورت تر نہ ہو جائے؟

۷۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ پر توکل سب انسانوں سے مایوس ہونے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ایسی صورت حال پیش

آئے بغیر بھی توکل حاصل ہو۔ کیا اللہ تعالیٰ صرف ٹوٹے دل میں ہی رہ سکتا ہے، ثابت و سالم دل میں نہیں؟ اقبال بھی کہہ گئے ہیں

ع جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں!

۸۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ ہم دوسروں کی برائی سن کر بڑے آرام سے یقین کر لیتے ہیں مگر کسی کی تعریف سنیں تو تصدیق چاہنے لگتے ہیں اور یقین کرنے میں دیر لگتی ہے۔ کیا ہمارے لاشعور میں دوسروں سے نفرت اور ان کو کم تر سمجھنا چھپا ہوتا ہے؟

۹۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ ہمیں اپنے ادا کردہ الفاظ کی عصمت کا پاس کیوں نہیں ہوتا۔ ہم ہر بات بے سوچے سمجھے فیصلہ کن انداز میں کر دیتے ہیں۔ دوسروں کی نیتوں پر شک کر کے فیصلہ صادر کر دیتے ہیں۔ ہمیں اپنے الفاظ کا اتنا ہی یقین ہوتا ہے تو کیا کسی دنیاوی عدالت میں بھی ہم وہی بات اتنے یقین سے کہہ سکتے ہیں؟ آخرت کی عدالت میں تو مالک یوم الدین نے ہر بات اور ہر لفظ کی عصمت کا حساب لینا ہی ہے۔

۱۰۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ انسان دوسروں سے صرف اسی وقت ملتا ہے جب اسے اس سے کوئی کام ہی آن پڑے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ کبھی اس کا حال احوال پوچھنے بھی چل پڑے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد: ۴۵
شمارہ: ۳
شوال المکرم ۱۴۱۶ھ
مارچ ۱۹۹۶ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زرتعاون ۱۰۰/-

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات، قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان — 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارہ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700-فون 03-02-5869501
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67-گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110
پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض احوال

۲۷ فروری کے قومی اخبارات میں یہ خبر شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی کہ وزیراعظم بے نظیر بھٹو کی زیر صدارت ہونے والے اجلاس میں وفاقی کابینہ نے آئندہ انتخابات کے "منصفانہ انعقاد" کو یقینی بنانے کے لئے انتخابی اصلاحات کمیٹی کی سفارشات کی منظوری دے دی ہے۔ منظور شدہ سفارشات میں شامل بعض نکات تو یقیناً ایسے ہیں کہ جن کی تائید کی جانی چاہئے۔ مثلاً قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے انتخابات کا ایک ہی دن میں انعقاد کا فیصلہ، تاہم بعض نکات معقولیت سے بالکل تہی نظر آتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس ضمن میں سب سے زیادہ محل نظر اور ناقابل فہم نکتہ یہ ہے کہ آئندہ انتخابات میں اقلیتوں کو ووٹ کا دوہرا حق حاصل ہو گا اور وہ اپنی مخصوص نشستوں کے علاوہ عام نشستوں پر بھی ووٹ ڈالنے کے مجاز ہوں گے۔ گویا یہ بات تو طے کر ہی لی گئی ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئندہ انتخابات مخلوط انتخابات ہوں گے، اس پر مستزاد اقلیتوں کو اپنی مخصوص نشستوں کے لئے ووٹ ڈالنے کا حق بھی حاصل ہو گا۔ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے!

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ مخلوط انتخابات کا معاملہ کسی طور دو قومی نظریئے کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے کہ جو قیام پاکستان کی اصل بنیاد تھا۔ یوں تو "دو قومی نظریئے" کی دھجیاں بکھیرنے اور اس طرح پاکستان کی بنیادوں پر تیشہ چلانے میں ہم نے پہلے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی اور قیام پاکستان سے قبل وطنی قومیت اور سیکولرزم کے جن نظریات کی شدت کے ساتھ تردید ہمارا اوڑھنا بچھونا تھی، قیام پاکستان کے بعد انہی باطل نظریات کو یکے بعد دیگرے ہم نے گلے سے لگانا شروع کر دیا۔ لیکن یہ ایک گوشہ بھی جو ابھی تک کسی قدر بچا ہوا تھا، بالآخر ہماری دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکا۔

اک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا ۔۔۔ اس کو بھی تو نے آخر چرکا لگا کے چھوڑا

بلاشبہ یہ فیصلہ نظریہ پاکستان کی جڑوں پر ضرب کاری کی حیثیت رکھتا ہے اور اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ قومی سطح پر اب سیکولرزم ہی ہماری ترجیح اول ہے۔ اس موقع پر تنظیم اسلامی کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات جنرل (ریٹائرڈ) محمد حسین انصاری صاحب کی جانب سے یہ بیان جو اخبارات کو برائے اشاعت ارسال کیا گیا تھا اسی حقیقت کی عمدگی کے ساتھ ترجمانی کرتا ہے:

> "انتخابی اصلاحات کے نام پر اقلیتوں کو دوہرے ووٹ کا حق ناقابل فہم ہے۔ قوم متفقہ طور پر جداگانہ طرز انتخاب کا فیصلہ کر چکی ہے جس کی رو سے قومی اور صوبائی اسمبلیوں اور سینٹ میں بھی اقلیتی ارکان کے لئے جداگانہ نشستیں مخصوص ہیں۔ انہوں نے کہا اقلیتوں کو ووٹ کا براہ راست حق دینا بنیادی اور اہم تبدیلی ہو گی جسے قومی اسمبلی اور سینٹ سے منظوری لئے بغیر نافذ کرنا مسلمہ جمہوری اصولوں کے بھی خلاف ہے۔

جنرل انصاری نے کہا کہ ملک کا نظریاتی تشخص اسلامی تصورات پر مبنی ہے جسے سیکولر عناصر ختم کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان جیسے نظریاتی اور جداگانہ تصور قومیت کی حامل ریاست کا مکمل شہری صرف مسلمان ہی ہو سکتا ہے۔ اقلیتوں کو نہ تو قانون ساز اسمبلی کا رکن بنایا جاسکتا ہے اور نہ ہی انہیں ووٹ کا حق دیا جاسکتا ہے۔ جنرل انصاری نے کہا کہ اقلیتوں کو ووٹ کا دوہرا حق درحقیقت دو قومی نظریئے کی نفی کے مترادف ہے"۔

وفاقی کابینہ کے اس ناروا فیصلے کے خلاف ۲ مارچ کو تنظیم اسلامی حلقہ لاہور نے پنجاب اسمبلی کے سامنے ایک احتجاجی مظاہرے کا پروگرام ترتیب دیا جس میں اس انتخابی پیکج کو مسترد کر کے حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ان نام نہاد انتخابی اصلاحات کو منسوخ کرنے کا اعلان کرے۔ اس مظاہرے کی رپورٹنگ لاہور کے اخبارات میں نمایاں انداز میں ہوئی۔ اس موقع پر جو ہینڈ بل وسیع پیمانے پر پبلک میں تقسیم کیا گیا اس میں تنظیم اسلامی کے موقف کی ترجمانی قدرے مفصل لیکن جامع انداز میں کی گئی ہے۔ قارئین میثاق کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ اس ہینڈ بل پر جلی انداز میں یہ سرخی لگائی گئی تھی: "مخلوط انتخابات۔ نظریہ پاکستان کی نفی" اور نیچے درج ذیل عبارت درج تھی:

"بیسویں صدی کے آغاز ہی میں مسلم لیگ کا قیام حاکم انگریز اور متعصب ہندو کو یہ واضح پیغام تھا کہ برصغیر ہند میں مسلمان قوم جداگانہ تشخص کی حامل ہے اور ہندو سے صدیوں کا جغرافیائی قرب اس کی طرز معاشرت میں کوئی شگاف نہیں ڈال سکا۔ برصغیر کا مسلمان جاننے لگا تھا کہ سماجی اور مذہبی سطح پر اسے ملیچھ جاننے والا ہندو سیاسی سطح پر اشتراک صرف اس لئے چاہتا ہے تاکہ انگریز کی خالی کردہ کرسی پر براجمان ہو جائے اور مسلمان جو پہلے ہی معاشی اور سیاسی سطح پر بہت کمزور ہیں انہیں اپنی اکثریت کی بنیاد پر غلام بنا لے۔ بابائے قوم قائداعظم محمد جناح ہندو کی اس بدنیتی کو بھانپ چکے تھے لہٰذا انہوں نے اپنی اصول پسندی، جانفشانی اور برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت کی حمایت سے انگریزوں اور ہندوؤں کی شدید مخالفت کے باوجود بحیثیت قوم برصغیر میں مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو منوایا۔ اور اسی بنیاد پر پاکستان کا مطالبہ دنیا کے سامنے رکھا کہ مسلمان کیونکہ ایک الگ قوم ہے لہٰذا اسے یہ حق حاصل ہے کہ برصغیر کے مسلم اکثریت والے علاقوں پر مشتمل ایک الگ ملک قائم کیا جائے جس کی تعریف قائداعظم نے کچھ یوں کی۔ "ہم پاکستان اس لئے حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ دنیا کو اسلامی اخوت و حریت اور مساوات کا نمونہ دکھا سکیں"۔

۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلمانان ہند نے مسلم لیگ کے اس فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہے اور مسلم لیگ اس کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اس پس منظر میں پاکستان میں مخلوط انتخابات کا رائج کرنا کیا یہ تسلیم کرنا نہیں کہ

(باقی صفحہ ۷۹ پر)

عہدِ حاضر میں نظامِ خلافت

کا دستوری، قانونی اور سیاسی ڈھانچہ

اور اس کے نفاذ کا طریق کار

(گزشتہ سے پیوستہ)

ڈاکٹر اسرار احمد

اپنی اب تک کی گفتگو میں میں نے وہ تین چیزیں بیان کی ہیں جو کسی بھی نظام کو نظامِ خلافت میں تبدیل کر سکتی ہیں۔ یعنی (۱) اللہ کی حاکمیت' (۲) کتاب و سنت کی مکمل اور غیر مشروط بالادستی' اور (۳) مکمل شہریت کا حق صرف مسلمان کے لئے۔ میں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اسلامی ریاست میں دستور سازی کیسے ہو گی۔ اسی طریقے سے مشاورتِ باہمی کا نظام کیا ہو گا؟ الیکشن کا نظام کیا ہو گا؟ پھر یہ کہ Impeachment کا نظام کیا ہو گا!

نظامِ حکومت۔ پارلیمانی یا صدارتی؟

دستوری ڈھانچے کے ضمن میں اب میں ایک بات "last but not the least" کے درجے میں عرض کر رہا ہوں اور اس کا تعلق پاکستان کے حالات خصوصاً کراچی کے مسئلے سے اور میری الطاف حسین صاحب سے ملاقات سے بھی جُڑتا ہے۔ میرے نزدیک ان اصولوں کو جو میں نے بیان کئے ہیں' روحِ عصر کے ساتھ جوڑنا اور اس کے ساتھ ان کا رشتہ قائم کرنا ضروری ہے۔ روحِ عصر کے اعتبار سے یہ بات جان لیجئے کہ جیسے سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا میں امریکہ سب سے آگے ہے' صرف خلائی تسخیر کے معاملے میں روس ذرا آگے نکل گیا تھا تو کھلبلی مچ گئی تھی' لیکن باقی تو ہر اعتبار سے امریکہ سرِفہرست ہے' اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ دستوری ڈھانچے کے اعتبار سے

بھی امریکہ ٹاپ پر ہے۔ دستوری ارتقاء اپنے نقطۂ عروج پر امریکی دستور میں نظر آتا ہے۔ اور اس کا صدارتی نظام 'نظامِ خلافت سے قریب ترین ہے۔ اس میں تینوں چیزیں بالکل علیحدہ ہیں۔ مقننہ (Legislature) علیحدہ 'انتظامیہ (Executive) علیحدہ اور عدلیہ (Judiciary) علیحدہ ہے۔ مقننہ اور انتظامیہ کا باہم کوئی رشتہ نہیں ہے۔

میرے نزدیک پارلیمانی نظام نہایت احمقانہ 'نہایت غلط 'مفسدانہ اور نہایت مشرکانہ نظام ہے۔ ایک شرک تو وہ ہے کہ خدا کی حاکمیت کی بجائے انسانی حاکمیت کا تصور 'لیکن اس نظام میں ایک مزید شرک یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ تقسیم ہو گیا کہ یہ سربراہ مملکت ہیں اور یہ سربراہ حکومت ہیں!اب ان کے مابین اختیارات کی تقسیم کیسے ہو؟ صدر مملکت کی حیثیت یا تو فضل الٰہی چوہدری کی سی ہو جائے گی کہ انہیں "رہا کرنے" کے مطالبے پر مشتمل نعرے (slogans) لکھیں جائیں گے اور یا وہ صدر غلام اسحاق خان یا صدر ضیاء الحق صاحب بن جائیں گے کہ جو شخص بھی منتخب ہو اس کو جب چاہیں معزول کر دیں اور منتخب اسمبلی کو جب چاہیں توڑ کر رکھ دیں۔ آخر وہ کچھ تو کرے گا ع "بے کار مباش کچھ کیا کر!" صرف ولیمے کھائے گا' دعوتوں میں جائے گا' یا کچھ اور بھی کرے گا؟ آخر وہ صدر ہے 'فوج ساری اس کے پاس ہے' وہ مملکت کا سربراہ ہے۔ کچھ تو کرے گا نا! خالی بنیا کیا کرے 'اِس کوٹھڑی کا مال اُس کوٹھڑی میں کرے۔ اور اس کوٹھڑی کے بدلنے کے اندر حکومتوں کو تلپٹ کر دیا جاتا ہے۔ پھر پارلیمانی نظام کے اندر جو مقننہ (Legislature) ہے وہی انتظامیہ (Executive) ہے۔ پارلیمنٹ کے چار گھوڑے بِک گئے تو حکومت ختم۔ لہٰذا ہر وقت عدم استحکام کی صورت رہتی ہے۔ خاص طور پر ہمارے ممالک میں تو مستحکم ادارے ہی نہیں ہیں۔ انگریز قوم کی بات اور ہے' ان کے ہاں بے انتہا روایت پرستی ہے جس نے انہیں پارلیمانی نظام سے چمٹائے رکھا ہے۔ ہمارے ہاں کیا ہوتا ہے؟ چار گھوڑے اِدھر سے اُدھر چلے گئے یا چار مینڈک اُدھر سے اِدھر پھدک کر آ گئے تو حکومت ختم۔ لہٰذا سارا زور انہیں جمع کئے رکھنے پر ہوتا ہے۔ بس اپنے اپنے مینڈکوں کی پنسیری سنبھالنے کی فکر کرتے رہو اور بلیک میل ہوتے رہو' ان کو خوش کرتے رہو۔ میرے نزدیک اس سے زیادہ

احمقانہ نظام کوئی نہیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ اب صدارتی نظام کے حق میں بہت سی آوازیں اٹھی ہیں۔ جب پہلے پہل میں نے صدارتی نظام کی بات کی تو مجھے بڑی گالیاں پڑی تھیں۔ ایس ایم ظفر صاحب نے بھی ایک مذاکرے میں کہا تھا کہ آپ کیا بات کر رہے ہیں، نہیں نہیں، بالکل نہیں، صدارتی نظام قابل قبول نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ہاں صدارتی نظام ہی بہتر ہے۔ آدمی ایک بات اپنے ذہن میں اپنی فکر اور اپنی سوچ سے، دیانت کے ساتھ طے کر لے اور پھر اس پر جم جائے تو وہ بات دوسرے لوگوں کی زبان پر بھی آتی ہے۔ چنانچہ اب بہت سے لوگوں نے یہی بات کہی ہے، تارڑ صاحب نے بھی یہی کہا ہے، اور سب سے بڑھ کر تو پسرِ اقبال فرما بیٹھے ہیں کہ صدارتی نظام اسلامی نظامِ خلافت کے قریب تر ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذلک۔ آپ نے ایک شخص کو صدر منتخب کیا جو پورے ملک کا نمائندہ ہے تو اب اسے کام کرنے کے لئے چار پانچ سال دیجئے، خواہ کانگرس میں اس کی اکثریت ہے یا نہیں ہے۔ وہ سربراہ حکومت کی حیثیت سے کام کرے گا۔ کانگریس کا کام قانون سازی ہے۔ البتہ احتساب اور "Checks and balances" کا نظام ہونا چاہئے۔ اسی طرح اس کے خلاف ہونے والی الزام تراشی (impeachment) کا جائزہ بھی ضروری ہے۔ لیکن صدارتی نظام میں بنیادی تصور یہ ہے کہ صدر کی حکومت کے برقرار رہنے کا دارومدار پارلیمنٹ یا کانگریس کی اقلیت یا اکثریت پر نہیں ہے۔ پھر یہ کہ وہ جس کو چاہے اپنی کابینہ میں وزیر بنائے۔ جسے وہ سمجھے کہ یہ مالیات کا ماہر ہے تو قطع نظر اس سے کہ وہ کانگرس یا سینٹ کا رکن ہے یا نہیں ہے، ارب پتی ہے یا نہیں ہے، الیکشن لڑ سکتا ہے یا نہیں لڑ سکتا، وہ اسے اپنی کابینہ میں شامل کر کے اس کی مہارت سے فائدہ اٹھائے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص خارجہ امور میں مہارت رکھتا ہو تو وہ اسے بھی کابینہ میں لے آئے۔ گویا ایک صدر کو منتخب کر کے "ہاتھی کے پاؤں میں سب کے پاؤں" کے مصداق ساری چیزیں اس کے حوالے کر دیجئے۔ ہاں غلط کرے تو اس کے سر پر impeachment کا ڈنڈا لٹک رہا ہو اور وہ ڈنڈا ایسا ہے کہ اس کی ذرا سی جھلک دیکھی تھی کہ نکسن صاحب وائٹ ہاؤس سے نکل کر بھاگ اٹھے تھے۔ اور وہ ڈنڈا ایسا ہی ہونا چاہئے۔ یہ نظام

ایسے نہیں بن گیا' لوگوں نے اس کے لئے بڑی محنتیں کی ہیں' ان کی ذہنی صلاحیتیں صَرف ہوئی ہیں' انہوں نے اس کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں' انہوں نے اپنے ہم وطنوں سے جنگ لڑی ہے۔ یہ سارے کام کئے ہیں' جن کا کریڈٹ ان کو جاتا ہے۔ "Give the devil his due" کے مصداق انہوں نے جو کچھ کیا ہے' اسے تسلیم کیجئے۔ اگرچہ پارلیمانی نظام میں بھی' جیسا کہ میں نے عرض کیا' مذکورہ بالا تین باتیں آ جائیں تو خلافت کا تقاضا پورا ہو جائے گا' لیکن صدارتی نظام عقلاً' نقلاً' مصلحتاً اور منطقی اعتبار سے یقیناً بہتر ہے اور خلافتِ راشدہ سے قریب تر ہے۔

وفاقی طرزِ حکومت کی ضرورت

اس روحِ عصر کا جو دوسرا پہلو ہے وہ البتہ خلافتِ راشدہ کے نظام کے برعکس ہے۔ یہ سب سے کٹھن بات ہے جو میں اب کہہ رہا ہوں۔ خلافت راشدہ کا نظام وحدانی (unitary) تھا۔ امیرالمومنین ہی مختلف صوبوں کے گورنر مقرر کرتے تھے۔ لیکن میرے نزدیک ایک صحیح وفاقی (federal) طرز حکومت روحِ عصر کا نہایت اہم اور بنیادی تقاضا ہے۔ وہ جو آدم کو خودشناسی اور خودنگری محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے دی تھی' لیکن جس کے اندر ع "ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں" کے مصداق ابلیسی قوتوں نے بہت کچھ شامل کر کے اسے زہرِ قاتل بنا دیا' اس کا ایک تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنا ماضی پسند ہے' اسے اپنے اَسلاف سے محبت ہے' اسے اپنی قومی روایات سے قلبی تعلق ہے' اس کا اپنی زبان سے گہرا قلبی رشتہ ہے۔ یہ ساری چیزیں فطری ہیں۔ اسلام نے ان فطری چیزوں کو کہیں بھی رد نہیں کیا۔ سورۂ حجرات میں فرمایا گیا: ﴿وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا﴾ یعنی "ہم نے خود تمہیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو"۔ تو یہ لسانی اور قومیتوں کی تقسیم تو پہچان اور تعارف کا ایک ذریعہ ہے۔ اس دنیا میں کہیں یک رنگی اور یکسانی نہیں ہے ع گلہائے رنگا رنگ سے ہے رونقِ چمن! ہر ایک کو اپنی ثقافت عزیز ہے۔ ہاں اس ثقافت میں کوئی شے خلافِ اسلام ہے تو اسے چھانٹ دیجئے۔ وہ تو دستور میں طے ہو جائے گا کہ کتاب و سنت کے منافی

کوئی شے ہو ہی نہیں سکتی۔ البتہ مباحات کے دائرے میں تمام تقاضوں کو تسلیم کیجئے، تمام زبانوں کو تسلیم کیجئے، تمام نسلی اور لسانی اکائیوں کو تسلیم کیجئے اور انہیں ان کا جائز مقام دیجئے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ خود اختیاری دیجئے۔ انہیں معلوم ہو کہ ہمارا معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہے، پنجاب ہم پر حکومت نہیں کر رہا ہے۔ پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہونے کے باعث پنجاب گالی بن گیا ہے۔ پہلے مشرقی پاکستان میں پنجاب کے خلاف نفرت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ مولوی فرید احمد کا ڈھاکہ ایئرپورٹ پر ان نعروں سے استقبال ہوا تھا کہ "پنجابار دلال پھری جاؤ" یعنی "پنجابیوں کے دلال واپس جاؤ!" کراچی میں بھی پنجابیوں کے خلاف شدید ردعمل تھا اور اس بنیاد پر فسادات بھی ہوئے۔ بہرحال ہر علاقے کے لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے اور اس کا احساس ہونا چاہئے کہ ہمارے یہاں کے معاملات ہمارے اپنے ہاتھ میں ہیں اور ہماری اپنی رائے سے طے ہوتے ہیں۔ اور اس میں قطعاً کوئی شے کتاب و سُنّت کے منافی نہیں۔ یہ بھی انتہاپسندی ہے کہ ان چیزوں کی نفی کر دی جائے۔

سرکاری زبان۔ عربی!

البتہ جیسا کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے، عربی زبان کو پاکستان کی سرکاری زبان بنا دیا جاتا تو نہ سندھی کو اعتراض تھا نہ بنگالی کو۔ اسے سندھی بھی پسند کر رہا تھا اور بنگالی بھی۔ لیکن دراصل ہماری قیادت کی مَت ماری گئی تھی۔ ہماری سیاسی قیادت اور ہماری دینی قیادت کی واقعتاً مت ماری گئی تھی۔ انہیں ہوش ہی نہیں تھا، یہ شعور ہی نہیں تھا کہ یہ زبان کا مسئلہ کتنا پیچیدہ مسئلہ ہے، یہ کتنا حساس مسئلہ ہے۔ اس وقت ہم نے اردو، اردو، اردو کی رٹ لگائے رکھی۔ آپ کو معلوم ہے مجھے صرف ایک ہی زبان آتی ہے اور وہ اردو ہے، لیکن میں اسے پورے ملک کی سرکاری زبان قرار دینے کے حق میں نہیں ہوں۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہم نے مشرقی پاکستان کو اردو کا شہید بنایا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سر آغا خان نے کہا تھا کہ عربی کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیں، لیکن کوئی سننے کو تیار نہ تھا۔ سٹیٹ بینک آف پاکستان کے پہلے گورنر زاہد حسین صاحب، جو میرے عزیزوں میں سے تھے، انہوں نے بھی یہی بات کہی تھی، لیکن بابائے اردو نے جلسۂ عام میں ان کی وہ خبر لی تھی اور وہ بے عزتی کی تھی کہ رہے

نام اللہ کا! اور سب سے بڑھ کر تو مجھے مولانا مودودی کے موقف پر افسوس ہے۔ اس لئے کہ وہ یہ اندازہ ہی نہیں کر سکے کہ حالات کس رخ پر جا رہے ہیں۔ انہیں سیاسی حالات کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ محرک تھے، مفکر تھے، مصنف تھے، ڈیسک ورکر تھے، لیکن گاؤں گاؤں نہیں پھرے نہیں، قریہ قریہ کبھی گئے نہیں، لوگوں سے ملنے جلنے کے مواقع بہت کم ملے، لہٰذا وہ حالات کا صحیح اندازہ نہیں کر پائے۔ چنانچہ انہوں نے بھی یہی کہا کہ اردو ہونی چاہئے۔ بہر حال میرا موقف یہ ہے کہ پاکستان کی سرکاری زبان عربی ہونی چاہئے۔ باقی یہ کہ وفاق کے تحت تمام علاقوں کو اپنی اپنی زبانوں کی ترویج کا موقع ملنا چاہئے۔ اور بھارت نے یہ کر کے دکھایا ہے، اس کے سارے صوبوں کی اپنی اپنی زبان ہے۔ بھارت کے تیس صوبے ہیں، لیکن ان میں سے صرف پانچ صوبے ایسے ہیں جن کی زبان ہندی ہے۔ یہ راجپوتانہ، ہریانہ، یو۔پی، سی۔پی، اور بہار ہیں جسے "ہندی بیلٹ" کہا جاتا ہے۔ باقی بنگال میں بنگلہ زبان ہے، تامل ناڈو میں تامل زبان ہے، کیرالہ میں ملیالم زبان ہے، آندھرا پردیش میں تلیگو زبان ہے، کرناٹکہ میں کروہی زبان ہے، اور وہ اپنے سارے صوبائی اور ریاستی معاملات اپنی اپنی زبان میں طے کرتے ہیں۔ البتہ مرکز کے ساتھ اور بین الصوبائی رابطے کی زبان انگریزی ہے۔

نئی صوبائی تقسیم

بہر حال میرے نزدیک ہمیں صحیح معنوں میں ایک وفاق کی ضرورت ہے اور اس کے لئے چھوٹے صوبے بنانا اصولی اعتبار سے بھی بہت ضروری ہے اور یہ روح عصر کا بھی بہت بڑا تقاضا ہے۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اِس وقت اس مسئلے کے ساتھ پاکستان کی سالمیت وابستہ ہو گئی ہے۔ کشمیر اور کراچی ہمارے دو 'کاف' ہیں۔ سکھوں کے پانچ 'ککے' ہوتے ہیں۔ کچھا کڑا، کرپان، کنگھا، کیس، ہمارے دو 'ک' ہیں، ایک اوپر کشمیر ہے اور دوسرا نیچے کراچی۔ اور جس طرح کسی بہت بڑے دیو کی جان کسی طوطے کی گردن میں ہوتی ہے اسی طرح اِس وقت پاکستان کی جان اور مستقبل ان دو گردنوں میں ہے۔ کشمیر کے بارے میں

مَیں اپنا پورا نقطہ نظر کل اپنے خطاب جمعہ میں بیان کر چکا ہوں جو آج کے اخبارات میں آگیا ہے اور کہیں مجھے محسوس نہیں ہوا کہ کوئی غلط بات میری طرف منسوب کی گئی ہے۔ لیکن کراچی کے مسئلے پر میں اب بات کر رہا ہوں۔

اس حوالے سے پہلی بات یہ نوٹ کیجئے کہ میرا یہ موقف آج کا نہیں ہے' ہمیشہ سے ہے۔ اور ستمبر ۱۹۹۱ء سے تو آن دی ریکارڈ ہے جب میں نے تحریک خلافت کا آغاز کیا اور اس سلسلے میں پہلی پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ تحریک خلافت کی طرف سے ہم نے "پاکستان میں نظامِ خلافت --- کیا' کیوں اور کیسے؟" کے عنوان سے ایک کتابچہ بہت عام کیا ہے' جو اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی موجود ہے۔ یہ کتابچہ میری اِس پریس کانفرنس کے متن پر مشتمل ہے۔ اس میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں' یعنی (۱) ہمیں پارلیمانی نظام کو طلاق دے کر صدارتی نظام اختیار کرنا چاہئے اور (۲) ہمیں چھوٹے صوبے بنانے چاہئیں' جن کی تشکیل میں جغرافیائی اور انتظامی عوامل کے ساتھ ساتھ لسانی' ثقافتی اور نسلی عوامل کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔

الطاف حسین سے ملاقات

چھوٹے صوبوں کے بارے میں میرا یہ موقف بہت پرانا ہے اور کراچی میں اب جو الاؤ دہکا ہے اس سے اس کا بنیادی تعلق نہیں ہے۔ تاہم اس میں چونکہ اتفاقاً کراچی کے مسئلے کا حل بھی موجود ہے اس لئے ع "میں کوچۂ رقیب میں بھی سَر کے بل گیا" کے مصداق میں لندن میں درخواست کر کے' وقت لے کر' الطاف حسین صاحب کی ملاقات کے لئے حاضر ہوا۔ قبل ازیں کوئی دس بارہ سال پہلے بھی ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اُس وقت تو وہ بندوق کی گولی کی طرح بولتے رہے تھے اور انہوں نے مجھے کچھ بولنے دیا ہی نہیں تھا' لہٰذا دوبارہ ان سے ملاقات کا کوئی خیال نہ آیا۔ اب کراچی کے حوالے سے پاکستان کی گھمبیر صورتحال کے پیش نظر میں نے سوچا کہ چلیں پھر دیکھتے ہیں' صورت حال کیا ہے۔ پہلے تو میں یہ اعتراف کر رہا ہوں کہ انہوں نے بہت دھیمے انداز میں بات کی اور میرا بہت اعزاز و اکرام فرمایا۔ ملاقات کے لئے انہوں نے جو وقت دیا تھا اس پر وہ پہنچ گئے تھے۔ معلوم ہوتا

ہے کہ وہ ان کا کوئی ریجنل آفس تھا جہاں پر ملاقات ہوئی۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ وہ سیکیورٹی کے پیش نظر کسی ایک مقام پر نہیں رہتے۔ ان کی طرف سے طے کر دیا گیا تھا کہ فلاں جگہ پر ملاقات ہو گی' جہاں میں بھی پہنچ گیا اور چند منٹ میں وہ بھی آ گئے۔ وہ سخت پریشان دکھائی دیتے تھے' اس لئے کہ اُس روز چار پانچ آدمی کراچی میں پولیس کی حراست میں ہلاک ہوئے تھے جن میں فہیم کمانڈو اور ان کے ساتھی شامل تھے۔ لیکن انہوں نے بڑے متحمل انداز میں میری باتیں سنیں۔ یہ بھی محسوس ہوا کہ وہ بہت پریشان ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ نہایت مایوس ہو چکے ہیں۔ پاکستان کی حکومت سے بھی اور اپوزیشن سے بھی مایوس ہیں اور سب سے بڑھ کر مایوسی انہیں افواجِ پاکستان سے ہے۔ وہ دراصل ردِ عمل میں مایوسی کی اس انتہا پر پہنچے ہیں۔ ان کی امید اب صرف "باہر کی مدد" پر ہے۔ ان کی تجویز یہ ہے کہ پاکستان میں جو بھی باشعور انسان ہے' جسے سیاسی شعور حاصل ہے اور وہ سیاسی کردار کا حامل ہے' اسے احتجاجاً پاکستان چھوڑ کر جلاوطنی اختیار کر لینی چاہئے اور جلاوطنی میں بیٹھ کر ہمیں انسانیت کے ضمیر کو پکارنا چاہئے' اس پر ہمیں باہر سے مدد ملے گی۔

الطاف حسین صاحب سے میں نے چھوٹے صوبوں کی بات بھی کی اور ان سے کہا کہ آپ کھل کر بات کیوں نہیں کرتے؟ آپ یہ تو کہتے ہیں کہ مہاجر صوبہ ہر مہاجر کے دل کی آواز ہے لیکن آپ اس کا مطالبہ تو نہیں کر رہے۔ اس پر انہوں نے کہا : ڈاکٹر صاحب! ہمارے پاس اتنی طاقت نہیں ہے' مہاجر صوبے کا نام لیتے ہی ایسی خون ریزی ہو گی کہ ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں کہ ہم اتنی لاشیں اٹھا سکیں۔ یہ ان کے احساسات ہیں جو میں نے تقریباً انہی کے الفاظ میں بیان کر دیئے ہیں۔

میں نے ان سے کہا کہ آپ اس تحریک کو لے کر جہاں تک پہنچ گئے ہیں اور مسلسل ایک خاص کمیونٹی کا جو خون بہہ رہا ہے اور اس سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے تو اس کے دونوں امکانات نکل سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق لوگ حکومت کے خلاف کھڑے ہو جائیں' فوج سے لڑ جائیں' لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی قیادت کی گردن ناپیں کہ جنہوں نے انہیں یہاں تک پہنچایا ہے۔ انہوں نے میری بات سنی اور اثبات میں سر ہلایا کہ ہاں یہ بھی ممکن ہے۔ گویا کہ یہ چیز

ان کے لئے کوئی بہت زیادہ شدید رد عمل کا باعث نہیں بنی۔ آخر وہاں کا مہاجر مسلمان کب تک مار کھائے گا۔ آپ کی طرف سے کوئی فیصلہ کن بات نہیں آ رہی، کوئی لائن نہیں آ رہی، کوئی عوامی تحریک چلانے کا آغاز نہیں ہے، مسلسل خون ریزی ہو رہی ہے، مسلسل خون رس رہا ہے تو یہ لازمی نتیجے نکل سکتے ہیں۔ بہرحال جو کوئی بھی تحریک چلاتا ہے وہ توامید رکھتا ہے کہ لوگ نکل آئیں گے اور سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے، لیکن اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ انہوں نے مانا کہ یہ ہو سکتا ہے۔

ایک اور بات میں نے یہ کہی کہ آپ کو اگر کوئی توقع ہے کہ کوئی باہر سے آپ کی مدد کرے گا تو اگرچہ اس کا بھی امکان ہے کہ آپ کو کوئی مدد مل جائے، میں اس کی نفی نہیں کرتا، لیکن اس کا بھی تو امکان ہے کہ جس سے آپ اپنی توقع وابستہ کریں وہ آپ کے ذریعے سے حکومت پاکستان کو بلیک میل کر کے کچھ مفادات حاصل کرے، اپنے مقاصد پورے کرے، یعنی پنجابی محاورے کے مطابق "اپنے کُچ تَل لے" اور آپ کو بے یارومددگار چھوڑ دے۔ سیاست میں ایسا بھی ہوتا ہے اور یہ تو وقت بتاتا ہے کہ کیا ہو گا۔ بڑی طاقتوں کے اپنے مقاصد ہیں، ان کی اپنی اغراض ہوتی ہیں، ان کی اپنی ترجیحات ہیں۔ ان کے مقاصد اگر شمال سے پورے ہوتے ہوں تو پھر انہیں جنوب سے آنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر شمال میں ان کا الو سیدھا نہیں ہوتا تو انہیں جنوب کی طرف آنا پڑے گا۔ ان کی اولین ترجیح شمال ہے (یعنی کشمیر) جو چین کے بھی قریب ہے اور بھارت کے بھی۔ ان کے لئے اس سے زیادہ پسندیدہ بات اور کونسی ہو گی۔ وہاں پر چھوٹا سا اسرائیل بن جائے تو انہیں پھر آپ کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے ان سے یہ بات کھل کر کی اور انہوں نے ساری بات سنی۔

پھر میں نے ان سے کہا کہ خدا کے لئے میں نے جو بات دس بارہ سال پہلے کہی تھی آپ اسی کی طرف آیئے۔ ایک تو یہ تسلیم کیجئے کہ پاکستان کا استحکام اور اس کا وجود اسلام سے مشروط ہے۔ اگر یہاں اسلام نہیں آئے گا تو یہ سب کچھ اس سے زیادہ گھمبیر اور خطرناک ہو گا۔ ع اور کچھ روز فضاؤں سے لہو برسے گا! دوسرے یہ کہ آپ پاکستان کی بات کیجئے، پورے پاکستان کے لئے پیکیج دیجئے اور چھوٹے صوبوں کا مطالبہ کیجئے۔ اس میں ہرگز کوئی

خون ریزی نہیں ہوگی۔ اس کے لئے رائے عامہ کو بیدار کیجئے' اپنے دلائل دیجئے۔ اس میں خون ریزی کا مسئلہ نہیں ہے۔ سندھ کے خلیق الزمان جو بہت سخت قسم کے قوم پرست لیڈر ہیں انہوں نے بھی یہ کہا تھا کہ ہم سندھ کے ٹکڑے نہیں ہونے دیں گے اور اگر سندھ کی تقسیم ہوئی تو پنجاب کی تقسیم پہلے ہوگی۔ گویا اگر دوسرے صوبوں کی بھی مزید تقسیم ہو تو ان کے لئے سندھ کی تقسیم قابل قبول ہوگی۔ ہم جو مشرقی پنجاب ۱۹۴۷ء میں چھوڑ کر آئے تھے اس کے تین صوبے بن چکے ہیں۔ اگر اس پنجاب کے بھی پانچ صوبے بن جائیں تو کیا کوئی صوبہ پاکستان سے باہر نکل جائے گا؟ کیا ہریانہ' ہماچل پردیش اور موجودہ پنجاب (مشرقی پنجاب والا) میں سے کوئی صوبہ بھارت سے کہیں باہر چلا گیا ہے؟ میرے نزدیک کراچی کے مسئلے کا یہی ایک حل ہے۔ یہ نہیں ہو گا تو خون بہتا رہے گا' زخم رستے رہیں گے۔ پھر میں نے ان سے یہ بھی عرض کیا کہ صوبے ایک دن میں نہیں بنا کرتے۔ بھارت کی مثال سامنے موجود ہے۔ نئی صوبائی تقسیم کے لئے وہاں پہلے ایک کمیشن مقرر کیا گیا' لیکن وہ بڑی اونچی سطح کے چیف جسٹس صاحبان وغیرہ پر مشتمل کمیشن تھا جس کے بارے میں پہلے سے یہ طے کر دیا گیا تھا کہ ان کی جو سفارشات ہوں گی' مانی جائیں گی۔ دو سال میں ان کی سفارشات آئیں' پھر ان کی implementations ہوئیں۔ وہاں پر جو بھی خون ریزی ہوئی وہ پہلے ہوئی تھی۔ صوبوں کے تقسیم ہونے کے بعد یا صوبے تقسیم ہونے کے دوران کوئی خون ریزی نہیں ہوئی تھی۔ خون ریزی روکنے کا ذریعہ ہی یہ ہے کہ لوگوں کو محسوس کراؤ کہ ہمارا اپنا کوئی علاقہ ہے' جہاں کے مسائل ہم حل کر سکتے ہیں' یہاں کی بھلائی بھی ہمارے لئے ہے اور یہاں کی برائی بھی ہمارے لئے ہے' یہاں کا بھلا ہو گا تو اس کا کریڈٹ ہمیں جائے گا اور برا ہوا تو اس کا ڈس کریڈٹ بھی ہمارا ہو گا۔ جب تک یہ احساس نہیں ہو گا معاملہ درست نہیں ہو گا۔

قوم اور قومیتوں کا معاملہ

اب میں ایک بات مہاجر قومیت کے بارے میں عرض کرنے لگا ہوں۔ اصولی طور پر مہاجر قومیت اور اس کی قیادت ان دونوں چیزوں میں گڈمڈ نہ کیجئے۔ آپ کو تسلیم کرنا پڑے

گا کہ اردو سپیکنگ مہاجرین کی ایک علیحدہ قومیت تشکیل پا چکی ہے اور اس کی ایک قیادت بھی مستحکم ہو چکی ہے۔ آپ کے آنکھیں بند کر لینے سے حقائق نہیں بدلیں گے۔ بلی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کر لے تو کبوتر بچ نہیں جائے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری قوم قومیتوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ اس لئے کہ آپ نے اسلام کی طرف پیش قدمی نہیں کی۔ اب آپ خیالات کی دنیا میں رہیں اور پروفیسر مرزا محمد منور صاحب کی طرح یا زیڈ اے سلہری صاحب کی طرف سے وحدتِ ملی کے گیت گاتے رہیں تو کیا حاصل؟ حالانکہ وحدتِ ملی کے سب سے بڑے حُدی خواں علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں یہ تسلیم کیا ہے کہ اِس وقت دنیا میں کوئی ایک امتِ مسلمہ موجود نہیں ہے۔

"Instead there are a number of Muslim Nations"

اسی طرح آج پاکستان میں کوئی پاکستانی قوم موجود نہیں ہے' بلکہ اس کے بجائے بہت سی قومیتیں موجود ہیں۔ حقائق کو سمجھئے' ان کا سامنا کیجئے اور انہیں تسلیم کیجئے' تبھی بات آگے چلے گی۔ مولانا مودودی کا ایک اصولی موقف تھا اور صد فی صد درست تھا کہ مسلمان کوئی قوم نہیں ہیں' بلکہ مسلمان تو درحقیقت ایک نظریاتی جماعت ہیں' ایک امت ہیں' حزب اللہ ہیں۔ قوم کا لفظ تو نسلی' علاقائی اور ثقافتی تقسیم کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مولانا مرحوم کا یہ بڑا تاریخی جملہ ہے کہ "اگرچہ اصولاً مسلمان کسی قوم کا نام نہیں ہے لیکن صدیوں کے تعامل کے نتیجے میں اب واقعتاً ایک مسلم قوم وجود میں آ چکی ہے۔" یعنی مسلمان کا بیٹا مسلمان ہے' وہ خواہ نماز پڑھے یا نہ پڑھے' یہاں تک کہ اشتراکی ہو جائے' خدا کا منکر ہو جائے' خدا کو گالیاں دے رہا ہو' لیکن ہے وہ مسلمان' کیونکہ اس کے باپ نے اس کا نام مسلمانوں والا رکھا تھا' لہٰذا وہ قوم میں شامل ہے۔ اسی طرح آپ کو پسند ہو یا ناپسند ہو' میں کہتا ہوں کہ مہاجر قومیت اپنے آپ کو منوا چکی ہے' یا یوں کہئے کہ ہماری سزا کے طور پر ہم پر مسلط کی جا چکی ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ اس کی قیادت بھی مستحکم ہے۔ اب ہمارے لئے صحیح حکمتِ عملی یہ ہے کہ اس قومیت کو تسلیم کریں اور اگر قیادت reactionary ہے تو اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچیں۔ یعنی اس قومیت کو تسلیم کر کے اس کو اس کے حقوق دیں۔ اگر حقوق کی نفی کریں گے تو اس کا ردعمل تو لازماً ہو گا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر آپ

نے اس کو ماننے سے انکار کیا تو وہ reactionary قیادت اس Point of no return کو پہنچ جائے جہاں کبھی شیخ مجیب الرحمٰن پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے خود کہا تھا کہ تم لوگوں نے مجھے اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں سے میرے لئے واپس آنا ممکن نہیں۔ لیکن ہملوا وطیرہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ وقت پر عقل کی بات کرنی نہیں' جذبات کے اندر بہتے رہنا اور وقت گزر جانے پر ہوش میں آنا۔ گویا۔

ہرچہ دانا کند کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار!

اور اس خرابیٔ بسیار کا پھر کوئی حل نہیں ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس صورت حال کو کسی وقت باہر سے کوئی طاقت اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے کسی بھی طرح استعمال کر لے۔

نظام خلافت کے معاشرتی اور معاشی پہلو بھی اپنی جگہ بہت اہم ہیں اور میں نے انہیں بارہا بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ لیکن اس کا دستوری پہلو میں خاص طور پر اس لئے تفصیل کے ساتھ واضح کرنا چاہتا تھا کہ یہ پہلا قدم ہے' یہ طے ہو گا تو گاڑی آگے چلے گی۔ پاکستان کے عوام کا اجتماعی عزم و ارادہ سامنے آئے گا کہ ہم مسلمان جینا چاہتے ہیں اور مسلمان مرنا چاہتے ہیں تو یہ پہلا قدم اٹھے گا جس کے بعد گاڑی چل پڑے گی (The ball will be set rolling)۔ بہرحال ان چیزوں پر میرے آڈیوز اور ویڈیوز مفصل بھی ہیں' مجمل بھی ہیں' اردو میں بھی ہیں' انگریزی میں بھی' ان سے استفادہ کیجئے!

نظامِ خلافت کے قیام کا طریقِ کار

اپنی گفتگو کے آخری حصے میں مَیں اختصار کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ عہدِ حاضر میں نظام خلافت کے نفاذ اور قیام کا طریق کار کیا ہے۔ یعنی اب نظام خلافت دوبارہ کیسے قائم ہو گا؟ اس ضمن میں پہلے چند چیزوں کی نفی کر رہا ہوں۔ اولاً: یہ محض آرزوؤں سے نہیں ہو گا (لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَا اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتَابِ) ثانیاً: محض دعاؤں سے بھی

نہیں ہوگا' دعائیں منہ پر دے ماری جائیں گی۔ قنوتِ نازلہ پڑھتے پڑھتے اور حرمین الشریفین میں پڑھتے پڑھتے سقوطِ ڈھاکہ ہو گیا تھا۔ ثالثاً : محض دعوت سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔ آج تک دنیا کی تاریخ میں محض دعوت سے کبھی نظام نہیں بدلا۔ دعوت کا کام اس معاشرے میں بڑے عرصے سے بہت بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ ہم نے بھی قرآن مجید کی دعوت بڑے پیمانے پر عام کی ہے۔ لیکن محض دعوت سے یہ کام نہیں ہوا کرتے۔ اس کے لئے اس سے کچھ آگے بڑھ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ رابعاً : انتخابات سے بھی کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ اس معاملے میں بجائے اس کے کہ کچھ مددگار ہوں الٹا نقصان دہ ہیں۔ انتخابات تو کسی نظام کو چلانے کے لئے کرائے جاتے ہیں' اسے بدلنے کے لئے نہیں۔ پھر انتخابات لازمی طور پر موجودہ نظام کے عکاس ہوتے ہیں۔ کسی جگہ جو بھی معاشی اور معاشرتی نظام ہے اس کی اقدار کا عکس انتخابات میں آجاتا ہے۔ جاگیردارانہ نظام ہے تو جاگیردار منتخب ہو کر آگے آجائیں گے' سرمایہ داری ہے تو سرمایہ دار آجائیں گے اور وہ اپنے نظام کو بدلنے نہیں دیں گے۔

مذکورہ بالا چار باتوں کی نفی کے بعد اب میں اثبات پر آرہا ہوں۔ جانیں دیئے بغیر' خون دیئے بغیر یہ کام کبھی ہوا ہے' نہ ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ سے بڑا داعی' آپ ؐ سے بڑا مربی' آپ ؐ سے بڑا مزکی اور آپ ؐ سے بڑا معلم تو کوئی نہیں ہو سکتا۔ آپ ﷺ کو بھی خود اپنا خون دینا پڑا ہے اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو بھی۔ حضور ﷺ کو مکی دور میں بھی' طائف میں' اپنا خون دینا پڑا ہے اور مدنی دور میں بھی' دامنِ احد میں' خون دینا پڑا ہے۔ پھر سینکڑوں صحابہ رضی اللہ عنہم کی جانوں کا نذرانہ دینا پڑا ہے۔ اور ایک ایک صحابیؓ کی جان ہم جیسے لاکھوں انسانوں کی جانوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ تو یہ نوٹ کر لیجئے کہ اس کے بغیر یہ کام نہیں ہوگا۔ یہ کام آسان نہیں ہے' بہت مشکل کام ہے۔ یہ کام اتنی آسانی سے نہیں ہوتے۔ نظام کا بدلنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ ہر نظام کے ساتھ مراعات یافتہ طبقہ کے مفادات (Vested Interests) وابستہ ہوتے ہیں اور یہ طبقہ ان مفادات کا پورا پورا دفاع کرتا ہے۔ چنانچہ وہ انقلاب کی ہر کوشش کو کچل دینے کے لئے متحد ہو کر اپنے تمام وسائل استعمال کرتا ہے۔ ع

نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے!!

لہٰذا تصا[illegible]زیر ہے' جانیں دینی پڑیں گی۔

لیکن [illegible] اثبات میں بھی ایک نفی ہے۔ اور وہ یہ کہ جانیں بھی اگر طریق محمدی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ [illegible]) پر دی جائیں گی تو کام ہو گا' ورنہ نہیں۔ افغانستان میں پندرہ لاکھ [illegible]م ہو[illegible] اور ابھی کہیں منزل کا نشان بھی نظر نہیں آ رہا۔ میں کہتا ہوں کہ پندرہ کروڑ جانوں سے بھی کچھ نہیں ہو گا اگر طریق محمدی ﷺ کے مطابق جدوجہد نہ کی جائے۔ امام مالکؒ کا قول ہے : لَایَصْلُحُ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا" اسی سے ملتا جلتا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول بھی موجود ہے۔ یعنی "اس امت کے آخری حصے کی اصلاح نہیں ہو سکتی مگر اسی طور سے جیسے کہ پہلے حصے کی اصلاح ہوئی"۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق اس امت کا آخری دور پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور ہو گا۔ اور یہ جس طور سے پہلے آیا تھا اسی طور سے بعد میں آئے گا۔ اور یہ پہلے کسی ایک ملک میں آئے گا' پھر پورے عالم میں پھیلے گا۔ لہٰذا عالمی خلافت کا ہدف ذہن میں رکھتے ہوئے پہلے کسی ایک جگہ پر کوشش کیجئے اور ظاہر بات ہے کہ جو جہاں ہے وہیں کوشش کر سکتا ہے۔ اگر امام جمیل الامین اور امام عیسیٰ عبد الکریم یہاں آ کر جدوجہد کریں گے تو یہ مؤثر نہیں ہوں گے۔ تاہم مختلف جگہوں پر کام کرنے والی تحریکوں اور افراد کے باہمی رابطے ضرور ہونے چاہئیں' اس سے حوصلے بڑھتے ہیں۔ میں جتنا کام یہاں کر سکتا ہوں' کہیں اور جا کر نہیں کر سکتا۔ دوسرے' جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' احادیث میں وارد شدہ پیشینگوئیوں کی بناء پر اور بعض دیگر عوامل کے پیش نظر میں اس کے بارے میں تقریباً یقین رکھتا ہوں کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے دورِ ثانی کا نقطہ آغاز یہی سرزمین بنے گی۔ گویا "جا ایں جاست!"

اب آیئے کہ وہ منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ ہے کیا؟ اس موضوع پر بھی میرے آڈیوز' ویڈیوز اور کتابیں وغیرہ موجود ہیں اور اللہ کا فضل اور اس کا شکر ہے کہ میں پورے اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس مسئلے کا حق ادا کر دیا ہے۔ آج کی نشست میں میں انتہائی اختصار کے ساتھ چند باتیں عرض کروں گا۔ پہلی بات' جیسے کہ رحمت اللہ بٹر صاحب

نے فرمایا : "پہلے اپنی ذات میں خلیفہ بنو، اپنی ذات پر خلافت نافذ کرو"۔ سب سے کٹھن کام یہی ہے ع منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں! ہمارا طرزِ عمل بالعموم یہ ہوتا ہے کہ دنیا بدل جائے، معاشرہ بدل جائے، نظام بدل جائے، لیکن میں وہیں کا وہیں رہوں، مجھے کوئی گزند یا نہ نقصان نہ پہنچے، کوئی تکلیف نہ آئے، میرے شب و روز نہ بدلیں، میرے پراٹھے اور حلوے مانڈے میں کوئی فرق نہ آئے، البتہ انقلاب برپا ہو جائے، نظام تبدیل ہو جانا چاہئے۔ اور کہیں کسی فائیو سٹار ہوٹل میں ڈنر کے بعد ملک کے حالات پر مرثیہ خوانی کرلی جائے تو اس سے کیا حاصل ہو گا؟ مجھ سے امریکہ میں کوئی صاحب پوچھتے ہیں کہ پاکستان کے حالات کیا ہیں تو میں جواب میں کہتا ہوں آپ کو اس سے کیا غرض ہے؟ ع تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا! تو اس پر وہ چونک جاتے ہیں۔ بہرحال پہلی بات یہ ہے کہ اپنی ذات پر خلافت کا نظام قائم کرو۔ اور اس کے لئے بٹر صاحب نے بڑی پیاری آیت بھی پیش کی ہے :

﴿ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ﴾ (الحدید : ۷)

"ایمان لاؤ (جیسا کہ ایمان کا حق ہے) اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر اور خرچ کرو ہر اس شے میں سے جس میں اس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے"۔

دوسرے یہ کہ اس کے لئے التزامِ جماعت ضروری ہے۔ یہ کام افراد کے کرنے کا نہیں، جماعت کے کرنے کا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا : يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ "اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے"۔ اور حضرت حارث الاشعریؓ سے مروی حدیث کے الفاظ ہیں :

آمُرُكُم بِخَمسٍ : بِالجَمَاعَةِ، وَالسَّمعِ، وَالطَّاعَةِ، وَالهِجرَةِ، وَالجِهَادِ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ (رواہ الترمذی)

(مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں : (۱) جماعت کے ساتھ منسلک رہنے کا (۲) صاحبِ امر کی بات سننے اور (۳) اس کو ماننے کا (۴) ہجرت اور (۵) جہاد کا"۔

التزامِ جماعت کے موضوع پر اگرچہ اردو میں میرے کچھ مضامین بھی چھپے ہیں اور میں

نے بہت سی تقریریں بھی کی ہیں' لیکن اس بار دورۂ امریکہ کے دوران شکاگو میں ایک جگہ خطاب کی دعوت ملی تو میں نے اس موضوع پر انگریزی میں تقریر کی :

"The importance, the nature and the bases of the organization in Islam with special reference to the institution of Bai'ah"

انقلاب اور نظامِ خلافت کے قیام کے لئے جو تنظیم قائم کی جائے اس کے نظام کی بنیاد بیعت پر ہو۔ انقلابی عمل اس کے بغیر نہیں ہو سکتا' کسی ڈھیلی ڈھالی اور Hotchpotch تنظیم سے یہ کام نہیں ہو گا۔ فَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا!

تیسری بات یہ کہ جماعت وجود میں آ کر کرے گی کیا؟ آیا مسلح انقلاب لائے گی؟ فوجی انقلاب لائے گی؟ یا انتخابات میں حصہ لے گی؟ کیا کرے گی؟ اس جماعت کی غرض و غایت کے لئے میں خالص دینی اصطلاح آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں اور وہ ہے "نہی عن المنکر"۔ یہ جماعت جس سطح پر بھی ممکن ہو برائی کو روکے گی۔ یہ اقتدار اور حکومت کی طالب نہیں ہوگی۔ اس کا کام منکر کو ختم کرنا ہے۔ یعنی شریعت کی رو سے جو شے حرام ہے' غلط ہے' اس کا استیصال کرنا۔ اور اس کے تین درجے ہیں جو حدیث میں آتے ہیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

مَنْ رَءٰی منکم منکرًا فلیغیّرہُ بیدِہٖ' فَاِن لَّمْ یَسْتَطِعْ فبلسانہٖ' فان لم یستطع فبقلبہٖ' وذٰلک اَضْعَفُ الایمان (مسلم)

"تم میں سے جو کوئی بھی کسی منکر کو دیکھے تو اس کا فرض ہے کہ اسے اپنے زورِ بازو سے روکے۔ اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے اور اگر اس کی استطاعت بھی نہ رکھتا ہو تو دل میں برائی سے نفرت کرے۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے"۔

اس موضوع پر اہم ترین حدیث حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے' جو بدقسمتی سے عوام کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ یہ روایت بھی مسلم شریف میں ہے اور اس کے الفاظ ہیں :

مامِن نبیٍّ بعثہ اللّٰہ فِی اُمَّۃٍ قبلی الاکان لہ مِن امّتہٖ

. حَوارِیُّون و اَصحابٌ یأخذون بِسُنَّتِہٖ وَیقتدون بِاَمرِہٖ، ثُمَّ اِنَّھا تخلفُ مِن بعدِ ھِم خلوفٌ یقُولونَ مَالایَفْعَلون ویَفعلون مَالاَ یُؤمَرُون، فمَن جاھَدَھُم بیدِہٖ فھومُؤمنٌ، ومَن جاھَدھم بلسانِہٖ فھو مؤمنٌ، ومَن جاھدھم بقلبِہٖ فھومومنٌ، ولَیس وَراءَ ذٰلکَ مِنَ الاِیمانِ حبّۃُ خردلٍ (مسلم)

"کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جسے اللہ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں مبعوث کیا ہو مگر یہ کہ اس کی امت میں سے کچھ لوگ (نکلتے تھے جو اس کے) حواری اور اصحاب ہوتے تھے (مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے صحابیؓ)۔ وہ نبی کی سنت کو مضبوطی سے تھامتے تھے اور اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے تھے۔ پھر (ہمیشہ ایسا ہوتا رہا کہ) انکے (کچھ عرصے کے) بعد ایسے ناخلف لوگ آجاتے تھے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا۔ تو جو کوئی ایسے لوگوں کے ساتھ اپنے ہاتھ سے جہاد کرے گا تو وہ مومن ہے، اور جو ان سے اپنی زبان سے جہاد کرے گا تو وہ مومن ہے، اور جو ان سے اپنے دل سے جہاد کرے گا تو وہ بھی مومن ہے۔ اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں!"

حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اُس قوت و اقتدار کے حامل طبقے سے جہاد کا حکم دیا جا رہا ہے جو بگاڑ کا شکار ہو گیا ہو۔ ان کے بارے میں پہلی بات ہی یہ فرمائی : "فمَن جاھدَھُم بیدِہٖ فَھومؤمنٌ" یعنی "جو ایسے لوگوں سے ہاتھ سے جہاد کرے گا وہ مؤمن ہے"۔ اور ہاتھ سے جہاد کے جو مراحل ہیں ان کے ضمن میں مولانا گوہر رحمٰن صاحب نے فرمایا ہے کہ مسلح بغاوت کا بھی حق ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی اجازت دی ہے اگرچہ شرائط عائد کی ہیں۔ مجھے ان سے اتفاق ہے، لیکن میرے پیش نظر غیر مسلح بغاوت کا پروگرام ہے۔ پھر فرمایا : "وَمن جاھد ھم بلسانہٖ فھومؤمنٌ" "اور جو ان سے زبان سے جہاد کرے گا وہ مومن ہے"۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ ہم کر رہے ہیں۔ اس کے بعد درجہ دل سے برائی کے خلاف نفرت کا ہے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر تو ایمان کی خیر منایئے۔ آنحضور ﷺ فرما رہے ہیں کہ اس کے بعد تو ایمان

رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں!! ان دو حدیثوں کے ساتھ سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۲ شامل کر لیجئے تو خالص دینی اصطلاح کے تحت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا پورا پروگرام وجود میں آجاتا ہے:

﴿اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝﴾

اس آیتِ مبارکہ میں وہ اوصاف بیان کر دیئے گئے ہیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے قائم ہونے والی جماعت کے کارکنوں کے اندر ہونا ضروری ہیں۔ یعنی: (۱) توبہ کرنے والے، رجوع کرنے والے۔ خطا یا غلطی ہو جائے تو فوراً توبہ کریں۔ (۲) اللہ کے عبادت گزار، اس کے اطاعت شعار۔ (۳) اللہ کی حمد و ثنا میں مصروف رہنے والے۔ (۴) لذاتِ دنیوی سے کنارہ کشی کر لینے والے۔ (۵) اللہ کی جناب میں رکوع کرنے والے۔ (۶) اللہ کی بارگاہ میں سجدے کرنے والے۔ (۷) نیکی کا حکم دینے والے۔ (۸) بدی سے روکنے والے۔ (۹) اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے۔ اور آخر میں فرمایا گیا کہ اے نبی، ایسے اہل ایمان کو بشارت دیجئے!

موجودہ حالات میں اقدام کی صورت کیا ہو گی؟ میرے نزدیک اس کے لئے ایک منظم، پرامن اور غیر مسلح تحریک اٹھانی ہو گی، جو ترکِ موالات (Non Co-operation) اور سول نافرمانی کے ذریعے حکومت کو برائیوں کے خاتمے پر مجبور کر دے --- جو یہ نعرۂ مستانہ بلند کرے کہ چونکہ تم حرام کاریوں میں مصروف ہو للذا ہم تمہیں ٹیکس نہیں دیں گے --- جو منکرات کے خلاف سینہ سپر ہو جائے کہ ہم جیتے جی ان کو برداشت نہیں کریں گے، ہم سودی کاروبار نہیں ہونے دیں گے۔ اس تحریک کے کارکنان گولیوں کے سامنے اپنے سینے حاضر کر دیں کہ چلاؤ گولیاں کہ ع شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن! مسلح بغاوت کی شرائط تو بہت کڑی ہیں، لیکن یہ ایک غیر مسلح بغاوت ہو گی، جس کی اس کے سوا کوئی شرط نہیں ہے کہ کسی کو گزند نہ پہنچاؤ، کسی کی جان، مال یا جائیداد کو نقصان نہ پہنچاؤ! ہورڈنگز اور سائن بورڈ مت توڑو! بے چاری بے گناہ بسوں کو مت جلاؤ! لیکن

اس کے لئے پہلے طاقت حاصل کرنا ہوگی، اپنے بازو مضبوط کرنے ہوں گے۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے!

پاکستان میں میرے اندازے کے مطابق کم از کم دو لاکھ افراد تیار ہو جائیں جو ایک قیادت کے تحت تن من دھن لگانے کے لئے تیار ہوں، جان دینے کو تیار ہوں، دوسروں کا خون بہانے کے لئے نہیں بلکہ اپنا خون دینے کے لئے تیار ہوں تو منزل سر ہوگی۔ اور ع
گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں! چاہے ہمارے جلسے ہوں، چاہے کانفرنسیں ہوں اور چاہے تربیتی کورسز ہوں۔ اگرچہ یہ سب کام بھی ضروری ہیں، دعوت ضروری ہے، تبلیغ ضروری ہے، اجتماعات ضروری ہیں، لیکن آخری منزل کیا ہے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی!

بہرحال یہ ہے نظامِ خلافت کے قیام کے لئے تنظیم اسلامی کا پروگرام جو میں نے چند جملوں میں بیان کردیا ہے۔ اس پر میرے متعدد آڈیوز اور ویڈیوز کے علاوہ "منہجِ انقلابِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم" کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب موجود ہے۔

آخر میں میں اللہ کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ ع

شکر صد شکر کہ جمّازہ بمنزل رسیدا

ہماری یہ دو روزہ "احیائے خلافت کانفرنس" اختتام کو پہنچی۔ میں تمام حاضرین کا اور خصوصیت کے ساتھ ان مہمانانِ گرامی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو طویل سفر کر کے یہاں آئے اور ان کی برکت و سعادت سے یہاں ہمارے کام کو تقویت حاصل ہوئی۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات OO

(مرتب : حافظ خالد محمود خضر)

نوٹ : خطابات کو تحریری شکل میں مرتّب کرتے وقت اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ مرتّب سے کسی علمی و فکری غلطی کا صدور ہو جائے۔ لہٰذا خطاب میں موجود کسی لفظی یا معنوی غلطی کو محترم ڈاکٹر صاحب کی طرف منسوب کرنے کی بجائے مرتب سے وضاحت طلب کر لی جائے۔ (مرتّب)

ابلاغ و تفہیم

منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ

اعتراضات اور جوابات

انجینئر نوید احمد، کراچی

تنظیم اسلامی میں کسی بھی مسلمان فرد کی شمولیت درج ذیل تین باتوں کی بنیاد پر ہوتی ہے:

۱۔ اس تصور فرائض دینی سے اتفاق جو امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے قرآن وسنت کی روشنی میں پیش فرمایا ہے۔

۲۔ فرائض دینی کی ادائیگی کے لئے اس طریقہ کار سے اتفاق جسے امیر تنظیم نے "منہجِ انقلاب نبوی" کے عنوان سے پیش کیا ہے۔

۳۔ امیر تنظیم کے خلوص واخلاص اور تقویٰ و تدین پر اعتماد، کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کے ذریعے ان کے پیش نظر خالصتاً رضائے الٰہی کا حصول ہے، دنیا کی طلب نہیں ہے۔

تنظیم اسلامی اس بات کا خصوصی اہتمام کرتی رہی ہے کہ اگر کسی بھی شخص یا حلقے کی طرف سے متذکرہ بالا تصور فرائض دینی یا طریقہ کار پر تنقید سامنے آئے تو اس کا جائزہ لیا جائے۔ پھر اگر اس تنقید میں کوئی اصلاح طلب پہلو ہو تو اسے قبول واختیار کیا جائے اور اگر کچھ مغالطے ہوں تو دلائل و براہین کے ذریعے ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس سب کا اصل مقصد یہ ہے کہ رفقائے تنظیم اسلامی کے قلوب واذہان تصور فرائض دینی اور طریقہ کار کے حوالے سے شکوک و شبہات سے پاک رہیں اور اس بارے میں ان کا اتفاق پورے شعور اور انشراح صدر کے ساتھ ہو۔

اصل موضوع کی طرف آنے سے قبل یہ مناسب ہو گا کہ متذکرہ بالا تصور فرائض دینی اور طریقہ کار کا ایک اجمالی نقشہ قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

تصورِ فرائض دینی :

قرآن حکیم، سنت رسول اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں ہر عاقل و بالغ مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے کہ :

"اپنی ذاتی زندگی کے تمام گوشوں میں پورے ذوق و شوق اور دلی آمادگی کے ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ کی کامل بندگی اختیار کرے، اسی کی دعوت ایک فطری تدریج اور حسین تناسب کے ساتھ اپنے اہل و عیال، کنبے قبیلے اور عوام الناس کو دے اور اس نظام عدل اجتماعی کے قیام کے لئے تن من دھن کے ساتھ کوشش کرے، جس میں دین و دنیا اور مذہب و سیاست کے مجموعے پر اللہ کی حاکمیت اور سنت رسول کی غیر مشروط اور بلا استثناء بالادستی قائم ہو۔"

اس سلسلے میں تفصیلات جاننے اور متعلقہ آیات قرآنیہ و احادیث مبارکہ کے حوالہ جات دیکھنے کے لئے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے مختصر کتابچے "فرائض دینی کا جامع تصور" کا مطالعہ مفید رہے گا۔

طریقہ کار :

دینی فرائض کی ادائیگی اور خاص طور پر نظام عدل اجتماعی کے قیام کے لئے قرآن و سنت پر مبنی طریقہ کار یعنی منہج انقلابِ نبوی کے چھ مراحل ہیں۔

۱۔ دعوت : ایک ایسے انقلابی نظریہ کی نشر و اشاعت جس میں اسلام کے نظام عدل اجتماعی کی برکات یعنی حریت، اخوت اور مساوات کی وضاحت ہو، باطل نظام کی خرابیوں اور ظلم پر مدلل تنقید ہو اور قرآن و حدیث کے ذریعے لوگوں کو باطل نظام کی بیخ کنی اور نظام عدل اجتماعی کے قیام کے لئے تن من کے ساتھ جدوجہد کرنے کی دعوت ہو۔

۲۔ تنظیم : جو لوگ دعوت قبول کریں ان کو شخصی بیعت سمع و طاعت فی المعروف کے ٹھیٹھ اسلامی اصول پر منظم کیا جائے اور تنظیم میں درجہ بندی کا معیار ایثار و قربانی اور انقلابی نظریہ کے ساتھ مکمل ذہنی اور عملی وابستگی ہو، نہ کہ ذات و برادری اور روپیہ پیسہ، مال و منال یا دنیوی جاہ و حشمت۔

۳- تربیت : تنظیم میں شامل ہونے والے افراد کی تربیت اسوۂ رسول اکرم ﷺ کی روشنی میں قرآن حکیم کے ذریعہ اس طرح کی جائے کہ

ان میں رضائے الٰہی کی طلب بڑھتی چلی جائے۔

ان کی باہمی محبتیں دین پر عمل اور اس کے لئے محنت کے معیار پر استوار ہوتی چلی جائیں۔ اور

(iii) ان میں نظم کی پابندی کے ساتھ دین کی نشر و اشاعت اور غلبے کے لئے مال و جان لگانے کا جذبہ حتیٰ کہ اسی راہ میں جان دینے کی آرزو پروان چڑھتی چلی جائے۔

۴- صبر محض : نظریہ اگر واقعی انقلابی ہو تو باطل نظام لازماً اس کی مخالفت کرتا ہے۔ یہ مخالفت زبانی طنز و استہزاء سے گزر کر جسمانی تشدّد اور خون ریزی تک جا پہنچتی ہے۔ صبر محض یہ ہے کہ مناسب قوت کی فراہمی تک اس مخالفت کی ہر شکل کو برداشت کیا جائے اور کوئی جوابی کارروائی نہ کی جائے۔ مناسب قوت سے مراد معتدبہ تعداد میں ایسے رفقاء کی فراہمی ہے جو اپنی ذات کی حد تک واقعتاً اللہ کے بندے بن چکے ہوں، پابندی نظم کے خوگر ہونے کا ثبوت دے چکے ہوں اور اللہ کے دین کے لئے جان و مال قربان کرنے کو سب سے بڑی سعادت سمجھتے ہوں۔

۵- اقدام : مناسب قوت فراہم ہونے پر نہی عن المنکر بالید کا آغاز کیا جائے، یعنی باطل نظام کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑا جائے۔ اس کے نتیجے میں باطل نظام کے محافظ پوری قوت سے انقلابی جماعت کو کچلنے کے لئے میدان میں نکل آئیں گے۔

۶- مسلح تصادم : اقدام کے نتیجے میں باطل پوری قوت کے ساتھ انقلابی تحریک پر حملہ آور ہوگا اور تصادم کا آغاز ہو جائے گا۔ اگر انقلابی تحریک نے ابتدائی مرحلے صحیح طور پر طے کر کے اقدام کا فیصلہ کیا ہے تو اسے تصادم میں کامیابی نصیب ہوگی۔ بصورت دیگر اس دنیا میں یہ تحریک ناکام ہو جائے گی۔ لیکن خلوص و اخلاص سے کی گئی جدوجہد کا اصل اور ہمیشہ باقی رہنے والا اجر تو بہرحال محفوظ ہے اور آخرت میں مل کر رہے گا۔

نبی کریم ﷺ نے مندرجہ بالا چھ مراحل طے فرما کر تاریخ انسانی کا ہمہ گیر اور عظیم

ترین انقلاب برپا کیا۔ البتہ موجودہ حالات دو اعتبارات سے مختلف ہیں :

۱۔ آج باطل نظام کے سرپرست اور محافظ کلمہ گو مسلمان ہیں۔

۲۔ باطل نظام کی حفاظت کے لئے تربیت یافتہ اور جدید ہتھیاروں سے مسلح افواج موجود ہیں۔

کلمہ گو مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے لئے فقہاء نے کڑی شرائط رکھی ہیں اور ویسے بھی نہتّے عوام جدید ہتھیاروں سے مسلح فوج کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ لہٰذا آج کے دور میں اقدام کے مرحلے کے دوران مسلح بغاوت کے بجائے پُرامن جلسوں، جلوسوں، مظاہروں، ناکہ بندیوں اور سول نافرمانیوں کے ذریعے حکومتِ وقت پر باطل نظام کو ختم کرنے کے لئے دباؤ ڈالا جاسکتا ہے۔

فرائض دینی کی ادائیگی کے لئے طریقہ کار کی تفاصیل ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی معرکتہ الآراء تصنیف "منہجِ انقلابِ نبوی" میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے انقلاب کے مراحل اور موجودہ حالات کے اعتبار سے ان مراحل میں اجتہاد کو بڑے شرح و بسط کے ساتھ بیان کردیا ہے۔

پچھلے دنوں کچھ اصحاب کی طرف سے تنظیم اسلامی کے اختیار کردہ طریقہ کار پر چند اعتراضات تحریری شکل میں سامنے آئے۔ چونکہ بعض رفقائے تنظیم نے ان اعتراضات میں کچھ وزن محسوس کیا لہٰذا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ان اعتراضات کا جواب قرآن و سنت اور عقل و منطق کی روشنی میں پیش کیا جائے۔

پہلا اعتراض

"انقلاب نبوی کا منہاج صرف اور صرف دعوت کا منہاج ہے۔ اس کی ابتداء بھی دعوت ہے اور انتہا بھی دعوت۔ دعوت کے ذریعہ مسلمانوں کو ہم نوا بنا کر ان کی آزادانہ مرضی اور ان کی رائے اور مشورہ سے پہلے اسے امت میں برپا کیا جائے، پھر اگر ضرورت ہو تو جہاد و قتال کے ذریعہ سے یہ امت اپنے فرماں رواؤں کی قیادت میں بالکل اسی طرح پوری دنیا میں اس کی توسیع کے لئے نکل کھڑی ہو، جس طرح رسالت مآب ؐ کے بعد صحابہ

کرام خلفائے راشدین کی قیادت میں روم و ایران کی بادشاہتوں میں اس کے لئے نکل کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے ان کی سرحدوں پر کھڑے ہو کر کہا تھا کہ اسلام لاؤ، جزیہ دو یا لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

رسالت مآب ﷺ نے انقلاب تو یقیناً برپا کیا اور تاریخ عالم کا سب سے حیرت انگیز انقلاب برپا کیا لیکن اس کے لئے جدوجہد کے دوران نہ بیعتِ سمع و طاعت کی بنیاد پر کوئی تنظیم قائم کی، نہ اپنے صحابہ سے کبھی اس کا مطالبہ کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ نفوس قدسیہ نے تعلیم بھی پائی اور تزکیہ بھی حاصل کیا لیکن نہ اس انقلاب کو برپا کر دینے کے لئے بحیثیتِ جماعت یہ کبھی میدان میں اترے، نہ اس کے لئے کبھی تلوار اٹھائی، نہ جہاد و قتال کی نوعیت کا کوئی اقدام کیا۔ انقلاب بیشک برپا ہوا اور اسے پیغمبر ﷺ اور اس کے چند ساتھیوں ہی نے برپا کیا مگر یقین کیجئے تیر و تفنگ اور تیغ و تبر سے نہیں بلکہ دعوت اور صرف دعوت سے برپا کیا۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ اس انقلاب کی جدوجہد میں کسی جارحانہ اقدام کے لئے تیغ و تبر تو ایک طرف ایک چھڑی اور ایک لٹھیا بھی کسی شخص نے حضور ﷺ کے ہاتھ میں کبھی نہیں دیکھی۔ اس کے لئے جدوجہد کی ابتداء بھی دعوت سے ہوئی اور انتہا بھی دعوت پر ہوئی۔ اس میں دعوت سے آگے کوئی اقدام کبھی کیا ہی نہیں گیا۔ اس کا ایک ہی مرحلہ ہے اور اسی مرحلہ دعوت میں یہ جدوجہد اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئی۔ باور کیجئے، تاریخِ عالم کے اس حیرت انگیز انقلاب میں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہا۔ یہ خدا کی اس زمین پر دعوت اور صرف دعوت کے ذریعہ سے برپا ہو گیا"۔

جواب

اس سے قبل کہ پہلے اعتراض کے جواب میں دلائل پیش کئے جائیں، مناسب محسوس ہوتا ہے کہ قارئین کے سامنے ایک سوال Searching Question کے طور پر رکھا جائے۔ سوال کرنے کا یہ اسلوب ہمیں قرآن حکیم سے ملتا ہے۔ کائنات کے بعض حقائق از خود اتنے واضح ہوتے ہیں کہ ان کے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ اگر پھر بھی کوئی ان حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کرے تو اس سے

Searching Question کیا جاتا ہے کہ کیا واقعی آپ اپنے اس انکار میں سنجیدہ ہیں؟ کیا اس کائناتی حقیقت پر اعتراض کرنے میں آپ کا دل آپ کی زبان کا ہمنوا ہے؟ سورۂ ابراہیم کی آیت نمبر۹ میں کفار کا رسولوں کی دعوت کے بارے میں جواب بیان کیا گیا ہے کہ

"اِنَّا لَفِیْ شَکٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَیْهِ مُرِیْبٍ"

"ہم تو اس بات کے بارے میں خلجان میں ڈالنے والے شبہ میں مبتلا ہیں جس کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو۔"

رسولوں کی طرف سے Searching Question کیا گیا :

"اَفِی اللّٰهِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"

"کیا (تمہیں) اللہ کے بارے میں شبہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے؟"

اسی طرح سورۃ الانعام کی آیت نمبر۱۹ میں مشرکین سے سوال کیا گیا کہ :

"اَئِنَّکُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی"

"کیا تم لوگ واقعی گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ اور بھی معبود ہیں؟"

اب ذرا آپ آج کی صورت حال پر غور کیجئے کہ ہم ایک ایسے معاشرہ میں ہمہ گیر انقلاب لانا چاہتے ہیں جہاں ایک مستحکم ریاست قائم ہے' نظام کی حفاظت کے لئے منظم' تربیت یافتہ' اور جدید اسلحہ سے لیس فوج موجود ہے اور اس نظام کی اصل سرپرست Sole Supreme Power on Earth یعنی امریکہ ہمارے معاملات پر براہ راست نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ کیا ان حالات میں ممکن ہے کہ ہم فرداً فرداً نظامِ باطل کے خلاف آواز اٹھائیں' کوئی اجتماعی قوت نہ بنائیں' کوئی دباؤ نہ ڈالیں اور یہ نظام دعوت اور محض دعوت سے تبدیل ہو جائے؟ کیا اس طرح سے ممکن ہے کہ معاشرے کے مفاد یافتہ طبقات یعنی جاگیردار' سرمایہ دار' بیوروکریٹس اپنے مفادات سے دستبردار ہو کر عدل' مساوات' اخوت اور آزادی کے اصول تسلیم کرلیں گے؟ آپ اپنے آپ سے یہ سوال کیجئے اور آپ کو یقیناً جواب ملے گا "نہیں"۔ اب آیئے اس ناقابل تردید حقیقت کو دلائل سے مؤکد کریں۔

<u>پہلی دلیل</u> : تاریخ انسانی میں کوئی ایک مثال بھی ایسی موجود نہیں جس سے ثابت ہو کہ

دعوت اور صرف دعوت کے ذریعے کسی خطۂ ارضی پر انقلاب برپا ہو گیا ہو۔ اللہ کے رسولوں سے بڑھ کر کس کی دعوت و تبلیغ مؤثر ہو سکتی ہے۔ قرآن حکیم اس بات پر گواہ ہے کہ ہر رسول پر اقامت دین کے لئے جدوجہد فرض تھی (سورۂ شوریٰ آیت ۱۸) اور ہر رسول نے اس کے لئے دعوت دی، لیکن آنحضور ﷺ سے قبل کسی ایک رسول کی دعوت سے بھی انقلاب برپا نہیں ہوا بلکہ حالات ناموافق اور ناسازگار ہی ہوتے چلے گئے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے کم و بیش ۹۵۰ برس تک دعوت دی لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ

"وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ"

"اور ان کے ساتھ ایمان نہیں لائے مگر تھوڑے" (ہود : ۴۰)

حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ سے شکوہ کیا :

"رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا ۝ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا ۝"

"اے میرے رب میں نے اپنی قوم کو رات اور دن دعوت دی لیکن میری دعوت نے ان میں سوائے بھاگنے کے کسی اور چیز کو زیادہ نہ کیا۔" (سورۂ نوح، آیات : ۵-۶)

پھر حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے حق میں بددعا کی :

"رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝"

"اے میرے رب تو زمین پر کافروں کا ایک بستا ہوا گھر نہ چھوڑ اگر تو ان کو چھوڑ دے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور وہ نہ جنیں گے مگر فاجر اور کافر۔"

(سورۂ نوح، آیات : ۲۶-۲۷)

آخر کار حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ سے فریاد کی :

"اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝"

"میں مغلوب ہوا چاہتا ہوں (اے میرے رب) سو تو بدلہ لے۔"

(سورۂ قمر، آیت : ۱۰)

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم نے فیصلہ کیا کہ :

"حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْا اٰلِهَتَكُمْ"

"اس کو جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔" (سورۂ انبیاء، آیت : ۶۸)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا ایک رخ آل فرعون کی طرف تھا اور دوسرا بنی اسرائیل کی طرف۔ آل فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں ایسا طرز عمل اختیار کیا کہ حضرت موسیٰ کو بددعا کرنی پڑی کہ :

"رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ○"

"اے ہمارے رب مٹا دے ان کے مال اور سخت کر دے ان کے دل کہ وہ ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں"۔ (سورہ یونس، آیت : ۸۸)

غور کریں کہ نبی تو شدید خواہش رکھتا ہے کہ لوگ ایمان لائیں، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ سے آل فرعون کے لئے ایمان نہ لانے کی درخواست کر رہے ہیں۔ اسی طرح بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کی دعوت کے جواب میں ایسی پیٹھ دکھائی کہ انہیں فریاد کرنی پڑی :

"رَبِّ اِنِّیْ لَا اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِيْنَ ○"

"اے میرے رب میں اختیار نہیں رکھتا سوائے اپنی جان اور اپنے بھائی کے۔ پس تو جدائی ڈال دے ہمارے اور اس فاسق قوم کے درمیان"۔ (سورۂ مائدہ، آیت : ۲۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم نے انہیں جادوگر یعنی مرتد قرار دے کر اپنے تئیں سولی پر لٹکا دیا۔

حضور اکرم ﷺ کی دعوت کے رد عمل میں دس برس بعد آپ ﷺ کو شہید کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا (سورۂ انفال، آیت ۳۰) اور آپ کو مکہ میں تین برس تک ایک مشرک مطعم بن عدی کی پناہ میں رہنا پڑا۔ (الرحیق المختوم صفحہ ۲۲۳۔ ۲۲۴)

عام طور پر مثال دی جاتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر لاکھوں کی تعداد میں بنی اسرائیل، حضرت یونس علیہ السلام پر ان کی قوم کے ایک لاکھ سے زائد افراد اور نبی کریم

ﷺ پر اہل مدینہ صرف دعوت کے نتیجہ میں ایمان لے آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے من حیث القوم فرعون کے خوف کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ کا ساتھ دیا تھا۔ اور دعوتِ ایمانی ان کے دلوں میں گھر نہ کر سکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی انہوں نے دریا پار کیا اور فرعون سے نجات حاصل کی تو حضرت موسیٰ سے درخواست کی کہ ہمارے لئے بھی ایک پتھر کا معبود مقرر کر دیا جائے۔ (سورۂ اعراف آیات ۱۳۸۔۱۳۹)۔ پھر صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کی نافرمانیوں اور شرارتوں کا نقشہ سورۂ بقرہ رکوع ۵ تا ۱۴ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح قوم یونس کے مایوس کن طرز عمل کی وجہ سے حضرت یونس اس کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان کی قوم تو عذابِ الٰہی کے آثار دیکھ کر ایمان لائی۔ اہل مدینہ بھی ابتداء میں یہود کے خوف اور باہمی جنگ و جدال سے نجات کے لئے حضور ﷺ کو ایک ثالث بالخیر سمجھ کر ایمان کی دولت سے سرفراز ہوئے۔ (الرحیق المختوم صفحہ ۲۳۴۔۲۳۵) ورنہ حضور اکرم ﷺ نے تو مدینہ میں ہجرت سے قبل ایک دن بھی دعوت کا کام نہیں کیا۔

اب تک جتنی مثالیں دی گئی ہیں وہ انبیاء کرام کی تھیں۔ لیکن جب ہم ماضی قریب کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ تین بڑے بڑے انقلاب دنیا کے مختلف حصوں میں آئے، یعنی انقلاب روس، انقلاب فرانس اور انقلاب ایران۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی انقلاب دعوت اور محض دعوت کے ذریعے نہیں آیا بلکہ جان و مال کی قربانیوں کے نتیجے میں برپا ہوا۔

دوسری دلیل : محض دعوت کے ذریعے عوام اور بالخصوص معاشرے کے مظلوم طبقات تو انقلابی جدوجہد میں شرکت کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن معاشرے کے اصل کرتا دھرتا عناصر کی اکثریت، جن کے ہاتھ میں باطل نظام کی زمام کار ہوا کرتی ہے اور جن کے مفادات اس نظام سے وابستہ ہوتے ہیں، دعوت قبول نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں جہاں رسولوں کا اپنی قوم کے ساتھ بحث و مباحثہ بیان کیا گیا وہاں قوم کی طرف سے اس کے سرداروں ہی کی بڑھ چڑھ کر مخالفت کا تذکرہ ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ نظام کو چلانے والے ہی نہ مانیں محض دعوت سے انقلاب کیوں کر ممکن ہے۔

تیسری دلیل : اس دور میں ہم ایک ایسے ملک میں انقلاب لانا چاہتے ہیں جہاں مستحکم ریاست قائم ہے۔ ایک مستحکم ریاست میں محض دعوت کے ذریعے نظام کی تبدیلی ناممکنات میں سے ہے۔ مکے میں حضور اکرم ﷺ کے مشن کا پایہ تکمیل کو نہ پہنچنا اس وجہ سے تھا کہ پورے جزیرہ نمائے عرب میں صرف مکہ ہی میں ایک قدرے مستحکم ریاست قائم تھی۔ یہ ریاست حضور کی بعثت سے ۱۷۰ برس قبل قصی بن کلاب کی قیادت میں قائم ہوئی۔ "دارالندوہ" کو اس ریاست کی پارلیمنٹ کا درجہ حاصل تھا جہاں قبیلہ قریش کے مختلف خاندانوں کے سردار بڑے بڑے مسائل کا حل طے کرتے تھے۔ پھر سفارت' مالیات' عدالت' ایسار (فال گیری) اور حج سے متعلق مختلف امور کے شعبے بھی قائم تھے جن کی ذمہ داریاں قریش کے مختلف خاندانوں کے سپرد تھیں۔ (الرحیق المختوم صفحہ ۶۳۔ ۶۴ اور ۶۹)۔ اس کے برعکس مدینہ میں دو عرب اور تین یہودی قبائل آباد تھے۔ یہاں کوئی اجتماعی نظام حکومت قائم ہی نہ تھا بلکہ باہمی انتشار پوری طرح سے نمایاں تھا۔ دونوں عرب قبائل کے درمیان "جنگ بعاث" طویل عرصے سے جاری تھی۔ یہود کے درمیان بھی (سورۂ حشر آیت ۱۴ کے مطابق) شدید نفرتیں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ میں اجتماعی نظام کے خلا کی وجہ سے حضور ﷺ کو اسلامی ریاست کی طرف پیش قدمی کا موقع مل گیا۔

چوتھی دلیل : یہ بات غیر منطقی معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے معاشرہ میں اقامت دین کی منزل صرف اور صرف دعوت کے ذریعہ سے سر کی جائے جبکہ غیر مسلموں کے خلاف ہتھیار تک اٹھائے جائیں۔ سورۂ مائدہ کے ساتویں رکوع میں ایسے لوگوں کو کافر' ظالم اور فاسق کہا گیا ہے جو اللہ کے نازل کردہ کلام کے مطابق فیصلے نہ کریں۔ لہٰذا اگر کوئی مسلمان حکمران اور اس کا ٹولہ حدودِ الٰہی نافذ کرنے پر راضی نہ ہو تو درحقیقت وہ بھی ارتکابِ کفر کر رہا ہے اور اس کے خلاف صرف زبانی کلامی وعظ و نصیحت سے آگے بڑھ کر مظاہروں اور سول نافرمانی کے ذریعے تحریک چلائی جا سکتی ہے اور اس سے آگے بڑھ کر قتال بھی کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ شرائط پوری ہو جائیں جو فقہاء نے مسلمان حکمران کے خلاف خروج کے لئے مقرر کی ہیں۔

پانچویں دلیل : نبی اکرم ﷺ مسلسل ۱۳ برس تک مکہ میں دعوت دی لیکن انقلاب نہ آسکا۔ جبکہ مدینہ میں ہجرت سے قبل آپؐ نے بنفس نفیس ایک روز بھی دعوت نہ دی لیکن دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ وہاں آپ کے قدم افروز ہونے سے پہلے ہی انقلاب آ گیا۔ اس کا نتیجہ تو یہ نکلا کہ "منہجِ انقلابِ نبوی" کا کوئی ایک بھی مرحلہ نہیں یا دوسرے الفاظ میں آپؐ کی سیرت سے انقلاب برپا کرنے کا کوئی منہج اخذ نہیں کیا جا سکتا اور انقلاب تو خود بخود ہی آجایا کرتے ہیں۔

چھٹی دلیل : اس سلسلے کی آخری لیکن اہم ترین دلیل سورۂ حدید کی آیت نمبر ۲۵ ہے جس میں اللہ نے واضح فرمادیا کہ عادلانہ نظام محض وعظ و نصیحت سے قائم نہیں کیا جا سکتا۔

"لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝"

"ہم نے اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں اور تعلیمات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل اجتماعی کی ضمانت دینے والی شریعت) نازل کی تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہوں اور ہم نے لوہا بھی اتارا جس میں جنگ کی شدید صلاحیت ہے اور لوگوں کے لئے دوسرے فائدے بھی ہیں تاکہ اللہ دیکھے کون ہیں وہ (اس کے وفادار بندے) جو غیب میں ہونے کے باوجود اللہ اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے"۔

اس آیت کی تفسیر میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں کہ :

"کلام کا مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو قیام عدل کی محض ایک اسکیم پیش کرنے کے لئے مبعوث نہیں فرمایا تھا بلکہ یہ بات بھی ان مشن کے میں شامل تھی کہ اس کو عملاً نافذ کرنے کی کوشش کی جائے اور وہ قوت فراہم کی جائے جس سے فی الواقع عدل قائم ہو سکے۔" (تفہیم القرآن جلد ۵، صفحہ ۳۲۲)

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ :

"جب رسولوں کی بعثت اور کتاب و شریعت کے نازل کرنے سے اصل مقصود قیامِ قسط

ہوا تو یہ کام مجرد وعظ و تذکیر اور انذار و تبشیر سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے طاقت کی بھی ضرورت ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو رسولوں کو بیّنات یعنی نہایت واضح دلائل کے ساتھ اور کتابوں کو میزان اور کسوٹی بنا کر بھیجا تاکہ لوگوں پر عقلی و اخلاقی پہلو سے اچھی طرح حجت قائم ہو جائے، دوسری طرف لوہا بھی اتارا کہ جو لوگ اتمامِ حجت کے بعد بھی حق کے آگے جھکنے پر تیار نہ ہوں اور اپنے اغراض کے لئے خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے ہی پر تلے ہوں ان کو طاقت کے ذریعے سے زیر کیا جائے"۔ (تدبر قرآن، جلد ۸، صفحہ ۲۳۰)

دوسرا اعتراض

"اسلام میں بیعتِ سمع و طاعت صرف اربابِ اقتدار ہی کے لئے ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں اس بیعت کا مطالبہ اہلِ یثرب سے اس وقت کیا جب انہوں نے آپ ﷺ کو اپنی بستی کا اقتدار سنبھالنے کی دعوت دی"۔

جواب

اہلِ یثرب نے حضور اکرم ﷺ کو اللہ کا رسول مانا تھا۔ رسول کی حیثیت و مقام صاحبِ اقتدار کی حیثیت و مقام سے انتہائی ارفع و اعلیٰ ہے۔ البتہ سن ۱۳ نبوی میں انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے ہاتھ پر جو بیعتِ سمع و طاعت کی اور جسے بیعتِ عقبۂ ثانیہ یا بیعتِ حرب کہا جاتا ہے، اس کے الفاظ اور پس منظر سے کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ اہلِ یثرب نے حضور ﷺ کو یثرب کا حکمران تسلیم کیا تھا۔ اس سلسلے میں درج ذیل نکات قابلِ غور ہیں۔

پہلی دلیل : مولانا صفی الرحمان مبارک پوری کی معرکۃ الآراء تصنیف الرحیق المختوم میں بیعتِ عقبہ ثانیہ کی آخری شق درج ذیل الفاظ کے ساتھ نقل کی گئی ہے :

"رسول اللہ ﷺ نے قرآن کی تلاوت، اللہ کی طرف دعوت اور اسلام کی ترغیب دینے کے بعد فرمایا : میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم اس چیز سے میری حفاظت کرو گے جس سے اپنے بال بچوں کی حفاظت کرتے ہو۔ اس پر حضرت براء بن

معرور رضی اللہ عنہ نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور کہا ہاں اس ذات کی قسم جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے، ہم یقیناً اس چیز سے آپ کی حفاظت کریں گے جس سے اپنے بال بچوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ لہٰذا اے اللہ کے رسول آپ ہم سے بیعت لیجئے۔ ہم خدا کی قسم جنگ کے بیٹے ہیں اور ہتھیار ہمارا کھلونا ہے۔ ہماری یہی ریت باپ دادا سے چلی آ رہی ہے"۔ (الرحیق المختوم صفحہ ۲۵۵)

مندرجہ بالا شق ظاہر کرتی ہے کہ اہل یثرب نے حضور ﷺ کی حفاظت کا عہد ایک حکمران کی حیثیت سے نہیں بلکہ پناہ گزین کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس بات کو مزید تقویت اس مشاورت سے ہوتی ہے جو آپ ﷺ نے بدر سے قبل صحابہ کرام سے کی تھی۔ الرحیق المختوم صفحہ ۳۴۴ پر اس مشاورت کا درج ذیل حصہ قابل غور ہے :

".....دراں حالیکہ بیعت عقبہ کی رو سے ان (انصار) پر لازم نہ تھا کہ مدینے سے باہر نکل کر جنگ کریں۔ اس لئے آپ نے مذکورہ تینوں (مہاجر) حضرات کی باتیں سننے کے بعد پھر فرمایا! "لوگو! مجھے مشورہ دو"۔ مقصود انصار تھے اور یہ بات انصار کے کمانڈر اور علمبردار حضرت سعد بن معاذ نے بھانپ لی۔ چنانچہ انہوں نے عرض کیا کہ بخدا! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اے اللہ کے رسول، آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا : ہاں! انہوں نے کہا : ہم تو آپ پر ایمان لائے ہیں، آپ کی تصدیق کی ہے اور یہ گواہی دی ہے کہ آپ جو کچھ لے کر آئے ہیں سب حق ہے اور اس پر ہم نے آپ کو اپنی سمع و طاعت کا عہد و میثاق دیا ہے، لہٰذا اے اللہ کے رسول! آپ کا جو ارادہ ہے اس کے لئے پیش قدمی فرمائیے۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے اگر آپ ہمیں ساتھ لے کر اس سمندر میں کودنا چاہیں تو ہم اس میں بھی آپ کے ساتھ کود پڑیں گے۔ ہمارا ایک آدمی بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہمیں قطعاً کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ کل آپ ہمارے ساتھ دشمن سے ٹکرا جائیں۔ ہم جنگ میں پامرد اور لڑنے میں جوانمرد ہیں اور ممکن ہے اللہ آپ کو ہمارا وہ جوہر دکھلائے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ پس آپ ہمیں ہمراہ لے کر چلیں۔ اللہ برکت دے"۔

مندرجہ بالا الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ اہل یثرب کی مدد رضاکارانہ تعاون کی سی تھی نہ کہ حکومت کے تحت ایک فوجی ڈسپلن کی۔

دوسری دلیل : جس وقت اہل یثرب میں سے ۷۲ نفوس قدسیہ نے حضور اکرم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی اس وقت یثرب کی اکثریت بشمول مجوزہ بادشاہ عبداللہ بن اُبی اس سے بے خبر تھی۔ الرحیق المختوم میں صفحہ ۲۶۰ پر قریش کی اہل یثرب سے بیعتِ عقبۂ ثانیہ سے متعلق یہ گفتگو درج ہے :

> "خزرج کے لوگو! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ اس صاحب کو ہمارے درمیان سے نکال لے جانے کے لئے آئے ہیں اور ہم سے جنگ کرنے کے لئے اس کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں حالانکہ کوئی عرب قبیلہ ایسا نہیں جس سے جنگ کرنا ہمارے لئے اتنا زیادہ ناگوار ہو جتنا آپ حضرات سے ہے"۔

لیکن چونکہ مشرکین خزرج اس بیعت کے بارے میں سرے سے کچھ جانتے ہی نہ تھے کیونکہ یہ مکمل رازداری کے ساتھ رات کی تاریکی میں زیر عمل آئی تھی اس لئے ان مشرکین نے اللہ کی قسم کھا کھا کر یقین دلایا کہ ایسا کچھ ہوا ہی نہیں ہے، ہم اس طرح کی کوئی بات سرے سے جانتے ہی نہیں۔ بالآخر یہ وفد عبداللہ بن ابی ابن سلول کے پاس پہنچا۔ وہ بھی کہنے لگا : یہ باطل ہے۔ ایسا نہیں ہوا ہے، اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ میری قوم مجھے چھوڑ کر اس طرح کا کام کر ڈالے۔ اگر میں یثرب میں ہوتا تو بھی مجھ سے مشورہ کئے بغیر میری قوم ایسا نہ کرتی۔ باقی رہے مسلمان تو انہوں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور چپ سادھ لی۔ ان میں سے کسی نے ہاں یا نہیں کے ساتھ زبان ہی نہیں کھولی۔ آخر رؤساءِ قریش کا رجحان یہ رہا کہ مشرکین کی بات سچ ہے، اس لئے وہ نامراد واپس چلے گے"۔

غور کیجئے کیا یہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ کسی کو اپنے شہر کا حاکم کرلیں جبکہ اس شہر کی اکثریت کو اس کا علم ہی نہ ہو؟

بیعتِ سمع وطاعت قرآن وسنت کی روشنی میں

اب آیئے ہم ان اصولی دلائل پر غور کریں جو ہمیں بیعت سمع وطاعت کے بارے میں قرآن وسنت، احادیث و آثارِ صحابہ، عقل ومنطق اور عملی تجربات سے حاصل ہوتے ہیں :

پہلی دلیل : سورۃ تغابن آیت نمبر ۱۶ میں اہل ایمان سے خطاب کرتے ہوئے اللہ نے

ارشاد فرمایا : وَاسْمَعُوا وَاَطِيْعُوا "اور سنو اور اطاعت کرو"۔

مندرجہ بالا حکم ہر مسلمان اور ہر دور کے لئے ہے اور اسے کسی بھی اصول کے تحت صرف ان لوگوں کے لئے خاص نہیں کیا جا سکتا جنہیں حضور ﷺ کی معیت بنفس نفیس حاصل تھی۔ اسی طرح سورۂ لقمان آیت نمبر ۱۵ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو وصیت کی کہ "وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ" "اس کے راستے کی پیروی کرو جو رجوع ہوا میری طرف"۔ اہل علم اس بات سے واقف ہیں کہ اتباع کا درجہ اطاعت سے بڑھ کر ہے۔ اس آیت میں ایسے شخص کی اطاعت ہی نہیں بلکہ اس کے راستے کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے جس کے خلوص و اخلاص اور تقویٰ و تدین پر اعتماد کیا جا سکتا ہو۔ بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف کے ذریعے در حقیقت ایک مخلص شخص کی ان امور میں پیروی کرنے کا عہد کیا جاتا ہے جو شریعت کے دائرے سے باہر نہ ہوں۔

دوسری دلیل : بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضور ﷺ کی بیعت ایک حکمران کی حیثیت سے کی گئی تھی، لیکن قرآن حکیم نے تو آپ کے مقرر کردہ امیر کی بھی اطاعت کو لازم کر دیا۔ سورۂ آل عمران آیت نمبر ۱۵۲ میں غزوۂ احد کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا :

"وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ حَتّٰى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ"

"اور اللہ نے تو اپنا (فتح کا) وعدہ سچ کر دکھایا یہاں تک کہ تم ڈھیلے پڑ گئے اور تم نے معاملات میں جھگڑا کیا اور نافرمانی کی"۔

مندرجہ بالا آیت میں جس نافرمانی کا ذکر ہے وہ دراصل حضور ﷺ کے مقرر کردہ امیر حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کی ہے نہ کہ حضور اکرم ﷺ کی۔ خود حضورؐ کا ارشاد مبارک ہے کہ :

"مَن اطاع امیری فقد اطاعنی ومَن عصٰی امیری فقد عصَانی"

"جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے

میرے مقرر کردہ امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی"۔

تیسری دلیل : حضور اکرم ﷺ نے اپنے بعض ارشادات کے ذریعہ سے بیعت سمع و طاعت کو ہمیشہ کے لئے لازم فرمادیا ہے۔ مثلاً :

"لااسلامَ الا باالجَماعۃِ وَلا جماعۃَ الا بِالسّماعہ ولا سماعۃ الا بالطاعۃ"

"اسلام ہے ہی نہیں بغیر جماعت کے اور جماعت ہے ہی نہیں بغیر سماعت کے اور سماعت ہے ہی نہیں بغیر اطاعت کے"۔ (مشکوٰۃ، عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ)

"آمُرُکم بخمسٍ : بِالجَماعۃِ وَالسَّمعِ وَالطَّاعۃِ والھجرۃ والجِھاد فی سبیل اللّٰہ"

"میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: جماعت کا، سننے کا، اطاعت کا، ہجرت کا، اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا"۔ (الترمذی، عن الحارث الاشعری)

"مَن خلع یدًا مِن طاعۃٍ لقی اللّٰہُ یومَ القیامۃِ ولاحجۃً لہ ومَن مات ولیس فی عنقہٖ بیعۃٌ مات میتۃً جاھلیۃً"

"جس کسی نے اطاعت سے ہاتھ کھینچا وہ روز قیامت اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی عذر نہ ہو گا اور جو مرا اس حال میں کہ اس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہیں وہ جاہلیت کی موت مرا"۔

مندرجہ بالا احادیث کی روشنی میں ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ بیعت سمع و طاعت کا التزام کرے۔ اگر اسلامی حکومت قائم ہے تو یہ بیعت خلیفۂ وقت کے ہاتھ پر ہو گی اور الجماعۃ سے مراد وہ تمام مسلمان ہوں گے جنہوں نے خلیفہ وقت سے بیعت کی ہو گی۔ البتہ اگر اسلامی حکومت قائم نہ ہو تو الجماعۃ کا وجود ہی نہیں اور ایسی صورت میں ضروری ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام کے لئے کسی پر خلوص اور صاحبِ تقویٰ شخص کے ہاتھ پر بیعت سمع و طاعت فی المعروف کر کے ایک اجتماعی قوت فراہم کی جائے۔

چوتھی دلیل : دین اسلام کا پورا مزاج ہی ایسی اجتماعیت کی تشکیل ہے جس کی بنیاد سمع و طاعت پر ہو۔ مثلاً مسلمانوں پر نماز جماعت کے ساتھ فرض ہے اور باجماعت نماز میں امام کی

آواز پر حرکت کرنا ضروری ہے۔ امام سے کسی عمل میں تقدیم کرنے والے کی نماز فاسد ہے۔ اسی طرح اگر امام غلطی کرے تو اس کو متوجہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن اگر وہ متوجہ نہ ہو تو بھی اس کی پیروی لازم ہے۔

پانچویں دلیل : امتِ مسلمہ کی تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اجتماعیت کی بنیاد ہمیشہ بیعت پر ہی رہی ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا شمار صغارِ صحابہ میں ہوتا ہے۔ انہوں نے حکومتِ وقت کے خلاف خروج کی بنیاد بیعت پر رکھی۔ ان کے بعد دورِ بنی امیہ اور بنی عباس میں حکومت وقت کے خلاف تمام تحریکیں بیعت ہی کی اساس پر تھیں۔ بعد ازاں، سوڈان میں مہدی سوڈانی، طرابلس میں سنوسی، سعودی عرب میں شیخ محمد بن عبدالوہاب اور مصر میں حسن البنا کی تحریکیں اسی بنیاد پر تھیں۔ برعظیم پاک و ہند میں سید احمد شہیدؒ نے بھی بیعتِ سمع و طاعت کی بنیاد پر تحریک چلائی جسے شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے صاحب زادے شاہ عبدالعزیزؒ کی سرپرستی حاصل تھی۔ مزید برآں، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحئیؒ جیسے صاحبانِ علم نے بھی سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بعد ازاں، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا معین الدین اجمیری نے بھی بیعت کو ہی اجتماعیت کی بنیاد بنایا۔ ان تمام بزرگوں نے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، حکمران کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک جماعت کے امیر کی حیثیت سے بیعت کا نظام اختیار کیا۔

چھٹی دلیل : یہ حقیقت مسلّم ہے کہ دنیا میں کوئی بھی بڑا کام بغیر جماعت کے نہیں ہو سکتا۔ بعض حضرات اپنی تحریر میں ایک طرف تو یہ لکھتے ہیں کہ انقلاب صرف اور صرف دعوت سے آ سکتا ہے لیکن اسی تحریر میں اقامتِ دین کی جدوجہد کے لئے ایک ایسی جماعت کے قیام کی ضرورت پر زور دیتے ہیں جو اخوت و محبت، شورائیت اور ایک دستور کی بنیاد پر ہو اور یہ کہ عوام کی اکثریت کو متاثر کئے بغیر اگلا قدم نہ اٹھایا جائے۔ گویا ایسے حضرات "منہجِ انقلابِ نبوی" میں دعوت کے ساتھ ساتھ جماعت کے قیام کے مرحلہ کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور اگلے مرحلے کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ جب جماعت کا قیام انقلاب لانے کے لئے ضروری ہی ٹھہرا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے لئے ہیئت کیا ہو؟ آیا یہ مغرب سے

در آمد شدہ دستوری، قانونی اور جمہوری طرز کی ہو یا بیعت کے اصول پر مبنی ہو جو قرآن و حدیث، سنت نبوی اور اسلاف کی روایات کے مطابق ہے۔ یقیناً ہماری رائے بیعت پر مبنی ہیئت تنظیمی ہی کے حق میں ہوگی۔

ساتویں دلیل : عملی طور پر جب ہم کسی بھی ادارے کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ہر جگہ نظم کے لئے سمع و طاعت ہی کا اصول نظر آتا ہے۔ گھر کے ادارے میں آخری فیصلے کا اختیار مرد کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ہر کمپنی میں ایک Managing Director یا کسی اور اصطلاح کا حامل سربراہ ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں آخری اختیار ہوتا ہے۔ Boss کا فیصلہ درست ہو یا غلط لیکن Boss is always right کا اصول ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے۔ جس ادارے کا کام جتنا زیادہ اہم ہوتا ہے۔ وہاں اس نظم پر زیادہ سختی سے عمل کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ فوج میں سخت نظم کا اصول کارفرما ہے :

Their's not to reason why
Their's but to do and die

ہماری مذہبی اور سیاسی جماعتیں خواہ کتنا ہی جمہوریت کا راگ الاپیں لیکن کسی ایک جماعت میں بھی یہ جمہوریت نظر نہیں آتی۔ بعض اوقات یہ جماعتیں اخوت و مساوات کی بنیاد پر متحدہ محاذ بناتی ہیں لیکن ان محاذوں کا انجام سب کے سامنے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوری اصول اداروں میں گروپ بندی اور انتشار پیدا کرتا ہے اور صرف سمع و طاعت کا اصول ہی قابل عمل اور مثبت پیش رفت کا ضامن ہے۔

ایک ضمنی اعتراض اور اس کا ازالہ :

مکی دور میں نبی کریم ﷺ نے اہل مکہ سے تو بیعت سمع و طاعت نہ لی لیکن اہل یثرب سے ایسی بیعت لی۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مکہ میں آپ ﷺ بنفس نفیس موجود تھے اور درمیان میں نظم کے سلسلے کا کوئی اور Link موجود نہیں تھا لہٰذا اہل مکہ نبی اور امتی کے رشتے کے حوالے سے آپ کی اطاعت کے پابند تھے۔ اس کے برعکس اہل یثرب کے لئے آپ نے نقباء کا تقرر فرمایا تھا جو آپ کے اور دیگر مسلمانوں

مکے درمیان ایک Link کی حیثیت رکھتے تھے۔ مدینے میں مسلمانوں کو در حقیقت ان نقباء کی اطاعت کرنی تھی۔ لہٰذا آپ ﷺ نے اہل یثرب سے سمع وطاعت کی بیعت لی۔ ڈاکٹر صاحب کی اس توجیہ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ سن ۶ نبوی میں حبشہ سے بھی کچھ لوگ آکر [illegible] ہوئے تھے، پھر آپ نے ان سے بیعت کیوں نہ لی؟ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ۱۰ برس تک مکے ہی کو اپنی دعوت کا محور و مرکز بنائے رکھا۔ البتہ ۱۰ نبوی کے بعد اہل مکہ کی اکثریت کے مایوس کن رویہ کی وجہ سے آپؐ نے دوسرے شہروں کی طرف توجہ کی۔ اسی سال میں آپؐ طائف تشریف لے گئے لیکن اہل طائف نے آپ ﷺ کے ساتھ انتہائی افسوس ناک سلوک کیا۔ اسی دوران سورۂ انعام کا نزول ہوا اور اسکی آیت نمبر ۸۹ میں اللہ نے آپ کو خوشخبری دی کہ :

"فَاِنْ یَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّیْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِیْنَ ۝"

"پس اگر یہ (مکہ والے) ان باتوں کا انکار کریں تو ہم نے ایسے لوگ مقرر کر دیئے ہیں جو ان کا انکار نہیں کریں گے۔"

اہل یثرب نے مسلسل تین برس حضور کی خدمت میں اضافی تعداد کے ساتھ حاضر ہو کر ثابت کیا کہ وہ حضور کی دعوت قبول کرنے میں سنجیدہ ہیں۔ اسی لئے حضور نے تیسرے برس ان سے بیعت سمع وطاعت لی۔

تیسرا اعتراض :

"ہجرت کے ساتھ ہی یثرب کا سیاسی اقتدار نبی اکرم ﷺ کو حاصل ہو گیا، اسلامی ریاست قائم ہو گئی اور اسلامی انقلاب برپا ہو گیا۔"

جواب :

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یثرب میں پہلے سے کوئی مرکزی حکومت قائم نہ تھی اور یہاں آباد پانچوں قبائل اپنے اپنے اصولوں کے مطابق اپنے معاملات چلا رہے تھے۔

اسی لئے حضور ﷺ کو یہاں اسلامی ریاست کے لئے ایک مرکز یعنی Base فراہم ہو گیا۔ بعض مصنفین نے ہجرت کے بعد مدینہ کے لئے مجازاً "اسلامی ریاست" کے الفاظ استعمال کئے ہیں لیکن کسی ایک نے بھی یہ نہیں لکھا کہ ہجرت کے ساتھ ہی نبی کریم ﷺ کے مقصدِ بعثت کی تکمیل ہو گئی تھی یعنی نظامِ عدلِ اجتماعی قائم ہو گیا تھا۔ درحقیقت ہجرت کے فوراً بعد نبی کریم ﷺ کو یثرب کی جغرافیائی حدود پر اقتدار حاصل نہ ہوا تھا بلکہ اوس اور خزرج کی ایک قابلِ ذکر تعداد نے آپ کو حاکم بلکہ اس سے آگے بڑھ کر رسول اور مطاع مطلق مان لیا تھا۔ تاہم مدینے ہی میں بسنے والے بعض مشرکین اور یہود آپ کو حاکم تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں دلائل حسب ذیل ہیں :

پہلی دلیل : سن ۳ ہجری میں غزوۂ احد سے قبل عبداللہ بن اُبَی اور اس کے تین سو ساتھی عین اس وقت میدانِ جنگ سے واپس ہوئے جبکہ مسلمان کفار کے لشکر کے بالکل سامنے آ چکے تھے۔ سورۂ آل عمران کی آیات ۱۶۶۔ ۱۶۸ میں اللہ نے ان منافقین پر شدید غصہ کا اظہار کیا ہے۔ اگر اس وقت واقعتاً کوئی حکومت قائم ہوتی تو ایسے لوگوں کو سخت ترین سزا دی جاتی اور آج کی اصطلاح میں ان کا کورٹ مارشل ہوتا۔ لیکن حضور ﷺ نے ان لوگوں کا نہ محاسبہ کیا اور نہ ہی سزا دی۔ اسی طرح سن ۶ ہجری میں باوجود تاکید کے منافقین حضور ﷺ کے ساتھ عمرے کے لئے نہیں نکلے۔ سورۂ فتح میں منافقین کے اس طرزِ عمل کی مذمت کی گئی لیکن انہیں بھی کوئی سزا نہیں دی گئی۔ اس کے برعکس سن ۹ ہجری میں یعنی فتح کے بعد جو لوگ غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہوئے ان کا محاسبہ کیا گیا۔ ان میں سے منافقین پر سورۂ توبہ میں لعن طعن کی گئی اور سزا کے طور پر ان کی مسجد کو ڈھا دیا گیا' ان کی غزوات میں شرکت پر پابندی لگا دی گئی' ان کے صدقات قبول کرنے سے انکار کر دیا گیا اور ایک موقع پر حضور ﷺ نے نام لے لے کر بعض منافقین کو مسجد نبوی سے باہر نکال دیا۔ اسی طرح تین صادق الایمان صحابہؓ کو پچاس روز تک معاشرتی انقطاع کی سزا دی گئی۔ وجہ اس کی صاف ظاہر ہے کہ فتح مکہ سے قبل ریاست قائم نہ تھی اور حضور کے ساتھ مہمات میں شرکت رضاکارانہ تھی۔ فتح مکہ کے بعد باقاعدہ اسلامی ریاست قائم ہو گئی اور حکم عدولی کرنے والوں کو سزا دی گئی۔

بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ غزوات میں شرکت نہ کرنے کے جرم پر کوئی حد نہیں لگائی جاسکتی، حالانکہ سابق مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع رحمتہ اللہ علیہ سورۂ توبہ میں تین صادق الایمان صحابہ کو ملنے والی سزا کے حوالے سے لکھتے ہیں :

"کسی گناہ کی سزا میں مسلمانوں کے امیر کو یہ حق بھی ہے کہ کسی شخص سے سلام و کلام قطع کر دینے کا حکم دے جیسے کہ اس واقعہ میں ان تین بزرگوں کے متعلق پیش آیا۔"

(معارف القرآن جلد ۴، صفحہ نمبر ۴۸۴)

اسی طرح یہ بھی کہا گیا کہ فتح مکہ سے قبل جن لوگوں نے غزوات میں شرکت نہ کی یا پیٹھ دکھائی ان کو محض مصلحت کی وجہ سے سزا نہ دی گئی۔ غور کیجئے مصلحت سے کام تو اسی وقت لیا جاتا ہے جب کہ کلی اختیار حاصل نہ ہو۔ مکی دور میں صبر محض کا مرحلہ، مدینے آکر یہود سے میثاق مدینہ کی طرز کا معاہدہ اور سن ۶ ہجری میں مشرکین مکہ کے ساتھ صلح حدیبیہ مصلحت ہی کی بناء پر تھیں ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ بقول اقبال ؎

باطل دوئی پسند ہے، حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

دوسری دلیل : ہجرت کے ۵ یا ۶ سال بعد تک صورت حال یہ تھی کہ بعض ایمان کے دعویدار اپنے فیصلے بجائے حضور سے کروانے کے یہود کی عدالتوں سے کرواتے تھے۔ سورۂ نساء، جس کا زمانہ نزول سن ۵ ہجری ہے، میں بیان کیا گیا :

"اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ ؕ وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا ○ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْکَ صُدُوْدًا ○"

"کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے اس پر جو آپ کی طرف نازل ہوا اور جو آپ سے پہلے نازل ہوا، چاہتے یہ ہیں کہ فیصلے کرائیں

طاغوت سے حالانکہ انہیں حکم دیا گیا کہ اس (طاغوت) کا انکار کر دیں۔ اور شیطان یہ چاہتا ہے کہ ان کو دور کی گمراہی میں مبتلا کر دے۔ اور جب بھی ان سے کہا گیا کہ آؤ اس کلام کی طرف جو اللہ نے نازل کیا اور رسول کی طرف تو اے نبی آپ نے دیکھا کہ منافقین آپ کی طرف آنے سے رکتے ہیں"۔

غور کیجئے کیا کوئی ایسی بھی اسلامی حکومت ہو سکتی ہے جو اپنی حدود میں مسلمانوں کو اختیار دے کہ اپنے فیصلے اللہ کے رسول سے کروائیں یا غیر مسلموں سے۔ بلاشبہ اسلام نے غیر مسلموں کو حق دیا ہے کہ وہ اپنے عائلی معاملات اپنی ہی عدالتوں میں طے کریں لیکن کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ فیصلے غیر مسلموں سے کروائے۔ صورت حال بالکل واضح ہے کہ ہجرت کے بعد فتح مکہ تک مدینے میں معاملہ رضاکارانہ تھا یعنی جو چاہے فیصلہ حضور سے کروائے اور جو چاہے یہود سے۔ اسی طرح یہود بعض اوقات اپنے مقدمات حضور کی عدالت میں لاتے لیکن پہلے سے طے کر لیتے کہ اگر فیصلہ ان کی منشاء کے مطابق ہوا تو تسلیم کریں گے ورنہ نہیں (سورہ مائدہ آیت نمبر ۴۱) اسی وجہ سے حضور ﷺ کو سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۴۶ میں منع کر دیا گیا کہ آپ یہود کے مقدمات سماعت کے لئے قبول نہ کریں۔ سوچئے کیا کوئی ایسا بھی حاکم ہو سکتا ہے جس کی رعایا اس کے فیصلے کو قبول کرے یا رد کر دے اور جو رعایا کے مقدمات سماعت کے لئے قبول ہی نہ کرے۔

<u>تیسری دلیل</u> : سورۂ مائدہ کی آیات نمبر ۵۲، ۵۳ اور ۵۷ میں منافقین کے اس طرز عمل کی اللہ نے مذمت کی ہے کہ وہ یہود سے دوستیاں رکھتے ہیں۔ گویا یہود اور ہیں اور مسلمان اور۔ ایک ہی حاکم کی رعایا اور ایک ہی ریاست کے شہری نہیں ہیں۔

<u>چوتھی دلیل</u> : مدنی قرآن میں مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کو کہیں بھی حکومت یا ریاست یا اس کی کسی مترادف اصطلاح سے موسوم نہیں کیا گیا۔ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران میں اس کے لئے امت کی اصطلاح آئی ہے جس کا مفہوم ہے ہم مقصد لوگوں کا گروہ۔ سورۂ مائدہ اور سورۂ مجادلہ میں مسلمانوں کو حزب اللہ یعنی اللہ کی پارٹی کہا گیا۔ گویا مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ ایک جماعت کی صورت میں تھی نہ کہ حکومت و ریاست کی شکل میں۔ قرآن حکیم میں حکومت و ریاست کے لئے سلطان، تمکّن اور استخلاف کی اصطلاحات آئی

ہیں۔ البتہ کہیں بھی ان کا استعمال مسلمانوں کی اس ہیئت اجتماعی کے لئے نہیں ہوا جو مدینہ میں فتح مکہ سے قبل تھی۔ آیئے قرآن حکیم میں ان آیات کا جائزہ لیں جن میں یہ اصطلاحات حکومت و ریاست کے معنی میں استعمال ہوئیں ہیں۔

"سلطان" کی اصطلاح سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۸۰ میں آئی ہے جس میں ہجرت کے موقع پر حضور ﷺ کو تلقین کی گئی ہے کہ :

"وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا ○ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ○"

"اور (اے نبی ﷺ) کہہ دیجئے کہ اے میرے رب مجھے داخل فرما سچا داخل کرنا اور مجھے نکال سچا نکالنا اور مجھے اپنے پاس سے عطا کر مددگار حکومت۔ اور کہہ دیجئے کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل ہے ہی مٹنے والا۔" (بنی اسرائیل ۸۰-۸۱)

مندرجہ بالا آیات کا مفہوم از خود واضح ہے کہ ہجرت کے وقت حضور ﷺ کو تلقین کی جا رہی ہے کہ آپ اللہ سے دعا کریں کہ وہ آپ کو غلبہ و اقتدار عطا فرمائے۔ گویا ابھی غلبہ و اقتدار حاصل نہیں ہوا۔ اگر ہجرت کے ساتھ حضور ﷺ کو غلبہ و اقتدار حاصل ہو گیا ہوتا تو بجائے دعا کے 'شکر کی تلقین کی جاتی' جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اقتیار کے حصول پر اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ (سورۂ یوسف آیت ۱۰۱)۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۸۰ کی تفسیر میں شاہ عبدالقادر رحمتہ اللہ علیہ موضح القرآن میں لکھتے ہیں :

"یعنی اس شہر سے نکل آبرو سے اور کسی جگہ داخل کر آبرو سے۔ وہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں داخل کیا اور وہاں کے لوگ حکم میں دیئے جس سے دین کو امداد ہوئی"۔

شاہ صاحب کے الفاظ پر غور فرمایئے 'مدینے کے لوگ حکم میں رہے نہ کہ مدینے کی جغرافیائی حدود۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

"اور آپ ﷺ کو ہجرت کی دعا سکھائی گئی اور اب انہی نازک حالات کے اندر حق

کی فتح اور باطل کی شکست کے اعلان کا آپ کو حکم ہوا۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم اس کے محل میں اشارہ کر چکے ہیں کہ ہجرت درحقیقت رسول کی فتح کا "دیباچہ" ہوتی ہے۔ اس کے بعد رسول کے مخالفین لازماً مٹ جاتے ہیں اور حق کا بول بالا ہو کر رہتا ہے"۔

"فتح مکہ کے موقع پر یہ پیش گوئی عملاً پوری ہو گئی۔ اس وقت آنحضرت ﷺ نیزے کی انی سے خانہ کعبہ کے بتوں کو توڑتے جاتے اور یہ آیت پڑھتے جاتے۔ گویا اس آیت کا مصداق منصۂ شہود پر آ گیا"۔ (تدبر قرآن، جلد ۴، صفحہ ۵۳۲)

نوٹ فرمایئے اصلاحی صاحب نے ہجرت کو فتح کا دیباچہ قرار دیا ہے نہ کہ مکمل فتح اور غلبہ دین کی تکمیل۔

مولانا مودودیؒ مذکورہ آیات کی تفسیر میں تحریر کرتے ہیں :

"یہ اعلان اس وقت کیا گیا جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد حبش میں پناہ گزین تھی اور باقی مسلمان سخت بے کسی و مظلومی کی حالت میں مکہ اور اطراف مکہ میں زندگی بسر کر رہے تھے اور خود نبی ﷺ کی جان ہر وقت خطرہ میں تھی۔ اس وقت بظاہر باطل ہی کا غلبہ تھا اور غلبۂ حق کے آثار کہیں دور دور تک نظر نہ آتے تھے، مگر اس حالت میں نبی ﷺ کو حکم دیا گیا کہ تم صاف صاف ان باطل پرستوں کو سنا دو کہ "حق آ گیا اور باطل مٹ گیا"۔ ایسے وقت میں یہ عجیب اعلان لوگوں کو زبان کا پھاگ محسوس ہوا اور انہوں نے اسے ٹھٹھوں میں اڑا دیا مگر اس پر نو برس ہی گزرے تھے کہ نبی ﷺ اس شہر مکہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور آپؐ نے کعبہ میں جا کر اس باطل کو مٹا دیا جو ۳۶۰ بتوں کی صورت میں وہاں سجا رکھا تھا"۔ (تفہیم القرآن جلد ۲، صفحہ ۶۳۸)

تمکن کی اصطلاح حکومت کے معنی میں سورۂ حج کی آیت نمبر ۴۱ میں استعمال کی گئی۔ یہ آیت دورانِ سفرِ ہجرت نازل ہوئی۔ اس آیت میں فرمایا گیا "اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ ----" یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار دیں ---- گویا ابھی اقتدار عطا نہیں کیا گیا اور گفتگو شرطیہ اسلوب میں کی جا رہی ہے۔

سورۂ نور کی آیت نمبر ۵۵ میں تمکّن کی اصطلاح بھی استعمال ہوئی ہے اور

استخلاف کی بھی۔ اس آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝"

"اللہ نے وعدہ فرمایا تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے اعمال کئے کہ انہیں زمین میں لازماً خلافت عطا فرمائے گا جیسے کہ ان سے پہلے لوگوں کو عطا فرمائی اور ان کے اس دین کو لازماً جمادے گا جو اس نے ان کے لئے پسند کیا اور ان کو ڈر کے بدلے میں امن دے گا' وہ میری بندگی کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔ اور جو کوئی اس کے بعد ناشکری کرے گا تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں"۔

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے اس آیت کی جو تفسیر کی ہے اس کے یہ الفاظ قابل غور ہیں :

"اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ فتح مکہ کے بعد جس طرح پورا ہوا وہ تاریخ کی ایک ایسی حقیقت ہے جس کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ پورے جزیرۂ عرب کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمادیا کہ "لا یجتمع فیھا دینان" (اس میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے)۔ (تدبر قرآن ج۵' ص ۴۲۷)

مفسرین نے سورۂ نور کا زمانہ نزول ۶ ہجری کا نصف آخر بتایا ہے۔ گویا ہجرت کے ۶ سال بعد اللہ تعالیٰ وعدہ فرما رہا ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ کا حق ادا کرنے والوں کو خلافت اور دین اسلام کو غلبہ عطا فرمائے گا۔ کیا اب بھی یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہجرت کے ساتھ ہی اہل ایمان کو اقتدار اور دین اسلام کو غلبہ حاصل ہو گیا تھا؟

پانچویں دلیل : فتح مکہ سے قبل نازل ہونے والے مدنی قرآن میں مسلمانوں کی جماعت میں یہ درجہ بندی برقرار رکھی گئی کہ اصل ارکان جماعت مہاجرین تھے جو مکہ میں حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ تربیت و تزکیہ کے مراحل طے کر چکے تھے اور شدید مصائب جھیل کر اور گھربار چھوڑ کر اپنے ایمان کا ثبوت فراہم کر چکے تھے جب کہ انصار کی حیثیت معاونین اور پناہ دینے والوں کی تھی (الانفال : ۷۲-۷۴)۔ اسی طرح سورۂ حج کی آیت نمبر ۳۹ میں اذنِ قتال بھی صرف مہاجرین کو دیا گیا۔ البتہ فتح مکہ کے بعد جب معاملہ حکومت کی صورت اختیار کر گیا تو مہاجرین اور انصار کو اسلامی حکومت کے یکساں شہریوں کی حیثیت دے دی گئی۔ (التوبہ : ۱۰۰)

بعض حضرات نے دلیل کے طور پر یہ بات پیش کی ہے کہ نو مسلم انصارِ صحابہ کو مدنی دور کے آغاز میں اسی طرح غزوات میں شرکت سے روک دیا گیا تھا جیسے کہ غزوۂ تبوک کے بعد منافقین کو روکا گیا تھا۔ جب غزوۂ تبوک کے موقع پر اسلامی ریاست قائم تھی تو مدنی دور کے آغاز میں اس کے وجود کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کا موازنہ ہرگز درست نہیں۔ غزوۂ تبوک کے بعد منافقین کو بطور سزا غزوات میں شرکت سے روکا گیا جبکہ انصار کے لئے معاملہ رضاکارانہ تھا یعنی چاہیں تو شریک ہوں یا نہ ہوں۔ اس کے باوجود انہوں نے بڑھ چڑھ کر غزوات میں حصہ لیا۔

<u>چھٹی دلیل</u> : جزیرہ نمائے عرب کا مرکز مکہ تھا جسے سورۂ شوریٰ کی آیت ۷ میں "ام القریٰ" کہا گیا۔ یہیں پر جزیرۂ نمائے عرب کی مستحکم ریاست قائم تھی جس کے حکمرانوں کو قرآن نے کفر کے سردار یعنی "ائمۃ الکفر" قرار دیا ہے۔ مکہ ہی میں وہ عظیم ترین گھر واقع تھا جسے اللہ تعالیٰ کی اولین عبادت گاہ کا درجہ حاصل ہوا۔ جب شہر مکہ پر کفر کے سرداروں کا تسلط ہو اور اللہ کا عظیم گھر شرک کا مرکز ہو تو کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ جزیرہ نمائے عرب میں وہ اسلامی انقلاب مکمل ہو چکا تھا جس کی جزو بنیادی توحید ہے۔

<u>ساتویں دلیل</u> : رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے حضور اکرم ﷺ کو ذاتی طور پر ایذائیں پہنچائیں (الرحیق المختوم ص ۵۳۰) اور آپ پر بہتان بھی لگائے، بلکہ غزوۂ بدر کے فوراً بعد یہودی قبیلے بنی قینقاع کے معاملے میں اس نے آپؐ کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر گستاخی کی اور یہودی قبیلے سے رعایت کے لئے دباؤ ڈالا۔ (الرحیق

المختوم ص ۳۲۰) پھر حضرت عائشہؓ پر بہت بڑی تہمت لگائی جس کی شدید ترین مذمت سورۂ نور میں کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے حضور ﷺ سمیت تمام مہاجر صحابہؓ کو "ذلیل" کہا (منافقون : ۸) اور کئی بار فتنے اٹھانے کی کوشش کی۔ حضور صلی اللہ علیہ [illegible] کہ اس شخص کو سزا نہ دے سکے اور مصلحت کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ [illegible] مدینہ میں بااختیار حاکم کی حیثیت حاصل ہوتی تو کسی مصلحت سے کام لینے کی ضرورت نہ تھی۔

آٹھویں دلیل : اہل مدینہ میں قبول اسلام کے باوجود قبائلی حمیت بڑی شدت کے ساتھ موجود تھی اور بعض اوقات وہ اس کے تحت لڑنے مرنے پر اتر آتے تھے۔ غزوۂ بدر کے بعد ایک یہودی سازش کی وجہ سے اوس اور خزرج میدان حرہ میں ہتھیار لے کر ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عین موقع پر جا کر انہیں جنگ سے منع فرمایا (الرحیق المختوم ص ۳۸۹) غزوہ بنی مصطلق سے واپسی پر عبداللہ بن ابی نے حضرت عائشہؓ کے خلاف فتنہ اٹھایا اور انصار و مہاجرین کو لڑانے کی کوشش کی۔ اس حرکت پر حضورؐ اسے سزا دینا چاہتے تھے لیکن اوس اور خزرج کے سرداروں میں اس معاملہ پر قبائلی حمیت کی وجہ سے ترش کلامی ہوئی اور آپؐ عبداللہ بن ابی کو سزا نہ دے سکے۔ قبائلی حمیت کی یہ مثالیں اس بات کی عکاسی کرتی ہیں کہ ابھی وہ ریاست قائم نہ ہوئی تھی جس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت قبائلی عصبیتوں پر غالب آ گئی ہو۔

نویں دلیل : مدینہ آ کر حضور ﷺ کو یہود سے معاہدہ کرنا پڑا جو کہ میثاق مدینہ کے نام سے مشہور ہے۔ حکومت کبھی رعایا سے معاہدے نہیں کرتی بلکہ ان کے لئے آرڈیننس جاری کرتی ہے۔ اس طرح کا آرڈیننس فتح مکہ کے بعد سورۂ توبہ کی آیت ۲۹ میں جاری کیا گیا جس میں یہودیوں کو اسلامی ریاست میں دوسرے درجے کا شہری قرار دیا گیا۔ میثاقِ مدینہ کی دفعات کا مطالعہ کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ دونوں فریقوں نے بالکل برابری کی سطح پر معاہدہ کیا۔ صرف ایک شق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غالب حیثیت تسلیم کر لی گئی کہ باہمی

نزاعات کی صورت میں فیصلہ وہ کریں گے۔ جیسے کہ دوسرے اعتراض کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ تو اجتماعیت کا اصول ہے کہ آخری فیصلے کا اختیار کسی فرد واحد کو دینا پڑتا ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ یہود نے یہ اختیار حضورؐ کے لئے اس وجہ سے تسلیم کیا کہ وہ آپؐ کو بحیثیت رسول اس طرح سے پہچانتے تھے جیسے اپنے بیٹوں کو (بقرہ : ۱۴۱)۔ انہیں یقین تھا کہ حضور ﷺ کبھی بھی عدل و انصاف سے نہیں ہٹ سکتے۔ لیکن انہوں نے کبھی دل سے آپؐ کو حاکم تسلیم نہیں کیا جس کا ثبوت ان کی عہد شکنیاں اور بے شمار سازشیں ہیں جن کا ذکر سورۂ بقرہ کے رکوع ۵ تا ۱۴ میں کیا گیا ہے۔

<u>دسویں دلیل</u> : یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قیامِ ریاست اور شے ہے اور تکمیلِ انقلاب اور۔ انقلاب کے معنی ہیں انفرادیت سے لے کر اجتماعیت تک مختلف شعبہ ہائے زندگی میں کلی تبدیلی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہجرت کے وقت نہ تو انفرادی زندگی سے متعلق تمام احکامات نازل ہوئے تھے اور نہ ہی اجتماعی زندگی سے متعلق۔ حدود و تعزیرات کے ضمن میں قتل' چوری' ڈاکہ زنی' زنا وغیرہ کی حدود تو ہجرت کے چھ سال بعد سورۂ نساء' مائدہ اور سورۂ نور میں جا کر نازل ہوئیں۔ معاشی میدان میں سود کی حرمت کا حتمی اعلان سن ۹ ہجری میں نازل ہوا۔ معاشرتی لحاظ سے ستر و حجاب اور مساوات انسانی وغیرہ کے بارے میں ہدایات مدنی دور کے وسط میں نازل ہوئیں۔ سیاسی نظام کے بارے میں اصولی ہدایات سورہ حجرات میں سن ۶ ہجری میں عطا کی گئیں۔ احکامات کی عدم موجودگی میں آخر وہ کونسا انقلاب تھا جو ہجرتِ مدینہ کے فوراً بعد برپا ہوا۔

<u>گیارہویں دلیل</u> : حضور اکرم ﷺ کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس مقصد کے لئے مبعوث فرمایا تھا کہ آپ کے ذریعہ سے اپنے دین کو کل نظامِ زندگی پر غالب فرما دے۔ (سورۂ توبہ ۳۳' سورۂ فتح ۲۸' سورۂ صف ۹)۔ ہجرت کے فوراً بعد صورت حال یہ تھی کہ مشرکوں' یہودیوں اور عیسائیوں کے نظام ہائے حیات اپنی اپنی حدود میں پوری طرح سے غالب اور چھائے ہوئے تھے۔ ہجرت کے بعد سے لے کر فتح مکہ تک ان ادیان باطلہ کے علم برداروں نے مسلسل مسلمانوں کو پریشان کئے رکھا اور حضور ﷺ نے بڑے گہرے فہم و

فراست سے مشرکین مکہ ' دیگر عرب قبائل اور یہود سے بیک وقت مقابلہ کیا۔ ہجرت کے پانچویں سال یعنی جنگ خندق کے موقع پر یہ تمام گروہ متحدہ محاذ بنا کر مسلمانوں کو کچلنے کے لئے جمع ہو گئے۔ کیا ایسی صورت میں تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ ہجرت کے فوراً بعد اظہار دین حق کا عظیم مشن پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا' جس کے لئے حضور ﷺ بھیجے گئے تھے؟

بارھویں دلیل : منہج انقلاب نبوی پر اعتراض کرنے والے بعض حضرات نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم بھی اس بات کے قائل تھے کہ ہجرتِ مدینہ کے ساتھ ہی اسلامی ریاست قائم ہو گئی تھی اور اسلامی انقلاب برپا ہو گیا تھا۔ مناسب محسوس ہوتا ہے کہ اس موقع پر مولانا کی ایک ایمان افروز تحریر قارئین کی خدمت میں پیش کی جائے۔ مولانا موصوف فرماتے ہیں :

"مکہ میں اس تحریک کو کام کرتے ہوئے تیرہ سال گزر چکے تھے کہ یکایک مدینے میں اس کو ایک ایسا مرکز بہم پہنچ گیا جہاں اس کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ عرب کے تمام حصوں سے اپنے پیروؤں کو سمیٹ کر ایک جگہ اپنی طاقت مجتمع کرے۔ چنانچہ نبی ﷺ اور بیشتر متبعینِ اسلام ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے۔ اس طرح یہ دعوت اگلے مرحلے میں داخل ہو گئی۔

اس مرحلہ میں حالات کا نقشہ بالکل بدل گیا۔ امت مسلمہ باقاعدہ ایک ریاست کی بنا ڈالنے میں کامیاب ہو گئی۔ پرانی جاہلیت کے علمبرداروں سے مسلح مقابلہ شروع ہوا۔ پچھلے انبیاء کی امتوں (یہود و نصاریٰ) سے بھی سابقہ پیش آیا۔ خود امتِ مسلمہ کے اندرونی نظام میں مختلف قسم کے منافق گھس آئے اور ان سے بھی نمٹنا پڑا اور دس سال کی شدید کشمکش سے گزر کر آخر کار یہ تحریک کامیابی کی منزل پر پہنچی کہ سارا عرب اس کے زیر نگین ہو گیا اور عالمگیر دعوت و اصلاح کے دروازے اس کے سامنے کھل گئے"۔ (تفہیم القرآن' مقدمہ جلد اول' صفحہ ۲۴)

تیرھویں دلیل : آخری دلیل کے طور پر ہم سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۳ اور سورۂ انفال کی آیت ۳۹ کو پیش کرتے ہیں :

"وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ"

"اور تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو

جائے"۔ (سورۂ بقرہ، آیت نمبر ۱۹۳)

"وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ"

"اور تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے۔" (سورہ انفال، آیت نمبر ۳۹)

سید ابو الاعلیٰ مودودی سورۂ بقرہ کی مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

"سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہے کہ اس مقام پر "فتنہ" سے مراد وہ حالت ہے جس میں دین اللہ کے بجائے کسی اور کے لئے ہو اور لڑائی کا مقصد یہ ہے کہ یہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو۔ پھر جب ہم لفظ 'دین' کی تحقیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں دین کے معنی اطاعت کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد وہ نظامِ زندگی ہے جو کسی کو بالاتر مان کر اس کے احکام و قوانین کی پیروی میں اختیار کیا جائے۔ پس دین کی اس تشریح سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ سوسائٹی کی وہ حالت جس میں بندوں پر بندوں کی خدائی و فرماں روائی قائم ہو اور جس میں اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہے 'فتنہ کی حالت' ہے اور اسلامی جنگ کا مطمحِ نظر یہ ہے کہ اس فتنہ کی جگہ ایسی حالت قائم ہو جس میں بندے صرف قانونِ الٰہی کے مطیع بن کر رہیں"۔ (تفہیم القرآن ج ۱، ص ۱۵۱)

سورۂ انفال کی آیت ۳۹ کے حوالے سے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تفسیر کا مندرجہ ذیل حصہ خاص طور پر توجہ کا طالب ہے کہ :

"اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ ان غاصبوں اور خائنوں سے جنگ کرو اور یہ جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ سرزمین حرم پر اللہ کے دین یعنی اسلام کے سوا جو ابراہیم علیہ السلام کا دین تھا اور کوئی دین باقی نہ رہ جائے۔ اسی بات کو نبی اکرم ﷺ نے یوں مؤکد فرمایا کہ اس سرزمین پر دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔ اصلاً تو یہ حکم سرزمین حرم کے لئے ہے لیکن کفر و شرک کے اثرات سے اس کی حفاظت بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ پورا علاقہ کفر و شرک کی مداخلت سے پاک رہے جس میں حرم واقع ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ جس طرح مکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے محترم ہے اسی طرح نبی ﷺ نے مدینہ کو محترم قرار دیا جس سے اس حکم کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا"۔ (تدبر قرآن۔ ج ۳، ص ۴۷۵)

معارف القرآن میں مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> "خلاصہ اس تفسیر کا یہ ہے کہ مسلمانوں پر اعداءِ اسلام کے خلاف جہاد و قتال اس وقت تک واجب ہے جب تک مسلمانوں پر ان کے مظالم کا فتنہ ختم نہ ہو جائے اور اسلام کو سب ادیان پر غلبہ نہ ہو جائے"۔

سورۂ بقرہ اور سورۂ انفال مدنی سورتیں ہیں اور ان کی مذکورہ آیات بڑی وضاحت سے کہہ رہی ہیں کہ ابھی دین کُل کا کُل اللہ کے لئے نہیں ہوا۔ بقول اقبال ۔

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے

بعض حضرات نے ہجرت کے فوراً بعد ہی اسلامی ریاست کے قیام کو ثابت کرنے کے لئے ایک نو مسلم صحابی حضرت ابو قیس بن صرمہ بن ابی انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اشعار پیش کئے ہیں جو انہوں نے قبول اسلام کے وقت کہے تھے۔ ان اشعار کا ترجمہ یوں ہے :

> "آپؐ دس سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک قریش میں اس امید پر لوگوں کو نصیحت کرتے رہے کہ کوئی ساتھی، کوئی رفیق ان (کے اعیان اور اکابر) میں سے مل جائے اور حج کے موقع پر اپنے آپکو لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہے لیکن نہ کوئی پناہ دینے والا ملا اور نہ کوئی ایسا شخص جو آپ کے ساتھ حق کا داعی بن کر کھڑا ہو جاتا۔ لیکن اس کے بعد جب آپ ہمارے پاس آئے تو اللہ نے یہاں اپنے دین کو غلبہ عنایت فرمادیا۔ چنانچہ طیبہ کی اس بستی سے آپ ہر لحاظ سے خوش اور راضی ہو گئے"۔

قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک نو مسلم صحابی نے عین قبول اسلام کے وقت جو اشعار کہے ہیں ان میں شاعری کی مجبوری کی وجہ سے مبالغہ کا رنگ پوری انتہا پر ہے۔ مکی دور میں جن نفوس قدسیہ کو حضور ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کا ساتھ دینے کا شرف حاصل ہوا، انہوں نے راہ حق میں وہ قربانیاں پیش کیں جن کی نظیر شاید ہی کوئی انسان قیامت تک پیش کر سکے گا۔

اسی طرح بعض حضرات نے افغانستان کی موجودہ حکومت کی مثال دی ہے کہ وہ بالفعل اپنے دار لحکومت میں بھی اپنا حکم پوری طرح منوا لینے پر قادر نہیں لیکن پوری دنیا

اسے ایک باقاعدہ حکومت تسلیم کرتی ہے۔ اسی طرح ہجرت کے فوراً بعد مدینے میں بھی اسلامی ریاست قائم ہو چکی تھی۔ غور کیجئے اللہ کے رسول ﷺ کی قائم کردہ ریاست کو افغانستان کی موجودہ حکومت کی طرح بے دست و پا اور بے اختیار قرار دے کر ایسے حضرات اللہ کے رسول اور ان کی قائم کردہ اسلامی ریاست کی شان بڑھا رہے ہیں یا گھٹا رہے ہیں!!

چوتھا اعتراض :

" شریعت کی رو سے جس طرح کوئی شخص اقتدار اور حکومت کے بغیر کسی زانی کو کوڑے نہیں مار سکتا، کسی چور کا ہاتھ نہیں کاٹ سکتا، اسی طرح جہاد و قتال کے لئے بھی کوئی اقدام نہیں کر سکتا۔ اس نوعیت کا ہر اقدام شریعت میں جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کسی پیغمبر نے اقتدار کے بغیر جہاد نہیں کیا۔ قرآن اس معاملے میں بالکل واضح ہے۔ عالم کے پروردگار نے ان کو اس کی اجازت اس وقت دی جب انہوں نے ہجرت کر کے اپنی جماعت کسی آزاد علاقے میں منظم کر لی اور ان کا اقتدار اس جماعت پر بزور قوت قائم ہو گیا۔ اللہ کے یہ پیغمبر اس معاملے میں اس قدر محتاط رہے ہیں کہ انہیں جب تک اقتدار حاصل نہیں ہوا قتال کا نام بھی ان کی زبان پر کبھی نہیں آیا۔ یہی حقیقت سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی سیرت سے بھی واضح ہوتی ہے۔ اسلام کے نزدیک یہ تصور ہی مضحکہ خیز ہے کہ جو نظام امارت اپنے لوگوں پر اللہ کی حدود نافذ کرنے اور ارتکاب جرم کی صورت میں مجرم کو سزا دینے کا اختیار نہیں رکھتا اسے قتال کی اجازت دی جائے"

جواب :

شریعت کی تکمیل کے بعد تو ضروری ہے کہ مسلمان کسی خطہ ارضی میں اللہ کی حدود کو اسی وقت نافذ کریں جب انہیں وہاں مکمل اقتدار حاصل ہو جائے۔ البتہ شریعت کے نزول کے دوران نبی کو پابند نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے ماننے والوں پر جزوی یا مکمل احکامات شریعت بغیر اقتدار کے حصول کے نافذ نہ کرے۔ البتہ قرآن کے حوالے سے یہ بات کہ

دینا کہ کسی بھی نبی نے بغیر اقتدار کے قتال نہیں کیا بہت بڑی جسارت اور غلط بیانی ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل آیات قابل غور ہیں :

<u>پہلی دلیل</u> : سورۂ آل عمران آیات ۱۴۶۔ ۱۴۸ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

"وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاٰتٰىھُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝"

"اور کتنے انبیاء گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی تو وہ ان مصیبتوں کی وجہ سے جو انہیں خدا کی راہ میں پہنچیں نہ تو پست ہمت ہوئے نہ انہوں نے کمزوری دکھائی اور نہ دشمنوں کے آگے گھٹنے ٹیکے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ان کی دعا تو ہمیشہ یہ رہی کہ اے رب ہمارے گناہوں اور ہمارے معاملے میں ہماری بے اعتدالیوں کو بخش دے' ہمارے قدم جمائے رکھ اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کا صلہ بھی عطا فرمایا اور آخرت کے اچھے اجر سے بھی نوازا۔ اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے"۔

کیا تاریخ انسانی سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ بہت سے انبیاء نے دعوت اور محض دعوت کے ذریعے پہلے اقتدار حاصل کیا اور پھر اس کے بعد اللہ کی راہ میں جنگ کی؟ شاید اس کی کوئی ایک مثال بھی پیش نہ کی جا سکے۔ ان آیات میں تو فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کرنے کے نتیجے میں انہیں دنیا کا صلہ عطا فرمایا گیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ان آیات کی تفسیر میں لکھا ہے :

"ان آیات میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں (اللہ والوں کو) جب مصیبتیں اور آزمائشیں پیش آئیں تو انہوں نے اس طرح کی باتیں نہیں بنائیں جس طرح کی باتیں آج کمزور قسم کے مسلمان اور منافق لوگ بنا کر پیغمبر کے خلاف طرح طرح کے شبہات

دلوں میں پیدا کر رہے ہیں بلکہ جو اللہ انہیں پیش آئیں اس کو انہوں نے خدا اور رسول کی طرف منسوب کرنے کے بجائے خود اپنی کمزوریوں اور اپنے تجاوز پر محمول کیا اور اللہ تعالیٰ سے اپنے قصوروں کی معافی مانگی۔ اس کا صلہ ان کو یہ ملا کہ دنیا میں بھی خدا نے ان کو اقتدار اور حکومت سے سرفراز فرمایا اور آخرت میں بھی ان کے لئے نہایت اعلیٰ صلہ و انعام موجود ہے"۔

دوسری دلیل : سورۃ البقرہ کے رکوع ۳۲ اور ۳۳ میں اس قتال فی سبیل اللہ کا ذکر ہے جو حضرت طالوت کی قیادت میں اللہ والوں نے کیا اور جس میں حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر کے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ قرآن حکیم کے اس مقام کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے نبی حضرت سموئیل علیہ السلام نے جب قوم کے مطالبہ پر ان کے سامنے قتال فی سبیل اللہ کے فرض ہونے کا اعلان کیا تو اکثریت نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ غور کیجئے کیا نبی کو ان پر اقتدار حاصل تھا؟ اسی طرح جب حضرت طالوت نے ایک نہر کے ذریعے ان لوگوں کو آزمایا تو اکثر نے حضرت طالوت کے حکم کی نافرمانی کی۔ پھر حضرت داؤد علیہ السلام کو جو کہ اس جنگ کے اصل ہیرو تھے فتح کے بعد نبوت بھی ملی اور رسالت بھی۔

تیسری دلیل : سورۂ مائدہ کے چوتھے رکوع میں اس واقعہ کا ذکر ہے جس میں حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کو مشرکین کے خلاف قتال فی سبیل اللہ کا حکم دیا۔ سوائے دو افراد کے پوری قوم نے بیک زبان حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا اور کہا :

"قَالُوا يٰمُوسٰى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا اَبَدًا مَّا دَامُوا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ ۝"

"وہ بولے کہ اے موسیٰ ہم اس (بستی) میں ہرگز نہیں داخل ہوں گے جب تک وہ اس میں موجود ہیں، تو تم اور تمہارا خدا جا کر لڑو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں"۔

چنانچہ حضرت موسیٰ ذات باری تعالیٰ کے سامنے اپنی بے بسی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"قَالَ رَبِّ اِنِّی لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِی وَاَخِی فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ○"

"حضرت موسیٰ نے فریاد کی کہ اے پروردگار میرا اپنی جان اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر کچھ زور نہیں' پس تو ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان علیحدگی کر دے"۔

قارئین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ بات قرآنی شواہد کے کس قدر برعکس ہے کہ "اللہ کے پیغمبر اس معاملے میں اس قدر محتاط رہے کہ انہیں جب تک اقتدار حاصل نہیں ہوا قتال کا نام بھی ان کی زبان پر نہیں آیا"۔

برائے توجہ رفقاء تنظیم اسلامی

آئندہ تربیت گاہوں اور خصوصی پروگراموں کا تبدیل شدہ شیڈول

تربیت گاہیں

☆ مبتدی	۱۵ تا ۲۱ مارچ ۹۶ء	مرکزی دفتر تنظیم اسلامی پاکستان لاہور
☆ ملتزم	۲۲ تا ۲۸ مارچ ۹۶ء	ایضاً
☆ مبتدی	۵ تا ۱۱ اپریل ۹۶ء	ایضاً
☆ ملتزم	۱۷ تا ۲۳ مئی ۹۶ء	حلقہ شمالی پنجاب
☆ مبتدی	۳۱ مئی تا ۶ جون ۹۶ء	مرکزی دفتر تنظیم اسلامی پاکستان لاہور
☆ ملتزم	۵ تا ۱۱ جولائی ۹۶ء	ایضاً
☆ مبتدی / ملتزم	۹ تا ۱۵ اگست ۹۶ء	قرآن اکیڈمی' ۲۵ آفیسرز کالونی' ملتان
☆ مبتدی	۶ تا ۱۲ ستمبر ۹۶ء	مرکزی دفتر تنظیم اسلامی پاکستان لاہور

خصوصی مشاورتی / تربیتی پروگرام بمقام لاہور

☆ مشاورتی و تربیتی پروگرام برائے ملتزم رفقاء ۸ تا ۱۱ جون ۱۹۹۶ء

☆ تربیتی پروگرام برائے ذمہ دار رفقاء ۱۲ تا ۱۳ جون ۱۹۹۶ء

نفاق کی نشانیاں (۳)

تالیف : فضیلۃ الشیخ الاستاذ عائض عبداللہ القرنی

ترجمہ و حواشی : ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور

آٹھویں نشانی

نماز میں ٹھونگے مارنا

جیسا کہ پچھلی حدیث میں ہم نے بیان کیا ہے "تِلْكَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ ...... يَنْقُرُ أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ ....(یہ منافق کی نماز ہے...... چار رکعات ٹھونگ لیتا ہے.....) اس کا معنی یہ ہے کہ وہ جلدی جلدی نماز پڑھتا ہے اور اس میں خشوع نہیں ہوتا۔ نماز میں اطمینان و سکون سے محرومی اور قلت ذکر دلی اکتاہٹ کی نشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت' ہیبت اور مقام سے خالی دل منافقین کی نمایاں نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ "مدارج السالکین" میں تحریر فرماتے ہیں : ایک نمازی دوسرے نمازی بھائی کے ساتھ ایک ہی امام اور ایک ہی صف میں کھڑا ہو کر نماز ادا کرتا ہے لیکن مقام و مرتبہ کے اعتبار سے دونوں کی نمازوں میں زمین و آسمان جتنا فرق ہوتا ہے کیونکہ ایک نمازی کے دل میں اخلاص' محبت اور شوق کے ساتھ ساتھ' ڈر اور خوف بھی ہوتا ہے جبکہ دوسرے کے دل پر اکتاہٹ' دوری' اور پژمردگی چھائی ہوئی ہوتی ہے (والعیاذ باللہ) دوران نماز خشوع کے معاملے میں ہمیشہ ہوشیار اور چوکنے رہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝﴾ (المومنون : ۱-۲)

"یقیناً کامیاب ہوئے ہیں وہ اہل ایمان جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہی"۔

"الخشوع فی الصلاۃ" مؤلفہ امام ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ نماز کے موضوع پر بہترین تالیف ہے۔ اس کتاب کی طرف توجہ دلانا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

نویں نشانی

رضاکارانہ طور پر دینی خدمات انجام دینے والے
نیک اہلِ ایمان پر طعنہ زنی کرنا

قرآن حکیم میں منافقین کے اس وصف کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے :

﴿ اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقَاتِ وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝﴾

(التوبہ : ۷۹)

"(اللہ تعالیٰ ان دولت مند مگر کنجوس منافقوں کو خوب جانتا ہے) جو برضا و رغبت دینے والے اہل ایمان کی مالی قربانیوں پر باتیں چھانٹتے ہیں اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن کے پاس (اللہ کی راہ میں دینے کے لئے) اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو وہ اپنے اوپر مشقت برداشت کر کے دیتے ہیں۔ اللہ ان (مذاق اڑانے والوں) کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لئے دردناک سزا ہے"۔

"لمز" سے مراد ہے لوگوں کی عزت پر حملہ آور ہونا اور ان پر زبانِ طعن دراز کرنا' اور "مُطَّوِّعِین" کی اصطلاح کا اطلاق ہر اس شخص پر ہو گا جو اللہ اور رسول کی اطاعت میں رضاکارانہ طور پر دینی خدمات انجام دے اور نتیجۃً اللہ کے دین کی طرف دعوت و تبلیغ میں مصروف رہے۔ ہر محفل میں منافق کو ایک ہی کام ہے کہ نیک لوگوں کی چغلیاں کرے اور ان پر آوازیں کسے' یعنی رضاکارانہ جہاد میں شریک ہونے والوں' سنجیدہ اور باوقار لوگوں' شرفاء اور دھیمے مزاج کے مالک حضرات کے خلاف زبان درازی کرے۔ اسے

یہودیوں، عیسائیوں، سوشلسٹوں اور ملحدوں کے بارے میں گفتگو کی توفیق نہیں ہوتی، بس صبح و شام اللہ والوں پر تیر چلانا اس کا کام ہے، چنانچہ وہ اللہ کے نیک بندوں کے بارے میں باتیں بناتا ہے، محفلوں میں ان کی عزت پر حملہ آور ہوتا ہے، ان کا مذاق اڑاتا ہے۔ مثلاً ایک ہم عصر مؤلف نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ متحدہ عرب امارات میں مقیم ایک گھنی داڑھی والے نے مجھ سے کولونیا کے بارے میں دریافت کیا۔ اس کا مقصد داڑھی اور کپڑوں کا مذاق اڑانا تھا۔ خبر نہیں یہ سنتِ رسول کو کیا سمجھتے ہیں، ہر سنت ہی ان کے دماغ کو ٹیڑھی محسوس ہوتی ہے ----- اس نے مزید لکھا ہے ہے کہ جزائر کے ایک گھنی داڑھی والے نے مجھ سے ٹخنوں سے اوپر کپڑا رکھنے کے بارے میں پوچھا، اور ایک دوسرے گھنی داڑھی والے نے پردے کا سوال کیا۔ ہم اس آدمی سے دریافت کرتے ہیں : کولونیا، اونچے کپڑے اور پردے کا گھنی داڑھی سے کیا تعلق؟ اس سے صرف طنز و تشنیع پیش نظر ہے۔

اے برادرانِ اسلام! مؤمن کو ایسی غلط حرکت سے ہمیشہ چوکنا رہنا چاہئے، کیونکہ نیک لوگوں کی عزت پر حملہ آور ہونا منافق کی نشانی ہے۔ منافق تو ہمیشہ اہل علم، دعوت و تبلیغ میں مصروف حضرات، طلبہ اور سیدھی راہ پر گامزن عبادت گزار حضرات کی ٹوہ میں رہتا ہے اور مذاق اڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ شاعر العربی نے اپنے بھائی سے کہا تا کہ وہ اس کا مخلص بھائی بن جائے :

یا "تو تم میرے مخلص بھائی بن جاؤ تا کہ مجھے تیرے نفع و نقصان کا پوری طرح پتہ چل جائے یا پھر مجھ سے بالکل الگ ہو جاؤ اور مجھے دشمن سمجھ لو، میں تجھ سے بچ کر رہوں اور تو مجھ سے بچ کر رہے۔ اپنا حال تو یہ ہے کہ اگر بایاں ہاتھ دشمنی کی وجہ سے مجھ سے اختلاف کر لے تو میرا دایاں ہاتھ بھی اس سے رشتہ برقرار نہیں رکھتا"

چنانچہ جو آدمی نیک لوگوں پر کیچڑ اچھالے اور ان کی عزت پر حملہ آور ہو تو سمجھ لو کہ اس میں نفاق کی نشانی پائی جاتی ہے۔

دسویں نشانی

قرآن کریم، سنتِ مطہرہ یا رسول اللہ ﷺ کا مذاق اڑانا

اس زمانے کے ایک ماڈرن فاجر کے بارے میں، میں نے سنا اور یہ فاجر بالکل ہی دین سے نکل چکا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک) وہ نہ نماز روزہ کرتا ہے اور نہ زکوٰۃ دیتا ہے۔ بات یہاں تک ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ سنت پر بھی زبان درازی کرتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کا مذاق اڑاتا ہے۔ ایک قابل اعتماد صاحب نے اس کا واقعہ بیان کیا۔ اگر واقعتاً یہ بات صحیح ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔ اس جرم پر اسے کبھی معافی نہیں ملے گی اور نہ کسی نیکی کے بدلے میں اس کا یہ گناہ معاف ہو گا، اللہ اس سے بات کرے گا نہ اس کی طرف دیکھے گا اور نہ کسی شکل میں اسے پاک کرے گا اور اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ چند نوجوانوں کے ساتھ وہ بیٹھا تھا اور انہیں جنت کے راستے سے بھٹکا کر جہنم کے راستے کی طرف بہکا رہا تھا۔ اس نے ساتھیوں سے پوچھا: ابو ہریرہ سے مروی چند حدیثیں کیا تمہیں نہ سناؤں؟ ساتھیوں نے کہا: ہاں ہاں ابو ہریرہ سے مروی حدیثیں ہمیں بھی سناؤ! اس نے کہا: (نقلِ کفر، کفر نہ باشد و نعوذ باللّٰہ مِنَ الکفر والنِّفاق) "مجھے میری پھوپھی نے بتایا، اس نے کہا کہ اسے اس کی خالہ نے بتایا کہ اس کی دادی نے حضور اکرم ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ ایک دن آپ ؐ نے اپنے اردگرد بیٹھے صحابہ کرام سے دریافت کیا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ پیپسی کسے کہتے ہیں؟ (واضح رہے کہ آپ ﷺ کے زمانے میں پیپسی نہیں تھی۔ لیکن اس نے مذاق بنایا) صحابہ ؓ نے کہا: ہم پیپسی کو نہیں جانتے تو آپ نے فرمایا: یہاں سے اٹھ جاؤ، تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ پیپسی کیا ہوتی ہے"۔

اسے کافر قرار دینے کے لئے اس کی یہی حرکت کافی ہے۔ اس گفتگو کی وجہ سے وہ کافر

قرار پاتا ہے، اس کا خون رائیگاں ہے، اس کے نصیب میں اب صرف تلوار ہے۔ اس پر جنازہ نہیں پڑھا جائے گا نہ کفن دیا جائے گا اور نہ ہی مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا بلکہ اس کا شمار کافروں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ﴾ (التوبہ : ۶۵،۶۶)

"ان سے کہو کیا تمہاری ہنسی دل لگی اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول ہی کے ساتھ تھی؟ اب عذرات نہ تراشو، تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے یہ آیات ان منافقین کے بارے میں نازل کیں جنہوں نے حضور اکرم ﷺ کے ساتھ مل کر نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، جہاد کیا، لیکن رات گپ شپ لگانے بیٹھ گئے۔ ان میں سے کسی ایک نے کہا: ہمارے قاری یعنی قرآن کے حافظ صحابہ پیٹ پوجا میں تو بڑی دلچسپی لیتے ہیں لیکن جنگ میں بڑے بزدل ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں ان کے کفر کا اعلان کر کے بر سر عام اور سب کے سامنے انہیں رسوا کر دیا۔۔۔ لاالٰہ الا اللہ۔

کتنے ہی اسلام کے مضبوط قلعوں کو ایسے لوگوں نے تباہ کیا ہے، اور کتنے ہی گھروں کو برباد کیا ہے۔ اور کتنے ہی شہروں کو اجاڑ دیا ہے۔ ان کی سزا جہنم کی آگ ہے اور وہ بہت بھیانک ٹھکانہ ہے۔

کپڑوں کی لمبائی، مسواک، داڑھی، بیٹھنے کے آداب اور اسی طرح کی دوسری باتوں سے دل لگی کے پیچھے دراصل رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کا مذاق اڑانے کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے اور عمداً ایسی چیزوں کا مذاق اڑانے والا کافر ہے۔

گیارھویں نشانی

اپنے تحفظ کی خاطر قسمیں کھانا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿ اِتَّخَذُوْا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً ﴾ (المنافقون : ۲)

"انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے"۔
یعنی قسمیں ان کی حفاظت کا کام کر رہی ہیں۔ جب تم نے کسی چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو سب سے آسان چیز اس کے ہاں قسم کھانا ہے' حالانکہ وہ جھوٹا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر وہ کسی کی غیبت کر چکا ہے تو جس کی غیبت کی اس کے سوال پر قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی' قسم بخدا تم نے مجھے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہو' خدا کی قسم تم تو میرے دوست ہو۔ جھوٹ پر جھوٹ بول رہا ہے اور قسم کو اپنے تحفظ کی خاطر استعمال کر رہا ہے۔
منافق کی پہچان یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ جھوٹی قسمیں کھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :
﴿فَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝﴾ (القلم : ۱۰)
"ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت زیادہ قسمیں کھانے والا بے وقعت آدمی ہے"۔
"حَلَّاف" سے مراد ہے بہت زیادہ قسمیں کھانے والا۔ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی مسلسل قسمیں کھانے والا۔ امام شافعی بیان کرتے ہیں: میں نے اللہ کے نام کی نہ کبھی سچی قسم کھائی ہے اور نہ کبھی جھوٹی۔ اللہ تعالیٰ امام شافعی کا مقام مزید بلند فرمائے' ورع و تقویٰ کے کتنے اونچے مقام پر فائز تھے۔ امام موصوف نے واحد و تنہا اللہ تعالیٰ کی عزت و تعظیم کی خاطر نہ کبھی سچی قسم کھائی ہے اور نہ جھوٹی'۔۔۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازے۔

بارھویں نشانی

اللہ کی راہ میں خرچ کے موقع پر
تنگ دلی کا مظاہرہ کرنا

وہ خرچ کرتا ہے' صدقہ دیتا ہے' راہ خدا میں دیتا ہے' بسا اوقات مسجد تک بنوا دیتا ہے یا کبھی چندہ دے دیتا ہے' لیکن محض ریا اور شہرت کے لئے اور انتہائی تنگ دلی کے ساتھ ۔۔۔ اس کے دل کی کیفیت کا تو اللہ ہی کو علم ہے۔ وہ یا تو شہرت اور لوگوں کے سامنے اپنے مال کی نمائش کے لئے خرچ کرتا ہے یا پھر لوگوں کے دکھلاوے اور انہیں اپنی ذات کی طرف متوجہ

کرنے کی خاطر ایسا کرتا ہے۔ وہ درحقیقت اللہ کو راضی کرنے کے لئے خرچ کرنا تو نہیں چاہتا لیکن مجبوراً خرچ کرتا ہے۔

ادھر سچے مسلمان کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو اس کا دل خوشی سے پھول جاتا ہے اور وہ پرسکون ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس بات پر شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے نیکی کے کام کی اسے توفیق بخشی یا یہ کہ کسی فقیر مسکین کی مدد کے قابل بنایا۔ وہ اس کمائی پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے---اور یہی مومن کی پہچان ہے۔

میرے بھائیو اور دوستو! انسان روپے پیسے کو خرچ کرتے وقت اپنے دل کا جائزہ لے لے کہ وہ اسے کس جذبے کے ساتھ خرچ کر رہا ہے۔ اگر دل میں ریا یا تنگی محسوس کرے تو اپنے مال کو خرچ نہ کرے تاکہ ایسا نہ ہو کہ دنیا میں مال سے محروم رہے اور آخرت میں حسرت و ندامت کا شکار ہو۔

تیرھویں نشانی

بزدلی پیدا کرنا

منافقوں کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی صفوں میں بزدلی اور کم ہمتی پیدا کرتے ہیں۔ ان کے ہاں بزدلی پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ مایوسی پھیلائیں گے، مثلاً یہ کہ "کافر مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں طاقتور ہیں، اسرائیل کے پاس بے شمار فوجی ساز و سامان ہے، جسے اللہ ہی جانتا ہے"۔ بطور تمسخر کہیں گے "کیا یہ تمام مسلمان مل کر بھی امریکہ کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ جس کے پاس ایٹمی اسلحہ ہے اور جوہری بم ہیں۔ ظاہر بات ہے امریکہ کا مقابلہ نہیں ہو سکتا، ہم مسلمان تو تباہ ہو چکے ہیں، ہلاکت میں ہیں، بہت ہی کمزور اور مسکین ہیں"۔ ایسی باتیں کرنا ان کی عادت بن چکی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جو منافق یورپ اور امریکہ کا چکر لگا کر آئیں، حالانکہ وہ ہماری اپنی ہی نسل سے ہیں، لیکن ان کے دماغ دھو دیئے جاتے ہیں اور وہ کافروں کی تصویر بن کر واپس آتے ہیں اور باہر سے مسلط ہونے والے استعمار کے ایجنٹ نظر آتے ہیں۔ ہمیشہ امریکہ کی عظمت کے قصے بیان کرتے ہیں، اس

کی طاقت، اس کے میزائل، اس کے ہوائی جہازوں کے تذکرے ان کی زبان پر ہوتے ہیں اور اس کے بالمقابل مسلمانوں کی کمزوری و رسوائی بیان کرتے ہیں، اس لئے کہ انہوں نے ذہنی طور پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ نسبت میں عزت کا مقام دیکھا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ﴾ (آل عمران : ۱۶۰)

"اگر اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں"۔

مزید فرمایا:

﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ (آل عمران . ۱۲۶)

"فتح و نصرت جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے ہے۔"

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَاۗءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ﴾ (العنکبوت : ۴۱)

"جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لئے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے، جو اپنا ایک گھر بناتی ہے، اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔"

لیکن اسے اس بات کی خبر ہی نہیں کہ عزت اللہ ہی کی طرف سے ملتی ہے۔ وہ ہمیشہ بزدلی کی باتیں ہی کرتا ہے۔ اگر تم اس کے سامنے افغان جہاد کا تذکرہ کرو تو اس کا جواب ہوگا کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ روس افغانیوں کی جان چھوڑ دے گا؟ وہ تو انہیں پیس کر رکھ دے گا، اس کا کیا مقابلہ؟ روس کے پاس اس قدر سامانِ جنگ ہے کہ اللہ ہی کو اس کی صحیح خبر ہے۔ اگر اس منافق کو پتہ چلے کہ کچھ نوجوان جہاد افغانستان کے لئے جا رہے ہیں تو وہ کہتا ہے میرے خیال میں انہیں نہیں جانا چاہئے، وہاں سے تو سخت جنگ کی خبریں آ رہی ہیں اور مجاہدین بری طرح کچلے جا رہے ہیں۔ اور اگر کسی کو وعظ و ارشاد کی محفل میں جاتے دیکھتا ہے تو اسے بھی روکنے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے: مجھے تو ان تقریروں میں کوئی فائدہ نظر

نہیں آتا، وہاں تو صرف "اِتَّقُوا اللّٰہ، اِتَّقُوا اللّٰہ" کی رٹ ہوتی ہے۔ کیا کوئی بات اِتَّقُوا اللّٰہ (اللہ سے ڈرو) سے بہتر، افضل، مفید اور عظیم ہو سکتی ہے؟ نہیں! قسم بخدا نہیں۔ اپنے ساتھیوں سے کہتا پھرتا ہے ایسی تقریروں میں نہ جاؤ، وہاں تو وہی گھسی پٹی باتیں ہوتی ہیں، بس اپنے گھر میں رہو اور جو باتیں کتابوں میں مل سکتی ہیں ان کے پیچھے وقت ضائع نہ کرو۔ یہ ساری کی ساری حرکتیں مسلمانوں کو بزدل بنانے کے قبیل میں شامل ہیں اور نفاق کی علامتوں میں سے یہ ایک علامت ہے۔ وَالعیاذ باللّٰہ من ذٰلک

چودھویں نشانی

اضطراب انگیز افواہیں پھیلانا

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :

﴿ لَئِنْ لَّمْ یَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَةِ ... ﴾ (الاحزاب: ٦٠)

"اگر منافقین، اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے اور جو مدینہ میں ہیجان انگیز افواہیں پھیلانے والے ہیں اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے..."

بزدلی پیدا کرنے والوں اور افواہ سازوں کے درمیان کئی قدریں مشترک ہیں، البتہ افواہ ساز واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں، اگر کوئی چھوٹی سی بات ہو جائے تو اسے کئی گنا بڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ بطور مثال اگر ایک مجاہد معرکے میں شہید ہو جائے تو افواہ ساز کہے گا کہ میں نے سنا ہے کہ سو مجاہد مارا گیا۔ اگر کسی عالم دین سے کسی چھوٹے سے مسئلے میں غلطی سرزد ہو جائے تو کہے گا: اللہ ہمیں اور اسے ہدایت دے، فلاں عالم نے کئی غلط مسئلے بیان کئے ہیں، یہ کیسا عالم ہے، اسے کسی چیز کا پتہ ہی نہیں۔ اگر کسی واعظ یا مقرر سے سبقتِ لسانی کی وجہ سے غلط لفظ ادا ہو جائے تو افواہ ساز محفلوں میں اسے بڑھا چڑھا کر پیش کرے گا کہ دوستو! سنا ہے کہ فلاں صاحب کیا کہہ رہے تھے؟ اور اس کے ساتھ ہی اس کی کردار کشی شروع کر دے گا، خواہ اس داعی اور مقرر میں بے شمار خوبیاں ہوں اور اس میں کئی عمدہ

خصلتیں ہوں' البتہ ایسی باتوں کا وہ لوگوں کے سامنے قطعاً تذکرہ نہیں کرے گا۔
امام شعبی کہتے ہیں: میں نے افواہ سازوں جیسا کم ظرف کسی کو نہیں پایا' اگر تم ننانوے درست اور ایک بات غلط کر لو تو ننانوے کو بھول جائیں گے اور ایک غلطی کو شمار کرنے بیٹھ جائیں گے۔ قسم بخدا! افواہ ساز لوگ دلوں کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔

پندرھویں نشانی

تقدیر پر اعتراض

اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے بارے میں فرمایا :

﴿اَلَّذِیْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِہِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا﴾

(آل عمران : ۱۶۸)

"یہ وہی لوگ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور ان کے جو بھائی بند لڑنے گئے اور مارے گئے ان کے متعلق انہوں نے کہہ دیا کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو نہ مارے جاتے"

جب مسلمان غزوۂ احد کے موقع پر نکلے تو منافقوں نے ان سے کہا کہ مت نکلو اور نہ جنگ میں شریک ہو' بلکہ ہمارے ساتھ بیٹھ رہو' تو اہل ایمان نے ان کی رائے کو ٹھکرا دیا' چنانچہ جنگ میں شریک ہوئے اور اللہ کی راہ میں شہادت پائی۔ اب منافق اپنی محفلوں میں بیٹھ کر بغلیں بجانے لگے اور کہنے لگے ہم نے انہیں مشورہ دیا تھا' انہیں نصیحت کی تھی' ان کی خیر خواہی کی تھی' لیکن انہوں نے ہماری ایک نہ سنی' اگر ہماری بات مان لیتے تو یوں نہ مارے جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان منافقوں کے جواب میں فرمایا :

﴿قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِکُمُ الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۝﴾

(آل عمران : ۱۶۸)

"ان سے کہو اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو تو خود تمہاری موت جب آئے اسے ٹال کر دکھا دینا"۔

قسم بخدا یہ تو سفید جھوٹ ہے' یہ تو گدھوں کی طرح مریں گے۔ شاعر نے کیا خوب کہا

ہے؛ مال یا اونٹ' بکری کا مرجانا کوئی بڑی مصیبت نہیں۔ اصل مصیبت تو سردار کا مرنا ہے جس کی موت سے بہت سے لوگ مرجاتے ہیں۔ منافق کہتے ہیں جو کوئی مرغیوں کے ڈربے میں مرجائے یا اللہ کی راہ میں تہہ تیغ ہو جائے دونوں برابر ہیں کیونکہ یہ بھی مرگیا وہ بھی مرگیا۔

جو آدمی شراب خانے میں مرجاتا ہے وہ بھی اللہ کی راہ میں مرنے والے کی طرح دنیا چھوڑ جاتا ہے' لیکن اصل فرق یہ ہے کہ پہلا جہنم میں اور دوسرا جنت میں' خواہ دونوں صورتوں میں مرنے کا مزہ یکساں ہی ہو۔ اسی بات کو شاعر اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے: بظاہر معمولی کام کی خاطر موت کا مزہ عظیم کام کی خاطر موت کے مزے جیسا ہی ہے۔ قضاء و قدر پر اعتراض کرنا نفاق کی نشانیوں میں سے ہے۔ اور مؤمن کی یہ شان ہے کہ تقدیر کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا﴾ (الحدید : ۲۲)

"کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب (نوشتۂ تقدیر) میں لکھ نہ رکھا ہو"۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ○ وَمَا اَمْرُنَا اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ○﴾ (القمر : ۴۹۔۵۰)

"ہم نے ہر چیز ایک تقدیر کے ساتھ پیدا کی ہے اور ہمارا حکم بس ایک ہی حکم ہوتا ہے۔ اور پلک جھپکاتے وہ عمل میں آجاتا ہے"۔

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۗ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ○ الَّذِیْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ○﴾

(البقرہ : ۱۵۵۔۱۵۶)

"اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر' فاقہ کشی' جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے

کھانے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو صبر کریں اور جب کوئی مصیبت آپڑے تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ تو انہیں (اے نبیؐ) آپ بشارت دے دیجئے"۔

منافق اعتراض کرتا رہتا ہے اور اللہ کی تقدیر پر راضی نہیں ہوتا۔ اگر وہ کسی مصیبت کا شکار ہو جائے تو کہتا ہے یہ کہاں سے آگئی؟ اگر میں یوں کر لیتا تو یوں ہو جاتا۔ اور لوگوں کو ملامت کرنے لگتا ہے، تقدیر اور قضاءِ الٰہی کا انکار کرتا ہے۔ جبکہ مومن کا حال یہ ہے کہ وہ کہتا ہے میں تو اللہ پر ایمان لایا اور اپنے تمام معاملات اس کے سپرد کر دیئے۔ اور وہ جانتا ہے کہ ہر کام اللہ کی قضاء و قدر کے تحت ہوتا ہے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

((عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَهٗ كُلَّهٗ خَيْرٌ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّاءُ فَشَكَرَ كَانَ خَيْرًا لَّهٗ وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ فَصَبَرَ كَانَ خَيْرًا لَّهٗ وَلَيْسَ ذٰلِكَ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ)) {۱}

"مومن کا معاملہ خوب ہے، اس کا ہر حال ہی بہتر ہوتا ہے، اگر خوشی نصیب ہو تو شکر گزار ہوتا ہے تو یہ اس کے لئے بہتر اور اگر تکلیف پہنچے تو صبر کرتا ہے تو اس کے لئے بہتر، اور یہ مقام مومن کے سوا کسی کو نصیب نہیں۔"

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: "اللہ کی قسم مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں غریبی میں وقت گزاروں یا امیری میں"۔ سبحان اللہ! اللہ کے دوست قضاء و قدر پر کس قدر راضی رہتے ہیں۔ اور ادھر منافق قضاء و قدر پر راضی ہونے کی لذت سے یکسر محروم ہیں۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے انہیں یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑے گا اور پھر ندامت و شرم میں ڈوبے ہوئے اللہ کے ہاں پیش ہوں گے۔ معروف عربی شاعر ابو تمام اپنے ایک دوست سے تعزیت کرتے ہوئے کہتا ہے:

"یا تو تم مصیبت پر امیدِ ثواب کے ساتھ صبر کر لو تو اجر پا لو گے یا پھر حیوانوں کی طرح بالآخر خاموشی اختیار کر لو گے"۔

{۱} صحیح مسلم، کتاب الزہد والرقاق، باب المومن امرہ کلہ خیر و مسند امام احمد، ج ۶، ص ۱۶۔

پاکستانی حوّازادیوں کے نام

—— نکہت حامد ' الریاض ——

آج کل پاکستان ٹیلیویژن بہت زور و شور سے کبھی "حوا کے نام" اور کبھی کسی اور نام سے خواتین کی آزادی اور خود مختاری کے راگ الاپتا رہتا ہے۔ بڑی علمی قسم کی گفتگو ہے مگر ہم جیسے سیدھے سادے مسلمان جو قرآن اور دین کا علم رکھتے ہیں اور مغربی دنیا کی سیر بھی کر چکے ہیں صرف سر دُھن کر رہ جاتے ہیں۔

آج کل پاکستان میں بھی ڈش عام چیز ہے اور خصوصاً کراچی شہر میں تو یہ بہت عام ہے۔ لوگ دنیا بھر کے ٹیلیویژن پروگرام دیکھ رہے ہیں۔ Star Plus پر اکثر Talk Shows میں خواتین خصوصاً امریکی خواتین اب خود پر عائد کردہ اضافی ذمہ داریوں سے پریشان ہیں۔ پھر غیر محفوظ زندگی ' ٹوٹے ہوئے خاندان ' ان کے نتیجے میں نفسیاتی مسائل سے دوچار بچے اور پھر میڈیا نے بوسنیا کی خواتین کی جو تصویر دکھائی۔۔۔ وہ بھی یورپ کی ترقی یافتہ خواتین تھیں۔ انکی کہانیاں اور امریکہ میں آج کے مقبول ترین کھیل "Bold and Beautiful" میں عورت جس طرح کام کر رہی ہے گویا کہ کھلونا بنی ہوئی ہے۔ ترقی اور آزادی کے نام پر جو کچھ ان سب میں نظر آ رہا ہے کیا یہ سب مسلمان اور پاکستان خواتین کی عبرت پذیری کے لئے کافی نہیں ہے؟ میں سمجھتی ہوں کہ غیور مسلمان مرد اور خواتین کے لئے یہ بہت کافی ہے مگر افسوس کہ ع حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے۔ اب یہ غیرت و حمیت نام کی شے کہاں سے خریدی جائے؟

قرآن کی رو سے دنیا کا نظام چلانے کے لئے اور عورت کو ایک آرام دہ اور پاکیزہ ماحول دینے کے لئے باپ ' بھائی اور شوہر کو حاکم بنایا گیا۔ مگر جب عورت غیر قوم کی تقلید میں نکل جاتی ہے تو ایک مرد کی حاکیت کی جگہ ہزاروں مَردوں کی حاکیت کے زیر اثر آ جاتی ہے۔ دفتروں اور بازاروں میں نہ صرف حاکیت بلکہ اسے للچائی ہوئی نظروں اور Dirty behaviours کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے عوض اسے سستی تعریف اور

گھٹیا شہرت کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ عورت وزیر اعظم ہو یا ملازمہ اس کے بارے میں جس قسم کے ریمارکس پاس کئے جاتے ہیں اور اس کے کردار کا جس طرح پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے اس کا اگر اسے علم ہو جائے تو کبھی گھر سے باہر نہ نکلے۔

بی بی سی سے گزشتہ دنوں بے گھر اور بھوکے انگریز بچوں پر فلم دکھائی گئی جو نتیجہ تھے ٹوٹے ہوئے خاندان کا۔ کبھی نفسیاتی مریض بچوں کا انٹرویو سٹار پلس پر آتا ہے۔ کیا پاکستانی مائیں اپنے بچوں کا یہ حال بنانے پر تیار ہیں؟ چند دن قبل شخصی آزادی کے نام پر ہمدردی کے ساتھ لیڈی ڈیانا کا بی بی سی پر انٹرویو دکھایا گیا اور ہر ذاتی بات کو ٹی وی پر زیر بحث لایا گیا۔ اس کے کردار پر بہت کچھ کہا گیا۔ آخر کار بادشاہت کا امیج خراب کرنے کے الزام میں طلاق کا حکم ہو گیا، جبکہ کردار کے اسی معیار کے حامل شہزادے صاحب باعزت گھوم رہے ہیں۔ پاکستانی خواتین اگر اتنی ہی پُرعزم ہیں تو دلائیں شہزادی صاحبہ کا حق۔ کیا پاکستانی قوم کے لئے یہ آئینے کافی نہیں ہیں؟ مگر پاکستان میں ایک خطرناک قوم ہے "چمچہ قوم" جو بہت مضبوط قوت بن گئی ہے۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ اس "چمچہ قوم" کو خاص قسم کی چوڑیاں پہنائی جائیں۔

پاکستان کی عورت مرد کی برابری کے لئے ٹی وی پر شور مچا رہی ہے۔ بیوقوف کو یہ نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ماں بنا کر مرد پر برتری دی ہے۔ اور یہ جو ننھے ننھے خوبصورت بچے انہیں قوم کا روشن مستقبل بنا کر اس کے حوالے کرتی ہے اور قدموں تلے جنت الگ۔ پھر باپ سے تین گنا زیادہ دیکھ بھال کی تنبیہ، مگر چراغ تلے اندھیرا۔ کبھی قرآن ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ پڑھا ہو یا اپنی تاریخ پڑھی ہو تو اسے معلوم ہو کہ وہ کیا مانگ رہی ہے۔

دنیا میں کوئی مصوّر یا مجسمہ ساز اللہ کی کسی تخلیق کی نقل کر کے مشہور ہو جاتا ہے، بے جان تصویروں کے ذریعے۔ عورت کے پاس کورے کاغذ کی طرح چھوٹے بچے جیتے جاگتے موجود ہیں، وہ اللہ کی اس نعمت کو تراش خراش کر انہیں خوبصورت رنگ دے کر شاندار کردار اور شخصیتیں بنا سکتی ہے۔ ہماری ماؤں نے جو کچھ ہمیں دیا وہ ہم اپنے بچوں کو نہیں دے سکے۔ اِس وقت زوال پذیری کی تربیت دی جا رہی ہے۔ کلاشنکوف بردار نسل پیدا کرنے میں ہماری طرح مادہ پرست ماؤں کا بڑا ہاتھ ہے، کیونکہ ہمیں یہ علم ہی نہیں ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے اولاد کی تربیت کے بارے میں بھی ہم سے پرسش کرنی ہے۔ آج کل لڑکیاں BBA' MBA اور CA سب کچھ کر رہی ہیں۔ معاشی ترقی میں وہ اس طرح ضرور آگے نکل سکتی ہیں' مگر بحیثیتِ عورت ان پر جو ذمہ داریاں ہیں انہیں کتنے مرد share کرتے ہیں؟ آج کل غیر ممالک میں نوجوان نسل میں طلاق کا رجحان بے انتہا بڑھ رہا ہے۔ کیا ہماری خواتین پاکستان کو بھی ادھورے خاندان' نفسیاتی مریض بچے اور بزرگوں کے لئے Old Homes دینا چاہتی ہیں؟ سٹار ٹی وی کے ذریعے پورا مغربی معاشرہ ہمارے سامنے ہے۔ پاکستانی خواتین اپنا مستقبل اس آئینے میں دیکھ لیں اور "حوا کے نام" اور ان جیسے بہت سے پروگراموں میں خواتین کو ان کا انجام بھی بتاتے جائیں۔

جہاں عورت مظلوم ہے ضرور ظالم کا ہاتھ پکڑیں۔ جہیز کی سب سے بڑی لعنت سے اسے چھٹکارا دلائیں جس نے والدین کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ اور صرف جہیز ہی کیا اس جیسی ہزاروں لعنتیں ہیں جن کا ختم کیا جانا ضروری ہے۔ پاکستان ٹیلیویژن جو زہر پھیلا رہا ہے اس کی کاٹ کے لئے اسلامی تحریکیں سٹار ٹی وی پر تبلیغی مقاصد کے لئے چینل خریدیں۔ ہم سب باہر رہنے والے اس کے لئے خود بھی ایک ایک ماہ کی تنخواہ اور عطیات جمع کرنے کے لئے تیار ہیں۔ جس تیزی کے ساتھ شیطنیت پھیل رہی ہے اسی تیزی سے اس کا دفاع بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

گھریلو معاشرہ اور عورت

مظہر علی ادیب' ایم اے

"عورت کو گھر کی چار دیواری میں مقید کر کے معاشرۂ انسانی ترقی نہیں کر سکتا"۔ "اب وقت آ گیا ہے کہ عورت ملک و ملت کی خدمت کے لئے مردوں کے شانہ بشانہ عملی جدوجہد میں حصہ لے"۔ "عورت اور مرد گاڑی کے دو پہیے ہیں' ایک پہیے کو ناکارہ کر کے' گاڑی نہیں سکتی"۔ "خاتونِ خانہ سوسائٹی کا عضوِ معطل ہے"۔

یہ چند ایسے جملے ہیں جو آج کل نہایت اہتمام اور کثرت کے ساتھ اخبارات و رسائل

کی زینت بنتے ہیں۔ یہ تمام جملے اور ان کا سارا بنیادی فلسفہ قطعی طور پر متعلقہ افراد کی حد سے بڑھی ہوئی مغرب پسندی' شعائرِ اسلام سے عدم واقفیت اور حقیقت سے جان بوجھ کر چشم پوشی یا پھر اس مسئلہ پر ہمہ گیر انداز میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کے فقدان کا نتیجہ ہے یا پھر جان بوجھ کر عیاشی کی فضا بنانے کا کوئی منصوبہ' ورنہ یہ ایک واضح اور یقینی حقیقت ہے کہ ایک گھریلو اور سگھڑ عورت بیرون خانہ سرگرمیوں میں حصہ لینے والی خاتون کے مقابلہ میں کہیں زیادہ معاشرہ کا فعال' سرگرم اور مفید رکن ہے اور "زندگی کی گاڑی" کا نسبتاً زیادہ مفید اور مصروفِ عمل "پہیتہ" ہے۔

معاشرہ افراد سے عبارت ہے۔ معاشرہ کی فلاح و کامرانی اور اچھائی برائی افرد کے اچھے اور برے ہونے پر منحصر ہے۔ اعلیٰ سیرت اور کردار کے حامل افراد معاشرے کی ترقی کا سبب بنتے ہیں' جبکہ ان ہی خصوصیات سے عاری افراد معاشرہ کے زوال کی وجہ بنتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر شریف النفس' غیرت مند' صلح کوش' انسان دوست' خدا پرست اور ہمدرد و غمگسار افرادِ انسانی ہی معاشرہ کو جنت کا گہوارہ بناتے ہیں اور اس کے برعکس شریر طبیعت' شرپسند' بے غیرت' جھگڑالو' انسان دشمن' دین فروش اور ظالم و بے مروت قسم کے لوگ انسانی معاشرہ کو جہنم کے گہرے غار میں دھکیل دیتے ہیں۔ انسانی سیرت و کردار کی اس عظیم اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے ذرا اس خاتون خانہ کا تصور کیجئے جو گھر کو اپنی مصروفیات کا محور بنائے ہوئے دن رات معاشرہ کی فلاح و بہبود کی خاطر اعلیٰ سیرت و کردار کے افراد مہیا کرنے کی کوشش میں منہمک رہتی ہے' بچوں کو پوری پوری مامتا دے کر اور ان کی نوع بہ نوع جسمانی اور ذہنی ضروریات کی تکمیل کر کے ان کی آئندہ شخصیت کی صحت مند بنیاد رکھتی' زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتی اور اپنی ذاتی مثال کے ذریعے نونہالوں میں صبر و تحمل' ایثار و قربانی' خلوص و محبت اور دوسروں کے لئے جینے کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ کیا ایسی عورت کو ملک و ملت کی ترقی میں عملی طور پر شریک نہ سمجھنا کھلی ہوئی احسان فراموشی نہیں ہے؟

سیاسی اور اجتماعی نظام میں خاندان ایک بنیادی یونٹ اور مرکزی نقطے کی حیثیت رکھتا ہے۔ خاندان ہی سے معاشرہ اور معاشرہ سے ریاست وجود میں آتی ہے۔ خاندان کی

مضبوطی اور استحکام سے معاشرہ اور ریاست کو قوت ملتی ہے۔ اگر خاندان کا شیرازہ بکھر جائے یا اس کی مضبوطی و استحکام میں کمزوری آ جائے تو ناگزیر طور پر معاشرہ کی بھی بنیادیں ہل جائیں گی اور ریاست کا نظام بھی درہم برہم ہو جائے گا۔ خاندان کی اس بنیادی اور عظیم اہمیت کے پیش نظر انسانی معاشرت میں "خاندان" کی مضبوطی کی طرف سب سے زیادہ توجہ دی جاتی ہے اور اس کے استحکام کا حد درجہ خیال رکھا جاتا ہے۔ اور یہاں یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ خاندان کی ساری شیرازہ بندی، اس کا سارا استحکام اور اس کی حقیقی مضبوطی عورت ہی کے دم قدم سے قائم اور دائم ہے، اور ظاہر ہے عورت بھی وہ جو خاندان کے مرکز یعنی گھر کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے مصروف عمل رہتی ہے، اس لئے کہ ایک ملازم پیشہ یا فکر معاش میں پوری طرح گھری ہوئی خاتون اپنا سارا قیمتی وقت اور اپنی حقیقی توجہ دفتر کی نذر کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ دفتر کی فائلوں کے اوراق پلٹنے والی ایک خاتون، ہوٹلوں اور ہوائی سروسوں میں مہمان نوازی کے فرائض ادا کرنے والی عورت یا دکانوں پر گاہکوں کو مال پیش کرنے والی سیل گرل کا خاندان کی شیرازہ بندی اور اس کی مضبوطی اور استحکام سے کیا واسطہ؟

ان بنیادی حقائق کو پیش نظر رکھ کر سوچئے، کیا ایسی صورت میں گھریلو عورت کو معاشرہ کا "بیکار حصہ" قرار دینا سراسر زیادتی نہیں ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسی خاتون خانہ کے بغیر اچھے خاندان اور معاشرہ کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

تازہ ہوا اور صاف ستھرے پانی کے علاوہ صحیح متوازن اور صالح خوراک انسانی صحت کے لئے ضروری ہے۔ اب یہ ایک عام مشاہدہ کی بات ہے کہ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں جو خوراک تیار کی جاتی ہے وہ عموماً ناقص اور غیر معیاری ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو حضرات اور خواتین گھر کی بجائے نعمت کدوں کے پکے ہوئے کھانے کھاتے ہیں نسبتاً زیادہ مریض دکھائی دیتے ہیں اور مختلف قسم کی بیماریاں بھی انہیں بہت جلد گھیر لیتی ہیں۔ ماہرین طب کا کہنا ہے کہ خوراک جلد ہضم ہونے اور اس کے جزو بدن بننے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنی روزمرہ کی خوراک کو پورے سکون اور اطمینان کی فضا اور صحت مند ماحول میں کھائے۔ ماہرینِ نفسیات بھی اس امر کی یوں کہہ کر توثیق کرتے ہیں کہ فکر، غم، غصہ،

مایوسی' جھنجلاہٹ' دوسری ذہنی پریشانیاں انسان کے عمل ہضم پر بہت برا اثر ڈالتی ہیں اور فرحت و انبساط کے جذبات' بے فکری' آسودہ خاطری اور قلبی آرام و سکون اچھا اثر ڈالتے ہیں۔ ہوٹل جہاں سب اجنبی ہوتے ہیں اور کسی کو کسی سے کوئی خونی لگاؤ یا قربت و یگانگت نہیں ہوتی ہرگز اس قسم کی ضروری فضا مہیا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ایک خانہ دار خاتون البتہ ضرور کھانا بھی حتی الوسع صفائی اور پاکیزگی کے ساتھ تیار کرے گی اور اپنے شوہر اور والدین یا بچوں وغیرہ کو حقیقی محبت' الفت اور دل بستگی کے نیک جذبات کے ساتھ پیش کرے گی۔ وہ اپنی ماتا' وفاداری' اطاعت گزاری اور فطری احساسات کے اظہار کے ذریعے گھر کی ساری فضا کو ماحول کے مطابق سازگار بنا دے گی۔ اور اس طرح طب اور نفسیات کے مذکورہ تقاضے بھی پورے ہو جاتے ہیں۔ الغرض ایک خانہ دار خاتون انسانی صحت کی برقراری اور عام جسمانی نشوونما کے سلسلے میں بہت اہم رول ادا کرتی ہے۔ اسے معاشرہ کا ایک "غیر فعال رکن" قرار دینا صریح زیادتی ہے۔

جدید طبی تحقیق کے مطابق اگر کوئی شیر خوار بچہ بیمار پڑ جائے تو اس کی والدہ کو اس کے پاس ہی رہنا چاہئے' یہاں تک کہ اگر بچہ کسی شفاخانہ میں داخل ہو تو اس صورت میں بھی اس کی والدہ کو اس کے ساتھ ہی رہنا ضروری ہے۔ تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ بچے جو اپنی بیماری کی حالت میں اپنی ماؤں کی آغوش میں رہتے ہیں بہت جلد صحت یاب ہو جاتے ہیں اور جو بچے ماں سے دور رہ کر اپنا علاج معالجہ کراتے ہیں زیادہ دیر میں صحت یاب ہوتے ہیں۔ اور بسا اوقات تو ان کی صحت یابی کا سارا عمل ہی مخدوش ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ ایک گھریلو عورت معاشرہ کے ان ننھے منے افراد کی بیماری کی صورت میں ان کے عمل صحت یابی میں زبردست طور پر معاون ثابت ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک گھریلو عورت باپ' بھائی' شوہر یا دوسرے اعزہ و اقارب کی تیمارداری کر کے ان کے عملِ صحت یابی کی رفتار کو تیز کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک ملازم پیشہ خاتون اپنی غیر موجودگی میں خاندان کے ان افراد کی تیمارداری اور دوسری دیکھ بھال کے لئے کسی خادم یا خادمہ کا انتظام بھی کر سکتی ہے۔ مگر اس بات کو ایک معمولی سمجھ بوجھ والا شخص بھی تسلیم کرے گا کہ یہ خدام اپنے دل میں ایک

بہن، بہو، بیٹی، یا بیوی اور ماں کے سے جذبات اور احساسات کسی صورت پیدا نہیں کر سکتے، لہٰذا ان کی تیمارداری بے روح اور ان کی دیکھ بھال بے جان اور محض رسمی ہوگی اور اس طرح مریض نفسیاتی طور پر ان سے کوئی آرام و سکون حاصل نہ کر سکے گا۔ گھر کی چوکھٹ کے اندر رہ کر کام کرنے والی سگھڑ عورت معاشرہ کے ان افراد کی بحالیٔ صحت کے سلسلہ میں نمایاں اور قابلِ قدر کردار ادا کرتی ہے اور ہم اسے کسی طور پر بھی معاشرہ کا ایک ناکارہ حصہ نہیں گردان سکتے۔

کسب رزق شاید انسانی زندگی کا سب سے زیادہ تھکا دینے والا کام ہے۔ غالباً انسان کے بچپن کا زمانہ صرف اسی وجہ سے قابل رشک اور حد درجہ پسندیدہ سمجھا جاتا ہے اور بار بار یاد کیا جاتا ہے کہ انسان اس منزل میں فکر معاش کے چکر سے آزاد ہوتا ہے۔ مرد جب سات آٹھ گھنٹے کی مسلسل جسمانی یا ذہنی کاوش کے بعد اپنے معاشی کام کاج سے فارغ ہو کر واپس گھر لوٹتا ہے تو فطری طور پر کسی محبت کرنے والی ہستی کے انتظار، اس کی مسکراہٹ اور "خوش آمدید" کا خواہاں ہوتا ہے اور یقیناً یہی وہ جذبات اور احساسات ہوتے ہیں جو اس کی ساری معاشی جدوجہد سے پیدا ہونے والی تھکاوٹ، گرانی اور اضمحلال کو فرحت اور انبساط اور تازگی میں بدل دیتے ہیں۔ یہ بیٹی، بہن اور بیوی کی خندہ روئی، دلجوئی اور پاکیزہ محبت کا اظہار ہی ہوتا ہے جو کمانے والے باپ، بھائی اور شوہر کا ذہنی بوجھ ہلکا کر دیتے ہیں اور یہ افراد تازہ دم ہو کر اگلے روز صبح پھر اپنے اپنے کاموں پر چلے جاتے ہیں۔ یورپی ممالک میں خاندان کا شیرازہ بکھر جانے کے سبب اور عورت کی بیرون خانہ مصروفیات کی وجہ سے مرد اور عورت دونوں مختلف قسم کی شدید نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہیں۔ دردِ سر، دماغی ہیجان، اعصابی کوفت اور تھکاوٹ کا مسلسل احساس اور بے خوابی وغیرہ وہاں کے عام نفسیاتی امراض ہیں۔ اس کے برخلاف انصاف اور حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھئے تو ایک پابندِ خانہ خاتون معاشرہ کو ان تمام امراض سے پاک و صاف رکھنے میں ایک نہایت ہی اہم اور قابلِ قدر خدمت سرانجام دیتی ہے۔

معاشرۂ انسانی میں آج جتنی بھی جنسی بے راہ روی اور صنفی انتشار پایا جاتا ہے اس کی اصل وجہ مرد و زن کا آزادانہ میل ملاپ ہے۔ آپ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو جس قدر

ایک دوسرے کے قریب آنے کے مواقع فراہم کریں گے، فحاشی اور بد اخلاقی کا سیلاب اسی قدر تیزی اور شدت کے ساتھ بہتا چلا جائے گا۔ معاشرہ کی پردہ دار اور خانہ دار خاتون گھر کی چار دیواری کے اندر مصروف کار رہ کر اور اس طرح مرد و زن کے آزادانہ میل جول کے امکانات کو کم سے کم کر کے اپنے معاشرہ کو پاک و صاف رکھنے کی قدرتی خدمت انجام دیتی ہے۔ وہ اپنی ستر پوشی، حیا اور شرم کے باعث سوسائٹی میں عصمت، عفت اور نسوانی وقار کی قدر و قیمت باقی رکھتی ہے۔ مردوں کی نظروں کی پاکیزگی اور ان کے دلوں کی طہارت انہی خانہ دار خواتین کی مرہونِ منت ہے، ورنہ بے پردہ اور مخلوط دفاتر میں کام کاج کرنے والی خواتین تو ہمیشہ مردوں کو دعوتِ نظارہ پیش کرتی ہیں اور انہیں نوع بہ نوع گناہوں میں ملوث کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ گویا ایک خانہ دار عورت بیرون خانہ سماجی مصروفیات سے دور رہ کر اور غیر نمائشی ٹھوس جدوجہد میں مصروف رہ کر معاشرہ کو جنسی بے راہ روی اور دوسری قسم کی اخلاقی گراوٹوں سے پاک و صاف رکھتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں ایسی عورت معاشرہ کے لئے رحمت کا فرشتہ ہے اور معاشرہ اس پر جس قدر بھی فخر کرے، کم ہے۔ اس فرشتۂ رحمت کو عضوِ معطل قرار دینا اپنے فکری دیوالیہ پن کا ثبوت دینا ہے۔

جیسے ہم کسی شخص کے جسم کے ایک حصے کی "ترقی" (صحت مندی) کو اس کی "جسمانی ترقی" قرار نہیں دے سکتے ٹھیک اسی طرح معاشرۂ انسانی کی ترقی اس وقت تک صحیح معنوں میں "ترقی" کہلانے کی مستحق نہیں ہے جب تک کہ اس کے تمام گوشے مجموعی طور پر ترقی نہ کریں۔ گھر، جیسا کہ گزشتہ صفحات میں میں نے ثابت کیا ہے، معاشرہ کا اہم ترین شعبہ ہے۔ اس شعبے کی ترقی اتنی ہی ضروری اور ناگزیر ہے جتنی کہ معاشرہ کے کسی دوسرے شعبے کی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اس شعبہ کی ترقی معاشرہ کے باقی تمام شعبوں کی مجموعی ترقی پر حاوی ہے اور اپنی پوری طاقت و گیرائی کے ساتھ ان پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اب کون نہیں جانتا کہ معاشرہ کے اس شعبہ کی انچارج، منتظم یا نگران صرف ایک گھریلو یا پابندِ خانہ عورت ہی ہوتی ہے اور ہو سکتی ہے۔ یہی وہ عورت ہے جو معاشرہ کی مجموعی ترقی کا باعث بنتی ہے اور اس گوشے کا حسن و نکھار باقی تمام دوسرے گوشوں کو حسن اور نکھار بخشتا ہے۔ معاشرہ میں اس خاتون کی کسی مشین کے ایک ایسے پرزے کی سی اہمیت ہے جس کے علیحدہ

ہو جانے یا جگہ سے بے جگہ ہو جانے سے ساری مشین ہی بے کار اور ناکارہ بن کر رہ جاتی ہے۔

ایک خانہ دار خاتون جو ہماری آئندہ نسلوں کی پرورش و نگہداشت اور ان کی بنیادی تعلیم و تربیت کے اسباب فراہم کرتی ہے' خاندان کی شیرازہ بندی کرتی ہے اور اس طرح ریاست کے استحکام کا سبب بنتی ہے' افرادِ معاشرہ کی صحت و تندرستی قائم رکھنے میں اعانت کرتی ہے' بحالیٔ صحت کی رفتار کو تیز تر کرتی ہے' انہیں قلبی سکون اور ذہنی چین بخشتی ہے' اپنی ستر پوشی اور حیا و شرم کے ذریعے اور اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کر کے معاشرہ کو اخلاقی گندگی سے پاک رکھتی ہے۔ اور معاشرہ کو اپنی مجموعی اور حقیقی ترقی کی جانب گامزن رکھتی ہے۔ سماج کے ایسے مؤثر' فعال اور بنیادی عنصر کو معاشرہ کا "عضوِ معطل" قرار دینا دنیا کی سب سے بڑی احسان فراموشی' عاقبت نااندیشی اور افسوسناک حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ ○○

بقیہ : عرض احوال

انتخابات کا انعقاد نظریہ پاکستان کی نفی نہیں؟ کیا کسی نظریاتی ریاست میں اس نظریہ کے منکر افراد کو دوہرا ووٹ استعمال کرنے کا حق دینے کی تاریخ میں کوئی اور مثال بھی ملتی ہے؟ یقیناً نہیں۔

اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم یہ جانتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے اقلیت کے حقوق کی کس طرح نگہداشت کی ہے۔ اقلیتوں کی جان مال اور عزت و آبرو کی حفاظت اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ تاریخ میں صرف اور صرف ایک مسلمان جرنیل نے یہ مثال قائم کی تھی کہ جب اسے اپنی فوج مرکز کے حکم کے تحت ایک ایسے علاقے سے نکالنی پڑی تھی جہاں کے غیر مسلموں سے جزیہ وصول کیا جا چکا تھا تو اس نے غیر مسلموں کو اکٹھا کر کے ان کا جزیہ واپس کر دیا تھا کہ اب ہم کیونکہ آپ کی حفاظت نہیں کر سکتے لہٰذا ہم آپ کو وہ رقم واپس کر رہے ہیں جو آپ کی حفاظت کی خاطر وصول کی گئی تھی۔

اقلیت کے حقوق کی حفاظت اکثریت پر فرض ہے لیکن انہیں اکثریت پر مسلط کر دینا ظلم ہے اور اسلام نام ہے عدل کا' ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا۔ لہٰذا تنظیم اسلامی

حکومت پاکستان سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وفاقی کابینہ کے اس فیصلے کو کہ "پاکستان میں آئندہ مخلوط طرز انتخاب رائج ہو گا" فوری طور پر واپس لے کیونکہ یہ طرز انتخاب پاکستان کے جوازہی کو متنازع بنا دیتا ہے اور نظریہ پاکستان پر کاری ضرب لگاتا ہے۔

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد عرصہ ہوا یہ تجویز پیش کر چکے ہیں کہ اقلیتوں کی الگ اسمبلی بھی وجود میں آجائے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں جس کے ذریعے وہ اپنے حقوق کے لئے آواز اٹھاتے رہیں لیکن اسلامی جمہوریہ پاکستان کی قانون ساز اسمبلی صرف مسلمانوں پر مشتمل ہونی چاہئے جو شریعت محمدی (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) کے دائرے کے اندر قانون سازی کرے تاکہ پاکستان صحیح معنوں میں ایک آزاد اسلامی ریاست کی حیثیت اختیار کر سکے"۔

☆ ☆ ☆

امیر تنظیم اسلامی، بحمد اللہ سفر امریکہ سے واپس تشریف لا چکے ہیں۔ ماہ رمضان المبارک کے دوران نیویارک میں انگریزی زبان میں دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام کے علاوہ بعد ازاں اپنے گھٹنوں کا آپریشن کرانا بھی اس سفر میں ان کے پیش نظر تھا، لیکن بعض احباب کے مشورے سے اور پاکستان میں اپنی بعض ضروری تنظیمی و انتظامی مصروفیات کے باعث سردست آپریشن کا خیال انہوں نے چھوڑ دیا اور اپنے دورے کو مختصر کرتے ہوئے ماہ رمضان کے فوراً بعد واپسی کا سفر اختیار فرمایا۔

راقم اس سفر میں امیر محترم کے ہمرکاب تھا۔ اللہ کے فضل و کرم سے اس ماہ مبارک میں ۱۵ پاروں کی حد تک دورۂ ترجمہ قرآن کی بزبان انگریزی تکمیل ہو گئی ہے اور ساتھ ہی اس کی آڈیو ویڈیو ریکارڈنگ بھی عمدہ طریقے پر کر لی گئی ہے۔ دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام کے ساتھ وہاں نماز تراویح میں قرآن سنانے کی سعادت راقم کے حصے میں آئی۔ گزشتہ سال کے تجربے کی بنا پر اس بار آغاز ہی سے پلاننگ ۱۵ پاروں کے لئے ہی تھی۔ اللہ کی تائید و توفیق سے یہ ارادہ بحسن و خوبی پورا ہوا۔ اگر اللہ نے چاہا تو اس دورے کی قدرے تفصیلی رپورٹ آئندہ شمارے میں ہدیہ قارئین کر دی جائے گی۔ OO
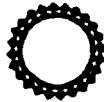
قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد: ۴۵
شمارہ: ۴
ذوالقعدہ ۱۴۱۶ھ
اپریل ۱۹۹۶ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زرتعاون ۱۰۰/-

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر	10 امریکی ڈالر
سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات، قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان	17 امریکی ڈالر
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ	22 امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارہ تحریر
شیخ جمیل الرحمن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مقام اشاعت: 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔فون: 03-02-5869501
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110
پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرض احوال

زیر نظر شمارہ اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی دو ایسی تحریریں شامل ہیں جنہیں انہوں نے بطور خاص "میثاق" کے لئے ہی مدون و مرتب کیا ہے۔ "میثاق" میں امیر تنظیم کے خیالات و افکار بالعموم ان کے خطبات جمعہ کے حوالے سے قارئین کے سامنے آتے ہیں' براہ راست تحریر کی اشاعت کی نوبت کم ہی آتی ہے۔ گو امیر محترم کے خطابات و تقاریر کو ٹیپ سے اتارنا اور پھر اسے مرتب کر کے شائع کرنا بھی فائدے سے خالی نہیں ہے اور اس سے اصل ضرورت ایک حد تک پوری ہو جاتی ہے' تاہم اسے کسی طرح بھی "تحریر" کا نعم البدل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ایک طویل عرصے بعد' زیر نظر شمارے میں اس امر کی تلافی کا کسی قدر سامان ہو گیا ہے۔

امیر تنظیم نے متعدد بار احباب و رفقاء کے سامنے اس حقیقت کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا عقدۂ لسانی تو خوب کھولا ہے لیکن ان کے قلم پر گرہ موجود ہے۔ چنانچہ کسی موضوع پر قلم اٹھانا اور کوئی مضمون تحریر کرنا' یہاں تک کہ کسی کو خط لکھنا بھی ان کے لئے کوہ گراں سے کم نہیں ہوتا جبکہ دروس و خطاب کی ذمہ داری نبھانا اس کے مقابلے میں انہیں بہت آسان محسوس ہوتا ہے۔ یہ اللہ کا فضل و احسان ہے کہ ان کی اس قوت بیان کا بیشتر حصہ قرآن حکیم کے مفہوم و معانی کے بیان کے لئے مخصوص رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے ساتھ انہیں جو خصوصی ذہنی مناسبت عطا فرمائی ہے یہ شاید اسی کا مظہر ہے کہ قرآن کو بیان کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ ان کی طبیعت پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ہوتا بلکہ باطنی انبساط و انشراح کی ایک کیفیت وہ اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس معاملے میں سورۂ مریم کی آیت ۹۷ میں وارد شدہ بشارت : فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰہُ بِلِسَانِکَ لِتُبَشِّرَ بِہِ الْمُتَّقِیْنَ وَتُنْذِرَ بِہٖ قَوْمًا لُّدًّا" کا ایک عکس اللہ نے انہیں بھی عطا فرمایا ہے۔ گزشتہ قریباً پندرہ سالوں سے ماہ رمضان المبارک کے دوران دورۂ ترجمہ قرآن کی ہر سال تکمیل اس کے بغیر ممکن نہ تھی' اور اب عمر کے اس حصے میں کہ جس میں قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں' گھٹنوں کی شدید تکلیف کے ساتھ انگریزی زبان میں ۵ پاروں تک دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل کا بھی اس کے بغیر کوئی امکان نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فی الواقع قرآن حکیم کو امیر محترم کی زبان پر رواں کر دیا ہے' ان کے لئے اس کا بیان آسان بنا دیا ہے۔ فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ وَالشُّکْر

☆ ☆ ☆

[illegible] تنظیم اسلامی کی پہلی تحریر جو زیر نظر شمارے میں "تذکرہ و تبصرہ" کے زیر عنوان شامل ہے' تحریک [illegible] کے بحران کے حوالے سے ہے کہ جس کا المیہ یہ ہے کہ اس کی باقاعدہ تاسیس کو ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا اور وہ داخلی انتشار کا شکار ہو کر دو دھڑوں میں بٹ چکی ہے۔ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ [illegible] انتشار کا اصل سبب تنظیمی ڈھانچے کی تشکیل اور دستوری خاکے کی تدوین کے معاملے میں رونما [illegible] اختلاف تھا جو اس تلخ صورت حال پر منتج ہوا۔ اس تناظر میں امیر تنظیم نے اس اہم بحث کو موضوع گفتگو بنایا ہے کہ ایک اسلامی تحریک کا تنظیمی ڈھانچہ کیا ہونا چاہئے۔ اس معاملے میں اب تک جو تجربات ہوئے ہیں ان کی روشنی میں امیر تنظیم نے واضح کیا ہے کہ اس میں اسلاف سے ثابت شدہ نظامِ بیعت اور موجودہ جمہوری طرزِ جماعت کو باہم گڈمڈ کر کے کوئی تنظیمی ڈھانچہ بنانے کی کوشش سعی لاحاصل ثابت ہو گی۔ اس معاملے میں یکسوئی کے ساتھ کوئی ایک طرزِ جماعت اختیار کر لینا ہی عافیت کا راستہ ہے۔

امیر تنظیم کی دوسری تحریر جو کسی بھی اسلامی انقلابی تحریک سے علیحدگی جیسے اہم اور نازک موضوع سے متعلق ہے' بہت قیمتی اصولی مباحث پر مشتمل ہے۔ غلبہ و اقامت دین کے لئے قائم ہونے والی کسی بھی جماعت کے کارکنان کے لئے اس میں رہنمائی کا وافر سامان موجود ہے۔

مذکورہ بالا دو تحریروں پر مستزاد امیر تنظیم اسلامی کے ۸/مارچ کے خطاب جمعہ کو بھی شامل شمارہ کیا گیا ہے جس میں ملکی و بین الاقوامی حالات پر امیر محترم کا مفصل اظہار خیال شامل ہے۔

قرآن کالج لاہور۔ اہم اعلان

- اس سال بی اے سال اول میں داخلے' حسب اعلان' جون کے اواخر میں ہوں گے اور انٹر کے رزلٹ کا انتظار کئے بغیر یکم جولائی سے تدریس کا آغاز ہو جائے گا۔
- لیکن ... ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس میں داخلے' حسب سابق' ستمبر کے اواخر میں ہی ہوں گے۔ تدریس کا آغاز ان شاء اللہ اکتوبر کے پہلے ہفتے سے ہو گا۔

اس ضمن میں فروری کے شمارے میں شائع شدہ اعلان کو منسوخ سمجھا جائے۔

المعلن : پرنسپل قرآن کالج' لاہور

تذکرہ و تبصرہ
ڈاکٹر اسرار احمد

تحریکِ اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ

”یا چناں کن یا چنیں!“

”تحریک اسلامی“ ایک جانب تو ادویات کے ”جنرک ناموں“ (GENERIC NAMES) کی طرح کا عمومی عنوان بھی ہے جس کے ذیل میں عالم اسلام کی جملہ احیائی تحریکیں شامل ہیں، لیکن دوسری جانب یہ ایک ایسی پاکستانی تنظیم کا ”عنوانِ خاص“ (BRAND NAME) یا اسم علم بھی ہے جو گزشتہ سال اپریل میں منصۂ شہود پر آئی تھی اور ایک سال سے بھی کم مدت میں تقسیم ہو کر دو دھڑوں کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اور یہ ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دونوں دھڑے ایک ہی نام اختیار کئے رکھتے ہیں اور مختلف سیاسی اور مذہبی تنظیموں (جیسے مسلم لیگ، جمعیت علماء اسلام، جمعیت علماء پاکستان وغیرہ) کے مانند اپنے اپنے قائدین کے ناموں سے معنون ”گروپس“ کی صورت اختیار کرتے ہیں یا ان میں سے کوئی ایک اپنا نام تبدیل کر لیتا ہے!

”جنرک“ اعتبار سے برعظیم پاک و ہند کی جماعت اسلامی اور عالم عرب کی الاخوان المسلمون ہوں جو لگ بھگ ساٹھ ستر سالوں سے مسلسل برسرِ کار ہیں، یا انڈونیشیا کی مسجومی پارٹی ہو جو شروع تو ان کے ساتھ ہی ہوئی تھی لیکن بعد میں طویل عرصہ تک پس منظر میں رہی اور اب حال ہی میں دوبارہ منظرِ عام پر آ رہی ہے، یا ایران کے فدائین ہوں جو آغاز کے اعتبار سے تو ان سب ہی کے ہم عصر تھے لیکن پھر ”پردۂ غیبوبتِ کبریٰ“ میں چلے گئے ....ان سب کو ایک ہی عظیم تر تحریک اسلامی کی مختلف تنظیمی ہیئتیں قرار دیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ جناب نعیم صدیقی کا یہ شعر کہ۔

"ہے ایک ہی نغمہ کہیں اونچا کہیں مدھم
ہے ایک ہی جذبہ کہیں واضح کہیں مبہم"

ان سب پر بالکلیہ منطبق ہوتا ہے۔

یہ دوسری خالص مذہبی یا نیم مذہبی و نیم سیاسی جماعتوں سے اس اعتبار سے بالکل ممیز، اور باہم ایک دوسرے سے مشابہ ہیں کہ ان کے نزدیک اسلام "دین" یعنی مکمل نظامِ زندگی ہے، صرف "مذہب" یعنی محض عقائد و عبادات اور چند معاشرتی رسومات و معمولات پر مشتمل انفرادی معاملہ نہیں۔ اور مسلمانوں کا اصل فرض منصبی "اقامتِ دین" ہے یعنی یہ کہ اسلام کو ایک مکمل سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام ----- یعنی POLITICO-SOCIO-ECONOMIC SYSTEM کی حیثیت سے بالفعل قائم کیا جائے۔ چنانچہ یہ سب تحریکیں یا تنظیمیں فرقہ واریت سے مبرا، اور فقہی و روحانی مسالک و مذاہب کے ضمن میں وسیع المشرب ہیں۔۔۔۔ جبکہ، صرف ایک استثناء کے سوا، باقی جملہ مذہبی تنظیمیں خالص فرقہ وارانہ بنیادوں پر قائم ہیں اور اپنے اپنے مسلکوں سے متعلق عوام کے تعاون سے موجودہ سیاست کے مروجہ اصولوں کے مطابق کشاکشِ اقتدار میں اپنی بساط کے مطابق بھرپور طور پر شریک ہیں۔

وہ "واحد استثناء" جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے تبلیغی جماعت کا ہے جو متعدد اعتبارات سے عجیب و غریب بھی ہے، اور اپنی مثال آپ بھی۔ اس لئے کہ اس کا تصورِ اسلام خالص "مذہبی" ہے، چنانچہ نہ یہ سیاسی ہے نہ انقلابی، بایں ہمہ یہ خود نہایت "متحرک" بھی ہے، اور حد درجہ فعال بھی۔ اسی طرح اگرچہ اس میں زیادہ تر ایک ہی مسلک و مشرب کے لوگ شامل ہیں (یعنی، حنفی دیوبندی) لیکن فرقہ واریت کو اس کی بنیاد میں ہرگز کوئی عمل دخل حاصل نہیں ہے۔ مزید برآں اگرچہ اس کا تنظیمی ڈھانچہ پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے لیکن ع "ہرچند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!" کے مصداق اسے نہ ٹھیٹھ دینی اصطلاح کے مطابق "جماعت" قرار دیا جا سکتا ہے، نہ موجودہ دنیا کے مروجہ اعتبارات سے! اس لئے کہ ایک جانب نہ تو اس کی عہدِ حاضر کے مروجہ نظاموں کے مطابق کوئی بنیادی اور مستقل رکنیت (MEMBER SHIP) ہے، نہ کوئی تحریری دستور، اور دوسری جانب اگرچہ جب تبلیغی

گروپوں کی تشکیل ہوتی ہے تب تو باقاعدہ امیر مقرر کئے جاتے ہیں لیکن کم از کم فی الوقت اس کا نہ کوئی عالمی امیر ہے نہ پاکستان کی جماعت کا۔ گویا آنحضور ﷺ کے قول مبارک "لا جَماعة الا بِالامارة" (سنن دارمی) کے مطابق جماعت قرار پانے کی شرطِ لازم پوری نہیں ہوتی (اس لئے کہ مولانا انعام الحسنؒ کے انتقال کے بعد کسی ایک شخص کو "امیر" نہیں بنایا گیا بلکہ تین افراد پر مشتمل بورڈ بنا دیا گیا ہے' جس میں سے دو تو "صاحبزادگان" ہیں یعنی ایک امیر ثانی مولانا محمد یوسفؒ کے پوتے اور دوسرے امیر ثالث مولانا انعام الحسنؒ کے بیٹے' اور ایک معمر بزرگ ہیں۔)

ادھر "عظیم تر تحریک اسلامی" کی دو نمایاں ترین تنظیمی صورتیں یعنی غیر منقسم ہندوستان کی جماعت اسلامی' اور عالمِ عرب کی الاخوان المسلمون امتدادِ زمانہ کے باعث طبعی طور پر شکست و ریخت کا شکار ہوئیں اور ان میں سے ہر ایک کی کوکھ سے متعدد تنظیموں اور جماعتوں نے جنم لیا۔ مثلاً مصر کی الاخوان المسلمون کے مؤسّس اور اولین مرشدِ عام شیخ حسن البنّا شہیدؒ کے ایک ساتھی اور ارادتمند شیخ تقی الدین نبہانیؒ نے ان کی زندگی ہی میں علیحدہ راستہ اختیار کر کے "حزب التحریر" کی بنیاد رکھی' پھر کچھ عرصہ کے بعد جناب عمر تلمسانی کی امارت کے زمانے میں اولاً "التکفیر والھجرۃ" نامی متشدد اور دہشت گرد گروہ علیحدہ ہوا' اور پھر "جماعتِ اسلامیہ" (جس کا تلفظ "گماعہ اسلامیہ" کیا جاتا ہے) علیحدہ ہوئی۔ اسی طرح جماعت اسلامی ہند بھی اول تو ہندوستان کی تقسیم در تقسیم کے نتیجے میں خود بھی چھ جماعتوں میں تقسیم ہو چکی ہے (یعنی جماعت اسلامی پاکستان' جماعت اسلامی بھارت' جماعت اسلامی بنگلہ دیش' جماعت اسلامی کشمیر' جماعت اسلامی آزاد کشمیر اور جماعت اسلامی سری لنکا) دوسرے اس سے مختلف مواقع پر علیحدگی اختیار کرنے والوں نے بھی علیحدہ علیحدہ ناموں سے جماعتیں قائم کرنے کی متعدد کوششیں کیں جن میں سے پاکستان میں ایک راقم الحروف کی قائم کردہ "تنظیم اسلامی" ہے جو بحمدِ اللہ اکیس برس سے مسلسل مدھم رفتار لیکن مستقل مزاجی کے ساتھ' سوائے چند افراد کی وقتاً فوقتاً علیحدگی کے' کسی بھی بڑے شکست و ریخت سے محفوظ و مامون رہتے ہوئے کام کر رہی ہے --- دوسرے نمبر پر حال ہی میں پنجاب میں مولانا مودودی مرحوم کے اولین رفیق کار اور مولانا

مودودی اور مولانا اصلاحی کے بعد جماعت اسلامی پاکستان کے بلاشبہ نمبر تین مصنف و مقرر جناب نعیم صدیقی صاحب کی امارت میں قائم ہونے والی "تحریک اسلامی" تھی، جس کے، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، ایک سال سے بھی کم مدت میں دو ٹکڑے ہو چکے ہیں، جن میں سے [illegible] یقی صاحب کا ساتھ دینے والا ٹکڑا دوسرے کے مقابلے میں تعدادِ ارکان کے اعتبار [illegible] ستان میں گزشتہ پچاس (قمری) سالوں کے دوران میں اور جتنے اکابر یا [illegible] سے علیحدہ ہوئے یا خارج کر دیئے گئے ان میں سے دوسرے متعدد حضرات نے بھی جماعتیں یا تنظیمیں بنانے کی کوشش تو کی لیکن کسی اور کو کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ اسی طرح میری محدود معلومات کی حد تک بھارت کی جماعت اسلامی سے بھی حیدر آباد دکن سے تعلق رکھنے والے چند حضرات نے علیحدہ ہو کر ایک نئی جماعت بنائی تھی جس کے سربراہ اس علاقے سے جماعت کے رکن اول مولانا محمد یونس مرحوم تھے، لیکن وہ بھی چل نہیں سکی تھی! (واللہ اعلم!)

پاکستان کی تاریخ کے ابتدائی دس سالوں کے دوران میں تحریک اسلامی یا تحریکِ اقامتِ دین 'جماعت اسلامی کے عنوان سے' چند سو ارکین اور چند ہزار کارکنوں کی نہایت منظم، متحد، پُرجوش، اور انتھک محنت و مشقت، اور ایک شخصِ واحد یعنی مولانا مودودی مرحوم کی ہمہ جہت اور ہر اعتبار سے مسلّم اور متفق علیہ قیادت کی بنا پر بہت سی بڑی اور پرانی مذہبی و سیاسی جماعتوں پر بھاری رہی۔ تا آنکہ ۵۷-۱۹۵۶ء میں یہ ایک عظیم بحران سے دوچار ہوئی جس کے نتیجے میں اس کی قیادت کی پوری صفِ دوم اس سے علیحدہ ہو گئی۔ چنانچہ اس "خروج" (EXODUS) کے بعد جماعت اسلامی کی امارت کے لئے مولانا مودودی مرحوم کے بعد مولانا مودودی کے سینئر رفقاء میں سے میاں طفیل محمد صاحب کے سوا کوئی نہ بچا۔

اُس وقت جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والوں میں تین اشخاص سب سے زیادہ نمایاں ہوئے: ایک سابق امیر جماعت اسلامی پنجاب اور مدیر روزنامہ "تسنیم" لاہور جناب سعید ملک (مرحوم) جنہوں نے شدید جارحانہ انداز اختیار کیا اور جماعت کی پوری نوکرشاہی اور بعض اہم قائدین پر جھوٹ، فریب اور خیانت تک کے الزام عائد کئے اور باقاعدہ

پریس کانفرنس میں علیحدگی کا اعلان کیا۔ دوسرے ان سطور کا ناچیز راقم جس کا اختلاف خالص اصولی تھا یعنی یہ کہ "جماعت اپنے ابتدائی اور صحیح اصولی' اسلامی' انقلابی رول کو ترک کر کے اب صرف ایک "اسلام پسند" قومی سیاسی جماعت کا رول اختیار کر چکی ہے جس سے رجوع لازمی ہے!" اور جو اپنی نوعمری اور بے بضاعتی کے باوجود "نمایاں" اس لئے ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے ایک مفصل بیان بھی تحریر کیا تھا (جو دس سال بعد ۱۹۶۶ء میں "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے سوا دو سو صفحات پر مشتمل کتاب کی صورت میں شائع ہوا) اور پھر اپنی تمام تر "بے کسی" کے علی الرغم ماچھی گوٹھ کے سٹیج سے مسلسل تین گھنٹے تک مولانا مودودی کی بعد از تقسیم ہند پالیسی پر تنقید کی "ناکام" کوشش بھی کی تھی۔ تیسرے نمبر پر مولانا امین احسن اصلاحی تھے' جو اگرچہ بقول شورش کاشمیری مرحوم مولانا مودودی کے "اینجلز" بھی تھے اور "حکیم نور الدین" بھی اور اس اعتبار سے تو بلاشبہ مولانا مودودی کے بعد جماعت اسلامی پاکستان کی نمایاں ترین شخصیت تھے لیکن اس جائزہ میں انہیں تیسرے نمبر پر اس لئے رکھا جا رہا ہے کہ اگرچہ انہیں فی الجملہ سعید ملک صاحب کی باتوں سے بھی اتفاق تھا---- اور میرے تجزیئے سے بھی وہ بہت حد تک متفق تھے' لیکن انہوں نے اپنی علیحدگی کی اصل اساس ان امور کو نہیں بلکہ صرف اس بات کو بنایا تھا کہ ان کے نزدیک مولانا مودودی نے شخصی طور پر "آمرانہ" روش اختیار کر لی تھی اور جماعت کا نیا دستور بھی "شورائیت" کی بجائے "آمریت" پر استوار کر لیا تھا۔ تاہم علیحدگی کے موقع پر جو خط و کتابت ان اعاظم رجال کے مابین ہوئی وہ اس اعتبار سے حیرت انگیز بھی ہے اور عبرت آموز بھی کہ مسلسل سترہ سال تک یک جان دو قالب رہنے والے انسانوں کے مابین دفعۃً غیظ و غضب' بدگمانی و بداعتمادی' اور طنز و استہزاء کی ایسی گھمبیر فضا کیسے پیدا ہو گئی۔ (یہ خط و کتابت میری تالیف: "تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب" میں من و عن درج ہے۔)

کیفیت و نوعیت کے اعتبار سے تو اس سے ملتی جلتی' لیکن کمیت کے اعتبار سے اس سے کہیں زیادہ عبرتناک مثال نعیم صدیقی صاحب کی "تحریک اسلامی" کے حالیہ بحران میں سامنے آئی ہے' کہ اپریل ۹۵ء میں جس شخص کو تقریباً بالاتفاق "امیر" چنا گیا تھا' اول تو چند

ہی مہینوں کے اندر اندر خود اسے اپنے قریب ترین ساتھیوں میں نجویٰ اور سازش کی بُو آنے لگی اور وہ محسوس کرنے لگے کہ انہیں محض "درشنی پہلوان" کی حیثیت دے کر کچھ ہوشیار لوگوں نے سارے اختیارات خود سنبھال لئے ہیں، اور اس کے ردِّ عمل میں ان کے قریبی ساتھیوں کے جو خطوط پندرہ روزہ "نشور" میں شائع ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی محبوب ترین اور معتمد ترین شخصیت چند ماہ کے اندر اندر "ارذل العمر" کو بھی پہنچ گئی اور "مطلق العنانی" کے "فراق" میں عقل و منطق، اور عدل و انصاف کی جملہ حدود کو بھی پھلانگ گئی! نتیجتاً دیکھتے ہی دیکھتے ایک جانب امیر نے مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ دونوں کو معزول کر دیا تو دوسری جانب مجلس شوریٰ نے امیر کو معزول کر کے نئے امیر کا انتخاب کرالیا۔ گویا وہ سب کچھ جو بالعموم مساجد کی انتظامی کمیٹیوں، سماجی انجمنوں، اور دیگر مذہبی و سیاسی جماعتوں میں ہوتا رہتا ہے "تحریک اسلامی" میں بھی ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن اور ع "چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!"

ہمیں نہ مولانا مودودی کے خلوص و اخلاص میں شبہ تھا، نہ مولانا اصلاحی کے۔ اسی طرح اب نہ جناب نعیم صدیقی کے اخلاص میں کوئی شک ہے نہ ان کے سابقہ اہم رفقاء کے۔ بلکہ اُس وقت تو چونکہ راقم خود بھی ع "کون طوفاں کے تھپیڑے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو!" کے مصداق "بحران" کے تھپیڑے کھا رہا تھا لہٰذا اس کے جذبات میں صدمے کے ساتھ ساتھ غصے کی آمیزش بھی تھی۔۔۔ اب تو اس حالیہ بحران میں کسی بھی جانب سے شریک یا ملوث نہ ہونے کے باعث متذکرہ بالا صورتحال پر رنج و افسوس کے سوا کوئی ردعمل نہیں ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ میں نے تو اگست ۹۵ء کی تقریر میں بڑے شد و مد کے ساتھ جماعت اسلامی، تنظیم اسلامی اور تحریک اسلامی کے مابین "وفاق" کے قیام کی تجویز پیش کی تھی اور کسی مثبت ردعمل کا منتظر تھا (خصوصاً اس لئے کہ ایک جانب دو سو میل شمال سے پروفیسر خورشید احمد صاحب کے ادارے سے شائع ہونے والے ماہنامہ "دینی صحافت" سے حوصلہ افزاء تبصرہ موصول ہوا تھا تو دوسری جانب دو ہزار میل جنوب میں واقع بنگلور سے شائع ہونے والے ماہنامے "ینگ مسلم ڈائجسٹ" نے بھی پذیرائی کی تھی!) لیکن ع "ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال!" کے مصداق ابھی "کثرت میں وحدت" کی شان کا کسی ادنیٰ درجہ

میں بھی ظہور نہیں ہوا تھا کہ ع "خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے!" کے مصداق تفرقہ و تقسیم کا عمل ایک قدم اور آگے بڑھ گیا۔ اور "تحریک اسلامی" خود دولخت ہو گئی!

راقم کے نزدیک اس حادثہ فاجعہ کا یہ پہلو اہم تر اور قابل توجہ ہے کہ چونکہ ابھی پالیسی یا طریق کار کے ضمن میں تو کسی اختلافِ رائے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا' لہٰذا نزاع کی کل بنیاد تنظیمی ڈھانچہ یا دستوری خاکہ ---- اور اس کے ضمن میں بھی یہ اہم اور اساسی مسئلہ ہے کہ اختیارات کے اعتبار سے زیادہ بھاری پلڑا "امیر" کا ہو یا "شوریٰ" کا؟ چنانچہ اس موقع پر جناب نعیم صدیقی نے جو باتیں کی ہیں ان میں سے اہم ترین یہی ہے کہ کچھ لوگوں نے سازش اور ریشہ دوانی کے ذریعے ایک "غیر اسلامی" دستور بنوا لیا۔ جس سے ان کی مراد غالباً یہی ہے کہ اس کی رو سے مجلس شوریٰ کے مقابلے میں "امیر" بالکل بے دست و پا بنا دیا گیا ہے۔ اور یہ وہ مسئلہ ہے جس پر اب سے ٹھیک پچاس سال قبل ۱۹۴۶ء میں غیر منقسم ہندوستان کی جماعت اسلامی کے کُل ہند اجتماع منعقدہ الٰہ آباد میں بھی شدید اختلافِ رائے سامنے آیا تھا۔ یعنی جبکہ مولانا مودودی مرحوم اس کے قائل یا مدعی تھے کہ اسلامی نظمِ جماعت میں اصل اختیار "امیر" کو حاصل ہوتا ہے جو مجلس شوریٰ کی اکثریت کی رائے کو "ویٹو" کر سکتا ہے' مولانا اصلاحی اس پر جازم تھے کہ امیر کو شوریٰ کی اکثریت کے "تابع" ہونا ضروری ہے۔ جس پر اُس وقت تو مولانا مودودی نے "حکمت عملی" کے تحت کسی قدر گھٹنے ٹیک دیئے تھے اور ایک پیچ در پیچ "مصالحتی فارمولا" قبول کر لیا تھا' لیکن دس سال بعد ان کا اصل ذہن پہلے تو اجتماع ماچھی گوٹھ کے موقع پر بقول مولانا اصلاحی "خلوتیانِ خاص" کی محفل میں اور پھر بھرپور طور پر کوٹ شیر سنگھ کے اجلاسِ شوریٰ میں سامنے آیا۔ جس کے نتیجے میں جماعت کے دستور میں پورا اختیار امیر کے ہاتھ میں مرکوز کر دیا گیا۔ جس پر مولانا اصلاحی یہ کہتے ہوئے جماعت سے رخصت ہو گئے کہ مولانا مودودی نے وہ بلی دوبارہ تھیلے سے نکال لی ہے جسے وہ اپنی دانست میں "گربہ کشتن روزِ اول" کے مصداق ۱۹۴۶ء ہی میں مار چکے تھے۔ (ان تمام تفاصیل کے لئے دیکھئے میری تالیف: "تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب") بعد میں یہ دستور مولانا مودودی کی زندگی تک تو بالکل ٹھیک کام کرتا رہا' اس لئے کہ وہ تحریک اسلامی کے داعیٔ اول بھی تھے اور جماعت اسلامی کے مؤسس بھی' پھر

میاں طفیل محمد صاحب کے دورِ امارت میں بھی اس بنا پر چلتا رہا کہ جماعت کے ارکان کی اکثریت، صحیح یا غلط طور پر، یہ سمجھتی رہی کہ وہ مولانا مودودی کے "معتمد ترین" شخص ہیں، جیسے ہی قاضی حسین احمد "سریر آرائے امارت" ہوئے جماعت کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی اکثریت "الامان" اور "الحفیظ" پکار اٹھی۔۔۔ چنانچہ یہ اسی کے ردعمل کا مظہر ہے کہ "نومولود تحریک اسلامی" نے اپنے اساسی دستور میں بالکل برعکس رخ اختیار کر لیا اور "امیر" کو بالفعل "صدر" کی حیثیت دے دی!

بہرحال چونکہ ابھی تحریک اقامتِ دین کو بہت طویل سفر طے، اور نہایت کٹھن مرحلے سر کرنے ہیں، ضروری ہے کہ "عظیم تر تحریک اسلامی" سے عملی یا ذہنی وابستگی رکھنے والا ہر شخص اس اہم اور اساسی مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کرے۔ اور خاص طور پر چونکہ ۱۱۔۱۲/ اپریل کو "تحریک اسلامی" کے نعیم صدیقی صاحب سے باغی دھڑے کا اجتماع ہونے والا ہے، مناسب ہو گا کہ اس کے اربابِ حل و عقد اس معاملے میں راقم کی معروضات پر بھی غور فرمالیں جو خالصتاً اقامت دین کے عظیم تر مقصد، اور تمام تر نصح و خیر خواہی کے جذبہ سے پیش کی جارہی ہیں۔

تاہم اس سے قبل کہ اس معاملے میں اپنی رائے پیش کی جائے، مناسب ہے کہ اس خط کا اقتباس سامنے آ جائے جو راقم نے ۲۲/ جنوری ۹۵ء مطابق یکم رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ کو نعیم صدیقی صاحب کی خدمت میں ارسال کیا تھا :

> "کل آپ سے حاضری کی اجازت حاصل کر کے گاڑی کے بارے میں معلوم کیا تو پتہ چلا کہ تین گاڑیوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں۔ TAXI بھی فوری طور پر نہ مل سکی۔ اور بعد میں پے بہ پے ایسی مصروفیات نکل آئیں کہ حاضری نہ ہو سکی۔۔۔۔ اب کل علی الصبح امریکہ کے لئے روانگی ہے، لہٰذا عریضہ ہٰذا کے ذریعے ہی حاضر ہوں!
>
> اگرچہ میرا یہ مقام ہرگز نہیں ہے کہ میں آپ کو کوئی مشورہ دے سکوں، لیکن حدیثِ نبوی "الدّینُ النّصیحۃ" کی رو سے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے دو درخواستیں پیش خدمت ہیں :

ایک یہ کہ آپ تحریکِ اسلامی کے تنظیمی قضیہ سے اپنے آپ کو بالکل علیحدہ کر کے' صرف تصنیف و تالیف کے کام میں ہمہ تن اور ہمہ وقت مشغول ہو جائیں۔ اِس وقت جو صورت بن گئی ہے اس سے جگ ہنسائی تو ہو ہی رہی ہے---- "بعد از خرابیٔ بسیار" بھی کسی خیر کی کوئی امید نہیں ہے---- اور اس سے لامحالہ "عظیم تر تحریکِ اسلامی" کو بہت گزند پہنچے گا۔ مجھے خوب اندازہ ہے کہ اس قسم کے معاملات میں جب ایک بار "پیچ پڑ جائے" یا "سینگ پھنس جائیں" تو اس سے باہر نکلنا بہت مشکل اور بہت بڑے ایثارِ ذات ہی کے ساتھ ممکن ہے' تاہم میری مخلصانہ درخواست یہی ہے کہ آپ یہ کڑوا گھونٹ بھر لیں--- آپ کو بخوبی اندازہ ہو گا کہ میری ساری نیاز مندی آپ کی ذات سے ہے' دوسری طرف جلیل خان صاحب ہوں یا کوئی اور میری تو ان سے پہلی ملاقات بھی آپ ہی کے واسطے سے ہوئی ہے۔ اور اگرچہ اب میرا کوئی تنظیمی یا جماعتی تعلق نہ جماعت اسلامی سے ہے نہ تحریکِ اسلامی سے' تاہم مجھے عظیم تر تحریکِ اسلامی کی عزت اور نیک نامی بھی عزیز ہے کہ اس کی رہی سہی اور بچی کھچی پونجی بھی ختم نہ ہو جائے---- اور اللہ گواہ ہے کہ ذاتی طور پر آپ کی عزت اور وقار کا بھی تہہ دل سے خیال ہے...."

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ ------ "اقامتِ دین" کی جدوجہد کے لئے قائم ہونے والی تنظیم یا جماعت کے تنظیمی ڈھانچے کے مسئلے پر راقم نے ۵۷-۱۹۵۶ء ہی سے غور کرنا شروع کر دیا تھا' اور بحمد اللہ راقم کی ایک رائے بھی اواخر ۱۹۵۸ء ہی میں بن گئی تھی' اگرچہ اس پر عمل کا آغاز لگ بھگ بیس سال بعد ۱۹۷۷ء میں ہوا۔ اور درمیانی عرصے میں راقم متبادل صورتوں پر بھی عمل کے لئے ذہناً و قلباً پوری طرح آمادہ رہا۔

راقم کی وہ رائے جو اب مزید تقریباً بیس سال گزرنے کے بعد کافی بڑے حلقے میں معلوم و معروف ہے' یہ ہے کہ---- اگرچہ عہدِ حاضر کے جملہ جمہوری و دستوری نظام ہائے جماعت بھی شریعت کی رو سے حرام یا ممنوع نہیں' بلکہ اصلاً مباح ہیں۔ (یہاں تک کہ ایک دستور کے ساتھ "حلف وفاداری" بھی ایک طرح کی دستوری "بیعت" ہی ہے!) تاہم

واحد منصوص و مسنون و ماثور طریقہ "شخصی بیعت" کا ہے! ---- مزید بر آں یہی کسی انقلابی جدّوجہد کے لئے عقل و منطق کی رو سے بھی زیادہ درست اور مفید تر ہے!

تاہم زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ دونوں طریقے ایک دوسرے سے بالکل متمیّز بلکہ متضاد ہیں جن میں سے بالکل "یا چناں کن یا چنیں" کے مصداق کسی ایک کو بتمام و کمال قبول کرلینا چاہئے۔ اصل خرابی ان دونوں کے مابین "پیوند کاری" سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ اصلاً ایسی پیوند کاری ہی کے نتیجے میں جماعت اسلامی اپنے ۵۷-۱۹۵۶ء والے شدید ترین بحران سے دوچار ہوئی تھی اور اسی کے باعث اب نوزائیدہ "تحریک اسلامی" اپنے حالیہ بحران کا شکار ہوئی ہے۔ اور دونوں مواقع پر تلخی' تندی' تیزی' جھنجلاہٹ' اور ان سب سے بھی بڑھ کر ایک دوسرے کی نیتوں تک پر حملے کی مکروہ ترین صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔

شخصی بیعت کا نظام کسی ایک "داعی" کی ذات سے شروع ہوتا ہے' جو پہلے انبیاء معصومین ہوا کرتے تھے' اور ختمِ نبوت کے بعد غیر نبی اور غیر معصوم انسان ہی ہو سکتے ہیں۔ یہ داعی سامنے آتا ہے' اپنے خیالات و نظریات کی اشاعت کرتا ہے' اور اپنے ہدف اور طریق کار کی بھی وضاحت کرتا ہے' اور پھر "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہ" کی صدا بلند کرتا ہے۔ پھر جو شخص اس سے فی الجملہ متفق بھی ہو اور اس کے خلوص و اخلاص پر اعتماد بھی کرتا ہو وہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس کا "ساتھی" بن جاتا ہے۔ اور اپنے "سمع و بصر و فواد" سے صرف یہ دو کام لیتا ہوا اس کی اطاعت پر کاربند رہتا ہے کہ اولاً مقدور بھر خود بھی غور و فکر کرتا رہے اور پیش آمدہ مسائل و مراحل کے ضمن میں اپنی رائے بھرپور طور پر پیش کرتا رہے' اس سے بالکلیہ قطع نظر کہ وہ قبول کی جائے یا رد کردی جائے! اور ثانیاً یہ دیکھتا رہے کہ "داعی" جو اب "امیر" کی حیثیت رکھتا ہے کہیں کتاب و سنّت کی حدود سے تجاوز نہ کر جائے! گویا کتاب و سنت کے دائرے کے اندر اندر اس امیر کی حیثیت "آمر" کی ہے۔ (واضح رہے کہ عربی قواعد کی رو سے "آمر" اسم فاعل ہے جس میں ایک طرح کا عارضی پن شامل ہوتا ہے' جبکہ "امیر" صفتِ مشبہ ہے جس میں دوام و استمرار کا رنگ پایا جاتا ہے!) ---- اس طرح یہ جماعت اوپر سے نیچے کی طرف بڑھتی ہے' اور اس میں نہ کبھی امیر کا انتخاب ہوتا ہے نہ ہی کبھی فیصلوں کے لئے آراء کی گنتی کی جاتی ہے--- مزید بر آں'

اس نظام جماعت میں مناصب کے لئے "امیدواری" بھی نہایت ناپسندیدہ شے ہے۔ رہی کنویسنگ، نجویٰ اور گروہ بندی تو وہ تو گناہ کبیرہ کے درجہ میں شمار ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس مغرب نے ریاست اور جماعت کے لئے جو جمہوری اور دستوری نظام صدیوں کے عمرانی ارتقاء کے نتیجے میں DEVELOPE کیا ہے وہ نیچے سے اوپر کی طرف چلتا ہے۔ چنانچہ اس کی اساس "شہریت" یا "رکنیت" پر ہے۔ اور اوپر کے جملہ مناصب درجہ بدرجہ "انتخابات" کے ذریعے وجود میں آتے ہیں۔ پھر ہر سطح پر منصب داروں یا عہدیداروں پر CHECKS AND BALANCES کا پورا اہتمام کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مجالس منتظمہ یا مجالس قانون ساز یا مجالس مشاورت بھی انتخابات ہی کے ذریعے وجود میں آتی ہیں اور پھر عہدیداروں اور ان مجالس کے مابین تقسیم اختیارات کے پیچ در پیچ فارمولے بنائے جاتے ہیں اور اگر "صدور" کے اختیارات غالب ہوں تو وہ نظام "صدارتی" بن جاتا ہے اور اس کے برعکس اگر مجالس کی کثرت رائے صدور پر "حاکم" اور "لازم" بن جائے تو اسے "پارلیمانی" کہا جا سکتا ہے۔۔۔۔ بہرحال اس نظام میں سربراہ "صدر" کہلاتے ہیں "امیر" نہیں!

لیکن اہم تر معاملہ یہ ہے کہ اس نظام میں کھلم کھلا امیدواری اور کنویسنگ، اور اعلانیہ دھڑے بندیاں اور بلاک سازیاں اجزائے لاینفک کی حیثیت رکھتی ہیں، اور ہرگز نہ معیوب ہیں نہ غیر مستحسن، بلکہ CHECKS AND BALANCES کا پورا نظام بنتا ہی ان کی بنا پر ہے۔ چنانچہ حال ہی میں لاہور میں امریکہ کے کونسلیٹ سے منسلک کلچرل اٹیچی مسٹر رھوفی ملاقات کے لئے تشریف لائے اور ان سے عہد حاضر میں نظام خلافت کے دستوری ڈھانچے کے موضوع پر مفصل گفتگو ہوئی تو انہوں نے صاف فرمایا کہ ہمارا تو سارا نظام تعمیر ہی اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ ہر شخص چور اور بے ایمان ہے اور دستوری اور قانونی ڈھانچہ ایسا ہونا چاہئے کہ اس کے ذریعے چوری اور بے ایمانی کو کم سے کم کیا جا سکے!

بیسویں صدی عیسوی کے دوران ہندوستان کے ہندوؤں نے دو عظیم جماعتیں قائم کیں۔ ایک خالص سیاسی یعنی انڈین نیشنل کانگرس جو صدفی صد جمہوری اور دستوری تھی۔ چنانچہ اس میں امیدواریاں بھی ہوتی تھیں اور کنویسنگ بھی۔ گویا الیکشن باقاعدہ

"لڑے" جاتے تھے۔ مزید برآں دھڑے بھی کھلم کھلا بنتے تھے اور بلاک بھی اعلانیہ بنائے جاتے تھے اور ان کے مابین رسہ کشی بھی برملا ہوتی تھی۔ ان ہی کیفیات کے ساتھ اس جماعت نے آزادی کی جدوجہد میں بھی اپنا کردار ادا کیا' اور پھر آزادی کے بعد بھی اب تک یہ جماعت بھارت کی حکومت کو چلا رہی ہے۔ اس جماعت نے ہمیشہ ایک خالص مغربی انداز کی سیاسی پارٹی کا رول ادا کیا اور اپنے جملہ امور کی گاڑی کو ہمیشہ دستور کی پٹڑی ہی پر چلایا۔ تاہم واضح رہے کہ جدّوجہدِ آزادی (یا جہادِ حریت) کے دوران جب بھی کبھی "راست اقدام" کا مرحلہ آتا تھا تو یہ اپنے صحیفۂ دستور کو بند کر کے رکھ دیا کرتی تھی اور یکے بعد دیگرے "ڈکٹیٹر" نامزد کر دیئے جاتے تھے۔ اس لئے کہ "تحریک" چلانے کے لئے یہ شے ناگزیر برائی کا درجہ رکھتی ہے۔

اس کے برعکس معاملہ ہے مذہبی اور احیائی جماعت "آر ایس ایس" کا کہ اس کا سربراہ "صدر" نہیں "گورو" ہوتا ہے جو منتخب نہیں ہوتا بلکہ سابق گورو کا نامزد کردہ ہوتا ہے' جو اسے اپنے دورِ سربراہی ہی میں نامزد کر کے زیر تربیت رکھتا ہے جو اس کے انتقال پر "تاحیات خلیفہ" بن جاتا ہے۔ چنانچہ ۲۵ء سے ۹۵ء تک ستر سالوں میں اس کے داعی اور مؤسس کے بعد دو گورو تو سابق گوروؤں کے انتقال ہی پر گورو بنے' البتہ اب چوتھے گورو کو تیسرے ہی نے خود نامزد کر کے اپنی علالت کے باعث اپنی زندگی ہی میں سربراہی سونپ دی ہے۔

اس جماعت کی وسعت اور قوت کا عالم یہ ہے کہ اب سے دس برس قبل اس پر ایک کتاب شکاگو سے "BROTHERHOOD IN SAFFRON" کے نام سے شائع ہوئی تھی تو اس میں اس کے تربیت یافتہ والنٹیرز کی تعداد پچیس لاکھ بتائی گئی تھی۔ (اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ دس سالوں کے دوران بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی ہو گی!) اور اس کے نظم و ضبط اور ڈسپلن کی پابندی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اجودھیا کی مسجد کو شہید کرنے کے لئے اس کے تین لاکھ والنٹیر ہندوستان کے کونے کونے سے اجودھیا پہنچے۔ لیکن اس سفر کے دوران پورے ہندوستان میں "مسلم کُش فساد" تو درکنار کسی مسلمان کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔ چنانچہ وہ لوگ پورے امن و ضبط کے ساتھ

گئے' اپنا کام پورا کیا اور اسی امن اور نظم وضبط کے ساتھ گھروں کو لوٹ گئے ---- جبکہ ہزار کے لگ بھگ مسلمان بعد میں اس وقت ہلاک ہوئے جب انہوں نے "احتجاجی" تحریک میں توڑ پھوڑ کی اور پولیس نے انہیں بھون کر رکھ دیا ---- اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت پر بھی نگاہ رہے کہ اس جماعت نے اس قدر قوت ووسعت کے باوجود ملکی انتخابات میں کبھی براہ راست حصہ نہیں لیا۔ بلکہ پہلے ۱۹۵۱ء میں "جن سنگھ" کو اپنا پولٹیکل فرنٹ قرار دیا۔ اور پھر ۱۹۸۰ء سے "بی جے پی" یہ رول ادا کر رہی ہے' جس کے نہایت عسکری بازو (MILITANT WINGS) وشوا ہندو پریشد (V H.P) اور شیو سینا ہیں! گویا معاملہ اس اعتبار سے بھی کانگرس کے برعکس ہوا۔ یعنی کانگریس نے جب تحریک چلائی تو دستور کو تہہ کر کے رکھ دیا اور "آمریت" اختیار کر لی' اور آر ایس ایس نے سیاست میں حصہ لیا تو "گوروؤں" والے نظام سے بالکل علیحدہ دستوری اور جمہوری بساط بچھالی۔

اس کے برعکس حال ہمارا رہا کہ جماعت اسلامی نے سیاست میں حصہ لینا چاہا تو بھی اپنی کڑی "شرائط رکنیت" کو برقرار رکھتے ہوئے' اور انتخابات میں حصہ لینا چاہا تو بھی ابتداءً امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کو حرام قرار دیتے ہوئے ---- چنانچہ نہایت مایوس کن صورتحال سے سابقہ پیش آیا۔ اور پھر اس کے بعد سے آج تک "تنزل" کے ضمن میں مسابقت کی دوڑ لگی ہوئی ہے کہ ادھر جماعت اپنے معیارات کو ایک قدم نیچے لاتی ہے تو ادھر معاشرہ اخلاقی اعتبار سے دو قدم اور نیچے اتر جاتا ہے اور جماعت کے ہاتھ میں ہر بار بھاگتے چور کی لنگوٹی تک نہیں آپاتی ---- دوسری طرف نو مولود "تحریک اسلامی" ہے جو تاحال "امارت" اور "شورائیت" کی بحثوں میں غلطاں و پیچاں ہے! ---- کاش کہ جماعت اور تحریک' دونوں کے اصحابِ فکر و نظر اور اربابِ حل و عقد ہماری ان گزارشات پر غور کر سکیں ---!

پھر ان میں سے بھی جہاں تک جماعت اسلامی کی "قیادت" کا تعلق ہے' وہ تو چونکہ بہت اونچی ہواؤں میں اڑنے کی عادی ہے' لہٰذا اس تک تو شاید ہماری یہ گزارشات پہنچ بھی نہ پائیں ----. البتہ تحریک اسلامی چونکہ ابھی ہماری ہی طرح "خاک نشین" ہے' لہٰذا بعید نہیں کہ اس کے ذمہ دار حضرات ان گزارشات پر غور گوارا کر لیں کہ:

○ اگر تو "عظیم تر" تحریک اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والے یا خارج کئے جانے والے بعض دوسرے حضرات کے مانند اب جناب نعیم صدیقی صاحب سے علیحدہ ہونے والے احباب کا اصل مطمحِ نظر بھی صرف دعوتی و تبلیغی یا علمی و تعلیمی یا رفاہی و اصلاحی ہے'

○ یا ان کے پیش نظر بھی اصلاً ملکی سیاست ہی کے اکھاڑے میں اترنا ہے' خواہ براہ راست خود انتخابات میں حصہ لے کر خواہ کسی سیاسی دھڑے کو تقویت پہنچا کر تب تو دستوری و جمہوری نظام ہی درست ہے' اور اس کے ضمن میں جس طرح انہوں نے جماعت میں شمولیت کی شرائط میں نرمی کر دی ہے (چنانچہ اب ایسے حضرات بھی اس کے رکن ہی نہیں شوریٰ تک میں شامل ہیں جو اپنے کاروبار کے ضمن میں بینک سے سودی قرضے لینے اور انکم ٹیکس کے ضمن میں اخفاء یا غلط بیانی پر مجبور ہیں' بنابریں اس سے قبل جماعت اسلامی کی رکنیت حاصل نہیں کر سکتے تھے) اسی طرح اختلاف رائے اور اس کے اظہار ہی کے لئے نہیں بلکہ اپنی رائے کو تقویت پہنچانے کے لئے اعلانیہ اور انفرادی سطح پر یا گروپوں کی صورت میں گفتگوؤں' اور پھر باضابطہ انتخابات میں اپنے ہم خیال لوگوں کے لئے رائے ہموار کرنے کی کوششوں کے ضمن میں بھی اپنے سابقہ معیارات میں نرمی اور تخفیف پیدا کیجئے۔

○ اور اگر اصل ہدف "اقامتِ دین" کے لئے وہ انقلابی جدوجہد ہے جس کے ابتدائی مراحل کا نقشہ مولانا مودودی مرحوم نے ۱۹۴۰ء میں "اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے!" نامی خطاب میں پیش کیا تھا اور جس کے آخری مراحل میں لازماً شدید تصادم اور ٹکراؤ اور جان کی بازی لگانا ناگزیر ہو گا تو اس صورت میں ابھی سے "بیعتِ شخصی" ہی کے خالص دینی نظام کو اختیار کر لیجئے تاکہ نفوس ابھی سے "فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ وَعَلٰی اثَرَۃٍ"..... "سمع وطاعت فی المعروف" کے ضمن میں ایثارِ ذات اور ایثارِ رائے کے عادی اور خوگر ہو جائیں.... اس ضمن میں قابل غور بات یہ ہے کہ کیا آپ کے پاس کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جس کے خلوص و اخلاص اور اصابتِ رائے پر اتنا اعتماد کیا جا سکے کہ ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں اور وہ جملہ

ساتھیوں کے بہترین مشوروں سے استفادہ کرتے ہوئے اطمینان کے ساتھ جماعت کے کام کو آگے بڑھا سکے!

دوسری جانب جناب نعیم صدیقی صاحب کا ساتھ دینے والے احباب اب اگر امیر کے ہاتھ میں فیصلہ کن اختیار دینے کے حق میں ہیں تو ان سے گزارش ہے کہ پھر سیدھے اور سادے طریقے پر ان کے ہاتھ پر "بیعت" ہی کر لیں۔ اس لئے کہ اگر امیر جماعت شوریٰ کی اکثریت کی رائے کو ویٹو کر دینے کا مجاز ہو (جیسا کہ مولانا مودودی مرحوم کا خیال تھا) تو خواہ مخواہ لمبے چوڑے دستوری کھکھیڑ میں پڑنے کی آخر کیا ضرورت ہے' جبکہ حیدر آباد دکن کے مولانا محمد یونس کی مرتب کردہ کتاب "خطوط کے چراغ" میں مولانا مودودی مرحوم کا جو خط مارچ ۱۹۴۱ء کا شامل ہے' اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم کا اپنا ذہن واضح طور پر شخصی بیعت کے منصوص' مسنون اور ماثور طریقے ہی کی جانب زیادہ رجحان رکھتا تھا۔ (مولانا مرحوم کا یہ خط اسی شمارے کے صفحہ ۲۰ پر دیکھا جا سکتا ہے!)

اور آخری گزارش یہ کہ بیعت خواہ شخصی ہو یا دستوری' دونوں ہی صورتوں میں اگر انتخابات میں حصہ لینے کے ضمن میں میری مولانا مودودی مرحوم ہی کی ۴۵ء کی تحریر پر مبنی اس تجویز کو قبول کر لیا جائے جو میں نے اگست ۹۵ء کی تقریر میں پیش کی تھی اور "میثاق" کے اکتوبر ۹۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی تو میں اپنی تنظیم کی جانب سے آپ کے دونوں دھڑوں کے ساتھ "وفاق" کی صورت اختیار کرنے کے لئے تیار ہوں---- تاکہ تقسیم در تقسیم اور تفرقہ و انتشار کا عمل کہیں تو رک کر ع "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!" کے مصداق "توفیق و وفاق" اور "توحید و اتحاد" کی جانب رخ کر سکے----- وَمَا عَلَینَا اِلَّا البَلاغ!

مکتوب گرامی مولانا مودودی مرحوم و مغفور

بنام مولانا محمد یونس، حیدر آباد دکن، مارچ ۱۹۴۱ء

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمتہ اللہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ اصطلاح میں بیعت سے مراد اطاعت اور پیروی کا اقرار ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں :

(۱) وہ بیعت جو کسی خاص موقع پر کسی خاص معاملہ کے لئے ہو۔ جیسے بیعت الرضوان تھی کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی افواہ سن کر حضورؐ نے اہل مکہ سے جنگ کا ارادہ فرمایا اور اس وقت صحابہ کرامؓ سے اس امر پر بیعت لی کہ وہ پیش آمدہ مہم میں آپؐ کے ساتھ جانفروشی کریں گے۔

(۲) دوسری وہ بیعت جو تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق و روحانیت کی نیت سے ایک مرشد و معلم اس شخص سے لیتا ہے جو اس کے پاس تربیت حاصل کرنے کے لئے آئے۔ یہ وہ بیعت ہے جو بالعموم ہر شخص کو کرنی پڑتی تھی جو نبی ﷺ کے ہاتھ پر ایمان لاتا تھا۔ آپؐ اس سے اقرار کراتے تھے کہ شرک، زنا، چوری وغیرہ سے پرہیز کرے گا اور جو احکام خداوند تعالیٰ کی طرف سے آپؐ پہنچائیں گے ان کی اطاعت کرے گا۔ اس بیعت کے لینے کا حق یا تو نبیؐ کو پہنچتا ہے یا اس شخص کو جو نبیؐ کے طریقہ پر ہو۔ یعنی طریقہ نبویؐ کا صحیح علم بھی رکھتا ہو، اس پر خود بھی عامل ہو اور بیعت لینے سے اصلاح و ارشاد کے سوا قطعاً دوسری نیت نہ رکھتا ہو۔

(۳) تیسری بیعت وہ ہے جو جماعت اسلامی کے امیر یا امام کے ہاتھ پر کی جاتی ہے اور اس کی نوعیت یہ ہے کہ جب تک امیر یا امام اللہ اور رسولؐ کا مطیع ہے اس وقت تک جماعت اسلامی کے تمام ارکان پر اس کی اطاعت فرض ہے۔

مَن ماتَ ولَيس في عُنقِه بيعةٌ مات ميتةً جاهليةً

اور دوسری تمام احادیث میں جس بیعت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے ان میں بیعت سے مراد تیسری بیعت ہے، کیونکہ اس پر جماعت اسلامی کی زندگی اور اس کے نظم کا قیام منحصر ہے۔ اس سے الگ ہونے یا الگ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ نبیؐ جس کام کے لئے تشریف لائے تھے اور جس امر عظیم کا بار امت پر چھوڑ گئے ہیں اس کو نقصان پہنچایا جائے یا ختم کر دیا جائے۔

خالص دینی جماعت سے علیحدگی

گزشتہ دنوں تنظیم اسلامی کے ایک اہم اور بزرگ رفیق نے بعض معاملات سے بددلی کے باعث تنظیم سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ اس پر جو مختصر خط و کتابت ان کے اور امیر تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے مابین ہوئی اس میں امیر تنظیم کے قلم سے چند ایسے جملے صادر ہوئے جن کو مستقلاً محفوظ رکھنا نہایت مفید ہوگا۔ چنانچہ انہیں ذیل میں شائع کیا جارہا ہے.... الحمدللہ کہ اس خط و کتابت کے نتیجے میں متعلقہ رفیق نے فوراً ہی دوبارہ تنظیم میں شمولیت اختیار کرلی! (ناظم اعلیٰ، تنظیم اسلامی پاکستان)

مکتوب نمبرا

"آپ کے استعفاء کی اطلاع کل صبح ہی فون پر مل گئی تھی۔ اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ میرے لئے تو یہ برادرم اقتدار احمد مرحوم کے سانحۂ ارتحال سے ہرگز کم افسوسناک اور غم انگیز حادثہ نہیں ہے،

تاہم -- بمصداق: "مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ" (التغابن) اور "لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ" (الحدید)

صبر کے سوا چارہ نہیں ہے

فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ!

تنظیم اسلامی میں شمولیت اور علیحدگی کا معاملہ چونکہ عام سیاسی جماعتوں یا سماجی تنظیموں سے بالکل مختلف 'ایک خالص دینی "معاملے" یعنی "بیعت" سے منسلک ہے' لہٰذا:

پہلے بھی واقعہ یہ ہے کہ میں نے اسے آپ کا بہت بڑا ایثار سمجھا تھا کہ آپ مجھ سے "بیعت سمع و طاعت فی المعروف" کے مقدس رشتے میں منسلک ہوئے.... درآنحالیکہ

میرے دل نے ہمیشہ یہ گواہی دی' اور میں برملا اعتراف بھی کرتا رہا (اور مجھے امیدِ واثق ہے کہ آپ نے بھی اس میں ہرگز کسی تکلف یا تصنّع کا شائبہ نہیں محسوس کیا ہو گا) کہ تقویٰ اور تدیّن میں آپ مجھ سے بہت آگے ہیں۔

اور اب بھی میں آپ سے یہ درخواست نہیں کر سکتا کہ آپ لازماً میری "بیعت" کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے رکھیں'

اس لئے کہ یہ کلیتہً آپ کے ایمان اور ضمیر کا معاملہ ہے اور اس میں کسی دوسرے کے کچھ کہنے سننے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

بالخصوص میں تو کچھ بھی عرض نہیں کر سکتا!

البتہ اس خالص دینی معاملے کے ایک اہم پہلو کے بارے میں خالصتاً "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ" کے فرمانِ نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کا حق ادا کرنے کے لئے یہ وضاحت کر رہا ہوں کہ : اس قسم کی "بیعت" سے "رجعت" --- جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں (واللہ اعلم!) صرف حسب ذیل تین صورتوں میں "جائز" ہے :

۱۔ یہ کہ امیر نے کتاب و سنّت کی حدود سے صریح تجاوز کیا ہو اور اس پر مصر بھی ہو۔ [اگرچہ اس معاملے میں حدیثِ نبوی ؐ کے یہ الفاظ کہ : "اِلَّااَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُم فِیْہِ مِنَ اللّٰہِ بُرْھَان" (صحیح مسلمؒ) پیش نظر رکھنے ضروری ہیں!]

۲۔ یہ کہ بیعت کرنے والے کو امیر کی نیت میں کسی قسم کے فتور کا حتمی شائبہ نظر آنے لگے!

۳۔ یہ کہ یہ محسوس ہو کہ طریق کار بحیثیتِ مجموعی اب کسی غلط سمت میں مڑ گیا ہے' یا پہلے ہی سے غلط تھا لیکن بیعت کرنے والے کو اس کا ادراک یا شعور نہ ہو سکا تھا۔ (اس ضمن میں بھی لازم ہے کہ امکانی حد تک افہام و تفہیم کی سعی کے بعد مجبوراً علیحدگی اختیار کی جائے!)

ان تین کے سوا' کوئی بھی صورت میرے نزدیک "جائز" نہیں ہے اور میری ناچیز

رائے میں اس کے ضمن میں "فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ" (الفتح) کے عکس کا اندیشہ موجود ہے۔ واللہ اعلم!

اس کے ساتھ ایک درخواست بھی!

اور وہ یہ کہ اگر آپ کی علیحدگی کا سبب مندرجہ بالا تین اسباب میں سے ہے، تو میری خواہش ہے (بلکہ میں یہ کہنے میں بھی حق بجانب ہوں کہ یہ میرا "حق" ہے) کہ آپ مجھے اس سے "مطلع" ضرور فرمادیں۔ (اگرچہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس سلسلے میں میں ہرگز نہ خود کسی بحث و تمحیص میں الجھوں گا نہ آپ کو الجھانے کی کوشش کروں گا۔ بلکہ ان شاء اللہ العزیز، حتی الامکان اپنے معاملے ہی پر ناقدانہ نگاہِ بازگشت ڈالوں گا۔۔۔ وَاللّٰہ علٰی ما اقول وَکیل!)

لیکن اگر آپ کی علیحدگی کا اصل سبب ان تین کے علاوہ ہے تو پھر یہ آپ کے اور اللہ کے مابین معاملہ ہے، اور اس کی جوابدہی اللہ کے یہاں آپ ہی کو کرنی ہوگی۔

میں صرف اس قدر ضرور عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ :

میں نے اپنے مقدور بھر آپ کی عمر، مرتبے، اور تقویٰ کے متناسب ادب و لحاظ میں جان بوجھ کر کبھی کوئی کمی نہیں کی۔ اگرچہ ذمہ داریوں کی تفویض میں آپ کی عمر، صحت اور آپ کی دوسری مصروفیات کو ضرور ملحوظ رکھا ہے۔

تاہم بفحوائے : "وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ" کے تحت عین ممکن ہے کہ مجھ سے کبھی کوئی تقصیر ہوئی ہو۔

لیکن اس کے ضمن میں بھی دو باتیں سامنے رہنی چاہئیں :

۱۔ یہ کہ امورِ بیعت میں سے ایک "وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا" بھی تھا۔ اور

۲۔ یہ کہ متعدد احادیث میں یہ ہدایتِ عمومی وارد ہوئی ہے کہ : تم اپنے امراء کی زیادتیوں پر صبر کرتے ہوئے، ان کے حقوق ادا کرتے رہنا اور اپنے صبر کے لئے اللہ سے اجر کی توقع رکھنا!" (روایت بالمعنیٰ)

مکتوب نمبر۲

"آگے بڑھنے سے پہلے آپ کے تین "شکریئے" مجھ پر واجب ہیں' ان کو ادا کرلوں :

شکریہ نمبر۱ اس کا کہ آپ ملاقات کے لئے تشریف لائے!

شکریہ نمبر۲ اس کا کہ آپ نے مجھ سے بھی فرمایا---(اور چند دوسرے احباب سے بھی یہی کہا) کہ آپ کی علیحدگی کا سبب ان تین اسباب میں سے کوئی بھی نہیں ہے جنہیں میں نے اپنی تحریر میں درج کیا ہے۔ فَلِلّٰهُ الحَمدُ وَلَکُم الشُّکرا

شکریہ نمبر۳ اس کا کہ آپ "اسلام میں تنظیم کی اہمیت' نوعیت اور اساس" کے موضوع پر میری تقریر کا ویڈیو دیکھنے کے لئے تشریف لے آئے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو ان تمام معاملات پر بھرپور اجر و ثواب عطا فرمائے' آمین!

میں نے جملہ رفقاء و احباب کو ہدایت کردی ہے کہ وہ خواہ مخواہ کی افواہوں پر دھیان نہ دیں۔ اور نہ ہی آپ کو زیادہ پریشان کریں۔ تنظیم اسلامی میں شمولیت کی اساس "بیعت" ہے اور وہ ایک "سہ فریقی" (Tripartite) معاملہ ہے' بیعت کرنے والے' اور جس سے بیعت کی جائے' اور اللہ کے مابین!!--- کسی تیسرے "انسان" کو اس میں کوئی دخل حاصل نہیں ہے۔!

آئندہ کے لئے دو گزارشات پیش خدمت ہیں :

ایک یہ کہ منفی اعتبار سے ان تین امور پر مزید غور جاری رکھئے جن کی بنا پر میری رائے میں اقامتِ دین کے لئے قائم ہونے والی کسی جماعت سے (اور وہ بھی بیعت کی مسنون بنیاد پر!) علیحدگی درست ہے-----

لیکن اس کے ساتھ حسب ذیل امور پر بھی مثبت انداز میں از سرِنو غور فرمالیں :

میرے اب تک کے مطالعۂ قرآن و حدیث و سنّت و سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حاصل یہ ہے کہ :

۱۔ ہر صاحبِ ایمان پر اقامتِ صلوٰۃ ہی کی طرح اقامتِ دین کی جدوجہد بھی فرض عین ہے۔
۲۔ اس کے لئے التزامِ جماعت بالکل اسی طرح کی شرط ہے جیسے نماز کے لئے وضو!!
۳۔ ایسی جماعت کے لئے اگرچہ دوسرے مروّجہ نظام بھی مباح کے درجہ میں ہیں لیکن واحد منصوص' مسنون اور ماثور اساس صرف "بیعتِ سمع وطاعۃ فی المعروف" کی ہے!

تنظیم اسلامی کے بارے میں اگرچہ آپ کی متعدد بار کی گواہی یہ رہی ہے کہ "اس کا ماحول خالص دینی ہے!" تاہم اگر آپ کو اس سے بہتر تنظیم یا جماعت نظر آگئی ہے' تو یہ یقیناً ایک چوتھا جائز سبب ہو سکتا ہے تنظیم اسلامی سے علیحدگی کا!

لیکن اس صورت میں حدیثِ نبوی ؐ ("لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ!") کے مصداق مجھے بھی اس پر لازماً مطلع فرمائیں!

مکتوب نمبر ۳

یہ عریضہ اس پیشگی وضاحت کے ساتھ تحریر کر رہا ہوں کہ میری جانب سے یہ آخری گزارش ہے۔ اس کے بعد میں مزید آپ کو پریشان نہیں کروں گا' اور گیند بالکلیہ آپ کے احاطے میں ہوگی!

مزید تمہید یہ کہ ---- تحریکوں' جماعتوں اور تنظیموں میں آمد و رفت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے' انبیاء کی جماعت میں سے بھی علیحدگی کی مثالیں موجود ہیں' تو تابہ دیگراں چہ رسد؟ (دین کی خدمت و اقامت کے لئے جو لوگ بھی کوئی جماعت قائم کرتے ہیں' ظاہر ہے کہ اپنی بساط کے مطابق اس جماعت ہی کا مصداق بننے کی کوشش کرتے ہیں جس کے بارے میں حضرت معاویہؓ سے آنحضورؐ کے یہ الفاظ مروی ہیں کہ "لَا تَزَالُ مِنْ اُمَّتِیْ اُمَّۃٌ قَائِمِیْنَ بِاَمْرِ اللّٰہِ" ---- اور اس جماعت کے لئے آپؐ کی صراحت ہے کہ: "لَا یَضُرُّھُمْ مَنْ خَذَلَھُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَھُمْ!" (بخاریؒ و مسلمؒ) ---- بنابریں میں نے تنظیم اسلامی کی ۲۰ سالہ تاریخ میں آج تک کسی بھی داغِ مفارقت دے جانے والے کا غیر ضروری

تعاقب نہیں کیا۔ آپ کی خدمت میں یہ تیسرا اور آخری عریضہ بھی صرف اس بنا پر تحریر کر رہا ہوں کہ مجھے آپ کے خلوص و اخلاص پر پورا اعتماد ہے۔

میرے اور آپ کے مابین جو بالواسطہ گفتگو اب تک ہوئی ہے' اس کے دو پہلو ابھر کر سامنے آئے ہیں' جن میں سے ایک کو منفی قرار دیا جا سکتا ہے اور دوسرے کو مثبت:

منفی پہلو ---- جن متعدد امور پر مشتمل ہے ان سب کا لبِ لباب یا حاصلِ جمع میری "نااہلی" قرار پاتی ہے --- اس لئے کہ (i) اگر تحریک میں نظری انقلابیت کے باوجود عملی انقلابیت کا فقدان ہے تو اس کا اصل ذمہ دار بھی میں ہوں (ii) اس طرح اگر میں نے تنظیمی ذمہ داریوں اور مناصب کی تقسیم میں صحیح فیصلے نہیں کئے تو یہ بھی یقیناً میری ناسمجھی ہے ---- وَقِسْ علٰی ذٰلکَ!

میں اپنی ان جملہ نااہلیوں کو صرف قرینِ قیاس و امکان ہی نہیں' لائقِ وثوق و یقین سمجھتا ہوں --- تاہم ان کے ضمن میں دو امور کی جانب توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں:

ایک یہ کہ اہلیت اور نااہلیت کا بنیادی تعلق دو ایسے امور سے ہے جو ہر انسان کے لئے GIVEN کے درجہ میں ہوتے ہیں' یعنی ایک پیدائشی GENES اور دوسرے ماحول' تعلیم' تربیت اور مواقع --- ان ہی دو سے ہر انسان کا "شاکلہ" تیار ہوتا ہے اور اس کی سعی و جہد اور دوڑ دھوپ اس کے اندر اندر ہی ہو سکتی ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم میں بھی "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا" کا مضمون بار بار وارد ہوا ہے۔ اور اس حقیقت کی جانب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی رہنمائی فرمائی ہے کہ: "اِعْمَلُوْا فَکُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ" ---- بہرحال میں اپنے بارے میں ہرگز نہ آج کسی مغالطے میں مبتلا ہوں نہ جولائی ۱۹۷۴ء میں تھا جب میں نے تنظیم کے قیام کے لئے اپنے "عزم" کا اعلان کیا تھا لیکن ایک فرض کا احساس تھا جس نے اُس وقت بھی ع "دل اگفندیم بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖھَا وَمُرْسٰھَا" پر آمادہ کر دیا تھا -- اور وہی اب بھی اپنی بساط و استعداد کے مطابق کام کئے جانے پر مجبور کئے ہوئے ہے! (ملاحظہ ہو تنظیم کا کتابچہ

نمبرا بعنوان "عزم تنظیم ا")

دوسرے یہ کہ افراد کی صلاحیتوں کے "کسر" کا "جبر" اجتماعیت ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے 'یعنی یہ کہ مل جل کر باہمی تنقید و مشورے کے ساتھ 'ایک ٹیم ورک کی سپرٹ سے ایک دوسرے کے "کسر" کا "جبر" کرتے ہوئے آگے بڑھیں --- اور اس سلسلے میں ظاہر ہے کہ "لڑتے جھگڑتے" ہوئے بھی ساتھ چلتے رہنا اس سے بہتر ہے کہ علیحدگی اختیار کر کے اجتماعی مقصد کو نقصان پہنچایا جائے۔ (اِلّا یہ کہ ان چار باتوں میں سے کوئی واقع ہو جائے جن کا پچھلے خطوط میں تذکرہ ہو چکا ہے!)

اس ضمن میں 'معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ 'میرے نزدیک آپ نے شدید "عدم توازن" کی روش اختیار کی۔ کہ میرے "لحاظ" اور "ادب" یا "حجاب" کے باعث وضاحت کے ساتھ بات نہیں کی اور اسے میں آپ کے خلوص و اخلاص کے پیش نظر صرف "عدم توازن" قرار دے رہا ہوں ورنہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ اس سے زیادہ قابلِ اعتراض بات ہے 'اس لئے کہ "بیعت" کے امور میں صراحت کے ساتھ "وَعَلٰی اَنْ اَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنْتُ لَا اَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ" کے الفاظ موجود ہیں۔ مزید برآں یہ کسی بھی اجتماعیت کے مسلّمہ اصولوں میں سے ہے کہ نہ صرف اظہارِ اختلاف بلکہ "اتمامِ حجت" کے بعد ہی علیحدگی اختیار کی جائے!

بہرحال اب بھی 'آپ خواہ تنظیم میں واپس تشریف لائیں یا نہ لائیں 'میرا یہ حق آپ کے ذمہ واجب الادا ہے 'اور اس کی ادائیگی آپ کی ذمہ داری ہے 'اور میری یہ گیند مستقلاً آپ کے احاطے میں رہے گی!

مثبت پہلو کے ضمن میں اللہ کا شکر ہے کہ آپ نے تیسری بار بھی اعتراف کر لیا کہ آپ کی علیحدگی میں نہ ان تین عوامل کو دخل حاصل ہے جن کا ذکر میں نے اپنے پہلے عریضے میں کیا تھا 'نہ اس چوتھے کو جس کا ذکر دوسرے عریضے میں برسبیلِ تذکرہ آگیا تھا۔

البتہ آپ کی جو ایک بات سامنے آئی ہے اس کے ضمن میں ضرور کچھ عرض کرنا

چاہتا ہوں :

یہ بات صدفی صد درست ہے کہ آخرت کا محاسبہ بالکلیہ اور خالصتاً انفرادی ہے لیکن اس کے حوالے سے اجتماعی فرائض سے گریز ہرگز درست نہیں بلکہ وسوسۂ شیطانی کے قبیل کی شے ہے!

جس طرح "اقامت الصلوٰۃ" کے ضمن میں مَردوں کے لئے "التزامِ جماعت" لازم ہے (اِلّا یہ کہ کوئی عذرِ شرعی مانع ہو!) چنانچہ "لَا صَلٰوۃَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ اِلَّا فِی الْمَسْجِدِ" (الحدیث) تک کی تنبیہ موجود ہے۔

اسی طرح "اقامتِ دین" کے لئے بھی "التزامِ جماعت" شرط ہے۔ بلکہ نماز تو تنہا پڑھ کر بھی کسی درجہ میں "ادا" تو ہو جاتی ہے --- اقامتِ دین کی جدوجہد کا تو انفرادی طور پر کوئی امکان ہی موجود نہیں!

ہاں یہ بات ختم نبوت کے بعد کسی بھی معیّن جماعت کے لئے حتمی اور یقینی نہیں ہے! --- تاہم اگر کسی شخص کا موجود الوقت کسی بھی جماعت پر دل نہ ٹھکے --- تو اس کے لئے لازم ہو گا کہ خود کھڑا ہو اور لوگوں کو اپنا ساتھ دینے کی دعوت دے۔

چنانچہ جس طرح ایک امام اور ایک مقتدی کے ساتھ بھی جماعت ہو جاتی ہے، اسی طرح ایک "امیر" اور ایک "مامور" سے بھی یہ تقاضا پورا ہو جائے گا۔ اس میں میرے علم و فہم کی حد تک واحد استثناء اس صورت میں ہے کہ فتنہ اتنا شدید اور گھمبیر ہو جائے کہ انسان کی سمجھ میں ہی نہ آسکے کہ ع "کس طرف جاؤں، کدھر دیکھوں، کسے آواز دوں!" --- لیکن اس صورت میں آبادیوں سے نکل کر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا کر درختوں اور پودوں کی جڑوں سے پیٹ بھرنے کا حکم احادیثِ نبویہؐ میں وارد ہوا ہے۔

فقط والسلام

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

گرفتہ چینیاں احرام و مکّی خفتہ در بطحا!

- ڈاکٹر محبوب الحق: حق تعالیٰ کے محبوب یا صیہونیت کے ایجنٹ؟
- نام نہاد انتخابی اصلاحات یا نظریۂ پاکستان کی حتمی نفی؟
- پاکستان: ایشیائی اتحاد کا مرکزی ستون یا نئے یہودی عالمی مالیاتی استعمار کا بے دام غلام؟ اور
- امریکہ میں انگریزی دورۂ ترجمہ قرآن اور نیویارک میں "انسٹیٹیوٹ آف قرآنک وِزڈم" کا قیام

حالیہ سفر امریکہ سے واپسی پر ۸/ مارچ کو مسجد دار السلام لاہور میں
امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا خطاب

خطبۂ مسنونہ 'سورۃ الاعراف کی آیات ۷۵ '۷۶ '۷۷ کی تلاوت اور ادعیہ ماثورہ کے بعد فرمایا:

حضرات! گزشتہ چھ جمعوں کی غیر حاضری کے بعد آج ملاقات ہو رہی ہے۔ ان میں سے تین جمعے میں نے تسلسل کے ساتھ مسلم سنٹر آف نیویارک میں پڑھائے' جو نیویارک میں کوئینز کے علاقے میں واقع آبادی فلشنگ کے اندر قائم ہے۔ یہ سنٹر وہاں بڑے عرصے سے قائم ہے' لیکن حال ہی میں اس کی بڑی عمدہ اور خوبصورت چار منزلہ عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ نیویارک سے متصل ہی لانگ آئی لینڈ کا علاقہ ہے' جس میں ایک جمعہ بے شور (Bay Shore) کی بستی کے اندر مسجد دار القرآن میں ادا ہوا۔ ایک جمعہ مین ہٹن' جو گویا کہ امریکہ کا قلب ہے' اس میں قائم مسجد الرحمٰن میں پڑھانے کی سعادت نصیب ہوئی' جبکہ

میرے قیام کا آخری جمعہ ساؤتھ نیو جرسی کے علاقے میں مسجد الصفا (ٹرینٹن) میں ادا ہوا۔ چنانچہ اس مرتبہ میں نے پورے چالیس دن وہاں بسر کئے ہیں' لیکن میرا امریکہ کا یہ چلہ "چلۂ قرآن" تھا۔ اس میں نہ تو میرا کوئی ذاتی سفر ہوا' نہ ہی اخبارات سے سرے سے کوئی رابطہ رہا' نہ کبھی ٹیلی ویژن ہی دیکھنے کا موقع ملا۔ گویا میں دنیا سے تقریباً منقطع رہا۔ اگرچہ وہاں پر کبھی کبھی پاکستان کے اخبارات کی کوئی شکل بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے' لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے کہ یہ چلہ درحقیقت دورۂ قرآن یعنی انگریزی زبان میں دورۂ ترجمہ قرآن کے لئے وقف تھا۔

امریکہ میں دورۂ ترجمہ قرآن' بزبان انگریزی

آپ کو یاد ہو گا کہ میں پچھلے سال رمضان المبارک میں وہاں اسی ارادے سے گیا تھا' اس لئے کہ وہاں کے احباب کا بڑا شدید تقاضا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اردو میں تو آپ کا دورۂ ترجمہ قرآن ریکارڈ شدہ ہے اور یہ آڈیو اور ویڈیو کیٹس میں دستیاب ہے' بلکہ اس کے کئی کئی "sets" موجود ہیں' لیکن اگر یہی کام انگریزی میں بھی ہو جائے تو یہ ہماری وہاں کی شدید ضرورت ہے۔ لیکن پچھلی مرتبہ یہ کام اللہ کو منظور نہ تھا۔ میں رمضان المبارک سے قبل وہاں گیا اور اپنے گھٹنوں کا چھوٹا آپریشن کرایا۔ مجھے یہ توقع دلائی گئی تھی کہ تین چار دن کے اندر اندر آپ اپنی معمول کی سرگرمیاں شروع کر سکیں گے۔ لیکن جب میں نے دورۂ ترجمہ شروع کیا تو معلوم ہوا کہ یہ بات محض خام خیالی تھی۔ لہٰذا جب گھٹنوں کے ساتھ ساتھ پورے پاؤں اور پنڈلیوں پر سوجن بہت زیادہ ہو گئی تو مجھے وہ سلسلہ چھوڑنا پڑا۔
اس مرتبہ اللہ کا شکر ہے کہ اگرچہ میرا وہاں پہنچنا تاخیر سے ہوا تھا' لیکن دورۂ ترجمہ کا کام بحسن وخوبی ہوا۔ اور مسلم سنٹر آف نیویارک کی نئی تعمیر شدہ عمارت کا افتتاح ہی گویا کہ دورۂ ترجمہ قرآن سے ہوا۔ بلکہ وہاں کے قوانین کے مطابق ابھی اس کا "قرطاسِ تصرف" (Occupancy Certificate) حاصل نہیں کیا جا سکا تھا۔ اس کے لئے انتہائی دوڑ دھوپ بھی کی گئی' لیکن پھر وہاں کے رفقاء نے یہ فیصلہ کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو' ہم اس کو شروع کر دیں گے۔ لہٰذا وہاں دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز ہو گیا۔ میرے لئے انگریزی میں

دورۂ ترجمہ قرآن اتنی تفصیل اور روانی کے ساتھ ممکن نہیں تھا جس طرح میرا اردو میں دورۂ ترجمہ قرآن ہوتا ہے' اس لئے اس کا نصاب بھی کم رہا اور روزانہ تقریباً آدھا پارہ یا عرف عام کے مطابق اڑھائی پاؤ کی اوسط کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن جاری رہا۔ پچھلے سال مجھے جو چند دن ملے تھے اس میں سورۃ البقرہ اور سورہ آل عمران کا انگریزی ترجمہ مختصر تشریحات کے ساتھ ریکارڈ ہو گیا تھا اور اس کے آڈیو اور ویڈیو تیار ہو گئے تھے۔ اس بار مسلم سنٹر آف نیویارک میں تقریباً سترہ دنوں میں سورۃ النساء سے سورۃ الحجر تک (ساڑھے نو پارے کے لگ بھگ) کی تکمیل ہو گئی۔ آخری عشرے کا وعدہ میں Bay Shore کی مسجد دارالقرآن کا کر چکا تھا' جہاں میں نے انتیسویں اور تیسویں پارے کی تکمیل کی ہے۔ اور اس کے بھی علیحدہ سے آڈیو ویڈیو تیار ہو گئے ہیں۔ گویا کہ اب تک وہاں پر نصف قرآن سے قدرے زائد یعنی سوا پندرہ پارے کا دورۂ ترجمہ قرآن انگریزی میں ریکارڈ ہو گیا ہے۔ اور بقیہ نصف کے لئے ان دونوں مسجدوں سے بڑی پر زور تاکید ہے کہ 'بشرطِ زندگی اور صحت اور حالات کے موافق ہونے کی شرط کے ساتھ' آپ ہماری ہی مسجد میں بقیہ دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل کریں۔ اب یہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ آئندہ سال کیا ہو گا۔ بہرحال میرا یہ پورا مہینہ بلکہ پورا چلہ "اعتکاف بالقرآن" میں گزرا ہے۔ اس میں سے خاص طور پر میرے جو سترہ اٹھارہ دن مسلم سنٹر آف نیویارک کی مسجد میں گزرے ہیں ان میں تو فی الواقع اعتکاف کی کیفیت تھی' اس لئے کہ سیکنڈ فلور پر مسجد تھی اور اس کے ساتھ ہی اسی فلور پر ان کا ایک فلیٹ تھا جس میں میری رہائش تھی' اور مجھے مسجد میں آنے جانے کے لئے جوتے اتارنے یا پہننے بھی نہیں پڑتے تھے' بلکہ اس فلیٹ کا دروازہ گویا مسجد ہی میں کھلتا تھا۔ میں سترہ دن تک وہاں سے نیچے اترا ہی نہیں۔ اس پورے چلے کے دوران قرآن کے ساتھ میرا جو اعتکاف رہا ہے اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے۔

امریکی سیاست کا ایک قابل ذکر پہلو

جیسا کہ میں نے عرض کیا' اس دوران اخبارات سے کوئی رابطہ رہا نہ ٹیلی ویژن سے' نہ ہی وہاں کی سماجی سرگرمیوں سے کوئی تعلق رہا اور نہ میں نے کہیں اور کا سفر کیا۔ لہٰذا اس

مرتبہ میں امریکہ کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات اور اس وقت وہاں پر جو تبدیلیاں آ رہی ہیں ان کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ گزشتہ مرتبہ جب میں حاضر ہوا تھا تو میں نے اس موضوع پر مفصل خطاب کیا تھا' لیکن اس مرتبہ میں اس موضوع پر اظہار خیال نہیں کر رہا' سوائے اس کے کہ ایک نئی بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ امریکہ کے آئندہ ہونے والے صدارتی انتخابات کے لئے ری پبلیکن (Republican) پارٹی کی طرف سے نامزد کردہ ایک امیدوار Buchanan بھی ہے اور یہ گویا اسی طرز فکر کی نمائندگی کر رہے ہیں جو یہودیوں کے بھی خلاف ہے اور تارکین وطن کے بھی۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں امریکہ کو امریکہ بنانا چاہئے' خواہ مخواہ پوری دنیا کا درد سر اپنے سر نہیں لینا چاہئے اور یہ کہ امریکہ کو اصل توجہ اپنے داخلی اور قومی و ملکی مسائل پر مرکوز کرنی چاہئے۔ اور اسے پوری دنیا کا پولیس مین بننے اور پوری دنیا کے لئے ایک نیو ورلڈ آرڈر بنانے کا کھکیڑ مول نہیں لینا چاہئے۔ اس لئے کہ انہیں خوب معلوم ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر دراصل جیو ورلڈ آرڈر ہے۔ یہ بھی درحقیقت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کے بارے میں میں نے پچھلی مرتبہ آکر ایک مفصل تقریر کی تھی کہ امریکہ میں نئے رجحانات اس رخ پر جا رہے ہیں۔ (ملاحظہ ہو میثاق نومبر دسمبر ۱۹۹۵ء) یہی وجہ ہے کہ اب امریکہ کے پریس اور ٹیلی ویژن نے اس شخص کی کردار کشی کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ جس طرح پال فنڈلے نے اپنی کتاب "They dare to speak" میں یہ ثابت کیا تھا کہ یہودیوں کے مفادات کے خلاف امریکہ میں جب بھی کسی نے زبان کھولی تو اس کی سیاسی زندگی ختم کر دی گئی اور اس کی سیاسی موت واقع ہو گئی' اس لئے کہ سارے ذرائع ابلاغ پر یہودیوں کا قبضہ ہے' اسی طرح اب وہی عمل وہاں پر کے حوالے سے شروع ہو چکا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے' یہ اللہ کو معلوم ہے۔

نیویارک میں "IQW" کا قیام

اس مرتبہ میں آپ حضرات کے لئے ایک خوشخبری لے کر آیا ہوں۔ میں نے ابھی فلشنگ' نیویارک کے مسلم سنٹر کا ذکر کیا ہے۔ یہ مرکز وہاں پر بہت عرصے سے قائم ہے' اور

عجیب بات یہ ہے کہ ۱۹۷۹ء میں اپنے پہلے سفر امریکہ کے دوران بھی میں نے کچھ نمازیں اس مسجد میں ادا کی تھیں۔ انجمن خدام القرآن کے مؤسسین میں سے میاں رشید صاحب' جو اب خود بھی امریکہ منتقل ہو گئے ہیں' ان کے صاحبزادے فلشنگ میں مقیم تھے اور میں ان کے پاس ٹھہرا تھا۔ ان دنوں میں نے اس مسجد میں کچھ نمازیں بھی ادا کی تھیں اور کچھ تقاریر بھی کی تھیں۔ ۷۹ء کے بعد جب بھی میں امریکہ گیا ہوں تو چونکہ نیویارک ہی سے داخلہ ہوتا ہے اور وہیں سے روانگی ہوتی ہے اس لئے ہر مرتبہ میری آمد سے اس سنٹر کے ساتھ کچھ نہ کچھ ربط قائم رہتا ہے۔ یہ سنٹر پہلے تو ایک بہت چھوٹے سے فلیٹ میں تھا' پھر انہوں نے ایک پورا مکان لے کر اس میں سے کچھ دیواریں نکال کر ذرا بڑا مرکز بنایا۔ پھر دو تین مراحل طے کرنے کے بعد اب یہ امریکہ میں تعمیر کے جدید معیار کے عین مطابق ایک بہت بڑی چار منزلہ عمارت کی صورت میں تعمیر ہوا ہے۔ اس سنٹر کے ساتھ میرے مسلسل رابطے کا نتیجہ بحمد اللہ یہ نکل رہا ہے کہ اس کے بارے میں اب اصولی طور پر یہ طے ہو گیا ہے کہ اس میں انسٹیٹیوٹ آف قرآنک وِزڈم (IQW) قائم کیا جائے گا' جو درحقیقت میری ہی سربراہی میں کام کرے گا۔ وہاں پر میری حیثیت پروفیسر امرطس (Professor Emeritus) کی ہوگی اور پھر میرا ہی کوئی شاگرد وہاں پر مستقل طور پر ہمہ وقت ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرے گا۔

آپ حضرات کے علم میں ہے کہ علم قرآن اور فہم قرآن کی بہت سی سطحیں ہیں جن میں اولین تو تذکر بالقرآن ہے۔ یعنی قرآن مجید کا سرسری مطالعہ اس انداز سے کرنا کہ اس سے انسان کو قرآن کا اصل پیغام حاصل ہو جائے' جس کے اعتبار سے قرآن حکیم نہایت آسان کتاب ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی : وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ "اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لئے آسان کر دیا ہے' تو ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا؟" دوسرا درجہ تدبرِ قرآن کا ہے' یعنی قرآن کی گہرائیوں کے اندر اترنا' اس کی حکمت' اس کے علوم وہدایات اور اس کی معرفت سے حصہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ پھر تدبر کی بھی مختلف سطحیں اور درجات ہیں۔ ایک درجہ تو یہ ہے کہ سوشل سائنسز اور عمرانیات مثلاً پولٹیکل سائنس' نفسیات' معاشیات' تاریخ اور فلسفہ تاریخ

وغیرہ کے ضمن میں قرآن مجید کی ہدایت و راہنمائی کو اجاگر کیا جائے' کیونکہ آج کل عملی طور پر یہ مسائل زیادہ اہم ہیں۔ اور الحمدللہ اس سطح پر وہاں اس کام کا آغاز پہلے سے ہو چکا ہے۔ لیکن اس مرکز کے لئے میرے پیش نظر جو کام ہے وہ اس سے بلند تر سطح کا ہے اور اس پر تاحال اگر کوئی کام ہوا ہے تو صرف پاک و ہند میں ہوا ہے۔ یہ علامہ اقبال کے خطبات "Reconstruction of Religious Thought in Islam" کی سطح ہے۔ یعنی مابعد الطبیعیات (Metaphysics) اور فلسفہ و تصوف اور شاعری کی اعلیٰ ترین فلسفیانہ سطح' جس کے لئے میں حکمت قرآنی (Quranic Wisdom) کی اصطلاح استعمال کرتا ہوں۔ "حکمت" کی اصطلاح خود قرآن کریم کی اپنی اصطلاح ہے۔ سورۃ البقرہ (آیت ۲۶۹) میں فرمایا گیا : يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا "اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جسے حکمت عطا فرمادی گئی اسے تو گویا کہ خیرِ کثیر عطا کر دیا گیا"۔ تو میرے نزدیک حکمتِ قرآنی کے حوالے سے اس وقت سب سے بڑھ کر ضرورت اس بات کی ہے کہ فلسفے کی سطح پر' مابعد الطبیعیات کی سطح پر' اخلاقیات کی سطح پر' قرآن حکیم کی روشنی میں ان مسائل پر غور و خوض کیا جائے جن کا تعلق تصوف کی بلند تر سطح سے بھی ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں ہم نے پچھلے سال یہاں بھی "مسائلِ حکمت" کے عنوان سے ایک تربیت گاہ کا انعقاد کیا تھا۔ تو اسی طرح کا کام کرنے کے لئے ایک انسٹیٹیوٹ آف قرآنک وِزڈم ان شاء اللہ العزیز وہاں کام کرنا شروع کردے گا جس کے ساتھ میرا مسلسل رابطہ رہے گا۔

میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے کہ میں ہر سال ایک مہینہ انہیں دیا کروں گا۔ پھر یہ کہ ابتداءً تو یہاں سے ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب وہاں جائیں گے' لیکن پھر مستقل انتظام کے لئے بھی ہمارے پاس ایک آدمی الحمدللہ تیار ہو چکا ہے۔ یہ وہیں کے ایک نوجوان باسط بلال ہیں جنہوں نے یہاں آ کر ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس مکمل کیا ہے۔ انہوں نے پہلے پولٹیکل سائنس میں ایم اے کیا اور پھر Hart fort Seminary سے اسلامک سٹڈیز میں ایم اے کیا۔ اس جیسے اعلیٰ ترین سطح کے مشنری اداروں میں عیسائیوں کے زیر سایہ اسلامک سٹڈیز کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے اصل فکر و فلسفے پر اور اپنے دین کی اصل

بنیادوں پر قائم رہنا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے جو ان پر اس شکل ہوا ہے۔ پھر ان کا رابطہ مجھ سے ہوا تو وہ یہاں آئے اور ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس میں وقت صرف کیا۔ اس کے بعد انہوں نے کچھ مزید علوم کی تحصیل کی۔ ابھی وہ یہیں ہیں' لیکن ان شاء اللہ وہ وہاں واپس جاکر ہمارے اس انسٹیٹیوٹ کے مستقل ڈائریکٹر ہوں گے۔

میں نے باسط بلال کا قدرے مفصل تعارف اس لئے بھی کرادیا ہے کہ پاکستان سے واپس جانے سے قبل میں یہاں لاہور میں ان کا ایک پروگرام رکھوانا چاہ رہا ہوں۔ اور وہ اس بار ہمارے سالانہ "محاضرات قرآنی" میں لیکچر دیں گے۔ (یہ محاضرات قرآنی ان شاء اللہ ۱۹ تا ۲۱ اپریل کو قرآن آڈیٹوریم لاہور میں ہوں گے) ان کے لیکچرز کا عنوان ہوگا :

"Modern man on the verge of Post Modernism between Nietzsche and Iqbal"

مغرب میں جدیدیت کا نیا تصور

جیسا کہ میں نے عرض کیا مابعد الطبیعیاتی سطح پر کام اولاً صرف علامہ اقبال نے کیا ہے۔ اور اقبال کے بعد ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے کیا ہے۔ علامہ اقبال کی طرح ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم بھی لاہور ہی میں مدفون ہیں۔ ان دو کے علاوہ اس سطح پر پورے عالم اسلام میں کسی شخص نے یہ کام نہیں کیا۔ ہمارے محاضرات میں جناب باسط بلال کی گفتگو اسی پہلو سے ہوگی۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں جس چیز کو "Modernism" یا "Modernity" (جدیدیت) سمجھا جارہا ہے اور ہمارے ہاں کے دانشور اور مغرب پرست لوگ خصوصاً خواتین کا طبقہ مغرب کی جس بھونڈے طریقے سے نقالی کررہا ہے وہ چیز تو درحقیقت مغرب میں داستان پارینہ بن چکی ہے۔ فکر کی سطح پر اور اعلیٰ نظریاتی سطح پر مغرب میں ان چیزوں کو مسترد کیا جاچکا ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ ان کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں کو از سرنو چچوڑنے کی فکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ وہ بات ہے جس کو یہاں کھل کر بیان کرنے کی ضرورت ہے کہ تم کن سایوں کے پیچھے بھاگ رہے ہو۔ اہل مغرب تو ان چیزوں کو استعمال کرنے کے بعد اب ترک بھی کرچکے ہیں۔ وہاں وہ تصورات و نظریات اب مسترد ہوچکے ہیں جن کے بارے

میں ہم آج یہ سمجھتے ہیں کہ وہ فکر انسانی کی معراج ہیں۔ اس اعتبار سے اس نوجوان کے لیکچرز کے لئے آپ اپنے آپ کو ذہنًا تیار کیجئے اور اپنے اپنے حلقہ اثر میں فلسفہ اور انگلش لٹریچر سے دلچسپی رکھنے والے دوست احباب کو بھی ان محاضرات میں شرکت کے لئے آمادہ کیجئے۔

قومی و ملکی حالات پر تبصرہ

اب آیئے اپنے ملکی حالات کی طرف۔ اُدھر تو میں آپ کے لئے یہ خوش خبری لے کر آیا ہوں اور اِدھر آکر جو دیکھا تو نظر آیا کہ اس ڈیڑھ مہینے کے اندر صورتحال اور زیادہ گھمبیر ہوئی ہے۔ گویا ع "گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!" یعنی چینیوں نے تو احرام باندھ لئے ہیں اور مکے کے رہنے والے ابھی وادیٔ بطحا کے اندر سوئے ہوئے ہیں۔ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ امریکی تو اسلام کے لئے کام کرنے کو کمر کس رہے ہیں' لیکن پاکستان جو کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے وجود میں لایا گیا تھا اس کے رہنے والے صرف خواب غفلت میں سو ہی نہیں رہے بلکہ اس اعتبار سے تو ایک رجعت قہقری اور ایک ترقی معکوس ہو رہی ہے۔ ہم دن بدن اپنی "منزل مراد" سے پیچھے ہٹتے چلے جا رہے ہیں اور اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان سیکولرزم کی طرف بڑی تیزی کے ساتھ بگٹٹ رواں دواں ہے۔ اس موضوع پر میں نے دسمبر ۱۹۹۲ء میں نوائے وقت میں دو کالم لکھے تھے اور واقعہ یہ ہے کہ ایک ساتھی کے توجہ دلانے پر میں نے انہیں دوبارہ پڑھا تو میں خود حیران رہ گیا کہ میں یہ باتیں اتنے عرصے پہلے کہہ چکا ہوں۔ (یہ تحریر ۲۶ مارچ ۹۶ء کے ندائے خلافت میں دوبارہ شائع کر دی گئی ہے) اُس وقت میں نے کہا تھا کہ پاکستان سیکولرزم اور مسلم فنڈا مینٹلزم کے دوراہے پر کھڑا ہے۔ لیکن یہ ساڑھے تین سال پہلے کی بات ہے اور اب وہ اس دوراہے سے بہت آگے نکل گیا ہے اور تیزی کے ساتھ سیکولرزم کی طرف بگٹٹ رواں دواں ہے۔

پاکستان ----- دوراہے پر!

دوسرے یہ کہ پاکستان عالم اسلام کے اتحاد کے ضمن میں اہم کردار ادا کر سکتا تھا۔ میں

نے بارہا بیان کیا ہے کہ عالم اسلام کے اتحاد کے سلسلے میں خاص طور پر ایران' افغانستان' پاکستان اور روسی ترکستان کی نو آزاد ریاستوں پر مشتمل ایک بلاک بنایا جائے۔ اور اس میں قائدانہ (leading) رول پاکستان ادا کرے۔ اور پھر یہ کہ ایشیا کی دو بڑی طاقتوں یعنی چین اور بھارت کے ساتھ اس مسلم بلاک کے کچھ قریبی دوستانہ روابط ہوں' ان کے مابین تجارتی تعلقات ہوں اور باہمی تعاون ہو۔ اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمارے لئے دوسرا راستہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ ہم نئے عالمی مالیاتی یہودی استعمار کے بے دام غلام بن جائیں۔ ایک دوراہا تو میں نے اپنی اندرونی سیاست سے متعلق بیان کیا ہے جس پر ہم چار سال پہلے کھڑے تھے کہ آیا ہم اسلام کی طرف بڑھتے ہیں یا سیکولرازم کی طرف جاتے ہیں۔ اور آج ہم اس دوراہے سے بہت آگے سیکولرازم کی طرف نکل آئے ہیں۔ اب بھی اگر قوم میں یہ شعور پیدا ہو جائے اور یہ صحیح رخ پر قدم بڑھانے کے لئے تیار ہو جائے تو شاید بریک لگایا جا سکے۔ لیکن دوسرا دوراہا عالمی سطح پر ہے جس پر میں مفصل تقریریں کر چکا ہوں کہ ہمارے لئے اب دو رول ہیں اور ان میں سے ایک رول بڑی جرأتِ رندانہ اور ہمتِ مردانہ کا متقاضی ہے۔ یہ "لڑا دے ممولے کو شہباز سے" والی صورت حال کا متقاضی ہے اور وہ یہ ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر کے نام سے جو نیا عالمی مالیاتی یہودی استعمار آ رہا ہے ہم اس کا مقابلہ کرنے کی غرض سے ایک مسلم بلاک بنائیں۔ میں نے ایک خطاب میں عالم اسلام پر مغرب کی یلغار کے تین ادوار گنوائے تھے۔ ایک دور صلیبی جنگوں کا دور تھا جس کے اندر بے پناہ خون ریزی ہوئی اور ایک عرصے تک مسجد اقصیٰ اور یروشلم عیسائیوں کے قبضے میں رہا' لیکن مغربی اقوام یا عیسائی اقوام عالم اسلام پر مستقل قبضہ نہیں کر سکیں۔ یہ تو سمجھئے کہ ۱۰۰۰۔ ۱۱۰۰ء یعنی آج سے آٹھ نو سو سال قبل کی بات ہے۔ اس کے بعد آج سے چار پانچ سو سال قبل عالم اسلام پر براہ راست قبضہ کرنے کے لئے مغربی طاقتوں کا نو آبادیاتی (Colonial) استعمار شروع ہوا۔ چنانچہ کہیں ولندیزیوں نے اپنے پنجے گاڑ لئے تو کہیں فرانسیسیوں نے' کہیں پر اطالوی قابض ہو گئے اور کہیں پر برطانوی۔ اس نو آبادیاتی استعمار کا آغاز ہسپانیہ پر عیسائیوں کے قبضے کے بعد سے ہوا۔ ۱۴۹۲ء میں سقوط غرناطہ ہوا اور ۱۴۹۸ء میں واسکوڈے گاما نے راس امید کا چکر لگا کر راستہ تلاش کیا اور اس راستے سے پھر جو سیلاب مغرب کی

طرف سے شروع ہوا وہ اس صدی کے آغاز پر سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے پر منتج ہوا۔ اس طرح پورا عالم اسلام نو آبادیاتی طاقتوں کی گرفت کے اندر آگیا۔ مقبوضہ ممالک میں آزادی کی تحریکیں چلیں تو اس براہ راست غلامی کی زنجیریں ٹوٹنی شروع ہوئیں۔ چنانچہ ہندوستان سے انگریز چلے گئے' الجزائر سے فرانسیسی چلے گئے' لیبیا سے اطالوی چلے گئے' انڈونیشیا سے ولندیزی چلے گئے' لیکن ابھی اس استعمار کی بساط پوری طرح تہہ نہیں ہوئی تھی کہ ایک نیا استعمار سر اٹھائے چلے آرہا ہے۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا!

یہ نیا استعمار "نیو ورلڈ آرڈر" کے عنوان سے آرہا ہے' جس کا مقصد براہ راست قبضہ نہیں ہے' بلکہ یہ صرف مالیاتی استعمار ہے۔ یعنی ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے ذریعے سے پوری دنیا کو معاشی شکنجے میں جکڑ لیا جائے اور ان کی تمام محنتوں کے اصل ثمرات حاصل کئے جائیں۔ میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ "نیو ورلڈ آرڈر" دراصل "جیو ورلڈ آرڈر" ہے اور یہود کے نزدیک تمام غیر یہودی جنٹائلز اور گوئمز ہیں' انسان نما حیوان ہیں۔ یہود کا فلسفہ یہ ہے کہ انہیں پوری نوع انسانی پر افضلیت حاصل ہے اور باقی پوری نوع انسانی کی حیثیت ان کے خدمت گاروں کی سی ہے' لہٰذا پوری دنیا کے انسانوں کی محنت کی کمائی یہود کو ملنی چاہئے۔ ان کو بس اتنا ملتا رہے کہ اگلے روز بھی محنت کرنے کے قابل ہوں' جیسے گھوڑے کو اگر اگلے روز بھی ٹانگے میں جوتنا ہو تو شام کو اسے کچھ نہ کچھ دانہ ڈالنا چاہئے اور کچھ گھاس کھلانا چاہئے تاکہ وہ اگلے روز کام کے قابل رہ سکے۔ اسی درجے میں بقیہ نوع انسانی کا اپنی محنت کی کمائی پر حق ہے۔ ورنہ اصل میں انسان تو صرف یہودی ہیں' باقی جو بھی ہیں یہ گوئمز ہیں' جنٹائلز ہیں' انسانوں کی شکل میں حیوان ہیں' ان کا استحصال کرنا ہمارا حق ہے' لہٰذا اس مالیاتی استعمار میں جکڑ کر ان کی ساری محنتوں کی ملائی اور مکھن ہم کھائیں اور ادور چھاچھ وغیرہ کبھی ان کے حوالے بھی کر دیا کریں۔ یہ استعمار جو چلا آرہا ہے اس کے راستے میں ایک مؤثر رکاوٹ صرف یہ مجوزہ مسلم بلاک بن سکتا ہے۔ اس لئے کہ عالم عرب تو اس کے آگے

سرنگوں ہی نہیں سرنگوں ہو چکا ہے۔ اب تو یہی ایران' افغانستان' پاکستان اور روسی ترکستان ہیں جن کا ایک بلاک بنے اور پھر مشرق کے دو بڑے ممالک بھارت اور چین کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم ہوں۔ ایک رول تو یہ ہے جو ہم ادا کر سکتے ہیں۔

دوسرا متبادل رول یہ ہے کہ آپ اس استعمار کے آلہ کار بن جائیں' اس کے بے دام غلام بن جائیں۔ یہ "بے دام" کا لفظ میں خاص طور پر استعمال کر رہا ہوں' اس لئے کہ پہلے ہم غلامی کرتے تھے تو کچھ قیمت بھی وصول کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دنیا بائی پولر (Bi-Polar) تھی' جس میں ایک طرف روس (USSR) ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے موجود تھا اور دوسری طرف امریکہ اور اس کا بلاک تھا۔ تو ہمارے جیسے چھوٹے ملک اگر کسی کے ہاتھ بکتے بھی تھے تو اپنی قیمت وصول کر سکتے تھے۔ لیکن اب کس سے قیمت وصول کریں اور کس بنیاد پر کسی کو بلیک میل کریں؟ چنانچہ معلوم ہوا کہ اب تو بے دام غلامی ہے' جس کا سب سے بڑا مظہر حال ہی میں سامنے آیا ہے کہ پاکستان میں امریکہ کے سفیر صاحب نے کھل کر بیان دے دیا ہے کہ پاکستان نے اگر ہماری شرائط پر دوستی کرنی ہے تو کرے' ورنہ کوئی اور دوست تلاش کر لے۔ انہیں معلوم ہے کہ اور ہے کون؟ لہٰذا اسے چاروناچار "اسی تنخواہ" پر کام کرنا پڑے گا۔ تو ہماری صورت حال تو واقعتاً یہ ہے کہ ہم ان کے بے دام غلام بن چکے ہیں اور ان کی پالیسیوں پر پورے طریقے سے عمل پیرا ہیں۔ اگر وہ کچھ عنایت کر دیں یا ان کی طرف سے کچھ چھوٹ ہو جائے تو یہ ان کا لطف و کرم ہے۔ چنانچہ کبھی کسی وقت ہمیں کوئی ترمیم کی خوشخبری سنا کر گویا "گاجر" دکھادی جاتی ہے اور کبھی ان کی طرف سے دھمکیاں آ جاتی ہیں۔ گویا ہم پوری طرح ان کی "کیرٹ اینڈ سٹک" (Carrot and Stick) پالیسی کے رحم و کرم پر ہیں اور ان کے بے دام غلام بن چکے ہیں۔

ڈاکٹر محبوب الحق کی ہرزہ سرائی

دوسری طرف اس سے بھی بڑھ کر بات یہ ہوئی ہے کہ ورلڈ بینک کا ایک گماشتہ ڈاکٹر محبوب الحق اسلامیانِ ہند کی نصف صدی کی قومی جدوجہد کو بیک جنبشِ قلم منسوخ کرنے پر

اتر آیا ہے۔ پاکستان کا قیام اسلامیان ہند کی پچاس برس کی محنت اور جدوجہد کا ثمرہ تھا۔ اور اس جدوجہد میں بڑا حصہ بھارت کے مسلمانوں کا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی تھی اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہوا۔ اس طرح اسلامیانِ ہند کی جدّوجہدِ آزادی قریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ لیکن انہوں نے بڑے آرام سے کہہ دیا کہ "میں تو سوچتا ہوں اور میرے بچے بھی یہ سوچتے ہیں کہ اب ان کو (پاکستان اور بھارت کو) ایک ہی ہو جانا چاہئے"۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "میں جب جموں سے بھاگ کر گیا تھا......." میں تو ان کا یہ بیان پڑھ کر حیران ہوا اور میں سوچتا رہا کہ یہی کشمیر تھا جہاں سے علامہ اقبال کے آباء و اجداد آئے تھے۔ پھر یہ جموں کے ہیں اور جموں ہی کے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم تھے' تو ایک ہی سرزمین سے کون کون پیدا ہوتا ہے۔ ایک ہی سرزمین سے ابوجہل بھی پیدا ہوتا ہے اور ابوبکر صدیق ؓ بھی پیدا ہوتے ہیں۔ انہوں نے پاکستان' تحریک پاکستان اور نظریہ پاکستان کی جس طور سے نفی کی ہے اس پر مجھے سخت صدمہ پہنچا ہے۔ دراصل انہوں نے یہ باتیں "ورلڈ بینک" کے گماشتے کی حیثیت سے کہی ہیں اور ورلڈ بینک کے بارے میں یہ جان لیجئے کہ اس کا قیام اسرائیل کے قیام کے فوراً بعد عمل میں آیا۔ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل قائم ہوا اور ۱۹۵۰ء میں ورلڈ بینک قائم ہو گیا۔ یہودی مالیاتی استعمار کا جو سب سے بڑا اور سب سے پہلا ادارہ وجود میں آیا وہ یہی ورلڈ بینک ہے۔

وطن کی فکر کر ناداں!

جہاں تک ہمارے دینی و مذہبی عناصر کا تعلق ہے تو ان کا معاملہ کسی طرح بھی قابل اطمینان نہیں ہے۔ وہی تفرقہ ہے' وہی تقسیم در تقسیم ہے اور وہی کشاکشِ اقتدار کی حاشیہ برداری ہے۔ ملک میں دو جماعتی سیاست کا جو رجحان پیدا ہو چکا ہے اس کے اعتبار سے پھر کمریں کسی جا رہی ہیں اور اس طرح کے شوشے چھوڑے جا رہے ہیں کہ اگر نواز شریف ہماری قیادت قبول کر لے تو ہم اس کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ اور اگر نواز شریف کہہ دے کہ اسلام قائم کروں گا تو ہم اس کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ یعنی ہم تو ساتھ دینے کو تیار ہیں' تم خدارا کوئی ایسا لفظ کہہ دو جس سے ہماری عزت کا کچھ بھرم رہ جائے۔ اسے پنجابی کہتے ہیں

"چور نالوں پنڈ کاہلی" - یہ حال ہے کہ اس کشاکش اقتدار کے سوا کوئی راستہ سوجھ نہیں رہا۔ لہٰذا اسی کی حاشیہ برداری پر مجبور ہیں۔ اب اس پر میں کیا کہہ سکتا ہوں؟

علامہ اقبال کی جو سب سے زیادہ معرکتہ الآرا نظم ہے وہ "ابلیس کی مجلس شوریٰ" ہے' جو درحقیقت ملتِ اسلامیہ کے نام علامہ اقبال کے پیغام کا نچوڑ ہے۔ اس لئے کہ کسی بھی مفکر یا فلسفی کا اصل فکر اس کی آخری عمر کے دور ہی میں سامنے آتا ہے۔ نبی کا معاملہ تو یہ نہیں ہوتا' کیونکہ وہ تو پہلے روز ہی سے وحی کے ذریعے اللہ سے براہ راست علم حاصل کر رہا ہوتا ہے۔ البتہ ایک عام مفکر اور فلسفی کی فکر ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے اور بہت سی منزلوں سے گزرتے ہوئے کہیں جا کر پختگی کو پہنچتی ہے۔ "ابلیس کی مجلس شوریٰ" ارمغانِ حجاز کی نظم ہے اور یہ کتاب ان کی زندگی میں شائع بھی نہیں ہو سکی تھی' بعد میں شائع ہوئی ہے۔ اگر آپ کو ملتِ اسلامیہ کے نام اقبال کے پیغام کا خلاصہ نہایت شاندار اور نہایت مختصر الفاظ میں دیکھنا ہے تو وہ "ابلیس کی مجلس شوریٰ" ہے۔ اس کے آغاز میں تمہید ہے جس میں کہ ابلیس نے اپنی مجلس شوریٰ کا افتتاح "فرماتے" ہوئے چھوٹا سا خطاب "فرمایا" ہے۔ اس میں ایک شعر آیا ہے۔

اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں!

کاف و نون سے اصل میں مراد لفظ "کُن" ہے جس سے یہ کائنات وجود میں آئی۔ تو ابلیس کہہ رہا ہے کہ وہ اللہ جس نے اس کائنات کو لفظ "کُن" سے پیدا کیا تھا' اب نظریہ آ رہا ہے کہ اب وہ خود اس کی بربادی کا فیصلہ کر چکا ہے۔

یہ عناصر کا پرانا کھیل یہ دنیائے دوں
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں!

اس لئے کہ فرشتوں نے تو کہا تھا کہ یا اللہ ہم حاضر ہیں' نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ' ہم آپ کی تسبیح و تحمید اور تقدیس میں لگے ہوئے ہیں' تو یہ خلافتِ ارضی کسی اور کو دینے کی ضرورت کیا ہے؟ ہم آپ کے نیازمند ہیں' آپ کے خادم ہیں۔ تو یہ جو انسان کو خلافتِ ارضی عطا کی گئی یہ گویا ؏ "ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں"

تھا۔ مذکورہ بالا دونوں شعروں کی ترتیب دراصل یوں ہے۔

یہ عناصر کا پرانا کھیل یہ دنیائے دوں
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں!
اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں!

مجھے تو اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ 'خاکم بدہن' شاید پاکستان کی بربادی کا کوئی فیصلہ ملأ اعلیٰ میں ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ میری اس بات کو غلط ثابت فرمادے۔ لیکن آثار سے تو یہی دکھائی دیتا ہے۔(Coming events cast their shadows before)اور جس طرح ہم سیکولرزم کی طرف اب بگٹٹ بھاگے جارہے ہیں وہ پاکستان کی نفی ہے 'دو قومی نظریئے کی نفی ہے۔ یہ ملک دو قومی نظریئے کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا اور جداگانہ انتخاب دو قومی نظریئے کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ اب چونکہ اسی سے پسپائی ہو رہی ہے اور قومی سطح پر دھڑلے کے ساتھ ہو رہی ہے لہٰذا اس کے بعد اس ملک کے لئے کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہے گی۔ اقلیتوں کو دوہرے ووٹ کا حق دینے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور اس کے لئے اب قانون پاس ہو گا اور ظاہر بات ہے کہ اس کے لئے انہیں قومی اسمبلی میں صرف ۵۱ فیصد اکثریت چاہئے جو انہیں مل جائے گی اور قانون پاس ہو جائے گا۔ البتہ اگر یہ باقاعدہ طور پر جداگانہ انتخاب کو ختم کر کے مخلوط انتخابات یہاں نافذ کرنا چاہتے ہیں تو دستور میں ترمیم کرنی پڑے گی جس کے لئے دو تہائی اکثریت درکار ہوتی ہے' لیکن اس معاملے میں ترمیم کی احتیاج نہیں ہے۔ واللہ اعلم! دستوری ماہرین اگر چاہیں گے تو مقدمہ کرتے رہیں گے اور سپریم کورٹ میں مقدمہ چلتا رہے گا۔ لیکن بہرحال نظر تو یہ آرہا ہے کہ ہم گویا کہ اپنی تباہی پر اور نظریہ پاکستان سے "تائب" ہونے پر دستخط کر رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ڈاکٹر محبوب الحق بھارت جاکر کھل کر بات کہہ آئے ہیں اور یہاں چونکہ حکومت کرنی ہے لہٰذا کھل کر وہ بات نہیں کہی جاسکتی۔ ان دونوں رویوں میں فرق یہ ہے کہ ایک تو "Cold blooded murder" ہوتا ہے' یعنی کسی کو بڑی سفاکی سے قتل کر دینا۔ میں سمجھتا ہوں کہ محبوب الحق صاحب کا جو بھی "فرمان" ہے یہ اس کا مظہر ہے۔ اور دوسری طرف ہماری حکومت کا طرز عمل

"slow poisoning" کا مظہر ہے' یعنی آہستہ آہستہ تھوڑا سا زہر دے کر کسی کو ختم کرنا۔ اگر جداگانہ انتخابات کا معاملہ ختم ہو کر مخلوط انتخابات کی بات شروع ہو جاتی ہے تو پھر سمجھ لیجئے کہ اس ملک کی نظریاتی اساس ختم ہو چکی' جبکہ اس ملک کی کوئی دوسری اساس سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ بات میں اپنی کتاب "استحکام پاکستان" میں بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ثابت کر چکا ہوں کہ اس ملک کی کوئی تاریخی اساس ہے نہ جغرافیائی اساس ہے' نہ اس کی کوئی قومی اساس ہے نہ نسلی اساس ہے۔ کوئی اساس اور بنیاد اگر ہے تو صرف اسلام ہے۔ اس کے سوا کوئی اور بنیاد سرے سے ہے ہی نہیں۔ اور اگر وہی منہدم ہو گئی تو اس ملک کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

بہرحال یہ جو صورتحال ہے کہ ایک طرف سیکولرزم کی قوتیں اس قدر تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں اور دوسری طرف ہمارے مذہبی و دینی عناصر کا حال یہ ہے کہ وہ نہ صرف تفرقہ و انتشار کا شکار ہیں بلکہ انہیں سیاست بازی کا جو چسکہ پڑ گیا ہے اور کشاکشِ اقتدار کے اندر حصہ لینے کی جو عادت ہو گئی ہے' اس کے باعث ان کا معاملہ زیادہ سے زیادہ گیدڑ بھبکیوں کا رہ گیا ہے' اس کے سوا کچھ نہیں۔ ہماری اس صورتحال پر علامہ اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

دیکھ کعبے میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ
بت کدے میں برہمن کی پختہ زُنّاری بھی دیکھ

قومی و ملکی صورت حال آئینہ قرآنی میں

اپنی قومی و ملکی صورتحال پر مجموعی تبصرہ قرآن حکیم کے الفاظ میں بارہا آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں فکر بھی ہے اور ذکر بھی ہے۔ اور ذکر ایک تو اس پہلو سے کہ یہ اللہ کا ذکر ہے' اللہ کو یاد کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے' پھر یہ یاد دہانی اور نصیحت کے معنوں میں بھی ذکر ہے۔ اور دوسرے ان معنوں میں کہ اس میں تذکرہ موجود ہے آنے والوں کا بھی اور جو پچھلے گزرے ہیں ان کا بھی۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے : فیہ نَبأُ ما قَبلکم وخبرُ ما بعدَکم وحُکمُ ما بَینکم۔ اس

اعتبار سے ہماری داستان اور ہماری تصویر قرآن حکیم کی دو سورتوں میں واضح طور پر موجود ہے۔ نظم کے حوالے سے قرآن حکیم کو سات گروپس میں تقسیم کیا جاتا ہے' جن میں سے ہر گروپ میں کچھ مکی اور کچھ مدنی سورتیں ہیں۔ اس اعتبار سے دوسرے گروپ کی مکی سورتیں الانعام اور الاعراف اور مدنی سورتیں الانفال اور التوبہ ہیں۔ سورۃ الاعراف کی آیات (۱۷۵'۱۷۶'۱۷۷) اور سورۃ التوبہ کی تین آیات (۷۵'۷۶'۷۷) میں ہماری صورتحال کی نقشہ کشی کی گئی ہے۔ ان دونوں مقامات کا تقابل کر کے دیکھئے کہ ان میں عددی اعتبار سے بھی کتنی حیرت انگیز مماثلت ہے۔ دو مکی سورتوں میں سے دوسری سورت سورۃ الاعراف' اور دو مدنی سورتوں میں سے دوسری سورت سورۃ التوبہ ہے' اور پھر ان میں سے مقدم الذکر کی آیات ۱۷۵'۱۷۶'۱۷۷ اور مؤخر الذکر کی آیات ۷۵'۷۶'۷۷ پاکستان کی تشریح پر مشتمل ہیں۔

جہاں تک سورۃ التوبہ کی تین آیات کا تعلق ہے' ان کے بارے میں بارہا مفصل گفتگو کر چکا ہوں' آج "کَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ" کے مصداق صرف یاددہانی کے طور پر حوالہ دے رہا ہوں : وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ "ان (منافقوں میں سے) ایک خاص قسم ان لوگوں کی ہے جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے نواز دے گا (غنی اور دولت مند بنا دے گا) تو خوب صدقہ و خیرات کریں گے اور صالح ہو جائیں گے (بڑے پکے سچے مسلمان بن جائیں گے)" فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ "پھر جب اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا تو انہوں نے بخل سے کام لیا (اپنی جیبیں بھی بند کر لیں اور تجوریوں کے دروازے بھی مقفل کر لئے) اور اعراض کرتے ہوئے پیٹھ موڑ لی (اللہ سے کئے ہوئے وعدے کو بھول گئے)"۔ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ "تو اس کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نفاق کا روگ پیدا کر دیا اس دن تک کے لئے جس دن یہ اللہ سے ملاقات کریں گے۔ یہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی اور اس لئے کہ وہ جھوٹ

بولتے رہے"۔ نَعوذ باللّٰہ مِن ذٰلک! نَعوذ باللّٰہ مِن ذٰلک!! نَعوذ باللّٰہ من ذٰلک!!! سورۃ التوبہ کی ان آیات کو پڑھتے ہوئے میں کانپ جاتا ہوں کہ کہیں خدانخواستہ ہمارے لئے توبہ کا دروازہ بند تو نہیں ہو گیا۔ تاہم میں چاہتا ہوں کہ ان الفاظ سے آپ مایوس نہ ہوں، ابھی وہ "یُغَرغَر" والی کیفیت نہیں آئی۔

یہ الفاظِ قرآنی اُس وقت کے منافقین پر تو صد فیصد نافذ ہو گئے تھے جنہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی تھی۔ اور قریباً یہی معاملہ ملتِ اسلامیہ پاکستان کا ہے کہ ہم نے اعلان کیا: "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!" ہم نے رو رو کر دعائیں کیں کہ اے اللہ ہمیں انگریز اور ہندو کی دوہری غلامی سے نجات دے اور ایک آزاد خطہ ارضی عطا فرما تو ہم وہاں تیرے دین کا بول بالا کریں گے۔ علامہ اقبال نے دسمبر ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں فرمایا کہ اگر ہمیں وہ ملک مل گیا اور ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہو گئی تو اسلام کے چہرے پر دورِ ملوکیت میں جو پردے پڑ گئے تھے ہم انہیں ہٹا کر صحیح اسلامی تعلیمات کا ایک نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔ اور قائداعظم نے اپنی لاتعداد تقاریر میں فرمایا کہ ہمارا دستور قرآن ہے اور ہم پاکستان اس لئے چاہتے ہیں کہ عہدِ حاضر میں اسلام کے اصولِ حریت واخوت ومساوات کا ایک عملی نمونہ پیش کریں۔ لیکن ہم نے کیا نمونہ پیش کیا؟ وہی جاگیرداری اور سرمایہ داری! "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں علامہ اقبال نے ابلیس کا پیغام ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!

اور ہمارا حال واقعتاً یہی ہے، ہمارے وہی لچھن ہیں، وہی قانون ہے، وہی جاگیرداری ہے، وہی زمینداری ہے، وہی بینکنگ ہے، وہی سودی معیشت ہے، وہی ڈیفنس سرٹیفکیٹ ہیں، وہی جوا ہے، وہی سٹہ ہے، سارے دھندے وہی ہیں بلکہ پہلے سے بہت زیادہ۔ بے حیائی و عریانی پہلے سے سوگنا زیادہ ہے۔ اور اس کا نتیجہ "نفاق" کی صورت میں نکل رہا ہے۔ ایک

طرف نفاقِ عملی اور دوسری طرف نفاقِ باہمی۔ چنانچہ قوم قومیتوں میں تقسیم ہو گئی ہے' اب وہ "قوم" کہاں ہے ع ڈھونڈ اب اس کو چراغِ رخِ زیبا لے کر! اب تو قومیتیں ہیں جن کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی طریقے سے نفاق عملی کا معاملہ ہے۔ حدیثِ نبویہ' میں منافق کی جو علامات بیان کی گئی ہیں' یعنی جھوٹ' وعدہ خلافی اور خیانت' وہ بحیثیتِ مجموعی پوری قوم میں پیدا ہو گئی ہیں۔ جیسے حدیث میں آتا ہے کہ جب دجال آئے گا تو اس کی پیشانی پر "ک ف ر" (کفر) لکھا ہوا ہو گا' اسی طرح پاکستان کی سیاست کی پیشانی پر "جھوٹ' وعدہ خلافی اور خیانت" کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں جو جتنا بڑا ہے وہ اتنا ہی بڑا جھوٹا' اتنا ہی بڑا وعدہ خلاف اور اتنا ہی بڑا خائن ہے' اِلّا ما شَاءَ اللّٰہ' وَقَلِیلٌ مَا ھُمْ۔ استثنائی مثالیں تو شاذ کے درجے میں ہوں گی۔ سورۃ التوبہ کی آیات ۷۵' ۷۶' ۷۷ کی روشنی میں ہم اپنی پاکستانی قوم کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔

البتہ سورۃ الاعراف کی آیات ۱۷۵' ۱۷۶' ۱۷۷ میں ایک فرد کی مثال دی گئی ہے:
وَاتْلُ عَلَیْھِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا "(اے نبیؐ) آپ انہیں اس شخص کی خبر سنائیے (اس شخص کے حالات بتائیے) کہ جسے ہم نے اپنی آیات عطا کی تھیں"۔ آپ جانتے ہوں گے کہ "آیات" کا لفظ بہت سے معانی میں آتا ہے۔ چنانچہ آیاتِ قرآنی بھی آیات ہیں' پھر آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی ہیں' آیات معجزات کو بھی کہتے ہیں اور کرامات کو بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ بنی اسرائیل میں سے ایک ایسے شخص کا ذکر ہے جو بڑا باکرامت' بہت بڑا زاہد' عابد اور عالم تھا۔ فَانْسَلَخَ مِنْھَا "تو وہ ان (آیات کی پابندی) سے نکل بھاگا"۔ اس بدبخت نے محض ایک عورت کے عشق میں مبتلا ہو کر اپنے مقام رفیع سے نیچے گرنا شروع کیا۔ "فَانْسَلَخَ مِنْھَا" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ پہلے اس نے خود پسپائی اختیار کی' فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ "اب شیطان اس کے پیچھے لگ گیا"۔ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ شیطان کسی کو از خود گمراہ نہیں کر سکتا۔ بمصداقِ الفاظِ قرآنی: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ "میرے بندوں پر تجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے"۔ گمراہ ہونے کا فیصلہ انسان خود کرتا ہے۔ اسی ابلیس نے قیامت کے دن کھڑے ہو کر کہہ دینا ہے:
فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَکُمْ کہ مجھے ملامت مت کرو' اپنے آپ کو ملامت

کروا یہ کہے گا کہ اللہ نے بھی تم سے ایک وعدہ کیا تھا' وہ سچا وعدہ تھا اور میں نے بھی تم سے ایک وعدہ کیا تھا جو جھوٹا وعدہ تھا' تم نے میرے وعدے کو قبول کیا اور اللہ کے وعدے کو پھینک دیا۔ تو کون مجرم ہے؟ تم یا میں؟ پس مجھے ملامت مت کرو' بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو تو یہ شخص خود اللہ کی آیات کی پابندی سے نکل بھاگا' اب شیطان کو اور کیا چاہئے تھا؟ اس نے اس کا پیچھا کیا۔ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ا "اور وہ انتہائی گمراہ لوگوں میں سے ہو کر رہ گیا"۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا "اور اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیات کے ذریعے بلندی عطا کرتے" یعنی ہم نے اسے جو آیات عطا کی تھیں' اسے جو علم عطا کیا تھا' جو کرامات عطا کی تھیں' جو اسے فہم دیا تھا' جو ہم نے اسے زہد و تقویٰ کی توفیق دی تھی' اگر ہم چاہتے تو اسے مزید بلند مقامات پر پہنچاتے وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ "لیکن وہ بدبخت زمین (اور زمینی خواہشات) ہی کی طرف جھکتا چلا گیا"۔ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ "اور اس نے اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کی" فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ "پس اس کی مثال تو کتے کی سی ہے" اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ "اگر اس کے اوپر تم بوجھ ڈال دو تب بھی ہانپے گا" اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ "اور اسے چھوڑ دو (بوجھ نہ ڈالو) تب بھی ہانپتا رہے گا۔" اس کی زبان باہر نکلی رہے گی۔ میں قبل ازیں اپنے دروس و خطابات میں ان آیات کے مفہوم پر تفصیل سے روشنی ڈال چکا ہوں اور ان کے جو دو معانی ہو سکتے ہیں وہ بیان کر چکا ہوں' اِس وقت صرف حوالہ دے رہا ہوں۔ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا "یہی مثال اس قوم کی ہے جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا"۔ نوٹ کیجئے کہ ایک فرد کی مثال دے کر اسے ایک قوم پر منطبق کیا جا رہا ہے۔ اور اِس وقت اس مثال کا مصداقِ کامل مسلمانانِ پاکستان کی قوم ہے جو عزت و آبرو کے لحاظ سے کتے سے بدتر ہو چکی ہے۔ آپ بین الاقوامی سطح پر اپنی ساکھ کو دیکھئے کہ کس قدر گر چکی ہے کہ آج امریکہ کا سفیر کھڑا ہو کر کہہ دیتا ہے کہ "ہماری شرائط پر دوستی کرنی ہے تو کرو ورنہ کوئی اور دوست تلاش کرو۔" کوئی حد ہے گراوٹ کی!! اور ہمارا حال کیا ہے؟

میرا یہ حال بوٹ کی ٹو چاٹتا ہوں میں
ان کا یہ حکم دیکھ مرے فرش پر نہ رینگ!

یہ حال اس قوم کا ہو چکا ہے جو اللہ کے دین کے نام پر وجود میں آئی تھی۔ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا "یہ مثال اس قوم کی ہے جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا"۔ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ "تو اے نبی آپ یہ قصہ سنا دیجئے شاید کہ وہ غور کریں"۔ شاید کہ ان کو کچھ سوچنے سمجھنے کی اور اپنے گریبانوں میں جھانکنے کی توفیق میسر آ جائے۔

سَاۗءَ مَثَلَاۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝ "بری مثال ہے اس قوم کی کہ جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور اپنی ہی جانوں پر ظلم کیا"۔ اللہ کی آیات کو جھٹلا کر اللہ کا کیا بگاڑا؟ بے عزتی' بے حیثیتی اور ذلت اپنے ہی حصے میں آئی۔ آج ایک طرف بھارت کے خوف سے کانپ رہے ہیں۔ ادھر امریکہ کا دامن پکڑتے ہیں تو وہ دامن جھٹک دیتا ہے۔ اور یہ جان لیجئے پاکستان کا قیام واقعتاً اللہ کی ایک "آیت" یعنی معجزے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی پشت پر اکابرینِ ملت کی چار سو برس کی تجدیدی مساعی ہیں' جن میں شیخ احمد سرہندی' شاہ ولی اللہ دہلوی' سید احمد بریلوی' علامہ اقبال' مولانا مودودی' مولانا الیاس اور شیخ الہند (رحمہم اللہ علیہم) جیسی عظیم شخصیات ہیں۔ پھر قیام پاکستان کے بعد قراردادِ مقاصد کا پاس ہو جانا بھی ایک معجزے سے کم نہیں۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا ہے اس پر "فَانْسَلَخَ مِنْهَا" کے الفاظ صادق آتے ہیں' جن کی میں تشریح کر چکا ہوں۔ اور اس کا نتیجہ جو نکلا ہے وہ ہماری آج کی صورت حال سے عیاں ہے۔

آزادی کی گولڈن جوبلی یا لمحۂ فکریہ؟

ایک بات پر مزید توجہ کر لیجئے۔ یہ رمضان جو ابھی گزرا ہے' اس کی ستائیسویں شب کو پاکستان کی عمرِ عزیز قمری حساب سے پورے پچاس سال ہو چکی ہے۔ قیام پاکستان کے پچیس برس کے بعد ہماری پیٹھ پر عذابِ الٰہی کا ایک شدید کوڑا برسا تھا۔ یہ اتنا بڑا کوڑا تھا کہ ملکِ خداداد پاکستان دو لخت ہو گیا' ہمیں ہندو کے آگے ہتھیار ڈالنے کی شرمناک ذلت کا

سامنا کرنا پڑا اور ہمارے ۹۳ ہزار جنگی قیدی، جن میں سے غالباً ۴ ہزار ریگولر فوجی تھے، سپاہی سے لے کر جرنیل تک، اس ہندو کے قیدی بنے جس پر ہم نے کہیں ہزار برس، کہیں آٹھ سو برس اور کہیں چھ سو برس تک حکومت کی تھی۔ مزید یہ کہ مشرقی پاکستان میں موجود ہمارے اسلحہ کے ذخائر اور بہت بڑی مقدار میں فوجی ساز و سامان پر ہندو فوج کا قبضہ ہو گیا۔ اس طرح سے ایک شرمناک اور ذلت آمیز شکست کی صورت میں بہت بڑا کلنک کا ٹیکہ ہمارے ماتھے پر لگا۔ اب میں یہ سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں کہ اگلے پچیس برس پھر مکمل ہو گئے ہیں۔

الٰہی خیر میرے آشیاں کی
زمیں پر ہیں نگاہیں آسماں کی

اب کہیں وہ بات واقعتاً پوری نہ ہو جائے کہ

اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے کار ساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں!

یہ سلطنتِ خداداد اللہ کی عطا کردہ سلطنت ہے۔ آج (۸ مارچ ۹۶ء) کے نوائے وقت میں پروفیسر مرزا محمد منور صاحب کی ایک نظم پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔ آج سے پہلے انہوں نے ستر کی دہائی میں بھی ایک دردانگیز نظم کہی تھی ع "کہ رہوارِ یقینِ ما بصحرائے گماں گم شد!" اور آج انہوں نے جو کہا ہے وہ بھی بہت صحیح تبصرہ ہے ع "بدخواہ نہ ہو اس کا یہ دولت ہے خداداد!" یہ پاکستان دولتِ خداداد ہے جس کی خیر خواہی ہم پر لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر کوئی شے ملتی ہے اور اگر کوئی احسان ہوتا ہے تو اس کا شکر ادا کرنا لازم ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ○ "اگر تم شکر کرو گے تو ہم تم پر مزید احسانات کریں گے اور اگر تم نے کفرانِ نعمت کا معاملہ کیا تو ہماری سزا بھی بہت سخت ہے"۔

اور اس سزا کے بارے میں میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ سورۃ السجدہ میں دو قسم کے عذابوں کا ذکر آیا ہے۔ سورۃ السجدہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ رسول اللہ ﷺ اسے ہر جمعہ کی صبح کو نمازِ فجر کی پہلی رکعت میں پڑھا کرتے تھے۔ اس کی آیت ۲۱ میں فرمایا گیا:

وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ○

"ہم انہیں لازماً چھوٹے عذاب کا مزہ چکھائیں گے بڑے عذاب سے پہلے شاید کہ یہ لوٹ آئیں"۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے......!

اب پاکستان کی عمر عزیز کے دوسرے پچیس برس پورے ہونے پر مجھے عذاب کے جس کوڑے کا اندیشہ ہے' اللہ کرے کہ وہ اگر آئے بھی تو عذابِ ادنیٰ ہی کا ہو جس سے ہم جاگ جائیں۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ عذابِ اکبر یعنی عذابِ استیصال ہو اور اس کے بعد ع "تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں!" والا معاملہ ہو جائے۔ اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ! بہرحال اپنا طرزِ عمل تو یہ ہے کہ ؎

اے آندھیو سنبھل کے چلو اس دیار میں
امید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم!

ہم نے یہ ملک بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم ایک مہینے سے بھی زیادہ حصار میں محصور رہے تھے جہاں ہر صبح بھی موت تھی اور ہر شام بھی موت تھی۔ صبح و شام حملے ہو رہے تھے۔ وہاں سے نکل کر بیس دن پیدل چل کر فی الواقع آگ اور خون کے دریا عبور کر کے ہم پاکستان پہنچے۔ ہم کیسی کیسی امیدیں لے کر یہاں آئے تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے میں نے تحریک پاکستان میں کم از کم دو سال تک مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں شامل ہو کر بہت بھرپور محنت اور کوشش کی۔ ضلع حصار کی فیڈریشن کا میں جنرل سیکرٹری تھا اور ۱۹۴۶ء میں اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں فیڈریشن کا جو بہت بڑا اجلاس ہوا تھا جس میں قائداعظم تشریف لائے تھے' اس میں ہر ضلع سے فیڈریشن کے دو دو نمائندے شریک ہوئے تھے' اور ضلع حصار سے جو دو نمائندے آئے تھے ان میں سے ایک میں تھا۔ کن تمناؤں اور کن آرزوؤں کے ساتھ' آگ اور خون کے دریا عبور کر کے ہم یہاں آئے تھے' لیکن اب کہاں کھڑے ہیں؟ پچاس برس بیت گئے' لیکن قیام پاکستان کے مقصد کی طرف کوئی

مثبت پیش رفت نہیں ہوئی۔ مجھے اپنی حد تک تو یہ اطمینان ہے کہ میری زندگی میں کوئی دن ایسا نہیں آیا کہ جب اس مقصد سے میری نگاہیں ہٹی ہوں' الحمد للہ میں نے ہمیشہ اسی کے لئے جدوجہد کی ہے' لیکن سوال افراد کا نہیں ہوتا۔ اقبال نے بھی اسی نظم میں ابلیس سے یہ کہلوایا ہے۔

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضوا

لیکن افراد سے کیا ہوتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ قوم کا کیا حال ہے؟ حُکمُ الاکثرِ حُکمُ الکُل۔ اسی حوالے سے عرض کر رہا ہوں کہ اللہ نہ کرے کہ وہ شکل پیدا ہو کہ ہم عذابِ استیصال کی لپیٹ میں آجائیں۔

بہرحال ہمارا طرزِ عمل یہی رہے گا جو سورۃ الاعراف کی آیت ۱۶۴ میں بایں الفاظ مذکور ہوا:

وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا' قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ○

یعنی جب نہی عن المنکر کرنے والوں کو کچھ سمجھانے والوں نے سمجھایا تھا کہ تم اس نابنجار قوم کو نصیحت کر کے کیوں اپنے آپ کو ہلکان کرتے ہو' یہ قوم اب ماننے والی نہیں ہے' اب یا تو اللہ اسے ہلاک کر دے گا یا اسے شدید عذاب سے دوچار کر دے گا' تو نہی عن المنکر کرنے والوں نے جواب دیا تھا کہ ہمیں تو تمہارے رب کے حضور معذرت پیش کرنی ہے (کہ اے اللہ ہم تو آخری سانس تک نہی عن المنکر کا کام کرتے رہے) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں خوفِ خدا پیدا ہو ہی جائے۔ تو یہ امید کا پہلو بھی ہے' جب تک سانس تب تک آس! بہرحال آس نہ بھی ہو تب بھی احساس فرض تو ہے جس کے تحت ہمیں اپنا کام کرتے رہنا ہے۔ بہرحال یہ دو تصویریں ہیں جو قرآن مجید کی تین تین آیات کے حوالے سے میں نے بارہا پیش کی ہیں۔

ڈاکٹر محبوب الحق کے بارے میں جناب الطاف گوہر کا مضمون

● ڈاکٹر محبوب الحق صاحب کے بارے میں میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس ضمن میں میری مشکل آج بہت آسان ہو گئی ہے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ گزشتہ دو دنوں سے میں کس قدر سخت الجھن میں رہا' کیونکہ ان موضوعات پر گفتگو کے لئے بہت وقت چاہئے اور میں ایک ہی نشست میں تین چار موضوعات پر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں ان تمام موضوعات سے کیسے عہدہ برآ ہو سکوں گا۔ لیکن آج کے نوائے وقت میں الطاف گوہر صاحب کا مضمون دیکھا تو اللہ کا شکر ادا کیا۔ یہ مضمون آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ انہوں نے "بوب اور باب" کے حوالے سے اس شخص کا پورا شجرۂ نسب بیان کر دیا ہے۔ میرے علم میں تو یہ باتیں نہیں تھیں جو انہوں نے بیان کر دی ہیں' ورنہ میں یہاں تک تو پہنچ بھی نہیں سکتا تھا۔ الطاف گوہر صاحب کے مضمون سے یہ بات کھلی کہ ایک یہ "بوب" صاحب ہیں اور ایک "باب" صاحب تھے' رابرٹ میکن مارا۔ ان دونوں کا گٹھ جوڑ رہا ہے۔ پاکستانی سیاست کے ہر دور میں گرگٹ کی طرح رنگ بدل کر یہ حکومتی ایوانوں میں موجود رہے اور ورلڈ بینک کے ایجنٹ کے طور پر معاشیات کے میدان میں اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ اس طرح کے لوگوں پر تھالی کے بینگن کی مثال صادق آتی ہے۔ انہیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ تھالی سونے کی ہے' چاندی کی ہے یا پیتل کی! وہ تو کھلم کھلا ورلڈ بینک کے ملازم ہیں اور اس حوالے سے نیو ورلڈ آرڈر کے ایجنٹ!--- انہیں تو اسی حوالے سے اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ بقول شاعر۔

انہی کی محفل سنوارتا ہوں' چراغ میرا ہے' رات ان کی
انہی کی باتیں سنا رہا ہوں' زبان میری ہے' بات ان کی

بین الاقوامی سطح پر یہود کا کردار

میں آپ کو یاد دلا دینا چاہتا ہوں ---- اور میں بڑی تفصیل سے یہ پورا پس منظر آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں' آج پھر تھوڑا سا درد غم آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں ---- کہ ۱۷۷۶ء میں یہودیوں نے آرڈر آف الیومیناٹی قائم کیا تھا۔ امریکہ کے ایک ڈالر کے نوٹ

پر "۱۷۷۶" کی تاریخ بڑے اہتمام سے شائع ہوتی ہے۔ عام امریکی شہری یہ سمجھتا ہے کہ یہ ہمارے سالِ آزادی کی تاریخ ہے جو یہاں درج ہے، حالانکہ دراصل یہ آرڈر آف الیومیناٹی کی تاسیس کا سال ہے۔ اس ادارے کے قیام کے پس پردہ مقاصد کیا تھے؟ دنیا میں کسی بھی جگہ کوئی بھی ذہین فطین اور باصلاحیت آدمی ابھرتا نظر آئے، دنیا میں بالعموم اور عالمِ اسلام میں بالخصوص، اسے فوراً اچک لو۔ خواہ وہ آدمی مذہبی ذہن رکھتا ہو خواہ وہ سیکولر ہو۔ اسے دولت اور شہرت، یا سیکس سکینڈل میں پھنسا کر اپنے قابو میں کرلو۔ اور اسے اپنے مذموم عزائم کی تکمیل میں استعمال کرو۔ اگر وہ قابو میں نہ آئے تو موت کے گھاٹ اتار دو۔ یہ آرڈر آف الیومیناٹی ۱۷۷۶ء سے برسرِعمل ہے۔ اسی آرڈر آف الیومیناٹی کے تحت فری میسن کا قیام عمل میں آیا۔ اسی فری میسن نے ترکی کے ابھرتے ہوئے لیڈر مصطفیٰ کمال پاشا کو اپنے دام میں پھانسا اور اس کے ہاتھوں خلافت کے ادارے کو ختم کرایا۔

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنوں کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

یہ سب کچھ انہوں نے ایک مسلمان کے ہاتھوں کرایا۔ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ حال ہی میں قیامِ امریکہ کے دوران مجھے مولانا مودودی مرحوم کی ایک تقریر کا ریکارڈ ملا ہے۔ ۷۰ء کے الیکشن سے پہلے انہوں نے رشید پارک اچھرہ میں یہ تقریر کی تھی۔ اس میں انہوں نے ہندوستان کی رواں صدی کی تاریخ کا جو تذکرہ کیا اس میں تحریکِ خلافت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، کہ ہندوستان کا مسلمان خلافت کو بچانے کے لئے عظیم ترین قربانیاں دینے پر اتر آیا تھا۔ ہزاروں لوگ اس کی خاطر ہجرت کر گئے، ہزاروں جیلوں میں چلے گئے، خلافت کی حفاظت کے لئے کروڑوں کا چندہ جمع ہوا۔ پورا ہندوستان اس نعرے سے گونج اٹھا:

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

لیکن اس خلافت کی قبا کو ایک ترک لیڈر نے بڑے آرام سے چاک کردیا اور ساری تحریک جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ مدعی سست گواہ چست!! --- یہ کام مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں کرایا گیا جو فری میسن تحریک کا رکن تھا۔

بہرکیف آرڈر آف الیومیناٹی کے قیام کا مقصد یہی تھا کہ جہاں بھی کوئی ذہین آدمی ابھرتا ہوا نظر آئے اسے اچک لو۔ اسے کسی سیکنڈل میں پھانس کر قابو کر لو تاکہ اس کی ذہانت اور صلاحیت کہیں ہمارے خلاف استعمال نہ ہو سکے بلکہ وہ ہمارے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ جائے کہ جہاں چاہیں اسے استعمال کریں۔ اور اگر وہ ہمارے قابو میں نہیں آتا تو اس کا پتہ چاک کر دو۔ لیاقت علی خان کا پتہ بھی اسی وجہ سے چاک کیا گیا۔ آج تک معلوم نہیں ہو سکا کس نے قتل کیا۔ ابھی چند ماہ قبل عمرے کے سفر میں ایک صاحب نے ایک عجیب بات مجھے بتائی۔ میں حیران ہوں میرے علم میں اب تک یہ بات نہیں تھی' اور آپ میں سے بھی شاید بہت سے حضرات کے علم میں نہ ہو۔ وہ صاحب گزشتہ تقریباً تیس برس سے سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ عمر میں مجھ سے شاید ایک دو سال بڑے ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ ۱۹۴۹ء میں کراچی میں جو "پاکستان ڈے پریڈ" ہوئی تھی اس میں چودہ مسلمان ممالک کے فوجی دستوں نے حصہ لیا تھا اور لیاقت علی خان نے اس موقع پر بہانگِ دہل کہہ دیا تھا :

"پوری دنیا سن لے' ہم تنہا نہیں ہیں"۔

لیاقت علی خان کی یہ للکار ناقابل معافی تھی۔ چودہ مسلم ممالک کے فوجی دستوں کی مشترک پریڈ دشمنان اسلام کے لئے خطرے کی ایک بہت بڑی گھنٹی تھی۔ گویا کہ پین اسلام ازم کا وہ خواب جو کبھی سید جمال الدین افغانی نے دیکھا تھا' اس کی ایک جھلک دنیا نے پاکستان ڈے پریڈ کی صورت میں دیکھ لی۔ یہ خوف ہندو کے سر پر بھی مسلط تھا۔ چنانچہ گاندھی جی نے ایک بار قائداعظم سے ملاقات میں نہایت خوف زدہ انداز میں یہ سوال کیا تھا کہ "آپ کے پاکستان کا مطلب پین اسلام تو نہیں ہے ناں؟" انہیں خوب اندازہ تھا کہ ہندو تو صرف ہندوستان میں آباد ہے' جبکہ مسلمان پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ مسلمان اگر ایک امت کی صورت میں متحد ہو گئے تو ہماری کہاں جان بخشی ہو گی۔ یہ تھا جرمِ عظیم لیاقت علی خان کا!

آگے چلئے' شاہ فیصل شہید کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ انہیں ان کے ایک بھتیجے کے ہاتھوں قتل کروایا گیا' جس کا ایک فوٹو اخبارات میں شائع ہوا تھا جس میں ایک یہودی عورت کو اس کی گردن پر سوار دکھایا گیا تھا۔ شاہ فیصل کا جرم یہ تھا کہ وہ عالم اسلام کے اتحاد

کے ایک بہت بڑے سفیر کے طور پر ابھر رہے تھے۔ ذرا ۱۹۷۴ء کی اس عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس کو ذہن میں لایئے جو پاکستان میں منعقد ہوئی تھی اور ہر سو "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا" کے قرآنی الفاظ گونج رہے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو بھی اس سازش کا شکار ہوا۔ اس شخص نے یہ نعرہ لگایا تھا کہ گھاس کھالیں گے لیکن ایٹم بم ضرور بنائیں گے۔ ہنری کسنجر نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ تمہیں سبق سکھادیا جائے گا۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ پاکستان نے اگر ایٹم بم بنالیا تو اصل خطرہ اسرائیل کے لئے ہوگا۔ وہ جانتے ہیں کہ اسرائیل کا توڑ اگر پوری دنیا میں کوئی ہے تو وہ پاکستان ہے۔ خدائی تدبیر دیکھئے' اسرائیل کی ریاست ۴۸ء میں قائم ہوئی' اس سے ایک سال قبل ۴۷ء میں پاکستان قائم ہو گیا۔ جیساکہ ایک حدیث کے الفاظ ہیں : "ما انزل اللّٰہُ مِن داءٍ الا انزل لہ دواءً" کہ اللہ تعالٰی نے کوئی بیماری ایسی نہیں اتاری جس کا علاج نہ اتار دیا ہو' کچھ اس طرح کا معاملہ یہاں بھی نظر آتا ہے--- بہرکیف ایٹم بم بنانے کا اعلان ان کے نزدیک ناقابل معافی جرم تھا۔

اسی طرح کی ایک مثال ڈاکٹر اسمٰعیل راجی الفاروقی کی ہے۔ انہوں نے ایسوسی ایشن آف مسلم سوشل سائنٹسٹس کے نام سے امریکہ میں ایک ادارہ قائم کیا۔ جس کے تحت IIIT یعنی انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ (International Institute of Islamic Thought) کا قیام عمل میں آیا' لیکن پھر انہیں بیوی سمیت قتل کرادیا گیا۔ فکر کے میدان میں کسی مسلمان کا ابھر کر سامنے آنا اور معاشیات اور سیاسیات کے میدان میں اسلام کی تعلیمات کو اجاگر کرنے کے لئے امریکہ میں علمی ادارے کا قیام انہیں گوارا نہ تھا۔ اسی طرح کا معاملہ ہوا عمران خان کے ساتھ۔ وہ شخص بہرحال ایک ہیرو کی حیثیت سے ابھر آیا تھا۔ اسلام کی طرف اس کا جھکاؤ ان طاقتوں کے نقطہ نظر سے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا' لہٰذا اسے بھی اچک لیا گیا۔ اب ایک بہت بڑا یہودی بینکر اس کا سسر ہے۔ وہ شخص جس سے اسلام کے حوالے سے بہت اونچی توقعات وابستہ کی جانے لگی تھیں' یہودیوں کی سازش کا شکار ہو کر اپنا وہ مقام کھو چکا ہے۔

فری میسن تحریک کے تحت یہود کے آلہ کار بننے والے ذہین اور باصلاحیت افراد کی

فہرست میں ایک نام معین قریشی صاحب کا بھی ہے۔ وہ بھی ورلڈ بینک کے نمائندے ہیں۔ یک بیک امپورٹ ہو کر یہاں آ کر وزیراعظم بن جاتے ہیں۔ لوگ حیران ہیں کہ یہ کون صاحب ہیں' اچانک کہاں سے نمودار ہو گئے ہیں!!! ان کا وزیراعظم بن جانا نواز شریف کو [illegible] ہے اور بے نظیر صاحبہ بھی اس پر راضی نظر آتی ہیں۔ اور کیسے نہ ہوں؟ ان کی تقرری کا حکم نامہ واشنگٹن سے آیا ہے!!! اسی کی ایک مثال اب محبوب الحق صاحب کی صورت میں سامنے آئی ہے جن کے بارے میں پروفیسر مرزا منور صاحب کے یہ الفاظ بڑے معنی خیز ہیں: "محبوب چچا سام کے' محبوب ہمارے"۔

میں نے تو اخباری اعلان میں ان کے نام کی مناسبت سے یہ الفاظ درج کئے تھے کہ "وہ محبوبِ حق تعالیٰ ہیں یا صیونیت کے ایجنٹ؟"۔ اس لئے کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ نظریہ پاکستان کی صریحاً نفی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "نوائے وقت" میں الطاف گوہر صاحب کے مضمون کی اشاعت کے بعد میری مشکل بہت آسان ہو گئی ہے کہ مجھے اب اس پر کچھ زیادہ گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ (رفقاء و احباب کی سہولت کے لئے جناب الطاف گوہر کا یہ مضمون ۲۶/مارچ کے ندائے خلافت میں شائع کر دیا گیا ہے)۔ ان کے مضمون سے مجھے صد فی صد اتفاق ہے' سوائے ایک بات کے' جس کا تذکرہ میں بعد کروں گا۔

مسئلہ کشمیر اور ڈاکٹر محبوب الحق

محبوب الحق صاحب کے فرمودات کے دو حصے ہیں۔ پہلا یہ کہ کشمیر کو دس سال کے لئے یو این او کی تحویل میں دے دیا جائے۔ ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کو بھی اور پاکستانی "مقبوضہ" کشمیر کو بھی۔ بہت صحیح گرفت کی ہے یہاں الطاف گوہر صاحب نے کہ انہوں نے "آزاد کشمیر" نہیں کہا' بلکہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر اور ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کے الفاظ استعمال کئے ہیں کہ ان دونوں کو یو این او کے حوالے کر دیا جائے۔ صاحب مضمون نے ٹھیک یاد دلایا ہے کہ بعینہ یہی معاملہ فلسطین کا ہوا تھا کہ اس کو پہلے U.N.O کے حوالے کیا گیا۔ پھر جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ یہی تاریخ اپنے آپ کو دہرانا چاہتی ہے یا یوں کہئے کہ یہودی اس تاریخ کو دہرانا چاہتے ہیں۔ اور ہمارے اپنے باحیثیت لوگوں کے ذریعے جو درحقیقت ان

کے ایجنٹ ہیں' اس ناپاک مقصد کے لئے راہ ہموار کرنے کے درپے ہیں۔

اس ضمن میں میری مستقل رائے کئی بار آپ حضرات کے سامنے آچکی ہے کہ کشمیر کے مسئلے کو یو این او کے حوالے کرنے کا فیصلہ ایک "انڈی پینڈنٹ کشمیر" کو وجود میں لائے گا' جو اصل میں امریکہ کا ایک مستقل اڈا ہوگا' جس کے بنیادی مقاصد میں چین کو Contain کرنے اور اس کی کڑی نگرانی کرنے کے ساتھ ساتھ بھارت پر مسلط رہنا بھی لازمی طور پر شامل ہوگا۔ اس لئے کہ بھارت بھی تو بہرحال ایک بڑا ملک ہے جو ایک عرصے سے ورلڈ پاور بننے کے خواب دیکھ رہا ہے' اس کی نیوی سے تو آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ جیسے دور دراز ممالک بھی کانپ رہے ہیں۔ پورا بحرہند اس کے قبضے میں ہے۔ لہٰذا بھارت کو قابو میں رکھنا بھی ضروری ہے۔ روسی ترکستان کی ریاستیں بھی ساتھ ہی ملحق ہیں' انہیں بھی قابو میں رکھنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان اور افغانستان پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس سارے کام کے لئے کشمیر ایک بہترین اڈا ثابت ہو سکتا ہے۔ وہی فلسطین کی تاریخ یہاں دہرائی جائے گی۔ ایک اسرائیل وہاں بنا' اسی طرح کا ایک اسرائیل یہاں قائم کرنا ان کے پیش نظر ہے۔ اسی کے لئے درحقیقت یہ سارے پاپڑ بیلے جا رہے ہیں۔

تاہم کشمیر کے بارے میں جو دوسری بات الطاف گوہر صاحب نے کہی ہے اس سے مجھے جزوی طور پر اختلاف ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہمیں اقوام متحدہ کی قراردادوں کے اوپر ڈٹے رہنا چاہئے۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ حکومت پاکستان کا موقف تو یہی رہنا چاہئے' لیکن اس سے مسئلہ حل کبھی نہیں ہوگا۔ بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ اگر کہیں بھارت عاجز آگیا اور اس نے تنگ آکر اس مسئلے کو اقوام متحدہ کے حوالے کر دیا تو اس کا نتیجہ "آزاد" کشمیر کی صورت میں نکلے گا' پاکستان اور بھارت دونوں بالکل بے دخل ہو جائیں گے۔ لیکن حکومتی سطح پر اسی موقف پر ڈٹے رہنے کی حکمت بہرحال سمجھ میں آتی ہے۔ سردست ہمیں ڈٹے رہنا چاہئے۔ لیکن غیر حکومتی سطح پر جو بھی ذرائع ہو سکتے ہیں ان کو بروئے کار لا کر مسئلے کے حل کی کوشش ہونی چاہئے میں نے بارہا کہا ہے کہ ایران اور چین کے good offices کو استعمال کیجئے۔ اور دوطرفہ مذاکرات کے ذریعے کوئی معقول مفاہمت کا راستہ تلاش کیجئے۔ اس مفاہمت یا Settlement کی بہترین شکل یہی دکھائی دیتی ہے کہ تقسیم کے ایجنڈا کو

نامکمل مانتے ہوئے کشمیر کے مسئلے کے حل کی جانب پیش قدمی کی جائے۔ اور اس تنازعہ کو جو گزشتہ پچاس برس سے پاکستان اور ہندوستان کے مابین باعث نزاع اور وجہ کشیدگی ہی نہیں' ملکی ترقی کی راہ کی بھی ایک بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے' گفت و شنید کے ذریعے حل کیا جائے۔ تقسیم صرف ہندوستان ہی کی نہیں ہوئی' یہ امرِ واقعہ ہے کہ پنجاب کی بھی تقسیم ہوئی اور بنگال کی بھی ہوئی۔ تو کشمیر کی بھی تقسیم پر اگر معاملہ طے ہو جائے تو یہ حقیقت پسندی کا مظہر ہو گا۔ غیر مسلم اکثریت کا علاقہ بھارت کے پاس رہے اور مسلم اکثریت کا علاقہ پاکستان کے پاس رہے۔ بالآخر پاکستان اور بھارت کو یہی معاملہ کرنا پڑے گا' لیکن یہ فیصلہ کوئی آسان فیصلہ نہیں ہے۔ اس کے لئے بڑی محنت سے زمین ہموار کرنی ہوگی۔ جس کے پاس بھی رائے عامہ کو قائل کرنے کے مناسب ذرائع موجود ہوں اسے ان ذرائع کو بروئے کار لانا چاہئے۔ دونوں طرف کے لوگوں کو یہ سمجھانا ہو گا کہ آپس میں لڑتے رہنے کا نتیجہ صرف یہ ہو گا کہ بلیاں لڑتی رہیں گی اور بندر پوری روٹی لے جائے گا۔ دونوں ممالک کے عوام میں اس کا احساس اور شعور پیدا کرنا دانشوروں کا کام ہے۔

محبوب الحق صاحب کا بیان --- ایک الجھن اور اس کا حل

محبوب الحق صاحب جو راگ الاپ رہے ہیں اس میں یہ بات میرے لئے اب تک ناقابل فہم تھی کہ وہ کھلم کھلا پاکستان کے درپے کیوں ہو گئے۔ یہ بیان انہوں نے کیوں دیا۔ کہ ہماری اگلی نسل اب سوچ رہی ہے کہ پاکستان اور بھارت کی اس تقسیم کو اب ختم کیا جائے۔ یہ بیان دینے سے پہلے انہوں نے سوچا تو ضرور ہو گا کہ پاکستان میں رائے عامہ پر اس کا اثر یقیناً منفی ہو گا۔ وہ ایک ذہین آدمی ہیں' بلا سوچے سمجھے کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ پھر یہ کہ میں سمجھتا ہوں کہ امریکہ بھی یہ کبھی نہیں چاہے گا کہ یہ تقسیم ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ متحدہ ہندوستان (United India) تو امریکہ کے لئے بہت بڑا خطرہ بن جائے گا۔ وہ تو جتنا کچھ بھارت اس وقت ہے وہ بھی ان کے لئے خطرہ بن رہا ہے۔ اس نے دھڑلے کے ساتھ ۷۶ء میں ایٹمی دھماکہ کیا' پھر امریکہ کی مسلسل تنبیہات کے باوجود میزائل پر میزائل بنا رہا ہے۔ ان کی کسی دھمکی کو خاطر میں نہیں لا رہا۔ اس کا وزیر داخلہ پارلیمنٹ کے اندر

کھلم کھلا یہ بات کہتا ہے کہ کشمیر کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے' یہ سب امریکہ کروا رہا ہے' امریکہ کی اپنی نیت خراب ہے۔ یہ کسی عام آدمی کی بات نہیں ہے بھارتی وزیر داخلہ کا بیان ہے۔ اس حوالے سے یہ سوال دو دن میرے ذہن میں اٹکا رہا کہ محبوب الحق صاحب نے یہ بات کیسے کہہ دی کہ یہ پاک بھارت تقسیم اب ختم ہو جانی چاہئے! یہ تو رائے عامہ کو اپنے خلاف کرنے والی بات ہے!! آخر اللہ نے جل سمجھا دیا اور بات سمجھ میں آ گئی۔ پاکستان کے عوام کے مخالفانہ رد عمل کی انہیں کوئی پروا نہیں ہے۔ یوں بھی پاکستان میں رائے عامہ نام کی کوئی شے ہے ہی نہیں۔ یہاں تو کچھ سیاسی کھلنڈرے ہیں جن کی حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی ہیں۔ وہ چاہے نواز شریف ہوں چاہے بے نظیر ہوں' دونوں امریکہ کی جیب میں ہیں۔ جہاں تک ہندوستان کی حکومت کے بارے میں انہیں بھی شاید یہ اندازہ ہو چکا ہے کہ وہ مجاہدینِ کشمیر کے ہاتھوں اب زچ ہو چکی ہے۔ آخر کب تک سلسلہ چلے گا۔ کشمیری مسلمان اگر شہید ہو رہے ہیں' ان کی عورتوں پر اگر ظلم ہو رہا ہے تو کیا ہندوستان کی اپنی فوج وہاں نہیں مر رہی۔ ارب ہا ارب روپیہ خرچ نہیں ہو رہا؟ بنیئے کے لئے یہ خرچ کا معاملہ بھی کم اہم نہیں ہے۔ تو بھارتی حکومت ان کا اصل مسئلہ نہیں ہے' وہ تو شاید تنگ آ کر یہ مسئلہ یو این او اور امریکہ کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو جائے' اصل مسئلہ وہاں کے عوام کا ہے اور عوام سے یہ بات منوانا آسان نہیں ہے۔ جیسا کہ کہا ہے سردار عبدالقیوم صاحب نے کہ یہ بات جس کا تم ہمیں مشورہ دے رہے ہو پہلے بھارت سے منواؤ۔ گویا کہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ سردار عبدالقیوم صاحب کو بھی محبوب الحق صاحب کی بات سے اختلاف نہ ہو۔ انہوں نے اپنا اختلاف ریکارڈ نہیں کرایا۔ محبوب الحق صاحب سے یہ ضرور کہا کہ یہ بات وہاں منواؤ۔ گویا کہ بھارت اگر مان لے تو کوئی حرج نہیں!! لیکن وہاں پر ہندو فنڈامینٹلسٹ طاقت ابھر کر آ گئی ہے' وہ کشمیر کو ہاتھ سے دینے پر کسی طرح آمادہ نہیں۔ اسے رام کرنے کے لئے یہ رشوت پیش کرنا ضروری تھا کہ بھئی کشمیر کے معاملے کو ایک بار یو این او کے حوالے تو کرو' ہم پورا پاکستان تمہاری جھولی میں ڈالنے کو تیار ہیں۔ بات سمجھ میں آتی ہے۔ دیوانے کی بڑ یونہی نہیں ہے۔ ربط محکم اسی بے ربطیٔ تحریر میں ہے! محبوب الحق صاحب کو خوب اندازہ ہے کہ جب تک وہ پاکستان کے بارے میں یہ نہیں کہیں گے کہ یہ غلط بنا اور

ہماری آئندہ نسل اس کو ختم کرنے کے لئے پر تول رہی ہے' میری اپنی اولاد یہ کہہ رہی ہے کہ یہ تقسیم غلط ہے' اس وقت تک ہندو اس بات پر دھیان دینے کو تیار نہیں ہو گا۔ وہاں کی رائے عامہ کو اگر کوئی رشوت دینی ہے تو ظاہر بات ہے کہ وہ تو اسی راستے سے ہو گی۔ بہرحال اس پر محترم مرزا منور صاحب کی جو فریاد نوائے وقت میں شائع ہوئی ہے وہ واقعتاً پڑھنے کے لائق ہے۔ (اس نظم کو بھی زیر نظر شمارے میں شائع کر دیا گیا ہے) انہوں نے بالکل صحیح فرمایا ہے :

محبوب چچا سام کے' محبوب ہمارے
یارو ہے یہی عالِم اسلام کی افتاد
تو ربِّ رحیم اور یہ رسی کی درازی
ہو گی تو درازی کی بھی مولا کوئی میعاد

اس دوسرے شعر کو میں دو طرفہ دیکھتا ہوں۔ مرزا منور صاحب نے اگرچہ کسی اور رنگ میں کہا ہے' لیکن میں اس سے یہ مفہوم لیتا ہوں کہ ایسا نہ ہو کہ ہماری رسی بھی اب اللہ کے ہاں کٹ رہی ہو۔ پچاس برس تک اللہ نے رسی دراز کئے رکھی۔ یہ رسی اب صرف محبوب الحق کی کٹے گی یا پوری قوم کی رسی اب کٹنے والی ہے اخاکم بدہن' لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ معاملہ پورے پاکستان پر بھی صادق آتا ہے کہ "ہو گی تو درازی کی بھی مولا کوئی میعاد!"۔ قرآن حکیم میں یہ مضمون کئی بار وارد ہوا ہے :

﴿ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴾

"ہر قوم کے لئے بھی ہم نے ایک اجل معین کر دی ہے' جب وہ اجل آ جاتی ہے تو پھر نہ وہ ایک گھڑی آگے جا سکتی ہے نہ پیچھے"۔

اللہ نہ کرے کہ ہماری اجلِ معین آ چکی ہو۔ اللہ کرے کہ اس کی جانب سے اگر کوئی پکڑ آئے بھی تو وہ صرف "عذابِ ادنیٰ" کے درجے کی ہو کہ ہم جاگ جائیں' قومِ یونس کی طرح کی اجتماعی توبہ کریں' اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر معافی مانگیں اور پھر اپنی اصل منزل کی طرف رخ کریں۔

پاکستان : دولتِ خداداد

مرزا منور صاحب کی اس نظم کے پہلے شعر کا یہ مصرع بھی میرے نزدیک نہایت بامعنی اور قیمتی ہے کہ "بدخواہ نہ ہو اس کا' یہ دولت ہے خداداد!" میری پختہ رائے ہے کہ واقعتاً یہ دولتِ خداداد پاکستان ہے۔ یہی سرزمین ان شاء اللہ 'عالمی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نقطۂ آغاز بنے گی۔ البتہ تین ممکنہ صورتوں میں سے کوئی ایک شکل مسلمانانِ پاکستان کے لئے ہو گی۔ میری کتاب "سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی حال اور مستقبل" کے آخری صفحہ پر اس کی تفصیل میں نے درج کی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عذاب کے کسی کوڑے کے بغیر ہی اللہ تعالیٰ ہمیں توبہ کی توفیق دے دے۔ یہ سب سے عمدہ صورت ہو گی کہ جس کی توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے آثار دور دور تک کہیں نظر نہیں آتے۔ تاہم ہم معجزے پر یقین رکھتے ہیں' اللہ کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے۔ دوسری امکانی صورت یہ ہے کہ اللہ کی سزا کا کوئی ایک جھٹکا ہمیں لگے اور ہمیں ہوش آ جائے۔ جیسا کہ سورۃ السجدہ میں وارد ہوا : وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ○ یہ بھی گھاٹے کا سودا نہیں ہو گا اگر ہم جاگ جائیں۔

تیسری اور آخری صورت جو یقیناً بہت کڑوی ہے اور ہماری دعا ہے کہ اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے' یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمانانِ پاکستان کروڑوں کی تعداد میں ہندوؤں کے ہاتھوں قتل ہوں' اور پھر ہندو اسلام لے آئیں۔ جیسے تاریخ میں ایک موقع پر تاتاریوں کے ہاتھوں کروڑوں مسلمان قتل ہوئے' لیکن پھر اسلام نے تاتاریوں کو فتح کر لیا۔ اسی طرح اب بھی اسلام ہندو کو فتح کر سکتا ہے۔ بہرکیف مجھے نظر یہی آتا ہے کہ عالمی غلبۂ اسلام کا نقطۂ آغاز بالآخر یہی سرزمین بنے گی۔ واللہ اعلم! اسلام کسی ایک قوم یا نسل کا محتاج نہیں ہے۔ ہم اگر اس لائق نہیں ہیں تو ہندوؤں کو یہ توفیق مل سکتی ہے' اسلام کے عالمی غلبہ کا نقطہ آغاز بننے کی سعادت ان کے حصے میں آ سکتی ہے۔ تاریخ میں اس سے پہلے عربوں کو معزول کیا جا چکا ہے۔ سورۂ محمد (ﷺ) کی آخری آیت میں صاف طور پر انہیں سنا دیا گیا تھا : "اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ" یعنی "تم اگر پیٹھ دکھاؤ گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی

اور قوم کو لے آئے گا"۔ عربوں کو معزول کیا گیا۔ آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کو محل سے گھسیٹ کر تاتاریوں کے گھوڑوں کی سموں تلے کچلا گیا اور عرب قوم کا عظیم اقتدار ختم ہو گیا۔ اس کے بعد منصب خلافت پر ترک فائز ہو گئے۔ عالم اسلام میں ہر طرف ترکوں کی حکومت تھی۔ یہ انہی تاتاریوں کی اولاد تھے۔ خواہ وہ ترکان تیموری ہوں یا ترکان صفوی، اور ترکان سلجوقی ہوں یا ترکان عثمانی۔ چار سو برس تک خلافت ترکان عثمانی کے پاس رہی۔

مخلوط انتخابات۔ نظریہ پاکستان کی نفی

انتخابی اصلاحات کے بارے میں صرف دو باتیں عرض کروں گا کہ اس میں دو پہلو یقیناً اچھے ہیں۔ جو اچھی بات ہے اسے اچھا کہئے اور جو بری ہے اسے برا کہئے۔ ایک ہی دن کے اندر مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا فیصلہ اچھا فیصلہ ہے، اس کی تائید کی جانی چاہئے۔ اسی طرح پبلسٹی پر جتنی بھی پابندیاں لگائی جا سکیں، جتنا بھی اس بخار کو کم کیا جا سکے اچھا ہے، بشرطیکہ اس پر فی الواقع عمل کیا جا سکے۔ لیکن اقلیتوں کو دوہرے ووٹ کا حق دینا میرے نزدیک نظریہ پاکستان کی صریحاً نفی ہے۔ اس معاملے میں خواہ ارشاد احمد حقانی صاحب اپنی منطق بھگار رہے ہوں یا اس کے جواز کے لئے دستور کا حوالہ تلاش کیا جا رہا ہو، اس فیصلے کی ہرگز تائید نہیں کی جا سکتی۔ جہاں تک اس بحث کا تعلق ہے کہ دستور میں اس بارے میں کیا مذکور ہے، تو میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں دستور کا ایکسپرٹ نہیں ہوں۔ ہاں، میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ ہمارا دستور چوں چوں کا مربہ ہے، تضادات کا شکار ہے۔ اگر قرارداد مقاصد ایک اعتبار سے اس دستور کا ایک حصہ ہے تو اس کے ساتھ ساتھ اس کے مخالف اور متضاد چیزیں بھی اسی دستور میں موجود ہیں۔ ایک موقع پر سندھ ہائی کورٹ نے قرارداد مقاصد کو مقدم رکھ کر بعض فیصلے دیئے تو ہماری سپریم کورٹ نے اس سے متصادم دفعات کے حوالے سے ان فیصلوں کو رد کر دیا۔ اور یہ فیصلہ دینے والے جناب سید نسیم حسن شاہ صاحب تھے۔ انہوں نے کہا کہ قرارداد مقاصد بائنڈنگ نہیں ہو گی، دوسری چیزیں بائنڈنگ ہوں گی!!! یہ چرکے ہمیں اپنوں ہی کے ہاتھوں لگے ہیں۔ بہرکیف مجھے اس سے بحث نہیں ہے کہ اس بارے میں دستور میں کیا ہے، لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ اقلیتوں کو دوہرے ووٹ کا حق دینا نظریہ پاکستان کی نفی ہے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ قومیت کی بنیاد پر پاکستان وجود میں آیا۔ اس کا سبب سے

بڑا مظہر اور منطقی تقاضا جداگانہ انتخابات ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہم اس رخ پر مزید آگے بڑھتے۔ میرے نزدیک اسلامی ریاست میں قانون ساز ادارے (Legislature) کے اندر کسی غیر مسلم کی شرکت کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسی طرح اعلیٰ سطح کے پالیسی ساز مناصب پر بھی غیر مسلموں کی تقرری کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ ہمیں تو اس رخ پر آگے بڑھنا چاہئے تھا تاکہ ایک صحیح اسلامی ریاست وجود میں آتی۔ لیکن ترقی معکوس ہو رہی ہے۔ عجیب طرفہ تماشا ہے کہ جداگانہ انتخابات کا سلسلہ ختم کرنے کا اگر فیصلہ کر ہی لیا گیا ہے اور جنرل الیکشن میں اگر ہندوؤں' عیسائیوں اور قادیانیوں نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ووٹ ڈالنا ہے تو یہ اضافی رشوت دینا کیوں ضروری خیال کیا گیا کہ ان کے لئے اسمبلی میں علیحدہ نشستیں بھی محفوظ ہیں!! یہ تو "چپڑی اور دو دو" والی بات ہے!۔۔۔ میں نے آج سے چار سال قبل یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اب اس ملک میں ننگے سیکولرزم کا راج ہو گا اب وہ اندیشہ ایک حقیقت بن کر سامنے آ چکا ہے۔ اس معاملے میں مزید کچھ کہنے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

تاہم ہمارے بعض علماء کا یہ وطیرہ بن گیا ہے کہ وہ بلند بانگ دعوے کرنے اور تیز و تند بیانات جاری کرنے میں بہت سرگرمی دکھاتے ہیں کہ اگر ہمارے مطالبات تسلیم نہ کئے گئے تو ہم یہ کر دیں گے اور وہ کر دیں گے' زبردست عوامی تحریک چلائیں گے' وغیرہ۔ شناختی کارڈ پر مذہب کے خانے کے اندراج کے مسئلے پر یہی کچھ ہوا تھا۔ علماء کرام کی طرف سے اس قسم کے بیانات سامنے آئے تھے' لیکن ہوا کیا؟ وہ بیانات ہوا میں تحلیل ہو گئے اور بس! ابھی اگر کچھ کرنا نہیں ہے تو ان گیدڑ بھبکیوں سے کیا حاصل! یہ تو مزید اپنی پوزیشن کو کمزور کرنے والی بات ہے۔

پہلے ہی اپنی کونسی ایسی تھی آبرو　　پر شب کی منتوں نے تو کھو دی رہی سہی!

اس قسم کے بیانات زیادہ تر ان علماء کی جانب سے آتے ہیں جن کی اپنی کوئی جماعت نہیں ہے۔ باقی رہا دینی جماعتوں کا معاملہ تو وہ اپنی اسی سابقہ روش پر مصر ہیں۔ وہی کشاکش اقتدار' وہی انتخابی سیاست کی رسہ کشی میں کبھی کسی ایک سیکولر جماعت کی طرفداری اور کبھی دوسرے سیکولر گروپ کے ساتھ پیمان وفاداری! نتیجہ ڈھاک کے وہی تین پات!

واحد راہ عمل

میرے نزدیک اصلاح احوال کا راستہ ایک ہی ہے۔ تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں

ہے۔ صرف اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

۱۔ انتخابی سیاست سے یہ تمام جماعتیں علیحدگی اختیار کرلیں اور اسمبلیوں اور سینٹ سے بلا تاخیر استعفے دے کر الگ ہو جائیں۔ وہاں رہ کر وہ کوئی موثر رول تو ادا کر نہیں سکتے ' سوائے اس کے کہ کسی معاملے میں کوئی احتجاجی آواز بلند کردی ' جس کی حیثیت نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ نہیں ہوتی!

۲۔ احتجاجی سیاست کے لئے دینی جماعتوں پر مشتمل متحدہ محاذ بنایا جائے۔ اور یہ اسی وقت موثر ہو گا جبکہ آپ اس انتخابی سیاست سے کنارہ کشی کر چکے ہوں۔ ورنہ قوم یہ کہنے میں حق بجانب ہوگی کہ کل تم فلاں سیاسی جماعت کے ساتھ تھے ' آج تم کسی اور سیاسی اتحاد کا حصہ ہو ' پہلے تم نے ایک کا دامن چھوڑا ' اب کچھ عرصے کے بعد پھر اس کی طرف رجوع کر رہے ہو ' تمہارا کیا دین ہے کونسا ایمان ہے ؟۔ آپ عوام کو کوئی الزام مت دیجئے۔ ہماری دینی سیاسی جماعتوں کی تاریخ سیاسی قلابازیوں کی داستان ہے! ع اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست!! جب تک وہاں سے کٹیں گے نہیں ' کوئی احتجاجی سیاست مؤثر نہیں ہوگی۔

۳۔ موجودہ حالات میں کرنے کا اصل کام کیا ہے ؟---اسلامی انقلاب کے لئے "حزب اللہ" کی تیاری!۔ یہ حزب اللہ ان لوگوں پر مشتمل ہو جو اپنی ذات اور اپنے گھر کی حد تک اسلام کو نافذ کر چکے ہوں ' شریعت قائم کر چکے ہوں۔ پھر وہ آپس میں جڑیں اور غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد کی غرض سے ایک امیر کے ہاتھ پر بیعت کر کے ایک انقلابی جماعت تشکیل دیں اور بتدریج نہی عن المنکر باللسان سے آگے بڑھ کر ' جب مناسب قوت فراہم ہو جائے تو نہی عن المنکر بالید کی طرف پیش قدمی کریں۔ برائی کا راستہ طاقت سے روکیں اور اس راہ میں اگر جان کا نذرانہ دینا پڑے تو اس سے بھی گریز نہ کریں۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن　　نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

اس کے سوا اصلاحِ احوال کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے علماء کو ' دینی زعماء کو ' مذہبی جماعتوں کی قیادتوں کو اس رخ پر غور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اقول قولی ہذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات OO

بحث و نظر

کیا موجودہ
مسلمان حکومتیں "الجماعۃ" ہیں؟

سید وصی مظہر ندوی

علمی اور دینی حلقوں میں معروف ماہانہ مجلہ "اشراق" جو مولانا حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی کے افکار و نظریات کا علمبردار ہونے کی شہرت رکھتا ہے اور جس کے مدیر اپنے مخصوص علمی اور تحقیقی اسلوب کے لئے معروف ہیں' اس مجلّے نے گزشتہ چند برسوں میں جمہور علماء اور مفکرین کے مسلّمہ مسائل سے اظہارِ اختلاف کا چونکا دینے والا ایک سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ بلاشبہ بعض مسائل میں اس مجلّے کی تحقیقات نے سوچ کی نئی جہتیں فراہم کی ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ بادل نخواستہ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ "تفرد" کا شوق فراواں اب اس درجہ بڑھ چکا ہے کہ خود اپنی تحقیقاتی کوششوں کے نامکمل ہونے کے اعتراف کے باوجود بعض مسلمہ مسائل میں جمہور کی رائے کو رد کر دینے کی جرأت بھی کی جانے لگی ہے۔ مثلاً نزول مسیح اور رفعِ سماوی کے بارے میں اس اعتراف کے باوصف کہ اس مسئلہ میں ابھی ان کی تحقیق جاری ہے' مسلمہ نقطہ نظر سے ہٹ کر نزول مسیح کا انکار کر دیا گیا۔

یوں تو "اشراق" کے ہر شمارے میں ایک سے زائد "تفردات" کا یہ سلسلہ جاری ہے لیکن گزشتہ سال کے رسائل میں "الجماعہ" کے حوالے سے بعض بڑے دلچسپ خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ تفردات اور یہ شذوذ اس سوال کے جواب میں ہیں کہ بکثرت احادیث صحیحہ میں "التزام جماعت" کے سلسلہ میں جو احکام موجود ہیں اور "الجماعہ" سے علیحدگی اختیار کرنے والوں کے بارے میں جو وعیدیں وارد ہوئی ہیں ان پر آج کا مسلمان کیا ردعمل

ظاہر کرے؟ جبکہ نبی ﷺ کی قائم کردہ "الجماعہ" اس وقت بظاہر کہیں موجود نہیں ہے۔

اس کے جواب میں بعض حضرات نے زور و شور کے ساتھ کہا ہے کہ اگر "الجماعہ" قائم نہیں ہے تو اسے قائم کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ بنابریں یا تو آدمی "الجماعہ" کے قیام کی کوشش خود کرے یا کسی اجتماعی جدوجہد میں شریک ہو جائے' ورنہ وہ "الجماعہ" سے الگ رہنے کی وعیدوں کا مخاطب ہو گا اور اپنے ایمان اور اعمال صالحہ کے باوجود اگر اسی حالت میں مرے گا تو اس کی یہ موت' نعوذ باللہ' از روئے احادیث' جاہلیت کی موت ہو گی۔

اس استدلال کی ظاہری قوت و شوکت سے مرعوب ہو کر اپنے اپنے ایمان کی خیر منانے کے لئے لوگوں نے جو تاویلیں تلاش کی ہیں ان میں سے سب سے زیادہ دلچسپ اور سب سے انوکھی تاویل و تحقیق اصحاب "اشراق" کی ہے۔ ان کا ارشاد ہے :

> "بعض لوگوں کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کہ کسی بھی ایسی تنظیم یا جماعت سے منسلک رہنا ضروری ہے جو غلبہ اسلام کے لئے کوشاں ہو۔ جماعت کے اس مطلب کی روشنی میں جس کو ہم نے اوپر واضح کیا ہے (یعنی یہ کہ الجماعہ اور السلطان مترادف اصطلاحات ہیں) یہ حکم ہمارے ملک میں "حکومت پاکستان" کے ساتھ وفادار رہنے اور اس کے قوانین کی پابندی کرنے سے پورا ہو جاتا ہے اور ہم علیٰ وجہ البصیرت یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت پاکستان ہی اس کی سرزمین کے مسلمانوں کے لئے "الجماعہ" ہے۔ (اشراق فروری ۱۹۹۴ء)

یہ تحریر اگرچہ زاویہ فراہی" کے ایک اسکالر جناب ساجد حمید کی ہے تاہم اس تحریر میں ضمیر "ہم" کا استعمال واضح کرتا ہے کہ یہ اس زاویہ اور اس کے سربراہ کی مجمع علیہ رائے ہے۔ زاویہ فراہی کے یہ سکالر اپنی رائے کو مبرہن کرتے ہوئے واضح فرماتے ہیں :

> "میں نے دین و شریعت سے یہی سیکھا ہے کہ مسلمان اگر کسی خطہ ارضی میں جمع ہوں اور اپنے اندر کسی شخص کو امیر (حکمران) بنالیں تو وہ الجماعہ ہیں۔ چنانچہ آپ کو فیصلہ بس اہل پاکستان کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے ہی کا کرنا ہے۔" (اشراق فروری ۹۶ء)

پھر جناب ساجد حمید کی بعض عبارتوں سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ مسلمان اپنی آزاد مرضی سے اگر کوئی حکومت قائم کریں تو وہ الجماعہ ہے۔ اس لحاظ سے محض نام نہاد

جمہوری انداز میں منتخب ہونے والی حکومتیں ان کے خیال میں "الجماعہ" ہوں گی جبکہ آمرانہ اور خاندانی بادشاہت پر مبنی حکومتیں غالباً "الجماعہ" کے معزز لقب کی حقدار نہ ہوں گی۔ جبکہ فاضل مضمون نگار کی بعض دیگر عبارتوں سے مترشح ہوتا ہے کہ اگر بادشاہوں اور آمر[illegible] نے عملاً قبول کر لیا ہو تو وہ بھی "الجماعہ" سمجھی جائیں گی۔ چنا[illegible]

"چنانچہ مسلمانوں کی کسی بھی حکومت کے لئے الجماعہ یا السلطان کے لئے پہلی اور آخری شرط یہی ہے کہ اس کے پاس اقتدار ہو اور مسلمان رعایا اس اقتدار کو تسلیم کرتی ہو"۔ (اشراق مارچ ۹۵)

مضمون نگار صاحب اپنی اس رائے میں اتنا غلو رکھتے ہیں کہ وہ کفر بواح کی مرتکب حکومت کو بھی الجماعہ قرار دینے میں تامل نہیں رکھتے جیسا کہ انہوں نے واضح فرمایا ہے کہ

"شریعت کی رو سے کفر بواح کی مرتکب حکومت بھی اس وقت تک الجماعہ ہے جب تک اسے عامۃ الناس کا اعتماد حاصل ہے"۔ (اشراق مارچ ۹۵)

(مضمون نگار کی سہل انگاری اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ "عامۃ المسلمین" کے بجائے "عامۃ الناس" ہی کے اعتماد کو کافی قرار دے رہے ہیں)

لیکن جب بعض اہل علم نے فاضل مضمون نگار سے سوال کیا کہ غیر مسلم حکومتوں میں جو مسلمان اقلیت آباد ہے وہ "الجماعہ" کے ساتھ التزام کے حکم پر کیسے عمل پیرا ہو تو مضمون نگار صاحب نے الجماعہ کے لئے خود اپنی طرف سے بیان کردہ "پہلی اور آخری شرط" (یعنی اقتدار کی موجودگی) کو فراموش کر دیا اور غیر مسلم حکمرانوں کے ماتحت رہنے والے کروڑوں مسلمانوں کو "الجماعہ" قائم کرنے کا وہ نسخہ مرحمت فرمایا جو بڑے بوڑھے حضرات کی طرف سے ازراہِ مذاق بچوں کو چڑیاں پکڑنے کے اس چٹکلے کے عین مطابق ہے کہ "گرمیوں میں دوپہر کے وقت چڑیا کے سر پر موم رکھ دو' جب موم دھوپ کی گرمی سے پگھل کر چڑیا کی آنکھیں بند کر دے تو آرام سے جا کر اسے پکڑ لو"۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ کروڑوں مسلمانوں کی یہ آبادی متحد ہو کر ایک جماعت بنا لے اور اس کا امیر چن لے اور اگر بالفرض [illegible] متحد ہو کر جیسا کہ [illegible] تو کم از کم [illegible] شریک ہو جائے [illegible] بس

کروڑوں کی آبادی کی "الجماعہ" بن کر تیار ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ان مسلمانوں کے لئے لازم ہے کہ وہ سب متحد ہو کر اپنے اندر کسی متقد دینی شخصیت کو اپنا راہنما بنالیں اور اس کا انتخاب ان کے باہمی مشورے سے ہو۔ وہ اپنے مشورے میں جس شخص پر بالاجماع یا مجرد اکثریتی رائے سے اعتماد کا اظہار کریں اسے اپنا امیر مقرر کر لیں۔ امیر کے انتخاب کے بعد وہ بھی "الجماعہ" ہیں۔" (اشراق، جنوری ۱۹۹۶ء)

واہ کیا آسان نسخہ ہے "الجماعہ" کی تشکیل کا!!

"زاویہ فراہی" کے ترجمان جناب ساجد حمید نے "التزام جماعہ" کے موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ دراصل قرآن و سنت میں التزام جماعت اور اطاعتِ امیر کے جو احکام دیئے گئے ہیں اور خروج یا الجماعہ سے علیحدگی کے بارے میں جو وعیدیں وارد ہوئی ہیں ان کے اصل "محل" کی طرف سے غالباً نادانستہ صرف نظر پر مبنی ہے۔

دراصل یہ سارے احکام اور یہ تمام ہدایات اس وقت دی گئیں تھیں جب نبی اکرم ﷺ کی سربراہی میں مدینہ منورہ کے اندر مسلمانوں کی ایک بااقتدار "الجماعہ" قائم ہو گئی تھی۔ لفظ "جماعت" جو نکرہ (Indefinite) ہونے کی صورت میں ہر جماعت کے لئے بولا جا سکتا ہے اس پر "ال" (Definite Article) داخل ہونے کے بعد اس کا اطلاق صرف اس جماعت پر ہو گا جو نبی ﷺ کی سربراہی میں قائم ہوئی تھی اور اس جماعت کے ساتھ وابستہ رہنے کے جتنے احکام ہیں وہ سب اس وقت تک کے لئے ہیں جب تک یہ جماعت قائم رہے، لیکن جب یہ قائم نہ رہے، جیسا کہ اس وقت ہے، تو التزامِ جماعت کے یہ سارے احکام نافذ العمل نہ سمجھے جائیں گے۔ جس طرح ہر نماز اس وقت فرض ہوتی ہے جب اس کا وقت داخل ہو۔ اس سے قبل نماز کا حکم تو موجود رہتا ہے مگر نافذ العمل نہیں ہوتا، یا جس طرح حدود اور تعزیرات کے احکام اس وقت نافذ العمل ہیں جب وہ اجتماعی نظام موجود ہو جو ان کے نفاذ پر قادر ہو لیکن اس نظام کی عدم موجودگی میں عام مسلمان ان احکام کے مخاطب نہیں، نہ ان کے نفاذ کے مکلف ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ نبی ﷺ کی قائم کردہ "الجماعہ" تو سردست موجود نہیں ہے،

پھر کیا

(۱) ہم اس جماعت کو قائم کرنے کے مکلف نہیں؟ اور اگر جماعت قائم کرنے کے مکلف ہیں تو اس کا طریقہ کار کیا ہو گا؟

(۲) اور وہ کم سے کم کیا خصوصیات و شرائط ہیں جن کی موجودگی کی صورت میں کسی جماعت کو "الجماعہ" قرار دیا جا سکتا ہے؟

پہلے سوال کے جواب کے سلسلہ میں مجھے اس رائے سے مکمل اتفاق ہے جو "اشراق" ہی کے صفحات پر ظاہر کی گئی ہے کہ ہم مکلف صرف اصل دعوت پہنچانے کے ہیں ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم

(۱) مشرکین (ہر طرح کے مشرکین) کی پرواہ کئے بغیر توحید خالص کی صاف صاف دعوت دیں۔

(۲) عقیدۂ آخرت کو غیر مؤثر بنا دینے والے تمام تصورات کی نفی کرتے ہوئے ایمان بالآخرت کی طرف بلائیں۔

(۳) ایمان بالرسالت اور ایمان بالکتاب کی دعوت دیں۔

(۴) توبہ (رجوع الی اللہ) اور استغفار کی دعوت دیں۔

یہ دعوت جتنی واضح، مداہنت سے پاک اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے مطابق ہو گی اتنی ہی شدت کے ساتھ مشرکین اور باطل پرستوں کی طرف سے اس کی مخالفت کی جائے گی۔ اور ان مخالفت کرنے والوں میں جہاں سکہ بند مشرک ہوں گے [كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ (الشوریٰ : ۱۳) "مشرکین پر سخت گراں ہے وہ دعوت جو تم ان کو پہنچا رہے ہو"] وہاں مخالفت کرنے والوں میں انبیاء علیہم السلام کے وہ نام نہاد وارث اور حاملینِ کتابِ الٰہی یا بالفاظ دیگر مسلمان کہلانے والے بھی ہوں گے جو اصل دعوت سے حقیقتاً منحرف ہو چکے ہیں لیکن محض اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے مسلمانوں میں اپنا شمار کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ

اُوتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ اَشْرَكُوا اَذًى كَثِيرًا

(آل عمران : ۱۸۶)

"اپنے مالوں اور جانوں کے سلسلہ میں تم کو ضرور آزمایا جائے گا اور ان گروہوں کی طرف سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور ان لوگوں کی طرف سے جو شرک کے مرتکب ہیں تمہیں سخت تکلیف دہ باتیں سنی پڑیں گی۔"

دعوت کی شدید مخالفت اور جان و مال کی آزمائشوں میں مبتلا کئے جانے کی وجہ سے دعوت قبول کرنے والوں کا تعلق داعی کے ساتھ مضبوط ہوتا چلا جائے گا اور ان کے درمیان باہم محبت و الفت' اخوت و مواسات کے رشتے قائم ہوتے چلے جائیں گے اور اس طرح "الجماعہ" کی تشکیل کا وہ فطری عمل شروع ہو جائے گا جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت سے اور اس دعوت پر ایمان لانے والوں کے طرز عمل سے تاریخ دعوت میں ہمیشہ شروع ہوتا رہا ہے اور جب یہ جماعت کسی خطہ میں اقتدار و اختیار کی مالک بن جائے گی تو یہی "الجماعہ" کہلانے کی مستحق ہو گی۔

مگر اس سارے عمل کے کسی بھی مرحلے میں داعی اور دعوت کو قبول کرنے والے نہ "الجماعہ" کو وجود میں لانے کی دعوت دیں گے اور نہ ہی خود کو کبھی "الجماعہ" کی حیثیت سے پیش کریں گے' مگر جب اقتدار حاصل کر کے یہ "الجماعہ" بن جائے گی تو پھر تمام مسلمانوں کو اسی سے مربوط رہنا پڑے گا۔

دوسرے سوال کے جواب میں گزارش ہے کہ

(۱) یہ تمام مسلمانوں کی جماعت ہو گی۔ اس میں شمولیت سے کسی مسلمان کو نہ جغرافیائی حدود کی وجہ سے' نہ لسانی اور نسلی اختلاف کی بنا پر روکا جا سکے گا۔

(۲) تمام مسلمان اس میں شامل ہوں یا کم از کم اس کو سوادِ اعظم کی تائید حاصل ہو۔

(۳) اس الجماعہ کا بنیادی مقصد "دعوت الی الخیر" اور اس کا اصل پروگرام امر بالمعروف و نہی عن المنکر' اقامتِ صلوٰۃ' ایتاءِ زکوٰۃ اور قیامِ قسط و عدل کے لئے اللہ کی کتاب اور میزان (شریعت) کو نافذ کرنا ہو گا۔

(۴) چوتھی خصوصیت وہی ہے جس کو اشراق کے مضمون نگار نے پہلی اور آخری شرط

قرار دیا ہے یعنی اس جماعت کا صاحب اقتدار ہونا اور مسلمانوں کی اکثریت کا اس کے اقتدار کو تسلیم کر لینا۔

واضح رہے کہ زوال و انحطاط کے عمل سے اگر ان خصوصیات میں کچھ ضعف پیدا ہو گیا ہے کہ دعوت الی الخیر، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، نفاذ شریعت یا قیام قسط و عدل ٹھیک ٹھیک معیار کے مطابق نہ رہیں تو ان کوتاہیوں کی وجہ سے اس کے الجماعۃ ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا نہ اس سے علیحدہ ہونا جائز ہوگا' نہ اس کے خلاف خروج و قتال کی اجازت ہوگی۔

اس قسم کی الجماعۃ کی موجودگی میں تمام مسلمانوں کو اس کے ساتھ مربوط رہنے کا حکم دیا گیا ہے' اس میں انتشار پیدا کرنے والے کو واجب القتل قرار دیا گیا ہے' اس سے علیحدگی اور دوری کو جہنم کی طرف جانے سے تعبیر کیا گیا ہے اور علیحدگی کی حالت میں موت کو جاہلیت کی موت قرار دیا گیا۔

اس الجماعۃ میں بگاڑ پیدا ہونے کی صورت میں اس کی اصلاح کی جدوجہد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر جب اس الجماعۃ کے حکمرانوں کی طرف سے "کفر بواح" کا اظہار ہو جائے تو ان کے خلاف طاقت کے استعمال کو انہی شرائط کے ساتھ لازمی قرار دیا گیا ہے جن شرائط کے ساتھ کسی بھی کافرانہ نظام کے خلاف طاقت کا استعمال لازم ہو جاتا ہے۔

کفر بواح کے ارتکاب کے بعد کسی اقتدار کی حیثیت "الجماعۃ" کی نہیں رہتی۔ ایسے اقتدار کے ساتھ مومن کا اصل تعلق محاربہ کا ہو جاتا ہے' اگرچہ عملاً محاربہ کرنے کے لئے اسلام نے چند اہم شرائط عائد کر دی ہیں جن کے بغیر نہ کفر بواح کے مرتکب نام نہاد مسلمان حکمرانوں کے خلاف طاقت استعمال کی جا سکتی ہے نہ کافر حکمرانوں کے خلاف۔ کافر حکمرانوں اور کفر بواح کے مرتکب نام نہاد مسلمانوں کے مابین کوئی فرق نہیں ہے۔ جب بھی کسی بااختیار امیر کی قیادت میں مسلمانوں کی کوئی جماعت وجود میں آ جائے اور اس کے پاس اتنی مادی طاقت بھی فراہم ہو جائے کہ کافرانہ حکومت کو کامیابی کے ساتھ ہٹانے کے واضح امکانات نظر آ رہے ہوں تو ان کے خلاف محاربہ صرف جائز ہی نہیں ہے بلکہ واجب ہے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (البقرہ)

"اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور اطاعت (صرف) اللہ کے لئے ہو جائے"

"اشراق" کے مضمون نگار کا فتویٰ یہ ہے کہ کفر بواح کی مرتکب حکومت "الجماعہ" رہتی ہے، بس اس کے خلاف طاقت کا استعمال جائز ہونے کی ایک علت البتہ پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"وأن لا ننازع الامر اهله إلا أن تروا كفراً بواحاً" سے منازعتِ امر (خروج) کا واجب ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان سے منازعت کے وجوہ جواز میں سے ایک وجہ کفر بواح بھی ہے۔ منازعت کے واجب نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس منازعت سے گریز بھی کیا جا سکتا ہے بلکہ اگر شرائط پوری نہ ہو رہی ہوں تو اس منازعت سے گریز ہی دین کی منشا ہے۔" (اشراق مارچ ۹۵ء)

میری گزارش یہ ہے کہ ہمارے دین میں قتال اور حکمرانوں سے طاقت کے ذریعہ اقتدار چھیننے کی صرف دو قسمیں ہیں (۱) حرام یا ناجائز (۲) واجب ---- "قتال جائز" کا تصور ہمارے دین میں موجود نہیں کہ جی چاہے تو قتال شروع کر دو اور جی نہ چاہے تو قتال نہ کرو۔ نہیں، انسانی جان کے احترام کی وجہ سے قتال حرام ہے الا یہ کہ کسی اعلیٰ تر ضرورت یا مصلحت کی وجہ سے قتال واجب ہو جائے۔

رہی یہ بات کہ "کافرانہ حکومت" کو دیکھتے ہی اس کے خلاف "بزن" کیوں نہیں بول دیا جاتا یا کفر بواح کی مرتکب حکومت کے خلاف فی الفور تلوار کیوں نہیں سونت لی جاتی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ طاقت کے استعمال کے لئے کچھ ضروری شرائط ہیں، یہ شرائط اگر پوری نہ ہوں تو طاقت کا استعمال جائز نہیں، اور اگر پوری ہو جائیں تو پھر طاقت کا استعمال کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

اشراق کے فاضل مضمون نگار ذرا دیر کے لئے فرض کریں:

(الف) حکومت کفر بواح کی مرتکب ہے

(ب) مسلمان ایک با اختیار امیر کے تحت منظم ہیں

(ج) مسلمان تعداد اور وسائل کے لحاظ سے کفربواح کی مرتکب حکومت ہٹانے کی نظر بظاہر صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

توکیا اس صورت میں ان کے لئے جائز ہو گا کہ وہ "کفربواح" کی حکومت کو ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق دیکھتے رہیں اور کچھ نہ کہیں۔

فاضل مضمون نگار نے ایک دلچسپ استدلال یہ کیا ہے کہ

"چنانچہ اگر کفربواح کے بعد منازعت سے گریز کیا جاسکتا ہے اور بعض حالات میں گریز ہی دین کی منشا ہے' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حکومت کو کفربواح کے بعد بھی مطاع مانا گیا ہے اور وہ اب بھی "الجماعہ" ہے۔" (اشراق مارچ ۱۹۹۵ء)

سبحان اللہ وبحمدہ! عزیز من! کفربواح کی مرتکب حکومت یا کافروں کی حکومت کے ماتحت رہتے ہوئے اگر ملکی قوانین کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے تو اس کی علت یہ نہیں ہے کہ یہ حکومتیں "الجماعہ" ہیں بلکہ اس کی علت "فساد فی الارض" سے احتراز ہے' لیکن جونہی اہل ایمان اس قابل ہو جائیں کہ کفر کی حکومت کی جگہ اللہ کی بادشاہت اور شریعت کی حکمرانی قائم کر سکیں تو ان پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ ایسا کر گزریں۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا، وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا O (النساء : ۷۵)

"تم کو کیا ہوا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے جبکہ کمزور بنا کر رکھے جانے والے مرد' عورتیں اور بچے کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو اس بستی سے نکال جس بستی والے ظالم ہیں اور اپنے پاس سے ہمارا کوئی سرپرست بنا اور اپنے پاس سے ہمارا کوئی مددگار بنا۔"

اس موقع پر یاد رکھنا چاہئے کہ "اطاعت" کے مفہوم میں خوش دلی کے ساتھ حکم کی بجا آوری کا تصور پایا جاتا ہے اور احکام کی اس طرح سے بجا آوری اللہ تعالیٰ کے بعد رسول اور ان اولوالامر کے ساتھ مخصوص ہے جو مسلمانوں میں سے ہوں' کافر اور کفربواح کے

مرتکب حکمرانوں کے لئے اطاعت کا لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

اب آخر میں میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ دورِ حاضر کی مسلم حکومتیں 'نام نہاد جمہوری حکومتیں' آمرانہ حکومتیں اور بادشاہتیں۔۔۔ حسب ذیل وجوہ کی بنا پر الجماعہ نہیں ہیں :

(۱) نام نہاد جمہوری حکومتوں میں ان ملکوں میں آباد غیر مسلم بھی برابر کے شریک ہیں جبکہ "الجماعہ" کا اطلاق صرف مسلمانوں کی جماعت پر ہوتا ہے۔

(۲) ان میں سے کسی حکومت میں نہ دنیا کے تمام مسلمان شریک ہیں نہ سوادِ اعظم۔ ان حکومتوں میں صرف ان لوگوں کو شرکت کی اجازت ہے جو مخصوص جغرافیائی حد کے اندر رہتے ہوں۔ اس سے باہر رہنے والا کوئی مسلمان محض مسلمان ہونے کی بنا پر اس "الجماعہ" میں شامل نہیں ہو سکتا' جو سراسر "الجماعہ" کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔ پاکستان نے تو ان مسلمانوں کو بھی غیروں کا غیر قرار دے دیا ہے جو پاکستان بنانے میں برابر کے شریک تھے مگر وہ بھارت میں رہ گئے اور پھر پاکستان نے ان کے لئے اپنے دروازے بند کر دیئے' بلکہ پاکستان تو بنگلہ دیش میں محصور پاکستانیوں کو بھی اس نام نہاد "الجماعہ" میں شریک کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

(۳) احادیث صحیحہ کی رو سے' نیز خود لفظ "الجماعہ" سے واضح ہے کہ مسلمانوں کی الجماعہ سارے عالم میں بس ایک ہی جماعت ہو سکتی ہے۔ بیک وقت کئی الجماعتوں کا وجود تناقض فی الاصطلاح ہے' نیز اس سے لازم آتا ہے کہ ایک حکومت میں رہنے والا مسلمان "الجماعہ" میں شامل ہونے کی وجہ سے الجماعہ میں شمولیت کی بشارتوں کا بھی مستحق ہو اور دوسری الجماعتوں میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے وعیدوں کا مستحق بھی۔

(۴) ان میں سے کسی ریاست یا حکومت سے الگ ہو کر کسی دوسرے ملک میں چلا جانے والا یا ان میں سے کسی ریاست سے اختلاف رکھنے والا کوئی شخص نہ واجب القتل ہے نہ اس کی علیحدگی جہنم کی طرف لے جانے والی ہے نہ اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔

(باقی صفحہ ۸۰ پر)

میثاق' اپریل ۱۹۹۶ء

گوشۂ خواتین

سچائی

طیبہ یاسمین' لاہور

سچائی کے خلاف بڑے سے بڑا گناہ گار اور ملحدانہ نظریات رکھنے والا بھی اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ خواہ اس کا اپنا عمل سچائی کی نفی کرتا ہو مگر اپنی تحریر و تقریر میں وہ ہمیشہ سچ کی پاسداری کرتا نظر آتا ہے۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ بعض اوقات وہ حقائق سے آنکھیں موڑ کر جھوٹ کو سچائی کا روپ دے دے۔ مگر کہتا وہ خود کو سچا ہی ہے کہ بقول شاعر ؎ کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے!

دراصل انسان کی فطرت سچائی پر پیدا کی گئی ہے اور وہ سچائی ہی پسند کرتا ہے۔ میں بھی کچھ "سچ" ہی کے بارہ میں خامہ فرسائی کی کوشش میں ہوں۔ تاہم میں باطنی سچائی پر کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

باطن کی سچائی میں انسانی تعلقات میں سچائی سرفہرست ہے۔ محبت کی سچائی بڑی اچھی چیز ہے۔ ملاوٹ کے اس دور میں یہ جتنی بھی مل جائے اسے خوشی خوشی لے لینا چاہئے۔ انسانی تعلقات' رشتہ داری' دوستی' ہمسائگی' مسافرت وغیرہ میں سچائی ہو' دکھاوا نہ ہو۔ محبت بے شک تھوڑی ہو' اظہار تھوڑا ہو مگر سچا ہو۔ جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ "تھوڑا کھاتے ہیں مگر خالص کھاتے ہیں"۔ وہی بہتر نتائج ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح محبت کی سچائی جو ملاوٹ سے پاک ہو۔ بے تحاشا اور اوپر اوپر سے واری صدقے جانے اور اندر سے جڑیں کھوکھلی کرنے والے اظہار سے بہتر ہے۔ گویا تھوڑا سا خالص دودھ بھرے ہوئے پانی ملے برتن سے بہتر ہے۔ سچی محبت وہی ہے جو ضرورت پڑنے پر ہمدردی اور حمایت کر سکے۔ ایسی بے تحاشا اور ظاہری محبت کا کیا فائدہ جو وقت پڑنے پر مصلحتوں اور بے نیازیوں کی بھینٹ چڑھ جائے۔

مہمان نوازی میں بھی دل سچائی مانگتا ہے۔ یہ اتنی ہی ہو جتنی بھی، اصلی اور خوشی خوشی کی جائے۔ جو حاضر ہے دل و جان سے حاضر ہے۔ صرف خود کو مہمان نواز ثابت کرنے کی خاطر تکلیف اٹھانے اور دو سرے کو مصیبت سمجھنے سے کیا حاصل؟ اور اگر کبھی اس راہ میں تکلیف اٹھانی بھی پڑتی ہے اور مہمان نوازی کرنی ہی ہے تو پھر اتنی مشقت اور کیوں نہ اٹھائی جائے کہ اس میں اپنی سچائی، خلوص اور محبت بھی شامل کی جائے، تاکہ یہ تو نہ ہو کہ مہمان تو مہمان کو مزید کھانے اور تھوڑی دیر اور رک جانے کو کہہ رہی ہو اور دل کو کوسنے دے رہا ہو کہ بجٹ کا ستیاناس کر دیا اور وقت برباد کر دیا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ایسے میں چہرہ دلی جذبات ظاہر کرنے سے باز نہیں رہ سکتا اور بعض مہمان بھی بڑے نازک طبع اور ذہین ہوتے ہیں اور یوں میزبان کی اپنی ہی سبکی ہوتی ہے۔ ایسے میں میزبان ہی قابل ملامت ہے نہ کہ بے چارہ مہمان جو اتنی آؤ بھگت دیکھ کر ویسے ہی شرمندہ اور احسان مند ہوا جا رہا ہے۔ وہ میزبانی بڑی پیاری ہوتی جس میں کھلے دل سے خلوص اور سچائی ہو نہ کہ دولت اور سلیقہ کا اظہار۔ اور پھر طبیعت یہ بھی چاہتی ہے کہ سلیقہ کے اظہار میں بھی سچائی ہو۔ یہ نہیں کہ ویسے تو گھر گندگی کا ڈپو بنا رہتا ہو مگر مہمان پر اپنی نفاست اور صفائی پسندی کی دھاک بٹھانے کے لئے پہلے اس روز پورا گھر نہایا دھویا اور صاف ستھرا لگ رہا ہو اور پھر جب مہمان چلا جائے تو "تماشا ختم" کے اعلان کے ساتھ ہی وہی گندگی، میلے بستر اور بیرنگ لوہ کپڑوں کے ساتھ اہل خانہ ان کی آنکھ مچولی شروع ہو جائے۔ خدا ایسا کیوں نہ ہو کہ گھر ویسے بھی صاف ستھرا ہو کہ مومن کا نصف ایمان صفائی ہے اور مہمان کی عزت افزائی کے لئے مزید نکھار پیدا ہو نہ کہ اظہار برتری و دولت کے لئے۔ کیا یہ جھوٹ اور منافقت نہیں کہ اصل کچھ ہو اور نظر کچھ آئے؟

ہر انسان سچائی، خلوص اور محبت کا بھوکا ہے، خواہ وہ اس پر عمل کرتا ہو یا نہ کرتا ہو۔ جو ظاہرداری کا پرچار کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ دنیا بھی تو دکھنی پڑتی ہے۔ مگر کیا دنیاداری قائم رکھنے کے لئے جھوٹ کی ضرورت ہے؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ انسان جو کچھ بھی کرے وہ سچائی کے ساتھ کرے۔ ظاہر کے ساتھ باطن کو بھی شریک کر لیں تو حقیقی خوشی بھی حاصل ہوتی ہے اور اس کے لئے انسان کو صرف نیت کو صحیح کرنی پڑتی ہے کہ وہ اللہ کی خاطر دولت،

کینہ، بغض، نفرت اور عداوت سے پاک ہو کر خلوص، ہمدردی، خیر خواہی اور محبت کا سرچشمہ ہو۔ جیسے بھی جذبات ہوں ان کی پرورش اور نشوونما کے لئے محنت اور کوشش سے کام لئے بغیر بات نہیں بنتی۔ تو جو کوشش خوشامد اور منافقت کے اظہار کے لئے کی جائے وہی سچے اور مثبت جذبات کے لئے کیوں نہ ہو؟ خوب و ناخوب کے اظہار کا ایک ہی معیار تو نہ ہو کہ سب اچھا، ورنہ پھر بقول شاعر ع "کس کا یقین کیجئے، کس کا نہ کیجئے!" والی بات ہو جاتی ہے۔ یہ کیسی مضحکہ خیز صورت حالات ہے کہ بُری اور اچھی چیز ایک جیسی تحسین و تعریف پاتی ہے، مزے دار اور بدمزہ کھانے کی تعریف یکساں ہے۔ دل شکنی ضروری نہیں مگر غلط فہمی بھی تو نہ ہو کہ اس صورت میں بہتری کی گنجائش نہیں رہتی، چرچل نے سچائی کا اظہار یوں کہہ کر بھی کیا تھا "اس ہال کے آدھے لوگ بے وقوف نہیں"۔

یاد رکھنے اور قابل غور بات یہ ہے کہ سچے جذبات کو بہت کم اظہار کی ضرورت ہوتی ہے، وہ آپ کے روئیں روئیں سے آشکار ہوتے ہیں اور دوسرے پر گہرا پائیدار اثر چھوڑتے ہیں۔ وہ ایسی ٹھنڈی پھوار کی مانند ہوتے ہیں جو تپتی دھوپ کی تلخی کو سکون و راحت میں بدل دیتے ہیں۔ سچائی کا راستہ اختیار کرنے سے انسان اپنے پاؤں اپنی چادر ہی میں رکھتا ہے، وہ جھوٹ کے ذریعے اپنی چادر کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتا، جس سے معاشرتی اور ثقافتی روگ نہیں پلتے۔ سچائی بڑی گہری اور مؤثر ہوتی ہے۔ وہ انسان کے اعمال و اقوال کو قابل اعتماد بناتی ہے۔ وہ بے شمار دکھوں اور فکروں کا علاج ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ سچ کڑوا ہوتا ہے یا اس پر چلنا مشکل ہوتا ہے۔ کڑوا سچ نہیں ہوتا بلکہ وہ غضب اور غصہ ہوتا ہے جو سچ کا لبادہ اوڑھ کر باہر نکلتا ہے اور سچ کو بدنام کرتا ہے۔ آخر سچائی بُرے اور بدبودار الفاظ و احساسات کا لبادہ اوڑھ کر ہی کیوں نکلتی ہے۔ وہ مٹھاس، اخلاق، مروت اور شرافت کا روپ دھار کر بھی تو ظاہر ہو سکتی ہے۔ سچ کی عادت ہو جائے تو خواہ مخواہ کی بہانہ بازیاں کرنے کی ضرورت بھی نہ ہو گی اور نہ ہی کسی کو بے اعتباری ہو گی۔ پیارے نبی ﷺ نے بھی تو آخر ایک چور کو سچائی کے ذریعے ہی بہتر انسان بنایا۔

اپنی توانائی اس حسین کائنات کو مزید حسن اور سکون بخشنے میں کیوں نہ صرف کی جائے کہ کائنات سراسر سچائی پر قائم ہے۔ کسی حقدار کا حق ادا کرنا بھی سچائی ہے۔ جھوٹ نیکی کی

حق تلفی کرتا ہے۔ سچائی میں سکون اور بھلائی کی بے بہا دولت پوشیدہ ہے۔ جھوٹ میں سراسر بدامنی، خوف و فساد اور بے چینی ہے اور پھر فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق مومن اور تو کچھ ہو سکتا ہے مگر جھوٹا نہیں!!

ناک کٹنے کا مسئلہ

ہمارے معاشرے میں ہی نہیں ہر معاشرہ میں ناک کٹنے کا مسئلہ بڑے زور و شور سے موجود ہے۔ ناک کٹنے کا مطلب ہے کہ اپنے معاشرے، اپنے ماحول اور ارد گرد کے باسیوں میں انسان کی سبکی ہو اور وہ ماحول کے معاشرتی تقاضوں کو پورا نہ کرتا ہو۔ ناک کٹنے کا باعث رائج الوقت رسوم اور طور طریقوں سے انحراف ہوتا ہے۔ انسانی معاشرہ صرف ایک ہی طرح اور ایک ہی طرز کے خیالات و عادات کا حامل نہیں ہوتا۔ اس میں ہر قسم اور ہر درجہ کی ذہنیت کے لوگ ہوتے ہیں۔ اگر ایک بات ایک کے لئے باعث عار ہے تو وہی دوسرے کے لئے باعث فخر ہو سکتی ہے۔

معاشرہ میں بے شمار گروہوں کی تقسیم کی وجہ سے ہر کسی کی ناک کٹنے کا مسئلہ متفرق وجوہات سے ہوتا ہے۔ معاشرہ میں ناک نہ کٹوانے کا مطلب اپنی عزت و آبرو کو سماج میں محفوظ کرنا ہوتا ہے۔

اس پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب انسانی معاشرہ کے بے شمار گروہ، بے شمار اقدار اور بے شمار معیارات ہیں تو انسان اپنی ناک کٹنے سے کیسے محفوظ رکھے۔ اگر وہ ایک کو خوش کرے گا تو دوسرے کو ناراض۔ جس کو ناراض کیا وہاں سبکی ہو گئی یا دوسرے الفاظ میں ناک کٹ گئی انسان کسی نہ کسی طبقہ یا گروہ سے ضرور متعلق ہوتا ہے۔ کوئی تنگ نظر، کوئی روشن خیال، کوئی لادین اور کوئی دیندار۔ ہر انسان جس گروہ سے بھی تعلق رکھتا ہے اس کی ناک اسی طبقہ یا گروہ کو خوش رکھنے سے بچ سکتی ہے۔ ایک اسلامی نظریہ رکھنے والے شخص کی ناک غیر اسلامی افعال کے سرزد ہونے سے کٹتی ہے اور غیر اسلامی نظریات کے حامل شخص کی ناک اسلامی نظریات پر عمل کرنے سے، تنگ نظر اور بنیاد پرست و رجعت

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِىْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد کرو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد: ۴۵
شمارہ: ۵
ذوالحجہ ۱۴۱۶ھ
مئی ۱۹۹۶ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زرتعاون ۱۰۰/-

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر 10 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات
  قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ 22 امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارہ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون 03-02-5869501
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110
پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض احوال

زیر نظر شمارہ اپنے مندرجات کے اعتبار سے "میثاق" کی عام معمول کی اشاعتوں کے مقابلے میں بہت مختلف اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے کہ یہ پورا شمارہ امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ان سیاسی تجزیوں پر مشتمل ہے جو جنوری ۱۹۶۹ء تا اکتوبر ۶۹ء ماہنامہ "میثاق" کے اداریوں کے طور پر شائع ہوئے۔

ایک دینی انقلابی تحریک کے داعی کا سیاسی امور کے بارے میں رائے زنی کرنا اگرچہ بظاہر کچھ عجیب اور کسی قدر ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے لیکن ہمیں قوی امید ہے کہ اس بارے میں امیر تنظیم کے نقطۂ نگاہ سے اکثر قارئین بخوبی آگاہ ہوں گے۔ اپنی کتاب "استحکام پاکستان" میں امیر تنظیم نے اس ضمن میں اپنا مستقل موقف نہایت وضاحت اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کتاب کے مقدمے میں امیر تنظیم نے اس صراحت کے بعد کہ "میرے بارے میں یہ بات عام طور پر مشہور ہے اور خود میں نے بھی اس کا بارہا اظہار کیا ہے کہ میں معروف معنی اور مروجہ مفہوم کے اعتبار سے ہرگز ایک سیاسی آدمی نہیں ہوں" اپنی تحریر و تقریر میں ملکی حالات پر گفتگو اور سیاسی امور پر رائے زنی کا سبب بایں الفاظ بیان فرمایا :

> "....اس کا اصل سبب یہ ہے کہ "سیاست" اگرچہ فی الاصل ایک نہایت وسیع مفہوم کی حامل اصطلاح ہے لیکن پوری دنیا میں بالعموم اور ہمارے یہاں بالخصوص اس کا ایک ہی محدود مفہوم رائج ہے۔ یعنی انتخابات میں حصہ لے کر حکومت کے حصول یا اس پر اثر انداز ہونے کی کوشش۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ پوری دنیا میں یہ امر مسلّم ہے کہ صحافت سیاست کا اہم ترین شعبہ ہے 'اس لئے کہ یہ رائے عامہ کو ایک خاص رخ پر ہموار کرتی ہے جس کا براہ راست اثر انتخابات پر پڑتا ہے' تاہم مروجہ معنی میں صحافیوں کو سیاسی آدمی کہیں بھی قرار نہیں دیا جاتا۔ اس اشکال کو اس طرح بآسانی حل کیا جا سکتا ہے کہ سیاست کو دو شعبوں میں منقسم سمجھا جائے۔ ایک نظری یا بالواسطہ سیاست اور دوسرے عملی یا براہ راست سیاست۔ ان میں

جہاں تک مؤخر الذکر یعنی عملی سیاست کا تعلق ہے اس نے عہدِ حاضر اور بالخصوص مغربی ممالک میں ایک پیشہ (Profession) کی حیثیت اختیار کرلی ہے لہٰذا یہ ہر شخص کے کرنے کا کام نہیں ہے بلکہ صرف پیشہ ور سیاستدانوں کی جولانگاہ ہے' لیکن جہاں تک مقدم الذکر یعنی نظری سیاست کا تعلق ہے تو کم از کم نظری اعتبار سے یہ ہر باشعور انسان کے لئے لازمی ہے' اس لئے کہ ملک اور قوم کے معاملات پر غور و فکر اور ان کو درپیش مسائل کے لئے سوچ بچار اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے دامے' درمے' سخنے کوشش ہر باشعور شہری کا فرض عین ہے اور اس سے اغماض و اعراض یقیناً ملک اور قوم سے بدعہدی اور بے وفائی کے مترادف ہے..."

حقیقت یہ ہے کہ کسی انقلابی جماعت کے کارکنوں کے لئے جہاں دینی و اخلاقی تربیت کا اہتمام ضروری ہوتا ہے وہاں ان کی سیاسی تربیت یعنی ملکی سیاسی حالات کا واضح شعور' کارفرما سیاسی قوتوں کے پس منظر اور شجرۂ نسب کا صحیح صحیح ادراک بھی ایک ناگزیر ضرورت ہوتا ہے۔

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ' کے زیر ادارت ماہنامہ "میثاق" کی اشاعت کا آغاز تو اگرچہ ۱۹۶۶ء میں ہو گیا تھا تاہم سیاسی تجزیوں پر مشتمل اداریوں کی اشاعت کا آغاز ۶۷ء سے ہوا۔ ان اداریوں میں امیر تنظیم نے تحریک پاکستان کے سیاسی پس منظر پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور اس بارے میں اپنا نقطۂ نظر بصراحت بیان کیا۔ پھر ۶۸ء میں بھی جب سابق صدر ایوب خان کا تخت حکومت ڈانواڈول تھا' ملک کی سیاسی صورتحال کے بارے میں متعدد اداریئے ماہنامہ میثاق کی زینت بنے۔ ۶۷ء اور ۶۸ء کے دوران شائع ہونے والے یہ سیاسی تجزیئے اب "اسلام اور پاکستان" نامی کتاب کی صورت میں دستیاب ہیں۔

پاکستانی سیاست کے نئے دور کا آغاز ۶۹ء میں ہوا۔ ایوب خان کے اقتدار کے خاتمے کے بعد اب ایک طویل مدت بعد مختلف سیاسی رہنماؤں اور سیاسی جماعتوں کو قسمت آزمانے کا موقع ہاتھ آیا تھا۔ اس دور میں بھی امیر تنظیم نے تسلسل کے ساتھ "میثاق" کے لئے سیاسی تجزیئے تحریر کئے اور میدان سیاست میں باہم نبرد آزما مختلف کرداروں کے پس منظر اور ملکی سیاست میں ان کے حقیقی کردار کو عمدگی سے واضح کیا۔ زیر نظر شمارے میں انہی

سیاسی تجزیوں کو ہدیہ قارئین کیا جارہا ہے۔

ان ۲۷ برسوں کے دوران اگرچہ وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ چکا ہے' کمیونزم اور USSR کی موت کے بعد عالمی حالات میں بڑی تبدیلی واقع ہو چکی ہے' پاکستان کی داخلی سیاست میں بھی بائیں بازو کے نمایاں سیاسی گروپ اب زیر زمین جا چکے ہیں' چنانچہ پیپلز پارٹی بھی اب اپنے سابقہ نظریات میں سے اکثر سے اس حد تک تائب ہو چکی ہے کہ اسے بائیں بازو کی سیاسی جماعت قرار دینا اب کسی طور مناسب معلوم نہیں ہوتا' تاہم ملکی سیاست کے میدان میں آج بھی بہت سے کردار وہی ہیں جو آج سے ستائیس اٹھائیس برس پہلے برسرعمل بلکہ برسرپیکار تھے۔ ان کرداروں کے پس منظر کو جاننے اور ملکی سیاست میں ان کے رول کو سمجھنے کے لئے زیر نظر شمارے میں شامل مضامین ایک کلید کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ قارئین ان مضامین کو دلچسپ اور مفید پائیں گے۔ ○○

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را!

پاکستانی سیاست کا
پہلا عوامی و ہنگامی دور

امیر تنظیم اسلامی اور داعی تحریکِ خلافت پاکستان

ڈاکٹر اِسرار احمد

کے سیاسی تجزیے

جو ۱۹۶۹ء کے دوران ماہنامہ "میثاق" کے ادارتی صفحات میں شائع ہوئے

ترتیب

باب اوّل

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کا زوال

اور ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی کیریئر کا آغاز

(ا)

جنوری ۱۹۶۹ء

اب سے ڈھائی تین ماہ قبل پاکستان کی سیاسی فضا میں جو زبردست طوفانی ہلچل پیدا ہوئی تھی' اس کا زور تو اگرچہ اب کم ہو گیا ہے اور دوبارہ کچھ ویسی ہی سکون آمیز کیفیت سیاسی میدان پر طاری ہو گئی ہے جیسی کسی بڑے طوفانِ باد و باراں کے بعد فضا پر طاری ہوتی ہے {ا} تاہم اس طوفان نے سیاسی میدان کے بہت سے گوشوں کو نکھار دیا ہے اور بہت سے زیر سطح رجحانات کو سطح پر لا کر نمایاں کر دیا ہے ------ "میثاق" اگرچہ ملکی سیاسیات سے بالعموم زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا' تاہم اس وقت جو صورت حال سامنے ہے اس سے بالکل صرفِ نظر بھی ممکن نہیں ------ بنابریں ہم بعض مسائل و معاملات کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

میدانِ سیاست کی اس حالیہ سرگرمی کی ابتدا کچھ تو واقعتاً طوفانی انداز کی تھی اور کچھ اس بنا پر بہت زیادہ طوفانی محسوس ہوئی کہ ایک عرصے سے ہمارے ملک میں سیاست کے میدان پر قبرستان کی سی خاموشی طاری تھی --- ورنہ ظاہر ہے کہ ہر آزاد ملک میں کچھ نہ کچھ سیاسی سرگرمی تو ہر وقت ہی جاری رہتی ہے' جو انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں بھی کبھی کبھی طوفانی انداز اختیار کر لیتی ہے (جیسا کہ حال ہی میں فرانس میں ہوا تھا) رہے درمیانی درجے کے ممالک تو ان میں تو اکثر و بیشتر سیاست چلتی ہی اس انداز پر ہے' مثلاً ہمارے ہمسایہ ملک ہندوستان میں سال بھر کے دوران شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو جب اس کے کسی نہ کسی حصے میں بالکل ابھی طرح کی صورت حال موجود نہ رہتی ہو

{ا} اگرچہ کچھ نہیں کہا جا سکتا' عین ممکن ہے کہ یہ سکوت و سکون کسی دوسرے طوفان کا پیش خیمہ ہی ثابت ہوا

جیسی ہمارے یہاں اس طوفان کے ابتدائی دنوں میں تھی---ہمارے یہاں چونکہ ایک طویل عرصے کے تعطل کے بعد سیاسی سرگرمی کا آغاز ہوا تھا لہٰذا کچھ تو یہ فی نفسہٖ تیز و تند (RASH) تھی اور کچھ انتظامیہ بھی اس کے لئے تیار نہ تھی۔ چنانچہ اس کی جانب سے صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے میں شدید غلطیاں ہوئیں۔ نتیجتاً آگ مزید بھڑکی اور کچھ ایسا سماں بندھا کہ ایک بار تو بالکل ایسے محسوس ہوا جیسے صدر ایوب کی حکومت خاتمے پر ہے اور پاکستان فوری طور پر کسی نئی سیاسی و انتظامی صورتِ حال سے دوچار ہونے والا ہے---- لیکن رفتہ رفتہ صورتِ حال سنبھل گئی۔ چنانچہ ایک طرف کچھ تو ایجی ٹیشن کا زور مدھم پڑا اور کچھ حکام سنبھلے' اور دوسری طرف کچھ اپوزیشن کی اپنی صفوں کے بعض رخنے منظرِ عام پر آئے اور کچھ حکومت کی اعلیٰ ترین سطح کی جانب سے بھی سیاسی گفتگو پر آمادگی کا اظہار ہوا---- نتیجتاً حالات و واقعات نے کسی فوری اور ہنگامی معاملے کی بجائے مسلسل اور مستقل سیاسی سرگرمی کی صورت اختیار کر لی-------!!

> ہمارے نزدیک سیاسی میدان کی یہ سرگرمی بجائے خود ملک و ملّت کے حق میں ایک فالِ نیک ہے۔ قبرستان کی سی خاموشی یا جیل کا سا "سب اچھا!" حکمرانوں کے نقطۂ نظر سے چاہے کتنا ہی خوش آئند ہو' کسی آزاد ملک اور زندہ قوم کے حق میں زہرِ ہلاہل سے کسی طرح کم نہیں۔

ہمارے نزدیک عوام کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملکی و ملی مسائل سے بھرپور دلچسپی لیں اور اپنے بھلے اور برے کے بارے میں خود سوچیں۔ اپنے ملک کے انتظامی معاملات کا فیصلہ اور اپنی قومی پالیسیوں کے رخ کا تعین عوام کا حق ہی نہیں فرض ہے----اور خاص طور پر پاکستان ایسے زیرِ ترقی ملک میں تو اس امر کی بھی شدید ضرورت ہے کہ عوام انتظامیہ پر نہ صرف یہ کہ کڑی نظر رکھیں بلکہ اسے پوری طرح لگام دے کر رکھیں ورنہ سیاسیات کے اس مشہور و معروف اصول کے مطابق کہ "اختیار و اقتدار میں بے راہ روی کا رجحان فطری طور پر موجود ہوتا ہے اور اقتدارِ مطلق تو لازماً بے راہ ہو کر رہتا ہے[۲]" ایک بے لگام اور بگٹٹ انتظامیہ کا بے راہ اور کج رو ہونا قطعی و یقینی ہے!!

{۲} "Authority tends to corrupt;and absolute authority corrupts alsolutely"

قیامِ پاکستان کے ابتدائی دس سالوں میں ملکی سیاست کے بازار میں خاصی رونق رہی تھی اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ "پارلیمانی سیاست" کی گہماگہمی اور حالات کی تبدیلی اور واقعات و حوادث کی رفتار میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا تھا---- اگرچہ مضبوط اور محکم سیاسی جماعتوں کے فقدان کے باعث میدانِ سیاست کی یہ ساری گرماگرمی خیر کے بجائے شر پیدا کرتی چلی گئی، جس کا منطقی نتیجہ ۵۸ء کے فوجی انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ہم نے مئی ۶۷ء میں ان ہی صفحات میں ۵۸ء کے اس فوجی انقلاب کی نوعیت، اس کے اسباب و علل اور عواقب و نتائج کے بارے میں جو رائے پیش کی تھی وہ حسب ذیل ہے :

"میدانِ سیاست کے اس اختلال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت سیاسی جماعتوں کے ہاتھوں سے نکل کر رفتہ رفتہ سروسز کے جانب منتقل ہوتی چلی گئی-- تا آنکہ ۵۸ء میں صدر ایوب نے تمام سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دے کر فوجی حکومت قائم کر دی اور تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر ایک طرف حکومت کا پورا نظم و نسق کلیۃً سروسز کے حوالے کر دیا اور دوسری طرف بنیادی جمہوریت کے نظام کے ذریعے سیاسی حقوق اور اختیارات کو تدریجاً عوام کے جانب منتقل کرنے کا وہی سلسلہ از سرِ نو شروع کیا جس پر تقریباً نصف صدی قبل غیر ملکی حکمران عمل پیرا ہوئے تھے--- گویا پاکستان کی عوامی سیاست ایک دم واپس نصف صدی قبل کے مقام پر پہنچ گئی! ملی اور قومی نقطۂ نگاہ سے یہ صورت حال یقیناً نہایت تشویش ناک اور پریشان کن ہے اور ہر مخلص اور محبِّ وطن پاکستانی کو لازماً اس پر سخت مضطرب اور غمگین ہونا چاہئے--- لیکن اس حقیقت کو ہر آن پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس کا اصل سبب قوم میں سیاسی شعور کی خطرناک حد تک کمی اور ملی و قومی احساسات کا خوفناک حد تک فقدان ہے! کسی ایک یا چند افراد کے سر اس پوری صورت حال کی ذمہ داری تھوپ دینا یا سیاسی بے بصیرتی کا شاہکار ہے یا علمی خیانت کا!"

بہرحال مارشل لاء کے نافذ ہوتے ہی فطری طور پر ملکی سیاست کا بازار ایک دم بند ہو گیا اور تمام سیاسی حلقے موت و زیست کی کش مکش سے دوچار ہو گئے۔

مارشل لاء تو ہمارے ملک میں اگرچہ چند ہی سال جاری رہا اور چاہے کسی کو پاکستان کے موجودہ دستور سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو بہرحال یہ ایک واقعہ ہے کہ ۶۲ء سے ہمارے ملک میں ایک باقاعدہ دستوری حکومت قائم ہے-----

> لیکن بالکل ایسے جیسے حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد بھی ایک عرصے تک جنوں اور شیطانوں پر ان کی ہیبت و وحشت کے اثرات قائم رہے تھے۔ ہمارے سیاستین کو بھی مارشل لاء کے صدمے سے ہوش میں آنے میں کافی وقت لگا ----- اور مارشل لاء کے خاتمے کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک ملکی سیاست کے میدان میں مکمل سردبازاری کا سماں طاری رہا!

یہ واقعہ ہے کہ مارشل لاء کے صدمے سے سب سے پہلے ہوش میں آنے والی جماعت ' جماعت اسلامی تھی' جو سیاسی جماعتوں پر سے پابندی اٹھ جانے کے فوراً بعد ایک منظم جماعت کی حیثیت سے برسرکار ہو گئی ----- اور یہ اس لئے ممکن ہو سکا کہ اس کے کارکنوں نے مارشل لاء کے دوران بھی کسی نہ کسی صورت میں اپنی اجتماعیت کو برقرار رکھا تھا ----- دوسرے نمبر پر حرکت میں آنے والا گروپ نظامِ اسلام کا تھا ----- مسلم لیگ کے احیاء کی کوشش ہوئی تو وہ فوراً سرکاری اور مخالفِ سرکار دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ رہے پاکستان کے اکثر قدیم ' خاندانی اور پیشہ ور سیاست دان تو ان کی اکثریت صورت حال کو کچھ زیادہ امید افزانہ پا کر بدستور گوشہ عافیت میں دبکی رہی۔

> ۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے موقع پر ۵۸ء کے بعد پہلی مرتبہ ملکی سیاست کے میدان میں کچھ ہلچل پیدا ہوئی۔ اور محترمہ فاطمہ جناح کی ہمت و جرأت نے دیمک کی طرح مارشل لاء کے عصائے سلیمانی کو چٹ کر لیا۔ تب سیاسی سورماؤں کو ہوش آیا اور وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ لیکن اب وقت کم تھا اور صدر ایوب کی سیاسی حکمت عملی نے انتخابات کو ملتوی کرنے سے انکار کر کے "احزابِ "مخالف کے ہاتھوں سے موقع چھین لیا!

اس موقع پر مخالف احزاب نے "COP" کے نام سے جو متحدہ محاذ قائم کیا تھا اس کے پاس عوام کو اپیل کرنے کے لئے آمریت کے مقابلے میں جمہوریت کے قیام کا بھاری بھرکم نعرہ تھا۔ لیکن تجزیئے سے جو بات سامنے آتی تھی وہ صرف یہ تھی کہ صدارتی طرز حکومت کے بجائے پارلیمانی طرز کا احیاء مطلوب تھا اور بس۔ اس مطالبے اور اس کے لئے متحدہ محاذوں کے قیام کے بارے میں ہماری پختہ رائے وہی ہے جو ہم نے مئی ۶۷ء کے متذکرہ بالا تذکرہ و تبصرہ میں عرض کی تھی ' یعنی یہ

کہ :

"ساتھ ہی یہ موٹی سی بات بھی ہر مخلص پاکستانی کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ اس کا علاج نہ صدارتی اور پارلیمانی جمہوریت یا بلاواسطہ و بالواسطہ انتخابات کے مسئلوں پر وقتی ہنگامے اٹھانے سے ہو سکتا ہے نہ مینڈکوں کی پنسیری کی طرح کے بالکل انمل بے جوڑ متحدہ محاذوں کے قیام سے ------ اس صورت حال کی اصلاح کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ بالکل فطری طریق پر عوام میں سے کوئی سیاسی جماعت ایسی اٹھے جو مسلسل محنت و مشقت اور پیہم جدوجہد کے ذریعے ایک طرف ان میں سیاسی شعور اور اپنے بھلے اور برے کی حقیقی پہچان پیدا کرے اور دوسری طرف ایک بڑی تعداد میں ایسے قومی کارکنوں کو تربیت دے کر تیار کرے جو ہر طرح کے مفادات سے صرف نظر کر کے خالص اصولوں کے لئے کام کر سکیں اور اپنے مقصد اور نصب العین کے ساتھ مخلصانہ تعلق اور قوم کی بہتری اور بھلائی کے لئے انتھک محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کی صلاحیت رکھتے ہوں ----- ۱"

۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے بعد کے چار سالوں کے بعض حالات و واقعات کا تذکرہ ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال کے صحیح تجزیئے اور ان مختلف عوامل کے صحیح فہم کے لئے ناگزیر ہے جو اِس وقت ملک کی سیاسی فضاؤں پر سرِ کار ہیں :

۱۔ ۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے دوران جو زلزلہ سا صدر ایوب کے ایوانِ اقتدار میں محترمہ فاطمہ جناح کی شرکت کے باعث آ گیا تھا' اس سے خبردار ہو کر صدر ایوب نے اپنی سیاسی حیثیت کو مستحکم کرنے اور اس غرض کے لئے اپنی جماعت کو مضبوط بنیادوں پر از سرِ نو منظم کرنے کی جانب توجہ کی اور واقعہ یہ ہے کہ اس کے لئے انہوں نے سرتوڑ کوشش کی۔ چنانچہ ابتدائی زمانے میں جبکہ احزاب اختلاف ابھی کچھ تو اپنی انتخابی شکست کے زخم چاٹنے میں معروف تھیں اور کچھ باہم دست و گریباں بھی ہو گئی تھیں' کنونشن لیگ کی تنظیم نو کا خاصہ چرچا ہوا اور کچھ عرصے تک تو یہ محسوس کیا گیا کہ شاید آئندہ اس ملک کی واحد سیاسی تنظیم سرکاری لیگ ہی ہو گی ---- لیکن جلد ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ نہ تو صدر ایوب عوام میں کوئی "جذبہ تازہ" پیدا کر سکے اور نہ ہی مخلص اور محنتی کارکنوں کی کوئی ٹیم تیار کر سکے ---- چنانچہ ادھر کچھ عرصے سے صدر ایوب کے قریبی حلقے کے لوگ بھی برملا اعتراف کر رہے ہیں اور غالباً حالیہ سیاسی ہنگاموں کے بعد تو صدر ایوب خود بھی

محسوس کرتے ہوں گے کہ وہ پاکستان مسلم لیگ کو ایک منظم اور فعال عوامی جماعت بنانے کی کوشش میں قطعاً ناکام ہو گئے ہیں اور اس کوشش میں جو وقت اور سرمایہ صرف ہوا وہ اکثر و بیشتر ضائع ہو گیا ہے!

> حقیقت یہ ہے کہ سیاسی جماعتیں کسی عوامی جدوجہد کے دوران محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کے ذریعے منظم و مستحکم ہوا کرتی ہیں اور مصائب و تکالیف کے الاؤ اور ابتلاؤں اور آزمائشوں کی بھٹیوں سے گزر کر ہی ان کے کارکنوں کا مسِ خام کندن بنتا ہے' مسندِ اقتدار تک رسائی کے بعد سے تو فوری طور پر کسی سیاسی جماعت کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ حکومت کے ایوانوں اور اقتدار کی مسندوں پر بیٹھ کر سیاسی جماعتوں کی تنظیم کی کوشش ویسا ہی احمقانہ خیال ہے جیسا یہ منصوبہ کہ پہلے سیدھے یا ٹیڑھے جس راستے سے بھی ممکن ہو اقتدار پر قبضہ جما لیا جائے اور پھر اس کے ذریعے ایک عوامی اسلامی انقلاب برپا کیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ کنونشن لیگ سے منسلک لوگوں میں سے اکثر و بیشتر کی اصل نظر مفادات پر ہے اور ان ہی کی باہمی بندر بانٹ پاکستان مسلم لیگ کی اصل اجتماعی سرگرمی ہے' نہ اس کے پاس مخلص کارکن ہیں اور نہ ہی عوام کی پشت پناہی اسے حاصل ہے ------ نتیجتاً صدر ایوب کی حکومت یا تو خود ان کی اپنی ذات کے بل پر قائم ہے' یا سروسز کے سہارے' اس کی کوئی حقیقی اور واقعی سیاسی اساس موجود نہیں ہے۔

۲ ۔ ۶۵ء کی پاک ہند جنگ بلاشبہ گزشتہ صدارتی انتخابات کے بعد کے دور کا اہم ترین واقعہ ہے۔ ملک کے بقا و دفاع اور خاص طور پر اس کی خارجہ حکمت عملی کے اعتبار سے تو اس کی اہمیت اظہر من الشمس ہے ہی' ملک کی داخلی سیاست پر بھی اس کے بہت گہرے اثرات مترتب ہوئے۔ ہمیں یہاں اس سترہ روزہ جنگ کے اسباب و علل سے تو سرے سے کوئی بحث ہی نہیں' اس کے تمام عواقب و نتائج کا استحصاء بھی مطلوب نہیں' البتہ ان میں سے چند ایسے امور کا تذکرہ ناگزیر ہے جن کا براہ راست تعلق ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال سے ہے۔

● ان میں سے اہم ترین امر تو یہ ہے کہ اس جنگ کے جو نتائج برآمد ہوئے ان کی بنا پر صدر

ایوب کی سیاسی حیثیت کو شدید دھکا لگا۔ اور ان کا جو ستارہ ایشیا کے ایک عظیم رہنما یا بالفاظِ دیگر ایشیائی ڈیگال کی حیثیت میں عروج کی جانب حرکت کر رہا تھا، مائل بہ زوال ہو گیا۔

● دوسرے یہ کہ پاکستان کی خارجہ حکمت عملی جو چند سال قبل سے مسلسل ایک خاص رخ پر بڑھتی چلی جا رہی تھی ایک انتہا پر پہنچ کر نہ صرف یہ کہ رک گئی بلکہ واپس قدیم سمت میں گردش کرنے لگی-----اور بظاہر احوال بھی اس میں کم از کم اعتدال کا رنگ نمایاں ہو گیا۔

● تیسرے یہ کہ مسلم قومیت کا جو جذبہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کا سبب بنا تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد جلد ہی سرد پڑ گیا تھا، اس جنگ کے دوران نہ صرف یہ کہ ایک دم پھر بیدار ہوا بلکہ ایک بار پھر اپنے پورے عروج کو پہنچ گیا، اگرچہ اس کا یہ زور شور (TEMPO) اب کی بار بھی عارضی ہی ثابت ہوا۔ اور جنگ کے بعد جلد ہی یہ جذبہ پھر سرد پڑنا شروع ہو گیا۔

> پاکستان کی خارجہ حکمتِ عملی اور پاکستانی قومیت دونوں کے اعتبار سے پاکستان کی سیاسیات میں جو مدّ اس جنگ کے دوران آیا تھا، صدر ایوب کو تو اپنی مخصوص ذمہ دارانہ حیثیت کی مجبوریوں کی بنا پر اسے ایک خاص حد تک لے جانے کے بعد واپس جذر کی جانب لوٹنا پڑا----- لیکن ان کے ایک اپنے تربیت دادہ نوجوان ساتھی نے مدّ سے جذر کی جانب رجوع سے انکار کر دیا اور وہ اسی مقام پر کھڑا رہ گیا۔ نتیجتاً اس نے اس مدّ کے لئے علامتی حیثیت اختیار کر لی-----بس یہیں سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی اصل ذاتی سیاسی زندگی اور پاکستان کی سیاسی تاریخ کے ایک بالکل نئے باب کا آغاز ہو گیا!!

۳۔ قدیم سکہ بند احزابِ اختلاف، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے بعد کچھ عرصہ تو کچھ اپنی انتخابی شکست کے زخموں کو سہلانے میں مصروف رہیں اور کچھ باہمی اختلافات میں الجھی رہیں۔ اس کے فوراً بعد ۶۵ء کی پاک ہند جنگ واقع ہو گئی جس میں پوری قوم متحد اور یکسو تھی اور اختلاف و افتراق کی گنجائش ہی نہ تھی۔ جنگ کے فوراً بعد اعلانِ تاشقند سے انہیں صدر ایوب کی حکومت کے خلاف عوامی جذبات کو مشتعل کرنے کا ایک سنہری موقع ہاتھ آیا تھا اور مخالف جماعتوں کے جوشیلے کارکن اس پر مُصر بھی تھے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔

لیکن بعض بزرگ سیاست دانوں نے عوامی ایجی ٹیشن کی تجویز کو رد کر کے ایک پُرامن آئینی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں جماعت اسلامی، کونسل مسلم لیگ، نظام اسلام پارٹی، عوامی لیگ اور مشرقی پاکستان کے قومی جمہوری محاذ پر مشتمل ایک متحدہ محاذ پاکستان ڈیمو کریٹک موومنٹ (PDM) کے نام سے معرض وجود میں آگیا۔ جو تقریباً دو سال سے سہل انداز میں اور سہج چال سے لیکن بڑے تسلسل واستقلال کے ساتھ دھیمے دھیمے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک مسٹر بھٹو نے ہنگامہ کھڑا کر کے اسے بالکل نئی صورت حال سے دوچار کر دیا۔

پی ڈی ایم کو اس بات کا کریڈٹ بہرحال دیا جانا چاہئے کہ اس نے تقریباً دو سال تک بحالیٔ جمہوریت کے لئے بڑی مستقل مزاجی سے کام کیا ہے اور اس کے لئے واقعی اور حقیقی محنت کی ہے۔ اور اگرچہ وہ جس شائستہ (SOPHISTICATED) قسم کے طریق کار کی عادی ہے اس سے کسی بھی حکومت کو فوری طور پر خائف ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی، کجا کہ ایک ملک کی اپنی نوکرشاہی (BEUROCRACY) کی حکومت کو، جو ایک حقیقی عوامی جمہوری حکومت کے سوائے باقی تمام قسم کی حکومتوں سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے---- تاہم اس میں شک نہیں کہ کم از کم پاکستان کی سیاسی تاریخ میں پی ڈی ایم کی حالیہ دو سالہ جدوجہد ایسی منظم اور مسلسل اور آئینی و پُرامن جدوجہد کی کوئی دوسری مثال، جماعت اسلامی کی ابتدائی دستوری مہموں کے سوا نہیں ملتی-----

اس کی وجہ بھی بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ PDM کا اصل تنظیمی ڈھانچہ بھی جماعت اسلامی ہی کے سہارے قائم ہے اور اس کی اصل روحِ رواں بھی جماعت اسلامی ہی ہے۔ پی ڈی ایم میں شامل دوسری تمام جماعتیں اور پارٹیاں چند معروف سیاست دانوں کی باہمی ایسوسی ایشنوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ وہ اصل جماعتی تنظیم جس کے بل پر پی ڈی ایم کا سارا کاروبار چل رہا ہے صرف جماعت اسلامی کی ہے۔

پی ڈی ایم کے بارے میں ایک اور اہم بات جو پیش نظر رہنی چاہئے وہ یہ ہے کہ اس پر دائیں بازو کے رجحانات کا فیصلہ کن غلبہ ہے۔ بائیں رجحانات کے حامل صرف نہایت نرم طبع اور معتدل مزاج لوگ ہی اس میں کھپ سکے ہیں اور انہیں بھی جلد یا بدیر اس سے علیحدگی اختیار کرنی ہوگی---- یہ بات بھی نوٹ

کرنے کے قابل ہے کہ اس اعتبار سے بھی اصل علامتی حیثیت اس گروہ میں
جماعت اسلامی ہی کو حاصل ہے۔ اور یہ' جیسا کہ ہم بعد میں قدرے تفصیل
سے عرض کریں گے' اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے ایک بہت
بڑی بد قسمتی کا آغاز ہے۔

۴۔ سوشلسٹ ذہن اور بائیں بازو کے رجحانات مشرقی پاکستان کی حد تک تو کم از کم اتنے ہی "قدیم" ہیں جتنا خود پاکستان' لیکن مغربی پاکستان میں یہ رجحانات زیادہ تر ۶۵ء کی جنگ کے بعد ابھرے ہیں۔ اور گزشتہ دو ڈھائی سال کے عرصے میں' اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رجحانات تیزی کے ساتھ پھیلے بھی ہیں اور مختلف تنظیمی ہیئتوں کی شکل میں نمودار بھی ہوئے ہیں۔ اس کا ایک سبب ملک کی معیشت میں "صنعتی انقلاب" کے اثرات بھی ہیں' جن سے موجودہ استحصالی نظامِ معیشت کی گھناؤنی صورت کھل کر سامنے آ رہی ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی بیکاری سے بھی ان رجحانات کو تقویت حاصل ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ ہماری گزشتہ پانچ چھ سال کی خارجہ پالیسی نے بھی' جس کے مدّو جذر کے جانب ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں ان رجحانات کو تقویت دی ہے ..... غرض کہ مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر ہمارے ملک میں سوشلسٹ نظریات اور بائیں بازو کے رجحانات نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑی قوت کی صورت اختیار کر لی ہے۔

مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی اس کی ایک عظیم علامت ہیں اور مغربی پاکستان
میں یوں تو اس کے کئی ایک دھڑے ہیں لیکن ان کے اصل علامت کی حیثیت
بلاشبہ مسٹر بھٹو کو حاصل ہو گئی ہے۔ اور اگرچہ ان دونوں کے مابین اشتراکِ
عمل کی کوئی واضح صورت تاحال سامنے نہیں آئی' تاہم یہ ایک یقینی امر ہے کہ
عنقریب ان دونوں میں اتحاد کی صورت پیدا ہو جائے گی اور پھر یہ بائیں بازو کا وہ
اصل مرکز (NUCLEUS) ہو گا جس کے گرد ملک کے تمام سوشلسٹ عناصر
حتیٰ کہ معتدل مزاج (یا عام اخباری اصطلاح کے مطابق ماسکو نواز) طبقے بھی جو
اِس وقت پی ڈی ایم کے ساتھ ہیں جلد یا بدیر جمع ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔

۵۔ گزشتہ دو ڈھائی سال کے دوران تدریجاً ایک اور قوت بھی پاکستانی سیاست کے منظرِ عام پر

نمودار ہوئی ہے۔ ہماری مراد جمعیت علمائے اسلام سے ہے، جس نے اس عرصے میں رفتہ رفتہ خاصی قوت بہم پہنچائی ہے اور اپنے منتشر اثرات کو خاصے مضبوط تنظیمی سلسلے میں منسلک کر لیا ہے۔ یہ تنظیم اگرچہ اپنی ہیئت اور نوعیت کے اعتبار سے دوسری تنظیموں مثلاً جماعت اسلامی سے بہت مختلف ہے (مثلاً اس کے یہاں کاغذی کاروائی اور دفتری نظام شاید بالکل ہی دقیانوسی اور PRIMITIVE طرز کا ہو) لیکن ایک مشترک ذہنی ساخت اور مشترک اندازِ فکر اور اس کے ساتھ ساتھ ایک شاندار ماضی کے ورثے کی بنا پر اس گروہ نے بہت جلد ایک نہایت منظم اور فعال فطری تنظیم کی صورت اختیار کر لی ہے۔ عوام میں اس کی جڑیں انتہائی زیریں سطحوں (SUBSTRATA) تک گہری اتری ہوئی ہیں۔ دینی مدارس اس کے مستقل مراکز اور اللہ کے گھر اس کے مستقل دفاتر ہیں۔ اس کے عام کارکن ہی نہیں اکابر تک سب خالص عوامی کارکن ہیں۔ سادگی، دینداری اور غایت درجہ خلوص کے ساتھ نہایت زوردار جذبۂ عمل اس کے شعائر ہیں۔ ان تمام چیزوں کے پیش نظر یہ اندازہ قطعاً مبالغہ پر مبنی نہیں ہے کہ آئندہ پاکستان کی سیاست کے میدان میں جمعیت علمائے اسلام نہایت مؤثر رول ادا کرے گی۔

ہم انہی صفحات میں چند ماہ قبل یہ عرض کر چکے ہیں کہ یہ گروہ ذہناً و قلباً خالص "حسینی" ہے۔ یعنی علمائے دیوبند کے اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے جس کے سرگروہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ تھے۔ اس طرح ان کا تعلق تحریکِ آزادئ ہند و استخلاصِ وطن کے اس قدیم و عظیم سلسلے سے جا ملتا ہے جو "تحریکِ شہیدین" سے شروع ہو کر ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی سے ہوتا ہوا، اور پھر تحریکِ خلافت اور ریشمی رومالوں کی تحریک ایسی دوسری متعدد چھوٹی چھوٹی کڑیوں سے گزر کر بالآخر جمعیت علمائے ہند پر ختم ہوا تھا۔ اور اس پورے عرصے میں اسلامیانِ ہند کی رہنمائی کا فرض ادا کرتا رہا تھا۔ آزادئ ہند سے متصلاً قبل مسلمانانِ ہند کی ایک عظیم اکثریت نے اس گروہ کے راستے کو چھوڑ کر ایک دوسرا راستہ اختیار کر لیا تھا جو بالآخر قیامِ پاکستان پر منتج ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اول اول اس طبقے پر شکست کا سا احساس طاری رہا۔ اور ان حضرات نے ایک عرصے تک حلقہ دیوبند کے ان دوسرے اکابر کی سیادت قبول کر کے جنہوں نے تحریک پاکستان کا ساتھ دیا تھا گوشہ عافیت میں پناہ لئے رکھی۔ ۵۳/۱۹۵۲ء میں مجلس احرار اسلام نے جو عظیم سیاسی ایجی ٹیشن برپا کیا تھا اس کی پشت پر اصل قوت اسی گروہ کی تھی۔ اس کے فوراً بعد جب پاکستانی سیاست میں انتشار برپا ہوا اور مسلم لیگ

کو فیصلہ کن سیاسی حیثیت حاصل نہ رہی تو اس گروہ نے بھی اپنی حامیٔ مسلم لیگ قیادت کا جوا گردن سے اتار پھینکا اور خالصتاً اپنا اصل اور قدیم رنگ اختیار کر لیا۔

------اُس وقت سے اب تک اندر ہی اندر ان کی تنظیم وسعت اختیار کرتی رہی اور اس کے کارکنوں میں جوش و جذبہ بیدار ہوتا رہا------ گزشتہ سال ان کی جو کانفرنس لاہور میں موچی دروازے کے باہر ہوئی تھی' اس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ جلد ہی جمعیت پاکستان کی عملی سیاست میں مؤثر طور پر دخیل ہو گی------ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ مارشل لاء کے بعد سے جو سکوت و سکون پاکستانی سیاست پر طاری تھا اور لوگ جس طرح سہمے سہمے سے تھے اس میں پہلی ہلچل اور اولین سیاسی سرگرمی جمعیت ہی کے زیر اثر پیدا ہوئی۔ ہماری مراد اس کامیاب ایجی ٹیشن سے ہے جو ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی کتاب کے خلاف برپا ہوئی تھی اور جس سے چھٹکارا پانے کے لئے حکومتِ وقت کو ڈاکٹر صاحب موصوف کو قربانی کا بکرا بنانا پڑا تھا!

> اس گروہ کے بارے میں اہم ترین بات جو نوٹ کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا رجحان بائیں بازو کی جانب ہے اور چاہے اس کا سبب مغربی استعمار سے شدید نفرت کا وہ قدیم جذبہ ہو جو انہیں اپنے اسلاف سے ورثے میں ملا ہے اور گویا ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے' چاہے یہ واقعہ ہو کہ چونکہ یہ خود ایک خالص عوامی قوت ہیں لہٰذا عوام کی دِقتوں اور مشکلات کا زیادہ قریبی احساس رکھتے ہیں' اور چاہے یہ ہو کہ ماضی میں ان کا اشتراکِ عمل جس عظیم سیاسی تحریک کے ساتھ رہا ہے (ہماری مراد ماضی کی انڈین نیشنل کانگرس ہے!) اس پر بالعموم سوشلسٹ خیالات کا غلبہ تھا---- سبب یا اسباب خواہ کچھ بھی ہوں بہر حال واقعہ یہی ہے کہ جمعیت علمائے اسلام کا رجحان بائیں بازو کی جانب ہے۔ اور چاہے اس کے اکابر و رہنما خالص اور بے آمیزش اسلام ہی کے علمبردار ہوں' اس کے کارکنوں میں کثیر تعداد ایسے جوشیلے لوگوں کی شامل ہے جو اسلام کے ساتھ سوشلزم کا پیوند نظری طور پر درست اور بحالاتِ موجودہ عملاً لازمی خیال کرتے ہیں---!

یہی وجہ ہے کہ شرقِ اوسط کی سیاست میں بھی یہ حضرات صدر ناصر کے حامی و مؤید اور شاہ

فیصل کے ناقد و مخالف ہیں ------ اور تازہ سیاسی ہنگامے میں بھی ان کی شرکت اولاً نیشنل عوامی پارٹی اور بھٹو صاحب کی پاکستان پیپلز پارٹی کے شانہ بشانہ ہوئی ہے۔ اس صورت حال کا صحیح اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انگلستان سے واپسی پر جب مولانا مودودی نے غیر معمولی گھن گرج کے ساتھ [illegible]زم کے حامیوں کو چیلنج کیا تو اس کے جواب میں جمعیت علمائے اسلام کے سرکاری آرگن "ترجمان اسلام" نے "مودودی صاحب کی تازہ گھن گرج" کے عنوان سے تحریر فرمایا کہ :

"لندن کی سرد آب و ہوا سے صحت یاب ہو کر مودودی صاحب پاکستان کے نسبتاً گرم ماحول میں تشریف لا چکے ہیں جس کی گرمی میں کافی اضافہ ان کی غیر حاضری کے دوران کے پیدا شدہ گرم سیاسی موسم نے کر رکھا ہے۔ آپ نے ۳۰/ دسمبر کی شام کو لاہور میں مختلف حصوں سے آئے ہوئے اپنی جماعت کے کارکنوں سے زبردست گھن گرج کے عالم میں فرمایا کہ "جب تک ہم زندہ ہیں اس وقت تک کسی کی یہ ہمت نہیں ہے کہ یہاں اسلام کے سوا کسی اور نظام کو لا سکے" ...... مودودی صاحب کی یہ گھن گرج اگر اس دعویٰ کی حقیقتاً حامل ہوتی اور اپنے ان فرمودات کے دوسرے حصوں میں خود ہی انہوں نے اپنی اس "گھن گرج" کی بالمعنی تردید نہ فرمادی ہوتی تو اس اعلان کا خیر مقدم پاکستان کا ہر دین دار مسلمان تہ دل سے کرتا۔ لیکن اسے کیا کیجئے کہ اس ساری "گھن گرج" کا مقصد صرف یہاں پہنچ کر ختم کر دیا گیا کہ "اسلام اور سوشلزم کا پیوند لگانا ممکن نہیں" اور یہ کہ "یہ محمد عربیؐ کی امت کا ملک ہے' یہ مارکس یا ماؤزے تنگ کی امت کا ملک نہیں ہے" ---- سوال یہ ہے کہ اسلام اور سوشلزم کے پیوند کا انکار کرنے والا اسلام اور برطانوی پارلیمانی نظام کے پیوند کا بھی انکار کیوں نہیں کرتا؟ اور محمد عربیؐ کی امت کے اس ملک کے مارکس اور ماؤزے تنگ کی امت کا ملک ہونے کی نفی کرنے والا اس ملک میں اس برطانوی سیاسی نظام کی بحالی کی جدوجہد میں کیوں معروف ہے جو گلیڈ سٹون' لائڈ جارج' چرچل وغیرہ کا تراشیدہ اور رائج کردہ ہے؟ آخر اسلامی نظام کے قیام کی یہ بلند بانگ صدا صرف سوشلزم کے ہی مقابلہ میں کیوں اتنی "گھن گرج" دکھاتی ہے اور کیوں برطانوی پارلیمانی نظام کی حمایت میں تبدیل ہوتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ اس نظام کے ہر چھوٹے بڑے جزو کو بھی قبول کرتی چلی جاتی ہے"۔ (ترجمان اسلام' ۱۰/ جنوری ۶۹ء)

الغرض ایک مدتِ طویل کے حبس کے بعد جو طوفانی کیفیت گزشتہ ڈھائی تین ماہ کے دوران پاکستانی سیاست کے میدان پر طاری رہی تھی اس کے مدھم پڑتے ہی جونئی صورت حال سامنے آئی ہے اور گزشتہ چند سالوں سے جو رجحانات زیر سطح تقویت پاتے رہے ہیں ان کے ایک دم سطح پر آ جانے سے سیاست کی جو تازہ بساط پاکستان میں بچھی ہے اس کا مختصر نقشہ یہ ہے :

۱۔ جہاں تک حکومتِ وقت کا تعلق ہے وہ کچھ ایک فرد کی ذاتی شخصیت کے سہارے اور زیادہ تر نوکرشاہی کے بل پر قائم ہے۔ اس کی عوامی و سیاسی جڑیں اول تو کوئی ہیں ہی نہیں اور جو ہیں ان کی حیثیت بھی زیادہ سے زیادہ ان اضافی جڑوں (ADVENTITIOUS ROOTS) کی سی ہے جو بعض درختوں (مثلاً برگد) کی شاخوں سے اتر کر زمین میں پنجے گاڑ لیتی ہیں اور درخت کے پھیلاؤ کے لئے اضافی سہاروں کا کام دیتی ہیں۔

۲۔ پاکستانی سیاست کا وہ دور اب گزر چکا جب سیاست صرف اصحابِ دولت و ثروت کے مشغلے کی حیثیت رکھتی تھی اور گنتی کے چند جاگیردار اور سرمایہ دار (جن میں تازہ اضافہ بعض نو دولتیے صنعت کاروں کا ہوا تھا) اس پر کامل اجارہ داری رکھتے تھے۔ اب یہاں عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہو گیا ہے اور وہ دور قریب آیا چاہتا ہے جس کی خبر علامہ اقبال مرحوم نے اپنے ان اشعار میں دی تھی کہ۔

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اور۔

گیا دورِ سرمایہ داری گیا تماشہ دکھا کر مداری گیا

۳۔ پاکستان کی موجودہ بساطِ سیاست کے عناصرِ اربعہ حسب ذیل ہیں : ایک دائیں بازو کے قدیم خاندانی اور پیشہ ور سیاست دان جو اکثر و بیشتر زمینداروں اور سرمایہ داروں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اگرچہ اس وقت متعدد سرکاری و غیر سرکاری لیگوں میں منقسم ہیں لیکن در حقیقت ملتِ واحدہ ہیں اور کسی بھی وقت ع ''آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک'' کے مصداق باہم متحد ہو سکتے ہیں۔ (کنونشن لیگ اور کونسل لیگ تو خالص ہم جنس ہیں ہی 'عوامی لیگ میں البتہ لیگی الاصل عناصر کے ساتھ ساتھ بعض حقیقی عوامی عناصر بھی شامل ہیں' لیکن سیاست کی موجودہ تیز رفتاری کے پیش نظر ان کا جلد ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جانا قطعی ہے) دوسرے 'دائیں بازو

مضبوط مذہبی جماعت --- جماعت اسلامی ----- تیسرے 'بائیں بازو کی سیاسی جماعتیں جن میں سے کچھ فی الوقت پی ڈی ایم (یا تازہ تر ڈی 'اے 'سی) میں شامل ہیں اور کچھ اس کے باہر ہیں۔اور ---- چوتھے 'بائیں بازو کی مذہبی جماعت ---- جمعیت علمائے اسلام {۳}

۴۔ پاکستان کی آئندہ سیاسیات کا اصل محور (AXIS) دائیں اور بائیں بازوؤں کے رجحانات کا تصادم ہو گا {۴} اور متذکرہ بالا موجودہ بساطِ سیاست میں جو گروہ بندیاں اس محور کے علاوہ کسی اور بنیاد پر قائم ہیں یا ابھی قائم ہو رہی ہیں وہ جلد یا بدیر ٹوٹ کر رہیں گی اور نئی صف بندی (ALIGHNMENT) اسی محور کے گرد ہو گی۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ قابلِ حذر لیکن قطعاً یقینی امر یہ ہے کہ دائیں اور بائیں بازو کی بیرونی قوتیں بھی اب پاکستانی سیاست میں پہلے سے کہیں زیادہ دخیل ہوں گی اور اپنے اپنے مفادات کے تحفظ اور اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر کے دفاع اور ان میں توسیع کے لئے زیادہ سے زیادہ امکانی حد تک اثر انداز ہونے کی کوشش کریں گی۔

۵۔ ہمارے نزدیک اس وقت ملک کی داخلی سیاست کے اصل بنیادی مسائل دو ہیں : ایک یہ کہ سیاسی اختیارات ---- جو مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر عوام کے بجائے نوکر شاہی کے قبضے میں چلے گئے ہیں، وہ اختیار و اقتدار کے اصل مالکوں یعنی جمہور کو منتقل کئے جائیں اور دوسرے یہ کہ دولت اور خصوصاً ذرائع پیداوار جو عوام الناس کے بجائے ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری بن گئے ہیں انہیں پوری قوم میں عدل و انصاف کے ساتھ تقسیم کیا جائے ------ گویا کہ پہلی "سلطانیٔ جمہور"

{۳} رہے بعض وہ "تازہ واردانِ" بساطِ سیاست جو آزاد سیاست دانوں کی حیثیت سے دنگل میں شریک ہوئے ہیں تو اس سے قطع نظر کہ ہمارے نزدیک ان حضرات کی کوئی واقعی سیاسی اہمیت نہیں ہے اور ان میں سے بعض کا جو شاندار استقبال ہوا ہے وہ بھی ہمارے نزدیک پاکستانی قوم کے ایک طبقے کے سیاسی افلاس کا مظہر ہے۔ چونکہ وہ تقریباً سب کے سب دائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ہم انہیں میدان سیاست کا پانچواں سوار بھی تسلیم نہیں کرتے، بلکہ متذکرۃ الصدر عناصرِ اربعہ میں سے پہلے عنصر ہی کا ضمیمہ سمجھتے ہیں!

{۴} جس کی ایک ناخوشگوار ابتداء لاہور اور کراچی میں دائیں بازو کی انتہائی جماعت جماعت اسلامی اور بائیں بازو کے انتہاپسند لوگ یعنی پی پی پی کے کارکنوں کے سر پھٹول کی شکل میں ہو چکی ہے۔

کے نظام کے واقعی اور حقیقی نفاذ کی کوشش ہے اور دوسری "دورِ سرمایہ داری" کے منحوس اثرات اور نقوشِ کہن کو مٹانے کی سعی و جہد ہے۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں ہی کوششیں درست بھی ہیں اور مبارک بھی! اور ملک کے ہر ذی شعور شہری کا فرض ہے کہ وہ ان میں اپنی اپنی صلاحیت' استعداد اور قوتِ کار کے مطابق حصہ لے۔ اسلام کے نزدیک یہ دونوں ہی مقاصد محمود ہیں۔ اسلام ایک طرف اسے بھی گوارا نہیں کرتا کہ بندگانِ خدا کی گردنوں پر کوئی ایک فرد یا کچھ افراد یا کوئی مخصوص طبقہ خدائی کا تخت جما کر بیٹھے' ---- اور دوسری طرف عدل و انصاف پر بھی انتہائی زور دیتا ہے۔ چنانچہ "وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ "{۵} آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں سے ہے اور "لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ "{۶} کتابِ الٰہی کا مقصدِ نزول ہے اور "دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ "{۷} کی کوئی صورت اسلام کے نزدیک کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں!

لیکن افسوس کہ ہمارے یہاں اس وقت ان دونوں ہی میں شدید افراط و تفریط سے کام لیا جا رہا ہے۔ دائیں بازو کے اہلِ سیاست نے صرف پہلے کام پر نگاہوں کو مرکوز کر دیا ہے اور دوسرے معاملے کے ضمن میں وہ "وعدۂ فردا" سے آگے قدم بڑھانے کو تیار نہیں' اور مزید بدقسمتی یہ کہ "سلطانیٔ جمہور" کے ذیل میں بھی ان کے سارے تصورات یورپ کے مبنی بر الحاد فکر سے مستعار لئے ہوئے ہیں ------- دوسری طرف بائیں بازو کے حامی لوگوں نے اپنی اصل توجہ دوسرے کام پر مرکوز کر دی ہے اور "عدلِ اجتماعی" کے لئے نظام بھی ان کے پیش نظر خدا تعالیٰ اور رسول ﷺ کا عطا کردہ نہیں' مارکس' لینن اور ماؤزے تنگ کا وضع کردہ ہے ----!!

{۵} "اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے مابین انصاف کروں"۔ (الشوریٰ : ۳۸)

{۶} "تاکہ لوگ عدل و انصاف کے نظام پر قائم رہیں" (الحدید : ۲۵)

{۷} "(سرمایہ) کا الٹ پھیر تمہارے اہل ثروت ہی کے مابین"۔ (الحشر : ۷)

اس صورت حال میں ہر اس شخص کے لئے جو اول و آخر صرف مسلمان ہو اور جس کے نزدیک دین و مذہب ہر چیز پر مقدم ہوں، ایک اہم لمحہ فکریہ ہے--- ایسے سب لوگوں کو، خواہ وہ موجودہ سیاسی سرگرمی میں کسی حیثیت سے شریک ہوں، خواہ کسی خالص غیر سیاسی کام میں مصروف ہوں، اس صورت حال کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنا چاہئے اور آئندہ پیش آنے والے حالات کے مدِ نظر دین کے احیاء اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لئے مناسب لائحہ عمل طے کر کے اس پر عمل پیرا ہو جانا چاہئے۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تُو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!

(۴)

فروری ۱۹۶۹ء

گزشتہ ماہ کا "تذکرہ و تبصرہ" ہم نے اس نسبتاً پر سکون وقفے کے دوران تحریر کیا تھا جو پاکستانی سیاست کے میدان میں پہلی طوفانی ہلچل کے بعد کچھ دنوں کے لئے آیا تھا۔ اور اگرچہ ہم نے اس وقت کی سکون آمیز کیفیت کے بارے میں اس خدشے کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ "عین ممکن ہے کہ یہ سکوت و سکون کسی دوسرے طوفان کا پیش خیمہ ہی ثابت ہو!" تاہم واقعہ یہ ہے کہ ہمیں قطعاً اندازہ نہ تھا کہ اس قدر فوری طور پر ایک دوسرا طوفان آجائے گا جس کی تیزی و تندی سابقہ تمام ریکارڈ توڑ ڈالے گی!

بہرحال، متوقع یا غیر متوقع، طوفان کا یہ دوسرا ریلا بہت سخت، جس میں معاملہ جلسوں، جلوسوں، مظاہروں، لاٹھی چارج اور اشک آور گیس کے استعمال سے بہت آگے نکل کر عوام کی طرف سے توڑ پھوڑ، لوٹ مار، آتش زنی و خشت باری بلکہ بعض مقامات پر مہلک ہتھیاروں کے استعمال تک ---اور حکومت کی جانب سے پولیس کی فائرنگ، فوج کی طلبی اور کرفیو کے نفاذ تک جا پہنچا۔ چنانچہ مشرقی و مغربی پاکستان کے درجن بھر بڑے بڑے شہروں میں مسلسل کئی روز تک لاقانونیت کا دور دورہ رہا اور شہری زندگی پر کامل تعطل کی کیفیت طاری رہی---اور اگرچہ ان سطور

کی تحریر کے وقت صورتِ حال یہ ہے کہ بالعموم حالات پر قابو پایا جا چکا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ فوج کی آمد اور کرفیو کے نفاذ کے بعد کسی جگہ سے بھی کسی خاص واقعے یا حادثے کی اطلاع نہیں ملی، چنانچہ اکثر مقامات سے کرفیو اٹھایا بھی جا چکا ہے، تاہم حالات کسی طرح بھی اطمینان بخش قرار نہیں دیئے جا سکتے اور عین ممکن ہے کہ کچھ وقفے کے بعد دوبارہ ناخوشگوار واقعات کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

ہم نے گزشتہ ماہ بھی عرض کیا تھا ---- اور پھر اعادتاً عرض ہے کہ ہمیں ملک کی سیاست سے براہِ راست کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ ع "ہر کسے را بہرِ کارے ساختند!" کے مصداق ہمارا مزاج ہی سیاست سے موافقت نہ رکھتا ہو اور ہم اپنی افتادِ طبع کے باعث اس سے بُعد محسوس کرتے ہوں۔

لیکن جہاں تک ہماری شعوری سوچ کا تعلق ہے، اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمیں اصل دلچسپی دین و مذہب سے ہے اور ہماری پختہ رائے یہ ہے کہ اگرچہ ہماری ملکی سیاست کے میدان میں مسلسل دین و مذہب کا نام لیا جاتا رہا ہے اور اِس وقت بھی دو مضبوط مذہبی گروہ پاکستانی سیاسیات میں بر سرِ کار ہیں، حقیقت یہ ہے کہ نہ ہماری موجودہ ملکی سیاست کا کوئی تعلق اسلام سے ہے، اور نہ ہی گزشتہ اکیس سال کے دوران کبھی دین و مذہب کو پاکستان کی سیاست میں کسی مؤثر عامل کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

بایں ہمہ ---- چونکہ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ انسان اپنے گرد و پیش سے بالکل لاتعلق نہیں رہ سکتا اور ملک و ملت کے مسائل تو بہت اہم ہیں، گلی اور محلے کے معاملات سے بھی کسی انسان کے لئے قطعاً لاتعلق رہنا ممکن نہیں، لہٰذا گزشتہ ماہ بھی ہم نے ملک کی موجودہ سیاسی صورتِ حال کا اپنے نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا تھا اور اپنے فہم کی حد تک موجودہ سیاست کے حدودِ اربعہ کے تعین کی کوشش کی تھی ---- اور اس ماہ بھی ہم اپنی رائے، جو خالصتاً ملک و ملت کی خیر خواہی اور قوم و وطن کی نصح و ہمدردی پر مبنی ہے، پیش کرنا چاہتے ہیں۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ پاکستان کی موجودہ سیاست سخت تشویش ناک صورت اختیار کر گئی ہے اور ملک و ملت کے تمام بہی خواہوں کا فرض ہے کہ وہ جماعتی سیاست کے تقاضوں سے بلند تر ہو کر خالص ملی و قومی سطح پر غور و فکر کریں اور اس پیچیدہ صورتحال کو جلد از جلد سلجھانے کی کوشش کریں۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ سیاسی ایجی ٹیشن کے اس دوسرے ریلے میں لاقانونیت اور انارکی کا رنگ غالب تھا اور اگرچہ تمام مخالف جماعتوں نے تخریبی سرگرمیوں کی ذمہ داری سے اظہارِ براءت کیا ہے اور توڑ پھوڑ اور لوٹ مار کی ساری ذمہ داری کسی قدر غنڈہ عناصر پر اور زیادہ تر خود حکام کے غلط اقدامات پر ڈالی ہے اور یہ الزام بھی لگایا ہے کہ یہ ساری کارروائی حکام نے سخت تر اقدامات کا جواز مہیا کرنے کے لئے از خود اپنے ایجنٹوں سے کرائی ہے، تاہم یہ بالکل واضح ہے کہ عوامی سطح پر سیاسی شعور اور جماعتی تنظیم کی ابھی ہمارے یہاں بہت کمی ہے اور اپوزیشن کسی طرح بھی اس امر کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ قوم کی ایک ایسی واضح اکثریت کا اعتماد و تعاون اسے حاصل ہے کہ وہ اپنی سیاسی تحریک کو طے کردہ خطوط پر چلانے اور اسے کوئی غلط رخ اختیار کرنے سے روکنے پر قادر ہے۔

آنجہانی موہن داس کرم چند گاندھی نے ایک مرتبہ اپنی سیاسی تحریک کو عین عروج کے موقع پر محض اس بنا پر ایک دم بند کر دیا تھا کہ ایک مشتعل ہجوم نے ایک تھانے پر حملہ کر دیا تھا اور اس کے باوجود کہ ان کے تمام اہم رفقاء اس پر سخت برہم ہوئے تھے اور مُصِر تھے کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لے لیں، وہ اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے تھے اور گویا ان کا موقف یہ تھا کہ ایسے واقعات کا ظہور ہماری سیاسی پوزیشن کی کمزوری اور عوام پر ہماری گرفت کی کمی کا ثبوت ہے۔ اور ہمیں ابھی۔

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی!

کے مصداق عوامی تحریک چلانے سے اجتناب کرتے ہوئے اپنی توجہات عوام کے سیاسی شعور کی تربیت اور عوامی تنظیم کے استحکام پر مرکوز کر دینی چاہئیں۔

ہمارے یہاں، جیسا کہ ہم نے گزشتہ ماہ بھی عرض کیا تھا، اس وقت عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ بالکل شروع ہی سے سیاست کے میدان میں صحت

مند روایات قائم ہوتی چلی جائیں اور مختلف الخیال عناصر اپنی اصل توجہ رائے عامہ کو بیدار کرنے اور اپنی جماعتی تنظیم کو مستحکم کرنے پر صرف کریں۔ ہلڑبازی اور ہنگامہ آرائی میں کسی کی بھی خیر نہیں ہے اور تخریبی سرگرمیوں سے موجودہ حکومت ہی کو پریشانی نہیں ہوگی، بلکہ اگر یہ عادت پختہ ہو گئی تو آئندہ بھی ہر حکومت کو مسلسل دقت کا سامنا رہے گا۔ ہمارا سیاسی شعور ابھی بہت کچھ پختگی کا محتاج ہے اور اس نیم خام اور نیم پختہ حالت میں اس امر کی بھی شدید ضرورت ہے کہ تمام محبِ وطن اور محبِ قوم عناصر پوری طرح ہوشیار رہیں۔ مبادا ملک و ملت کے دشمن انارکی کے پردے میں قوم و وطن کو کوئی ناقابل تلافی نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں۔

خاص طور پر طلبہ کا مسئلہ اس وقت نہایت پیچیدہ صورت اختیار کر گیا ہے، ان میں عام بے چینی اور اضطراب کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اس کے بہت سے اسباب ہیں، اور یہ مسئلہ صرف ہمارے ملک کا ہی نہیں پوری دنیا کا ہے۔ تہذیب جدید نے انسان کو روحانی قدروں سے جس طرح بیگانہ کیا ہے اور اخلاقی معیارات جتنی تیزی سے پست ہوئے ہیں اس کا مظہرِ اتم بہرحال نوجوان نسل ہی کو ہونا چاہئے اور کسی اعلیٰ نصب العین کے فقدان کے باعث جو مہیب خلا انسانی زندگی میں پیدا ہو گیا ہے اس کا سب سے نمایاں اثر بھی نوجوان طلبہ ہی میں نظر آنا چاہئے۔ ان پیچ در پیچ اسباب کی بنا پر پوری دنیا میں نوجوان طلبہ کے طبقے کی کیفیت بالکل بارود کی سی ہے جو ذرا سی چنگاری سے بھڑک اٹھنے کو تیار ہوتا ہے۔ پھر خاص طور پر زیر ترقی ممالک کے اپنے مخصوص مسائل ہیں جن سے طلبہ کی بے چینی میں مزید اضافہ ہوتا ہے --- چنانچہ ہمارے یہاں بھی یہ طبقہ ع "دیوانہ را ہوئے بس است!" کے مصداق گویا منتظر ہی تھا کہ کہیں سے کوئی صورت ایجی ٹیشن کی پیدا ہو اور یہ اس میں کود پڑیں۔

گزشتہ چند سالوں کے دوران ہماری حکومت نے طلبہ کی سیاسی سرگرمیوں پر جو پابندیاں عائد کئے رکھی ہیں ان سے بھی ان کے اندر ہی اندر ایک لاوا پکتا رہا ہے جسے بہرحال ایک نہ ایک دن پھٹنا تھا۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ حالیہ سیاسی ایجی ٹیشن میں اصل زور شور طلبہ ہی کا پیدا کردہ ہے اور موجودہ سیاسی ہما ہمی ان ہی کی رہینِ منت ہے۔ تین ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا کہ یونیورسٹیاں اور کالج بند ہیں اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ قطعاً معطل پڑا ہے۔ اور اب بھی اگرچہ کچھ کالج کھل گئے ہیں بہت

سے طالب علم کلاسوں کا بائیکاٹ کر رہے ہیں اور اس کے باوجود کہ ان کے کچھ مطالبات تسلیم بھی کئے جا چکے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حکومت نے گویا ان کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں لیکن ان کا ایجی ٹیشن علیٰ حالہٖ قائم ہے اور نہ صرف یہ کہ اس میں کوئی کمی نہیں آ رہی بلکہ ان کے مطالبات میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے --- حتیٰ کہ مشرقی پاکستان کے طلبہ نے تو اپنے مطالبات میں تمام سیاسی طبقات کے جملہ مطالبات کو شامل کر لیا ہے۔

یہ صورتحال بھی متقاضی ہے کہ ملک و ملت کے بہی خواہ اس پر اپنے اپنے جماعتی و گروہی نقطہ ہائے نظر سے نہیں بلکہ قومی و ملی نقطۂ نظر سے سوچیں۔ جو سیاسی حلقے طلبہ کو اپنے پیش نظر سیاسی انقلاب کے لئے استعمال کرنے کی کوشش میں ہیں' وہ درحقیقت آگ سے کھیل رہے ہیں اور انہیں کسی طرح قوم اور وطن کا بہی خواہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سیاست اصلاً ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جو تعلیم سے فارغ ہو کر ملک کے ذمہ دار شہریوں کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ طلبہ کا اصل کام یہ ہے کہ اپنے زمانۂ تعلیم میں آئندہ زندگی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی زیادہ سے زیادہ استعداد پیدا کریں۔ اسی تعلیم و تربیت کا ایک جزو یقیناً سیاسی شعور اور ملکی و قومی مسائل کی سوجھ بوجھ بھی ہے' لیکن دورانِ تعلیم کسی سیاسی دھڑے کا آلہ کار بننا طلبہ کے لئے اپنے مستقبل کے اعتبار سے بھی نقصان دہ ہے اور ملک و ملت کے مجموعی مفادات کے اعتبارات سے بھی سخت مضر ہے۔

اس تازہ ایجی ٹیشن پر صدر ایوب کا ردِ عمل ہمارے نزدیک بہت صائب اور متوازن ہے۔ ان کے لئے ایک راستہ یہ بھی تھا کہ موجودہ صورتحال کو صرف "بعض شرپسند لوگوں" کی جانب منسوب کر کے تشدد کی راہ اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو بہرحال حکومت کی قوت اس وقت ان کے ہاتھ میں تھی ہی۔ لیکن اس کے بجائے اپوزیشن کے ساتھ دستوری مسائل پر گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر کر کے انہوں نے یقیناً دانشمندی کا ثبوت دیا ہے جس کی ہمارے نزدیک قدر کی جانی چاہئے۔

دوسری طرف یہ پیچیدگی بھی صاف محسوس ہو رہی ہے کہ اپوزیشن نے اب تک جو موقف اختیار کئے رکھا ہے اور جس نہج پر اپنی سیاسی تحریک کو چلایا ہے' اس کے پیش نظر اس کے کسی بھی

عنصر کے لئے اس وقت حکومت کے ساتھ سیاسی گفت و شنید کی راہ اختیار کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ بائیں بازو کے لوگوں سے تو ظاہر ہے کہ اس وقت کسی گفتگو کا کوئی امکان ہی نہیں، انہیں تو اب اس ملک کی سیاست میں حقیقی اور واقعی اپوزیشن کا کردار ادا کرنا ہے۔ معاملہ جو بھی ہو سکتا ہے، دائیں بازو کے ان عناصر ہی سے ہو سکتا ہے جو ڈی اے سی اور صحیح تر الفاظ میں پی ڈی ایم میں شریک ہیں ---- لہٰذا پہلا خطرہ تو یہی ہے کہ مفاہمت کی ادنیٰ ترین کوششوں کو بھی بائیں بازو کی جماعتیں عوامی جدوجہد سے فرار اور عوامی مفادات سے غداری کے نام سے اچھالیں گی--- پھر پی ڈی ایم خود کوئی ایک سیاسی جماعت نہیں بلکہ کئی سیاسی جتھوں کا مجموعہ ہے، مفاہمت کی گفتگو کے شروع ہوتے ہی ان کے باہم ایک دوسرے سے الجھ جانے کا امکان بھی خارج از بحث نہیں۔ گویا چند در چند وجوہ کی بنا پر صدر ایوب سے مفاہمت کی گفتگو فی الوقت ان لوگوں کے لئے بھی بہت مشکل ہو گئی ہے جن کا صدر ایوب اور حکمران پارٹی سے نظریات کا کوئی اختلاف نہیں اور جنہیں بعض فروعی دستوری معاملات کے ذیل میں اپنے بعض مطالبات منوا کر منطق کے ہر اصول کے مطابق موجودہ حکمران گروہ کے ساتھ ع "آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک" کی سی کیفیت سے بغل گیر ہو جانا چاہئے۔

. .

> تاہم یہ وقت کا ایک اہم تقاضا ہے، جو ہماری رائے میں مشکلات اور موانع کے باوجود پورا ہو گا ----- اور انتشار، لاقانونیت اور انارکی کے خطرات اور خصوصاً طالب علموں کی موجودہ صورتحال کے پیش نظر، ہمارے نزدیک فی الوقت ملک و ملت کے مجموعی مفادات کے اعتبار سے یہی مناسب اور صحیح تر بھی ہے۔

اس مقصد کے لئے اس وقت خاص طور پر ایسے لوگوں کو میدان میں آنا چاہئے جو تحریک مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ رہے تھے، لیکن بعد میں مختلف اسباب کی بنا پر میدان سیاست سے ہٹتے اور گوشہ گیر ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ اس وقت نہ کونسل لیگ سے وابستہ ہیں نہ کونشن لیگ سے ----

متحدہ ہندوستان جب انگریز کی غلامی سے نجات پانے کی جدوجہد میں مصروف تھا تو بارہا ایسا ہوتا تھا کہ جب حکومتِ وقت اور تحریکِ آزادی کی علمبردار جماعتوں کے مابین کسی مسئلے پر ڈیڈلاک ہو جاتا تھا تو کچھ ایسے لوگ حرکت میں آتے تھے جو اپنی نرم طبیعت اور دھیمے مزاج کی بنا پر سرکار دربار میں بھی رسائی رکھتے تھے لیکن ساتھ ہی مخلص محبِ وطن بھی تھے۔ ایسے لوگ اگرچہ نہ تاریخ تحریکِ

آزادی میں کسی نمایاں حیثیت کے مالک ہیں نہ ہی عوام نے انہیں کبھی اپنا ہیرو تسلیم کیا۔ تاہم اصحابِ فہم و بصیرت جانتے ہیں کہ حصولِ آزادی کی جدوجہد میں انہوں نے بھی ایک مثبت کردار ادا کیا ہے ---- ہماری مخلصانہ رائے یہ ہے کہ ہماری ملکی سیاست کی موجودہ پیچیدہ صورتحال بھی کچھ لوگوں کے ناخنِ تدبیر سے سلجھ سکتی ہے ---- اور اگر ایسے لوگ اس مرحلے پر سامنے نہ آئے تو اندیشہ ہے کہ صورتحال پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی چلی جائے گی اور انتشار بڑھتا چلا جائے گا جس سے پاکستان کا وجود تک خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

یہ تو ہے موجودہ پیچیدہ صورتحال کا فوری حل ---- باقی جہاں تک پاکستان کی موجودہ سیاست کے مستقل خطوط کا معاملہ ہے اس کے ضمن میں جو تجزیہ ہم نے گزشتہ ماہ ان صفحات میں پیش کیا تھا، ہمیں خوشی ہے کہ قارئینِ "میثاق" نے بھی بالعموم اس سے اتفاق کا اظہار کیا اور بعد کے بعض حالات و واقعات سے بھی ان کی مجموعی حیثیت سے تائید و توثیق ہوئی۔

یہ بات اب مزید واضح ہو گئی ہے کہ آئندہ اس ملک کی سیاست کا اصل محور دائیں اور بائیں بازو کے رجحانات کا تصادم ہو گا۔ موجودہ حکومت بھی واضح طور پر دائیں بازو کی جانب جھک چکی ہے اور پی ڈی ایم کے اکثر عناصر بھی واضح طور پر اسی نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔ گویا پی ڈی ایم اِس وقت حقیقی و واقعی اپوزیشن نہیں، مصنوعی اپوزیشن ہے جس کا موجودہ حکومت سے اصل اختلاف نظریات پر نہیں ذاتیات پر مبنی ہے جس پر بعض فروعی دستوری اختلافات کا پردہ ڈال دیا گیا ہے ---- لہٰذا بساطِ سیاست کے موجودہ نقشے میں بہت جلد تبدیلیاں واقع ہوں گی اور پھر اس ملک کی سیاست کی اصل بساط بچھے گی جو دائیں اور بائیں بازو کی تقسیم پر مبنی ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ ڈی اے سی کے نام سے جو وسیع تر اتحاد وجود میں آیا تھا وہ مستحکم ہونے سے پہلے ہی بکھرتا نظر آ رہا ہے۔ چنانچہ سابق سندھ کے بعض مقامات پر جب ڈی اے سی کے تحت جلوس نکالنے کی کوشش کی گئی تو بعض نعروں اور کتبوں کی عبارتوں پر شدید اختلاف ہو گیا، چنانچہ ڈی سی اے کی صرف چار جماعتیں اس میں شریک ہو سکیں اور بقیہ چار نے علیحدگی اختیار کی۔

دائیں اور بائیں بازو کے رجحانات کے حامل ---- اور مغربی طرز کی سرمایہ دارانہ جمہوریت

اور سوشلزم و کمیونزم کے حامی عناصر کی اس باہمی ٹکر میں ہمیں اندیشہ ہے کہ اسلام کا نام خواہ مخواہ لیا جائے گا جس سے کسی فریق کو تو شاید نہ کوئی نفع پہنچے نہ نقصان' لیکن اسلام کو یقیناً نقصان پہنچے گا۔

حال ہی میں جمعیت علمائے اسلام کی پاکستان میں نشأۃِ ثانیہ کے اصل معمار مولانا غلام غوث ہزاروی کے ایک بیان پر جو لے دے ہوئی ہے اس سے یہ بحث زور شور کے ساتھ شروع ہو گئی ہے کہ آیا سوشلزم کا اسلام کے ساتھ پیوند لگ سکتا ہے یا نہیں۔ ہم نے گزشتہ شمارے میں جمعیت کے بارے میں جو تفصیلی رائے پیش کی تھی' مولانا غلام غوث صاحب کے اس بیان سے اس کے اہم ترین جزو کی تصدیق ہو گئی۔ مولانا کے اس بیان کا اصل تعاقب حلقہ دیوبند ہی کے ان علماء کی جانب سے ہوا ہے جنہوں نے ماضی میں تحریکِ مسلم لیگ کا ساتھ دیا تھا۔ ان حضرات کی ہمارے دل میں واقعتاً بڑی عزت ہے' لیکن انہوں نے سوشلزم کو اسلام کی عین ضد اور جمہوریت کو عین اسلام ثابت کرنے کے لئے جس قسم کے دلائل دیئے ہیں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے بھاری بھرکم لوگوں کی جانب سے اور ایسی بچگانہ باتیں!

> اسلام بلاشبہ اپنی ذات میں ایک مکمل نظام ہے اور اساسی عقائد و نظریات سے لے کر حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں کی تفصیلی تشکیل تک اس کا اپنا ایک منفرد مزاج ہے جو کسی دوسرے نظریئے یا نظام کی پیوند کاری قبول نہیں کرتا۔

چنانچہ نہ اس کے کسی جزو کا پیوند کسی اور نظام کو لگایا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور نظام کے کسی جزو کی پیوند کاری اس کے ساتھ ممکن ہے۔ لیکن اگر اس بنا پر کہ اس کے سیاسی و انتظامی ڈھانچے کے بعض اجزاء جمہوریت کے بعض اجزاء سے جزوی مشابہت رکھتے ہیں' اس کا تعلق جمہوریت کے ساتھ قائم کیا جا سکتا ہے تو یقیناً اس کے معاشی نظامِ عدل و قسط کے بھی بعض اجزاء سوشلزم کے بعض اجزاء سے مطابقت رکھتے ہیں اور اس بنا پر اسلام کا رشتہ سوشلزم کے ساتھ بھی ممکن ہے.... بلکہ ہمیں یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ خلافتِ راشدہ میں خلیفہ کی ذات میں اختیارات کا جس قدر ارتکاز تھا اس سے مشابہت کی بنا پر آمریت کا رشتہ بھی اسلام کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے....! اسلامی نظامِ معیشت و حکومت کا عروج یقیناً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ اور اس میں جہاں جمہوریتِ کاملہ کے ایسے مظاہر دیکھنے میں آتے تھے کہ ایک عام مسلمان ان کو برسرِ منبر ٹوک دیتا تھا وہاں ان کے سفرِ بیت المقدس میں سوشلزم کی بلند ترین منزل کی شان بھی موجود ہے۔

ویسے ہمارے نزدیک ان دونوں ہی کے ساتھ اسلام کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کرنا نرا تکلف ہے۔ ہمارے یہاں نہ حامیانِ جمہوریت جمہوریت کے داعی اس لئے بنے ہیں کہ انہیں اسلام کی بارگاہ سے اس کا حکم ملا ہے اور نہ ہی سوشلزم کے حامی اس کی جانب اس لئے جھکے ہیں کہ انہیں اسلام کا تقاضا یہی معلوم ہوا---- یہ سب کچھ تو تاریخ کے ایک عام بہاؤ کے تحت ہو رہا ہے جو گزشتہ دو تین صدیوں سے خالصتاً غیر مذہبی ولادینی رخ پر بہہ رہا ہے اور جس میں مذہب سے سرے سے کوئی بحث (Reference) ہی نہیں! حامیانِ دین ومذہب کی اس عام بہاؤ کے زیر اثر پیدا ہونے والے مختلف رجحانات کو 'بپتسمہ' دینے کی کوشش بالکل خواہ مخواہ ہے------!

موٹی سی بات ہے کہ فکر و فلسفے کے اعتبار سے موجودہ پوری دنیا کا امام تاحال یورپ ہے۔ اور جو خالص بے خدا و مادہ پرستانہ تہذیب وہاں سے اٹھی تھی وہ تاحال پورے کرۂ ارضی پر حکمران ہے۔ وہاں کے ازمنۂ وسطیٰ کے جاگیرداری نظام (Feudal System) کی کوکھ سے خالص تاریخی عوامل کے زیر اثر جو جمہوری نظام برآمد ہوا تھا اس نے اولاً سیاسی شعبۂ زندگی میں جمہوریت (Democracy) کی صورت اختیار کی جس کے مختلف ممالک میں مختلف ایڈیشن تیار ہوئے۔ اسی جمہوریت نے بعد میں معاشی نظام میں آزاد معیشت کی راہ سے سرمایہ داری (Capitalism) کی کریہہ صورت اختیار کرلی، جس کا ردِ عمل سوشلزم اور کمیونزم کی صورت میں ظاہر ہوا، جو درحقیقت نظریہ و فکر کے اعتبار سے اسی قدیم لادینی مادہ پرستانہ سلسلۂ فکر کی اگلی منطقی کڑی اور نظام کے اعتبار سے سرمایہ داری کا قدرتی ردِ عمل ہے--- اس ردعمل کے بھی مختلف ملکوں میں مختلف ایڈیشن تیار ہوئے اور اس میں مادر پدر آزاد معیشت کی تباہ کاریوں کی روک تھام میں انسان نے ایک دوسری انتہا پر پہنچ کر فرد کی آزادی کو بالکل سلب کر کے اسے اجتماعیت کے کاملۃً بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ اس کے باوجود چونکہ اس صورت میں بھی انسان اپنے اوپر کسی اور بالاتر اقتدار کو تسلیم نہیں کرتا، لہٰذا سوشلزم کے تمام ایڈیشن بھی چاہے وہ روسی ہوں یا چینی، مدعی جمہوریت ہی کے ہیں ---- چنانچہ اس وقت عالمی کمیونسٹ تحریک کا سب سے بڑا علمبردار ملک بھی "عوامی جمہوریہ چین"

ہی کہلاتا ہے---!!

سیاسی و معاشی نظاموں کے انقلابات کا یہ سلسلہ اولاً تو صدی ڈیڑھ صدی میں تکمیل کو پہنچا تھا، لیکن اب دنیا کے تمام زیر ترقی ممالک میں یہ داستان بڑی تیزی کے ساتھ دوہرائی جارہی ہے اور یہ حالات کا ایک خالصتاً اپنا رخ ہے جو کسی مرحلے پر بھی دین و مذہب سے کوئی فتویٰ طلب نہیں کرتا۔ مفتیانِ دین و مذہب خواہ مخواہ اس کے مختلف موڑوں پر اپنے دار الافتاء سے فتوے صادر کرنے کا تکلف کرتے رہتے ہیں۔

پاکستان بھی ایک نیم ترقی یافتہ اور نیم پسماندہ ملک ہے اور اس میں بسنے والے عوام بھی ایک نیم خوابیدہ و نیم بیدار قوم ہیں۔ اس نیمے دروں و نیمے بروں حالت میں جتنے دوسرے ممالک مبتلا ہیں، عام اس سے کہ وہ مسلمان ہیں یا غیر مسلم، جو کچھ وہاں ہو رہا ہے وہی یہاں ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے ---- اور ہوتا رہے گا جب تک کہ دین و مذہب اس معاشرے میں واقعتاً ایک مؤثر عامل کی حیثیت اختیار نہ کرلیں ---- جس کے امکانات بحالاتِ موجودہ دُور دُور تک نظر نہیں آتے!!

ہمارے اس وقت کے جملہ اجتماعی مسائل کی اصل صورت یہ ہے کہ :

۱ ۔ آج سے اکیس سال قبل آزادی کی صورت میں دفعتہً جو سیاسی حقوق و اختیارات ہمارے ہاتھ آئے ہم بحیثیتِ قوم اس کے اہل ثابت نہیں ہوئے۔ اور چاہے یہ کہہ لیا جائے کہ یہ حقوق و اختیارات عوام کے ہاتھوں تک کبھی پہنچے ہی نہیں، بیچ ہی میں کچھ جاگیرداروں (Feudal Lords) اور کچھ سابق حکمرانوں کی تربیت دادہ سروسز (Services) نے انہیں اچک لیا، خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ چونکہ عوام اس کے لئے تیار نہ تھے لہٰذا رفتہ رفتہ یہ اختیارات پہلے چند پیشہ ور سیاست دانوں اور پھر ان کے بھی نااہل ثابت ہو جانے پر کلیۃً سروسز کو منتقل ہو گئے، دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے اور اس کا ردعمل عوامی جمہوریت کی بحالی یا از سرنو قیام کی کوششوں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے!

۲ ۔ آزادی کے وقت ہمارا ملک ایک خالص زرعی ملک تھا اور ان اکیس سالوں کے دوران رفتہ رفتہ صنعت نے ترقی کی، تاآنکہ اب ہم ایک نیم زرعی و نیم صنعتی ملک بن چکے ہیں۔

لیکن چونکہ یہ سارا کام مغرب سے مستعار لئے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے تحت ہوا ہے لہٰذا ہمارے یہاں بھی سرمایہ داری اپنی کریہہ ترین صورت میں ظہور پذیر ہو چکی ہے۔ چنانچہ ملک کی زرعی دولت پر جو اجارہ داری پہلے سے قائم تھی اس میں مزید اضافہ یہ ہوا کہ ملک کی پوری صنعت و تجارت پر بھی چند خاندانوں کا قبضہ ہو گیا ہے ---- اس کے ردِ عمل کے طور پر یہاں بھی وہی کچھ سوچا جا رہا ہے جو دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک میں سوچا جا سکتا ہے یعنی یہ کہ تقسیمِ دولت اور ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت کے پورے نظام کو بیخ و بُن سے اکھیڑ ڈالا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں ردِ عمل تاریخ کے متذکرہ بالا عمومی بہاؤ ہی کے اجزا ہیں اور ان میں سے کسی کا بھی کوئی تعلق دین و مذہب سے نہیں!! -----!!

لیکن چونکہ اتفاقاً ہمارے ملک کے عوام کو مذہب سے ایک جذباتی سا تعلق بھی ہے لہٰذا اس غریب کا نام خواہ مخواہ اچھالا جاتا ہے۔ خود تحریک پاکستان کے دوران بھی، جس کے اصل اساسی عوامل معاشرتی و معاشی تھے، اس کا نام زور شور سے لیا گیا اور پاکستان کا مطلب ہی "لا الٰہ الا اللّٰہ" بتایا گیا، جس کی حقیقت آج روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ رُبع صدی گزر جانے کے باوجود اس غریب اسلام کا زیادہ سے زیادہ اتنا ہی نام نشان یہاں نظر آتا ہے جتنا ہندوستان کے مسلمانوں میں، بلکہ ہمارے اندازے کے مطابق اس سے بھی کم ---- اور اب بھی مختلف عمرانی نظریات کے حامل لوگ خواہ مخواہ اس کا نام بدنام کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں ---!!

جمعیت علمائے اسلام کا ذکر تو اِس وقت رہنے دیجئے۔ اس لئے کہ وہ پاکستانی سیاست کے میدان میں فی الحال نووارد ہے اور ابھی اس کی سیاست کے خطوط بالکل مبہم ہیں۔ چنانچہ وہ کبھی این اے پی اور پی پی پی کے دوش بدوش نظر آتی ہے اور کبھی پی ڈی ایم سے اشتراک کرتی دکھائی دیتی ہے اور کبھی ایک پلڑے میں وزن ڈالتی ہے کبھی دوسرے میں ---!!

البتہ جماعت اسلامی اس لئے قابل ذکر ہے کہ اسے پاکستان کی سیاسیات میں برسرِ عمل ہوئے پورے اکیس سال بھی ہو چکے ہیں اور اس پورے عرصے میں وہ اس امر کی مدعی بھی رہی ہے کہ اس کا اصل مقصد احیائے اسلام اور اقامتِ دین ہے!!

ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس پورے سفر کے دوران اس کی دینی و مذہبی حیثیت اگر کوئی تھی بھی تو کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو چکی ہے اور وہ تاریخ کے بہاؤ کا رخ موڑنے کی بجائے خود مذکرہ بالا تاریخی بہاؤ کے رخ پر بہہ نکلی ہے---!! اور اب چاہے ایک مضبوط اور منظم گروہ کی حیثیت سے ملکی سیاست کے میدان میں اس نے اپنا کوئی وقار قائم کر بھی لیا ہو، دینی و مذہبی حیثیت سے اس کی سرے سے کوئی اہمیت باقی نہیں رہی---!

پاکستانی سیاست کے افق پر اول اول جماعت اسلامی بڑے اعتماد اور ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ نمودار ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ تحریک پاکستان ہی کے جذباتی پس منظر کو اجاگر کر کے اور "پاکستان کا مطلب کیا' لاالٰہ الا اللہ " کے خالص مسلم لیگی نعرے کو اپنا کر 'اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کے نام پر وہ انقلابِ قیادت کی مہم تنہا اپنے زورِ بازو کے بل پر بہت جلد سر کر لے گی۔ چنانچہ اُس وقت اگر کسی اور نے اس کو تعاون و اشتراک کی پیشکش بھی کی تو اس نے نہایت حقارت کے ساتھ اس کو ٹھکرا دیا۔

لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ مسئلہ اتنا آسان نہیں اور تنہا اپنے زورِ بازو سے کام نہیں چل سکے گا تو جماعت نے مذہب ہی کے نام پر علماء اور مذہبی جماعتوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی اور ایک عرصے تک جماعت اسلامی کی مذہبی سیاست "علماء کے متحدہ و متفقہ مطالبات" کی بنیاد پر چلتی رہی۔

لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد پھر محسوس ہوا کہ چڑھائی بہت سخت ہے اور گاڑی اس سیکنڈ گیئر میں بھی آگے نہیں بڑھ سکتی تو ایک قدم اور نیچے اتر کر خالص "جمہوریت" کے نعرے پر سیاست کی نئی بساط بچھائی گئی جس پر تاحال سیاسی کھیل کھیلا جا رہا ہے---!! ----اور جس کا مظہرِ کمال یہ ہے کہ "ڈی اے سی" جس میں پاکستانی سیاست کے اکھاڑے کے دونوں مذہبی پہلوان اس وقت مجتمع ہیں' اس کے مطالبات اور متفقہ نکات میں غریب اسلام کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں!

خدا شاہد ہے کہ ہمارے پیش نظر کسی جماعت کی تنقیص ہرگز نہیں۔ ان گزارشات سے ہمارا مقصد صرف اپنی اس رائے کی وضاحت ہے کہ موجودہ سیاست کا دین و مذہب سے قطعاً کوئی

تعلق نہیں اور وقت کا جو دھارا خالص غیر مذہبی و لادینی رخ پر بہہ رہا ہے' اس کی مختلف لہروں کی باہمی آویزش میں اسلام کا نام استعمال کرنا اور خاص طور پر اسے موجودہ بوسیدہ' گلے سڑے اور ظالمانہ و استحصالی نظامِ معیشت کا پشت پناہ بنا کر کھڑا کر دینا اسلام کی دوستی نہیں' اس کے ساتھ دشمنی ہے۔ تاریخ کے رخ کا جو "ڈاؤن" ایک خاص سمت میں بہہ رہا ہے اس کا رخ مذہب کی جانب موڑنے کی صرف ایک راہ ہے اور وہ یہ کہ پہلے فلسفہ و فکر کے میدان میں انقلاب برپا کیا جائے اور روحانی اقدار کا از سرِ نو احیا ہو' ایمان و یقین کی روشنی دنیا میں پھیلے' اور اخلاق و اعمال میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوں۔ جب یہ انقلاب کسی انسانی معاشرے میں ایک معتد بہ حد تک رونما ہو چکے گا تب کہیں جا کر اس کا امکان پیدا ہو گا کہ اس کی سیاست بھی مذہب کے تابع ہو اور وہاں خدا پرستانہ نظامِ زندگی پوری شان کے ساتھ جلوہ آرا ہو سکے---- ہمیں تسلیم کرنا چاہئے کہ ہمارا موجودہ پاکستانی معاشرہ ان اعتبارات سے دین و مذہب کی روح سے بہت بعید ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کا جن کا اصل تعلق اسلام اور صرف اسلام سے ہو اور جن کی زندگیوں کا مقصود صرف اور صرف احیائے اسلام و اقامتِ دین ہو' موجودہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا اپنی قوتوں' صلاحیتوں اور اوقات کو ضائع کرنا ہے۔ ان کے لئے ایک ہی راہ کھلی ہے اور وہ یہ کہ ---- اگر علمی و فکری کام کرنے کی استعداد رکھتے ہوں تو تعلیم و تعلمِ قرآن کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیں اور کتاب اللہ کے علم و حکمت کی تحصیل و اشاعت میں مصروف ہو جائیں۔ اس لئے کہ ایمان و یقین کے احیاء کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ---- اور اگر علمی کام سے مناسبت نہ رکھتے ہوں تو معاشرے کے کونوں کھدروں میں بیٹھ جائیں اور خلوص و اخلاص کی قوتوں کو بروئے کار لا کر عوام الناس میں دینی و روحانی اقدار کی از سرِ نو ترویج کی کوشش کریں۔

ہم تحریکِ پاکستان کے بارے میں تو یہ رائے نہیں رکھتے کہ اس کا اساسی محرک دینی و مذہبی جذبہ تھا' لیکن پاکستان کے معجزنما ظہور ---- اور دو اہم مواقع پر اس کے معجزانہ تحفظ و بقاء کی بنا پر یہ احساس ضرور رکھتے ہیں کہ پاکستان کا قیام دین کے احیاء اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور پورے عالمِ ارضی میں غلبۂ اسلام کی خدائی سکیم کی ایک کڑی ضرور ہے۔ اور اسی بنا پر ہمیں اس کا بقا و وجود بھی عزیز ہے اور اس میں انتشار اور انار کی کسی صورت گوارا نہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس مبارک انقلاب کی ابتداء سیاسی میدان سے نہیں بلکہ علم و فکر اور فلسفہ و حکمت کے میدان سے ہو گی۔ اور

ایک علمی و تعلیمی انقلاب کے سوا اس کی کوئی راہ موجود نہیں ---- اس میدان میں بالکل ابتدائی اور کمیت کے اعتبار سے نہایت حقیر کوشش کئے چلے جانا بھی، چاہے اس کے محسوس نتائج سامنے نہ آئیں، ہمارے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ سیاسی میدان میں بلند بانگ دعاوی کے ساتھ شرکت کی جائے، لیکن بجائے اس کے رخ کو دین و مذہب کے جانب موڑنے کے خود اس کی رو میں بہہ جایا جائے!

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج پھر درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے!!

اللہ تعالیٰ ہمیں مسلمان جینے اور ایمان پر مرنے کی سعادت نصیب فرمائے!! --- آمین!

(۳)

مارچ ۱۹۶۹ء

آج سے دو ماہ قبل، جنوری ۱۹۶۹ء کے "تذکرہ و تبصرہ" میں "میثاق" کے دورِ جدید کے ڈھائی سال کے عرصے میں پہلی بار ملکی سیاسیات پر قلم اٹھایا گیا تھا۔ "میثاق" کے تیرہ صفحات پر پھیلی ہوئی اس تحریر میں پاکستان کی موجودہ سیاست کے رجحانات اور ان کے پشت پر کارفرما عوامل کا جو تجزیہ ہم نے اپنے فہم کے مطابق کیا تھا وہ قارئینِ "میثاق" کے حلقے میں تو بالعموم پسند کیا ہی گیا، بعض دوسرے حلقوں کی جانب سے بھی اس کی تائید و تصویب ہوئی [۱]۔ اور عام طور پر یہ محسوس کیا گیا کہ یہ صورتحال کی واقعی اور حقیقی عکاسی اور مسائل و معاملات کا صحیح و بے لاگ تجزیہ ہے ---- اس تحریر کی اشاعت کے بعد کے دو ماہ بلاشبہ پاکستانی سیاسیات کی اکیس سالہ تاریخ کا اہم ترین دور ہیں، جن میں عوامی تحریک ایک طوفان بن کر اٹھی اور ایسی معرکۃ الآرا تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا کوئی تصور بھی چھ ماہ قبل تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس طوفان کے متعدد ریلے گزر جانے کے بعد جو صورتحال سامنے آئی ہے اور پاکستانی سیاست کی سٹیج پر جو تازہ نقشہ جما ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جس کی تصویر ہم نے دو ماہ قبل کی اس تحریر میں کھینچی تھی۔

---

[۱] چنانچہ ہفت روزہ "نصرت" نے جسے اس وقت مسٹر بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی کے سرکاری ترجمان کی حیثیت حاصل ہے اپنی اکیسویں اشاعت میں اس پوری تحریر کو نقل کیا۔

گزشتہ دو ماہ کے دوران کی ساری کھینچ تان اور اکھیڑ پچھاڑ اور اتنی مختلف النوع پیش قدمیوں اور پسپائیوں کے بعد جو صورتحال واضح ہو کر سامنے آتی ہے اس کا اس قدر صحیح اور پیشگی اندازہ صرف اسی لئے ممکن ہو سکا کہ ہمارا مطالعہ خالصتاً معروضی تھا اور اس میں ہماری پسند یا ناپسند کو قطعاً کوئی دخل نہ تھا۔ صورتِ واقعہ جیسی کچھ ہے ہم نے اسے بعینہٖ اسی طرح سمجھنے کی کوشش کی اور بغیر کسی قطع و برید اور کتر بیونت کے جوں کا توں پیش کر دیا۔

ہماری گزشتہ ماہ کی پیش کردہ مندرجہ ذیل رائے بھی اگر ذہن میں تازہ کر لی جائے تو جو صورت حال اب درپیش ہے اس کی نقشہ کشی بھی مکمل ہو جائے گی اور اس کے بارے میں ہماری رائے بھی ایک بار پھر واضح ہو جائے گی :

"اس تازہ ایجی ٹیشن پر صدر ایوب کا ردعمل ہمارے نزدیک بہت صائب اور متوازن ہے۔ ان کے لئے ایک راستہ یہ بھی تھا کہ موجودہ صورتحال کو صرف "بعض شرپسند لوگوں" کی جانب منسوب کر کے تشدد کی راہ اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو بہرحال حکومت کی قوت اس وقت ان کے ہاتھ میں تھی ہی۔ لیکن اس کے بجائے اپوزیشن کے ساتھ دستوری مسائل پر گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر کر کے انہوں نے یقیناً دانشمندی کا ثبوت دیا ہے جس کی ہمارے نزدیک قدر کی جانی چاہئے۔

دوسری طرف یہ پیچیدگی بھی صاف محسوس ہو رہی ہے کہ اپوزیشن نے اب تک جو موقف اختیار کئے رکھا ہے اور جس نہج پر اپنی سیاسی تحریک کو چلایا ہے اس کے پیش نظر اس کے کسی بھی عنصر کے لئے اس وقت حکومت کے ساتھ سیاسی گفت و شنید کی راہ اختیار کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ بائیں بازو کے لوگوں سے تو ظاہر ہے کہ اس وقت کسی گفتگو کا کوئی امکان ہی نہیں، انہیں تو اب اس ملک کی سیاست میں حقیقی اور واقعی اپوزیشن کا کردار ادا کرنا ہے۔ معاملہ جو بھی ہو سکتا ہے، دائیں بازو کے ان عناصر ہی سے ہو سکتا ہے جو ڈی اے سی اور صحیح تر الفاظ میں پی ڈی ایم میں شریک ہیں---- لہٰذا پہلا خطرہ تو یہی ہے کہ مفاہمت کی ادنیٰ ترین کوششوں کو بھی بائیں بازو کی جماعتیں عوامی جدوجہد سے فرار اور عوامی مفادات سے غداری کے نام سے اچھالیں گی--- پھر پی ڈی ایم خود کوئی ایک سیاسی جماعت نہیں بلکہ کئی سیاسی جتھوں کا مجموعہ ہے۔ مفاہمت کی گفتگو کے شروع ہوتے ہی ان کے باہم ایک دوسرے سے الجھ جانے کا امکان بھی خارج از بحث نہیں۔ گویا چند در چند وجوہ کی بنا پر صدر

ایوب سے مفاہمت کی گفتگو فی الوقت ان لوگوں کے لئے بھی بہت مشکل ہو گئی ہے جن کا صدر ایوب اور حکمران پارٹی سے نظریات کا کوئی اختلاف نہیں اور جنہیں بعض فروعی دستوری معاملات کے ذیل میں اپنے بعض مطالبات منوا کر منطق کے ہر اصول کے مطابق موجودہ حکمران گروہ کے ساتھ ع "آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک" کی سی کیفیت سے بغل گیر ہو جانا چاہئے۔

تاہم یہ وقت کا ایک اہم تقاضا ہے جو ہماری رائے میں مشکلات اور موانع کے باوجود پورا ہو گا---- اور انتشار، لاقانونیت اور انارکی کے خطرات اور خصوصاً طالب علموں کی موجودہ صورتحال کے پیش نظر، ہمارے نزدیک فی الوقت ملک و ملت کے مجموعی مفادات کے اعتبار سے یہی مناسب اور صحیح تر بھی ہے"۔

وقت کا یہ "اہم تقاضا" ہونے کو پورا تو ہو گیا لیکن جو "موانع و مشکلات" اس کی راہ میں پیش آئی ہیں اور ان کے دوران پاکستان اپنی سیاسی تاریخ کے جس نازک ترین موڑ سے گزرا ہے اس کا اندازہ بہت کم لوگوں کو ہے۔

صدر ایوب کی گفت و شنید کی دعوت نے پوری ڈی اے سی کو بالکل اچانک آ لیا تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ تو وہ غریب شش و پنج میں مبتلا رہی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ صدر ایوب تو ایک فرد تھے، انہوں نے ایک رخ پر چلتے چلتے اچانک اباؤٹ ٹرن کر دیا، لیکن ایک تحریک کی رواں دواں گاڑی کو تو بریک لگاتے لگاتے بھی آخر وقت لگتا ہے۔ دوسری جانب یہ خطرہ بھی واقعی اور حقیقی تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ادھر ایک قیادت عوامی تحریک کو بریک لگا کر نیچے اترے ادھر دوسری قیادت اس کے انجن کو دوبارہ سٹارٹ کر کے لے کر چلتی بنے۔ تیسری طرف یہ معاملہ بھی صاف تھا کہ اب یہ عوامی تحریک اگر مزید آگے بڑھی تو اس کا روکنا مشکل تر ہو جائے گا اور پھر اس کا تمام تر فائدہ بائیں بازو کے لوگوں کے حصے میں آئے گا۔

یہ اسباب و عوامل تھے جن کی بنا پر وہ عمل اندرونی طور پر بڑی تیزی کے ساتھ لیکن ظاہری اعتبار سے بڑی تدریج اور مدھم چال کے ساتھ شروع ہوا جسے اب مسٹر بھٹو بجا طور پر "غیر فوجی انقلاب" (Civilian Coup de tat) سے تعبیر کر رہے ہیں۔ [۲]

{۲} عین اس مرحلے پر جبکہ پاکستان اس "غیر فوجی انقلاب" سے گزر رہا ہے، مسٹر آدم ملک وزیر خارجہ انڈونیشیا

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مفاہمت اور مصالحت کا یہ عمل بنیادی طور پر تین لوگوں ہی کے مابین ہوا ہے اور اگر کوئی "عبوری قومی حکومت" وجود میں آئی جس کا امکان بالکل خارج از بحث نہیں تو وہ اصلاً ان لیگ ہائے ثلاثہ ہی پر مشتمل ہو گی۔

اس عمل کی مخالفت و مزاحمت بھی' جیسا کہ ہم نے عرض کیا تھا' بائیں بازو کے انتہا پسند لوگوں کی جانب سے ہوئی۔ مسٹر بھٹو چونکہ ابھی کوئی مستحکم تنظیم نہیں رکھتے اور بدلتے ہوئے حالات نے گویا کم از کم وقتی طور پر تو ان کے پاؤں تلے سے زمین ہی کھینچ لی ہے لہٰذا انہیں محض منفعلانہ مخالفت (Passive Resistance) پر اکتفا کرنا پڑا۔ لیکن مولانا بھاشانی چونکہ اپنی پشت پر ایک واقعی عوامی سیاسی قوت بھی رکھتے ہیں لہٰذا انہوں نے اس مفاہمت کو برسرِ میدان للکارا اور بالفعل یہ کوشش کی کہ اب جبکہ ڈی اے سی عوامی تحریک کو بریک لگا رہی ہے وہ خود اس کی قیادت سنبھال کر اپنے پیش نظر انقلاب کی داغ بیل ڈال دیں۔

----اور واقعہ یہ ہے کہ کم از کم مشرقی پاکستان میں اس "انقلاب" کی ابتدا ہو گئی تھی۔ فروری ۶۹ء کی سترہ تاریخ سے اکیس تاریخ تک کے چند دن واقعتاً پاکستان کی تاریخ میں وہ تیسرا نازک موقع تھے جبکہ پاکستان کا وجود سخت خطرے سے دوچار تھا اور اس کی سالمیت سخت مشکوک ہو گئی تھی۔

ہم نے گزشتہ ماہ ان صفحات میں بر سبیلِ تذکرہ عرض کیا تھا کہ ---- "ہم تحریک پاکستان کے بارے میں تو یہ رائے نہیں رکھتے کہ اس کا اساسی محرک دینی و مذہبی جذبہ تھا لیکن پاکستان کے معجزنما ظہور ------ اور دو اہم مواقع پر اس کے معجزانہ تحفظ و بقاء کی بنا پر یہ احساس ضرور رکھتے ہیں کہ پاکستان کا قیام دین کے احیاء اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور پورے عالمِ ارضی میں غلبۂ اسلام کی خدائی سکیم کی ایک کڑی ضرور ہے!" تحریک پاکستان کے اساسی محرکات اور پاکستان کے معجزنما قیام کے ضمن میں تو ہم اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ مارچ تا مئی ۶۷ء کے "تذکرہ و تبصرہ" میں ظاہر کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)
جہاں کچھ عرصہ قبل ایک باقاعدہ فوجی انقلاب آیا تھا کا دورۂ پاکستان اور حکومت پاکستان کی طرف سے سارتو حکومت کے ساتھ تعلقات مزید بڑھانے کی خواہش کا اظہار بہت معنی خیز ہے!!

چکے ہیں۔(یہ مضامین اب ہماری تالیف "اسلام اور پاکستان" میں شامل ہیں) رہے وہ دو اہم مواقع جن پر ہمارے نزدیک پاکستان کے وجود و بقا کا تحفظ بالکل معجزانہ طور پر ہوا تو ان میں سے پہلا موقع تو وہ تھا جب صدر ایوب نے اُس وقت جبکہ وہ پاکستان کے سیاہ و سفید کے بالکل تنہا مالک تھے، امریکی اثرات کے تحت "متحدہ دفاع" (Joint Defence) کی تجویز کی صورت میں گویا پاکستان کو چاندی کی طشتری میں رکھ کر بھارت کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ اسے اللہ تعالیٰ کی خاص حکمت و مشیت کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ پنڈت نہرو کی عقل اس وقت ماری گئی اور انہوں نے کمال رعونت کے ساتھ صدر ایوب کی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا {۳} اور اس طرح خالصتاً معجزانہ طور پر پاکستان کا مستقل وجود برقرار رہ گیا {۴}۔۔۔۔۔ دوسرا موقع ۶۵ء کی جنگ تھی جس میں پاکستان کا بچ جانا کسی دنیوی حساب کتاب سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ اس کی ایک ہی توجیہہ ممکن ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی کو پاکستان کا تحفظ و بقا مطلوب ہے!

ہمارے تجزیئے میں ہر اعتبار سے ان دونوں مواقع کے برابر نازک موقع سترہ تا اکیس فروری ۶۹ء کے چند دن تھے۔ اور ہمارے نزدیک اگر اس موقع پر صدر ایوب وہ بھاری قیمت ادا نہ کرتے جو انہوں نے اولاً انتخابات میں حصہ نہ لینے کا اعلان کر کے ادا کی جو ایک کھلے اعترافِ شکست کے مترادف تھا اور پھر اگر تلہ سازش کیس واپس لے کر ادا کی جو داخلی و بین الاقوامی دونوں حیثیتوں سے سخت ذلت آمیز صورت تھی، تو واقعہ یہ ہے کہ کم از کم مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی

{۳} یاد ش بخیر، بالکل اسی مقام سے پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کے "چین نواز" دور کا آغاز ایک بالکل ناگزیر ضرورت کے طور پر ہوا تھا۔ راقم نے بارہا نجی گفتگوؤں میں اس صورتحال کو اس تشبیہ سے تعبیر کیا ہے کہ امریکہ کے زیر اثر صدر ایوب نے پنڈت نہرو اور بھارت کے سامنے رکوع تو کر لیا لیکن پنڈت جی شاید اپنے تہذیبی پس منظر کی بنا پر چاہتے تھے کہ وہ باقاعدہ سجدہ کریں جسے ایک مسلمان کا بیٹا گوارا نہ کر سکا۔ چنانچہ بجائے سجدہ کرنے کے صدر ایوب الٹے تن کر کھڑے ہو گئے اور اس کے بعد مسلسل نہ صرف بھارت بلکہ اس کے معنوی سرپرست امریکہ سے بھی دور ہوتے چلے گئے۔ نتیجتاً پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کا جھکاؤ چین کی جانب ہو تا چلا گیا!

{۴} یاد رہے کہ آنجہانی پنڈت نہرو ہی کی ایک پہلی حماقت کے نتیجے میں پاکستان اپنی موجودہ صورت میں دنیا کے نقشے پر ظاہر ہوا تھا۔ ورنہ مسلم لیگ نے تو کیبنٹ مشن پلان کو قبول کر لیا تھا۔ اور اگر کبھی تین خطوں پر مشتمل "مہا بھارت" ایک بار وجود میں آ جاتا تو پھر کسے معلوم کہ پھر کبھی علیحدگی ممکن ہو سکتی یا نہیں!

کے جاری کردہ "انقلاب" کو روکنے کی کوئی صورت ممکن نہ تھی!......{۵}

اور اس صورت میں پاکستان کے مشرقی و مغربی خطوں کے حالات ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہو جاتے کہ پھر ان کے ساتھ رہنے کی کوئی صورت ممکن نہ رہتی اور عوامی جمہوریہ چین کی زیر سرپرستی مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال پر مشتمل ایک علیحدہ کمیونسٹ ریاست کے قیام کی راہ ہموار ہو جاتی{۶}

ہمارے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے پاکستان اور اہلِ پاکستان پر کہ صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے اس موقع پر بالکل گھٹنے ٹیک دینے کی سخت ذلت آمیز کیفیت کو گوارا کر لیا اور اس طرح پاکستان کی سالمیت کو جو خطرہ لاحق ہو گیا تھا وہ کم از کم فوری طور پر ٹل گیا......!

ہم ایک سے زائد بار اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ ہمارے نزدیک نہ سیاسی جبر و استبداد کے خلاف عوام کی جدوجہد کوئی بری چیز ہے نہ ہی معاشی ظلم و استحصال کے خلاف عوامی تحریک چلانا کسی درجے میں کوئی غلط کام ہے۔ دونوں ہی مقاصد اپنی اپنی جگہ درست ہیں، بلکہ ہمیں ان لوگوں کی رائے میں بہت وزن معلوم ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لائے بغیر سیاسی ڈھانچوں میں سطحی اور اوپری تبدیلیوں سے قطعاً کچھ حاصل نہ ہو گا اور نام نہاد جمہوریت بھی اس صورت میں سرمایہ داروں کے گھر کی لونڈی بن کر رہ جائے گی---- لیکن ہماری پختہ رائے یہ ہے کہ یہ سارے معاملات معروف سیاسی اسلوب و طریق سے طے ہونے چاہئیں اور اس میں نہ تو لاقانونیت اور انار کی کا رنگ پیدا ہونا چاہئے اور نہ ہی انقلابی طریقے اختیار کئے جانے چاہئیں۔

{۵} مولانا بھاشانی کی سیاسی قوت کا جو مظاہرہ اس موقع پر ہوا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن پیرول پر رہائی کی صورت میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت پر آمادہ ہی نہیں بے تاب تھے۔ لیکن مولانا بھاشانی کی سیاست نے پورے ملک کو تعطل اور گومگو کی کیفیت میں مبتلا کئے رکھا تاآنکہ صدر ایوب نے متذکرہ بالا بھاری قیمت ادا کر کے مولانا بھاشانی کو بے بس کر دیا!

{۶} مغربی بنگال کے درمیانی زمانے کے انتخابات کے جو نتائج حال ہی میں سامنے آئے ہیں ان کے پیش نظر یہ خطرہ خیالی و وہمی نہیں---- بالکل حقیقی تھا!...

جو لوگ سیاست کے میدان میں ملک و ملت کی مخلصانہ خدمت کرنا چاہتے ہوں انہیں چاہئے کہ محنت و مشقت سے کام کرنے کی عادت ڈالیں۔ اور مستقل مزاجی اور عزم و استقلال کے ساتھ اپنے اپنے نظریات کی نشر و اشاعت کریں اور اپنے اپنے پروگرام عوام کے سامنے پیش کریں اور اس طرح اپنے حق میں رائے عامہ کو ہموار کریں---- پھر اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر کو مضبوط و محکم تنظیمی سلسلوں میں منسلک کریں۔ اور کھلی سیاسی جدوجہد کے ذریعے ملک کے اجتماعی نظام میں اپنی صوابدید کے مطابق تبدیلیاں برپا کرنے کی کوشش کریں---- محض ہلڑ بازی اور ہنگامہ آرائی یا وقتی مسائل و معاملات کو نعروں کی صورت میں اچھال کر عارضی شور و غوغا برپا کر دینے سے نہ صرف یہ کہ حاصل کچھ نہ ہو گا بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ کہیں کوئی ناقابلِ تلافی نقصان نہ پہنچ جائے۔ اسی طرح انقلابی طریقوں کے اختیار کرنے میں بھی شدید خطرات مضمر ہیں اور بھلائی سے زیادہ برائی کا اندیشہ ہے۔ گویا کہ ان دونوں کی حیثیت ہمارے نزدیک وہی ہے جو قرآن مجید کی رو سے شراب اور قمار کی' یعنی اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔

اس اعتبار سے ہمارے لئے انگریز قوم کی تاریخ میں ایک بڑا اہم سبق ہے۔ اس قوم نے اپنے ملک میں "رائے عامہ" کے بروئے کار آنے کے راستوں کو ہمیشہ کھلا رکھا۔ نتیجتاً دنیا میں جتنے انقلاب آئے ان کے بہترین ثمرات سے بھی یہ متمتع ہوتی رہی لیکن کبھی کوئی انقلابی تبدیلی بھی اس کے یہاں برپا نہیں ہوئی۔ بادشاہت اور جاگیرداری کے خلاف "انقلاب" فرانس کی سرزمین پر رونما ہوا اور اس کے لئے فرانسیسی قوم کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑی' لیکن اس کے بہترین ثمرات سے انگلستان متمتع ہوا۔ چنانچہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ جمہوریت کی اعلیٰ ترین صورت وہاں قائم ہے اور لطف یہ ہے کہ علامتی بادشاہت بھی تاحال وہاں موجود ہے اور جاگیرداری نظام کے آثار کو بھی ابھی تک انہوں نے بالکلیہ ختم نہیں کیا۔ اسی طرح کیمونسٹ انقلاب کے لئے خون کی ندیاں دوسرے ممالک میں بہیں لیکن فلاحی ریاست اور کفالتِ عامہ کی خوبصورت ترین صورت کو آزاد معیشت کے ساتھ خوبصورت ترین طریقے پر انگلستان نے متحقق کیا---- اور یہ سب کچھ نہایت عمدہ تدریج کے ساتھ بالکل کھلی اور عیاں سیاسی سرگرمی کے نتیجے کے طور پر ہوتا رہا۔

اسی قسم کا ایک تجربہ ہمارے ہمسایہ ملک میں ہو رہا ہے جہاں جملہ معاملات کو سیاست کے میدان میں طے کرنے کے دروازے کھلے ہیں۔ چنانچہ کیمونسٹ پارٹی حتیٰ کہ چین کے حامی

کیونسٹوں پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ چنانچہ سیاست کے میدان میں اتار چڑھاؤ اور مدوجزر تو آتے رہتے ہیں، لیکن تاحال کسی "انقلاب" سے بھارت کو دوچار ہونا نہیں پڑا۔

ہمارے یہاں بھی خیر اسی میں ہے کہ یہ بات بطورِ اصولِ موضوعہ تسلیم کرلی جائے کہ جملہ معاملات و مسائل کا حل معروف سیاسی و جمہوری طریقوں پر ہوگا اور سب کو یہ حق حاصل ہوگا کہ رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرکے اختیار و اقتدار حاصل کرنے اور مسندِ حکومت پر قبضہ جمانے [illegible]۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ سیاسی میدان کی پابندیوں کو حتی الامکان ختم کردیا جائے اور جذبہ و فکر کے اثر و نفوذ کی تمام راہوں کو حتی الامکان سب کے لئے یکساں کھول دیا جائے، تاکہ کہیں کسی زیرِ زمین سرگرمی یا انقلابی طریق کار کی ضرورت کا احساس [illegible] اس اعتبار سے ہمارے نزدیک مسٹر بھٹو کی اس رائے میں بڑا وزن ہے کہ پاکستان کی کیونسٹ پارٹی پر سے بھی پابندی اٹھالی جانی چاہئے۔۔۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جذبہ و فکر کی راہوں کو کبھی مسدود نہیں کیا جاسکتا۔ آپ ان کے ایک جانب بند باندھیں گے تو وہ دوسری جانب بہہ نکلیں گے۔ ہمارے حالیہ تجربے سے تو یہ بات بالکل ہی ثابت ہوگئی ہے کہ کسی فکر کو پابند و پابجولاں کرنا ممکن نہیں۔ کیونسٹ پارٹی پر ہمارے یہاں پابندی عائد رہی، لیکن کیونسٹ انقلاب ہمارے نصفِ بہتر خطے کے عین دروازوں تک پہنچ گیا تھا۔۔۔ فکر کا مقابلہ جوابی فکر ہی سے کیا جاسکتا ہے اور معاملات و مسائل کا حل ان کا مردانہ وار مواجہہ (Face) کرنے ہی سے ممکن ہے۔ مصنوعی پابندیوں اور فراری ذہنیت سے کوئی معرکہ سر نہیں کیا جاسکتا!

ایک دوسری نہایت اہم بات یہ ہے کہ ملکی سیاست کے میدان میں مذہب کا نام نہایت احتیاط کے ساتھ اور بالکل ناگزیر حد تک ہی لیا جانا چاہئے۔ ہمارے پڑھے لکھے طبقے کا بالعموم مذہبی اعتبار سے جو حال ہے وہ سب ہی کو معلوم ہے اور خود عوام کی ایک عظیم اکثریت میں بنیادی اخلاقی و روحانی اقدار جس سطح پر ہیں وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ تو جب مذہب اس وقت نہ ہمارے فکر میں سرایت کئے ہوئے ہے نہ جذبے میں تو آخر سیاست کے میدان میں اس کی کار فرمائی کیسے ہوگی؟ پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ دین و مذہب کے اعتبار سے میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ اور سردار شوکت حیات خاں اور شیخ مجیب الرحمن اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے مابین کون سا فرق و تفاوت ہے؟۔۔۔۔ بلکہ عجیب تر صورت یہ ہے کہ پاکستان میں سوشلسٹ انقلاب کے داعیٔ اعظم مولانا بھاشانی تو علمائے

دیوبند کے صحبت یافتہ اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں اور نظام اسلام پارٹی کے متعدد اہم کارکنوں کے ملی و قومی جذبہ و اخلاص کے معترف ہونے کے باوجود ذاتی طور پر ہمیں معلوم ہے کہ وہ جمعے کی نماز پڑھنے کے بھی روادار نہیں!..... مقصود کسی کی تنقیص نہیں بلکہ صرف اس امر کی وضاحت ہے کہ ہمارے ملک میں مذہب بالکل بنیاد سے تعمیرِ جدید کا محتاج ہے اور احیاءِ اسلام کی آرزو رکھنے والے لوگوں کو پہلے فکر کے میدان میں اسلامی انقلاب اور عوامی سطح پر اسلام کی مخصوص اخلاقی و روحانی اقدار کی از سرِ نو ترویج کا کٹھن اور صبر آزما کام کرنا ہو گا۔ موجود الوقت حالات میں سیاسی میدان میں اسلام کا نعرہ لگانا اور سیاسی و معاشی مسائل میں مختلف نقطہ ہائے نظر کے حامل لوگوں پر کفر و الحاد کے فتوے چسپاں کرنا بالآخر خود دین و مذہب کے لئے مضر ثابت ہو گا۔

سوچنا چاہئے کہ اس وقت جو مسائل بالعموم ملک اور قوم کے سامنے ہیں ان میں سے آخر کون سے مسئلے کا کوئی خاص تعلق دین و مذہب سے ہے؟ طرزِ حکومت وحدانی ہو یا وفاقی' جمہوریت صدارتی ہو یا پارلیمانی' انتخابات بالواسطہ ہوں یا بلاواسطہ' مغربی پاکستان ایک صوبہ رہے یا دوبارہ متعدد صوبوں میں منقسم ہو جائے۔ جس طرح ان تمام مسائل میں اسلام کا کوئی ایک منصوص حکم نہیں ہے بلکہ حالات و ضروریات کے اعتبار سے مناسب تر کوئی صورت بھی اختیار کی جا سکتی ہے اسی طرح ان مسائل میں بھی اسلام میں حالات و ضروریات کے مطابق مناسب صورتیں اختیار کرنے کی بڑی گنجائش ہے کہ زمین کا بندوبست کن بنیادوں پر ہو اور بڑی بڑی صنعتوں اور ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت برقرار رکھی جائے یا انہیں اجتماعی ملکیت قرار دے کر حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے۔ مزارعت کا مسئلہ ہمارے یہاں سلف سے متنازعہ فیہ چلا آ رہا ہے اور حضرت عمرؓ نے مفتوحہ علاقوں کو مجاہدین کے مابین تقسیم کرنے کی بجائے پوری ملّتِ اسلامی کی اجتماعی ملکیت قرار دے کر ایک اہم اجتہاد فرمایا تھا جس پر پوری امت کا اجماع بھی ہو گیا تھا۔ لہٰذا ان مسائل میں دلیل کی بنیاد پر کوئی ایک یا دوسرا موقف تو اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن اپنی کسی رائے کو اسلام کا حتمی فیصلہ قرار دے کر بقیہ آراء کو کفر و الحاد قرار دے دینا یقیناً زیادتی اور حدود سے تجاوز ہے۔ ہماری رائے میں بالکل صحیح کہا ہے مولانا غلام غوث ہزاروی نے کہ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تمام مسائل و معاملات اور ان کی پیچیدگیوں اور مشکلات کا صحیح فہم حاصل کیا جائے اور ان کے حل کی مخلصانہ کوشش کی جائے' نہ یہ کہ جو بھی ذرا عام روش سے ہٹ کر بات کرے اس کے خلاف کفر

والحاد ... توں کی توپیں داغنی شروع کر دی جائیں----!!

پاکستان میں بحالی جمہوریت کے علمبردار اگر یہ سمجھتے ہیں کہ اب پھر بس قبل از مارشل لاء کی سی جمہوریت ملک میں دوبارہ قائم ہو سکتی ہے اور بالکل اسی طرح کے سے حالات لوٹ کر آ سکتے ہیں تو سخت غلطی پر ہیں۔ اس ملک میں اب حقیقی عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہو رہا ہے اور جمہور اب صرف اس بات پر کبھی قانع نہ ہوں گے کہ ان کو "ووٹ" کی صورت میں سرمایہ داروں سے کچھ "نوٹ" حاصل کرنے کا ایک کاغذی سا حق مل جائے بلکہ وہ اپنے تمام سیاسی و معاشی حقوق کے حصول کے لئے سردھڑ کی بازی لگانے سے گریز نہیں کریں گے۔ اس صورت حال میں اگر کسی نے مذہب کو ان کے خلاف دلیل کی حیثیت سے استعمال کیا تو اس کا ایک ہی نتیجہ نکلے گا اور وہ یہ کہ مذہب کے ساتھ عوام کا رہا سہا تعلق بھی ختم ہو جائے گا اور مذہب سے بیزاری کی عام رو چل نکلے گی۔ تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ہوش مند لوگوں کو ان سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی پہلی نشست اگرچہ کُل نصف گھنٹے کی تھی اور اس کی نوعیت خالص رسمی ملاقات کی تھی تاہم اس سے آئندہ صورت حال کا پورا نقشہ سامنے آگیا ہے اور اگرچہ فی الحال شرکائے کانفرنس بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں، چنانچہ کسی جانب سے "عبوری قومی حکومت" کا نام لیا جا رہا ہے اور کوئی صرف نئے انتخابات تک کے لئے "عارضی نگران ادارے" کا نام لے رہا ہے، کوئی ۵۶ء کے دستور کی کامل بحالی کا مطالبہ کر رہا ہے تو کوئی بالکل نئے سرے سے دستور سازی کا تقاضا کر رہا ہے۔ ون یونٹ توڑنے کا مطالبہ تو پرانا ہی تھا، اب شیخ مجیب الرحمٰن صاحب مشرقی و مغربی خطوں کے مابین مساوات (Parity) کے اصول کو بھی ختم کرنے پر تل گئے ہیں۔ غرضیکہ وہ تمام مسائل از سرنو اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جن کی بنا پر پاکستان میں دستور سازی کے کام میں ابتداءً تاخیر و تعویق ہوئی تھی اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ پاکستان کی ان تمام دستوری پیچیدگیوں کے حل کی عملی صورت کیا ہو گی--- تاہم یہ بات واضح ہے کہ کنونشن، کونسل اور عوامی تینوں لیگوں ہی کے مابین کچھ لے اور دے کر اور کسر و انکسار کے اصول کے تحت کوئی معاہدہ ہو جائے

گا اور ان ہی کے اتحاد و اتفاق سے کوئی مضبوط حکومت مرکز میں بن سکے گی ---- دوسری جانب یہ بھی بالکل واضح ہے کہ مولانا بھاشانی اور مسٹر بھٹو سے اتحاد کے اصل اپوزیشن وجود میں آئے گی۔ اور مقابل کے اصل دھڑے یہی دو ہوں گے۔ باقی رہے ڈی اے سی کے دوسرے شرکاء تو ان میں سے بعض اِدھر اور بعض اُدھر ہو جائیں گے۔ مغربی پاکستان کا ولی و قصوری گروپ اور مشرقی پاکستان کے شش نکاتی عوامی لیگ کے انتہا پسند طبقات اپوزیشن کے جانب آئیں گے اور مذہبی جماعتوں میں سے جمعیت علمائے اسلام بلاواسطہ یا بالواسطہ ان ہی کے پلڑے میں وزن ڈالے گی ---- دوسری طرف نظام اسلام اور جماعت اسلامی چاہے فوراً حکومت میں شرکت کو ترجیح دیں یا فی الحال باہر رہنے کو پسند کریں، بہرحال متذکرہ بالا اتحادِ ثلاثہ کو سہارا دیں گی ---!!

آئندہ کی سیاست کا عملی نقشہ یہ بنے، یا کوئی اور، ہماری دلی خواہش جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، صرف یہ ہے کہ سارے معاملات سیاست کے کھلے میدان میں معروف طریقے پر طے ہوں اور نہ تشدد، انارکی اور ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو، نہ انقلابی طور طریقے اختیار کئے جائیں۔

خدا کرے کہ اب ملک کے دونوں خطوں میں حالات معمول پر آجائیں، تعلیمی ادارے کھل جائیں اور زندگی کا عام کاروبار معمول کے مطابق جاری رہے اور طوفانی سیاست کی کوئی نئی لہر ملک کو اپنی گرفت میں نہ لے لے۔ اس لئے کہ اب اگر کوئی نئی لہر اٹھی تو اس کا رنگ بالکل مختلف ہو گا۔ صدر ایوب اور ان کی حکومت تو اب میدان سے عملاً ہٹ ہی گئے ہیں۔ اب اگر تصادم ہوا تو عوام کا عوام سے ہو گا اور اس کے نتائج نہایت سنگین ہوں گے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ مولانا بھاشانی اور مسٹر بھٹو دونوں اپنی موجودہ شکست کو کھلے دل سے قبول کر کے معروف طریقے پر اپوزیشن کا کردار اختیار کرلیں اور اپنی قوت کے مظاہرے اور کسی انقلابی اقدام کا خیال دل میں نہ آنے دیں ---- بصورتِ دیگر پاکستان کے مشرقی و مغربی دونوں خطوں میں عوامی تصادم شدید ترین صورت میں ظاہر ہو گا۔ مشرق میں اصل مقابلہ مولانا بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمٰن کے مابین ہو گا اور مغرب میں مسٹر بھٹو اور جماعت اسلامی کے حامی طلبہ میں۔ مغرب میں تو دھمکیوں اور جوابی دھمکیوں کا آغاز بھی ہو چکا ہے،

مشرق میں فی الحال خاموشی ہے لیکن یہ خاموشی کسی بہت بڑے ٹکراؤ کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے اللہ تعالیٰ ہی اس نازک موقع پر پاکستان کی حفاظت فرمانے والا ہے!!

(۲)

آزادیٔ ہند کے بعد ابتداءً عام خیال یہ تھا کہ بھارت میں کمیونسٹ انقلاب کے امکانات بہت روشن ہیں، جبکہ پاکستان میں اس کا دُور دُور تک کوئی امکان نہیں! لیکن گزشتہ چھ ماہ کے دوران رفتہ رفتہ یہ بات واضح ہوتی چلی گئی ہے کہ دراصل معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے اور آج کا پاکستان بھارت کے مقابلے میں کمیونزم اور سوشلزم سے زیادہ قریب ہے۔ سوچنا چاہئے کہ اس انقلاب کے اسباب کیا ہیں۔

متذکرہ بالا عام خیال کی بنیاد اس مغالطے پر تھی کہ پاکستان میں مذہب ایک مؤثر قوت ہے اور وہ کمیونزم کے سیلاب کی راہ میں ایک مضبوط بند ثابت ہو گا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑا مغالطہ تھا اور حقیقت اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ قومی حیثیت سے ہمارے اوپر بھی مذہب کا رنگ ایک ملمع سے زیادہ نہیں۔ اس لئے کہ جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا مذہب نہ ہمارے فکر پر حاوی ہے اور نہ ہی اسے ہمارے اصل مؤثر طبقات کے جذبات میں کوئی حقیقی نفوذ حاصل ہے۔ خالص عوامی سطح پر جو جذباتی لگاؤ مذہب کے ساتھ ہے اس کی اجتماعیات میں کوئی فیصلہ کن اہمیت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا کمیونزم کی متوقع روک تھام کرنے والا یہ دفاعی بند محض ہوائی و خیالی تھا اور اس کا بے حقیقت ہونا اب ثابت ہو چکا۔

اس اعتبار سے تو پاکستان اور بھارت ایک ہی جیسے تھے لیکن دو باتوں میں ان کے مابین بہت فرق و تفاوت تھا۔

ایک یہ کہ یہاں فکر اور نظریئے کے میدان میں ایک گھپلا اور الجھاؤ مسلسل جاری رہا اور قوم کے اصل مؤثر طبقات کی لادینیت کے ساتھ ایک سطحی اور عوامی مذہبیت مسلسل الجھتی رہی جبکہ بھارت خالص لادینیت کی راہ پر گامزن رہا اور اس میدان میں کوئی منافقت کی راہ اس نے اختیار نہ کی۔

اور دوسرے یہ کہ ہمارے یہاں ایک مہیب سیاسی خلا تھا۔ چنانچہ نہ کوئی مضبوط سیاسی

جماعت موجود تھی نہ قابلِ اعتماد قومی قیادت ---- جبکہ بھارت میں ایک عظیم اور محکم سیاسی جماعت بھی موجود تھی اور ایک مضبوط اور معتمد علیہ قومی قیادت بھی۔

ہمیں معلوم ہے کہ ہماری یہ "عریاں حقیقت نگاری" بہت سے لوگوں پر بڑی گراں گزرے گی، لیکن ہم مجبور ہیں کہ صورتِ واقعہ جیسی کچھ ہمیں نظر آتی ہے ویسی ہی بیان کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں کے نظریاتی کھیلے اور سیاسی خلا ہی نے موجودہ صورتحال کو جنم دیا ہے اور حالات کے رخ میں کوئی تبدیلی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ایک طرف نظریئے اور فکر کے میدان میں دوغلے پن کو ختم کر کے یک سوئی و یک رنگی اختیار کی جائے اور دوسری طرف سیاسی میدان کے خلا کو مضبوط اور محکم سیاسی جماعتوں اور کھلی اور بے روک ٹوک سیاسی سرگرمی کے ذریعے پُر کیا جائے۔

دوسری بات کے ضمن میں تو ہم تفصیل کے ساتھ اوپر لکھ چکے ہیں اب چند گزارشات پہلی بات کے ذیل میں عرض کرنی ہیں۔ خصوصاً اس امر کے پیشِ نظر کہ بعض حضرات نے یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ "ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی" اسلام آباد کو ختم کر دیا جائے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ پاکستان میں نظریئے اور فکر کے میدان میں جو الجھاؤ موجود ہے اس کو جانبِ لادینیت نہیں بلکہ جانبِ دین و مذہب ہی سلجھانا ممکن ہے۔ اگر یہ بات مسلّم ہے کہ کسی ملک اور قوم کی اصل قوت اس کے عوام ہی ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ پاکستان کے عوام کا جذباتی تعلق بہرحال دین و مذہب ہی کے ساتھ ہے، لادینیت و لامذہبیت کے ساتھ نہیں۔ نتیجتاً قوم میں فکر و نظر کی یکسانی و یک رنگی پیدا کرنے کی صرف ایک صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ قوم کے طبقہ خواص کے اذہان بھی دین و مذہب کے رخ پر ڈھلیں اور ان کے قلوب بھی اسلام و ایمان کے نور سے منور ہوں۔ لیکن یہ کام جس قدر اہم اور ضروری ہے اسی قدر مشکل اور کٹھن بھی ہے اور محض سیاسی میدان میں عوام کی مذہبیت کے سہارے دین و مذہب کے نعرے لگانے سے یہ کام ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ضرورت ہے ایک عظیم علمی و تعلیمی تحریک کی جس کے ذریعے ایک طرف علم کو مومن بنایا جائے اور دوسری جانب آئندہ نسلوں کو مسلمان بنا کر اٹھایا جائے ---- اور چونکہ یہی وہ چیز ہے جس پر ہمارے نزدیک اسلام کے مستقبل اور احیائے اسلام اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا دارومدار بھی ہے اور پاکستان کے بقاء و تحفظ کا انحصار بھی لہٰذا ہم ان صفحات میں بھی اسی کی اہمیت بار بار اجاگر کرتے رہے ہیں۔ اور اپنی حقیر قوتوں اور صلاحیتوں اور محدود فرصت و مہلتِ عمر کا مصرف بھی ہم

نے یہی قرار دیا ہے کہ خالص قرآن حکیم کی بنیاد پر ایک علمی و فکری تحریک کا اجراء ہو اور اس کے لئے ابتدائی اقدام کے طور پر ایک قرآن اکیڈمی قائم کی جائے۔ (الحمد للہ کہ "قرآن اکیڈمی" کا سنگِ بنیاد ۷۶ء میں رکھ دیا گیا تھا اور اب تو اس کے کوکھ سے "قرآن کالج" اور "قرآن آڈیٹوریم" بھی بر آمد ہو چکے ہیں!)

علم و فکر کے میدان میں انقلابی کام کی توقع حکومتوں سے بالعموم نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ حکومتیں عموماً موجود الوقت فکری و نظریاتی ماحول کی عکاسی ہی کر سکتی ہیں۔ رائج الوقت فکری دھاروں کو بدلنا عام طور پر افراد اور پرائیویٹ اداروں ہی کے کرنے کا کام ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے گزشتہ اکیس سالوں کے دوران جدید و قدیم کے امتزاج کی ضرورت کے احساس کے تحت جتنے ادارے حکومت کی زیر سرپرستی قائم ہوئے وہ دین سے زیادہ بے دینی کے رخ پر بہہ نکلے اور ان سے اکثر و بیشتر فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا جس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال "ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی" کراچوی ثم اسلام آبادی ہے۔

اس ادارے کی داستان بہت طویل ہے۔ یہ اولاً کراچی میں مرحوم لیاقت علی خان کے دورِ حکومت میں مرحوم ظہیر الدین لال میاں کے پرزور اصرار پر قائم ہوا تھا۔ یکے بعد دیگرے متعدد حضرات اس کی سربراہی کے منصب پر فائز ہوئے لیکن اس کے کام کا کوئی واضح نقشہ متعین نہ ہو سکا۔ ۵۸ء کے فوجی انقلاب کے بعد اس کی سربراہی ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے ہاتھ آئی اور ۶۲ء کے دستور میں اس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل الفاظ میں متعین ہوئے:

> "THE FUNCTION OF THE INSTITUTE SHALL BE TO UNDERTAKE ISLAMIC RESEARCH AND INSTRUCTION IN ISLAM FOR THE PURPOSE OF ASSISTING IN THE RECONSTRUCTION OF MUSLIM SOCIETY ON A TRULY ISLAMIC BASIS."
>
> Constitution:ArticleNo.207(2)

لیکن افسوس کہ اس ادارے نے بجائے اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے بالکل دُور از کار اور لایعنی بحثوں کے دروازے کھول دیئے جن سے الجھنوں ہی میں اضافہ ہوا اور فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ نتیجتاً عوام میں اس ادارے کے خلاف غم اور غصہ کے

جذبات پیدا ہوئے جس کی انتہائی صورت پچھلے دنوں اس مطالبے کی شکل میں سامنے آئی کہ اس ادارے ہی کو بند کر دیا جائے۔

ہمارے نزدیک یہ مطالبہ محض غصے اور جھنجلاہٹ کا مظہر ہے اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ یہ مطالبہ کیا جائے کہ چونکہ پاکستان اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے حاصل کیا گیا تھا لیکن گزشتہ اکیس سال کے عرصے میں یہاں نہ صرف یہ کہ اسلام کی جانب کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی بلکہ الٹی لادینیت اور اباحت پسندی ہی کو ترقی ہوئی لہٰذا پاکستان کا وجود عبث ہے اور اسے ختم کر دینا چاہئے۔

ہمارے نزدیک صحیح طریقہ یہ ہے کہ یہ مطالبہ کیا جائے کہ اس ادارے کو جس پر پاکستان کے غریب عوام کا کروڑوں روپیہ خرچ ہو چکا ہے اور لاکھوں روپیہ ہر سال خرچ ہو رہا ہے صحیح اور اہل لوگوں کے سپرد کیا جائے اور اس سے بالفعل وہی مقصد حاصل کیا جائے جس کے لئے اسے قائم کیا گیا تھا۔

پاکستان میں آئندہ جو حکومت بھی بنے، اور جو لوگ بھی بر سر اقتدار آئیں ان سے ہماری مخلصانہ گزارش یہی ہے کہ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ پاکستان کی ترقی و استحکام ہی نہیں اس کا عین وجود بھی اسی ایک امر پر منحصر ہے کہ آیا اسلام یہاں خواص و عوام دونوں کے اذہان و قلوب میں رچ بس کر پوری قوم میں فکر و نظر کی ہم آہنگی و یک رنگی پیدا کرتا ہے یا نہیں۔ اگر ہم نے جلد اس سوال کا مثبت جواب عملاً پیش نہ کیا تو جو صورت حال سامنے ہے اس کے پیش نظر دنیا کی اس عظیم ترین مسلمان مملکت کا چھوٹی چھوٹی علاقائی و لسانی قومیتوں میں بٹ کر منتشر ہونا اور پھر انہی بنیادوں پر آس پاس کی بڑی قومیتوں میں ضم ہو جانا یقینی ہے ---- اور یہ کام محض تقریروں اور بیانوں میں اسلام کی تعریف و توصیف سے نہیں ہو گا بلکہ صرف اس طرح ہو گا کہ ایک طرف علوم کو مسلمان بنایا جائے اور ایمان باللہ ہی کی بنیاد پر تمام طبعی، عمرانی اور نفسیاتی علوم کی تدوین جدید ہو اور دوسری طرف نظامِ تعلیم کے پورے ڈھانچے کو از سرِ نو اسلامی خطوط پر استوار کیا جائے ---- ان دونوں کاموں میں بھی مقدم چونکہ بہر حال علوم کی تدوینِ جدید ہی ہے اور اس ضمن میں اسلامی ریسرچ کے سرکاری و نیم سرکاری ادارے نہایت وقیع خدمت سرانجام دے سکتے ہیں لہٰذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ یہ ادارے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دیئے جائیں جو جدید و قدیم دونوں علوم پر حاوی بھی ہوں اور ذہناً مسلم اور قلباً مومن بھی ہوں اور اسلامی ریسرچ کے کام کو صحیح خطوط

پر آگے بڑھا سکیں۔ خدا کرے کہ یہ اہم ترین کام جو ہمارے یہاں اب تک نظر انداز ہوتا آیا ہے، اب مزید مؤخر نہ ہو!

اس سلسلے میں اپنی جانب سے ایک حقیری کوشش کے طور پر ہم ہی نے "تحقیق اسلامی: اس کے معنی و مدعا و دائرہ کار" کے موضوع پر محترم ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کا مقالہ بالاقساط "میثاق" میں شائع کیا اور ان شاء اللہ بہت جلد اسے ایک پمفلٹ کی صورت میں بھی شائع کر دیں گے۔ (یہ کتاب شائع ہو چکی ہے اور مکتبہ انجمن سے حاصل کی جا سکتی ہے) ہمارے نزدیک یہ مقالہ اپنے موضوع پر قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے اور ہمیں امید ہے کہ قوم کا ہر صاحبِ بصیرت مخلص جو ذہناً و قلباً مؤمن و مسلم ہو، اس کے مندرجات کو اپنے دل کی آواز محسوس کرے گا!

باب دوم

جنرل محمد یحییٰ خاں کا مارشل لاء

مئی ۱۹۶۹ء

ملک میں مارشل لاء کو نافذ ہوئے سوا مہینہ ہو گیا ہے اور اس عرصے میں وہ گومگو کی سی کیفیت اور غیر یقینی سی صورتحال ختم ہو چکی ہے جو کسی اچانک تبدیلی کے بعد کچھ عرصہ تک فطری طور پر طاری رہتی ہے۔ اس دوران میں نہ صرف یہ کہ حالیہ فوجی حکومت کے ذمہ دار حضرات نے قوم کو بار بار یہ اطمینان دلایا ہے بلکہ اب تو ان کے طرز عمل سے بھی بہت حد تک ثابت ہو گیا ہے کہ نہ وہ کوئی سیاسی عزائم رکھتے ہیں اور نہ ہی اپنے دورِ اقتدار کو غیر ضروری طول دینے کے خواہش مند ہیں بلکہ ان کا مقصد محض ایک ایسی صورتحال کو جو بالکل بے قابو ہوئی جارہی تھی قابو میں لانا اور ملک کی سیاسی زندگی کی گاڑی کو از سرِنو صحیح پٹڑی پر ڈالنا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ امر انتہائی اطمینان بخش ہے اور موجودہ فوجی قیادت اس پر پوری قوم کے تشکر و امتنان کی مستحق ہے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو حالیہ مارشل لاء گزشتہ مارشل لاء سے بہت مختلف ہے جو بڑی آن بان کے ساتھ ملک و ملت کے جملہ عوارض و امراض کی مسیحائی کے دعوے کے ساتھ آیا تھا اور جس نے صرف ایک نیا تنظیمی ڈھانچہ ہی نہیں بلکہ ایک مکمل جدید سیاسی فلسفہ اور مختلف عمرانی معاملات حتیٰ کہ دینی و مذہبی مسائل میں بھی ایک نیا اندازِ فکر قوم پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی ---- حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے معاملات مارشل لاء کے فطری دائرۂ کار سے باہر ہیں۔ مارشل لاء کبھی کسی قوم یا ملک کے امراض و عوارض کا مستقل اور پائیدار علاج نہیں بن سکتا۔ اس کی مثال زیادہ سے زیادہ ان فوری اور سریع الاثر مگر خالص وقتی اور عارضی افاقہ بخش ادویہ کی سی ہے جو کسی مرض کی بحرانی کیفیت میں فوری خطرے کو ٹالنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔

ہم ان صفحات میں اس سے قبل بھی عرض کر چکے ہیں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ دیانت دار اور باضمیر سیاسی کارکنوں، منظم و محکم سیاسی جماعتوں اور مسلسل اور پیہم سیاسی سرگرمی کا فقدان ہماری قومی و ملی زندگی کا ایک مہیب اور خطرناک خلا ہے جسے لازماً پر کیا جانا چاہئے ---- اب

ظاہر ہے کہ یہ خلا اگر پُر ہو سکتا ہے تو سیاسی سرگرمی ہی سے ہو سکتا ہے۔ کوئی دوسری چیز اس کا بدل نہیں بن سکتی اور مارشل لاء ہرگز اس خلاء کو پر نہیں کر سکتا۔۔۔ مارشل لاء زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ ملک کی انتظامی مشینری کو پوری رفتار سے حرکت میں لے آئے، سستی اور کاہلی کا قلع قمع کر دے، دفاتر اور عدالتوں میں جمع شدہ کام تیزی سے پورا کرا دے، دھاندلی اور غنڈہ گردی کا سدِباب کر دے، شہری زندگی کی بدعنوانیوں کا خاتمہ کرا دے اور سرکاری واجبات کی وصولی کا فوری بندوبست کر دے۔ اور الحمدللہ کہ یہ سارے کام پورے زور شور کے ساتھ اِس وقت جاری ہیں ۔۔۔ رہا ملک اور قوم میں فکری و نظریاتی ہم آہنگی پیدا کرنا اور ملک و ملت کو ایک جذبۂ تازہ دے کر سرگرمِ عمل کرنا تو ظاہر ہے کہ نہ کسی فوجی حکومت سے اس کی توقع کی جاتی ہے اور نہ ہی، خدا کا شکر ہے کہ ان معاملات میں موجودہ فوجی قیادت نے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ کسی لمبی چوڑی مہم کا آغاز ہی کیا ہے۔۔۔ خدا کرے کہ یہ صورتحال برقرار رہے۔۔۔ اور صدرِ مملکت آغا محمد یحییٰ خان اپنی ذمہ داریوں میں اضافہ کرنے کی بجائے جلد از جلد ان سے سبکدوش ہونے کی کوشش کریں۔

بدقسمتی سے ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو ایک طرف تو ہر چڑھتے سورج کی پرستش کو اپنا فرضِ عین سمجھتے ہیں اور دوسری طرف ہر اس شخص کو جو کسی وقت کسی طرح برسرِاقتدار آ جائے قوت و اقتدار کے نشے میں مست کر کے اس کے ذریعے اپنا اُلّو سیدھا کرنے میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔۔۔ ایسے لوگ سروسز میں بھی کثرت سے ہیں اور پرانے زمینداروں اور نئے صنعت کاروں میں بھی۔ اور حال ہی میں ان کی صفوں میں کچھ سرگرمی کے آثار بھی نظر آئے ہیں۔۔۔ خدا کرے کہ موجودہ فوجی قیادت ایسے لوگوں کے منحوس اثرات سے محفوظ رہے اور کم سے کم مدت میں ان نازک ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو کر جو اس وقت اس کے کاندھوں پر آ گئی ہیں اپنی تمام تر توجہات اور مساعی کو اپنی اصل اور مستقل ذمہ داری یعنی دفاعِ وطنِ عزیز پر مرکوز کر دے۔

مارشل لاء کے نفاذ سے قبل مسلسل پانچ چھ ماہ سے جو ہنگامی صورتحال پورے ملک پر طاری چلی آ رہی تھی اس کے یک لخت خاتمے سے جو پرسکون کیفیت پیدا ہوئی اس میں ملک و ملت کے ہی

خواہوں میں سے بہت سے اصحابِ فکر و نظر نے ان عوامل کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے جن کے نتیجے میں ہمارے یہاں سیاسی عدم استحکام اور فکری و نظریاتی انتشار پیدا ہوا ہے اور یہ ۔ ماً فیوماً بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ اخبارات و رسائل میں بہت سے عمدہ مضامین اس موضوع پر شائع ہوئے ہیں جن سے یہ تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے اصحابِ فکر و نظر اس امر کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ قوم میں فکر و نظر کی وہی یک جہتی اور جذبہ و عمل کی وہی ہم آہنگی دوبارہ پیدا کی جائے جو آج سے تقریباً ربع صدی قبل کچھ عرصے کے لئے ملّتِ اسلامیہ پاک و ہند میں پیدا ہوئی تھی اور جس کے نتیجے کے طور پر پاکستان وجود میں آیا تھا۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ اُس وقت وہ کیفیت کیوں اور کن اسباب و عوامل سے پیدا ہوئی تھی اور آج اسے کیونکر پیدا کیا جا سکتا ہے، مبہم طور پر یہ کہہ دینا کہ اُس وقت بھی وہ جذبہ اسلام کی بنیاد پر پیدا ہوا تھا --- اور آج بھی اسے اسلام ہی کی بنیاد پر دوبارہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ شاعری میں تو شاید روا ہو لیکن ملک و ملت کے ٹھوس مسائل سے بحث کرنے والی سنجیدہ علمی تحریروں کے شایانِ شان نہیں ---- اس لئے کہ اس کے معاً بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ سب کچھ اسلام ہی کی بنیاد پر تھا تو بعد میں وہ ختم کیوں ہو گیا؟ جبکہ اسلام سے نہ اس قوم کے عوام منحرف ہوئے نہ خواص ---- بلکہ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں بتایا جا سکتا جو یہاں کبھی کسی حیثیت سے برسرِ اقتدار رہا ہو اور اٹھتے بیٹھتے اسلام کا کلمہ نہ پڑھتا رہا ہو اور اپنے جملہ مسائل و مشکلات کا حل اسلام ہی میں نہ بتاتا رہا ہو۔

ہمارے یہاں "اسلام!" ---- "اسلام!" اور "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" کے نعرے اِس وقت جس زور شور کے ساتھ لگ رہے ہیں، ویسے تو ہمارے لئے وہ ہر حال میں خوش آئند ہیں اور ہم بہرصورت انہیں خوش آمدید کہتے ہیں، لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج سے رُبع صدی قبل کسی محکم اور پائیدار اساس کے بغیر محض ہوا میں ان نعروں کی گونج پیدا کر کے مسلسل بائیس سال تک ہم جس طرح ان کی مٹی پلید کرتے آئے ہیں، ہمیں خدشہ ہے کہ آج جس انداز سے یہ نعرے لگ رہے ہیں اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ مستقبل میں ان کی حرمت کو کچھ اور بھی زیادہ ہی بٹا لگایا جائے گا اور ان مقدس الفاظ کی رسوائی پہلے سے بھی کچھ زائد ہی ہو گی۔ اس کا تھوڑا سا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس وقت جو جلوس یہ نعرے لگاتے تھے ان میں شامل

خواتین کی اکثریت باپردہ اور برقع پوش ہوتی تھیں ---- اور آج وہ نوجوان لڑکیاں ان کی علمبردار ہیں جو پردے اور برقعے کی قید سے بالکل آزاد ہو چکی ہیں اور نیم عریاں ٹیڈی لباس میں ملبوس ہیں ----
ع "قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا!"

ہمارے یہاں اِس وقت جن اصحابِ قلم و قرطاس نے "اسلام" کی دہائی دی ہے ان میں سے کچھ وہ ہیں جو "سوشلزم" کے ہوّے سے خوفزدہ ہو کر اسلام کی پناہ گاہ کی جانب رجوع کرنے پر مجبور ہوئے ہیں اور جن کے دین و مذہب سے تازہ شغف کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ
ع "جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا!"

ان کو ایک طرف رکھتے ہوئے بعض ایسے حضرات کا حال بھی' جن کے خلوص اور اخلاص کے ہم بھی معترف ہیں اور جن کے بارے میں ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ اسلام کے قدیم شیدائی و فدائی ہیں' یہ ہے کہ خود ان کا مسجد سے کوئی رشتہ و تعلق نہیں اور ان کی جوان لڑکیاں بے پردہ گھومتی اور "قتالۂ عالم" کا لقب پاتی ہیں۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون!

خدا کے لئے حقائق کا مواجہہ کرنا سیکھئے! ---- حقائق سے گریز محض خود فریبی ہے' اس سے نہ یہ ارض و سماء دھوکا کھاتے ہیں' نہ خالقِ ارض و سماوات' اور "وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ!" کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا ---- واقعہ یہ ہے کہ اسلام سے تو پوری امتِ مسلمہ بحیثیتِ مجموعی کب کی دستبردار ہو چکی۔ دین و مذہب کے ساتھ اس کا مخلصانہ رشتہ استوار ہوتا تو یہ عالمگیر ذلت و رسوائی سے دوچار ہی کیوں ہوتی۔ غلطی "اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ" میں نہیں' امت کے دعوئ ایمان میں ہے۔

میر کے دین و مذہب کی کیا پوچھو ہو جی' ان نے تو
قشقہ کھینچا' دَیر میں بیٹھا' کب کا ترک اسلام کیا

مدتِ مدید گزری کہ اسلام کا شجرۂ طیبہ بیخ و بن سے اکھڑ چکا اور اب از سرِ نو تخم ریزی و آبیاری کا محتاج ہے۔ دین و مذہب کی عمارت محض شکستہ ہی نہیں ہوئی کہ ادھر ادھر کی مرمت سے کام چل جائے' یہ عظیم تعمیر کبھی کی زمین بوس ہو چکی۔ اور اگرچہ اس کے کھنڈر اب بھی اس کی عظمتِ رفتہ کے شاہد ہیں' تاہم اب ضرورت بالکل بنیاد سے از سرِ نو تعمیر کی ہے اور افسوس کہ امتِ مسلمہ تاحال اس حقیقت کے اعتراف تک پر آمادہ نہیں' بلکہ مسلسل مغالطے ہی میں مبتلا رہنے پر مصر ہے ---- اتو

پھر کون سے تعجب کی بات ہے اگر ہر تدبیر الٹی پڑتی نظر آئے اور کوئی دوا کارگر ثابت نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ آج سے ربع صدی قبل ملتِ اسلامیہ ہندوپاک کی باسی کڑھی میں جو ابال آیا تھا اس کا اصل محرک دینی و مذہبی جذبہ تھا' نہ آج اس کی ملی و اجتماعی زندگی میں دین و مذہب کو کسی مؤثر عامل کی حیثیت حاصل ہے! اُس وقت کا سارا جوش و خروش ایک ایسی قوم کے جذبۂ تحفظ و خود اختیاری کا رہینِ منت تھا' جس کی بنیاد تو صدیوں پہلے مذہب ہی کی اساس پر قائم ہوئی تھی لیکن جس کا دین و مذہب سے تعلق اب محض برائے نام رہ گیا تھا اور جسے کچھ مخصوص حالات میں یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا قومی تشخص ختم ہو جائے گا اور وہ ایک بڑی قومیت میں جذب ہو کر رہ جائے گی۔ اس خالص قومی تحریک کے آخری ایام میں خالص وقتی اور عارضی طور پر کچھ رنگ آمیزی دینی و مذہبی جذبے کی بھی کی گئی تھی' لیکن یہ سب کچھ ایک فوری ضرورت (Expediency) کے تحت تھا' نہ کہ کسی مستقل اور محکم اساس پر --- چنانچہ جب تحریک ایک حد تک کامیاب ہو گئی اور اس قوم کو اپنے معاشی و سیاسی تحفظ کی ضمانت کے طور پر ایک علیحدہ خطہ مل گیا تو وہ جوش و خروش بھی فوراً ختم ہو گیا --- اور دوبارہ اس کا سراغ کبھی ملا تو صرف اس وقت جب ایک بار پھر ۶۵ء میں خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں قوم کا یہ دفاعی حصار ٹوٹ نہ جائے --- اور ہندو امپیریلزم کا سیلاب اس قوم کو بہا کر نہ لے جائے --- پھر جونہی یہ خطرہ دوبارہ ٹلا وہ جذبہ بھی سرد پڑ گیا --- اور پھر وہی صورتحال طاری ہو گئی ع

"اب اسے ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر!"

یہ ہیں وہ حقائق جن کا ادراک اس لئے ضروری ہے کہ ملک و ملت کا ہر بہی خواہ اچھی طرح سمجھ سکے کہ مسئلے کی حقیقی نوعیت کیا ہے --- اور اصلاحِ احوال کے لئے کس جگہ سے کام کی ابتدا لازمی ہے۔ ظاہر ہے کہ علاج کی کامیابی کا سارا دار و مدار تشخیص کی صحت و درستی پر ہے --- ہمارا مرض سطحی نہیں' بہت گہرا اور نہایت مزمن ہے' اس کا علاج بھی سطحی تجاویز سے نہیں' بڑی گہری حکیمانہ تدبیر ہی سے ممکن ہے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار کی جرأت شاید ہی کوئی کر سکے کہ پاکستان کا استحکام ہی نہیں محض وجود و بقا بھی اسلام ہی سے وابستہ ہے --- لیکن خوب

اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ اسلام اِس وقت ہمارے عقیدہ و عمل دونوں سے خارج ہو چکا ہے اور اب اس کی بازیافت محض نعروں، تقریروں، مقالوں اور بیانوں سے ممکن نہیں----

اس کے لئے مسلسل اور پتّہ مار کر کام کرنے اور پیہم جِدّوجُہد کرنے کی ضرورت ہے۔ اس جدّوجہد کا اصل اور اولین میدان علم و فکر کا میدان ہے-----اور علم و فکر کا رشتہ ایمان و یقین کے ساتھ از سرِ نو استوار کرنا وقت کی اہم ترین اور مقدم ترین ضرورت ہے---- پھر اخلاق و اعمال کی دنیا میں انقلاب لانا لازمی ہے-----اس لئے کہ تطہیرِ فکر اور تزکیۂ اخلاق کی کٹھن مہموں کے سر ہونے کے بعد ہی اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ قوم کے رگ و پے میں دینی و اسلامی جذبہ سرایت کر جائے اور "اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ" کی صورت عملاً پیدا ہو۔

ہماری ان گزارشات سے ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو یہ بدگمانی پیدا ہو کہ شاید ہم فوری طور پر اسلامی نظام کے قیام کی کوششوں کے حامی نہیں، یا یہ کہ ہم پر مایوسی کا غلبہ ہے----- حالانکہ درحقیقت صورتِ واقعہ نہ تو یہ ہے نہ وہ---- ہم تجدیدِ دین اور احیائے اسلام کی ہر کوشش کی دل سے قدر کرتے ہیں اور خود بھی بحمد اللہ اپنی صلاحیتوں کی حقیری پونجی کو اسی مقصد کے لئے کھپا دینے کا عزمِ مصمم رکھتے ہیں۔ پھر ہم یہ یقین بھی رکھتے ہیں کہ بہت جلد انسانیت اپنے مسائل کے حل اور اپنے دکھوں کے مداوا کے لئے اسلام ہی کی جانب رجوع کرنے پر مجبور ہو گی اور وہ دَور زیادہ دُور نہیں جب پورے عالمِ ارضی پر اسلام ہی کا غلبہ ہو گا---- لیکن اس کے لئے کیا کام-----اور کس طرح سے کیا جانا چاہئے، اس کے بارے میں ہمارا ایک پختہ نقطۂ نظر ہے اور ہم علیٰ وجہ البصیرت جانتے ہیں کہ یہ کام کس نہج پر کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں دکھ ہوتا ہے تو اس وقت، اور ہمارے لہجے میں تلخی پیدا ہوتی ہے تو تب جب ہم دیکھتے ہیں کہ اچھے بھلے سمجھدار لوگ اس معاملے میں غالباً صرف تساہلِ فکر کی بنا پر محض سطحی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں اور مسئلے کی حقیقی و واقعی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے---اور واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دل میں ایک بے اختیار ہُوک اٹھتی ہے اُس وقت جب ہمیں خیال آتا ہے کہ برِّصغیر کی ایک اچھی بھلی دینی تحریک جو صورتحال کی صحیح تشخیص

کے ساتھ ایک بہت حد تک صحیح طریق کار پر برسرِ عمل ہوئی تھی----- وہ بھی قیامِ پاکستان کے وقت، حالات اور مواقع کی ایک وقتی سی ترغیب و تحریص (Temptation) کے زیرِ اثر اپنے موقف سے منحرف اور اپنے نہجِ کار سے دستبردار ہو گئی اور سطحیتِ فکر و عمل کا شکار ہو کر ہی خالی نعرے لگانے میں مصروف ہو گئی جن کی شدید مذمت ماضی میں وہ خود کرتی رہی تھی----- اور آج بھی جبکہ تقریباً رُبع صدی گزر چکی ہے وہ سیاست کے ریگزار میں حکومت و اقتدار کے سراب کے پیچھے بھٹکتی پھر رہی ہے، فَاعْتَبِرُوا يَا اُولِي الْاَبْصَارِ----- اس تحریک کا خیال ہمیں بار بار اس لئے آتا ہے کہ خود ہم نے اسی تحریک کی گود میں آنکھ کھولی تھی اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی تڑپ اسی کے طفیل پائی تھی۔

گزشتہ منزلیں منزل بہ منزل یاد آتی ہیں
مسافر یہ خلش دل کی بآسانی نہیں جاتی!

دین و مذہب سے قطعِ نظر کہ وہ بے چارے تو ہمارے یہاں اب صرف "بوقتِ ضرورت" استعمال کے لئے رہ گئے ہیں۔ اور اسلام و ایمان کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہ وہ غریب صرف لیڈروں کی تقریروں کا مطلع و مقطع فراہم کرنے کے کام آتے ہیں، خالص قومی سطح پر بھی غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ ہم زندہ قوموں کے لازمی اوصاف سے خطرناک حد تک تہی دست ہیں اور اس میدان میں بھی ہماری تہی دامنی روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے----- ہماری قومی و ملی زندگی جس طرح پے بہ پے حادثوں سے دوچار ہو رہی ہے اور ملکی سیاست کی گاڑی جس طرح بار بار زور دار جھٹکوں کے ساتھ رک جاتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ آزادی ایسی نعمتِ عظمیٰ کے حصول سے قبل قومی تعمیر کا کام جس حد تک لازماً ہو جانا چاہئے تھا وہ ہمارے یہاں نہیں ہوا۔ اور اس عظیم ذمہ داری سے کماحقہ، عہدہ بر آ ہونے کے لئے جن صلاحیتوں کی ضرورت تھی وہ ناگزیر حد تک بھی پیدا نہیں ہوئیں۔ گویا آزادی ہمیں ایک ایسے عطیہ کی حیثیت سے ملی جس کے لئے ہم عملاً تیار نہ تھے۔

یہ صورتِ حال بہت مشابہ ہے اس کیفیت سے جس سے بعض وہ طالب علم جو

> نچلے درجوں میں رعایتی پاس ہوتے چلے آتے ہیں کسی بڑے امتحان کے موقع پر دوچار ہو جاتے ہیں --- کہ لاکھ کوشش کرنے پر بھی ان کی وہ بنیادی کمی کسی طرح پوری نہیں ہوتی جو بالکل ابتدا میں رہ گئی تھی!

برِ صغیر کی ہندو قوم میں قومی تعمیرِ نو کا کام انیسویں صدی کے اواخر ہی سے شروع ہو گیا تھا اور بیسویں صدی کی ابتدا سے تو اس میں بے پناہ جوش و خروش اور جذبۂ عمل پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہر جہت اور ہر سمت میں تعمیر و اصلاح کا کام تیزی کے ساتھ شروع ہوا' بے شمار انجمنیں بنیں' لاتعداد ادارے وجود میں آئے' ہزاروں ٹرسٹ قائم ہوئے' چھوٹی بڑی لاکھوں درس گاہیں تعمیر ہوئیں ------ اور لکھوکھا قومی کارکن جذبۂ اخلاص کے مظہر' سادگی و کفایت شعاری کے پیکر اور مجسم قربانی و ایثار بن کر میدانِ عمل میں کود پڑے ---- پھر تعمیرِ جدید کا یہ کام کسی ایک ہی میدان میں نہیں ہوا بلکہ ایک طرف اگر سیاسی میدان میں ہلچل اور ہماہمی تھی تو دوسری طرف خالص معاشرتی اور سوشل اصلاح اور معاشی فلاح و بہبود کے لئے بھی زور شور سے کام جاری تھا۔ اور ایک طرف مذہبی اصلاح و تجدید کی کوششیں ہو رہی تھیں اور مذہبی افکار کے تنقیدی جائزے اور ان میں شکست و ریخت اور تالیفِ جدید سے نئے نئے دھرم ایجاد ہو رہے تھے تو دوسری طرف صحت و تندرستی کے اصولوں کے پرچار اور ورزش و ریاضت کے عملی پروگراموں سے جسم اور جسمانی قوتوں کے نشوونما کا کام بھی پورے انہماک سے ہو رہا تھا ---- غرض ہر شعبۂ زندگی میں ایک نئی ہلچل اور نئی سرگرمی پیدا ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں پوری ہندو قوم میں بیداری اور حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی اور فی الجملہ آزادی کی عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت اور استعداد اس میں پیدا ہو گئی۔

مسلمان قوم میں صورت اس کے برعکس رہی۔ اس کی اکثریت "عظمتِ رفتہ" کی یاد ہی کو سینے سے لگائے بیٹھی رہی اور "پدرم سلطان بود" کا راگ الاپ کر ہی دل کو تسلی دیتی رہی۔ قومی و ملی تعمیرِ جدید کا کام تقریباً نہ ہونے کے برابر رہا اور تعطل اور جمود کا تسلط اور بدنظمی' انتشار اور طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔ ہم اسی حال میں تھے کہ دفعۃً محسوس ہوا کہ غیر ملکی اقتدار کا خاتمہ ہونے کو ہے اور اس صورت میں ہندوستان کی مسلمان قوم ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر رہ جائے گی۔ چنانچہ فوری طور پر اپنے قومی تشخص کے تحفظ کی ضرورت محسوس ہوئی اور جیسے تیسے ایک قومی تحریک

اٹھی جسے ابتداءً صرف کچھ نوابوں اور جاگیرداروں کی پشت پناہی حاصل تھی اور جس کا دائرۂ کار ابتدا میں صرف کچھ آراستہ پیراستہ ڈرائنگ روم تھے۔ چنانچہ اسی بنا پر قوم کے وہ مذہبی طبقات اس سے بدظن بھی ہو گئے جو حریت و آزادی کی راہ میں مسلسل قربانیاں دیتے آئے تھے اور جن میں عوامی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی اور اس طرح قوم بے شمار مخلص کارکنوں سے محروم ہو گئی---- آزادی سے متصلاً قبل ایک دو سال کے لئے اس قومی تحریک میں بھی کچھ عوامی رنگ پیدا ہوا تھا، لیکن ابھی اس کے کارکن بالکل خام حالت ہی میں تھے کہ آزادی کی گھڑی آ پہنچی اور اللہ تعالیٰ کے ایک خصوصی عطیہ اور انعام کے طور پر اس قوم کو بھی ایک علیحدہ آزاد مملکت مل گئی۔

پھر آزادی کیا ملی---- گویا دولت و ثروت کا سیلاب آ گیا جو قوم کی دیانت و شرافت اور خلوص و اخلاص کی رہی سہی پونجی کو بھی بہا کر لے گیا۔ اولاً متروکہ دولت پر چھینا جھپٹی ہوئی، پھر تجارت و صنعت کے میدانوں میں دولت کے دریا بہنے لگے، دیکھا دیکھی سرکاری ملازموں نے بھی ہاتھ رنگنے شروع کئے اور دشتِ دولت کے "ہر آبلہ پا سے زبردستی خراج" وصول کرنا شروع کیا---- غرض پوری قوم کے سر پر دولت کا بھوت سوار ہو گیا---- قومی تعمیرِ نو کا کام پہلے ہی نہیں ہوا تھا جبکہ اس کے لئے تمامتر اسباب و عوامل بھی موجود تھے تو اب کیا خاک ہوتا! خلوص، دیانت، ایثار اور قربانی نام کی کوئی شے پہلے کہیں کچھ موجود تھی تو اس دَور میں بالکل ختم ہو گئی۔ ذمہ داری، احساسِ فرض، تندہی اور محنت کالعدم ہو گئے۔ سیاست نے ایک کاروبار کی صورت اختیار کر لی اور روپے پیسے یا زیادہ سے زیادہ کنبہ و برادری کے سوا اس میدان میں کوئی سکہ رواں نہ رہا۔ چنانچہ طبقہ متوسط کے وہ لوگ جو قومی تحریک کے آخری ایام میں ملی و قومی جذبات کے تحت سیاست کے میدان میں آ گئے تھے رفتہ رفتہ مایوس اور بددل ہو کر اسے خیرباد کہہ گئے اور سیاست اور حکومت کا پورا معاملہ صرف بڑے زمینداروں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا مشغلہ بن کر رہ گیا۔ ان میں سے جو کبھی کسی وجہ سے مات کھا جاتا تھا ایسے خاموش اور بیکار ہو کر بیٹھ رہتا تھا جیسے سیاست بازی کے علاوہ ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے لئے کرنے کا کوئی اور کام ہے ہی نہیں---- نتیجتاً سیاسی اختلال پیدا ہوا، جوڑ توڑ اور سازش کا بازار گرم ہوا، حکومتیں آئے دن بدلنے لگیں، بین الاقوامی ساکھ اور قومی و ملکی معیشت کا دیوالہ نکل گیا---- تو پہلا مارشل لاء لگا---- جس نے کچھ عرصہ کے لئے ان امراض کی ظاہری علامتوں کو دبا دیا۔ لیکن جونہی خالص فوجی حکومت سے کسی قدر سیاسی و دستوری حکومت کی طرف رجعت

ہوئی وہی پہلا سماں پھر بندھ گیا اور علاماتِ مرض پھر ظاہر ہو گئیں------ بلکہ حالت پہلے سے بدتر ہو گئی----!!

یہ ہیں وہ حالات جن سے ہم بحیثیتِ قوم دوچار ہیں---- کہ قوم کے سوادِ اعظم کے پیشِ نظر نہ کوئی نظریہ ہے نہ مقصد' نہ قومی و ملی ذمہ داریوں کا احساس ہے نہ شہریت کے فرائض کا---- پھر نہ کوئی مستحکم قومی تنظیم موجود ہے نہ قابلِ اعتماد قومی قیادت۔ سیاسی شعور کی کمی کا یہ حال ہے کہ جو چاہے وقتی طور پر نعرے لگائے اور عارضی طور پر قوم کو اپنے پیچھے لگا لے---اور قیادت کے افلاس کا یہ عالم ہے کہ جس شخص کے بارے میں ذرا یہ معلوم ہو کہ دیانت دار اور مخلص آدمی ہے' قوم بالکل یتیموں کی طرح سرپرستی کے لئے اس کی طرف دیکھنا شروع کر دیتی ہے' چاہے وہ سیاست کے میدان میں بالکل نووارد ہی ہو اور سیدھا کسی سرکاری محکمے کی ملازمت سے فارغ ہو کر چلا آ رہا ہو ----وَقِس علٰی ھٰذا!!

اس میں شک نہیں کہ حال ہی میں بعض گروہ ایسے بھی سامنے آئے ہیں جو کچھ واضح نظریات بھی رکھتے ہیں اور کسی قدر محکم تنظیمی سلسلے بھی' لیکن چونکہ ابھی ان کا حلقہ اثر بہت محدود ہے وہ وسیع تر ملی و قومی تقاضوں کا جواب نہیں بن سکتے۔

> یہ حالات متقاضی ہیں کہ ملتِ اسلامیہ پاکستان کا ہر فرد اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے ان کو ادا کرنے کے لئے سرگرمِ عمل ہو جائے اور ان بنیادی کمزوریوں' کمیوں اور کوتاہیوں کی تلافی کے لئے کوشاں ہو جو عرصۂ دراز سے چلی آ رہی ہیں اور اس طرح دین و مذہب' علم و فکر' تعلیم و تربیت' تطہیرِ اخلاق و عمل' سماجی و معاشرتی اصلاح' قومی و ملی تنظیم غرض ہر میدان میں اصلاح و تعمیر کا عمل تیزی سے شروع ہو جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم بحیثیتِ ملک و ملت اس وقت موت و زیست کی کشمکش سے دوچار ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ قدرت کی جانب سے عطا کردہ مہلت ہماری غفلت میں اضافے کا موجب ہو۔ اور پھر قانونِ خداوندی کا کوئی کوڑا ہم پر اچانک برس پڑے!

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ --- آمین!

باب سوم

"مری تعمیر میں مضمر تھی کچھ صورت خرابی کی!"

جولائی ۱۹۶۹ء

میڈیکل کالج لاہور میں اپنے پانچ سالہ عرصہ تعلیم کے دوران راقم الحروف نے معمارِ پاکستان محمد علی جناح مرحوم کا حسب ذیل فقرہ جو کالج ہال کی دیوار پر نہایت جلی حروف میں لکھا ہوا تھا، بلا مبالغہ سینکڑوں مرتبہ پڑھا ہو گا۔

"GOD HAS GIVEN US A GOLDEN OPPORTUNITY TO SHOW OUR WORTH AS ARCHITECTS OF A NEW NATION (OR STATE?) AND LET IT NOT BE SAID THAT WE DID NOT PROVE EQUAL TO THE TASK!" [1]

پھر کچھ تو اس بنا پر کہ فقرہ بجائے خود نہایت جاندار تھا اور اس کے الفاظ کا در و بست نہایت موزوں تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ پاکستان ابھی نیا نیا بنا تھا اور ہر پاکستانی مسلمان کے دل میں ایک "ولولۂ تازہ" موجزن تھا اور اس جملے میں گویا ہر شخص کو اپنے ہی دل کی صدا سنائی دیتی تھی۔ یہ فقرہ کچھ اس طرح ذہن میں ثبت ہو گیا تھا کہ آج تک من و عن یاد ہے۔

لیکن ----- افسوس ----- کہ آج جبکہ پاکستان کو قائم ہوئے بائیس سال ہونے کو آئے اور خود محمد علی جناح مرحوم کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بیس سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا مملکتِ خداداد پاکستان بزبانِ حال نوحہ خواں ہے کہ اس کے بانی و مؤسّس کا خدشہ صحیح ثابت ہوا اور اس نئی مملکت کو وہ معمار میسر نہ آسکے جو ایک انگریز شاعر کے قول کے مطابق "اس کے ستونوں کو نہایت گہری اور پختہ بنیادوں سے اٹھاتے اور پھر تعمیر کرتے ہوئے اوجِ ثریا تک پہنچا دیتے!" [2] ---- بائیس سال گزر

---

[1] یعنی "(مملکت خداداد پاکستان کی صورت میں) اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک نئی قوم (یا مملکت؟) کے معماروں کی حیثیت سے اپنی اہلیت و صلاحیت کے اظہار کا ایک سنہری موقع عطا فرمایا ہے اور دیکھنا! ایسا ہرگز نہ ہو کہ دنیا یہ کہے کہ ہم اس عظیم کام کے اہل ثابت نہیں ہو سکے!"

[2] THEY BUILD A NATION'S PILLARS DEEP, AND LIFT THEM TO THE SKY!

جانے کے بعد بھی اگر کسی مملکت کا "اساسی نظریہ" تک زیر بحث چلا آ رہا ہو اور دستور سازی ہنوز معرضِ بحث میں ہو بلکہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں کے بارے میں نئی نئی بحثیں اٹھ رہی ہوں اور ردّو قدح اور تکرار و نزاع کی نت نئی صورتیں پیدا ہو رہی ہوں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ساری مادی ترقیوں اور معاشی منصوبہ بندیوں کے باوجود ابھی مملکت کی اصل تعمیر کی ابتدا بھی نہیں ہوئی اور قومی تعمیرِ نو کا کام شروع بھی نہیں ہو سکا۔

پاکستان کی زندگی کے بائیس سال در حقیقت گیارہ گیارہ سالوں کے دو مساوی ادوار پر مشتمل ہیں۔ پہلے گیارہ سالوں (۴۷ء تا ۵۸ء) کے دوران پاکستان کے سیاست دانوں کی نااہلی و ناقابلیت کا تدریجی ظہور ہوا اور اس کے اختتام کے قریب قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور شخصیتیں اس عظیم مملکت کی ذمہ داریوں سے عہدہ بر آ ہونے میں بالکل ناکام ہو چکی ہیں اور ان کے ہاتھوں اب کسی خیر کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی --- اس کے فطری نتیجے کے طور پر ۱۹۵۸ء میں ایک انقلاب آیا جو بظاہر اور ابتداءً تو فوجی تھا لیکن بہت جلد اس نے ایک سابق فوجی کے زیر سربراہی ایک خالص نوکر شاہی کی صورت اختیار کر لی اور اہل سیاست کو میدان سے ہٹا کر مملکت کے دوسرے منظم ادارے یعنی سول سروسز نے ملک کے نظم و نسق کو سنبھال لیا۔ چنانچہ دوسرا دور (۵۸ء تا ۶۹ء) در حقیقت بیوروکریسی کا دور تھا اور اس کے دوران قوم کے اس دوسرے طبقے کی بھی بھرپور آزمائش ہو گئی۔ لیکن افسوس کہ اس دور کے بالکل ابتدا ہی سے ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا کہ قوم کا یہ طبقہ بھی دیانت و امانت اور احساسِ فرض کے ان اوصاف سے بہت حد تک عاری ہے جو اس عظیم ذمہ داری کو کماحقہٗ ادا کرنے کے لئے لازمی ہیں جو اس کے کندھوں پر آ پڑی ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس طبقے کی نااہلیت بھی واضح ہوتی چلی گئی اور ۶۸ء کے اواخر میں بے اطمینانی کا وہ لاوا جو قوم کے مختلف طبقات میں اس طبقے کی دست درازیوں کے باعث کھول رہا تھا اچانک پھٹ پڑا --- اور اس طرح یہ دَور بھی دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔

ان دونوں طبقات کی ناکامی کے بعد --- ملک و ملّت کے پاس ایک ہی منظم ادارہ باقی رہ گیا ہے یعنی فوج، چنانچہ بدرجۂ مجبوری پھر اسی کو آگے بڑھ کر ملک و ملت کی زمام اپنے ہاتھ میں لینی پڑی ہے اور خدا کا شکر ہے کہ شرافت، دیانت، امانت، حبِ وطن، حبِ قوم، ایثار، قربانی، احساسِ فرض اور

تن دہی و جانفشانی کے اوصاف کے اعتبار سے قوم اپنے اس طبقے پر مکمل اعتماد بھی کرتی ہے۔۔۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس ادارے کا اصل فریضہ دفاعِ وطن ہے اور یہ بجائے خود اتنی عظیم ذمہ داری ہے کہ اس پر کوئی مزید بوجھ ڈالنا حد درجہ ناانصافی ہے۔ بین الاقوامی حالات جس رخ پر جا رہے ہیں اس کے پیش نظر مستقبل میں دفاعِ وطن کی ذمہ داری یقیناً پہلے سے بھی کہیں زیادہ بھاری اور بوجھل ہو جائے گی اور ڈیفنس سروسز کے کندھوں پر اگر زیادہ دیر تک ملک کے داخلی نظم و نسق کا بوجھ بھی پڑا رہا تو اس سے دفاعِ وطن کے محاذ کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے اور یہ خطرہ (risk) اتنا بڑا ہے کہ اسے کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف ملک کی سیاسی جماعتوں اور شخصیتوں کی صفوں میں خاصی سرگرمی اور ہلچل کے باوجود تاحال کوئی ایسی صورت سامنے نہیں آ رہی ہے کہ یہ امید کی جا سکے کہ اگر حکومت ان کے حوالے کر دی جائے تو یہ اطمینان بخش طور پر اسے سنبھال سکیں گی اور دوبارہ وہی صورتحال پیدا نہ ہو جائے گی جس کے پیش نظر مارشل لاء کا نفاذ لازمی ہو گیا تھا۔

الغرض ---- نظریاتی اور دستوری بحثوں اور مناقشوں پر مستزاد یہ ہے وہ نازک صورتحال اور عظیم الجھاؤ (dilemma) جس سے مملکتِ خداداد پاکستان اِس وقت دوچار ہے۔

اس صورتحال کے اسباب میں سے تین عوامل تو ہماری گزشتہ نصف صدی کی تاریخ سے متعلق ہیں اور تین پیچیدگیاں وہ ہیں جو قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہوئیں اور مسلسل بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔

تاریخی عوامل کے بارے میں ہم ان صفحات میں مفصل لکھ چکے ہیں اور یہاں ان کے مفصل اعادے کی گنجائش بھی نہیں۔ مختصراً وہ یہ ہیں کہ :

اولاً ---- آج سے تقریباً نصف صدی قبل ملّتِ اسلامیہ ہندو پاک کی قوتیں اور توانائیاں منقسم ہو گئیں اور قومی لائحہ عمل اور پالیسی سے اختلاف کی بنا پر علماء کا وہ طبقہ جو ماضی میں قوم کا اصل رہنما رہا تھا اور جس میں مخلص اور بے لوث عوامی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی اپنے متوسلین سمیت قوم کے سوادِ اعظم سے کٹ کر رہ گیا اور اس طرح قوم اپنی بہترین متاع سے محروم

ہو گئی۔ رہا یہ سوال کہ یہ حادثہ کیسے اور کیوں واقع ہوا' تو یہ ایک علیحدہ مستقل موضوع ہے جس پر گفتگو کی اس وقت گنجائش نہیں۔ (یہ تحریر اب "اسلام اور پاکستان" نامی کتاب میں شامل ہے!)

ثانیاً--- اسلامیانِ ہند کی قومی قیادت قومی تعمیرِ نو اور قوم کی تنظیم و تربیت کے ضمن میں کوئی قابل ذکر کام نہیں کر سکی۔ اب چاہے یہ کہہ لیا جائے کہ اسے اس کا وقت نہیں ملا' چاہے یہ کہ اس نے اس کی جانب توجہ نہیں کی' فرق کوئی واقع نہیں ہوتا۔ اور واقعہ بہرحال یہی ہے کہ قومی تحریک نے بس ایک ہنگامی اور فوری سی ضرورت کو تو ضرور پورا کر دیا لیکن اس نے قوم کو نہ کوئی قومی تنظیم دی نہ قومی قیادت!

ثالثاً--- قیامِ پاکستان سے تقریباً ایک دہائی قبل ایک اور صاحب نے "قومی تحریک" کو مطعون کر کے ایک "بین الاقوامی اور خالص اصولی اسلامی تحریک" کے نام پر قوم کے جسد سے مخلص کارکنوں کا ایک اور ٹکڑا کاٹ لیا اور قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اسی "ٹکڑی" کی مدد سے "اسلامی دستور" اور "انقلابِ قیادت" کے نعروں کے ساتھ قومی قیادت پر ایک زوردار شبخون مارا ---- نتیجتاً قومی قیادت کے رہے سہے مخلص عناصر کو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ایک جانب قومی تنظیم کے اندرونی خلفشار کا سامنا کرنا پڑا اور دوسری طرف ان صاحب کی بیرونی یلغار کا۔ اس دوگونہ کشمکش نے قومی قیادت کے ان مخلص عناصر کو کمزور کرتے کرتے بالآخر بالکل میدان سے خارج (knock out) کر دیا اور میدان بالکلیہ ان لوگوں کے ہاتھ آ گیا جن کا کوئی دین تھا تو خالص اغراض پرستی اور ایمان تھا تو محض مفادات پر اور جو کبھی یونینسٹ ہوتے تھے' کبھی لیگی۔ پھر کبھی ری پبلکن بن جاتے تھے اور کبھی پھر لیگی! ---- ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں پاکستان کی قومی سیاست کے تابوت میں وہ آخری کیل ٹھکی جس کے بعد خالص بیوروکریسی کا دور شروع ہو گیا۔ (ان تینوں امور پر ہماری مفصل تحریریں "اسلام اور پاکستان" نامی کتاب میں شامل ہیں)

ان تین تاریخی عوامل پر مستزاد ہیں وہ تین پیچیدگیاں جو قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہو گئی تھیں اور گویا پاکستان کی تعمیر ہی میں مضمر ہیں اور جن کا الجھاؤ روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے---- آئندہ ہم ان کے بارے میں قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین پیچیدگی خالص جغرافیائی ہے یعنی یہ کہ مملکتِ خداداد پاکستان دو ایسے علیحدہ اور دُور دراز خطوں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلے پر واقع ہوئے ہیں اور جن کے مابین ایک ایسی مملکت حائل ہے جو حالتِ جنگ ہی میں نہیں عین حالتِ امن میں بھی ایک بالقوہ دشمن (Potential Enemy) کی حیثیت رکھتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یوں تو اگرچہ پاکستان کا وجود ہر اعتبار سے ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن خاص اس اعتبار ہی سے تو یہ تاریخِ عالم کا ایک نہایت ہی انوکھا اور محیر العقول تجربہ ہے۔ جس کی شاید ہی کوئی دوسری نظیر کبھی موجود رہی ہو۔

یہ جغرافیائی پیچیدگی بجائے خود بھی کچھ کم اہم اور الجھی ہوئی نہ تھی، لیکن دو مزید عوامل نے اس کے الجھاؤ کو دوگونہ کر دیا ہے ---- یعنی ایک اس حقیقت نے کہ تہذیب، تمدن، زبان، لباس، طرزِ بود و باش اور جذباتی و ذہنی ساخت غرض ایک مذہب کے سوا ہر اعتبار سے ان دو خطوں کے رہنے والے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور اگر دین و مذہب کے سوال کو خارج از بحث کر دیا جائے تو دنیا کے مروّجہ معیارات میں سے کسی معیار کے اعتبار سے بھی انہیں ایک قوم قرار نہیں دیا جا سکتا ---- اور دوسرے اس واقعے نے کہ ان دو خطوں میں سے جو خطہ، رقبہ، محلِ وقوع، دفاع اور تعمیر و ترقی کے امکانات، الغرض تمام اعتبارات سے اہم تر ہے وہ بلحاظِ آبادی کم تر ہے اور دوسرا خطہ جو نہ صرف یہ کہ ان تمام اہم امور کے اعتبار سے بہرحال ثانوی حیثیت رکھتا ہے {۲}، بلکہ ایک نہایت جاندار، فعال، سرمایہ دار اور تعلیم یافتہ غرض ہر اعتبار سے نہایت مؤثر لیکن پاکستان کے اساسی نظریئے کی دشمن اور اس کے عین وجود سے بغض و عداوت رکھنے والی اقلیت کی اضافی پیچیدگی بھی لئے ہوئے ہے، تعدادِ نفوسِ انسانی کے لحاظ سے دوسرے خطے سے برتر ہے ---- ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دو اضافی عوامل کی بنا پر اس خالص جغرافیائی اشکال نے ایک نہایت پیچیدہ مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہے

{۲} ممکن ہے ہماری یہ عریاں حقیقت نگاری بعض لوگوں کو ناگوار معلوم ہو اور واقعہ یہ ہے کہ کوئی سیاسی کارکن اس حقیقت کے اظہار کی جرأت نہیں کرے گا۔ تاہم ہمارے نزدیک واقعہ یہی ہے اور اسے ذہنی طور پر قبول کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

> اور یہ اسی پیچیدگی اور اشکال کا نتیجہ ہے کہ بائیس سال کی طویل مدت میں بھی پاکستان کا کوئی دستور نہیں بن سکا اور دستور سازی کے میدان میں نہ صرف یہ کہ ہنوز روزِ اول کا معاملہ ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دُور دُور تک امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی اور الجھاؤ روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے!!

اس اشکال اور الجھاؤ کا مستقل حل تو ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ دینی جذبات اور ملی احساسات کو مسلسل اجاگر کیا جاتا رہے اور اس جذبہ کے دوام اور تسلسل کا مستقل اور پائیدار بندوبست کیا جائے جو ایک دوسرے سے اتنے بعید اور باہم اس قدر مختلف خطوں کے ایک مملکت میں شامل ہونے کا سبب بنا تھا۔ تاہم فوری طور پر بعض دوسری چیزیں بھی پیشِ نظر رہنی ضروری ہیں۔

ایک یہ کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اس "سنجوگ" کا برقرار رہنا مشرقی پاکستان کے عوام کی آزاد مرضی ہی پر منحصر ہے اور اسے کسی طرح بھی ان پر ٹھونسا نہیں جا سکتا۔ بلکہ اس معاملے میں جبر و تشدد کا ردِّ عمل نہایت خوفناک ہو سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس "آزاد مرضی" کا انحصار بھی جتنا کچھ دینی جذبات اور ملی احساسات پر ہے اتنا ہی اس امر پر بھی ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ یہ محسوس کریں کہ ہمارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو رہی بلکہ مثبت طور پر انہیں یہ احساس بھی ہو کہ خود ان کا مفاد مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے ہی سے وابستہ ہے اور مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں ایک دوسرے سے پیوستہ رہ کر ہی دنیا میں ایک باعزت اور باوقار آزاد مملکت کی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ اگر خدانخواستہ کبھی "علیحدگی" کی صورت پیدا ہوئی تو مغربی پاکستان کے لئے تو پھر بھی امکانِ غالب موجود ہے کہ وہ اپنی آزاد اور باوقار حیثیت کو برقرار رکھ سکے گا' لیکن مشرقی پاکستان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوگا کہ کسی دوسری وسیع تر قومیت میں ضم اور کسی دوسری بڑی مملکت میں جذب ہو کر رہ جائے۔

ان دو امور کی روشنی میں جائزہ لیا جانا چاہئے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی مرضی دراصل ہے کیا؟---اگر وہ واقعتاً مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو کر ایک آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرنے کے خواہش مند ہیں تو ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کی اس خواہش کے آڑے نہیں آ سکتی۔ بین الانسانی علائق میں سب سے زیادہ مقدس رشتہ میاں اور بیوی کا ہوتا ہے لیکن اس میں بھی دینِ

فطرت نے علیحدگی کی ایک سبیل رکھ دی ہے اور صاف ہدایت کی ہے اگرچہ طلاق، حلال چیزوں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے تاہم "معلق" رکھنے سے بہتر یہی ہے کہ علیحدگی اختیار کر لی جائے ---- بالکل اسی طرح اگر ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی واقعتاً یہ محسوس کرتے ہوں کہ مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے میں انہیں کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے تو ان کی بے اطمینانی کے سبب سے پورے ملک کی سیاسی و دستوری زندگی کو مسلسل "معطل" رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ ان کی مرضی کو بروئے کار آنے کا موقع دے دیا جائے۔

ہم نے اوپر بھی عرض کیا تھا ---- اور اب مزید وضاحت سے کہے دیتے ہیں کہ مشرقی و مغربی پاکستان کے مابین "مساوات" کا مفہوم اگر یہ ہے کہ دارالحکومت ایک مغربی پاکستان میں ہو اور دوسرا مشرقی پاکستان میں اور مرکزی حکومت چھ ماہ وہاں رہے اور چھ ماہ یہاں، اور دفاعی اخراجات میں بھی لازماً کامل مساوات برتی جائے تو یہ خالص احمقانہ تصور ہے۔ ایسی مساوات خاندان کے مختصر سے ادارے میں بھی نہیں چل سکتی، کجا یہ کہ ایک عظیم مملکت جو طرح طرح کی پیچیدگیوں سے دوچار ہو، اس کے انتظام و انصرام میں برتی جا سکے۔ اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس سے کہیں بہتر یہ ہے کہ دونوں خطے آزاد ہو کر اپنے اپنے بقاء و استحکام اور تعمیر و ترقی کی فکر کریں ----!!

لیکن ہمیں یقین ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی خواہش ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ مغربی پاکستان سے علیحدہ ہوں۔ اور اگرچہ ماضی قریب میں ان پر یہ "بہتان" کثرت سے لگایا گیا ہے کہ ان میں "علیحدگی پسندی" کا رجحان موجود ہے ہم یہ باور نہیں کر سکتے کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان حقائق و واقعات اور موجود الوقت ظروف و احوال سے اتنے بے خبر ہو سکتے ہیں کہ ان خطرات کا اندازہ نہ کر سکیں جو ایسی کسی تجویز میں لازماً مضمر ہیں ---- ہمارا اندازہ یہ ہے کہ ان میں زیادہ سے زیادہ بس "صوبائی خود اختیاری" کے حصول کی خواہش ہے اور وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ صوبائی معاملات میں انہیں زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو اور یہ ہمارے نزدیک ان کا ایک ایسا حق ہے جس سے کسی بھی معقول انسان کو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اور مرکزی حکومت کے مؤثر طور پر اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جو امور ضروری ہیں انہیں مرکز کی تحویل میں دینے کے بعد بقیہ تمام معاملات میں مشرقی پاکستان کو کامل صوبائی خود اختیاری لازماً ملنی چاہئے۔

انہی متذکرہ بالا دو امور کی روشنی میں دستور کے مسئلے پر بھی ایک بار حتمی طور پر فیصلہ کر لینے

کی شدید ضرورت ہے اور تمام مصلحتوں و اقتضاءات کا مردانہ وار مواجہہ کر کے اس مسئلے کو ایک بار قطعی طور پر طے کر لینا لازمی ہے۔ اور اگرچہ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جن کے نزدیک کسی مملکت کے انتظام و انصرام میں اصل فیصلہ کن عامل کی حیثیت دیانت و امانت کو حاصل ہے نہ کہ قواعد و ضوابط اور تدابیرِ تحدید و توازن (CHECKS AND BALANCES) کے اس بے جان ڈھانچے کو جسے "دستور" کہا جاتا ہے تاہم ہمارے یہاں جو خلاء اس میدان میں چلا آ رہا ہے اسے ایک بار جرأت و ہمت کے ساتھ عوام کی آزادانہ رائے کے مطابق پر کر لینا ہی بہتر ہے!

دستور کے مسئلے پر ہمارے یہاں اس وقت بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں۔ بہت سے لوگ ۱۹۵۶ء کے دستور کی بحالی کے خواہاں ہیں' اگرچہ وہ ساتھ ہی یہ تصریح بھی کر رہے ہیں کہ اس میں بنیادی ترمیموں کی ضرورت ہے اور اگرچہ خان قیوم خان نے ایک علیحدہ آواز بلند کی ہے یعنی یہ کہ فی الحال ایک عبوری دستور نافذ کر دیا جائے' لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "دائیں بازو" نے اپنے حلقہ اثر کی تمام جماعتوں اور شخصیتوں کو اس معاملے میں تقریباً متفق کر لیا ہے (جس کی تازہ ترین مثال شیخ مجیب الرحمٰن کا بھی ۱۹۵۶ء کے دستور کی بحالی سے متفق ہو جانا ہے) دوسری طرف ایک مطالبہ یہ ہے کہ بالغ حقِ رائے دہی کی بنیاد پر ایک دستور ساز اسمبلی کا انتخاب عمل میں آئے اور اسے ایک معین مدت (مثلاً چھ ماہ) کے اندر اندر دستور سازی کا پابند کیا جائے ----- بعد میں یہی اسمبلی پارلیمنٹ کی حیثیت سے کام کر سکتی ہے۔

ہمارے نزدیک یہی دوسری رائے منطق کے ہر اصول کے مطابق اقرب الی الصواب ہے اور اگرچہ ہمیں' جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا' ۱۹۵۶ء کے دستور سے بھی کوئی کد نہیں' تاہم ہمارے نزدیک حقیقت یہی ہے کہ ہمارے یہاں اب تک کی کسی دستوری دستاویز کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی پشت پر عوام کی مرضی اور رائے موجود ہے۔ اور ان میں سے کسی کو بھی آئندہ انتخابات کی بنیاد بنایا گیا' تو یہ اعتراض جائز طور پر موجود رہے گا کہ ایک غیر نمائندہ دستور کے تحت منعقد شدہ انتخابات کے نتائج بھی قابلِ اعتماد نہیں قرار دیئے جا سکتے ----- ہمارے نزدیک صدرِ مملکت محمد یحییٰ خاں کی وہ رائے نہایت صحیح ہے جو انہوں نے خان قیوم خاں کی متذکرہ بالا تجویز کے جواب میں ظاہر کی ہے' یعنی یہ کہ موجودہ مارشل لاء خود ایک "عبوری دستور" کی ضرورت پوری کر رہا ہے ----- اب اس معاملے میں جو اقدام بھی ہو وہ عارضی اور عبوری اور پیشگی طور پر واجب

الغرض کم نوعیت کا نہیں ہونا چاہئے بلکہ ضرورت ہے کہ اس مسئلے کو ایک بار قطعی طور پر طے کر لیا جائے ----- اور ظاہر ہے کہ اس کی کوئی صورت اس مؤخر الذکر تجویز کے سوا ممکن نہیں۔

دوسری بڑی پیچیدگی جو گویا پاکستان کی تعمیر ہی میں مضمر ہے اور روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے یہ ہے کہ اپنے اول یوم پیدائش ہی سے پاکستان کو ایک ایسی مملکت کی عداوت و دشمنی کا سامنا ہے جو ایک طرف تو نہ صرف یہ کہ اس کے بالکل قریبی ہمسائے کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ پاکستان کے دونوں خطوں کے مابین حائل ہونے کی بنا پر گویا پاکستان کے چھوٹے سے جسم میں ایک بہت بڑے خنجر کی طرح پیوست ہے اور دوسری طرف اپنی وسعت' قوت' آبادی اور وسائل تمام اعتبارات سے پاکستان سے کم از کم چوگنی ہے [۳]

بھارت کی یہ مستقل عداوت نہ صرف یہ کہ ہمارے محدود وسائل و ذرائع پر ایک بہت بڑے بوجھ کا سبب بنی رہی ہے جس کی بنا پر اس نوزائیدہ مملکت کی تعمیرو ترقی کے جملہ امکانات بروئے کار نہ آ سکے ---- بلکہ بدقسمتی سے اسی ایک مرکز کے گرد ہماری پوری خارجہ حکمتِ عملی کو ہمیشہ گھومنا پڑا ہے۔

اس اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو گزشتہ بائیس سالوں کے دوران دو دور گزر چکے ہیں اور اب تیسرے دور کا آغاز ہو رہا ہے ---- پہلا دور آرام و آسائش بلکہ عیش اور گلچھروں کا دور تھا۔ دوسرے میں ہمیں نسبتاً مشکل تر حالات کا سامنا کرنا پڑا اور اب جو دور شروع ہو رہا ہے آثار و قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ہمیں اپنی آزاد اور باوقار حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے نہایت شدید جدوجہد اور محنت و مشقت کا سامنا کرنا ہوگا۔

---

[۳] اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بھارت اور اسرائیل میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔ دونوں دنیا کے نقشے پر اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے بالکل خنجروں سے مشابہ ہیں۔ ایک بلادِ عرب کے سینے میں پیوست ہے اور دوسرا اسلامیانِ پاکستان کے جسد میں ---- بلادِ عرب اگر وسعت میں زیادہ ہیں تو اسلامیانِ پاکستان تعداد میں مسلمانانِ عرب کی مجموعی تعداد سے بھی کئی گنا زیادہ ہیں۔ اور اسرائیل بھارت کے مقابلے میں چاہے بہت چھوٹا ہے لیکن مغربی استعمار کی پشت پناہی کی بنا پر بھارت سے کسی طرح بھی کمزور نہیں!

پہلے دور میں دنیا کی بڑی طاقتیں دو دھڑوں میں منقسم تھیں۔ ایک طرف روس اور چین پر مشتمل کمیونسٹ بلاک تھا اور دوسری طرف اینگلو امریکی اتحاد۔ اور ان کے مابین شدید کش مکش اور مسلسل جنگ جاری تھی جو کبھی گرم ہو جاتی تھی کبھی سرد۔ بھارت نے ایک نئی طاقت کی حیثیت سے ان کے مابین "ثالث" کا کردار اختیار کرنے کی کوشش کی اور اپنی نام نہاد آزاد اور غیر جانب دار خارجہ پالیسی کے نام پر خصوصاً مغربی بلاک کو پریشان کرنا شروع کیا۔ اس صورت حال کا عروج تھا وہ وقت جب ہندوستان میں "ہندی چینی بھائی بھائی" کے نعرے لگ رہے تھے!! اس وقت مغربی بلاک کو شدید ضرورت تھی کہ اس علاقے میں کوئی ملک ایسا ہو جہاں اس کے قدم بھی کسی قدر جم سکیں۔ ان کی اس ضرورت کو اپنی خارجہ حکمت عملی میں فِٹ کر کے پاکستان نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ یہ وہ دور تھا جب ہم پر چچا سام نہایت مہربان تھے اور ہمارے ہر طرح کے ناز نخرے برداشت کرنے کو تیار تھے ----!! اور دوسری طرف ہم بھی ان کے کامل نیاز مند تھے اور ان کے اشارے پر کبھی سیٹو میں حاضری دیتے تھے کبھی سنٹو میں ----!!

اس کے بعد حالات بدلے۔ ایک طرف چین اور روس کے مابین اختلافات کی خلیج نمودار ہوئی، دوسری طرف روس کا رویّہ مغربی اتحاد کے ساتھ بدلنا شروع ہوا، تیسری طرف بھارت کو "عقل" آئی اور اس نے اندر ہی اندر چچا سام سے تعلقات استوار کر لئے ---- اور چوتھی طرف روس، مغربی اتحاد اور بھارت تینوں نے چین کو اپنے مشترک دشمن کی حیثیت دینی شروع کر دی ---- نتیجتاً بین الاقوامی تعلقات اور خارجہ حکمت عملی کے میدان میں ہم نے جس زمین پر تعمیر کی تھی وہ پیروں تلے سے کھسکنی شروع ہو گئی ---- اور بھارت کو امریکہ اور روس دونوں کے منظورِ نظر کی حیثیت حاصل ہو گئی ---- یہ ہمارے لئے مشکلات کے دور کا آغاز تھا۔ اس دور کے بالکل ابتدا میں ایک کوشش امریکہ نے یہ کی بھی کہ کسی طرح بھارت اور پاکستان کے مابین ایسی مکمل "مفاہمت" کرا دی جائے کہ یہ دونوں سوکنوں کی بجائے بہنوں کی صورت اختیار کر لیں اور دونوں ہمارے اشاروں پر یکساں حرکت کر سکیں۔ اسی غرض سے اس نے پنجاب کے دریاؤں کے پانی کے مسئلے کو جیسے تیسے حل کرانے کا ٹھیکہ مول لیا اور بعض دوسرے معاملات میں بھی صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کوششوں کا عروج (CLIMAX) تھی وہ تجویز جو امریکہ نے سابق صدر ایوب کے ذریعے پیش کرائی کہ پاکستان اور ہندوستان کا دفاع مشترک ہو جائے ---- اس تجویز

پر پنڈت نہرو کے احمقانہ ردِ عمل سے اس معاملے میں "ANTI-CLIMAX" کے دور کا آغاز ہوا۔ اور پاکستان میں آزاد خارجہ حکمت عملی کا دور شروع ہو گیا۔

اب ظاہر ہے کہ کسی کے گھڑے کی مچھلی بنے رہنے میں جو آسانی اور عافیت ہے وہ اپنی آزاد رائے اور آزادانہ حیثیت و تشخص کو برقرار رکھنے اور دوسروں سے منوانے (یعنی ASSERT کرنے) میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ آزادی بہرحال جدوجہد اور محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کا مطالبہ کرتی ہے ---- چنانچہ اس دور میں ہمیں لامحالہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں۔

اور اب جس تیسرے دور کا آغاز ہو رہا ہے وہ اسی صورت حال کی گویا ایک منطقی انتہا کا دور ہے۔ اِس وقت جن حالات سے ہم دوچار ہیں وہ یہ ہیں کہ ایک طرف صاحب برطانیہ بہادر تو بالکل ہی اپنی بساط مشرق سے لپیٹ گئے ہیں، خود چچا سام بھی پہلے کوریا اور پھر ویٹ نام میں اس قدر مار کھا چکے ہیں کہ اب اس علاقے سے کسی قدر باعزت طور پر کھسک جانے ہی میں عافیت محسوس کر رہے ہیں۔ دوسری طرف روس نے امریکہ کی خاموش رضا کے تحت اس علاقے میں کچھ زیادہ ہی پاؤں پسارنے شروع کر دیئے ہیں اور تیسرے، جنوب مشرقی ایشیا میں ان دونوں کا اصل اتحادی بھارت اور اصل دشمن چین بن چکا ہے ---- اور اب امریکہ، روس اور بھارت تینوں مل کر زور لگا رہے ہیں کہ ہم ان کے تابع مہمل بن کر ان کی مرضی کے مطابق چین کی مخالفت میں ان کا پسندیدہ کردار ادا کریں اور اس علاقے میں بھارت کے مقابلے میں گھٹیا درجے کی شہریت (SECOND RATE CITIZEN SHIP) قبول کر لیں ---- اس طرح یہ دور ہماری قومی غیرت اور حمیت کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج بن کر شروع ہو رہا ہے اور اس کے لئے ہم پر ہر ممکن دباؤ کو استعمال کرنے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف بھارت نے ایران اور عرب ممالک میں اپنے تجارتی و صنعتی اثر و رسوخ کے جال کو تیزی کے ساتھ بچھانا شروع کر دیا ہے اور یہ امر ہمیں ہوشیار کرنے کے لئے کافی ہونا چاہئے کہ ان ممالک کی جانب سے بھارت کے ان عزائم کو خوش آمدید کہا جا رہا ہے۔ دوسری طرف بھارت نے افغانستان سے اپنے پرانے معاشقے کی از سرِ نو تازہ جوش و خروش کے ساتھ تجدید کرنی شروع کر دی ہے اور ایک فراخہ بند سے جو خطرہ مشرقی پاکستان کی زرعی معیشت کو تھا، اس کا حل بھی ابھی نہیں ہوا تھا کہ افغانستان سے آنے والے دریاؤں کو خشک کر کے مغربی

پاکستان کی معیشت پر خطرناک وار کرنے کی سکیم پر سوچ بچار شروع ہو گیا ہے۔ تیسری طرف خاص اس موقع پر سرحدی گاندھی سے اندرا گاندھی کی ملاقات' انہیں نہرو پرائز وصول کرنے کے لئے بھارت آنے کی دعوت اور ان کی خدمت میں اسّی لاکھ روپے کی رقم بطورِ نذرانہ پیش کرنے کی سکیم سے بھارت کے عزائم واضح طور پر سامنے آرہے ہیں----اور بھارت کی ان ساری کوششوں اور تدبیروں پر مستزاد ہیں روس کی تجاویز جو کبھی کوسیگن صاحب کے پیش کردہ معاشی تعاون کے منصوبے کی صورت میں سامنے آتی ہیں اور کبھی برزنیف صاحب کی پیش کردہ "اجتماعی سلامتی" کی سکیم کی شکل اختیار کرتی ہیں----اور ان سب پر ثبت ہے چچا سام کی منظوری و رضامندی کی مُہر جو ایسی تمام تجاویز پر خاموشی یا "محتاط ردِّ عمل" کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

یہ صورت حال ہر غیور اور باحمیت پاکستانی سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ کمرِ ہمت کس کر حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے مستعد ہو جائے۔ اس مشکل کے وقت میں ہماری اصل قوتِ مدافعت و مزاحمت ایک آزاد اور باعزت و باوقار ملک و ملت کی حیثیت سے زندہ رہنے کے ایک شدید داعیے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور یہ داعیہ محض "زندگی برائے زندگی" کے نظریے سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس نظریے کے تحت تو انسان بسا اوقات ذلت اور بے عزتی کی حالت کو بھی گوارا کر لیتا ہے۔ یہ داعیہ کسی مقصدِ زندگی سے آشنا ہو کر ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ پاکستان کے اندر اگر کسی مقصد کا عشق پیدا ہو جائے اور یہ انسانیت کے لئے کسی نظریے اور پیغام کی علمبردار بن کر اٹھ سکے تبھی اس میں وہ ہمت' وہ جرأت' وہ ایثار' وہ قربانی اور محنت و مشقت کا وہ جذبہ بیدار ہو سکتا ہے جو ان حالات میں اس کے بقا و تحفظ ہی نہیں ترقی و استحکام اور عزت و وجاہت کا ضامن بھی بن سکتا ہے----اب ظاہر ہے کہ یہ نظریہ وہی ہو سکتا ہے جس کے نام پر پاکستان قائم ہوا تھا اور وہ پیغام اسلام کے پیغام کے سوا اور کوئی نہیں----گویا جس طرح پہلی پیچیدگی کا اصل اور مستقل حل دینی جذبات اور ملی احساسات کو اجاگر کرنے میں ہے' اسی طرح اس دوسری پیچیدگی اور اشکال کا اصل حل اور اس سے پیدا شدہ چیلنج کا اصل جواب بھی یہی ہے کہ ہم بحیثیتِ قوم ایمان کے داعی اور اسلام کے علمبردار بن کر کھڑے ہوں اور اس مقصد کے ساتھ ایک ایسا والہانہ عشق ہمارے اندر پیدا ہو جائے کہ اس کے لئے بڑی سے بڑی محنت اور کٹھن سے کٹھن مشقت ہمیں آسان معلوم ہونے لگے اور بڑے سے بڑا ایثار اور اونچی سے اونچی قربانی حقیر محسوس ہو----!!

اس پیچیدہ صورت حال کا ایک ضمنی تقاضا بھی ہے اور وہ یہ کہ ہماری خارجہ حکمت عملی کو اب دورِ ثانی کے مقابلے میں بھی زیادہ "آزاد" ہونا چاہئے اور اندریں حالات ہمیں عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ اپنے تعلقات پر پہلے سے بھی زیادہ زور دینا چاہئے۔ چنانچہ خدا کا شکر ہے کہ اس موقع پر ایک طرف "دائیں بازو" کی چوٹی کی قیادت (TOP BRASS) نے بھی اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں چین کی مخالفت میں بڑی طاقتوں (SUPER POWERS) کا آلۂ کار ہرگز نہیں بننا چاہئے اور دوسری طرف وزیر اعظم روس کے دہلی سے واپسی پر "سرِ راہے" ورودِ پاکستان اور اب صدرِ امریکہ کی خلائی جہاز کی واپسی کے منظر کو دیکھنے کے بعد ٹہلتے ٹہلاتے پاکستان کو بھی نوازتے جانے کے پروگرام سے یہ احساس شدت کے ساتھ ابھرا ہے کہ عوامی جمہوریہ چین کے وزیر اعظم چو این لائی کو بھی جلد پاکستان آنا چاہئے (جس کا سب سے بڑا مظہر آج ۵/ جولائی کے اخبارات میں شائع شدہ صدر مملکت محمد یحییٰ خاں کا یہ بیان ہے کہ چو این لائی عنقریب پاکستان کا دورہ کریں گے)

نہ صرف یہ ' بلکہ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ مستقبل قریب میں پاکستان کو روس ' امریکہ اور بھارت کے اتحادِ ثلاثہ کے احمقانہ دباؤ کے تحت کچھ زیادہ ہی تیزی کے ساتھ چین کی جانب جھکنا ہوگا اور یہ حالات کا ایک ایسا بہاؤ ہوگا' جس کے رخ کو روکنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں رہے گا----!!

بابِ چہارم

"حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں!"

اکتوبر ۱۹۶۹ء

سالِ رواں کے اس رُبع کے دوران میں جو واقعات عالمِ اسلامی میں رونما ہوئے اور جن حوادث کا سامنا امتِ مسلمہ کو رہا ان کی یاد سے کلیجہ شق ہوتا ہے' اتنے گوناگوں مصائب اور ایسے پے بہ پے حوادث کہ انسان حیران و پریشان ہو کر رہ جائے کہ ع

"حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں!"

ایک طرف مسجدِ اقصیٰ کو نذرِ آتش کیا گیا اور عالمِ اسلامی کے روحانی مراکز میں سے تیسرا عظیم ترین مرکز' حرمِ ثالث اور ان تین مقدس ترین مقامات میں سے ثالثِ ثلاثہ جن کی زیارت کی نیت سے شدِّ رحال کی آنحضور ﷺ نے اجازت دی ہے---- آگ کے شعلوں میں لپٹ کر پورے عالمِ اسلام کے لئے مجسم دعوتِ آہ و فغاں بن گیا۔

"رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونناب بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار!!"

پورا عالمِ اسلام بے قرار ہو گیا' قلوب مضطرب ہو گئے' روحیں بے چین ہو گئیں' غم و اندوہ اور غیظ و غضب کی ایک لہر پوری ملّتِ اسلامی کے جسد میں دوڑ گئی---- لیکن آخرش "قہرِ درویش بر جانِ درویش!" کے سوا کچھ نہ ہو سکا۔ پوری ملّتِ اسلامی بس تلملا کر رہ گئی۔ اس لئے کہ ع

"ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!"

جس طرح بسا اوقات کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے ہی میں عافیت دیکھتا ہے اسی طرح جی چاہتا ہے کہ اس صورتِ حال کے عواقب سے بھی آنکھیں بند کر لی جائیں اور قطعاً نہ سوچا جائے کہ یہ سلسلہ کہاں جا کر رکے گا!!---- بصورتِ دیگر سخت مایوسی کا سامنا ہوتا ہے' اعصاب جواب دینے لگتے ہیں اور نبضیں چھوٹتی محسوس ہوتی ہیں---- دشمن ہمیں ٹٹول رہا ہے اور رفتہ رفتہ

ہماری کمزوریوں سے آگاہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ صورت حال یک دم تبدیل ہو گئی ہے ---- اور دفعۃً عالمِ ارضی کی پوری نام نہاد ملّتِ اسلامی کا بھرم کھل گیا ہے ---- ابھی تک معاملہ صرف فلسطینی عربوں کے حقوق کا تھا' جسے خود عربوں نے سخت ناعاقبت اندیشی سے کام لے کر اپنا ایک داخلی سا مسئلہ بنا رکھا تھا' لیکن اب معاملہ پوری ملّتِ اسلامیہ کی دینی غیرت و حمیت کا ہے۔ اس ذلت کو اگر یہ پوری امت اس طرح گوارا کر گئی تو دشمن حرمِ نبوی ﷺ کی حرمت پر وار کرنے سے کب باز رہے گا؟ ---- آج کے دور میں جبکہ لاکھوں میل کے فاصلے کی بھی کوئی وقعت نہیں رہی' اسرائیل کی موجودہ سرحدوں سے مسجدِ نبویؐ کا فاصلہ کل چھ سو میل ---- اور مسجدِ حرام کا فاصلہ قریباً آٹھ سو میل رہ گیا ہے ---- اور کم از کم حرمِ نبویؐ پر اپنے دعوائے استحقاق کو تو اسرائیل نے کبھی مخفی بھی نہیں رکھا ---- ادھر قرآن حکیم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمان امتوں کو ان کی بدعملی و بدکرداری کی سزا' ان کے مقاماتِ مقدسہ کی اغیار کے ہاتھوں بے حرمتی کی صورت میں بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ ماضی کی امتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کو یہ سزا دو بار دی گئی :

فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا ○

(سورۂ بنی اسرائیل' آیت ۷)

"پھر جب آیا دوسری وعید کا وقت (تو مسلط کیا تم پر لوگوں کو) تاکہ بگاڑ دیں وہ تمہارا حلیہ اور داخل ہوں مسجد میں اسی طرح جس طرح داخل ہوئے تھے اس میں پہلی بار اور تباہ کر دیں ہر چیز کو جس پر بھی بس چل جائے!"

تو کیا اب ہماری سیہ کاریوں کی کالک حرمین شریفین کی مقدس پیشانیوں پر بھی مل جائے گی!! ---- عیاذًا باللّٰہ! عیاذًا باللّٰہ!!

دوسری طرف بھارت میں مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی گئی ---- اور تاحال یہ شغل جاری ہے!! یوں تو ہندی مسلمانوں پر ظلم و تشدّد اور تعدّی و عدوان بھارت کی ہندو جاتی کا روز کا معمول ہے' لیکن احمد آباد اور اس کے گرد و نواح میں تو ان دنوں بالکل ۱۹۴۷ء کی خونچکاں داستان دہرائی گئی اور بعینہٖ وہی نقشہ سامنے آگیا کہ ؏ ---- "ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو!"

اللہ کی شان ہے کہ جو شہر خود احمدِ مجتبیٰ ﷺ کے نامِ نامی سے معنون ہو اس میں ان ؐ ہی کے دین کے نام لیوا اس طرح بھیڑ بکریوں کے مانند ذبح ہو رہے ہیں اور پورا عالمِ اسلام ہے کہ "تک تک دیدم دم نہ کشیدم" کا نقشہ پیش کر رہا ہے --- در آنحالیکہ کتابِ الٰہی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ۝ (سورۃ النساء : ۷۵)

"اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم جنگ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں اور ان مغلوب و مقہور مردوں، عورتوں اور بچوں (کی دادرسی) کے لئے جو کہتے ہیں کہ : اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے لوگ ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی جانب سے کوئی حمایتی اور مددگار اٹھا!"

اس معاملے میں یوں تو اس عالمِ ارضی کی پوری اُمتِ مسلمہ کی ملی غیرت و حمیت کا مرثیہ کہنا چاہئے ---- خصوصاً اس لئے کہ یہ ایک ناقابلِ انکار واقعہ ہے کہ برصغیر ہند و پاک کی ملتِ اسلامی نے ہمیشہ پورے عالمِ اسلامی کے رنج و غم کو اپنا دکھ درد شمار کیا اور تاریخ شاہد ہے کہ ہمیشہ صورت حال یہ رہی کہ چاہے کبھی بلقان و ترکی پر برا وقت آیا ہو، چاہے طرابلس و شام پر، ہندوستانی مسلمان بالکل اس طرح تڑپ اٹھتا رہا جیسے خود اس کے پہلو میں خنجر بھونکا گیا ہو۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!!

لیکن ادھر یہ عالم ہے کہ بھارت میں "فِي كُلِّ عَامٍ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ" مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے، لیکن عالمِ اسلام ---- اور بات کہنے کی نہیں لیکن ؎ "خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے!" کے مصداق کہنی پڑتی ہے کہ خصوصاً عالمِ عرب کا حال یہ ہے کہ ان کی ہر حکومت بھارت کی نیاز مندی میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے اور اسے سر آنکھوں پر بٹھانے کے لئے ایک دوسرے سے زیادہ بے تاب نظر آتی ہے ---- ماضی میں پنڈت نہرو کو عین مملکتِ عربیہ سعودیہ میں حرمین شریفین کی خادم و محافظ حکومت نے "رسول السلام" کے خطاب سے نوازا ----

اور اس موقع پر تو حد ہو گئی کہ عین اس وقت جبکہ بھارت کے ایک صوبائی دار الحکومت میں مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا اور گھاس پھونس کی طرح جلایا جا رہا تھا' زعمائے عرب' رباط کی مسلم سربراہ کانفرنس میں بھارت کی شرکت پر زور دے رہے تھے اور اس معاملے میں ان کی صفوں میں ایک غیر معمولی اتحاد و اتفاق نظر آ رہا تھا' حتیٰ کہ اس حمام میں "رجعت پسند شاہ پرست" اور نام نہاد "ترقی پسند" سب یکساں ننگے تھے۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے!

عالمِ اسلام اور خصوصاً عالمِ عرب سے یہ گلہ شکوہ قدرے دور کی بات سہی' لیکن ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے لئے تو یہ واقعتاً ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ وہ جن کی قربانیوں کے طفیل آج نہ صرف یہ کہ آزادی کے سانس لے رہی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ گلچھرے اڑا رہی ہے ان پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹتے دیکھ کر بھی یہ ٹس سے مس نہیں ہوتی ---- خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں اور مکافاتِ عمل صرف عالمِ آخرت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اقوام و ملل کے اجتماعی جرائم کا حساب تو اکثر و بیشتر یہیں چکا دیا جاتا ہے ---- ہمارے بعض اگر وہی رہے کہ جواب ہیں اور ہم اسی طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے خون کی سرخی کو شرابِ ارغوانی اور غازۂ چہرۂ نسوانی میں تبدیل کرتے رہے تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہو گا ----!!

کم از کم ایک بات بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم ہندی مسلمانوں پر ظلم و ستم کی اس پیہم یلغار کو اسی طرح خاموش تماشائی بنے دیکھتے رہے اور ہماری رگِ حمیت صرف اسی قدر جوش کھاتی رہی کہ ہر بار ظالموں کی اس منڈلی کی دہائی دی جاتی رہی جسے اقوامِ متحدہ کہا جاتا ہے تو رفتہ رفتہ ہماری حمیتِ قومی اور غیرتِ ملی کا جنازہ بالکل نکل جائے گا اور وہ وقت زیادہ دور نہیں جب صورت وہ ہو جائے گی کہ ؏ :

"حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے!"

پھر تاریخ کی یہ شہادت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس گھرانے سے غیرت و حمیت رخصت ہو جائے اس سے آزادی اور خود اختیاری کو بھی روانہ ہوتے دیر نہیں لگتی اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجامِ بد سے بچائے! آمین۔

اندرونِ ملک کے حالات کو دیکھئے تو مزید مایوس کن صورت حال نظر آتی ہے اور ؏

"تن ہمہ داغ داغ شد' پنبہ کجا کجا نہم!"

کا نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اوپر کا سارا گلہ شکوہ ہی بے بنیاد نظر آنے لگتا ہے۔ اس لئے کہ یہ سارا "استغاثہ" تو صرف "ملّتِ اسلامیہ" کے نام مناسب ہو سکتا ہے اور یہاں یہ تصور ہی کم ہوتے ہوتے بالکل معدوم کے درجے کو پہنچ چکا ہے ؏:

"آں قدح بشکست و آں ساقی نماند!"

چنانچہ جس قسم کے نعرے آج سے پچیس تیس سال قبل عالم عرب میں لگے تھے یعنی "المِصرُ لِلمِصریین!" (مصر مصریوں کا ہے!) اسی قسم کے نعرے آج سرزمینِ پاک میں بلند ہو رہے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں تو بنگالی قومیت کا راگ شروع ہی سے الاپا جا رہا تھا۔ اب سندھ بھی "جئے سندھ" کے نعروں سے گونج رہا ہے اور یہی حال بلوچستان اور سابق صوبۂ سرحد کا ہے' ----وہاں پختونستان کا سٹنٹ تو قدیم تھا ہی' ایک نئی دو عملی یہ ایجاد ہوئی ہے کہ "عظیم باپ" افغانستان میں بیٹھ کر آزاد پختونستان کے نعرے کو ہوا دے رہا ہے اور اس کی صُلبی و معنوی ذریت پاکستان میں بیٹھ کر اس کی ایک دوسری نسبتاً کم قابل اعتراض تعبیر پیش کر رہی ہے ----الغرض وہ نغمہ کہ۔

"بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
کہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی!!"

جو تحریک پاکستان کے دوران خوب زور شور سے بلند ہوا تھا' ایران و افغانستان تک کیا پہنچتا خود پاکستان میں دم توڑ رہا ہے {۱}۔ پوری ارضِ پاک میں ایک خطۂ پنجاب ہے جو شاید اپنے اس مایۂ ناز

{۱} خود ہم نے جولائی کے شمارے میں پاکستان کی اجتماعی زندگی کی جن الجھنوں اور پیچیدگیوں کا تذکرہ کیا تھا ان میں سے تیسری الجھن جو مضمون کی دوسری قسط میں بیان ہوئی تھی یہی ہے کہ پاکستان میں "قومیت" کا ایک ہولناک خلا ہے جو کوئی آج پیدا نہیں ہوا بلکہ بالکل ابتدا سے چلا آ رہا ہے لیکن بعد میں ہم نے اس موضوع پر قلم اٹھانے سے اس لئے احتراز کیا کہ ؏ "اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں!" سرِدست صرف اس اشارے پر اکتفا مناسب ہے کہ پاکستان قائم تو "ملت از وطن است!" کی پر زور نفی اور "ملّتِ اسلامی" کے تصور کے زوردار اثبات پر ہوا تھا' لیکن خود اس کے قائم کرنے والے نے پہلے ہی روز غیر مبہم الفاظ میں یہ کہہ کر کہ: "پاکستان میں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سپوت کی لاج رکھنے کو جسے دنیا علامہ اقبال کے نام سے جانتی ہے "رجوع الی الجاہلیت" کی اس وبا سے قدرے بچا ہوا ہے----- لیکن تابہ کے؟-----اگر یہ ایک واقعی قانونِ فطرت ہے کہ "ہر عمل ایک ردِّ عمل کو جنم دیتا ہے!" تو جلد یا بدیر یہاں بھی وہی صورت پیدا ہو کر رہے گی-----!

اس صورت حال میں ہندی مسلمانوں کی داد رسی کی توقع کس سے ہو؟-----یہاں تو بنگالی مسلمان نے غیر بنگالی مسلمان کا خون بہانے سے دریغ نہ کیا۔ کوئٹے میں بار بار فسادات کی آگ بھڑکی اور سندھ کے متعدد شہروں میں غیر سندھی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا باقاعدہ پروگرام بن چکا تھا-----یہ تو بھلا ہو مارشل لاء کا کہ بروقت نافذ ہو گیا ورنہ مغربی پاکستان بھی اس میدان میں مشرقی پاکستان کی ہمسری کا شرف حاصل کر لیتا۔

تشتّت و انتشار کی اس گرم بازاری میں مزید اضافہ دائیں اور بائیں بازو کی قوتوں کی ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی سے ہو گیا ہے' چنانچہ دونوں کیمپوں میں ایک دوسرے سے نفرت اور بیزاری بڑھتی جا رہی ہے اور اشتعال میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے حتیٰ کہ تشدد اور تصادم اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

نہ کوئی ہندو ہندو رہے گا نہ مسلمان مسلمان' مذہبی اعتبار سے نہیں' اس لئے کہ وہ تو ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے بلکہ سیاسی اعتبار سے ! "ملتِ اسلامی کے تصور کی نفی اور "وطنی قومیت" کا اثبات کر دیا تھا۔ چنانچہ اسی وقت سے ہمارے یہاں "ملتِ اسلامی" اور "پاکستانی قومیت" کے مابین ایک کھیلا جاری ہے۔ اور یہ اسی کھیلے کے ثمرات ہیں جو آج علاقائی و لسانی قومیتوں کے فروغ کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ نظریۂ ملت کو خود ہم نے منہدم کر دیا اور پاکستانی قومیت کا تصور ہمارے مزاج کے مناسب نہ تھا چنانچہ ہماری اجتماعی زندگی میں وہ خلا پیدا ہوا جو رفتہ رفتہ متذکرہ بالا قومیتوں اور عصبیتوں سے پُر ہوا-----چنانچہ اب شکایت ہو تو کس سے اور گلہ ہو تو کس کا؟ کہ----- ع "اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست!!"

اگرچہ یہ اندیشہ بھی شدید ہے کہ بات کہیں "حدود" سے تجاوز نہ کر جائے' لیکن دردِ دل بالکل خاموش بھی نہیں رہنے دیتا۔ حیرت ہوتی ہے کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے "مبینہ" الفاظ پر تو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا اور آج تک بھی ان کا قصور معاف نہیں ہوا' حالانکہ جب انہوں نے اپنے بیان کی وضاحت فرمائی تو علامہ اقبال نے بھی اپنے اشعار سے رجوع کر لیا تھا۔ لیکن بانی پاکستان کے اس نظریہ وطنیت پر تنقید کی جرأت کسی کو نہ ہوئی حتیٰ کہ علماء بھی منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔

دیکھ کعبے میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ!
بتکدے میں برہمن کی پختہ زُنّاری بھی دیکھ!!

فیصلہ کن مقابلے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور نوجوان ایک دوسرے پر پل پڑنے کے لئے پر تول رہے ہیں۔

رہی سہی کسر علمائے دیوبند کے دو متحارب گروہوں نے ایک دوسرے کے مقابل آکر پوری کر دی ہے۔ ان کے مابین بغض حادث نہیں قدیم ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصے تک ان کی صفوں میں اتحاد و اتفاق کے مظاہرے دیکھنے میں آئے تھے لیکن معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ "تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى" والا معاملہ تھا' چنانچہ جونہی دوبارہ اختلاف رونما ہوا فضا ایک دم شرعی گالیوں سے معمور ہو گئی---- بنائے نزاع "سوشلزم" کو قرار دیا گیا ہے۔ درآنحالیکہ سرمایہ داری کے دونوں ہی گروہ یکساں مخالف ہیں۔ اور مزدوروں اور کسانوں کی "حالتِ زار" کا دونوں ہی کو برابر رنج و غم ہے۔ حتیٰ کہ معاشی عدل و اعتدال کے لئے فوری تدابیر میں بھی دونوں میں کوئی اختلاف نہیں---- بایں ہمہ کفر کے فتوے عام ہو رہے ہیں اور "کانگرسی مولوی" کی گالی میں تو خیر کوئی مضائقہ ہی نہیں ؏

"بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بو العجبی است"

عجیب طرفہ تماشا ہے کہ "اسلامی جمہوریت" کی اصطلاح تو سر آنکھوں پر لیکن "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح قطعاً ناجائز و حرام---- پھر مزید یہ کہ جس شخص نے سب سے پہلے یہ اصطلاح استعمال کی یعنی محمد علی جناح مرحوم وہ تو سب کے نزدیک قائداعظم اور رحمتہ اللہ علیہ' لیکن اب جو بھی یہ لفظ منہ سے نکالے وہ کافر و مرتد۔ بحالی جمہوریت کے لئے تو ہر کس و ناکس سے تعاون کو جائز ہی نہیں لازمی و ناگزیر قرار دیا جائے اور معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے کی غرض سے کوئی مزدوروں سے اتحاد کر لے تو گردن زدنی ٹھہرے!

خدا وندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری!

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس تفرقہ و انتشار کا انجام کیا ہو گا---- اور ہماری قومی و ملی زندگی کس حادثے سے دوچار ہو گی۔ بظاہر احوال تو امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی!

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِیْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

جلد: ۴۵
شمارہ: ۶
محرم الحرام ۱۴۱۷ھ
جون ۱۹۹۶ء
فی شمارہ -/۱۰
سالانہ زرتعاون -/۱۰۰

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

ادارہ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر 10 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات
  قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ 22 امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مقام اشاعت: 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔فون: 03-02-5869501
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110
پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرض احوال

ملک و قوم کی نیا الحاد اور سیکولرزم کی طوفانی موجوں کے رحم و کرم پر ہلاکت و تباہی کی منزل کی جانب تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ملک میں موجود مذہبی عناصر اور دینی سیاسی جماعتیں اس سیلابی دھارے کا رخ موڑنے میں قطعی طور پر ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ بعض سیاسی جماعتوں نے "زمانہ با تو نہ سازد تو بازمانہ بساز" کے اصول پر خود بھی موجودہ سیکولرزم نظام کے ساتھ سازگاری اختیار کر لی ہے اور اب ان کی حیثیت سیکولر قوتوں کے ہاتھوں میں ایک کھلونے سے زیادہ نہیں۔ دنیاداری کے اس کھیل میں وہ خود تو رسوا ہو رہی ہیں، ان کے اس طرز عمل سے دین و مذہب کے حصے میں جو رسوائی آئی ہے وہ اس داستان کا سب سے زیادہ تلخ باب ہے اور اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ مادہ پرستی اور سیکولرزم کا زہر پورے جسد ملی میں سرایت کر چکا ہے۔ اس کے مظاہر آئے روز ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں، کبھی شراب کے لائسنسوں کے کھلے عام اجراء کی خبر ذہن و قلب پر برق بن کر گرتی ہے، تو کبھی اخبارات میں مختلف خبروں اور عدالتی کیسوں کے حوالے سے اسلامی نظام معاشرت کی دھجیاں بکھرتے دیکھ کر سانس رکنے لگتا ہے۔ دین و مذہب کی بنیادوں کو تاک تاک کر نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اسلامی اقدار کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا جا رہا اور یہ سب کچھ اتنی گہری منصوبہ بندی کے تحت ہو رہا ہے کہ حیرانی ہوتی ہے کہ جن نااہل ہاتھوں میں تقدیر حنا ٹھہری ہے ان میں اتنا سلیقہ کہاں سے آگیا! ہمارے اس ملک میں سرکاری و اجتماعی سطح پر کوئی کام سلیقے اور نفاست سے نہیں ہوتا۔ کرپشن، بددیانتی اور نااہلی کا روگ مفادِ عامہ کے ہر کام میں زہر گھول دیتا ہے۔ ہاں دین و مذہب کی جڑیں کھودنے اور فحاشی و عریانی کو فروغ دینے میں ہم نے بڑے بڑے ہنرمندوں کو خجالت و شرمندگی سے دوچار کیا ہے۔

ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ!!

ان حالات میں اصلاح احوال کی صرف اور صرف وہی ایک صورت ممکن ہے جس کی جانب قوم کو متوجہ کرتے اب ہمیں ربع صدی ہونے کو آئی ہے۔ لیکن من حیث القوم ہماری مادہ پرستانہ سوچ اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ہم اب تک دو مارشل لاؤں کا مزا چکھ چکے ہیں اور تیسرے کو خوش آمدید کہنے کے لئے آمادہ ہیں، ہم بدترین آمریت کا دور بھی دیکھ آئے ہیں، ہمیں نام نہاد جمہوریت کے ہاتھوں بھی گہرے چرکے لگ چکے ہیں، ہمیں یہ سب کچھ منظور ہے، لیکن نظام خلافت کے قیام اور اسلامی انقلاب کی راہ پر آنا کسی طور پر گوارا نہیں!!..... ان تجربات

سے کم از کم اتنا سبق تو ہمیں سیکھ ہی لینا چاہئے کہ ہمارے قومی و ملی دکھوں کا مداوا ہمارے ان خود ساختہ اور مغرب سے مستعار لئے ہوئے نظاموں میں سے کوئی نظام نہیں بن سکتا اور اب "ناچار مسلمان شو" کے مصداق ہمیں نظام خلافت کے دامن میں ہی پناہ لینی ہو گی۔ تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ محض نیک تمناؤں اور خوش نما آرزوؤں کے ذریعے نظام خلافت قائم نہیں ہو گا' اس کے لئے ہمیں اسی طریق پر ایک بھرپور انقلابی جدوجہد کرنا ہو گی جس طریق کو اختیار کر کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے نظام باطل کو جڑ سے اکھاڑ کر دین حق کو قائم و غالب کیا تھا۔ اللھم وفقنا لھذا

☆ ☆ ☆

ملکی سیاسی صورتحال کے بارے میں امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خیالات اور مختلف اہم قومی مسائل کے متعلق امیر تنظیم کے موقف سے قارئین کو آگاہ کرنے کے لئے حسب معمول ذیل میں امیر تنظیم کے خطابات جمعہ کے پریس ریلیز ہدیہ قارئین کئے جا رہے ہیں :

۱۷/ مئی ۹۶ء کے خطاب جمعہ کا پریس ریلیز

لاہور (پ ر) حکومت پنجاب کی جانب سے بڑے پیمانے پر شراب کے لائسنسوں کا اجراء کوئی بڑی گہری سازش معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح انسانی حقوق کی آڑ میں بالغ لڑکی کے بغیر ولی کے نکاح کر لینے کی پشت پناہی کی جا رہی ہے۔ یہ دراصل اسلام کے خاندانی نظام اور مشرقی اقدار کو تلپٹ کر دینے کی کوشش ہے۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے مسجد دار السلام باغ جناح لاہور میں اپنے خطاب جمعہ میں کہا کہ توہین رسالت اور قادیانیوں سے متعلق قوانین کی منسوخی کے امریکی مطالبے کے جواب میں حکومت کی جانب سے دو تہائی اکثریت کے نہ ہونے کا جواز پیش کر کے معذرت خواہانہ رویئے کا اظہار قابل مذمت ہے۔ اس قسم کا طرز عمل ہماری حکومت کے عزائم کو ظاہر کرتا ہے جو وہ اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے اسلام کے خلاف کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے رول کی تعریف کی کہ دین کے ایک خاص پہلو کی حفاظت کے حوالے سے اس مجلس کی جدوجہد قابل فخر ہے۔

عمران خان کی تحریک انصاف کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ انہیں واضح کرنا چاہئے کہ ان کا "انصاف" کا تصور کیا ہے۔ انصاف کا ایک تصور وہ ہے جو اسلام ہمیں دیتا ہے اور اس کے بارے میں ایک تصور وہ ہے جو مغرب میں رائج ہے۔ عمران خان کا یہ کہنا ہے کہ وہ

سیاست میں اسلام کا نام استعمال کرنے کے قائل نہیں، لیکن اگر انہیں اسلام کا عادلانہ نظام لانا ہے تو انہیں اسلام کا نام لینا پڑے گا۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ لوگوں کے سامنے بھی آئے کہ جو لوگ اسلام کا نظام انصاف لانا چاہتے ہیں خود ان کی زندگیوں میں اسلام کس قدر ہے۔ قاضی حسین احمد بھی عمران خان کی تحریک انصاف سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، یہی وجہ ہے کہ اب انہوں نے شباب ملی کو از سر نو متحرک کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ یہ بات جماعت اسلامی کے ان لوگوں کے لئے لمحہ فکریہ ہے جو ایسے اصلاحی کاموں کے لئے جماعت اسلامی کے ہوتے ہوئے کوئی علیحدہ پلیٹ فارم بنانے کے قائل نہیں ہیں۔

۲۴/ مئی ۹۶ء کے خطاب جمعہ کا پریس ریلیز

لاہور (پ ر) ملک کی زمینوں کی شرعی حیثیت کے از سر نو تعین کے لئے اعلیٰ اختیاراتی لینڈ کمیشن قائم کیا جائے جس میں جید علماء اور بندوبست اراضی کے ماہرین شامل ہوں۔ پاکستان کے نظام میں جاگیرداری کی جڑیں بہت گہری اور مضبوط ہیں جس کو محض ملکیت زمین کی حدود متعین کرنے سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ملک کو جاگیرداری اور سرمایہ داری کی گرفت سے آزاد کرانے کے لئے خونی انقلاب کی ضرورت ہے۔ تاہم غیر مسلح بغاوت یا سول نافرمانی کی تحریک کے ذریعے بھی انقلاب لایا جا سکتا ہے جس میں جان لینے کی بجائے انقلابی اپنی جان کی بازی لگاتا ہے۔

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے نماز جمعہ سے قبل مسجد دار السلام باغ جناح لاہور میں "مسئلہ ملکیت زمین اور جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری" کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ شریعت اپیلیٹ بینچ نے انفرادی ملکیت کو قومی ملکیت بنانے کے خلاف فیصلہ دے کر زرعی اصلاحات کا راستہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا ہے۔ چنانچہ اب زرعی اصلاحات کے ذریعے زمینداری کے موجودہ نظام کا خاتمہ ممکن نہیں رہا۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ عہد خلافت راشدہ کے بعد عرب ملوکیت کے دور میں زرعی زمین کی نوعیت و حیثیت میں بڑی تبدیلی کر دی گئی۔ چنانچہ نظریہ ضرورت کے تحت ریاست کی ملکیت "خراجی" زمین کو بیت المال سے نکال کر ذاتی ملکیت بنا کر "عشری" قرار دے دیا گیا۔ عشری اور خراجی زمین کے فرق کو واضح کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ خراجی زمین اسلامی ریاست کی ملکیت ہوتی ہے جس کی پیداوار میں سے حکومت براہ راست کاشتکار سے خراج وصول کرتی ہے اور حکومت اور کاشتکار کے مابین کوئی جاگیردار یا غیر حاضر زمیندار حائل نہیں ہوتا۔ جب کہ انفرادی ملکیتی زمین عشری کہلاتی ہے جس کی پیداوار میں سے عشر وصول کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے ملکیت زمین کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کی رو سے کسی شخص کو کسی شے پر مطلق ملکیت کا اختیار حاصل نہیں، اس لئے کہ کائنات کی ہر شے اللہ کی ملکیت ہے۔ تاہم اسلام انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتے ہوئے انسانوں کو حصول رزق کے لئے تصرف و استفادہ کا حق دیتا ہے۔ انسان سمیت تمام جاندار مخلوق کا رزق چونکہ زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے اس لئے دیگر اشیاء کی ملکیت اور زمین کی ملکیت میں بنیادی فرق ہے۔ انہوں نے کہا اسلام کی رو سے مسلسل تین سال تک زمین کو کاشت نہ کرنے والے کا حق تصرف ختم ہو جاتا ہے۔

امیر تنظیم اسلامی نے شاہ ولی اللہ دہلوی کے حوالے سے کہا کہ انہوں نے ایک حدیث نبویؐ سے استدلال کرتے ہوئے اپنی مشہور کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں زمین کو "مسجد اور سرائے" کی طرح سب لوگوں کے لئے "وقف" قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا عہد فاروقیؓ میں ہونے والے "اجماع" کے ذریعے مفتوحہ زمینوں کو "مال فے" قرار دے کر جاگیرداری نظام کا راستہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے کہا برعظیم پاک و ہند کی تمام اراضی چونکہ مجاہدین اسلام نے بزور شمشیر فتح کی تھی لہٰذا حضرت عمرؓ کے فیصلے کے مطابق یہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ عوام کی اجتماعی ملکیت اور اسلامی ریاست کی جاگیر ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا جاگیرداروں اور غیر حاضر زمینداروں کا موجودہ طبقہ انگریز کے دور کی پیداوار ہے۔ اس دور میں شیخ جلال الدین تھا نیسری اور بعد ازاں شاہ عبد العزیز دہلوی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور دیگر علماء نے برعظیم کی زمینوں کو واضح طور پر خراجی یعنی ریاست کی ملکیت قرار دیا تھا۔ لیکن پاکستان بن جانے کے بعد ایک ہی نام سے دو کتابیں ایسی آئیں جن میں مزارعت کے جواز کا فتویٰ دیا گیا تھا۔ ایک کتاب کے مصنف مولانا مودودی مرحوم اور دوسری کا مصنف مرزا بشیر الدین محمود تھا۔ قادیانی گروہ کے اکابرین نے سندھ اور بلوچستان میں قادیانی ریاست کے قیام کے لئے وہاں کے جاگیرداروں کو قادیانی بنانے کے ارادے سے مزارعت کو جائز قرار دیا تھا، حالانکہ چاروں فقہاء کے نزدیک مزارعت حرام ہے اور زمین کو ٹھیکے پر دینے اور بٹائی پر دینے کی اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں۔ مزارعت بھی درحقیقت سود ہی کی ایک شکل ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام ذرائع پیداوار کی منصفانہ تقسیم چاہتا ہے۔ اسلام کا اصل الاصول ہے "ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ سرمایہ تمہارے دولت مندوں کے مابین ہی گردش کرتا رہے"۔ اسلامی معاشرے میں ہر شخص کی بنیادی ضروریات پوری ہونی چاہئیں۔

تذکرہ و تبصرہ

عاکف سعید

حیاتِ اقبال کا ایک گم شدہ ورق

امارت اور بیعت کی اساس پر خالص دینی تنظیم کے قیام کی کوشش

علامہ اقبال کے بارے میں یہ بات سب جانتے ہیں کہ وہ ایک عظیم قومی و ملی شاعر اور بلند پایہ فلسفی و حکیم ہی نہیں تھے، مفکر و مصورِ پاکستان بھی تھے۔ وہ برِ عظیم پاک و ہند میں بسنے والے مسلمانوں کو انگریز کی غلامی اور ہندو کے تسلّط سے نجات دلانے اور سیاسی و معاشی میدان میں ان کے بہتر مستقبل کے بارے میں ہی فکر مند نہیں رہتے تھے، امّتِ مسلمہ کی عظمت و سطوتِ گزشتہ کی بازیافت اور احیاء اسلام کے شدت کے ساتھ آرزو مند بھی تھے۔

علامہ کے بارے میں یہ بات بھی کسی سے مخفی نہیں کہ علامہ نے پاکستان کا محض تصور اور تخیل ہی پیش نہیں کیا، پاکستان کے قیام کا مطالبہ لے کر اٹھنے والی مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی جماعت، مسلم لیگ میں باقاعدہ شمولیت اختیار کی اور ایک فعال کارکن اور ایک صاحبِ فہم اور مدبر رہنما کے طور پر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کی آزادی کی جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔ علامہ کی حیات کا یہ گوشہ ایک کھلی کتاب کی مانند ہے۔ لیکن یہ بات بہت ہی کم لوگوں کے علم میں ہو گی کہ اپنی حیاتِ دنیوی کے آخری حصے میں حضرت علامہ "مسلمانوں کے عروج و اقبال" اور "اعلاءِ کلمۃ اللہ" کی خاطر خالص اسلامی اصولوں یعنی بیعت کی بنیاد پر قائم ہونے والی ایک ایسی انقلابی جماعت کی تشکیل کی سرتوڑ کوشش بھی کرتے رہے جو محض نام کے مسلمانوں پر نہیں بلکہ "فداکاروں" پر مشتمل ہو۔ علامہ اپنی کوشش میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے لیکن تشکیلِ جماعت کے بالکل آخری مرحلے پر

پہنچ کر بعض وجوہات کی بنا پر جن کا ذکر آگے قدرے تفصیل سے آئے گا، یہ معاملہ رک گیا اور یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ حیاتِ اقبال کا یہ گم شدہ اور فراموش کردہ ورق حال ہی میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم کی ایک کتاب "علامہ اقبال اور مسلمانوں کا سیاسی نصب العین" کے ذریعے منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس اہم تاریخی دستاویز کو آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس نے دسمبر ۱۹۹۴ء میں، یعنی ڈاکٹر فاروقی مرحوم کے انتقال سے چند ماہ قبل شائع کیا۔ ہمارا احساس ہے کہ حیاتِ اقبال کے اس اہم گوشے کی نقاب کشائی کر کے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے ملّتِ اسلامیہ پاکستان پر احسان عظیم کیا ہے، ورنہ ان کے سینے میں محفوظ یہ بیش قیمت تاریخی امانت ان کے ساتھ ہی قبر میں اتر جاتی اور حیات قبال کا یہ گوشہ ہمیشہ کے لئے تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہو جاتا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی قبر کو نور سے بھر دے اور انہیں اپنے دامنِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے (آمین)۔

☆ ☆ ☆

اس اجمال کی تفصیل جاننے کے لئے بطور تمہید ہمیں علامہ اقبال کے خطبہ الٰہ آباد کی جانب رجوع کرنا ہو گا جو بلاشبہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں علامہ اقبال نے جو تاریخی خطبۂ صدارت پیش فرمایا اس میں جہاں اس نکتے کو خصوصی طور پر اجاگر کیا کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان ہر اعتبار سے ہندو کے مقابلے میں ایک جداگانہ قوم ہیں اور ان کی قومیت کی واحد بنیاد اسلام ہے، وہیں ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مملکت کے قیام کا خیال بلکہ مطالبہ بھی پہلی بار وضاحت کے ساتھ پیش کیا، جس کے لئے اپنے خطبے میں علامہ نے "ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند" کے الفاظ استعمال کئے۔ حضرت علامہ کے خطبہ الٰہ آباد کے درج ذیل اقتباسات نوٹ کرنے کے لائق ہیں :

"کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس

کے نظامِ سیاست کے بجائے ان قومی نظاموں کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ اسلام کا مذہبی نصب العین، اس کے معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کو ترک کرنا بھی لازم آئے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے پر آمادہ نہ ہو گا جو اسلام کے اصول اتحاد کی نفی کرنے پر مبنی ہو......"

ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک الگ خطۂ زمین کے مطالبے کا جواز علامہ نے اپنے خطبے میں بایں الفاظ پیش فرمایا :

"... مغربی ممالک کی طرح ہندوستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک ہی قوم آباد ہو، وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے، جن کی نسل، زبان، مذہب سب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ان کے اعمال و افعال میں وہ احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو ایک ہی نسل کے مختلف افراد میں موجود رہتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہندو بھی تو کوئی واحد الجنس قوم نہیں۔ پس یہ امر کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کئے بغیر ہندوستان میں مغربی اصول جمہوریت پر عمل کرنا شروع کر دیا جائے۔ مسلمانوں کا مطالبہ بالکل بجا ہے کہ وہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کریں....."

مسلمانوں کے لئے ایک الگ خطے کے مطالبے کی ضرورت و اہمیت کو بیان کرتے ہوئے اسی خطبے میں ذرا آگے چل کر علامہ فرماتے ہیں :

"ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے...."

اس خطبے کے درج ذیل الفاظ ہمارے نقطۂ نگاہ سے خصوصی طور پر اہمیت کے حامل ہیں :

"میں صرف ہندوستان اور اسلام کے فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عرب ملوکیت کی وجہ سے اس پر اب تک قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گی"۔

گویا علامہ، مسلمانانِ ہند کے بہتر مستقبل کی خاطر محض ایک علیحدہ خطۂ زمین کے حصول ہی کے خواہاں نہیں تھے، بلکہ وہ "احیاءِ اسلام" کے بھی شدت کے ساتھ آرزومند تھے اور اس مجوزہ خطۂ زمین میں اسلام کو محض ایک مذہب کے طور پر نہیں بلکہ ایک زندہ اور غالب سیاسی و معاشرتی قوت کی حیثیت سے سربلند کرنا چاہتے تھے۔ علامہ کو اس امر کا پورا شعور و ادراک حاصل تھا کہ دین اسلام اپنی اصل شکل اور کامل صورت میں صرف دورِ خلافتِ راشدہ تک قائم رہا۔ خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہوتے ہی اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے حسین نقوش دھندلانے لگے اور اسلام کے رخِ روشن کی تابناکی ماند پڑنے لگی۔ دورِ ملوکیت میں مدون ہونے والی فقہ بھی ملوکیت کے اثرات سے بالکلیہ پاک نہ تھی۔ نظام اجتماعی کے بعض اہم گوشوں میں مسلم فقہاء نے "نظریۂ ضرورت" کے تحت بعض ایسے فتوے دیئے جو ملوکیت اور جاگیرداری نظام کے تحفظ و بقا کا ذریعہ بنے۔

اپنے اس خطبے میں اقبال دو اعتبارات سے نہایت پرامید نظر آتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں مسلمانوں کی ایک آزاد ریاست کا قائم ہو جانا یقینی نہیں ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مسلمانانِ ہند کی نمائندگی کرتے ہوئے انہوں نے اپنے اس خطبے میں مسلمانوں کے لئے ایک آزاد ریاست کا پرزور مطالبہ کرنے اور اس کے حق میں مضبوط عقلی دلائل پیش کرنے پر ہی اکتفا نہیں کی، ایک وژنری (VISIONRY) کی حیثیت سے قیام پاکستان کو ایک یقینی امر اور تقدیرِ مبرم بھی قرار دیا ہے۔ خطبہ الٰہ آباد میں شامل ان کے یہ تاریخی الفاظ خصوصیت کے ساتھ نوٹ کرنے کے

قائل ہیں: "میں محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان کے شمال مغربی خطے میں ایک آزاد مسلم ریاست کا قیام ایک ایسی تقدیر ہے جسے ٹالا نہیں جا سکتا"[1]......اسی طرح وہ اس بارے میں بھی بہت پر امید نظر آتے ہیں کہ مسلمانوں کی ایک علیحدہ آزاد ریاست کے نتیجے میں احیاء اسلام کے دیرینہ خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے کا سامان فراہم ہو جائے گا۔ پھر ہمارے لئے اس بات کا موقع ہو گا کہ دورِ خلافتِ راشدہ کے بعد گویا قریباً ساڑھے تیرہ صدیوں کے وقفے کے بعد ایک بار پھر اسلامی تعلیمات کا صحیح نمونہ اور اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کی سچی تصویر عملاً دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ اس طرح پاکستان کا قیام عالمی سطح پر اسلام کے غلبۂ ثانی کی تمہید بن جائے گا۔ اقبال کے یہ مشہور اشعار اسی رجائیت کا مظہر ہیں:

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

اور

کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اور

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

☆ ☆ ☆

خطبہ الٰہ آباد کے ان انقلاب آفریں افکار کا فوری نتیجہ علی گڑھ میں ظاہر ہوا۔ یوں بھی الٰہ آباد اور علی گڑھ مکانی طور پر ایک دوسرے سے بہت قرب رکھتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے صدر شعبۂ فلسفہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے جن کے علم و فضل کی دھاک ایک زمانے تک رہی، علامہ کے اس خطبے سے متأثر ہو کر جماعتِ مجاہدین علی

---

[1] علامہ کے انہی الفاظ کو بنیاد بناتے ہوئے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے گزشتہ ماہ ۲۶/ اپریل ۹۶ء کو یوم اقبال کے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے علامہ اقبال کو پہلی بار "مبشر پاکستان" کا خطاب دیا جسے علمی حلقوں میں بہت سراہا گیا۔

گڑھ کے نام سے خالصتاً اسلامی اصولوں پر مبنی ایک جماعت کی تشکیل کا جامع منصوبہ تیار کیا' تا کہ علامہ کے تجویز کردہ نصب العین کے حصول کے لئے منظم جدوجہد کی جا سکے۔ اس کے ابتدائی قدم کے طور پر انہوں نے ایک جامع دستاویز تیار کی جس میں جماعت مجاہدین کے قیام کی غرض وغایت سے لے کر اس کے تنظیمی ڈھانچے تک تمام تفصیلات شامل تھیں۔ (اس دستاویز کا مکمل متن ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی کتاب میں درج ہے) اس دستاویز کا پہلا حصہ دراصل علامہ کے خطبہ الٰہ آبادی کی مزید تشریح و توضیح پر مشتمل تھا جس میں مسلمانانِ ہند کی حالت زار کا ایک نقشہ کھینچنے کے بعد سب سے زیادہ زور اس نکتے پر دیا گیا کہ ہندو اور مسلمان ہرگز ایک قوم نہیں بلکہ یہ دو علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں' جو ہر اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد رجحانات کی حامل ہیں۔ اس دستاویز کے ابتدائی حصے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو!

> "مسلمانو! یہ ایک سراب ہے کہ ہندو اور مسلمان مل کر رہیں گے یا ہندوستان ایک نیشن یعنی قوم ہے یا ہو جائے گا۔ مسلمان بالیقین ایک علیحدہ قوم ہیں اور ہندو ایک علیحدہ قوم۔ جو چیزیں گروہ کو ایک قوم بناتی ہیں ان میں سے کوئی چیز ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشترک نہیں۔ مسلمانوں کے عقائد و اخلاق جدا ہیں' ہندوؤں کے جدا۔ مسلمانوں کے اقدار و عادات' رسم و رواج' طرز ماند و بود جدا ہیں' ہندوؤں کے جدا۔ مسلمانوں کا قانون جدا ہے' ہندوؤں کا جدا۔ مسلمانوں کی تاریخ جدا ہے' ہندوؤں کی جدا۔ مسلمانوں کی امنگیں جدا ہیں اور ہندوؤں کی جدا۔ مسلمانوں کو اصول قومیت جدا ہے' ہندوؤں کا جدا۔ مسلمانوں کا خدا اور ہے' ہندوؤں کا اور"۔

مسلمان قوم کو اس گرداب سے کیسے نکالا جائے؟ انہیں انگریز کی غلامی اور ہندو کے تسلط سے کیسے نجات دلائی جائے؟ ملت اسلامیہ ہند کے تن مردہ میں نئی روح کیونکر پھونکی جائے؟ اس دستاویز کے دوسرے حصے میں ان اہم سوالات پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر سید ظفر الحسن اس کا حل یہ تجویز کرتے ہیں کہ مسلمان قوم کو اگر کسی بلند مقصد سے آشنا کر دیا جائے اور اسے ایک نظم کے تحت منظم کر دیا جائے تو صورتحال بدل سکتی ہے۔ دلچسپ بات

یہ ہے کہ انہوں نے نظم جماعت کے سلسلے میں جمہوریت یا جمہوری اصولوں کو سرے سے درخورِ اعتناء نہ سمجھا بلکہ صاف الفاظ میں تسلیم کیا کہ :

> "مسلمانوں کو منظم کرنے کا وہی ایک صحیح اصول ہے جس پر اسلام آغاز میں منظم ہوا تھا۔ جس کی صورت موجودہ حالات کو مدنظر رکھ کر آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ مسلمانوں کا ایک امیر ہونا چاہئے اور ان کی ایک مجلس شوریٰ ہونی چاہئے اور قوم کو پابند ہونا چاہئے امیر کے احکام کا"۔

جماعت کے نظم یا مسلمانوں کی تنظیم کی مزید وضاحت اس دستاویز میں بایں الفاظ کی گئی :

> "جماعت کی تنظیم میں سب سے اہم چیز امیر ہے۔ ایک طرف تو یہ ضروری ہے کہ امیر کو اختیاراتِ کلی ہوں، اور دوسری طرف یہ کہ وہ مطلق العنان نہ ہو جائے۔ زمانہ حال کی جمہوریت غلط ثابت ہو چکی ہے۔ اس کے مصائب سے عالم لبریز ہے۔ پس شورائیت پر نظر ڈالنی چاہئے۔ اسلامی جمہوریت کے دو اصول معلوم ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ امیر جمہور کے اتفاق رائے سے امیر ہو اور رہے۔ یعنی اس کا عزل و نصب جمہور کی رائے پر مبنی ہو۔ دوسرے یہ کہ امیر عمر بھر کے لئے اور اس کا اقتدار کلی ہو اور جمہور اس کی رائے اور احکام سے انکار نہ کر سکیں"۔

امیر کو مجلس شوریٰ کی اکثریت کے فیصلے کا پابند ہونا چاہئے یا اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ مجلس شوریٰ کی تحریکوں یا فیصلوں کو برطرف کر سکے، اس اہم مسئلے میں ڈاکٹر سید ظفر الحسن کا ذہن بالکل واضح تھا۔ واضح رہے کہ ان کی پرورش بسم اللہ کے گنبد میں نہیں ہوئی تھی بلکہ علامہ اقبال کی طرح وہ بھی "عذابِ دانشِ حاضر" سے خوب اچھی طرح باخبر تھے اور علامہ ہی کی طرح انہیں بھی یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ بھی "کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ" کا مصداق ثابت ہوئے۔ گویا ساری زندگی خرد کی گتھیاں سلجھانے اور عقل و منطق کے بحر میں شناوری کے باوجود وہ ہمارے دور کے دانشوروں کی مانند عقل گزیدہ نہیں تھے بلکہ اسلام کے نظم جماعت کی روح کو سمجھتے اور امارت کے تقاضوں کا پورا ادراک رکھتے تھے۔ چنانچہ امیر اور مجلس شوریٰ کے اختیارات پر گفتگو کرتے ہوئے وہ دوٹوک انداز میں لکھتے ہیں :

"پس ہمیں امیر کو اختیاراتِ کلی دینے چاہئیں۔ مجلس شوریٰ کا کام فقط مشورہ دینا ہو گا نہ کہ کثرت رائے سے امیر کے خلاف مسائل طے کرنا۔ لیکن مجلس شوریٰ کو اختیار ہو گا کہ اگر وہ امیر کو نااہل سمجھے تو برطرف کر سکے۔

ان سب پہلوؤں پر نظر رکھ کر یہ کرنا چاہئے کہ امیر کو اختیار دیا جائے کہ مجلس شوریٰ کی تمام تحریکوں اور فیصلوں کو برطرف کر سکے، الا یہ کہ وہ تحریک جو امیر کے عزل کے لئے ہو"۔

چنانچہ اس دستاویز میں یہ طے کیا گیا کہ یہ جماعت بیعت کی بنیاد پر قائم ہو گی۔ اس کے ارکان امیر کے ہاتھ پر بیعت کے ذریعے جماعت میں شامل ہوں گے۔ جماعت کا مقصدِ تأسیس "ہندوستان کے مسلمانوں کا عروج و اقبال" قرار پایا اور یہ بھی طے کیا گیا کہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب اس جماعت کے پہلے امیر ہوں گے۔ مزید بر آں جماعتِ مجاہدین کے تاسیسی ارکان کے طور پر درج ذیل افراد کا نام درج کیا گیا اور ان کے بارے میں یہ صراحت بھی کی گئی کہ مجلس شوریٰ ان ہی افراد پر مشتمل ہو گی :

- افضال حسین قادری صاحب
- برہان احمد فاروقی صاحب[۲]
- محمد محمود احمد صاحب
- چودھری عبد الحمید صاحب
- محمد شفیع صاحب
- عمر الدین صاحب
- یعقوب بیگ نامی صاحب
- حکیم عبد اللطیف صاحب
- حکیم ظہیر الدین خاں صاحب
- سید عبد المجید صاحب

☆ ☆ ☆

اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے کہ اس دستاویز کی تیاری میں علامہ اقبال کا مشورہ بھی شامل تھا یا نہیں، تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر سید ظفر الحسن

---

[۲] ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم جن کے ذریعے یہ تمام معلومات ہم تک پہنچیں، جماعت مجاہدین علی گڑھ کے تاسیسی ارکان میں سے تھے۔ بقیہ ارکان میں سے مکتبہ کاروان والے چوہدری عبد الحمید صاحب ابھی بحمد اللہ بقید حیات ہیں، باقی افراد کے بارے میں نہیں معلوم کہ کس حال میں ہیں۔

صاحب نے گرمیوں کی تعطیلات میں علی گڑھ سے کشمیر جاتے ہوئے لاہور میں اپنے مختصر قیام کے دوران علامہ اقبال سے بالمشافہ اس دستاویز پر تفصیلی گفتگو فرمائی۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے اس ملاقات کا ذکر اپنی کتاب میں بایں الفاظ کیا ہے :

"یہ دستاویز جس میں علامہ اقبال کے الٰہ آباد کے خطبہ صدارت میں مجوزہ نصب العین کی وضاحت کی گئی تھی، مرتب ہو گئی تو حضرت استاذی ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے ۳۲ء کی گرمیوں کی تعطیل کے دوران علی گڑھ سے کشمیر جاتے ہوئے لاہور میں رک کر علامہ اقبال سے بالمشافہ تفصیلی گفتگو فرمائی اور اس خیال کو عملی صورت دینے کے لئے غور و خوض اور طریق کار متعین کرنے کے لئے مشورہ طلب فرمایا اور طے پایا کہ اس باب میں کچھ جدوجہد شروع کی جائے"۔

اس ملاقات کے بعد علامہ اور ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب کے مابین اس بات کو آگے بڑھانے اور دوسرے اہم لوگوں کو ہم خیال بنانے کے ضمن میں خط و کتابت کے ایک طویل سلسلے کا آغاز ہو گیا۔ سب سے پہلا خط جو علامہ نے اس سلسلے میں ڈاکٹر سید ظفر الحسن کو لکھا وہ ۲/اگست ۱۹۳۲ء کا تحریر کردہ ہے۔ اس خط میں علامہ نے نہ صرف ڈاکٹر سید ظفر الحسن کے تجویز کردہ خاکے کی مکمل تصویب کی بلکہ اس کی تائید میں اپنے ایک ۲۵ سال پرانے کشف یا روحانی واردات کا ذکر بھی کیا جس کا تجربہ علامہ کو دو مختلف مواقع پر ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کی سربلندی کے لئے بیعت اور امارت کے اصولوں پر جماعت بنانے کی ضرورت و اہمیت کا احساس علامہ کو بہت پہلے سے تھا لیکن خود علامہ کے بقول کچھ اس بنا پر کہ "قابل اعتماد دوست مفقود ہیں" اور کچھ اس بنا پر کہ وہ خود اپنے اندر اس کے "موثر طریق" کی ہمت نہیں پاتے، اس سمت میں اب تک خود کوئی پیش رفت نہیں کر سکے تھے۔ خط کا متن ملاحظہ ہو!

"لاہور۔ ۲/اگست ۳۲ء — پرائیویٹ اینڈ کانفیڈنشل

ڈیئر سید ظفر الحسن صاحب!

آپ کا خط ابھی ملا ہے، الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں۔ اس بات کا احساس اب بہت سے لوگوں کو ہو گیا ہے۔ مجھے پچیس سال ہوئے جب اس کا احساس ایک

عجیب و غریب طریق میں ہوا۔ اس وقت میں انگلینڈ میں تھا۔ اس کے بعد ہندوستان میں اس کا اعادہ ہوا۔ اس کو اب کئی سال گزر چکے۔ جو طریق آپ نے بتایا ہے اس پر ایک دفعہ ایک خاص طرح پر عمل بھی ہوا۔ اور اس کو ایک متعین صورت بھی دی گئی۔ مگر جلد معلوم ہوا کہ قبل از وقت ہے۔ زیادہ تر اس وجہ سے کہ قابل اعتماد دوست مفقود ہیں۔ میں آپ کو تفصیلات بتاؤں تو آپ حیران رہ جائیں۔ یہاں کے طبائع کی رو سے ایک ہی طریق مؤثر ہو سکتا ہے لیکن میں اس کے لئے اپنے آپ کو موزوں نہیں پاتا۔ یا یوں کہئے کہ اپنے میں اس قسم کی جرأت نہیں دیکھتا۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ آپ کب واپس آئیں گے۔ زبانی گفتگو سے معاملہ بخوبی طے ہو سکتا ہے۔ جن صاحب کو آپ بھیجیں ان پر پورا اعتماد ہونا چاہئے۔ مجھ کو کسی قدر تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ایسا لکھنے پر مجبور ہوا۔

آج شام دہلی جا رہا ہوں کیونکہ کل وہاں مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہے۔ ان شاء اللہ سوموار کی صبح کو واپس آؤں گا۔

مخلص محمد اقبال"

اس خط کے بعض مندرجات کی تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی لکھتے ہیں :

"انگلینڈ کے دوران قیام میں اور ہندوستان واپس آنے کے بعد عجیب و غریب طریق پر جو احساس ہوا وہ اس مقصد کے لئے جدوجہد کرنے سے متعلق کسی وجدانی واردات کی طرف اشارہ ہے۔

خاص طرز پر عمل کرنے سے مراد اس خیال کو کوئی منظم صورت دینے کی کوشش ہے جسے لوگوں کے ناقابل اعتماد ہونے کی بناء پر قبل از وقت سمجھ کر ملتوی کرنا بہتر سمجھا گیا۔

جس طریق کار کے مؤثر ہو سکنے کی طرف اشارہ ہے وہ مذہبی روحانی پہلو کو مدنظر رکھ کر تحریک کی ابتداء کرنا ہے"۔

علامہ کے خط کے بین السطور سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ علامہ اس اسکیم کے معاملے میں رازداری چاہتے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ یہ منصوبہ اگر طشت از بام ہو گیا تو ابتدائی مرحلے پر ہی اس کی بساط لپیٹ دینی پڑے گی۔ انہیں خوب اندازہ تھا کہ ان کی انقلاب آفرین ملی شاعری کے باعث انگریز ان سے خدشہ محسوس کرتا ہے اور ان کے اپنے

قریبی ساتھیوں کے ذریعے سے ان کی نگرانی کرائی جاتی ہے۔ چنانچہ احتیاط کے پیش نظر اس خط میں انہوں نے محض اشاروں کنایوں پر ہی اکتفا کی ہے۔

اس کے بعد چند ماہ کے اندر اندر علامہ اقبال نے ڈاکٹر سید ظفر الحسن کو یکے بعد دیگرے کئی خطوط لکھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اس جماعت کی تشکیل اور اس معاملے کو آگے بڑھانے میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے اور ان کا ذہن اس مسئلے پر غور و خوض سے کبھی فارغ نہ ہوا تھا۔ ۳۰/ دسمبر ۳۲ء کو جو خط ڈاکٹر ظفر الحسن کو موصول ہوا اس کی نقل درج ذیل ہے :

"لاہور۔ ۳۰ دسمبر ۳۲ء

ڈیر ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! جس تجویز پر ہم نے لاہور میں گفتگو کی تھی اس کو مہر صاحب ایڈیٹر انقلاب نے بہت پسند کیا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی فہرست تیار کروائیں گے جن کو اس سے اتفاق ہو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اور لوگ بھی تیار ہیں۔

امید ہے آپ نے بھی اپنے احباب سے گفتگو کی ہو گی۔ نتیجہ سے مجھے وقتاً فوقتاً اطلاع دیتے رہئے۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

محمد اقبال"

ٹھیک تین ماہ بعد علامہ کی طرف سے ایک اور خط ڈاکٹر سید ظفر الحسن کے نام موصول ہوا۔ اس دوران علامہ اقبال نے اس ضمن میں ایک اور نامور علمی شخصیت ڈاکٹر عبدالجبار خیری سے جو خود ڈاکٹر ظفر الحسن کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے' متعدد ملاقاتیں کیں اور ان سے اس خاص موضوع پر مفصل گفتگو کی (واضح رہے کہ بعد میں ڈاکٹر عبدالجبار خیری کا مولانا مودودی مرحوم سے بھی قریبی رابطہ رہا' اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے جماعت اسلامی کا خاکہ مرتب ہونے میں خیری صاحب کے اثرات کو عمل دخل حاصل تھا)

"لاہور۔ ۶ مارچ ۳۳ء
ڈیئر ظفر الحسن

آپ کا خط مجھے آج صبح دہلی سے واپس آنے پر ملا۔ الحمدللہ کہ آپ خیریت سے ہیں۔ میں نے دہلی میں سنا تھا کہ سید راس مسعود وہاں ہیں، مگر وقت نہ تھا کہ ان سے مل سکوں۔ افغانستان میں اس وقت حالات اچھے نہیں تھے۔ تاہم وہاں سے جب اطلاع آئے گی عرض کروں گا۔ بمبئی میں ان کے قونصل سردار صلاح الدین سلجوقی سے بھی گفتگو ہوئی تھی۔ وہ شاید اس سے پہلے بلاتے مگر میں ہندوستان میں نہ تھا۔

انگلستان جانے سے پہلے میں نے آپ کو اس تحریک کے متعلق لکھا تھا جس کا ذکر یہاں لاہور میں ہوا تھا۔ کہئے آپ کے مولوی عبدالجبار صاحب کے حالات کیا ہیں۔ اگر آپ صاحبان نے اس پر مزید غور کیا ہو تو مطلع فرمایئے۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ سید راس مسعود صاحب کی خدمت میں سلام عرض کیجئے۔

محمد اقبال لاہور"

صرف ۱۳ دن کے وقفے کے بعد علامہ نے ڈاکٹر سید ظفر الحسن کو ایک اور خط ارسال کیا۔ اس خط میں علامہ مجوزہ جماعت کے بارے میں بھی پر امید نظر آتے ہیں اور عالم اسلام کے مستقبل کے بارے میں بھی۔ خط کی عبارت ملاحظہ ہو!

"۱۹/ مارچ ۳۳ء
ڈیئر ڈاکٹر صاحب
السلام علیکم!

آپ کا خط مل گیا ہے جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ میں نے افغانستان پیغام بھیج دیا ہے، جواب آنے پر مطلع کروں گا۔ میرے خیال میں وہ تجویز نہایت اچھی تھی اور اس قابل ہے کہ اسے جامہ عمل پہنایا جائے۔ خیری صاحب مجھ سے دہلی میں ملے تھے۔ معلوم ہوتا ہے وہ اس تجویز کو فراموش کر چکے ہیں۔ مگر میرا عقیدہ ہے کہ ایک اچھی جماعت اس کے لئے تیار ہے۔

ممالک اسلام میں بیداری کی لہر دوڑ رہی ہے، خصوصاً ممالک عرب میں۔ یورپ میں باوجود سیاسی انہماک کے اسلام کے متعلق بے انتہا دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ ہسپانیہ کے عربی الاصل لوگوں میں ایک نیا قومی شعور پیدا ہو رہا ہے۔ وسطی یورپ میں اسلام کے متعلق بے انتہا دلچسپی بالخصوص بڑھ رہی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کا اصل کام یعنی مشرق و مغرب کا انہی ممالک سے شروع ہو گا۔ افسوس میرے پاس روپیہ نہ تھا ورنہ ان ممالک کا سفر بھی کرتا۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

مخلص محمد اقبال"

اس کے قریباً دو ماہ بعد ۲۷ / مئی کو علامہ اقبال کو ڈاکٹر سید ظفر الحسن کی جانب سے ایک مفصل خط موصول ہوتا ہے جس میں اس اسکیم کو فوری طور پر عملی جامہ پہنانے کے ضمن میں ایک معین تجویز کا بھی ذکر ہے اور جماعت کی تنظیمی ہیئت سے متعلق بعض مزید تفاصیل بھی مذکور ہیں۔ اسی طرح ابتدائی نقشہ کار کا ایک اجمالی خاکہ بھی اس خط کے ذریعے سامنے آتا ہے۔ خط کے ساتھ ایک الگ کاغذ پر اس حلف یا بیعت کے الفاظ بھی علامہ کے ملاحظے اور مشورے کے لئے درج کئے گئے تھے جو امیر ہر رکن سے لے گا۔ اس اہم خط کا متن حسب ذیل ہے :

"۲۷ / مئی ۳۳ء

بخدمت ڈاکٹر سر محمد اقبال

محترم تسلیم!

میں اسی خیال میں اب بھی غلطاں و پیچاں ہوں جس کی گفتگو سال گزشتہ کشمیر سے لوٹتے ہوئے لاہور میں آپ سے ہوئی تھی۔ اس کے مناسب جو تعلیم و تربیت نوجوانوں کو زمانہ تعلیم میں دی جا سکتی ہے یہاں جاری کر دی ہے۔ باہر بھی کام شروع ہو جانا چاہئے۔ اس کے متعلق مجھے آپ سے کلی اتفاق ہے کہ دس بارہ ہم خیال اور ممتاز مسلمان ایک جگہ جمع ہو جائیں اور ایک امیر منتخب کر لیں اور دنیا میں اس کا اعلان ہو جائے۔

اس غرض کے لئے میں نے ایک تحریر لکھی ہے جو آپ کے ملاحظہ کے لئے ملفوف ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ یہ تحریر نیز دیگر ضروری ہدایات لے کر میر نیرنگ پنجاب کے دورے کے واسطے اٹھیں اور اہل لوگوں سے جابجا ملیں اور بالمشافہ گفتگو کریں۔ اس سلسلے میں غالباً وہ آپ سے خط و کتابت بھی کریں گے اور آپ کی خدمت میں بھی آئیں گے تاکہ مفصل گفتگو ہو جائے۔

دو کاغذ اور ملفوف ہیں ایک میں تو وہ حلف یا بیعت ہے جو امیر ہر رکن سے لے گا۔ دوسرے میں وہ وعدے ہیں جو غایت قصویٰ کو حاصل کرنے کے لئے فی الحال جملہ ارکان سے لینے چاہئیں۔

میری رائے میں ارکان کی دو قسمیں ہوں گی، عام اور خاص۔ عام سے بیعت اس پر لی جائے گی کہ وہ مسلمانوں کے عروج و اقبال کو اپنی غایت بنائیں گے اور خواص وہ ہوں گے جو راز کے متحمل ہو سکیں۔ انہیں عروج و اقبال کے اصلی معنی سمجھا دیئے جائیں گے۔ عہدہ دار اور کارکن خواص میں سے ہوں گے۔ خواص ہی میں سے مجلس شوریٰ ہو گی۔ مجلس شوریٰ محض ایک مشاورتی جماعت ہو گی۔ فصل امور کا حق اصولاً فقط امیر کو ہو گا یعنی امیر انتخاب سے ہو گا لیکن اختیارات اس کے تام ہوں گے۔

امیر کا عزل و نصب ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔ اس کی صورت ایسی ہونی چاہئے جس میں جمہوریت فرنگ کے مضار کم سے کم ہوں اور اوائل اسلام کی روایات زیادہ سے زیادہ۔ بہت سی ردو قدح اور غور و فکر کے بعد جو اس کی صورت سمجھ میں آئی ہے وہ بھی میر نیرنگ آپ سے عرض کریں گے۔

کام کو پنجاب سے شروع کرنا چاہئے، جب وہاں کچھ تقویت پکڑ جائے تو فوراً سندھ، سرحد اور بلوچستان میں بھی شروع کر دیا جائے۔

پنجاب کا امیر، امیر لاہور کہلائے کیونکہ اس میں گنجائش رہے گی کہ حسب ضرورت اس کا احاطہ اقتدار وسیع کیا جا سکے۔ غالباً اسے ہی آئندہ سب مسلمان صوبوں کا امیر بننا ہو گا۔

جماعت کا نام جماعت مجاہدین بہتر معلوم ہوتا ہے۔ ملک کی سیاسیات میں اس

وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم تمام مسلمان صوبوں یعنی پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان نیز بنگال کے مابین مفاہمت کو اپنا نصب العین بنائیں۔ زیر تجویز سکیم کے جاری ہو جانے کے بعد کوئی مناسب موقعہ نکال کر پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان کی ایک فیڈریشن بنوانے کو اپنا نصب العین بنالیں جو باقی ہندوستان سے بالکل علیحدہ ہو یعنی جس کی فوج خزانہ وغیرہ اپنا ہو۔

جماعت کا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کی فوجی تنظیم بہت تیزی کے ساتھ کرلی جائے یعنی قوائے جسمانی کی درستی۔ لکڑی اور ہتھیار چلانے کی قابلیت بہتر اجتماعی اور انفرادی مدافعت و مجارحت کے طریقے مسلمانوں میں عام ہو جائیں اور وہ سب ایک نظم میں منضبط ہوں تاکہ انہیں دبانا اور مٹانا آسان نہ رہے۔

اس کے ساتھ ہی بعض اصولی اصلاحیں مسلمانوں کی اقتصادی اور معاشرتی زندگی میں ضروری ہیں اور ان کے تحت میں اخلاقی اور روحانی اصلاحیں۔

رائے عالی سے مطلع فرمائیے۔ میں ابھی چند دنوں تک یہاں ہوں۔

والسلام ظفرالحسن"

اب تک کی خط و کتابت سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ معاملہ بتدریج آگے بڑھ رہا تھا۔ تشکیل جماعت کے ابتدائی مراحل طے کرلئے گئے تھے اور اب یہ قافلہ جادہ پیائی کے لئے پر تول رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب کی روایت کے مطابق ایک خاص سبب سے ڈیڑھ پونے دو برس کا عرصہ تعطل کا گزرا۔ ہوا یہ کہ اس دوران افغانستان کے فرمانروا غازی نادر خان نے افغانستان میں تعلیمی اصلاحات کا اعلان کیا۔ نادر خان نے یہ طے کیا کہ یہ اصلاحات علامہ اقبال، سر راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی کے مشورے پر مبنی ہوں گی۔ چنانچہ علامہ کو اس ضمن میں مذکورہ حضرات کے ساتھ کابل کا سفر کرنا پڑا۔ آپ کچھ روز وہاں قیام پذیر بھی رہے۔ اس وفد کی واپسی کے کچھ ہی عرصہ بعد کابل سے یہ افسوسناک خبر موصول ہوئی کہ نادر شاہ بھرے دربار میں شہید کر دیئے گئے۔ چنانچہ اس کے بعد کچھ عرصہ افسردگی اور خاموشی کا گزرا جس کے دوران "جماعت مجاہدین" کے باب میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ پھر اغلباً ۱۹۳۴ء کے اواخر میں میر سید

غلام بھیک صاحب نیرنگ نے جو تشکیل جماعت کے ضمن میں ڈاکٹر سید ظفرالحسن کے ہم خیال تھے، سلسلہ جنبانی کیا جس کا اندازہ علامہ کے نام میر صاحب کے اس خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے ۱۵/ جنوری ۱۹۳۵ء کو انبالہ سے تحریر کیا :

"مکرمی ڈاکٹر صاحب، السلام علیکم

کاغذات مرسلہ کی رسید پہنچ گئی۔ آپ کی تحریر کردہ باقی ماندہ کاغذات کی تلاش کی تو وہ مل گئے۔ علیحدہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ بھی بھیجتا ہوں۔

آپ کارروائی کیجئے۔ میں تو اب بے حد بے فرصت ہو گیا ہوں۔ مسودات کی تیاری خود آپ کی ہدایت سے آپ کے روبرو ہونی چاہئے۔ البتہ کسی وقت حسب ضرورت میں لاہور حاضر ہو سکتا ہوں۔ ڈاکٹر ظفرالحسن صاحب کو بھی لکھ لیجئے کہ بوقت ضرورت آنے کو آمادہ رہیں۔ زیادہ نیاز۔

والسلام

بندہ غلام بھیک نیرنگ

۱۵-۱-۳۵"

حضرت علامہ کی جانب سے اس خط کا فوری رد عمل ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب کے نام ان کے اس خط کی صورت میں ظاہر ہوا جو ۱۷ جنوری ۳۵ء کا تحریر کردہ ہے۔ اس خط سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اس دوران میں علامہ کے ایک عقیدت مند خواجہ عبدالوحید صاحب نے علامہ ہی کے ایما پر بعض احباب کے ساتھ مل کر جماعت مجاہدین' علی گڑھ کے طرز پر لاہور میں جمعیت شبان المسلمین ہند کی تاسیس کے منصوبے پر کام کا آغاز کر دیا تھا۔ (اس کی تفصیل ہمارے اس بیان میں ذرا آگے چل کر آئے گی) علامہ لکھتے ہیں :

"ڈیئر ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم

معاملہ معلومہ کے متعلق میر صاحب نے انبالے سے تمام کاغذات مجھے بھیج دیئے ہیں، کچھ باقی رہ گئے وہ بھی آج مل گئے ہیں۔ اگر آپ کے غور و فکر کا کچھ مزید نتیجہ نکلا ہو وہ بھی لکھ کر ارسال کر دیجئے۔ شاید خواجہ وحید صاحب نے آپ کو لکھا ہو گا۔ یہاں کے لوگوں نے بھی تجویز کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا ہے۔ اگر کوئی

اچھی جمعیت پیدا ہو گئی تو میں آپ کو اور میر صاحب کو چند گھنٹوں کے لئے لاہور آنے کی تکلیف دوں گا۔ آپ اس مہم کے لئے آمادہ رہئے۔ بچے کی دعا!

محمد اقبال لاہور

۱۷ جنوری ۳۵ء"

ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے بھی حضرت علامہ کے اس خط کا جواب تحریر کرنے میں کوئی تاخیر نہیں کی۔ ان کے جوابی خط پر ۱۹ جنوری کی تاریخ درج ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس روز علامہ کا خط انہیں موصول ہوا اسی روز انہوں نے مفصل جوابی خط سپرد ڈاک کر دیا۔ اس خط میں جماعت مجاہدین کی تنظیمی ہیئت کے ضمن میں بعض مزید تفصیلات بھی مذکور تھیں۔ خط کا متن درج ذیل ہے :

"۱۹/ جنوری ۳۵ء

محترم۔ تسلیم

خواجہ وحید صاحب کی تحریر سے ایک شائبہ سا پیدا ہوا تھا۔ آپ کے کارڈ نے جان ڈال دی۔ خدا کرے یہ کام ہو جائے۔ میں ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ آؤں گا اور ایک نظم میں امیر کے حضور میں نذر گزاروں گا۔

ڈیڑھ دو سال سے منظم طور پر کام ہو رہا ہے۔ اس کا پہلو تلقین ہے۔ خیالات کی ایک محدود اور منتخب جماعت خاص بن گئی ہے مگر نشر خیالات عام ہے۔ پس اندریں اثناء ہم اسی پہلو سے غور بھی کرتے رہے ہیں۔ اس لئے کوئی نئی بات عرض نہیں کر سکتا۔

ڈھائی سال ہوئے بہت غور و تمحیص کے بعد ایک پورا نظام تجویز کیا تھا۔ اس کی تدوین خیری صاحب کے سپرد ہوئی۔ وہ ذرا نامکمل رہ گئی اور اس میں عربی مصطلحات کا ذکر زیادہ آگیا۔ اس پر نظر ڈال کر بذریعہ رجسٹری آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ نقل کروالیں اور اصل مجھے واپس فرمادیں۔

اس سلسلے میں چند امور عرض کردوں جو ان کاغذات میں نہیں ہیں :

۱ ۔ فدا کاروں کی ایک جماعت خفیہ ہو گی جو امیر کے ہاتھ میں تلوار کی طرح کام کرے گی۔ اس کا نظام بہت سوچ کر طے ہو گا۔ اس پہلو پر ارشاد ہو تو اپنے

اور خیری صاحب کے خیالات عرض کروں گا۔

۲ ۔ ارکان خاص میں وہ لوگ نہیں لئے جائیں گے جن کے اصول مذہبی اس جماعت کے اصول کے منافی ہیں، مثلاً قادیانی۔

اگر ارکان خاص میں انکا لینا نظریہ مصلحت سے جائز رکھا جائے تو یہ ایک وقتی ہنگامی، اضطراری امر کی طرح ہونا چاہئے کہ یہ لوگ امیر جماعت ہندو غیرہ نہیں بن سکتے اور نہ اس کی جماعت عاملہ میں لئے جائیں گے اور نہ فداکاروں میں۔ ایک مختصر سافنڈ بھی میرے پاس جمع ہے۔

اعضائے عام یعنی ارکان عام سے بیعت کی صورت... خدا کو حاضر و ناظر جان کر پورے صدق اور تہ دل سے عہد کرتا ہوں کہ :

- ہندوستان میں مسلمانوں کا عروج و اقبال ہمیشہ میری غایت ہوگی اور اس غایت کو حاصل کرنے کے لئے میں اپنی جان، مال، آسائش اور عزت سب کچھ قربان کرنے کو ہمیشہ تیار اور آمادہ رہوں گا۔
- اس غایت کو حاصل کرنے کے واسطے جو حکم امیر مجھے دے گا اس کی بے چون و چرا بدل و جان تعمیل کروں گا۔

اعضائے خاص سے جو بیعت خاص لی جائے گی اس میں غایت ہوگی "اسلامی اصول پر حکومت قائم کرنے کی"۔ باقی وہی جو اعضائے عام کی بیعت میں ہے۔

میں نے آغا خان سے بھی اس باب میں چھیڑ چھاڑ شروع کی تھی۔ اپنے اور ان کے خط کی نقل ملفوف کرتا ہوں، ان تلوں میں کچھ تیل ہو تو نکالا جائے۔

بچہ (احمد) سلام عرض کرتا ہے اور آپ کو اکثر یاد کرتا رہتا ہے۔ بانگ درا کو بہت شوق سے پڑھتا ہے۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

خادم، ظفر"

اپنے اس خط کے آخر میں ڈاکٹر سید ظفر الحسن نے ایک نوٹ کا اضافہ بھی کیا تھا۔ یہ نوٹ بھی چونکہ ہمارے اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے لہٰذا اسے بھی ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے :

"نوٹ : ہماری غایت اصل میں سارا عالم ہے مگر بہ ضرورت وہ اس تدریج کے ساتھ محدود ہوتا چلا جاتا ہے۔

دنیا۔ دنیائے اسلام، ہندوستان، مسلم انڈیا (اسلامی ہند) شمال مغربی ہند۔ پس عملاً ہمیں معکوس تدریج سے اپنی غایت کو وسعت دیتے رہنا ہوگا۔
۱۔ شمال مغربی ہند ۳ ۲۔ بنگال آسام ۳۔ شمالی ہند
۴۔ ہندوستان ۵۔ دنیائے اسلام ۶۔ دنیا۔

یہ تنظیم پہلے پنجاب اور پھر صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان سے چلے گی۔ یہاں کام پوری طرح منتقل ہو جائے تو پھر باقی شمال و مشرقی ہندوستان یعنی صوبہ متحدہ، بہار، بنگال و آسام میں پھیلایا جائے، اس کے بعد جنوبی ہند میں۔

تحریک کے غیر فرقہ وارانہ کردار کو اول دن سے قائم رکھنا چاہئے تاکہ کبھی یہ تحریک فرقہ واریت کا شکار نہ ہونے پائے اور شمال مغربی ہند میں کام شروع ہونے کے بعد جلد شمال مشرقی اور جنوبی ہند میں شروع کر دیا جائے"۔

☆ ☆ ☆

علامہ اقبال اور ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب کی اس باہمی خط و کتابت اور بالخصوص ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب کے نام حضرت علامہ کے مذکورہ بالا خط (مرقومہ ۱۷/ جنوری) اور ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب کی جانب سے اس کے مفصل جواب کو اگر بیک نگاہ سامنے رکھا جائے اور ان خطوط کے متون کے ساتھ ساتھ ان کے بین السطور عبارتوں کو بھی اگر پڑھنے کی کوشش کی جائے تو درج ذیل امور نکھر کر سامنے آتے ہیں:

۱) حضرت علامہ اور ڈاکٹر سید ظفر الحسن، دونوں اس کام کو آگے بڑھانے اور بھرپور جماعتی جدوجہد کا آغاز کرنے کے لئے بے تاب تھے۔

۲) لاہور میں علامہ اپنے طور پر، اپنے ایک قریبی ساتھی اور عقیدت مند خواجہ عبدالوحید صاحب کے ذریعے جنوری ۱۹۳۵ء میں فدائین کی ایک جماعت کی ترتیب و تشکیل کے کام کا آغاز کر چکے تھے۔

۳) جماعت مجاہدین علی گڑھ نے اس سے ڈیڑھ دو سال قبل ابتدائی سطح کی دعوتی سرگرمیوں کا آغاز منظم انداز میں کر دیا تھا۔ تاہم ڈاکٹر سید ظفر الحسن اس بات کے

---

۳ یعنی موجودہ پاکستان جس کی "بشارت" حضرت علامہ نے خطبہ الٰہ آباد میں دی تھی۔

شدت کے ساتھ متمنی تھے کہ سالار قافلہ کے طور پر علامہ اقبال قیادت و رہنمائی کے منصب پر فائز ہوں تاکہ انکے زیر امارت اس کام کو بھرپور اور موثر انداز میں آگے بڑھایا جا سکے۔ چنانچہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن نے اپنے خط میں اپنی جس خواہش کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے کہ :"خدا کرے یہ کام ہو جائے۔ میں ایک نہیں ہزار دفعہ آؤں گا اور ایک نظم میں امیر کے حضور نذر گزاروں گا" اس کی وضاحت میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی لکھتے ہیں :"امیر کی خدمت میں جو نظم پیش کرنے کے لئے کہا گیا تھا اس کے نذر کرنے کی نوبت اس لئے نہ آسکی کہ علامہ اقبال کی صدارت میں اس جماعت کا قیام اور اس کے قیام کا اعلان ملتوی ہوتا رہا"۔ گویا یہاں "امیر" سے مراد خود حضرت علامہ ہیں۔

۴) اس جماعت کے بارے میں یہ طے کر لیا گیا کہ یہ ٹھیٹھ اسلامی اصولوں یعنی نظام بیعت پر استوار ہو گی جس کے ارکان کے لئے امیر کے ہر حکم کی بے چون و چرا اور بہ دل و جان اطاعت لازم ہو گی۔ گویا "سمع و طاعت" کا اصول اپنی حقیقی صورت میں یہاں نافذ و جاری ہو گا۔ گو ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب کے خط میں "سمع و طاعت" کے ساتھ "فی المعروف" کی شرط مذکور نہیں ہے، تاہم ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اتنی بین حقیقت ہے کہ اس کی صراحت کی ضرورت انہوں نے محسوس نہیں کی اور اسے از خود شامل سمجھا۔

۵) مجوزہ جماعت کے بارے میں یہ بھی طے کیا گیا کہ اس میں امیر کو کلی اختیارات حاصل ہوں گے۔ مجلس شوریٰ کا کام فقط مشورہ دینا ہو گا نہ کہ کثرت رائے سے فیصلہ کرنا۔ نیز یہ کہ امیر کو مجلس شوریٰ کی تمام تحریکوں اور فیصلوں کو بر طرف کر دینے کا اختیار بھی حاصل ہو گا، جسے عرف عام میں "ویٹو" (VETO) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۶) "صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم" کے مصداق اس جماعت میں فداکاروں کی ایک خفیہ جماعت امیر کے ہاتھ میں تلوار کی طرح کام کرے گی۔ اور اس جماعت میں ارکان دو طرح کے ہوں گے : i) عام ارکان، اور ii) ارکان خاص۔

۷) اگرچہ اس جماعت کے تمام ارکان ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج و اقبال کی

خاطر اپنا تن من دھن نچھاور کرنے کا عہد اور امیر کے ہاتھ پر سمع و طاعت کی بیعت کریں گے، تاہم اس جماعت کی ریڑھ کی ہڈی کا مقام ارکان خاص کو حاصل ہو گا۔ ان سے جو بیعت لی جائے گی اس میں غایت اور مقصود کے طور پر "ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج و اقبال" کا ذکر نہیں ہو گا بلکہ "اسلامی اصولوں پر حکومت قائم کرنا" غایت کے طور پر متصور ہو گا۔

۸) جماعت کے تمام اہم مناصب صرف ارکان خاص کے لئے مخصوص ہوں گے اور "فدا کاروں" کی جماعت بھی انہی میں سے ترتیب دی جائے گی۔

۹) جماعت مجاہدین علی گڑھ کے پیش نظر اصلاً پوری دنیا میں اسلامی اصول پر حکومت قائم کرنا یعنی دین حق کا عالمی غلبہ تھا، لیکن ظاہر بات ہے کہ جماعت کے موسسین اس بات کو بخوبی جانتے اور سمجھتے تھے کہ یہ کام مرحلہ وار ہی ممکن ہے۔ اس کا آغاز کسی ایک خطے سے ہو گا اور پھر یہ معاملہ بتدریج وسعت پذیر ہو گا۔ چنانچہ یہ اسی حقیقت پسندی کا مظہر ہے کہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن نے اپنے لئے کام کی جو ترتیب معین کی اس میں انہوں نے اپنا ہدف اول شمال مغربی ہند کو قرار دیا ہے۔ اس حد تک غایت کی تکمیل کے بعد بنگال و آسام تک اس کام کو وسعت دینا، پھر شمالی ہند تک، اس کے بعد پورے ہندوستان پر، پھر دنیائے اسلام پر اور آخر میں پوری دنیا پر اسلامی حکومت کا قیام ان کے پیش نظر تھا۔

گویا ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت کا مکمل نقشہ ہم اس خاکے میں دیکھ سکتے ہیں۔ اور ہمارے لئے نہایت اطمینان کی بات یہ ہے کہ تنظیم اسلامی کی اٹھان بھی بحمد اللہ تقریباً انہی خطوط پر ہوئی ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ طریق تنظیم براہ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت اور اسلام کے قرن اول سے ماخوذ ہے، اور ہمیں خوشی ہے کہ حکیم الامت اور مجدد فکر اسلامی، علامہ اقبال اور ان کے نیاز مند ڈاکٹر سید ظفر الحسن نے بھی جو خود اپنی جگہ علم و فضل کا کوہ ہمالہ تھے، نظام بیعت و امارت ہی کو صحیح اسلامی اصول جماعت قرار دیا۔ یہی نہیں بلکہ جماعت کی تنظیمی ہیئت سے متعلق تفصیلی خاکہ جو انہوں نے مرتب کیا وہ بھی بہت سے اعتبارات سے حیرت انگیز طور پر تنظیم اسلامی کے نظام کے مشابہ اور

مماثل ہے۔ گویا "متفق گردید رائے بوعلی بارائے ما"۔ لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت علامہ کی حیات کے اس اہم گوشے اور ایک اسلامی انقلابی جماعت کی ہیئت تنظیمی کے بارے میں حضرت علامہ کے خیالات و نظریات سے تنظیم اسلامی کے امیر اور ان کے ساتھی تاحال بے خبر تھے، اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی یہ وقیع تصنیف اگر منظر عام پر نہ آتی تو آئندہ بھی شاید ہمیشہ کے لئے بے خبر ہی رہتے۔ اس کے باوجود اکثر جزئیات تک میں کامل اتفاق کا پایا جانا انتہائی حیران کن ہے اور یقینی طور پر اس امر کا مظہر ہے کہ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کو علامہ اقبال کے ساتھ صرف ذہنی و فکری ہی نہیں ایک خصوصی روحانی نسبت بھی حاصل ہے۔ (جاری ہے)

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ ﷺ:

((إِنَّ الرَّجُلَ الَّذِي لَيْسَ فِي جَوْفِهِ مِنَ الْقُرْآنِ شَيْءٌ كَالْبَيْتِ الْخَرِبِ))

رواہ احمد والترمذی، وقال: حسن صحیح

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:
"جس شخص کے سینے میں قرآن میں سے کچھ بھی محفوظ نہ ہو وہ ویران گھر کی مانند ہے۔"

ضرورت رشتہ

شادمان میں سرکاری رہائش میں مقیم وزارت دفاع کے ایک گزیٹڈ آفیسر کو دوسری شادی (اولاد نہ ہونے کی وجہ سے) دینی مزاج کے حامل گھرانے سے نیک سیرت، شرعی پردہ کرنے والی اور تعلیم یافتہ دوشیزہ کا رشتہ درکار ہے۔

برائے رابطہ: محمد عطاء اللہ صدیقی، ۸۵۔ شاہ جمال، لاہور

انجمن کے بعد تنظیم کیوں؟

(جولائی ۷۴ء میں راقم الحروف نے اپنی جس تقریر میں تنظیم اسلامی کے قیام کا اعلان کیا اور جو اب "عزمِ تنظیم" کے نام سے طبع ہوتی ہے وہ اواخر ۷۴ء میں "میثاق" میں راقم کی اس تحریر کے ساتھ شائع ہوئی جو اب "تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر" کے عنوان سے طبع ہوتی ہے..... اس پر ایک مخلص کرم فرما کی جانب سے ایک مفصل خط موصول ہوا کہ اس سے کرنے کا وہ "اصل کام" رہ جائے گا جس کا تذکرہ "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ" میں کیا گیا ہے.... اس پر جو خط راقم نے انہیں تحریر کیا تھا اس کی حیثیت اب ایک تاریخی دستاویز کی ہے' لہٰذا وہ رفقائے تنظیم اسلامی کے افادہ کے لئے ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے.... اسرار احمد عفی عنہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

۱۱۔ افغانی روڈ' سمن آباد' لاہور

۳/مارچ ۱۹۷۵ء

برادر مکرم' وفقنا اللہ وایاکم لما یحبُ ویرضٰی!

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!!

امید ہے کہ آپ مع اہل خانہ و جملہ احباب و رفقاء بخیر و عافیت ہوں گے'

----- آپ کا یکم دسمبر ۷۴ء کا مرقومہ اور لگ بھگ ۲۰/جنوری ۷۵ء کا موصولہ سترہ صفحات پر مشتمل گرامی نامہ پیش نظر ہے۔ اس دوران میں کئی بار اس کا جواب تحریر کرنے کی غرض سے اسے

از ابتدا تا انتہا پڑھا۔ لیکن پھر کوئی چیز ایسی سامنے آگئی کہ ادھر متوجہ ہو جانا پڑا اور جواب رہ گیا۔
-----مجھے آپ سے ایک "حسنِ ظن" تو یقیناً تھا۔ لیکن اتنا ہرگز نہ تھا جتنا اس خط کے بعد ہو گیا ہے۔ احیائے اسلام کی "آرزو" (آپ کے پاس تو یقیناً اپنے خط کی نقل نہ ہوگی۔ اس لئے آپ کے الفاظ for ready reference درج کئے دیتا ہوں: "....اس جسارت کی محرک آپ سے ایک نسبت ہے۔ احیائے اسلام کی جس تڑپ نے آپ کو عملِ پیہم پر اکسایا ہے وہ ایک آرزو کی شکل میں میرے دل میں بھی نشوونما پاتی رہی ہے....") بھی اس دور میں بسا غنیمت ہے 'بقول علامہ اقبال ع "مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار!" اور "آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں---اور ہو جائے تو مرجاتی ہے یا رہتی ہے خام!"----اب اگر یہ آپ کے "دل میں نشوونما پاتی رہی ہے!" تو اور کیا چاہئے؟ فھو المطلوب! آرزو حقیقی اور طلب صادق ہو تو وہ اپنے لئے عمل کی راہیں خود پیدا کر لیتی ہے---- جلد نہ سہی ذرا دیر سے سہی! کسی اور کے ساتھ نہ سہی اپنے طور پر سہی!
(ع "تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن!")

آپ نے میری تحریروں میں سے "نشأۃِ ثانیہ" کو بجا طور پر اہمیت دی ہے۔ میں خود بھی محسوس کرتا ہوں کہ میری اب تک کی سوچ کا نقطہ عروج وہی ہے! مجھے بخدا نہ مفکر ہونے کا دعویٰ ہے نہ متفکر ہونے کا (حال ہی میں ایک رسالے میں ان دو الفاظ کے مابین فرق پر بحث نظر آئی ہے!) تاہم میری تحریکی یا احیائی سوچ جیسی کچھ اور جتنی کچھ بھی ہے اس میں عمودی بلندی یا گہرائی کے اعتبار سے اہم ترین تحریر "نشأۃ ثانیہ" والی ہی ہے البتہ افقی وسعت کے اعتبار سے میری سب سے زیادہ اہم وہ تحریر ہے جو اکتوبر نومبر ۷۴ء کے میثاق میں بطور "تذکرہ و تبصرہ" شائع ہوئی ہے! (مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اسے آپ نے کچھ زیادہ ہی رواروی میں پڑھا ہے۔ کیا اس پر ایک نگاہ بازگشت کے لئے وقت نکال سکیں گے؟) (نوٹ : یہ تحریر اب "تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر" کے عنوان سے طبع ہوئی ہے!)

آپ نے میری اس تحریر کے غالباً صرف اس حصے سے اختلاف ظاہر کیا ہے جو تبلیغی جماعت کی تحسین پر مشتمل ہے۔ بقیہ پورے مضمون کے Main line of Argument سے اغلباً

آپ کو کامل اتفاق ہے۔

آپ کو اصل اندیشہ، جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں، یہ ہے کہ تنظیم اسلامی کی وسیع تر سرگرمیوں اور اس کی گراں تر ذمہ داریوں کے باعث "اسلام کی نشاۃ ثانیہ" کے لئے "کرنے کا اصل کام" رہ جائے گا۔ خصوصاً جبکہ میری قوتِ کار یا صلاحیتِ کار جتنی ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ ایک ماہنامہ تو میں صحیح طرح چلا نہیں پایا!---- مزید بر آں یہ کہ "انجمن خدام القرآن کے دائرۂ کار میں رہ کر آخر ایسی کونسی مشکل نظر آئی کہ ایک نئی جماعت بنانے کا ارادہ کر لیا؟"

----(ا) اس سلسلے میں اولین بات تو یہ پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ دنیا میں علمی و فکری---اور تحقیقی و تصنیفی کام صرف دو طریقوں سے ممکن ہیں۔ یا تو یہ کام حکومت کی زیرِ سرپرستی یا صحیح تر الفاظ میں نیم سرکاری اداروں کے تحت ہوتے ہیں جہاں کھلے وسائل موجود ہوں اور محققین و مصنفین کو باوقار مشاہرے دیئے جا سکیں---یا پھر یہ کام کسی زوردار انقلابی دعوت کو لے کر اٹھنے والی تحریکوں اور جماعتوں کے زیرِ اہتمام ہو سکتا ہے جو ایک طرف ایسے محققین اور مصنفین پیدا کر سکیں جو مشاہروں سے بے پروا ہو کر محض مقصدِ زندگی کی دھن اور لگن میں اپنے آپ کو کھپا دیں اور دوسری طرف عوام میں اس کام کی اہمیت کا اتنا احساس اور شعور ضرور اجاگر کر دیں کہ اس کے لئے جو کم از کم اور ناگزیر وسائل ضروری ہوں ان کی مسلسل اور uninterrupted بہم رسانی جاری رہے----ان دو کے علاوہ کوئی تیسری ممکن صورت کم از کم میرے علم میں موجود نہیں ہے!

ان میں سے بھی پہلے طریقے پر کوئی تخلیقی کام کبھی نہیں ہوا۔ سرکاری یا نیم سرکاری اداروں کے تحت صرف آثارِ قدیمہ کی چھان پھٹک کی قسم کا کام ہو سکتا ہے جس سے "تراثِ علمی" (Academic Heritage) کی حفاظت کی خدمت تو سرانجام پا سکتی ہے کوئی تعمیری خدمت ممکن نہیں۔ لہٰذا "احیائے اسلام" کے لئے جس نوع کا علمی کام مطلوب ہے اس کے لئے اب صرف ایک راہ کھلی رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک زبردست تحریک برپا ہو جو اولاً احیائے دین کی تڑپ اور لگن بیدار کر دے---اور ساتھ ہی اس کے لئے جو اہمیت اس علمی کام کی ہے اسے واضح کرے تاکہ ایک طرف اس کے لئے وسائل pool ہو سکیں----اور دوسری طرف وہ نوجوان مل سکیں جو اس کے لئے عمریں کھپا دینے کا عزم مصمم کر لیں----

یہی وجہ ہے کہ خود نشأۃِ ثانیہ میں میں نے (صفحہ ۱۲ اپر) عملی اقدامات کے عنوان کے تحت قرآن اکیڈمی کے ذکر سے بھی پہلے دعوت و تبلیغ کے ایک عمومی ادارے کے قیام کی ضرورت کا ذکر کیا ہے بایں الفاظ:

"ایک یہ کہ عمومی دعوت و تبلیغ کا ایک ایسا ادارہ قائم ہو جو ایک طرف تو عوام کو تجدید ایمان اور اصلاح اعمال کی دعوت دے اور جو لوگ اس کی جانب متوجہ ہوں ان کی ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی تربیت کا بندوبست کرے اور ساتھ ہی اس علمی کام کی اہمیت ان لوگوں پر واضح کرے جو خلوص اور دردمندی کے ساتھ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے آرزومند ہوں اور دوسری طرف ایسے ذہین نوجوان تلاش کرے ..... "الخ

جون ۶۷ء میں میں نے میثاق میں وہ تحریر لکھی تھی جو اب نشأۃِ ثانیہ نامی پمفلٹ کی صورت میں موجود ہے اور اسی سال کے اواخر میں عین اسی ضرورت کے تحت تنظیم اسلامی کے قیام کی سعی ہوئی --- یہ دوسری بات ہے کہ وہ بعض وجوہ سے ناکام ہو گئی۔ لیکن اس وقت عرض یہ کرنا ہے کہ اس کا قیام "نشأۃِ ثانیہ" کے اس پروگرام ہی کا ایک جزو تھا۔ نہ کہ اس سے باہر یا اس کے خلاف!

-----(۲) دوسری اہم اور توجہ طلب بات یہ ہے کہ ---- "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ" یا "تجدید و احیائے دین" ایک اجتماعی مسئلہ ہے جبکہ "نجاتِ اخروی" کا حصول ہر مسلمان کا ذاتی اور انفرادی مسئلہ ہے۔ ضروری نہیں کہ جو کام احیائے اسلام کے عظیم تر منصوبے کے اعتبار سے مقدم یا اہم تر ہو وہی ہر فرد کے ذاتی و انفرادی نقطۂ نظر سے بھی مقدم اور اہم تر ہو ---- پھر کون نہیں جانتا کہ علمی و فکری کام کرنے کی صلاحیت تو کسی کسی ہی میں ہوتی ہے ---- جبکہ فلاحِ اخروی کا حصول ہر انسان کے لئے ضروری و لابدی ہے: اس پہلو سے دیکھئے تو تنظیم اسلامی کا قیام "گھوڑے کے آگے گاڑی جوتنا" نہیں بلکہ ٹھیک گھوڑے کو گاڑی کے آگے جوتنے ہی کا مصداق نظر آئے گا۔ فَافْهَمْ وَتَدَبَّرْ!

-----(۳) رہا مسئلہ میری قوتِ کار یا صلاحیت ----- یا خصوصاً تنظیمی استعداد کا ---- تو واقعہ یہ ہے کہ خود مجھے سب سے زیادہ کمزور پہلو یہی نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ایک بہت ہی کمزور اور بے صلاحیت انسان ہوں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے ذہن ضرور رسا عطا فرمایا ہے اور سمجھ کی گہرائی بھی عطا فرمائی ہے اور یہ بھی اس کی بڑی نعمت ہے (وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ!) لیکن واقعہ

یہ ہے کہ اس کی مناسبت سے قوتِ کار یا صلاحیتِ عمل مجھ میں موجود نہیں ہے۔ اور میں خدا کو حاضر ناظر جان کر عرض کرتا ہوں کہ اگر کوئی دوست یا بزرگ مجھے مطمئن کر سکتا کہ استعداد کی کمی یا صلاحیت کے فقدان کے باعث تم اس فریضۂ دینی سے بَری ہو گئے ہو تو میں ان کا عظیم احسان اپنے اوپر سمجھتا' لیکن میرا حال بخدا یہ ہے کہ جو لوگ اس جانب سے مطمئن ہو کر بیٹھ رہے ہیں ان کو دیکھ کر دل سے یہ صدا نکلتی ہے کہ۔

کاش! شویم تسلّا بہ لاف و لاغ ماہم
روداً می خوشنود چہ دوست بزمِ ز ناداں

اس مسئلے سے متعلق اصلاً تو مجھے صرف یہی کہنا ہے کہ ----- "جزدار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ۔ ناچار گنہگار سوئے دار چلے ہیں!" (فیض) ویسے محض تفننِ طبع کے طور پر ذکر کر رہا ہوں کہ خصوصاً میثاق کی اشاعت کی بے قاعدگی کے ذکر سے یاد آیا کہ مرحوم شیخ محمد اکرام نے مولانا مودودی کے بارے میں بھی یہی لکھا تھا کہ ----- "تعجب کی بات ہے کہ ایک شخص بات تو حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی کرتا ہے اور وہ بھی کسی محدود خطے میں نہیں پورے روئے زمین پر ---- اور اس کی صلاحیتِ کار کا یہ عالم ہے کہ "جنگ کے زمانے میں ۴۸ صفحات کا ایک ماہانہ پرچہ بھی باقاعدہ جاری نہ رکھ سکا!"

"تنظیم اسلامی" کی ۶۷ء والی کوشش کی ناکامی کے اسباب متعدد ہیں ---- کی بات بھی بالکلیہ غلط نہیں۔ internal sabotage بھی اس کا ایک سبب تھا ---- اور خود وہ بھی بلا سبب نہ تھا (یہ گلہ جفائے وفا نما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے۔ جو میں بتکدے میں بیاں کروں تو صنم بھی بولے ہری ہری!) ----- لیکن ---- فاش تر گویم ---- اس کی اصل وجہ یہ تھی اُس وقت جو لوگ جمع ہوئے ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو اپنے آپ کو اس Cause کے ساتھ Completely identify کرتا ---- کہ "یا تن رسد بجاناں ---- یا جاں ز تن بر آید!!" سب لوگ اسے بس ایک اچھا کام سمجھ رہے تھے ---- کہ ہو جائے تو بہت اچھا ---- نہ ہو تو بھی ایسی کوئی بات نہیں! اور ظاہر ہے کہ اس طرح کی کیفیت کے ساتھ پہلے سے چلتے ہوئے کام تو جاری رہ سکتے ہیں ---- کسی نئے کام کی داغ بیل نہیں پڑ سکتی ----- "در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بسے۔ شرطِ اول قدم این است کہ مجنوں باشی!"

اکتوبر نومبر ۷۴ء کے میثاق کے "تذکرہ و تبصرہ" میں جس رجائیت کی جھلک ہے وہ خالص وجدانی ہے اور کبھی کبھی حالات و واقعات کے پیش نظر خود مجھ پر قنوطیت کا تسلط ہونے لگتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ یہ ہوتا ہے عارضی ہی۔ پھر کوئی نہ کوئی کرن امید کی نظر آجاتی ہے--- ویسے بحمد اللہ میں جس راہ پر چلنا چاہتا ہوں اس میں نتائج---اور کامیابی کی امید ایک بالکل ثانوی--- بلکہ "ثالثی" شے ہے۔ اصل محرک صرف ایک ہے اور وہ ہے احساسِ فرض------جس کی تفصیل میں اپنی اس تقریر میں دے چکا ہوں جو اسی پرچے میں شائع ہوئی ہے۔ (یہ تقریر اب "عزمِ تنظیم" کے نام سے طبع ہوتی ہے!)

باتیں تو اور بھی بہت سی کرنی تھیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ معاملات باتوں سے طے ہی نہیں ہوا کرتے---اکثر باتیں تمام ہو جاتی ہیں اور مسئلہ وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ "دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر: ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم!"----اصل معاملہ دل کا ہوتا ہے۔ دل کسی بات کو قبول کر لے تو عقل کو فوراً ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا----اور "دل ابا کر رہا ہو تو عقل کرائے کے وکیل کی مانند دلائل کے انبار لگانے پر مستعد ہو جاتی ہے----لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظِ مبارکہ کے مطابق گزارش ایک ہی ہے-----یعنی "اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ وَلَوْ اَفْتَاكَ الْمُفْتِي!"

اور اگر کسی درجہ میں درخواست بھی قابل قبول ہو سکے----تو عرض ہے کہ ۲۳/ تا ۳۱/ مارچ آٹھ دن کی "تفریغ" (تبلیغی جماعت کی اصطلاح ہے---- تفریغِ اوقات---یعنی وقت کا فارغ کرنا) کر ہی ڈالیں اور لاہور آئیں۔ تاسیسی اجلاس میں بھی شریک ہوں---اور قرآن کانفرنس میں بھی! پھر جو بھی فیصلہ ہو، ظاہر ہے کہ جبر کا تو کوئی سوال ہی نہیں!---- آخر میں صرف ایک بات اور عرض کر دوں--- آرزو بھی یقیناً بہت غنیمت ہے لیکن تا بہ کے؟ اگر یہ واقعتاً سینے کے اندر پرورش پاتی رہی ہے تو اب وقت ہے کہ "بر آور ہر چہ اندر سینہ داری!"

فقط والسلام

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

کتابیات

نفاق کی نشانیاں (۳)

تالیف : فضیلۃ الشیخ الاستاذ عائض عبداللہ القرنی

ترجمہ و حواشی : ابو عبدالرحمن شبیر بن نور

سولہویں نشانی

نیک لوگوں کی عزت پر حرف زنی کرنا

حرف زنی، استہزاء اور ٹھٹھہ سے مختلف چیز کا نام ہے۔ حرف زنی سے مراد غیبت، طعن، تشنیع اور عیب جوئی جیسے نازیباءِ اخلاق کام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ سَلَقُوكُمْ بِأَلْسِنَةٍ حِدَادٍ أَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ﴾

(الاحزاب : ۱۹)

"یہی لوگ فائدوں کے حریص بن کر قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبانیں لئے تمہارے استقبال کو آجاتے ہیں"۔

"حِدَاد" سے مراد ہے تلوار کی طرح تیز۔ منافقوں کی نشانی یہ ہے کہ جب نیک لوگوں کے پاس سے اٹھ کر جاتے ہیں تو ان کے بارے میں زبان درازی کرتے ہیں، ان پر الزام تراشی کرتے ہیں، ان پر دانت پیستے ہیں اور محفلوں میں بیٹھ کر ان کے خلاف غیبت کرتے ہیں۔

فتورِ نیت کی وجہ سے کچھ دعائیں بھی غیبت بن جاتی ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ دعا کرنے والے کے ارادے اور مقصد کے لحاظ سے بعض دفعہ دعاء غیبت شمار ہوتی ہے، حالانکہ وہ بظاہر دعا ہی کر رہا ہوتا ہے، مثلاً اگر تم دریافت کرو کہ فلاں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اور وہ جواب میں کہے : "اللہ ہماری اور اس کی بخشش کرے" تو درحقیقت وہ اپنے لئے اور اس آدمی کے لئے بخشش کی دعا نہیں کر رہا بلکہ اس کا

مقصد کچھ اور ہی ہے۔ اللہ ہی اس کے مقصد کو بہتر جانتا ہے۔ یا وہ جواب میں یہ کہے : "جس معاملے میں وہ پھنس گیا ہے اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے"۔ یا وہ یوں کہے "اللہ اسے ہدایت دے"۔ اس طرح کے جملے دعا نہیں بلکہ طنز ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ "سبحان اللہ" کہنا بھی غیبت بن جاتا ہے۔ یہی حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا قول ہے۔ ایک بادشاہ کے سامنے کسی آدمی کا تذکرہ ہوا۔ ایک وزیر نے کہا "سبحان اللہ" یعنی اس سے بچ کر رہو۔ بظاہر تو وزیر نے سبحان اللہ کہا لیکن درحقیقت اس شخص کی عیب جوئی کی اور حقارت کی طرف اشارہ کیا۔۔۔ ان ارادوں کا اللہ ہی کو صحیح علم ہے۔ جس دن قبر کے مُردے اٹھا دیئے جائیں گے اور دلوں کے راز ظاہر کر دیئے جائیں گے اس دن ان مقاصد کی صحیح حقیقت بھی سامنے آ جائے گی۔ تعجب کی بات ہے کہ کچھ لوگ فاسق و فاجر کی غیبت نہیں کرتے، یہودی اور عیسائی بھی ان کی زبان کے تیر سے محفوظ رہتے ہیں، البتہ نیک مسلمان ان کے حملے سے بچ کر نہیں جا سکتا۔

ایک آدمی کسی نیک بزرگ کی محفل میں حاضر ہو کر اپنے بھائی کی غیبت کرنے لگا۔ نیک آدمی نے اس سے دریافت کیا : کیا رومیوں کے خلاف تو نے جہاد کیا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ نیک آدمی نے دریافت کیا : کیا ایرانیوں کے خلاف جہاد کیا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ نیک آدمی نے کہا رومی اور ایرانی تو تجھ سے محفوظ رہ سکتے ہیں البتہ اپنا مسلمان بھائی محفوظ نہیں رہ سکتا، میری محفل سے چلے جاؤ۔ ایک عالمِ دین کی محفل میں کسی آدمی نے دوسرے کی غیبت کی تو عالم نے کہا : اس روئی کے ٹکڑے کو یاد رکھ جسے عزیز و اقارب سکرات الموت کے وقت تیری آنکھوں پر رکھ دیں گے۔ اس دن مال و اولاد کوئی کام نہیں آئیں گے، ہاں البتہ جو آدمی حسد و کینہ سے پاک صاف دل لے کر آیا، اس کا عمل کام آئے گا۔

سترھویں نشانی

نمازِ باجماعت سے پیچھے رہنا

یہ ایک بہت بڑا اور لاعلاج مرض ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں :

((وَمَا يَتَخَلَّفُ عَنْهَا اِلَّا مُنَافِقٌ مَعْلُوْمُ النِّفَاقِ)) {۱}

"نماز باجماعت سے صرف ایسا منافق ہی پیچھے رہتا تھا جس کا نفاق معروف و مشہور تھا"۔

جب تم کسی ایسے آدمی کو دیکھو جو صحت مند، تندرست و توانا اور فارغ ہو اور اس کے پاس کوئی شرعی عذر بھی نہ ہو، اگر اس کے باوجود وہ اذان سننے کے بعد مسجد میں نہیں آتا تو اس کے نفاق کی گواہی دے دو۔

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِہٖ لَقَدْ ھَمَمْتُ اَنْ آمُرَ بِالصَّلَاۃِ فَتُقَامَ ثُمَّ اُخَالِفَ اِلٰی اُنَاسٍ لَا یَشْھَدُوْنَ الْعِشَاءَ مَعَنَا۔ [وَفِی لَفْظٍ لِلصَّلَاۃِ] فَاُحَرِّقَ عَلَیْھِمْ بُیُوْتَھُمْ بِالنَّارِ)) {۲}

"اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ میں نماز کھڑی کرنے کا حکم دوں، پھر خود پیچھے رہ کر ان لوگوں کی خبر لوں جو ہمارے ساتھ نماز عشا میں شریک نہیں ہوتے۔ (ایک روایت میں نماز کا لفظ ہے) پھر ان سمیت ان کے گھروں کو آگ لگا دوں"۔

مسند امام احمد میں اس قدر اضافہ ہے :

((لَوْلَا مَا فِی الْبُیُوْتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالذُّرِّیَّۃِ)) {۳}

"یعنی میں ایسا ضرور کر گزرتا اگر گھروں میں موجود عورتوں اور بچوں کا خیال نہ ہوتا"۔

(اس کے بعد صحیح بخاری والی روایت کے الفاظ یوں ہیں :)

((وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِہٖ لَوْ یَعْلَمُ اَحَدُھُمْ اَنَّہٗ یَجِدُ عِرْقًا سَمِینًا اَوْ مِرْمَاتَیْنِ حَسَنَتَیْنِ لَشَھِدَ الْعِشَاءَ مَعَنَا))

"اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر ان میں سے کسی کو علم ہو

{۱} صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب فضل صلاۃ الجماعۃ والتشدید.....

{۲} صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب وجوب صلاۃ الجماعۃ

{۳} مسند احمد، ج ۲، ص ۳۶۷

اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝﴾ (المنافقون : ۱)

"اے نبی جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ ہاں اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور اس کے رسول ہو، مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں"۔

چنانچہ اگر تم سے دریافت کیا جائے کہ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے بظاہر سچی گواہی دی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کا اعتبار نہیں کیا اور اس جھوٹی گواہی کی پاداش میں انہیں جہنم میں داخل کر دیا۔۔۔ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟۔ کہہ دو یہ منافق ہی ہو سکتے ہیں۔ بظاہر انہوں نے سچی بات کی ہے کہ "محمد" اللہ کے رسول ہیں، لیکن ان کی باطنی کیفیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں جھوٹا قرار دیا۔ اور بظاہر سچی گواہی نے انہیں آگ میں داخل کر دیا۔ تو ثابت ہوا کہ ظاہر و باطن کا تضاد نفاق کی علامت ہے۔ منافق کا ظاہر تو بہت خوبصورت ہوتا ہے لیکن اندر سے تباہ حال! وہ بظاہر خشوع کا اظہار کرتا ہے لیکن اس کا دل ذکر اللہ سے غافل اور بے تعلق ہوتا ہے۔ ایک صالح آدمی یوں دعا کیا کرتا تھا "اے اللہ میں منافقانہ خشوع سے تیری پناہ مانگتا ہوں"۔ دریافت کیا گیا : منافقانہ خشوع سے آپ کی کیا مراد ہے؟۔ فرمایا : کہ جسمانی اعضاء پر تو خشوع و خضوع کی کیفیت طاری ہو اور دل میں خشوع والی کیفیت نہ ہو۔

بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو دورانِ نماز داڑھی اور کپڑوں سے کھیلتے دیکھا تو آپ نے فرمایا :

((لَوْ خَشَعَ قَلْبُ هٰذَا لَخَشَعَتْ جَوَارِحُهٗ)) {۴}

"اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے اعضا پر بھی خشوع طاری ہو جاتا"۔

یہ سرے سے حدیث ہی نہیں ہے، دیگر حفّاظِ حدیث کے علاوہ امام الدار قطنی نے اس کی تردید کی ہے۔ یہ جملہ حضرت سعید بن المسیب کی طرف منسوب ہے، حضور اکرم ﷺ سے ثابت نہیں۔

(جاری ہے)

{۴} یہ قول حضرت سعید بن المسیبؒ کے نام سے بیان کیا جاتا ہے۔ یہ اثر ثابت نہیں ہے، نہ مرفوع، نہ موقوف، تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو ارواء الغلیل، ج ۲، حدیث نمبر ۳۷۳، تالیف العلامہ محمد ناصر الدین الالبانی۔

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را!

پاکستانی سیاست کا
پہلا عوامی و ہنگامی دور

(۲)

امیر تنظیم اسلامی اور داعی تحریکِ خلافت پاکستان

ڈاکٹر اسرار احمد

کے سیاسی تجزیے

جو ۱۹۷۰ء کے دوران ماہنامہ "میثاق" کے ادارتی صفحات میں شائع ہوئے

باب پنجم

دائیں اور بائیں بازوؤں کی تقسیم

اور

"CIVILIAN COUP D'ÉTAT"

فروری مارچ ۱۹۷۰ء

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی حکومت کو ختم ہوئے اور ملک میں دوسرا مارشل لاء نافذ ہوئے ابھی پورا ایک سال بھی نہیں ہوا، لیکن حالات اتنے بدل چکے ہیں اور ع "کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!" کا ایسا نقشہ بندھا ہے کہ موصوف کی حکومت ماضیٔ بعید کا قصہ اور ازمنۂ قدیم کی داستان نظر آتی ہے۔ بالکل یقین نہیں آتا کہ ایک ہی سال قبل یہاں صدر ایوب "کوس لمن الملک" بجا رہے تھے ---- اور آنجہانی کنونشن مسلم لیگ ملک کی واحد فعال اور نمائندہ سیاسی جماعت ہونے کی مدعی تھی ---!! کہاں آج یہ حال ہے کہ سابق صدر کو کارٹونوں میں سانپ کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے ---- اور لیگ کے ٹٹو کے سر سے "کنونشن" کا سینگ ہی سرے سے غائب ہو چکا ہے۔ کتنا عظیم انقلاب ہے ---- اور "وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ" کی کیسی کامل تصویر!!

عبرت کی جا ہے کہ وہی لوگ جو کل تک ایوب خان کے بوٹ کی ٹو چاٹنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے کوشاں نظر آتے تھے آج انہیں گالیوں سے نواز رہے ہیں۔

من تو شدم تو من شدی ، من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

ایسے لوگوں سے تو ہمیں کچھ نہیں کہنا، اس لئے کہ ان کا تو اپنا وجودِ نامسعود ہمارے نزدیک ملک و ملت کے ماتھے کا کلنک کا ٹیکہ ہے ---- سابق صدر کے دورِ اقتدار کے سیاسی مخالفین سے البتہ ہم یہ ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ وہ اب انہیں کوسنا چھوڑ دیں۔ اس لئے کہ سیاسی میدان میں ان کی وفات واقع ہو چکی ہے اور ہمارے دین کی تعلیم یہی ہے کہ "اُذْكُرُوا مَوْتَاكُمْ بِالْخَيْرِ!" ---- ان کا دور گزر گیا۔ اور جو کچھ انہوں نے کیا عدالتِ اخروی میں اس کا حساب کتاب ہو جائے گا

---- تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ---- وہ کامیاب ہوئے یا ناکام' ان کا امتحان بہرحال ختم ہو چکا۔ اب امتحان آپ کا ہے' اپنی کامیابی کی فکر کیجئے۔

یہ گھڑی محشر کی ہے' تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!!

خصوصاً ان لوگوں پر تو اس وقت بہت بڑی ذمہ داری عائد ہو گئی ہے جو سابق صدر کی ذات اور ان کی حکومت ہی کو ملک و ملت کے جملہ امراض و علل کا سببِ واحد قرار دیتے تھے کہ اب جبکہ وہ میدان سیاست سے ہٹ گئے یا ہٹا دیئے گئے تو منطقی طور پر انہیں جلد از جلد سب مسائل کو حل کر کے دکھا دینا چاہئے۔ ہماری بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس عظیم امتحان میں کامیابی عطا فرمائے۔

اس ایک سال کے عرصے میں پاکستان کی سیاسیات کا جو جدید نقشہ بنا ہے وہ تقریباً وہی ہے جو ہم نے گزشتہ سال جنوری فروری اور مارچ کے شماروں میں "تذکرہ و تبصرہ" کے صفحات میں کھینچا تھا۔ چنانچہ مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ' مدیر ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ اپنے ایک حالیہ مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :

> "وہاں (پاکستان) سے کوئی اخبار' رسالہ' پرچہ پرزہ نہ آسکنے کی وجہ سے وہاں کے حالات سے مکمل بے خبری ہے۔ رمضان المبارک میں ہمارے مولانا بنوری مکہ معظمہ پہنچ گئے تھے۔ ان سے اس وقت تک کے حالات خاصی تفصیل سے معلوم ہو گئے تھے اور سن کر قلق اور افسوس ہی ہوا تھا.... لیکن آپ نے بہت پہلے مستقبل کی سیاسی معرکہ آرائی کا جو نقشہ کھینچا تھا اس کی پوری پوری تصدیق ہو گئی تھی....." [۱]

اگرچہ پاکستان کی تاریخ کے اس عظیم ترین سیاسی ایجی ٹیشن میں جو نومبر ۱۹۶۸ء میں شروع ہو کر بالآخر مارچ ۱۹۶۹ء میں دوسرے مارشل لاء کے نفاذ پر منتج ہوا تھا دائیں اور بائیں بازو کے عناصر بہت حد تک گڈمڈ تھے' لیکن دو باتیں بالکل واضح تھیں ---- ایک یہ کہ دائیں اور بائیں بازو کے

---

[۱] اس عرصے کے دوران میں مولانا نعمانی اور مولانا بنوری دونوں ہی وفات پا چکے ہیں۔ غَفَرَ اللّٰہُ لَھُمَا وَرَحِمَھُمَا!!

عناصر کی واضح تقسیم کا عمل (POLARIZATION) تیزی سے ہو رہا تھا---- اور دوسرے یہ کہ اس عوامی تحریک میں بائیں بازو کے عناصر کا پلڑا فیصلہ کن طور پر بھاری تھا اور دائیں بازو کے عناصر اپنے آپ کو بالکل ایک مخمصے کی سی کیفیت میں گرفتار پا رہے تھے اور اگر وہ تحریک جاری رہتی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان ایک عظیم انقلاب سے دوچار ہو جاتا' جس کی ابتدا بھی کم از کم مشرقی پاکستان میں تو مولانا بھاشانی کی سرکردگی میں ہو گئی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں میں سے کسی میں بھی یہ دم خم نہ تھا کہ وہ اس عوامی تحریک کی راہ روک سکتی۔ یہ تحریک رکی تو صرف سابق صدر ایوب کی حکمتِ عملی سے جس کی لئے صاحب موصوف بالکل بجا طور پر دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کے تشکّر و امتنان کے حقدار ہیں!! (چنانچہ گول میز کانفرنس کے دوران ان جماعتوں کے زعماء نے صدر ایوب کی جو مدح و ثنا کی تھی' اس سے یہ قرض کسی حد تک ادا بھی ہو گیا تھا---- اور اب اگر ان کی اکثریت دوبارہ اپنی تقاریر کو ان پر تیز و تند تنقید سے مزیّن کرنے لگی ہے تو یہ غالباً ایک مجبوری ہے جس کے لئے وہ معذور ہیں۔ اس لئے کہ :

ع "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر!")

سیاسی جماعتوں سے افہام و تفہیم اور گفت و شنید پر آمادگی' ڈی اے سی (DAC) کی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کرنا اور پھر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس (RTC) کا انعقاد---- ایسے اقدامات کو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اُس وقت بالکل بجا طور پر "غیر فوجی انقلاب" (CIVILIAN COUP DETAT) سے تعبیر کیا تھا اور واقعہ یہی ہے کہ ان کے ذریعے کم از کم مغربی پاکستان کی حد تک "انقلاب" کی راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔

گول میز کانفرنس کی ناکامی کا پورا الزام شیخ مجیب الرحمٰن کے سر تو خواہ مخواہ لگ گیا' حتیٰ کہ بعض ناداں لوگوں نے اس کا حصہ رسدی میاں ممتاز دولتانہ تک بھی صرف اس لئے پہنچا دیا کہ انہوں نے شیخ صاحب موصوف کو گول میز کانفرنس میں شریک کرنے پر اصرار کرنے میں پہل کی تھی---- ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خود شیخ صاحب خالص "سیاسی" آدمی ہیں "انقلابی" ہرگز نہیں'

اور خود ان کی پشت پر بھی مغرب کے ڈوبتے سورج کا سایہ ہے، مشرق کے ابھرتے ہوئے سورج کا نہیں ---- اصل مسئلہ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی ایسے عظیم "انقلابی" آدمی نے عوامی ایجی ٹیشن کی باگ ڈور سنبھال لی تھی --- اور شیخ صاحب خوب جانتے تھے کہ اگر وہ راولپنڈی میں کچھ لے دے کر سودا کرلیں تو پلٹن میدان تک پہنچنا تو دور کی بات ہے، ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر اترنا ہی محال ہو جائے گا۔

بہر حال متذکرہ بالا "غیر فوجی انقلاب" مشرقی پاکستان کے لئے ناکافی ثابت ہوا اور وہاں عوامی تحریک کو روکنے کے لئے سابق صدر ایوب کو پہلے آئندہ کے لئے صدارتی الیکشن میں حصہ نہ لینے کے فیصلہ کا اعلان، پھر اگر تلہ سازش کیس کی واپسی ایسی گراں قیمتیں ادا کرنے کے بعد بھی اس کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا کہ خود حکومت سے دستبردار ہو کر نظم و نسق اور امن و امان کے قیام کی ذمہ داری فوج کے حوالے کردیں ---- اور اس طرح انہیں بالآخر ملک کو دوبارہ فوج کے سپرد کرتے ہی بنی ---- !! اور پاکستان دوسرے مارشل لاء کی آہنی گود میں چلا گیا۔

مارشل لاء کے نفاذ کے بعد کچھ عرصہ گومگو (SUSPENSE) کی کیفیت طاری رہنا فطری تھا، جس کے دوران عوامی ایجی ٹیشن بالکل فرو ہو گیا اور پاکستان کے مشرقی اور مغربی دونوں خطوں میں پر سکون کیفیت پیدا ہو گئی۔ نتیجتاً دائیں بازو کے "سیاست دانوں" کو بھی سکھ چین کا سانس لینا نصیب ہوا اور انہوں نے بھی بند کمروں، کوٹھیوں کے باغیچوں اور آراستہ پیراستہ ہوٹلوں میں منعقد ہونے والی پریس کانفرنسوں میں چہکنا شروع کردیا۔

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ملکی سیاست کے میدان میں دائیں اور بائیں بازو کے کیمپوں کی واضح تشکیل کا عمل (POLARIZATION) بھی وقتی طور پر معطل ہو گیا --- !

ادھر نئے صدر مملکت اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر آغا محمد یحییٰ خاں نے کل چھ سات ماہ کے عرصے میں ملک کی اس سیاسی و آئینی گاڑی کو جو پٹڑی سے اتری ہوئی ہے دوبارہ راستے پر ڈالنے کی

غرض سے پُرامن انتقالِ اقتدار کے واضح اقدامات کا متعین پروگرام اور ٹائم ٹیبل سمیت اعلان کر کے اپنے سر سے پورا الزام اتار پھینکا اور ایک انگریزی محاورے کے مطابق گیند کو قطعی طور پر عوام کے پالے میں پہنچا دیا۔۔۔۔اس طرح "سیاست دانوں" کے لئے تو راہیں ایک دم کشادہ ہوگئیں لیکن "انقلابی" لوگ بالکل اسی طرح کے مخمصے میں پھنس کر رہ گئے جس طرح کے مخمصے میں عوامی ایجی ٹیشن کے دوران دائیں بازو کے سیاست دان پھنس گئے تھے۔

پاکستان کی بائیں بازو کی قوتوں کے بارے میں جنوری ۱۹۶۹ء میں ہم نے یہ رائے ظاہر کی تھی:

> "مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی اس کی ایک عظیم علامت ہیں اور مغربی پاکستان میں یوں تو اس کے کئی ایک دھڑے ہیں لیکن اس کی اصل علامت کی حیثیت بلاشبہ مسٹر بھٹو کو حاصل ہوگئی ہے۔ اور اگرچہ ان دونوں کے مابین اشتراکِ عمل کی کوئی واضح صورت تاحال سامنے نہیں آئی، تاہم یہ ایک یقینی امر ہے کہ عنقریب ان دونوں میں اتحاد کی صورت پیدا ہو جائے گی اور پھر یہ بائیں بازو کا وہ اصل مرکز (NUCLEUS) ہو گا جس کے گرد ملک کے تمام سوشلسٹ عناصر حتیٰ کہ معتدل مزاج (یا عام اخباری اصطلاح کے مطابق ماسکو نواز) طبقے بھی جو اس وقت پی ڈی ایم کے ساتھ ہیں، جلد یا بدیر جمع ہونے پر مجبور ہو جائیں گے"۔

ان میں سے مولانا بھاشانی اور ان کے گروہ نے تو تاحال الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان بھی نہیں کیا اور وہ برملا کہہ رہے ہیں کہ الیکشن کی کوئی اہمیت سرے سے ہے ہی نہیں، اصل مسئلہ روٹی کا ہے۔۔۔۔جسے ووٹ سے قبل حل ہونا چاہئے۔ مغربی پاکستان میں مسٹر بھٹو اگرچہ الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان کر چکے ہیں لیکن یہ بھی غالباً یہاں کی عام فضا کے زیرِ اثر ہے ورنہ ان کی اکثر تقریروں کا ٹیپ کا بند یہی ہوتا ہے کہ پاکستان اس وقت جن مسائل سے دوچار ہے ان کی نوعیت فی الاصل سیاسی نہیں معاشی ہے۔۔۔۔بایں ہمہ چونکہ حکومتِ وقت کا موقف بالکل منطقی اور ابتناصاف ہے کہ جس پر کسی براہِ راست چوٹ (FRONTAL ATTACK) کی گنجائش نہیں لہٰذا بائیں بازو کی قوتیں اس وقت بالکل "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" کی سی صورتحال سے دوچار ہیں۔ اور الیکشن کے بارے میں ان کا رویہ ؏ "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" کا مصداق بن کر رہ گیا ہے۔

ویسے بھی سیدھی سی بات ہے کہ "سیاسی سرگرمی" کی نوعیت کچھ اور ہوتی ہے اور "انقلابی

جدّوجہد" کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں---- اور الیکشن کو جہاں ایک طرف سیاسی سرگرمی کے نقطۂ عروج کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، وہاں ایک انقلابی کارکن کے نقطۂ نظر سے وہ کھیل تماشے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، بلکہ اس کے نزدیک اس کی اصل حیثیت ایک گلے سڑے نظام کے عفونت بھرے سنڈاس کی ہوتی ہے۔ بقول علامہ اقبال :

الیکشن ، ممبری، کرسی، صدارت — بنائے خوب آزادی نے پھندے
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں — نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

پاکستان کے سیاسی میدان میں اس وقت دو گروہ تو ایسے ہیں جو "انقلاب" کے علمبردار ہونے کے مدعی ہیں، یعنی ایک بائیں بازو کے عناصر جو سوشلسٹ انقلاب کے علمبردار ہیں اور دوسری جماعت اسلامی جو اسلامی انقلاب کی علمبرداری کا اِدّعا کرتی ہے۔ باقی تمام عناصر خالص سیاسی مزاج کے حامل ہیں جن میں سے کچھ قومی سیاست کے علمبردار ہیں، ایک گروہ خالص مذہبی سیاست کا دعوے دار ہے اور بقیہ علاقائی نیشنلزم کا پرچم اٹھائے ہوئے ہیں۔

بائیں بازو کی قوتوں میں سے بھی ہمارے نزدیک خالص اور ٹھیٹھ انقلابی مزاج صرف مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی کا ہے اور اگرچہ فی الوقت انہوں نے بھی شیخ مجیب الرحمٰن کے بنگلہ نیشنلزم کے نعرے کا مقابلہ کرنے کے لئے پاکستانی قوم پرستی کا راگ الاپنا شروع کر دیا ہے، تاہم حقیقت یہی ہے کہ وہ اول و آخر خالص سوشلسٹ انقلاب کے داعی ہیں۔ رہے مسٹر بھٹو تو وہ بائیں بازو کی جانب فیصلہ کن رجحان رکھنے کے باوجود "انقلابی" سے زیادہ "سیاسی" مزاج کے حامل ہیں۔ بنا بریں اگرچہ اسلام پر تو ان کی کرم فرمائی صرف شدید ضرورت کے تحت اور وہ بھی برائے نام ہی ہوتی ہے، تاہم پاکستانی قوم پرستی کا عنصر ان کی تحریک میں ایک مستقل جزو کی حیثیت سے شامل ہے ---- یہی وجہ ہے کہ مولانا بھاشانی اور ان کی جماعت نے نہ صرف یہ کہ تاحال الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ نہیں کیا بلکہ گمان غالب یہی ہے کہ وہ الیکشن کا مقاطعہ کر کے "تحریک" کا راستہ اختیار کریں گے اور کسی نہ کسی راہ سے کوئی عوامی ایجی ٹیشن برپا کرنے کی کوشش کریں گے---- اور خود مسٹر بھٹو بھی الیکشن میں حصہ لینے کے اعلان اور اس کی بھرپور تیاری کے ساتھ ساتھ "تحریک" کی راہ بھی کھلی رکھے ہوئے ہیں اور ایسا آتش گیر مواد بھی جابجا چھڑکتے چلے جا رہے ہیں جو "بوقتِ ضرورت" کام آسکے اور جس سے کسی مناسب موقع پر کسی عوامی ایجی ٹیشن کا دھماکہ پیدا کیا جا سکے!

رہی جماعت اسلامی تو اس کے بارے میں چونکہ ہماری مستقل رائے یہ ہے کہ اس کی ابتدا تو ضرور ایک انقلابی جماعت کے انداز میں ہوئی تھی لیکن اب اس کا مزاج خالص سیاسی ہے لہٰذا اس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے ---- یہاں صرف اس قدر اشارہ کافی ہے کہ اپنے اسی سیاسی مزاج کے ناگزیر تقاضے کے تحت جماعت اسلامی بھی نہ صرف یہ کہ الیکشن کے دنگل میں شرکت کے لئے پورے زور شور کے ساتھ لنگر لنگوٹے کس رہی ہے ---- بلکہ اس کے نزدیک الیکشن ہی ملک و ملت کے جملہ مسائل کا واحد حل ہے۔

اصل سیاسی قوتوں میں سے 'جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا' کچھ قومی سیاست کی علمبردار ہیں اور نہ صرف پاکستانی قوم پرستی بلکہ کسی حد تک جذبۂ ملی کا پرچم بھی اٹھائے ہوئے ہیں 'لہٰذا فطری طور پر ان کے نعروں میں اسلام اور نظریۂ پاکستان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے' چاہے اس کے رہنماؤں کی زندگیوں میں نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ ایسے بنیادی شعائرِ اسلام تک کا دور دور تک کوئی نام و نشان نظر نہ آئے۔ یہ عناصر دراصل تحریکِ مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کے اصل وارث ہیں اور فی الوقت پی ڈی پی اور مسلم لیگ کے ان متعدد دھڑوں پر مشتمل ہیں جن کے مابین بعض سیاسی پہلوانوں کی شخصیتوں کے تصادم کے سوا اور کوئی چیز مابہ الاختلاف موجود نہیں ---- دوسرا گروہ جو آل پاکستان سطح پر سیاست میں حصہ لے رہا ہے جمعیت علمائے اسلام کا ہے جو نظریۂ پاکستان سے زیادہ اسلام کا علمبردار ہے اور جس کا اسلام کے ساتھ مخلصانہ تعلق بھی ظاہر و باہر ہے ---- لیکن فی الوقت بائیں بازو کی قوتوں کا ساتھ دینے کی وجہ سے کفر تک کے فتووں کا ہدف بن رہا ہے ---- اس گروہ کے بارے میں بھی ہم بعد میں تفصیل سے کلام کریں گے۔

باقی سیاسی جماعتیں علاقائی رجحانات کی حامل ہیں جو اپنے اپنے علاقوں کی تہذیب' زبان' کلچر' مالی مفادات اور سیاسی و معاشی حقوق کے تحفظ کے نعروں کے سہارے اقتدار کی جنگ جیتنا چاہتی ہیں ---- ان میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ بااثر جماعت شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ ہے جو بنگلہ نیشنلزم اور مشرقی بنگال کے معاشی و سیاسی حقوق کی بازیافت کی تحریک کا پرچم اٹھائے ہوئے ہے اور اس وقت بلاشک و شبہ مشرقی پاکستان کی سب سے بڑی "سیاسی" قوت ہے۔ دوسرے نمبر پر عبدالولی خان کی نیپ ہے جو سرحد اور بلوچستان میں علاقائی نیشنلزم کو ہوا دے رہی ہے اور کراچی اور مشرقی پاکستان میں مزدوروں اور کسانوں کے مفادات کا دم بھر رہی ہے۔ تیسرے نمبر پر جی ایم سید

اور ان کا سیاسی ٹولہ ہے جو سندھ میں سندھی نیشنلزم کی آگ بھڑکا رہا ہے ---- ان تمام دھڑوں کے مابین ایک قدر تو مشترک ہے۔ یعنی علاقہ پرستی اور ریجنل نیشنلزم (REGIONAL NATIONALISM) لیکن ایک اہم پہلو مابہ الامتیاز بھی ہے۔ یعنی یہ کہ جب کہ شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی عوامی لیگ پرانے اور پختہ کار RIGHTIST ہیں' بقیہ تمام کے تمام کم از کم معتدل حد تک ضرور LEFTIST ہیں۔

ان اختلافات کے علی الرغم جہاں تک متذکرہ بالا سیاسی گروہوں کا تعلق ہے اس پرانے اور صدفی صد درست مقولے کے مطابق کہ "سیاست میں کوئی چیز آخری اور حتمی نہیں ہوتی!" ان کے مابین جوڑ توڑ' کسرو انکسار اور "ادھر سے کٹ ادھر جڑ" کے عمل کا مستقلاً جاری رہنا بالکل طبعی اور فطری امر ہے اور اس پر خواہ مخواہ ناک بھوں چڑھانے اور واویلا کرنے سے کچھ حاصل نہیں ---- البتہ یہ ظاہر ہے کہ کچھ مہلتِ عمر صرف اس اتحاد و اتفاق کو مل سکتی ہے جو چاہے کتنا ہی جزوی سہی بہرحال کسی نہ کسی قدر مشترک کی بنیاد پر قائم ہو ---- مثلاً دولتانہ اور مجیب کے مابین چاہے قومی اور علاقائی سطح کا فرق موجود ہو' دائیں بازو کی قدرِ مشترک بھی موجود ہے۔ چنانچہ ان کے مابین مفاہمت اگر ہو چکی ہے تو کسی قدر پائیدار بھی ثابت ہوگی اور اگر نہیں ہوئی تو کسی بھی وقت ہو سکتی ہے' لیکن جی ایم سید سے دولتانہ کا اتحاد بالکل بے بنیاد تھا اور اسے ختم ہی ہو جانا چاہئے تھا۔ دوسری طرف سید اور مجیب کے مابین علاقہ پرستی کی قدر مشترک موجود تھی جس کی بنا پر اتحاد ہو گیا۔ اور یہ پائیدار بھی ثابت ہو گا' وقس علیٰ ہٰذا۔

الغرض پاکستان کے سیاسی میدان میں اِس وقت ایک جماعت خالص انقلابی ہے یعنی مولانا بھاشانی کی نیپ۔ تین جماعتیں نیم مقصدی اور نیم سیاسی ہیں۔ یعنی جماعت اسلامی' جمعیت علماء اسلام' اور پاکستان پیپلز پارٹی۔ ان میں سے مقدم الذکر دونوں مذہبی رنگ کی حامل ہیں جبکہ تیسری اس اعتبار سے بالکل بے رنگ ہے ---- اور مؤخر الذکر دونوں بائیں بازو سے تعلق رکھتی ہیں' جبکہ پہلی EXTREME RIGHTIST ہے ---- بقیہ تمام جماعتیں خالص سیاسی ہیں' چاہے پاکستانی قومیت کی علمبردار ہوں چاہے علاقائی نیشنلزم کی۔

متذکرہ بالا جماعتوں کے علاوہ کچھ اور گروپ بھی سیاسی میدان میں بر سر عمل ہیں۔ مثلاً ایک ایئر مارشل اصغر خان جو اپنی ذات ہی میں ایک انجمن ہیں اور اب تک تو کٹی ہوئی پتنگ کے مانند ادھر ادھر پھر رہے تھے لیکن اب "تحریک استقلال" کے اجراء کے عزم کے ساتھ از سرنو سامنے آئے ہیں ------ ان کے علاوہ کچھ مذہبی گروپ ہیں جن کی اپنی تو کوئی خاص سیاسی اہمیت نہیں، لیکن اس اعتبار سے خاصی اہمیت ہو گئی ہے کہ ان سب کا متفقہ وزن دائیں بازو کے پلڑے میں پڑ رہا ہے۔ ہماری مراد مرکزی جمعیت علماء اسلام، مرکزی جمعیت اہل حدیث اور جمعیت علمائے پاکستان وغیرہ مذہبی گروہوں سے ہے۔ ان کے سیاسی موقف پر ہم آئندہ اظہار خیال کریں گے۔

پاکستان میں آئندہ حالات کیا رخ اختیار کریں گے؟ ------ اس سوال کے جواب کا کلی انحصار اس امر پر ہے کہ آیا بائیں بازو کی اصل قوتیں مستقبل قریب میں کسی انقلابی تحریک اور عوامی ایجی ٹیشن کے اجراء کا انتہائی اقدام کر گزرتی ہیں یا نہیں ---- مولانا بھاشانی کے بارے میں ہم اوپر عرض کر آئے ہیں کہ اِس وقت ان کی حالت اس شیر کی سی ہے جو نرغے میں آگیا ہو اور کسی راستے کی تلاش میں دیوانہ وار ادھر ادھر دوڑ رہا ہو۔ چنانچہ وہ کبھی پاکستان کی سالمیت کی دہائی دیتے ہیں کبھی "خلافتِ ربانیہ" کا نعرہ لگاتے ہیں اور کبھی "اسلامی ثقافتی انقلاب!" کا راگ الاپتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تاحال انہیں کوئی "مخرج" نظر نہیں آیا۔ تاہم چند اسباب کی بنا پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جیسے تیسے کسی نہ کسی بہانے کوئی نہ کوئی انتہائی اقدام کر گزریں گے، اس لئے کہ نرغے میں آئی ہوئی تو بلی بھی شیر ہو جاتی ہے اور ایک DESPERATE انسان سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔ پھر مولانا بھاشانی عمر کی اس حد کو بھی پہنچ چکے ہیں جہاں مزید انتظار کی گنجائش مشکل ہی سے رہ جاتی ہے ------ دوسری طرف مسٹر بھٹو کو بھی صاف نظر آ رہا ہے کہ کسی عوامی ایجی ٹیشن کی صورت میں ان کے CHANCES الیکشن کی نسبت بہرحال زیادہ ہیں، چنانچہ جیسا کہ ہم عرض کر چکے وہ الیکشن کی تیاری کے ساتھ ساتھ پاکستان کی خارجہ حکمتِ عملی میں "SHIFT" اور خصوصاً پاک چین دوستی، ہندو پاک جھگڑے اور قضیئے اور پاکستان اور امریکہ کے تعلقات ایسے مسائل کو بھی چھیڑ رہے ہیں اور کبھی کسی مرکزی وزیر کو برسرعام للکار کر اور کبھی لائسنسوں اور پرمٹوں وغیرہ کی بندر بانٹ کا تذکرہ کر

کے پرسکون سیاسی فضا میں تلاطم کی لہریں اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مزید بر آں "تاشقند کا بِلّا" بھی ابھی ان کے تھیلے میں محفوظ ہے۔

اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس وقت زیر ترقی ممالک کی اکثریت جن حالات سے دوچار ہے ان کے پیش نظر خصوصاً ایسے ملکوں میں جہاں سیاسی خلا بھی پایا جاتا ہو' کسی عوامی ایجی ٹیشن کا برپا کر دینا کوئی مشکل کام نہیں---!!

عوام کی زندگی جس طرح دن بدن اجیرن ہوتی چلی جارہی ہے اس کی بنا پر عوام تو ع "دیوانہ راہوئے بس است!" کے مصداق بس اس کے منتظر ہوتے ہیں کہ کوئی ذرا ہمت اور جرأت سے کام لے کر ایک بار کوئی زوردار نعرہ لگا دے۔

اور جہاں تک ہمت و جرأت کا تعلق ہے مسٹر بھٹو تو ماضیٔ قریب ہی میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ان میں چاہے اور کسی چیز کی کتنی بھی کمی کیوں نہ ہو' ہمت و جرأت کی ہرگز کوئی کمی نہیں---رہے مولانا بھاشانی تو ان کا بھی پورا سیاسی کیریئر جرأت اور ہمت کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے---!!

بنابریں پاکستان کے سوشلسٹ عناصر کی جانب سے کسی انقلابی اقدام کا امکان ہرگز خارج از بحث نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ بحالاتِ موجودہ بہت متوقع ہے!!

لیکن اگر ایسا ہو گیا تو---ایک طرف تو اس کا نتیجہ ہمارے نزدیک ایک بہت بڑے خون خرابے کی صورت میں ظاہر ہو گا جو مغربی پاکستان میں تو چاہے زیادہ ہولناک نہ ہو' مشرقی پاکستان میں بالکل انڈونیشیا کے پیمانے پر ہو گا جس کے نتیجے میں پاکستان کا وجود تک سخت خطرے سے دوچار ہو سکتا ہے------اور دوسری طرف ایسے کسی اقدام سے ہمارے نزدیک بحالاتِ موجودہ سوشلسٹ عناصر کی کامیابی کے امکانات بھی بہت کم ہیں' اس لئے کہ ان کا مقابلہ بیک وقت دو طاقتوں سے ہو گا۔ ایک طرف حکومتِ وقت ہو گی اور وہ بھی سیاسی نہیں فوجی جو امن و امان کو برقرار رکھنے کے فرض کو ادا کرے گی اور دوسری طرف مخالف سیاسی قوتیں ہوں گی جن کو اس طرح آپ سے آپ گویا حکومت کا کور بھی حاصل ہو جائے گا------اور پاکستان کے سوشلسٹ عناصر ابھی اتنے طاقتور بہرحال نہیں ہیں کہ ایسی دو طرفہ جنگ لڑ کر بھی کامیاب ہو جائیں۔

لہٰذا ہماری استدعا پاکستان کے سوشلسٹ عناصر سے یہی ہے کہ وہ اس آگ سے

کھیلنے کی کوشش نہ کریں بلکہ سیدھی طرح سیاسی میدان میں اپوزیشن کا
معروف کردار اختیار کر کے ایک مضبوط اور پیہم سیاسی عمل کے ذریعے رائے
عامہ کو ہموار کریں --- اور اس طرح ملک کے سیاسی و معاشی ڈھانچے میں وہ
تبدیلیاں برپا کرنے کی کوشش کریں جو انہیں مناسب اور ضروری معلوم ہوں۔

لیکن چونکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اول تو ہماری اس درخواست کا اس کیمپ کے کانوں تک پہنچنا ہی بہت مشکل ہے اور اگر یہ مرحلہ بھی کسی طرح سر ہو جائے تو اس کی "قبولیت" کا امکان بہت کم ہے' لہٰذا ہم اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان حضرات کو تحمل اور بردباری کے ساتھ غور و فکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور پاکستان کو بدامنی' انتشار' فتنہ و فساد اور خون خرابے کے اس خطرے سے بچالے جو آج عین اس کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے ---!!

اور اگر یہ صورت پیدا ہو گئی ---- اور پاکستان کی بائیں بازو کی قوتیں "آخری مقابلے" کو کسی اور موقع کے لئے مؤخر کر کے فی الوقت صرف سیاسی جدوجہد پر قناعت کرنے پر آمادہ ہو گئیں تو اگرچہ نظریاتی بحث مباحثہ (IDEOLOGICAL DEBATE) کی گرما گرمی تو پھر بھی باقی رہے گی لیکن ظاہر ہے کہ اصلاً سارے کا سارا کھیل خالص سیاسی نوعیت کا رہ جائے گا اور مختلف سیاسی جماعتوں کے مابین "کچھ دے کچھ لے" کے اصول پر کسر و انکسار کے ذریعے معاملات طے ہو جائیں گے۔ اس صورت میں حکومت جو بھی بنے گی بہرحال دائیں بازو کے عناصر پر مشتمل ہو گی اور بائیں بازو کو فی الحال صرف اپوزیشن کی پوزیشن پر اکتفا کرنا ہو گا۔

خالص سیاسی نقطۂ نظر سے ہمارے نزدیک اِس وقت مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی عوامی لیگ کو فیصلہ کن قوت حاصل ہے اور مغربی پاکستان کے دائیں بازو کے عناصر کو انہیں چاہے ناگزیر برائی (INEVITABLE EVIL) کی حیثیت ہی سے سہی' بہرحال قبول کر لینا چاہئے ---- اس لئے کہ بالآخران کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار بھی نہیں رہ جائے گا اور۔

ہر چہ دانا کند ' کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار !!

کے مصداق ان کا اس وقت کا سبّ و شتم بعد میں نقصان دہ ہی ثابت ہو گا مفید نہیں!---- اس اعتبار سے ہمارے نزدیک مسٹر دولتانہ کی سیاسی حکمت عملی بہت صحیح ہے اور وہ لوگ سخت غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں جو حد سے زیادہ بڑھی ہوئی عجیب دشمنی کے جوش میں خود مسٹر دولتانہ کو بھی مسلسل رگڑے چلے جا رہے ہیں۔

دوسری طرف مغربی پاکستان میں بھی اگرچہ دائیں بازو کی سیاسی قوت تو بہت زیادہ منتشر و منقسم ہے لیکن شخصی اعتبار سے واقعہ یہ ہے مسٹر دولتانہ کے قد کاٹھ (STATURE) کا کوئی دوسرا سیاست دان ریٹائرڈ لوگوں میں ہو تو ہو کم از کم میدان میں موجود نہیں۔ اس اعتبار سے "نظریۂ پاکستان" کی علمبردار تمام جماعتوں کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ ان کی شخصیت کو ذہنی طور پر قبول (RECONCILE) کرنے کا کڑوا گھونٹ جیسے تیسے بھر ہی لیں اور ماضی کی تلخ یادوں کو بھلا کر ان سے مفاہمت کر لیں۔ خاص طور پر لیگ ہائے ثلاثہ کو تو اگر وہ واقعتاً اپنے مبینہ اغراض و مقاصد اور نظریات کے ساتھ مخلصانہ تعلق رکھتی ہیں، شخصیتوں کے تصادم سے صرفِ نظر کر کے ان کی ذات پر جمع ہو ہی جانا چاہئے---- ہماری رائے میں آنجہانی کنونشن مسلم لیگ کا وہ دھڑا جس کی قیادت بظاہر فضل القادر چودھری لیکن درحقیقت سابق صدر ایوب ہی کے ہاتھ میں ہے غالباً جلد ہی اس "نوشتۂ دیوار" کو پڑھ لے گا---- رہے خان قیوم تو ان کا معاملہ خالص ذاتی نوعیت کا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ آل پاکستان سطح پر "ابھرنے" کی غرض سے ہر قیمت پر دولتانہ کو گرانے کی کوشش کی بجائے اپنی تمام قوتیں اور توانائیاں صرف سابق صوبۂ سرحد میں علاقہ پرستی کے رجحانات کے مقابلے کے لئے وقف کر دیتے لیکن ع "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!"---- اسی طرح کاش کہ پی ڈی پی کے مختلف عناصر میں بھی شخصی سطح سے ابھر کر ملک و ملت کے وسیع تر مفادات کے پیش نظر حقائق کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

رہی جماعت اسلامی اور پیپلز پارٹی تو ہمارے نزدیک اگر ملک کی گاڑی سیاسی پٹڑی پر چلتی رہی اور الیکشن منعقد ہونے کی نوبت آ ہی گئی تو

"ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی"

کے مصداق الیکشن کی ساری رونق انہی کے دم سے ہو گی اور سارا شور و شغب اور ہنگامہ بلکہ سر

پھٹول بھی ان ہی کے مابین ہو گا ---- واللہ اعلم

واضح رہے کہ مندرجہ بالا تمام گفتگو خالص سیاسی نقطۂ نظر سے تھی ---- اور اس میں ہم نے حتی الامکان ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے واقعی صورتحال کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے جس میں ہماری پسند یا ناپسند کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔

جہاں تک ہماری ذات کا تعلق ہے، ہمیں اصل دلچسپی تو اگرچہ صرف دین و مذہب اور اس کے مستقبل سے ہے، تاہم چونکہ پاکستان نہ صرف یہ کہ اسلام کے نام پر بنا ہے بلکہ ہمیں فی الواقع یہ محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کا قیام اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی خدائی تدبیر کے سلسلے کی ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا ہمیں دل سے اس کا بقاء و استحکام بھی مطلوب ہے ---- اور سیاسی جماعتوں میں سے فطری طور پر ریجنل نیشنلزم کے علمبرداروں کے مقابلے میں ہماری ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو "نظریۂ پاکستان" کے علمبردار ہیں اور اسلام کا نام بھی لیتے ہیں، چاہے اس کی حیثیت زبانی جمع خرچ سے زیادہ کچھ نہ ہو ---- دوسری طرف جو تحریکیں معاشی بے اعتدالیوں اور ناانصافیوں کے مداوا کے طور پر "اجتماعی معیشت" کی علمبردار بن کر اٹھ رہی ہیں، انہیں بھی ہم نہ دشمنِ پاکستان سمجھتے ہیں نہ دشمنِ اسلام ---- بلکہ ہمارے نزدیک مناسب حدود کے اندر رہتے ہوئے یہ بھی وقت کا ایک اہم تقاضا ہے اور ہماری پختہ رائے یہ ہے کہ سیاسی حقوق کے ساتھ ساتھ جب تک عوام کو اپنے جائز معاشی حقوق بھی حاصل نہ ہوں، جمہوریت واقعتاً ایک "گندے انڈے" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

> ہمارے تجزیئے کے مطابق ہمارے ملک کے عوام اس وقت جاگیرداری، سرمایہ داری اور نوکر شاہی بیک وقت تین لعنتوں کے چنگل سے نکل کر سیاسی، معاشی اور تہذیبی استقلال سے ہمکنار ہونے کی جدوجہد کر رہے ہیں اور اس وقت ہم بحیثیتِ ملک و قوم اپنی زندگی کے دو بالکل مختلف ادوار کے مابین ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں!!

اس قسم کے عبوری دور میں جبکہ بہت سے رجحانات بیک وقت متصادم ہوں ایک پیچیدہ

صورتحال کا پیدا ہو جانا بالکل طبعی و فطری ہے اور بھانت بھانت کی بولیاں، شور و شغب اور کسی قدر اونچ نیچ قطعاً غیر متوقع نہیں۔

اس پر مستزاد ہیں بین الاقوامی کھینچ تان اور مختلف عالمی قوتوں کی باہمی رسہ کشی کے اثرات جن سے پیچیدگی دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو جاتی ہے اور حالات مزید نازک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

ہمارے ملک میں اس وقت یہ سارے ہی عوامل کار فرما ہیں اور ان کی پیدا کردہ پیچیدگی ہی کم نہ تھی، لیکن اس میں مزید اضافہ دین و مذہب کے نام کی دہائی کی وجہ سے خواہ مخواہ پیدا کر لیا گیا ہے، در آنحالیکہ اجتماعی زندگی تو بہت دور کی بات ہے، دین و مذہب کو ہماری ایک عظیم اکثریت کی نجی زندگی میں بھی کسی فیصلہ کن عامل کی حیثیت حاصل نہیں۔

اور یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ پاکستان کی موجودہ سیاسی کشمکش میں اسلام ہرگز کسی قابل لحاظ فریق کی حیثیت سے شریک نہیں ہے بلکہ اسے محض ایک سیاسی نعرے کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے!

ہم نے گزشتہ سال کی ابتدائی اشاعتوں میں بھی اس صورتحال کی جانب چند اشارے کئے تھے، لیکن زیادہ تفصیل میں جانا اس لئے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ ہماری گزارشات سے حاصل تو کچھ بھی نہ ہوگا البتہ کچھ ایسے بزرگ ضرور ناراض ہو جائیں گے جن کا احترام ہم تہہ دل سے کرتے ہیں۔ لیکن اب دو اسباب کی بنا پر ہمارے لئے اس موضوع پر قلم اٹھانا ضروری ہو گیا ہے:

ایک اس سبب سے کہ ہوتے ہوتے اب اس معاملے نے بہت نازک صورت اختیار کر لی ہے اور ملک کی سیاسی فضا میں اسلام اور سوشلزم کی خیالی جنگ کا کچھ ایسا ہوائی سا سماں باندھ دیا گیا ہے کہ عوام کی اکثریت کے لئے صحیح صورتحال کا فہم نہایت مشکل ہو گیا ہے اور ان میں ایک شدید جذباتی تناؤ پیدا ہو رہا ہے جو کسی بھی وقت خونریز تصادم کی صورت اختیار کر سکتا ہے---- چنانچہ تازہ ترین صورتحال یہ ہے کہ نوبت فتویٰ بازی تک پہنچ چکی ہے اور اس کا ہدف عوام ہی نہیں بالواسطہ طور پر وہ لوگ بھی بن گئے ہیں جن کی دینداری اور تقویٰ کی قسم تک کھائی جا سکتی ہے۔

اور دوسرے اس وجہ سے کہ ہمارے بزرگوں، کرم فرماؤں، دوستوں اور عزیزوں میں سے

بھی بہت سے حضرات نے ان دنوں ہمیں اپنے موقف پر نظرثانی کرنے کی دعوت دی ہے۔ عام ملاقاتوں اور گفتگوؤں سے قطع نظر ان دنوں پے بہ پے متعدد خطوط میں اس مسئلے کو چھیڑا گیا ہے اور مختلف مشوروں سے بھی نوازا گیا ہے۔ ہمارے لئے ان سب حضرات کے خطوط کا جواب دینا مشکل ہے اور اس کے مقابلہ میں آسان تر صورت یہی ہے کہ ایک بار ہم اس موضوع پر "میثاق" کے صفحات میں مفصل اظہارِ خیال کر دیں۔

چنانچہ آئندہ اشاعت میں ہم ان شاء اللہ العزیز اس موضوع پر مفصل کلام کریں گے۔

اللّٰھم ارنا الحق حقًّا وارزقنا اتباعہٗ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہٗ!

آمین یا ربّ العٰلمین!!

باب ششم

تحریکِ پاکستان کی وراثت

اور

"مذہبی رومانویت"

جون جولائی ۱۹۷۰ء

آج سے تین چار ماہ قبل ان صفحات میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان کی موجودہ سیاسی کشکش میں دین ومذہب کو جس طرح اچھالا جارہا ہے اور اسلام کے نام کو جس طرح ایک سیاسی نعرے کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے اس پر بھی مفصل اظہارِ خیال کریں گے اور جتنے مذہبی گروہ اس وقت سیاسی میدان میں برسرِپیکار ہیں ان کے بارے میں بھی اپنی رائے تفصیل کے ساتھ پیش کریں گے۔ گزشتہ شمارے میں یہ وعدہ بوجوہ پورا نہیں کیا جاسکا تھا۔ آج کی صحبت میں ہم اللہ کا نام لے کر اپنے اس وعدے کو پورا کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ وَمَا تَوفِیقِی اِلّا بِاللّٰہِ العَظِیم!

ان تین چار مہینوں کے دوران' اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ پاکستانی سیاست کی فضا میں "انقلابی" رنگ مسلسل کم ہوتے ہوتے تقریباً معدوم ہوچکا ہے اور اس کی جگہ انتخابی رنگ نے لے لی ہے۔

گزشتہ شمارے میں ہم نے پاکستان میں سوشلسٹ انقلاب کے علمبرداروں کی جانب سے کسی انقلابی جدوجہد اور عوامی ایجی ٹیشن کے اجراء کے امکان کا تذکرہ کرنے کے بعد عرض کیا تھا کہ :

> "لہٰذا ہماری استدعا پاکستان کے سوشلسٹ عناصر سے یہی ہے کہ وہ اس آگ سے کھیلنے کی کوشش نہ کریں بلکہ سیدھی طرح سیاسی میدان میں اپوزیشن کا معروف کردار اختیار کر کے ایک مضبوط اور پیہم سیاسی عمل کے ذریعے رائے عامہ کو ہموار کریں۔۔۔۔۔اور اس ملک کے سیاسی ومعاشی ڈھانچے میں وہ تبدیلیاں برپا کرنے کی کوشش کریں جو انہیں مناسب اور ضروری معلوم ہوں"۔

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ملتِ اسلامیہ پاکستان پر اللہ تعالیٰ کے عظیم احسانات میں سے

ایک یہ بھی ہے کہ ...... چاہے اس کے ظاہری اسباب کچھ بھی رہے ہوں اور اس کا Credit کوئی بھی لے لے، بہرحال نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کسی فوری انقلاب کے امکانات تقریباً ختم ہو چکے ہیں اور تمام سیاسی جماعتیں اور سارے سیاسی گروہ پوری دلجمعی کے ساتھ انتخابات کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے ہیں۔

مسٹر بھٹو کے بارے میں ہم نے بارہا عرض کیا ہے کہ وہ خود بھی "انقلابی" سے زیادہ "سیاسی" مزاج رکھتے ہیں اور ان کی تحریک بھی "نظریاتی" سے زیادہ "قومی" رنگ کی حامل ہے---- لہٰذا انہیں تو خالص انتخابی رنگ اختیار کرنے میں کسی دِقت کے پیش آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ چنانچہ انہیں زیادہ سے زیادہ یہ کرنا پڑا کہ انہوں نے اپنے ڈھیلے ڈھالے جماعتی نظم میں چند "پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو" نوجوانوں کو خارج کر کے اصل اہمیت صاحب حیثیت اور ذی وجاہت لوگوں کو دے دی---- اور خود بھی زیادہ گرما گرم اور اشتعال انگیز باتیں کہنی بند کر دیں---- (اگرچہ عوام کے جذبات اور ان کی دلچسپی کے اعتبار سے جو کمی اس طرح واقع ہو سکتی تھی اس کو بعض دوسرے Fire Brand مقررین (جیسے مثلاً ریٹائرڈ میجر جنرل اکبر خاں) کی شعلہ نوائی سے پورا کرنا پڑا!) حد یہ ہے کہ سابق صدر ایوب خاں کے فیلڈ مارشل کے منصب کی بحالی ایسے اقدام پر بھی وہ مہر بلب رہے ع

"کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں"

ویسے بھی صوبۂ سندھ کی حد تک تو ان کی جماعت یا جمعیت پہلے ہی سے عوام سے زیادہ وڈیروں کے سہارے قائم تھی۔ اب یہ رنگ مزید پختہ ہو گیا ہے اور اندازہ یہ ہے کہ زمینداروں اور جاگیرداروں کی باہمی سیاست میں مسٹر بھٹو آنے والے انتخابات میں کھوڑو اور قاضی فضل اللہ گروپ کا بھرپور مقابلہ کریں گے اور کیا عجب کہ انہیں شکست دینے میں بھی کامیاب ہو جائیں۔

البتہ مولانا بھاشانی کا معاملہ بہت مختلف تھا اور ان کیلئے یہ قلب ماہیت اتنی آسان نہ تھی۔ چنانچہ ان کی گاڑی کو پٹڑی بدلتے ہوئے بہت سے شدید جھٹکے کھانے پڑے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کانفرنس تک ان کا "انقلابی" رنگ پوری طرح قائم تھا اور اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس وقت تک وہ کلیتاً اپنی جماعت کے، خصوصاً مشرقی پاکستان کے انتہا پسند عناصر کے زیر اثر تھے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ان کی آتش نوائی ان کے مغربی پاکستانی ساتھیوں کی اکثریت کو پسند نہیں آئی۔ ادھر مشرق میں

ایک قابل لحاظ عنصر انتخابات کے حق میں زور لگا رہا تھا۔ چنانچہ ان کی جماعت میں ان تین چار ماہ کے دوران بڑی رسہ کشی اور کھینچا تانی رہی---- اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی اعلان کردہ ملک گیر ہڑتال کی ناکامی میں جہاں خارجی اسباب کا دخل تھا وہاں اصل فیصلہ کن دخل اسی داخلی انتشار کو حاصل تھا۔

ہڑتال کی ناکامی کے بعد اس کشمکش میں رفتہ رفتہ سیاسی عنصر کا پلڑا بھاری ہو تا گیا اور مولانا بھاشانی نے پٹڑی بدلنی شروع کر دی۔ چنانچہ ایک طرف تو ایسٹ پاکستان نیپ کے انتہاپسند انقلابی عناصر جن کے سرخیل مسٹر طہٰ تھے پارٹی سے کٹ گئے---- اور دوسری طرف مولانا بھاشانی نے جو "انقلابی سٹیم" انقلابی جدوجہد کی تیاریوں کے دور میں کارکنوں میں بھر دی تھی اسے چند بے ضرر سے "گھیراؤں" میں نکلوا کر پارٹی کے انقلابی انجن کو ٹھنڈا کر دیا---- اور اس ڈرامے کا ڈراپ سین اس طرح ہوا کہ مولانا خود بیمار ہو کر پارٹی کونسل کے اجلاس سے غیر حاضر ہو گئے اور کونسل نے ایک طرف انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کر کے اپنی قلبِ ماہیت کا اعلان کر دیا اور دوسری طرف مولانا بھاشانی کو تیسری بار پارٹی پریذیڈنٹ منتخب کر کے ان کی شخصیت کو بھی مجروح ہونے سے بچا لیا۔

اس طرح اصولی اعتبار سے تو اب نیشنل عوامی پارٹی کے دونوں گروپوں کے مابین کوئی فرق نہیں رہا، ماسوائے اس کے کہ بھاشانی گروپ "تازہ واردِ بساطِ سیاست" ہونے کی وجہ سے ابھی قدرے زیادہ "نظریاتی" ہے، جبکہ ولی خاں گروپ ایک عرصے سے اس دشت کی بادیہ پیمائی کر رہا ہے لہٰذا قدرے زیادہ "سیاسی" ہے۔ لہٰذا ہماری رائے میں اگر ان دونوں گروپوں کے لیڈر ذاتیات سے بلند ہو سکیں تو اب جلد ہی انہیں دوبارہ باہم مدغم ہو جانا چاہئے---- واللہ اعلم!

بہرحال، بھٹو اور بھاشانی کے سیاسی و انتخابی لائن اختیار کر لینے سے پاکستان کے سر سے کسی فوری دھماکہ خیز انقلاب کا خطرہ ٹل گیا ہے اور سارا کھیل خالص سیاسی نوعیت کا رہ گیا ہے---- فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ!!

ان تین چار ماہ کے دوران میں اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی پاکستان میں پورے زور و شور سے اور مشرقی پاکستان میں کسی قدر کم قوت کے ساتھ 'تحریک پاکستان کا گویا از سرنو احیاء ہو گیا ہے' چنانچہ ایک طرف مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور نظریۂ ملی کا راگ خوب الاپا جا رہا ہے۔ دوسری

طرف "نظریہ پاکستان" کی دہائی دی جا رہی ہے اور اس کے تحفظ کیلئے سرمایہ داروں کی تجوریوں کے منہ کھل گئے ہیں اور تیسری طرف اسلام "اسلام" کا شور مچ رہا ہے اور بہت سے خوش گمان لوگوں کی آنکھوں میں اسلامی نظام کے نفاذ اور اسلامی حکومت کے قیام کی امیدوں کے سوکھے چمن میں یکبارگی بہار کی آمد کے خیال سے چمک پیدا ہو گئی ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ اس تازہ احیاء شدہ "تحریکِ پاکستان" کے دلِ صد پارہ کے کچھ ٹکڑے کسی کے قبضے میں ہیں اور کچھ کسی دوسرے کے ہاتھ ---- چنانچہ ایک طرف تحریکِ پاکستان کی "مذہبی رومانویت" ہے جس پر کم از کم تاحال بلا شرکتِ غیرے پوری مضبوطی کے ساتھ جماعت اسلامی قابض ہے اور اس میں وہ کسی کو بھی شریک کرنے کو تیار نہیں۔ حتیٰ کہ اس کے اصل وارثین میں سے ایک گروہ جو علماء دیوبند کے تھانوی و عثمانی حلقوں پر مشتمل ہے نہ صرف پورا زور صرف کرنے بلکہ چھینا جھپٹی کرنے کے باوجود جماعت اسلامی کو اس "قبضۂ غاصبانہ" سے بے دخل کرنے میں ناکام ہو رہا ہے۔ اور اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا تھانوی کی طرف سے اس سلسلے کی مزید کارروائی کے سدِباب کیلئے غالباً جماعت اسلامی متحدہ اسلامی محاذ کے قیام کیلئے گفت و شنید تک سے احتراز کرے گی ---- حال ہی میں تحریک پاکستان کی مذہبیت کی وراثت کا دعویدار ایک دوسرا گروپ البتہ ایسا سامنے آیا ہے جو چاہے جماعت اسلامی کو اس "قبضۂ غاصبانہ" سے کلی طور پر بے دخل نہ کر سکے، بہرحال اس میں سے قابلِ لحاظ حصہ ضرور بٹوا لے گا' ہمارا اشارہ بریلوی مکتب فکر کے علماء اور مشائخ کی اس کانفرنس کی جانب ہے جو حال ہی میں "دار السلام" ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بڑی شان و آن بان کے ساتھ منعقد ہوئی ہے اور جس میں متعدد مقررین نے جماعت اسلامی پر شدید لے دے کی ہے۔

دوسری طرف اس "مذہبی رومانویت" کے بالکل برعکس تحریک پاکستان کے اصل اور اساسی محرک یعنی ہندوؤں کے سیاسی' تہذیبی اور معاشی تسلط کے خوف اور اس سے بچاؤ کے جذبے کی وراثت ہے جس پر اتفاقاً ہی سہی بہرحال کم از کم مغربی پاکستان کی حد تک کلیتاً مسٹر ذوالفقار علی بھٹو قابض ہو گئے ہیں۔ تحریک پاکستان کا یہ اصل "باطن" اس وقت دو صورتوں میں ظاہر ہو رہا ہے : ایک ہندوستان دشمنی اور دوسرے عوام کے معاشی حقوق کی بازیافت کی جدوجہد۔ ان میں سے مقدم الذکر کی علامت (Symbol) تو مسٹر بھٹو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران ہی میں بن گئے تھے

اور مؤخر الذکر کی علامت وہ اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگا کر بن گئے۔ اور چونکہ ایک طرف یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ تحریک پاکستان کے اساسی محرکات میں اصل فیصلہ کن حیثیت معاشی عوامل ہی کو حاصل تھی اور دوسری طرف اس حقیقت کا انکار بھی شدید قسم کی ڈھٹائی کے بغیر ممکن نہیں کہ اسلامی سوشلزم کا تصور "مصورِ پاکستان" علامہ اقبال کے یہاں تو پورے زور و شور کے ساتھ موجود ہے ہی، خود "خالقِ پاکستان" مسٹر محمد علی جناح اور ان کے دستِ راست خان لیاقت علی خاں کے یہاں بھی بصراحت مذکور ہے (اور یہ تو شاید پرانی باتیں معلوم ہوں---- تازہ ترین انکشاف یہ ہے کہ اس خط میں جو محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی انتخابی مہم کے دوران بی ڈی ممبروں کو بھیجا اور جسے گویا ان کے چھوٹے سے منشور کی حیثیت حاصل تھی، محترمہ فاطمہ جناح نے ٹیپ کا بند یہی ارشاد فرمایا تھا کہ : "... تاکہ ... ہماری آئندہ نسلیں اپنی زندگی اسلامی سوشلزم اور ان اصول و نظریات کے مطابق گزار سکیں جن کی بنیاد پر ہماری عظیم مملکت پاکستان وجود میں آئی ہے ..." ؏ "چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما") لہٰذا چاہے یہ کسی کو برا لگے چاہے بھلا، بہر حال واقعہ یہی ہے کہ تحریک پاکستان کی اصل روح باطنی کے وارث مسٹر بھٹو ہیں (اگرچہ مغربی پاکستان میں ہندوستان دشمنی کی راہ سے خان عبدالقیوم خاں اور مشرقی پاکستان میں اس خطے کے معاشی حقوق کی بازیافت کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے شیخ مجیب الرحمٰن بھی تحریک پاکستان کے اس جزو کی وراثت میں کسی حد تک شریک قرار دیئے جاسکتے ہیں۔)

تیسری طرف تحریک پاکستان کے اس "جسدِ خاکی" کی وراثت کا مسئلہ ہے جو نواب زادوں، جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں سے مرکب تھا اور دین و مذہب کے باب میں زیادہ سے زیادہ "لبرل اسلام" کا قائل تھا۔ اور اگرچہ مسلم لیگ بطور ایک وحدت کے تو کبھی کی مرحومین کی فہرست میں شامل ہو چکی تاہم اس کے جسدِ خاکی کے اجزاء ابھی موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ ٹھنڈے پیٹوں ہرگز اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی دوسری جماعت زبردستی تحریک پاکستان کی وراثت پر تنہا قابض ہو جائے اور مسلم لیگ کی واحد جانشین بن بیٹھے ۔ اس لئے کہ بظاہر احوال تو تحریک پاکستان کی وراثت کے اصل مدعی وہ ہیں نہ کہ کوئی اور! (مسلم لیگ کے "باقیات الصالحات" ہونے کی حیثیت سے تحریک پاکستان کی وراثت کے دعوے داروں میں فی الوقت مدعیٔ اعظم کی حیثیت بلاشبہ مسٹر ممتاز محمد خاں دولتانہ اور ان کے ساتھیوں کو حاصل ہو گئی

ہے۔ اگرچہ کچھ دوسرے گروپوں کا دعویٰ بھی اس بات میں بالکل بے بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا۔)

قصہ مختصر یہ کہ ---- اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت پاکستان میں تحریک پاکستان کے احیاء کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے لیکن چونکہ تحریک پاکستان کے حصے بخرے ہو چکے ہیں اور ؏

"اڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے"

کے مصداق اس کی وراثت کے مدعی بہت سے ہیں، لہٰذا چاہے "تحفظِ نظریۂ پاکستان" کے نام پر بھیک کسی ایک جماعت ہی کو زیادہ مل جائے، انتخابات کے میدان میں تحریک پاکستان کے اس حالیہ احیاء کے ثمرات بہت سی سیاسی جماعتوں کے مابین تقسیم ہوں گے اور کوئی ایک جماعت چاہے وہ کوئی سی بھی ہو ان سے بلا شرکتِ غیرے متمتع نہیں ہو سکتی! ---- !!

"مذہبی رومانویت" کی اصطلاح ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کے لئے بالکل اجنبی ہو اور وہ اس سے ناخوش بھی ہوں، اس لئے وضاحتاً عرض ہے کہ یہ "ایجادِ بندہ" نہیں ہے بلکہ سب سے پہلے اس اصطلاح کو مسلم ہندوستان کے زمانۂ حاضر کے سب سے بڑے مؤرخ شیخ محمد اکرام صاحب نے مسلمانانِ ہند کی ماضیٔ قریب کی تاریخ کے اس دور کی کیفیت کی تعبیر کیلئے استعمال کیا تھا جس میں مسلمانوں کی قیادت کچھ صحافی قسم کے لیڈروں کے ہاتھ آ گئی تھی جنہوں نے ملّتِ اسلامیہ ہند کو حقائق کا مواجہہ (Face) کرنے کی بجائے تصورات و جذبات کی دنیا میں رہنا سکھایا اور گویا زمین پر قدم بہ قدم چلانے کی بجائے ہوا میں اڑایا اور فضا کی پہنائیوں کی سیر کرائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بجائے اس کے کہ قوم میں محنت و مشقت، ایثار و قربانی اور جُہدِ مسلسل و سعیٔ پیہم کا مادہ پیدا ہوتا اسے اکثر و بیشتر تصورات کے حسین خوابوں کی دنیا میں کھوئے رہنے اور کبھی کبھی ہڑبڑا کر اٹھنے اور جوش و ہیجان میں کچھ نعرے لگا کر پھر خوابِ خرگوش میں مبتلا ہو جانے کی عادت پڑ گئی۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کا "کامریڈ" اس مرض کی صرف ابتدائی علامات کا مظہر تھا ---- مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے "الہلال" اور "البلاغ" میں یہ مرض اپنی پوری شدت کو پہنچا اور وہیں سے اس کی چھوت مولانا

ابوالاعلیٰ مودودی کو لگی جنہوں نے "ترجمان القرآن" کے ذریعے اس طرز کی صحافیانہ قیادت کے تسلسل کو برقرار رکھا۔۔۔اور یہ تو اس "سلسلۃ الذہب" کی صرف متصل کڑیاں ہیں۔ان کے علاوہ ملک کے طول و عرض میں اس کی اور بھی شاخیں پھوٹیں۔ جیسے مولانا ظفر علی خاں مرحوم کا "زمیندار" وقس علیٰ ہذا۔

اس صحافیانہ قیادت نے ایک طرف مسلمانوں کو ان کی عظمتِ رفتہ کی داستانیں سنا کر شاد کام کیا اور "پدرم سلطان بود" کے نشے میں مبتلا کر دیا اور دوسری طرف حکومتِ الٰہیہ کے قیام اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے بلند ترین نصب العین عطا کئے لیکن اس کے لئے کسی عملی نہج کو نہ واضح کیا نہ اس کی داغ بیل ڈالی۔ نتیجتاً پوری قوم پر مذہبی رومانویت کی سی کیفیت طاری ہو گئی جس کا تعلق ہوش سے زیادہ جوش اور عمل سے زیادہ تصور سے تھا۔

مولانا ابوالکلام مرحوم نہایت ذہین آدمی تھے۔انہوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ یہ سب ہوائی رومان ہے، حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ نتیجتاً انہوں نے جلد ہی قیامِ حکومتِ الٰہیہ کے "آسمانی" نصب العین سے دست کش ہو کر غیر ملکی سامراج سے آزادی کے حصول کا حقیر سا "زمینی" نصب العین اختیار کر لیا۔ اور بقیہ زندگی خاموشی کے ساتھ اس کی تحصیل میں کھپا دی ۔۔۔۔۔اس موقع پر مولانا مودودی آگے بڑھے اور انہوں نے مولانا ابوالکلام کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کے چھوڑے ہوئے مشن کو سنبھال لیا اور اس مذہبی رومان میں مزید رنگ آمیزی شروع کر دی۔ لیکن "بدقسمتی" سے اسی زمانے میں مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک زور پکڑ گئی اور اس نے حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے مذہبی رومان کی قیادت خود سنبھال لی اور اسلامی تہذیب، اسلامی تمدن، اسلامی قانون وغیرہ اصطلاحات کا استعمال کثرت سے شروع کر دیا اور اس طرح وہ "مذہبی رومانویت" کم از کم وقتی طور پر مسلم لیگ کے قبضے میں چلی گئی۔ تب مولانا مودودی نے یہ کہہ کر کہ اس قسم کی قومی تحریکوں سے کبھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہو سکتی {۱} اس کا توبس

{۱} "اس خام خیالی (LOOSE THINKING) کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے جس کا نام "اسلامی حکومت" ہو، لیکن خالص علمی (SCIENTIFIC) طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کی نوعیت کیا ہے اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ کیونکر قائم ہوتی ہے۔"

اقتباس از "اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے" تحریر مولانا مودودی

"ایک ہی مخصوص" طریقہ ہے "مسلمانوں کی قومی تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی اور اس "ایک ہی مخصوص" طریق {۲} پر کام شروع کر دیا۔

۴۵ء سے ۴۷ء تک مسلم لیگ نے مسلمانانِ ہند کی اس مذہبی رومانویت کو خوب استعمال (Exploit) کیا۔ اور اس کے بل پر اپنی اس حیثیت کو تسلیم کرالیا کہ وہ مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ یہی وہ وقت تھا جبکہ بریلوی مکتب فکر کے علماء و مشائخ کی ایک بڑی تعداد اور دیوبندی مکتب فکر کے تھانوی اور عثمانی حلقے اس رومانی غبارے میں مزید ہوا بھرنے کے لئے میدانِ عمل میں آ گئے ---- چنانچہ اسی بنا پر ہم نے سطورِ بالا میں ان ہی دونوں حلقوں کو تحریکِ پاکستان کی مذہبی رومانویت کی وراثت کے حقیقی دعویدار قرار دیا ہے۔ لیکن رومان بہرحال رومان ہی ہوتا ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد جلد ہی اس حسین خواب کا بھانڈہ چوراہے میں پھوٹ گیا اور یہ محسوس ہونے لگا کہ ع "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا!" ------ لیکن ابھی اس غبارے کی پوری گیس نکلنے نہیں پائی تھی کہ مولانا مودودی اپنے اس "ایک ہی مخصوص طریق کار" کو چھوڑ چھاڑ مذہبی رومانویت کے اس غبارے میں از سرِ نو گیس بھرنے کے لئے میدان میں آ گئے۔ اول

{۲} اس مخصوص طریق کار کے ابتدائی ناگزیر لوازم (PRE-REQUISITES) کا بیان مودودی صاحب ہی کے الفاظ میں سنئے :

"در حقیقت اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اس کے پیدا ہونے کے لئے ناگزیر ہے کہ ابتداء میں ایک ایسی تحریک اٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریہ حیات، وہ مقصد زندگی، وہ معیار اخلاق، وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہو۔ اس کے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لئے مستعد ہوں ---- پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائٹی میں اسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں ---- پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام لے کر اٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنٹسٹ، مسلم فلسفی، مسلم مورخ، مسلم ماہرین سیاست، غرض ہر شعبہ علم و فن میں ایسے آدمی موجود ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں، جن میں یہ قابلیت ہو کہ افکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کریں اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے خدا ناشناس ائمہ فکر کے مقابلے میں اپنی عقلی و ذہنی قیادت (INTELLECTUAL LEADERSHIP) کا سکہ جما دیں...."

(ایضاً)

اول انہیں اپنی اس کوشش میں بری طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن ع "پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ!" کے مصداق وہ تندہی کے ساتھ کام میں لگے رہے تا آنکہ آج نہ صرف یہ کہ پاکستان میں تحریک پاکستان کی مذہبی رومانویت کا از سرِ نو دور دورہ ہے بلکہ اس کی وراثت پر جماعت اسلامی اس طرح قابض ہے کہ اس کے اصل اور جائز وارثوں تک کو اپنا جائز حق وصول کرنا اور جماعت اسلامی کو اس "قبضۂ غاصبانہ" سے بے دخل کرنا مشکل نظر آ رہا ہے!!----!!

تاہم جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں "قیادتِ پاکستان" کے خواب کی تعبیر ابھی کہیں آس پاس بھی نظر نہیں آتی۔ اس لئے کہ اول تو تحریک پاکستان کی مذہبی رومانویت کے جائز وارث بھی میدان عمل میں آ گئے ہیں اور دوسرے اس تحریک کے بعض دوسرے اجزاء بھی تھے جن کی وراثت دوسروں کو منتقل ہو چکی ہے----الغرض ع "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!"

پاکستان کے سیاسی میدان میں اس وقت جو مذہبی گروہ یا جماعتیں برسرِ کار ہیں ان میں سب سے نمایاں تو جماعت اسلامی ہی ہے' دوسرے نمبر پر جمعیت علمائے اسلام ہے جس کی قیادت مولانا درخواستی' مفتی محمود اور مولانا ہزاروی کر رہے ہیں----اور ان کے بعد چند متفرق مذہبی گروہ ہیں جو مسلک و مزاج کے اعتبار سے چاہے کتنے ہی مختلف ہوں سیاسی موقف کے اعتبار سے ملّتِ واحدہ ہیں' یعنی مرکزی جمعیت علماء اسلام' جمعیت اہل حدیث اور بریلوی مکتب فکر کے علماء و مشائخ کے مختلف گروپ۔

ان میں سے جہاں تک مؤخر الذکر متفرق گروہوں کا تعلق ہے ہمیں ان کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہنا۔ اس لئے بھی کہ سیاست ان کا مستقل مشغلہ نہیں ہے بلکہ سیاست سے ان کی دلچسپی صرف موسمی (SEASONAL) قسم کی ہے۔ ان کا اصل اور مستقل شغل درس و تدریس اور اپنے اپنے ہم خیال فرقوں کی مذہبی پیشوائی ہے جس کے ذیل میں مدارس و مکاتیب کے قیام و اہتمام' مساجد کی امامت اور اپنے اپنے مخصوص عقائد کی تبلیغ و تلقین میں یہ حضرات پوری طرح مصروف رہتے ہیں اور اس لئے بھی کہ ان کی یہ موسمی سیاست بھی تضادات اور قلابازیوں سے خالی

ہے...... آج سے پچیس سال قبل بھی یہ حضرات قومی سیاست کا مذہبی ضمیمہ بن گئے تھے......
اور آج پھر انہوں نے یہی رول اختیار کر لیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُس وقت قومی سیاست کی علمبردار جماعت ایک ہی تھی۔ لہٰذا یہ سب متفقہ طور پر اس کے معاون و مددگار بن گئے تھے اور اب قومی سیاست کئی دھڑوں میں بٹی ہوئی ہے لہٰذا ان کا تعاون بھی منقسم ہو جائے گا' چنانچہ ان کی اکثریت تو مرحوم مسلم لیگ کے صُلبی وارثوں کے مختلف گروہوں ہی کی مدد کرے گی۔ ایک قدرِ قلیل شاید تحریکِ مسلم لیگ کی معنوی وارث یعنی جماعت اسلامی کا ساتھ دے دے...... اسلام اور سوشلزم کی ہوائی جنگ میں چونکہ ان سب گروہوں نے متفقہ طور پر جماعت اسلامی کا ساتھ دیا تھا لہٰذا جماعت اسلامی کو توقع ہو گئی تھی کہ شاید انتخابات میں بھی وہ ان سب کی متفقہ حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے لیکن جونہی وہ ہوائی جنگ ختم ہوئی اور انتخابات کی بساط بچھنی شروع ہوئی اس متحدہ اسلامی محاذ کے شرکاء کے رخ بھی تبدیل ہونے شروع ہو گئے حتیٰ کہ اب اتحاد و اتفاق کے لئے کبھی کراچی اور کبھی لاہور میں مذاکرات تو منعقد ہوتے رہتے ہیں لیکن بات نہ کسی طور بن رہی ہے نہ بن سکے گی۔ اور ہمارے اندازے کے مطابق مولانا احتشام الحق تھانوی کی مرکزی جمعیت علماء اسلام بالواسطہ یا بلاواسطہ کونسل مسلم لیگ کا ساتھ دے گی اور بریلوی مکتبِ فکر کے علماء اور مشائخ کی اکثریت اپنے اپنے علاقوں میں لیگ ہائے ثلاثہ میں سے زیادہ تر دوسری دو مسلم لیگوں سے منسلک زمینداروں اور جاگیرداروں کے ہاتھوں کو مضبوط کرے گی جبکہ جمعیتِ اہل حدیث کی تازہ نوجوان قیادت اور جمعیت علماء پاکستان کے صرف نعیمی گروپ کی حمایت جماعت اسلامی کو حاصل ہو جائے گی...... واللہ اعلم!!

پاکستان کے سیاسی میدان کے اصل اور مستقل مذہبی کھلاڑی درحقیقت دو ہی ہیں یعنی جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام اور اگرچہ فی الوقت یہ دونوں بالکل مخالف کیمپوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اکثر معاملات میں ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں تاہم ان دونوں کے مابین بعض امور مشترک بھی ہیں :

مثلاً ایک یہ کہ قبل از تقسیم ملک و قیامِ پاکستان ان دونوں کی راہیں مسلمانانِ ہند کی مجموعی قومی سیاست سے جدا تھیں...... ایک گروپ کانگریس کا حامی و حلیف تھا اور دوسرے نے اپنی

ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بالکل ہی الگ بنائی تھی (اگرچہ اس اتفاق میں بھی اختلاف کا ایک رنگ موجود تھا یعنی یہ کہ مودودی صاحب نے ابتدا میں کچھ عرصے تک کم از کم نظری اور کاغذی حد تک قومی سیاست کا ساتھ دیا تھا ----- اور اس زمانے میں جمعیت علماء ہند کے موقف پر شدید اور نہایت تلخ تنقیدیں کی تھیں جن کی یاد فریق ثانی کے ذہن سے کسی طرح محو نہیں ہو سکتی!)

دوسرے یہ کہ قیام پاکستان کے بعد یہاں کی قومی قیادت کے مقابلے میں بھی ان دونوں کا رویّہ ایک جیسا رہا اور دونوں نے ہر ممکن طریق پر قومی قیادت کو کمزور کرنے کی کوشش کی، صرف اس فرق کے ساتھ کہ جبکہ جماعت اسلامی نے بزعمِ خویش قومی قیادت کے حریف کی پوزیشن سنبھال لی تھی اور وہ اس کی جگہ لینے کے لئے مثبت طور پر جارحانہ پیش قدمی کر رہی تھی وہاں جمعیت اور اس کے ہم خیال علماء کی روش اکثر و بیشتر صرف عدم تعاون اور ترکِ موالات کی قسم کی PASSIVE RESISTANCE تک محدود رہی، تاہم نتیجہ تقریباً ایک ہی رہا اور اکثر معاملات میں یہ دونوں گروہ، چاہے برضا و رغبت چاہے بادلِ ناخواستہ، ایک دوسرے سے تعاون کرتے رہے، چنانچہ انٹی قادیانی موومنٹ میں جماعت کو مجبوراً احرار اور جمعیت علماء اسلام کے پیچھے لگنا پڑا...... اور دوسری طرف پاکستان کے پہلے دس گیارہ سالوں کے دوران اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کے مطالبے اور دوسری دہائی کے دوران سابق صدر ایوب خاں کی مخالفت میں اکثر جمعیت جماعت کا ساتھ دیتی رہی حتیٰ کہ بعض مواقع پر تو حیرت انگیز حد تک اشتراکِ عمل رہا۔ مثلاً ۱۹۶۷ء میں عید الفطر کے موقع پر اور ۱۹۶۸ء کے اواخر میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے خلاف ایجی ٹیشن میں۔

تیسرے یہ کہ دونوں ہی نے احیائے دین اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے باب میں صرف نعروں پر اکتفا کی اور اس کے لئے کسی مثبت تعمیری کام کی داغ بیل نہیں ڈالی۔ اس سلسلے میں زیادہ ذمہ داری جماعت اسلامی پر عائد ہوتی ہے اور اصل گلہ اسی سے ہے، اس لئے کہ جیسا کہ سطور بالا میں دیئے ہوئے اقتباس سے ظاہر ہے وہ علمی و فکری انقلاب ہی کے نام پر قومی تحریک سے علیحدہ ہوئی تھی اور واقعہ یہ ہے کہ اس کی کسی حد تک صلاحیت بھی اس نے اپنے اندر قیام پاکستان سے قبل کے پانچ چھ سالوں میں پیدا کر لی تھی ----- لیکن افسوس کہ قیام پاکستان کے بعد اس نے ساری صلاحیتوں اور قوتوں کو سیاسی میدان میں جھونک دیا۔ رہی جمعیت علماء تو اس غریب نے نہ کبھی اس کا دعویٰ کیا اور نہ ہی علوم و فنونِ جدیدہ سے بُعدِ شدید کی بنا پر اس میں ایسے کسی کام کی صلاحیت ہی ہے!! لہٰذا اس

سے نہ کبھی اس کی کوئی توقع تھی نہ اب کوئی گلہ ہے!-----!!

ان چند مابہ الاشتراک امور کے سوا ہر اعتبار سے پاکستانی سیاست کے اکھاڑے کے یہ دونوں مذہبی پہلوان ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں اور ہوتے ہوتے ان کے عناد اور بغض نے انتہائی خطرناک صورت اختیار کرلی ہے' حتیٰ کہ اب جس شدید نوعیت کی عداوت ان دونوں کے مابین ہے اس کی مثال نہ دوسری سیاسی جماعتوں میں مل سکتی ہے نہ مذہبی گروہوں میں۔

سیاسی امور میں ان کے مابین جو بُعد المشرقین پایا جاتا ہے اس کے تذکرے سے قبل اس حقیقت کی جانب اشارہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان دونوں کا مذہبی رنگ بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ کسی گزشتہ اشاعت میں ہم ضمنی طور پر حاشیے میں یہ جملہ لکھ بیٹھے تھے کہ "جماعت اسلامی کا مذہبی رنگ ہلکا اور سطحی ہے اور قدامت پسندی اور جدّت پسندی کا ملغوبہ' جبکہ جمعیت علماء اسلام کا مذہبی رنگ نہایت گہرا بھی ہے اور خالص قدیم اور روایتی بھی!" جس پر بہت سے لوگوں حتیٰ کہ ہمارے بعض بزرگوں اور کرم فرماؤں نے بھی ناک بھوں چڑھائی حالانکہ یہ ایک روزِ روشن کے مانند عیاں حقیقت ہے جس کا انکار بالکل آنکھیں بند کرکے ہی کیا جاسکتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ جمعیت علماء اسلام کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو پرانے سند یافتہ اور سکہ بند علماء ہیں اور سالہا سال سے درس و افتاء کی مسندوں پر رونق افروز ہیں۔ پھر کیا یہ حقیقت نہیں کہ جمعیت علماء اسلام کے کارکنوں کی ایک عظیم اکثریت درس نظامی کے فارغ شدہ علماء پر مشتمل ہے یا زیر تعلیم طلبہ پر' جبکہ جماعت اسلامی کی اصل قوت سکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ ایسے نوجوانوں پر مشتمل ہے جن کی اکثریت ناظرہ قرآن مجید تو شاید پڑھ لے کسی ایک حدیث کے متن تک کو صحیح نہیں پڑھ سکتی۔ پھر ظاہری وضع قطع اور تراش خراش کے اعتبار سے بھی ان دونوں کے مابین عظیم تفاوت ہے۔ اس سلسلے میں فوری تقابل (SIMULTANEOUS CONTRAST) کا ایک موقع حال ہی میں لاہور میں پیش آیا۔ پچھلے دنوں یہاں ایک جلوس جماعت اسلامی کے زیر اہتمام "اسلام پسندوں" کی قوت کے مظاہرے کے لئے نکالا گیا' اور دوسرا جمعیت علماء اسلام نے اپنی طاقت کے مظاہرے کے لئے نکالا۔ پہلے جلوس کے قائدین میں بھی چار میں سے صرف ایک باریش تھے اور شرکاء میں بھی بمشکل پانچ فی صد داڑھی والے تھے اور ان میں سے بھی زیادہ سے زیادہ ایک

فی صد کی داڑھی فقہی معیار پر پوری اترتی تھی جبکہ دوسرے جلوس کے قائدین اور شرکاء سب کم از کم پچانوے فی صد مکمل شرعی وضع قطع کے حامل تھے۔ (ان جلوسوں کے مابین ایک اور نمایاں تفاوت جس کا براہ راست تعلق جماعت اسلامی سے نہیں ہے یہ تھا کہ "شوکتِ اسلام" کے جلوس میں نعرۂ تکبیر پر نعرۂ رسالت حاوی تھا اور کہیں کہیں سے نعرۂ حیدری کی آواز بھی سنی جاتی تھی جبکہ جمعیت علمائے اسلام کے جلوس میں دینی نعروں میں سے نعرۂ تکبیر کے سوا کوئی اور نعرہ سننے میں نہیں آیا) --- باقی رہا نظریات و افکار کا معاملہ تو مولانا مودودی خود تجدد پسندوں اور قدامت پرستوں کے مابین "بیچ کی راس" کے آدمی ہونے کے مدعی ہیں جبکہ جمعیت علماء اسلام ہے ہی ان علماء پر مشتمل جن کو قدامت پرستی اور جمود کے طعنے دیئے جاتے ہیں ---- تو پھر ہم نے اپنے اس جملے میں آخر اور کون سا زہر گھول دیا تھا؟

سیاسی موقف کے اعتبار سے جماعت اور جمعیت کے مابین جو بُعد المشرقین پایا جاتا ہے' تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد تین امور پر قائم ہے :

ایک یہ کہ عالمی سیاست کے میدان میں جمعیت علماء اسلام مغربی سامراج کی جانی دشمن ہے ----- اور اس کی بیخ کنی کے لئے وہ کسی بھی دوسری طاقت سے تعاون کو درست سمجھتی ہے (درحقیقت یہی وہ جذبہ تھا جس کے تحت ماضی میں جمعیت علماء ہند نے انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دیا تھا) جبکہ جماعت اسلامی کی رائے میں چونکہ مغربی الحاد نے کسی نہ کسی حد تک دین و مذہب کے ڈھانچے کو بھی قائم رکھا ہے اور مغربی جمہوریت میں رائے کی آزادی بھی برقرار رہتی ہے لہٰذا کمیونسٹ بلاک کے مقابلے میں مغربی طاقتیں کم تر درجے کی برائی ہیں۔

دوسرے یہ کہ بین الاسلامی اور خصوصاً بین العرب سیاست میں جمعیت کی تائید اور ہمدردیاں ان ممالک کے ساتھ ہیں جنہوں نے بادشاہتوں کے تختے الٹ کر سوشلسٹ یا نیم سوشلسٹ نظام اختیار کر لئے ہیں ---- اور روس کی امداد کے سہارے مشرقِ وسطیٰ میں امریکی سامراج کے مظہرِ اعظم اسرائیل کے خلاف مصروفِ پیکار ہیں ----- جبکہ جماعت اسلامی ان ممالک کی مؤید اور حامی ہے (اور ان کی سرپرستی سے فائدہ بھی اٹھا رہی ہے) جہاں ابھی ملوکیت قائم ہے اور جو سوشلزم کی مخالفت کے پردے میں امریکہ کی حمایت کا دم بھر رہے ہیں۔

تیسرے ملکی سیاست کے میدان میں حال ہی میں دائیں اور بائیں بازو کی جو تقسیم عمل میں آئی ہے اس میں جمعیت علمائے اسلام بائیں بازو کی حامی ہے اور عوام کے معاشی حقوق کی بازیافت کی جدوجہد میں مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ ہے۔ چنانچہ لیبر پارٹی کے ساتھ اس کا باقاعدہ معاہدہ ہو چکا ہے اور بائیں بازو کی دوسری تمام سیاسی جماعتوں کے ساتھ اس کا اتحاد کسی بھی وقت اور کسی بھی صورت میں ممکن ہے۔۔۔۔ جبکہ جماعت اسلامی نے سوشلزم کی مخالفت کو اسلام اور کفر کی جنگ کا درجہ دے کر دائیں بازو کی انتہاپسند جماعت کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ چنانچہ ملک کے سرمایہ دار طبقات کو اپنی نجات صرف اسی سے وابستہ نظر آتی ہے اور ان کی تجوریوں کے منہ اس کے "تحفظِ نظریۂ پاکستان فنڈ" کے لئے کھل گئے ہیں۔

بات تو درحقیقت بس اتنی سی ہے جو اوپر بیان ہوئی لیکن شدّتِ مخالفت میں یہی اختلافات اس صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں کہ جماعت اسلامی اور اس کے ہم خیال حلقوں کی جانب سے جمعیت پر کانگریسی مولویوں کی پھبتی کے علاوہ سوشلزم اور کمیونزم کے لیبل ہی نہیں کفر کے فتوے تک چسپاں کئے جا رہے ہیں اور جمعیت کی طرف سے جماعت اور ان کے ہم نواؤں کو امریکہ کے پٹھو، سامراج کے آلۂ کار، یہودیوں کے کارندے اور سرمایہ داروں کے ایجنٹ ایسے خطابات سے نوازا جا رہا ہے۔

جمعیت علمائے اسلام کے بارے میں ہم نے آج سے پورے ڈیڑھ سال قبل جبکہ پاکستانی سیاست کے موجودہ ہنگامہ خیز دور کی ابتدا ہوئی ہی تھی، ان صفحات میں کچھ گزارشات پیش کی تھیں جن سے جمعیت کے متذکرہ بالا سیاسی موقف کے تاریخی پس منظر پر روشنی پڑتی ہے۔ یعنی یہ کہ جمعیت علماء اسلام کا عوامی مزاج اور سامراج دشمن کردار ہرگز "حادث" نہیں بلکہ نہایت قدیم ہے اور اپنی پشت پر ایک طویل تاریخ اور شاندار ماضی لئے ہوئے ہے اور بعض لوگوں کا یہ گمان بالکل بے بنیاد ہے کہ اس کا موجودہ رویّہ صرف جماعت اسلامی کی مخالفت کا نتیجہ یا ذاتی طور پر مولانا مودودی کی دشمنی کی پیداوار ہے۔

مئی ۱۹۶۸ء میں باغ بیرون موچی دروازہ لاہور میں ان کی جو کانفرنس منعقد ہوئی اس کے تقریباً

دو سال اور ایک ماہ بعد پھر ایک عظیم الشان "آئینِ شریعت کانفرنس" لاہور میں جون کے آخری ہفتے میں جمعیت کے زیر اہتمام منعقد ہوئی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے اکابر و عام کارکن دونوں نہایت سخت جان اور واقعتاً آہنی چنوں کے مانند ہیں، اس لئے کہ گزشتہ ایک سال سے ملک کے تمام مذہبی عناصر متحد ہو کر ان کی مخالفت پر کمربستہ رہے ہیں اور انہوں نے ہر ممکن طریقے سے انہیں بدنام کرنے اور عوام کو ان سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ان کے قدم آگے ہی بڑھ رہے ہیں ---- اور تازہ ترین اضافہ یہ ہوا ہے کہ جس طرح جماعت اسلامی گزشتہ تقریباً دس سال سے صدر ناصر اور عالمِ عرب کی عوامی تحریکوں کی دشمنی اور ان کے خلاف شدید زہر آلود پروپیگنڈے کی قیمت عرب بادشاہوں اور امیروں کی "سرپرستی" کی صورت میں وصول کرتی رہی ہے اسی طرح اب جمعیت بھی عرب ممالک کے فریق مخالف کی نگاہوں میں آگئی ہے اور اسے بھی کچھ نہ کچھ "سرپرستی" ضرور حاصل ہو جائے گی۔

ان حضرات پر "کانگریسی مولوی" کی پھبتی سن کر خدا جانتا ہے کہ دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے، اس لئے کہ اس کی اولین زد مولانا حسین احمد مدنیؒ ایسے اکابرِ ملت، مجاہدینِ حریت اور زعمائے دین پر پڑتی ہے جن کے سیاسی موقف سے چاہے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے علم و فضل، تقویٰ و تدین، خلوص و بے نفسی، عزم و ہمت، جانفشانی و تندہی، قربانی و ایثار اور حلم و تواضع کی کوئی دوسری مثال مسلم ہند کی ماضیٔ قریب کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی ---- مولانا مدنیؒ کی زیارت کا شرف ہماری گنہگار آنکھوں کو تو حاصل نہیں ہوا لیکن ان کی اس "کرامت" کا مشاہدہ ہم نے بچشمِ سر کیا ہے کہ کتنے ہی مخلص اور متدین لوگوں کی آنکھوں سے ان کا نام سنتے ہی آنسوؤں کا دریا بہہ نکلتا ہے ---- اور حلقہ دیوبند کے مدارس کی وہ زیر تعلیم نوجوان نسل جس نے مولانا کو نہ دیکھا نہ سنا ان کی توہین پر مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ اور

> ذاتی طور پر ہمارے لئے تو سب سے بڑی شہادت مولانا امین احسن اصلاحی کی ہے جن کے الفاظ میں "مولانا مدنیؒ صرف اپنی سیاسی رائے کے سوا ہر اعتبار سے ایک مثالی شخصیت تھے"۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی ایک مرتبہ مولانا اصلاحی نے سنایا کہ: جن دنوں کانگریس اور

مسلم لیگ کی کشمکش زوروں پر تھی اور مولانا مدنیؒ اور ان کے رفقاء تنقید و استہزاء کا ہدف بنے ہوئے تھے ایک روز خبر آئی کہ کچھ لیگی نوجوانوں نے مولانا کے ساتھ نہایت توہین و تذلیل کا معاملہ کیا۔۔۔۔ ان دنوں دارالاسلام سرنا پٹھان کوٹ میں عام معمول یہ تھا کہ شام کے وقت ہم سب لوگ اکٹھے سیر کے لئے نہر پر جایا کرتے تھے (گویا یہ ان دنوں کی مرکز جماعت اسلامی کی شام کی نشست تھی (مدیر) وہاں مولانا مودودی سمیت کچھ لوگوں نے اس خبر پر خوش گپی کے انداز میں تبصرے کرنے شروع کئے، لیکن میں خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد مولانا مودودی نے مجھ سے بھی کچھ کہنے کی فرمائش کی تو میں نے کہا کہ ۔۔۔۔ "میں اور تو کچھ نہیں جانتا لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ جس قوم نے مولانا مدنیؒ ایسے شخص کی توہین کی ہے اس پر یقیناً کوئی بہت بڑی آفت آنے والی ہے!" ۔۔۔۔ اس پر پوری مجلس پر خاموشی طاری ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا مودودی نے کہا کہ "مولانا آخر جو لوگ قوم کے احساسات و جذبات کا بالکل لحاظ نہ کریں ان کے ساتھ قوم کبھی گستاخی بھی کر گزرے تو کون سی بڑی بات ہے!" اس پر میں نے مزید تو کچھ نہ کہا لیکن اپنے اس فقرے کو دہرا دیا : "میں اور تو کچھ نہیں جانتا صرف یہ جانتا ہوں کہ جس قوم نے مولانا مدنیؒ ایسے شخص کی توہین کی ہے اس پر یقیناً کوئی بہت بڑی آفت آنے والی ہے!"

ذاتی تقویٰ و تدین کے علاوہ ۔۔۔ اب تو ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو ان حضرات کے سیاسی موقف کے بارے میں بھی اپنی رائے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ خود مولانا احتشام الحق تھانوی نے آج سے تقریباً تین سال قبل جامعہ اشرفیہ لاہور میں جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کچھ ایسے الفاظ کہے تھے کہ "اب جو حالات پیش آ رہے ہیں ان کو دیکھ کر تو خیال ہوتا ہے کہ تحریک پاکستان کے بارے میں ان حضرات کی رائے زیادہ درست تھی جو کہتے تھے کہ پاکستان میں فروغ اسلام کو نہیں، فرقِ باطلہ اور الحاد و اباحیت کو حاصل ہو گا!" لیکن بات یہاں تک نہ پہنچے تو بھی کم از کم اتنا تو ہونا چاہئے کہ اس وقت کی ضدم ضدا میں جو زیادتیاں ایک دوسرے پر ہو گئی تھیں اب کم از کم ان کا اعادہ تو نہ ہو۔۔۔۔

ہم خود اپنا یہ ذاتی احساس بھی اس مقام پر بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتے ۔۔۔ کہ بقیہ تمام معاملات اور قیل و قال ایک طرف، کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں کے مسئلے کے اعتبار سے تو کبھی کبھی شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ کہا تھا کہ "پاکستان کی سکیم سے

ہندوستان کے مسلمانوں کی قوت جو پہلے ہی تہائی ہے وہ تو تین حصوں میں بٹ کر مزید کم ہو جائے گی اور ہندوؤں کی طاقت بالکل یکجا اور مجتمع رہے گی----!!" ان کا خیال کس قدر درست تھا!!

> اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ جب بھی ہندوستان کے مسلمانوں کے کسی تازہ قتل عام کی خبر آتی ہے دوسرے لاکھوں اور کروڑوں حساس مسلمانوں کی طرح راقم الحروف کے دل پر بھی چھریاں چل جاتی ہیں----اور نہ صرف یہ کہ یہاں کا محکہ چین کاٹ کھانے کو دوڑنے لگتا ہے بلکہ سیدنا مسیحؑ کی تمثیل کے عین مطابق ہر کھانا ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کا گوشت اور ہر مشروب ان کا خون نظر آنے لگتا ہے----!!

ہمیں دوسروں سے تو کوئی گلہ نہیں لیکن حیرت ناک افسوس ہوتا ہے حلقہ دیوبندی کے ان اکابر پر جو نہ صرف درس و افتاء بلکہ تلقین و ارشاد کی مسندوں پر رونق افروز ہوتے ہوئے بھی ایسے کٹھور دل واقع ہوئے ہیں کہ کچھ سیاسی یا روپہلی مصلحتوں کی بنا پر اب بھی ان خادمانِ دین و ملت پر کانگریسی مولوی ایسی تحقیر آمیز پھبتی کسنے سے باز نہیں رہتے----!!

رہا سوشلسٹ اور کمیونسٹ ہونے کا الزام اور اس کی آڑ میں بالواسطہ کفر کا فتویٰ تو جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے وہ تو، جیسا کہ ہم بعد میں تفصیل سے واضح کریں گے، یہ سب کچھ ایک شدید مجبوری اور اضطرار کے تحت حکمتِ عملی کے طور پر کر رہی ہے، رہے تھانوی و عثمانی حلقے تو ان کی جانب سے یہ معاملہ کچھ تو ناسمجھی میں ہو رہا ہے اور کچھ غالباً مدنی گروپ کے اُس جُرمِ عظیم کے انتقام کے طور پر جو اس نے جمعیت العلماء کی قیادت سے ان حضرات کو بے دخل کر کے "یوسفِ بے کارواں" بنا کر کیا تھا---اس لئے کہ جتنی کچھ سوشلزم کی قائل جمعیت علماء اسلام ہو سکتی ہے اس سے کہیں زیادہ سوشلزم جماعت اسلامی نے بھی حالات سے مجبور ہو کر اپنے منشور میں داخل کر لیا ہے اور تھانوی و عثمانی اکابر کی قیادت میں مختلف مذہبی گروہوں کے ۱۱۸ علماء نے بھی اپنے فتویٰ کے ذریعے اسے سندِ جواز عطا فرما دیا ہے ---- تو ظاہر ہے کہ بنائے نزاع سوشلزم نہیں کچھ اور ہے-----!!

جمعیت کی طرف سے ان ساری مدافعانہ گزارشات کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ خود ان کی اپنی بعض باتوں سے نہ صرف یہ کہ ان کی موجودہ قیادت کے وقار کو دھکا لگا ہے بلکہ ان کے اکابر و اسلاف کی شہرت اور نیک نامی کو بھی نقصان پہنچا ہے۔

ان چیزوں میں سے ایک ان کی شدید بدنظمی و بے ترتیبی ہے جس کی وجہ سے بسا اوقات بڑی ہی مضحکہ خیز صورتیں پیش آتی ہیں اور پوری جمعیت تمسخر و استہزاء کا ہدف بنتی ہے۔ چنانچہ ماضی میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی معاملے میں جمعیت کے ایک لیڈر کا بیان کچھ اور ہوتا ہے اور کسی دوسری مقتدر ہستی کا بالکل کچھ اور...... اور بالکل وہ کیفیت ہوتی ہے کہ ع

"من چہ می گویم و طنبورۂ من چہ می سراید!"

اگر گستاخی شمار نہ ہو تو ہم جمعیت کے اکابر کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ اس سقم کو جلد از جلد دور کرنے کی کوشش کریں اور تنظیم و جماعت بندی کے کم از کم ناگزیر لوازم کا ضرور اپنے یہاں اہتمام کریں۔

دوسری اور اہم تر چیز جمعیت کے اکابر میں سے بعض کی معیارِ شرافت سے گری ہوئی زبان اور ہلکا طرزِ تکلم ہے جس نے حقیقت یہ ہے کہ جمعیت کو خصوصاً شہروں کی پڑھی لکھی مڈل کلاس کے حلقے میں شدید نقصان پہنچایا ہے۔ ہمیں ان حضرات کے خلوص میں ہرگز کوئی شک نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے جوش، جذبے اور قوتِ کارکردگی پر رشک آتا ہے، لیکن ان کے طرزِ خطاب اور اندازِ تکلم پر گردن کو ندامت سے جھکا لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔ کاش کہ یہ حضرات تقریر و خطاب کے موقع پر "وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ" کی قرآنی ہدایات کو پیش نظر رکھ سکیں اور یہ اندازہ کر سکیں کہ اس کی خلاف ورزی کر کے وہ خود اپنے مقصد اور مشن کو کس قدر نقصان پہنچانے کا سبب بن رہے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ اعوان و انصار کے انتخاب میں ان کے یہاں بھی احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی بلکہ جس وقت جو شخص مفیدِ مطلب نظر آئے اسے سر آنکھوں پر بٹھا لیا جاتا ہے، حالانکہ اس کا ایک نہایت تلخ قسم کا تجربہ انہیں ماضیٔ قریب میں بھی ہو چکا ہے..... اس کے علاوہ ان کے جلسوں اور جلوسوں میں بعض اوقات بالکل آوارہ اور اوباش لوگ شریک ہو کر ایسی حرکتیں کرتے ہیں جن سے ہر شریف انسان کو ذہنی کوفت بھی ہوتی ہے اور قلبی اذیت بھی۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے "متحدہ

اسلامی محاذ" کا توڑ کرنے کے لئے جو "متحدہ دینی محاذ" جمعیت کے زیر سرپرستی بنا' اس کے جلسے میں نہایت ناگفتہ بہ صورتیں پیش آئیں ---- اور پھر یوم جہاد کے مشترکہ جلوس میں بھی اس قسم کے عناصر نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اس پر بھی ہر شخص نے نفرین و ملامت کی اور اس میں شریک ہونے کی وجہ سے جمعیت کی شہرت کو شدید نقصان پہنچا ---- ہماری ناچیز رائے میں جمعیت کو ہرگز اس طرح کے سہارے تلاش نہیں کرنے چاہئیں اور جو کام بھی ہو بس اپنی ہی قوت کے بل پر کرنا چاہئے ------ اور ہمارا اندازہ ہے کہ غالباً اب جمعیت کے اکابر نے کم از کم اس معاملے میں تو اپنی روش تبدیل کر بھی لی ہے ---- چنانچہ حالیہ "آئینِ شریعت کانفرنس" کے موقع کے جلوس و جلسوں میں بحمد اللہ ایسی کوئی صورت پیدا نہیں ہونے پائی' بلکہ جلوس تو بلاشبہ اسلامی متانت' سنجیدگی اور وقار کا ایک عظیم الشان شاہکار تھا ----!!

رہی جماعت اسلامی تو اس کا ماضی اگرچہ کچھ زیادہ لمبا چوڑا نہیں' اس لئے کہ اس کا شجرۂ نسب زیادہ سے زیادہ مولانا ابوالکلام مرحوم کے "الہلال" اور "البلاغ" سے ملتا ہے یا خیری برادران سے ---- اور اگرچہ مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک سے اس کی علیحدگی کے اسباب کے بارے میں بھی بہت کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہے ---- تاہم ہمارے نزدیک اس نے جو کام ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک کیا وہ درست خطوط پر بھی تھا اور نتیجہ خیز بھی! اور اگر وہ انہی خطوط پر کام کرتی رہتی تو شاید آج اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا خواب "شُد پریشاں خوابِ من...." کی سی مایوس کن صورت پیش نہ کر رہا ہوتا' لیکن افسوس کہ اس نے کچھ وقتی سی ترغیبات (TEMPTATIONS) سے دھوکا کھا کر' جیسا کہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں' خود اپنے بیان کردہ "ایک ہی مخصوص طریق کار" کو تج کر کے پاکستانی سیاست کے اکھاڑے میں کود جانے کا فیصلہ کر لیا ---- اور تحریک پاکستان کی مذہبی رومانویت کے اس غبارے میں از سرِ نو گیس بھرنی شروع کر دی جو قیام پاکستان کے بعد تیزی سے خالی (DEFLATE) ہو رہا تھا۔

پھر چونکہ سیاسی میدان میں داخلے کے لئے ان کے پاس سوائے مذہب کے اور کوئی اسناد (CREDENTIALS) سرے سے موجود ہی نہیں تھیں لہٰذا اس میدان کے ہر مقابلے اور حصولِ اقتدار کی جنگ کے ہر معرکے کو انہیں ایک ناگزیر ضرورت کے تحت "اسلام اور کفر کی

جنگ" قرار دینا پڑا۔۔۔۔ چنانچہ کم ازکم ان کے جرائد و رسائل کے صفحات کی حد تک 'پاکستان میں مسلسل تئیس برس سے اسلام اور کفر کی جنگ لڑی جا رہی ہے۔

اول اول اس جنگ میں "کفر" کی جانب سے لڑنے والی اور اسلام کا راستہ روکنے والی وہ قومی قیادت تھی جس میں خواجہ ناظم الدین اور سردار عبدالرب نشتر ایسے پابندِ صوم و صلوٰۃ اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر محمود حسین ایسے اسلامی ذہن رکھنے والے لوگ بھی موجود تھے۔۔۔۔ جب یہ قیادت کچھ خارجی دباؤ اور کچھ داخلی انتشار کی وجہ سے میدان سے ہٹی تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور گمان کیا کہ اب میدان صاف ہے۔ چنانچہ "حکمتِ عملی" سے کام لیتے ہوئے ۱۹۵۵ء کے سالانہ اجتماع کی قراردادوں کے ذریعے امریکہ کو بھی سفید جھنڈی دکھا دی گئی کہ آپ پریشان نہ ہوں، ہم بھی کوئی غیر نہیں آپ ہی کے نیاز مند ہیں۔۔۔۔ لیکن افسوس کہ اُس وقت کی اکھیڑ پچھاڑ اور توڑ پھوڑ میں سے بجائے اس کے کہ ان کے لئے کوئی "خیر کی راہ" نکلتی 'الثا ۱۹۵۸ء کا مارشل لاء اور سابق صدر ایوب خاں کا دس سالہ دورِ اقتدار بر آمد ہو گیا۔ چنانچہ "اسلام اور کفر کی جنگ" کا ایک دوسرا دور شروع ہو گیا۔ اس دور کی ابتدا میں جماعت اسلامی نے ایوب خاں کے بھاری پتھر کو راستے سے ہٹانے کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کی۔ کبھی سہروردی مرحوم سے اشتراک کیا، کبھی محترمہ فاطمہ جناح کی قیادت قبول کی۔ الغرض ؏ "ہم نے کیا کیا نہ کیا دیدہ و دِل کی خاطر!"۔۔۔۔ لیکن جب یہ پتھر اپنی جگہ سے ٹس سے مس ہوتا نظر نہ آیا تو تھک ہار کر اپنے قدیم ترین جریدے کے ایک اداریئے کے ذریعے صلح کی پیشکش کی اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔۔۔۔ لیکن ابھی یہ دوستی صرف گول میز کانفرنس تک ہی پہنچ پائی تھی کہ خود ایوب خاں کا دورِ اقتدار ختم ہو گیا۔

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا!

صرف یہی نہیں بلکہ جس چیز کو مسلسل دس سال تک سب سے بڑا شر اور ساری برائیوں کی جڑ اور اسلام کے راستے کی واحد رکاوٹ ٹھہرایا تھا اس کے ہٹتے ہی ایک اور بلا نمودار ہو گئی۔۔۔۔ اور ؏ "شامتِ اعمالِ ما صورتِ بھٹو گرفت!" کا نقشہ نظر آنے لگا۔ علاوہ ازیں ایک طرف معاشرے کے مظلوم و مجبور طبقے یعنی کسان، مزدور، کم تنخواہ پانے والے سرکاری ملازم اور محنت کش ایک طوفان بن کر اٹھتے نظر آئے اور دوسری طرف "یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے!" گلے کو آنے لگے

------چنانچہ اسلام اور کفر کی جنگ کا ایک نیا معرکہ شروع ہوا-----اور سوشلزم کو کفر کا ایک ہوائی اور فرضی مورچہ قرار دے کر اس پر گولہ باری شروع کر دی گئی۔

اسلام اور سوشلزم-----یا بالفاظ دیگر اسلام اور کفر کی ہوائی جنگ گزشتہ ایک سال سے ہمارے ملک میں پورے زور و شور سے جاری ہے اور اس میں شک نہیں کہ کچھ سرمایہ داروں کی پشت پناہی اور کچھ دوسرے دینی حلقوں کی امداد نے اس جنگ میں خالص سوشلسٹ عناصر کو پسپائی پر مجبور بھی کر دیا ہے لیکن

> برا ہو جمعیت علماء اسلام کا------کہ وہ اس جیت کو بھی شکست میں تبدیل کرنے پر تل گئی ہے' چنانچہ اس نے ایک طرف مزدوروں' کسانوں اور مظلوم و مقہور عوام کی پشت پناہی شروع کر دی ہے اور دوسری طرف جماعت کی امریکہ نوازی' سامراج دوستی اور سرمایہ داروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کا بھانڈہ چوراہے میں پھوڑنا شروع کر دیا ہے-----!!

تو پھر کون سے تعجب کی بات ہے اگر جماعت اسلامی کو سب سے زیادہ غصہ "جمعیت علماء اسلام" ہی پر آئے اور اس کے کارکن اس کے اکابر کا تذکرہ کرتے ہوئے آپے سے باہر ہو جائیں!

ہم واضح طور پر عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ جہاں تک اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی کسی حقیقی امید اور واقعی توقع کا تعلق ہے وہ تو ہمیں نہ جماعت اسلامی سے ہے' نہ جمعیت علماء سے' اس لئے کہ ان دونوں جماعتوں کا اصل اور حقیقی مزاج سیاسی ہے------اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لئے جو کام ناگزیر اور لابدّ منہ ہے یعنی ایک ذہنی و فکری انقلاب----اور عوام کی اخلاقی و عملی تربیت' وہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں کر رہا۔

لیکن جہاں تک ان دونوں مذہبی گروہوں کی سیاسی حکمتِ عملی کا تعلق ہے' ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہمارے نزدیک جماعت اسلامی کا یہ مستقل شغل کہ وہ اپنی حصولِ اقتدار کی جنگ کے ہر معرکے کو اسلام اور کفر کی جنگ بنا کر پیش کرتی ہے اسلام کے حق میں نہایت مضر اور اس ملک میں مذہب کے مستقبل کے اعتبار سے سخت خطرناک ہے-----اس چرواہے کی مانند جو خواہ مخواہ شیر

آیا شیر آیا کہہ کر لوگوں کو امداد کے لئے بلا کر ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا' ہمیں اندیشہ ہے کہ ہر وقت اور ہر موقع پر "اسلام خطرے میں!" کے نعرے لگانے سے کہیں ایسا نہ ہو کہ جب کبھی واقعی شیر آ ہی جائے اور اسلام کو حقیقی خطرہ درپیش ہو تو عوام اسے بھی مذاق سمجھ کر بیٹھے رہ جائیں اور کسی کی غیرتِ دینی جوش میں نہ آئے!------

تحریکِ پاکستان کے دوران بھی "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" کے نعرے بڑے زور شور سے لگے تھے اور اُس وقت بھی بہت سے سادہ لوح اور نیک دل مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی امیدوں کے چراغ روشن ہو گئے تھے---- لیکن پھر مسلسل ۲۳ سال جس طرح ان نعروں کی مٹی پلید کی گئی اس سے خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے لوگوں کے دلوں پر مایوسی اور ناامیدی کے کیسے کیسے اندھیارے پھیلے----اب پھر اسی "رومانویت" کا دور دورہ ہے' لیکن انتخابات کے نتیجے میں جو کچھ ہو گا وہ کسے معلوم نہیں۔ ظاہر ہے کہ "اسلام اور کفر" کی اس ہوائی جنگ کی فتح کے ثمرات کی ساری فصل پرانے' پیشہ ور اور جدّی و پشتی سیاست دان کاٹیں گے-----اور ایک بار پھر مذہبی رومانویت کا غبارہ پھٹے گا اور لوگوں میں مایوسی و بددلی کی عام لہر پھیلے گی------اور اس بار اس "DIS-ILLUSIONMENT" کی پوری ذمہ داری جماعت اسلامی پر عائد ہو گی۔

دوسری طرف جمعیت علماء اسلام کی تمام خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہماری رائے میں اس کی موجودہ حکمتِ عملی آخر کار اسلام کے لئے مفید ثابت ہو گی------اس لئے کہ اس وقت اصل صورتحال یہ ہے کہ ہمارے ملک میں کچھ لوگوں نے طبقاتی شعور فی الواقع پیدا کر دیا ہے اور کسانوں' مزدوروں اور دوسرے محنت کش طبقات میں یہ احساس بیدار ہو گیا ہے کہ وہ مظلوم و مجبور ہیں اور ان کا استحصال ہو تا رہا ہے---- چنانچہ وہ اپنے معاشی حقوق کی بازیافت کے لئے منظم جدّوجہد کا آغاز کر چکے ہیں---اور ملک میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو ان کو مسلسل ذہنی و فکری غذا بھی دے رہے ہیں اور اس جدّوجہد میں ان کے ساتھ تعاون بھی کر رہے ہیں۔ جب تک یہ صورت پیدا نہیں ہوئی تھی اور کسان اور مزدور "قسمت" پر راضی و شاکر تھے بات مختلف تھی' لیکن اب صورتحال بالکل تبدیل ہو چکی ہے اور پسے ہوئے طبقات اپنا حق وصول کرنے کے لئے عملاً اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس مرحلے پر "سرمایہ داری" بھی اپنے تحفظ کے لئے ہر ممکن چال چل رہی ہے اور اس کے مدافعانہ ہتھیاروں میں سے ظاہر ہے کہ اہم ترین ہتھیار "مذہب" کا ہے----

لہٰذا

اگر خدانخواستہ صورت یہ ہوتی کہ ملک کے تمام مذہبی طبقات مجتمع ہو کر سرمایہ داری کے پشت پناہ بن جاتے تو یہ ہمارے نزدیک نہایت خطرناک صورتحال ہوتی، اس لئے کہ اس صورت میں عوامی طاقتوں کا سیلاب سرمایہ داری کے ساتھ ساتھ دین و مذہب کو بھی بہا کر لے جاتا------!!

لیکن "جمعیت علماء اسلام" کے اپنے آپ کو غرباء کی صف میں کھڑا کر لینے سے بحمد اللہ یہ خطرہ دور ہو گیا ہے------- اب ان شاء اللہ جنگ اسلام اور کفر کی نہیں رہے گی بلکہ سیاسی گروہوں کی باہمی جنگِ اقتدار ہو گی، یا ایک نظریۂ سیاست و معیشت کا دوسرے نظریۂ سیاست و معیشت سے مقابلہ ہو گا!!

ہم اپنے بارے میں وضاحت سے عرض کئے دیتے ہیں کہ ہمیں اصل دلچسپی صرف اسلام اور اس کی نشأۃِ ثانیہ سے ہے۔ بین الاقوامی سیاست کے اتار چڑھاؤ بھی ہمارے سامنے ہیں، بین الاسلامی اور بین العرب سیاست کے بارے میں بھی ہمارا ایک نقطۂ نظر ہے اور ملکی سیاست کے پیچ و خم سے بھی ہم بحمد اللہ بالکل ناآشنا نہیں---- لیکن ہم علیٰ وجہ البصیرت جانتے ہیں کہ ان چیزوں کا فی الوقت اسلام اور اس کی نشأۃ ثانیہ اور دین اور اس کے احیاء سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا ان تمام چیزوں سے نظری دلچسپی رکھنے کے باوجود ان میں سے کسی میں کسی پہلو سے کوئی عملی حصہ لینے پر ہماری طبیعت کسی طرح مائل نہیں ہوتی۔ ہم اپنی مہلتِ عمر اور صلاحیتوں کی حقیر سی پونجی کو اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے عظیم الشان کام کے کسی ایک چھوٹے سے گوشے کی خدمت میں صرف کر دینے ہی کو اصل کامیابی سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق ارزانی عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ○○

تاریخ ساز
روایت شکن
مسلسل اشاعت کے 32 درخشاں سال
طلباء کا مقبول اور
سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ماہنامہ
ہمقدم
اب مستقبل اسلام کا ہے
• طلباء کے مستقبل کا رہنما
آپ کے ذہنوں میں سلگتے سوالات کا جواب
• آج کا طالب علم مایوس کیوں؟ • مغرب کا تہذیبی و سیاسی تسلط؟
• تزکیۂ نفس؟ • نوجوانوں کو درپیش چیلنجز؟
• تعلیمی اداروں میں امن کیسے؟ • تعلیمی اداروں میں بگاڑ کا ذمہ دار کون؟
• اسلامی زندگی کی تشکیل نو؟ • طلباء کے اجتماعی مسائل؟
• عالم اسلام، احیائے اسلام اور اسلامی تحریکات کا مستقبل؟
جرأتوں اور جذبوں، عظمتوں اور عزیمتوں کے تذکروں اور
نئے انعامی سلسلوں سے مزین
ہمقدم
۱۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور، پاکستان۔ فون ۷۵۸۷۱۲۴، ۷۵۸۸۴۸۸۔ فیکس ۷۵۷۲۳۱۰

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

جلد: ۴۵
شمارہ: ۷
صفر المظفر ۱۴۱۷ھ
جولائی ۱۹۹۶ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زرِ تعاون ۱۰۰/-

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات، قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان — 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 امریکی ڈالر

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت: 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون: 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تذکرہ و تبصرہ

زیر نظر شمارے کے ساتھ بحمد اللہ 'امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ادارت و اہتمام میں ماہنامہ "میثاق" کی اشاعت کے تیس سال پورے ہو گئے ہیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۶۶ء میں اس پرچے کی ادارت سنبھالی تھی اور ان کے زیر ادارت میثاق کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب تنظیم اسلامی قائم ہوئی تھی نہ انجمن خدام القرآن کا قیام عمل میں آیا تھا بلکہ محترم ڈاکٹر صاحب نے اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کے بھروسے پر تن تنہا ایک عظیم مقصد کے حصول کے لئے سفر کا آغاز کیا تھا۔ گویا۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر راہرو ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ادھر کچھ عرصے سے دعوتی و تنظیمی مصروفیات میں بے پناہ اضافے کے باعث امیر تنظیم نے میثاق کی اکثر ادارتی ذمہ داریوں' بالخصوص ادارتی صفحات تحریر کرنے کی پابندی سے خود کو بہت حد تک فارغ کیا ہوا ہے' چنانچہ آج کل میثاق کے قارئین کو محترم ڈاکٹر صاحب کا تحریر کردہ اداریہ شاذ و نادر ہی پڑھنے کو ملتا ہے' تاہم ابتدائی سالوں میں محترم ڈاکٹر صاحب بڑی پابندی اور اہتمام سے میثاق کے اداریئے تحریر فرماتے رہے اور ان کے اداریئے بڑے شوق اور توجہ سے پڑھے جاتے تھے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کے تحریر کردہ اکثر و بیشتر اداریئے دینی اور تحریکی موضوعات پر مشتمل ہوتے تھے اور ان میں وقتی حالات کے حوالے سے گفتگو اور ملکی سیاسی صورتحال پر تبصرے کا عنصر تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔ چنانچہ اس پر بعض احباب نے شکوے کے انداز میں اور بعض نے تنقید بلکہ استہزاء کے پیرائے میں بھی اس رائے کا اظہار کیا کہ کسی ماہانہ پرچے کے ادارتی صفحات میں حالات حاضرہ کے حوالے سے گفتگو اور ملکی سیاست کے اتار چڑھاؤ پر تبصرہ تو ایک ناگزیر ضرورت ہے' ادارتی صفحات میں ان موضوعات سے گریز ناقابل فہم ہے!!!۔۔۔۔ اس کے جواب میں محترم ڈاکٹر صاحب کی جو تحریر "تذکرہ و تبصرہ" کے عنوان سے جولائی ۱۹۶۸ء کے میثاق میں شائع ہوئی اس کے ذریعے چونکہ اس امر کی وضاحت بہت ہی عمدگی کے ساتھ ہوتی ہے کہ انہوں نے گوشۂ صحافت میں قدم کیوں رکھا' "میثاق" کا اجراء کس مقصد کے پیش نظر ہوا اور کن حالات میں ہوا' لہٰذا آج جب کہ ان کے زیر ادارت اس پرچے کی اشاعت کو تیس برس مکمل ہو گئے ہیں اور اس طرح ماہنامہ میثاق نے اپنے سفرِ حیات کا ایک اہم سنگ میل عبور کیا ہے' ذیل میں اس تحریر کو ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے :

"گزشتہ شمارے کے ساتھ راقم الحروف کے زیر ادارت "میثاق" کے دو سال مکمل ہو گئے تھے اور زیر نظر اشاعت سے تیسرے سال کی ابتدا ہو رہی ہے۔ دو سال کی اس مدت میں

"میثاق" کے ذریعے اگر دین کی کوئی بری بھلی خدمت ہوئی ہے تو وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہے ---- اور اگر کسی کوتاہی یا غلطی کا صدور ہوا ہے تو وہ یقیناً میری نااہلی اور شرارتِ نفس کی بنا پر ہے۔ آئندہ بھی صرف اللہ تعالیٰ کی ہدایت و رہنمائی کی امید اور اس کے اس حتمی وعدے پر پختہ یقین کی بنا پر کہ :

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت ۶۹)

"اور جو لوگ ہماری اس راہ میں کوشش کریں گے ہم لازماً انہیں اپنے راستوں پر چلائیں گے"

اس دعا کے ساتھ اس سفر کو جاری رکھنے کا عزم ہے کہ :

رَبَّنَا اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ (آمین)

صحافت نہ تو راقم الحروف کا "پیشہ" ہے اور نہ "مشغلہ"۔

جہاں تک کسب معاش کا تعلق ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے وہ ذریعہ عطا فرمایا تھا جو سب کے نزدیک دنیا کا شریف ترین پیشہ ہے۔ پھر میرے بارے میں کسی نے چاہے اور کچھ بھی کہا ہو، مجھ پر غبی ہونے کا الزام آج تک کسی نے نہیں لگایا ----- یہ بالکل دوسری بات ہے کہ اپنے دور تعلیم کے انتہائی اہم زمانے میں ایک تحریک اور اس کی دعوت سے متاثر ہوا اور فوری طور پر میں نے پورے فہم اور شعور کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا کہ میری زندگی میں اولیت اس تحریک اور اس کی دعوت کو حاصل ہو گی، معاش اور کسب معاش کے ذریعے (یعنی PROFESSIONAL CAREER) کو بالکل ثانوی مقام حاصل ہو گا۔ تعلیم کے اختتام اور عملی زندگی کے آغاز کے بعد بھی قلب کی گہرائیوں سے ابھرنے والے بعض تقاضوں اور روح کی پہنائیوں سے اٹھنے والے بعض مطالبوں نے مسلسل بے چین کئے رکھا۔ چنانچہ مروجہ معیارات کے مطابق "پیشہ ورانہ کامیابی" کے بنیادی لوازم ---- یعنی توجہ کا ارتکاز ---- اور ایک مقام پر مستقل قیام ------ کبھی پورے نہ کئے جا سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دوران میں جب بھی کبھی ایسا ہوا کہ پیشہ ورانہ مصروفیت میں اضافہ ہوتا اور وقت اور توجہ کا معتدبہ حصہ اس میں صرف ہونے لگتا تو قلب و روح کی گہرائیوں سے وہی صدا بلند ہونے لگتی جو ایک روایت کے مطابق ایک شکار کے دوران ایک بیابان میں حضرت ابراہیم بن ادھم کو سنائی دی تھی کہ

یَا اِبرَاھِیمُ اَلِھٰذا خُلِقتَ اَم بِھٰذا اُمِرتَ ؟
(اے ابراہیم کیا اسی کام کیلئے تمہیں پیدا کیا گیا ہے یا کیا اس کا تمہیں حکم ملا ہے؟)

نتیجتاً طبیعت میں توحش پیدا ہو جاتا ---- اور پیشہ ورانہ مصروفیت سے دل بالکل اچاٹ ہو جاتا! معاش میں استحکام ---- اور پیشہ و فن میں تمکن کا اصل زمانہ یعنی اختتام تعلیم سے لے کر مسلسل دس بارہ سال تک کا عرصہ میں نے اس حال میں گزارا کہ جہاں کی فضا اپنے "مقصد زندگی" کے لئے نسبتاً زیادہ سازگار نظر آئی اپنا سارا بوریا بستر سمیٹ کر وہاں چل دیا اور ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ ایک مقام پر ایک عرصہ تک قیام کی بنا پر معاشی و فنی اعتبار سے جو حیثیت بنی ہے اس کو اس طرح نظرانداز کرنے سے معاشی مستقبل کتنا مخدوش ہو جائے گا ---- حد یہ ہے کہ ایک بار "مقصد زندگی" کے نام پر دی جانے والی ایک دعوت کی بنا پر پیشہ و فن کی پوری بساط ہی لپیٹ کر رکھ دی ---- الغرض مسلسل آج کل یہاں وہاں، پرسوں کہیں اور اگلے روز کہیں اور کی حالت طاری رہی ---- لوگ تلون اور غیر مستقل مزاجی کی پھبتیاں کستے رہے، لیکن میں اپنے باطن کا جائزہ لیتا تو یہ معلوم کر کے مطمئن ہو جاتا کہ میرے اس ظاہری تلون کا اصل سبب بحمد اللہ اپنے اس قدیم فیصلے پر پوری "مستقل مزاجی" کے ساتھ عمل پیرا رہنا تھا کہ میری زندگی میں اولیت بہرحال "مقصد زندگی" کو حاصل رہے گی، معاش اور اس کے متضمنات ہمیشہ ثانوی رہیں گے! ---- ایک طویل عرصے تک ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد آج سے دو ڈھائی سال قبل حکمت خداوندی اور مشیت ایزدی کے تحت یہ صورت پیدا ہوئی کہ میں لاہور منتقل ہوا ---- اور یہاں مقصد زندگی کے لئے خالص "ذاتی حیثیت" میں ایک حقیر جدوجہد کے آغاز کے طور پر پہلے "تحریک جماعت اسلامی" کی اشاعت اور پھر "میثاق" کے از سر نو اجراء کا اہتمام کیا ---- !

رہا "شوق" کا معاملہ تو خدا جانتا ہے کہ "لکھنے" کا شوق مجھے کبھی نہیں رہا۔ اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ "لکھنا" مجھے ہمیشہ ایک نہایت مشکل اور نہایت کٹھن کام نظر آیا۔ نہ تو کبھی میرا یہ مشغلہ (HOBBY) رہا اور نہ ہی کبھی میں نے اس کی مشق کی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ اس "فن" کے ابجد تک سے میں تاحال ناواقف ہوں۔ اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستگی کے دوران خالص تنظیمی نوعیت کی چند تحریروں یا ایک آدھ واردات قلبی کے اظہار کے قبیل کی چیزوں کے علاوہ پورے زمانہ طالب علمی میں میں نے کبھی کچھ نہ لکھا ---- اس کے بعد مسلسل دو سال تک ایک حرف بھی قلم سے نہ نکلا،

لیکن پھر اچانک مقصدِ زندگی کی لگن اور اس کے ساتھ شدید ذہنی وابستگی سے یہ "معجزہ" صادر ہوا کہ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں دس پندرہ دن کی مدت میں سوا دو سو صفحات پر مشتمل وہ بیان تحریر میں آگیا جو اب "تحریک جماعت اسلامی" کی صورت میں مطبوعہ موجود ہے۔

اس کے بعد مسلسل دس سال پھر اس حال میں گزرے کہ ایک حرف بھی قلم سے نہ نکلا حتیٰ کہ اس پورے عرصہ میں خطوط بھی چند بالکل گنے چنے ہی لکھنے میں آئے ---- تا آنکہ جولائی ۱۹۶۶ء میں "میثاق" کا دوبارہ اجراء عمل میں آیا۔ اس کے بعد کی قلمی "داستان" سے قارئین "میثاق" بخوبی واقف ہی ہیں۔

یہ پوری داستان بے اختیار اس لئے نوک قلم پر آگئی کہ حال ہی میں چند مخلصین نے یہ شکوہ کیا ہے کہ "رسائل و اخبارات کے اداریئے وقتی حالات و مسائل پر تبصرے کے لئے ہوتے ہیں، تم ان میں بھی ثقیل مضامین بھر کر "صحافت" کے معروف اصولوں کو توڑ رہے ہو----!" اور بعض دوسرے حضرات نے یہ طعنہ دیا ہے کہ "معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے پاس "لکھنے" کے لئے کچھ ہے ہی نہیں!"

میری گزارش اپنے ان تمام دوستوں اور بزرگوں سے یہ ہے کہ واقعتاً صحافت نہ میرا پیشہ ہے نہ مشغلہ!---- لہٰذا صحافت کے مروجہ معیارات کے مطابق میری جانچ پرکھ مجھ پر شدید زیادتی ہے۔ علامہ اقبال کو جو گلہ اپنے دوستوں سے تھا کہ ؏

مرا یاراں غزلخوانے شمردند!

وہی مجھے اپنے ان مخلصوں سے ہے کہ وہ مجھے صحافی سمجھ رہے ہیں۔ میں نے ہرگز صحافت کا شوق پورا کرنے کے لئے اس کوچے میں قدم نہیں رکھا' بلکہ "میثاق" کا اجراء صرف اپنے مقصد زندگی کے حصول کی جدوجہد کے لئے کیا ہے۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے اس وسیع و عریض دنیا میں اپنے مقصد اور اس کی جدوجہد سے بڑھ کر اہم چیز کوئی نظر ہی نہیں آتی! موجودہ حالات و واقعات میرے نزدیک بذاتہٖ اور فی نفسہٖ نہ کوئی علیحدہ وجود رکھتے ہیں نہ مستقل اہمیت کہ ان پر تبصرہ کسی افادیت کا حامل ہو۔ مجھے اس ایک مقصد کے سوا کسی چیز سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے کہ مسلمان جیوں اور مومن مروں۔ میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ خود میرا سینہ بھی نور ایمان سے منور ہو-------اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے قلوب و اذہان بھی اسی نور سے جگمگا اٹھیں تاکہ وہ بھی اسلام پر زندہ رہیں اور ایمان پر اس دنیا سے رخصت ہوں۔ پھر کوئی جماعت یا تنظیم ایسی مل جائے جو اس مقصد کے لئے

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے انقلابی نظریات کے علمبردار

اور

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے جہادِ حریت کے رفیقِ کار

مولانا عبید اللہ سندھی

کی قرآنی درس گاہ

نظارت المعارف القرآنیہ (دہلی)

کے دو فارغ التحصیل خادمانِ قرآن:

۱۔ خواجہ عبدالحیٔ فاروقی ——— اور

۲۔ مولوی انیس احمد بی اے (علیگ) کے

دو[1] زیرِ طبع تبرکاتِ علمی کی تقدیم

——— از قلم ———

ڈاکٹر اسرار احمد

اور مولوی انیس احمد اور ان کی تالیف 'انوار القرآن' کا تعارف

از قلم : شاہد احمد خلف الرشید انیس احمد

---

[1]: یہ دونوں تبرکات علمیہ ان شاء اللہ جلد کتابی صورت میں شائع ہو جائیں گے۔

مولانا عبد الحئ فاروقیؒ کی تفسیر سورۃ بقرہ بعنوان

الخلافۃ الکبریٰ

کے مقدّمہ کی تقدیم

خواجہ عبد الحئ فاروقیؒ کا نام میں نے پہلی بار حاجی عبد الواحدؒ کی زبانی سنا تھا للذا پیش نظر کتابچے کی تقدیم کے ضمن میں اولاً حاجی صاحب موصوف کا تعارف ضروری ہے اور اس کے لئے بجائے اس وقت کچھ لکھنے کے 'ذیل میں وہی تحریر جوں کی توں درج کی جارہی ہے جو ۱۹۷۸ء میں خواجہ عبد الحئ فاروقیؒ کی تفسیر سورۂ بقرہ موسوم بہ "الخلافۃ الکبریٰ" کا مقدمہ "میثاق" میں شائع کرتے ہوئے سپرد قلم ہوئی تھی ---- وھو ھذا :

"حاجی عبد الواحد مدّ ظلہ 'دینی حلقوں کی ایک معروف اور جانی پہچانی شخصیت ہیں اور راقم الحروف انہیں اپنا خیر خواہ اور معاون ہی نہیں سرپرست اور بزرگ سمجھتا ہے۔

دوسری طرف حاجی صاحب کا جو معاملہ راقم کے ساتھ ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۷۲ء میں راقم کے دو تین درسوں ہی میں شرکت کے بعد حاجی صاحب نے اولاً تو یہ فرمایا "کاش کہ میں اُس وقت تک زندہ رہوں اور آپ کے کچھ کام آسکوں جب مولوی آپ پر جھپٹیں گے!" اور پھر کچھ ہی عرصہ بعد ایک دن اچانک راقم کا ہاتھ کھینچ کر اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے فرمایا : "احیائے دین کی جدّ وجہد کے لئے میں آپ کے ہاتھ پر سمع وطاعت اور جہاد و ہجرت کی بیعت کرتا ہوں!" جس پر راقم سراسیمہ سا ہو کر رہ گیا۔ لیکن اس دن سے آج تک حاجی صاحب اپنے اس عہد کو کمال وفاداری کے ساتھ نبھا رہے ہیں 'جس سے کم از کم ان کے معاملے میں راقم کو شدید شرمندگی کا احساس ہوتا ہے!

۱۹۳۲ء میں انگریزی ادب میں ایم اے کرنے والے اور محکمہ تعلیم میں ایک اعلیٰ

عہدے پر فائز اس باہمت شخص نے عین جوانی میں جبکہ دنیوی ترقی کا ایک وسیع و عریض میدان ان کے سامنے تھا اپنی تمام صلاحیتوں اور توانائیوں کو صرف احیائے اسلام کی جدوجہد کے لئے وقف کر دینے کے عزم مصمم کے ساتھ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مجاہدانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ بالکل نوجوانی میں خلافت اور ہجرت کی تحریکوں میں حصہ لینے کے بعد سے برِّعظیم پاک و ہند میں اٹھنے والی ہر احیائی تحریک کا انہوں نے قریب سے مطالعہ کیا اور بعض کے ساتھ طویل عرصے تک سرگرمی کے ساتھ کام بھی کیا۔ چنانچہ وہ ایک طرف مولانا عبید اللہ سندھی کے ساتھ مسلسل ایک برس مکہ معظمہ میں قیام پذیر رہے تو دوسری طرف شیخ طریقت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی خدمت میں حاضری کی خاطر ایک خاصا طویل عرصہ خانقاہ رائے پور میں مقیم رہے۔ اسی طرح ایک جانب مولانا مودودی کے ساتھ ان کا ذہنی سفر "ترجمان القرآن" کی ادارت کے آغاز سے تشکیلِ جماعت اسلامی تک جاری رہا (جس میں وہ بوجوہ شامل نہ ہوئے) تو دوسری جانب وہ مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور ایک طویل عرصے تک نہایت سرگرمی اور جوش و خروش کے ساتھ تبلیغی جماعت میں کام کرتے رہے۔ اسی طرح ادھر لاہور میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے انہیں انتہائی قرب حاصل رہا تو ادھر مولانا محمد منظور نعمانی مدیر 'الفرقان' لکھنؤ سے بھی ان کے دوستانہ مراسم قائم رہے ---- اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ تو شاگردی اور استادی کا دو طرفہ تعلق رہا۔ یعنی یہ کہ جب وہ ایک سال کے لئے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مقیم رہے تو انہوں نے مولانا علی میاں سے عربی سیکھی اور مولانا علی میاں نے ان سے انگریزی پڑھی، اور تاحال مولانا علی میاں کو جو تعلقِ خاطر ان سے ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حال ہی میں جب پاکستان تشریف آوری کا موقع ہوا تو انہوں نے حاجی صاحب کو خط میں بھی یہ لکھا کہ "میں پاکستان صرف آپ سے ملاقات کے لئے آنا چاہتا ہوں!" اور پھر اپنی بے انتہا مصروفیات کے علی الرغم انہوں نے واقعتاً حاجی صاحب کے مکان پر حاضری دی ---- بلکہ چونکہ اپنی شدید مصروفیات کے باعث اس "حاضری" میں قدرے تاخیر ہو گئی تھی لہٰذا اس پر وہاں ایک سعادت مند خورد کی حیثیت سے حاجی صاحب کی "بزرگانہ ڈانٹ" بھی پورے صبر و سکون کے ساتھ سنی ----

یہ ساری تفصیل تمہید ہے اس بات کی کہ حاجی صاحب راقم کے ساتھ گفتگو میں اکثر خواجہ عبدالحیؒ کا ذکر فرمایا کرتے تھے اور اس کا برملا اعتراف کیا کرتے تھے کہ انکی زندگی کے رخ موڑنے والے اصل میں وہ دروسِ قرآن تھے جو خواجہ صاحب اسلامیہ کالج کے قریب برانڈرتھ روڈ کے کسی چوبارے میں دیا کرتے تھے اور جن میں حاجی صاحب نے اپنے زمانہ طالب علمی میں شرکت کی تھی۔۔۔ ایک دوبار حاجی صاحب کی زبان سے یہ الفاظ بھی نکلے کہ "خواجہ صاحب اُس وقت کے ڈاکٹر اسرار احمد تھے اور ڈاکٹر اسرار آج کے خواجہ عبدالحیؒ فاروقی ہیں!" راقم خواجہ صاحب سے بالکل واقف نہ تھا لیکن حاجی صاحب کے اس ذکر سے انکی ذات سے ایک ذہنی تعلق اور قلبی اُنس قائم ہو گیا۔۔۔۔

اسی دوران میں ایک روز اچانک ملک ظفر اللہ خان صاحب (خلف الرشید ملک نصر اللہ خان عزیز مرحوم جو اولاً مولانا ابوالکلام آزاد کی "حزب اللہ" اور پھر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعت اسلامی میں فعال طور پر شریک رہے تھے) ایک بوسیدہ سی کتاب لئے ہوئے آئے اور انہوں نے فرمایا: "ابا جان کے سامان میں سے بہت سی بوسیدہ و کرم خوردہ کتابوں کے ڈھیر میں سے یہ کتاب بھی ملی ہے' شاید آپ کو اس سے دلچسپی ہو!" اب جو راقم نے دیکھا تو وہ "الخلافۃ الکبریٰ" تھی "یعنی سورۂ بقرہ کی انقلابی رنگ میں تحریر شدہ تفسیر از قلم خواجہ عبدالحیؒ فاروقی" اور اس کا صرف "مقدمہ" ہی پوری طرح ثابت و سالم تھا۔ بہرحال اس کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ حاجی صاحب کا فرمانا بالکل ٹھیک ہے اور یہ خالص وہی فکر ہے جسے خود راقم اپنی حقیر صلاحیت اور محدود استعداد کے مطابق پھیلانے کی کوشش کر رہا ہے! چنانچہ راقم نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ کم از کم اس کے مقدمے کو ضرور شائع کیا جائے گا اور اس کے لئے اصل کتاب ہی کا عکس استعمال ہو گا۔ اس غرض سے دو سال سے ان صفحات کے پوزیٹو بنے رکھے تھے لیکن کوئی موقع نہ آ رہا تھا۔ آج بحمد اللہ راقم کی وہ خواہش پوری ہو رہی ہے۔

اس تبرکِ علمی و دینی کے تعارف کا ایک دوسرا رخ بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس کا تعلق علم و تفسیر قرآن کے اس "انقلابی" مزاج کے حامل سلسلے سے ہے جو اس صدی کے اوائل میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمتہ اللہ علیہ کی ذات بابرکات سے

شروع ہوا تھا، جس کے خلیفۂ اول کی حیثیت حاصل تھی مولانا عبید اللہ سندھی کو جو اواخرِ عمر میں کچھ زیادہ ہی "انقلابی" ہو گئے تھے اور خلیفۂ ثانی کا درجہ حاصل تھا مولانا احمد علی لاہوری رحمتہ اللہ علیہ کو جو عمر کے آخری دور میں اغلباً اعوان و انصار کی کمی اور حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر انقلابیت سے کسی قدر رجعت فرما کر روحانیت اور بیعتِ ارشادی میں منہمک ہو گئے تھے اور تیسری اہم شخصیت تھی خواجہ عبدالحیٔ فاروقیؒ کی جو اغلباً از اول تا آخر معتدل مزاج کے حامل رہے اور ان کے انقلابی فکرِ قرآنی نے نہ تو کوئی بڑی زقند لگائی اور نہ کسی درجے میں رجعت ہی اختیار کی!

راقم نے آج سے ٹھیک دو سال قبل "میثاق" بابت دسمبر۱۹۷۶ء میں ایک طویل مضمون میں تفسیر قرآن کی ان مختلف شاخوں کا جائزہ لیا تھا جو برِ عظیم پاک و ہند میں انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں پھلی پھولیں۔ (یہ تحریر اب راقم کی تالیف "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" میں شامل ہے!) ان میں قادیانی و لاہوری سلسلے سے قطع نظر جو "ضَلَّ ضَلاَلاً بَعِيدًا" کا مصداقِ کامل بن گیا' ایک انتہا پر تو متجددین کا سلسلہ تھا جس کے بانی مبانی تھے سرسید مرحوم' اور ان کے اہم خلفاء میں شامل ہیں علامہ عنایت اللہ خان مشرقی اور چوہدری غلام احمد پرویز' اور دوسری انتہا پر تھے "الرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ" جن کے سیّد الطائفہ تھے حضرت شیخ الہندؒ۔ اور ان کے مابین تھیں تین درمیانی رنگ کی حامل شاخیں جو ---- مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا حمید الدین فراہی اور علامہ اقبال سے شروع ہوئیں اور جن کے خلفاءِ عظام ہیں علی الترتیب مولانا مودودی' مولانا اصلاحی اور ڈاکٹر رفیع الدین۔ علماءِ راسخین کے حلقے کی دوسری اہم شخصیت ہیں مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ جن کے بارے میں راقم لکھ چکا ہے کہ ان کی تفسیر بیان القرآن سے تین تفسیریں مزید نکلی ہیں' ایک مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم کی' دوسری مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی اور تیسری مفتی محمد شفیعؒ کی۔ البتہ خاص حضرت شیخ الہندؒ کی ذاتِ بابرکات سے تفسیر قرآن کے جو دو چشمے پھوٹے ان میں سے متذکرہ بالا تحریر میں صرف ایک کا ذکر ہوا تھا یعنی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حد درجہ سلیس لیکن انتہائی عمیق حواشی کا۔ لیکن دوسرے اہم سلسلے کا ذکر رہ گیا تھا جس کے اہم افراد ہیں مولانا عبید اللہ

سندھی مرحوم، مولانا احمد علی لاہوری" اور خواجہ عبدالحئی فاروقی"۔

راقم ایک دوسرے موقع پر "میثاق" ہی میں اپنی اس رائے کا اظہار بھی کر چکا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی کے اصل مجدد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن" ہیں۔(یہ تحریر اب راقم کی تالیف: "جماعت شیخ الہند" اور تنظیم اسلامی" میں شامل ہے)۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جو جامعیتِ کبریٰ ان کی ذات میں نظر آتی ہے وہ اس صدی کے اعاظم رجال میں سے اور کسی میں نظر نہیں آتی۔ تعلیمی و تصنیفی کام بھی اپنی جگہ حد درجہ اہمیت کا حامل ہے اور تزکیۂ نفوس اور مجاہدہ مع النفس کی عظمت سے بھی ہرگز انکار ممکن نہیں، لیکن صدی کے مجدد کا جامہ اسی پر راست آتا ہے جو ان دونوں میدانوں میں بھی مسلّمہ حیثیت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ مجاہدہ مع الکفار کے میدان میں بھی سرگرم نظر آئے اور قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلے اور دار و رسن کو بھی رونق بخشے۔ اور اس صدی میں ان تینوں پہلوؤں کو اپنی ذات میں بتمام و کمال جمع کرنے والی شخصیت صرف حضرت شیخ الہند" کی ہے۔ چنانچہ ان کی ذات سے فکرِ قرآنی کی ایک انقلابی مزاج کی حامل شاخ بھی پھوٹی جس کے گلِ سرسبد ہیں یہ تین حضرات جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

الغرض ---- علم و تفسیرِ قرآن اور دعوت رجوع الی القرآن یا تحریکِ تعلیم وتعلّم القرآن کے اس جائزے یا تجزیئے میں جو راقم الحروف نے دسمبر ۷۶ء کے "میثاق" میں سپرد قلم کیا تھا ایک کمی رہ گئی تھی جس کی تلافی ان سطور کی تحریر اور "الخلافة الکبریٰ" کے مقدمے کی اشاعت سے مطلوب ہے!"

(میثاق لاہور بابت نومبر دسمبر ۷۸ء)

"الخلافة الکبریٰ" کا یہ مقدمہ اُس وقت تو صرف "میثاق" میں شائع ہو کر رہ گیا تھا۔ اب حال ہی میں جب مولانا عبید اللہ سندھی" کے ایک اور شاگرد (جو رشتے میں میرے ماموں بھی تھے) مولوی انیس احمد بی اے (علیگ) کی ایک تالیف "انوار القرآن" کی اشاعت کا فیصلہ ہوا تو خیال آیا کہ خواجہ عبدالحئی" کے اس تبرکِ علمی کو بھی کتابچے کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

مولوی انیس احمد بی اے (علیگ) کی تالیف

انوار القرآن

کی تقدیم

یہ ۴۰۔۱۹۴۱ء کی بات ہے جب میں تیسری چوتھی جماعت کا طالب علم تھا، اور ہم حصار میں ریلوے سٹیشن سے بالکل متصل اپنے اس نئے مکان میں رہائش پذیر تھے جو والد صاحب مرحوم و مغفور نے چند سال قبل ہی تعمیر کرایا تھا کہ میرے مشاہدے میں آیا کہ دو حسین و دیدہ زیب کتابوں کے دو سیٹ ہمارے یہاں بہت اہتمام کے ساتھ رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایک سیٹ مردان خانے کی "بیٹھک" میں رکھی ہوئی میز کی دراز میں مستقلاً موجود رہتا تھا، اور دوسرا منقسم طور پر دو جز دانوں میں خواجہ حسن نظامی مرحوم کے ترجمے اور حواشی والے قرآن مجید کی ان دو جلدوں (پندرہ پندرہ پاروں پر مشتمل) کے ساتھ رکھا رہتا تھا جو والدہ صاحبہ مرحومہ کے زیر تلاوت رہتی تھیں! (مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ دونوں جلدیں "متاعِ عزیز" کے طور پر اس مختصر ترین سامان کے ساتھ بھی پاکستان پہنچ گئی تھیں جس کے ساتھ ہمارے خاندان نے حصار سے سلیمانکی ہیڈورکس تک کا ایک سو ستر میل کا فاصلہ آگ اور خون کے دریا عبور کر کے بیس روز میں طے کیا تھا۔ پھر پاکستان میں بھی والدہ صاحبہ مرحومہ کی یہ "متاعِ عزیز" نہایت بوسیدہ ہو جانے کے باوجود کئی سال تک محفوظ رہی۔ تا آنکہ والدہ صاحبہ نے میرے مشورہ پر پچاس کی دہائی کے اوائل میں حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی والے مصحف کی تلاوت شروع کی۔)

بہرحال، متذکرہ بالا دو کتابوں کے نام تھے : تعلیم القرآن اور کلید القرآن۔ اور ان دونوں پر مصنف کا نام تحریر تھا "انیس احمد۔ بی اے (علیگ)"۔ پھر یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ان ہی دنوں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ انیس احمد والدہ صاحبہ کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی

ہیں۔ تاہم یہ یاد نہیں کہ میں نے کبھی ان کتابوں کو توجہ کے ساتھ پڑھا بھی ہو۔ ہائی اسکول کے زمانے میں اولاً مجھ پر "بانگِ درا" چھائی رہی' بعد ازاں کچھ حفیظ جالندھری کا "شاہنامہ" اور کچھ مولانا مودودی کے ابتدائی کتابچے زیرِ مطالعہ رہے' اور زیادہ تر وقت مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی عملی سرگرمیوں کے نذر ہوا۔

میڈیکل کالج کی تعلیم کے دوران جب ذرا معلومات کا دائرہ وسیع ہوا اور حلقہ دیوبند کے بعض حضرات سے تعارف حاصل ہوا تو کان کھڑے ہوئے کہ یہ مولوی انیس احمد تو بہت بدنام انسان تھے اور ان پر حضرت شیخ الہندؒ سے غداری اور انکے خلاف مخبری کا الزام تھا۔ چنانچہ دل ہی دل میں شرم اور ندامت کا احساس بھی پیدا ہوا اور ان کے ساتھ اپنی رشتہ داری کی نسبت کو چھپائے رکھنے ہی میں عافیت محسوس ہوئی۔ بلکہ ایک واقعہ تو میں بھول ہی نہیں سکتا۔ یہ ۵۷۔۵۸ء کی بات ہے کہ میں اجمل باغ' رحیم آباد (ضلع رحیم یار خان) میں سردار اجمل خان لغاری مرحوم کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کے مولوی صاحب تشریف لائے جن کی داڑھی اور سر دونوں کے بال نہایت پراگندہ' اور کپڑے نہایت میلے اور بوسیدہ تھے' چہرے پر خشونت بلکہ وحشت تک کے آثار تھے اور ہاتھ میں ایک بہت بھاری بھرکم عصا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے شاگرد اور مصاحب رہے تھے۔ (مجھے ان کا نام اس وقت یاد نہیں آ رہا۔ اگرچہ بہت بعد کی بات ہے کہ ایک بار جب جناح ہال لاہور میں قرآن کانفرنس کا ایک اجلاس ہو رہا تھا' یہ اچانک "وارد" ہو گئے تھے' اور انہیں میں نے ایک مختصر سے خطاب کا موقع بھی دیا تھا!) بہرحال وہ سردار اجمل خاں صاحب مرحوم سے گفتگو کرتے رہے اور میں صرف سنتا رہا۔ لیکن اثنائے گفتگو میں ایک بار ان کی زبان پر "مولوی انیس احمد" کا نام ایسے غیظ و غضب کے ساتھ آیا کہ مجھے محسوس ہوا کہ اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ میں ان کا رشتہ کا بھانجا ہوں تو چشم زدن میں ان کا بھاری بھرکم عصا میرے سر پر ہو گا!

اس کے چند سالوں کے بعد مولوی انیس احمد صاحب کے ایک بھتیجے سے تعارف ہوا۔ یہ شکیل احمد قریشی مرحوم تھے' محکمہ انہار میں سپرنٹنڈنگ انجینئر' اور اس اعتبار سے نہایت مشہور اور معروف کہ گہری دینداری کے ساتھ ساتھ پورے "دیانتدار" بھی تھے اور اس

پر مستزاد یہ کہ نہایت دبنگ افسر بھی تھے اور اپنے کام میں ماہر بھی! (یہ موجودہ ماحول کے اعتبار سے "متضاد" اوصاف کسی ایک انسان میں شاذ ہی جمع ہوتے ہیں)۔ ان کے بارے میں جب یہ معلوم ہوا کہ وہ مولانا احمد علی لاہوریؒ سے بیعت ہیں تو حیرت ہوئی کہ جس حلقے کے لوگ ان کے تایا اور دادا کو انگریز کے ایجنٹ اور قوم کے غدار قرار دیتے ہیں اسی کے ایک بزرگ سے یہ کیسے بیعت ہو گئے!

تاہم اس پوری صورتحال کا "ڈراپ سین" اس صورت میں ہوا کہ جب میں ۱۹۸۰ء میں پہلی بار "بھارت" گیا اور لکھنؤ میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ سے ملاقات ہوئی تو چونکہ ان کا قیام بھی بہت طویل زمانے تک بریلی میں رہا تھا جہاں مولوی انیس احمد صاحب کے والد خان بہادر مولوی ادریس احمد مرحوم محکمہ تعلیم میں بہت اونچے منصب پر فائز رہے تھے (اس صدی کی تیسری دہائی کے دور میں ان کی تنخواہ ایک ہزار روپے ماہانہ سے متجاوز تھی!) تو میں نے مولانا نعمانیؒ سے ڈرتے ڈرتے مولوی ادریس صاحب کے بارے میں دریافت کر لیا۔ اس پر مولانا نے بتایا کہ ان کے ساتھ ان کی گہری شناسائی تھی اور گھریلو مراسم بھی رہے تھے اور یہ کہ کچھ لوگوں نے ان کے بیٹے مولوی انیس احمد کو خواہ مخواہ بدنام کیا، حالانکہ اب جو انڈیا آفس کا ریکارڈ منظر عام پر آیا ہے اس سے تو معلوم ہوا ہے کہ مولوی صاحب مرحوم نہایت مخلص اور جوشیلے انقلابی کارکن تھے اور انگریز انہیں شیخ الہندؒ کے "خطرناک ترین" فدائیوں میں شمار کرتے تھے۔ اس پر میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ اور میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میرے رشتے کے ماموں بفضلہٖ تعالیٰ نہ غدار تھے نہ سرکار انگریزی کے مخبر، بلکہ مخلص مومن اور مرد مجاہد تھے۔

اس کے چند سال بعد کراچی میں انیس احمدؒ صاحب کے فرزند شاہد احمد (مرحوم) سے ملاقات ہوئی (جو ایک دوسرے رشتے سے میرے خالو بھی تھے!) تو مزید معلومات حاصل ہوئیں جن سے کچھ احساس فخر بھی پیدا ہوا.... خصوصاً اس بات سے کہ مولوی انیس احمدؒ بھی ان چند خوش قسمت نوجوانوں میں سے تھے جنہوں نے گریجویشن کے بعد فتح پوری مسجد دہلی میں قائم شدہ "ادارۂ نظارۃ المعارف" میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ ایسے انقلابی انسان سے قرآن پڑھا تھا اور ان ہی کی وساطت سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی مشہور

تحریک آزادی موسوم بہ "تحریک ریشمی رومال" میں شرکت کر کے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں!

جہاں تک ان کے والد مرحوم اور میری والدہ مرحومہ کے حقیقی پھوپھا یعنی خان بہادر مولوی [illegible] احمد صاحب کا تعلق ہے وہ یقیناً سرسید مرحوم کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے اور مسلمانانِ ہند کی مصلحت اس میں سمجھتے تھے کہ انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی روش کو ترک کر کے مصالحت کا رویہ اختیار کیا جائے' اور انگریزی زبان بھی پڑھی جائے اور جدید علوم کی بھی بھرپور طور پر تحصیل کی جائے۔ چنانچہ یہ حقیقت ان کے نام کے ساتھ ملحق خطاب سے بھی ظاہر ہے۔ تاہم ایک تو یہ ایک خاص دور کی بات ہے جس میں بہت سے عظیم المرتبت علماء بھی اس رائے کے حامل تھے۔ (جیسے مولانا اشرف علی تھانوی' مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور مولانا محمد حسین بٹالوی رحمہم اللہ!) اور دوسرے یہ کہ ایسا تو بارہا ہوا ہے کہ بیٹے نے باپ کی رائے اور روش کے بالکل برعکس راستہ اختیار کر لیا اور آزر کے گھر میں ابراہیمؑ پیدا ہو گئے۔ چنانچہ یہی صورت اس معاملے میں ہوئی!

بہر حال' اپنی اسی ملاقات میں جناب شاہد احمد صاحب نے مجھے اپنے والد مرحوم کی پیش نظر تالیف "انوار القرآن" کا ایک نہایت بوسیدہ نسخہ اپنے تحریر کردہ "تعارف" کے ساتھ عنایت فرمایا تھا جسے ایک "تبرکِ علمی" کی حیثیت سے شائع کرنے کا فیصلہ تو اگرچہ میں نے اسی وقت کر لیا تھا' تاہم دیگر دعوتی و تنظیمی مصروفیات کی وجہ سے' جن میں گزشتہ دس پندرہ سالوں کے دوران بیرونی اسفار نے زیادہ ہی شدت پیدا کر دی ہے' یہ کام مؤخر ہوتا رہا۔ تا آنکہ "کلّ امرٍ مرھونٌ لوقتہٖ" کے مطابق مشیتِ ایزدی میں اس کی اشاعت کا وقت آگیا۔ چنانچہ اب یہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اس تحریر کا اقتباس بھی پیش کردوں جو میں نے ۱۹۸۷ء میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے ایک دوسرے شاگرد خواجہ عبد الحیٔ فاروقیؒ کی تالیف "الخلافۃ الکبریٰ" کا مقدمہ ماہنامہ "میثاق" میں شائع کرتے ہوئے اس کے تعارف کے ضمن میں سپردِ قلم کی تھی ۔

"اس تبرکِ علمی و دینی کے تعارف کا ایک دوسرا رخ بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس کا تعلق علم و تفسیرِ قرآن کے اس "انقلابی" مزاج کے حامل سلسلے سے ہے جو اس صدی کے اوائل میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی ذاتِ بابرکات سے شروع ہوا تھا، جن کے خلیفۂ اول کی حیثیت حاصل تھی مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو جو اواخر عمر میں کچھ زیادہ ہی "انقلابی" ہو گئے تھے، اور خلیفۂ ثانی کا درجہ حاصل تھا مولانا احمد علی لاہوریؒ کو جو عمر کے آخری دور میں اغلباً اعوان و انصار کی کمی اور حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر انقلابیت سے کسی قدر رجعت فرما کر روحانیت اور بیعتِ ارشاد میں منہمک ہو گئے تھے اور تیسری اہم شخصیت تھی خواجہ عبد الحئی فاروقیؒ کی جو اغلباً از اول تا آخر معتدل مزاج کے حامل رہے اور ان کے انقلابی فکرِ قرآنی نے نہ تو کوئی بڑی زقند لگائی اور نہ کسی درجے میں رجعت ہی اختیار کی!

راقم نے آج سے ٹھیک دو سال قبل "میثاق" بابت دسمبر ۱۹۷۶ء میں ایک طویل مضمون میں تفسیر قرآن کی ان مختلف شاخوں کا جائزہ لیا تھا جو برعظیم پاک و ہند میں انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسوی صدی کے اوائل میں پھلی پھولیں۔ (یہ تحریر اب راقم کی تالیف "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" میں شامل ہے!) ان میں قادیانی و لاہوری سلسلے سے قطع نظر جو "صَلَّ صَلَالًا بَعِيدًا" کا مصداقِ کامل بن گیا، ایک انتہا پر تو متجددین کا سلسلہ تھا جس کے بانی مبانی تھے سر سید مرحوم اور ان کے اہم خلفاء میں شامل ہیں علامہ عنایت اللہ خان مشرقی اور چوہدری غلام احمد پرویز، اور دوسری انتہا پر تھے "الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ" جن کے سید الطائفہ تھے حضرت شیخ الہندؒ۔ اور ان کے مابین تھیں تین درمیانی رنگ کی حامل شاخیں جو ---- مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا حمید الدین فراہی اور علامہ اقبال سے شروع ہوئیں اور جن کے خلفاءِ عظام ہیں علی الترتیب مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور ڈاکٹر رفیع الدین۔ علماءِ راسخین کے حلقے کی دوسری اہم شخصیت ہیں مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ جن کے بارے میں راقم لکھ چکا ہے کہ ان کی تفسیر بیان القرآن سے تین تفسیریں مزید نکلی ہیں، ایک مولانا عبد الماجد دریا بادی مرحوم کی، دوسری مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی اور تیسری مفتی محمد شفیعؒ کی۔ البتہ خاص حضرت شیخ الہندؒ کی ذاتِ بابرکات سے تفسیر قرآن کے جو دو چشمے پھوٹے ان میں سے متذکرہ بالا تحریر میں صرف ایک کا ذکر ہوا تھا

یعنی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حد درجہ سلیس لیکن انتہائی عمیق حواشی کا۔ لیکن دوسرے اہم سلسلے کا ذکر رہ گیا تھا جس کے اہم افراد ہیں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم، مولانا احمد علی لاہوریؒ اور خواجہ عبدالحیٔ فاروقیؒ۔"

پیش نظر کتاب کی اشاعت کے ذریعے، ان شاء اللہ العزیز، اس "سلسلۃ الذھب" کی ایک تیسری کڑی کا ذکر بھی تاریخ کے صفحات میں مذکور و محفوظ ہو جائے گا۔

مولوی انیس احمدؒ کے بڑے بیٹے نفیس احمد مرحوم تو میری معلومات کی حد تک لاولد ہی فوت ہو گئے تھے۔ البتہ ان کے چھوٹے بیٹے شاہد احمد مرحوم کی اولاد بحمد اللہ پاکستان میں موجود ہے اور سب بہن بھائی بحمد اللہ ذہانت و فطانت میں تو اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ ان سب کو اپنے جدِ امجد کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بھی عطا فرمائے۔ آمین!

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ
لاہور، ۵۔ جون ۱۹۹۶ء

مولوی انیس احمدؒ کی کتاب "انوار القرآن" کا

تعارف

یہ کتاب "انوار القرآن" والد صاحب مرحوم و مغفور نے غالباً ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں تصنیف کی۔ اس سے پہلے بھی ان کی دو کتابیں آرٹ پیپر پر شائع ہوئیں جن کے نام تھے "تعلیم القرآن" اور "کلیدِ قرآن"۔ آخر الذکر کتاب انہوں نے دوبارہ شائع کرنے کے لئے شیخ محمد اشرف صاحب کو دی تھی جو لاہور کے بڑے پبلشر ہیں۔ لیکن چونکہ مولانا موصوف پر انگریز دشمنی کا لیبل لگا ہوا تھا لہٰذا انہوں نے اس کو شائع نہیں کیا۔ اس کی آخری کاپی ضرور ان کے مطبع کے ریکارڈ میں ہوگی۔

والد صاحب مرحوم بڑے روشن خیال عالم تھے اور بڑے پکے موحد اور مجاہد۔ انہوں نے دنیاوی منفعت اور آسائش کو کبھی کوئی حیثیت نہیں دی۔ جہاں تک مجھے ان سے معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ ۱۹۱۲ء میں جب ایم اے او کالج علی گڑھ سے انہوں نے بی اے بڑے امتیاز سے پاس کیا تو ان کو ڈپٹی کلکٹری کا پروانہ انگریزوں نے عطا کیا۔ لیکن ان کو جذبۂ دینی اور جذبۂ جہاد نے گھر سے جانے پر مجبور کیا۔ اُس وقت تک ان کی تین اولادیں ہو چکی تھیں۔ ان کی والدہ محترمہ نے ان کو زادِ راہ کے لئے اپنا سارا زیور دے دیا اور وہ خاموشی سے دہلی چلے گئے۔ وہاں مولانا عبید اللہ سندھی صاحب نے ادارۂ نظارۃ المعارف فتح پوری مسجد میں بنایا تھا جہاں وہ صرف گریجویٹ طلبہ کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ وہاں سے بہت جلد وہ فارغ ہوئے اور مولانا عبید اللہ نے اپنی خصوصی سند کے ساتھ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے پاس دیوبند بھیج دیا۔ حضرت شیخ الہند نے ایک سال سے کم عرصے میں ان کو سندِ تبلیغِ قرآن اور علومِ دین عطا فرمائی۔

حضرت موصوف کی تحریک جہاد، جسے انگریز ریشمی رومال کی سازش یا بغاوت کہتے ہیں، شروع ہوئی تو وہ اولین ساتھیوں میں سے تھے۔ تحریک کی تنظیم حیدر آباد دکن ان کے سپرد ہوئی۔ افغانستان میں انگریزوں کے سفیر کو جب حبیب اللہ خان نے حضرت شیخ الہند کی

تحریک کی دستاویزات دے دیں تو جو لوگ تحریک میں شامل تھے ان کے نام انگریزی حکومت کو معلوم ہو گئے اور حضرت والد صاحب کو حیدر آباد میں گرفتار کر کے دیگر قیدیوں کے ساتھ آہنی پنجروں میں ہر قسم کے لباس سے معرار نگون بھیج دیا گیا۔

رنگون جانے سے پہلے جب وہ جنگی قیدیوں کی کار میں جامع مسجد دہلی کے قریب سے گزرے تو انہوں نے محافظوں سے اجازت لے کر حضرت باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر یہ دعا مانگی کہ ان کو مجاہد کی موت نصیب ہو، جو قبول ہوئی اور میں اس کا گواہ ہوں۔

ان کے والد یعنی ہمارے دادا صاحب مرحوم خان بہادر مولوی ادریس احمد صاحب کا انگریزوں میں بڑا نام تھا۔ انہوں نے اُس وقت کے وائسرائے سے والد صاحب مرحوم کی رہائی کی درخواست کی۔ والد صاحب مرحوم نے یہ شرط لگائی کہ ان کے مرشد حضرت شیخ الہند سے اجازت لی جائے۔ چنانچہ جب ان کی اجازت آئی تو وہ انگریزوں کی قید سے اپنے والد مرحوم کی نظربندی میں آ گئے۔ جنگ عظیم اول کے فوراً بعد ان کی نظربندی ختم ہوئی۔ ان کا فرمانا تھا کہ انہی دنوں میں یا جس دن رہائی کا حکم آیا تھا میری پیدائش کی اطلاع ان کو ملی۔

اس کے بعد ۱۹۴۷ء تک ان کی زندگی کشاکشِ حیات اور ابتلا میں گزری۔ انہوں نے اپنی درویشانہ منش نہیں چھوڑی اور نہ اپنے ضمیر کا سودا کیا۔ دیوبند کے علماء سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، نہ وہ کانگرسی مولویوں کے ہم خیال تھے۔ انہوں نے انگریزوں سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھا۔ ان کو بہت بڑی بڑی ملازمتوں کی پیشکش ہوئی لیکن وہ صرف جرنلزم سے روپیہ کماتے تھے۔ میں نے الطاف حسین مرحوم کو، جو بعد میں وزیر ہوئے، ان کے شاگرد کی حیثیت سے دیکھا ہے۔

ان کی علمی وجاہت کی یہ شان تھی کہ خواجہ حسن نظامی جیسے لوگ ان سے عاجزانہ ملتے تھے۔ علامہ مشرقی، شاعر مشرق علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، سر عبدالقادر، غرض اس زمانہ کے سب بڑے لیڈر ان سے مشورہ کرنے کو اعزاز سمجھتے تھے۔ ہندوستانی ریاستوں کے تمام مسلمان حکمران بھی ان سے ذاتی طور پر واقف تھے اور ان کا ادب کرتے تھے۔

انگریزوں نے ہر طرح انکو نقصان پہنچایا۔ یہاں تک کہ جب میں نے مقابلہ کے امتحانوں میں بیٹھنا چاہا تو مجھے اجازت نہیں ملی اور میں نے اپیل کی تو اجازت ملی۔ اس میں میرا ایک سال ضائع ہو گیا۔

مسلم لیگ میں بھی وہ کبھی باقاعدہ شریک نہیں ہوئے' البتہ پاکستان کے تصور سے ان کو محبت تھی اور ۱۹۴۶ء کے آخر میں وہ پشاور آ گئے تھے اور انہوں نے مالاکنڈ ایجنسی میں جہاد پر تقاریر کیں اور مضامین لکھے' جو سرحد کے تقریباً سب اخباروں میں اردو اور پشتو میں شائع ہوئے۔ انہی میں سے میں نے چند ایک کتابی صورت میں شائع کئے ہیں۔ یہی ایک خدمت ہے جو میں ان کی کر سکا ہوں۔

پاکستان بننے کے بعد ان کے قدیم دوستوں میں نواب زادہ لیاقت علی خان مرحوم' غلام محمد مرحوم اور جسٹس دین محمد مرحوم نمایاں تھے۔ غلام محمد صاحب جب گورنر جنرل ہوئے تو انہوں نے والد صاحب کو چار لاکھ روپے پیش کئے کہ اس سے ادارۂ ثقافت اسلامی بنائیں اور قرآن مجید کا ترجمہ کریں جس پر غلام محمد کی مہر ہو کہ ان کی تصدیق سے شائع ہوا' جیسے بائبل مہر پر ہوتی ہے۔ والد صاحب نے کسی اور بزرگ کا نام پیش کر دیا' کیونکہ وہ قرآن کی خدمت میں اس قسم کا معاوضہ یا کسی گورنر جنرل کے دستِ اعانت سے محفوظ رہنا چاہتے تھے۔ جسٹس دین محمد مرحوم نے ان کو حیدر آباد گورنمنٹ کالج میں دینی تعلیم کے کورس اساتذہ کو کرانے کے لئے لیکچرر مقرر کیا اور یہ کام انہوں نے تقریباً تین سال کیا۔ انہی دنوں میں انہوں نے کلام مجید کے پارہ عمّ اور پھر پہلے ۹ پاروں کا سلیس اردو ترجمہ کیا جو جناب سعید بہاری مرحوم نے کئی لاکھ کی تعداد میں شائع کرا کر مفت تقسیم کیا۔ عالمِ نزع میں انہوں نے جو باتیں مجھ سے کیں ان سے معلوم ہوا کہ جتنی خدمت ان سے قرآن کی ہو گئی ہے اور جتنا جہاد اسلام کی خدمت میں انہوں نے کیا ہے اس سے وہ مطمئن ہیں۔

انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اب دمِ واپسیں آ گیا ہے' چنانچہ انہوں نے مجھے اپنے کمرہ سے باہر بھیج دیا اور اپنے خادمِ خاص سے جسم کو صاف کرایا' اور پھر دو رکعت نماز پڑھی۔ اس کے بعد مجھے بلایا اور فرمایا کہ اب وہ آرام کرنا چاہتے ہیں۔ چادر انہوں نے خود اوڑھی اور منہ چادر میں کر لیا۔ میں نے دل میں یٰسین شریف پڑھنی شروع کی تو انہوں نے ایک دم منہ

باہر نکال کر پوچھا کہ کیا پڑھ رہے ہو؟ میں نے بتایا تو کہا کہ زور سے پڑھو۔ جب چار رکوع ہو گئے تو کہا کہ بس۔ اس کے فوراً بعد لیڈی نرس آئی۔ اس نے نبض دیکھی تو کہا کہ وہ انتقال کر چکے ہیں۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہ رَاجِعُون۔

ان کی پیدائش ستمبر ۱۸۹۰ء میں اور وفات ستمبر ۱۹۵۴ء میں ہوئی۔ اس طرح یہ مردِ مجاہد نفسِ مطمئنّہ کے ساتھ اپنے مقام موعود پر پہنچا۔

میں اس زمانہ میں لاہور میں کنٹرولر آف ملٹری اکاؤنٹس تھا اور اس حیثیت میں لیفٹیننٹ جنرل محمد اعظم خاں کا جو لاہور ڈویژن کی ملٹری کے کمانڈر تھے، مالی مشیر تھا۔ جنرل صاحب شرفاء نوازی کے لئے مشہور ہیں۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ میرے والد صاحب آئے ہوئے ہیں اور بیمار ہیں تو ان کی مزاج پرسی کے لئے آئے۔ ان سے ملاقات کے بعد مجھ سے کہا کہ آپ کے والد تو مجاہد معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے جنرل صاحب کی مردم شناسی کو سراہا۔ جنرل صاحب نے انہیں اپنا مہمان بنالیا اور ان کا علاج ایسے ہی کیا جیسے کہ وہ اپنے والد کا کرتے۔ والد صاحب مرحوم نے ان سے فرمایا کہ آپ نے میرا ایسا اہتمام کیا ہے جیسا کسی صاحبِ تخت و تاج کا ہوتا ہے۔

ان کا جنازہ بھی فوجی اعزاز سے لے جایا گیا اور فوج کے اہتمام میں ان کی تدفین ہوئی۔

یہ وہ شخص تھا کہ زندگی میں اپنے کپڑے اپنے ہاتھ سے دھوتا تھا۔ کبھی قیمتی کپڑے نہیں پہنے۔ نہ کسی کی خوشامد کی، نہ کبھی کسی کی برائی کی۔ اگر کسی کی مدد کر سکے تو ضرور کی اور کبھی جتایا نہیں۔

اپنے اہل خانہ کو، جس قدر کماتے تھے، بھیجتے تھے، لیکن ہمارا گزارا نہیں ہوتا تھا۔ ہمارے دادا صاحب جب تک زندہ رہے وہ ہمیں ایک معقول رقم خرچ کے لئے بھیجتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ہمارا وقت کافی تکلیف سے گزرا۔ بہرحال ہمیں اپنے باپ سے ایسا کیریکٹر ملا ہے کہ ہم بڑے سے بڑے ظالم سے پنجہ آزمائی کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ رزقِ حلال کھانے کی وجہ سے ہمیں کبھی دنیاوی فکر نہیں ہوئے اور ہر تکلیف پر اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہ رَاجِعُون کہتے ہیں۔

ان کی طبعِ غیور کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ اپنی اولاد کا بھی احسان لیتے۔ مجھے ان کی زندگی

میں کافی بڑا عہدہ نصیب ہوا اور ان کی دعاؤں سے بڑی عزت و توقیر ملی، لیکن وہ کبھی ایک ہفتہ سے زیادہ میرے ہاں نہیں ٹھہرے۔ وہ بھی اس لئے کہ انہیں مجھ سے محبت تھی۔ ان کی آخری علالت جو میرے گھر میں ہوئی صرف چار دن تھی۔ لاہور آتے ہی انہوں نے مجھے دو ہزار روپے دے دیئے تھے۔ ان کے سفرِ آخرت کے لئے دنیاوی بندوبست کے لئے یہ کافی رقم تھی۔

یہ باتیں اس کے لئے لکھی گئی ہیں کہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ اگر ان کا انگریزوں سے کوئی تعلق ہوتا اور حضرت شیخ الہند" سے انہوں نے کوئی غداری کی ہوتی تو انہیں کوئی معاوضہ، کوئی عہدہ، کوئی اور انعام ملا ہوتا۔ انہوں نے تو دیوبندی اور کانگرسی مولویوں میں شامل ہونا بھی پسند نہیں کیا ورنہ کم از کم کسی درگاہ یا دارالعلوم کے متولّی تو ہوتے۔ مسلم لیگ کافی عرصہ برسرِاقتدار رہی لیکن ان کی قلندری کا وہی حال رہا۔ البتہ جہاد کی جب ضرورت تھی انہوں نے اپنے مرشد کے ساتھ بھی کیا اور پھر پاکستان بننے سے پہلے سرحد کے غیور پٹھانوں میں جہاد کی روح پھونکی۔

البتہ وہ مردِ خدا تھے اور مردِ خدا کو صرف خدا اور رسول ﷺ کا دھیان رہتا ہے۔ اس معاملہ میں وہ ثابت قدم بھی رہتا ہے اور مطمئن بھی۔

خاکسار شاہد احمد

مورخہ ۸۵-۳-۱۸

بقیہ : تذکرہ و تبصرہ

> کام کرنا چاہتی ہو تو کیا کہنا! بصورت دیگر میں تن تنہا اسی مقصد کے لئے کام کرتے رہنے ہی کو اصل کامیابی و سعادت و فلاح سمجھتا ہوں، چاہے پوری زندگی کی جدوجہد کے بعد بھی اس کا کوئی محسوس و مشہود نتیجہ سامنے نہ آئے۔"

۶۷-۶۸ء کے دوران محترم ڈاکٹر صاحب نے جو اداریئے تحریر کئے ان میں جہاں بعض نہایت اہم، خالص علمی اور دعوتی نوعیت کے موضوعات زیر بحث آئے، وہاں تحریک پاکستان کے تناظر میں قیام پاکستان کے بعد دینی جماعتوں بالخصوص دینی سیاسی جماعتوں کے طرز عمل کے بھرپور جائزے اور اس کے حوالے

سے کچھ اصولی مباحث پر مشتمل خالص تحریکی و سیاسی موضوعات پر بعض اداریے بھی محترم ڈاکٹر صاحب کے قلم سے نکلے جو اب "اسلام اور پاکستان" کے نام سے ایک کتابی صورت میں دستیاب ہیں۔ اسی طرح دعوتی و فکری اعتبار سے محترم ڈاکٹر صاحب کی اہم ترین تحریریں جو اس دور میں ضبط تحریر میں آئیں وہ بھی اب کتابی صورت میں موجود ہیں۔ ان میں "اسلام کی نشأۃ ثانیہ : کرنے کا اصل کام" "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" اور "راہ نجات: سورۃ العصر کی روشنی میں" کے نام قابل ذکر ہیں۔

۶۹۔۷۰ء کے دوران محترم ڈاکٹر صاحب نے جو اداریے تحریر فرمائے وہ خالص سیاسی و قومی موضوعات پر تھے۔ ان میں ملک کے کرنٹ سیاسی حالات پر پر مغز تبصرے کے ساتھ ساتھ ملک میں موجودہ مختلف سیاسی جماعتوں کے پس منظر کے حوالے سے بھرپور تجزیہ نگاری بھی شامل تھی۔ یہ اداریے علمی و سیاسی حلقوں میں بہت پسند کئے گئے۔ حال ہی میں میثاق کی مئی اور جون ۹۶ء کی اشاعتوں میں "تازہ خواہی داشتن" کے عنوان سے انہی اداریوں کو مکرر شائع کیا گیا تھا۔ ۷۰۔۷۱ء میں ملک کی سیاسی فضا جس تکدر کا شکار تھی اور سیاست کے میدان میں جو ہنگامہ آرائی تھی اس کا نہایت خوفناک نتیجہ سقوط مشرقی پاکستان کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس وقت جبکہ ملک کے نامور سیاسی تجزیہ نگار بھی حالات کی سنگینی کا ادراک کرنے اور آنے والے خطرے کی بو سونگھنے سے قاصر رہے بلکہ بعض چوٹی کے تجزیہ نگار "محبت کا زمزمہ بہہ رہا ہے" کی نوید سنا کر قوم کو حقائق سے چشم پوشی کا سبق دیتے رہے، محترم ڈاکٹر صاحب ۶۹۔۷۰ء کے دوران اپنے سیاسی تجزیوں میں نہ صرف حالات کی نزاکت و سنگینی سے قوم کو خبردار کرتے رہے بلکہ مسئلے کے ممکنہ حل یعنی مشرقی پاکستانی بھائیوں کو کامل صوبائی خود اختیاری دینے کا مشورہ بھی انہوں نے بلا خوف لومۃ لائم دیا، جس کا اس وقت کھلے الفاظ میں ذکر کرنا طنز و استہزاء کے تیروں کو دعوت دینے کے مترادف تھا، لیکن بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ وہی صائب رائے تھی۔ ہم اگر اس وقت حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے وہ راستہ اختیار کر لیتے تو اس ذلت و رسوائی اور شکست و ہزیمت سے محفوظ رہتے جو بعد میں پاکستانی قوم کے حصے میں آئی ---- زیر نظر شمارے میں ۷۰۔۷۱ء کے مذکورہ اداریوں کے علاوہ ۷۲ء کا ایک اداریہ بھی جو سقوط مشرقی پاکستان کے فوراً بعد محترم ڈاکٹر صاحب نے سپرد قلم کیا تھا، شامل اشاعت کیا گیا ہے --- یوں سیاسی تجزیوں پر مشتمل "میثاق" کے سابقہ اداریوں کی اشاعت کا جو سلسلہ دو شمارے قبل شروع ہوا تھا، زیر نظر شمارے میں وہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا ہے۔ اب ان شاء اللہ بہت جلد ان سب کو یکجا کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے گا۔

عاکف سعید

حیاتِ اقبال کا ایک گم شدہ ورق

امارت اور بیعت کی اساس پر خالص دینی تنظیم کے قیام کی کوشش

(۲)

اُدھر علی گڑھ میں ڈاکٹر سید ظفر الحسن، حضرت علامہ اقبال کے افکار سے متأثر ہو کر ۳۲-۱۹۳۲ء میں جماعت مجاہدین علی گڑھ کے نام سے بیعت اور امارت کی بنیاد پر فداکاروں پر مشتمل ایک اصولی انقلابی جماعت کی داغ بیل ڈال چکے تھے اور حضرت علامہ کی جانب سے اس کام کی مکمل اور بھرپور تائید سے حوصلہ پا کر نہ صرف یہ کہ اسے زیادہ بھرپور انداز میں آگے بڑھانے اور وسعت دینے کے شدید آرزو مند تھے بلکہ اس بات کے بھی شدت کے ساتھ متمنی تھے کہ خود حضرت علامہ اس جماعت کی امارت کی ذمہ داری سنبھالیں تاکہ ان کی قیادت اور رہنمائی میں مسلمانانِ ہند اپنے اصل ہدف یعنی "اسلامی اصول پر حکومت قائم کرنے" کی جانب مؤثر انداز میں پیش قدمی کر سکیں۔ اِدھر لاہور میں حضرت علامہ کے ایک اور عقیدت مند خواجہ عبدالوحید نے ۱۹۳۴ء کے لگ بھگ براہ راست حضرت علامہ کی رہنمائی میں "جمعیت شبان المسلمین" کے نام سے اسی طرز کی ایک جماعت کی تاسیس کی کوشش کا آغاز کر دیا۔ اس جماعت کی ضرورت و اہمیت کی وضاحت اور اس کے نقشہ کار پر مشتمل جو ابتدائی دستاویز مرتب کی گئی وہ اس دستاویز سے بہت مشابہ تھی جو ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے جماعت مجاہدین علی گڑھ کے ابتدائی خاکے کے طور پر مرتب کی تھی [۱]۔ ڈاکٹر سید ظفر الحسن کے نام حضرت علامہ نے ۱۷ جنوری ۳۵ء کو جو خط تحریر فرمایا تھا اس کے ان الفاظ میں کہ "شاید خواجہ عبدالوحید صاحب نے آپ کو لکھا ہو گا،

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی کتاب 'علامہ اقبال اور مسلمانوں کا سیاسی نصب العین' ص ۳۵ تا ۳۸

یہاں کے لوگوں نے بھی تجویز کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا ہے' اگر کوئی اچھی جمعیت پیدا ہو گئی تو میں آپ کو اور میر صاحب کو چند گھنٹوں کے لئے لاہور آنے کی تکلیف دوں گا" اسی جانب اشارہ ہے۔ ان الفاظ کے بین السطور میں صاف پڑھا جا سکتا ہے کہ "جمعیت شبان المسلمین" کے قیام کی تجویز کو حضرت علامہ کی نہ صرف مکمل حمایت حاصل تھی بلکہ اس کے لئے تفصیلی نقشہ کار بھی علامہ کی براہ راست رہنمائی میں مرتب کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کے بارے میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی لکھتے ہیں :

> "علامہ اقبال نے اپنے مکتوب گرامی مورخہ ۱۷/ جنوری ۳۵ء میں خواجہ عبدالوحید صاحب کی جس تحریر کی طرف اشارہ کیا ہے وہ علامہ اقبال ہی کے ایماء سے جمعیت شبان المسلمین ہند کے نام سے ایک وسیع کارکن جماعت کے قیام کی ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی تھی اور اس میں اس جماعت کے قیام کے لئے تائید طلب کی گئی تھی"۔
>
> (علامہ اقبال اور مسلمانوں کا سیاسی نصب العین، ص ۳۵)

جماعت مجاہدین علی گڑھ کے دستور کی مانند اس تحریر یا دستاویز میں بھی ایک اصولی اسلامی جماعت کا مکمل خاکہ موجود ہے۔ اس تحریر کے درج ذیل اقتباسات کو توجہ سے پڑھئے :

> "قوم کی شیرازہ بندی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ افرادِ قوم کسی ایک فردِ واحد کی زیرِ قیادت مصروفِ عمل ہونا گوارا نہ کریں۔ یہی چیز تھی جس کی طرف ارکانِ اسلام میں سے اہم ترین رکن 'نماز مسلمانوں کو لے جانا چاہتی ہے۔ کسی قوم کی تمام عملی زندگی کا خلاصہ ان ہی تین لفظوں "جماعت" "امارت" اور "اطاعت" میں بیان کیا جا سکتا ہے اور جب تک یہ تینوں چیزیں کوئی قوم اپنے اندر پیدا نہ کرے اس وقت تک وہ قوم کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔"
>
> "... آج مسلمانوں کی دنیوی اور اخروی نجات کے لئے وقت کی سب سے بڑی ضرورت ایک ایسی جماعت کا قیام ہے جس کے افراد ایک طرف آپس میں اخوت و اتحاد اور اشتراکِ عمل کا بہترین نمونہ اور دوسری طرف ایک امیر کی کامل اطاعت کا عملی ثبوت پیش کر سکیں۔"

مقام غور ہے کہ مندرجہ بالا اقتباسات مغربی طرز کی جمہوری جماعت پر منطبق ہوتے ہیں یا ایک اصولی اسلامی جماعت کی بہترین عکاسی پر مشتمل ہیں؟ یہ علامہ اقبال کی واقعیت پسندی کا بہت بڑا مظہر ہے کہ ریاست کی سطح پر جمہوری اقتدار کے بہت بڑے حامی ہونے کے باوجود اور اس امر کے باوصف کہ وہ "ری پبلکن" طرز حکومت کو عصرِ حاضر کا ایک اہم تقاضا ہی نہیں اسلامی تعلیمات کے عین مطابق گردانتے ہیں' "اصولی اسلامی حکومت کے قیام" اور "اعلاء کلمتہ اللہ" کے لئے قائم ہونے والی جماعت کے بارے میں ان کا ذہن بالکل واضح تھا کہ ایسی جماعت کا قیام نہ صرف یہ کہ ایک ناگزیر ضرورت ہے بلکہ وہ جماعت یقینی طور پر امارت اور بیعت کی بنیاد پر ہی استوار کی جا سکتی ہے۔ لیکن آج علامہ کے خوانِ علم و دانش سے استخواں چننے والے بعض دانشور ایسی جماعت کے قیام کی ضرورت و اہمیت ہی کے سرے سے منکر ہو گئے ہیں اور امارت اور بیعت کے الفاظ تو ان کے نزدیک گالی سے کم نہیں!!! یہ نتیجہ ہے اس "فکری توازن" کے فقدان کا جو حضرت علامہ کا طرۂ امتیاز تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جو لوگ "عقل" کو اپنے اوپر حاوی کر کے عقل کی غلامی {۲} اختیار کر لیتے ہیں اور اسے "چراغ راہ" سمجھنے کی بجائے "منزل" {۳} قرار دے بیٹھتے ہیں وہ اسی نوع کے عدم توازن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ایک اصولی انقلابی جماعت کے امیر کو کن صفات کا حامل ہونا چاہئے' اس بارے میں اس دستاویز میں شامل درج ذیل پیراگراف اس کے مرتبیں کے فکری اعتدال اور فہم و بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپ بھی پڑھئے!

> "مجوزہ جماعت کا امیر کسی ایسے بزرگ کو منتخب کرنا چاہئے جو ایک طرف تعلیم و تمدن اور تاریخ اسلام کا بہترین سمجھنے والا ہو اور دوسری طرف مغرب کی سیاسی چالبازیوں اور علمی بلند پروازیوں سے بھی پورا واقف ہو۔ جس کے دل میں قوم و ملت کا درد بھی موجود ہو اور جس کی ذات سے ایثار اور جاں فروشی کی توقع بھی ہو

{۲} "صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے ۔ جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول (اقبال)

{۳} گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور ۔ چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے (اقبال)

سکتی ہو۔ جس کا ایمان سلاطین زماں کے دبدبے اور شوکت سے متزلزل نہ ہو سکے اور جس کے عزائم میں غیر ہمدرد حکومتوں کا جبر و قہر کمزوری پیدا نہ کر سکے۔ جس کے خزانہ معلومات میں مشرق و مغرب کے اخبار حکم موجود ہوں اور جس کے تدبر و تفکر کی قرآن و سنت سے تصدیق ہوتی ہو۔ جب ایسا رہنما ایک جماعت کے ہاتھ آجائے تو اس کے افراد بلا خوف و خطر اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیں۔"

تنظیمی ہیئت اور جماعتی ساخت کے اعتبار سے تنظیم اسلامی کا جمعیت شبان المسلمین ہند سے مماثل و مشابہ ہونا تو بالکل واضح ہے ہی' انتخابی سیاست میں حصہ لینے یا نہ لینے اور قومی سیاسی امور پر اظہار رائے کرنے یا اس پر سکوت اختیار کرنے کے مسئلے میں بھی جمعیت شبان المسلمین ہند کی پالیسی نہایت حقیقت پسندانہ اور تنظیم اسلامی کی پالیسی سے پورے طور پر مشابہ اور ہم آہنگ تھی۔ اسی دستاویز کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو!

"... یہ جمعیت سردست کوئی سیاسی پارٹی نہ ہوگی اور نہ کونسلوں اور اسمبلی کے لئے امیدوار کھڑے کرے گی۔ مگر چونکہ قوموں کی اجتماعی حیات پر سیاسیات کا ایک گہرا اثر پڑتا ہے' اس لئے یہ جماعت ان تمام سیاسی امور میں مسلمانان ہند کی اجتماعی زندگی پر مؤثر ہونے کے لئے حسب تقاضائے وقت مسلمانوں کے سیاسی افکار کی تربیت کے لئے اپنی رائے کا اظہار کرتی رہے گی۔ اس طرح گو فی الحال اس جماعت کو سیاسیات میں عملی اقدام سے کوئی سروکار نہ ہوگا لیکن امیر جماعت کو اختیار ہوگا کہ بوقت ضرورت جماعت کو ایسے مقاصد کے لئے بھی تیار کرے۔"

اسی طرح جمعیت کے مجوزہ دستور میں امیر اور اس کے اختیارات کی تفصیل جن الفاظ میں درج کی گئی ہے ان سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ حضرت علامہ اور ان کے قریبی ساتھی ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت کے تقاضوں سے بخوبی باخبر اور اسلام کے تصورِ امارت کا صحیح ادراک رکھتے تھے۔ ملاحظہ ہو :

"پہلا امیر تاحیات امیر رہے گا۔
امیر کو اختیاراتِ کلی حاصل ہوں گے۔
امیر کے لئے لازم ہوگا کہ وہ ارکانِ اسلام کا پابند ہو اور سادہ زندگی بسر کرے۔

امیر مجلس شوریٰ کے فیصلوں کی پابندی پر مجبور نہ ہو گا بلکہ ہر معاملے میں حکم ہو گا۔"

جماعت کے اندر مشورہ و مشاورت کی فضا کو برقرار رکھنے کی خاطر امیر کے بارے میں طے کیا گیا کہ وہ مجلس عاملہ کے اجلاس میں ایک عہد نامہ پر دستخط کرے گا جس میں یہ الفاظ بھی شامل ہوں گے :

"میں حتی الامکان ہر معاملے میں مجلس مشاورت کے مشورے سے کام کروں گا"۔

تاہم اس کے فوراً بعد دستور میں یہ صراحت بھی موجود ہے جو آج کے جمہوریت پسندوں کو بہت کھٹکے گی :

"امیر مجلس مشاورت کے مشورے اور مجلس تنفیذیہ کی وساطت کے بغیر احکام صادر کر سکتا ہے۔"

(علامہ اقبال اور مسلمانوں کا سیاسی نصب العین۔ ص ۴۴)

اسی طرح ارکان جماعت کے لئے جو عہد نامہ مرتّب کیا گیا اس کے الفاظ بھی اس امر کا واضح طور پر پتہ دیتے ہیں کہ یہ ایک ٹھیٹھ اسلامی جماعت تھی جس کا قیام "اعلاء کلمۃ اللہ" کے لئے عمل میں آیا تھا۔ اس عہد نامہ کے چیدہ چیدہ نکات درج ذیل ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا تنظیم اسلامی کے دستور العمل ہی کو قدرے مختلف الفاظ میں پیش کیا گیا ہے :

- "میں اعلائے کلمۃ اللہ اور ہندوستان میں مسلمانوں کی بہتری کے لئے اپنی جان مال' آسائش اور جاہ ہر چیز قربان کرنے کے لئے ہمیشہ تیار اور آمادہ رہوں گا۔
- ارکان اسلام اور اخلاق صالحہ کی پابندی کی پوری کوشش کروں گا۔
- جماعت کے اجتماعات میں شامل ہوا کروں گا۔
- جماعت کا اخبار باقاعدہ پڑھتا رہوں گا۔
- کسی سیاسی جماعت میں بغیر اجازت امیر کے شامل نہ ہوں گا۔
- اسلام کی تعلیم' تاریخ اور تمدن کا مطالعہ کروں گا۔
- غیر ضروری اور خلاف شریعت' مخرب اخلاق رسومات سے پرہیز کروں گا۔
- امیر جماعت کے احکام (بالواسطہ یا بلاواسطہ) پر بے چون و چرا عمل کروں گا۔

○ میں اپنے بچوں (لڑکوں اور لڑکیوں) کی تعلیم و تربیت صحیح اسلامی اصول کے مطابق کروں گا۔
○ میں ہر قسم کے صدقات جمعیت کے بیت المال میں جمع کروں گا۔"

مجلس تنفیذیہ یا جسے آج کی اصطلاح میں مجلس عاملہ کہا جاتا ہے' کے بارے میں درج ذیل امور دستور میں طے کئے گئے :

"○ اس مجلس کے تمام ارکان کا انتخاب امیر کرے گا۔
○ یہ مجلس' مجلس شوریٰ اور مجلس عامہ کے فیصلوں پر عمل درآمد کرائے گی۔
○ تعدادِ ارکان سات ہو گی۔
○ کورم تین کا ہو گا۔
○ مجلس کا انتخاب سالانہ ہو گا۔"

اسی طرح مجلس شوریٰ کے انتخاب اور اس سے متعلق دیگر اہم معاملات کے بارے میں جو امور طے پائے ان میں بھی مجلس تنفیذیہ کے انتخاب کی مانند "امیر" کو غیر معمولی اختیارات دیئے گئے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے :

"۱۔ اس مجلس کے بیس ارکان ہوں گے۔
۲۔ دس ارکان کا انتخاب امیر کرے گا۔
۳۔ دس ارکان کا انتخاب مجلس عامہ کرے گی۔
۴۔ کورم سات کا ہو گا۔
۵۔ مجلس کا انتخاب سالانہ ہو گا۔
۶۔ یہ مجلس امیر کے حسب منشا جمع ہو کر جماعت کے کاروبار کے متعلق مشورہ دے گی۔"

مالیات کے ضمن میں یہ طے پایا کہ ہر رکن جمعیت ہر ماہ کم از کم چار آنے جمعیت کے خزانے میں داخل کرے گا۔ یاد رہے کہ اس دور کے چار آنے قدر و قیمت کے لحاظ سے کم و بیش آج کے ۱۰۰ روپوں کے مساوی تو ضرور ہوں گے.....

جمعیت کی مجلس عامہ اور سالانہ اجلاس عام کے بارے میں جو امور طے کئے گئے وہ

بھی یقیناً قارئین اور بالخصوص رفقائے تنظیم اسلامی کی دلچسپی کا موجب ہوں گے :

"۱۔ جماعت کا ہر رکن مجلس عامہ کا رکن ہو گا۔

۲۔ یہ جماعت سال میں ایک بار لاہور میں اپنا اجلاس عام کرے گی۔

۳۔ سالانہ اجلاس لاہور کے علاوہ اور شہروں میں بھی ہو سکتا ہے۔"

یہ دستور بعض اعتبارات سے تشنہ محسوس ہوتا ہے' بالخصوص یہ اہم مسئلہ کہ جماعت کے اندر اظہارِ رائے کے چینلز کون کون سے ہوں گے' مشاورت کا تفصیلی نظام کیا ہو گا اور اختلافِ رائے کا طریق کار اور Process کیا ہو گا۔ بحمد اللہ تنظیم اسلامی کے دستور العمل میں' جس کی تدوین میں اوقات اور صلاحیتوں کا اچھا خاصا اثاثہ صرف ہوا' ان تمام گوشوں کا عمدہ طریقے پر احاطہ کیا گیا ہے اور وہ امور جو جمعیت شبان المسلمین ہند کے دستور میں تشنہ نظر آتے ہیں ان کی تلافی کا مکمل سامان بھی فراہم ہو گیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ علامہ اقبال کی تجویز کردہ یہ جماعت اگر اپنے سفر کا باقاعدہ آغاز کر دیتی اور کچھ عرصہ منزل کی جانب اپنا سفر جاری رکھتی تو وہاں بھی بتدریج ان تشنہ گوشوں کی تلافی کا سامان ہو جاتا۔

☆ ☆ ☆

علامہ اقبال کی رہنمائی میں "جمعیت شبان المسلمین ہند" کے قیام کی تجویز کو تحریری شکل دینے اور اس کی تشکیل کے لئے بھاگ دوڑ کرنے والے حضرت علامہ کے نوجوان ساتھی خواجہ عبدالوحید نے تحریک شبان المسلمین کے تعارف پر مشتمل اپنے ایک مضمون میں جو اقبال اکیڈمی پاکستان کے مجلّہ "اقبال ریویو" کی جولائی ۶۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا' بصراحت لکھا ہے کہ "جماعت مجاہدین علی گڑھ" اور "جمعیت شبان المسلمین ہند" دونوں جماعتوں کے قیام کا اصل مقصد "اعلاء کلمتہ اللہ" تھا {۴}' اور یہ کہ دونوں جماعتوں کے

{۴} اس امر کی بھرپور تائید دونوں جماعتوں کی اساسی دستاویزات اور دستور العمل سے متعلق تفصیلات سے بھی ہوتی ہے جن کا قدرے تفصیلی ذکر سطور بالا میں کیا جا چکا ہے۔ تاہم حیرت ہوتی ہے کہ اس کھلی حقیقت کے ہوتے ہوئے بھی بعض لوگ مصر ہیں کہ ان جماعتوں کے قیام کا مقصد محض مسلمانان ہند کی سیاسی آزادی کا حصول تھا جو بالآخر مسلم لیگ کے ذریعے پورا ہو گیا'۔۔۔۔۔۔ اسی طرح بعض حضرات کا خیال ہے کہ ان دونوں جماعتوں کے قیام سے علامہ اقبال کا مقصود محض ایک "کلچرل انسٹی ٹیوٹ" قائم کرنا تھا'۔۔۔ ناظم

سرکردہ افراد کے ذہنوں میں مشترک امیر کے طور پر اسی شخص کا نام تھا جس کے انقلاب آفرین افکار نے ان کے دلوں میں احیاء اسلام کی جوت جگائی تھی، یعنی علامہ ڈاکٹر محمد اقبال۔ خواجہ عبدالوحید لکھتے ہیں :

"بیسویں صدی کے رُبعِ اول میں اسلامیان ہند نے بڑی بڑی عظیم الشان تحریکیں چلائیں جن کا تعلق براہ راست برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد کرنے سے تھا۔ تحریک خلافت کے بعد مسلمانانِ ہند پر یاس و قنوطیت کا عالم چھا گیا۔ اس کے بعد مختلف مقامات کے حساس مسلمانوں میں اعلاء کلمتہ اللہ کے لئے جذبۂ عمل بیدار ہوا۔ ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ مختلف طرح کے لوگوں میں احیائے اسلام کے لئے سوچ بچار شروع ہو گئی تھی۔ علی گڑھ میں ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب صدر شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی اور مشرقی پنجاب میں میر غلام بھیک نیرنگ جیسے لوگ اس موضوع پر سوچ بچار کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں لاہور کے چند نوجوان بھی اس طرف متوجہ ہوئے۔ ان سب لوگوں کے اس سوچ بچار کے لئے مرکزی شخصیت ایک ہی تھی، یعنی علامہ سر محمد اقبال" چنانچہ ان میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ ان سے زبانی یا تحریری طور پر تبادلہ خیالات کر رہا تھا۔"

☆ ☆ ☆

خواجہ عبدالوحید نے اپنے مذکورہ مضمون میں اپنی ذاتی ڈائری سے ۲۸ فروری ۳۵ء سے لے کر ۲/ ستمبر ۱۹۳۵ء تک کے عرصے میں پیش آنے والے وہ چیدہ چیدہ واقعات نقل کئے ہیں جو جمعیت شبان المسلمین ہند کی تاسیس و تشکیل اور اس ضمن میں درجہ بدرجہ ہونے والی پیش رفت سے متعلق ہیں۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب نے اپنی کتاب میں خواجہ صاحب کے مضمون میں شامل تمام تفصیلات درج کرنے کے علاوہ علامہ اقبال سے اپنی ان ملاقاتوں کا ذکر بھی کیا ہے جو انہوں نے اسی عرصے کے دوران ڈاکٹر سید ظفرالحسن

◄ سرگرداں ہے اسے کیا کیجئے! یہ طرز فکر صرف ان لوگوں کا ہو سکتا ہے جنہوں نے یا تو ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی کتاب کے محض سرسری اور جزوی مطالعے پر اکتفا کی ہے یا پھر جماعت 'امارت' بیعت اور اطاعتِ امیر کے تصورات سے انہیں اس درجے ذہنی بُعد ہے کہ ان سے بہرصورت اغماض برتنا ان کی ایک نفسیاتی ضرورت بن چکا ہے۔ واللہ اعلم!

صاحب کے خصوصی نمائندے کے طور پر حضرت علامہ سے کیں۔ زیر نظر مضمون میں ان تمام واقعات و تفصیلات کا من و عن بیان پیش نظر نہیں ہے' تاہم چیدہ چیدہ واقعات اور بعض اہم معاملات کا تذکرہ ضروری ہے۔

۲۸ فروری ۳۵ء کے حوالے سے اپنی ڈائری کے جو چند جملے خواجہ صاحب نے اپنے مضمون میں درج کئے ہیں ان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جمعیت شبان المسلمین ہند کا سارا نقشہ حضرت علامہ نے خود تجویز کیا تھا اور اسے انہی خطوط پر مرتب کیا تھا جن خطوط پر ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے جماعت مجاہدین علی گڑھ کو استوار کیا تھا۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں :

> • "کل رات صوفی صاحب کے ہاں (مراد ہیں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم) اس غرض سے مجلس مشاورت منعقد ہوئی کہ سر محمد اقبال" کے تجویز کردہ نظام شبان المسلمین پر غور کیا جائے۔ دراصل یہ سکیم جو ہمارے زیر غور ہے غلام بھیک نیرنگ اور ڈاکٹر سید ظفر الحسن کی تجویز کی ہوئی ہے' جس کا مقصد ہندوستان میں مسلمانوں کا عروج و اقبال ہے۔ افسوس ہے کہ ان دونوں کی طرف سے آئے ہوئے کاغذات ڈاکٹر صاحب کے پاس ہیں اور وہ بھوپال گئے ہوئے ہیں۔ اس لئے اس مسئلے پر صحیح طور پر غور نہیں ہو سکتا۔"

۵ / اپریل ۳۵ء کی ڈائری کے حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ علامہ کی تجویز کردہ سکیم کو تحریری صورت میں مرتب کرنے کا کام خواجہ عبدالوحید صاحب نے سرانجام دیا تھا۔ اور حضرت علامہ کی ہدایت پر انہوں نے اس ضمن میں ڈاکٹر سید ظفر الحسن اور میر غلام بھیک نیرنگ سے سلسلہ جنبانی کا آغاز بھی کیا۔ ڈائری ملاحظہ ہو :

> "۵ / اپریل ۱۹۳۵ء ۔ کل حسب الارشاد سر محمد اقبال ایک مضمون مجوزہ جمعیت شبان المسلمین تیار کیا اور دفتر جاتے ہوئے حضرت علامہ کو دکھایا۔ انہوں نے پسند فرمایا۔ دفتر میں مسٹر افضل بھٹی سے اس مضمون کی چار نقلیں کرالیں۔ اب ان پر لوگوں کے دستخط کرائے جائیں گے۔ پھر دستخط کرنے والوں کا اجلاس ہو گا جس میں جمعیت کا رسمی طور پر قیام اور امیر کا انتخاب ہو گا اور اس کے بعد قیام و انتخاب کا اعلان کیا جائے گا۔

جس زمانہ میں میرے احباب کی توجہ اس طرف ہوئی تھی ہم میں سے کوئی بھی اس حقیقت سے واقف نہ تھا۔ جب پہلی مرتبہ علامہ مرحوم سے اس بارے میں گفتگو ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ میر غلام بھیک نیرنگ اور ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب بھی ان خطوط پر سوچ رہے ہیں اور انہوں نے اپنے خیالات تحریر میں پیش بھی کئے ہیں۔ آپ لوگ ان سے خط و کتابت کر کے دونوں کی تجاویز حاصل کریں۔ چنانچہ میں نے ان دونوں بزرگوں سے خط و کتابت شروع کر دی.....“

☆ ☆ ☆

اپریل کے اواخر میں ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے علی گڑھ سے اپنے دو ہونہار شاگردوں کو بطور نمائندہ لاہور بھیجا تاکہ وہ علامہ اقبال اور خواجہ عبدالوحید صاحب سے مل کر جمعیت شبان المسلمین کی مجوزہ سکیم کے بارے میں تفصیلی طور پر تبادلہ خیال کریں۔ علی گڑھ سے آنے والے ان دو صاحبان میں ایک ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب تھے جن کے ذریعے جماعت مجاہدین علی گڑھ سے متعلق جملہ معلومات ہم تک پہنچی ہیں اور دوسرے ڈاکٹر ایم ایم احمد صاحب تھے۔ ڈاکٹر سید ظفر الحسن نے اپنے ان دونوں شاگردوں کو یہ ہدایت بھی کی تھی کہ وہ حضرت علامہ کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ دونوں جماعتوں کے مشترک امیر کے طور پر جماعت کی امارت کی ذمہ داری قبول کریں تاکہ سب متحد ہو کر ایک امیر کی قیادت میں اس مبارک جدوجہد کا آغاز کر سکیں۔ ان دونوں حضرات کی حضرت علامہ اور خواجہ عبدالوحید صاحب کے ساتھ باقاعدہ میٹنگ ۲۸/ اپریل ۳۵ء کو علامہ کے مکان (جاوید منزل، واقع میو روڈ، لاہور) پر ہوئی۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے علامہ کے ساتھ اپنی اس اہم ملاقات کا ذکر بایں الفاظ کیا ہے :

”۲۸/ اپریل ۳۵ء کو راقم الحروف (برہان احمد فاروقی) اور ایم ایم احمد صاحب علامہ اقبال کی خدمت میں ان کے مکان جاوید منزل (واقع میو روڈ لاہور) میں حاضر ہوئے۔ مغرب کا وقت ”جمعیت شبان المسلمین“ کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے مقرر ہوا تھا تاکہ خواجہ عبدالوحید صاحب کو بھی مع ان کے دوستوں کے بلایا جا سکے۔

جب ہم سب حضرت علامہ کے مکان پر جمع ہوئے تو ایک ایسی تنظیم کی احتیاج اور اس کے قیام کی شرائط پر حضرت علامہ نے گفتگو شروع کی.... حضرت علامہ نے فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کی کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اس کے روحانی پہلو کی تربیت بھی نہ ہو۔ میں نے عرض کیا کہ آپ اس کے لئے تیار ہوں تب ہی یہ پہلو ابتدا سے سامنے رکھا جا سکتا ہے کیونکہ مجھے یہ کہہ کر یہاں بھیجا گیا ہے کہ اگر آپ اس کے لئے تیار ہوں تو ابھی علی گڑھ جا کر ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب کو یہاں لا کر آپ کے دست مبارک پر بیعت کر کے آپ کی امارت میں جماعت کے قیام کا اعلان اخبارات میں کر کے کام شروع کر دیتے ہیں' مگر حضرت علامہ خاموش ہو گئے اور اگلے روز یعنی ۲۹/اپریل کو خواجہ عبدالوحید صاحب کے مکان پر میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں جمعیت شبان المسلمین کے دستور کے بارے میں جملہ امور طے کئے گئے۔"

☆ ☆ ☆

اس کے بعد اس معاملے میں کیا پیش رفت ہوئی' ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم نے اپنی اس کتاب میں اپنی جانب سے مزید کوئی تفصیل بیان نہیں کی' نہ ہی حضرت علامہ کے ساتھ اپنی ۲۸/اپریل ۳۵ء کی ملاقات پر کسی قسم کا کوئی تبصرہ کیا' تاہم انہوں نے تحریک شبان المسلمین کے بارے میں خواجہ عبدالوحید صاحب کے مضمون کے آخری حصہ کو جو ۲۱/اگست سے ۲۲/ستمبر ۳۵ء تک اور پھر ۱۴/مارچ ۱۹۳۶ء کی ڈائری سے ماخوذ یادداشتوں پر مشتمل ہے' مِن و عَن نقل کر دیا ہے۔ خواجہ صاحب کی ڈائری کے ان اوراق کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۱/اگست ۱۹۳۵ء کو جمعیت شبان المسلمین کی بنیاد باضابطہ طور پر رکھ دی گئی تھی۔ اس موقع پر تمام ارکان نے اطاعتِ امیر کا عہد کیا اور امارت کے لئے متفقہ طور پر علامہ اقبال کا نام تجویز کیا گیا۔ خواجہ صاحب نے اپنی ڈائری میں ان حضرات کے نام بھی درج کئے ہیں جو شریک اجلاس تھے۔ ڈائری کا متعلقہ حصہ ملاحظہ ہو!

"۲۱/اگست ۱۹۳۵ء: ہمارے ہاں مجوزہ جمعیت شبان المسلمین کے ہمدردوں کا جلسہ ہوا جس میں جمعیت کی بنیاد رکھ دی گئی' نیز ارکان نے تحریری طور پر اطاعت امیر کا عہد کیا اور جمعیت کی امارت کے لئے علامہ سر محمد اقبالؒ کا اسم گرامی تجویز ہوا۔ نیز

جنرل سیکرٹری کا کام ثاقب صاحب کے سپرد ہوا اور خزانچی بدر صاحب مقرر ہوئے۔

آج ہمارے ہاں کا اجلاس بہت کامیاب رہا، غیر معمولی رونق تھی، نذیر نیازی صاحب نے گفتگو کو بہت پر لطف بنا دیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبدالمجید صاحب، ثاقب صاحب، افضل صاحب، بدر صاحب، طارق صاحب، ابوالخیر صاحب، پی صاحب، خواجہ غلام دستگیر صاحب، ارمان صاحب بھی تھے۔"

۲۲/ اگست کی ڈائری میں کوئی واقعہ تو مذکور نہیں ہے، تاہم یہاں خواجہ صاحب نے حضرت علامہ کے بارے میں اپنا ایک تاثر درج کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ احیاءِ اسلام کی آرزو اور اس کے لئے فدائین کی ایک جماعت کی تشکیل کی خواہش حضرت علامہ ہی کے نہیں، خود ان کے اپنے دل میں بھی کس شدت کے ساتھ موجزن تھی۔ لکھتے ہیں :

"۲۲/ اگست ۱۹۳۵ء: علامہ سر محمد اقبالؒ کے دل میں اسلام کا جو درد موجود ہے اور اسلام کو دنیا میں اقبال اور سربلند دیکھنے کا جو جذبہ ان کے قلب میں موجزن ہے اس کے بروئے کار آنے کی شدید ضرورت ہے اور اس کی صورت یہی ہے کہ ان کے گرد فدائیوں کا ایک ایسا گروہ جمع کر دیا جائے جو صدق دل کے ساتھ اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دینے پر آمادہ ہو۔ اس صورت میں ایک طرف خود حضرت علامہ اقبال کے دل و دماغ میں ایک ایسی حرکت پیدا ہو گی جو قوم سے کام لے سکے گی اور دوسری طرف وہ جماعت آپ سے وابستہ ہو چکی ہو گی جس میں زبردست قوتِ عمل بروئے کار آئے گی۔ خدا کرے کہ میرا یہ خواب سچا ثابت ہو اور نوجوانانِ اسلام کثیر تعداد میں ایک فعال جماعت کی صورت میں منظم ہو جائیں۔"

یکم ستمبر کو جمعیت شبان المسلمین کے اجلاس میں رکنیت فارم مطبوعہ شکل میں حاضرین میں تقسیم کئے گئے۔ اس اجلاس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ جمعیت کی طرف سے ایک وفد حضرت علامہ سے ملاقات کر کے انہیں اب تک کی پیش رفت سے آگاہ کرے تاکہ اب اس کام کو جلد از جلد، حضرت علامہ کی قیادت اور رہنمائی میں بھرپور انداز میں آگے بڑھایا جا سکے۔ مطبوعہ فارم میں بھی امیر جماعت کے طور پر بصراحت حضرت علامہ ہی کا نام تجویز کے

انداز میں مذکور تھا۔ خواجہ صاحب کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں :

"یکم ستمبر ۱۹۳۵ء : آج جمعیت شبان المسلمین کا اجلاس میرے مکان پر ہوا اور رکنیت کے مطبوعہ فارم حاضرین میں تقسیم ہوئے۔ قرار پایا کہ کل ایک وفد حضرت علامہ کی خدمت میں پیش ہو کر اس جماعت کی طرف سے چند معروضات پیش کرے اور کوشش کی جائے کہ جلد از جلد کام شروع ہو جائے۔

۲/ ستمبر ۱۹۳۵ء : آج دفتر الاسلام کو جاتے ہوئے میں علامہ سر محمد اقبال سے ملا اور انہیں مطبوعہ فارم (رکنیت) دکھایا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ فارم ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب کو علی گڑھ بھیجا جائے۔

اس فارم کا مضمون حسب ذیل ہے :

۱ ۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج و اقبال کے حصول کے لئے جو جماعت قائم کی گئی ہے میں اس کا رکن بننے کے لئے تیار ہوں اور اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ امیر کی اطاعت قرآن و سنت کے مطابق بہرحال اور ہر وقت بلاچون و چرا کروں گا۔

۲ ۔ میں متمنی ہوں کہ اس جماعت کی امارت علامہ سر محمد اقبال مدّ ظلہ' کے دست مبارک میں ہو۔

نام پتہ و دستخط

اس کے بعد وسط مارچ ۳۶ء تک گویا اگلے قریباً چھ ماہ تک پیش آمدہ واقعات کے بارے میں خواجہ صاحب بھی بالکل خاموش ہیں۔ پھر ۱۴/ مارچ ۱۹۳۶ء کی ڈائری سے درج ذیل اقتباس انہوں نے اپنے مضمون میں شامل کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس چھ ماہ کے عرصے کے دوران نہ صرف یہ کہ اس باب میں مزید کوئی پیش رفت نہ ہو سکی بلکہ آرزوؤں اور امیدوں کی یہ خوشنما بیل بوجوہ پنپنے اور برگ و بار لانے کی بجائے ابتدائی مرحلے ہی میں مرجھا کر رہ گئی۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں :

"۱۴/ مارچ ۱۹۳۶ء : آج میرے مکان پر معتقدینِ اقبال کا اجتماع ہوا جس میں راجہ حسن اختر اور پروفیسر منیر الدین صاحب کے علاوہ جناب ثاقب صاحب' نبی صاحب' ابوالخیر صاحب' ڈاکٹر بھٹی صاحب بھی شریک ہوئے اور ظاہر ہوا کہ لوگ

اصل تجویز دربارہ جمعیت شبان المسلمین پر عمل پیرا ہونے کے لئے تیار نہیں۔ وہ سب محض اس بات کے حامی تھے کہ ایک دار المطالعہ قائم کیا جائے جہاں اقبال کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کی تعلیمات کی نشر و اشاعت ہوا کرے۔ چنانچہ اس پر اجلاس ختم ہو گیا۔

ایک بڑی ہی خوش آئند تحریک کا ایک المناک انجام ہم لوگوں کے کمزور ارادوں کا ثبوت پیش کرتا ہے۔"

☆ ☆ ☆

یوں ایک اصولی اسلامی جماعت کے قیام کی یہ نہایت وقیع اور قابل قدر کوشش تشکیل و تاسیسِ جماعت کے ابتدائی مراحل کامیابی کے ساتھ طے کرنے کے بعد میدانِ عمل میں باقاعدہ قدم رکھنے سے قبل ہی حسرتناک انجام سے دوچار ہو گئی۔ اس میں جہاں علامہ اقبال کے "معتقدین" کی کم ہمتی اور کم کوشی کو یقینی طور پر دخل تھا وہاں زیادہ قرینِ قیاس بات وہ ہے جو آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کے ڈائریکٹر چوہدری مظفر حسین صاحب نے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب کی زیر نظر کتاب کے پیش لفظ میں بیان کی ہے' یعنی یہ کہ علامہ کی اس کوشش کے باوصف کہ وہ اس منصوبے کو پردۂ خفا میں رکھنا چاہتے تھے' برطانوی حکومت کی طرف سے حضرت علامہ اور ان کی سرگرمیوں کی نگرانی پر مامور افراد کو چونکہ اس منصوبے کا علم ہو گیا تھا لہٰذا یہ منصوبہ ترک کرنا پڑا۔ چودھری صاحب لکھتے ہیں :

"ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے اس مقالہ میں اس امر پر روشنی نہیں ڈالی گئی کہ یہ منصوبہ یکایک کیوں ترک کر دیا گیا لیکن انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ اس طرح کے کاموں میں برطانوی استعمار کی طرف سے جو موانع پیدا کئے جا رہے تھے ان کے پیش نظر یہ منصوبہ بہت احتیاط اور رازداری کا تقاضا کرتا تھا' مگر علامہ اقبال کے وہ "فدائین" جو حکومت کی طرف سے "علامہ اقبال کی نگرانی پر مامور تھے" اس منصوبے سے واقف ہو گئے' اس لئے یہ منصوبہ ترک کر دینا پڑا۔ خواجہ عبدالوحید کی تحریر سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے "معتقدین اقبال" ہی

اس منصوبہ پر عمل پیرا ہونے کو تیار نہیں تھے۔"

بعض لوگوں نے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم کی اس روایت سے کہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن کی اس تجویز کے جواب میں کہ حضرت علامہ اس پوری تحریک کی قیادت سنبھالیں اور منصبِ امارت قبول فرمائیں حضرت علامہ نے خاموشی اختیار کی' یہ مفہوم اخذ کیا ہے کہ علامہ نے اس تجویز کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ لیکن مشہور عوامی مقولے "الخاموشی نیم رضا" کے مصداق تو حضرت علامہ کی خاموشی یقینی طور پر قبولیت کے مترادف قرار پاتی ہے۔ اس کی توثیق جناب بی اے ڈار کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے اپنی کتاب "The Letters and writings of Iqbal" کے صفحہ ۶ پر درج کی ہے کہ "علامہ نے امارت کے منصب کو جھجکتے ہوئے قبول کرلیا تھا"۔

رہے حضرت علامہ کے وہ الفاظ جو انہوں نے اپنے ۱۲/ جولائی ۳۲ء والے خط میں جماعت مجاہدین علی گڑھ کے منصوبے کی بھرپور تائید و توثیق کرنے اور اس کی تائید میں اپنی روحانی واردات کا ذکر کرنے کے بعد اپنے بارے میں اعترافاً تحریر فرمائے تھے' یعنی :

> "یہاں کے طبائع کی رو سے ایک ہی طریقہ مؤثر ہو سکتا ہے' لیکن میں اس کے لئے اپنے آپ کو موزوں نہیں پاتا' یا یوں کہئے اپنے میں اس قسم کی جرأت نہیں دیکھتا۔"

تو اولاً یہ الفاظ ان کی عالی ظرفی اور منکسر المزاجی کا مظہر ہیں' ثانیاً یہ تحریر ۳۲ء کی ہے' اور خود حضرت علامہ کا ۳۵ء کا طرز عمل لامحالہ اس کا "ناسخ" قرار پاتا ہے۔

بہرکیف' اس منصوبے کی ناکامی کا سبب خواہ کوئی بھی ہو' یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے' اور ہماری اصل دلچسپی بھی اسی معاملے سے ہے کہ علامہ اقبال اپنی عمر کے آخری حصے میں' ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء کے درمیان' بیعت اور امارت کی بنیاد پر فداکاروں پر مشتمل ایک ایسی جماعت کی تشکیل کی بھرپور کوشش کرتے رہے جس کے قیام کا اصل مقصد "اعلاءِ کلمتہ اللہ" یعنی دین حق کے غلبے اور اقامت کے لئے انقلابی انداز میں جدوجہد کرنا تھا۔ اس جماعت کے نقشہ کار اور دستور العمل میں جو خود حضرت علامہ کی رہنمائی میں اور ان ہی کے

مشوروں سے مرتب ہوا، ایک اصولی اسلامی جماعت کا مکمل خاکہ موجود تھا، جس میں "اطاعتِ امیر" کے اصول کو مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ بالکل انہی اصولوں پر اور انہی اہداف کے لئے تنظیم اسلامی کا قیام عمل میں آیا ہے جسے بحمد اللہ اپنے سفر کا آغاز کئے اب بیس برس سے زائد ہو چکے ہیں۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ حضرت علامہ کے اس خواب کی بتمام و کمال تعبیر صرف اور صرف محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی پیہم کاوشوں کے نتیجے میں تنظیم اسلامی کی صورت میں سامنے آئی ہے، جس کی حسرت دل میں لئے حضرت علامہ اس دنیا سے تشریف لے گئے تھے اور ان کی وفات کے ساتھ ہی ان کی حیات کا یہ نہایت اہم باب بھی پردۂ خفا میں چلا گیا تھا۔

حیات اقبال کا یہ گمشدہ ورق اب ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم و مغفور کی زیر نظر کتاب کے ذریعے منظر عام پر آیا ہے جس کی اشاعت پر ہم آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کے اربابِ کار بھی ممنون احسان ہیں جن کے ذریعے تاریخ کی اس گرانقدر امانت کی حفاظت کا سامان ہوا۔ فجزاھم اللّٰہ احسن الجزاء ○○

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصّہ پارینہ را!

پاکستانی سیاست کا
پہلا عوامی و ہنگامی دَور

—— (۳) ——

سیاسی افراتفری کا اندوہناک نتیجہ
مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی

امیر تنظیم اسلامی اور داعی تحریکِ خلافت پاکستان
ڈاکٹر اِسرار احمد

کے سیاسی تجزیے

جو ۶۷ تا ۱۹۷۰ء کے دوران ماہنامہ "میثاق" کے ادارتی صفحات میں شائع ہوئے

باب ہفتم

"دیکھ کعبے میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ!"

اگست ۱۹۷۰ء

پاکستان کی موجودہ حکومت کا یہ کارنامہ بلاشبہ نہایت قابلِ داد ہے کہ اس نے ڈیڑھ سال سے بھی کم مدت میں ملک کو سخت ہیجان انگیز اور ہنگامہ خیز "انقلابی" فضا سے نکال کر نہایت پُرسکون "سیاسی" جدّوجہد کی راہ پر ڈال دیا ہے ---- واقعہ یہ ہے کہ اِس وقت پاکستان کے طول و عرض میں "انتخابی" سرگرمی جس زور شور کے ساتھ لیکن جس ہموار طریقے پر جاری ہے اس کے پیش نظر یہ باور کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ صرف سال سوا سال قبل یہاں "گھیراؤ" اور "جلاؤ" کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اور مظاہروں، جلوسوں اور ہڑتالوں سے شہری زندگی تقریباً معطل ہو گئی تھی ---- اور نہ صرف باہمی تصادم اور سر پھٹول بلکہ باقاعدہ کشت و خون اور سِوِل وار کا خطرہ درپیش تھا!

صدر یحییٰ نے اپنی ۲۸/ جولائی کی نشری تقریر میں اگر اس سلسلے میں کسی کریڈٹ کا دعویٰ کیا ہے تو یہ یقیناً ان کا حق ہے ---- جس قسم کے ناگفتہ بہ اور مخدوش حالات میں انہوں نے حکومت کی ذمہ داری سنبھالی تھی ان کا بیان تحصیلِ حاصل ہے، الجھی ہوئی صورت حال کی یہ گتھی کسی نہایت پختہ کار، معاملہ فہم اور سلجھے ہوئے سیاست دان کے ناخنِ تدبیر ہی سے سلجھ سکتی تھی۔ اس لئے کہ اس قسم کے حالات میں ذرا سی بے احتیاطی نہایت مضر نتائج پیدا کر سکتی ہے اور جہاں ضرورت سے زیادہ نرمی سے لوگوں کی جرأتیں بڑھ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے وہاں ضرورت سے زیادہ سختی بھی جلتی پر تیل کا کام کر سکتی ہے ---- گویا "سردی گرمی، نرمی سختی" کا ایک نہایت معتدل سا امتزاج ہی ایسے مواقع پر کامیاب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ماننا پڑتا ہے کہ صدر یحییٰ اس "بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز" راستے پر چلنے میں کامیاب رہے ---- ابتدا میں انہوں نے قدرے نرمی سے

کام لیا جسے' جیسا کہ خود انہوں نے فرمایا' کچھ لوگوں نے کمزوری پر محمول کیا' لیکن انجامِ کار ان کی یہ پالیسی صحیح ثابت ہوئی اور اس طرح واقعتاً لوگوں کے دلوں کی بھڑاس نکل گئی۔ چنانچہ بعد میں انہوں نے تدریج کے ساتھ باگیں کھینچنی شروع کر دیں تا آنکہ آج اُدھر مولانا بھاشانی کے صاحبزادے "اندر" ہیں اور مسیح الرحمان صاحب بھی معافی مانگ کر ہی "باہر" آسکے ہیں' اور اِدھر مسٹر بھٹو کی شوخیاں قصۂ ماضی بن چکی ہیں اور اب وہ ہر بات ناپ تول کر کر رہے ہیں ----- اور صورت یہ ہے کہ انتخابی جلسے اطمینان اور سکون کے ساتھ ہو رہے ہیں اور کہیں گڑ بڑ نہیں ہو پاتی اور بڑے بڑے جلوس نکل رہے ہیں لیکن ہنگامہ نہیں ہوتا اور بڑے بڑے جغادری قسم کے "انقلابی" رہنما بھی دوٹوں اور سیٹوں کے "اہتمامِ خشک و تر" کے شدید "دردِ سر" میں مبتلا کاسۂ گدائی لئے مارے مارے پھر رہے ہیں۔

اِن حالات میں صدر یحییٰ کا تازہ انتباہ بروقت بھی ہے اور نہایت معنی خیز بھی۔ اس لئے کہ اب حالات جس مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں اس میں تھوڑی سی نرمی سے بھی سارے کئے کرائے پر پانی پھر سکتا ہے اور اب نہ صرف یہ کہ اگر حکومت امن و سکون کے قیام اور نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کے لئے سختی کرے تو وہ بالکل حق بجانب ہوگی بلکہ اگر صورت اس کے برعکس ہو اور حکومت کی نرمی کی وجہ سے صورت حال دوبارہ بگڑ جائے تو خود حکومت پر یہ الزام آئے گا کہ وہ اقتدار کی منتقلی کو معرضِ التوا میں رکھنا چاہتی ہے۔

اور یہ وہ الزام ہے جس سے موجودہ حکومت کم از کم تاحال بالکل بری ہے ----- اس لئے کہ اگرچہ نیتوں اور ارادوں کا جاننے والا تو اللہ ہی ہے تاہم اِس وقت تک صدر یحییٰ اور ان کی حکومت کے بارے میں کسی انتہائی بدگمان مزاج انسان کے لئے بھی یہ کہنا کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ اقتدار کو عوام کے منتخب نمائندوں کی طرف منتقل کرنے کے معاملے میں نیک نیت نہیں ہیں۔ انہوں نے اس معاملے میں جس پختہ عزم کے ساتھ مسلسل اور بروقت اقدامات کئے ہیں اس سے تاحال ان کی پوزیشن شک و شبہ سے بالکل بالا رہی ہے۔ اور اب اسی پوزیشن کا تقاضا ہے کہ ایک طرف تو وہ انتخابات کے لئے سازگار فضا برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں اور اس معاملے میں کسی نرمی کو ہرگز راہ نہ دیں بلکہ اگر ضرورت ہو تو انتخابات کے بالکل قریب ملک پر نیم فوجی و نیم سول حکومت کی بجائے خالص فوجی نظم قائم کر دیں (اس سلسلے میں ہمارے نزدیک یہ مطالبہ بھی بالکل صحیح ہے کہ

انتخابات سے دو ماہ قبل کم از کم صدارتی کابینہ کو توسبکدوش کر ہی دیا جائے)----اور دوسری طرف انتخابات کے التوا کے کسی مطالبے پر کان نہ دھریں بلکہ ووٹروں کو ہر امکانی سہولت مہیا کرنے پر خواہ کتنا ہی خرچ آجائے انتخابات مقررہ تاریخ پر ضرور منعقد کرائیں، تاکہ اس شبہ کی گنجائش پیدا نہ ہو سکے کہ موجودہ حکومت خود زیادہ دیر تک برسر اقتدار رہنا چاہتی ہے!

اِس مؤخر الذکر معاملے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم ایک غریب قوم ہیں اور انتخابی بخار کی جس کیفیت میں ہم اس وقت مِن حیث القوم مبتلا ہیں اس کو طول دینے کی "عیّاشی" کے ہم کسی طرح متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس وقت نہ صرف یہ کہ پوری قوم کی توجّہ انتخابات پر مرتکز ہو گئی ہے بلکہ ایک غریب قوم کے روپے پیسے کی حقیر پونجی اور صلاحیتوں، قوتوں اور اوقات کے سرمائے کا بڑا حصہ اس مد میں صرف ہو رہا ہے۔ چنانچہ اب یہ مرحلہ جس قدر جلد طے ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے اور اس کو طول دینا کسی طرح صحیح نہیں۔ اس لئے کہ :

ع "اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا!"

یہ بات محتاجِ بیان نہیں کہ "اقتدار کی منتقلی" کی ذمہ داری کا بوجھ جتنا جتنا موجودہ حکومت کے کندھوں سے اترتا جا رہا ہے اتنا ہی سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے کندھوں پر پڑتا چلا جا رہا ہے----اور جس قدر وہ بریٔ الذمہ ہوتی جا رہی ہے اسی قدر یہ "ذمّہ دار" بنتے چلے جا رہے ہیں ----تاآنکہ اگر انتخابات بروقت منعقد ہو گئے اور بظاہر احوال اب یہ یقینی ہی سا نظر آتا ہے اور پھر بھی اس ملک کے پیچیدہ مسائل حل نہ ہوئے اور معاملات کی گتھی نہ سلجھی تو مستقبل کا مؤرخ مجبور ہو گا کہ اس کی ذمہ داری سے موجودہ فوجی حکومت کو بالکل بری قرار دے اور سارا الزام سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں پر عائد کرے----گویا آئندہ چند ماہ ہمارے سیاسی رہنماؤں کے فہم و فراست، تدبّر و حکمت، قربانی و ایثار اور سب سے بڑھ کر حبِّ وطن اور حبِّ قوم کے لئے کھلا چیلنج بن کر آ رہے ہیں اور بزبانِ حال مبارزت خواہ ہیں کہ :

ع "پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!"

پاکستانی سیاست کا جو دور اواخر ۱۹۶۸ء سے شروع ہوا تھا اس میں اول اول انقلابیت کا دَوْر دورہ رہا اور اس کی ایسی طوفانی آندھی آئی کہ باقی ہر چیز نگاہ سے اوجھل ہو گئی۔ اس کا زور کم ہوا اور فضا قدرے صاف ہوئی تو اسلام اور سوشلزم کی کاغذی اور ہوائی جنگ شروع ہو گئی اور کچھ عرصے کے لئے تو ایسا سماں بندھا کہ گویا ایک طرف "نظریۂ پاکستان" ہے جو خالص اور بے مَیل اسلام ہے اور دوسری طرف سوشلزم ہے جو بے شک و بلاریب کفر ہے ---- اور جنگ بس صرف ان دو کے مابین ہے' بیچ کی راہ سرے سے کوئی ہے ہی نہیں! ---- ادھر کچھ عرصے سے یہ مصنوعی شور اشوری بھی ختم ہو چکی ہے۔ چنانچہ ہوائی باتوں کے بجائے ٹھوس معاملات پر گفتگو ہونے لگی ہے اور "رومانویت" پر حقیقت پسندی غالب آنے لگی ہے۔ نتیجتاً ایک طرف دولتانہ اور فضل القادر گلے مل گئے ہیں اور بھٹو اور قاضی فضل اللہ میں بھی "معاملے" کی بات چیت ہوئی ہے' چاہے بیل منڈھے نہ چڑھ سکی ہو ----- اور دوسری طرف "انتہاپسندی" کی مذمت ہونے لگی ہے اور باقاعدہ پرچار شروع ہو گیا ہے کہ ملک و ملت کی نجات "بیچ کی راہ" اختیار کرنے میں ہے۔

اس سلسلے میں بعض نہایت "عریاں حقائق" بھی بہت دلچسپ انداز میں پیش کئے جانے لگے ہیں' مثلاً یہ کہ :

"پاکستان 'غیر صالح' لوگوں ہی نے قائم کیا تھا اور وہی اسے قائم رکھ سکتے ہیں...."

یا یہ کہ :

"تحریک پاکستان صرف 'لبرل اسلام' کی علمبردار تھی' نہ کہ رجعت پسند مولویانہ اسلام کی ......!" وغیرہ وغیرہ

ان باتوں پر اس اعتبار سے تو اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ "عریاں نگاری" ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ یہ "حقیقت نگاری" نہیں۔ سچ ہے :

"نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں
فقیہِ مصلحت بیں سے وہ رندِ بادہ خوار اچھا!"

ادھر ہمارے 'فقہائے مصلحت بیں' اور 'حکمائے حکمتِ عملی' کا حال یہ ہے کہ نہ صرف یہ

کہ اپنے پورے ماضی سے دستبردار اور سابقہ ہر موقف سے منحرف ہو گئے ہیں بلکہ اپنی ساری ذہانت اس پر صَرف کر رہے ہیں کہ حقائق کو توڑ مروڑ کر اور تاریخ کو مسخ کر کے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کر دکھایا جائے۔

"جماعت اسلامی نے کبھی تحریک پاکستان کی مخالفت نہیں کی!" ایسے دروغِ مصلحت آمیز کا سلسلہ تو عرصۂ دراز سے چل ہی رہا تھا' اب ایک قدم آگے بڑھا کر قیام پاکستان کے کریڈٹ میں بھی حصہ داری کا دعویٰ شروع ہو گیا ہے اور اس سلسلے میں جماعت کی سول سروس کے اساتین ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے ایک نسبتاً سادہ لوح بزرگ تو کچھ عرصہ قبل ایک جلسۂ عام میں یہ تک کہہ بیٹھے کہ :

"پاکستان کے قیام میں اکیلے مولانا مودودی کا حصہ باقی تمام لوگوں کے مجموعی حصے سے بھی زیادہ ہے....!"

---- جس پر پرائے تو خیر پرائے ہی ہوتے ہیں اپنوں (جیسے ہفت روزہ "زندگی" لاہور) کو بھی چیخ اٹھنا پڑا کہ :

"اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ!"

ہمارا اسی وقت یہ خیال تھا کہ یہ بات ان کی "طبع زاد" نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ حال ہی میں بات واضح ہو گئی اور مولانا مودودی نے بہ نفس نفیس ایک طرف یہ ارشاد فرما کر کہ : "جماعت اسلامی ہندوستان کی مسلمان قوم کے دفاع کے حصارِ ثانوی کے طور پر قائم کی گئی تھی!" ----- قطع نظر اس سے کہ یہ صحیح ہے یا غلط' کم از کم اپنی طرف سے تو اپنی "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش حصہ سوم" اور "مسئلہ قومیت" ایسی تالیفات سے اعلانِ براءت کر دیا ----- اور دوسری طرف یہ اعلان کر کے کہ : "ہم نہ مَردوں کو داڑھی رکھنے پر مجبور کریں گے نہ عورتوں کو برقع پہننے پر!" نہ صرف یہ کہ اپنی مایۂ افتخار تصنیف "پردہ" سے رجوع کر لیا بلکہ اپنی مبیّنہ "راسخ العقیدگی" سے تائب ہو کر "لبرل اسلام" کی بارگاہ میں سجدۂ سہو بھی ادا کر دیا۔

"دیکھ کعبے میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ
بتکدے میں برہمن کی پختہ زنّاری بھی دیکھ!"

رہا یہ سوال کہ آیا اس تمام ہیر پھیر سے کچھ حاصل بھی ہو سکے گا یا نہیں؟----تو ظاہر ہے کہ جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے وہ تو بہر حال اتنی بڑی بڑی قیمتیں کسی بڑی توقع ہی پر ادا کر رہی ہے----اور یقیناً کوئی بڑی ہی امید ہے {۱} جس کی بنا پر اپنے پورے دین و مذہب کو "اِک قصۂ ماضی" بنایا جا رہا ہے----لیکن ہمیں یقین ہے کہ قوم کے بارے میں یہ گمان کہ شاید یہ بھی ع "ہنس کے وہ بولی کہ پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو!" {۲} والا معاملہ کرلے گی 'نری خوش فہمی ہے----یہ دنیا بڑی "حقیقت پسند" واقع ہوئی ہے اور ایسی سطحی باتوں سے یہاں کوئی دھوکا نہیں کھاتا----خصوصاً جو خود اپنے "ماضی" ہی سے رشتہ توڑلیں ان سے کون اپنا "حال" وابستہ کرنا پسند کرتا ہے۔ ان کا انجام تو یہی ہوتا ہے کہ 'جیسا کہ کبھی ہم نے پہلے بھی عرض کیا تھا' یہ بے لنگر کی کشتیوں کے مانند لہروں کے رحم و کرم پر ادھر ادھر بھٹکتے رہیں اور

"ہم تو فانی جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا!"

کی جیتی جاگتی تصویر----اور خلقِ خدا کے لئے عبرت کا سامان بن جائیں!

{۱} اس فریب خوردگی پر بھی "اسلام پسند" حلقے کے سب سے زیادہ کثیر الاشاعت ہفت روزہ جریدے "زندگی" نے اپنی ایک حالیہ اشاعت میں تحریر کیا ہے کہ : "........ لیکن گزشتہ کچھ عرصے سے انتخابی مہم کے دوران جماعت کے مختلف اکابرین نے جس طرح کے مبالغہ آمیز دعوے شروع کئے ہیں ان سے ہر صاحب نظر کو صدمہ پہنچا ہے۔ اس کے رہنماؤں کی طرف سے کبھی تو عوام کو مژدہ سنایا جاتا ہے کہ بلوچستان میں ہماری حکومت قائم ہو جائے گی اور کبھی یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ فلاں علاقے پر ہم قبضہ کرلیں گے ...... ہمیں حیرت ہے کہ ایک ایسی سیاسی جماعت جس کی بنیادی حیثیت دینی ہو 'اس کے ذمہ دار ارکان اس قدر غیر ذمہ دارانہ اندازے لگا کر خود کو خوش فہمیوں میں مبتلا کر کے اور عوام کو اپنی کامیابیوں کی لوریاں سنا کر آخر کون سی شے حاصل کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں . . ."

{۲} ؎ "میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو!"
ہنس کے وہ بولی کہ "پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو!" اکبر

باب ہشتم

پاکستان کی مذہبی سیاست کا نیا ہدف

"برسراقتدار طبقہ" کی بجائے "سوشلزم"

اکتوبر ۱۹۷۰ء

پاکستان کے سیاسی حالات نے اواخر ۱۹۶۸ء سے جو پلٹا کھانا شروع کیا تھا اس کی تیزی اور تندی کو تو اگرچہ سابق صدر ایوب اور حالیہ صدر یحییٰ کی حکمت عملی نے بہت حد تک روک دیا' تاہم وہ تبدیلی اندر ہی اندر دھیمی چال اور مدھم آواز کے ساتھ مسلسل جاری ہے اور اس کے اثرات صرف سیاسی میدان ہی تک محدود نہیں بلکہ ہماری اجتماعی زندگی کا ہر گوشہ اس سے تدریجاً متاثر ہو رہا ہے' حتیٰ کہ صرف دو پونے دو سال میں حالات اس قدر بدل چکے ہیں کہ پہلی بہت سی باتیں بالکل بھولی بسری یادیں معلوم ہوتی ہیں ----- اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان دو سالوں میں ہم کم از کم بیس سال کی مسافت قطع کر آئے ہیں۔

دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر ----- صرف "مذہبی سیاست" کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اواخر ۱۹۶۸ء سے ماقبل اور مابعد کے حالات میں زمین آسمان کا فرق واقع ہو چکا ہے۔ اور اس کے مقدمات و مبادی اور صغریٰ کبریٰ سمیت ساری منطق تبدیل ہو گئی ہے۔

پاکستان کے پہلے اکیس سالوں کے دوران میں ہماری مذہبی سیاست میں کامل اتحاد اور اتفاق کا سماں بندھا رہا اور مولانا مودودی' مولانا تھانوی یہاں تک کہ مفتی محمود اور مولانا ہزاروی (غور فرمایئے کہ موجودہ حالات کے پیش نظر یہ کس قدر عجیب نظر آتا ہے کہ کبھی کسی مرحلے پر مولانا مودودی اور مولانا ہزاروی بھی ایک ہی کشتی میں سوار رہے ہیں اور دونوں کی حکمت عملی ایک ہی رہی ہے!) ----- ایک ہی راگ الاپتے اور ایک ہی منطق کے چپوؤں سے مذہبی سیاست کی ناؤ کھیتے رہے۔

اس منطق کا صغریٰ کبریٰ یہ تھا کہ ----(i) پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے----اور (ii) پاکستان کے عوام کی ایک عظیم اکثریت (نو سو ننانوے فی ہزار کی حد تک!) اسلام ہی کی فدائی اور شیدائی ہے اور اسلامی قانون و دستور ہی کا نفاذ چاہتی ہے----(iii) صرف ایک "برسراقتدار طبقہ" ہے جو قوم کے اس ارادے کی راہ میں مزاحم ہے۔ اور ملک کو دستوری اعتبار سے لادینیت اور تہذیبی و اخلاقی اعتبار سے بے حیائی اور اباحیت پرستی کی راہ پر چلانا چاہتا ہے (iv) لہٰذا ساری اجتماعی جدوجہد کا رخ ان "اربابِ اقتدار" اور اس "برسراقتدار طبقے" کے خلاف ہونا چاہئے۔ اور نہ تو قوم کو ان سے بدظن کرنے کی کوشش میں کوئی کمی رہنے دینی چاہئے اور نہ ہی ان کے خلاف بے چینی اور بے اطمینانی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے سے چُوکنا چاہئے۔

چنانچہ ان پورے اکیس سالوں کے دوران ہماری تمام مذہبی قوتیں' چاہے وہ جماعتیں تھیں یا جمعیتیں' ایک ہی ہدف پر حملے کرتی رہیں اور تحریر و تقریر کا سارا گولہ بارود ایک ہی نشانے پر صرف ہوتا رہا---- یہ دوسری بات تھی کہ قلعہ تھا خالص ہوائی۔ اس لئے کہ نہ تو کبھی "اربابِ اقتدار" اور "برسرِاقتدار طبقہ" کی واضح تعریف کی جا سکی اور نہ ہی اس کا حدود اربعہ متعین کیا جا سکا -----

عوام کے بارے میں چونکہ متذکرہ بالا صغریٰ کبریٰ کی رو سے یہ بات طے شدہ تھی کہ وہ تو اسلام کے فدائی اور شیدائی ہیں ہی لہٰذا ان کے ذہن و فکر کی تطہیر اور ان کی سیرت و کردار کی تعمیر کا سوال منطقی طور پر خارج از بحث رہا۔ اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ ان کی طرف سے خطاب کا رخ بالکل پھر گیا۔ گویا ان سے تو کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں' کہنا تو جو بھی کچھ تھا وہ ان کے انگوٹھوں' دستخطوں اور قراردادوں کے بل پر "اربابِ اقتدار" سے تھا!

اس سیاست کا عظیم ترین شاہکار ۱۹۵۳ء کی "انٹی قادیانی موومنٹ" تھی جو شروع تو اگرچہ مجلس احرار اسلام اور جمعیت علمائے ہند کے باقیاتُ الصالحات نے کی تھی لیکن جس میں بعد میں اضطراراً جماعت اسلامی کو بھی اپنے پورے لاؤ لشکر سمیت شریک ہونا پڑا----اس موومنٹ کا نقد نتیجہ (NET RESULT) یہ نکلا کہ "اربابِ اقتدار" کے طبقے سے نسبتاً مخلص اور دیندار عناصر کو دیس نکالا مل گیا اور ملکی سیاست کی باگ ڈور زیادہ شاطر اور عیّار لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی اور پھر وہ افراتفری مچی جس کے نتیجے میں بالآخر فوجی حکومت قائم ہو کر رہی۔

دورِ ایوبی کے اواخر میں مذہبی سیاست نے پھر طاقت پکڑنی شروع کی اور اس بار اس نے دو

کامیاب چھاپے مارے۔ ایک اوائل ۱۹۶۷ء میں عید الفطر کے موقع پر اور دوسرے اواخر ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر فضل الرحمان کے خلاف ایجی ٹیشن برپا کر کے۔ ان دونوں مواقع پر بھی ملک کے تمام مذہبی عناصر بالکل متحد تھے اور بالکل ایسا سماں بندھ گیا تھا کہ ایک طرف حکومت اور برسرِ اقتدار طبقہ ہے دوسری طرف تمام علماء اور "رجالِ دین"۔ گویا یہ پاکستان کی مذہبی سیاست کی متذکرہ بالا منطقی کا نقطۂ عروج تھا---!!

لیکن افسوس کہ مذہبی سیاست کے اس عروج کو ع "خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بُود!" کے مصداق نہایت مختصر عمر ملی اور اواخر ۱۹۶۸ء سے ملکی سیاست ایک بالکل ہی نیا موڑ مڑ گئی۔

اس نئے موڑ کے یوں تو متعدد پہلو ہیں لیکن مذہبی سیاست جس پہلو سے سب سے زیادہ متأثر ہوئی وہ یہ ہے کہ چونکہ ایک طرف سیاسی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور دوسری طرف موجودہ فوجی حکومت نے کسی مستقل حکومت کی شکل اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی اور کم از کم تاحال اس نے ایک خالص عبوری اور Care Taker قسم کی حکومت کی صورت اختیار کر رکھی ہے، لہٰذا "اربابِ اقتدار" اور "برسر اقتدار طبقہ" ایسی اصطلاحات بے معنی ہو کر رہ گئیں اور اس طرح گویا وہ "ہوائی قلعہ" فضا میں تحلیل ہو کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا جس پر تمام مذہبی جماعتیں متحد اور متفق ہو کر حملے کیا کرتی تھیں-----

نتیجتاً ایک جانب وہ اتحاد و اتفاق پارہ پارہ ہو گیا جس کی بنیاد حُبِّ علیؓ کی مثبت اساس کے بجائے بغضِ معاویہؓ کی منفی بنیاد پر قائم تھی----چنانچہ دو سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور مذہبی جماعتیں یعنی جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئیں۔ اور دوسری طرف تصادم کا میدان بدل گیا---اور مقابلہ "رجالِ دین" اور "اربابِ اقتدار" کے مابین نہ رہا بلکہ اس نے عوامی سطح پر مختلف جماعتوں اور گروہوں کے مابین تصادم کی صورت اختیار کر لی، جس میں اصل جتھہ بندی دائیں اور بائیں بازو کے رجحانات کے تحت ہو رہی ہے اور اصل وزن انہی دو پلڑوں میں ہے اور مذہبی جماعتیں پاسنگ کی حیثیت سے ان دونوں اطراف میں بلاواسطہ یا بالواسطہ وزن ڈالنے پر مجبور ہو رہی ہیں!

خالص نظریاتی اعتبار سے تو پاکستانی سیاست کے موجودہ عبوری دَور کو جلد ہی ختم ہو جانا چاہئے اور زیادہ سے زیادہ آئندہ سال کے وسط تک انتخابات اور دستور سازی وغیرہ کے تمام مراحل طے ہو کر عوام کی نمائندہ حکومت کو قائم ہو جانا چاہئے ----- لیکن عملاً جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ متذکرہ بالا مراحل میں سے ہر مرحلہ نہایت کٹھن ہے اور دستور سازی کی گھاٹی تو تقریباً ناقابلِ عبور ہی ہے ----- بنابریں موجودہ عبوری دور مستقل نہیں تو کم از کم "عارضی مستقل" ضرور ہے ' ----- اور چاہے کسی کو پسند ہو یا ناپسند جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ ایک خاصی طویل مدت تک پاکستان میں عوامی کش مکش ہی کا سلسلہ چلتا رہے گا اور "چارو ناچار" فوج ہی کو پاکستان کی سِوِل ایڈ منسٹریشن کی نگرانی بھی کرنی ہوگی۔ گویا "بر سر اقتدار طبقہ" کا تصور اب ایک طویل عرصے تک مفقود رہے گا اور مذہبی جماعتوں کے اتحاد و اتفاق کی یہ منفی اساس دوبارہ وجود میں نہ آسکے گی!

تاہم کارکنوں کے لہو کو گرم رکھنا ایک ناگزیر جماعتی ضرورت ہے اور اس کے لئے ایک ایسا ہدف بھی لازم ہے جس پر کارکن مسلسل جھپٹ کر پلٹتے اور پلٹ کر جھپٹتے رہیں۔ چنانچہ اب کی بار ایک جمعیت علمائے اسلام کو چھوڑ کر بقیہ تمام مذہبی جماعتوں نے اپنی مسلسل چاند ماری کے لئے "سوشلزم" کا ہدف منتخب کیا ہے اور تمام مذہبی جماعتوں کے شعلہ بیان مقررین اپنا پورا زورِ خطابت اسی ایک محاذ پر صرف کر رہے ہیں ' اور اگرچہ مختلف مذہبی جماعتوں کی مختلف سیاسی جماعتوں سے علانیہ یا درپردہ ساز باز کی بنا پر یہ آپس میں ہرگز متحد نہیں بلکہ اندر ہی اندر ایک دوسرے کی کاٹ میں مصروف ہیں ' تاہم کم از کم ظاہری اعتبار سے ان سب کا مشترک ہدف "سوشلزم" ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ "بر سر اقتدار طبقہ" کی طرح یہ تازہ ہدف بھی ہے خالص ہوائی ' اس لئے کہ ذرا تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ملک میں سوشلزم کے علمبردار ہیں کون لوگ؟ جماعت اسلامی اور پی ڈی پی تو ہوئیں اصلی اور ٹھیٹھ اسلام پسند ' تینوں لیگیں بھی اور چاہے جو کچھ بھی ہوں سوشلسٹ بہر حال نہیں ' رہے مسٹر بھٹو تو خود وہ اگرچہ "اسلامی سوشلزم" کا راگ الاپتے ہیں لیکن ان کے تمام سیاسی مخالفین سب سے زیادہ زور اسی بات پر دیتے ہیں کہ وہ سوشلسٹ ہرگز نہیں ہیں بلکہ یا تو سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں یا صرف ایک فاشسٹ نیشنلسٹ -----

لے دے کے دو نیپیس (NAPS) رہ جاتی ہیں' جنہیں سوشلسٹ کہا جا سکتا ہے۔ تو اول تو ان کا حلقہ اثر ہے ہی کتنا کہ اس قدر شور و ہنگامہ اٹھانے کی ضرورت پڑ گئی' پھر ان میں سے بھی ولی خاں گروپ بنیادی طور پر نیشنلسٹ ہے نہ کہ سوشلسٹ۔

ہاں ایک حقیقت ایسی ہے جسے مانے بغیر چارہ نہیں اور وہ یہ کہ اس ملک کے پڑھے لکھے طبقے ----اور خاص طور پر ان میں سے بھی ذہین تر عنصر میں سوشلسٹ خیالات قابل لحاظ حد تک موجود ہیں اور نوجوان نسل کا خاصا قابل لحاظ حصہ ذہنی اور فکری طور پر اس رو میں بہہ گیا ہے----اور ان دونوں طبقات میں ایک اچھی بھلی تعداد ایسے مخلص انقلابی کارکنوں کی بھی موجود ہے جو اپنے پیش نظر انقلاب کے لئے کبھی ایک اور کبھی دوسرے سیاسی گروہ میں شامل ہو کر کام کرتے رہتے ہیں اور ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اگرچہ تعداد کے اعتبار سے یہ لوگ اس ملک میں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تاہم اپنے جوش اور جذبۂ کار اور مخصوص انقلابی تکنیک کے اعتبار سے یقیناً قابلِ لحاظ ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں بھی دو باتیں سوچنے کی ہیں :

ایک یہ کہ یہ لوگ آخر آئے کہاں سے ہیں' ظاہر ہے کہ نہ روس سے درآمد ہوئے ہیں نہ چین سے----بلکہ اسی سرزمین کی پیداوار اور اسی قوم کے افراد ہیں----اور خاص طور پر ان کی اصل قوت یعنی نوجوان نسل تو ہے بھی قیام پاکستان کے بعد معرضِ وجود میں آنے والی' تو پھر ان میں اس ذہنی بے راہ روی کے پیدا ہونے کی ذمہ داری کس پر ہے؟----اور کیا یہ ذمہ داری سب سے بڑھ کر ان لوگوں پر عاید نہیں ہوتی جو بزعمِ خویش اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی علمبرداری فرماتے رہے لیکن جنہوں نے تمام زور "برسراقتدار طبقہ" پر تنقید کرنے میں ضائع کر دیا اور قوتوں' صلاحیتوں اور اوقات کا سارا سرمایہ صرف سیاسی جدّوجہد کے نذر کر دیا اور تعلیم و تربیت کے کام سے یکسر نگاہیں پھیر لیں۔ چنانچہ نہ قوم کی ذہنی و فکری رہنمائی ہو سکی نہ اخلاقی و عملی تربیت' اور صورت یہ ہو گئی کہ نوجوان نسل میں سے جو جتنا زیادہ ذہین تھا اتنا ہی زیادہ تیزی سے الحاد و مادہ پرستی کی جانب جھکتا چلا گیا---- پھر اگر آج یہ نسل خالص مادہ پرستی کی عینک سے معاملات کو دیکھتی ہے تو آخر قصور کس کا ہے؟----دوسرے مذہبی طبقات کو تو چھوڑیئے کہ سب ہی کا خیال ہے کہ ان میں جدید نسل کی ذہنی رہنمائی کی صلاحیت موجود نہیں ' سوال یہ ہے کہ جماعت اسلامی نے پاکستان کے

تئیس سالوں کے دوران کیا کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ کسی تحریک کو اتنی طویل مہلتِ کار کا مل جانا بڑی ہی غیر معمولی خوش قسمتی شمار کی جا سکتی ہے۔ اور تاریخ اس جماعت کا یقیناً شدید محاسبہ کرے گی جسے اتنی مہلت ملی لیکن اس نے اپنے آپ کو دور از کار معاملات میں الجھائے رکھا۔۔۔۔ اور سیاسی مہمیں تو چلائیں لیکن نہ ذہن و فکر کی دنیا میں انقلاب برپا کیا اور نہ اخلاق و کردار کی وادیوں میں کوئی تبدیلی پیدا کی۔۔۔۔ چنانچہ اب اپنی ہی "غفلتوں کے شاخسانوں" سے دوچار ہے!

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ کیا اس قسم کی سیاسی ہنگامہ آرائی اور نعرہ بازی سے جیسی کہ آجکل مذہبی طبقات کی طرف سے "سوشلزم" کے مقابلے میں کی جا رہی ہے، کوئی مفید نتیجہ نکلنے کی توقع کی جا سکتی ہے؟ اس لئے کہ یہ تو شاید ممکن ہو کہ اس طرح ان سیاسی جماعتوں کی پیش قدمی کو آپ کچھ دیر کے لئے روک دیں جو اپنی حصول اقتدار کی جنگ میں پیٹ کے نعرے کو اچھال رہی ہیں لیکن اس کی ہرگز کوئی امید نہیں کی جا سکتی کہ اس طریقے پر کسی ایک ذہن کو بھی بدلا جا سکے ۔۔۔۔۔ اور کسی ایک شخص کے فکر کے رخ کو بھی تبدیل کیا جا سکے۔ گویا یہ سارا "جہاد" ان لوگوں کے خلاف تو شاید کسی حد تک نتیجہ خیز ثابت ہو سکے جنہیں "Pseudo Socialist" کہا جاتا ہے، لیکن جو لوگ حقیقتاً سوشلسٹ ہیں اور جن کی زندگی کا مقصد ہی سوشلسٹ اور کمیونسٹ انقلاب برپا کرنا ہے اور جو واقعتاً موجودہ انقلابی رو کی ذہنی و فکری رہنمائی کر رہے ہیں ان کے خلاف یہ ساری مہم قطعاً لاحاصل اور بے کارِ محض ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرز کی نعرہ بازی سے ایسے لوگ اپنے موقف پر مزید جازم اور اپنے نقطہ نظر میں مزید پختہ ہوتے چلے جا رہے ہیں اور دین و مذہب رہا سہا اخلاقی وقار بھی خاک میں ملتا چلا جا رہا ہے۔

ہمیں خوب معلوم ہے کہ ہماری اس بار بار کی مرثیہ خوانی کا حاصل کچھ بھی نہیں، اس لئے کہ ملکی سیاست کے میدان میں بر سر کار مذہبی جماعتوں کے لئے اب طریق کار کی تبدیلی قطعاً ناممکن ہے۔ ان کی ایک بڑی تعداد تو جو کچھ کر رہی ہے اس کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ جن سے توقع ہو سکتی تھی وہ خود ہی اپنی غلط منطق کے صغریٰ کبریٰ کے جال میں اس درجہ پھنس چکے ہیں کہ اب اس سے ان کا رہائی پانا ممکن نہیں رہا۔ بنابریں اکثر گمان ہوتا ہے کہ ہماری ساری قیل و قال بیکار اور سعیٔ لاحاصل ہے۔

لیکن پھر خیال آتا ہے کہ کیا واقعی اتنے بڑے ملک اور اتنی عظیم قوم میں چند لوگ بھی ایسے

نہیں جو وقتی طور پر سیاست کے اتار چڑھاؤ سے صرفِ نظر کر کے دین و مذہب کی بنیادی اقدار کے احیاء کے لئے بالکل بنیادی اور اساسی کام میں منہمک ہو سکیں ------ تو دل گواہی دیتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا [illegible] کی ہمارے اپنے جذبِ دروں کی، اور اصل کوتاہی ہمارے بیانِ مطلب اور ا[illegible] ہے اور اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ بارگاہِ ایزدی ہی میں درخواست کی جائے کہ "رَبِّ اشْرَحْ لِی صَدْرِی وَیَسِّرْلِی اَمْرِی وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِسَانِی یَفْقَهُوا قَوْلِی ---!"

ہمارے اسی باطنی اضطراب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بار بار خیال آتا ہے کہ "میثاق" کو بند کر دیا جائے تاکہ سیاسی میدان سے بالکل لاتعلق ہونے کے باوجود محض اس کے صفحات میں جو سیاسی تبصرے کبھی کبھی آجاتے ہیں ان کا سلسلہ بھی بند ہو جائے اور ہم اپنی صلاحیتوں کی حقیری پونجی کو کامل یکسوئی کے ساتھ صرف علومِ قرآنی کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تعلّمِ قرآن میں کھپادیں۔ تاہم ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہوگا۔

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا!

اعزازی خطابت کی پیشکش

ڈگری کالج کے ایک پروفیسر جو ڈبل ایم اے ہیں اور جن کا تعلق جناب ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ، کے حلقہ اثر سے ہے، لاہور یا گوجرانوالہ ڈویژن میں رفقاء تنظیم اسلامی یا انجمن خدام القرآن کے زیر انتظام یا زیر اثر کسی مسجد میں خطاب جمعہ کی اعزازی خدمت سرانجام دینا چاہتے ہیں۔

رابطہ کے لئے : معرفت حافظ خالد محمود خضر

قرآن اکیڈمی، K-36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 3-5869501

باب نہم

"وقتِ دُعا ہے !"

دسمبر ۱۹۷۱ء

ان سطور کی تحریر کے وقت مشرقی پاکستان پر بھارت کا باقاعدہ حملہ شروع ہوئے بیس روز ہو چکے ہیں اور مغربی پاکستان اور بھارت کے مابین جنگ شروع ہوئے بھی آٹھ دن ہو چکے ہیں۔ اور اس وقت دونوں محاذوں پر میدانی جنگ بھی نہایت گھمسان کی ہو رہی ہے اور دونوں ملکوں کی بحری و فضائی قوتوں میں بھی خوفناک ٹکراؤ جاری ہے ---- ادھر اقوامِ متحدہ میں بھی گفت و شنید کا سلسلہ چل رہا ہے اور دنیا بھر کے تمام اہم دار السلطنتوں کی توجہات بھی برِّ صغیر پر مرتکز ہیں۔

کل کیا ہو گا وہ "وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا"{۱} کے مصداق کسی کو معلوم نہیں اور اس جنگ کا مجموعی نتیجہ کیا نکلے گا وہ بھی "وَأَنَّا لَا نَدْرِي أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَن فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا"{۲} کے مصداق کسی کے علم میں نہیں ! ---- حتیٰ کہ یہ کہنا بھی ممکن نہیں کہ جنگ کے خاتمے سے قبل یہ سطور بھی طبع ہو کر قارئین تک پہنچ پاتی ہیں یا نہیں !

تاہم ایک بات بالکل واضح ہے کہ پاکستان کے وجود اور بقا کے لئے یہ جنگ فیصلہ کن ہے اور ہر پاکستانی مسلمان کے لئے یہ وقت جان کی بازی کھیل جانے کا ہے' اور ساتھ ہی چونکہ پاکستان کا قیام بھی اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی فضل ہی تھا اور اس کا اب تک قائم رہنا بھی اسی کے رحم و کرم کا نتیجہ ہے لہٰذا ہر پاکستانی کو بارگاہِ خداوندی میں صدقِ دل سے دعا بھی کرنی چاہئے۔

لیکن واضح رہنا چاہئے کہ دعا بس کچھ رٹے ہوئے الفاظ کے زبانوں سے ادا کر دینے کا نام نہیں

{۱} "اور نہیں جانتا کوئی ذی نفس کہ وہ کل کو کیا کمائے گا"۔ (سورۂ لقمان' آیت ۳۴)

{۲} "اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کی شامت آ گئی ہے یا ان کا رب ان پر کرم فرمائی کا ارادہ رکھتا ہے"۔ (سورۂ جن' آیت ۱۰)

ہے بلکہ اس کے لئے لازم ہے کہ ہر وہ شخص جو خدا کی رحمت کو پکارنا اور اس کی تائید و نصرت کو آواز دینا چاہے' پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے کہ خود اس نے اپنے پروردگار سے کوئی وفادارانہ رشتہ بھی استوار کیا یا نہیں؟ اور خود اس نے اس کے دین کے ساتھ خلوص و اخلاص کا معاملہ کیا یا نہیں؟ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا تو واضح فرمان یہ ہے کہ "اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ" {۳}

واقعہ یہ ہے کہ ہم نے پاکستان ایسی نعمتِ غیر مترقبہ اور دولتِ خداداد کی نہ کوئی قدر کی اور نہ ہی اس کا کوئی حق ادا کیا اور ہم بحیثیتِ قوم عدالتِ خداوندی میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں اور اب بھی کوئی آثار ایسے موجود نہیں کہ یہ امید کی جاسکے کہ ہماری اجتماعی زندگی کا دھارا دین کی طرف مڑ سکے گا۔

ان حالات میں ظاہر ہے کہ کوئی بھی فرد اس پوزیشن میں نہیں کہ پوری قوم کی جانب سے بارگاہِ خداوندی میں "اِنَّا ھُدْنَا اِلَیْکَ" {۴} کا توبہ نامہ پیش کر کے "اَتُھْلِکُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَھَاءُ مِنَّا" {۵} کی استفہامی درخواست اور دعا پیش کر سکے'----ہاں ایک بات ممکن ہے اور وہ یہ کہ :

> ہر وہ شخص جو واقعتاً صدقِ دل سے خدا کی رحمت کو پکارنا اور اس کی تائید و نصرت کو آواز دینا چاہتا ہو پہلے بارگاہِ خداوندی میں اپنے تمام گناہوں پر صدق دل سے اظہارِ ندامت بھی کرے اور عزمِ توبہ بھی اور پھر یہ عہد کرے کہ کم از کم اس کی اپنی زندگی اور اس کے بیشتر اوقات اس کے دین کی نصرت کے لئے وقف رہیں گے اور اس کی قوتوں' صلاحیتوں اور توانائیوں کا بہتر اور اکثر حصہ اللہ کی ہدایت

(باقی صفحہ ۸۰ پر ملاحظہ کیجئے)

{۳} "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جمادے گا"۔(سورۃ محمدؐ' آیت ۷)

{۴} "ہم تیری جانب رجوع کرتے ہیں"! (سورۃ اعراف' آیت ۱۵۶)

{۵} "کیا تو ہمیں ہمارے ناسمجھ لوگوں کے کرتوتوں کے سبب ہلاک فرمادے گا"۔(سورۃ اعراف' آیت ۱۵۵)

باب دہم

۶۹ء سے ۷۱ء تک

پاکستانی سیاست کی افراتفری کا اندوہناک نتیجہ

مشرقی پاکستان کی علیحدگی

جنوری فروری ۱۹۷۲ء

دسمبر ۷۱ء کا شمارہ پاک ہند جنگ کے دوران شائع ہوا تھا اور اس کے "تذکرہ و تبصرہ" میں ہم نے "وقتِ دعا ہے......!" کے عنوان سے عرض کیا تھا کہ

"کل کیا ہو گا وہ...... "وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا" کے مصداق کسی کو معلوم نہیں اور اس جنگ کا مجموعی نتیجہ کیا نکلے گا وہ بھی "وَاَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِھِمْ رَبُّھُمْ رَشَدًا" کے مصداق کسی کے علم میں نہیں ..."

تو اگرچہ ہم ان لوگوں میں سے تو نہیں تھے جو "فتح لازماً ہماری ہو گی!" اور "ہم عید کی نماز دہلی اور کلکتہ میں پڑھیں گے!" کی قسم کی بڑیں ہانکتے تھے، تاہم اس اقرار میں ہمیں کوئی باک محسوس نہیں ہوتا کہ ایسی ذِلّت آمیز شکست کا ہمیں تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کی مخصوص جغرافیائی پوزیشن کے سبب سے یہ خدشہ تو ہمیں کبھی کبھی ہوتا تھا کہ کہیں مشرقی پاکستان ہماری فوج کا قبرستان نہ بن جائے (چنانچہ مخدومی پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے یاد دلایا کہ بالکل انہی الفاظ میں ایک بار راقم نے اس خدشے کا اظہار ان کے سامنے کیا تھا!) لیکن یہ کبھی تصور میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ مشرقی پاکستان عالمِ ارضی کی سب سے بڑی مسلمان مملکت کی عزت و ناموس کی شمشان بھومی کی صورت اختیار کر لے گا اور ایک ایسی فوج کے ایک لاکھ کے لگ بھگ جوان اور افسر انتہائی ذلت کے ساتھ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے جس کی شجاعت کا ڈنکا صرف عالمِ اسلام ہی میں نہیں پوری دنیا میں بجتا ہے اور جس کی بہادری کے اپنے ہی نہیں دشمن بھی معترف ہیں۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ مشرقی پاکستان سے گرفتار کر کے بھارت لے جائے جانے والے لوگوں میں ریگولر فوجی تینتالیس ہزار (۴۳۰۰۰) تھے، باقی سویلین لوگ تھے!)

بنی اسرائیل کی تاریخ کے دوران کئی بار ایسا ہوا کہ انہیں دشمنوں کے ہاتھوں عبرتناک شکستیں اٹھانی پڑیں۔ تاریخ کے اوراق میں ایسے کئی مواقع کی داستانیں تفصیل کے ساتھ محفوظ ہیں۔ چنانچہ جب کبھی پڑھنے میں آتا کہ اس طرح کے مواقع پر کئی کئی لاکھ کی تعداد میں یہودی مرد عورتیں اور بچے قیدی بنا لئے جاتے تھے تو حیرت ہوتی تھی کہ کیا واقعی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک قوم ابھی لاکھوں کی تعداد میں موجود ہو لیکن اسیری کی ذلت کو قبول کر لے۔ اور جیسا کہ نبوکد نصر کے حملے کے بعد ہوا' بالکل بھیڑ بکریوں اور ڈھور ڈنگروں کی طرح لاکھوں کی تعداد میں ہنکا کر ایک ملک سے دوسرے کو لے جائی جائے۔۔۔۔ افسوس کہ ملّتِ اسلامیہ پاکستان نے اپنی آنکھوں سے جیتے جی یہ منظر دیکھ لیا کہ اس کے ایک لاکھ کے لگ بھگ کڑیل افراد نے نہ صرف یہ کہ انتہائی ذلت آمیز طریقے پر دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالے بلکہ انہیں اس حال میں "بنگلہ دیش" سے بھارت منتقل کیا گیا کہ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔۔۔۔۔۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

اس حادثہ فاجعہ پر جو کرب والم نہ صرف مسلمانانِ پاکستان بلکہ مسلمانانِ عالم نے محسوس کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ بیان سے باہر ہے۔ کتنے ہی لوگوں کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ کاش کہ ہماری فوج ایک ایک کر کے کٹ مرتی لیکن ہتھیار نہ ڈالتی۔ ہر شخص اپنے دل میں رنج و غم کا ایک بند طوفان لئے پھرتا ہے اور پوری قوم کے احساسات میں تلخی کا زہر گھل کر رہ گیا ہے۔

کاش کہ اس موقع پر قوم کو کوئی "زبان" میسر ہوتی جو اس کے احساسات کی ترجمانی کر کے اس کے دل کے بوجھ کو کسی قدر ہلکا کر دیتی۔ قومی اور ملی سطح پر ہماری تہی دامنی کا عالم یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پاس ایسی کوئی "زبان" بھی موجود نہیں۔ بغداد کی تباہی پر جو نوحے شیخ سعدیؒ نے کہے تھے ان سے اس وقت نہ معلوم کتنے لوگوں کے دلوں کا بوجھ ہلکا ہوا ہو گا۔ ان کا یہ شعر جو زبان زدِ خاص و عام ہے ان کے اپنے احساسات کی شدت کا کس درجہ غماز ہے کہ۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنیں

پھر جب دولتِ ہسپانیہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھنی تو بقول علامہ اقبال مرحوم۔

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابنِ بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی!

پھر جب دہلی پر قیامت ٹوٹی تو علامہ اقبال مرحوم ہی کے الفاظ میں "داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر!" یہاں تک کہ اسی صدی میں شمالی افریقہ پر یورپی استعمار کے مظالم پر علامہ شبلی مرحوم نے دردناک مرثیے کہے' اور خود علامہ اقبال نے جزیرہ صقلیہ (سسلی) پر بایں الفاظ نوحہ کہا کہ۔

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کے تھا محرم ترا

لیکن افسوس کہ آج حال یہ ہے کہ روئے ارض کی عظیم ترین مسلمان مملکت پر قیامت گزر گئی' پھر بھی کوئی ایسا نالہ کسی جانب سے سننے میں نہیں آیا جو قوم کی آواز قرار پاتا اور جسے سن کر قوم محسوس کرتی کہ کم از کم اس کے جذبات کا اظہار تو ہو گیا---ان حالات میں بے ساختہ نوکِ قلم پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ الفاظِ مبارک آتے ہیں جو آپ کی زبان مبارک سے غزوۂ احد کے بعد مدینہ منورہ واپس تشریف لانے پر جوشِ گریہ سے نکلے تھے کہ "اَمَّا حَمْزَةُ فَلَا بَوَاكِيَ لَهُ!"--- "ہائے! حمزہؓ کے لئے رونے والیاں بھی نہیں!" بالکل اسی طرح حقیقت یہ ہے کہ آج سقوطِ مشرقی پاکستان کا رونے والا بھی کوئی موجود نہیں۔

یہ رونا رلانا' واقعہ یہ ہے کہ محض رسمی نہیں ہوتا بلکہ اس سے حقیقتاً قوم کے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے اور ذہن کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ ورنہ بسا اوقات اس طرح کے صدمے اندر کی اس بند چوٹ کے مانند جو کسی مریض کو اندر ہی اندر ختم کر دیتی ہے کسی قوم کو بالکل کھوکھلا کر کے رکھ دیتے ہیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ "سقوطِ مشرقی پاکستان" پر قوم کے جذبات کا اظہار نہ ہو سکنے کے باعث اندر ہی اندر کا صدمہ ملتِ اسلامیہ پاکستان کے جذبہ خود اعتمادی کو گھن کی طرح چٹ کر رہا ہے اور عوام کی اکثریت نہ صرف یہ کہ اس طرح کے خیالات میں غلطاں و پیچاں ہے کہ آیا ہماری کوئی حقیقی بنیاد ہے بھی کہ نہیں؟ اور آئندہ بقیہ ملک بھی قائم رہ سکے گا یا نہیں؟ بلکہ لوگ یہاں تک سوچنے لگے ہیں کہ کیا واقعی پاکستان کا قیام درست اور صحیح تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ پاکستان کا قیام ہی ایک غلطی ہو اور اب تاریخ کے بے رحم ہاتھ اس غلطی کی جبری اصلاح کے درپے ہو چکے ہوں۔

یہ صورتحال بہت مشابہ ہے اس کیفیت سے جو زلزلے کے کسی جھٹکے کے بعد اعصاب پر طاری ہوتی ہے یعنی یہ کہ انسان ہل کر رہ جاتا ہے اور اسے نہ اپنے نیچے زمین ہی محسوس ہوتی ہے نہ

سر پر آسمان۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ فضا میں معلّق ہو۔ پھر یہ حالت زلزلے کے جھٹکے کے بعد فوراً ختم نہیں ہو جاتی بلکہ دیر تک طاری رہتی ہے' اور انسان بہت دیر تک غیر یقینی کی سی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔

اس صورتحال میں اس چیز کی شدید ضرورت ہے کہ رنج والم اور درد و کرب کے احساسات کو زبانِ اظہار عطا کرنے کے ساتھ ساتھ سنجیدگی سے تجزیہ بھی کیا جائے کہ جو کچھ پیش آیا اس کے اسباب کیا تھے۔ حقیقی غلطی کہاں تھی اور کتنی تھی' بلکہ یہ بھی کہ یہ واقعہ جو پیش آیا ہے وہ حقیقت میں ہے کیا؟ اور اس سے ہماری کمزوریاں اور خامیاں ظاہر ہوئی ہیں تو کونسی؟......... تاکہ قوم پر بحیثیتِ مجموعی ناامیدی اور مایوسی کی جو کیفیت طاری ہو گئی ہے وہ ختم ہو اور بے اعتمادی اور غیر یقینی کے بادل جو ملک و ملّت کی فضا پر چھا گئے ہیں وہ چھٹ جائیں۔

ہمارے نزدیک "سقوطِ مشرقی پاکستان" ایک حادثہ نہیں بلکہ دو واقعات کا مجموعہ ہے' اور کسی حقیقی تجزیئے کے لئے لازمی ہے کہ ان دونوں پر آغاز ہی سے علیحدہ علیحدہ غور کیا جائے' ان میں سے ایک ہے مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی اور وہاں ایک نئی خود مختار مملکت کا "بنگلہ دیش" کے نام سے قیام ---- اور دوسرا ہے پاک ہند جنگ میں پاکستان کی ذلت آمیز شکست اور عبرت ناک ہزیمت۔ ان دونوں حوادث کے جمع ہو جانے اور بیک وقت وقوع پذیر ہونے کو چاہے روایتی طور پر اپنی بدقسمتی پر محمول کر لیا جائے چاہے چند افراد کی نااہلی اور بے تدبیری یا غداری پر' چاہے پوری قوم کی سیاسی بے شعوری اور اجتماعی نابالغی پر' بہر حال یہ حقیقت ہے کہ یہ ہیں دو بالکل جدا حادثات اور انہیں گڈمڈ کرنا کسی طور پر درست نہیں' اس لئے کہ اس حادثے کی اصل تلخی دوسرے جزو سے متعلق ہے نہ کہ پہلے سے!

جہاں تک مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی کا تعلق ہے' اس سے پہلے کہ ہم اس واقعے پر اپنا حالیہ "تبصرہ" پیش کریں مناسب ہے کہ آج سے دو ڈھائی سال قبل جولائی ۶۹ء کے "تذکرہ و تبصرہ" میں ہم نے اس مسئلے کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اسے دوبارہ قارئین کی خدمت میں پیش کر دیں۔

اس "تذکرہ و تبصرہ" کا آغاز ہم نے بانی پاکستان محمد علی جناح مرحوم کے اس مشہور فقرے سے کیا تھا کہ :

"GOD HAS GIVEN US A GOLDEN OPPORTUNITY TO SHOW OUR WORTH AS ARCHITECTS OF A NEW STATE AND LET IT NOT BE SAID THAT WE DID NOT PROVE EQUAL TO THE TASK!"

اور اس کے بعد عرض کیا تھا کہ

"افسوس ---- کہ آج جبکہ پاکستان کو قائم ہوئے بائیس سال ہونے کو آئے اور خود محمد علی جناح مرحوم کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بیس سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا' مملکتِ خداداد پاکستان بزبانِ حال نوحہ خواں ہے کہ اس کے بانی و مؤسّس کا خدشہ صحیح ثابت ہوا اور اس نئی مملکت کو وہ معمار میسر نہ آسکے جو ایک انگریز شاعر کے قول کے مطابق "اس کے ستونوں کو نہایت گہری اور پختہ بنیادوں سے اٹھاتے اور پھر تعمیر کرتے ہوئے اوجِ ثریا تک پہنچا دیتے!"

پھر اس صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے اسباب میں سے "تین تاریخی عوامل" پر گفتگو کی تھی اور تین ایسی "پیچیدگیوں" کا ذکر کیا تھا جو "قیام پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہو گئی تھیں اور گویا پاکستان کی تعمیر ہی میں مضمر ہیں اور جن کا الجھاؤ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے ----" اور پھر ان میں سے ایک کے بارے میں عرض کیا تھا کہ :

"ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین پیچیدگی خالص جغرافیائی ہے یعنی یہ کہ مملکتِ خداداد پاکستان دو ایسے علیحدہ اور دُور دراز خطّوں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلے پر واقع ہوئے ہیں اور جن کے مابین ایک ایسی مملکت حائل ہے جو حالتِ جنگ ہی میں نہیں عین حالتِ امن میں بھی ایک بالقُوّۃ دشمن (Potential Enemy) کی حیثیت رکھتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یوں تو اگرچہ پاکستان کا وجود ہر اعتبار سے ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن خاص اس اعتبار ہی سے تو یہ تاریخِ عالم کا ایک نہایت ہی انوکھا اور محیرّ العقول تجربہ ہے جس کی شاید ہی کوئی دوسری نظیر کبھی موجود رہی ہو۔

یہ جغرافیائی پیچیدگی بجائے خود بھی کچھ کم اہم اور الجھی ہوئی نہ تھی' لیکن دو مزید عوامل نے اس کے الجھاؤ کو دوگونہ کر دیا ہے ---- یعنی ایک اس حقیقت نے کہ تہذیب' تمدن' زبان' لباس'

طرزِ بود و باش اور جذباتی و ذہنی ساخت غرض ایک مذہب کے سوا ہر اعتبار سے ان دو خطوں کے رہنے والے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور اگر دین و مذہب کے سوال کو خارج از بحث کر دیا جائے تو دنیا کے مروّجہ معیارات میں سے کسی معیار کے اعتبار سے بھی انہیں ایک قوم قرار نہیں دیا جا سکتا۔۔۔ اور دوسرے اس واقعے نے کہ ان دو خطوں میں سے جو خطہ 'رقبہ' محلِ وقوع' دفاع اور تعمیر و ترقی کے امکانات' الغرض تمام اعتبارات سے اہم تر ہے وہ بلحاظِ آبادی کم تر ہے اور دوسرا خطہ جو نہ صرف یہ کہ ان تمام اہم امور کے اعتبار سے بہرحال ثانوی حیثیت رکھتا ہے' بلکہ ایک نہایت جاندار' فعّال' سرمایہ دار اور تعلیم یافتہ غرض ہر اعتبار سے نہایت مؤثر لیکن پاکستان کے اساسی نظریئے کی دشمن اور اس کے عین وجود سے بغض و عداوت رکھنے والی اقلیت کی اضافی پیچیدگی بھی لئے ہوئے ہے' تعدادِ نفوسِ انسانی کے لحاظ سے دوسرے خطے سے برتر ہے۔۔۔ ذرا دقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دو اضافی عوامل کی بنا پر اس خالص جغرافیائی اشکال نے ایک نہایت پیچیدہ مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہے۔

> اور یہ اسی پیچیدگی اور اشکال کا نتیجہ ہے کہ بائیس سال کی طویل مدت میں بھی پاکستان کا کوئی دستور نہیں بن سکا اور دستور سازی کے میدان میں نہ صرف یہ کہ ہنوز روزِ اوّل کا معاملہ ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دور دور تک امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی اور الجھاؤ روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے!!

اس اشکال اور الجھاؤ کا مستقل حل تو ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ دینی جذبات اور ملی احساسات کو مسلسل اجاگر کیا جاتا رہے اور اس جذبہ کے دوام اور تسلسل کا مستقل اور پائیدار بندوبست کیا جائے جو ایک دوسرے سے اتنے بعید اور باہم اس قدر مختلف خطوں کے ایک مملکت میں شامل ہونے کا سبب بنا تھا۔ تاہم فوری طور پر بعض دوسری چیزیں بھی پیش نظر رہنی ضروری ہیں۔

ایک یہ کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اس "سنجوگ" کا برقرار رہنا مشرقی پاکستان کے عوام کی آزاد مرضی ہی پر منحصر ہے اور اسے کسی طرح بھی ان پر ٹھونسا نہیں جا سکتا۔ بلکہ اس معاملے میں جبر و تشدد کا ردِّ عمل نہایت خوفناک ہو سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس "آزاد مرضی" کا انحصار بھی جتنا کچھ دینی جذبات اور ملّی احساسات پر ہے

اتنا ہی اس امر پر بھی ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ یہ محسوس کریں کہ ہمارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو رہی بلکہ مثبت طور پر انہیں یہ احساس بھی ہو کہ خود ان کا مفاد مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے ہی سے وابستہ ہے اور مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں ایک دوسرے سے پیوستہ رہ کر ہی دنیا میں ایک باعزت اور باوقار آزاد مملکت کی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ اگر خدانخواستہ کبھی "علیحدگی" کی صورت پیدا ہوئی تو مغربی پاکستان کے لئے تو پھر بھی امکانِ غالب موجود ہے کہ وہ اپنی آزاد اور باوقار حیثیت کو برقرار رکھ سکے گا، لیکن مشرقی پاکستان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوگا کہ کسی دوسری وسیع تر قومیت میں ضم اور کسی دوسری بڑی مملکت میں جذب ہو کر رہ جائے۔

ان دو امور کی روشنی میں جائزہ لیا جانا چاہئے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی مرضی دراصل ہے کیا؟---- اگر وہ واقعتاً مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو کر ایک آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرنے کے خواہش مند ہیں تو ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کی اس خواہش کے آڑے نہیں آسکتی۔ بین الانسانی علائق میں سب سے زیادہ مقدس رشتہ میاں اور بیوی کا ہوتا ہے لیکن اس میں بھی دینِ فطرت نے علیحدگی کی ایک سبیل رکھ دی ہے اور صاف ہدایت کی ہے کہ اگرچہ طلاق، حلال چیزوں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے تاہم "معلق" رکھنے سے بہتر یہی ہے کہ علیحدگی اختیار کرلی جائے---- بالکل اسی طرح اگر ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی واقعتاً یہ محسوس کرتے ہوں کہ مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے میں انہیں کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے تو ان کی بے اطمینانی کے سبب سے پورے ملک کی سیاسی و دستوری زندگی کو مسلسل "معطل" رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ ان کی مرضی کو بروئے کار آنے کا موقع دے دیا جائے۔"

اس قدر طویل اقتباس کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی حادثے کے وقوع پذیر ہو جانے کے بعد تو ہر شخص ہی "پنڈت" بن جاتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے اپنی اس تحریر میں اس "اشکال اور الجھاؤ" کے جس مستقل حل کی طرف اشارہ کیا تھا یعنی یہ کہ "دینی جذبات اور ملی احساسات کو مسلسل اجاگر کیا جاتا رہے اور اس جذبے کے دوام اور تسلسل کا مستقل اور پائیدار بندوبست کیا جائے جو ایک دوسرے سے اتنے بعید اور باہم اس قدر مختلف خطوں کے ایک مملکت میں شامل ہونے کا سبب بنا تھا" وہ تو نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ البتہ جتنی قابلِ حذر چیزوں کا ذکر ہم نے کیا تھا، شامتِ اعمال سے وہ سب کی سب بدترین صورتوں میں رونما ہو کر رہیں۔

چنانچہ جب یہ کمزور رشتہ کمزور تر ہوتا نظر آیا تو نہ تو "مشرقی پاکستان کے عوام کی آزاد مرضی" کو بروئے کار آنے کا موقع دیا گیا' نہ ان سے سیدھی طرح بات ہی کی گئی' بلکہ اس کے برعکس "جبر و تشدد" کی راہ اختیار کی گئی اور دفعۃً طاقت و قوت کا سخت ترین استعمال کر لیا گیا۔ نتیجتاً اس کا ردِ عمل" بھی "نہایت خوفناک" صورت میں سامنے آیا۔ اور آج ہم اس صورتحال سے دوچار ہیں کہ ایک طرف مغربی پاکستان کے عوام کی گردنیں شدید ترین احساسِ ذلّت و رسوائی سے جھکی ہوئی ہیں اور ان کی آنکھوں میں مایوسی اور دل شکستگی کے مہیب سائے ڈیرہ ڈالے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف وہ حسین و زرخیز اور سرسبز و شاداب خطہ جسے دنیا ربع صدی تک "مشرقی پاکستان" کے نام سے جانتی رہی ہے نہ صرف یہ کہ ہم سے کٹ گیا ہے بلکہ اِس وقت دشمن کے قبضے میں ہے اور اس بات کا حقیقی خطرہ موجود ہے کہ کہیں وہ مستقل طور پر "مہابھارت" میں "ضم" اور ہندی قومیت میں "جذب" ہو کر نہ رہ جائے۔ (پ۔ن : واقعہ یہ ہے کہ یہ اللہ کے بہت بڑے فضل و کرم کا مظہر ہے کہ ہمارے یہ اندیشے غلط ثابت ہوئے اور آج بحمد اللہ بنگلہ دیش ایک آزاد و خود مختار ملک کی حیثیت سے موجود ہے' جہاں نہ صرف یہ کہ مسلمان عظیم اکثریت میں ہیں بلکہ دینی احساسات کے اعتبار سے بھی دنیا کے کسی اور خطے کے مسلمانوں سے پیچھے یا کم تر نہیں ہیں!)

حقیقت یہ ہے کہ دسمبر ۷۰ء کے عام انتخابات کے بعد پاکستان میں جو حالات و واقعات رونما ہوئے وہ ہمارے سابق حکمران ٹولے کی شدید نااہلی اور انتہائی بے بصیرتی و بے تدبیری حتیٰ کہ بدنیتی اور بددیانتی کے شاہکار تو ہیں ہی' مجموعی اعتبار سے ہماری پوری قوم کے سیاسی افلاس کا بھی منہ بولتا ثبوت ہیں ---- ہم نے گزشتہ پورے سال کے دوران اس موضوع پر بالکل قلم نہیں اٹھایا کہ مارشل لاء کی تلوار سر پر لٹکی ہوئی تھی اور زبان و قلم پر سخت پہرے قائم تھے۔ چنانچہ ستمبر اکتوبر ۷۱ء کے "تذکرہ و تبصرہ" میں ہم نے عرض بھی کر دیا تھا کہ :

> "جہاں تک ملکی حالات کا تعلق ہے ان پر کچھ لکھنے پر ابھی طبیعت بالکل آمادہ نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ بحالاتِ موجودہ "پورا سچ" (Whole Truth) کہنا ممکن نہیں اور جزوی صداقت (Half Truth) کے بارے میں ہماری رائے یہ کہ وہ بسا اوقات جھوٹ اور کذب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ لہٰذا جب تک قلم غیر معمولی حالات کی بنا پر عاید شدہ پابندیوں سے آزاد نہیں ہو جاتا ہم منقار زیرِ پر رہنے ہی کو ترجیح دیتے ہیں...."

ہماری حتمی رائے جو مندرجہ بالا اقتباس کے بین السطور میں بھی موجود ہے' یہ ہے کہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کو ابتدا ہی سے ایک ملک متصور کر کے سفر کا آغاز اگرچہ نہایت خلوص کے ساتھ اور "IN ABSOLUTE GOOD FAITH" ہوا تھا تاہم تھی یہ ایک غلطی۔ اس کے برعکس صحیح شکل وہی تھی جس کی جانب مشہور و معروف "قراردادِ لاہور" میں اشارہ کیا گیا تھا یعنی یہ کہ جغرافیائی حقائق کا منہ چڑانے کی بجائے ان کا مناسب لحاظ کیا جاتا اور ان دونوں خطوں کو ابتدا ہی سے دو آزاد اور خود مختار ملک تصور کر کے سفر کا آغاز کیا جاتا۔ اس صورت میں غالب امکان یہی تھا کہ ایک طرف تو یہ دونوں ملک بھارت کی مشترک دشمنی کے زیر اثر آپ سے آپ بغیر کسی بیرونی دباؤ کے ایک دوسرے کے ساتھ نہایت قریبی تعاون اور اشتراکِ عمل رکھنے پر مجبور ہوتے اور دوسری طرف مشرقی پاکستان میں مقامی ہندو سرمایہ داروں کے غریب مسلمان عوام کے معاشی استحصال کا وہ احساس و شعور بھی برقرار رہتا جو پاکستان کے وجود میں آنے کا اصل اور بنیادی محرک بنا تھا۔ لیکن افسوس کہ ہم بحیثیتِ قوم چاہے خالص عارضی اور محض وقتی طور پر ہی سہی بہرحال آزادیٔ ہند سے متصلاً قبل کے زمانہ میں "جذبۂ ملی" سے اس درجہ سرشار ہو گئے تھے کہ نہایت ٹھوس حقائق بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور ہم نے ان دونوں دور دراز خطوں کا "سنجوگ" ایک متحدہ ملک کی صورت میں قائم کر دیا۔ یہ دراصل قومی سطح پر ہمارے سیاسی افلاس کا نہایت نمایاں مظہر اور ہمارے قومی مزاج کی "جذباتیت" کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر بحیثیتِ قوم ہم میں کچھ بھی سیاسی شعور ہوتا تو ہم بہت جلد اس غلطی کا احساس و ادراک کر لیتے۔ اس لئے کہ خان لیاقت علی خان مرحوم کی بی پی سی رپورٹ کا حد درجہ حسرتناک انجام اسی لئے ہوا تھا کہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کے مابین بندھن کے لئے کوئی قابلِ قبول دستوری فارمولا تلاش نہ کیا جا سکا۔ لیکن ہماری "جذباتیت" اور حقائق سے گریز کی مستقل عادت پھر آڑے آئی اور ہم نے حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد پاکستان میں حکومت کی سطح پر سازشوں اور انقلابوں کا جو چکر چلا اس کا اصل اور بنیادی سبب تو اگرچہ یہ تھا کہ یہاں جو قوم آباد تھی وہ دفعۃً آزاد تو ہو گئی تھی لیکن اس کا سیاسی و اجتماعی شعور ابھی بالکل خام تھا اور یہاں قومی سطح پر نہ کوئی محکم تنظیم موجود تھی نہ مضبوط قیادت' لیکن اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ جب ملک کی کوئی دستوری اساس ہی قائم نہ ہو سکی تو لامحالہ ع

"خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری!" کے مصداق بے دستوری ہی یہاں کا دستور اور بے آئینی ہی یہاں کا آئین قرار پایا۔ چنانچہ ملک و ملت کا سفینہ کچھ عرصہ تو سازشوں اور انقلابوں کے چھوٹے گردابوں میں ہچکولے کھاتا رہا اور بالآخر ایک بڑے بھنور میں آپھنسا۔ اور ایوب خاں کا گیارہ سالہ "سنہری دور" شروع ہو گیا، جس کے دوران میں "صدارتی طرزِ حکومت" نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کے سیاسی محرومی کے احساس کو نقطہ عروج پر پہنچا دیا۔

اس میں شک نہیں کہ دورِ ایوبی میں مشرقی پاکستان میں صنعتی ترقی وغیرہ کی صورتوں میں وہاں کے عوام کی اشک شوئی اور دلجوئی کی بہت کوششیں بھی ہوئیں، لیکن اس کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ ان تمام کوششوں کے علی الرغم رفتہ رفتہ مشرقی پاکستان واقعتاً مغربی پاکستان کی "نو آبادی" (Colony) بنتا چلا گیا، جس سے وہاں فطری طور پر سیاسی بے چینی مسلسل بڑھتی چلی گئی۔

اس صورتحال سے دشمن نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ ایک طرف مشرقی پاکستان کی اس ہندو اقلیت نے جلتی پر تیل ڈالا جو خود ہمارے الفاظ میں "نہایت جاندار، فعال، سرمایہ دار اور تعلیم یافتہ، غرض ہر اعتبار سے نہایت مؤثر لیکن پاکستان کے اساسی نظریئے کی دشمن اور اس کے عین وجود سے بغض و عداوت رکھنے والی تھی"۔ اور جو وہاں زبان اور کلچر کی بنیاد پر جداگانہ قومیت کی اساس کو اجاگر کرنے کا کام بھی مسلسل بیس سال سے کر رہی تھی۔ ہندوؤں کو ابھی اس نہج پر کام کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے میں یقیناً بہت مدت تک جدوجہد کرنی پڑتی لیکن اس سیاسی بے چینی نے ان کے لئے ایک سنہری موقع فراہم کر دیا اور انہوں نے سیاسی محرومی کے احساس کو بآسانی مغربی پاکستان کے خلاف جذبۂ نفرت (Hate Complex) میں تبدیل کر دیا۔ اور دوسری طرف ہمارے "عظیم ہمسائے" نے اس آگ کو نہ صرف ہوا دی اور بھڑکایا بلکہ اس کے لئے ہر طرح کا ایندھن بھی فراہم کیا.... نتیجتاً علیحدگی پسندی کا ایک زبردست رجحان پیدا ہوا اور اس کے لئے ایک عوامی تحریک جڑ پکڑ گئی۔

۶۹ء میں دوسرے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد اگرچہ حکومتِ وقت نے بہت سی ہمالیہ ایسی غلطیاں بھی کیں، مثلاً یہ کہ مغربی پاکستان کی وحدت کو بلاوجہ ختم کر دیا، تاہم دسمبر ۷۰ء کے انتخابات کے بعد تک بحیثیتِ مجموعی سابق صدر یحییٰ کی نیک نیتی پر شک کے لئے کوئی گنجائش موجود نہ تھی اور ان کا ملک کو ہنگاموں اور ایجی ٹیشنوں کی فضا سے نکال کر معروف سیاسی سرگرمی حتیٰ کہ عام

انتخابات کی راہ پر لے آنے میں کامیاب ہو جاتا تو بلاشبہ بہت قابلِ قدر تھا' لیکن اس کے بعد کی داستان نہایت تلخ ہے' اور جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں حکمران ٹولے کی شدید نااہلی اور انتہائی بے بصیرتی اور بے تدبیری ہی نہیں بدنیتی اور بددیانتی کا عظیم شاہکار ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے "سقوطِ مشرقی پاکستان" کے اصل تلخ جزو یعنی ہماری ذلت آمیز شکست اور عبرتناک ذلت و رسوائی کے اسباب کا آغاز ہوتا ہے۔

دسمبر ۷۰ء کے انتخابات کے نتائج سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ مشرقی پاکستان نے بحیثیتِ مجموعی علیحدگی پسندگی کے حق میں واضح فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کی آزاد رائے کو عملاً بروئے کار آنے کا موقع دیا جاتا یا کم از کم یہ کہ ان سے واضح انداز میں بات کی جاتی اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جاتی کہ حقیقتاً وہ چاہتے کیا ہیں؟ آیا مغربی پاکستان سے مکمل علیحدگی کے خواہاں ہیں یا کسی درجے کا کوئی بندھن قائم رکھنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ راقم نے انتخابات کے نتائج مدینہ منورہ میں سنے تھے اور اسی وقت احباب سے عرض کر دیا تھا کہ اب مشرقی اور مغربی پاکستان کو کوئی طاقت ساتھ نہیں رکھ سکتی۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ۔

ہر چہ دانا کند' کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار!

کے مصداق یہ علیحدگی خوش اسلوبی سے نہ ہو بلکہ بھونڈے طریق پر ہو اور صرف خرابی ہی نہیں خون خرابے کے ساتھ ہو۔ ساتھ ہی بارگاہِ ربّ العزت میں دعا بھی کی تھی کہ "پروردگار! پاکستان کے موجودہ فوجی حکمرانوں کو جنرل ڈیگال ہی کی سمجھ عطا فرما دے کہ وہ اس علیحدگی کو خوش اسلوبی کے ساتھ عمل میں لے آئیں!" لیکن افسوس کہ ہماری یہ دعا بارگاہِ ربّ العزت میں قبول نہ ہوئی اور قوم کے سیاسی افلاس اور اجتماعی شعور کے فقدان کے نتائج سامنے آکر رہے۔

اب یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے کہ سابق صدر یحییٰ خان اور ان کے مشیروں کا "عام انتخابات" کے انعقاد کا کریڈٹ حاصل کرنے کا فیصلہ اس غلط اندازے پر مبنی تھا کہ دونوں خطوں میں چاہے کچھ بڑے بڑے گروپ بھی انتخابات جیت لیں لیکن اکثریت چھوٹے چھوٹے سیاسی گروپوں کی ہو گی جن کو مہرے بنا کر ہم سیاست کی شطرنج پر بازی کھیلتے رہیں گے۔ لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خوش قسمتی تھی یا بدقسمتی کہ ان کے یہ اندازے غلط ثابت ہوئے۔ مغربی پاکستان میں تو پھر بھی

پیپلز پارٹی کے بڑے دھڑے کے ساتھ کچھ نہ کچھ چھوٹے گروپ بھی آ گئے، لیکن مشرقی پاکستان میں تو ساری کی ساری سیٹیں عوامی لیگ نے حاصل کرلیں اور اس طرح شطرنج کی کسی بساط کے بچھنے کا امکان ہی موجود نہ رہا۔

بس یہیں سے بدنیتی کے اس سلسلے کا آغاز ہو گیا جو بالآخر انتہائی ذلّت و رسوائی پر منتج ہوا۔ پہلے تو تین ماہ شش و پنج ہی میں گزار دیئے گئے، پھر اسمبلی کا اجلاس طلب بھی کیا گیا تو اس پیشگی اہتمام کے ساتھ کہ وہ بالفعل منعقد نہ ہونے پائے۔

اس مرحلہ پر پاکستان کے موجودہ صدر مملکت اور چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر ذوالفقار علی بھٹو کا کردار بھی نہایت مشکوک اور حد درجہ تباہ کن ثابت ہوا۔۔۔اور اب چاہے بھٹو صاحب اپنے اُس وقت کے موقف کی کیسی ہی خوشنما تاویلیں کرلیں حقیقت یہ ہے کہ یہ داغ ان کے دامن پر ہمیشہ قائم رہے گا کہ چاہے دانستہ اس سازش میں شریک نہ رہے ہوں اور محض نادانستہ ہی استعمال ہوئے ہوں بہرحال ایک بہت بڑی تباہی کے اسباب میں شامل ضرور ہو گئے۔ ان کے بارے میں ہمارا اندازہ یہ تھا کہ ان کی جذباتی، سیماب وش، جلد باز اور Volatile شخصیت کے ظاہری خول کے اندر ایک سنجیدہ، حقیقت بیں اور ٹھوس Calculating شخصیت چھپی ہوئی ہے لیکن افسوس کہ مشرقی پاکستان کے معاملے میں انہوں نے کسی تدبّر اور معاملہ فہمی کا ثبوت نہیں دیا۔

اس مسئلے میں تھوڑا سا الزام ہماری رائے میں مغربی پاکستان کے دائیں بازو کے ان شکست خوردہ سیاست دانوں پر بھی آتا ہے جنہوں نے انتخابات کے فوراً بعد بھٹو دشمنی کے جذبات سے مغلوب ہو کر شیخ مجیب الرحمٰن کی مدح سرائی اور کاسہ لیسی شروع کردی اور اس طرح گویا بھٹو صاحب کو بالکل corner کر دینے کی کوششیں شروع کردیں۔ ہمارے نزدیک یہ ان لوگوں کی بے تدبیری اور ناسمجھی کا بہت بڑا ثبوت تھا۔ لیکن اگر بھٹو صاحب کا رویّہ ان کے اس طرز عمل کے ردِ عمل کے طور پر تھا تب بھی یہ بھٹو صاحب کے اپنے فہم اور تدبّر کے دامن پر ایک بہت بڑا داغ ہے۔

بہرحال اسمبلی کے انتہائی تاخیر کے ساتھ طلب کئے جانے اور پھر ملتوی کر دیئے جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں نے محسوس کیا کہ ہم اپنا مقصود آئینی طریق پر حاصل نہیں کرسکتے۔ چنانچہ حالات بگڑنے شروع ہوئے، قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا، جس پر پہلے تو حکومتِ

وقت نے نہایت پُراسرار خاموشی اختیار کی اور پھر یکبارگی سخت ترین ملٹری ایکشن کا آغاز کر دیا۔
اس کے بعد کی داستان بہت طویل ہے، اور داستان سرائی یہاں مقصود نہیں۔ مختصراً یہ کہ ملٹری ایکشن کے نتیجے میں لاکھوں افراد گھربار چھوڑ کر بھارت بھاگ گئے جسے بھارت نے اپنا مسئلہ بنا لیا۔ اور اس کے پردے میں پہلے گوریلے اور مسلّح تخریب کار بھیج کر اور پھر براہِ راست حملہ کر کے مشرقی پاکستان کے لئے فوری خطرہ پیدا کر دیا اور پھر وہ چودہ روزہ جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں پاکستان کو ذلت آمیز شکست اٹھانی پڑی اور مشرقی پاکستان "بنگلہ دیش" بن گیا۔

جہاں تک اس "ذِلّت آمیز شکست" اور "عبرتناک ہزیمت" کے اسباب کا تعلق ہے اب تک اس موضوع پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ سے یہی ہمارے عوام کی گفتگوؤں کا موضوع بھی رہا ہے اور "دانشوروں" کے تجزیوں کا بھی۔ اور اب تو اس قضیئے کے باقاعدہ تصفیے کے لئے ایک اعلیٰ سطح کا کمیشن بھی کام کر رہا ہے۔ تاہم اس مسئلے کے بعض پہلو ایسے ہیں جو عوام کی نظروں سے تو اوجھل ہیں ہی، ہمارے علم کی حد تک "دانشوروں" نے بھی کم از کم تاحال دانستہ یا نادانستہ ان سے اعراض ہی کیا ہے۔ رہا حمود الرحمٰن کمیشن تو غالباً یہ پہلو اس کے دائرۂ تحقیق و تفتیش (Scope) سے بھی باہر ہی رہیں گے۔ لہٰذا ہماری رائے میں ان صفحات میں ان کے جانب مختصر اشارہ مناسب رہے گا۔
اب تک جو کچھ کہا اور لکھا گیا ہے اس کا مرکز و محور سابق صدر یحییٰ خان اور اُن کے رفقائے کار فوجی حکمران رہے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ اس شکست کے فوری اسباب (Exciting Causes) بہرحال ان لوگوں کی شدید ترین نااہلی، حد درجہ کی بے تدبیری اور بے بصیرتی، حوصلے کی کمی، قوت فیصلہ کے فقدان اور اعصاب کے ضعف کے گرد ہی گھومتے ہیں۔ اور یہ تمام چیزیں براہِ راست نتیجہ ہیں ان کی عیاشیوں اور بدکاریوں کا اور ان کے کردار کی پستی، اخلاق کی دناءت اور سیرت کے گھناؤنے پن کا۔ خمر تو کہتے ہی اسے ہیں جو عقل کو ڈھانپ لے (اَلْخَمْرُ مَا یُخَامِرُ الْعَقْلَ) لہٰذا ہمارے ان حکمرانوں کی سمجھ بوجھ اور معاملہ فہمی تو اس راہ سے رخصت ہوئی۔ رہی ہمت و جرأت اور حوصلہ و ارادہ تو ان سب کا جنازہ بدکاریوں نے نکال دیا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف یہ کہ یہ لوگ خود بتاشے کی طرح بیٹھ گئے بلکہ ساتھ ہی ایک پوری قوم بلکہ روئے ارض کی [illegible] امتِ مسلمہ کی عزت و [illegible] کو دھیلہ کر گئے۔

لیکن، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، یہ سب شکست کے صرف فوری اسباب ہیں اور اس بحر کی گہرائیوں میں "ظُلُمٰتٌ [illegible] فَوْقَ بَعْضٍ" کے مصداق تہہ بر تہہ تاریکیاں موجود [illegible] صرف سطحِ آب پر چمکنے والی چیزوں پر نگاہ رکھنا اور گہرائیوں میں اتر کر حقائق کا مواجہہ کرنے [illegible]یز کرنا بھی من جملہ ان بیماریوں کے ہے جو ہمیں اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں۔ اس لئے کہ یہ درحقیقت قومی سطح پر گریز اور فراریت کا وہ مرض ہے جس نے پوری قوم کا مزاج اس طرز پر ڈھال دیا ہے کہ ہر ناکامی اور ہر خرابی کی ساری ذمہ داری کسی ایک یا چند افراد یا کسی ایسے گروہ یا طبقے کے سر تھوپ کر پوری قوم اپنی جگہ مطمئن ہو جائے اور بڑی سے بڑی ناکامی پر نہ اس کا اجتماعی شعور بیدار ہو، نہ اسے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا احساس و ادراک ہو سکے اور نہ ہی اس کے قومی ضمیر میں کوئی خلش یا چبھن پیدا ہو۔ اس صورتحال کی ذمہ داری سب سے بڑھ کر دانشوروں اور خصوصاً صحافیوں پر عائد ہوتی ہے کہ ان کا دماغ اور قلم اکثر و بیشتر قوم کے اجتماعی شعور کو تھپک تھپک کر اور لوریاں دے دے کر سلانے ہی کا کام کرتا ہے۔ اب یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ اس طبقے کے فہم و ادراک کے قصور کا نتیجہ ہے یا مصلحت بینی اور عافیت کوشی کا ثمرہ۔ اس لئے کہ اس دور میں اصل "سلطانِ جابر" عوام ہیں اور ان کے سامنے "کلمۂ حق" کہنا.... "لانا ہے جوئے شیر کا"

ہمارے نزدیک ہماری ذلت آمیز شکست کے متذکرہ بالا فوری اسباب اور سطحی سبب کے نیچے کے تہہ در تہہ اسباب میں سے پہلا سبب یہ ہے کہ نہ صرف اس جنگ بلکہ اس پورے قضیئے میں ہمارا سرے سے کوئی اخلاقی موقف ہی موجود نہ تھا، بلکہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں دسمبر ۷۰ء کے عام انتخابات کے انعقاد کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب بڑی دھاندلی اور صریح بددیانتی پر مبنی تھا۔ نتیجتاً چاہے ہم خود اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے میں کتنے ہی کامیاب ہو گئے ہوں بہرحال پوری دنیا کے سامنے ہم بالکل ننگے (Exposed) تھے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ دنیا میں جس کسی نے بھی ہمارے ملٹری ایکشن کی کسی درجے میں مدافعت کی اسے کس قدر بوجھ اپنے ضمیر پر ڈالنا پڑا ہو گا۔ خود ہم اپنے موقف کی مدافعت میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہہ سکے وہ یہ تھی کہ اس حمام میں صرف ہم ہی

ننگے نہیں ہیں بلکہ ع "ایں گناہیست کہ در شہر شمانیز کنند!" بھارت نے بھی تو کشمیر میں یہی کیا تھا اور خود رُوس بھی تو اپنے کئی حلیف ممالک میں یہی کچھ کر چکا ہے----!

اس معاملے کا افسوس ناک ترین پہلو یہ ہے کہ اس مسئلے میں بعض ایسے لوگوں نے بھی نہ صرف یہ کہ حکومتِ وقت کی تائید کی اور اس پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے بلکہ عملاً امداد اور تعاون کی روش اختیار کی اور ایک بددیانت اور شرابی و زانی ٹولے کا آلۂ کار بننا قبول کر لیا جو اس ملک کے سیاسی میدان میں حق و صداقت کے سب سے بڑے علمبردار رہے ہیں اور جن کا سارا سیاسی کاروبار دین و مذہب کے نام پر چل رہا ہے۔ ہمارا دل اس تصور سے کانپ اٹھتا ہے کہ اگر ع "قیاس کن زِ گلستانِ من بہار مرا" کے مصداق اسی واقعے کو ہماری قوم کی اخلاقی حس کو ماپنے کے لئے پیمانہ بنا لیا جائے تو نتیجہ کیا نکلے گا!---- ظلم اور دھاندلی کے خلاف بولنے کی جرأت اور ہمت نہ ہو تو کم سے کم خاموش تو رہا جا سکتا ہے۔ یہ کتنی بڑی ابن الوقتی اور جواری پن ہے کہ انسان اپنے مفادات پر نگاہ رکھتے ہوئے اور ذاتی مواقع کے پیش نظر کسی ظالم کے ظلم میں اس کا ساجھی اور مددگار بن جائے۔ ہماری قوم کے اخلاقی دیوالیہ پن کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ اس دھاندلی کے آغاز میں تو مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی کا لیڈر اس کا آلۂ کار بن گیا اور دوسرے مرحلے (Phase) میں جب اس لیڈر کو ہوش آ گیا اور اس نے دبی زبان سے ہی سہی ظلم کے خلاف کسی قدر بولنا شروع کیا تو اس ملک میں مذہب و سیاست کی سب سے بڑی علمبردار جماعت کو اس ظلم اور زیادتی کا آلہ کار بننے کا شرف حاصل ہو گیا۔

شکست کے اسباب و عوامل میں سے دوسرا گہرا سبب یہ ہے کہ ہم تاحال سیاسی اعتبار سے ایک "نابالغ" قوم ثابت ہوئے ہیں اور ہمارے یہاں جو ذمہ داریاں کسی قومی قیادت کو سنبھالنی چاہئیں تھیں ان کا بوجھ بھی فوج کو اٹھانا پڑا ہے۔ جدید دور کی ریاست (State) ایک بڑا عظیم اور ہمہ گیر ادارہ ہے اور اس میں مختلف ذمہ داریاں مختلف طبقوں کو اٹھانی پڑتی ہیں اور ع "ہر کسے را بہر کارے ساختند!" کے مصداق ہر طبقے کو اپنی مخصوص ذمہ داریوں کے لئے مناسب تربیت (Training) دی جاتی ہے اور جس طرح ملک کے دفاع اور اس کی سرحدوں کا تحفظ نہ عوام کے بس کا ہے نہ سِوِل انتظامیہ کے' اسی طرح اہل سیاست کے حصے کا بوجھ نہ فوج اٹھا سکتی ہے نہ سِوِل انتظامیہ۔ اور کسی قومی تنظیم اور قومی قیادت کے خلا کو کوئی دوسرا ادارہ پُر نہیں کر سکتا۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہماری حالیہ شکست قومی اور اجتماعی سطح پر ہماری مسلسل ناکامیوں (Failures) اور درجہ بدرجہ پسپائی کا نقطہ عروج (Climax) ہے اور بظاہر تو یہ نتیجہ ہے صرف ہماری فوج بلکہ صحیح تر الفاظ میں اس کی بھی صرف سابق عیاش اور بد کردار قیادت کے بودے پن کا، لیکن در حقیقت یہ منطقی انتہا ہے ہمارے سیاسی دیوالیہ پن کی اور مظہرِ اَتم ہے پوری پاکستانی قوم کی نااہلیت اور ناقابلیت اور اجتماعی و سیاسی نابالغی کا!

جیسا کہ ہم نے جولائی ۶۹ء کے محولہ بالا "تذکرہ و تبصرہ" میں بھی عرض کیا تھا، پاکستان کی رُبع صدی کی مختصری تاریخ کے ابتدائی گیارہ سالوں کے دوران یعنی ۴۷ء تا ۵۸ء تک کے عرصے میں، پاکستان کے سیاست دانوں کی نااہلی و ناقابلیت کا تدریجی ظہور ہوا اور اس کے اختتام کے قریب قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور شخصیتیں اس عظیم مملکت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں بالکل ناکام ہو چکی ہیں اور ان کے ہاتھوں اب کسی خیر کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کے فطری نتیجے کے طور پر ۱۹۵۸ء میں ایک انقلاب آیا جو بظاہر اور ابتداءً تو فوجی تھا لیکن اس نے بہت جلد ایک سابق فوجی کے زیر سربراہی ایک خالص نوکر شاہی کی صورت اختیار کر لی اور اہل سیاست کو میدان سے ہٹا کر مملکت کے دوسرے منظم ادارے یعنی سوِل سروسز نے ملک کے نظم و نسق کو سنبھال لیا۔ چنانچہ دوسرا گیارہ سالہ دور جو ۵۸ء تا ۶۹ء تک جاری رہا در حقیقت بیوروکریسی کا دور تھا اور اس کے دوران قوم کے اس دوسرے طبقے کی بھی بھرپور آزمائش ہو گئی، لیکن افسوس کہ اس دور کے بالکل ابتدا ہی سے ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا کہ قوم کا یہ طبقہ بھی دیانت و امانت اور احساسِ فرض کے ان اوصاف سے بہت حد تک عاری ہے جو اس عظیم ذمہ داری کو کماحقہٗ ادا کرنے کے لئے لازمی ہیں جو اس کے کندھوں پر آ پڑی ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس طبقے کی نااہلیت بھی واضح ہوتی چلی گئی اور ۶۸ء کے اواخر میں بے اطمینانی کا وہ لاوا جو قوم کے مختلف طبقات میں اس طبقے کی دست درازیوں کے باعث کھول رہا تھا اچانک پھٹ پڑا اور اس طرح یہ دور بھی دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔

ان دونوں طبقات کی ناکامی کے بعد ملک و ملت کے پاس ایک ہی منظم ادارہ باقی رہ گیا ہے، یعنی فوج۔ چنانچہ اب کی بار ایک خالص "جرنیلی حکومت" قائم ہوئی اور فوج نے ملک کے پورے نظم و نسق کو سنبھالا۔ ہم نے اسی وقت عرض کر دیا تھا کہ :

"اس ادارے کا اصل فریضہ دفاعِ وطن ہے اور یہ بجائے خود اتنی عظیم ذمہ داری ہے کہ اس پر کوئی مزید بوجھ ڈالنا صد درجہ ناانصافی ہے۔ بین الاقوامی حالات جس رخ پر جا رہے ہیں اس کے پیش نظر مستقبل میں دفاعِ وطن کی ذمہ داری یقیناً پہلے سے بھی کہیں زیادہ بھاری اور بوجھل ہو جائے گی اور ڈیفنس سروسز کے کندھوں پر اگر زیادہ دیر تک ملک کے داخلی نظم و نسق کا بوجھ بھی پڑا رہا تو اس سے دفاعِ وطن کے محاذ کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے اور یہ خطرہ اتنا بڑا ہے کہ اسے کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کیا جا سکتا"۔

اب اگر یہ ادارہ ان دو طرفہ ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے میں ناکام ہوا تو اس کا الزام جتنا اس کے سر آتا ہے اتنا ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ پوری قوم پر آتا ہے کہ اس نے اس پر اس کی بساط سے زیادہ بوجھ ڈالا ہی کیوں۔ لہٰذا سابق صدر یحییٰ خان اور ان کے رفقائے کار کی نااہلیت کے پردے میں دراصل پوری قوم کی ناقابلیت کا ظہور ہوا ہے اور ان کی ناکامی اصلاً پوری قوم کی ناکامی ہے۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ اربابِ سیاست اور بیورو کریسی کی نااہلیوں اور ناکامیوں کے نتائج صرف اندرونِ ملک بد انتظامی اور بے چینی و خلفشار تک محدود رہے تھے اور فوج کی ناکامی نے ہماری خامیوں اور نااہلیوں کا بھانڈا بین الاقوامی چوراہے میں پھوڑ کر رکھ دیا اور ہم اپنے قدیم دشمن کے ہاتھوں ایک شرمناک شکست سے دوچار ہو گئے۔

مزید گہرائی میں اتر کر دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پوری صورت حال کی تہہ میں دراصل وہی الجھاؤ (DILEMMA) کار فرما ہے جس کا ذکر ہم نے نومبر اے ء کی اشاعت میں شائع شدہ اپنی ایک تقریر میں کیا تھا۔ یعنی یہ کہ ایک طرف تو نہ پاکستان کے قیام کے لئے کوئی وجہ جواز مذہب کے سوا موجود ہے اور نہ ہماری قومیت کے لئے کوئی اساس دین کے سوا کسی چیز کو قرار دینا ممکن ہے۔ گویا کہ نظری اعتبار سے تو ہماری قومیت بھی صرف اور صرف اسلام ہے اور ہمارا وطن {۱} بھی صرف اور صرف اسلام ہے لیکن دوسری طرف عملاً صورت حال یہ ہے کہ یہی چیزیں یہاں کم ہوتے ہوتے بالکل معدوم کے حکم میں آ گئی ہیں۔ اس لئے کہ قیامِ پاکستان کے وقت تو پھر بھی، چاہے ایک جذباتی اور سطحی سی نوعیت ہی کا سہی، بہرحال ایک "جذبۂ ملی" ہمارے یہاں موجود تھا، لیکن بعد میں نہ صرف یہ کہ اسے غذا نہیں ملی، بلکہ رفتہ رفتہ ان جڑوں ہی کو کھود ڈالا گیا جو اسے امکانی طور پر سینچ

{۱} "اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے!"

سکتی تھیں۔ نتیجتاً اس وقت ہم بحیثیتِ قوم فضا میں معلق ہیں اور باوجود اس کے کہ ہمارے نیچے ایک ایسا خطۂ زمین موجود ہے جسے دنیا مغربی پاکستان کے نام سے جانتی ہے حقیقت یہ ہے کہ ہماری قومیت کی کوئی بنیاد بالفعل موجود نہیں۔

اب ظاہر ہے کہ قومی و ملی کردار اور سیاسی و اجتماعی شعور بہرحال کسی تصورِ قومیت ہی کی اساس پر وجود میں آسکتے ہیں اور کسی ملک کے رہنے والوں میں فکر کی کوئی ہم آہنگی، سوچ کی یکسانیت اور مقاصد کی یک جہتی کسی مشترک قومی جذبے ہی کی بنیاد پر پیدا ہو سکتی ہے، بلکہ خود انفرادی سیرت و کردار کی تشکیل و تعمیر کا انحصار بھی بہت حد تک اس اجتماعی شعور ہی پر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ۔

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں، اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

تو بحالاتِ موجودہ ہمارے اندر کوئی روح بیدار ہو تو کیسے؟ ہمارے قومی کردار کی تعمیر ہو تو کس طرح اور ملک و ملت کے لئے قربانی اور ایثار کا جذبہ پروان چڑھے تو کس بنیاد پر؟ یہی اصل سبب ہے اس کا کہ نہ ہمارے اندر کوئی اجتماعی شعور بیدار ہوا نہ کوئی قومی نقطہ نظر پیدا ہو سکا، نہ کوئی قومی تنظیم وجود میں آسکی، نہ کوئی قومی قیادت ابھر سکی۔ نتیجتاً ناکامیوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ پہلے اہل سیاست ناکام ہوئے، پھر بیوروکریسی فیل ہوئی اور آخر کار فوج کی ناکامی کی صورت میں ہمارے قومی وقار کو وہ دھکا لگا جس کی یاد نسلوں تک باقی رہے گی اور جس کی تلافی خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کب اور کس صورت میں ممکن ہو سکے گی!

افسوس کہ گزشتہ تین مہینوں کے دوران جو حالات و واقعات رونما ہوئے انہوں نے ان دو نکات، یعنی ایک یہ کہ پاکستان کی بحیثیتِ ملک اور اس میں بسنے والوں کی بحیثیتِ قوم کوئی اساس اور بنیاد اسلام کے سوا موجود نہیں اور دوسرے یہ کہ یہی جنس اب یہاں عنقا کے حکم میں ہے، کو نہایت تلخ لیکن حد درجہ سنگین حقائق کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے لا کر رکھ دیا ہے، چنانچہ ایک طرف ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے اور ایک "علاقائی قومیت" نے پاکستانی قومیت کے تصور پر فتح حاصل کر لی۔ علیحدگی پسندی کے اس عمل کا آغاز تو فطری طور پر وہیں سے ہوا جہاں جغرافیائی فاصلے کی ایک اضافی پیچیدگی بھی موجود تھی لیکن خود مغربی پاکستان میں بھی یہ عمل اندر ہی اندر جاری ہے اور حقیقت بین نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ مغربی پاکستان میں شمالاً جنوباً وہ دراڑ پڑ چکی ہے جو بڑھ کر کسی

خوفناک کھائی میں تبدیل ہو سکتی ہے ---- اور دوسری طرف پاکستان کے دونوں خطوں میں وہ قیادتیں برسرکار آگئی ہیں جن کا اور چاہے کسی بھی چیز سے کتنا ہی مضبوط رشتہ کیوں نہ ہو دین و مذہب سے بہرحال کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ "بنگلہ دیش" کی حکمران جماعت کے تو متعدد ذمہ دار لوگ کہہ ہی چکے ہیں کہ ہمارے تین بنیادی اصول وہی ہیں جن پر بھارت عمل پیرا ہے یعنی لادینیت جمہوریت اور سوشلزم' بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ "اگرچہ بنگلہ دیش مسلمانوں کی تعداد کے لحاظ سے دنیا میں دوسرا سب سے بڑا ملک ہے تاہم ہم یہ پسند نہیں کریں گے کہ اسے ایک مسلمان ملک کہا جائے"۔ اور ایک صاحب تو یہاں تک غزل سرا ہوئے ہیں کہ "ہم بنگلہ دیش میں اسلام کو کچل کر رکھ دیں گے!"۔ وَقِس علٰی ھٰذا۔ اِدھر مغربی پاکستان میں بھی اب وہ قیادت برسراقتدار آ گئی ہے جو اس نظریئے کی حامل ہے جسے ہمارے ملک کے ایک صد و چودہ علماء کرام نے کفر قرار دیا تھا۔ اور جو اگرچہ قولاً جمہوریت اور سوشلزم کے ساتھ اسلام کا پیوند بھی لگاتی ہے لیکن جس کی سیاست خالصتاً سیکولر اصولوں پر قائم ہے' چنانچہ وہ طریق انتخاب کے مسئلے میں کھلم کھلا جداگانہ کی بجائے مخلوط انتخابات کی حامی رہی ہے اور اگرچہ وہ اس امر کی مدعی ہے کہ "اسلام ہمارا دین ہے" تاہم اس سوال سے قطعاً بحث کرنے کو تیار نہیں کہ کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم!

متذکرہ بالا مباحث سے راقم الحروف کے نزدیک تین اہم نتائج مستنبط ہوتے ہیں :

ایک یہ کہ اگرچہ ملکی اور ملی استحکام کے لئے کرنے کے کام بے شمار ہیں تاہم پاکستان کا اصل استحکام اور ملتِ اسلامیہ پاکستان کے اتحاد اور یکجہتی کا اصل دارومدار "احیائے اسلام" پر ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص صرف بعض سماجی برائیوں (SOCIAL EVILS) مثلاً رشوت یا جہیز کی رسم ایسی چیزوں کے استیصال (ERADICATION) کے لئے کوئی حقیقی اور واقعی محنت کرتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بھی یقیناً قومی تعمیرِ نو ہی کا ایک کام کر رہا ہے اور اسے ملک و ملت کے ہر بہی خواہ کی اشیرواد حاصل ہونی چاہئے' لیکن ع "خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ" کے مصداق پاکستان دنیا کا ایک ایسا انوکھا ملک ہے جس کی واحد اساس مذہب ہے اور اس میں بسنے والے لوگ دنیا کی وہ واحد قوم ہیں جن کی قومیت کی کوئی بنیاد مذہب کے سوا موجود نہیں' لٰہذا یہاں ملک اور ملت دونوں کا

استحکام' آخری تجزیے میں' صرف ایک ہی شے سے وابستہ ہے اور وہ ہے احیائے دین و مذہب۔
اور یہ 'ایک اعتبار سے 'ایک بہت بڑی خوش قسمتی بھی ہے' اس لئے کہ انسان کو عقیدے' قومیت اور وطنیت کی ایسی "وحدت" شاذ ہی نصیب ہوتی ہے۔ ذرا ہندوستان کے کسی مسلمان کی حالتِ زار کو ذہن میں لائیے کہ وہ کیسے انتشارِ ذہنی اور خلفشارِ قلبی کا شکار ہے کہ اس کے دین و مذہب کے تقاضے اس کے دل و دماغ سے کچھ اور ہیں اور ملک و وطن کے تلخ حقائق اسے کسی اور جانب چلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ کسی عرب ملک کے دیندار مسلمان کا حال بھی یہ ہے کہ اس کا دین اسلام ہے' قومیت عربی اور وطنیت مصری یا سعودی یا اردنی۔ اس کے برعکس ایک پاکستانی مسلمان ہے کہ اس کا دین بھی اسلام' قومیت بھی اسلام اور وطن بھی اسلام۔
اس اعتبار سے حقیقت یہ ہے کہ میں خود اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا ہوں کہ جب میں احیائے دین کے لئے کسی حقیری خدمت میں اپنے آپ کو کھپا رہا ہوتا ہوں تو مجھے کامل اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ میں اپنے خالق و مالک کا حق بھی ادا کر رہا ہوں اور اپنی قوم اور ملک کا بھی۔ اس لئے کہ میری قوم کا اتحاد بھی اصلاً اسی میں مضمر ہے اور ملک کے استحکام کا دارومدار بھی حقیقتاً اسی پر ہے۔
دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ "احیائے اسلام" اور "احیائے دین و مذہب" کا کام فی الوقت سیاسی میدان میں نہیں کیا جاسکتا بلکہ ابھی ایک عرصے تک اس غرض کے لئے پوری قوت تعلیم و تدریس اور فکر و ادب کے میدان میں کھپانی ہوگی اور توجہ کو معاشرتی اور سماجی دائروں میں مرتکز رکھنا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ کسی ملک کے سیاسی میدان میں صرف وہی اقدار بروئے کار آسکتی ہیں جو فی الواقع معاشرے میں رچی بسی ہوئی ہوں اور لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں گہری جڑیں رکھتی ہوں۔ عوام کی سوچ کے زاویوں اور ان کی بنیادی اقدار کو بدلے بغیر سیاست کے میدان میں کسی انقلاب یا حقیقی تبدیلی کی توقع نہایت احمقانہ ہے۔ اور ادھر حال یہ ہے کہ فی الواقع ہمارے معاشرے میں دینی اقدار نہایت مضمحل بلکہ تقریباً مردہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ چوبیس سالوں کے دوران اس ملک کی سیاسی فضا میں جو کام دین کے نام پر کیا گیا وہ قطعاً بے ثمر اور لاحاصل ثابت ہوا۔
دوسری جانب مندرجہ ذیل معروضی حقائق ہیں جن کی تفصیل میں جانا اس وقت ممکن نہیں :

(تفصیل کے لئے دیکھئے راقم کی تالیف "استحکام پاکستان")

۱۔ ہماری ایک عظیم اکثریت کا دین و مذہب کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق نہیں!

۲۔ مذہب کے متوسّلین کی اکثریت کا تصورِ دین محدود بھی ہے اور مسخ شدہ بھی!

۳۔ وسیع تر تصور کے حامل لوگوں کی اکثریت بھی بالکل بے عمل ہے!۔۔۔اور

۴۔ فعّال مذہبی عناصر کا مجموعی اثر و نفوذ بھی نہایت قلیل اور ناقابل شمار ہے!!

یہ حقائق اگرچہ نہایت تلخ ہیں تاہم ہیں بالکل واقعی جن کا انکار سوائے ہٹ دھرمی اور بے جا ضد کے کسی طرح ممکن نہیں۔ تو سوچنا چاہئے کہ دین کے مستقبل سے حقیقی دلچسپی رکھنے والوں کا فی الوقت سیاسی میدان میں اپنی قوتوں کو ضائع کرتے رہنا آخر چہ سود؟

اس سے بھی بڑھ کر ہم چاہتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے حقِ نصح کی ادائیگی کے طور پر یہ عرض کر دیں کہ ملک کے سیاسی میدان میں اسلام کے نام پر جو کچھ ہوا اب تک تو وہ صرف لاحاصل اور بے کار ہی رہا ہے لیکن آئندہ انتہائی خطرناک بھی ہو سکتا ہے' اور اس وقت خود حکمتِ عملی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس میدان سے پسپائی اختیار کر کے پوری قوت کو تعلیم و تدریس اور ذہنی و فکری انقلاب پر مرکوز کر دیا جائے! یہ بات ہم بہت پہلے سے کہہ رہے ہیں لیکن اکثر و بیشتر ہماری بات کو کسی ضد یا تعصب پر محمول کیا گیا۔ لیکن اب حقائق تلخ ترین صورت میں سامنے آ چکے ہیں۔ کاش کہ اب بھی لوگ سوچنے پر آمادہ ہو جائیں اور ایک غلط میدان میں قوتوں کو ضائع کرتے رہنے سے باز آ جائیں!

تیسرا نتیجہ جو دراصل دوسرے نتیجے ہی کی منطقی انتہا ہے' یہ ہے کہ چونکہ دین کا قصر بنیادوں تک منہدم ہو چکا ہے لہٰذا اس کی سرسری مرمت سے کام نہیں چل سکتا بلکہ ضرورت بنیاد سے از سرِ نو تعمیر کی ہے' یا بالفاظِ دیگر یہ مرحلہ درحقیقت "قیامِ نظامِ اسلامی" کا نہیں بلکہ "تجدیدِ ایمان" اور "تعمیرِ یقین" کا ہے اور "احیائے اسلام" کے لئے لازم ہے کہ پہلے پورے معاشرے میں "احیائے ایمان" کی ایک ہمہ گیر تحریک برپا ہو جائے اور ایمان و یقین کی روشنی سے ہمارا معاشرہ جگمگا اٹھے۔

اس مرحلے پر ایک نگاہ بازگشت اپنے معاشرے پر اس اعتبار سے دوبارہ ڈال لیجئے کہ اس کے مختلف طبقات میں ایمان اور یقین واقعتاً کس حال میں ہیں۔

ہماری رائے میں ایمان اور یقین کا جائزہ لینے کی غرض سے ہم اپنے معاشرے کو تین طبقات میں تقسیم کر سکتے ہیں:

سب سے بڑا طبقہ عوام الناس پر مشتمل ہے جن کے یہاں ایمان درحقیقت نام ہے چند موروثی عقائد کا، جن کا ان کے فہم اور شعور سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ انہوں نے چند اعتقادات کو اپنے ذہن کے کسی گوشے میں بس رکھ تو لیا ہے لیکن ان کا کوئی لحاظ نہ رکھتے ہوئے زندگی کی عملی روش کو زمانے کے عام بہاؤ کے رخ پر ڈال دیا ہے --- اور اس سے زیادہ کی ان سے توقع بھی فضول ہے۔

دوسرا بڑا اور اہم ترین طبقہ پڑھے لکھے، سمجھدار، اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل ہے جن میں ڈاکٹر، انجینئر، وکلاء، سی ایس پی افسر، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر بلکہ یونیورسٹیوں کی زیر تعلیم نسل بھی شامل ہے۔

اس طبقے کی اکثریت، حقیقت یہ ہے کہ خالص ملحد لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان میں سے اکثر "خاموش ملحد" ہیں اور اپنے الحاد کو زبان پر نہیں لاتے، اگرچہ ایک چھوٹی سی اقلیت ایسے نسبتاً زیادہ جری اور بے باک لوگوں کی بھی موجود ہے جو کھلم کھلا اپنے الحاد کا اقرار اور اعلان کرنے سے نہیں ہچکچاتے!

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جدید تعلیم یافتہ طبقے میں خاصی تعداد میں ایسے بھلے لوگ بھی موجود ہیں جو کم از کم ایک ثقافت کی حد تک اسلام کے دامن سے وابستہ ہیں اور کچھ نماز روزہ کر لیتے ہیں۔ لیکن زیادہ گہرے تجزیئے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بھی ایک عظیم اکثریت ذہنی و فکری اعتبار سے دوغلی شخصیت (Split Personality) کی حامل ہے اور انہوں نے اپنے دماغ کے ایک کونے میں مذہب اور اس کے معتقدات کو رکھ چھوڑا ہے اور دوسرے خانے میں جدید افکار و نظریات کو، اور ان دونوں کو متضاد متصور کرتے ہوئے بھی بیک وقت قبول کر رکھا ہے۔

مثال کے طور پر جدید علم الحیات (Biology) جس شخص نے بھی پڑھا ہے وہ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کو ایک واقعہ تصور کرنے پر مجبور ہے یا کم از کم اس کی تردید کے لئے کوئی تشفی بخش دلائل نہیں رکھتا۔ دوسری طرف عام خیال یہی ہے کہ یہ نظریہ قرآن حکیم کے نظریۂ تخلیق و ہبوطِ آدم کی عین ضد ہے۔ لیکن ہمارے ڈاکٹروں اور علم الحیوانات یا علم النباتات کے فارغ التحصیل

لوگوں میں بہت سے ایسے نیک سرشت لوگ بھی موجود ہیں جو ان دونوں کو بیک وقت مانتے بھی ہیں اور ساتھ ہی ان کے دلوں میں یہ چور بھی موجود ہے کہ ہیں یہ دونوں چیزیں باہم متضاد اور ایک دوسرے کی کامل ضد!

حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم کے طبقہ متوسط کے بہت سے دینی مزاج رکھنے والے لوگ جو فعال مذہبی جماعتوں سے بھی وابستہ ہیں خود اس باطنی روگ کا شکار ہیں کہ ان کے اپنے دین و ایمان کو جدید علوم و فنون اور نظریات و افکار نے اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔

تیسرا طبقہ علماء کرام کا ہے۔ اس طبقے میں بلاشبہ کہیں کہیں علم و عرفان کی شمعیں روشن ہیں، لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس طبقے کی بھی اکثریت کا حال یہ ہے کہ اگرچہ ایمان کے اعلان میں سب سے زیادہ بلند و بانگ وہی ہیں لیکن عملی زندگی میں ان کی کیفیت خالص دنیاداری بلکہ دنیا پرستی کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ چنانچہ عوام الناس میں ایک کہاوت مشہور ہو چکی ہے کہ "مولوی جو کہے اسے سن بھی لیا کرو اور حتی الامکان اس پر عمل کی کوشش بھی کرو، لیکن جو کرے اسے دیکھا مت کرو"۔ یہ ہے حال ہمارے معاشرے کا ایمان اور یقین کے اعتبار سے!

چنانچہ ہمارے نزدیک تو "کرنے کا اصل کام" وہی ہے جو ہم نے تفصیل کے ساتھ اپنے کتابچے "اسلام کی نشاۃ ثانیہ" میں بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ قرآن حکیم کی روشنی میں وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر ایک ایسی زبردست فکری تحریک برپا کی جائے جو ایک طرف منفی طور پر جدید مادہ پرستانہ اور ملحدانہ افکار و نظریات کا مدلّل ابطال کرے اور دوسری طرف مثبت طور پر معاشرے کے پڑھے لکھے اور ذہین طبقے (Intelligentsia) کے قلوب و اذہان میں ایمان اور یقین کی شمعیں روشن کر دے۔ اس لئے کہ جہاں تک عوام الناس کا تعلق ہے ان کے قلوب میں تو نورِ ایمان صرف اصحابِ یقین کی صحبت سے بھی پیدا ہو سکتا ہے اور یہ کام ہمارے معاشرے میں اس گئے گزرے دور میں بھی کسی نہ کسی درجے میں ہو رہا ہے، یعنی جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا علماء کرام کے حلقوں میں کہیں کہیں علم و عرفان کی جو شمعیں روشن ہیں ان سے عوام الناس کی حد تک ماحول میں کچھ نہ کچھ نورِ ایمان سرایت کر ہی رہا ہے، لیکن متذکرہ بالا ذہین طبقہ اپنے ذہن کی ساخت اور مزاج کی افتاد کے اعتبار سے مجبور و محتاج ہے کہ پہلے ان کے ذہن کی گرہیں کھولی جائیں، اور اسے گمراہ کن افکار و نظریات سے خلاصی دلائی جائے، تب ہی ان کے قلوب و اذہان ایمان اور یقین کی روشنی کو قبول کرنے کے

لئے تیار ہو سکیں گے!---- اس موضوع پر ہم تفصیل کے ساتھ اپنے متذکرہ بالا کتابچے میں گزارشات پیش کرچکے ہیں۔ اور جہاں تک راقم الحروف کا تعلق ہے اس کا حال تو اس معاملے میں واقعتاً اب وہ ہو چکا ہے کہ۔

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
اِلّا حدیثِ دوست کہ تکرار می کنیم

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ زندگی کو تعلیم و تعلّمِ قرآن ہی میں صرف کر دینے کی توفیق عطا کئے رکھے! آمین ۔

بقیہ : "..... وقتِ دعا ہے !"

کی نشر و اشاعت اور اس کے دین کے غلبے کے مقصد میں صرف ہو گا اور وہ پاکستان میں ایک صحیح معنی میں اسلامی معاشرہ اور حقیقی معنوں میں اسلامی ریاست کے قیام کو اپنی زندگی کا اصل نصب العین بنائے رکھے گا۔

تب اگر وہ اللہ تعالیٰ سے پاکستان کی سلامتی کی دعا کرے گا تو وہ یقیناً مقبول ہو گی۔ راقم خود اسی عزم اور ارادے کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں پاکستان کی فتح کی درخواست پیش کرتا ہے اور ساتھ ہی جاننا چاہتا ہے کہ کون ہیں وہ لوگ جو اس عزم اور ارادے میں اس کے ساتھ ہیں------ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔ آمین یا ربَّ الْعٰلَمِیْن!!

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

جلد: ۴۵
شمارہ: ۸
ربیع الاوّل ۱۴۱۷ھ
اگست ۱۹۹۶ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زرِ تعاون ۱۰۰/-

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

ادارہ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر 15 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات، قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ 22 امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مقام اشاعت: 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون: 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

زیر نظر شمارے کا نمایاں ترین اور بہت سے اعتبارات سے اہم ترین مضمون تو وہی ہے جس کا حوالہ سرورق پر مذکور ہے یعنی امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ۵ / جولائی کا خطاب جمعہ جس میں انہوں نے ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال بلکہ بحرانی کیفیت کا موازنہ ماضی کے دو بحرانی ادوار سے کیا ہے اور اس کی تمہید کے طور پر ملک کی سیاسی تاریخ اور اس میں اتار چڑھاؤ کے مختلف ادوار کا بھرپور جائزہ بھی نہایت جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسے حسن اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ گزشتہ تین ماہ کے دوران ماہنامہ "میثاق" میں امیر تنظیم کے ۶۹ء سے ۷۷ء کے عرصے میں ضبط تحریر میں آنے والے پر مغز سیاسی تجزیے بالاقساط شائع کئے گئے۔ ان مضامین کی مکرر اشاعت کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ ملکی سیاسی امور میں رفقاء و احباب کی ذہنی تربیت کا سامان فراہم ہوا۔

ہم مسلمانان پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ ہماری ایک عظیم اکثریت اپنے ذاتی مسائل اور کسب معاش کی مصروفیت میں اس درجے منہمک ہے کہ اسے یہ سوچنے کی فرصت ہی نہیں کہ ملک کے سیاسی حالات کیا ہیں، ہم بحیثیت قوم کس رخ پر بڑھ رہے ہیں، ہماری پیش قدمی اپنے اصل ہدف یعنی قیام نظام اسلام کی جانب ہو رہی ہے یا ہم سیکولرزم کی راہ پر گامزن ہو کر بتدریج اپنے ہدف سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں، امت مسلمہ میں ہمارا کیا مقام ہے اور بین الاقوامی سطح پر ہم آج کس مقام پر کھڑے ہیں، وغیرہ۔۔۔ ایک غم روزگار نے ہمیں ہر دوسرے غم سے بیگانہ کیا ہوا ہے۔ ہماری عظیم اکثریت کا معاملہ تو یہی ہے، باقی رہ جانے والی ایک مختصر اقلیت جو ان معاملات کا کچھ شعور رکھتی ہے اس میں شامل اکثر افراد کا معاملہ بھی یہ ہے کہ ان کی سوچ کا دائرہ بہت تنگ اور مشاہدہ نہایت سطحی ہے۔ یہ لوگ بالعموم گروہی تعصبات میں مبتلا ہونے کے باعث ملکی و قومی اور سیاسی حالات کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں۔ دین کے وسیع تر تصور سے ناآشنا ہونے کے سبب یہ لوگ میدان سیاست میں برسرکار سیکولر قوتوں میں سے کسی ایک کو حق کا علمبردار اور دوسرے کو باطل کا نمائندہ گردانتے ہیں۔ چنانچہ ان کے مابین ہونے والی انتخابی کشمکش کو کفر و اسلام کی جنگ قرار دے کر معاشرے میں ایک مصنوعی فضا پیدا کر دی جاتی ہے، جسے حقیقت کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ ملک میں موجود مختلف دینی و مذہبی سیاسی جماعتوں سے متعلق افراد کی اکثریت بھی بدقسمتی سے اسی سوچ کے حامل اشخاص پر مشتمل ہے۔

ان حالات میں اس امر کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے کہ مسلمانان پاکستان کی بالعموم اور رفقاء و احباب کی بالخصوص ذہنی تربیت کا سامان کیا جائے، ملکی سیاسی معاملات میں ان کی سوچ کو صحیح خطوط پر استوار کیا جائے اور ان کے اندر قومی و ملی معاملات کا شعور پیدا کیا جائے۔ بحمد اللہ ان مقاصد کے حصول میں یہ مضامین بہت ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔ بہت سے رفقاء و احباب نے ان مضامین

کی اشاعت پر خوشگوار حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ان کی افادیت کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔
پچیس تیس سال پرانے ان مضامین کی اشاعت کا ایک اضافی فائدہ یہ بھی ہوا کہ ملکی و قومی معاملات اور سیاسی امور میں امیر تنظیم اسلامی کی بالغ نظری' اصابت رائے' غیر جانبدارانہ سوچ اور بے لاگ تجزیہ نگاری کا وصف بھی کھل کر قارئین کے سامنے آیا ہے۔ چنانچہ بعض سنجیدہ اور اصابت فکر کے حامل احباب نے ان مضامین کو پڑھ کر ان کی افادیت کے پیش نظر امیر تنظیم سے پر زور مطالبہ کیا ہے کہ وہ سیاسی تجزیہ نگاری کا کام نہ صرف یہ کہ آئندہ بھی باقاعدگی سے جاری رکھیں بلکہ ہر دوسرے کام پر اسے ترجیح دیں۔ ان کی رائے میں ان امور میں رفقاء و احباب ہی کی نہیں مسلمانان پاکستان کی بھی ذہنی و فکری تربیت وقت کا نہایت اہم تقاضا ہے۔ ہمیں یہاں اس رائے کے حق میں یا اس کے خلاف کچھ عرض نہیں کرنا' بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ ان مضامین کے بارے میں احباب کے تاثرات قارئین تک پہنچا دیئے جائیں۔

زیر نظر شمارے میں شامل امیر تنظیم کے خطاب کو بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھا جائے۔ اس خطاب کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ ملکی سیاسی تاریخ کے فکر انگیز تجزیئے اور ملک کی موجود الوقت سیاسی صورتحال کے ماضی کے دو سیاسی بحرانوں کے ساتھ تقابل پر مشتمل ہے۔ خطاب کا یہ حصہ ایسے ٹھوس حقائق و واقعات پر مشتمل ہے کہ اس کے مندرجات سے اختلاف کی گنجائش بہت ہی کم ہے' بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ملکی و قومی امور میں عوام کی ذہنی و فکری تربیت کے نقطہ نگاہ سے یہ بہت قیمتی حصہ ہے تو یہ بات ہرگز غلط نہ ہوگی۔ تاہم دوسرا حصہ جو قاضی حسین احمد صاحب کی حالیہ احتجاجی تحریک جسے خود قاضی صاحب نے "دھرنا" کا عنوان دیا' سے بحث کرتا ہے' چونکہ ایک ایسے معاملے سے متعلق ہے جو زمانہ حال سے تعلق رکھتا ہے اور جس کا تسلسل ابھی جاری ہے لہٰذا اس کے بارے میں کہنے سننے اور اختلاف رائے کی وسیع گنجائش موجود ہے۔ اس لئے کہ وہ واقعات جو ماضی کا حصہ بن جاتے ہیں ان کے عواقب و نتائج سامنے آنے کے بعد ان کے بارے میں رائے زنی آسان ہوتی ہے لیکن کرنٹ واقعات کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ محترم قاضی صاحب کی اس "دھرنا" تحریک کے بارے میں امیر تنظیم اسلامی نے اپنی دیانتدارانہ رائے اور بے لاگ تجزیہ اس خطاب میں صاف لفظوں میں سامنے رکھ دیا ہے۔ امیر تنظیم کی اصابت رائے اور معاملات کے تجزیہ کرنے کی صلاحیت کا ایک زمانہ معترف ہے تاہم یہ کوئی وحی آسمانی نہیں ہے' ایک انسانی کاوش ہے جس میں خطا کا احتمال بہرطور موجود ہوتا ہے' چنانچہ اس سے اختلاف کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ ان معاملات میں وقت سب سے بڑا قاضی ہے۔ آنے والا وقت بتا دے گا کہ امیر تنظیم کا یہ تجزیہ درست تھا یا اس سے اختلاف رکھنے والوں کی رائے مبنی بر صواب تھی۔ ○○○

مشمولات

پاکستان کے موجودہ حالات کا ماضی کے دو بحرانی ادوار سے تقابل

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ۱۵/ جولائی کا خطاب جمعہ

○

خطبہ مسنونہ ' سورۃ الروم کی آیات ۴۱ تا ۴۵ کی تلاوت اور ادعیہ ماثورہ کے بعد فرمایا :

جیسا کہ آپ حضرات نے اخباری اعلان میں دیکھ لیا ہو گا' آج میری پوری گفتگو بنیادی طور پر ملکی و قومی حالات اور ضمنی طور پر بھارت اور افغانستان کے حالات کے بارے میں ہو گی۔ اگرچہ بین الاقوامی معاملات کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے' لیکن بھارت اور افغانستان ہمارے سب سے قریبی پڑوسی ہیں جن کے ساتھ ہماری سب سے طویل سرحدیں ہیں' لہٰذا ان کا معاملہ ہمارے لئے اہم تر ہے۔

ملکی و قومی حالات پر میری آج کی گفتگو کا ایک خاص سبب تو یہ ہے کہ ملک کی ایک اہم نیم سیاسی و نیم مذہبی جماعت ' جماعت اسلامی نے اچانک ایک ایجی ٹیشن کا آغاز کیا ہے۔ چونکہ ہم خود اسلامی انقلاب کا جو لائحہ عمل بیان کرتے ہیں اس کا آخری مرحلہ بھی ایجی ٹیشن ہے' لہٰذا بہت سے حضرات کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ شاید جماعت اسلامی کا موجودہ ایجی ٹیشن اسی طریقہ کار کا مظہر ہے۔ لیکن میں اس کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ چہ آئیں وہ یاں خدا کرے' پر نہ خدا کرے کہ یوں! در حقیقت یہ ایجی ٹیشن کسی اور نوعیت کا ہے اور جس ایجی ٹیشن کا ہم نے نقشہ پیش کیا ہے وہ بالکل دوسری نوعیت کا ہے۔ اس ضمن میں مغالطے پیدا نہیں ہونے چاہئیں۔

اس کا دوسرا اہم سبب یہ ہے کہ اِس وقت سب دیکھ رہے ہیں کہ ملک پھر ایک سیاسی بحران کے بھنور میں پھنس رہا ہے۔ اس بارے میں بے نظیر صاحبہ نے تو یہ کہا ہے کہ موجودہ حالات ۷۷ء کے حالات کے مشابہ ہیں اور ایک نیا ضیاء الحق پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ میرے نزدیک اگرچہ ۷۷ء کے حالات اور موجودہ حالات میں بہت سے معاملات مشترک ہیں' مثلاً وہ ایجی ٹیشن ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تھا اور یہ ایجی ٹیشن بے نظیر بھٹو کے خلاف ہے اور باپ بیٹی کا رشتہ دونوں کے مابین قدر مشترک ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سی چیزیں قدرِ مشترک کی حیثیت سے گنوائی جاسکتی ہیں۔ لیکن میرے اپنے تجزیئے میں یہ حالات ۶۹ تا ۷۱ء کا جو ایک بحرانی دور گزرا ہے اس سے زیادہ مشابہ ہیں۔ میں جب ان حالات کا تذکرہ کرتا ہوں تو ہمارے بعض نوجوان ان کا صحیح طور سے اندازہ نہیں کرپاتے۔ ابھی حال ہی میں روزنامہ وفاق کی طرف سے ایک نوجوان صحافی انٹرویو لینے کے لئے آئے' وہ بھی ان حالات سے اتنے ناواقف تھے کہ کہنے لگے کہ میری تو عمر اس وقت تین برس کی تھی جب سقوطِ مشرقی پاکستان کا سانحہ ہوا ہے۔ جبکہ ہمیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کل کی بات ہے' کیونکہ یہ حالات ہماری نگاہوں سے گزرے ہیں' بلکہ ہم ان حالات میں سے ہو کر گزرے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اِس وقت کی نوجوان نسل ان حالات سے سرے سے واقف نہیں ہے۔ وہ کیا حالات تھے؟ ع "یہی عالم تھا جس عالم میں دنیا لٹ گئی اپنی!" اُس وقت ملک دولخت ہوا تھا اور تاریخ کی عظیم ترین ہزیمتوں اور شرمناک ترین شکستوں میں سے ایک ہمارا مقدر بنی تھی۔ ہمارے ۹۳ ہزار جنگی قیدی (P.O.W) جن میں سے ۴۳ ہزار ریگولر فورسز کے لوگ تھے' اس ہندو کے قبضے میں گئے جس پر ہم نے کہیں ہزار سال تک حکومت کی تھی' کہیں آٹھ سو اور کہیں چھ سو برس تک۔ یہ حادثہ تاریخ کے المناک ترین حوادث میں سے ایک تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس صدی میں یا تو سلطنتِ عثمانیہ کا خاتمہ امتِ مسلمہ کے لئے ایک عظیم حادثہ تھا جو پہلی جنگ عظیم کے بعد ہوا' اور یا پھر یہ جو دو حوادث ہوئے کہ ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کے مقابلے میں عربوں کی شرمناک شکست' اور ۱۹۷۱ء کا سقوطِ مشرقی پاکستان کا حادثہ۔ یوں سمجھئے کہ اس صدی میں امتِ مسلمہ کی پیشانی پر یہ تین بہت بڑے داغ لگے ہیں۔

پاکستان کا چار سو سالہ پس منظر

آج کے حالات میں مجھے چونکہ اُس وقت کے حالات سے مشابہت نظر آ رہی ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ ؎

آگ ہے ' اولادِ ابراہیم ہے ' نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

لہٰذا میں ان حالات کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہوں گا۔ اور اس ضمن میں میری سوچ کا ایک خاص dimension بھی ہے۔ میں نے بارہا عرض کیا ہے کہ پاکستان کا قیام در حقیقت مشیتِ ایزدی کا ایک مظہر ہے۔ ایک اعتبار سے تو ہر معاملے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو بھی چیز واقع ہو گئی ہو وہ اذنِ رب کے بغیر تو نہیں ہوئی' اس لئے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے' وہ قادرِ مطلق ہے' اس کی اجازت کے بغیر تو پتا بھی نہیں ہلتا۔ لیکن میں اس اِذن سے آگے بڑھ کر کہہ رہا ہوں کہ پاکستان مشیتِ ایزدی کا ایک خاص مظہر ہے۔ میرا فلسفہ یہ ہے کہ پاکستان کا قیام احیائے اسلام اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی الٰہی تدبیر کی ایک اہم کڑی ہے۔ در حقیقت اللہ تعالیٰ کی تدبیر بڑی طویل ہوتی ہے۔ ہمارے منصوبے بنتے ہیں تو وہ پانچ سالہ یا سات سالہ منصوبے ہوتے ہیں' لیکن اللہ کا منصوبہ ہزار برس کا ہوتا ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی : "اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ" (الحج : ۴۷) "تمہارے رب کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے"۔ اسی طرح سورۂ سجدہ میں فرمایا : "یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ" (آیت ۵) "وہ آسمان سے زمین تک (دنیا کے) معاملات کی تدبیر کرتا ہے اور اس تدبیر کی روداد اوپر اس کے حضور جاتی ہے' ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے"۔ اس حوالے سے اللہ کی تدبیر بڑی طویل ہوتی ہے۔

اس اعتبار سے پاکستان کا کم از کم چار سو برس کا پس منظر میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ علمی اور روحانی اعتبار سے امتِ مسلمہ کا جو مرکزِ ثقل (Centre of Gravity) تھا وہ چار سو برس پہلے برِ عظیم پاک و ہند میں منتقل ہو گیا۔

اس سے پہلے ایک ہزار برس تک تمام مجددینِ امت عالمِ عرب میں پیدا ہوئے' لیکن امتِ مسلمہ کی تاریخ کے پہلے ہزار برس مکمل ہونے کے بعد تمام مجددین امت اس صنم خانہ ہند میں پیدا ہوئے۔ چنانچہ الفِ ثانی کے مجددِ اعظم' مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی"' شیخ عبدالحق محدث دہلوی"' حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی" اور سید احمد بریلوی" سب یہیں پیدا ہوئے۔ پھر گزشتہ صدی ہجری میں شیخ الہند مولانا محمود حسن' علامہ اقبال' مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا الیاس (رحمہم اللہ تعالیٰ) جیسی نابغہ روزگار شخصیتیں اس سرزمین میں پیدا ہوئیں' جن کے پائے کی کوئی شخصیت پورے عالم اسلام میں کہیں اور پیدا نہیں ہوئی۔

قیامِ پاکستان اور سُنّت اللہ

پاکستان کے قیام کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اصول کی بنیاد پر ہوا تھا کہ جب کوئی قوم اجتماعی طور پر اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد کرے کہ "اے اللہ تُو یہ کر دے تو ہم یہ کریں گے" تو اللہ تعالیٰ اس قوم کی دعا قبول کر کے اسے امتحان سے دوچار کر دیتا ہے۔ ہندوستان میں بسنے والی پوری مسلمان قوم نے اللہ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اے اللہ تو ہمیں ہندو اور انگریز کی دوہری غلامی سے نجات دے دے اور ایک آزاد خطۂ ارضی عطا فرما دے تو ہم وہاں تیرے دین کا بول بالا کریں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک آزاد ملک عطا فرما دیا۔ اگرچہ قائداعظم محمد علی جناح نے' جو واقعتاً تحریکِ پاکستان کے فعّال قائد تھے' قیام پاکستان سے ایک سال پہلے آزاد پاکستان کے مطالبے سے دست برداری اختیار کر لی تھی اور کیبنٹ مشن پلان تسلیم کر لیا تھا' جس کے تحت ہندوستان ایک مرکزی حکومت کے تحت آزاد ہوتا' جو تین زون (Zones) پر مشتمل ہوتا' مشرقی زون اور مغربی زون میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی اور سنٹرل زون میں ہندوؤں کی اکثریت ہوتی۔ مستقبل کے لئے اس پلان میں یہ طے کیا گیا تھا کہ دس سال بعد ان میں سے کوئی زون علیحدہ ہونا چاہے تو اسے اختیار ہو گا۔ گویا کہ ایک علیحدہ ملک کا امکان دس سال کے لئے تو بہرحال مؤخر ہو رہا تھا اور قائداعظم نے اسے تسلیم کر لیا تھا' لیکن اللہ نے فرمایا کہ نہیں' ابھی لو' آزاد اور خود

مختار پاکستان لو! جب تم نے کہا ہے کہ ہم وہاں تیرے دین کا بول بالا کریں گے تو ہم تم پر حجت قائم کر رہے ہیں' فَنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ پھر ہم دیکھیں گے کہ تم کرتے کیا ہو! ہم سے کیا ہوا وعدہ پورا کرتے ہو یا وعدہ خلافی کرتے ہو! لیکن ہم نے اللہ سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کے بجائے ان منافقین کا سا طرز عمل اختیار کیا جن کا ذکر سورۃ التوبہ کی آیات ۷۵' ۷۶' ۷۷ میں وارد ہوا ہے۔ میں یہ آیات بارہا بیان کر چکا ہوں' تذکیر و یاد دہانی کے لئے ان کا پھر مطالعہ کر لیجئے :

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝﴾

"اور ان (منافقین) میں ایک خاص قسم ایسے لوگوں کی بھی ہے جنہوں نے اللہ سے ایک عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا (دولت مند بنا دے گا) تو ہم خوب صدقہ و خیرات کریں گے اور نیک بن جائیں گے"۔

﴿ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝﴾

"پھر جب اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا تو اب وہ اس دولت کے ساتھ بخل کا معاملہ کرنے لگے' انہوں نے پیٹھ موڑ لی اور اعراض کرنے لگے"۔

یعنی انہوں نے اللہ سے کیا ہوا وعدہ بھلا دیا اور اپنی تجوریوں کو تالے لگا دیئے۔ ان کے اس طرز عمل کا نتیجہ کیا نکلا؟

﴿ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝﴾

"چنانچہ اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق کی بیماری پیدا کر دی اس دن تک جب وہ اس سے ملاقات کریں گے' اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ سے کئے ہوئے وعدے کی خلاف ورزی کی اور اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے"۔

یہی معاملہ اس پاکستانی قوم کے ساتھ پیش آیا کہ اس کی وعدہ خلافی کی وجہ سے اس پر نفاق کی بیماری مسلط کر دی گئی۔ چنانچہ ایک طرف یہ نفاقِ باہمی کا شکار ہو گئی اور قوم قومیتوں میں تحلیل ہو گئی۔ اب نئی نئی قومیتیں ہیں۔ فرض کیجئے پہلے پانچ قومیتیں تھیں' تو

اب ان میں بہت سی قومیتوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ پہلے بنگلہ قومیت، پنجابی قومیت، سندھی قومیت، بلوچی قومیت اور پٹھان قومیت ہوا کرتی تھیں، لیکن اب ان کے علاوہ مہاجر قومیت، سرائیکی قومیت اور نامعلوم کتنی قومیتیں ہیں۔ ہر قومیت کئی مزید قومیتوں میں بٹ چکی ہے۔ پھر یہ کہ مذہبی اختلافات فرقہ واریت کی شکل اختیار کر چکے ہیں اور ان کی بنیاد پر باہمی خون ریزی شروع ہو چکی ہے۔ یہ سارے نفاقِ باہمی کے مظاہر ہیں۔ دوسری طرف یہ قوم نفاقِ عملی کا شکار ہو گئی۔ حدیث میں آتا ہے کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں، چاہے وہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور اپنے آپ کو بڑا مسلمان سمجھتا ہو، لیکن اگر اس میں یہ تین خصلتیں موجود ہیں تو وہ کٹر منافق ہیں۔ وہ تین چیزیں حدیث میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہیں: "اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ، وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ" (متفق علیہ) یعنی "جب بات کرے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور کہیں امین بنا دیا جائے (چاہے اختیارات کی امانت ہو یا مال کی امانت) تو خیانت کرے"۔ نفاقِ عملی کی یہ تینوں نشانیاں ہماری پاکستانی قوم میں بحیثیت مجموعی بتمام وکمال موجود ہیں۔

مزید برآں اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے وعدے کو فراموش کرنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کا ایک کوڑا سوا پچیس برس انتظار کرنے کے بعد سقوطِ مشرقی پاکستان کی صورت میں ہماری پیٹھ پر برسا۔ قیامِ پاکستان (اگست ۴۷ء) سے سقوطِ مشرقی پاکستان (دسمبر ۷۱ء) تک شمسی حساب سے اگرچہ سوا چوبیس برس بنتے ہیں لیکن قمری حساب سے یہ سوا پچیس برس ہو جاتے ہیں۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر میں بار بار کہتا ہوں کہ اب شاید پھر وہی وقت آ رہا ہے، اگلے سوا پچیس برس اب پھر پورے ہو رہے ہیں۔ تو میری سوچ کے اندر چونکہ یہ dimensions بھی ہیں تو مجھے تو بار بار خیال آتا ہے کہ ؎

الٰہی خیر میرے آشیاں کی
زمیں پر ہیں نگاہیں آسماں کی!

معلوم ہوتا ہے کہ ہماری شامتِ اعمال پھر کسی عذابِ الٰہی کو دعوت دینے والی ہے۔ اس اعتبار سے مجھے یہ حالات ۶۹ء سے ۷۱ء تک کے حالات سے زیادہ مشابہ نظر آ رہے ہیں اور اسی کا آج مجھے تجزیہ پیش کرنا ہے۔

پاکستان سے وابستہ امیدیں اور آرزوئیں

میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ ملکی سیاست سے مجھے اس اعتبار سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ گاؤ آمد و خر رفت یا خر آمد و گاؤ رفت۔ میرے نزدیک موجودہ نظام کی موجودگی میں پیپلز پارٹی کی حکومت ہو یا مسلم لیگ کی حکومت، کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ چہرے بدلتے ہیں، تھوڑا سا انداز بدلتا ہے، اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہی سودی نظام، وہی جاگیردارانہ نظام، وہی امریکہ کے کھڑے کی مچھلی اور آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی اسامی بن کر رہ جانا، یہ ساری پالیسیاں مشترک ہیں، ان میں سرِمو کوئی فرق نہیں۔ لہٰذا سیاسی حالات میں میری دلچسپی اس معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا تھا لیکن ابھی تک یہاں اس کے قیام کے مقصد کی طرف کوئی مثبت پیش رفت نہیں ہوئی۔

مسلمان زعماء میں سے مولانا ابوالکلام آزاد قیامِ پاکستان کے شدید ترین مخالف تھے، لیکن پاکستان بننے کے بعد انہوں نے بھی یہ کہا تھا کہ جب تک پاکستان بنا نہیں تھا مسئلہ اور تھا، مگر اب اسلام کی عزت پاکستان کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے۔ کشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک اہم سیاسی راہنما تقسیمِ ہند کے وقت پاکستان آ گئے تھے۔ ابتداء میں آمد و رفت کی زیادہ پابندیاں نہیں تھیں۔ یہ دوبارہ انڈیا گئے اور وہاں پر نہرو سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ آپ کیوں چلے گئے ہیں؟ آپ واپس آ جائیے، ہم آپ کو کسی مسلمان ملک میں سفیر بنا کر بھیجتے ہیں۔ ان کے دل میں بھی اس پر کچھ آمادگی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد یہ ابوالکلام آزاد سے ملنے گئے۔ مولانا آزاد نے جب ان سے نہرو سے ملاقات کے بارے میں پوچھا اور انہوں نے ان کی پیشکش کے بارے میں بتایا تو مولانا آزاد نے کہا: "نہیں میرے بھائی! اب تم پاکستان کو مستحکم کرو۔ اب جا کر اپنی صلاحیتیں اور قوتیں وہاں لگاؤ۔ اب اس کے ساتھ اسلام کی عزت وابستہ ہو گئی ہے"۔ اسی طرح کا واقعہ مولانا محمد مالک کاندھلویؒ شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ نے ہماری قرآن کانفرنس میں سنایا تھا کہ قیامِ پاکستان کے بعد مولانا حسین احمد مدنیؒ ڈابھیل گئے ہوئے تھے، وہاں پر ایک نشست ہو رہی تھی، کسی

..... نے ایسے ہی پاکستان کا ذکر چھیڑ دیا کہ دیکھیں اب شاید مولانا مدنی کی طرف سے بڑے غیظ و غضب کا اظہار ہو۔ لیکن اس پر مولانا کی طرف سے عجیب تاثرات کا اظہار ہوا۔ مولانا نے فرمایا کہ دیکھو بھائی' جب تک مسجد بن نہیں جاتی' اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے کہ یہاں مسجد بنانی چاہئے یا نہیں۔ پھر یہ کہ کتنی لمبی چوڑی بنانی چاہئے' اس کا کیا نقشہ ہونا چاہئے' اس کے اندر کیا میٹریل لگنا چاہئے' سب میں اختلافات کی گنجائش ہے' لیکن جب مسجد بن جائے تو اب اس کا اینٹ گارا محض اینٹ گارا نہیں رہا' اب وہ مسجد کا جزوِ لاینفک بن گیا ہے۔ اب اس کی حفاظت ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔

یہ مملکتِ خداداد جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی تھی اس سے کیسے کیسے لوگوں کی امیدیں وابستہ تھیں' لیکن اب اس خیال سے دل کانپتا ہے کہ کہیں ایک کے بعد اب عذابِ الٰہی کا دوسرا کوڑا بھی برسنے کے لئے تیار نہ ہو۔ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں جلّاد اپنا ہاتھ اونچا نہ کرچکا ہو۔ لیکن پھر بھی ؎

اے آندھیو سنبھل کے چلو اس دیار میں
امید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم!

بہرحال ایک امید ابھی باقی ہے' ٹمٹماتی ہوئی امید' جو کبھی حوصلہ دیتی ہے ' پھر دھندلا جاتی ہے' اس کی روشنی کبھی تھوڑی سی بڑھتی ہے' پھر اس کے اوپر مایوسی کے اندھیارے طاری ہو جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی کبھی نہ کبھی وہ چمک اٹھتی ہے۔ ایک طبیب کے الفاظ میں اس کے بارے میں کہا جائے گا "جب تک سانس تب تک آس"۔ جب تک یہ ملک باقی ہے' کوئی نہ کوئی توقع ہے' بالفاظ قرآنی لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ شاید کہ یہ لوٹ آئیں' اور لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ کیا عجب کہ تقویٰ کی روش اختیار کر ہی لیں!

اب آیئے' اِس وقت کے حالات کیا ہیں؟ ان کا کیا پس منظر ہے؟ آیا یہ ۷۷ء کے حالات سے مشابہ ہیں یا ۶۹ تا ۷۱ء کے حالات سے مشابہ ہیں؟ اس کے لئے میں چاہتا ہوں کہ پہلے پاکستان کے ابتدائی بائیس برس کو گیارہ گیارہ برس کے دو ادوار (۴۷ء تا ۵۸ء اور ۵۸ء تا ۷۱ء) کے حوالے سے سمجھ لیجئے۔

پاکستان کے ابتدائی گیارہ سال

قیام پاکستان کے بعد پہلے گیارہ برس (۴۷ء تا ۵۸ء) کے دوران تین کام ہوئے۔ سب سے پہلے یہ کہ مسلم لیگ، جو بانی پاکستان مسلم لیگ تھی، تین برس کے اندر اندر تحلیل ہو گئی۔ نام کی مسلم لیگیں تو اب بھی ہیں، لیکن اصل مسلم لیگ باقی نہ رہی۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ سا یاد آگیا ہے۔ جب مولانا مودودی پہلی مرتبہ گرفتار ہوئے تو ان پر پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت مقدمہ زیر سماعت تھا اور ججوں میں ایک صاحب ایس اے رحمان خان صاحب بھی تھے۔ جب نعیم صدیقی صاحب کو معلوم ہوا کہ کیس کی سماعت ایس اے رحمان صاحب کر رہے ہیں تو انہوں نے کہا: ایسے (ایس اے) رحمان تو بہت سے ہیں، اصل فیصلے تو رحمان کی عدالت میں ہونے ہیں۔ اسی طرح میں عرض کر رہا ہوں کہ نام کی مسلم لیگیں تو بعد میں بہت ہوئیں جو یوں سمجھئے کہ اب تاریخ کے عجائب گھر کی زینت ہیں، اور ان کے تو نام بھی اب بہت سے لوگوں کے ذہنوں سے نکل گئے ہوں گے۔ اب بہت کم لوگوں کو یہ یاد رہ گیا ہو گا کہ کبھی مسلم لیگ کے لیبل کے ساتھ کوئی کونشن مسلم لیگ بھی تھی، کوئی کونسل مسلم لیگ بھی تھی، کوئی قیوم لیگ ہوتی تھی، کوئی جناح لیگ ہوتی تھی، کوئی عوامی مسلم لیگ ہوتی تھی، جو پھر جناح عوامی مسلم لیگ بن گئی تھی، پھر قاسم لیگ تھی، مشرقی پاکستان کے فضل القادر چودھری کی بھی ایک مسلم لیگ تھی۔ کتنی لیگیں آپ گنیں گے۔ پھر یہ کہ اب جونیجو لیگ ہے، نواز شریف لیگ ہے۔ تو ایسی لیگیں تو بہت ہیں، لیکن وہ مسلم لیگ جو بانیٔ پاکستان تھی وہ قیام پاکستان کے تین برس کے اندر اندر ہی تحلیل ہو گئی تھی۔

دوسرے مرحلے میں اس ملک کے اندر مقامی جاگیرداروں اور وڈیروں پر مشتمل اشرافیہ (Landed Aristocracy) نے جنم لیا۔ قائد اعظم تو بمبئی سے آئے تھے، حسین امام بہار سے آئے تھے، لیاقت علی خان یوپی سے آئے تھے، خلیق الزمان لکھنؤ سے آئے تھے، اسی طرح کوئی مدراس سے اور کوئی چندی گڑھ (سی پی) سے چل کر آیا تھا۔ اصل مسلم لیگی راہنما تو یہ تھے، لیکن ان حضرات کے منظر سے ہٹنے کے بعد مسلم لیگ یہاں کے وڈیروں، جاگیرداروں اور زمینداروں کی مسلم لیگ ہو گئی۔ چنانچہ لینڈڈ اَرسٹوکریسی کا دور آیا جو اس ملک میں شدید بدنظمی اور انتشار (Chaos) کا دور تھا۔ پھر سول بیورو

کریسی نے بھی رفتہ رفتہ ملک و قوم کی قسمت سے کھیلنا شروع کر دیا۔ ہماری سول بیورو کریسی میں اگرچہ ہر طرح کے لوگ تھے' ان میں وہ بھی تھے جو پاکستان کے بہت مخلص تھے' لیکن وہ بھی تھے جو موقع پرست تھے۔ ان ہی میں سے ملک غلام محمد صاحب نکل کر آگئے۔ ویسے تو زاہد حسین صاحب بھی بیورو کریسی سے آئے تھے لیکن وہ سیاست میں کبھی نہیں آئے' صرف سٹیٹ بینک کے گورنر ہی رہے۔ چوہدری محمد علی صاحب اور پھر سکندر مرزا صاحب بھی بیورو کریسی سے آئے تھے۔ یہ دوسرا دور تھا کہ جس میں کچھ ہماری لینڈڈ سٹو کریسی اور کچھ سول بیورو کریسی کے درمیان ایک ملی بھگت چل رہی تھی۔ تیسرے مرحلے پر آکر پھر سول بیورو کریسی بھی بالکل ناکام ثابت ہوئی۔ اس کے بعد پھر صدر ایوب خان صاحب کو اپنے جوہر آزمانے کا موقع ملا۔

لیاقت علی خان کے تین کارہائے نمایاں :

۱۹۵۸ء کے مارشل لاء تک گیارہ برس تو اس میں گزر گئے جو میں نے تین مرحلے بیان کئے ہیں۔ بانی پاکستان قائد اعظم تو جلد ہی رخصت ہو گئے تھے' ان کے بعد ان کے دست راست لیاقت علی خان میدان میں آئے۔ ان کی کمزوریاں اپنی جگہ پر تھیں' لیکن ان کے دور میں تین اہم کام ہوئے' جس کا بہت بڑا کریڈٹ انہیں جاتا ہے۔

اولاً : قرار دادِ مقاصد پاس ہو گئی۔ اگرچہ اس کے لئے مہم جماعت اسلامی نے چلائی' ہم نے بھی اس میں کام کیا' طالب علموں کی حیثیت سے بھاگ دوڑ کی' پھر مسلم لیگی حلقوں نے بھی اس کی حمایت کی' پھر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس کے منظور کروانے میں اسمبلی کے اندر فیصلہ کن کردار ادا کیا' لیکن بہرحال یہ لیاقت علی خان کے دورِ حکومت میں منظور ہوئی اور اس کا کریڈٹ ان کو جاتا ہے۔ زمانے کے اعتبار سے تو یہ بہت بڑا جرم تھا ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

ہمارے ارکان اسمبلی تو اس پر شرم کے مارے زمین میں گڑے جا رہے تھے کہ دنیا کیا کہے گی کہ ہم نے خدا کو سیاست اور ایوانِ ریاست سے نکال باہر کیا تھا' یہ پھر اسے لے کر آگئے ہیں؟ یہ عالمی سطح پر سیکولرزم کا دور ہے' اس دور میں تو خدا' God' اللہ یا رام کا مقام

مسجد' مندر' چرچ یا سینیگاگ ہے' یہ اسے وہاں سے نکال کر ایوانِ ریاست میں لا رہے ہیں؟

ثانیاً: دورِ حاضر کے اعتبار سے انہوں نے ایک بہت بڑی "غلطی" مزید کی' جسے عالمی استعمار پسند نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یہ کہ "پاکستان ڈے پریڈ" کے موقع پر چودہ مسلمان ممالک کے فوجی دستے لا کر کھڑے کر دیئے۔ گویا کہ پاکستان کے راستے سے اللہ بھی آ رہا ہے (Allah is staging a comeback through Paksitan) اور یہیں اسلام ازم بھی آ رہا ہے۔

تیسرا کام جو وہ کام کرنا چاہتے تھے' لیکن انہیں اس کا موقع نہیں مل سکا' وہ اس ملک سے جاگیرداری کا خاتمہ ہے۔ میرے پاس اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں' حال ہی میں سید حسین نصر کے صاحبزادے ولی رازی کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ لیاقت علی خان اس ملک سے جاگیرداری کے خاتمے کا بھی فیصلہ کر چکے تھے' جس کی بعض مذہبی جماعتوں نے بھی مخالفت کی تھی۔ تاہم یہ اس حوالے سے تفصیل میں جانے کا محل نہیں ہے۔ قصہ مختصر لیاقت علی خان اپنے ان "ناقابلِ معافی جرائم" کی پاداش میں منظر سے ہٹا دیئے گئے۔ بہت بعد میں ایسے ہی "جرائم" کی پاداش میں شاہ فیصل کو شہید کر دیا گیا تھا اور ایسے ہی "جرائم" کی پاداش میں بھٹو کو منظرِ عام سے ہٹایا گیا۔

تحریکِ ختمِ نبوت اور اس کا نتیجہ:

ابتدائی گیارہ برسوں پر مشتمل یہ ہماری سیاسی تاریخ کا پہلا دور تھا۔ اس عرصے میں ملک کی سیاسی گاڑی کو پہلی بار دستور کی پٹڑی سے اتارنے میں بنیادی کردار مجلس احرار کی تحریک ختم نبوت (۱۹۵۳ء) نے ادا کیا تھا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ختمِ نبوت کی تحریک اپنی جگہ پر ایک درست تحریک تھی' اور احرار کی نیک نیتی پر ہرگز کوئی حرف زنی نہیں کی جا سکتی' لیکن اس کے نتیجے میں بہرحال ایسی صورتحال پیدا ہوئی کہ ملکی سیاست کی گاڑی دستور کی پٹڑی سے اتر گئی۔ اُس وقت لینڈڈ ارسٹو کریسی کے ایک بڑے کھلاڑی ممتاز دولتانہ نے اس تحریک سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا رخ مرکز کی

طرف کردیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خواجہ ناظم الدین صاحب وزارت عظمیٰ سے محروم کر دیئے گئے اور بیوروکریسی نے آکر اپنے قدم جمالئے۔

ایوب خان کا گیارہ سالہ دورِ آمریت

ملکی سیاست کے دوسرے گیارہ سال ایوب خان کے دورِ اقتدار پر محیط ہیں۔ اس کے شروع کے ساڑھے تین سال مارشل لاء رہا، لیکن پھر ایوب خان نے اسے صدارتی نظام اور کنٹرولڈ ڈیموکریسی (یعنی ایسی محدود جمہوریت جو اپنے کنٹرول میں رہے) میں بدل کر ایک ظاہری سا سویلین فیس (Civilian Face) عطا کر دیا۔ وہ درحقیقت ایک آمرانہ نظام تھا، لیکن ایک دستور کا نقشہ بھی بہرحال موجود تھا۔ اُسے آپ ایک دستوری آمریت کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ جب صدارتی انتخابات میں فاطمہ جناح مقابلے پر آئیں تو ایوب خان کو دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔ کیونکہ جہاں بھی دستور اور قانون و قاعدہ نام کی کوئی چیز ہو گی تو چاہے وہ آمریت کے ساتھ ہی ہو، پھر بھی بہت بڑے بڑے آمروں کے لئے پریشان کن ثابت ہو سکتی ہے۔

اس گیارہ سالہ دور کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ اس دور میں ملک میں بے پناہ صنعتی ترقی ہوئی۔ نیز سیاسی اکھیڑ پچھاڑ اور اختلال (Chaos) کی وہ صورتحال بھی ختم ہو گئی کہ جس کے بارے میں نہرو صاحب نے بڑے طنزیہ انداز میں کہا تھا کہ میں ہفتے بھر میں کپڑوں کے اتنے جوڑے نہیں بدلتا جتنی وہاں حکومتیں بدل جاتی ہیں۔ جب ان سے کہا گیا تھا کہ پاکستان کی حکومت سے گفتگو کرو تو انہوں نے کہا تھا کہ میں کس سے گفتگو کروں، آج وہاں ایک کی حکومت ہے، کل کسی اور کی، پرسوں کسی اور کی ہے۔ پتہ تو چلے کہ "Who is who there!" کس کے پاس کوئی اختیار ہے، کس کو کوئی مینڈیٹ حاصل ہے، کس کے ساتھ عوام ہیں۔ بہرحال سیاسی انتشار کا وہ دور جب ختم ہوا تو یقیناً ایک استحکام پیدا ہوا، جس کا ایک معاشی فائدہ یہ ہوا کہ اس دور میں صنعتی ترقی ہوئی۔ لیکن اس کا جو منفی نتیجہ نکلنا تھا وہ بھی نکلا۔ یعنی مشرقی پاکستان میں شدید احساسِ محرومی نے جنم لیا۔ اس لئے کہ ان لوگوں کی بات درست ہے جو کہتے ہیں کہ "پاکستان اسلام کے نام

پر' لیکن جمہوریت کے راستے سے بنا ہے"۔ واقعہ یہ ہے کہ ۴۶ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کی فتح نے پاکستان بنوایا ہے' لوگوں نے مسلم لیگ کو اسلام کے نام پر ووٹ دیئے تھے۔ چنانچہ ایوب خان کے دورِ آمریت میں جب دار الخلافہ بھی کراچی سے اسلام آباد منتقل ہو گیا' تو مشرقی پاکستان کے لوگوں نے اسی وقت کہنا شروع کر دیا تھا کہ "This is the beginning of the end"۔ کراچی ایک کاسمو پولیٹن شہر تھا' وہاں سے مشرقی پاکستان کا رابطہ سمندری راستے سے آسان تھا' ہوائی سفر تو اُس وقت تک بہت مہنگا تھا۔ لیکن دار الخلافہ وہاں سے اسلام آباد منتقل کر دیا گیا۔ اس اقدام سے ایک طرف تو مہاجرین کی خوش فہمیاں دور ہونے لگیں اور ان پر عیاں ہو گیا کہ اب وہ یہاں پر تیسرے درجے کے شہری بن کر رہ گئے ہیں۔ کراچی کے دار الخلافہ ہوتے ہوئے انہیں کسی درجے میں اپنی اہمیت کا احساس تھا' لیکن اب وہ احساس محرومی کا شکار ہو گئے۔ دوسری طرف مشرقی پاکستان کے لوگوں کی آنکھیں بھی کھلنے لگیں اور انہوں نے کچھ زیادہ ہی حقیقت پسندانہ انداز میں حساب کتاب شروع کر دیئے کہ غیر ملکی زرِ مبادلہ ہم زیادہ کماتے ہیں جبکہ یہ خرچ مغربی پاکستان پر ہوتا ہے۔ بجٹ میں ملکی دفاع اور مسلح افواج کے لئے جو رقم مختص کی جاتی وہ اسے بھی مغربی پاکستان بلکہ پنجاب کے کھاتے میں ڈالتے تھے' کیونکہ ان کے نزدیک فوج کا تعلق صرف پنجاب سے تھا۔ بہرحال ایسے عوامل کے نتیجے میں وہاں پر احساس محرومی پیدا ہوا جس نے بڑھتے بڑھتے انتہائی خوفناک شکل اختیار کر لی۔ لیکن اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ پاکستان جمہوریت کے ذریعے وجود میں آیا تھا اور اسی جمہوریت کے ساتھ ہی یہ چل سکتا تھا۔ کم از کم مشرقی پاکستان کے لوگ اس کے بغیر ساتھ دینے کو قطعاً تیار نہیں تھے۔ چنانچہ دورِ آمریت میں یہ احساس محرومی بڑھتے بڑھتے اپنی منطقی انتہا تک پہنچ گیا۔

اپنے گیارہ سالہ دور میں اقتدار پر ایوب خان کی گرفت خاصی مضبوط رہی' لیکن ۱۹۶۸ء سے کچھ اضطراب اور ہلچل کا آغاز ہوا۔ پہلے تو عید کے چاند پر جھگڑا ہو گیا تھا' جس پر علماء کی طرف سے کچھ ایجی ٹیشن ہوا۔ پھر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی کتاب "اسلام" چھپ کر آ گئی' جس کے خلاف علماء اور مذہبی جماعتوں کی طرف سے شدید ردِ عمل سامنے آیا' اس

لئے کہ واقعتاً اس میں بعض چیزیں بہت ہی قابل اعتراض تھیں۔ اور چونکہ انہوں نے ایک سرکاری ادارے ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے سربراہ کی حیثیت سے وہ کتاب لکھی تھی اس لئے اس کتاب کے خلاف ایجی ٹیشن نے حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن کی صورت اختیار کرلی۔ اس کے بعد پھر صدر ایوب کے قدم جم نہ سکے۔

یحییٰ خان کا تین سالہ دور

اس کے بعد ۶۹ء سے ۷۱ء تک یحییٰ خان کے جو تین سال ہیں ان کے لئے انگریزی کا ایک ہی لفظ "Chaos" بولا جاسکتا ہے، یعنی یہ شدید افراتفری، اختلال و انتشار اور بے یقینی کا دور تھا۔ اور کسی بھی استحکام کے دور کے بعد کوئی نیا دور شروع ہونے کے درمیان Chaos کا ایک عبوری دور آیا کرتا ہے۔ ۶۹ء سے ۷۱ء تک کے اسی ہنگامی دور میں "دنیا لٹ گئی اپنی" والی بات ہوئی اور وہ پاکستان ختم ہوگیا جو ۱۹۴۷ء میں قائم ہوا تھا، جو اپنے قیام کے وقت دو خطوں پر مشتمل تھا اور آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا مسلمان ملک تھا --- وہ پاکستان کہ جس سے بھارت کے مسلمانوں کی امیدیں بھی وابستہ تھیں اور جسے وہ اپنا سہارا اور محافظ سمجھتے تھے، قصۂ ماضی بن گیا۔ ۱۹۸۰ء میں میں پہلی مرتبہ ہندوستان گیا تو علی گڑھ کے مسلمانوں نے مجھ سے صاف کہا کہ ۷۱ء تک ہم یہ سمجھتے رہے کہ پاکستان ہمارا محافظ ہے، لیکن اب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان اپنی حفاظت ہی کرلے تو بہت ہے، ہماری حفاظت کیا کرے گا۔ ہم تو اب یہیں پر رہیں گے، یہیں جئیں گے یہیں مریں گے، لیکن ہم نے یہ طے کرلیا ہے کہ مریں گے تو لڑ کر مریں گے، ہم بھیڑ بکریوں کی طرح نہیں مریں گے۔ بہرحال یہ ان کی عزیمت کا پہلو تھا، لیکن اِس وقت میری گفتگو سے متعلق بات یہ ہے کہ وہ پاکستان جو برّعظیم پاک و ہند کے تمام مسلمانوں کی خوابوں اور امیدوں کی آماجگاہ تھا، ۷۱ء کے بعد وہ پاکستان نہیں رہا۔

ایوب خان کے زوال میں جماعت اسلامی کا کردار

یہ ایک حقیقت ہے کہ صدر ایوب کے اقتدار کو کھوکھلا کرنے میں سب سے بڑا کردار جماعت اسلامی کے اخبارات و جرائد نے ادا کیا۔ ان کی آمریت کی ایسی نقشہ کشی

کی گئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری خرابی کی جڑ اور بنیاد صدر ایوب ہیں' جس کا نقطہ عروج صدارتی انتخاب میں فاطمہ جناح اور ایوب خان کے مقابلے کے وقت مولانا مودودی کا وہ جملہ ہے کہ "ایک طرف ایک عورت ہے جس میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ وہ عورت ہے اور ایک طرف ایک مرد ہے جس میں اس کے سوا کوئی خوبی نہیں کہ وہ مرد ہے"۔ جماعت اسلامی نے ملک کو ایوبی آمریت سے نجات دینے کے لئے دوسری سیاسی پارٹیوں سے مل کر بہت سے اتحاد بھی قائم کئے اور بحالی جمہوریت کی تحریک چلائی' لیکن اس ساری جدّوجہد کا حاصل کیا ہوا؟ کھیر کسی نے پکائی' اور کھا کوئی اور گیا۔ جماعت اسلامی نے ایوب خان کے اقتدار کے خاتمے کے لئے جو شدید محنت اور بھاگ دوڑ کی' اس کے لئے دن رات ایک کر دیئے' اس کا فائدہ ایک نیا ابھرنے والا نوجوان ذوالفقار علی بھٹو لے گیا' جو ایوب خان کے زیر سرپرستی پروان چڑھا تھا اور اسے ڈیڈی کہا کرتا تھا۔ بہرحال اس تین سالہ دوڑ کی تمام تر سیاسی شورش کا انجام امّتِ مسلمہ کے لئے عظیم ترین سانحے یعنی پاکستان کے دولخت ہونے کی صورت میں ظاہر ہوا' اور اس کے بعد مغربی پاکستان یا بچے کھچے پاکستان پر ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت قائم ہو گئی۔

پیپلز پارٹی کا پہلا پانچ سالہ دور

اس کے بعد چوتھا دور ۷۲ء سے ۷۷ء تک کے پانچ سال پر مشتمل ہے۔ یہ پیپلز پارٹی کا پہلا دور ہے' یعنی ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کا دور جو اسلامی سوشلزم کے نام پر برسرِاقتدار آئی تھی' جس نے روٹی کپڑا اور مکان کے نام پر ووٹ حاصل کئے تھے' جس نے مزدوروں اور کاشتکاروں کے حقوق کے نام پر عوامی حمایت حاصل کی تھی' جو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے گٹھ جوڑ کو ختم کرنے کا اعلان کر کے آئی تھی۔ اب جبکہ بھٹو کو اس دنیا سے رخصت ہوئے سترہ اٹھارہ برس گزر چکے ہیں' ہمیں اس کے دورِ حکومت کا دیانت داری سے تجزیہ کرنا چاہئے۔ بھٹو داخلی طور پر ناکام ترین حکمران ثابت ہوا' اگرچہ اس نے دو کارنامے واقعتاً ایسے کر دکھائے کہ ان کا کریڈٹ اس کو جاتا ہے۔ وہ دراصل ایک "سیاسی حیوان" (Political Animal) تھا۔ وہ خود کہا کرتا تھا کہ

"We are animals of the deserts" یعنی ہم تو صحراؤں کے حیوان ہیں۔ گویا جس طرح صحرا کے اونٹ یا دوسرے جانور مشقت برداشت کر سکتے ہیں، صحراؤں کی سختیاں جھیل سکتے ہیں، ہم اس طرح کے لوگ ہیں۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں سیاسی سوجھ بوجھ موجود تھی۔ اس کا مزاج سیاسی ہونے کے ساتھ ساتھ عوامی بھی تھا۔

اس کا پہلا کارنامہ ۷۳ء کے دستور پر اتفاقِ رائے (consensus) حاصل کر لینا تھا، اگرچہ اس نے خود ہی اس میں ترمیمیں کر کے بہت جلد اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اس طرح اس نے دستور کو موم کی ناک بنا کر رکھ دیا جسے وہ جدھر چاہتا موڑ لیتا۔ اور ایک مرتبہ اسے مرضی کے مطابق موڑنے کے لئے اسے بہت سے بزرگ اراکین کو اٹھا کر ڈنڈا ڈولی کر کے اسمبلی سے باہر بھی پھینکوانا پڑا۔ یہ سب ساری باتیں یاد کر لیجئے، لیکن یہ سب اس کے بعد کی باتیں ہیں جب اس نے دستور بنوا لیا تھا اور سب سے اس پر دستخط لے لئے تھے۔ یہ یقیناً اس کا ایک اہم کارنامہ تھا۔

بھٹو کا دوسرا اہم کارنامہ قادیانی مسئلے کو حل کرنا تھا۔ اس مسئلے کو اس نے جس مدبّرانہ انداز سے حل کیا وہ یقیناً قابل ستائش ہے، ورنہ اگر ۵۳ء کی طرح تشدد کی پالیسی اختیار کی جاتی تو اس کے نتائج ملک و قوم کے حق میں اچھے نہ نکلتے۔ میرے نزدیک اس کا کریڈٹ بھی اسے دیا جانا چاہئے۔

تیسری بات جس کا کریڈٹ میں اسے دیتا ہوں وہ اس کا ایک ایسا کارنامہ ہے کہ بدقسمتی سے وہ اس کے نتائج کو کنٹرول نہیں کر سکا اور اس سے بجائے خیر کے شر پیدا ہو گیا۔ میری مراد اس کے اس کارنامے سے ہے کہ اس نے ایک طرف مزدوروں اور کسانوں میں عزّتِ نفس کا احساس بیدار کیا کہ ہم بھی انسان ہیں اور یہ جاگیردار اور کارخانے دار بھی انسان ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اس ملک کے اندر ایک بہت بڑا "Break through" تھا۔ اور دوسری طرف وہ ملک کی سیاست کو وڈیروں کے ڈرائنگ روموں سے نکال کر گلی کوچوں میں لے آیا۔ یہ بھی یقیناً اس کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا، جس سے سیاست میں عوامی دور کا آغاز ہوا۔ پاکستان کی سیاست یا تو شروع میں

قائداعظم اور لیاقت علی خان کے دور میں عوامی تھی یا پھر اس کے بعد حقیقتاً عوامی ہوئی ہے ذوالفقار علی بھٹو کے دَور میں۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا' وہ ان دونوں چیزوں کے نتائج کو نہیں سنبھال سکا۔ سٹیم پیدا کر لینا یقیناً ایک کام ہے' لیکن اسے اس طرح سے استعمال کرنا کہ وہ انجن کے پسٹن (Piston) کو تو حرکت دے مگر کسی اور طرف سے لیک نہ ہو جائے' یا بوائلر میں اتنی سٹیم جمع نہ ہو جائے کہ بوائلر ہی پھٹ جائے' یہ سب کچھ اہم تر ہے۔ لیکن بھٹو نے سٹیم تو پیدا کر دی لیکن بوائلر کو نہ سنبھال سکا' جس کا منطقی نتیجہ ایک طرف یہ نکلا کہ مزدور نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ گویا تُو بھی رانی میں بھی رانی' کون بھرے گا پانی؟ دوسری طرف سیاست' جس کی عصمت دری پہلے ڈرائنگ روموں میں ہوتی تھی اب سرعام غنڈوں کے ہاتھوں بے آبرو ہونے لگی' اس لئے کہ گلی میں غنڈے کا راج تھا۔ معاشرہ تو تبدیل نہیں ہوا تھا۔ وڈیرے سیاستدانوں کے ڈرائنگ روموں اور سجے سجائے ایوانوں میں کوئی وضعداری تو تھی' کوئی رکھ رکھاؤ تو تھا' ان کی اپنی ایک تہذیب تو تھی' کچھ روایات تو تھیں' وہ جو بھی کرتے تھے وہاں اندر کرتے تھے لیکن اب وہ سب کچھ چوراہے میں غنڈوں کے ہاتھوں ہونے لگا۔ لہٰذا اندرونی طور پر تو واقعہ یہ ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو ناکام ترین حکمران ثابت ہوا۔ اس نے خود اعتراف کیا تھا کہ میرے پاس آدمی نہیں ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ پانچ سو آدمی بھی میرے پاس نہیں ہیں۔ گویا جو بات قائد اعظم نے کہی تھی کہ میری جیب میں صرف کھوٹے سکے ہیں وہی بات ذوالفقار علی بھٹو کو کہنی پڑی۔

ذوالفقار علی بھٹو کی خارجہ پالیسی

ذوالفقار علی بھٹو داخلی طور پر جتنا ناکام تھا' خارجی طور پر اور بین الاقوامی سطح پر وہ اتنا ہی کامیاب تھا۔ قبل ازیں وہ ایک کامیاب وزیر خارجہ بھی رہ چکا تھا اور وہ امریکیوں سے برابری کی سطح پر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا تھا' جو کسی اور کے بس کا روگ نہیں۔ وہ تیسری دنیا کے لیڈر کی حیثیت سے ابھر رہا تھا۔ عرب میں عالم اسلام کا ابھرتا ہوا ستارہ شاہ فیصل شہید تھے اور ان کا منظورِ نظر اور چہیتا شخص ذوالفقار علی بھٹو

۱۹۷۴ء کی عالمی سربراہی کانفرنس کو یاد کیجئے جب دنیا کانپ اٹھی تھی کہ یہ کیا ہونے لگا ہے؟ عالمِ اسلام متحد ہو رہا ہے! پھر پین اسلام ازم کی طرف پیش رفت ہو رہی ہے!! ہر رکشا کے پیچھے لکھا ہوا تھا : "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا" (اللہ کی رسی کو مل جل کر مضبوطی سے تھام لو!) اتحادِ اسلامی پر مشتمل بڑے بڑے بینرز لگے ہوئے تھے۔ غرضیکہ اس ملک کے اندر ایک عجیب سماں بندھ گیا تھا۔ پوری اسلامی دنیا کی سربراہی کانفرنس یہاں منعقد ہوئی' جس میں اہم فیصلے ہوئے۔ چنانچہ ایک طرف شاہ فیصل نے اسرائیل اور اس کے عالمی سرپرستوں کے خلاف تیل کا ہتھیار استعمال کیا اور دوسری طرف بھٹو نے ایٹم بم بنانے کی دھمکی دے دی۔ ان دونوں کے یہ "جرائم" ناقابلِ معافی تھے۔ چنانچہ اُدھر شاہ فیصل کو ان کے سگے بھتیجے کے ہاتھوں شہید کرا دیا گیا' جو ایک یہودی لڑکی کے دام میں گرفتار تھا' جس کے ان دنوں اخبارات میں فوٹو بھی چھپے تھے' جس میں وہ اس کے کندھے پر سوار تھی۔ اور اِدھر بھٹو جس انجام کو پہنچا وہ بھی آپ کو معلوم ہے۔ اندرونی سطح پر اس سے یا اس کے جونیئرز سے ایک فاش غلطی ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں دھاندلی کی ہوئی' جس کی بنیاد پر اس کے خلاف ایک برجستہ تحریک اٹھ کھڑی ہوئی' جس سے بیرونی طاقتوں نے فائدہ اٹھایا۔ بیرونی حکومتیں تو اپنے داؤ پر ہوتی ہیں' وہ دیکھتی رہتی ہیں کہ ان ممالک میں کیا ہو رہا ہے؟ کونسا گھوڑا اس وقت تیز دوڑنے والا ہے کہ اس پر داؤ لگائیں اور اپنی قسمت آزمائیں اور کس کو کس کے ذریعے میدان سے ہٹائیں۔ پھر اس سے بعد میں نپٹ لیں گے۔

۱۹۷۷ء کے حالات کا ایک جائزہ

۷۷ء کے حالات کا مختصر تجزیہ میں آپ کے سامنے اس لئے رکھ رہا ہوں کہ آپ ان سے موجودہ حالات کا تقابل کر سکیں۔ چنانچہ اب ذرا جائزہ لے لیجئے کہ ہمارے ۷۷ء کے حالات میں تین باتیں نمایاں تھیں' جو اَب نہیں ہیں۔

اولاً : بھٹو کی حکومت بہت مستحکم تھی۔ ثانیاً : پاکستان قومی اتحاد (PNA) بھی نہایت منظم اتحاد تھا' جس میں نو جماعتیں یکمشت جمع تھیں۔ اس ملک کی تاریخ میں اتنے

بڑے اور اتنے کامیاب اتحاد کی کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی، جس میں تمام فیصلے اتفاقِ رائے سے ہوتے تھے، جبکہ اس میں اس قدر مختلف نظریات کے حامل لوگ اکٹھے تھے۔ اس میں بائیں بازو کے خالص سیکولر لوگ بھی تھے، آزاد خیال (Liberals) بھی تھے اور راسخ العقیدہ قدامت پسند (Orthodox) اور بنیاد پرست (Fundamentalists) بھی تھے۔ آرتھوڈوکس میں بریلوی بھی تھے، دیوبندی بھی تھے اور اہلحدیث بھی۔ ان میں سے بعض ایک دوسرے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے، لیکن سیاسی اعتبار سے بندھی ہوئی مٹھی کے مانند تھے۔ ثالثاً یہ کہ ان حالات میں کوئی اور ابھرنے والی تازہ شخصیت تاک میں بیٹھی ہوئی نہیں تھی۔ پی این اے کی ساری محنت، ساری کوشش، ساری قربانیوں اور تمام تر جدّوجہد کا فائدہ فوج نے اٹھالیا۔ چنانچہ جیسے پہلے پکی پکائی کھیر بھٹو صاحب نے کھائی تھی ایسے ہی ضیاء الحق صاحب اور ہماری فوج کو پکی پکائی کھیر کھانے کا موقع مل گیا اور اس طرح اس غریب ترین ملک کے بعض جرنیل دنیا کے امیر ترین جرنیلوں میں شمار ہونے لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ضیاء الحق صاحب نے اپنے جرنیلوں کو لوٹ کھسوٹ کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی اور ان کے مابین ایک "شریفانہ معاہدہ" (Gentleman Agreement) تھا۔ ضیاء صاحب نے گویا ان سے کہہ رکھا تھا کہ تم جس طرح چاہو کھاؤ پیو، موج اڑاؤ، مجھے حکومت کرنے دو۔ مجھے فری ہینڈ دو کہ میں جس طرح چاہوں مولویوں کی ناز برداری کرتا رہوں، انہیں فائیو سٹار ہوٹلوں میں ٹھہرالوں یا ذرا ان کے لئے کاروں کے دروازے کھول دیا کروں۔ اس "شریفانہ معاہدے" کے بغیر وہ چل ہی نہیں سکتے تھے، اس لئے کہ، خود ان کے اپنے الفاظ میں، ان کا حلقہ انتخاب (constituency) فوج تھی۔

میں نے یہ بات ضیاء الحق صاحب سے بالواسطہ کہی بھی تھی۔ ۱۹۸۱ء میں میں اپنے بیٹے ڈاکٹر عارف رشید کے نکاح کے لئے کراچی گیا ہوا تھا۔ ان دنوں ضیاء الحق صاحب نے اپنی پہلی کابینہ برطرف کی تھی جس میں پروفیسر خورشید صاحب اور فاروقی صاحب وغیرہ شامل تھے اور عمرے پر جاتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ واپس آکر نئی کابینہ تشکیل دیں گے۔ ان کے برادرِ نسبتی ڈاکٹر نور الٰہی سرجن میرے پاس ان کا پیغام لے کر آئے کہ آپ کو

اگر اسلام کے لئے کام کرنا ہے تو حکومت میں آئیں' میری مرکزی کابینہ میں وزارت سنبھالیں۔ میں نے جواب دیا کہ میری طرف سے انہیں دو باتیں کہہ دیجئے۔ ایک تو یہ کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ ہر کام کے لئے ایک خاص تربیت درکار ہوتی ہے' میں اس کوچے میں کبھی گیا نہیں' نہ میرا بیورو کریسی سے رابطہ رہا ہے' اس لئے میں شاید اس کام کے لئے موزوں ثابت نہ ہوں۔ اور دوسرے یہ کہ آپ کی حکومت فوج کی حکومت ہے' جس نے ہمیں کرنے کچھ بھی نہیں دینا ہے۔ خواہ مخواہ کی بدنامی ہم پر آئے گی لیکن آپ نے ہمیں کچھ کرنے کا اختیار دینا نہیں ہے۔ ڈاکٹر نور الٰہی صاحب آج بھی زندہ ہیں' آپ ان سے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ میری بات سن کر انہوں نے کہا کہ میں نے ضیاء الحق صاحب سے اپنے طور پر بھی یہ کہہ دیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس کو قبول نہیں کریں گے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی مجلس شوریٰ قائم کی تو میں نے اس میں شمولیت قبول کر لی۔ اس لئے کہ اس میں تو اختیارات والی کوئی بات ہی نہیں تھی' شوریٰ میں تو مشورہ دینا تھا اور وہ میں انہیں مسجد کے منبر سے بھی دیا کرتا تھا۔ یہیں سے میں نے انہیں کرکٹ کے بارے میں مشورہ دیا تھا جبکہ وہ میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے' لیکن مجھے افسوس ہے کہ انہوں نے ابوظبی جا کر میری بات کو غلط طریقے پر بیان کیا اور میری جانب وہ بات منسوب کی جو میں نے نہیں کی تھی۔ بہرحال میں چونکہ انہیں پہلے بھی مشورے دیا کرتا تھا لہٰذا اس خیال سے ان کی مجلس شوریٰ کی رکنیت قبول کر لی کہ ملک و قوم کی خیر و فلاح کے لئے براہ راست مشورہ دینے کا موقع مل رہا ہے تو اسے کیوں ضائع کروں۔ لیکن مجلس شوریٰ کے دوسرے اجلاس ہی میں مجھ پر واضح ہو گیا کہ اس مجلس کی حیثیت "Window Dressing" سے زیادہ نہیں ہے' اور یہ محض امریکی رائے عامہ کو یہ باور کرانے کے لئے ہے کہ میری حکومت خالص فوجی حکومت نہیں ہے' اس میں مملکت کے شہری بھی شریک ہیں' اس کے سوا کوئی فائدہ اس شوریٰ کا نہیں ہے۔ چنانچہ میں اس سے استعفاء دے کر آ گیا۔

موجودہ حالات کا ۱۹۷۷ء کے حالات سے تقابل

موجودہ حالات سے تقابل کے ضمن میں میں نے ۱۹۷۷ء کے حالات کی تین چیزیں

آپ کو نوٹ کروائی ہیں۔ ایک یہ کہ بھٹو کی حکومت مستحکم تھی۔ دوسرے یہ کہ قومی اتحاد (PNA) بھی منظم تھا۔ اور تیسرے یہ کہ کوئی نئی سیاسی ابھرتی ہوئی شخصیت' خصوصاً کسی بیرونی سرپرستی کے ساتھ نہیں تھی' لہٰذا جو کچھ ہوا اندرونی طور پر ہوا اور مارشل لاء لگ گیا۔ ان حالات کا ۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۱ء کے حالات سے تقابل کیجئے۔ اولاً' ایوب خان گزشتہ گیارہ برس سے اقتدار میں تھا اور لوگ اب اس سے بیزار بھی ہو چکے تھے۔ وہ گویا ایک گرتی ہوئی دیوار تھا' جو چند مراحل میں زمین پر آ رہی۔ ثانیاً یہ کہ اس وقت بھی "Free For All" کی پوزیشن تھی۔ حزب مخالف کی جماعتوں کی حیثیت بھی کسی منظم ادارے کی نہیں تھی۔ مختلف گروپس علیحدہ علیحدہ اپنی اپنی گیم کھیل رہے تھے۔ ایک طرف "بھٹو بھاشانی بھائی بھائی" کے نعرے لگ رہے تھے' لیکن دوسری طرف وہ دونوں بھی ایک دوسرے کے خلاف چالوں میں مصروف تھے۔ اور تیسری بات یہ کہ اس وقت ایک تازہ ابھرتا ہوا شکاری بھٹو تاک میں تھا۔ آج کے حالات بھی یہی ہیں۔ بے نظیر کی حکومت کا چل چلاؤ ہے۔ میں یہ بات تین ہفتے قبل کہہ چکا ہوں کہ تبدیلی کی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی ہیں۔ اس ضمن میں مَیں خاص طور پر ارشاد احمد حقانی صاحب کے آرٹیکل (شائع شدہ روزنامہ جنگ) کو اہمیت دیتا ہوں' اس لئے کہ وہ ایک اعتبار سے صدر مملکت کا ماؤتھ پیس ہیں' جیسے کسی زمانے میں مصر کے ایک اخبار نویس حسنین ہیکل صدر ناصر کا ماؤتھ پیس ہوا کرتے تھے۔ وہ ان کے مشیر بھی تھے اور ان کی بات گویا کہ صدر ناصر کی بات ہوتی تھی۔ ارشاد احمد حقانی صاحب کا تجزیہ یہ ہے کہ اب اس حکومت کا چل چلاؤ ہے۔ چنانچہ "ایک دھکا اور دو" کا نعرہ لگا کر دھکا دینے والے اسے مختلف طریقوں سے دھکے دینے کی فکر میں ہیں' اگرچہ ان میں سے ہر ایک اپنا دھکا علیحدہ چلانا چاہتا ہے اور PNA کی طرح کا کوئی اتحاد اس وقت موجود نہیں ہے۔ قاضی صاحب نے ۲۴ جون کے دھرنے کا اعلان کیا تو مسلم لیگ نے ۲۳ جون کی ہڑتال کی کال دے کر گویا "دہلے پہ نہلا" مار دیا۔ پھر ان کی طرف سے ۳ جولائی کی کال آئی تو مسلم لیگ نے ۴ جولائی کو عوامی اسمبلی لگا کر "نہلے پہ دہلا" دے مارا۔ اب مولانا فضل الرحمٰن کی جمعیت علماء اسلام بھی یوم احتجاج منا رہی ہے اور قاضی صاحب کا بیان آیا ہے کہ ہم اس کا بھی ساتھ دیں گے۔ یہ سب اوپرے

بیانات ہیں اور اصل حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے داؤ پر ہے۔ اور بعض لوگوں نے تو صاف کہہ بھی دیا ہے کہ اب یہ بات نہیں ہو گی کہ محنت ہم کریں اور کھیر کوئی اور کھا جائے۔ لیاقت بلوچ صاحب نے بیان دیا ہے کہ خون ہم دیں گے تو چوری کسی اور کو نہیں کھانے دیں گے۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے دھرنے میں یہ بات پہلے سے طے شدہ تھی کہ قاضی صاحب کے سوا کسی اور کو تقریر کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اور مجھے جماعت کے ایک ذمہ دار شخص نے بتایا ہے کہ ان کے بعض کارکن تو نواز شریف صاحب سے اتنے نالاں اور ناراض ہیں کہ انہوں نے کہا کہ اگر وہ ہمارے جلسے میں آئیں گے تو ہم ان پر اینٹیں برسائیں گے۔ میں اس وقت نواز شریف کے حق میں کوئی بات کرنا چاہتا ہوں نہ قاضی صاحب کے حق میں' اور نہ ہی ان کے خلاف۔ بلکہ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حالات کا نقشہ کیا ہے؟ اسے فری سٹائل کشتی کہہ لیں یا "فری فار آل" والا معاملہ کہہ لیں' وہ بات نہیں ہے کہ جو قومی اتحاد کی تحریک میں بندھی ہوئی مٹھی والا معاملہ تھا۔ وہاں تو آخری درجے میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی ورنہ وہ تحریک بہترین نتائج لے جاتی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ پی این اے کا جو معاہدہ ہو گیا تھا وہ اگر روبعمل آجاتا تو واقعہ یہ ہے کہ اس ملک کے اندر ایک بہت بڑی نظیر قائم ہو جاتی کہ یہاں ایجی ٹیشن کے ذریعے سے بھی بات منوائی جا سکتی ہے اور ایک ایسے شخص کو جھکا کر مذاکرات پر مجبور کیا جا سکتا ہے جس نے کہا تھا کہ "میری کرسی بہت مضبوط ہے"۔ اُس وقت ایئر مارشل اصغر خان صاحب کی ہٹ دھرمی آڑے آ گئی' ورنہ ضیاء الحق صاحب کے لئے مارشل لاء لگانے کا کوئی جواز تلاش کرنا ممکن نہ تھا۔

تیسرے یہ کہ اس وقت بھی ایک نیا شکاری تاک میں ہے۔ اور وہ عمران خان ہے جسے بیرونی سرپرستی بھی حاصل ہے۔ جس شخص کی شادی میں ہنری کسنجر شریک ہوں اس کے بارے میں بھی کوئی شبہ رہ جاتا ہے کہ اسے بیرونی سپورٹ حاصل نہیں ہے۔ قبل ازیں عمران خان "ریگولر ٹیک آف" کی کوشش کر رہے تھے لیکن اس میں تو وہ بری طرح ناکام ہو گئے' ان کی تحریک انصاف کے معدودے چند دفاتر قائم ہوئے اور بہت تھوڑے لوگ ان کے ساتھ آئے۔ اب بھی اگر کچھ قوتیں انہیں آگے لانا چاہیں گی تو وہ

الیکشن کے ذریعے نہیں ہو گا' اور خود عمران خان کی یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ "ہو سکتا ہے کہ الیکشن کی ضرورت ہی پیش نہ آئے"۔

موجودہ حالات کے یہ تین عوامل ایسے ہیں جو ۱۹۷۷ء میں موجود نہیں تھے' لیکن ۶۹ء تا ۷۱ء کے حالات میں موجود تھے۔ ان کا جو نتیجہ نکلے گا وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہمارے لئے عذاب کا کوئی آخری فیصلہ ہو گیا ہو یا آخری "عذابِ استیصال" سے قبل ۱۹۷۱ء جیسے کسی عذاب کا کوڑا ہماری پشت پر پڑنے والا ہو۔ اس ضمن میں مَیں نے اپنی کتاب "سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی' حال اور مستقبل اور مسلمانان پاکستان کی خصوصی ذمہ داری" میں قدرے تفصیل سے بات کی ہے۔ میں ایک تلخ حقیقت بیان کر رہا ہوں' جسے یقیناً بہت سے لوگ پسند نہیں کریں گے 'کہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ ہم ایک آزاد و خود مختار قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کے اہل نہیں ہیں۔ ہم اپنا یہ استحقاق ثابت نہیں کر سکے۔ قائداعظم کا یہ جملہ میرے ذہن و قلب پر نقش ہے جو میں نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں اپنے پانچ سالہ عرصۂ تعلیم کے دوران بلا مبالغہ سینکڑوں مرتبہ پڑھا ہو گا' جو کالج ہال کی دیوار پر نہایت جلی حروف میں لکھا ہوا تھا :

"God has given us a golden opportunity to show our worth as architects of a new nation and let it not be said that we did not prove equal to the task."

یعنی "(مملکت خداداد پاکستان کی صورت میں) اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک سنہری موقع عطا کیا ہے کہ ہم ایک نئی قوم کے معماروں کی حیثیت سے دنیا کے سامنے اپنی اہلیت و صلاحیت کو ثابت کر سکیں۔ اور دیکھنا! ایسا ہرگز نہ ہو کہ دنیا یہ کہے کہ ہم اس عظیم کام کے اہل ثابت نہیں ہو سکے"۔ اور واقعہ یہ ہے کہ نصف صدی کے عرصے میں ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ہم اس کے اہل نہیں ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اشعار کے مصداق عفو و درگزر کا معاملہ فرمادے ۔

عصیاں سے کبھی ہم نے کنارا نہ کیا
پر تو نے دل آزردہ ہمارا نہ کیا

ہم نے تو جنم کی بہت کی تدبیر
لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا!

سو اللہ تعالیٰ کی رحمت دستگیری فرمائے تو یہ اس کا کرم ہے، ورنہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے ہمیں دنیا میں جینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ بہرحال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی ایک جھٹکا لگے اور ہم جاگ جائیں۔ یہ یقیناً ایک بہت بڑی کامیابی ہو گی۔ اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تاریخ کا ایک باب ختم ہو جائے۔

قاضی صاحب کا ایجی ٹیشن اور اس کے ممکنہ نتائج

اس پس منظر میں مَیں قاضی صاحب کے ایجی ٹیشن کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرتا ہوں۔ اس ضمن میں یہ بات بہت اہم ہے کہ جماعت اسلامی کا مستقل موقف یہ رہا ہے کہ وہ دستوری و انتخابی راستے سے ہی تبدیلی لائے گی جبکہ ہمارا ان سے اختلاف ہی یہ رہا ہے کہ یہاں انتخابی راستے سے اسلام نہیں آ سکتا۔ اگرچہ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ جب تک یہاں اسلام نہیں آ جاتا ملکی سیاست کی گاڑی دستور کے مطابق چلتی رہے، انتخابات ہوتے رہیں، لیکن جو لوگ یہاں اسلامی انقلاب لانا چاہتے ہیں وہ اپنا وقت انتخابات میں ضائع نہ کریں، بلکہ ایک بھرپور ایجی ٹیشن کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں۔ بقول اقبال ؎

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے!

یعنی پہلے دعوت و تربیت کے مراحل طے کرتے ہوئے سمع و طاعت کی مضبوط بنیادوں پر قائم ایک منظم جماعت تیار کرلیں اور پھر "ایک وار والا" بھرپور ایجی ٹیشن کریں۔ لیکن ان کا موقف یہ رہا ہے کہ یہ کام دستوری اور انتخابی راستے سے ہی ہو گا، یہ دوسرا راستہ صحیح نہیں۔ دستوری اور جمہوری راستے میں اب تک جو بڑی بڑی رکاوٹیں آئیں، مثلاً مسلسل مارشل لاء لگتے رہے، اس وجہ سے قوم سیاسی اعتبار سے نابالغ ہو گئی اور ہمارے ہاں سیاسی و جمہوری ادارے مستحکم نہ ہو سکے۔ تاہم اب ہم تقریباً اس سطح پر پہنچ گئے تھے کہ اب اس ملک میں دو پارٹیاں مستحکم ہو گئیں، یعنی پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ۔ بعض لوگ

میری زبان سے پیپلز پارٹی کا ذکر سننا پسند نہیں کرتے' لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پیپلز پارٹی بہرحال ایک پارٹی ہے۔ یہ بات میں ایک عرصے سے کہہ رہا ہوں جب کالم نویس میری اس بات پر استہزاء کیا کرتے تھے۔ خواہ یہ میری یا آپ کی پسندیدہ پارٹی نہ ہو' جمہوری نہ ہو' لیکن پارٹی تو ہے نا۔ قائداعظم کی مسلم لیگ بھی کوئی خاص جمہوری پارٹی نہیں تھی۔ اس میں آخری اور اصل فیصلہ قائداعظم کا ہوتا تھا۔ اور تحریکیں چلتی ہی شخصیتوں کے بل پر ہیں۔ اس حوالے سے نواز شریف صاحب نے محنت و مشقت کر کے' قربانیاں دے کر' تکلیفیں جھیل کر مسلم لیگ کو ایک مستحکم پارٹی بنایا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ اصل مسلم لیگ ان کی ہے یا جونیجو لیگ ہے' بہرحال ایک مسلم لیگ اب نواز شریف کی قیادت میں مستحکم ہے' جو حکمران جماعت سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتی ہے۔ اب اگلا تقاضا یہ تھا کہ جمہوری اصولوں کے مطابق اس گاڑی کو چلایا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپوزیشن نے بہت سے پوائنٹ حاصل کئے ہیں۔ سَرے محل کا معاملہ بھی نواز شریف صاحب ہی عوام کے سامنے لے کر آئے ہیں۔ اگرچہ اب قاضی صاحب بھی کچھ چیزیں نکال کر لا رہے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ سٹیل مل کے معاملات میں جس طرح بے ضابطگیاں ہوئی ہیں وہ انہیں ثابت کر سکتے ہیں' لیکن عربی مقولے "اَلفَضلُ لِلمُتقَدِّم" کے مصداق نواز شریف کو اس معاملے میں ان پر سبقت حاصل ہے۔ سرے محل کا معاملہ منظرِعام پر آنے کے بعد بے نظیر کا رویہ جس طرح نرم ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اندر سے ہل گئی ہے۔ دوسری طرف سے عدلیہ کا دباؤ بھی حکومت پر بڑھ رہا ہے' اور ظاہر بات ہے کہ یہ بھی ایک دستوری معاملہ ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ گیم اپنے رولز کے مطابق آگے بڑھتی' لیکن ایسے میں اچانک قاضی صاحب کی طرف سے ایجی ٹیشن شروع ہو گیا۔ گویا کہ وہ ملکی سیاست کی گاڑی کو دستوری پٹڑی پر آگے بڑھتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے۔ یہ بات اس لئے کہی جا رہی ہے کہ ایجی ٹیشن کے پہلے سے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس کے لئے کوئی بات واضح نہیں کی گئی۔ پہلے سے نہ تو کوئی ایشوز (issues) دیئے گئے اور نہ ہی مطالبے واضح کئے گئے۔ اچانک فیصلہ ہوا کہ اب دھرنا ماریں گے۔

اس کے دو ہی امکانی اسباب ہو سکتے ہیں۔ یا تو یہ فیصلہ انتہائی مایوسی (Out of sheer frustration) میں کیا گیا کہ اب پھر انتخابات ہوئے تو ظاہر بات ہے کہ نواز شریف صاحب ہی جیتیں گے۔ چنانچہ انہوں نے آخری داؤ کھیلا تاکہ وہ اس میدان میں اپنی کوئی حیثیت منوا سکیں۔ میرے پاس ایک ایسے رکن جماعت کی شہادت موجود ہے جو ایک وقت میں صوبائی وزیر بھی رہے ہیں کہ اس ضمن میں شوریٰ کو بھی اعتماد میں نہیں لیا گیا' کوئی مشورہ نہیں کیا گیا اور قاضی صاحب کا یہ فیصلہ بالکل ہی اچانک اور غیر متوقع طور پر سامنے آیا۔ اس کی ایک امکانی وجہ تو میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ سب کچھ انتہائی فرسٹریشن کے عالم میں کیا گیا اور دوسری وجہ' جو میں یقینی طور پر تو نہیں کہہ سکتا' لیکن اس رائے کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ کہیں سے کوئی "اشارہ" ہو سکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ کسی طرف سے کوئی تحریک ملی ہو۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تحریک کہاں سے ملی ہے' کس کی جانب سے ملی ہے' کیوں ملی ہے' کس کے واسطے سے ملی ہے' اس کے پیچھے اصل کون ہے اور براہ راست سامنے کس سے بات ہے۔ پھر یہ کہ یہ معاملہ شعوری طور پر ہو رہا ہے یا غیر شعوری طور پر۔ اس لئے کہ عالمی معاملات بڑے لطیف اور پراسرار (subtle) انداز میں ہوتے ہیں' کہ لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ ہم اس وقت کسی کا کھیل کھیل رہے ہیں یا کسی کے آلہ کار بن رہے ہیں۔ بالکل نیک نیتی کے ساتھ جانیں دینے والے افغان مجاہدین کو کیا پتہ تھا کہ ہم امریکہ کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا تا!! اور بعد میں شاید ہمارے کشمیری مجاہدین کو بھی پتہ چلے کہ یہ تو کسی اور کا کھیل تھا' جانیں ہم نے دیں لیکن ثمرات کوئی اور لے گیا۔ اسی طرح PNA کا معاملہ اگرچہ برجستہ و بے ساختہ (Spontaneous) اور مقامی (indigenous) تھا' لیکن عالمی استعمار نے اسے اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا۔ یہی حال شاہ ایران کے خلاف تحریک کا تھا۔ اور یہ دونوں دنیا سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے کہ "ہمیں امریکہ نے مروا دیا"۔ اس لئے کہ بھٹو بھی چاہتا تھا کہ ہم ایٹم بم بنائیں اور شاہ ایران بھی ایٹم بم بنانا چاہتا تھا۔ حالانکہ امریکہ کو ان دونوں کا سرپرست تصور کیا جاتا تھا' بلکہ شاہ ایران تو اس علاقے میں امریکہ کا سب سے بڑا ایجنٹ تھا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا، قاضی صاحب کے ایجی ٹیشن کے ایشوز (issues) بھی واضح نہیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ایشو کرپشن ہے۔ لیکن کرپشن بھی کوئی ایک دن میں تو پیدا نہیں ہو گئی۔ سنا ہے کہ کسی کالم نویس نے بڑے لطیف انداز میں لکھا ہے کہ قاضی صاحب کا تو بیرونی اسفار کا شیڈول بنا ہوا تھا۔ کابل میں معاملات نمٹانے کے بعد انہوں نے ترکی جانا تھا، جہاں سے واپس آنے کے بعد یہاں تھوڑا سا قیام کر کے ملائشیا جانا تھا، لیکن وہ ترکی سے واپس آئے تو انہیں اچانک معلوم ہوا کہ پاکستان میں تو کرپشن زوروں پر ہے، لہٰذا انہوں نے سوچا کہ میں ملائشیا کیسے جاؤں، پہلے یہاں کرپشن ختم کر لوں۔ اس کے علاوہ مہنگائی اور افراطِ زر بھی مسلسل ہے، کوئی ایک دن کی بات نہیں۔ پیسے کی قیمت مسلسل گر رہی ہے اور چیزوں کی قیمتیں مسلسل بڑھ رہی ہیں۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے فیصلے ہماری حکومتوں کے ہاتھوں نافذ ہوتے ہیں۔ ایک قومی اخبار میں ایک بڑا خوبصورت کارٹون تھا کہ ایک طرف آئی ایم ایف ایک دیو قامت یانکی (Yankee) کی صورت میں دھرنا مارے بیٹھا ہے جس کی گود میں CBR (سنٹرل بورڈ آف ریونیو پاکستان) رکھا ہے اور دوسری طرف چھوٹے سے قاضی صاحب دھرنا مارے بیٹھے ہیں۔ اس کارٹون سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اس ملک پر اصل دھرنا تو آئی ایم ایف کا ہے اور ہماری حکومت کی حیثیت ان کی کٹھ پتلی کی ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے ان کے اشارے پہ ہوتا ہے۔ سو اس حوالے سے بھی اس ایجی ٹیشن کا کوئی ہدف معین نہیں ہے۔

پھر یہ بات اہم ہے کہ اس ایجی ٹیشن کا پہلا مرحلہ پُرامن نہیں رہ سکا۔ اس کی عدالتی تحقیقات ہونی چاہئیں کہ پہلی گولی کس نے چلائی اور اس میں ہونے والی اموات کی ذمہ داری کس پر ہے؟ ایک بات تو طے ہے کہ کارکنوں نے مثالی نظم و ضبط کا مظاہرہ نہیں کیا اور مرکز کی ہدایات کا خیال نہیں رکھا۔ مرکز کی طرف سے کارکنوں کو حکم تھا کہ کہیں بھی تصادم کا راستہ اختیار نہ کیا جائے، جہاں بھی حکومت کی طرف سے مزاحمت ہو اور روکا جائے قافلہ وہیں پر رک جائے اور وہیں دھرنا دے دیا جائے۔ چنانچہ سرحد میں اسی پالیسی پر عمل ہوا اور وہاں سے کوئی قافلہ لڑتا بھڑتا ہوا اسلام آباد تک نہیں پہنچا۔ لیکن مجھے لاہور سے جانے والے مرکزی قافلے میں شریک جماعت کے ایک نہایت اہم کارکن نے بتایا کہ

ہمارے قافلے نے اپنے طور پر طے کر لیا تھا کہ ہم زبردستی راستہ بنائیں گے۔ گویا کہ مرکزی کمانڈ کا حکم توڑنے کا فیصلہ لاہور سے چلنے والا سب سے بڑا قافلہ طے کر چکا تھا۔ میں صرف اسی بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ گڑبڑ کا آغاز مظاہرین کی طرف سے ہوا ہو۔ ورنہ اگر پُرامن مظاہرے ہوتے رہیں تو حکومت کی صحت پر کونسا برا اثر پڑے گا۔ اسے پولیس کو تنخواہ تو دینی ہے' خواہ وہ پولیس لائن میں بیٹھے یا سڑک پر آ جائے۔ لیکن لوگ آئے روز اپنے دھندے اور کاروبار چھوڑ کر سڑکوں پر آنا afford نہیں کر سکتے۔ "دھرنا" تو یہ ہوتا ہے کہ آپ مطالبات منوانے کے لئے ایک جگہ بیٹھ گئے' کہ جب تک یہ مطالبات منظور نہیں ہوں گے ہم یہاں سے نہیں اٹھیں گے۔ لیکن اب جو دھرنے کے نام سے مظاہرے شروع کئے گئے ہیں اس سے حکومت کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سینٹ میں اس پر قہقہے پڑے ہیں اور قاضی صاحب نے غصے میں کہا ہے کہ نوجوانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کے بعد دانت نکالتے ہوئے تم لوگوں کو شرم نہیں آتی؟ اور اگر کہیں انہوں نے "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق کوئی معاملہ کیا اور تصادم کی پالیسی اپنائی تو پھر سوائے "Chaos" کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا' یا پھر بھٹو صاحب کی اصطلاح میں "دمادم مست قلندر" ہو گا' جس کے نتیجے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کون آجائے گا۔ اس کا امکان موجود ہے کہ ایک بار پھر وہی معاملہ ہو کہ ساری کھیر پکائے کوئی اور' کھائے کوئی اور!! اس ملک میں جو پہلا سیاسی اختلال وانتشار (Chaos) پیدا ہوا تھا اس کا باعث بھی بدقسمتی سے ایک مذہبی جماعت بنی تھی اور اب جس Chaos کی تیاری ہو رہی ہے اگر وہ رونما ہو گیا تو یہ بھی ایک مذہبی جماعت کے ذریعے ہو گا۔

احوالِ بھارت

سرحد کے پار جو صورت حال ہے اس کے ضمن میں ایک بات اچھی طرح جان لیجئے کہ پاکستان کا وجود ہر ہندو کے دل میں ایک کھٹکتا ہوا کانٹا ہے۔ اس کے دماغ میں' اس کے دل میں اور اس کے وجود کے رگ وپے کے اندر "مہابھارت" کا تصور سرایت کئے ہوئے ہے۔ دوسرے یہ کہ بی جے پی (بھارتیہ جنتا پارٹی) اس وقت بھارتی پارلیمنٹ کی سب سے بڑی جماعت ہے۔ اس کی وہاں صرف تیرہ دن کی حکومت بنی۔ اس میں کوئی شک

نہیں کہ وہاں سب جماعتوں نے بڑی بالغ نظری کا مظاہرہ کیا۔ ہمارے ہاں کے مبصرین نے بھی اس پر تبصرے لکھے ہیں۔ لیکن اب وہاں سے موجودہ حکومت میں دراڑیں پڑنے کی خبریں موصول ہو رہی ہیں کہ فلاں رکن ناراض ہو کر چلا گیا اور فلاں اٹھ کر چلا گیا۔ ظاہر ہے کہ بھان متی کے اتنے بڑے کنبے کو جوڑ کر لے کے چلنا بہت مشکل کام ہے۔ اور جب بھی یہ حکومت ٹوٹی تو اسی کے کچھ گروپس بی جے پی کے ساتھ مل کر حکومت بنائیں گے۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہو سکتا ہے میں اس کے تصور ہی سے کانپ جاتا ہوں۔ سبرا منیم انڈیا کا ایک بڑا سیاسی تجزیہ نگار تھا' اس نے ۱۹۷۱ء میں ایک مضمون لکھا تھا کہ اس وقت مشرقی پاکستان کی جو پوزیشن ہے یہ ہمارے لئے ایک نادر موقع ہے۔ اس کے الفاظ تھے :

"This is the chance of the centuries, we cannot afford to lose it."

یعنی ایسا موقع تو صدیوں بعد آیا کرتا ہے' ہم کہیں اسے ضائع نہ کر بیٹھیں۔ اور انہوں نے فی الواقع اسے ضائع نہیں کیا۔ اللہ نہ کرے کہ بھارت میں پھر ایسی کوئی حکومت قائم ہو جو "چانس آف دی سنچری" سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لئے تیار ہو۔

بھارتی مسلمانوں کے بارے میں میں ایک بات یہ نوٹ کرانا چاہتا ہوں کہ اب ان میں پاکستان سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں اگرچہ بھارت کے مسلمان فوجی تو پاکستان کے خلاف لڑے' اور کھیم کرن سے آگے پاکستانی دستوں کی یلغار کو روکنے والے بھارتی مسلمان فوجی ہی تھے' جن میں حوالدار نور محمد کو بھارت کا سب سے بڑا فوجی اعزاز "اشوکا چکر" ملا تھا' لیکن وہاں کے عام مسلمانوں کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ تھیں۔ اب وہ کیفیت بھی بہت حد تک بدل چکی ہے اور بھارت کے عام مسلمان کو بھی اب آپ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ندائے خلافت کے ۸ جولائی کے شمارے میں ایک خاتون ثمین طاہر خان کے تاثرات شائع ہوئے ہیں' جو انہوں نے بھارت کا سفر کر کے تحریر کئے ہیں اور وہاں کے مسلمانوں کی سوچ اور ان کے رویے میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے۔ ابھی حال ہی میں ضلع سہارنپور (یوپی) سے آئے ہوئے ایک مسلمان جوڑے نے مجھ سے ملاقات میں اسی طرح کے تاثرات کا اظہار کیا' جس سے اندازہ ہوا کہ اب

وہاں کے مسلمانوں کی سوچ کافی حد تک تبدیل ہو چکی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ پاکستان نے آخر انہیں دیا ہی کیا ہے! انہوں نے جو قربانیاں دیں پاکستان کے لئے دیں اور جو بھی دکھ سہے پاکستان کے لئے سہے، لیکن پاکستان نے انہیں کیا دیا؟ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہماری خواتین ماتھے پر بِندیا لگالیتی ہیں یا مانگ میں سیندھور ڈال لیتی ہیں تو کونسی قیامت آجاتی ہے؟ تمہاری عورتوں نے کونسی ثقافت اختیار کی ہوئی ہے؟ ان کی اس بات کا ہمارے پاس کیا جواب ہے؟؟

بھارت کے احوال کے ضمن میں آخری بات یہ کہ اب بھارت دوسرا دھماکہ کرنے پر تلا ہوا ہے، امریکہ کی وارننگ ایسے ہی نہیں آئی۔ یہ حالات ہیں ہماری مشرقی سرحد کے اوپر۔

افغانستان کی موجودہ صورتحال

اور اب آیئے افغانستان کی موجودہ صورت حال کی طرف۔ ندائے خلافت کے ۸ جولائی ہی کے شمارے میں پشاور سے مولانا راحت گل صاحب کا ایک بڑا دردمندانہ استفتاء شائع ہوا ہے۔ مولانا گزشتہ دنوں پورے افغانستان کے علاقے کا دورہ کر کے آئے ہیں۔ افغانستان میں اِس وقت دو مستحکم حکومتیں قائم ہو چکی ہیں اور دونوں اسلامی ہونے کی مدعی ہیں، جبکہ دونوں میں سانپ اور نیولے کا بیر ہے۔ قندھار میں طالبان کی اسلامی شرعی حکومت قائم ہے جس کے سربراہ امیر المومنین ملا محمد عمر ہیں، جن کے ہاتھ پر بیعت کی گئی ہے۔ افغانستان کے ایک تہائی علاقے، یعنی پچاس میں سے سترہ اٹھارہ صوبے ان کے زیر نگیں ہیں۔ دوسری جانب برہان الدین ربانی اور گلبدین حکمت یار وغیرہ کے مابین جو بیر تھا وہ ختم ہوا ہے اور مرکز میں ایک مستحکم حکومت قائم ہو رہی ہے۔ جبکہ تیسری جانب ابھی دوستم ان دونوں سے الگ ہے۔ اس طرح افغانستان اِس وقت تین ٹکڑوں میں بٹ کر رہ گیا ہے۔ جس طرح ۹۱ء کی جنگ کے بعد عراق کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، اوپر اور نیچے دو "نو فلائی زون" بنا دیئے گئے تھے اور عراق صرف درمیانی علاقے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا، اسی طرح کا معاملہ افغانستان کا ہو گیا ہے۔ مولانا راحت گل صاحب

نے علماء دین سے سوال کیا ہے کہ اب اگر قندھار کی شرعی حکومت اور مرکز کے درمیان جنگ ہوئی تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہو گی اور ایسے میں غیر جانبدار مسلمانوں کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے؟

افغانستان کے حالات کی بہتری میں جو پیش رفت ہوئی اس میں قاضی حسین احمد صاحب کا کردار واقعتاً لائق تحسین ہے۔ میں نے اس پر اپنے ذاتی حلقوں میں بھی قاضی صاحب کی بہت تعریف کی تھی اور میں خود جا کر قاضی صاحب کو مبارکباد بھی دینا چاہتا تھا، لیکن قاضی صاحب اپنی مصروفیات کی بنا پر وقت نہیں دے سکے۔ قاضی صاحب کی کوششوں سے گلبدین حکمت یار، برہان الدین ربانی اور عبد الرب رسول سیاف کے تین بڑے گروہوں کا ایک مشترکہ میثاق پر متحد ہو جانا ایک بہت ہی مستحسن بات ہے۔ اس کے بعد ضرورت ہے کہ طالبان کو بھی گفت و شنید پر آمادہ کیا جائے۔ اگر قاضی صاحب اس کام میں مزید محنت صرف کرتے اور اپنی توجہات کو وہاں مرکوز کرتے تو شاید بہت سا خیر برآمد ہو جاتا اور حالات میں مزید بہتری ہوتی۔ ورنہ حمید گل صاحب بھی جا کر اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگا کر آ گئے تھے لیکن گلبدین حکمت یار اور ربانی صاحب کے مابین مفاہمت نہیں کرا سکے تھے۔ اب حالات کا بھی تقاضا ہے کہ اس عمل کو مزید آگے بڑھایا جائے۔ پاکستان میں ملی یکجہتی کونسل میں جمعیت علماء اسلام کے دونوں دھڑے شامل ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور مولانا سمیع الحق صاحب دونوں کی جماعتوں کے اثرات طالبان کے اندر موجود ہیں۔ مفاہمت کے لئے ان اثرات سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ قاضی صاحب اگر محنت کر کے مزید وقت لگاتے تو وہاں کوئی بہتر نتیجہ نکلتا۔ لیکن انہوں نے یہاں پر اپنی نئی سکیم شروع کر دی۔

اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ اور حالیہ ایجی ٹیشن

اپنی گفتگو کے آخر میں میں یہ وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اسلامی انقلاب کے لئے جس ایجی ٹیشن کی بات کرتے ہیں اس میں اور قاضی صاحب کے ایجی ٹیشن میں کیا فرق ہے۔ ہمارا موقف یہی ہے کہ اسلامی نظام اور اسلامی انقلاب کے لئے آخری مرحلہ ایجی ٹیشن ہی ہے۔ قاضی صاحب کا ایجی ٹیشن اگرچہ وہ تقاضے پورے نہیں کرتا جو اسلامی

انقلاب کے لئے ناگزیر ہیں' اس کے باوجود لوگوں نے اس کی برکات کا بچشمِ سر مشاہدہ کر لیا۔ جماعت اسلامی جو کہ بالکل پس منظر میں چلی گئی تھی اور دھندلکوں میں اوجھل ہو رہی تھی اس ایجی ٹیشن سے ایک دم فرنٹ لائن کے اندر آگئی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلامی نظام کے نفاذ میں ایجی ٹیشن ہی فیصلہ کن کردار ادا کر سکتا ہے اور انتخابی عمل سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ تاہم ہمارے نزدیک اسلامی انقلاب کی خاطر کئے جانے والے ایجی ٹیشن کی کچھ شرائط ہیں۔

اس کے لئے پہلے ایک انتہائی منظم اور مضبوط جماعت کا ہونا ضروری ہے جس کے افراد اپنی معاش اور معاشرت کو حرام سے پاک کر چکے ہوں۔ کیا قاضی صاحب کے ایجی ٹیشن میں شریک ہزاروں افراد اس شرط پر پورا اترتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر ان کے لئے تہنیت اور مبارک باد ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ ہزاروں افراد جماعت اسلامی کے رکن کیوں نہیں بن گئے؟ رکنیت کے لئے ظاہر ہے کہ دین و شریعت پر عمل ہی کی شرط پوری کرنا ہو گی' پھر جماعت کا رکن بننے میں ان کو کیا رکاوٹ ہے؟ پھر کبھی پاسبان اور کبھی شبابِ ملی کا تکلف کیوں؟ دراصل وجہ یہ ہے کہ

؏ من اپنا پرانی پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا!

ایجی ٹیشن کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن دین پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اور ایسے ایجی ٹیشن سے کوئی خیر برآمد نہیں ہو گا۔ ہمارے پیش نظر جو ایجی ٹیشن ہے اس میں وہ لوگ شریک ہوں جو پہلے اپنی معاش اور معاشرت کو حرام سے پاک کر چکے ہوں اور اپنی ذات پر اور اپنے گھر میں اللہ کے دین کو قائم کر چکے ہوں۔ پھر یہ لوگ ایک امیر کے ہاتھ پر بیعت کر کے ایک مضبوط اور منظم جماعت کی شکل اختیار کریں۔ پھر یہ جماعت ایجی ٹیشن شروع کرے۔ دوسری جماعتوں سے اگر تعاون حاصل کرنا ہو تو کم از کم ایک وفاق کی شکل تو ہو' کوئی پی این اے کی سطح کا اتحاد ہو جس کا ایک نظم تھا' ڈسپلن تھا' سارے فیصلے اتفاق رائے سے ہوتے تھے۔ اِس وقت جو صورتحال ہے کہ ہر پارٹی اپنا ہی کھیل کھیل رہی ہے' اس سے کوئی بات نہیں بنے گی۔

پھر یہ کہ ایجی ٹیشن کے ایشوز (issues) اور مطالبات واضح طور پر دینی ہونے چاہئیں' تاکہ آپ کے ملک کے عوام کی اکثریت جو دین کا کچھ فہم و شعور رکھتی ہے' اگرچہ عمل سے عاری ہے' اسے واضح طور پر معلوم ہو کہ یہ ایجی ٹیشن دینی ایشوز کے لئے ہے۔ گڈمڈ ایشوز کے ذریعے اسلامی انقلاب آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ پھر یہ کہ اگر یہ شرطیں پوری کرنے کے بعد دھرنا دیا جائے گا تو وہ پھر دھرنے کی شکل میں مظاہرہ نہیں ہو گا۔ پھر قدم پیچھے ہٹانے والی بات نہیں ہو گی۔ پھر تو واضح مطالبات سامنے رکھے جائیں گے کہ ان کے پورے ہونے تک ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ چاہے لاٹھیاں برسیں یا گولیاں چلیں' یہ دھرنا مطالبات کی منظوری تک ختم نہیں ہو گا۔ ورنہ یہ کہ اگر کچھ دنوں کے بعد حکومت کو جھٹکے دیتے رہیں گے تو اس سے کچھ بھی نہیں بنے گا۔ اگر یہ جھٹکے پُرامن رہے تو اندیشہ ہے کہ جگ ہنسائی ہو گی اور پولیس کو ایک مصروفیت ملی رہے گی اور وہ انہیں کوستی رہے گی کہ کیا ہمیں آئے روز کی مصیبت ڈالی ہوئی ہے' یا دوکاندار انہیں کوسیں گے کہ روز روز ہماری مارکیٹیں بند ہو جاتی ہیں' حکومت کا کیا بگڑتا ہے! اور اگر کہیں بدنظمی والا معاملہ ہو گیا تو وہ Chaos پر منتج ہو گا جس سے کسی خیر کی توقع نہیں۔

بہرحال جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم اس مملکت خداداد پاکستان کے لئے اللہ تعالیٰ سے خیر مانگتے رہیں گے اور اپنے اسی طریق پر عمل پیرا رہیں گے۔

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللہ لی ولکم
ولسائر المسلمین والمسلمات OO

(مرتّب : حافظ خالد محمود خضر)

موجودہ حالات میں

اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ

ازقلم : انجنیئر نوید احمد، کراچی

الحمدللہ کہ اس وقت امت مسلمہ کی ایک قابل ذکر تعداد اسلام کو محض "مذہب" نہیں بلکہ "دین" سمجھتی ہے۔ "مذہب" انسان کی صرف انفرادی زندگی کے گوشوں یعنی عقائد، عبادات اور رسومات پر مشتمل ہے جب کہ دین انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ انسان کی اجتماعی زندگی کے پہلوؤں یعنی سیاسی، معاشی اور معاشرتی معاملات کا احاطہ کرتا ہے۔ مزید برآں اب ایسے افراد کی بھی مناسب تعداد موجود ہے جو اسلام کے عطا کردہ نظامِ حیات کو غالب کرنے کی جدوجہد کو اپنا دینی فریضہ سمجھتی ہے۔ البتہ اسلامی انقلاب کے لئے طریق کار اور خاص طور پر اس کے آخری مرحلے کے بارے میں کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک یہ انقلاب، انتخابات میں کامیابی حاصل کرکے برپا کیا جا سکتا ہے، بعض کے نزدیک یہ کام دعوت اور محض دعوت سے سرانجام دیا جا سکتا ہے اور کچھ اس کے لئے مسلح جدّوجہد کو ضروری سمجھتے ہیں۔

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی کتاب "منہجِ انقلابِ نبویؐ" میں سیرت النبی ﷺ کے حوالہ سے اسلامی انقلاب کا طریق کار اور اس کے مختلف مراحل بیان کئے ہیں۔ اسلامی انقلاب کے ابتدائی مراحل کے بارے میں تو کوئی اختلاف رائے موجود نہیں ہے، تاہم اس تحریر کے ذریعے اسلامی انقلاب کے آخری مرحلے کی قدرے وضاحت پیش نظر ہے۔

اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ "مسلح تصادم"

اسلامی انقلاب کے آخری مرحلے کے لئے جب ہم قرآن حکیم، سنّتِ نبوی اور

تاریخ انسانی پر غور اور منطق کی روشنی میں سوچ و بچار کرتے ہیں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ "انقلاب کا آخری مرحلہ مسلح تصادم ہے"۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم' سنتِ نبوی' تاریخ انسانی اور منطق سے جو دلائل ہمیں ملتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :

۱۔ سورۃ الانفال (آیت ۳۹) میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے :

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ﴾

"اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین کل کا کل اللہ کے لئے ہو جائے۔"

اس آیت میں اہل ایمان کو اس وقت تک لڑنے کا حکم دیا جا رہا ہے جب تک کہ کل کا کل نظام زندگی مکمل طور پر اللہ کے لئے نہ ہو جائے۔ گویا نظام کی تبدیلی کے لئے جنگ ناگزیر ہے۔

۲۔ سورۃ الحدید (آیت ۲۵) میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَاْسٌ شَدِيدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ○﴾

"بے شک ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے ان کے ساتھ نازل کیں کتابیں اور ترازو تا کہ لوگ قائم ہوں عدل پر' اور ہم نے لوہا نازل کیا جس میں شدید جنگ (کی صلاحیت) ہے اور لوگوں کے لئے دوسرے فائدے بھی ہیں اور تا کہ اللہ ظاہر کر دے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی غیب میں رہتے ہوئے مدد کرتا ہے۔ بے شک اللہ قوت والا اور زبردست ہے۔"

اس آیت کا مضمون بھی از خود واضح ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے کتابیں اور میزان یعنی نظام عدل انبیاء کرام کو اس لئے عطا فرمایا کہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہوں۔ اس کے لئے ایسے طبقات کی اکثریت پر محض وعظ و نصیحت کارگر نہ ہو گی جو باطل نظام میں دوسروں

کے حقوق غصب کر کے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لہٰذا ان کے علاج کے لئے اللہ نے لوہا بھی اتارا ہے تا کہ ان سے جنگ کی جائے اور عدل و انصاف کے نظام کو بالفعل قائم کیا جائے۔

۳۔ الصف (آیت ۹) میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس نے نبی کریم ﷺ کو بھیجا ہی اس مقصد کے لئے ہے کہ وہ کُل نظام زندگی پر دینِ حق کو غالب کریں۔ اسی سورہ کی آیت نمبر ۴ میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں :

﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ﴾

"بے شک اللہ محبت کرتا ہے ان لوگوں سے جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صف در صف گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔"

دینِ حق کو غالب کرنے کے لئے مسلح تصادم ناگزیر ہے اور اللہ کو ایسے بندے پسند ہیں جو اس مقصد کے لئے مسلح تصادم میں پامردی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔

۴۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کے بعد اس کی امت میں اس کے حواریوں اور اصحاب نے اس کی سنت کو قائم نہ کیا ہو اور اس کے احکام کی پیروی نہ کی ہو۔ پھر ان کے جانشین ایسے لوگ بن جاتے ہیں جن کے قول اور فعل میں تضاد ہوتا ہے اور وہ ایسے کام کرتے ہیں جن کا انہیں حکم نہیں دیا گیا ہوتا۔ پس جو ان کے خلاف ہاتھ (قوت) سے جہاد کرے وہ مومن ہے' جو ان کے خلاف زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو ان کے خلاف دل سے جہاد کرے (یعنی دل میں انہیں برا سمجھے) وہ مومن ہے۔ اس کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں۔"

اس حدیث میں اللہ اور اس کے رسولوں کے احکامات کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف ہاتھ سے جہاد کو ایمان کا افضل ترین درجہ قرار دیا گیا ہے۔

۵۔ نبی کریم ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں اور آپ ہرگز یہ پسند نہیں کر سکتے تھے کہ اللہ کے بندوں کو کسی قسم کی کوئی تکلیف پہنچے۔ لیکن ایسے ظالموں کا سر کچلنے کے لئے جنہوں نے نوعِ انسانی کو اپنا غلام بنا رکھا تھا' آپ ﷺ کو بھی دعوت سے آگے

بڑھ کر تلوار ہاتھ میں لینی پڑی۔ اس راہ میں آپ کے انتہائی محبوب ساتھیوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا، خود آپ کو زخم بھی آئے اور آپ کے دندانِ مبارک بھی شہید ہوئے۔

۶۔ ماضی قریب میں روس، فرانس اور ایران میں جزوی طور پر انقلاب آئے لیکن ان سب کے لئے انقلابیوں کو مسلح تصادم کی راہ سے گزرنا پڑا۔ ایران کا انقلاب اس اعتبار سے منفرد ہے کہ یہاں مسلح تصادم یکطرفہ تھا۔ حکومت نے عوام کو کچلنے کے لئے ہتھیار استعمال کئے لیکن عوام کی طرف سے احتجاج پُرامن اور منظم گھیراؤ کی صورت میں رہا۔

۷۔ منطقی اعتبار سے بھی یہ بات واضح ہے کہ کوئی بھی طبقہ اپنے مفادات سے آسانی سے دست بردار نہیں ہوتا۔ ظالمانہ نظام میں ایک طبقہ ایسا ہوتا ہے جو بااختیار ہوتا ہے اور وہ دوسروں کے حقوق غصب کر کے عیاشی کر رہا ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی تحریک اس ظلم کو ختم کرنے کے لئے اٹھتی ہے تو یہ طبقہ اسے کچلنے کے لئے پوری قوت صرف کرتا ہے اور یوں مسلح تصادم کا مرحلہ ضرور آتا ہے۔

مسلح تصادم کے لئے مشکلات

اب تک کی بحث سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ انقلاب کا آخری مرحلہ مسلح تصادم ہے۔ البتہ موجودہ حالات میں مسلح تصادم کی راہ میں دو ایسی مشکلات ہیں جو دورِ نبوی میں نہیں تھیں۔

۱۔ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں باطل نظام کے چلانے والے اور محافظ کافر تھے۔ جو حضور کے ساتھ تھا وہی مسلمان تھا اور جو بھی مخالف تھا وہ کافر تھا، جبکہ آج کے حالات میں تمام مسلمان ممالک میں جو بھی غلط نظام قائم ہے اس کے چلانے والے اور محافظ دونوں کلمہ گو مسلمان ہیں۔ ان میں سے بعض کو ان کے غلط کردار کی وجہ سے فاسق و فاجر تو کہا جا سکتا ہے لیکن دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کلمہ گو مسلمانوں کے خلاف مسلح جدوجہد یعنی خروج کے لئے فقہاء نے جو سخت

شرائط رکھی ہیں ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس نظام کو بدلنے کے لئے جو افراد اٹھیں ان کی طاقت اور ان کے اثرات اتنے زیادہ ہو چکے ہوں کہ کامیابی یقینی نظر آ رہی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تھوڑی سی طاقت کے ساتھ تصادم کا آغاز کر دیا جائے جس کا نتیجہ بدامنی اور ہلاکت کے سوا کچھ نہ نکلے۔ صاف ظاہر ہے کہ موجودہ دور میں اس شرط کا پورا کرنا آسان نہیں ہے۔

۲۔ حضور ﷺ کے زمانے میں جنگی مہارت اور ہتھیاروں کے اعتبار سے مسلمانوں اور کفار میں زیادہ فرق نہ ہوتا تھا۔ دونوں طرف لڑنے والوں کی جنگی مہارت یکساں ہوتی تھی اور ان کے ہتھیار بھی ایک جیسے تھے۔ گویا کمیت کا فرق تو تھا کیفیت کا فرق نہ تھا، جب کہ آج کے زمانے میں باطل نظام کی حفاظت کے لئے حکومت کے پاس ہر طرح کے وسائل اور لاکھوں کی تعداد میں ایسی ہمہ وقت فوجیں (Standing Armies) ہیں جو جنگ کے لحاظ سے پوری طرح تربیت یافتہ، منظم اور جدید ترین اسلحہ سے لیس ہیں۔ دوسری طرف انقلاب کی جدوجہد کرنے والے عوام نہ اس طرح کی جنگی مہارت کے حامل ہیں اور نہ ہی جدید ہتھیار رکھتے ہیں۔ اس فرق کی وجہ سے مسلح تصادم میں کامیابی تقریباً ناممکن نظر آتی ہے۔ اس کی ایک واقعاتی مثال مالاکنڈ میں نفاذ شریعت کی تحریک ہے۔ نفاذ شریعت کے لئے تحریک کے مخلص کارکنوں نے ہتھیار اٹھائے لیکن حکومت نے علاقے کی ناکہ بندی کر کے جدید ہتھیاروں کے استعمال اور بعض علاقوں پر فضائی بمباری کے ذریعے سے تحریک کو کچل کے رکھ دیا۔

موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ
"پُرامن اور غیر مسلح منظم احتجاج"

اب تک کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ:

۱۔ اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ مسلح تصادم ہے۔

۲۔ موجودہ حالات میں مسلح تصادم کا امکان یا اس کے ذریعے کامیابی قریباً ناممکن ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ کیا ہوگا؟ موجودہ حالات نے جہاں مسلح تصادم کے مرحلے کو قریباً ناممکن بنا دیا ہے وہیں ایک متبادل صورت بھی فراہم کر دی ہے۔ آج کے دور میں جو بھی جمہوری آزادی ہر ملک میں دی جاتی ہے اس کی بنا پر کسی غلط بات پر حکومت کے خلاف احتجاج کو شہریوں کا حق تسلیم کیا جاتا ہے اور اسے ریاست کے خلاف بغاوت تصور نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا آج کے دور میں اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ پرامن اور غیر مسلح منظم احتجاج کے ذریعے طے کیا جا سکتا ہے۔ اس احتجاج میں کسی ایسے منکر کو لے کر اٹھنا ضروری ہوگا جس کا خلافِ شرع ہونا تمام دینی طبقات کے نزدیک مسلّم ہو۔ مثال کے طور پر "سودی نظام" وغیرہ۔ ایسے منکر کے خلاف اقدام ریاست کے اہم اداروں کا پرامن گھیراؤ، دھرنا دے کر بیٹھنا یا سول نافرمانی کی تحریک ہو سکتا ہے۔ ان پرامن اور منظم مظاہروں کے ذریعے سے حکومتِ وقت کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس منکر کا قلع قمع کرے اور اللہ کی حدود کو نافذ کرے۔

یہ طریقہ حکومت کے خلاف بغاوت کا نہیں اور نہ ہی قوم کو خانہ جنگی میں مبتلا کرنے کا ہے۔ اسی طرح اس طریقہ میں اقتدار کی طلب نہیں بلکہ مسلمان حکمرانوں سے مسلم معاشرے میں دین کو نافذ کرنے کا مطالبہ ہے۔ اگر حکومت یہ مطالبہ نہیں مانتی تو پھر ہم میدان میں ہیں، گولیوں کے لئے ہمارے سینے کھلے ہیں اور لاٹھیوں کے لئے ہمارے سر حاضر ہیں۔ ہم قید و بند کی آزمائشیں برداشت کرنے کو تیار ہیں لیکن پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ ہم ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسوہ پر عمل کریں گے جنہوں نے مکی دور میں ہر طرح کی تکالیف برداشت کیں، لیکن جواب میں کوئی اقدام نہ کرتے ہوئے اپنے موقف پر ڈٹ کر صبر کا مظاہرہ کیا۔

آخری مرحلے کے آغاز کے لئے شرائط

البتہ اس طرح کے پرامن احتجاج سے قبل ضروری ہے کہ :

فلاںی جماعت نے اپنے معاشرے میں دعوت کا حق ادا کیا ہو۔ بڑی وضاحت کے

ساتھ اسلامی انقلاب کے لئے جدوجہد کی فرضیت' اسلامی انقلاب کے برپا کرنے کی اہمیت اور اس کی برکات لوگوں کے سامنے پیش کی ہوں۔ ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات و اعتراضات کے جوابات دیئے ہوں۔

۲۔ انقلابی جماعت میں شامل کارکنان نے اپنے اپنے دائرہ کار میں شریعت کے احکامات پر [illegible] عمل کر کے سیرت و کردار کا لوہا منوایا ہو۔ عوام الناس ان کے قول و فعل کی درستی کے قائل ہوں۔ انہوں نے تزکیہ کے مراحل طے کئے ہوں' ان کا مطلوب و مقصود اللہ کی رضا کا حصول اور نجاتِ اخروی ہو اور ان کے دل راہ حق میں جان دینے کے لئے بے چین ہوں۔

۳۔ انقلابی جماعت ایک شخص کی قیادت میں حکم سننے اور ماننے کے اصول پر پوری طرح سے منظم ہو' مختلف درجات پر تربیت یافتہ افراد نظم کے ذمہ دار ہوں اور تمام کارکنان نظم کے خوگر ہونے کا ثبوت دے چکے ہوں۔

دعوت' تنظیم اور تربیت کے مندرجہ بالا مراحل طے کر کے ہی انقلابی جماعت کو انقلاب کے آخری مرحلے یعنی میدان میں آکر پُرامن احتجاج کا آغاز کرنا چاہئے۔

آخری مرحلے کی اہم شرائط

انقلاب کے آخری مرحلے کے سلسلہ میں دو باتوں کا خاص اہتمام کرنا ہو گا :

۱۔ احتجاج کا موضوع کسی ایسے منکر کے خلاف جدوجہد کو بنانا ہو گا جو مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ مثلاً عریانی و فحاشی کی ترویج' سود' جوا وغیرہ۔

۲۔ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ احتجاج مکمل طور پر پُرامن ہو' یعنی اپنی طرف سے ہاتھ بالکل نہ اٹھایا جائے' کسی قسم کی توڑ پھوڑ نہ کی جائے' کسی شے کو آگ نہ لگائی جائے۔ جس طرح مکی دور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہر قسم کے ظلم و تشدد کو پامردی سے برداشت کیا اور اپنی طرف سے جوابی کارروائی تو درکنار مدافعت تک نہیں کی' وہی طرز عمل اس اقدام یعنی مظاہروں' گھیراؤ وغیرہ کے معاملے میں اس انقلابی جماعت کو اختیار کرنا ہو گا۔ اگر کچھ شرپسند لوگ بدامنی پر اتر آئیں تو انقلابی

جماعت کی تنظیمی طاقت اتنی مضبوط ہو کہ ان کو قابو کر کے حکومت کے حوالے کر دے کہ یہ ہم میں سے نہیں ہیں۔

ماضی قریب میں اس طریق کار کی کامیابی کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں جماعت اسلامی نے اسی طریق کار کو اختیار کرتے ہوئے مطالبہ دستورِ اسلامی کی تحریک چلائی۔ چونکہ اس وقت تک جماعت اسلامی نے انتخابی سیاست کے میدان میں قدم نہیں رکھا تھا اس لئے دیگر دینی جماعتوں نے بھی اس تحریک کا بھرپور ساتھ دیا' چنانچہ تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ ۱۹۷۳ء میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کے لئے اسی طریق کار کو اختیار کیا گیا اور کامیابی حاصل کی گئی۔ یاد رہے کہ اس تحریک کی قیادت ایک ایسی شخصیت کر رہی تھی جو معروف معنوں میں سیاسی نہیں تھی۔ ۱۹۸۰ء میں پاکستان میں اہل تشیع نے زکوٰۃ آرڈیننس کے تحت حکومت کو زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور آرڈیننس واپس لینے کا مطالبہ کیا۔ حکومت کے انکار پر انہوں نے اسلام آباد میں قصرِ صدارت کا پرامن گھیراؤ کیا اور مطالبہ کی منظوری تک دھرنا دے کر بیٹھ گئے۔ حکومت کو بالآخر گھٹنے ٹیکنے پڑے اور آرڈیننس میں ترمیم کرنی پڑی۔ ایران میں شاہ کے خلاف بھی اہل تشیع نے اسی انداز سے احتجاج کیا۔ فوج نے گولی چلائی اور ہزاروں مظاہرین مارے گئے لیکن احتجاج جاری رہا۔ آخر کار فوج نے اپنے ہی ملک کے عوام پر مزید گولیاں چلانے سے انکار کر دیا اور مظاہرین کو کامیابی حاصل ہوئی۔

ممکنہ نتائج

پُرامن اور منظم احتجاج کے تین ممکنہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں :

۱۔ حکومت ان مظاہروں کے نتیجے میں پسپائی اختیار کرے اور منکرات کے خاتمے اور حدود اللہ کے نفاذ کا آغاز کر دے۔ اس طرح انقلابی جماعت ایک ایک منکر کو ختم کروا کر حدود اللہ کا نفاذ کرواتی رہے گی اور پورا نظام درست ہونے تک یہ جدوجہد جاری رہے گی۔

۲۔ حکومت انقلابی تحریک کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لے اور اپنی بقاء اور مفادات کے تحفظ

کے لئے تحریک کو مکمل طور پر کچلنے کا فیصلہ کرے۔ اس صورت میں حکومت پر قابض مراعات یافتہ طبقات یعنی سرمایہ دار اور جاگیردار ریاست کی پولیس اور فوج کو اس تحریک کو کچلنے کے لئے بے دریغ استعمال کریں گے۔ لاٹھیاں برسائی جائیں گی، آنسو گیس کے شیل پھینکے جائیں گے، گولیوں کی بوچھاڑ آئے گی اور گرفتاریاں ہوں گی۔ اگر لوگ اللہ کی راہ میں قربانیاں حتیٰ کہ جان دینے پر تیار ہوں اور ثابت قدمی سے میدان میں ڈٹے رہیں تو پولیس کتنوں کو گرفتار کرے گی اور کتنوں کو شہید کرے گی؟ بالآخر پولیس اور فوج جواب دے دے گی کہ یہ مظاہرین ہمارے ہی ہم مذہب اور ہم وطن ہیں، یہ کسی ذاتی غرض کے لئے نہیں بلکہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کے نفاذ کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے نکلے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ حکومت کا تختہ الٹ جائے گا اور انقلابی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہو گی۔ ان شاء اللہ العزیز۔ ماضی قریب میں اس کی ایک مثال موجود ہے۔ ۱۹۷۷ء میں نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی تحریک کے دوران پاکستانی فوج نے نہتے عوام پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اس وقت چونکہ کوئی ایک منظم جماعت اقتدار سنبھالنے والی موجود نہ تھی لہٰذا فوج نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

۳۔ اگر حکومتِ وقت اس تحریک کو کچلنے میں کامیاب ہو جائے، تو جن لوگوں نے اس راہ میں جانیں دی ہوں گی ان کی قربانیاں ہرگز ضائع نہیں ہوں گی۔ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اجرِ عظیم اور فوزِ کبیر سے نوازے جائیں گے (ان شاء اللہ)۔

ہم نظام کو بالفعل بدلنے کے مکلّف یعنی ذمہ دار نہیں ہیں، البتہ اس کو بدلنے کی جدّوجہد ہم پر فرض ہے۔ مزید برآں انہی جاں نثاروں اور سرفروشوں کے خون اور ہڈیوں کی کھاد سے ان شاء اللہ جلد یا بدیر کوئی نئی انقلابی اسلامی تحریک ابھرے گی جو طاغوتی، استحصالی اور جابرانہ نظام کو للکارے گی اور اس طرح وہ وقت آ کر رہے گا جس کی خبر الصادق والمصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے کہ پورے کرۂ ارضی پر اللہ کا دین اسی طرح غالب ہو کر رہے گا جس طرح آپ ﷺ کی حیاتِ طیّبہ میں جزیرہ نمائے عرب پر غالب ہوا تھا۔

مسئلہ اجتہاد کے ضمن میں
علامہ اقبال کی ایک اہم غلط فہمی
اور اس کی اصل بنیاد

حافظ خالد محمود خضر

قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا﴾ (المائدہ : ۳)

"آج میں نے مکمل کر دیا ہے تمہارے لئے تمہارا دین، اور تم پر پورا کر دیا ہے اپنا احسان، اور میں نے پسند کیا تمہارے لئے اسلام کو بطور دین۔"

یہ آیۂ مبارکہ سورۃ المائدہ کے آغاز میں وارد ہوئی ہے، جسے "تکمیلِ شریعت کی سورت" کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے قرآن حکیم کی آخری سورتوں میں سے ہے، اور اس میں شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اعتبار سے تکمیلی احکام وارد ہوئے ہیں۔ چنانچہ متذکرہ بالا آیۂ مبارکہ کے بعد کھانے پینے کی چیزوں میں حِلّت و حرمت کا تکمیلی ضابطہ اور اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ نکاح کے احکام بیان ہوئے [۱]۔ مزید برآں اس سورۂ مبارکہ میں حدِ سرقہ قطع ید کی صورت میں بیان کی گئی [۲] اور محاربہ (یعنی فتنہ و فساد برپا کرنے اور ڈاکہ و راہزنی) کی انتہائی سخت سزا قتل کر دیئے جانے، سولی چڑھا دیئے جانے، مخالف سمتوں سے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جانے، یا ملک بدر کر دیئے جانے کی صورت میں بیان ہوئی [۳]۔ اس کے علاوہ سورۃ البقرہ میں قتلِ عمد کی سزا قصاص بیان کی گئی ہے، یعنی مقتول کے بدلے میں قاتل کو بھی قتل کر دیا جائے، اِلّا یہ کہ مقتول کے ورثاء خون بہا (دیت) لینے پر آمادہ ہو جائیں [۴]۔ پھر سورۃ النور میں زنا کی سزا (زانی یا زانیہ کے غیر شادی شدہ ہونے کی صورت میں) سو کوڑے [۵] اور قذف کی سزا

اسی کوڑے{۶} مذکور ہے۔

قرآن حکیم کے بارے میں ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو اس نے اپنے آخری نبی حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمائی، اور اس کے ذریعے نوعِ انسانی کو ایک مکمل ضابطہ حیات عطا فرمایا۔ بقول اقبال ؎

نوعِ انساں را پیامِ آخریں!
حاملِ اُو رحمۃٌ لِلعالمیں!!

اور یہ کہ اس میں بیان کردہ احکام کی نوعیت وقتی اور عارضی نہ تھی بلکہ یہ احکام قیامت تک کے لئے بعینہٖ اسی طرح واجب العمل رہیں گے جس طرح اس کے نزول کے وقت تھے۔ اس کا ایک ایک حرف دائمی و غیر مبدّل اور شک و شبہ سے بالاتر ہے ؎

حرفِ اُو را ریب نے، تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی آخر الزماں حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو قرآن حکیم دے کر مبعوث فرمایا گیا تو آپؐ کی ذمہ داری صرف اس کا "ابلاغ" ہی قرار نہیں دی گئی، بلکہ اس کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ اس کی تبیین بھی آپ کا فرضِ منصبی ٹھہرایا گیا، از روئے الفاظ قرآنی :

﴿یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ﴾ (المائدہ : ۶۷)

"اے رسول، پہنچا دو جو کچھ تم پر اترا تمہارے رب کی طرف سے۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کا پیغام کچھ نہیں پہنچایا"۔

اور

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ وَلَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ ○﴾ (النحل : ۴۴)

"اور (اے نبی) ہم نے تم پر یہ یاد دہانی نازل کی ہے تا کہ تم کھول کر بیان کر دو لوگوں کے سامنے وہ چیز جو ان کے لئے نازل کی گئی اور تا کہ وہ غور کریں"۔

چنانچہ رسولِ ختمی مرتبت ﷺ نے اپنے قول و عمل سے قرآن حکیم کی تشریح و توضیح

نوعِ انسانی کے سامنے پیش فرمادی۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اسیؐ کی حکمتِ بالغہ کے تقاضے کے طور پر، رسول اللہ ﷺ کی بیان کردہ اس تشریح و توضیح کو بھی قیامِ قیامت تک کے لئے محفوظ رکھے جانے کے انتظامات فرمادیئے گئے۔ حضور ﷺ نے قرآن میں مذکور سزاؤں کے علاوہ چند مزید سزائیں بھی نافذ فرمائیں، مثلاً شادی شدہ زانی کے لئے رجم کی سزا، ارتداد اور توہینِ رسالت کے مرتکب افراد کے لئے قتل کی سزا، اور شرابی کے لئے چالیس کوڑوں کی سزا۔ آنحضورؐ کی نافذ کردہ ان سزاؤں پر بھی تواتر کے ساتھ امّت کا اجماع چلا آرہا ہے، اس لئے کہ وحی جلی کی طرح وحی خفی بھی امت کے لئے حجت کا درجہ رکھتی ہے۔

قرآن و سُنّت سے ثابت شدہ ان معیّن سزاؤں کو "حدود" کا نام دیا جاتا ہے اور نزولِ قرآن سے لے کر آج تک امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ حدود غیر مبدّل اور ابدی ہیں اور یہ کہ کسی بھی زمانے میں عصری تقاضوں کے پیش نظر ان میں کسی تغیر و تبدیل کی گنجائش نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر ان حدود کے معاملے میں تاقیامِ قیامت کسی اجتہاد کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ لیکن بدقسمتی سے عصرِ حاضر میں دینی علوم سے بے بہرہ، مغربی تہذیب کے دلدادہ اور مغربی فکر و قانون سے مرعوب بعض نام نہاد دانشوران اسلامی حدود کے بارے میں بھی طرح طرح کی گل افشانیاں کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ کبھی ان سزاؤں کو (معاذ اللہ) وحشیانہ اور غیر مہذب کہا جاتا ہے، اور کبھی ان کے بارے میں یہ دُور کی کوڑی لائی جاتی ہے کہ ان سزاؤں کی حیثیت ابدی اور عالمگیر نہیں ہے، بلکہ یہ اُس وقت کے عرب بدّوؤں کے لئے تھیں جو قرآن اور رسول اللہ ﷺ کے اولین مخاطب تھے، اور یہ کہ دوسری اقوام اور بعد کے زمانوں کے لئے ان سزاؤں میں تغیر و تبدیل کی گنجائش ہے، لہٰذا عہدِ حاضر میں ان کے بارے میں اجتہاد کیا جانا چاہئے۔ بعض دانشور اپنے اس موقف کی تائید میں علامہ اقبال کے ایک خطبے کا حوالہ بھی دیتے ہیں جس میں انہوں نے شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" سے ایک حوالہ دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ انبیاء جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں ان پر اسی قوم کے رسم و رواج اور عادات و خصائص کے مطابق شریعت نازل کی جاتی ہے، لہٰذا ضروری نہیں کہ ان

احکامِ شرعیہ کو آئندہ نسلوں کے لئے بھی واجب ٹھہرایا جائے۔ یہ طرزِ استدلال چونکہ بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دے سکتا ہے اور اس کی بنیاد پر گمراہی کی ایک بہت بڑی عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے' لہٰذا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے خطبے کی عبارت اور اس میں بیان کردہ حجتہ اللہ البالغہ کی عبارت کا جائزہ لیا جائے تاکہ یہ معاملہ نکھر کر سامنے آسکے کہ غلط فہمی کی اصل بنیاد کیا ہے۔

علامہ اقبال کی "تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامی" (The Reconstructionof Religious thought in Islam) کے چھٹے خطبے کا موضوع "اسلام کا حرکی تصور اور اجتہاد" (The Principle of Movement in the Structure of Islam) ہے۔ یہاں انہوں نے ذیلی بحث کے طور پر اسلامی قانون کے چار مآخذ یعنی قرآن' سنت' اجماع اور قیاس کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر ان کے ضمن میں اپنے دور کے حالات کے پیدا کردہ مسائل کے حوالے سے تبصرہ کیا ہے۔ سنت کے ماخذِ قانون ہونے کی حیثیت سے گفتگو کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں :

> "For our present purposes, however, we must distinguish traditions of a purely legal import from those which are of a non-legal character. With regard to the former, there arises a very important question as to how far they embody the pre-Islamic usage of Arabia which were in some cases left intact and in others modified by the Prophet is difficult to make this discovery, for our early writers do not always refer to pre-Islamic usages. Nor is it possible to discover that usages, left intact by express or tacit approval of the Prophet, were intended to be universal in their application. Shah Wali Allah has a very illuminating discussion on the point. I reproduce here the substance of his view. The Prophetic method of teaching, according to Shah Wali Allah, is that, generally speaking, the law revealed by a prophet takes especial notice of the habits, ways, and peculiarities of the people to whom he is specifically sent. The Prophet who aims at all-embracing principles, however, can neither reveal different principles for

different peoples, nor leaves them to work out their own rules of conduct. His method is to train one particular people, and to use them as a nucleus for the building up of a universal *Shari'ah*. In doing so he accentuates the principles underlying the social life of all mankind, and applies them to concrete cases in the light of the specific habits of the people immediately before him. The *Shari'ah* values (*Ahkam*) resulting from this application (e.g. rules relating to penalties for crimes) are in a sense specific to that people; and since their observance is not an end in itself they cannot be strictly enforced in the case of future generations".{۷}

اس عبارت کا ترجمہ نذیر نیازی صاحب نے اس طرح کیا ہے :

"لیکن جہاں تک مسئلہ اجتہاد کا تعلق ہے ہمیں چاہئے ان احادیث کو جن کی حیثیت سر تا سر قانونی ہے' ان احادیث سے الگ رکھیں جن کا قانون سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر اول الذکر کی بحث میں بھی ایک بڑا اہم سوال یہ ہو گا کہ ان میں عرب قبل اسلام کے اس رسم و رواج کا جسے جوں کا توں چھوڑ دیا گیا' یا جس میں حضور رسالت مآب صلعم نے تھوڑی بہت ترمیم کر دی' کس قدر حصہ موجود ہے۔ لیکن یہ وہ حقیقت ہے جس کا انکشاف مشکل ہی سے ہو سکے گا' کیونکہ علماء متقدمین شاذ ہی اس رسم و رواج کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ہمیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ جس رسم و رواج کو جوں کا توں چھوڑ دیا گیا' خواہ حضور رسالت مآب صلعم نے اس کی بالصراحت منظوری دی یا خاموشی اختیار فرمائی' اس پر کیا یچ مچ ہر کہیں اور ہر زمانے میں عمل کرنا مقصود تھا' شاہ ولی اللہ نے اس مسئلے میں بڑی سبق آموز بحث اٹھائی ہے۔ ہم اس کا مفاد ذیل میں پیش کریں گے۔

شاہ ولی اللہ کہتے ہیں انبیاء کا عام طریق تعلیم تو یہی ہے کہ وہ جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں ان پر اسی قوم کے رسم و رواج اور عادات و خصائص کے مطابق شریعت نازل کی جاتی ہے۔ لیکن جس نبی کے سامنے ہمہ گیر اصول ہیں' اس پر نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول نازل کئے جائیں گے' نہ یہ ممکن ہے کہ وہ ہر قوم کو اپنی اپنی ضروریات کے لئے الگ الگ اصول عمل متعین کرنے کی اجازت دے۔ وہ کسی ایک قوم کی تربیت کرتا اور پھر ایک عالمگیر شریعت کی

تشکیل میں اس سے تمہید کا کام لیتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے میں وہ اگرچہ انہی اصولوں کو حرکت دیتا ہے جو ساری نوعِ انسانی کی حیاتِ اجتماعیہ میں کار فرما ہیں، پھر بھی ہر معاملے اور ہر موقع پر عملاً ان کا اطلاق اپنی قوم کی مخصوص عادات کے مطابق ہی کرتا ہے لہٰذا اس طرح جو احکام وضع ہوتے ہیں (مثلاً تعزیرات) ایک لحاظ سے اس قوم کے لئے مخصوص ہوں گے۔ پھر چونکہ احکام مقصود بالذات نہیں [illegible] یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو آئندہ نسلوں کے لئے بھی واجب ٹھہرایا جائے"۔ {۸}

علامہ اقبال کا یہ اقتباس مندرجہ ذیل دو پہلوؤں سے قابل غور ہے :

i) کیا اسلامی سزاؤں سے متعلق شاہ ولی اللہؒ کا موقف واقعتاً یہی ہے جو مذکورہ بالا اقتباس سے متبادر ہوتا ہے، یا علامہ اقبال کو حجۃ اللہ البالغہ کا حوالہ دینے میں کوئی تسامح ہوا ہے؟

ii) علامہ اقبال نے حجۃ اللہ البالغہ سے استدلال کرتے ہوئے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، کیا یہ اقبال کا مستقل موقف تھا؟ اور اس کو بنیاد بنا کر کیا اسلامی حدود کے بارے میں یہ موقف کسی بھی درجے میں اختیار کیا جا سکتا ہے کہ ان کا تعلق عرب کے بدو معاشرے سے تھا اور آج کے "مہذب" معاشرے کے لئے ان کا نفاذ قابل عمل نہیں ہے؟

اس ضمن میں ہم اولاً پہلے نکتہ پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ اس مسئلے پر حال ہی میں اقبال اکادمی کے نائب ناظم جناب محمد سہیل عمر کا ایک تحقیقی مضمون "سزا یا ناسزا" کے عنوان سے منظر عام پر آیا ہے {۹} جس میں اس پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس قابل قدر مضمون میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے خطبے میں شاہ ولی اللہؒ کی جس عبارت کا حوالہ دیا ہے وہ حجۃ اللہ البالغہ میں بایں طور مذکور نہیں ہے، بلکہ علامہ اقبال نے دراصل علامہ شبلی نعمانی پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی تالیف "الکلام" میں مندرج عبارت کو اپنے خطبے میں نقل کیا ہے، جبکہ حجۃ اللہ البالغہ کی اصل عبارت اور "الکلام" میں دی گئی عبارت میں بہت فرق ہے۔ محمد سہیل عمر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں :

".....: یہاں آ کر علامہ نے ایک نکتہ اٹھایا ہے اور وہ ہے احکام شرعی کے تعین میں اِلف و عادت اور عرف و رواج کی رعایت رکھنے کا معاملہ۔ اس نکتے کی وضاحت کے لئے علامہ نے شاہ ولی اللہ صاحب کی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ سے ایک حوالہ دیا ہے اور اس میں بیان کردہ فکری مقدمے پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھی ہے۔ تشکیل جدید کے متداول انگریزی ایڈیشن کی تصحیح متن اور تعلیقات نویسی جناب شیخ محمد سعید صاحب نے انجام دی ہے۔ ان کے تعلیقات کے وسیلے {۱۰} سے شاہ ولی اللہ کی اصل عبارت کی جستجو کی گئی تو یہ بات پہلی مرتبہ سامنے آئی کہ حجۃ اللہ البالغہ کے مذکورہ صفحے پر اس مضمون کی کوئی متعلقہ عبارت موجود نہیں ہے۔ اس تعلیقہ میں عربی عبارت بھی دی گئی تھی اور الکلام میں اس کے اقتباس کا ذکر بھی تھا۔ الکلام کا متعلقہ صفحہ دیکھا گیا {۱۱} تو یہ کھلا کہ اقتباس کردہ عبارت اور تعلیقے کی عبارت میں فرق ہے۔ مزید پرچول کی تو شاہ صاحب کی اصل عبارت بھی مل گئی {۱۲}۔ الکلام میں دی گئی عبارت کو اصل عربی عبارت سے ملا کر دیکھا تو واضح ہوا کہ شبلی نے جو عبارت الکلام میں درج کی اور جسے علامہ نے اپنے استدلال کے لئے شبلی کے بھروسے پر بنیاد بنایا اس میں اور شاہ ولی اللہ کی اصل عبارت میں اختلاف ہے۔ شبلی نے اپنے مخصوص انداز تالیف میں پہلے تو عبارت کے درمیان سے چھ سطریں حذف کر دیں، پھر آخر کی دو سطریں اڑا دیں اور اس کے بعد نہ صرف اس امر کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا کہ عربی عبارت مسلسل نقل نہیں ہوئی بلکہ آخر میں استنباطِ نتائج کے طور پر جو اردو میں خلاصہ یا مقصودِ کلام دیا ہے وہ بھی اس طرح درج ہوا ہے کہ بظاہر شاہ صاحب ہی کا مدعا قرار پاتا ہے..... {۱۳}"

زیر نظر مضمون جناب محمد سہیل عمر کی تحقیق سے استفادہ کر کے لکھا گیا ہے اور ان کے شکریئے کے ساتھ قارئین میثاق کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

مسئلے کی وضاحت کے لئے پہلے ہم شاہ صاحبؒ کی اصل عبارت ملاحظہ کرتے ہیں۔ متعلقہ عبارت حجۃ اللہ البالغہ کے مبحث سادس (مبحث السیاسات الملیۃ) کے "باب الحاجۃ الی دین ینسخ الادیان" میں واقع ہوئی ہے۔ اس باب میں اس امر پر بحث کی گئی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے وقت انسانیت ذہنی، روحانی اور

تمدنی ارتقاء کے حوالے سے اس سطح تک پہنچ چکی تھی کہ اب ایک ایسی شریعت نازل کر دی جاتی جو سابقہ شریعتوں کی ناسخ ہوتی اور اب یہی شریعت قیامت تک کے لئے نافذ العمل رہتی۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ پر جو شریعت نازل ہوئی وہ اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ تاقیامت انسانوں کے مسائل حل کر سکتی ہے۔ شریعت اسلامی میں یہ خوبی کیسے پیدا ہوتی ہے اور اس میں ناقابل تغیر اور قابل تغیر احکام کس حکمت کے ساتھ سموئے گئے ہیں اس پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں :

وھذا الامام الذی یجمع الامم علٰی ملة واحدة یحتاج الٰی اصول اخری غیر الاصول المذکورة فیما سبق۔ منھا ان یدعو قوما الی السنة الراشدة' ویزکیھم' ویصلح شأنھم' ثم یتخذھم بمنزلة جوارحہٖ' فیجاھد اھل الارض' ویفرقھم فی الآفاق' وھو قولہ تعالٰی : ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ وذٰلک لان ھذا الامام نفسه لایتاتی منه مجاھدة امم غیر محصورة' واذا کان کذٰلک وجب ان تکون مادة شریعته ماھو بمنزلة المذھب الطبیعی لاھل الاقالیم الصالحة عربھم وعجمھم' ثم ماعند قومه من العلم والارتفاقات' ویراعی فیه حالھم اکثر من غیرھم' ثم یحمل الناس جمیعًا علٰی اتباع تلک الشریعة لانه لاسبیل الی ان یفوض الامر الٰی کل قوم او الٰی ائمة کل عصر' اذلا یحصل منه فائدة التشریع اصلاً' ولا الٰی ان ینظر ماعند کل قوم' ویمارس کلامنھم' فیجعل لکل شریعة' اذالاحاطة بعاداتھم وما عندھم علی اختلاف بلدانھم وتباین ادیانھم کالممتنع' وقد عجز جمھور الرواة عن روایة شریعة واحدة' فما ظنک بشرائع مختلفة' والاکثر انه لایکون انقیاد

الآخرين الا بعد عدد ومدد لايطول عمرالنبی اليها، كماوقع فی الشرائع الموجودة الآن فان اليهود والنصارٰی والمسلمين مآمن من اوائلهم الا جمع، ثم اصبحوا ظاهرين بعد ذٰلك، فلا احسن ولا ايسر من ان يعتبر فی الشعائر والحدود والا رتفاقات عادة قومه المبعوث فيهم، ولا يضيّق كل التضييق على الآخرين الذين ياتون بعد، ويبقى عليهم في الجملة، والاولون يتيسر لهم الاخذ بتلك الشريعة بشهادة قلوبهم وعاداتهم، والآخرون يتيسر لهم ذلك بالرغبة فی سير ائمة الملة والخلفاء، فانها كالامر الطبيعی لكل قوم فی كل عصر قديمًا وحديثًا.... [۱۴]

عبدالحق حقانی صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے اردو ترجمے "نعمۃ اللہ السابغۃ" میں مذکورہ بالا عبارت کا ترجمہ بایں الفاظ کیا ہے :

"......اس امام کو جو تمام فرقوں کو ایک مذہب پر جمع کرنا چاہتا ہے علاوہ ان اصول امامت کے جو پیشتر مذکور ہو چکے ہیں اور اصول کی بھی ضرورت پڑتی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگوں کو راہ راست کی طرف بلائے، ان کے نفوس کا تزکیہ کرے اور ان کی حالت کو درست کرے، پھران کو بمنزلہ اپنے اعضاء کے بنالے تا کہ ان کے ذریعے تمام عالم میں جہاد کرے اور ان کو دنیا میں پھیلادے۔ چنانچہ خدا کے اس قول میں یہی مراد ہے "تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی تکمیل کے لئے پیدا کئے گئے ہو"۔ اور یہ اس لئے ہے کہ یہ امام خود تنہا بے شمار قوموں سے جہاد نہیں کر سکتا، اور جب یہ بات ہے تو ضروری ہے کہ اس کی شریعت کا مادہ تمام معتدل اقالیم کے باشندوں کے لئے اور تمام عرب و عجم کے لئے بمنزلہ طبعی مذہب کے ہو۔ اس کے بعد وہ مادۂ شریعت اس کی قوم کے علم و ارتفاقات کے موافق ہو اور اس میں بہ نسبت دوسروں کے اس کی قوم کی حالت کا زیادہ خیال رکھا گیا ہو۔ پھر تمام لوگوں کو اس شریعت کی پیروی کا حکم دیا جائے کیونکہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہر

قوم کی حالت کو (خود) اسی کے سپرد کر دیا جائے یا ہر زمانہ کے اماموں پر اس کو چھوڑ دیں، اس لئے کہ اس سے شریعت مقررہ بے سود ہو جاتی ہے۔ اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ ہر ہر قوم کے حالات و عادات دیکھ کر ہر ایک کے لئے جداگانہ شریعت مقرر کی جائے، اس لئے کہ ان کی عادات اور ان کے حالات کا احاطہ کرنا باوجود ان کے شہر اور مذاہب کے اختلاف کے محال کے درجہ میں ہے، حالانکہ تمام نقل کرنے والے صرف ایک شریعت کے نقل کرنے میں عاجز آ گئے ہیں تو مختلف شرائع کی نسبت تم کیا خیال کر سکتے ہو۔ اور نیز اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک مدتِ دراز کے بعد دوسرے لوگ شریعت کے مطیع ہوتے ہیں جس کے لئے نبی کی عمر وفا نہیں کرتی۔ اس وقت کی موجودہ شریعتوں میں ایسا ہی ہوا ہے، یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کے متقدمین میں سے ایک مختصر سی جماعت ہی ایمان لائی تھی، پھر اس کے بعد ان کو غلبہ حاصل ہو گیا تھا۔ تو اس سے زیادہ عمدہ اور آسان طریقہ نہیں ہے کہ شرائع، حدود اور تدابیر میں اسی قوم کی عادت کا اعتبار کیا جائے جس کی طرف رسول مبعوث ہوا ہے اور یہ کہ ان کے بعد دوسرے آنے والوں پر یہ امور بالکل تنگی کا باعث نہ ہوں گو کسی قدر ان پر تنگی رہے۔ متقدمین کے لئے تو اس شریعت کو قبول کرنا اپنی دلی شہادت اور اپنی عادات کی وجہ سے آسان ہو جاتا ہے اور متاخرین کے لئے اس شریعت کا اختیار کرنا اس مذہب کے ائمہ اور خلفاء کی سیرتوں میں رغبت رکھنے کی وجہ سے سہل ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ امر ہر قوم کے لئے ہر زمانہ میں خواہ قدیم ہو یا جدید بمنزلہ امر طبعی کے ہے......."(۱۵)

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی اصل عبارت اور اس کا ترجمہ ملاحظہ کرنے کے بعد اب ہم دیکھتے ہیں کہ اسی عبارت کو شبلی نعمانی نے "الکلام" میں کس انداز سے پیش کیا ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ کے مذکورہ اقتباس سے پہلے شبلی نے شاہ صاحب کی عبارت کا خلاصہ اردو میں بایں الفاظ درج کیا ہے:

"اوپر بیان ہو چکا ہے کہ پیغمبر جس قوم میں مبعوث ہوتا ہے، اس کی شریعت میں اس قوم کے عادات اور خصوصیات کا خاص طریقہ پر لحاظ ہوتا ہے، لیکن جو پیغمبر تمام عالم کے لئے مبعوث ہو، اس کے طریقہ تعلیم میں یہ اصول چل نہیں سکتا، کیونکہ نہ وہ تمام دنیا کی قوموں کے لئے الگ الگ شریعتیں بنا سکتا ہے نہ تمام

قوموں کی عادات اور خصوصیتیں باہم متفق ہو سکتی ہیں۔ اس لئے وہ پہلے اپنی قوم کی تعلیم و تلقین شروع کرتا ہے اور ان کو محاسن اخلاق کا نمونہ بناتا ہے، یہ قوم اس کے اعضا اور جوارح کا کام دیتی ہے اور اسی نمونہ پر وہ اپنی تلقین کا دائرہ وسیع کرتا جاتا ہے۔ اس کی شریعت میں اگرچہ زیادہ تر وہ قواعد کلیہ اور اصول عام ہوتے ہیں جو قریباً تمام دنیا کی قوموں میں مشترک ہوتے ہیں، تاہم خاص اس کی قوم کی عادات اور خصوصیات کا لحاظ زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن جو احکام ان عادات اور حالات کی بنا پر قائم ہوتے ہیں ان کی پابندی مقصود بالذات نہیں ہوتی اور نہ ان پر چنداں زور دیا جاتا ہے۔"(۱۶)

اس کے معاً بعد شبلی نعمانی نے شاہ صاحب کی تحریر سے اقتباس اس انداز سے پیش کیا ہے

"اس اصول کو شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ (صفحہ ۱۲۳) میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

وھذا الامام الذی یجمع الامم علی ملۃ واحدۃ یحتاج الیٰ اصول اخرٰی غیر الاصول المذکورۃ فیما سبق منھا ان یدعو قوما الی السنۃ الراشدۃ ویزکیھم ویصلح شانھم ثم یتخذھم بمنزلۃ جوارحہ۔ وذلک لان ھذا الامام نفسہ لایتاتی منہ مجاھدۃ امم غیر محصورۃ واذا کان کذلک وجب ان تکون مادۃ شریعتہ ماھو بمنزلۃ المذھب الطبیعی لاھل الاقالیم الصالحۃ عربھم وعجمھم ثم ماعندقومہ من العلم الارتفاقات ویراعی فیہ حالھم اکثر من غیرھم ثم یحمل الناس جمیعا علی اتباع تلک الشریعۃ لانہ لاسبیل الی ان یفوض الامر الی کل قوم اوالی ائمۃ کل عصر اذلا یحصل منہ فائدۃ التشریع اصلا ولا الیٰ

یہ امام جو تمام قوموں کو ایک مذہب پر لانا چاہتا ہے اس کو اور چند اصول کی جو اصول مذکورہ بالا کے علاوہ ہیں حاجت پڑتی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک قوم کو راہ راست پر بلاتا ہے، اس کی اصلاح کرتا ہے، اس کو پاک بنا دیتا ہے۔ پھر اس کو اپنا دست و بازو قرار دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ یہ امام تمام دنیا کی قوموں کی اصلاح میں جان کھپائے، اس لئے ضرور ہوا کہ اس کی شریعت کی اصلی بنیاد تو وہ ہو جو تمام عرب و عجم کا فطری مذہب ہو، اس کے ساتھ خاص اس کی قوم کے عادات اور مسلّمات کے اصول بھی لئے جائیں اور ان کے حالات کا لحاظ بہ نسبت اور قوموں کے زیادہ تر کیا جائے، پھر تمام لوگوں کو اس شریعت کی پیروی کی تکلیف دی جائے کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہر قوم یا ہر پیشوائے قوم کو اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنی شریعت آپ بنالیں ورنہ تشریع محض بے فائدہ

"ان یعتبر فی الشعائر والحدود والارتفاقات عادة قومه المبعوث فیهم ولا یضیق کل التضییق علی الآخرین الذین یاتون بعد

ہوگی' نہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر قوم کی عادات اور خصوصیات کا تجسس کیا جائے اور ہر ایک کے لئے الگ الگ شریعت بنائی جائے۔ اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان کوئی اور طریقہ نہیں کہ شعار' تعزیرات' اور انتظامات میں خاص اس قوم کی عادات کا لحاظ کیا جائے جن میں یہ امام پیدا ہوا ہے' اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے۔

اس اصول سے یہ بات ظاہر ہوگی کہ شریعت اسلامی میں چوری' زنا' قتل وغیرہ کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں ان میں کہاں تک عرب کی رسم و رواج کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ کہ ان سزاؤں کا بعینہا اور بخصوصہا پابند رہنا کہاں تک ضروری ہے۔"{۱۷}

حجۃ اللہ البالغہ کی اصل عبارت اور الکلام میں اقتباس شدہ عبارت کے متن میں تقابل کر کے قارئین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شبلی مرحوم نے شاہ صاحب کی عبارت کو اپنی مرضی کے معانی پہنانے اور اس سے اپنا من پسند مفہوم نکالنے کے لئے کس طرح حسب ضرورت کتر بیونت سے کام لیا ہے اور اصل عبارت سے جابجا فقرے حذف کر کے اسے کس طرح مسلسل عبارت کی شکل دے دی ہے۔ ان میں سے بعض (حذف شدہ) فقرے اس قدر اہم ہیں کہ عبارت میں ان کے ہونے یا نہ ہونے سے استدلال کا سارا تناظر بدل جاتا ہے۔ اس ضمن میں حجۃ اللہ البالغہ کی اصل عبارت کا آخری حصہ بہت اہم ہے۔ اس کا ایک رواں اور بامحاورہ ترجمہ ذیل میں دیا جا رہا ہے :

"..... چنانچہ اس سے بہتر اور آسان تر کوئی بات نہیں کہ شعائر' حدود اور ارتفاقات میں اسی قوم کی عادت کا اعتبار کیا جائے جس میں وہ مبعوث ہوا ہے اور بعد میں آنے والے دوسرے لوگوں کے لئے بالکل ہی تنگی نہ کر دی جائے۔ ان کے لئے ان (شعائر' حدود اور ارتفاقات) کو فی الجملہ باقی رکھا جائے۔ پہلے لوگوں کے لئے اس شریعت کو اختیار کرنا اس لئے آسان ہوا کہ ان کے دل اور ان کی عادات اس کے شاہد تھے۔ پچھلوں کے لئے اس کو اختیار کرنے میں آسانی اس

لئے ہو گئی کہ ان کے لئے ائمہ ملت اور خلفاء کی سیرت کا اتباع مرغوب چیز تھا۔
پس یہ شریعت ہر قوم کے لئے اور قدیم و جدید ہر زمانے میں امر طبیعی کی
طرح ہے۔" {۱۸}

جبکہ اسی عبارت کو حسب ضرورت کتر بیونت کے بعد شبلی نے یہ صورت دی ہے :

"......اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان کوئی اور طریقہ نہیں کہ شعار، تعزیرات
اور انتظامات میں خاص اس قوم کی عادات کا لحاظ کیا جائے جن میں یہ امام پیدا ہوا
ہے، اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ
کی جائے"۔

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا! شاہ صاحب کی عبارت سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ
احکامِ شریعت ہر قوم اور ہر زمانے کے لئے واجب العمل ہیں اور ان پر عمل کرنا بعد والوں
کے لئے بھی اتنا ہی آسان ہے جتنا پہلے والوں کے لئے تھا، البتہ اس آسانی کے اسباب
دونوں کے لئے مختلف ہیں۔ معلوم نہیں کہ شبلی نعمانی جیسے صاحبِ علم نے کہاں پہ ٹھوکر
کھائی کہ اسی عبارت کی کوکھ سے ایک بالعکس مفہوم کی حامل عبارت نکال لے آئے اور
اس کی تمہید اور استنباطِ نتائج کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا کہ

"جو احکام ان عادات و حالات کی بنا پر قائم ہوتے ہیں ان کی پابندی مقصود بالذات
نہیں ہوتی اور نہ ان پر چنداں زور دیا جاتا ہے"۔

اور

"اس اصول سے یہ بات ظاہر ہو گی کہ شریعت اسلامی میں چوری، قتل، زنا وغیرہ
کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں ان میں کہاں تک عرب کی رسم و رواج کا لحاظ رکھا
گیا ہے اور یہ کہ ان سزاؤں کا بعینہا اور بخصوصہا پابند رہنا کہاں تک
ضروری ہے؟"

ہمیں تو یہ صورت حال علامہ اقبال کے اس شعر کا مصداق نظر آتی ہے ؎

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر!

اب ہم واپس علامہ اقبال کے محولہ بالا خطبے کی طرف آتے ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ کی

اصل عبارت اور الکلام میں اقتباس شدہ عبارت میں تقابل کے بعد یہ نتیجہ بھی بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال کو اپنے خطبے میں حجۃ اللہ البالغہ کا حوالہ دینے میں یہ تسامح ہوا ہے کہ انہوں نے شبلی پر اعتماد کرتے ہوئے الکلام میں مندرج عبارت کو حجۃ اللہ البالغہ کی اصل عبارت سمجھتے ہوئے نقل کر دیا۔ گمان غالب یہ ہے کہ اقبال نے اس وقت تک حجۃ اللہ البالغہ کی اصل عبارت ملاحظہ نہیں کی تھی' ورنہ انہیں شبلی کے فراہم کردہ اقتباس پر انحصار کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی اور وہ شبلی کے خلاصۂ افکار سے تاثر قبول نہ کرتے۔

جیسا کہ حجۃ اللہ البالغہ کی مندرجہ بالا عبارت سے واضح ہے' اسلامی سزاؤں کے بارے میں شاہ ولی اللہؒ کا موقف اس کے بالکل برعکس ہے جو ان سے الکلام میں منسوب کیا گیا ہے۔ مسئلے کی مزید وضاحت کے لئے حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم کے باب الحدود سے شرعی سزاؤں کے بارے میں شاہ صاحب کی رائے ملاحظہ ہو :

> واعلم انه كان من شريعة من قبلنا القصاص فى القتل والرجم فى الزنا والقطع فى السرقة' فهذه الثلاث كانت متوارثة فى الشرائع السماوية واطبق عليها جماهير الانبياء والامم' ومثل هذا يحب ان يؤخذ عليه بالنواجذ ولا يترك......
>
> "اور واضح ہو کہ سابقہ شریعتوں میں قتل کی سزا میں قصاص اور زنا کی سزا میں سنگسار کرنا اور چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹنا تھا۔ پس یہ تینوں سزائیں آسمانی شریعتوں میں ہمیشہ سے چلی آتی تھیں اور تمام انبیاء اور ان کی امتیں اس پر متفق تھیں۔ اور یہ ایسی چیزیں ہیں جن کو نہایت مضبوطی سے پکڑنا ضروری ہے اور کبھی ان کو ترک نہیں کرنا چاہئے...."{۱۹}

اس کے بعد شاہ صاحب نے ان سزاؤں کے بارے میں شریعتِ محمدیہؐ کا یہ تصرف بیان کیا ہے کہ اس شریعت میں ہر ایک سزا کے' تخفیف کے طور پر' دو درجے مقرر کئے گئے ہیں' جیسے قتل کی سزا میں قصاص کے علاوہ دیت اور زنا کی سزا میں رجم کے علاوہ کوڑے مارنا ہے۔ حدود کی بحث میں شاہ صاحب نے قتل' زنا' چوری' رہزنی' شراب

خوری اور قذف کا ذکر کیا ہے اور ان جرائم کی سخت سزاؤں کی حکمتیں بھی بیان کی ہیں۔

مندرجہ بالا معروضات کے بعد اب ہم علامہ اقبال کے خطبے کا اس پہلو سے جائزہ لیتے ہیں کہ شرعی سزاؤں کے بارے میں اس میں جس نقطہ نظر کا اظہار کیا گیا ہے، کیا اس ضمن میں اقبال کا مستقل موقف یہی تھا؟

علامہ اقبال کا متذکرہ بالا خطبہ اپنی اولین شکل میں ۱۹۲۴ء کے لگ بھگ تصنیف ہوا تھا اور موجودہ شکل میں ۱۹۲۸ء میں تیار کیا گیا۔ علامہ اپنی وفات (۱۹۳۸ء) سے قبل اس خطبے پر نظر ثانی نہ کر سکے، اگرچہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دوران انہیں اپنے اس تسامح کا احساس ہو گیا تھا جو ان سے حجتہ اللہ البالغہ کا حوالہ دینے میں ہوا، اور نتیجتاً ان کے افکار و نظریات میں تبدیلی آچکی تھی۔ چنانچہ سید سلیمان ندوی صاحب سے علامہ اقبال کی مکاتبت کا وہ حصہ جو حیدر آباد دکن میں خطبات پیش کرنے کے بعد کا ہے، اس میں تخصیص کے ساتھ شبلی کی تحریر اور شاہ صاحب کے اقتباسات کے بارے میں استفسارات موجود ہیں، جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو حجتہ اللہ البالغہ کی اس تشریح کے بارے میں تحیّر ہے جو شبلی نے پیش کی اور اس کے وہ مضمرات ان کے سامنے عیاں ہیں جو اسے قبول کرنے سے ظاہر ہو سکتے تھے۔ سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ستمبر ۱۹۲۹ء کے بعض خطوط میں اقبال نے الکلام کے اسی اقتباس پر خلش کا اظہار کیا ہے جو تشکیل جدید میں نقل ہوا ہے اور جسے شاہ ولی اللہ کا موقف قرار دیا جاتا ہے۔

اگرچہ ان خطوط کے مطالعہ سے علامہ اقبال کے موقف کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنا مشکل ہے، تاہم ان سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ ۱۹۲۹ء کے اواخر تک علامہ کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ شاید شبلی نے شاہ صاحب کے مقصود کی صحیح ترجمانی نہیں کی اور اس لئے شاہ صاحب کے اصل موقف کے تعین کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ان خطوط سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اقبال نے حجتہ اللہ البالغہ کا مطالعہ ۱۹۲۹ء کے اواخر ہی میں کیا تھا اور قبل ازیں اپنے خطبے میں اس کی عبارت کا حوالہ "الکلام" میں مندرج عبارت ہی سے دیا تھا۔ البتہ سید سلمان ندوی کے نام ۱۹۳۴ء کے ایک خط سے کسی حد تک یہ غالب گمان کیا جا سکتا ہے کہ اس ضمن میں اقبال کے موقف میں تبدیلی آچکی تھی۔ اپنے

۲۴/جنوری ۱۹۳۴ء کے خط میں اقبال لکھتے ہیں:

"میں نے آپ کا پہلا خط پھر دیکھا ہے، آپ نے جو کچھ لکھا ہے درست ہے، مگر میں ان معاملات کی ایک فہرست چاہتا ہوں جن کے متعلق رائے قائم کرنا "امام" کے سپرد ہے۔ جرائم میں ایسے جرم ہیں جن کی تعزیر غالباً قرآن شریف میں مقرر ہے، ان کے متعلق امام کیوں کر رائے دے سکتا ہے؟" {۲۰}

بہرحال علامہ اقبال کے اس خط سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن حکیم میں مذکور جرائم کی سزاؤں کے بارے میں ان کا موقف یہی تھا کہ ان کی حیثیت ابدی ہے اور زمانے کے تغیر و تبدل کے ساتھ ان میں تغیر و تبدیل ممکن نہیں۔ گویا یہ دائرۂ اجتہاد سے ماوراء ہیں۔

موضوع زیر بحث سے متعلق ڈاکٹر محمد امین صاحب کا ایک مضمون بھی "شاہ ولی اللہ اور اسلامی حدود" کے عنوان سے سہ ماہی فکر و نظر میں شائع ہوا ہے جس میں یہ نکتہ بھی اٹھایا گیا ہے کہ شاہ صاحب کی عبارت نقل کرنے میں اپنے تسامح کے باوجود اس میں وارد شدہ لفظ "الحدود" کو علامہ اقبال نے غالباً شرعی اور اصطلاحی حدود کے مفہوم میں نہیں لیا۔ اقبال نے "حدود" کا ترجمہ *Shariah Values* کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی قوسین میں (e.g. rules relating to penalties for crimes) یعنی "مثلاً جرائم کی سزاؤں سے متعلق احکام" کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :

"یہاں اگر "جرائم کی سزاؤں سے متعلق احکام" سے مراد تعزیری احکام ہیں، جیسا کہ اس کا ترجمہ نذیر نیازی صاحب نے کیا ہے، تو یہ بالکل صحیح ہے، کیونکہ تعزیری احکام کی تفصیلات میں زمان و مکان کے بدلنے سے تغیر کا واقع ہونا ایک امر ظاہر ہے، لیکن اگر اس سے مقصود اصطلاحی حدود ہیں تو اس پر وہی اعتراض وارد ہوگا جو اس سے پہلے ہم علامہ شبلی کے بارے میں بیان کر چکے ہیں۔ لیکن چونکہ اقبال نے یہاں حدود کا لفظ استعمال نہیں کیا اس لئے اسلامی حدود کا لفظ خوامخواہ اقبال کے سر کیوں منڈھا جائے؟" {۲۱}

واضح رہے کہ شبلی نے الکلام میں "حدود" کا ترجمہ "تعزیرات" کرنے کے باوجود اس

سے مراد شرعی اور اصطلاحی حدود ہی ہیں۔

دورِ حاضر کے جو نام نہاد دانشور اسلامی حدود و تعزیرات کو عرب کے بدو معاشرے کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں اور انہیں وحشیانہ قرار دے کر موجودہ "مہذب" معاشرے کے لئے ناممکن العمل قرار دیتے ہیں ان کے افکار و نظریات درحقیقت دین سے محض ناواقفیت ہی پر مبنی نہیں ہیں بلکہ اسلام دشمنی کا مظہر ہیں۔ مغربی تہذیب و ثقافت کے دلدادہ اور مغربی افکار سے مرعوب یہ کج فہم اور دریدہ دہن لوگ اپنے خود ساختہ نظریات کے پرچار کے لئے علامہ اقبال کا نام بھی استعمال کرتے ہیں، حالانکہ مندرجہ بالا معروضات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال احکامِ شریعت میں ردّ و بدل کے قائل نہیں تھے اور ایک دور میں ان کے قلم سے اگر اس سے فروتر کوئی بات نکل گئی تھی تو وہ محض غلط فہمی پر مبنی تھی، جس سے انہوں نے بعد میں رجوع کر لیا تھا۔

حواشی

(۱) سورۃ المائدہ، آیت ۵۔
(۲) سورۃ المائدہ، آیت ۳۸۔
(۳) سورۃ المائدہ، آیت ۳۳۔
(۴) سورۃ البقرۃ، آیت ۱۷۸۔
(۵) سورۃ النور، آیت ۲۔
(۶) سورۃ النور، آیت ۴۔
(۷) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (انگریزی) تدوین و تعلیقات از شیخ محمد سعید، مطبوعہ اقبال اکیڈمی پاکستان و ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۹ء ص ۱۳۶۔
(۸) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ نذیر نیازی، مطبوعہ بزم اقبال کلب روڈ لاہور، طبع سوم مئی ۱۹۸۶ء، ص ۲۶۴-۲۶۶
(۹) اقبالیات، اقبال اکادمی پاکستان، جلد ۲۶، شمارہ ۴، جنوری۔ مارچ ۱۹۹۶ء، ص ۱۰۷-۱۳
(۱۰) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (انگریزی)، محولہ ماقبل، ص ۱۹۶
(۱۱) شبلی نعمانی، الکلام مشمولہ علم الکلام اور الکلام، مسعود پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۲۳۷-۲۳۸
(۱۲) شاہ ولی اللہ دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، قاہرہ، ۱۳۵۲ھ ج ۱، ص ۱۱۸

(۱۳) اقبالیات، محولہ ماقبل، ص ۱۰۷

(۱۴) حجۃ اللہ البالغہ، محولہ ماقبل، ج۱، ص ۱۱۸

(۱۵) حجۃ اللہ البالغہ، مع اردو ترجمہ نعمۃ اللہ السابغہ، مترجم ابو محمد عبدالحق حقانی، نور محمد اصح المطابع، کراچی، (۱۳۰۲ھ) ج۱، ص ۲۵۴-۲۵۵

(۱۶) شبلی نعمانی، الکلام، محولہ ماقبل، ص ۲۳۶

(۱۷) شبلی نعمانی، الکلام، محولہ بالا، ص ۲۳۷-۲۳۸

واضح رہے کہ حجۃ اللہ البالغہ سے جو ادھوری عبارت "الکلام" میں نقل کی گئی ہے اس میں بھی کئی جگہ سہو کتابت موجود ہے، لیکن اس سے صرف نظر کرتے ہوئے یہاں اس کی تصحیح کر دی گئی ہے۔

(۱۸) اصل عبارت کے لئے دیکھئے حجۃ اللہ البالغہ، محولہ ماقبل، ج۱، ص ۱۱۸

ترجمہ عبارت از محمد سہیل عمر، اقبالیات، محولہ ماقبل، ص ۱۱۴

(۱۹) حجۃ اللہ البالغہ، مع اردو ترجمہ نعمۃ اللہ السابغہ، محولہ ماقبل، ج۲، ص ۴۵۰

(۲۰) اقبالیات، محولہ ماقبل، ص ۱۲۵

(۲۱) سہ ماہی فکر و نظر، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، جلد ۳۲، شمارہ ۲، اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۹۴ء، ص ۷۰

نفاق کی نشانیاں (۵)

تالیف : فضیلۃ الشیخ الاستاد عائض عبداللہ القرنی

ترجمہ و حواشی : ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

بیسویں نشانی

حادثاتِ زمانہ سے خواہ مخواہ ڈرنا

ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ﴾ (المنافقون ۰ ۴)

"وہ ہر زور کی آواز کو اپنے خلاف سمجھتے ہیں"۔

وہ ہمیشہ ڈرتے ہی رہتے ہیں' اگر قیمتیں چڑھ جائیں تو محفلوں میں بیٹھ کر واویلا کرتے ہیں۔ ہر ایک دوسرے سے کہتا ہے سنا ہے کہ چاول اور چینی کا نرخ کس قدر بڑھ گیا ہے؟۔ بس انہیں تو کھانے پینے کا خیال ہے' انہیں دعوتِ دین یا نصرتِ اسلام کی قطعاً فکر نہیں' اور نہ ہی انہیں غلط کاموں کو ختم کرنے کی فکر ہے اور نہ ہی امربالمعروف والنہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کا خیال ہے۔ ان کی ساری سوچ تو مارکیٹ کے ریٹوں' درختوں' خبروں' بارشوں' رات کو کھلی رہنے والی ڈسپنسریوں اور زمینی درجۂ حرارت کے ارد گرد گھومتی ہے ان کا سارا دین ہی یہی ہے۔ دنیاوی آسائشیں ان کا مقصدِ حیات ہے۔ بعض لوگ تو اسی دعا میں مصروف رہتے ہیں کہ اے اللہ' کہیں ہمارے یہ اچھے حالات نہ بدل جائیں اور ان میں کوئی ردّوبدل نہ ہو جائے۔ اگر تم معلوم کرو کہ کس نعمت کی بات کرتے ہو؟ تو وہ کہے گا آج کل بینگن بہت سستا ہو گیا ہے۔ ان کے خیال میں کھیرے اور سبزی و ترکاری میں نعمت والی بات ہے اور اس دین کی شکل میں موجود اللہ کی ازلی و ابدی نعمت کو وہ بھول چکے ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں :

﴿ يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا قُلْ لَّا تَمُنُّوا عَلَيَّ

اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدَاكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ ۝﴾ (الحجرات : ۱۷)

"یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا' ان سے کہو کہ اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو' بلکہ اللہ تم پر اپنا احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی اگر تم (اپنے دعوئ ایمان میں) سچے ہو"۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝﴾ (یونس : ۵۸)

"اے نبی کہو کہ یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز (نصیحتِ خداوندی) اس نے بھیجی' اس پر تو لوگوں کو خوشی منانی چاہئے۔ یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ سمیٹ رہے ہیں"۔

للذا ہونا تو یہ چاہئے کہ یہ لوگ دین' رسالت' مساجد' قرآن کریم' سنّتِ مطہرہ' سیرتِ طیبہ' علماء کے وجود اور داعی حضرات کو پاکر خوش ہوں۔ رہا اس دنیا کا معاملہ تو کافر ہر میدان میں ہم سے آگے ہیں۔ تم اگر پختہ مکان میں رہ رہے ہو تو کافر فلک بوس عالی شان بلڈنگوں میں رہ رہے ہیں' تم اگر ایک عام گاڑی میں سوار ہو سکتے ہو تو کافر اپنے ہی ملک میں بنی ہوئی عالی شان گاڑیوں میں سواری کر رہے ہیں۔ موجودہ ترقی کی صورت حال کو شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

"ہم نے کافروں سے آلاتِ موسیقی اور سگریٹ تو لے لیا ہے' البتہ گاڑی بنانی نہیں سیکھی۔ جب ہم سو رہے تھے وہ لوگ ہمت سے جاگ گئے۔ اور جب ہمیں ہوش آیا تب تک وہ لوگ فضاؤں میں پہنچ چکے تھے"۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کس خوبصورتی سے حقیقتِ حال کا نقشہ کھینچ رہا ہے :

﴿وَلَوْلَا اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۝ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ۝ وَزُخْرُفًا ، وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'

وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ (الزخرف : ۳۳-۳۵)

"اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سارے لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم خدائے رحمٰن سے کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں اور ان کی سیڑھیاں جن سے وہ اپنے بالا خانوں پر چڑھتے ہیں اور ان کے دروازے اور ان کے تخت جن پر وہ تکیے لگا کر بیٹھتے ہیں، سب چاندی اور سونے کے بنا دیتے، یہ تو محض حیاتِ دنیا کی متاع ہے اور آخرت تیرے رب کے ہاں صرف متقین کے لئے ہے"۔

اسی لئے ان کے خیال میں صرف کھانے پینے کا نام ہی نعمت ہے۔ بلاشبہ یہ نعمت ہے بشرطیکہ یہ وسائلِ زندگی اطاعتِ خداوندی کے معاون بنیں۔ البتہ اگر ان نعمتوں میں پلنے والا نماز چھوڑ بیٹھے، گھر میں اسلامی ماحول نہ رکھے، پردے کا خیال نہ رہے، موسیقی سے اپنے آپ کو نہ بچائے، مسلمانوں کی پردہ داری اس کے ہاتھوں چاک ہو، پھر اچھا کھانا پینا نعمت کہاں رہے؟ ڈھور ڈنگر بھی کھاتے پیتے ہیں لیکن نعمتِ ایمان سے محروم! اسی لئے تم منافقوں کو دیکھو گے کہ ناگہانی حادثات سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اگر فلپائن کے اندر بھی آتش فشاں پھٹے تو گھبرا جاتے ہیں، اور ان کے ہاتھ پیر کانپنے لگتے ہیں ---- اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھ کر کہتے ہیں کہ اب وقت آگیا ہے، ہم سب اکٹھے ہی مر جائیں گے۔

ان کے برعکس مومن کا معاملہ یہ ہے کہ جان کو ہتھیلی پر رکھے رہتا ہے، شاعر نے کہا ہے :

"اے ہمارے رب ہماری جان ہماری ہتھیلی پر ہے۔ کامیابی اور جہنم سے نجات کی امید کے ساتھ تیرے حضور پیش ہونا چاہتی ہے"۔

کیونکہ مومن نے تو اپنی جان پہلے ہی اللہ کے ہاتھ فروخت کر رکھی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ......۝﴾ (التوبہ : ۱۱۱)

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں.... "

اسی کا نتیجہ تھا کہ صادق اور مخلص صحابہ کا حال یہ تھا کہ تلواریں سونتی ہوئی ہیں،

جانیں ہتھیلیوں پر رکھی ہوئی ہیں اور دورانِ جنگ قہقہے لگ رہے ہیں۔ اور اُدھر منافق کا حال یہ ہے کہ جنگ ہزار کلو میٹر پر لڑی جا رہی ہے اور وہ خوف کے مارے کانپ رہا ہے اور جان حلق میں پھنسی ہوئی ہے۔ تو ثابت ہوا کہ بزدلی اور ناگہانی حادثات سے ڈرنا منافق کی پہچان ہے، وہ ہمیشہ ڈگمگایا رہتا ہے، بس پر سکون زندگی کا طلبگار رہے۔ وہ کہتا ہے ہمیں مت چھیڑو، ہمیں چھوڑ دو، شاید اللہ تعالیٰ اس نعمت کو ہم پر اسی طرح برقرار رکھے، ہمارا اپنا حال بدلنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ حالانکہ اس کا حال سب سے قابلِ ترس ہوتا ہے۔

اکیسویں نشانی

جھوٹ موٹ کا عذر تراشنا

سیرت کی کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جَد بن قیس سے کہا کہ جہاد کی خاطر ہمارے ساتھ چلو۔ اس نے کہا : یا رسول اللہ میں آزمائش سے ڈرنے والا آدمی ہوں، مجھے اپنے کانوں اور آنکھوں کی طرف سے خطرہ ہے ۔ اللہ اکبر! کس قدر خوفِ خدا کا مالک ہے!! امام ابن تیمیہ کہتے ہیں : "بے روح اور بے جان تقویٰ اسی کو کہتے ہیں۔" بعض لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب تم فرعون کے متعلق بات کرو تو کہتے ہیں : استغفراللہ، نیک لوگوں کی غیبت نہ کرو، اور اگر تم ابلیس کا نام لو تو کہتے ہیں : اللہ کے ولیوں کے بارے میں ہم کوئی بری بات کرنے کو تیار نہیں۔ کتاب الحمقیٰ میں امام ابن الجوزی نے اس طرح کا واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک آدمی کے سامنے فرعون کا تذکرہ ہوا، اس نے کہا میں اپنے آپ کو اور اپنے کانوں کو اللہ کے نبیوں کے بارے میں بات کرنے سے بچاتا ہوں۔ اس کا خیال ہے کہ فرعون بھی کوئی اللہ کا نبی تھا۔ یہ ہے بے روح تقوےٰ کی شکل۔ جَد بن قیس جیسے منافق نے غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ میں اس فطرت کا آدمی ہوں کہ جب بنی اصفر کی لڑکیاں دیکھ لیتا ہوں تو اپنی ذات پر فتنے کا خطرہ محسوس کرتا ہوں۔ اس کی بات کو بظاہر صحیح سمجھتے ہوئے آپ ﷺ نے اس کا اعتبار کر لیا اور ادھر اللہ تعالیٰ نے اس کے جھوٹ کا پردہ چاک کر دیا۔ فرمایا :

﴿ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ ائۡذَنۡ لِّىۡ وَلَا تَفۡتِنِّىۡ‌ ؕ اَلَا فِى الۡفِتۡنَةِ سَقَطُوۡا‌ ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيۡطَةٌ ۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ ۝﴾ (التوبہ : ۴۹)

"ان میں سے کوئی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے رخصت دے دیجئے اور مجھ کو فتنے میں نہ ڈالئے۔ سن رکھو فتنے ہی میں تو یہ لوگ پڑے ہوئے ہیں اور جہنم نے ان کافروں کو گھیر رکھا ہے"۔

یہی منافق صلح حدیبیہ کے موقع پر اپنا گمشدہ اونٹ تلاش کرتے ہوئے آیا۔ صحابہ نے کہا : ادھر آؤ' رسول اللہ ﷺ تمہارے حق میں مغفرت کی دعا کر دیتے ہیں۔ اس نے جواب دیا : مجھے میرا سرخ اونٹ مل جائے' میرے نزدیک محمد کی دعاءِ مغفرت سے یہ زیادہ بہتر ہے (و نعوذ باللہ)۔ صحابہ کرام نے جب یہ بات اصرار کے ساتھ کہی تو وہ عناد و تکبر سے سر جھٹک گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ فرمایا :

﴿ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا يَسۡتَغۡفِرۡ لَكُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ لَوَّوۡا رُءُوۡسَهُمۡ وَرَاَيۡتَهُمۡ يَصُدُّوۡنَ وَهُمۡ مُّسۡتَكۡبِرُوۡنَ‏ ۝ سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ اَسۡتَغۡفَرۡتَ لَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ؕ لَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ﴾ (المنافقون : ۵-۶)

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تا کہ اللہ کا رسول تمہارے لئے مغفرت کی دعا کرے تو سر جھٹکتے ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ آنے سے رکتے ہیں۔ اے نبی تم چاہے ان کے لئے مغفرت کی دعا کرو یا نہ کرو' ان کے لئے یکساں ہے۔ اللہ ہرگز انہیں معاف نہیں کرے گا۔"

اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فیصلہ کر دیا ہے کہ قطعاً ان کی بخشش نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا :

﴿ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ﴾

(التوبہ : ۸۰)

"اگر تم ستر مرتبہ بھی انہیں معاف کر دینے کی درخواست کرو گے تو بھی اللہ انہیں ہرگز معاف نہ کرے گا۔"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : اگر مجھے علم ہو کہ ستر مرتبہ سے بھی زیادہ استغفار پر ان کی بخشش ہو سکتی ہے تو میں ضرور ان کے حق میں مغفرت کی دعا کر دوں۔

بائیسویں نشانی

برائی کا حکم دینا اور اچھائی سے روکنا

منافقین سے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ﴾ (التوبہ : ٦٧)

"وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں"۔

چنانچہ لوگ جس قبلہ کی طرف منہ کریں یہ اس کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب تم اللہ اور رسول کی بات انہیں سنانا شروع کرو' تو وہ کہتے ہیں : بھائی صاحب ہمیں معاف رکھو' ہمیں آرام سے رہنے دو' ہمیں دین کا خوب علم ہے' ہمیں دین کی تم سے زیادہ سمجھ ہے' الحمدللہ دین اور علم خوب پھیل چکا ہے' نیشاپور کی بوڑھی عورتیں بھی علم جانتی ہیں' حتیٰ کہ گدھے بھی تعلیم یافتہ ہو گئے ہیں---- لیکن اگر تم سجدۂ سہو کا مسئلہ پوچھ لو تو چٹا جاہل ثابت ہو گا اور اسے دین کے کسی مسئلے کا علم نہیں ہو گا۔ منافقوں کی نشانیوں میں سے ایک نشانی فہم و فراست کی کمی ہے' جس کا تذکرہ عنقریب آ رہا ہے۔

وہ برائی کا حکم دیتے ہیں' بھلائی سے منع کرتے ہیں۔ ان کا پروگرام یہی ہوتا ہے کہ برائی اہل ایمان میں پھلے پھولے اور پردہ ختم ہو جائے۔ کچھ مؤلفین و مصنفین نعرہ لگا رہے ہیں کہ عورت کو آزادی ملے' وہ پردے سے باہر نکلے' گانے اور فحش رسالے عام ہوں' نشہ آور چیزوں کا رواج ہو۔ یہ سب کا سب برائی کا حکم ہے اور بدی سے محبت کا نتیجہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کسی نیکی اور بھلائی کو پسند نہیں کرتے۔ ان کا پروگرام ہے کہ خیر کی قوت کمزور ہو' علم ناپید ہو اور دعوتِ دین کا کام ٹھپ ہو جائے ---- اللہ ہی ان کو سنبھالے۔

تیئیسویں نشانی

کنجوسی کرنا

امورِ دین اور نیکی کے معاملات میں خرچ کرنے کے سلسلے میں منافق لوگ سب سے زیادہ بخیل ثابت ہوتے ہیں۔ البتہ نام اور شہرت کی خاطر تو ایک ہی ولیمہ پر ساٹھ ساٹھ بکرے ذبح کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر تم نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے' مسجد کی تعمیر یا جہاد کی خاطر تعاون کا کہہ دیا تو دس روپے نکال کر انہیں گنے گا' ہاتھوں میں مسلے گا' اس کی قبولیت کی دعا کرے گا' اور ان کے بدلے جنت کی دائیں جانب سفید محل کی اُمید کرے گا۔ منافقین انتہائی تنگ دلی کے ساتھ خرچ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا حال ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں :

﴿ اَلْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ ' يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ' نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ﴾ (التوبہ : ٦٧)

"منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں۔ وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ خیر سے روکے رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا"۔

ایسے لوگ قدرت رکھنے کے باوجود بھی نیکی کے کاموں میں خرچ نہیں کرتے اور ہمیشہ ہاتھ روک کر رکھتے ہیں۔ نفاق کی نشانیوں میں سے ایک اہم نشانی یہ ہے۔ وَالعَیاذ باللّٰہ۔

چوبیسویں نشانی

اللہ کو بھلا دینا

اللہ کے علاوہ ہر چیز اسے یاد رہتی ہے۔ تم دیکھو گے کہ وہ ہر چیز کو یاد رکھتا ہے۔ بیوی کو' بچوں کو' گانوں کو' اپنی امیدوں اور آرزوؤں کو حتیٰ کہ دنیا کی ہر چیز اسے یاد ہے' بس

نہیں آتی تو اللہ کی یاد نہیں آتی 'یا بس کہیں بھولے بھٹکے انداز میں اس کے دل پر اللہ کا گزر ہو جاتا ہے 'کیونکہ اس کا دل مرچکا ہے۔ شاعر نے کہا ہے :

"جو دو [illegible]ں کو بے وقعت کرے اس کے لئے بے عزتی برداشت کرنا آسان ہے اور کسی مُردے کے زخموں کا اندمال نہیں ہوا کرتا ہے۔"

اللہ کو بھول جانا منافقوں کی سب سے بڑی کوتاہی اور غفلت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ﴾ (التوبہ : ٦٧)

"یہ منافق لوگ اللہ کو بھولے تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا"۔

دوسری جگہ فرمایا :

﴿اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَاَنْسَاهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ﴾

(المجادلہ : ۱۹)

"شیطان ان پر مسلط ہو چکا ہے اور اس نے خدا کی یاد ان کے دلوں سے بھلا دی ہے"۔

احیاء العلوم کے مصنف امام الغزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : جو آدمی کسی چیز سے محبت کرتا ہے تو اس کا تذکرہ بار بار کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اگر مختلف کاموں کے کاریگر اور فنکار ایک گھر میں داخل ہوں تو ہر آدمی اپنے اپنے کام کا تذکرہ کرے گا اور اپنے اپنے کام سے متعلق چیزوں کو غور سے دیکھے گا' اس کا ذکر اس کی زبان پر ہو گا' ایک بڑھئی جب گھر میں داخل ہو گا تو کھڑکیوں اور دروازوں کو غور سے دیکھے گا اور جب رنگ ساز داخل ہو گا تو قلعی اور رنگوں پر غور کرے گا اور جولاہا اور قالین فروش زمین پر دیکھے گا۔ یعنی ہر ایک ہمیشہ اپنے اپنے فن اور پیشے کی بات کرے گا۔ اور اللہ سے محبت کرنے والا اللہ ہی کا بار بار نام لے گا۔ البتہ منافق کو اللہ کے ذکر سے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے ان کے تذکرے سے سخت غصہ اور بغض آتا ہے 'لہٰذا شاذ ہی اللہ کا نام اس کی زبان پر آئے گا۔ جب وہ اللہ کو بھول گیا ہے تو اللہ نے بھی اسے بھلا دیا ہے 'یعنی چھوڑ دیا ہے۔

تہذیب الاطفال

(تیسری قسط)☆

—— بیگم ڈاکٹر عبدالخالق ——

ولادت سے رضاعت تک

تہذیب الاطفال کے ضمن میں ہم اختصار کے ساتھ ولادت سے رضاعت تک کے دور کو تقریباً مکمل کر چکے ہیں' لیکن ایک آخری بات جو کہ انتہائی ضروری تھی' اس کا ذکر وہاں نہیں ہو سکا۔ وہ یہ ہے کہ عام طور پر خواتین جب نماز پڑھتی ہیں تو اپنے شیر خوار بچوں کو ایک طرف ڈال دیتی ہیں' خود نماز میں مصروف ہوتی ہیں اور بچہ چیخ و پکار کر رہا ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ نیکی کا کام سمجھا جاتا ہے اور تقویٰ کا عمدہ معیار' کہ ماں کا دل نماز میں اس قدر لگا ہوا ہے کہ بچے کی بھی پروا نہیں کر رہی' جبکہ درحقیقت چاہے ماؤں کا نماز میں دھیان ہی نہ ہو۔ آیئے یہاں بھی ہم نبی اکرم ﷺ کی ذاتی رہنمائی سے سبق حاصل کرتے ہیں۔ حضرت ابو قتادہؓ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے اپنی نواسی کو اٹھا کر نماز پڑھی (جو کہ حضرت زینبؓ کی بیٹی تھیں) آپؐ کھڑے ہوتے تو ان کو گود میں اٹھا لیتے اور سجدے میں جاتے تو اپنے پاس بٹھا لیتے۔

یہاں دو باتیں سمجھ لینے کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بچے کے شعور اور اس کی بنیادوں میں خدائے پاک کی عبادت اور عظمت کا شعور اور شوق خود بخود پیدا ہو' کیونکہ جب بچہ ماں سے سب کچھ سیکھتا ہے تو نماز کی حرکات و سکنات سے بھی کچھ نہ کچھ سیکھے گا۔ آپ اسے پیار سے بٹھائیں گی تو شوق سے آپ کو دیکھے گا اور اگر مار پیٹ کر ایک طرف کر دیں گی تو آپ جونہی جائے نماز پر کھڑی ہوں گی بچہ نہ صرف چیخ و پکار شروع کر دے گا بلکہ اسے نماز سے نفرت ہونا شروع ہو جائے گی۔

☆ مضمون کے تسلسل کے لئے دوسری قسط دسمبر ۹۵ء کے میثاق میں ملاحظہ فرمائیں۔

دوسری بات یہ کہ مسجد میں یا کسی دینی محفل وغیرہ میں اگر آپ خود نماز کی نیت باندھ لیتی ہیں اور بچہ رونا شروع کر دیتا ہے تو باقی تمام خواتین کی نماز بے حد خراب ہونے کا خطرہ ہے جو کہ کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ان تمام خواتین کی نماز خراب ہونے کی ذمہ دار بھی آپ ہیں۔ اگر ہم بچوں والیاں اگلی صفوں میں کھڑے ہونے کی بجائے آخری صفوں میں کھڑی ہوں اور نبی اکرم ﷺ کے عمل کے مطابق رونے والے بچوں کو اپنے پاس لے کر کھڑی ہوں تو نہ صرف یہ کہ آپ سمیت سب کی نماز احسن طریقے سے پڑھی جائے گی بلکہ سنّتِ مبارکہ پر عمل کرتے ہوئے آپ اضافی ثواب بھی کما لیں گی۔ ان شاء اللہ۔

ایک مزید بات یہ کہ بچے کپڑوں پر پیشاب کر دیتے ہیں تو مائیں نماز سے غافل ہو جاتی ہیں کہ کپڑے ناپاک تھے' کیا کریں۔ گھر میں بھی جگہ جگہ ناپاکی پھیلی ہوتی ہے۔ یہ بات انتہائی غور طلب ہے کہ ہم بچوں کی آڑ میں دو بڑے گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایک تو گھر میں ناپاکی پھیلتی ہے۔ پیشاب چاہے بچے کا ہی ہو بالکل ناپاک ہے (اِلّا یہ کہ تین ماہ کی عمر تک کے بچے کا اور وہ بھی صرف لڑکے کا' جس پر کہ تین دفعہ پانی کا ہاتھ پھیر لینے سے کسی حد تک پاکی حاصل ہو جاتی ہے) اور حدیث میں ہے کہ پیشاب کے چھینٹوں کی وجہ سے کئی لوگوں کو قبر میں عذاب ہوتا نبی اکرم ﷺ نے خود سنا ہے اور صحابہ کرامؓ کو بتایا ہے۔ تو ایک تو یہ اتنی بڑی سزا صرف پیشاب سے بد احتیاطی کی وجہ سے اور دوسری بات یہ کہ نماز سے غفلت۔ بچے کے پیشاب کا بہانہ کر کے فرض نماز چھوڑ دینا کیا ہمیں کسی قسم کا بھی کوئی فائدہ دے سکے گا۔ صرف اپنی سستی اور غفلت اور آسانی کو اپنا کر ہم کتنے بڑے نقصان کا سودا کر لیتے ہیں کہ نہ صرف قبر میں ناپاکی کی وجہ سے عذاب بلکہ نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے قبر میں اور روزِ قیامت سخت ترین رسوائی اور ذلت کا سامنا۔ تو میری گزارش ہے کہ نہ صرف یہ کہ اپنے گھر کو پاک صاف رکھنے کی کوشش کریں بلکہ اپنے آپ کو بھی حتی الامکان پیشاب کے چھینٹوں سے بچائیں۔ آپ کو تکلیف تو ضرور ہو گی لیکن اللہ سے اجر کی امیدوار رہیں اور "اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیۡنَ وَیُحِبُّ الۡمُتَطَهِّرِیۡنَ" والی آیت اور "الطھارۃُ من الایمان" والی حدیث مبارکہ ذہن میں رکھیں تو ان شاء اللہ ایک

ایک عمل جو آپ اس ضمن میں کریں گی وہ باعث اجر و ثواب ہو گا۔

تین سے سات سال تک

ولادت سے رضاعت کے بعد اب تین سال سے سات سال تک کی عمر میں ہمیں جو رہنمائی نبی اکرم ﷺ کی احادیثِ مبارکہ سے ملتی ہے اسے مختصراً دیکھتے ہیں۔ بچے کی تین سال کی عمر بہت پیاری بھی ہوتی ہے اور سیکھنے کے اعتبار سے انتہائی نازک بھی ہوتی ہے۔ بچے بولنا سیکھتے ہیں' نئی نئی حرکتیں سیکھتے ہیں تو ان کی ایک ایک بات اور ایک ایک ادا بہت پیاری لگتی ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ "اِذَا اَفْصَحُوا اَوْلَادَ کُمْ فَعَلِّمُوْھُنَّ لا الٰہ الا اللّٰہ" کہ جب تمہارے بچے بولنا سیکھیں تو ان کو لا الٰہ الا اللہ سکھاؤ۔

افسوس ہوتا ہے ہم مسلمانوں پر کہ جنہوں نے دین کو مسجدوں میں یا ہفتے کے دنوں میں (مثلاً جمعرات و پیر وغیرہ کے دن) یا بدعات وغیرہ میں باندھ کر رکھ دیا ہے' جبکہ ہمارے ہادی اور دین کامل کے رہنما حضرت محمد ﷺ نے تو زندگی کا کوئی گوشہ بھی نہیں چھوڑا جہاں دین پر قولاً یا عملاً عمل پیرا ہو کر نہ دکھایا ہو اور ایک انسان کی زندگی کا کوئی پہلو بھی (پیدائش سے لے کر وفات تک کے تمام مراحل کو) نہیں چھوڑا جہاں پر دین کو سمو کر نہ دکھایا ہو۔ تہذیب الاطفال کے تمام مراحل بیان کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم بحیثیت مسلمان اپنی اور بچوں کی زندگی میں ان کی تربیت میں قرآن اور حدیث سے قدم قدم پر رہنمائی حاصل کریں ---- تاکہ ہماری پوری کی پوری زندگی میں صحیح دین کا نمونہ پیش ہو اور "وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ" والی صورت حال بن جائے۔

اسی ضمن میں اگلی حدیث بیان کرتی ہوں۔ عَنِ ابنِ عباسٍ عن النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم اَكْرِمُوا اَوْلَادَكُمْ وَاَحْسِنُوْا اَدَبَهُمْ (ترغیب و ترہیب بحوالہ ابن ماجہ) ترجمہ "حضرت ابن عباسؓ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا : اولاد کے ساتھ رحم و کرم کا برتاؤ کرو اور ان کو اچھی تعلیم و تربیت دو"۔ ہمارے بچے جب بولنے کی عمر کو پہنچیں تو نبی اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق

انہیں کلمہ طیبہ سکھایا جائے اور چھوٹی چھوٹی دعائیں وغیرہ یاد کروائی جائیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام سے آشنا ہوں۔ اچھے طریقے سے اور اچھی گفتگو سے ان کی تربیت کی جائے اور انہیں دین اسلام کے مطابق آداب زندگی سکھائے جائیں تاکہ ان کے ہر ہر قول اور فعل سے مسلمان بچے کی جھلک نظر آئے۔ انہیں روزمرہ کے معمولات کی چھوٹی چھوٹی دعائیں یاد کرائی جائیں، مثلاً سونے کی، جاگنے کی، کھانے سے پہلے اور بعد کی، دودھ پینے کی، بیت الخلاء میں جانے اور باہر آنے کی۔ ان کو شروع سے ہی جھوٹی کہانیوں کے بجائے صحابہ کرامؓ اور صحابیاتؓ کے واقعات، غزوات کے بارے میں معلومات اور اہل ایمان کی بہادری کے ایمان افروز واقعات سنا کر ان کے اندر ایک اعتماد کی فضا قائم کی جائے تاکہ وہ اپنے مسلمان ہونے پر فخر محسوس کریں۔ انہیں نماز یاد کروانی شروع کی جائے اور خود بھی پابندی سے احسن طریقے سے نماز پڑھیں تاکہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کا جذبہ بیدار ہو۔ اخلاقی طور پر ان کو سچ اور جھوٹ کی تمیز کروائی جائے۔ کسی وقت سچ بولنے پر ان کو انعام بھی دیں اور جھوٹ سے اس حد تک نفرت دلائیں کہ بچہ واقعی تھوڑے سے فائدے کی خاطر بھی جھوٹ کی طرف نہ آئے۔ ہلکی پھلکی چوری کرنے سے بھی پرہیز کروائیں۔ بچوں سے اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آئیں، لہجہ میں نرمی ہو۔ آپ بچوں کے حق میں رحم دل ہوں۔ ان کی چھوٹی موٹی جائز فرمائش بھی پوری کر دیں۔ ان سے مہذّبانہ گفتگو کریں تاکہ بچے بااخلاق اٹھیں۔

یہ عمر یعنی تین سال سے سات سال تک کی ایسی نازک ہوتی ہے کہ واقعتاً آپ جو کچھ بھی گھر میں شعوری اور لاشعوری طور پر کرتی ہیں اسے بچے ٹیپ کی طرح اپنے ذہنوں میں منتقل کرتے جاتے ہیں۔ ہم جب دوسری خواتین کے سامنے بات کرتی ہیں کہ ہم تو اپنے بچوں کو تمیز سکھا سکھا کر تھک گئے ہیں لیکن بچہ پھر بھی بدزبان ہے، جھوٹ بولتا ہے تو درحقیقت اس میں ہماری اپنی غلطی موجود ہوتی ہے۔ ہم خود بچے کے ساتھ گالی گلوچ بھی کرتے ہیں، جھوٹ بھی بول لیتے ہیں اور مبالغہ آرائی تو بہت زیادہ کرتے ہیں، چاہے وہ لاشعوری طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن بچہ دیانتداری سے یہ تمام چیزیں اپنے معصوم ذہن میں اتارتا چلا جاتا ہے۔ درحقیقت اسلام نے اخلاقیات پر جس قدر زور دیا ہے شاید کسی اور

چیز پر نہ دیا ہو۔ اس ضمن میں چند ایک احادیث ملاحظہ فرمائیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الاَخْلَاق" کہ میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ قرآن حکیم میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن اخلاق کے بارے میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: "اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم" یعنی "آپ یقیناً اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہیں"۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا: "اَحْسَنُکُم اَحْسَنُکُم اَخْلَاقًا" یعنی "تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو تم میں اخلاق کے اعتبار سے اچھا ہے"۔

سوچنے کی بات ہے کہ یہ تمام رہنمائی اور عمل کی یہ ساری باتیں کس کے لئے ہیں؟ یہی تو وہ اخلاقی اقدار ہیں کہ جن سے مسلمان کے اندر تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور وہ قرآن کا انسانِ مطلوب بنتا ہے۔ چھوٹی عمر سے ہی بچے کے خمیر میں یہ اوصاف ڈالے جائیں تو وہ جوان ہونے تک اللہ کے فضل و کرم سے ایسے تناور درخت کی مانند ہوتا ہے جس کی مثال اللہ تعالیٰ نے سورۃ ابراہیم میں اس طرح دی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَاءِ" ترجمہ: "کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایک پاکیزہ درخت کی ہے جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں"۔ بالکل یہی سمجھیں کہ بچے کی جڑ اسی عمر میں جمتی ہے۔ ایک مسلمان اور باخبر و باہوش ماں بچے کی اس عمر کو ضائع نہیں ہونے دیتی کہ ابھی تو بچہ ہے، اس کو ان چیزوں کا یا ان باتوں کا کیا پتہ۔ جس طرح ایک عام ماں کو بچے کی ظاہری حالت کی فکر رہتی ہے، جسمانی طور پر اسے توانا رکھنے کا فکر دامن گیر رہتا ہے کہ بچہ کوئی غلط چیز منہ میں نہ ڈال لے، خراب کھانا نہ کھالے، بالکل اسی طرح ایک نیک ماں کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ میرا بچہ روحانی طور پر بھی صحیح معنوں میں توانا ہو، کوئی غلط بات منہ سے نہ نکالے، کوئی گالی گلوچ کی بات نہ کرے، ہر ایک سے اچھی طرح پیش آئے وغیرہ وغیرہ۔ اخلاقی طور پر اس طرح قدم قدم پر اس کی رہنمائی کی جائے تو وہ بڑا ہو کہ واقعتاً علامہ اقبال کے اس شعر کا مصداق ہوگا۔

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری!

تصویر کا دوسرا رخ

میں آپ کو تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھانا چاہتی ہوں کہ ہونا تو کیا چاہئے، لیکن آجکل مسلمان خواتین بچوں کے حق میں کیا کر رہی ہیں۔ ذرا دیانتداری سے گردوپیش کا جائزہ لیں تو اندازہ ہو گا کہ جدید تہذیب الاطفال کیا سکھا رہی ہے کہ جونہی بچہ بولنا شروع کرے تو اس کی زبان سے مسلمان والی کوئی بات نہ نکلے بلکہ اس کی جگہ ماما، پاپا، سوری، تھینک یو، گڈ مارننگ، بائے بائے، انگریزی پوئمز، فضول گانے اور تھرکنا، مٹکنا سکھانا شروع کیا جائے۔ جتنے بھی غیر اسلامی آداب ہیں وہ بچے کو ازبر کروائے جائیں۔ برا نہ مانیں، اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھ لیں۔ اس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ اس لئے کہ "جدّت پسندی" کا تقاضا یہی ہے۔ "مہذّب" کہلانے کی صورت یہی رہ گئی ہے۔ انگریزوں سے ہم مرعوب ہیں، ہندوؤں کے رسم و رواج ہم بہت پسند کرتے ہیں، عیسائیت کی تعلیم ہمیں بہت اچھی لگتی ہے۔ تو کیوں نہ ہم پورے کے پورے ہی ان کے رنگ میں رنگ جائیں (اَعاذنا اللّٰہُ مِن ذٰلک) اسی موقع کے لئے علامہ اقبال نے کہا ہے۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

افسوس کا مقام ہے کہ کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا، خدا ہی ملا نہ وصال صنم، اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔ گویا "مُذَبْذَبِينَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَا اِلٰى هٰٓؤُلَاءِ وَلَا اِلٰى هٰٓؤُلَاءِ"۔ اس اعتبار سے غیر مسلم ہم سے اچھے نکلے کہ بظاہر وہ چاہے کیسے ہی کیوں نہ ہوں، انہوں نے اسلام کا بیج، مغز اور گودا یعنی اخلاق وغیرہ مستعار لے کر اپنے معاملات وغیرہ سنوار لئے اور نکھار لئے، لیکن ہم اجتماعی لحاظ سے نہ اخلاقی طور پر کچھ بن سکے اور نہ ہی اپنی ظاہری حالت سنوار سکے۔ بات ذرا تلخ ہو گئی ہے، معافی چاہتی ہوں، لیکن یہ حقائق ہیں۔ ہم مسلمان جنہیں قرآن نے "خیرِ امت" قرار دیا ہے، ذرا گہرائی میں جا کر جائزہ لیں تو ہم پر عیاں ہو جائے گا کہ ہم جیسا بیج بوئیں گے، جس طرح اس کی آبیاری کریں گے، جیسی تہذیب سے بچوں کو روشناس کروائیں گے، لازماً "لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى" کے مصداق اور "As you sow so shall you reap" کے مطابق ویسا ہی پھل

آپ کے سامنے پکتا جائے گا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہم بچوں کو اسلامی باتیں اور اخلاقی اقدار اسی لئے نہیں سکھاتے کہ چونکہ سارا معاشرہ دوسرے رخ پر جا رہا ہے تو اگر ہم نے انہیں دین کی باتیں سکھا دیں، اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات پر عمل کرنا سکھا دیا تو لوگ کیا کہیں گے کہ انہیں تو تمیز ہی نہیں، یہ نئی تہذیب سے آشنا ہی نہیں ہیں، بیک وارڈ ہیں، مولوی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

یاد رکھیں، آپ کی اولاد آپ کے حق میں صدقہ جاریہ یا عذاب کی صورت اسی وجہ سے ہو گی کہ آپ نے ان کی نشوونما کس طریقے سے کی۔ اسلام کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر ان کی تربیت کی تو فھوالمَطلوب، لیکن اگر معاملہ ایسا ہی رہا کہ بچے کو صحیح خوراک نہیں دی بلکہ تربیت کے معاملہ میں کچھ انگریزی اور ہندوانہ کھاد ڈال دی، کچھ یہودیت کی آبیاری کر دی اور کچھ عیسائیت کی dose دے دی، تو اپنی اصل کے برعکس ناقص اور گلا سڑا پھل لئے ہوئے "شجرۂ خبیثہ" آپ کے سامنے پروان چڑھتا نظر آئے گا اور آپ کی چہیتی اور لاڈلی اولاد سرکش، بدتمیز اور زبان دراز ہو گی، خود غرض اور نافرمان اٹھے گی اور آپ کے بڑھاپے میں آپ کو دور ہی سے سلام کرے گی جیسا کہ آجکل عام گھرانوں میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ دنیا میں تو آپ کے ساتھ یہ سلوک ہو گا ہی، لیکن اسی پر خاتمہ نہیں ہے بلکہ مرتے ہی جب ہم قبر میں جائیں گے تو بری اولاد کی وجہ سے عذاب کی پکڑ میں آ جائیں گے۔ زمین کی گود میں گناہ کے کام آپ کی اولاد مزے سے کر رہی ہو گی اور گور میں اس کی سزا آپ کو مل رہی ہو گی، کیونکہ اپنی اولاد کو گناہ کے کام اور غلط کاریاں آپ نے ہی سکھائی تھیں اور آپ ہی اپنی اولاد کی ذمہ دار تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد کے بارے میں زیادہ پوچھ گچھ ماؤں ہی سے کرنی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ : "وَالْمَرْاَۃُ رَاعِیَۃٌ عَلٰی بَیتِ زَوجِھَا وَوَلَدِہٖ" کہ عورت اپنے مرد کے گھر کی اور اس کی اولاد کی نگران ہے۔ لہٰذا اس اولاد کے ساتھ دین کے معاملے میں ولادت سے ہی دیانتداری اور خیر خواہی اور خلوص کا ثبوت دیں۔ "اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ" کے الفاظِ قرآنی میں اولاد آپ کے حق میں اسی لئے فتنہ اور آزمائش ہے کہ آپ اس کی تربیت دین کے اصولوں کے مطابق نہیں کر رہیں۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد: ۴۵
شمارہ: ۹
ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
ستمبر ۱۹۹۶ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زرِ تعاون ۱۰۰/-

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات، قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان — 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 امریکی ڈالر

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مقام اشاعت: 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

گزشتہ دنوں اپوزیشن لیڈر جناب نواز شریف کے ایک بیان کی بازگشت اخبارات کے ذریعے کانوں میں پڑی جس کی رو سے موصوف نے کسی محفل میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ اقتدار میں آکر خلافت راشدہ کا نظام لائیں گے۔ نواز شریف صاحب کے منہ میں گھی اور شکر' انہوں نے ہمارے دل لگتی بات کہی ہے۔ اس بیان کے رد عمل میں وزیر اعظم بے نظیر صاحبہ نے جو بیان داغا اس کے اس حصے کی تو ہم بھی تائید کریں گے کہ انہوں نے پلٹ کر نواز شریف سے وضاحت طلب کی ہے کہ خلافت راشدہ کا نظام آپ نے اس وقت نافذ کیوں نہ کیا جب آپ اقتدار میں تھے!!۔۔ تاہم خلافت راشدہ کے بارے میں وزیر اعظم کے جو ریمارکس اخبارات میں شائع ہوئے وہ نہایت غیر مناسب بھی ہیں اور انتہائی قابل مذمت بھی۔

قائد حزب اختلاف کا مذکورہ بیان بظاہر کتنا ہی خوش آئند کیوں نہ ہو' ان کے سابقہ کردار یعنی ان کے دور اقتدار میں نفاذ شریعت کے معاملے میں ان کی مجرمانہ کوتاہی اور حالیہ رویہ یعنی اقتدار سے محرومی کے بعد آج کی تاریخ تک اسلام اور اسلامی اقدار کے بارے میں ان کے مجموعی رویئے کے پیش نظر ان سے خلافت راشدہ کے نظام کے احیاء کی توقع رکھنا حد سے بڑھا ہوا حسن ظن قرار پائے گا یا محض خوش فہمی۔ ہمیں حیرت ہے کہ تین سال قبل اقتدار سے علیحدہ کئے جانے کے بعد جناب نواز شریف صاحب اپنی تقاریر اور گفتگوؤں میں اسلام یا اسلامی نظام کے بارے میں بات کرنے سے گریز کرتے تھے۔ انہیں شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ اسلام کے نام پر الیکشن جیت کر اقتدار میں آنا' آئی جے آئی کی حکومت میں اسلامی جماعتوں کی شرکت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے دور حکومت میں وفاقی شرعی عدالت کا سود کے خلاف فیصلہ دینا' یہ سب باتیں ان بین الاقوامی طاقتوں کو پسند نہ تھیں جو ہماری اپنی نااہلی کے باعث ہماری تقدیر کی مالک بنی بیٹھی ہیں۔ انہی جرائم کی پاداش میں وہ اقتدار سے علیحدہ کئے گئے اور پھر ناگہاں آسمان امریکہ سے معین قریشی نامی ایک گمنام شخص نے براہ راست تخت حکومت پر نزول اجلال فرمایا اور مملکت خداداد پاکستان کے سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھا۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ آئندہ وہ اسلام کا نام لے کر امریکہ بہادر کو دوبارہ ناراض کرنے کا رسک نہیں لے سکتے۔ چنانچہ ایک عرصہ انہوں نے اس حوالے سے اپنی زبان پر پہرہ بٹھائے رکھا اور اسلام کے لفظ ہی کو اپنی لغت سے خارج کر دیا۔ اس تناظر میں یک بیک ان کا خلافت راشدہ کے قیام کا نعرہ لگانا نا قابل فہم ہے۔ یا تو اس درجے سکوت تھا کہ ان کے اسلام پسند ساتھیوں کو وحشت ہونے لگی تھی یا اب بولے ہیں تو کفن پھاڑ کر۔

ان کے اس نعرے کی ایک تاویل تو یہ ممکن ہے کہ حکومت کے خلاف اپوزیشن کی حالیہ تحریک اب اس مرحلے میں داخل ہو چکی ہے کہ جہاں عوام کو حرکت دینے اور انہیں قربانیوں پر آمادہ کرنے کے لئے اسلام کا نعرہ لگانا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی ہر سابقہ تحریک میں آخری حربے کے طور پر یہی نسخہ

آزمایا گیا اور بڑی کامیابی کے ساتھ آزمایا گیا۔ گویا جس طرح اس سے قبل ہماری سیاسی جماعتوں کے ہاتھوں اسلام کے نام کی حرمت بار بار پامال ہوئی ہے' اور سیاسی اغراض کے حصول کے لئے اسلام کے نام کو زینے کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے' اسی طرح اب ایک بار پھر اس کو بٹہ لگانے کا سامان کیا جا رہا ہے۔ تاہم اس بار اسلامی نظام یا نظام مصطفیٰ ﷺ کا نعرہ لگانے کی بجائے خلافت راشدہ کا نعرہ سن کر ہمارے کان کھڑے ہوئے ہیں۔

گزشتہ چند سالوں میں مختلف جماعتوں کی مساعی کے نتیجے میں جن میں سب سے زیادہ نمایاں قابل قدر حصہ تحریک خلافت پاکستان اور تنظیم اسلامی کا ہے' ملک کے طول و عرض میں خلافت کا غلغلہ کچھ بلند ہونے لگا ہے۔ نام نہاد جمہوریت کے زخم خوردہ عوام اب اس حقیقت کا ادراک کرنے لگے ہیں کہ ہمارے دکھوں کا مداوا نہ موجودہ متعفن جمہوری نظام بن سکتا ہے نہ مارشل لاء یا کوئی فوجی آمریت۔ "کافر نتوانی شد' ناچار مسلماں شو" کے مصداق ہمارے لئے امید کی واحد کرن اب نظام خلافت کی صورت میں باقی رہ گئی ہے۔ جبکہ دوسری جانب دجالی قوتوں کو اصل خطرہ خلافت کے نظام ہی سے ہے۔ ابلیس نے اپنے چیلوں کو بہت پہلے خبردار کر دیا تھا ؎

ہے اگر کوئی خطر مجھ کو تو اس امت سے ہے ۔۔۔ جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو

خلافت کا غلغلہ بلند ہونا ان قوتوں کے لئے سب سے زیادہ باعث تشویش ہے۔ چنانچہ کچھ عجب نہیں کہ جیسے اس سے قبل مختلف ذرائع سے اس ملک میں اسلام کے نام کو بدنام کیا گیا' اسی طرح اب' خلافت راشدہ کے نام کے تقدس کو پامال کرنا ان قوتوں کا اصل ہدف ہو کہ خلافت راشدہ کا عنوان لوگوں کے ذہنوں میں آج بھی انتہائی عظمت و احترام کا حامل ہے۔ گویا ؎

اک دسترس سے تیرے حالی بچا ہوا تھا ۔۔۔ اس کو بھی تو نے آخر چرکا لگا کے چھوڑا

ہمارے اس سوء ظن کا اصل سبب یہ ہے کہ خلافت راشدہ کا نعرہ آج وہ شخص لگا رہا ہے جس کے دور حکومت میں اسمبلی نے جو شریعت بل منظور کیا اس میں سودی معیشت کو پورا تحفظ دیا گیا تھا' عنان حکومت جب تک اس شخص کے ہاتھ میں رہی وہ یہاں سودی معیشت کو فروغ دینے میں پیش پیش رہا۔ یہی نہیں بلکہ اس کی حکومت نے سود کے خلاف وفاقی شرعی عدالت کے تاریخ ساز فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی' جس کا اپنا کاروبار از اول تا آخر سود اور سودی قرضوں پر استوار ہے۔ حالانکہ نظام خلافت میں معیشت کے میدان میں جو چیز سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور ناقابل برداشت ہو سکتی ہے وہ سود ہی ہے۔ ہاں یہ شخص اگر علی الاعلان توبہ کرے' خود اپنی ذات پر اسلام کو نافذ کرے اور اپنے کاروبار کو سودی آلائشات سے پاک کر کے قیام نظام خلافت راشدہ کا نعرہ لگائے تو کوئی نہایت مسلوب التوفیق مسلمان ہی ہو گا جو اس کا دست و بازو بننے پر آمادہ نہ ہو۔ OO

اسلامی نظمِ جماعت میں بیعت کی اہمیت

اگست ۱۹۹۵ء میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا
شکاگو (امریکہ) میں ایک فکر انگیز خطاب

ترجمہ : ڈاکٹر احمد افضال

محترم خواتین و حضرات! آپ کے علم میں ہے کہ آج مجھے "اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت اور اس کی اساس" کے موضوع پر خطاب کرنا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بنیادی طور پر قرآن حکیم کا طالب علم ہوں' اور چونکہ میں اپنے فہم کے مطابق اللہ کی کتاب کے علم اور اس کی حکمت کو عام کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں' لہٰذا آپ مجھے قرآن کا معلم بھی کہہ سکتے ہیں۔ تاہم آج کا خطاب اصلاً چند احادیثِ نبوی ﷺ کے حوالے سے ہو گا' اور صرف ثانوی درجے میں قرآنی آیات کا حوالہ آئے گا۔ یہ بات ان شاء اللہ ایک سادہ سی مثال سے واضح ہو جائے گی کہ میں احادیث کو کیوں بنیاد بنا رہا ہوں۔

سنّتِ رسول ؐ سے راہنمائی

ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن حکیم میں نماز کو قائم کرنے پر کس قدر زور دیا گیا ہے۔ اس عبادت کی اہمیت کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ نماز کے تمام عناصرِ ترکیبی کا ذکر متفرق طور پر قرآن حکیم میں آیا ہے ---- جیسے قیام' رکوع' وضو اور تیمم --- لیکن نماز کی کوئی واضح شکل اور اس کا مکمل طریقہ قرآن میں کہیں نہیں ملتا۔ اقامتِ صلوٰۃ کی اہمیت تسلیم' لیکن اس کی عملی صورت کیا ہو؟ اس عملی صورت کو معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ ہم سنّتِ رسول اللہ ﷺ کی طرف

رجوع کریں۔

اسی طرح کا معاملہ میرے آج کے موضوع کا ہے۔ اسلام میں اجتماعیت کی اساس اور اس کے عملی طریقہ کار کو معلوم کرنے کے لئے سنتِ نبوی ؐ ہی سے اصل راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں تک اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور مختلف عناصرِ ترکیبی کا تعلق ہے تو قرآن حکیم میں اس سے متعلق متعدد اشارے مل سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم چاہیں کہ ہمارے سامنے اس موضوع کا ایک مکمل اور مربوط خاکہ آجائے اور اس کے عملی خدوخال واضح ہو جائیں تو یہ سنتِ نبوی ؐ کی طرف رجوع کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے میں جس روایت کی طرف آپ کی توجہات کو مرکوز کرنا چاہتا ہوں وہ مشکوٰۃ المصابیح (کتاب الامارۃ) میں مسند احمد بن حنبلؒ اور جامع ترمذیؒ کے حوالے سے موجود ہے۔ اس روایت کے الفاظ انتہائی اہم ہیں۔ حضرت حارث الاشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

((آمُرُکُمْ بِخَمسٍ [اَللّٰہُ اَمَرَنِی بِھِنَّ] بِالْجَمَاعَۃِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ))

"میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے۔ یعنی جماعت، سننا، اطاعت کرنا، ہجرت، اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا"۔

میرا گمان ہے کہ آپ میں سے اکثر نے یہ حدیث پہلی مرتبہ سنی ہو گی۔ اس روایت کا تقابل اگر آپ اس انتہائی مشہور روایت سے کریں جس میں اسلام کے پانچ ارکان کا ذکر ہے تو بظاہر ایک عجیب تضاد ہمارے سامنے آتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

((بُنِیَ الاسلامُ علٰی خمسٍ : شَھادۃِ اَن لا اِلٰہَ الا اللّٰہ، وَاَنَّ محمدًا رسولُ اللّٰہ، واِقامِ الصلاۃِ، وَایتاءِ الزَّکاۃِ، وحَجِّ البَیتِ، وَصَومِ رمضانَ)) (رواہ البخاری ومسلم)

"اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے : اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا

کرنا، بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا"۔

آپ جانتے ہیں کہ اسلام کے پانچ ارکان کا تصور اسی حدیث سے اخذ کیا گیا ہے، اور یہ کہ یہ حدیث انتہائی عام ہے، بار بار دہرائی جاتی ہے، اور مختلف طریقوں سے اس کا حوالہ آتا ہے۔ حالانکہ اگر آپ اس روایت کے الفاظ پر غور کریں تو آپ صاف طور پر محسوس کریں گے کہ اس حدیث میں کوئی حکم نہیں دیا جا رہا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے۔ یہ ایک حقیقت کا اظہار تو ہے لیکن کلام انشائیہ نہیں ہے۔ کوئی واضح حکم نہیں دیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف وہ روایت دیکھئے جس کا میں نے حوالہ دیا ہے، اس میں صریح الفاظ اور انتہائی تاکیدی اسلوب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں پانچ باتوں کا حکم دیا ہے، یعنی جماعت، سمع وطاعت، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کا۔ اس کے باوجود یہ حدیث وہ ہے جس سے لوگ بالعموم واقف نہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ اس روایت کے وجود ہی سے بے خبر ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس بے خبری کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔

اس موقع پر میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے ایک واقعہ بیان کروں۔ یہ تقریباً ۲۰ برس پہلے کا واقعہ ہے۔ میرا اس حدیث کے ساتھ تعارف مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مودودی مرحوم کے ذریعے ہوا۔ مولانا آزاد نے ۱۹۱۲ء میں اپنے جریدے "الہلال" میں اور مولانا مودودی نے ۱۹۴۶ء میں مراد پور (سیالکوٹ) کی ایک تقریر میں (جو "شہادتِ حق" کے نام سے مطبوعہ موجود ہے) اس حدیث کا حوالہ دیا تھا۔ لیکن دونوں نے اس روایت کی سند کا ذکر نہیں کیا، یعنی یہ حوالہ نہیں دیا کہ یہ حدیث کس کتاب سے لی گئی ہے۔ مجھے اس روایت میں خاص دلچسپی تھی اور اسی تجسس کی وجہ سے میں نے ایک بڑے عالم دین سے رابطہ قائم کیا جو لاہور کے ایک دینی ادارے میں شیخ الحدیث تھے۔ چنانچہ میں نے ان سے اس حدیث کے ماخذ اور اسناد سے متعلق سوال کیا۔ جواب میں انہوں نے کہا کہ اس روایت کے الفاظ نامانوس سے محسوس ہو رہے ہیں، مجھے یاد نہیں کہ یہ الفاظ میری نظر سے گزرے ہوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ حدیث، جیسا کہ میں نے عرض کیا، مشکوٰۃ میں موجود ہے، جو علمِ حدیث کی پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کے باوجود ایک

عالم نے، جو علمِ حدیث کے استاد اور اپنے فن میں ماہر سمجھے جاتے ہیں، اس روایت کو نامانوس قرار دیا۔ آخر کوئی وجہ تو ہے کہ ایک نہایت اہم روایت عام مسلمانوں ہی کے نہیں بلکہ علماء کے شعور سے بھی محو ہو گئی! اس وجہ کو سمجھنے کے لئے کسی قدر تفصیل کی

اسلام "مذہب" کیونکر بنا؟

اسلام عام معنوں میں مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ مذہب کا لفظ عموماً نہایت محدود مفہوم میں مستعمل ہے، یعنی چند عقائد (dogma)، پرستش یا عبودیت کے طریقے (rituals)، اور چند سماجی رسومات (social customs)۔ اس سے زیادہ یا اس سے آگے بڑھ کر مذہب کی کوئی حیثیت تسلیم نہیں کی جاتی۔ چنانچہ جہاں تک سماجی، معاشی اور سیاسی نظام کا تعلق ہے تو آج کے دور میں یہ مان لیا گیا ہے کہ ان تمام امور کا کوئی تعلق کسی مذہب یا کسی آسمانی ہدایت سے نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے برعکس ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا دین ---- دین اسلام --- ایک مکمل نظام حیات فراہم کرتا ہے اور یہ کہ اس میں ذاتی اور اجتماعی زندگی دونوں کے لئے مکمل ہدایات موجود ہیں۔ بدقسمتی سے مسلمان امت کے زوال کی وجہ سے یہ بنیادی حقیقت بھی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ کے بعد سے زوال کا جو عمل شروع ہوا وہ رفتہ رفتہ یہاں تک پہنچا کہ دین کا یہ مفہوم کہ وہ ہمیں ایک کامل سماجی، معاشی، اور سیاسی نظام بھی فراہم کرتا ہے، ہمارے اجتماعی شعور سے محو ہو گیا اور ہم اسلام کو بھی معروف معنوں میں صرف ایک مذہب سمجھنے لگے۔

اس سلسلے میں مغربی استعمار کی غلامی کا بھی اہم کردار ہے۔ یہ وہ دور تھا جب عیسائیت جیسے "مذہب" سے ہمارا سابقہ پیش آیا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، مسیحیت میں کوئی قانون یا شریعت نہیں ہے۔ پورا مذہب محض چند عقائد، چند اخلاقی تعلیمات اور تھوڑے بہت تصوف پر مشتمل ہے۔ نظام اجتماعی کی بات تو بہت دور کی ہے، مسیحیت میں تو کوئی قانون تک موجود نہیں ہے۔ مغرب کی غلامی کے دور میں ہم نے بھی یہی لفظ یعنی

"مذہب" اختیار کر لیا' اور باوجودیکہ اس کا اصل انطباق تو مسیحیت پر ہوتا ہے' ہم نے اسلام کو بھی ایک "مذہب" کہنا اور سمجھنا شروع کر دیا۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان ملکوں پر مغربی قانون اور استعماری نظام کا غلبہ تھا' نظامِ اجتماعی کے کسی بھی گوشے کا تعلق اسلام سے باقی نہ رہا تھا' بلکہ ہر کام ہمارے غیر ملکی آقاؤں کی مرضی کے مطابق ایک لادینی نظام کے تحت ہوتا تھا۔ نظامِ اسلام جب ایک ٹھوس اور واقعی حقیقت کی صورت میں موجود نہ رہا تو آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کے مصداق دین کا یہ تصور کہ وہ ایک مکمل نظام بھی ہے ہماری نظروں سے غائب ہو گیا۔ نوبت یہاں تک آپہنچی کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کا اپنا ایک مکمل اور قابل عمل سیاسی' سماجی اور معاشرتی نظام بھی ہے تو بہت سے مسلمان بھی چونک جاتے ہیں۔

صدیوں کے مسلسل زوال کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسلام کا بحیثیتِ دین تصور ہی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چنانچہ مغربی استعمار کی غلامی کے دور میں بھی ہم مسلمانوں کو عقائد' نماز' روزے' زکوٰۃ' حج وغیرہ کی پوری آزادی تھی۔ ہمیں اجازت تھی کہ بچے کی پیدائش پر عقیقہ کریں' شادی کے موقع پر نکاح کا طریقہ اختیار کریں' فوتیدگی کی صورت میں تجہیز و تکفین کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تمام چیزیں ---- عقائد' عبادات' رسومات ---- تو ہماری نظروں میں رہیں' لیکن چونکہ اس دورِ غلامی میں ہمارا سماجی' معاشی اور سیاسی نظام برقرار نہ رہا' لہٰذا اسلام کے یہ پہلو ہمارے اجتماعی شعور سے غائب ہو گئے۔

ہجرت کا وسیع تر تصور

اب میں چاہوں گا کہ زیر بحث حدیث کے الفاظ پر غور کر لیا جائے۔ حضور ﷺ نے جن پانچ باتوں کا حکم فرمایا ہے ہم ان کو عکسی ترتیب سے سمجھنے کی کوشش کریں گے' جس کی وجہ آگے چل کر واضح ہو جائے گی۔ آخری دو باتیں ہیں ہجرت اور جہاد۔ یہ دونوں دراصل ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اکثر ہم کسی بات کے منفی پہلو کو پہلے بیان کرتے ہیں اور مثبت کو بعد میں۔ مثلاً لا الٰہ الا اللہ میں بھی نفی پہلے ہے' اثبات بعد میں۔ پہلے تمام خداؤں کی نفی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا اقرار ہے۔ اسی طرح

آپ دیکھیں گے کہ ہجرت ایک ہی حقیقت کا منفی پہلو ہے اور اسی فریضہ کے مثبت پہلو کا نام جہاد ہے۔ ہجرت کا مطلب ہے کسی شے کو ترک کر دینا اور جہاد کا مفہوم ہے کسی شے کے لئے کوشش کرنا۔ چنانچہ یہ دونوں فرائض حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔

ہجرت اور جہاد دونوں کے کئی مراحل اور درجات ہیں، لیکن میں آپ کے سامنے ان دونوں فرائض کے ابتدائی اور پھر آخری مراحل بیان کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ ابتدائی اور آخری مراحل سمجھ لینے کے بعد آپ درمیانی مراحل کا اندازہ خود ہی لگا لیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار یہ سوال پوچھا گیا کہ کون سی ہجرت سب سے افضل ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ سب سے افضل ہجرت یہ ہے کہ تم ہر اس شے کو چھوڑ دو جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں ناپسندیدہ ہے۔ (رواہ النسائی، عن عبداللہ بن عمرو) اب آپ ذرا اس حدیث مبارک کے نتائج پر غور کریں۔ اگر کوئی شخص آج یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ ہر اس شے کو ترک کر دے گا جو اللہ کو پسند نہیں تو گویا آج ہی سے اس کی "ہجرت" کا آغاز ہو جائے گا۔ اگر اس کے کاروبار میں سود کا کوئی حصہ ہے تو اسے چھوڑنا پڑے گا اور اگر اس کی معاشرت میں کہیں احکام شریعت سے تجاوز ہو رہا ہے تو اس طرز معاشرت کو ترک کرنا پڑے گا، خواہ اس شخص کو اپنے دوستوں اور عزیزوں کے استہزاء بلکہ مخالفت ہی کا نشانہ کیوں نہ بننا پڑے۔ چنانچہ ہجرت کا پہلا مرحلہ تو یہ ہے کہ انسان ہر اس شے کو ترک کر دے جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

اب اس نکتے کو سمجھئے کہ ہجرت کا آخری مرحلہ یا ہجرت کے عمل کا نقطہ عروج کیا ہے؟ اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد ہم سب پر فرض ہے۔ اگر اس جدوجہد کے دوران ایسا موقع آ جاتا ہے کہ وطن اور گھربار چھوڑ کر کسی خاص مقام پر جمع ہونے کی ضرورت پیش آ جائے تاکہ باطل کے خلاف آخری حملے کے لئے قوت فراہم کی جاسکے تو یہ ہجرت کی انتہائی شکل ہو گی۔ اگر ایسا موقع آ جاتا ہے تو ہر اس شخص کے لئے جو اقامتِ دین کی جدوجہد میں مصروف ہو، یہ لازم ہو گا کہ وہ اپنے گھر، اپنی جائیداد، اپنے دوستوں اور رشتہ

داروں بلکہ اپنے محبوب وطن تک کو چھوڑ کر اللہ کے دین کے لئے نکل آئے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نقل مکانی اپنا معیارِ زندگی بلندی کرنے کے لئے یا کسی بہتر اور آسودہ ماحول کی تلاش کے لئے نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضاجوئی کے لئے ہوگی۔

اس ہجرت کا تصور کیجئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم نے مکے سے مدینے کی طرف فرمائی تھی۔ انہوں نے اپنے گھروں اور اپنے مال و متاع کو چھوڑا' اپنے آباء و اجداد کا شہر چھوڑا' انہوں نے وہ سرزمین چھوڑی جہاں ان کے باپ دادا کی ہڈیاں دفن تھیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے دنیا کا سب سے قیمتی اور مقدس مقام' خانہ کعبہ' تک چھوڑ دیا۔ تصور کیجئے کہ یہ ہجرت کس غرض کے لئے تھی؟ کیا یہ لوگ اپنا معیارِ زندگی بلند کرنا چاہتے تھے؟ کیا انہیں بہتر کاروباری مواقع کی تلاش تھی؟ کیا وہ دولت و جائیداد کے اعتبار سے پھلنا اور پھولنا چاہتے تھے؟ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی شے بھی ان کو مطلوب نہ تھی۔ ان کی یہ ہجرت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے تھی' اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لئے تھی۔ اس کے علاوہ کوئی اور مقصد ان کے سامنے نہ تھا۔

جہاد کے مختلف مراحل

اب اس تصویر کے دوسرے رخ پر اپنی توجہ کو مرکوز کیجئے۔ جہاد کا پہلا مرحلہ کیا ہے اور اس کی آخری منزل کون سی ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا جہاد سب سے افضل ہے؟ حضورؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ سب سے افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس کے خلاف کشمکش کرو اور اسے اللہ تعالیٰ کا مطیع بنا دو۔ اسی طرح ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا : اصل مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ نفس سے کیا مراد ہے؟ انسان کے وجود میں ایک شے تو اس کی فطرت ہے جو اس کی روح سے عبارت ہے' اور دوسرا اس کا نفسِ حیوانی ہے جو اس کے جبلی تقاضوں سے عبارت ہے۔ یہ حیوانی اور جبلی تقاضے اندھے ہیں' انہیں حرام و حلال سے غرض نہیں' بلکہ صرف اپنی تسکین چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ان خواہشات کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو انسان لامحالہ گناہ اور فسق و فجور کے راستے پر پڑ جاتا ہے' لہٰذا لازم ہے کہ ہم ان

خواہشات کے خلاف کشمکش کریں اور انہیں اللہ تعالیٰ کے احکامات کے تابع بنائیں۔ یہ کوشش اصل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مطابق جہاد کی پہلی سیڑھی ہے۔

اس بات کو سمجھئے کہ جہاد کا آخری مرحلہ یا جہاد کا نقطہ عروج کیا ہے؟ اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد ہم سب پر فرض ہے۔ اگر اس جدوجہد کے دوران ایسا موقع آ جاتا ہے کہ ہر وہ شخص جو اس جدّوجہد میں معروف ہو اس کے لئے لازم ہو جائے کہ وہ کفر اور شرک کی طاقتوں کے خلاف لڑنے کے لئے میدان میں آجائے تو یہ جہاد کا آخری مرحلہ ہو گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر ایک مسلمان اس حال میں مرجاتا ہے کہ اس نے نہ تو اللہ کی راہ میں کسی جنگ میں حصہ لیا اور نہ اس کے دل میں اس کی خواہش پیدا ہوئی تو وہ ایک قسم کے نفاق کی حالت میں مرا۔ (صحیح مسلم، کتاب الامارہ : عن ابی ہریرۃؓ) حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو ایمانِ حقیقی حاصل ہو اور اسے یہ علم ہو کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد ان پر فرض ہے' تو یہ آپ سے آپ لازم آجاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کرنے کی ایک شدید خواہش بھی اس کے دل میں موجود ہو۔ البتہ یہ عین ممکن ہے کہ اس شخص کی زندگی میں ایسے مسلح تصادم کا موقع ہی نہ آئے۔ جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے صحابہ ایسے تھے جو ہجرت سے پہلے ہی وفات پا گئے۔ گویا ان کی زندگیوں میں قتال فی سبیل اللہ کا موقع ہی نہیں آیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس راہ میں لڑنے کی شدید آرزو ان کے دلوں میں یقیناً موجود تھی۔ اس لئے کہ اگر یہ آرزو کسی کے دل میں موجود نہ ہو تو اس کے ایمان ہی کی نفی کر دی گئی ہے۔

ہجرت و جہاد کی شرطِ لازم : التزامِ جماعت

یہاں یہ سوال اپنے سامنے رکھئے کہ کیا ہجرت اور جہاد کے یہ فرائض ایک منظم اور متحد جماعت کے بغیر بھی ادا کئے جا سکتے ہیں؟ کیا کوئی شخص اپنی انفرادی حیثیت میں ہجرت اور جہاد کا حق ادا کر سکتا ہے؟ آپ اپنے نفسِ امارہ کے خلاف تو کشمکش تنہا رہ کر بھی کر سکتے ہیں' لیکن کیا اللہ کے دین کی اقامت اس طرح ممکن ہے؟ کیا کوئی فرد اپنی ذاتی حیثیت میں اتنا طاقتور ہو سکتا ہے کہ وہ اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کو محض اپنے زورِ بازو سے نافذ کر

سکے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب صرف نفی میں ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اگر ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ کا حق ادا کرنا ہے تو یہ کام ایک منظم جماعت کے بغیر ناممکن ہے۔ اگر اقامتِ دین کی جدوجہد فرض ہے تو یہ فرض ایک منظم جماعت کے بغیر محض انفرادی طور پر ادا نہیں کیا جا سکتا' اس کے لئے ایک جماعت کا ہونا لازم ہے۔ چنانچہ زیر مطالعہ حدیث میں یہ نکتہ خاص طور پر قابل غور ہے کہ حضور ﷺ نے سب سے پہلے جس بات کا مسلمانوں کو حکم دیا وہ التزامِ جماعت ہے۔ یعنی مسلمانوں کے لئے یہ شے لازم کی گئی کہ وہ اپنے آپ کو ایک جماعت کی شکل میں منظم رکھیں۔ یہ جماعت اور اس کا نظم اس لئے مطلوب ہے کہ آخری دو فرائض یعنی ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ کو کماحقہ' ادا کیا جا سکے۔ اس نکتے کی مزید وضاحت کے لئے میں چاہوں گا کہ آپ کے سامنے چند اور احادیث بھی آ جائیں جن میں جماعت کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

امام ترمذیؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا :

((عَلَيكُم بِالجَماعةِ' وَاِيَّاكُم وَالفُرقةِ' فَاِنَّ الشَّيطانَ معَ الواحدِ' وهومِنَ الاِثنَينِ اَبعَدُ)) (رواه الترمذی)

"تم پر جماعت کی شکل میں رہنا فرض ہے' اور تم تنہا مت رہو' اس لئے کہ اکیلے شخص کا ساتھی شیطان بن جاتا ہے' لیکن اگر دو (مسلمان) ساتھ رہیں تو وہ دور ہو جاتا ہے۔"

اس حدیث میں حضور ﷺ نے مسلمانوں کو واضح طور پر خبردار کیا ہے کہ اگر ایک مسلمان جماعت سے الگ رہتا ہے تو شیطان اسے اپنا شکار بنا لیتا ہے اور صراطِ مستقیم سے بھٹکا دیتا ہے۔

ایک دوسری روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا :

((يَدُاللّٰهِ علَى الجَماعةِ' ومَنْ شَذَّ شُذَّ اِلَى النَّارِ)) (رواه الترمذی)

"اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ جو شخص خود کو جماعت سے کاٹ لیتا ہے وہ آگ میں ڈالا جائے گا"

مراد یہ ہے کہ اللہ کی مدد اور حمایت مسلمانوں کی اجتماعیت کے لئے ہے نہ کہ افراد کے لئے۔ اگر ایک شخص اجتماعیت سے خود کو کاٹ لیتا ہے تو پہلی حدیث کی رُو سے وہ شیطان کے لئے نرم چارہ ثابت ہوتا ہے جو اسے صراطِ مستقیم سے بھٹکا دیتا ہے۔ اور اس طرح آخرت میں ایسا شخص جہنم کا مستحق بنتا ہے۔

اس سلسلے کی تیسری روایت اصل میں حضرت عمر فاروق کا قول ہے (اور علم حدیث کی رو سے یہ بھی "حدیث" ہی ہے)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

((اِنَّہٗ لَا اِسلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَۃٍ وَلا جَمَاعَۃَ اِلَّا بِاِمارۃٍ ولا اِمارۃَ اِلَّا بطاعۃٍ)) (رواہ الدارمی)

"یہ ایک حقیقت ہے کہ جماعت کے بغیر اسلام نہیں ہے' اور امارت کے بغیر جماعت نہیں ہے' اور امارت کا کوئی فائدہ نہیں اگر اس کے ساتھ اطاعت بھی نہ ہو"۔

دین میں اجتماعیت کی اہمیت

آگے بڑھنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے ہمارے دین کے مزاج کی ایک جھلک آجائے۔ میں نے شروع میں اس اہمیت کی طرف اشارہ کیا تھا جو ہمارا دین نماز کو دیتا ہے۔ مَردوں کے لئے فرض نمازیں باجماعت ادا کرنا لازم کیا گیا ہے' سوائے اس کے کہ کوئی حقیقی عذر لاحق ہو۔ جماعت کی شکل میں نماز ادا کرنا دراصل اس امر کی ایک علامت ہے کہ اسلام تمام معاملات میں ایک طرح کا عمومی نظم چاہتا ہے۔

باجماعت نماز میں کیا ہوتا ہے؟ ایک امیر یا امام ہے جس کی تمام نمازیوں کو پیروی کرنا ہوتی ہے۔ کسی نمازی کو اجازت نہیں کہ وہ نماز کا کوئی رکن امام سے پہلے ادا کرلے۔ اگر کوئی شخص امام سے پہلے اپنا سر سجدے سے اٹھالے تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی۔ انتہا یہ ہے کہ اگر امام نماز پڑھانے میں کوئی غلطی کر بیٹھتا ہے تو آپ کو اس کی اجازت تو ضرور ہے

کہ سبحان اللہ کہہ کر اسے متوجہ کریں، لیکن اگر وہ اپنی غلطی پر قائم رہتا ہے تو آپ کو جماعت چھوڑ دینے کی ہرگز اجازت نہیں۔ یہاں تک کہ اگر آپ کو سو فیصد یقین ہو کہ امام سے غلطی کا صدور ہو رہا ہے تب بھی آپ جماعت چھوڑ کر الگ نہیں ہو سکتے، بلکہ ضروری ہے کہ آپ لازماً جماعت کے ساتھ رہیں اور امام کی غلطی میں بھی اس کی پیروی کریں۔ جماعت کی اہمیت یہ ہے کہ آپ کو اس کے ساتھ اپنے آپ کو پیوستہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے خواہ آپ اپنے امام سے اختلاف ہی کیوں نہ رکھتے ہوں۔

دوسری مثال اسلام کے سماجی نظام سے لیجئے، جس کی بنیاد "نکاح" کے ادارے کے ذریعے استوار ہوتی ہے۔ نکاح کیا ہے؟ ایک عورت اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ وہ شریعت کے دائرے کے اندر اندر اپنے شوہر کی اطاعت کرے گی اور اپنے آپ کو نکاح کے لئے پیش کرتی ہے۔ ایک مرد اس پیشکش کو قبول کرتا ہے اور اس طرح نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔ غور کیجئے کہ فی الواقع اگر آپ کو ایک مضبوط اور صحت مند خاندانی نظام تشکیل دینا ہے تو یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اطاعت فی المعروف اور نظم کو بھرپور طریقے سے قائم کیا جائے۔ اسی لئے اسلام نے بیوی پر لازم کیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کی اطاعت کرے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ بیوی اپنے شوہر سے اختلاف کر سکتی ہے، اس کی رائے بدلنے کی کوشش کر سکتی ہے، وہ اپنے شوہر کو مشورہ یا تجویز دے سکتی ہے، وہ دلائل کے ذریعے بات کر سکتی ہے یا استدعا اور درخواست کر سکتی ہے، لیکن اگر وہ اپنے شوہر کی اطاعت پر کاربند نہیں تو یہ رویّہ اسلامی تعلیمات کے منافی سمجھا جائے گا۔

ایک تیسری مثال لیجئے۔ حضور ﷺ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ اگر دو افراد بھی اکٹھے سفر کر رہے ہوں تو انہیں چاہئے کہ وہ اپنے میں سے زیادہ تجربہ کار اور باعلم شخص کو امیر مقرر کر لیں، جو دوسرے مسافر کی رہنمائی کرے۔ اسی طرح اگر دو افراد ساتھ ہوں اور نماز ادا کرنے کا موقع آ جائے تو ان میں سے ایک کو امام بن جانا چاہئے اور دوسرے کو مقتدی۔ ان مثالوں سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں اجتماعیت کو کس قدر اہمیت دی گئی ہے۔ نیز ان سے اسلام میں اجتماعی زندگی کے نظام پر روشنی پڑتی ہے، جو ہمارا اگلا موضوع ہے۔

نظم جماعت کی مختلف شکلیں

اسلام میں اجتماعی زندگی کے مزاج کو درست طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے سامنے اس نظام کا خاکہ بھی رہے جو دنیا میں عموماً اختیار کیا جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کی دنیا میں کئی طرح کے ادارے 'جماعتیں' انجمنیں وغیرہ قائم کی جاتی ہیں۔ یہ سب اجتماعیت ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں دو امور نہایت اہم ہوتے ہیں' اولاً تاسیسی یادداشت جس میں اس ادارے 'جماعت' یا انجمن کے اغراض و مقاصد بیان کئے جاتے ہیں اور ثانیاً اس کا دستور۔ جہاں تک دستور کا تعلق ہے' ہم دیکھتے ہیں کہ قریب قریب ایک جیسے قواعد و ضوابط ہیں جو مختلف قسم کے اداروں کے دساتیر میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ رکنیت کی شرائط ہوتی ہیں۔ پھر ارکان کسی صدر یا چیئرمین کو منتخب کرتے ہیں۔ پھر مجلس عاملہ یا شوریٰ کے انتخاب کے لئے قواعد ہوتے ہیں۔ آخر میں اختیارات کی تقسیم کا معاملہ طے کیا جاتا ہے اور Checks and balances کا نظام وضع ہوتا ہے۔ اس قسم کی جماعتیں نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتی ہیں۔ اس طریق کار میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جسے قرآن یا سنت کی بنیاد پر غلط کہا جاسکے۔ تنظیم یا اجتماعیت کی یہ صورتیں قطعی طور پر جائز اور مباح ہیں۔

جو نکتہ میں واضح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگرچہ جماعت سازی کا یہ نظام جو آج دنیا میں عام طور پر پایا جاتا ہے خلافِ اسلام نہیں ہے' تاہم اس نظام کے حق میں کوئی دلیل نہ قرآن مجید سے ملتی ہے اور نہ سنتِ رسول ﷺ سے۔ اس کے باوجود میری رائے یہی ہے کہ یہ طریقہ غیر اسلامی یا غیر شرعی ہرگز نہیں۔ یہ رائے دراصل فقہ کے ایک بنیادی اصول پر مبنی ہے' یعنی ہر کام مباح اور جائز سمجھا جائے گا جب تک کہ اس کا حرام ہونا کسی شرعی دلیل سے ثابت نہ کر دیا جائے۔

اس کے برعکس جماعت سازی کا جو طریقہ ہمیں قرآن پاک سے ملتا ہے' جو حضور ﷺ کی سیرت اور سنت سے ملتا ہے اور جو امتِ مسلمہ کی ۱۴سو سالہ تاریخ میں ملتا ہے وہ اس طریقے سے بالکل مختلف ہے جو آج کی دنیا میں عموماً رائج ہے۔

اسلامی اجتماعیت کی دو بنیادی اصطلاحات

آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ اسلامی اجتماعیت سے متعلق بعض بنیادی اصطلاحات کو سمجھ لیا جائے۔

۱۔ امیر : اس ضمن میں پہلی اصطلاح ہے امیر۔ امیر سے کیا مراد ہے؟ آپ کے علم میں ہے کہ لفظ امیر سے ملتا جلتا ایک اور لفظ اردو میں مستعمل ہے' یعنی آمر۔ آمر کا لفظ انگریزی Dictator کے مترادف کے طور پر بولا جاتا ہے اور یہ لفظ کبھی بھی اچھے معنوں میں نہیں آتا۔ اگر آپ کسی قائد یا رہنما کو "آمر" کہہ دیں یا اس کے رویئے کو "آمرانہ" قرار دیں تو گویا یہ ایک شدید تنقید سمجھی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم آج ایک ایسے دَور میں سانس لے رہے ہیں جو جمہوریت اور عوام کی حاکمیت کا دور ہے' اور اس ماحول میں کوئی بھی ایسی شے پسندیدہ نہیں سمجھی جاتی جو سلطانیٔ جمہور کے اونچے تصورات سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ لیکن نوٹ کیجئے کہ امیر کا لفظ آمر کے مقابلے میں کہیں زیادہ گاڑھا ہے۔

عربی زبان کی باریکیوں سے واقفیت رکھنے والے اس نکتے کو اچھی طرح سمجھ لیں گے کہ جب کوئی شخص ایک کام کر رہا ہو تو اسے "فاعل" کہتے ہیں' مثلاً قادر' عالم' آمر وغیرہ' لیکن جب اس کام کو کرنے کی صلاحیت اور صفت اس شخص میں مستقل طور پر پائی جائے اور اس کی شخصیت کا مستقل جزو بن جائے تو پھر اسے "فعیل" کہتے ہیں' مثلاً قدیر' علیم' اور امیر۔ چنانچہ دوبارہ نوٹ کیجئے کہ جس حدیث کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں اس میں قائد یا رہنما کے لئے لفظ امیر استعمال ہوا ہے جو آمر سے کہیں زیادہ گاڑھا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے : "جس نے میری اطاعت کی اس نے اصل میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ جس نے (میرے مقرر کئے ہوئے) امیر کی اطاعت کی اس نے گویا میری اطاعت کی اور جس نے (میرے مقرر کئے ہوئے) امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی"۔ (متفق علیہ : عن ابی ہریرہؓ)

ظاہر ہے کہ جب حضور ﷺ اس دنیا میں بنفسِ نفیس موجود تھے تو آپ خود ہی مسلمانوں کے امیر بھی تھے، فوج کے سپہ سالار بھی تھے اور سربراہِ حکومت بھی تھے۔ لیکن اُس وقت بھی آپ کے مقرر کردہ امراء کا ایک پورا سلسلہ موجود تھا اور یہ امراء مختلف علاقوں پر نگران اور قائد تھے۔ مثال کے طور پر اگر کسی غزوے کا موقع ہو تو ظاہر ہے کہ فوج کے سپہ سالار تو حضور ﷺ خود ہی تھے، لیکن پھر آپ کے تحت دوسرے امراء بھی مقرر ہوتے تھے، مثلاً میمنہ کا امیر، میسرہ کا امیر، وغیرہ۔ پھر ان بڑی شاخوں کے آگے چھوٹی شاخیں اور ان میں سے ہر ایک لئے الگ امیر کا تقرر ہوتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ حضور کے بعد امراء کی ایک پوری زنجیر تھی اور اس زنجیر کو برقرار رکھنا ضروری تھا۔ اگر اس سلسلے میں کہیں کوئی خرابی ہوتی تو لازماً منفی نتائج برآمد ہوتے۔ چنانچہ یہی چیز غزوۂ احد میں پیش آئی۔

غزوۂ احد میں حضور ﷺ نے ۵۰ تیراندازوں کا ایک دستہ ایک پہاڑی درّے پر مقرر فرمایا اور حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کو اس کا امیر بنایا۔ آپ کا حکم تھا کہ تم یہاں سے ہرگز مت ہلنا، یہاں تک کہ اگر تم دیکھو کہ تمام مسلمان مارے گئے ہیں تب بھی تم اپنی جگہ مت چھوڑنا۔ جنگ کے دوران جب تیراندازوں نے دیکھا کہ دشمن مغلوب ہو گیا ہے تو انہوں نے اپنے امیر یعنی حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کے روکنے کے باوجود اپنی جگہ چھوڑ دی۔ میری رائے یہ ہے کہ تیراندازوں نے حضور کے حکم کی تاویل کی، اور یہ سمجھا کہ حضور کا حکم صرف اس صورت میں تھا اگر مسلمانوں کو شکست کا سامنا ہوتا، لیکن یہاں تو ہمیں فتح مل رہی ہے۔ چنانچہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان صحابہؓ نے حضور کی نہیں بلکہ اپنے مقامی امیر کی حکم عدولی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کے گھڑسواروں نے موقع غنیمت جان کر مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کر دیا اور شدید نقصان پہنچایا۔ ۳۵ صحابہؓ کی غلطی کی وجہ سے ۷۰ صحابہ شہید ہوئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمان افواج پر واضح کر دیا کہ نظم کی کیا اہمیت ہے اور امیر کا حکم نہ ماننے کی کس طرح سزا ملتی ہے۔

غور کیجئے کہ اسلام نظم اور تنظیم کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کا معاملہ تو یہ تھا کہ آپ کو براہ راست خود رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا تھا۔ بعد میں

صورت حال یہ رہی کہ مسلمان خود اپنے خلیفہ یا امیر کو باہمی مشورے کے ذریعے منتخب کرتے تھے۔ لیکن ایک حدیث کے مطابق، جس کے راوی حضرت عرباض بن ساریہؓ ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ (اے مسلمانو!) تم پر سمع و طاعت لازم ہے خواہ کوئی شخص تمہارا امیر بن بیٹھے[۱] (یعنی مسلمانوں کی مرضی کے بغیر) بشرطیکہ وہ تمہیں کوئی خلافِ شریعت حکم نہ دے۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں اجتماعیت اور نظم کی کیا اہمیت ہے کہ اگر کوئی شخص زبردستی حکومت پر قبضہ کر لیتا ہے تب بھی شریعت کے دائرے کے اندر اس کی اطاعت کی جائے گی۔ مقصد یہ ہے کہ غیر ضروری فتنہ و فساد سے امت کو بچایا جائے۔ امیر کے حکم کی نافرمانی صرف اسی صورت میں جائز ہے اگر وہ واضح طور پر شریعت سے تجاوز کرے، اور مسلح بغاوت اسی صورت میں صحیح ہوگی اگر ایک پائیدار تبدیلی برپا کر دینے کے لئے کافی طاقت فراہم ہو چکی ہو۔

خود سے امیر بن جانے کی ایک صورت اور بھی ممکن ہے، مثلاً میں بھی امیر ہوں، حالانکہ کسی نے مجھے منتخب نہیں کیا ہے۔ میں پاکستان میں ایک انقلابی جدوجہد کے ذریعے اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی، یا دوسرے لفظوں میں نظامِ خلافت، قائم کرنا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ مجھ اکیلے کے بس کی بات نہیں۔ مجھے ساتھی اور اعوان و انصار درکار ہیں۔ میں

---

(۱) حضرت عرباض بن ساریہؓ سے مروی یہ روایت امام نوویؒ نے اپنی "اربعین" میں ترمذی اور ابوداؤد کے حوالے سے درج کی ہے، جس کے الفاظ ہیں: "اُوصِیکم بِتَقوَی اللّٰہِ وَالسَّمعِ وَالطَّاعَۃِ وَاِن تَاَمَّرَ عَلیکم عَبدٌ الخ" (حدیث ۲۸) یعنی "میں تمہیں خدا ترسی کی نصیحت کرتا ہوں اور سننے اور ماننے کی، خواہ تم پر ایک غلام ہی امیر بن بیٹھے"۔ لیکن ترمذی اور ابوداؤد کے علاوہ سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں بھی عرباض بن ساریہ کی روایت جن الفاظ میں نقل ہوئی ہے ان میں "تَاَمَّرَ عَلیکم" کے الفاظ شامل نہیں ہیں ---- تاہم امام نوویؒ نے صحیح مسلم کی شرح میں اسی مضمون کی ایک اور حدیث مبارک "وَلَوِ استُعمِلَ عَلَیکم عَبدٌ یَقُودُکم بِکِتَابِ اللّٰہِ فَاسمَعُوا لَہٗ وَاَطِیعُوا" کے ذیل میں لکھا ہے کہ "ایک غلام اگر غلبہ حاصل کر کے از خود امیر بن بیٹھے اور امورِ سلطنت کتاب و سنت کے مطابق انجام دے تو اس کی اطاعت لازم ہے۔ البتہ عام حالات میں جبکہ امیر کا انتخاب مسلمانوں کی آزادانہ رائے سے ہو رہا ہو، کسی غلام کو امیر منتخب کرنا درست نہیں ہوگا"۔ (حاشیہ از ادارۂ میثاق)

عوام میں اپنے خیالات کو عام کرتا ہوں اور پھر یہ پکار لگاتا ہوں کہ مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ؟ کون لوگ اس کام میں میرے دست و بازو بننے کو تیار ہیں؟ کون لوگ اللہ کی حاکمیت کو بالفعل قائم کرنے کے کام میں میری مدد کریں گے؟ اب جو افراد بھی مجھ سے اتفاق کرتے ہیں اور میرے بتائے ہوئے طریق کار کو درست سمجھتے ہیں وہ میرے ساتھ مل جاتے ہیں' میرے ساتھی اور اعوان و انصار بن جاتے ہیں۔ اس طرح کی جماعت اوپر سے نیچے کی طرف بڑھتی ہے۔ چونکہ لوگ میری پکار پر جمع ہوئے ہیں لہٰذا میں خود بخود امیر بن جاتا ہوں' اور کسی قسم کے انتخاب کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اب آپ ان چار اقسام کے امراء کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اولاً وہ امیر جسے کوئی بڑا امیر کسی خاص علاقے یا کسی مخصوص گروہ کا قائد مقرر کرے۔ مثلاً وہ امراء جنہیں رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا تھا۔ ثانیاً وہ امیر جسے مسلمان باہمی مشورے اور رضامندی سے اپنا حاکم منتخب کریں۔ مثلاً خلفائے راشدینؓ۔ ثالثاً وہ شخص جو مسلمانوں کی مرضی کے بغیر حکومت پر قبضہ کرکے ان کا حاکم بن جائے۔ مثلاً مسلمانوں کی تاریخ کے اکثر بادشاہ اور آج کے دور کے فوجی حکمران۔ رابعاً وہ شخص جو اسلام کے لئے کسی جدّوجہد کا آغاز کرنا چاہے اور اس میں اسے دوسرے مسلمانوں کی مدد اور ان کے تعاون کی ضرورت ہو۔ یہ شخص ابتداء میں داعی کے طور پر کام کرتا ہے اور لوگوں کو جمع کرنے کے لئے پکار لگاتا ہے۔ جب لوگ جمع ہو کر اس کے ساتھی بن جاتے ہیں تو وہ ان کا فطری امیر بن جاتا ہے۔

۲۔ سمع و طاعت : امیر کے بعد دوسری اصطلاح جس کے مفہوم کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے وہ ہے "سمع و طاعت"۔ واضح رہے کہ جس طرح "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" بظاہر دو کام ہیں لیکن اصلاً ایک ہی اصطلاح بنتے ہیں' اسی طرح سمع و طاعت بھی قرآن حکیم کی ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے دونوں اجزاء باہم پیوست ہیں اور جدا نہیں کئے جا سکتے۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ سمع و طاعت دراصل فوج کے نظم کو ظاہر کرنے کی خاص اصطلاح بھی ہے۔ ایک عام سپاہی کا فرض یہ ہے کہ وہ سنے اور اطاعت کرے۔ یعنی یہ کہ وہ اپنے سے بالاتر افسر سے احکامات وصول کرے اور ان پر عمل پیرا ہو۔ اسے اس کا

حق نہیں ہے کہ وہ اپنے کمانڈر سے بحث کرے اور اس کے حکم کی علت یا مقصد دریافت کرے۔ ظاہر ہے کہ ایک جنگ کے دوران وہی سپاہی کار آمد ثابت ہوں گے جو کیا اور کیوں کی بحث میں پڑنے کے بجائے اپنے افسر کے احکامات کو سنیں اور عمل کریں۔ فوج کا یہی وہ نظم ہے جسے ایک مشہور انگریزی نظم Charge of the Light Brigade میں بیان کیا گیا ہے۔ کسی لڑائی کے دوران صورت حال یہ ہوئی کہ فوج کے ایک دستے کو آگے بڑھنے کا حکم ملا۔ لیکن دشمن کی توپیں ہر طرف موجود تھیں۔ ہر سپاہی سمجھ رہا تھا کہ آگے بڑھنے کا حکم صریحاً کسی غلطی کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود کسی نے بحث نہیں کی' کسی نے وضاحت طلب نہیں کی' اور کسی نے حکم کے صحیح یا غلط ہونے کا سوال نہیں اٹھایا۔ سب نے حکم کی تعمیل کی اور سب کے سب مارے گئے۔

Their's not to reason why,

Their's but to do and die.

اس موقع پر میں قرآن مجید کے تین مقامات کا حوالہ دینا چاہتا ہوں' تاکہ سمع و طاعت کی جو اہمیت اسلام کے نظام زندگی میں ہے وہ پوری طرح واضح ہو جائے۔

﴿ . . . وَقَالُوا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۝﴾ (البقرہ : ۲۸۵)

"... اور کہہ اٹھے کہ ہم نے سنا اور قبول کیا' ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے"۔

﴿وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۡ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۝﴾ (المائدہ : ۷)

"اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر اور عہد اس کا جو تم سے ٹھہرایا تھا جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور مانا' اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' بیشک اللہ خوب جانتا ہے دلوں کی بات"۔

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَاَطِيعُوا وَاَنْفِقُوا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ....﴾ (التغابن : ۱۶)

"سو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جہاں تک ہو سکے اور سنو اور مانو' اور خرچ کرو اپنے بھلے کو..."

اسلام میں تنظیمِ جماعت کی اساس

جیسا کہ میں نے عرض کیا' جماعت سازی کا جو طریقہ ہمیں قرآن میں ملتا ہے' حضور ﷺ کی سُنّت میں نظر آتا ہے' اور امّتِ مسلمہ کی ۱۴ سو سالہ تاریخ میں جس کی مثالیں ملتی ہیں وہ صرف ایک ہے۔ یہ طریقہ بیعت کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ بیعت سے کیا مراد ہے؟

عربی میں بَاعَ یَبِیعُ کے معنی ہیں بیچنا۔ اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ بیچنے کا عمل دو طرفہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی اصل "تبادلہ" ہے۔ مثلاً آپ روپے دے کر آٹا حاصل کر لیتے ہیں۔ اور کرنسی کی ایجاد سے پہلے ایک جنس کے تبادلے میں دوسری جنس حاصل کی جاتی تھی۔ یہاں اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ آپ روپے کو قیمت سمجھیں اور آٹے کو جنس یا آٹے کو قیمت قرار دیں اور روپے کو جنس کہہ لیں۔ وجہ یہ ہے کہ جہاں بھی بیچنے کا عمل ہو گا وہاں خریدنے کا عمل بھی لامحالہ ہو گا۔

اس تفصیل سے میرا مقصد یہ ہے کہ آپ سورۂ توبہ کی اس آیت کے اصل مفہوم کو اور اس آیت کی شان اور عظمت کو سمجھ سکیں :

﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْاٰنِ ۚ وَمَنْ أَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهٖ ۚ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝﴾ (التوبہ : ۱۱۱)

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے خرید لی ہیں مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس قیمت پر کہ ان کے لئے جنت ہے۔ وہ لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں' پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ وعدہ ہو چکا اللہ کے ذمہ پر سچا توریت اور انجیل

اور قرآن میں، اور کون ہے جو اپنے وعدے کا پورا کرنے والا ہو اللہ سے بڑھ کر؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اس سے کیا ہے، اور یہی ہے بڑی کامیابی"۔

یہ آیت قرآن مجید کی اہم ترین آیات میں سے ایک ہے، بدقسمتی سے آج ہماری زندگیوں میں اس آیت کی وہ اہمیت نہیں رہی جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں اس کو حاصل تھی۔ یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ مومن اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک خرید و فروخت کا معاملہ ہوتا ہے۔ اس سودے میں اللہ تعالیٰ خریدار ہے اور مومن فروخت کرنے والا ہے۔ ایمان لانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو، اپنی صلاحیتوں اور اوقات کو، اپنے وسائل اور اموال کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں کھپا دینے کے لئے آمادہ ہے، اور ان تمام قربانیوں کے عوض اس سے موت کے بعد کی زندگی میں جنت کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ یہ وہ سودا ہے جو مومن اور اللہ تعالیٰ کے مابین انجام پاتا ہے۔ اس سودے کے نتیجے میں اہل ایمان اللہ کے راستے میں جنگ کرتے ہیں تاکہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو۔ اس جنگ میں وہ اللہ کے دشمنوں کو بھی قتل کرتے ہیں اور خود بھی قتل ہوتے ہیں۔

یہ سودا جو ایک مومن اور اللہ تعالیٰ کے مابین ہوتا ہے نقد کا نہیں بلکہ ادھار کا معاملہ ہے۔ مومن سے مطالبہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اسے اللہ کی راہ میں صرف کر دے۔ اور جواباً اسے ملتا کیا ہے؟ محض ایک وعدہ۔ اللہ کی طرف سے یہ وعدہ کہ اسے اس کی محنت اور قربانی کا صلہ آخرت میں ملے گا۔ ظاہر ہے کہ اس معاملے کو دیکھ کر کوئی بھی شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے اس معاملے میں کافی خطرہ (risk) نظر آتا ہے۔ اگر میں اپنا سب کچھ یہاں اللہ کی راہ میں قربان کر دوں اور موت کے بعد مجھے اس کا صلہ نہ ملے تب تو یہ گھاٹے کا سودا ہوا۔ اس طرح تو میں دنیا میں بھی نقصان میں رہا اور آخرت میں بھی۔

ظاہر ہے کہ ادھار کے سودے میں شکوک و شبہات کا پیدا ہو جانا فطری امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہایت شدّ و مدّ کے ساتھ فرمایا ہے کہ اس وعدے کا پورا کرنا اس

نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ لہٰذا کسی کو اس معاملے میں ہرگز متزلزل نہ ہونا چاہئے۔ یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے اور وہ لازماً اسے پورا کرے گا۔ اس نے یہ وعدہ تین مرتبہ کیا ہے' تورات میں' انجیل میں' اور پھر قرآن مجید میں۔ اور اللہ سے زیادہ اپنے قول کا سچا اور وَعدے کا پورا کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟ لہٰذا اس سودے پر جو تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہے خوشیاں مناؤ۔ تم سے جو کچھ قربان کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ نہایت حقیر شے ہے' اور جس کا وعدہ کیا جا رہا ہے وہ ابدی راحت ہے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے جو کسی انسان کو حاصل ہو سکتی ہے۔

سورۂ توبہ کی یہ آیت لفظ اِشْتَرٰی سے شروع ہو کر بَیْعِکُم پر ختم ہوتی ہے۔ ان دونوں الفاظ میں کیا فرق ہے؟ اِشْتَرٰی کا مطلب ہے خریدنا' اور بیع سے مراد وہ تبادلہ ہے جو دو اشخاص کے مابین ہوتا ہے اور جسے ہم "خرید و فروخت" کہتے ہیں۔ عربوں کا عام رواج تھا کہ جب ان کے درمیان خرید و فروخت کا معاملہ ہوتا تو وہ پہلے تو قیمت اور جنس کی خوبیوں یا خامیوں کے متعلق بحث کرتے' اور جب معاملہ طے پا جاتا تو وہ ہاتھ ملا کر یہ ظاہر کرتے کہ اب کوئی فریق سودے سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ یہ آخری معاہدہ' جس کی علامت کے طور پر ہاتھ ملائے جاتے تھے' مبایعت کہلاتا ہے' اور یہی وہ چیز ہے جو بیعت کی بنیاد بنی۔

قرآن و سُنّت میں بیعت کا ثبوت

یہاں اہم بات یہ ہے کہ یہ سودا اصل میں تو اللہ تعالیٰ اور مومن کے درمیان ہوتا ہے' لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ بذاتہٖ اور براہِ راست یہ سودا نہیں کرتا' لہٰذا ہمیں ایک درمیانی فریق کی ضرورت پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مومن کی جان و مال کا خریدار ہے' اور مومن اس سودے کے لئے تیار ہے' لیکن یہ سودا کس طرح انجام پائے گا؟ مومن کو کون بتائے گا کہ اسے کب اور کس طرح اپنی جان اور اپنے مال کو پیش کرنا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ مکی زندگی کے بارہ برسوں میں حکم یہ تھا کہ کوئی مزاحمت یا جوابی کارروائی نہیں کرنا ہے۔ پھر مدینے میں جا کر حکم ملا کہ اب تصادم اور جنگ کا مرحلہ آ گیا ہے۔ لیکن یہ تمام احکام کس نے

دیجیے؟ اس موقع پر تنظیم اور امیر اور سمع وطاعت کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔

یہ سارا معاملہ فی الواقع بہت منطقی اور سادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ خریدار ہے' مومن اپنے جان ومال کو جنت کے عوض فروخت کر رہا ہے' اور ان دونوں کے درمیان رسول اللہ ﷺ تھے۔ اصل خریدار تو اللہ تعالیٰ ہے' لیکن اطاعت کا وعدہ حضور ﷺ سے کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آتا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝﴾ (الفتح : ۱۰)

"(اے نبیؐ) جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہو گا' اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ عنقریب اسے بڑا اجر عطا فرمائے گا"۔

معلوم ہوا کہ یہ اصل میں ایک سہ فریقی معاہدہ ہے' جان ومال کا سودا تو اللہ تعالیٰ اور مومن کے درمیان طے پایا' لیکن اطاعت کا وعدہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے ہوا۔ مطلب یہ کہ گویا مومن رسولؐ سے عرض کرتا ہے کہ میری زندگی اور میرا مال آپؐ کی خدمت میں پیش ہیں' جس طرح آپ حکم دیں گے ویسے ہی ان چیزوں کو قربان کر دوں گا۔ اس میں آخری مقصد رضائے الٰہی کا حصول اور اخروی کامیابی ہے۔

وہ بیعت جو رسول اللہ ﷺ نے مسلمان مردوں سے لی تھی' اس کا ذکر قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے' اگرچہ احادیث میں اسے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تاہم وہ بیعت جو حضور ﷺ نے خواتین سے لی تھی' اس کا ذکر واضح الفاظ میں قرآن حکیم میں موجود ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ

وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (الممتحنۃ : ۱۲)

"اے نبیؐ! جب تمہارے پاس مومن عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کے لئے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی' چوری نہ کریں گی' زنا نہ کریں گی' اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی' اور اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی' اور کسی امر معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی' تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو' یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا رحم کرنے والا ہے"۔

سیرتِ نبویؐ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے بعد جو سب سے اہم بیعت ہوئی ہے وہ "بیعتِ رضوان" ہے' جو حضور ﷺ نے صلح حدیبیہ سے متصلاً قبل صحابہؓ سے لی تھی۔ تاہم ہجرت سے پہلے کی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ دو نہایت اہم مواقع پر بیعت ہوئی ہے۔ یعنی جب یثرب سے آنے والوں نے حضور ﷺ سے قول و قرار کیا۔ منیٰ کا جو مقام مکے سے قریب ترین ہے وہ وادیٔ عقبہ ہے' جہاں حج کے موقع پر یثرب کے چھ افراد نے حضور ﷺ سے ملاقات پر اسلام قبول کیا۔ اگلے برس ان میں سے پانچ افراد دوبارہ حج پر آئے اور ۷ مزید افراد کو ہمراہ لائے۔ اس موقع پر ان ۱۲ افراد نے حضور ﷺ سے وہ قول و قرار کیا جسے بیعتِ عقبہ اولیٰ کہا جاتا ہے۔ اس بیعت کے الفاظ وہی تھے جو بیعت النساء کے حوالے سے سورۃ الممتحنہ میں وارد ہوئے ہیں۔ اس سے اگلے برس ۷۲ مرد اور دو خواتین یثرب سے آئے اور انہوں نے حضور ﷺ سے وہ عہد کیا جسے بیعتِ عقبہ ثانیہ کہتے ہیں۔ اس دوسری بیعت کے الفاظ نہایت اہم ہیں' جنہیں ہم ابھی بیان کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے مختلف اوقات میں کئی قسم کے عہد لئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب بھی کسی مضبوط وعدے کی ضرورت پیش آئی تو حضور ﷺ نے ہمیشہ بیعت ہی کا معاملہ فرمایا۔ چنانچہ علم حدیث کے ایک عظیم عالم امام نسائیؒ نے دس مختلف اقسام کی بیعتوں کا ذکر کیا ہے جو حضور ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے لی تھیں۔ (۱) سمع و

طاعت کی بیعت (۲) ہمیشہ سچ بولنے پر بیعت (۳) اس بات پر بیعت کہ حضورؐ کو صحابہ میں سے کسی کو بھی ترجیح دینے کا اختیار ہوگا (۴) اس بات کا عہد کہ ہم میدان جنگ سے نہ بھاگیں گے (۵) اس بات کا وعدہ کہ ہم جہاد کریں گے (۶) اس بات پر بیعت کہ ہمیشہ عدل پر مبنی بات کہیں گے (۷) ہر مسلمان کی خیر خواہی کی بیعت (۸) اللہ کے راستے میں جان قربان کرنے پر بیعت (۹) اس بات کا عہد کہ ہم حضورؐ کے حکم پر اپنے گھروں کو چھوڑ دیں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وعدہ لینے اور نظم قائم کرنے کا واحد طریقہ جو ہمیں رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور سُنّت سے ملتا ہے وہ بیعت پر مبنی ہے۔ چنانچہ غزوۂ احزاب کے موقع پر جب صحابہ رضی اللہ عنہم خندق کھود رہے تھے تو ان کی زبانوں پر یہ شعر جاری تھا ؎

نَحْنُ الَّذِينَ بَايَعُوا مُحَمَّدًا عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِينَا اَبَدًا

(بخاری، مسلم، مسند احمد)

اسلامی تاریخ میں بیعت کا مقام

میں عرض کر چکا ہوں کہ امتِ مسلمہ کی ۱۴سو سالہ تاریخ میں جماعت سازی کے لئے صرف بیعت ہی کی اساس ملتی ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد جو نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوا اس کی بنیاد بیعت ہی تھی۔ پھر جب صحابہؓ نے محسوس کیا کہ خلافت کا ادارہ رفتہ رفتہ ملوکیت میں تبدیل ہو رہا ہے اور انہوں نے اس زوال کو روکنے کے لئے جدوجہد کی تو اس میں بھی بیعت کا طریقہ ہی اختیار کیا گیا۔ چنانچہ حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ دونوں کی جدوجہد بیعت کی اساس پر ہوئی۔ اس کے بعد جب ملوکیت نے اپنے پنجے پوری طرح گاڑ لئے تب بھی خلفاء (اصل میں ملوک) اپنی حکومت کو بیعت کی بنیاد پر استوار کرتے رہے۔

اصولی طور تو اسلام میں مذہب و سیاست کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے، لیکن عملاً ہم دیکھتے ہیں کہ عہد ملوکیت میں یہ تقسیم نمایاں ہونے لگی تھی۔ نتیجتاً بیعت کا ادارہ بھی دو

حصوں میں منقسم ہو گیا۔ بادشاہ عوام سے سیاسی اطاعت کا وعدہ بیعت کے ذریعے لیتے تھے، لیکن ساتھ ہی اسلامی معاشرے میں افراد کے تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کے لئے صوفیائے کرام بھی لوگوں سے روحانی اور اخلاقی اطاعت کا وعدہ لینے لگے، اور یہ شے بیعتِ ارشاد کہلائی۔

بیعتِ ارشاد سے کیا مراد ہے؟ ایک شخص محسوس کرتا ہے کہ اسے کسی بزرگ رہنما کی ضرورت ہے جو اسے ایک بہتر مسلمان بننے میں مدد دے۔ اس مقصد کے تحت وہ کسی ایسے متقی شخص کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنا چاہتا ہے جو خود اپنے نفس کا تزکیہ کر چکا ہو اور دوسروں کی اس راہ میں رہنمائی کر سکتا ہو۔ یہ وابستگی بیعت کی صورت میں ہوتی ہے۔ یعنی مرید یا سالک کسی بزرگ سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ آپ مجھ سے علم، تجربے اور تقویٰ میں بہت آگے ہیں، لہٰذا آپ میری رہنمائی فرمائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے، میں اس معاملے میں آپ کی اطاعت کروں گا اور آپ میرے اخلاق اور میری روحانی ترقی کی نگرانی فرمائیں گے۔ یہ وہ شے ہے جسے بیعتِ ارشاد کہا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کے طویل انحطاط اور زوال کے نتیجے میں آج صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ جب بیعت کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو عموماً ایک عام مسلمان کے سامنے بیعتِ ارشاد ہی کا تصور آتا ہے۔ یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ بیعتِ ارشاد کے لئے قرآن مجید میں جواز بیعت النساء کی صورت میں موجود ہے، جس کا مقصد بھی یہی تھا جو بیعت ارشاد کا ہوتا ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ گزشتہ صدی میں مسلمانوں کو غیر ملکی استعمار سے نجات دلانے کے لئے جتنی بھی عسکری تحریکیں چلیں، ان سب کی بنیاد بیعت ہی تھی۔ چنانچہ ہندوستان میں سید احمد بریلوی کی تحریکِ شہیدین، لیبیا میں محمد بن علی السنوسی کی سنوسی تحریک، اور سوڈان میں محمد احمد المہدی کی تحریک، سب میں نظم کی بنیاد بیعت ہی تھی۔ موجودہ صدی میں مولانا ابو الکلام آزاد نے جب ۱۹۱۳ء اپنی جماعت یعنی حزب اللہ قائم کی، تو بیعت ہی کو اس کی اساس کے طور پر اختیار کیا۔ اسی طرح الاخوان المسلمون کے بانی ارکان نے شیخ حسن البناء شہید کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، جو مرشدِ عام کہلاتے تھے۔ اس موقع پر میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے موجودہ صدی کا ایک نہایت اہم واقعہ بیان

کروں جو اکثریت کے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے۔ جمعیت علمائے ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس نومبر ۱۹۲۰ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس کی صدارت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے کی، اور علماء سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ سب مل کر ابوالکلام آزاد کو اپنا متفقہ قائد تسلیم کر لیں، ان سے بیعت کریں، اور ہندوستان میں آزادی اور اسلامی حکومت کے قیام کے لئے منظم جدوجہد کا آغاز کیا جائے۔ بدقسمتی سے اس تجویز کو علماء میں پذیرائی حاصل نہ ہوئی۔

موجودہ صدی کی ایک اور تحریک جو بیعت کی بنیاد پر منظم ہوئی تھی وہ قادیانیت کے فتنے کا مقابلہ کرنے کے لئے تھی۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں ۵۰۰ علماء اکٹھے ہوئے، جن میں سے اکثریت کا تعلق دیوبندی مکتب فکر سے تھا، اور انہوں نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کو امیر شریعت مان کر ان سے بیعت کی۔ اگرچہ مولانا بہت نمایاں مذہبی عالم نہ تھے، اس کے باوجود ان سے بیعت کرنے والوں میں مولانا احمد علی لاہوری اور مولانا انور شاہ کاشمیری جیسے جید علماء بھی شامل تھے۔

غرضیکہ امت کی ۱۳ سو سالہ تاریخ کی گواہی ہمارے سامنے موجود ہے کہ جہاں بھی کسی منظم جدوجہد کے لئے جماعت سازی کی ضرورت پیش آئی وہاں ہمیشہ بیعت ہی کے طریقے کو اختیار کیا گیا۔ خواہ معاملہ حکومت بنانے کا ہو، یا اسلامی اصولوں کو نظامِ حکومت میں دوبارہ رائج کرنے کا ہو، تزکیۂ نفوس اور اصلاحِ باطن کا مسئلہ ہو، یا مسلمانوں کے علاقوں کو غیر مسلموں سے آزاد کرانے کی جدوجہد ہو، ہر بار افراد کو جمع کرنے اور منظم کرنے کے لئے صرف بیعت کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس میں واحد استثناء مولانا مودودی کی جماعت اسلامی کا ہے جو بیعت کی بنیاد پر قائم نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے امت کی تاریخ کے ۱۳ سو برسوں کا حوالہ دیا ہے، کیونکہ چودھویں صدی میں ایک بڑی تحریک کا دستوری بنیاد کو اختیار کرنے کا معاملہ بھی موجود ہے۔

تنظیم اسلامی میں شمولیت کی بیعت

جہاں تک میرا تعلق ہے، تو میں نے تنظیم اسلامی بیعت کی بنیاد پر قائم کی ہے۔ تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لئے جو بیعت ہے اس کے الفاظ ایک مستند حدیث سے لئے گئے

ہیں۔ یعنی بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر یثرب سے آنے والوں نے حضور ﷺ سے جن الفاظ میں بیعت کی، انہی الفاظ کو ایک تبدیلی کے ساتھ ہم نے اختیار کیا ہے۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ اس حدیث کے الفاظ میں ایک حزب اللہ قائم کرنے کے لئے پورا منہج اور طریقہ کار موجود ہے، یعنی ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت کو قائم کرنے کا پورا نقشہ اس حدیث سے مستنبط کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کوئی جماعت بنا رہے ہیں تا کہ سماجی سطح پر فلاح و بہبود کا کام کیا جا سکے تو کسی بھی قسم کا دستوری ڈھانچہ اختیار کیا جا سکتا ہے، لیکن جہاں معاملہ ہو ایک انقلابی جماعت کے قیام کا، جسے غیر معمولی نظم اور اندرونی ہم آہنگی درکار ہوتی ہے، تو یہ جماعت صرف بیعت کی بنیاد پر قائم ہونی چاہئے۔

پیش نظر حدیث حضرت عبادۃ بن الصامتؓ سے روایت کی گئی ہے، اور امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں نے اسے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ بیعت کے الفاظ ایسے ہیں کہ حضور ﷺ نے ان کے ذریعے تنازعات کے تمام دروازے بند فرما دیئے ہیں۔ عبادہ بن الصامتؓ فرماتے ہیں :

((بَایَعْنَا رَسُولَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ، فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ، وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ، وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا، وَعَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ، وَعَلٰی اَنْ نَقُولَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا، لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ)) (متفق علیہ)

"ہم نے اللہ کے رسول ﷺ سے بیعت کی کہ ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے، خواہ آسانی ہو یا مشکل، خواہ ہماری طبیعت آمادہ ہو یا ہمیں اس پر جبر کرنا پڑے، اور خواہ دوسروں کو ہمارے اوپر ترجیح دے دی جائے۔ ہم اصحاب اختیار سے جھگڑیں گے نہیں، لیکن سچ بولیں گے جہاں کہیں بھی ہم ہوں گے، اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے بے پروا رہیں گے۔

غور کیجئے کہ جہاں بھی کوئی اجتماعی جدّوجہد ہو رہی ہو اور کسی خاص مسئلے پر فیصلہ کرنا پڑے تو بے شمار آراء سامنے آتی ہیں، اور بہت سے مختلف بلکہ متضاد حل پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن قائد کو صرف ایک ہی فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع پر جن ارکان

کی رائے کے مطابق فیصلہ ہو جائے وہ اس پر عمل کرنے میں انشراح اور آمادگی محسوس کریں گے، اور جن کی مرضی یا رائے کے خلاف فیصلہ ہو جائے وہ عمل درآمد کے معاملے میں انقباض محسوس کریں گے۔ حضور ﷺ نے تنازعات اور نظم کی خلاف ورزی کے اس امکان کو اس طرح ختم کیا کہ صحابہؓ سے یہ عہد لے لیا کہ وہ ہر حال میں اطاعت کریں گے، خواہ جو حکم انہیں ملا ہو وہ اس سے سو فیصد متفق ہوں یا نہ ہوں، خواہ حکم پر عمل کرنے میں وہ دل کی آمادگی پائیں یا انہیں اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے۔

اسی طرح اصحابِ اختیار کو مقرر کرنے کا معاملہ بھی ایسا ہے جہاں بہت سے اختلافات ابھر سکتے ہیں۔ اگر کسی باصلاحیت مگر نووارد رُکن کو کسی اہم عہدے پر فائز کر دیا جائے تو پرانے اراکین میں ناراضگی پیدا ہو سکتی ہے۔ تنازع کے اس دروازے کو بند کرنے کے لئے حضور ﷺ نے صحابہؓ سے یہ عہد لیا کہ مختلف عہدے یا ذمہ داری کے مناصب دینے کے معاملے میں کُل اختیار میرا ہو گا، اور یہ کہ وہ لازماً سمع و طاعت کی روش پر قائم رہیں گے خواہ وہ یہ محسوس کریں کہ دوسروں کو ان پر ترجیح دی جا رہی ہے۔

یہ بات نہایت اہم ہے کہ "سمع و طاعت" کی اصطلاح سے غیر معمولی نظم کا جو نقشہ ذہنوں میں ابھرتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک اسلامی انقلابی جماعت کے ارکان بلا سوچے سمجھے اور اپنے ذہن اور عقل و فہم کی صلاحیتوں کو بالائے طاق رکھ کر امیر کی اطاعت کرتے رہیں گے۔ ان کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ جس بات کو حق سمجھتے ہوں اس کا برملا اظہار کریں، اور امراء کے طرزِ عمل یا حکمتِ عملی میں کوئی غلط شے دیکھیں تو اپنی زبانوں پر تالے ڈال کر نہ بیٹھے رہیں۔ چنانچہ بیعت کے الفاظ میں ہے کہ "اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا" (ہم سچ کہیں گے جہاں کہیں بھی ہم ہوں گے)۔ ظاہر ہے کہ بیعت کی بنیاد پر تنظیم بنانے کا مطلب یہ ہے کہ آخری فیصلے کا اختیار ایک فرد کے پاس ہو گا، یعنی تمام بحث و تمحیص اور گفتگو اور مشاورت ہو جانے کے بعد جب فیصلے کا وقت آئے گا تو یہ فیصلہ ووٹوں کی گنتی سے نہیں بلکہ امیر کی مرضی سے ہو گا۔

تنظیمِ اسلامی میں شمولیت کے لئے بیعت کے جو الفاظ اختیار کئے گئے ہیں اس کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں ایک شخص شعوری طور پر یہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی

معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ پھر وہ اللہ سے اپنے تمام سابقہ گناہوں کی معافی مانگتا ہے اور مستقبل میں گناہوں سے اجتناب کا پختہ وعدہ کرتا ہے۔ دوسرے حصے میں وہ اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کرتا ہے کہ وہ ہر اس شے کو چھوڑ دے گا جو اللہ کو ناپسند ہے اور یہ کہ وہ اس کے راستے میں مقدور بھر جدوجہد کرے گا' اپنے مال سے بھی اور جان سے بھی' تاکہ اس کے دین کو قائم کیا جاسکے۔ تیسرے حصے میں وہ تنظیم اسلامی کے امیر کے ساتھ یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ ان کے تمام احکام کو سنے گا اور ان پر عمل کرے گا' بشرطیکہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہوں۔ یہ آخری شق' یعنی اطاعت "فی المعروف" ہوگی نہ کہ مطلق' وہ اضافہ ہے جو ہم نے بیعتِ عقبہ ثانیہ کے الفاظ میں کیا ہے۔

بیعت کی تاکیدی اہمیت

حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ :

((مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً))

(صحیح مسلم' کتاب الامارہ' عن عبداللہ بن عمرؓ)

"جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہ تھا تو وہ جاہلیت کی موت مرا"۔

یعنی ایسا شخص حقیقی معنوں میں ایک مسلمان کی موت نہیں مرا۔ یہ حدیث بالکل واضح ہے' لیکن ہم میں سے اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی لاحق ہے کہ اگر ہم کسی متقی شخص کے ساتھ اپنے آپ کو بیعتِ ارشاد کے ذریعے وابستہ کرلیں تو اس حدیث پر عمل ہو جائے گا۔ یہ خیال بالکل غلط ہے! مذکورہ حدیث میں بیعت سے مراد وہ بیعت ہے جو امت کی مجموعی ہیئت سے تعلق رکھتی ہے' اور اس کی صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ کم از کم شرائط پوری کرنے والی اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت قائم ہو تو خلیفۃ المسلمین یا امیر المومنین کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی' اگر ایسا نہیں ہے تو مسلمانوں پر ایسی ریاست اور ایسا نظام بالفعل قائم کرنے کے لئے کوشش فرض ہو جاتی ہے' اور اس جدّوجہد کے لئے جو حزب اللہ قائم ہوگی اس کے امیر سے بیعت کی جائے گی۔

ظاہر ہے کہ نظامِ خلافت آسانی سے قائم ہو جانے والی شے تو نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے ہمیں جدوجہد کرنا پڑے گی اور بڑی بڑی قربانیاں دینا پڑیں گی۔ اپنا وقت، صلاحیتیں، اور وسائل کھپانے پڑیں گے۔ دنیا میں کوئی بھی بڑا کام اجتماعی جدوجہد کے بغیر نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اگر اسلامی ریاست قائم نہیں ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اسے قائم کرنے کے لئے کوشش کریں، اور یہ کوشش ایک مضبوط اور منظم جماعت ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے نہ کہ انفرادی طور پر۔ اور ایک مضبوط اور منظم جماعت صرف بیعت ہی کے اصول کو اختیار کر کے وجود میں لائی جا سکتی ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک ہی ایسی صورت ہے جس میں ایک مسلمان کو بیعت کے بغیر زندگی گزارنے کی اجازت ہے۔ یعنی فتنے اور فساد کی وہ کیفیت جس میں کسی کو کسی کا ہوش نہ ہو، کسی کو معلوم نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے، ایسے میں کس کا ساتھ دینا چاہئے اور کیا کرنا چاہئے۔ اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ آپ فتنہ و فساد کے عہد میں رہ رہے ہیں، اور اس لئے بیعت سے مستثنیٰ ہیں، تو جان لیجئے کہ ایسی حالت میں آپ کے لئے جائز نہیں کہ کسی مہذب معاشرے میں رہیں، بلکہ ضروری ہے کہ آپ ہر شے کو چھوڑ کر کسی جنگل میں جا بسیں۔ لیکن اگر آپ ایک نارمل زندگی گزار رہے ہیں، شہری زندگی اور ٹیکنالوجی کے تمام فوائد اور سہولتوں سے مستفید ہو رہے ہیں اور پھر بھی آپ کا خیال ہے کہ فتنہ و فساد کی وجہ سے آپ کو بیعت سے استثناء مل گیا ہے تو یہ خیال محض خود فریبی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ہمت دے کہ ہم حق کو اختیار کریں خواہ وہ کسی جگہ سے ملے، اور ہمیں توفیق دے کہ ہم مسلمان جئیں اور مسلمان مریں۔ اور توفیق دے کہ ہم وہ کام کریں جو اسے پسند ہوں۔ آمین OO

کفر و گمراہی اور صراطِ مستقیم

کفرِ اعتقادی اور کفرِ عملی میں فرق کرنا ضروری ہے!

علامہ محمد ناصر الدین الالبانی سے ایک استفسار اور اسکا مفصّل جواب

علامہ ناصر الدین الالبانی کی شخصیت علمی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ علم حدیث کے میدان میں ان کی خدمات اور مقام و مرتبے کو پوری مسلم دنیا میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ ذیل کا مضمون اگرچہ ایک مخصوص سوال کے مفصل جواب پر مشتمل ہے تاہم ضمنی طور پر بعض نہایت قیمتی اصولی مضامین بھی اس میں زیرِ بحث آئے ہیں۔ چنانچہ یہ مضمون ان لوگوں کے لئے درسِ فکر ہے جو قرآن و سنت کی علمی و عملی تعبیر کے ضمن میں سنّتِ خلفائے راشدین، تعامل صحابہ و تابعین و تبع تابعین اور خیر القرون کے اکابر کی تشریحات سے بے نیاز ہو کر محض اپنے علم و فہم پر اعتماد کی روش اختیار کئے ہوئے ہیں اور اسلام کے چودہ سو سال سے متفقہ احکام کو مشکوک بنانے کی خاطر ان کو صحافتی و عدالتی بحث و مباحثہ کا موضوع بنانے پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔ یہ مضمون ہم برطانیہ سے شائع ہونے والے جریدے ماہنامہ "صراط مستقیم" کے شکریئے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

سوال :

شیخ محترم! آپ سے یہ امر مخفی نہیں کہ افغانستان کے معرکہ میں ایسے دو گروہ اور فرقے بھی شامل ہیں جو افغانستان کی تباہی و بربادی میں روز بروز اضافے کا باعث بن رہے ہیں۔ افسوس کہ یہ فرقے جہاد میں مصروف ہمارے سلفی نوجوانوں میں ایسے افکار و نظریات کی اشاعت میں لگے ہوئے ہیں جو سلف صالح کے منہج سے ہٹے ہوئے ہیں۔ ہمارے بعض سلفی نوجوان جوان آراء و نظریات سے متاثر ہیں، جہاد کے بعد جب اپنے وطن واپس آتے

ہیں تو یہ افکار اپنے ملکوں میں بھی پھیلاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے اور اخوان میں سے کسی کے مابین تکفیر کے مسئلہ پر ایک طویل مناقشہ ہوا ہے جو ٹیپ ہے لیکن کیسٹ کی خرابی کے سبب اسے سنا نہیں جا سکتا۔ اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ اس مسئلہ کی وضاحت دوبارہ فرما دیں۔ فجزاکم اللّٰہ خیرًا

جواب :

اِنّ الحمدَ للّٰہ نَحمدہٗ وَنستعینہٗ وَنستغفرہٗ وَنعوذ باللّٰہ مِن شُرورِ اَنفُسنا ومِن سیّئاتِ اعمالِنا ' مَن یھدہِ اللّٰہُ فلا مُضِلَّ لہ ' وَمن یُضلِل فلا ھادِیَ لَہٗ واَشھد اَن لا الٰہ الا اللّٰہ وحدَہٗ لاشریکَ لہٗ واَشھدُ انَّ محمدًا عبدُہٗ ورسولُہٗ۔ امّا بعد :۔

اصل میں یہ مسئلہ تکفیر حکام ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ محکومین کا مسئلہ بھی ہے۔ یہ دراصل ایک قدیم فتنہ ہے جس کی بنیاد اسلامی فرقوں میں سے ایک فرقہ خوارج نے رکھی ہے۔ یہ بڑے افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ لوگ پھر کتاب و سنت سے خروج کر رہے ہیں اور وہ بھی کتاب و سُنّت کے نام سے۔ میری سمجھ و دانست میں اس کی دو بنیادی وجہیں ہیں جن میں سے ایک وجہ علم کی کمی اور دینی بصیرت کا فقدان ہے۔ دوسری وجہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے' وہ یہ ہے کہ ہم مسائل و معاملات میں ان شرعی اصولوں کی روشنی میں غور و خوض نہیں کرتے جو صحیح اسلامی دعوت کی اساس ہیں۔ ان اصولوں کو وہ تمام منحرف فرقے بھی مانتے ہیں جنہوں نے اس مخصوص جماعت سے خروج کیا ہے جس کی تعریف رسول اللہ ﷺ نے متعدد احادیث میں فرمائی ہے بلکہ خود اللہ عزّوجل نے جس کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے اور اس کی صراحت فرما دی ہے کہ جو اس جماعت سے خروج کرے گا وہ اللہ اور اس کے رسول کا مخالف ہو گا۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے :

﴿ وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۚ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ۝﴾ (النساء : ۱۱۵)

"اور جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہو جانے کے بعد پیغمبر کی مخالفت کرے اور مومنوں کے راستے کے سوا اور راستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اسے ادھر ہی چلنے دیں گے اور (قیامت کے دن) جہنم میں داخل کریں گے، اور وہ بری جگہ ہے"۔

چنانچہ اللہ عزو جل نے ایک ایسے مسئلہ میں جو اہل علم کے نزدیک بہت واضح ہے صرف "وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى" کہنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ "مشاقة الرسول" کے ساتھ ساتھ "اتباع غير سبيل المومنين" کا بھی اضافہ کیا اور فرمایا . ﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ (النساء : ۱۱۵)

مسئلہ فہم کتاب وسنّت

لہٰذا "سبیل المومنین" کی اتباع وعدم اتباع ایجاباً وسلباً دونوں حیثیتوں سے ضروری ہے۔ رب العالمین کے نزدیک جو سبیل المومنین کی اتباع کرے گا وہ ناجی ہو گا اور جو اس کی مخالفت کرے گا تو اس کے لئے جہنم کافی ہو گا جو بہت برا ٹھکانہ ہے۔

اسی نقطہ پر پہنچ کر قدیم وجدید فرقے گمراہ ہوئے ہیں، کیونکہ وہ سبیل المومنین پر کاربند نہیں رہ سکے اور اپنی عقلوں کو انہوں نے اپنا مرکب بنالیا اور کتاب وسنت کی تفسیر میں وہ خواہشات کی اتباع میں پڑ گئے اور پھر اس پر بڑے اہم نتائج کی بنا رکھ لی اور اس روش کو چھوڑ بیٹھے ہیں جس پر سلف صالح گامزن تھے۔

اس آیت میں "وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ" کا جو ٹکڑا آیا ہوا ہے اس پر اللہ کے نبی ﷺ نے بہت سی احادیثِ صحیحہ میں زور دیا ہے۔ جن احادیث کی جانب میں یہاں اشارہ کر رہا ہوں ان میں سے چند کا، جن کے سلسلہ میں میری یادداشت میرا ساتھ دے گی، میں یہاں ذکر کروں گا۔ ان احادیث سے عوام بھی اچھی طرح واقف ہیں، چہ جائیکہ خواص۔ البتہ جس بات سے لوگ ناواقف ہیں یہ اس آیت کا کتاب وسنت کے فہم میں سبیل المومنین پر کاربند رہنے کی ضرورت واہمیت پر دلالت کرنا ہے۔ یہ نکتہ بہت سے

خواص تک کے ذہنوں سے اوجھل ہے، چہ جائیکہ وہ لوگ جو جماعت التکفیر کے نام سے موسوم ہیں۔

یہ لوگ اپنی داخلی کیفیات کے اعتبار سے کبھی کبھی مخلص ہوتے ہیں لیکن اللہ کے نزدیک ناجی اور فلاح یاب گروہ ہونے کے لئے صرف نیک و مخلص ہونا کافی نہیں، بلکہ اس کے لئے مسلمان کے لئے دو چیزوں کا جامع ہونا ضروری ہے۔ ایک تو اخلاصِ نیت اور دوسرے رسول اللہ ﷺ کے راستے کی سچی اور مکمل پیروی۔ لہٰذا مسلمان کے لئے اخلاص کے ساتھ کتاب و سنت پر عمل پیرا ہونا اور لوگوں کو ان دونوں کی دعوت دینا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایسے منہج کا حامل ہو جو صحیح و درست اور انحرافات سے مامون و محفوظ ہو۔

جن احادیثِ مشہور کی جانب میں نے ابھی اشارہ کیا ہے ان میں "اِثْنَتَیْنِ وَسَبْعِینَ فرقۃً" والی روایت بھی شامل ہے جس کے پورے الفاظ اس طرح ہیں:

> اِفْتَرَقَتِ الیهودُ علٰی اِحدٰی وَسبعینَ فرقةً وَافترقَتِ النصارٰی علی اثنتینِ وسبعینَ فرقةً وستفترق اُمتی علٰی ثلاثٍ وسبعینَ فرقةً کلُّها فِی النَّارِ اِلّا واحدةً۔ قَالُوا : ومَن هِی یارسولَ اللّٰهِ؟ قال : اَلْجَماعةُ
>
> (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)
>
> "یہود اے فرقوں میں بٹ گئے تھے اور نصاریٰ ۷۲ فرقوں میں اور عنقریب میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی، جن میں سے سب جہنمی ہوں گے، سوائے ایک فرقہ کے لوگوں کے۔ لوگوں نے پوچھا: اللہ کے رسول، وہ فرقہ کون سا ہو گا؟ آپ نے فرمایا: وہ جماعت (یعنی صحابہ اور ان کے متبعین کی جماعت) ہے"۔

اور ایک روایت میں "مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِی" کے الفاظ وارد ہیں، یعنی وہ میری اور میرے اصحاب کی روش پر چلنے والا گروہ ہو گا۔

یہاں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے جواب اور مندرجہ بالا آیت کے ٹکڑے "وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیلِ الْمُؤْمِنِینَ" میں کس قدر ہم آہنگی اور تطابق پایا

جاتا ہے۔

آیت کے عموم میں سب سے پہلے جو لوگ داخل ہیں وہ اصحاب الرسول ﷺ ہیں۔ اس حدیث میں آپ نے صرف "مَا اَنَا عَلَیہ" کہنے پر اکتفا نہیں کیا جبکہ کتاب و سنت کا فہم رکھنے والے مسلمان کے لئے یہ چیز کافی ہو سکتی ہے، بلکہ آپ ﷺ نے اس کے ساتھ "وَاَصحَابِی" کا اضافہ بھی فرمایا۔ اس طرح آپ اللہ تعالیٰ کے فرمان "بِالْمُؤْمِنِینَ رَءُ وفٌ رَّحِیمٌ" جو اس نے آپ کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں، کی عملی تصدیق فرما رہے تھے۔ آپ نے ان کے لئے اس بات کی تصریح فرمادی کہ فرقہ ناجیہ کی پہچان یہ ہے کہ وہ اس روش کی اتباع کرتا ہو جس پر خود نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب گامزن تھے۔ لہٰذا کتاب و سنت کے فہم کے لئے عربی زبان کی معرفت اور ناسخ و منسوخ وغیرہ ضروری علوم و وسائل پر اکتفا کر لینا کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جملہ معاملات میں اس روش کی طرف رجوع بھی ضروری ہے جس پر نبی ﷺ کے اصحاب گامزن تھے۔ اس لئے کہ یہ لوگ، جیسا کہ ان کے حالات اور کارناموں سے واضح ہے، اپنی عبادتوں میں سب سے زیادہ مخلص اور کتاب و سنت کے فہم میں ہم سے کہیں آگے تھے۔ یہ حدیث سنن میں وارد عرباض بن ساریہ کی حدیث کے بالکل مطابق ہے، جس میں آیا ہے :

وعَظنَا رسولُ اللّٰہ صلّی اللّٰہ عَلیہ وسلم مَوعِظۃً وَجِلَتْ مِنھا القلوبُ ودَرفَتْ منھا العیونُ فقلنا : کانّھا موعظۃُ مُوَدِّعٍ، فاَوصِنا یارسولَ اللّٰہ! قال : اُوصیکم بِالسَّمع والطاعۃِ وَاِن وُلِّیَ علیکم عبدٌ حبَشیٌّ، وَاِنّہ مَن یَعِشْ منکم فسیرَی اختلافًا کثیرًا، فعلیکم بِسُنّتی وسُنّۃِ الخُلَفاءِ الرَّاشدینَ المھدِیّین مِن بعدی، عَضّوا علیھا بِالنَّواجذ (الحدیث)

"رسول اللہ ﷺ نے ہم کو نصیحت فرمائی، ایسی نصیحت جس سے دل دہل گئے اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ ہم نے کہا گویا کہ یہ رخصت کرنے والے کی نصیحت ہے تو اللہ کے رسول! آپ ﷺ ہمیں وصیت فرمائیں۔ اس پر آپ نے فرمایا : میں تمہیں

سمع و طاعت کی وصیت کرتا ہوں گو کوئی حبشی غلام ہی تمہارا امیر بنا دیا گیا ہو' اور جو تم میں سے زندہ رہے گا عنقریب بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا' پس تم میری سنت اور ان راہ یاب خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑنا جو میرے بعد ہوں گے"۔

اس کے بعد پوری حدیث درج ہے اور اس کے ایک شاہد کا ذکر ہے' شاہد وہی ہے جو آپ کے اوپر والے سوال کے جواب کا شاہد ہے جس میں اپنی امت کو آپؐ نے اس بات کی ترغیب دی ہے کہ وہ آپ کی سنت کو مضبوطی سے تھامے رہے۔ اس کے بعد آپ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ "سنۃ الخلفاءِ الراشدین المھدیین" فرما کر خلفاء راشدین کی سنت کو بھی مضبوطی سے تھامنے کی ہدایت کی ہے۔ اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس بات کو برابر دہراتے رہیں کہ اگر ہم اپنے عقیدہ' اپنی عادات اور اپنے اخلاق و سلوک کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے سلف صالح کی جانب مراجعت ضروری ہے تاکہ یہ متحقق ہو جائے کہ یہی فرقہ ناجیہ ہے۔ اسی جگہ پہنچ کر قدیم فرقے گمراہ ہوئے اور یہیں جدید عہد کے فرقے بھی آ کر گمراہی کے کھڈ میں گر جاتے ہیں جب وہ مندرجہ بالا آیت اور "سنّۃ الخلفاء الراشدین المھدیین" والی حدیث سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں۔ لہٰذا جادۂ مستقیم سے ان کا منحرف ہو جانا ایک امر طبعی ہے جیسا کہ ان کے پیش رو' جن میں قدیم و جدید دونوں عہد کے خوارج داخل ہیں' کتاب اللہ' سنّتِ رسول اور منہجِ سلف سے منحرف ہوئے۔

مسئلہ تکفیر جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے' کی بنیاد اس دور میں قرآن کریم کی ایک آیت ہے جسے یہ لوگ بکثرت دہراتے ہیں اور وہ آیت یہ ہے :

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۝﴾ (المائدہ : ۴۴)

"اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں"۔

یہ سب جانتے ہیں کہ اللہ نے اس آیت کریمہ کو کئی بار دہرایا ہے اور آیت کا آخری ٹکڑا ہر بار تین الگ الگ لفظوں کے ساتھ آیا ہے۔

﴿..........فَاُولٰئِکَ هُمُ الْکَافِرُوْنَ۝﴾ (المائدہ : ۴۴)

﴿..........فَاُولٰئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝﴾ (المائدہ : ۴۵)

﴿..........فَاُولٰئِکَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ۝﴾ (المائدہ : ۴۷)

جو لوگ ان تینوں آیتوں میں سے پہلی آیت کے لفظ فَاُولٰئِکَ هُمُ الْکَافِرُوْنَ سے مسئلہ تکفیر پر استدلال کرتے ہیں ان کی جہالت و نادانی یہ ہے کہ وہ دوسرے ان نصوص پر غور نہیں کرتے جن میں یہ لفظ "کفر" آیا ہوا ہے۔ اس لفظ کو ان لوگوں نے دین سے خروج کے معنی میں لے لیا ہے اور وہ اس کے کفر اور یہود و نصاریٰ اور دیگر مذاہب کے متبعین کے کفر میں کوئی فرق نہیں کرتے حالانکہ کتاب و سنت کی زبان میں لفظ "کفر" کا صرف یہی ایک مطلب نہیں جسے یہ لوگ دہراتے رہتے ہیں اور اس غلط مفہوم کو بعض ایسے لوگوں پر منطبق کردیتے ہیں جو اس سے بری ہیں۔

اس آیت میں وارد لفظ "اَلْکَافِرُوْن" کا معاملہ بالکل وہی ہے جو دونوں آیتوں کے لفظ "الظّٰلِمُوْن" اور "الْفَاسِقُوْن" کا ہے۔ یہ تینوں الفاظ ہر جگہ ایک معنی پر دلالت نہیں کرتے۔ بنابریں جس طرح جس شخص کے بارے میں یہ کہا گیا ہو کہ "یہ ظالم ہے یا فاسق ہے" تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے' اسی طرح جس کے بارے میں یہ کہا گیا ہو کہ "یہ کافر ہے" تو اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا ہے۔ ایک ہی لفظ کے مفہوم میں یہ تنوع اور رنگا رنگی ہی دراصل وہ چیز ہے جس پر زبان' شریعت جو اہل عرب کی زبان میں اتری اور لغتِ قرآن تینوں دال ہیں۔

اس لئے جو شخص مسلمانوں کے لئے خواہ وہ حاکم ہو یا محکوم' احکام و فتاویٰ صادر کرتا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کتاب و سنت کے علم سے بہرہ ور ہو اور سلف صالح کے منہج پر کاربند ہو۔

کتاب و سنت اور کتاب و سنت پر مشتمل امور کا فہم اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عربی زبان اور اس کے آداب کی گہری معرفت حاصل نہ ہو اور اگر طالب علم میں اس پہلو سے کوئی کوتاہی ہو تو اس کی تلافی علمائے سلف کے فہم کی طرف مراجعت ہی سے ممکن ہو سکتی ہے' بالخصوص ان علماء کے فہم کی طرف جن کا تعلق قرونِ مشہود لہا بالخیر سے ہو۔

کفر کے مختلف درجے ہیں

اب ہم آیت کریمہ ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (المائدہ : ۴۴) کی طرف دوبارہ لوٹتے ہیں۔ اس آیت میں کفر سے کیا مراد ہے؟ کیا اس سے مراد دائرہ اسلام سے خروج ہے یا کچھ اور۔ یہی نکتہ اس آیت کی تفہیم میں قابل غور ہے کیونکہ کبھی کبھی کفر سے کفر اعتقادی کے بجائے کفر عملی مراد ہوتا ہے جس کے معنی اپنے عمل سے اسلام کے بعض احکام سے خروج کے ہیں۔ اس سلسلہ میں عبداللہ بن عباس، جو حبرالامۃ اور ترجمان القرآن کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں اور جن کا شمار رسول اللہ ﷺ کے ان اصحاب میں ہوتا ہے جن کے امام تفسیر ہونے پر تمام مسلمانوں کا (باستثناءِ چند جن کا تعلق فرق ضالہ سے ہے) اتفاق ہے، کے قول سے ہماری تصدیق ہوتی ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ کے اس قول سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو آواز آج ہمارے کانوں میں پڑ رہی ہے اس کے لئے انہوں نے اسی وقت کان کھڑے کر لئے تھے کہ کچھ ایسے لوگ بھی پائے جاسکتے ہیں جو آیت کو اس کے ظاہری معنی پر بغیر کسی تفصیل کے محمول کریں گے۔ لہٰذا "کُفْرٌ دُوْنَ کُفْرٍ" کہہ کر انہوں نے اس کی تصریح کردی کہ یہاں وہ کفر مراد نہیں ہے جس کے قائل تم ہو، یہ اس سے کمتر درجہ کا کفر ہے۔

ہو سکتا ہے اس سے مراد یہی خوارج کا گروہ رہا ہو جس نے امیرالمومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خروج کیا اور جس کے نتیجہ میں اس نے مسلمانوں کی خونریزیاں کیں اور ان کے ساتھ وہ سب کچھ روا رکھا جسے مشرکین کے ساتھ بھی وہ روا نہیں رکھ سکا۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے صاف صاف اس کی وضاحت فرمادی کہ یہ بات ہرگز اس طرح نہیں جیسے یہ لوگ کہتے یا سمجھتے ہیں، بلکہ یہ اس کفر سے جس سے انسان دائرہ اسلام سے نکل جاتا ہے کمتر درجہ کا کفر ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں ترجمان القرآن حضرت ابن عباس کا یہ واضح اور دوٹوک جواب ہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس کے علاوہ ان نصوص سے جن کی طرف اس گفتگو کے آغاز میں میں نے اشارہ کیا تھا کہ کوئی اور چیز سمجھا جانا ممکن نہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لفظ "کفر" بہت سے نصوص میں آیا ہوا ہے، اس کے ساتھ اس بات

میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس کی تفسیر ہر جگہ دائرہ اسلام سے خروج سے کیا جانا ممکن نہیں۔
اس کی مثال عبداللہ بن مسعود سے مروی صحیحین کی ایک مشہور روایت ہے جس میں رسول
اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "سِبابُ المسلِم فسوقٌ وقتالہٗ کفرٌ"....
کفر کے معنی اس حدیث میں معصیت کے ہیں اور معصیت اطاعت سے خروج کو کہتے ہیں۔
لیکن رسول اللہ ﷺ چونکہ "افصح العرب" تھے اس لئے آپ نے زجر میں مبالغہ کے
لئے تعبیر میں تنوع کے اس طریقہ کو اختیار کیا اور فرمایا: "سِبابُ المسلِم فسوقٌ
وقتالہٗ کفرٌ"۔۔ ایک دوسرے پہلو سے ہم اس حدیث پر غور کریں، کیا ہمارے لئے
اس حدیث کے پہلے ٹکڑے "سِبابُ المسلِم فسوقٌ" کی تفسیر اس لفظ "فسق"
سے کرنی ممکن ہے جس کا ذکر اوپر کی آیت کے تیسرے لفظ میں آیا ہوا ہے۔

جواب یہی ہو گا کہ فسق کا لفظ بھی کبھی اس کفر کا مترادف ہوتا ہے جس کے معنی دائرہ
اسلام سے خروج کے ہیں اور کبھی اس کفر کے جو اس سے کمتر ہوتا ہے۔

یہی مطلب ہے ترجمان القرآن عبداللہ بن عباس کے قول "کفر دون کفر" کا
کہ یہ ایسا کفر ہے جو اس کفر سے کم درجہ کا ہے جس کے معنی دائرہ اسلام سے خروج کے
ہیں۔ یہ حدیث نہایت پرزور انداز سے یہ ثابت کرتی ہے کہ لفظ کفر کبھی کبھی فسق اور
معصیت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ:

﴿ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا
بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ
تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ (الحجرات: ۹)

میں لفظ "بَغَتْ" کو معصیت ہی کے معنی میں ذکر کیا ہے کیونکہ اس آیت میں اللہ عزوجل
نے اس باغی گروہ کا ذکر کیا ہے جو حق پر قائم رہنے والے اہل ایمان کے گروہ سے برسرپیکار
ہو، اس کے باوجود اس باغی گروہ پر کفر کا حکم نہیں لگایا گیا ہے، جب کہ حدیث صاف کہہ رہی
ہے قِتالُہٗ کُفرٌ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قتالہ کفر میں کفر سے مراد وہ کفر نہیں ہے
جس کے معنی دائرہ اسلام سے خروج کے ہیں بلکہ یہ کفر اس سے کم درجہ کا ہے جیسا کہ ابن
عباس نے اوپر والی آیت کریمہ کی تفسیر کے ضمن میں اس کی وضاحت کی ہے، لہٰذا مسلمان کا

مسلمان سے قتال کرنا بغی، اعتداء، فسق اور کفر تو ہے لیکن یہ کفر کفرِ اعتقادی نہیں کفرِ عملی ہے۔

یہیں سے یہ نازک نکتہ نکلا ہے جس کی وضاحت امامِ حق شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے تلمیذ رشید علامہ ابن القیم الجوزیہ نے فرمائی ہے۔ ان دونوں نے کفر کی اس تقسیم کا بار بار اعادہ و اظہار کیا ہے "جس کا علم ترجمان القرآن عبداللہ بن عباس کے اس مختصر اور جامع لفظ کفر دون کفر کے ذریعہ انہیں ہوا تھا"۔ اس لئے کفر عملی اور کفر اعتقادی میں تفریق لازمی ہے۔ اگر یہ فرق نہیں کیا گیا تو مسلمان غیر شعوری طور پر مسلمانوں کی تکفیر کے فتنہ میں گرفتار ہوتے رہیں گے جیسا کہ قدیم عہد کے خوارج اور موجودہ دور کے بعض نامعقول لوگ جو ان کی روش پر چل رہے ہیں اس فتنہ میں برابر ملوث رہے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے ارشاد "وَقِتَالُهُ كُفْرٌ" میں کفر سے دائرۂ اسلام سے خروج مراد نہیں ہے۔ اس کی تائید میں بہ کثرت روایتیں موجود ہیں۔ اگر کوئی ذخیرۂ احادیث میں وارد ان روایات کو ڈھونڈ کر ایک جگہ جمع کر دے تو ایک مفید رسالہ تیار ہو جائے گا۔

اس میں ان لوگوں کے خلاف دلیل قطعی ہے جو مذکورہ بالا آیت پر توقف کرتے اور اس کی تفسیر لازماً کفر اعتقادی سے کرتے ہیں۔ بنا بریں تنہا یہی روایت ہمارے موقف کی تائید کے لئے کافی ہے کیونکہ یہ اس امر پر دلیل قاطع ہے کہ مسلمان کا اپنے مسلمان بھائی سے لڑنا کفر ہے اور یہ کفر کفر عملی کے معنی میں ہے نہ کہ کفر اعتقادی کے۔

اس کے بعد جب ہم "جماعتِ تکفیر" کی طرف اور ان کے اس اطلاق کی طرف جسے وہ مسلمان حکام اور ان کے پرچم کے نیچے زندگی گزارنے والوں بالخصوص ان کے زیر سایہ رہنے والوں اور ان کی ماتحتی میں کام کرنے والوں پر روا رکھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ چونکہ یہ لوگ معاصی کے مرتکب ہیں اس لئے کافر ہیں۔

"جماعتِ تکفیر و ہجرت" کے تعلق سے کچھ باتیں

منجملہ ان امور کے جن کا ذکر سائل نے ابھی ہم سے کیا ہے ہم نے کچھ لوگوں سے جو

جماعتِ تکفیر سے وابستہ تھے پھر اللہ نے انہیں ہدایت کی توفیق دی، کچھ باتیں سنیں۔ ہم نے ان سے کہا فرض کیجئے آپ نے بعض حکام کو کافر کہہ دیا، لیکن یہ بتایئے کہ حکام کے علاوہ دیگر لوگوں مثلاً مساجد کے ائمہ و خطباء اور مؤذنین وغیرہ کو آپ کافر کیوں کہتے ہیں؟ اسی طرح دینی مدارس میں پڑھانے والے اساتذہ کی کیوں تکفیر کرتے ہیں؟ تو وہ کہنے لگے کہ ان لوگوں کو کافر اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ان حکام کے فیصلوں کو مان لیتے ہیں جو "غیر ما انزل اللّٰہ" سے فیصلے کرتے ہیں۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ کفر عملی کفر اعتقادی میں اس وقت بدلتا ہے جب یہ رضائے قلبی ہو۔ اب آپ بتایئے کہ کون سا حاکم ایسا ہے جو "ما انزل اللّٰہ" کے علاوہ سے فیصلہ کرتا ہو اور وہ یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اس کا فیصلہ ہی فی زمانہ قابل قبول ہے اور کتاب و سُنّت میں وارد منصوص حکم شرعی ماننے کے لائق نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو اس کا یہ کفر کفرِ اعتقادی ہے، کفرِ عملی نہیں۔ لیکن اولاً آپ تمام حکام یا بیشتر حکام پر جو مغربی آئین و قوانین کی رو سے فیصلے کرتے ہوں یہ حکم نہیں لگا سکتے کہ اگر ان سے پوچھا جائے تو وہ لازماً جواب میں یہی کہیں گے کہ ان کا فیصلہ ہی حق و انصاف اور اس عہد کے تقاضوں کے مطابق ہے اور اسلامی قوانین کی رُو سے کیا گیا فیصلہ درست نہیں۔

اگر وہ یہ پوچھے جائیں تو آپ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا جواب یہی ہو گا کہ اس عہد میں "مَا اَنْزَلَ اللّٰہ" سے فیصلہ درست نہیں۔ اگر انہوں نے ایسا کہا تو بلاشبہ وہ کافر ہیں۔ پھر جب آپ رعایا اور محکومین کی سطح پر اتر کر غور کریں تو ان میں آپ کو علماء اور صلحاء بھی نظر آئیں گے۔ پھر محض اس وجہ سے کہ وہ ایک ایسی حکومت کے زیر سایہ زندگی گزار رہے ہیں جس کی ماتحتی میں انہی کی طرح آپ بھی ہیں، آپ ان کی تکفیر کیونکر کر سکتے ہیں اور انہیں کیسے بر سرعام کافر کہہ سکتے ہیں اور وہ بھی مرتد کے معنی میں۔ یہ صحیح ہے کہ "مَا اَنْزَلَ اللّٰہ" ہی سے فیصلہ کرنا واجب ہے، لیکن محض عمل سے حکم شرعی کی مخالفت اس بات کو مستلزم نہیں کہ اس کے کرنے والے پر مرتد ہونے کا حکم داغ دیا جائے۔

منجملہ ان مناقشات کے جن سے ان کی غلطی اور گمراہی واضح ہو جاتی ہے ہم نے ان سے کہا کہ آپ اس مسلمان پر جو "لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ" کی گواہی دیتا

ہو اور کبھی کبھی خواہ کم یا زیادہ نماز پڑھ لیتا ہو' ارتداد کا حکم کب لگائیں گے؟ کیا اس کے لئے ایک دفعہ "غیر ما انزل اللّٰہ" سے فیصلہ کر لینا کافی ہو جائے گا یا یہ ضروری ہو گا کہ وہ اپنی زبانِ قال یا حال سے اس کا اعلان کرے کہ وہ دین سے مرتد ہو گیا ہے' تو ان سے اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ پھر میں مجبور ہوا کہ انہیں ایک مثال سے سمجھاؤں۔ میں نے کہا فرض کیجئے کہ ایک حاکم جس کی عام عادت یہ ہو کہ وہ از روئے شرع ہی فیصلہ کرتا ہو لیکن ایک بار اس کا قدم پھسل جاتا ہے اور وہ ایک مسئلہ میں خلافِ شرع فیصلہ دے دیتا ہے یعنی حق ظالم کو دے دیتا ہے اور مظلوم محروم رہ جاتا ہے' کیا یہ "غیر ما انزل اللّٰہ" سے فیصلہ ہے یا نہیں؟ آپ یقیناً یہی کہیں گے کہ ہاں ہے۔ اب آپ یہ بتایئے کہ کیا آپ اس قاضی کے متعلق یہ کہیں گے کہ وہ کافر اور مرتد ہو گیا؟ انہوں نے کہا نہیں' ہم اس پر کافر و مرتد ہونے کا حکم نہیں لگا سکتے۔ اس پر ہم نے ان سے پوچھا کیوں نہیں؟ تو انہوں نے کہا' کیونکہ اس سے صرف ایک ہی بار ایسا ہوا ہے۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے' فرض کیجئے پھر وہ دوبارہ یہی یا اس طرح کا کوئی فیصلہ خلاف شرع کر دیتا ہے' کیا وہ کافر ہو جائے گا؟ اور میں لگا اسے دہرانے کہ اس نے تیسری اور چوتھی دفعہ بھی اسی طرح خلاف شرع فیصلہ دیا تو آپ اسے کب کافر کہیں گے؟ ظاہر ہے کہ آپ اس کے خلاف شرع فیصلوں کی تعداد کی کوئی حد متعین نہیں کر سکتے۔ اس کے برخلاف اگر آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص "غیر ما انزل اللّٰہ" سے فیصلہ کرنے کو مستحسن سمجھتا ہے اور فیصلۂ شرعی کو قبیح گردانتا ہے تو بلا جھجک آپ اس پر ارتداد کا حکم لگا سکتے ہیں۔

اس کے برعکس آپ اسے دسیوں خلافِ شرع فیصلے کرتے دیکھتے ہیں لیکن جب آپ اس سے پوچھتے ہیں کہ تم "غیر ما انزل اللّٰہ" سے کیوں فیصلے دیتے ہو تو اس کا جواب یہ ہوتا ہے کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ محسوس ہوتا ہے یا میں نے اس سے رشوت لے لی ہے (اور یہ پہلے سے بھی زیادہ ہے) تو آپ اس کی تکفیر نہیں کر سکتے جب تک وہ یہ ظاہر نہ کر دے کہ وہ "ما انزل اللّٰہ" سے فیصلہ کرنے کو درست نہیں سمجھتا۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ کفر' فسق اور ظلم' ان تینوں کی دو دو قسمیں ہیں' ایک کفر' فسق اور ظلم وہ ہے جس کے ارتکاب سے انسان دائرۂ اسلام سے نکل جاتا ہے' جس کے معنی یہ

ہوتے ہیں کہ وہ اس کام کو دل سے حلال جانتا ہے۔ دوسری قسم اس کے برعکس ہے، جس کے معنی قلبی استحلال کے بجائے عملی استحلال کے ہوتے ہیں۔

عُصاۃ کی تکفیر جائز نہیں

عُصاۃ بالخصوص عملی استحلال کے قبیل کی برائیوں مثلاً سود، زنا، شُربِ خمر وغیرہ جو اس دَور میں عام ہیں، کے مرتکبین کو محض ان برائیوں کے ارتکاب اور عملی استحلال کی وجہ سے کافر کہنا جائز نہیں۔ الا یہ کہ ان کی طرف سے یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ اسے حلال سمجھتے ہیں اور جن چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے انہیں حرام نہیں مانتے۔ اگر ان کی اس قلبی مخالفت کا پتہ چل جائے تو بلا دریغ ان پر ارتداد اور اسلام سے خروج کا حکم لگایا جا سکتا ہے، لیکن اگر یہ معلوم نہ ہو سکے تو ان کی تکفیر قطعاً درست نہیں، کیونکہ خطرہ ہے کہ ہم خود نبی ﷺ کے فرمان :

اِذَا قَالَ الرَّجلُ لاخیہِ یَا کافر فقد باءَ بِھَا احَدُھُمَا

(جب آدمی اپنے بھائی کو "اے کافر!" کہتا ہے تو یہ ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف ضرور پلٹتا ہے۔)

کی وعید میں داخل نہ ہو جائیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث ہیں جو اس معنی میں وارد ہیں۔ اس تعلق سے ہم یہاں اس صحابی کا واقعہ ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو ایک مشرک شخص سے مصروفِ قتال تھے، جب اس مشرک نے دیکھا کہ وہ مسلمان صحابی کی تلوار کی زد میں آ گیا ہے تو اس نے لا الٰہ الا اللہ پڑھ دیا، لیکن صحابی نے اس کے کلمہ پڑھنے کی پرواہ نہیں کی اور اسے قتل کر دیا۔ جب نبی ﷺ کو اس واقعہ کی خبر ملی تو آپ نے اس پر اپنی شدید ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ دیکھ کر اس صحابی نے یہ عذر پیش کیا کہ اس نے قتل کے ڈر سے یہ کہا تھا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا : ھَلَّا شَقَقْتَ عَنْ قَلْبِہٖ ؟ (تم نے کیوں اس کا دل پھاڑ کر نہیں دیکھ لیا؟) آپ نے یہ جملہ اس لئے فرمایا کیونکہ کفر اعتقادی کا عمل سے کوئی علاقہ و رشتہ نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق صرف دل سے ہوتا ہے اور ہم فاسق اور فاجر، زانی اور سارق اور سود خور کے دل کی بات نہیں جان سکتے، اِلّا یہ کہ وہ زبان سے اس کا

اظہار کر دے۔ رہا اس کا عمل تو اس سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنے عمل سے شریعت کی مخالفت کی ہے۔ اس پر ہم اس سے یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ تم نے شریعت کی مخالفت کی ہے اور فسق و معصیت کا کام کیا ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ تُو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا، جب تک اس سے کوئی ایسی چیز ظاہر نہ ہو جائے جو اللہ کے نزدیک اس پر ارتداد کا حکم لگانے کے لئے عذر بن سکے۔ اسی وجہ سے اسلام میں ظاہر و معروف ہی پر حکم لگتا ہے، جیسے آپ کا ارشاد "مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ" ہے۔

حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا نبوی منہاج

اس کے ساتھ ان لوگوں سے جو مسلمان حکام کی تکفیر کرتے ہیں، میں برابر یہ کہتا رہا ہوں کہ فرض کیجئے یہ حکام کافر اور مرتد ہیں تو آپ اس کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟ کیا آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ کفار بلادِ اسلام پر قبضہ کئے ہوئے ہیں اور ہم فلسطین پر یہود کے غاصبانہ قبضے کے صدمہ سے برابر تڑپ رہے ہیں، لیکن ہم اور آپ ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ پھر آپ ان حکام کا جنہیں آپ کافر کہتے ہیں کیا بگاڑ لیں گے؟ آپ ان باتوں کو نظر انداز کر کے وہ بنیادی کام کیوں نہیں شروع کرتے جس پر اسلامی حکومت کی بناء رکھی جا سکے؟ اور وہ کام رسول اللہ ﷺ کی سنت کی اتباع ہے جس پر آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مقدس جماعت کی تربیت کی تھی اور جس کے اصول و اساس پر انہیں پروان چڑھایا تھا۔ اس قسم کے مناسبات پر میں بار بار اس بات کا اظہار کرتا ہوں کہ مسلمان تنظیموں اور جماعتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف ارض اسلام ہی پر نہیں بلکہ روئے زمین پر اسلامی حکومت کی بحالی کے لئے صدق دل سے کام کریں تاکہ اللہ کا فرمان: ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾ (الصف : ۹) عملی طور پر صادق آسکے اور مسلمان اس نصِ قرآنی میں کئے گئے وعدہ کو اپنے عمل سے سچ کر دکھائیں کیونکہ بعض صحیح احادیث میں وارد ہے کہ اس آیت میں دین کے جس غلبہ کا ذکر ہے اس کا اتمام بعد میں ہو گا۔ کیا اس کا راستہ ان حکام کے خلاف ہے جنہیں یہ کافر و مرتد کہتے ہیں۔ صرف بغاوت کا اعلان رہ گیا

ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک غلط خیال ہے اور اپنے اس غلط خیال کے ساتھ وہ غلبہ اسلام کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ پھر آخر اس کا صحیح راستہ کیا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا راستہ وہی ہے جس کا اظہار رسول اللہ ﷺ اپنے خطبہ میں بار بار اپنے اصحاب سے کرتے تھے ۔ وَخَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّم "اور بہترین راستہ محمد ﷺ کا راستہ ہے۔"

لہٰذا جملہ مسلمانوں بالخصوص ان تمام لوگوں پر جو اپنی توجہ اسلامی حکومت کی بحالی پر مرکوز رکھتے ہیں لازم ہے کہ اس کام کا آغاز وہیں سے کریں جہاں سے رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا اور وہ دو چیزیں ہیں جنہیں ہم "تصفیہ" اور "تربیت" کا ہلکا پھلکا نام دے سکتے ہیں۔ اور یہ اس وجہ سے کہ ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں جس سے غلو پسند' جن کا کام سوائے حکام کی تکفیر کے کچھ اور نہیں' یا تو غافل ہیں یا جان بوجھ کر اس سے غفلت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ تو اپنی اس حرکت سے باز نہیں آسکتے اور حکام کے خلاف کفر کے فتوے برابر داغتے رہیں گے' جس سے بدامنی اور شورش کے ان واقعات کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہو گا جو ادھر چند سالوں سے پیش آ رہے ہیں اور جن کی ابتداء حرم کے حادثہ سے ہوئی تھی اور جس کا سلسلہ فتنۂ مصر' انور سادات کے قتل اور بہت سے بے قصور مسلمانوں کی جانوں کے ضیاع تک وسیع ہے اور اس کے بعد شام اور افسوس اب پھر مصر اور الجزائر میں یہی واقعات برابر دہرائے جا رہے ہیں۔ ان سب چیزوں کی اصل وجہ دراصل کتاب و سنت کے بہت سے نصوص کی مخالفت ہے جن میں سب سے اہم اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ·

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيرًا ۝﴾

(الاحزاب · ۲۱)

اگر ہم زمین پر حکومتِ الٰہیہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو کیا اس کی ابتداء ہم حکام سے قتال کے ذریعے کریں گے یا ہم اس کی شروعات وہاں سے کریں گے جہاں سے رسول اللہ ﷺ نے اس کی شروعات کی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا جواب یہی ہے کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ اب یہاں سوال یہ ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے کس چیز سے ابتداء کی تھی۔

آپ بخوبی اس بات سے واقف ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کی ابتداء ان افراد کے درمیان کی تھی جن کے متعلق آپ ﷺ یہ سمجھتے تھے کہ ان میں قبولِ حق کی استعداد موجود ہے۔ پھر آپ ﷺ کی دعوت کو جنہوں نے قبول کیا' جیساکہ سیرتِ نبوی سے جو لوگ واقف ہیں انہیں معلوم ہے' اور پھر اس کے بعد مکہ کے مسلمانوں پر ایذا رسانی اور دار و گیر کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا اور پھر ہجرتِ اولیٰ اور پھر ہجرتِ ثانیہ کا حکم ملا اور ایذا رسانی کا یہ سلسلہ جاری رہا' تا آنکہ مدینہ منورہ میں اللہ نے مسلمانوں کو استحکام و استقرار بخشا' پھر دشمنانِ اسلام سے جھڑپوں کی ابتداء ہوئی اور اس کے بعد ایک طرف مسلمانوں اور کافروں میں اور دوسری طرف مسلمانوں اور یہودیوں میں معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ اس طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم بھی اس کی ابتداء اسلام کو لوگوں میں عام کرنے سے کریں جیساکہ رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا' لیکن ہمارے لئے اسلام کی نشر و اشاعت ہی پر اکتفا کر لینا کافی نہ ہو گا کیونکہ اسلام میں بہت سے ایسے اجنبی عناصر کی آمیزش ہو گئی ہے جن کا اسلام سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یہ باہر سے آکر اس میں دخیل ہو گئے ہیں جو اسلام کی شاندار عمارت کے انہدام کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے اسلام کے داعیوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسلام کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ اسلام کو ان اجنبی عناصر سے پاک و صاف کرنے کے عمل کا بھی آغاز کریں۔

تصفیہ و تطہیر کے اس عمل کے ساتھ ساتھ دوسری چیز جو اہم ہے وہ خالص اسلام کے نام سے جو جماعتیں اور تنظیمیں وجود میں آئی ہیں جب ہم ان کے کاموں کا جائزہ لیتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان جماعتوں نے اس پہلو سے کوئی خاص استفادہ نہیں کیا ہے' سوائے یہ چیخنے چلانے کے کہ وہ اسلامی حکومت کا قیام چاہتی ہیں۔ اپنی اسی دلیل سے انہوں نے بہت سے معصوموں کے خون سے ہولیاں کھیلیں۔ ان کے کتاب و سنّت سے متصادم عقائد و نظریات کی گونج برابر ہمارے کانوں میں سنائی دیتی رہی ہے۔

یہاں اس کی مناسبت سے ہم ایک داعیٔ اسلام کی بات کر رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ

(باقی صفحہ ۵۷ پر ملاحظہ کیجئے)

کتابیات

نفاق کی نشانیاں(۶)

تالیف : فضیلۃالشیخ الاستاذ عائض عبداللہ القرنی

ترجمہ و حواشی : ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

پچیسویں نشانی

اللہ اور رسولؐ کے وعدے کو جھٹلانا

اللہ تعالیٰ منافقوں کے الفاظ دہراتے ہیں کہ وہ لوگ کہتے ہیں :

﴿مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا﴾ (الاحزاب : ۱۲)

"اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے ہم سے کئے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے"

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ غزوۂ احزاب کے موقع پر حضور اکرم ﷺ صحابہ کے ہمراہ خندق کی کھدائی میں شریک تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین خندق کھود رہے تھے کہ حضور اکرم ﷺ کو ایک پتھر دکھایا گیا۔ آپ ﷺ بذات خود کدال لے کر اسے توڑنے لگے۔ آپ نے ایک چوٹ لگائی تو اس سے چنگاری نکلی۔ آپ نے دوسری چوٹ لگائی تو اس سے دوسری چنگاری نکلی۔ آپ نے فرمایا : مجھے دو خزانے دکھائے گئے ہیں' ایک سرخ دوسرا سفید' اور یہ دونوں خزانے میری امت کو ملیں گے۔ خندق کے اردگرد موجود منافقوں نے آنکھوں کے اشاروں سے ایک دوسرے کو پیغام دیا کہ دیکھو ہمیں کسریٰ و قیصر کے خزانوں کی امید دلا رہے ہیں اور ادھر حال یہ ہے کہ ہم ڈر کے مارے پیشاب کے لئے نہیں نکل سکتے۔ اللہ تعالیٰ ان منافقوں کی گفتگو نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں :

﴿وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا﴾ (الاحزاب : ۱۲)

"یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا' صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے ہم سے کئے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔"

منافقوں کی بد ظنی کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے قیصر و کسریٰ کی فتح کا وعدہ پورا کر دکھایا اور امّتِ اسلام کی مدد فرمائی۔ بالآخر رسول اللہ ﷺ نے مشرق و مغرب میں فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ وَلِلّٰہِ الحَمدُ وَالمِنَّة!!

چھبیسویں نشانی

ظاہری جسم کا خوب اہتمام اور باطن کے متعلق لاپرواہی کرنا

ایسے ہی لوگوں کے بارے میں شاعر نے کیا خوب کہا ہے :

"مردانِ قوم کے جسم تو خوب لمبے چوڑے ہیں۔ جسم اگرچہ خچروں جیسے ہیں لیکن سوچ چڑیوں جیسی ہے۔"

ان کا ظاہری رکھ رکھاؤ بہت خوبصورت ہوتا ہے' لیکن اندرونی حالت تباہ حال' برباد اور بگڑی ہوئی ہوتی ہے۔ ہم اس بات کی دعوت بھی نہیں دیتے کہ انسان بالکل مست قلندر ہو جائے' اسلام کا اس طرح کی قلندری سے کوئی واسطہ نہیں' بلکہ خوبصورت کپڑے پہنے' عطر لگائے اور جو بہتر سے بہتر اللہ کی دی ہوئی نعمت میسر ہو اس سے فائدہ اٹھائے۔ اللہ خود خوبصورت ہے اور خوبصورتی پسند فرماتا ہے' اپنے بندے پر نعمت و احسان کے اثرات دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بندے کا یہ بھی فرض ہے کہ ذکر' مراقبہ' اخلاص' توکّل' عبادت اور اللہ کے ساتھ سچے معاملے کے ذریعے اپنے باطن کو بھی خوبصورت بنائے تاکہ ظاہری خوبصورتی کے ساتھ باطن کی طہارت و پاکیزگی بھی جمع ہو

جائے، پھر تو نورٌ علیٰ نور ہو جائے گا۔

ہاں البتہ جو لوگ باطن کو بھول کر صرف ظاہر پر توجہ دیتے ہیں، نماز، مراقبہ اور ذکر کے قریب تک نہیں جاتے، یہ لوگ واقعتاً اللہ سے دور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہی لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے :

﴿ وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ ۖ وَإِنْ يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۖ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُسَنَّدَةٌ ۞ ﴾ (المنافقون : ۴)

"انہیں دیکھو تو ان کے جثے تمہیں بڑے شاندار نظر آئیں گے، بولیں تو تم ان کی باتیں سنتے رہ جاؤ، مگر اصل میں یہ گویا لکڑی کے کندے ہیں جو دیوار کے ساتھ چن کر رکھ دیئے گئے ہیں۔"

چنانچہ یہ آیت ظاہر کر رہی ہے کہ ظاہری بود و باش کے معاملے میں ان کا اہتمام خوب ہے اور اسی طرح گفتگو کرنے اور باتیں بنانے میں ان کا جواب نہیں، البتہ ہیں وہ چنی ہوئی لکڑیوں کی طرح بے حرکت و بے فائدہ۔

ابو الفتح البستی شاعر کہتا ہے :

"اے جسم کے خادم، تو اس جسم کی راحت و سکون کے لئے کس قدر محنت کرتا ہے اور جس کام میں خسارہ ہی خسارہ ہے اس میں اپنے جسم کو تھکا مارتا ہے۔ روح پر توجہ دو اور اس کے فضل و کمال کو مکمل کرنے کی کوشش کرو۔ انسان اس جسم کی وجہ سے نہیں بلکہ روح کی وجہ سے انسان کہلاتا ہے۔"

ستائیسویں نشانی

چرب زبانی اور متکبرانہ گفتگو

منافقوں کی عادت ہے کہ تکبر، ذاتی بڑائی اور گھمنڈ کی خاطر فصیحانہ تیز طرار اور آپے سے بڑی باتیں بناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرماتے ہیں :

﴿ وَإِنْ يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ﴾ (المنافقون : ۴)

"وہ (منافق لوگ) اگر بولیں تو تم ان کی باتیں سنتے رہ جاؤ"۔

حضور اکرم ﷺ نے چرب زبان اور تیز طرار باتیں بنانے والے کی مذمت کی ہے۔ یعنی جو آدمی تکبر' ذاتی بڑائی اور لوگوں میں نمایاں نظر آنے کے لئے اس طرح باتیں کرے کہ نہ صرف حروف کو تکلف کے ساتھ مخارج سے ادا کرے' بلکہ انہیں غیر ضروری طور پر کھینچے بھی' اور بآوازِ بلند بات کرے' اور محفل میں زبردستی کی فصیحانہ گفتگو کرے ---اور پُر تکلف باتیں بنائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ "ہمیں پر تکلف باتوں سے منع کیا گیا ہے"۔ بے جا تکلف نفاق کی علامت ہے۔ ہمیں اس سے بچ کر رہنا چاہئے۔

"جھجک اور حیا ایمان کے دو جزو ہیں اور اس کے بالمقابل فحش گوئی اور بے لحاظ بات کر دینا نفاق کے دو جزو ہیں"۔ اس کا معنی یہ ہے کہ حقیقت کو تبدیل کرنے کے لئے وہ منافق فصاحت و بلاغت کا سارا زور لگا دیتا ہے اور ایسے ایسے فارمولے اور مسلّمات بیان کرتا ہے گویا کہ اس کی بات بہت وزنی ہے اور وہ خود بہت سمجھ دار اور عقلمند ہے اور وہ نہایت مہذّب اور تربیت یافتہ بھی ہے' حالانکہ اس کے پاس ایسی کوئی بھی خوبی نہیں ہوتی۔ یہ بھی نفاق کے اجزاء میں سے ایک جزو ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے :

اٹھائیسویں نشانی

دین کی سمجھ بوجھ سے محرومی

منافقوں کا امتیازی نشان یہ ہے کہ وہ دین کی سمجھ بوجھ سے محروم ہوتے ہیں۔ وہ گاڑی چلانا جانتے ہیں' وہ اچھے مکینک بھی ہوتے ہیں' ساری دنیا اور اس کے اہم مراکز کی بھی انہیں خبر ہوتی ہے اور ایسی ایسی معلومات جمع کرتے ہیں جن کا اگر انہیں نقصان نہ ہو تو کوئی فائدہ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن اگر تم ان سے دین کے بنیادی اصول پوچھ بیٹھو تو انہیں قطعاً خبر نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝﴾ (المنافقون : ۷)

"اور لیکن منافقوں کو کسی بات کی سمجھ نہیں ہے"۔

اور حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا : "جس شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ بھلائی کا فیصلہ کر لے اسے دین کی سمجھ بوجھ عطا کر دیتا ہے" [۱]۔ اہل علم کہتے ہیں کہ حدیث کا مفہومِ مخالف یہ ہے کہ جس شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی کا فیصلہ نہ ہو اسے تفقہ فی الدین سے محروم کر دیتے ہیں۔

مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتا ہے اور مسلسل ان معلومات میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ ہمیشہ علم اور مجالسِ علم تک محنت سے پہنچتا ہے۔ البتہ منافق پوری طرح علم سے بے نیاز رہتا ہے۔ جب لوگ کسی محفل میں نماز یا عبادت کی بات کریں تو اس کا رویہ اس قدر بیگانہ ہوتا ہے گویا کہ وہ لوگ کسی اور زبان میں بات کر رہے ہیں۔ لیکن جب دنیوی معاملات زیرِ بحث ہوں، مثلاً مختلف جنسوں کے دام، بانڈز، ٹریولرز چیک، جاپانی ین یا ڈالر کا ریٹ تو پھر اس کی معلومات کے خزانے کا منہ کھل جاتا ہے۔ میرا کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ مومن کو ان چیزوں کا پتہ نہیں ہونا چاہئے۔ نہیں، بلکہ ان کی خبر ہونی چاہئے اور ان سے کہیں زیادہ دینی مسائل معلوم ہونے چاہئیں۔ ہاں البتہ جو آدمی ان دنیاوی معاملات کو تو خوب جانتا ہو اور دین کے معاملے میں بالکل کورا ہو تو یہ نفاق کی علامت قرار پاتی ہے۔ وَالعیاذُ باللّٰہ

انتیسویں نشانی

تنہائی میں بے دھڑک گناہ کرنا

مومن اور منافق کی پہچان کے سلسلے میں یہ نشانی سب سے اہم ہے، کیونکہ منافق کا حال یہ ہوتا ہے کہ برے کاموں میں اللہ کے دیکھنے کی اسے قطعاً پروا نہیں ہوتی۔ البتہ جب

{۱} صحیح البخاری، کتاب العلم، باب من یرد اللہ بہ خیرا ...
صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب النھی عن المسالۃ

لوگوں کے سامنے آتا ہے تو پارسائی اور نیکی کا جعلی چہرہ سجا لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ﴾ (النساء : ۱۰۸)

"یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات چھپا سکتے ' ہیں مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے ' وہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب یہ راتوں کو چھپ کر اس کی مرضی کے خلاف مشورے کرتے ہیں"۔

اس کے برعکس مومن تنہائی اور محفل ہر حال میں اللہ سے ڈرتا ہے ' بلکہ خلوت میں تو وہ اور زیادہ اللہ سے ڈرتا ہے۔ شاعر نے خوب کہا ہے :

"جب تنہائی اور اندھیرے میں کوئی غلط کام ممکن ہو اور دل بھی گناہ کی دعوت دے رہا ہو ' تو اللہ کی نگاہ اور نظر کا ہی خیال کر لو اور دل کو یہ بات سمجھا دو کہ جس نے اندھیرے کو پیدا کیا ہے وہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔"

تو اے میرے بھائی! اس مذموم عادت سے بچ کر رہو۔

تیسویں نشانی

اہلِ ایمان کی مشکل پر خوش ہونا اور ان کی خوشی سے تکلیف محسوس کرنا

اللہ تعالیٰ نے منافقوں کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

﴿إِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَإِنْ تُصِبْكَ مُصِيبَةٌ يَقُولُوا قَدْ أَخَذْنَا أَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ﴾ (التوبہ : ۵۰)

"تمہارا بھلا ہوتا ہے تو انہیں رنج ہوتا ہے۔ اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ اچھا ہوا ہم نے پہلے ہی اپنا معاملہ ٹھیک کر لیا تھا۔"

جب کسی نیک اور مومن پر مشکل آ جائے تو منافق اس خبر کو پھیلاتا بھی پھرے گا اور ظاہر یہ کرے گا کہ اسے اس حادثے سے بہت تکلیف پہنچی ہے اور کہے گا کہ بس اللہ ہی مدد کرے کہ فلاں پر اس اس طرح مشکل پڑ گئی ہے ' اللہ تعالیٰ ہمیں اور اس کو صبر دے۔

حالانکہ اندر سے اس کا دل خوشی سے پھول رہا ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں کو خوشی نصیب ہو تو سخت غصے اور جھنجلاہٹ میں ہو گا اور اس خوشی کے موقع پر اس کا دل تنگ ہو رہا ہو گا۔ دلوں کے رازوں کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اور صرف وہی اس بات پر قادر ہے۔

خاتمہ

ہم اپنے لئے اور آپ سب کے لئے اللہ تعالیٰ سے اس نقصان دہ مرض سے تحفظ اور بچاؤ کی درخواست کرتے ہیں۔ یہ مرض معاشرے میں بری طرح سرایت کر چکا ہے۔ نتیجتاً زمینی پیداوار اور نسلِ انسانی تباہ ہو کر رہ گئی ہے۔

اے میرے دینی بھائیو! ہم سب کا فرض ہے کہ ہم اپنے آپ کو منافقوں والی نشانیوں سے بچانے کی از حد کوشش کریں۔

اور ----- بالآخر دنیا اور آخرت کی کامیابیوں سے ہمکنار ہو جائیں۔ وَصَلَّی اللّٰہ وَبَارَکَ عَلٰی نبینا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلہ وَصَحْبِہٖ اجمَعین۔

بقیہ : کفر و گمراہی اور صراط مستقیم

ان کے متبعین اس کا التزام کریں اور اسے عملی جامہ پہنائیں۔ وہ فرماتے ہیں ۔ اَقِیمُوا دولۃ الاسلام فی قلوبکم تقم لکم علٰی ارضکم "تم اپنے دلوں پر اسلام کی حکمرانی قائم کرو، اسلام تمہاری زمینوں پر خود بخود قائم ہو جائے گا"۔

یہ حقیقت ہے کہ مسلمان جب کتاب و سنت پر مبنی اپنے عقائد صحیح و درست کر لیں گے تو ان کے عبادات اور اخلاق و سلوک بھی صحیح و درست ہو جائیں گے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس حکیمانہ بات کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں۔ حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے صرف چیخنا چلانا رہ گیا ہے۔ شاعر نے ایسے ہی لوگوں کے متعلق کہا ہے :

ترجو النجاۃَ ولم تسلک مسالکھا
انّ السفینۃ لا تجری علی الیَبَسِ

"تم نجات کی امید رکھتے ہو اور اس کے راستوں پر چلتے نہیں۔ یاد رکھو کشتی خشکی پر نہیں چلتی"۔

خطوط و نکات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

MADARSSAH MAHDUL ISLAM
TABLEEGHEE MARKAZ SINDH

مدرسہ مہد الاسلام
تبليغي مركز سنڌ

MAKKI MASJID SHAH BAHAUDDIN LIBRARY ISLAMIC EDUCATIONAL INSTITUTE PREACHING CENTRE

FOUNDER & MANAGING DIRECTOR DR. HUSSAIN BUX MEMON

Letter No MMTMS 4291 96 DS
RPT No M-PK-B-THT-001

Date: 10-08-96

To,

Honourable,
The Editor Sahib,
Monthly Meesaq, Lahore
Assalam-o-Alaikum.

Thanking you very much for Meesaq, August 1996 The address of Dr. Israr Ahmad Sahib, published in the magazine on the history of Pakistani politics and the role of Islamic Tehreeks and the solution for the situation is really impressive and admirable

Your these services to educate the Muslims of Pakistan for the future challenges and the Islamic Journalism is really appreciable.

We again thanks to the continuous issuance of monthly "Meesaq" for our Institution, where a large number of readers are waiting for their liked magazine.

Thanking you.

Yours Sincerely,
Dr. Allah Dino Memon
Secretary General

P.O. GARHO DISTRICT THATTA, SINDH PAKISTAN TELEPHONE # 16 (GARHO) FAX # 92-221-20205

صحیح نظامِ تعلیم اور پاکستان

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

تعلیم صحیح بھی ہوتی ہے اور غلط بھی۔ صحیح تعلیم صحیح قسم کا فرد پیدا کرتی ہے اور غلط تعلیم غلط قسم کا فرد، اور تعلیم کا مقصد اس کو صحیح یا غلط کرتا ہے۔ فرض کیا ایک ڈاکو چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا ایک کامیاب اور ہوشیار ڈاکو بن جائے۔ اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ اپنے بیٹے کو قفل اور سیف توڑنے اور پگھلانے، بندوق چلانے، وقت پر بھاگنے اور چھپنے اور پولیس کی گرفت سے محفوظ رہنے اور نکل آنے کی پوری پوری نظری اور عملی تعلیم دے۔ جب وہ ان طور طریقوں کا ماہر ہو جائے گا تو وہ اپنے باپ کے نزدیک تعلیم یافتہ کہلانے کا حقدار ہو گا۔ لیکن ہمارے خیال کے مطابق اس کی تعلیم صحیح نہیں ہو گی بلکہ غلط ہو گی۔ وہ ایجوکیشن (Education) نہیں بلکہ مِس ایجوکیشن (Miseducation) ہو گی، کیونکہ ہمارے نزدیک اس کی تعلیم کا مقصد غلط ہے۔

کوئی نظام تعلیم مقصد کے بغیر نہیں ہوتا، خواہ اس کا مقصد آشکار ہو یا مخفی، مذکور ہو یا غیر مذکور، شعور میں ہو یا لاشعور میں، موضوعِ کلام بن چکا ہو یا معہودِ ذہنی رکھا گیا ہو۔ اور یہ مقصدِ تعلیم وہی ہوتا ہے جو نظام تعلیم قائم کرنے والے کے نزدیک خود زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔ زندگی کا جو مقصد بھی معلم کے ذہن میں ہوتا ہے، خواہ وہ اس کا ذکر کرے یا نہ کرے، وہ اس کے برپا کئے ہوئے نظام تعلیم کے ہر جزو پر حاوی ہو جاتا ہے، خواہ وہ جزو نصابی کتاب ہو یا معلم کا لیکچر یا درس یا مکتب کا عام ماحول۔ جس طرح کوئی نقش اس کاغذ یا کپڑے سے الگ نہیں ہو سکتا جس پر وہ بنایا گیا ہو اسی طرح کوئی نظام تعلیم اس مقصدِ حیات سے الگ نہیں ہو سکتا جس پر وہ قائم ہو، خواہ اس مقصدِ حیات کا ذکر نظام تعلیم کے اندر موجود ہو یا نہ ہو۔

چونکہ حضرت انسان نے مقصدِ زندگی کے مختلف نظریات قائم کئے ہوئے ہیں' لہٰذا اس کے نظام ہائے تعلیم بھی مختلف ہیں۔ دنیا میں اتنے ہی نظام ہائے تعلیم ہیں جتنے مقاصدِ حیات یا نظریاتِ زندگی۔ ہر ریاست کسی نظریہ زندگی پر قائم ہوتی ہے' لہٰذا ہر ریاست کا اپنا الگ نظام تعلیم ہوتا ہے جس کا مقصد وہی ہوتا ہے جو ریاست کا مقصد زندگی ہو۔ حکمائے تعلیم نے اس حقیقت کا اعتراف حال ہی میں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب فلسفہ تعلیم کا ایک نیا شعبہ وجود میں آیا ہے' جس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے مختلف نظام ہائے تعلیم کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اور ہر ایک کی خصوصیتیں معلوم کی جائیں۔ اس شعبۂ علم کو تقابلی تعلیم (Comparative Education) کا نام دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ تعلیم کا ہر مقصد جو انسان کے ذہن میں آئے صحیح نہیں ہو سکتا۔ صحیح مقصدِ تعلیم جو صحیح نظام تعلیم کو پیدا کرنے والا ہو' صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اور ضروری ہے کہ اس ایک مقصدِ تعلیم اور نظامِ تعلیم کے علاوہ باقی تمام مقاصدِ تعلیم اور نظام ہائے تعلیم کم و بیش غلط اور بے ہودہ اور بے کار ہوں۔ جس نسبت سے کسی نظام تعلیم کا مقصد صحیح مقصدِ تعلیم سے ہٹا ہوا ہوگا اسی نسبت سے وہ نظام تعلیم غلط تعلیم یا مس ایجوکیشن (Miseducation) کا باعث ہوگا اور غلط قسم کے افراد پیدا کرے گا۔ اگر اس کا مقصد مکمل طور پر صحیح ہوگا تو وہ نظام تعلیم مکمل طور پر صحیح ہوگا اور صحیح قسم کے افراد پیدا کرے گا۔ افسوس ہے کہ مغرب کے حکمائے تعلیم مختلف قسم کے نظام ہائے تعلیم کے مقاصد اور ان کی خصوصیات کا جائزہ لینے کے باوجود اس بات پر کوئی تحقیقی کام نہیں کر سکے کہ صحیح مقصد تعلیم' جو صحیح قسم کے نظام تعلیم کو پیدا کرتا ہو' کیا ہے۔ اور کس طرح سے جانچا یا پرکھا جا سکتا ہے کہ واقعی صحیح ہے اور اس کا علمی اور عقلی محک و معیار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تحقیقی کام ایسے حقائق کو سامنے لاتا ہے جو ان کے لادینی نقطہ نظر کے منافی ہیں اور جن کا سامنا کرنے سے ان کو اس لئے بھی گریز ہے کہ وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ تحقیق کرنے والے کا خود اپنا قومی نظام تعلیم غلط مقصدِ تعلیم اور غلط مقصدِ حیات پر مبنی ہے اور لہٰذا غلط ہے۔ یہ بات کہنے کے بعد تحقیق کرنے والا اپنی قوم کا پسندیدہ اور ہر دلعزیز فرد نہیں رہ سکتا۔ اوپر کی مثال میں ڈاکو خود کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ اس کی تعلیم غلط ہے' بلکہ وہ اس

کی صحت اور معقولیت اور ضرورت کے حق میں دلائل مہیا کرے گا۔ تاہم جو معلم افراد کی صحیح تعلیم کا اہتمام کرنا چاہتا ہے اس کے لئے حد درجہ ضروری ہے کہ وہ اپنا کام شروع کرنے سے پہلے یہ دریافت کرے کہ صحیح مقصد تعلیم کیا ہے۔

آج تمام حکمائے تعلیم اپنے مشاہدات اور تجربات کی بنا پر اس حقیقت پر متفق ہیں کہ تعلیم انسان کی اندرونی اور قدرتی نشوونما کا ایک عمل ہے جو خود بخود اپنے مراحل طے کرتا جاتا ہے بشرطیکہ گردوپیش کے حالات اس نشوونما کے مدومعاون ہوں' مزاحم اور مخالف نہ ہوں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک حیوان یا پودے کی نشوونما۔ جب ایک پودا یا حیوان نشوونما پاتا ہے تو کوئی چیز باہر سے اس پر تھوپی نہیں جاتی بلکہ جو صلاحیتیں اس کے اندر بالقوۃ موجود ہوتی ہیں وہی نشوونما پانے سے بالفعل آشکار اور نمودار ہوتی چلی جاتی ہیں' بشرطیکہ بیرونی حالات مثلاً ہوا' پانی' روشنی اور خوراک اس پودے یا حیوان کی نشوونما کے لئے سازگار ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ صحیح طریق تعلیم یہ ہے کہ بچے کی اندرونی قدرتی نشوونما کے عمل میں کوئی مداخلت نہ کی جائے اور اس کو خود اپنی راہ پانے کے لئے آزاد رہنے دیا جائے۔ معلم کا کام صرف اتنا ہو کہ وہ بچے کے اردگرد ایسے حالات پیدا کر دے جو اس کی نشوونما کے اندرونی مخفی تقاضوں سے پوری پوری موافقت رکھتے ہوں اور ایسے حالات کو بچے کے ماحول سے باز رکھے جو ان تقاضوں کے منافی ہوں۔

عمل تعلیم کی اس بنیادی' عظیم الشان اور مسلّمہ حقیقت سے کئی قیمتی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ مثلاً اس سے ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ انسان کے پاس اس کے جسم کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ایسی ہے جو نشوونما پا سکتی ہے اور پاتی ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ تعلیم جسم کی نشوونما کا نام نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک ناتعلیم یافتہ آدمی کا جسم پوری طرح سے نشوونما پایا ہوا ہو اور ایک عمدہ اور اعلیٰ تعلیم کے آدمی کا جسم نحیف و نزار ہو۔ اگر انسان کا جسم ہوا' پانی' روشنی اور غذا سے نشوونما پاتا ہے تو نشوونما پانے والی یہ دوسری چیز تعلیم سے نشوونما پاتی ہے۔ لہٰذا ماہر تعلیم کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ وجود انسانی کے اندر یہ دوسری چیز جس کی نشوونما کا کام اس کے سپرد کیا گیا ہے کون سی ہے اور کیسی ہے' اس کے اوصاف و

خواص کیا ہیں، اس کے تقاضے کیا ہیں، اس کی ضرورتیں کیا ہیں، کونسی چیزیں اس کی نشوونما کے لئے ممدو معاون ہیں اور کونسی مضراور مخالف۔ جب تک ماہر تعلیم اس چیز کی ضروریات کو نہ جانے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ تعلیم سے بالیدگی اور نشوونما پانے والی یہ دوسری چیز وہی ہے، جسے فلسفہ کی اصطلاح میں شخصیت اور مذہب کی اصطلاح میں روح کہا جاتا ہے۔

شیخِ مکتب ہے اِک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روحِ انسانی

دوسرا نتیجہ اس عظیم الشان عملی حقیقت سے یہ نکلتا ہے کہ جس طرح سے آم کی ایک گٹھلی کی نشوونما کا یہ صحیح مقصد کہ اسے نشوونما پا کر ایک خاص قسم کا درخت بننا چاہئے، جس کی چھال، پھل پھول، پتے اور ٹہنیاں خاص قسم کی ہوں، گٹھلی کی فطرت کے اندر ہی پوشیدہ ہے۔ اسی طرح سے شخصیت انسانی کی نشوونما کا صحیح مقصد جو اس کی صحیح اور کامل نشوونما کا ضامن ہے اس کی فطرت کے اندر ہی پوشیدہ ہے اور ہم (جیسا کہ ڈیوی اور اس کے ہم خیال مغربی حکمائے تعلیم نے غلطی سے سمجھا ہے) اسے انسان کے خارجی حالات و واقعات اور بیرونی ضروریات میں تلاش نہیں کر سکتے۔ ان حالات و واقعات اور ضروریات کے خلاف انسان کا صحیح ردعمل وہی ہونا چاہئے جو انسانی شخصیت کے صحیح اندرونی فطرتی مقصد تعلیم کے مطابق نشوونما پائی ہوئی ایک انسانی شخصیت سے سرزد ہوتا ہے۔ اگر انسانی شخصیت کی نشوونما اس کے اندرونی فطری مقصدِ تعلیم کے مطابق ہوئی ہو تو انسانی شخصیت آزادانہ اور مکمل طور پر نشوونما پاتی ہے اور نشوونما پا کر خود بخود نظریاتی، علمیاتی، اخلاقیاتی اور جمالیاتی خصوصیتوں کے ایسے پھل پھول، پتے اور ٹہنیاں پیدا کرلیتی ہے جو خالصتاً انسانی قسم کے ہوں اور مقام انسانی کے شایان شان ہوں۔

تیسرا نتیجہ اس حقیقت سے یہ نکلتا ہے کہ روح انسانی یا شخصیت انسانی کو اپنی نشوونما کے لئے کسی غذا کی ضرورت ہے، کیونکہ نشوونما بغیر غذا کے تصور میں نہیں آسکتی۔ وہ غذا کونسی ہے جو روح کی پرورش یا دوسرے لفظوں میں انسان کی تعلیمی نشوونما کا باعث ہوتی

ہے۔ اس سوال کا معقول جواب جس کی طرف صحیح علمی و عقلی استدلال راہنمائی کرتا ہے یہ ہے کہ روح کی غذا حسن ہے۔ جس طرح جسم کو غذا کی اشتہا ہوتی ہے اسی طرح روح کو حسن کی اشتہا ہوتی ہے اور جس طرح جسم غذا سے لذت اندوز ہوتا ہے اور تازگی اور شگفتگی حاصل کرتا ہے اسی طرح روح حسن سے لذت اندوز ہوتی' اطمینان پاتی اور سرور حاصل کرتی ہے۔ پھر جس طرح جسم کے اندر غذا کو جذب کرنے اور جذب کر کے قوی اور توانا ہونے کی صلاحیت ہے اسی طرح روح انسانی میں حسن کو جذب کرنے اور جذب کر کے اخلاقی' علمی' روحانی اور جمالیاتی طور پر قوی اور توانا ہونے کی صلاحیت ہے۔ جس طرح جسم کی اشتہا کو مطمئن کرنے کے لئے انسان ایسی خوراک کی جستجو کرتا ہے جو پاک اور صاف اور لذیذ اور صحت بخش ہو اور جس کے اندر پروٹین اور حیاتین اور فلزات کے تمام ضروری عناصر موجود ہوں اسی طرح حسن کی اشتہا کو مطمئن کرنے کے لئے انسان ایک ایسے تصور کی جستجو کرتا ہے جو نہایت ہی حسین اور جمیل ہو' جس سے زیادہ حسین اور جمیل تصور اور کوئی نہ ہو' جو ہر نقص اور کمی سے مبرا ہو اور جس کے اندر بلا استثناء تمام صفاتِ حسن و کمال بدرجۂ اُتم موجود ہوں۔ صرف ایسا تصور ہی انسان کی اشتہائے حسن کو پوری طرح سے مطمئن کر سکتا ہے۔ لفظ خدا کی تعریف ہی سے ظاہر ہے کہ ایسا تصور سوائے خدا کے تصور کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جو ذات تمام نقائص سے مبرا اور تمام صفاتِ حسن و کمال سے متصف ہو اسی کو خدا کہا جاتا ہے' لہٰذا انسان فطرتاً خدا اور اس کی صفاتِ حسن کی اشتہا یا آرزو رکھتا ہے اور اس آرزو کو مطمئن کرنے اور حسن کو اپنی شخصیت کے اندر جذب کرنے کے لئے حسن کی ستائش کرتا ہے اور اس غرض کے لئے ہر مفید اور کار آمد طریق جس کی راہنمائی پاتا ہے' اختیار کرتا ہے۔ مثلاً خدا کی صفات حسن پر توجہ مرکوز کر کے حسن کے باطنی مشاہدہ سے لذت اندوز ہونے کے لئے ان الفاظ کو بار بار دہراتا ہے جو ان صفات پر دلالت کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ اور حسن سے انتہائی قرب حاصل کرنے اور ہر ایسی خواہش سے چھٹکارا پانے کے لئے جو اس قرب میں حائل ہونے والی ہو وہ قیام اور رکوع اور سجود اور قعود کے ذریعہ سے حسن کے سامنے عاجزی اور انکساری اور تضرع اور ابتہال اور گریہ زاری کرتا ہے۔ آرزوئے حسن کو مطمئن کرنے کا

یہ طریق جس کی ایک صورت نماز بھی ہے ذکر کہلاتا ہے۔ پھر وہ علمی صداقتوں اور حقیقتوں میں خدا کی صفتِ حق کی جھلک دیکھ کر ان کی جستجو کے در پے ہوتا ہے۔ طلب حسن کے اس طریق کو جستجوئے صداقت یا جستجوئے علم کا نام دیا جاتا ہے۔ پھر وہ خدا کی تخلیق میں خدا کی صفاتِ حسن کے نشانات کی جستجو کرنے کے لئے مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتا ہے۔ آرزوئے حسن کو مطمئن کرنے کا یہ طریق جسے تفکر یا زیادہ تفصیل کے ساتھ "تفکّر فی الخَلق" کہا جاتا ہے، طلبِ حسن ہی کا ایک پہلو ہے، جس کی بدولت مسلمانوں نے سائنسی طریق تحقیق ایجاد کیا تھا اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھی تھی۔ پھر وہ اپنے ان اعمال و افعال میں جو اپنے آپ کے ساتھ اور دوسروں کے ساتھ اس کے برتاؤ سے تعلق رکھتے ہیں باطنی اور معنوی حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، یعنی ان کو بمصداق "تَخَلَّقُوا بِاَخلَاقِ اللّٰہ" خدا کی صفات حسن کے مطابق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آرزوئے حسن کو مطمئن کرنے کے اس طریق کو حسن اخلاق یا نیکی کی جستجو کا نام دیا جاتا ہے۔ پھر وہ اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، اوڑھنے پہننے، رہنے سہنے، کھانے پینے، بات چیت کرنے، کھیلنے، سفر کرنے اور دوسروں سے میل ملاقات کرنے اور ان کے علاوہ اپنے دوسرے کاموں کے طور طریقوں میں ظاہری حسن اور صفائی اور عمدگی اور زیبائی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، بحکم "اللّٰہ جمیلٌ یحبّ الجمال"۔ آرزوئے حسن کی تشفی کے اس طریق کو جس کا مقصد ماحولِ زندگی میں تخلیقِ حسن ہے جمالیاتی فعلیت (Aesthetic Activity) کہا جاتا ہے۔ حسن کی آرزو کو مطمئن کرنے کے یہ چاروں طریقے، یعنی عبادت یا ستائش حسن، تحصیل علم یا جستجوئے حسن، نیکی یا حسن خلق اور جمالیاتی عمل یا حسن ذوق شخصیت انسانی کی تکمیل اور تعمیل کا یا دوسرے لفظوں میں اس کی بالیدگی اور نشوونما کا موجب ہوتے ہیں۔

چوتھا نتیجہ اس حقیقت سے یہ نکلتا ہے کہ چونکہ تعلیم ایک اندرونی اور قدرتی عمل ہے لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ قدرت نے اس کو کلیۃً انسان پر چھوڑ دیا ہو، بلکہ ضروری ہے کہ اس نے اس کے بنیادی لوازمات کا اہتمام خود کیا ہو۔ قدرت کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ اپنی پیدا کی ہوئی ہر ضرورت کا بنیادی اور ضروری اہتمام خود کرتی ہے اور پھر یہ اہتمام اس قسم کا

ہوتا ہے کہ اس کو نظرانداز کر کے یا اس سے پہلو تہی کر کے اس ضرورت کو بتمام و کمال پورا کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک حیوان کی بدنی نشوونما ایک قدرتی عمل ہے۔ قدرت اس کا بنیادی اہتمام دو طرح سے کرتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نے حیوان کے جسم کے اندر غذا جذب کرنے اور غذا کو جذب کر کے نشوونما پانے کی اندرونی صلاحیتیں پیدا کر دی ہیں اور دوسرے یہ کہ اس نے حیوان کے جسم کے باہر ہوا اور غذا اور پانی اور روشنی ایسی چیزیں مہیا کی ہیں جن کے بغیر اس کی یہ اندرونی صلاحیتیں بے کار ہوتیں' کیونکہ ان کا مہیا کرنا حیوان کے بس کی بات نہ تھی۔ بالکل اسی طرح سے روح انسانی کی نشوونما ایک قدرتی عمل ہے اور قدرت نے اس نشوونما کا بنیادی اہتمام دو طرح کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نے شخصیتِ انسانی سے باہر پے درپے آنے والے معلموں کا ایک سلسلہ پیدا کیا ہے جن کو انبیاء کہا جاتا ہے اور پھر اس سلسلہ کو اس نے ایک معلّمِ کامل (ﷺ) پر ختم کیا ہے جو نہ صرف اپنی زبانی تلقین اور ہدایت سے بلکہ اپنی عملی زندگی کے نمونہ سے بھی انبیاء کی تعلیم کو کمال پر پہنچاتے ہیں۔ خاتم النبیّین کے ظہور کے بغیر نہ تو خدا کا تصور ہی ان غلطیوں اور شرک کی آلائشوں سے پاک و صاف ہو سکتا تھا جو اس میں داخل ہو گئی تھیں اور نہ ہی خدا کے پاک اور صاف عقیدہ کے مطابق عملی زندگی بسر کرنے کا کوئی ایسا نمونہ ہی سامنے آ سکتا تھا جس میں خدا کا پاک و صاف عقیدہ انسان کی قدرتی عملی زندگی کے تمام ضروری شعبوں پر چسپاں کیا ہوا نظر آتا۔ نظری اور عملی طور پر خدا کے عقیدہ کے معنی کیا ہیں۔ اس سوال کا مکمل جواب ہمیں صرف خاتم النبیّین ﷺ کی تعلیمات ہی سے مل سکتا ہے۔

مختصر طور پر صحیح تعلیم کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کا ہر عنصر خدا کے عقیدہ پر مبنی ہو۔ خدا کا عقیدہ ہی اس کے عملی' اخلاقی' سائنسی اور جمالیاتی پہلوؤں کی بنیاد ہو۔ تعلیم کا جو پہلو بھی خدا کے عقیدہ کے بغیر رہے گا وہ روح انسانی کے لئے جذبِ حسن کا اہتمام نہیں کر سکے گا اور لہٰذا فرد کی تعلیمی نشوونما کے لئے بے کار ہو گا۔ چونکہ سارے حسن کا منبع خدا ہے اور علم اور اخلاق اور عبادت اور جمالیاتی عمل کا مقصد حسن کی جستجو ہے' لہٰذا ظاہر ہے کہ انسان کی علمی' اخلاقی' جمالیاتی اور سائنسی فعلیت اپنے مقصد کو اس وقت پائے گی اور اپنے کمال کو اس وقت پہنچے گی جب اس کا مطلوب اور مقصود اور اس کا مدار اور محور خدا

ہو گا۔ ہمارے علمی' اخلاقی' سائنسی اور جمالیاتی اعمال جس قدر خدا کے تصور سے ہٹے ہوئے ہوں گے وہ اسی قدر غلط اور ناقص ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ معلم کامل ﷺ کی تعلیمات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ہمارے تمام سائنسی' اخلاقی' علمی اور جمالیاتی اعمال وافعال کا مقصود خدا ہونا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے عقیدہ سے ہٹ کر اگر کوئی تعلیم ممکن ہے تو وہ کم وبیش ایسی ہو سکتی ہے جیسی کہ اوپر کی مثال میں راہزن کے بیٹے کی تعلیم۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ بے خدا تعلیم کی بعض قسمیں بڑے آشکار راہزن پیدا کرتی ہیں اور بعض قسمیں چھوٹے اور مخفی راہزن۔

جسم کی اشتہائے غذا کی طرح روح کی اشتہائے حسن بھی پوری طرح سے دبائی نہیں جا سکتی۔ اگر انسان کو اچھی' لذیذ اور صحت بخش غذا نہ مل سکے تو پھر جو غذا بھی اسے مل جائے وہ اسی سے اپنا پیٹ بھرتا ہے اور اسی میں لذت محسوس کرتا ہے' خواہ اس کی صحت ٹھیک رہے یا نہ رہے۔ اسی طرح سے جب انسان اپنی لاعلمی یا اپنے تعصب کی وجہ سے خدا کے تصور سے پوری طرح آشنا نہ ہو اور خدا کی صفات کے حسن وکمال کا ذاتی احساس نہ کر سکے تو وہ اپنی اشتہائے حسن کی تشفی کے لئے کسی غلط اور ناقص تصور کی طرف لاشعوری طور پر خدا کی صفاتِ حسن کو منسوب کرنے لگتا ہے۔ اور اسی کو اپنی مشاقِ جمال فطرت سے مجبور ہو کر اس طرح سے چاہنے لگتا ہے کہ گویا وہ سچ مچ کا خدا ہے۔ جب یہ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے تو وہ پھر تمام علمی یا سائنسی حقائق جو اس کے دائرۂ علم میں داخل ہوتے ہیں اور اس کے تمام قدرتی' اخلاقی اور جمالیاتی اور سائنسی اعمال وافعال جو اس سے سرزد ہوتے ہیں اس کے اس تصورِ حسن میں ڈوب کر اور اس کے رنگ سے رنگین ہو کر باہر آتے ہیں اور اس عمل کے دوران میں اپنی قدرتی حالت سے بدل کر اس کے مطابق ہو جاتے ہیں اور لہٰذا اتنے ہی غلط اور ناقص ہو جاتے ہیں جتنا کہ اس کا یہ تصور حسن غلط یا ناقص ہوتا ہے۔ اس کے علمی حقائق اس کے تصور حسن کے ساتھ مل کر ایک تنظیم بناتے ہیں اور اس کے اردگرد جمع ہو کر اس طرح موجود رہتے ہیں جیسے کہ مقناطیس کے اردگرد لوہچون کے اجزاء۔

دورِ حاضر کے غلط اور ناقص تصورات حسن جو اس طرح سے خدا کی جگہ لیتے ہیں

حسب ذیل ہیں : انگریزی قومیت، فرانسیسی قومیت، اطالوی قومیت، جرمن نسلیت، یہودی نسلیت، عربی نسلیت، روسی اشتراکیت، امریکی جمہوریت وغیرہ۔ یہی آج کل قوموں کے مقاصد حیات ہیں اور یہی ان کے مقاصد تعلیم۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اصل مقصدِ حیات اور مقصدِ تعلیم جو انسان کی فطرت سے پیدا ہوتا ہے، کہیں بھی نہیں۔ اس وقت عالم انسانی میں کوئی بھی نظام تعلیم ایسا نہیں جو تعلیم کو ایک اندرونی نشوونما کے عمل کی حیثیت سے اپنا صحیح اور قدرتی راستہ اختیار کرنے کے لئے آزاد چھوڑتا ہو، بلکہ جس طرح سے آم کا نوخیز پودا ایک طرف دباؤ پڑنے سے اگنے کے باوجود ٹیڑھا ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جھک کر زمین سے لگ جاتا ہے، اسی طرح سے اس وقت دنیا کے ہر نظام تعلیم کے اندر کسی نہ کسی غلط اور ناقص مقصد حیات اور مقصد تعلیم کا دباؤ نوخیز لڑکوں اور لڑکیوں کی شخصیتوں کو ٹیڑھا کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب ٹیڑھی اور غیر قدرتی نشوونما پانے والی شخصیتوں نے عالمِ انسانی کو بھر دیا ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ لاکھوں افراد ذہنی بیماریوں کا شکار ہو کر دنیا کے دماغی ہسپتالوں کو بھر رہے ہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ طفولیتی بے راہ روی (deliquency) کی حدود ہر روز پھیلتی جا رہی ہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ خود کشیوں، ڈکیتیوں، قتلوں اور دوسرے جُرموں کے اعداد و شمار بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ امریکہ کی مخلوط یونیورسٹیوں میں آزادانہ جنسی میل جول کی شرمناک تحریکیں ارباب اختیار کی چشم پوشی سے ہی نہیں بلکہ سرپرستی میں کھلم کھلا منظم کی جا رہی ہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس وقت عالم انسانی ہر لحہ ایک عالمگیر جنگ کی تباہ کاریوں کا خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ اقتصادی خوشحالی کے باوجود مہذب اور ترقی یافتہ لوگوں کے دل بے قرار اور زندگی سے بے زار ہیں۔ اس وقت نوع انسانی کی سب سے بڑی بدبختی ایٹم بموں اور میزائلوں کے جابجا پھیلے ہوئے انبار نہیں بلکہ غلط اور بے خدا تعلیم کی عالمگیری ہے جس سے انسان کی اور تمام بدبختیاں پیدا ہو رہی ہیں۔

افسوس ہے کہ اس وقت ہمارا پاکستانی نظام تعلیم بھی، جس کو ہم نے اسلامیات کا ایک مضمون شامل کر کے صحیح بنانے کی کوشش کی ہے، مغرب کے بے خدا اور غلط نظام ہائے تعلیم کی ایک بھونڈی نقل ہے۔ اسلامیات کا مضمون شامل کرنے سے اس کے اساسی

لادینی مقصدِ حیات اور مقصدِ تعلیم میں کوئی فرق نہیں آتا۔ البتہ پاکستانی طالب علم کے ذہن میں یہ بات [illegible] اور واضح ہو گئی ہے کہ یونیورسٹی کے اصل علوم کے ساتھ جو پورے نصاب [illegible] حصے میں ' اسلام یا اسلامیات کا کوئی تعلق نہیں۔ گویا اس وقت پاکستانی نظام [illegible] کے زیر اثر ہے۔ ایک صحیح اور باخدا نظریہ تعلیم جو اسلامیات کے مضمون کی حد تک کام کرتا ہے اور دوسرا غلط اور لادینی نظریہ تعلیم جو باقی ماندہ پورے نظام تعلیم پر چھایا ہوا ہے۔ لیکن حق و باطل کا امتزاج باطل ہی بن جاتا ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ۔ اقبال نے اسی آیت کا ایک شعر میں ترجمہ کیا ہے ؎

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

بڑی مدت کے بعد اہلِ مکّہ نے یہ بات سمجھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی عبادت کے ساتھ ساتھ بتوں کی عبادت گوارا کیوں نہیں کر سکتے۔ حق و باطل اور نور و ظلمت بہم نہیں ہو سکتے۔

اگر نوع انسانی نے زندہ رہنا ہے اور پھر اگر اس نے امن و اتحاد کی نعمتوں سے ہمکنار ہونا ہے' اگر اس نے اپنی علمی' اخلاقی' جمالیاتی' روحانی اور مادی ترقیوں کی اس انتہا تک پہنچنا ہے جو اس کی فطرت کی صلاحیتوں کے اندر اس کے لئے مقدر ہو چکی ہے تو اس بے خدا اور غلط تعلیم کا طلسم ٹوٹنا چاہئے۔ لیکن مغرب جو اس طلسم کا خالق ہے اس کو توڑ نہیں سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کے حکمائے تعلیم خدا کے عقیدہ کے خلاف ایک شدید قسم کے علمی تعصب میں مبتلا ہیں۔ اسی تعصب کی وجہ سے وہ خدا کے عقیدہ کو دنیوی اور عقلی علوم کے منافی سمجھتے ہیں اور ان کا یہ دستور بن گیا ہے کہ جب بھی ان کا علمی اور عقلی استدلال خود بخود اور بے ساختہ خدا کے تصور کی طرف جانے لگتا ہے وہ بتکلف اس کو گھما پھرا کر واپس لاتے ہیں' خواہ ان کا استدلال مضحکہ خیز کیوں نہ بن جائے۔ اسی تعصب کی وجہ سے مغرب کے حکمائے تعلیم اپنی ہی دریافت کی ہوئی اس عظیم الشان علمی حقیقت سے کہ تعلیم قدرتی نشوونما کا ایک عمل ہے' اوپر بیان کئے ہوئے نتائج کو جو ظاہر اور باہر ہیں' اخذ کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مغرب کا ہر فلسفہ

تعلیم پراگندہ خیالات کا ایک مجموعہ اور علمی اور عقلی اور منطقی استدلال کی سنگین غلطیوں کا ایک سلسلہ ہے۔

پاکستانی نظام تعلیم کی موجودہ حالت کے باوجود اگر یہ طلسم کسی خطۂ ارض میں ٹوٹ سکتا ہے تو وہ پاکستان ہے' کیونکہ فقط پاکستانی قوم ہی کا نظریۂ حیات یعنی اسلام وہ روشنی بخشتا ہے جو اس بے خدا تعلیم کی علمی خامیوں اور عملی تباہ کاریوں کو آشکار کر سکتی ہے اور صحیح باخدا محافظ و معاون انسانیت نظام تعلیم کو وجود میں لا سکتی ہے۔ مسلمان ممالک اور بھی ہیں لیکن اس دور میں صرف پاکستانی قوم ہی ایک ایسی قوم ہے جس نے بے شمار قربانیاں دے کر فقط اس لئے آزادی حاصل کی ہے کہ وہ اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کر سکے۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں بلکہ کائنات کی آخری منزل کی طرف حرکتِ ارتقاء کا ایک ضروری قدم ہے جس کا وقت پہنچ گیا تھا۔ قرآن حکیم نے ہمیں بتایا ہے کہ خدا کا قانون ہے کہ جب باطل قوت پکڑتا ہے تو ہم حق کو اس کے مقابل پر کھڑا کر دیتے ہیں کہ اس کا سر کچل دے اور اس کو صفحہ ہستی سے مٹا دے۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ۔ اب بتایئے کہ کیا ابتدائے تاریخ سے لے کر آج تک باطل کبھی اتنا طاقتور ہوا تھا جتنا کہ آج ہے۔ لادینیت پسندوں اور دہریت پرستوں کی بڑی بڑی سلطنتوں سے پوری دنیا بھری ہوئی ہے' جن کی اقتصادی اور فوجی قوت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اگر خدا کا قانون سچا ہے تو اور کونسا وقت ہے جب حق باطل کے مقابل پر آنے کے لئے ابھرے گا۔ یقیناً پاکستان کا قیام باطل کے مقابل میں حق کا پہلا ظہور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ جنگ (ستمبر ۱۹۶۵ء) میں پانچ گنا طاقت سے حملہ کرنے والا دشمن اپنی پوری کوششوں کے باوجود پاکستان کی اتنی لمبی سرحد پر کہیں بھی پاکستان کی ڈیفنس لائن میں دراڑ پیدا نہیں کر سکا۔ واقعات بتا رہے ہیں کہ پاکستان اس لئے وجود میں آیا ہے کہ صحیح باخدا نظام تعلیم یہاں سے ابھرے اور غلط اور بے خدا تعلیم کو ہر جگہ سے ملیامیٹ کرتا ہوا دنیا بھر میں پھیل جائے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ظہور دورِ حاضر کی تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے' لیکن دورِ حاضر کی تاریخ کا اس سے بھی بڑا واقعہ یہ ہوگا کہ پاکستان کے اندر ایک جدید اسلامی یونیورسٹی کی صورت میں صحیح اور باخدا نظام تعلیم کا ایک نمونہ یا ماڈل ظہور پذیر ہو

جو اپنی معقولیت اور آفاقیت کی وجہ سے پہلے پورے پاکستان میں اور پھر پوری دنیا میں نقل کیا جائے۔ جو لوگ اس ماڈل کی تخلیق اور تکمیل میں اعانت کریں گے "اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ" کے مصداق خدا کی حیرت انگیز اعانت ان کے ساتھ ہو گی۔

اقتصادی وسائل اور تباہ کن آلاتِ حرب و ضرب سے دوسری قوموں پر غالب آنے کا دور گزر چکا ہے۔ اب نظریات اور تصورات کا زمانہ ہے۔ اب وہی قوم دنیا میں غالب رہے گی جس کے پاس دلوں کو مسخر کرنے والے افکار و تصورات ہوں۔ تمام دوسری قوموں کے اقتصادی وسائل اور آلاتِ حرب و ضرب اسی قوم کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور اسی کے کام آئیں گے۔ اس قسم کے تمام افکار و تصورات کا سرچشمہ توحید کا عقیدہ ہے اور جب سائنسی علوم یعنی طبیعیاتی، جمالیاتی اور انسانی علوم کو موحد بنالیا جائے اور خدا کے عقیدہ کو ان کی ابتدا اور انتہا قرار دے دیا جائے تو پھر یہ تمام افکار و تصورات اس سرچشمہ سے بہہ نکلتے ہیں اور ان کے اندر ایک ایسی تنظیم اور ہم آہنگی اور معقولیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ منکرین توحید کے دلوں کو بھی متاثر کرتے چلے جاتے ہیں۔ اقبال نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا جب اس نے کہا تھا ؎

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے!

اگر مسلمان قوم کا یہ رول پاکستان کے ذریعہ سے اس طرح ادا ہونے والا ہے کہ پاکستان میں ہی صحیح اور باخدا نظام تعلیم کا وہ نمونہ پیدا ہو گا جو رفتہ رفتہ تمام دنیا میں اپنا لیا جائے گا تو آیئے آج سے ہم مل کر اس نمونہ کو پیدا کرنے کی کوشش کریں تاکہ اسلام کی آخری عالمگیر نشر و اشاعت کی ابتداء کرنے کی سعادت ہمارے حصہ میں آئے۔

تہذیب الاطفال

(آخری قسط)

بیگم ڈاکٹر عبد الخالق

سات سال سے بلوغت تک

بچہ جب سات سال کا ہو جائے تو اس کو نماز کی تلقین کریں اور نماز پڑھائیں۔ کوشش کریں کہ سات سال سے پہلے پہلے بچے کو نماز پڑھنا اور وضو وغیرہ کرنا سکھا دیں تا کہ ایک دم سے بچہ زیادہ بوجھ محسوس نہ کرے۔ حدیث مبارکہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

مُرُوا اَوْلَادَكُمْ بِالصَّلٰوةِ وَهُمْ اَبْنَاءُ سَبْعٍ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ اَبْنَاءُ عَشْرٍ وَفَرِّقُوْا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ

"اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں اور دس سال کی عمر میں (اگر وہ نماز نہ پڑھیں) ان کو مارو اور ان کے بستر الگ کر دو۔"

غور طلب بات ہے کہ ہم اپنے بچوں کو عام طور پر تین سال کی عمر میں ہی سکول داخل کروا دیتے ہیں کہ اور کچھ نہیں تو بچہ اٹھنا بیٹھنا اور کچھ تمیز اور تہذیب ہی سیکھ لے گا' جبکہ اللہ تعالیٰ نے دین کی بنیاد یعنی نماز کا باقاعدہ اہتمام سات سال کی عمر سے کروایا ہے۔ آخر اس میں کیا حکمت ہے؟ یہ کہ ماں سات سال کی عمر تک اپنے بچے کو ذہنی طور پر تیار کرتی ہے اور اخلاقی طور پر اچھی تربیت کر کے اس کے شعور کو صحیح رخ پر پروان چڑھاتی ہے---- تا کہ ماں کو صحیح رخ پر دیکھ کر بچہ بھی خدائے وحدہٗ لاشریک کے آگے سجدہ ریز ہو۔ اور خود بخود خدا کی عظمت آہستہ آہستہ اس کے دل و دماغ میں اجاگر ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ اچھے ماحول کا اثر ہوتا ہے جو کہ لامحالہ بچوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بچہ ہر طرف سے بے خوف ہو کر ایک خدا سے ڈرتا ہے بشرطیکہ اس کو یکسو کیا جائے اور اس معصوم کے دماغ کی سوئیوں کو کسی اور طرف حرکت نہ دی جائے' اسے پیروں فقیروں سے مانگنا نہ سکھایا جائے' غلط

معاشرے کی بندگی کرنا نہ سکھائی جائے' روپے پیسے کا بندہ نہ بنایا جائے' اپنے آباء واجداد کی روایات کی اندھا دھند تقلید نہ کروائی جائے' غرض یہ کہ ان تمام خداؤں سے بچا کر ایک خدائے وحدہٗ لاشریک کی پوجا اور پرستش کروائی جائے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

تو بچہ بڑے ہوتے ہوتے اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّین کے مفہوم سے صحیح طور پر آگاہ ہوتا ہے اور پانچ دفعہ نماز باجماعت سے نظم و ضبط کا جو شعور اس میں پروان چڑھتا ہے' بڑے ہوتے ہوتے اس شعور میں پختگی آجاتی ہے اور یہی نظم و ضبط جماعت اقامت دین کا نچوڑ ہے۔ صراط مستقیم کی شاہراہ پہ گامزن ہونے کا راستہ یہی نماز کی بروقت اور پنج وقت ادائیگی ہے۔ ہم جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" کی استعانت طلب کرتے ہیں۔ اور در حقیقت اللہ تعالیٰ صراط مستقیم پر گامزن ضرور کرتا ہے اگر اس کے احکامات پر عمل کرنا شروع کردیں۔ اس کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ آپ خود باشعور ہیں لہٰذا خود دین پر عمل پیرا ہوں اور خدا تعالیٰ کی ان امانتوں یعنی بچوں کو شروع ہی سے نماز پابندی سے پڑھنا سکھائیں اور باقی اخلاقیات پر عمل بھی کروائیں۔

آپ دیکھیں مذکورہ بالا حدیث میں آگے کیا فرمایا جارہا ہے' کہ ۱۰ سال کی عمر میں اگر بچہ نماز نہ پڑھے یعنی سستی کرے تو اب اس سے نرمی نہ کی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کی محبت آڑے آجائے اور آپ انہیں سردیوں میں ٹھنڈے پانی سے بچانے کے لئے اور گرمیوں میں نیند کی کمی کی وجہ سے نماز کے لئے نہ اٹھائیں اور ان کے آرام کا زیادہ خیال کرلیں۔ اور اس طرح نہ صرف ان کے ساتھ بلکہ اپنے ساتھ بھی دشمنی کا معاملہ کریں' بلکہ اس کے برعکس معاملہ کریں کہ خود بھی محتاط ہوں اور بچے کی سستی یا نماز سے غفلت برتنے کی وجہ سے ان کی پٹائی بھی کریں۔ ویسے تو ہمیں نبی اکرم ﷺ نے بچوں کے حق میں نرم دل اور رحم دل ہونے اور ان کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنے کا حکم دیا ہے' لیکن یہاں معاملہ دین کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کا ہے' نسلِ نو کو دینی نظم کے خوگر بنانے کا ہے' لہٰذا یہاں

سختی کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ بچوں کی بنیادوں میں دینی بنیادیں بھی مضبوطی سے قدم جمائیں' جیسا کہ حدیث میں ہے کہ "اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّین" کہ نماز دین کا ستون ہے۔ اگر آپ دنیا میں ان کے ساتھ نماز اور دوسرے دینی معاملات میں سختی کرلیں گی تو آخرت میں شدید ترین آگ کے عذاب سے نہ صرف خود بھی بچ جائیں گی بلکہ بچوں کے حق میں بھی بہتر ہوگا کہ وہ قبر کے عذاب سے اور روزِ قیامت کی رسوائی و ذلت سے بچ جائیں گے۔ لہٰذا پیار سے' ڈانٹ سے' مار پیٹ سے' غرض ہر وہ حربہ استعمال کریں کہ آپ کا بچہ نمازی بن جائے۔ آپ کا طرزِ عمل ان کے ساتھ ایسا ہو کہ ان پر یہ چیز واضح ہو جائے کہ نماز سے غفلت یا سستی آپ ہرگز برداشت نہیں کریں گی۔ اس ضمن میں قرآن حکیم کا حکم یہ ہے کہ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا "اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور خود بھی اس کے پابند رہو"۔

بڑے ہوتے ہوئے بچے کو نماز کے ساتھ ساتھ قرآن کی ناظرہ تعلیم دلوائیں' حافظِ قرآن بنائیں' قرآن کا عالم اور عامل بنائیں۔ اسے دنیاوی تعلیم بھی ضرور دیں' لیکن یہ تمام چیزیں بھی اپنے اوپر بچے کا فرض سمجھیں' اس لئے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے جو کہ آپ کے پاس عمل کرنے کے لئے ہے اور بچے آپ کے پاس اللہ کی امانت ہیں تا کہ آپ انہیں اللہ کی کتاب پر عمل کرنا سکھائیں۔ اور خود ہم بھی تو اللہ ہی کے ہیں۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم سب اللہ کے ہیں' اسی کی مخلوق ہیں اور اسی کی طرف ہمیں لوٹنا ہے۔ تو جب ہم سب کو اسی کی طرف جانا ہے اور ہمارا یہی یقین کامل ہے تو کیوں نہ اپنے بچوں پر آج سے ہی توجہ دینی شروع کر دیں۔

شادی کا مرحلہ

والدین کی ذمہ داریوں کا آخری مرحلہ بچوں کی شادی کرنے کا ہوتا ہے۔ شادی تک بچے والدین کی سرپرستی میں ہوتے ہیں اور وہ اللہ کے ہاں ان کے بارے میں جواب دہ ہیں۔ اس کے بعد بچے خود اپنے ذمہ دار ہیں' کیونکہ اس وقت تک وہ باشعور ہو چکے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس ضمن میں والدین پر آخری فرض شادی کا رہ جاتا ہے۔ اس کے بارے میں

بھی ہم نبی اکرم ﷺ سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ نکاح کے لئے عام طور پر عورت میں چار چیزیں دیکھی جاتی ہیں : مال و دولت' خاندانی شرافت' حسن و جمال اور دین و اخلاق۔ تم دیندار عورت سے شادی کرو' تمہارا بھلا ہو اس حدیث سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھولاتے وقت اولین اہمیت دین و اخلاق کو دینی چاہئے' اگر باقی تین چیزیں لڑکی میں موجود نہیں ہیں اور صرف دین و اخلاق ہے تو تم صرف اسی کو اہمیت دو اور شادی کردو۔ اگر دین و اخلاق نہیں ہے اور باقی چیزیں پوری موجود ہیں تو تم وہاں شادی نہ کرو' خواہ دنیوی فائدہ کتنا ہی کیوں نہ نظر آئے۔ یہ ہے نبی اکرم ﷺ کی تعلیم۔ اس لئے کہ اگر باقی چیزیں موجود نہ ہوں اور دین و اخلاق اچھا ہو تو آئندہ نسل اچھی اٹھے گی اور ایک اچھا معاشرہ تشکیل پائے گا اور یہی مقصود و مطلوب ہونا چاہئے۔ لیکن دین و اخلاق سے محروم لڑکی تو یوں سمجھیں کہ ہر لحاظ سے نقصان دہ ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا : "جب تمہارے ہاں کوئی ایسا شخص نکاح کا پیغام بھیجے جس کے دین و اخلاق سے تم مطمئن اور خوش ہو تو اس سے اپنے جگر گوشے کی شادی کردو۔ اگر تم ایسا نہ کروگے تو زمین میں زبردست فساد ہوگا"۔ اس حدیث مبارکہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نکاح میں مسلمان مرد و عورت کا دین و اخلاق کے لحاظ سے اچھا ہونا ہی ایمان کی علامت ہے اور مسلمان میاں اور بیوی کا با اخلاق ہونا آئندہ زندگی میں بھی اور دین کو آگے بڑھانے میں بھی حد درجہ مفید ہے۔ دیندار زوجین دین کے معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ صالح بیوی اپنے قول و عمل سے صالح مرد کا دست و بازو بنتی ہے۔ دنیا میں یہ اس لحاظ سے بھی نہایت ضروری اور مفید ہے کہ اولاد بہت اچھی اٹھے گی اور صحیح اسلامی طریقے سے پروان چڑھے گی۔ دیکھئے بات پھر وہیں پہنچ گئی ہے جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا۔ یعنی اولاد کی اچھی تربیت۔ اور یہ پہیہ ان شاء اللہ اسی طریقے سے چلتا رہے گا۔ لیکن اگر ہم بے مقصد پہیے چلاتے رہیں تو ہمارا اور ہمارے بچوں کا دنیا میں آنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پھر تو ہماری حیثیت بھیڑ بکریوں سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ اگر میاں بیوی مل کر بامقصد طریقے سے

خود بھی زندگی گزاریں اور بچوں کو بھی دین کی راہ پر لگائیں تاکہ ان کے بچے بھی اسی طرح دیندار بنیں، تبھی ایک اسلامی معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے اور ہماری نجاتِ اخروی بھی تب ہی ممکن ہے۔

شادی کے ضمن میں ایک بات بہت اہم ہے کہ بلاوجہ شادی کرنے میں تاخیر کرنا شرعی لحاظ سے درست نہیں ہے۔ اس طرح اولاد کا غلط رخ پر پڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، جس کے ذمہ دار والدین ہی ٹھہرتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر کوئی ایسا معاملہ ہو جائے تو والدین دنیا میں بھی ذلت اور رسوائی اٹھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں بھی گنہگار ہوتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے :

((مَن وُلِدَ لهُ وَلَدٌ فَلْيُحْسِنِ اسْمَهُ وَاَدَّبَهُ فَاِذَا بَلَغَ فَلْيُزَوِّجْهُ وَاِنْ بَلَغَ وَلَمْ يُزَوِّجْهُ فَاَصَابَ اِثْمًا فَاِنَّمَا اِثْمُهُ عَلٰى اَبِيهِ)) (بیہقی)

"جس شخص کے ہاں بچہ پیدا ہو تو اسے چاہئے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کی اچھی تعلیم و تربیت کرے۔ پھر جب وہ بالغ ہو جائے تو اس کا نکاح کر دے۔ اور اگر بالغ ہونے پر اس کا نکاح نہ کیا اور وہ کسی گناہ میں پڑ گیا تو اس کا وبال اس کے باپ پر ہو گا"۔

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ باقی تمام معاملات میں عورت کو زیادہ ترغیب دلائی گئی ہے کہ وہ بچوں پر نگران ہے اور وہ اس اعتبار سے اللہ کے ہاں مسئول ہے، لیکن یہاں معاملہ الٹ ہو گیا۔ یہاں عورت کی نسبت مرد کی بازپرس ہو رہی ہے، کیونکہ قانونی طور پر اولاد مرد کی ہے۔ لہٰذا شادی بیاہ جیسے بندھن کو باندھنا مرد ہی کی ذمہ داری ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تورات میں لکھا ہے کہ جس کسی کی بچی بارہ سال کی عمر کو پہنچ گئی اور اس نے اس کا نکاح نہ کیا اور وہ بچی کسی غلط کام میں پڑ گئی تو اس کا گناہ اس کے باپ پر ہو گا۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ چاہے رشتہ اچھا نہ مل رہا ہو یا کچھ اور مجبوریاں آڑے آ رہی ہوں تب بھی ہر حال میں شادی اسی عمر میں کرنی ہے، بلکہ ذہنی طور پر ہمیں تیار رہنا چاہئے کہ جونہی دین و اخلاق کے لحاظ سے

اور معاشی و معاشرتی اعتبار سے اچھا رشتہ مل جائے تو شادی کر دینی ہے۔ اس بات سے زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہئے کہ بچی ابھی چھوٹی ہے یا بچہ ابھی چھوٹا ہے۔ والدین کی فطری محبت [illegible] معاشی مسائل واقعتاً اس راہ میں حائل ہو سکتے ہیں لیکن یہی فطری محبت اولاد کے حق [illegible]ی ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر اولاد بری صحبت میں پڑ جائے اور اس سے کوئی گناہ [illegible]ر ہو جائے تب تو "خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ" والا معاملہ ہو جائے گا۔

حرفِ آخر

تہذیب الاطفال یعنی بچوں کی تربیت کے ضمن میں پیدائش سے لے کر شادی تک کے تمام مراحل کو اسلامی طریقے سے ادا کرنے کا مقصد ایک تو یہی ہے کہ ایک صحیح مسلمان معاشرہ قائم ہو، مسلمان بچوں کو بھی اپنے قول و عمل پر اعتماد ہو اور بچے، جو کہ فطرت کے اصولوں پر پیدا ہوتے ہیں، تصنع اور بناوٹ سے پاک دین فطرت یعنی اسلام پر عمل پیرا ہو سکیں۔ اولاد کی صحیح تربیت کے بارے میں لکھنے کا دوسرا بڑا مقصد یہ ہے کہ اس وقت اولاد ہم سب کو بہت پیاری ہے۔ اولاد کی خاطر عام طور پر جائز کے علاوہ ناجائز ذرائع سے بھی دولت کمائی جاتی ہے، اپنا تن من دھن اولاد کی خاطر قربان کیا جاتا ہے۔ کوئی اولاد کو ٹیڑھی نگاہ سے دیکھے تو والدین کے تن بدن میں غصے اور انتقام کی آگ بھڑکنے لگتی ہے۔ بچے ذرا بیمار ہوں تو جگہ جگہ ڈاکٹروں کے پاس، جادو ٹونے اور تعویذ دھاگے کرنے والوں کے ہاں بھاگ دوڑ کی جاتی ہے، غرض اپنی [illegible] کی فکر نہیں ہوتی لیکن اولاد کی خاطر ہلکان ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ تو عام معاشرے کا حال ہے۔ تھوڑی بہت دین کی سوجھ بوجھ رکھنے والے بھی حرام سے نہ سہی حلال ذرائع سے ہی اولاد کی ضروریات کو پورا کرنے میں دل و جان سے لگے ہوتے ہیں۔ اچھی تعلیم، اچھے کپڑے، بہترین اسکول، عمدہ سوسائٹی، عمدہ کھانا پینا، رہائش کے لئے بہترین گھر ہر شخص اپنی اولاد کے لئے ضروری تصور کرتا ہے۔ اولاد کی خواہشات کو پورا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے۔ غرضیکہ اولاد کی دنیا سنوارنے کی بھرپور جدوجہد یہاں بھی ہو رہی ہے۔

ایک وہ طبقہ ہے کہ جو دین کی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ سے بھی ناواقف ہے اور روپے پیسے سے بھی محروم ہے۔ روٹی' کپڑا اور مکان جیسی ناگزیر ضروریات میں یہ خود بھی بندھے ہوئے ہیں اور ان کے بچے بھی۔ یہ لوگ خود فاقہ کرلیتے ہیں' لیکن بچوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ خود تن ڈھانپنے کے لئے چاہے ضروری کپڑے بھی نہ ہوں لیکن بچوں کا تن ڈھانپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غرض اولاد کی محبت میں خون پسینہ ایک کرکے انہیں بنیادی ضروریات فراہم کرنے کی تگ و دو یہاں بھی جاری ہے۔

یہاں اب میں بہت اہم بات کہہ رہی ہوں کہ وہ اولاد' جس کی دنیا سنوارنے کی خاطر ہم نے اپنا تن من دھن ایک کیا ہوا ہے' اس لئے کہ یہ ہماری اولاد ہے' ہمارا اپنا تسلسل ہے' ہماری پہچان ہے' ہمارے بعد ہماری جائیداد کی وارث ہے' اس لئے ان کے ساتھ جتنا بھی پیار محبت کرلیں' ان کے لاڈ اور چاؤ چونچلے برداشت کرلیں' حرام و حلال کی تمیز کئے بغیر انہیں آسائشیں فراہم کرتے چلے جائیں' کم ہے--- لیکن ذرا سوچئے کہ اُس وقت کیا ہوگا جب آپ ذات باری تعالیٰ کے حضور کھڑی ہوں گی اور آپ کی اپنی اولاد آپ کے خلاف گواہی دے رہی ہوگی۔ اس دن یہ رشتہ داری (جو کہ اس وقت انتہائی مضبوط سمجھی جاتی ہے) ختم ہو جائے گی' نہ ماں بیٹے کی ہوگی نہ بیٹا ماں کے کسی کام آسکے گا۔

سورۂ عبس میں میدان حشر کی اس کیفیت کو نہایت عبرتناک انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

﴿ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۝ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ۝ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۝﴾

"اس دن آدمی اپنے بھائی' اپنی ماں' اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے فرار حاصل کرنا چاہے گا"۔

جبکہ سورۃ المعارج میں یہ لرزا دینے والے الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ۝ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ۝ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ۝ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيهِ ۝﴾

"مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لئے اپنی اولاد کو' اپنی بیوی کو'

اپنے بھائی کو' اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا' اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اسے نجات دلا دے"۔

یہ ہے وہاں کی سراسیمگی کا عالم اور افراتفری کا سماں۔ تو فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ! اے عقلمندو' ان حقائق سے چشم پوشی کرنے کی بجائے عبرت پکڑلو! اولوالابصار کون ہیں؟ وہ جن کی ظاہری بصارت کے ساتھ ساتھ باطنی بصیرت بھی روشن ہے' یعنی صحیح مسلمان مرد اور خواتین۔

تو میں اپنی بہنوں سے التجا کرتی ہوں کہ ان ظاہری نگاہوں سے ظاہری چیز یعنی دنیا ہی کو دیکھنا اور دکھانا چھوڑ دیں۔ اور بچوں کی تربیت اس نہج پر نہ کریں کہ وہ آخرت سے بے گانہ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد کو کہیں "عَدُوًّا لَّكُمْ" (تمہاری دشمن)' کہیں "فِتْنَةٌ" (تمہارے لئے آزمائش) اور کہیں "زِينَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" (دنیوی زندگی کی آرائش و زیبائش) کہا ہے۔ ہمیں خبردار رہنا چاہئے کہ ہماری غلط تربیت انہیں خدا کے ہاں کہیں ہماری دشمن نہ بنا دے۔ ہماری بہنوں کو یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ عورتیں اس کی پکڑ میں زیادہ آئیں گی۔ خدا تعالیٰ نے ماں میں مامتا بھی زیادہ رکھی ہے اور وہ محاسبۂ اخروی میں اولاد کی ذمہ دار بھی مَردوں کی نسبت زیادہ ٹھہرائی جائیں گی۔ تو آپ اولاد کی محبت کو خدا کی محبت کے تابع کر کے ان کی تربیت کریں۔ یہی ان کے اور آپ کے حق میں بہتر ہو گا۔ ورنہ مذکورہ بالا آیات کو ذہن میں رکھیں کہ انصاف کے کٹہرے میں آپ کی اولاد آپ کے خلاف گواہی دے رہی ہو گی کہ اے رب! ہمارے بگاڑ کے ذمہ دار ہمارے یہ والدین ہیں جنہوں نے ہمیں غلط راہ پر لگایا' حرام کھلایا' رشوتیں کھلائیں' جھوٹ بولنا' چوری کرنا سکھایا۔ دنیا میں ہر جائز اور ناجائز طریقے سے ہماری آسائشوں' آرام اور راحت کا خیال رکھا' لیکن ہمیں اس دن کے انجام سے بے خبر رکھا۔ نہ ہمیں تیرا ڈر خوف سکھایا اور نہ تیرے نبی کی تعلیمات پر عمل کرنے کو کہا۔ دنیوی اعتبار سے ہمیں بہترین تعلیم دلوائی' بہترین سکولوں اور کالجوں میں داخل کروایا لیکن تیرے قرآن پر عمل تو بہت دور کی بات ہے ہمیں قرآن پڑھنا تک نہیں سکھایا۔ اے رب آج تو ان کی گردن پکڑ لے اور دوزخ میں جھونک دے اور ہمیں بچا لے!

خواتین اگر "شہادت علی الناس" کے فریضے کو نہیں سمجھ سکتیں تو یہ تو ضرور ان کی سمجھ میں آ جانا چاہئے کہ ان کے لئے شہادت علی الناس کہاں ضروری ہے؟ باہر نکل کر شہادت علی الناس کے فریضے کو انجام دینا مردوں کا کام ہے' لیکن گھر کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے اہل خانہ کو اخروی انجام سے خبردار کرنا اور سب سے بڑھ کر اپنی اولاد کی آخرت بنانے کے لئے قدم قدم پر قرآن و حدیث سے رہنمائی حاصل کرنا اور انہیں دوزخ کے عذاب سے بچانے کے لئے اپنا تن من دھن لگا دینا خواتین کی اولین ذمہ داری ہے۔

پہلی قسط میں پیش کردہ آیت قرآنی یہاں دوبارہ لا کر میں اپنا مضمون ختم کر رہی ہوں۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾

اے ایمان والو' اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو (جہنم کی) آگ سے بچاؤ!

وما علینا الا البلاغ

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد: ۴۵
شمارہ: ۱۰
جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ
اکتوبر ۱۹۹۶ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زرتعاون ۱۰۰/-

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات، قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان — 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون 03-02-5869501
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی 67۔ گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110
پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

تنظیم اسلامی کا اکیسواں سالانہ اجتماع ان شاء اللہ العزیز ۴ تا ۶/ اکتوبر لیاقت باغ راولپنڈی میں منعقد ہو گا۔ تنظیم اسلامی کی تاریخ میں یہ دوسرا موقعہ ہے کہ سالانہ اجتماع کا انعقاد لاہور کے علاوہ کسی دوسرے مقام یا شہر میں ہو رہا ہے۔ قبل ازیں ۱۹۸۸ء میں ایک رفیق تنظیم کی دعوت پر بہاولنگر کے ایک غیر معروف مقام طارق آباد میں واقع ان کی وسیع اراضی پر کھلے میدان میں اجتماع منعقد کیا گیا تھا۔ تاہم وہ ایک استثنائی معاملہ اور منفرد تجربہ تھا کہ اس کے باوجود کہ اجتماع کھلے میدان میں ہوا' وہ صرف تنظیم کے رفقاء تک محدود تھا اور "جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا" کے مصداق عام پبلک کو اس کی بھنک بھی نہ پڑی۔ کھلے میدان میں تنظیم کا پہلا باقاعدہ سالانہ اجتماع جو شہر کے ایک معروف میدان اور پبلک کے نقطہ نگاہ سے نہایت اہم مقام پر منعقد ہوا وہ پچھلا سالانہ اجتماع تھا جس کا انعقاد مینار پاکستان کے سبزہ زار پر عمل میں آیا۔ بحمد اللہ یہ تجربہ بہت اچھا رہا۔ اسی سے حوصلہ پا کر اس سال راولپنڈی / اسلام آباد میں سالانہ اجتماع کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ گویا پہلے کے مقابلے میں ایک قدم مزید آگے بڑھنے کا معاملہ ہے۔ بحمد اللہ اس فیصلے کی عملی تعبیر لیاقت باغ راولپنڈی میں منعقد ہونے والے اجتماع کی صورت میں سامنے آیا چاہتی ہے۔

۴ تا ۶/ اکتوبر منعقد ہونے والا یہ سالانہ اجتماع اس اعتبار سے بھی پہلے اجتماعات سے مختلف ہے کہ تنظیم کی تاریخ میں یہ پہلا اجتماع ہے جو کل پاکستان کی بنیاد پر منعقد نہیں کیا جا رہا بلکہ اسے نصف پاکستان کا اجتماع کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ سندھ' بلوچستان اور جنوبی پنجاب کے رفقاء تنظیم کے لئے اس اجتماع میں شرکت لازم قرار نہیں دی گئی بلکہ ان علاقوں کے رفقاء کے لئے ایک علیحدہ سالانہ اجتماع ان شاء اللہ العزیز دسمبر کے اوائل میں سکھر میں منعقد کیا جائے گا۔ سالانہ اجتماع کو دو حصوں میں منعقد کرنے کا فیصلہ اگرچہ بنیادی طور پر سندھ اور بلوچستان کے رفقاء کی سہولت کے پیش نظر کیا گیا ہے تاہم اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اس فیصلے کے بعض مفید نتائج بھی سامنے آئیں گے۔ سکھر میں سالانہ اجتماع کا انعقاد ان شاء اللہ اندرون سندھ تنظیم اسلامی کے حلقہ تعارف کو وسعت دینے میں ممد و معاون ثابت ہو گا اور اس طرح پاکستان میں غلبہ و اقامت دین کی اس جدوجہد کو تقویت حاصل ہو گی جس کے لئے تنظیم اسلامی گزشتہ ۲۰ برسوں سے کوشاں ہے۔ اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ملت اسلامیہ پاکستان کی بقا و استحکام کا دارومدار پورے طور پر دین حق کے نفاذ یا بالفاظ دیگر نظام خلافت کے قیام پر ہے جس کے بغیر اس ملک کی مثال اس ہچکولے کھاتے سمندری جہاز کی

سی ہے جو طے کردہ راہ سے بھٹک کر پورے طور پر کسی خوفناک طوفان کے تھپیڑوں کے رحم و کرم پر ہو کہ جس کے مسافر ہر دم اس اندیشے کا شکار ہوں کہ نہ معلوم کب کوئی مہیب طوفانی لہر جہاز کو بیخ کر لخت لخت کر دے کہ پھر اس جہاز اور جہاز والوں کا نشان ملنا محال ہو جائے۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

☆ ☆ ☆

پچھلے دنوں ملتان کی ایک مسجد میں ہونے والے قتل عام نے اہل پاکستان کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ انتہائی قابل مذمت سانحہ مسجد الخیر میں نماز فجر کے وقت پیش آیا جس میں دہشت گردوں کی بے رحمانہ فائرنگ سے ۲۴ افراد جاں بحق اور متعدد شدید زخمی ہوئے۔ اس سانحہ کو چونکہ سپاہ صحابہؓ اور سپاہ محمدؐ کی باہمی آویزش کے تناظر میں دیکھا گیا لہٰذا اس حوالے سے ملک کے طول و عرض میں تشویش کی لہر دوڑ گئی کہ فرقہ واریت کا یہ خوفناک ڈرامہ اور کیا کیا سین دکھائے گا اور اس کا ڈراپ سین آخر کب اور کس صورت میں ہو گا؟ --- گزشتہ چند ماہ کے دوران ہونے والے باہمی قتل و غارت گری کے واقعات کی ترتیب کو ہی اگر دیکھا جائے تو بڑی آسانی کے ساتھ اس سانحے کا الزام سپاہ محمدؐ کو دیا جا سکتا ہے لیکن ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ بعض ملک دشمن عناصر اور بالخصوص دشمن ممالک کی خفیہ ایجنسیاں بھی پاکستان میں انتشار اور فساد برپا کرنے کے درپے ہیں اور اس فرقہ وارانہ اختلاف کی آڑ میں بڑی کامیابی کے ساتھ اپنی گیم کھیل رہی ہیں۔ بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کے بعض تخریب کاری کے خوفناک منصوبے اس سے قبل طشت ازبام بھی ہو چکے ہیں اور بعض دیگر ممالک بھی جن میں اسرائیل سرفہرست ہے' پاکستان کے خلاف سازشیں کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ اس تناظر میں دینی جماعتوں اور فرقہ وارانہ تنظیموں کے قائدین پر یہ ذمہ داری آتی ہے کہ وہ حالات کی نزاکت کا ادراک کریں اور اس گھمبیر صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لئے آپس کے اختلافات کو جائز حدود کے اندر رکھتے ہوئے مل جل کر اصلاح احوال کی کوشش کریں۔ دشمنوں کے ناپاک عزائم کو ناکام بنانے کا یہی واحد راستہ ہے۔ اتحاد و اتفاق کا عمل صرف اسی صورت میں موثر ہو سکتا ہے کہ تمام دینی عناصر پاکستان میں نفاذ اسلام کے لئے اجتماعی طور پر سرگرم عمل ہو جائیں۔ اس لئے کہ ملک و ملت کی بقا ہی نہیں استحکام بھی اسی پر موقوف ہے۔

اس ضمن میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ' نے ۲۶/ ستمبر کے اخبارات میں دینی جماعتوں کے ذمہ دار لوگوں کے نام ایک اپیل پر مشتمل ایک اشتہار شائع کروایا جسے سنجیدہ حلقوں میں

(باقی صفحہ ۸ پر)

پاکستان انقلاب کے دہانے پر؟

سفر امریکہ سے مراجعت کے بعد مسجد دارالسلام میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے خطاب جمعہ (۱۳/ ستمبر ۹۶ء) کا خلاصہ

پاکستان کا استحکام اور اس کی ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی حیثیت سے بقاء صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہاں اسلام کا نظام عدل اجتماعی قائم ہو۔ یہ نظام عدل یا نظام خلافت محض دعوت و تبلیغ یا انتخابی سیاست کے ذریعے قائم نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے ایک ہمہ گیر اسلامی انقلاب کی ضرورت ہے۔ تاہم فی الوقت صورت حال یہ ہے کہ اس انقلاب کو برپا کرنے کے لئے جن قربانیوں کی ضرورت ہے ان کے لئے پاکستانی مسلمانوں کی اکثریت آمادہ نہیں ہے' لہٰذا ایک اسلامی انقلاب اور اس کے نتیجے میں نظام عدل اجتماعی کے قیام کی منزل تاحال دور دور تک نظر نہیں آ رہی۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا معاملہ اور ہے' لیکن پاکستان کے موجودہ حالات کا معروضی تجزیہ کیا جائے اور یہاں کے بسنے والوں کے رنگ ڈھنگ دیکھے جائیں تو بظاہر مستقبل قریب میں ایک اسلامی انقلاب کے آثار تقریباً معدوم محسوس ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم ملکی اور قومی سطح پر بتدریج خودکشی کر رہے ہیں۔ اس تدریجی خودکشی کے پانچ مظاہر ہیں۔ اولاً امن و امان کی صورت حالت میں شدید خرابی' ثانیاً علمی اور تعلیمی معیارات میں زوال' ثالثاً قوم کے اخلاق و کردار کا دیوالہ نکل جانا' رابعاً روز بروز شدید سے شدید تر ہونے والا معاشی بحران' اور خامساً سیاسی انتشار اور عدم استحکام۔

سیاسی تجزیوں اور تقریروں میں حکومت کی تبدیلی کے اشارات مل رہے ہیں' اور اس متوقع تبدیلی کو "انقلاب" کا نام دیا جا رہا ہے۔ لیکن وقتی سیاست کے نشیب و فراز اور سطحی نوعیت کی تبدیلیوں کو انقلاب کہہ دینا صریحاً غلط ہے' انقلاب اصل میں نام ہے سیاسی'

معاشی' اور سماجی نظاموں کے اندر کسی بنیادی تبدیلی کا۔ پاکستان کی سیاست میں اگر کوئی تبدیلی آ جائے اور موجودہ حکومت کی جگہ کوئی عبوری حکومت قائم ہو جائے تو یہ محض چہروں کی تبدیلی ہوگی' انقلاب نہیں ہوگا۔ جہاں تک انقلاب کا تعلق ہے تو واقعہ یہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی انقلاب کے علاوہ کسی دوسرے انقلاب کا سرے سے کوئی امکان نہیں ہے۔ آج کے دور میں انسان کے معاشی مسئلے نے مرکزی اہمیت اختیار کرلی ہے اور انسان فی الحقیقت محض ایک "معاشی حیوان" بن گیا ہے۔ ایسی صورت میں کوئی بڑی سے بڑی تبدیلی اس وقت تک "انقلاب" نہیں کہلا سکتی جب تک کہ اس کے ذریعے ملک کے معاشی نظام کو پوری طرح تبدیل نہ کر دیا جائے۔ اور کوئی انقلاب اس وقت تک "اسلامی انقلاب" نہیں قرار دیا جاسکتا جب تک کہ اس کے نتیجے میں سود' جاگیرداری' جوا' رشوت خوری اور فحاشی کے ذریعے پیسہ کمانے کے تمام راستوں کو مکمل طور پر بند نہیں کردیا جاتا۔

پاکستان کا موجودہ معاشی بحران نہایت خطرناک ہو چکا ہے اور ملک کے دیوالیہ ہو جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی ہے۔ ہر حکومت اس ضمن میں گزشتہ حکمرانوں پر الزام ڈالتی ہے' لیکن درحقیقت یہ ہماری پچاس سالہ غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔ ہم نے اپنی معیشت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے اور اپنے پیروں پر خود کھڑے ہونے کے بجائے بیرونی امداد اور قرضوں پر یہاں تک انحصار کیا کہ آج پورا ملک عالمی مالیاتی استعمار کا غلام بن چکا ہے۔ مغربی سیاسی استعمار سے تو آزادی مل گئی ہے لیکن اب ہم بحیثیت مجموعی عالمی یہودی مہاجن کی مستقل اسامی ہیں۔ ملک کا معاشی لحاظ سے دیوالیہ ہونا سودی قرضوں کا شاخسانہ ہے۔ سامراجی طاقتیں اب سفید چمڑی والے وائسرائے کے بجائے براؤن چمڑی والے معین قریشی جیسے ایجنٹوں کے ذریعے اپنے مقاصد کی تکمیل کر رہی ہیں۔ ان حالات میں سیاسی تبدیلی اور پانچ یا چھ سال کے لئے عبوری حکومت کا قیام عین ممکن ہے' اس لئے کہ عالمی مالیاتی اداروں کی خواہش یہی ہے کہ پاکستان کی معیشت مکمل طور پر برباد نہ ہو جائے کیونکہ اس کے ساتھ ان کے قرضوں اور سود کی رقم بھی ڈوب جائے گی۔

اس وقت ایک امکان یہ ہے کہ بے نظیر خود اسمبلی توڑ کر نئے انتخابات کا اعلان کرے' لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ نہ تو اپنے باپ کی غلطی دہرائے گی' نہ استعفاء دے گی' اور نہ

ہی اسمبلی توڑے گی۔ زیادہ قرین از قیاس یہی ہے کہ موجودہ سیاسی انتشار کا حل کسی ماورائے آئین کارروائی کے ذریعے ڈھونڈا جائے گا اور ایک طویل مدت کی عبوری حکومت قائم ہوگی تاکہ سیاست اور معیشت کو کسی حد تک بدعنوانی سے پاک کیا جا سکے۔ ایسے کسی اقدام کو یقینی طور پر عالمی مالیاتی استعمار کی حمایت حاصل ہوگی۔ بے نظیر اور نواز شریف کے درمیان مفاہمت کی باتوں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ حکومت کو اسمبلی توڑے جانے کا حقیقی خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ خصوصاً دو معاملات میں بے نظیر حکومت کو واضح طور پر شکست اور پسپائی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایک سرے میں محل کی خریداری کا اسکینڈل اور دوسرا نواز شریف کی جانب سے احتسابی کمیشن کے قیام کی تجویز اور اس پر حکومت کی مسلسل خاموشی۔

پاکستانی قوم مجموعی طور پر اخلاق و کردار کے لحاظ سے زوال کی انتہائی حد کو پہنچ چکی ہے۔ سی ٹی بی ٹی کے ضمن میں بھارت نے ایک اصولی اور جراتمندانہ موقف اختیار کیا اور عالمی طاقتوں سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اپنے اپنے جوہری ہتھیاروں کے ذخیروں کو تباہ کرنے کے بعد ہی دوسروں کو اس معاہدے پر دستخط کرنے کے لئے کہہ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس پاکستان کا موقف دوغلے پن اور منافقانہ ذہنیت کا عکاس ہے کہ اس نے ایک طرف آسٹریلیا کی قرارداد کی حمایت کی لیکن دوسری طرف خود معاہدے پر دستخط نہیں کئے۔

موجودہ سیاسی انتشار کے دور میں دو افراد کوئی بڑا فائدہ اٹھانے کے لئے امید لگائے ہوئے ہیں۔ ایک قاضی حسین احمد ہیں جن کے پاس ایک نہایت منظم جماعت اور بزرگوں کی محنت کی بدولت قائم ہونے والی نیک نامی کا سرمایہ موجود ہے۔ قاضی صاحب عرصے سے تیسری طاقت بننے کا خواب دیکھ رہے ہیں مگر سب کچھ کرنے کے باوجود وہ بری طرح ناکام رہے ہیں۔ بہتر ہوتا اگر وہ اپنے اکلوتے استعفاء کے بجائے جماعت کے تمام ممبران اسمبلی سمیت سیاست کے "گند" سے باہر آ جاتے۔ دوسری طرف عمران خان ہیں جنہیں اس وقت عالمی مہاجن کے آلہ کار کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ محض ایک مبہم سے "انصاف" کا نام لے رہیں اور سودی معیشت اور جاگیرداری نظام کے سلسلے میں مسلسل خاموش ہیں۔ پاکستان میں دو مرتبہ کسی بڑی اور مثبت تبدیلی کے لئے مواقع پیدا ہوئے لیکن دونوں مرتبہ

یہ مواقع گنوا دیئے گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو یہاں جاگیرداری نظام کا خاتمہ کر کے پاکستان کے ماؤزے تنگ بن سکتے تھے اور جنرل ضیاء الحق اسلامی نظام نافذ کر کے عمر بن عبدالعزیزؒ کا مقام حاصل کر سکتے تھے' لیکن دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر ناکام رہے۔

پاکستان کی مذہبی سیاسی جماعتیں دن رات اسلامی انقلاب کا نعرہ لگاتی ہیں لیکن انتخابات کی دلدل سے نکلنے کے لئے لئے تیار نہیں۔ ان جماعتوں نے جہاد کی طرح انقلاب کے لفظ کو بھی بدنام کر دیا ہے۔ مذہبی سیاسی جماعتوں کو انتخابی سیاست ترک کر کے حقیقی اسلامی انقلاب کے لئے کمربستہ ہونا چاہئے۔ ایک منظم انقلابی تحریک ہی اس ملک میں کوئی مستقل اور پائیدار انقلاب لا سکتی ہے۔ دو لاکھ تربیت یافتہ کارکنوں کے ذریعے گھیراؤ اور سول نافرمانی کا راستہ اختیار کر کے پاکستان میں اسلامی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔

بقیہ : عرضِ احوال

تحسین کی نگاہوں سے دیکھا گیا اور امیر محترم کے طرز فکر اور نقطہ نظر کو سراہا گیا کہ کرنے کا اصل کام یہی ہے۔ یہ اشتہار انہی صفحات میں ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح اتحاد المسلمین کے موضوع پر بھی ایک اہم مضمون شامل اشاعت کیا گیا ہے جس کے حوالے سے اہل علم کو خصوصی دعوت فکر دی گئی ہے۔

اتحاد بین المسلمین

اہمیّت، تاریخی پس منظر اور عملی تجاویز

ہر شخص جانتا ہے کہ پاکستان میں فرقہ واریت کی بنیاد پر دہشت گردی اور تشدد کے واقعات نہایت خوفناک صورت اختیار کر چکے ہیں۔ یہ صورت حال ملک و ملت کے داخلی استحکام کے اعتبار سے تو نہایت سنگین ہے ہی' ملک خداداد پاکستان میں نفاذ اسلام کی راہ کی بھی ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ ان حالات میں "اتحاد بین المسلمین" کا محض درس دینا کافی نہ ہو گا' اس کے لئے ٹھوس عملی قدم اٹھانا ضروری ہو گا۔ تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ حقیقی اتحاد کے لئے ٹھوس اور مثبت اساسات کا دستیاب ہونا ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اس ضمن میں ذیل میں ہم ایک نامور عالم دین کی تحریر شائع کر رہے ہیں جو ہماری رائے میں اتحاد کے عمل کے لئے ایک عمدہ بنیاد کا کام دے سکتی ہے۔ ہم نے اس مضمون میں سے بعض عبارات جن کے ذریعے صاحب مضمون کے مسلک کا اظہار ہو تا تھا' حذف کر دی ہیں تاکہ فرقہ بندی اور مسلک کی سطح سے بلند ہو کر معروضی طور پر اس مضمون کا مطالعہ کیا جا سکے۔ ہم اہل علم حضرات کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس مضمون کے مندرجات کا بغور مطالعہ فرمائیں اور اس بارے میں اپنی رائے سے ہمیں نوازیں کہ کیا ان بنیادوں پر امت مسلمہ کے تمام مسالک و فرق متحد نہیں ہو سکتے!! اس ضمن میں اہل علم کی جانب سے سنجیدہ تحریروں کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

خاکسار

اسرار احمد عفی عنہ

باسمہ تعالٰی

قرآن میں وحدت کی اقسام

۱۔ وحدت عالم بشریت

یاایھاالناس انا خلقناکم من ذکرٍ و انثٰی وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

(اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے خلق کیا اور تمہیں قوموں اور قبائل کی صورت میں بنایا تاکہ تمہارا تعارف ہو ۔ بے شک اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ صاحب تکریم وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہو ۔)

یہ ایک حقیقت ہے کہ عالم انسانیت قوموں اور قبائل میں بٹی ہوئی ہے اور ایسا تاریخ کے قدیم ترین ادوار سے ہے ، مگر خداوند کریم نے یہ اختلاف ، جنگ و شورش اور آشوب کے لئے نہیں بلکہ ایک دوسرے سے تعارف اور پہچان کے لئے بنائے ہیں تاکہ ایک دوسرے سے انس پیدا کریں ۔

۲۔ توحیدی ادیان کی وحدت

قرآن دین پرستوں کے درمیان ایک اور قسم کی وحدت کا قائل ہے اور وہ ہے توحیدی وحدت ، ایسی آیات قرآن میں موجود ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ دین کی حقیقت صرف اسلام ہی ہے ۔

ان الدین عند اللہ الاسلام

(بے شک دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے ۔)

قل یا اھل الکتاب تعالوا الٰی کلمۃٍ سواءٍ بیننا و بینکم ان لا نعبد الا اللہ و لا نشرک بہ شیئا "آل عمران ۔ آیت ۶۴"

(کہہ دو اے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے (مسلمانوں) اور تمہارے (اہل کتاب) کے درمیان مشترک ہے ، وہ یہ ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور اس (خدا) کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں ۔)

۳۔ امت مسلمہ کی وحدت:

جس وحدت پر ہم نے بحث کرنی ہے ، وہ امت مسلمہ کی وحدت ہے ۔ قرآن کریم

کا ارشاد ہے: إِنَّ هٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً (بتحقیق تمہاری امت ایک ہی امت ہے۔)
"سورۂ انبیاء۔ آیت۔ ۹۲"

قرآنی سیاق و سباق میں اس آیت کے دو معنی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت سب انبیاءؑ کے پیروکاروں سے مخاطب ہے کیونکہ اس آیت سے پہلے قرآن نے دوسرے انبیاءؑ کا ذکر کیا ہے، اس کے بعد کہا ہے۔
وَإِنَّ هٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ

لیکن بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ نہیں قرآن نے دیگر انبیاءؑ کا ذکر کرنے کے بعد مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے اور کہا ہے "ان کا ذکر تو ہم نے کیا، آپ کے متعلق کیا خیال ہے؟ آپ خود بھی تو ایک ہی امت ہیں۔

اس سے ہماری ایک امت ہونے کے معنی معلوم ہو جاتے ہیں۔ امت مسلمہ کے پیروکار چونکہ موحد ہیں، خدا پرست اور ایک پیغمبرؐ اور شریعت کے پیروکار ہیں، اس لئے تمام مسلمان ایک امت ہیں۔

قرآن نے اس موضوع پر بہت بحث کی ہے اور آیات کریمہ میں اس قدر لطیف نکات ہیں کہ انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ قرآن نے وحدت اسلامی اور مسلمانوں کی سعادت سے متعلق تمام امور میں سے کسی بھی شے کو نہیں چھوڑا۔ لیکن مسلمانوں کی اس طرف کوئی توجہ نہیں، وہ قرآن سے دور نہیں دور تر ہوتے جا رہے ہیں۔

وحدت اسلامی ایک اور مسئلہ ہے اور مذاہب کا نزدیک کیا جانا دوسرا مسئلہ، تاہم دونوں میں باہم ربط ہے، تقریب مذاہب و فرق مسلمانوں کی وحدت کا پیش خیمہ ہے۔ اسی بناء پر مسلمان ایک امت ہیں اور یہ ضروریات اسلام میں سے ہے۔

قرآن نے فرمایا: "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا" تاکہ مسلمان سب ایک صف میں قرار پائیں۔ ایک ہی رسی کو پکڑیں، وہ رسی، خدا کی رسی ہے، رسی کی بہت سی تفسیریں کی گئی ہیں، اس سے مراد قرآن، دین، اسلام اور احکام اسلامی ہیں، ———— ———— حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ایک اصول کی طرف رجوع کریں، اور وہ توحید، نبوت اور قیامت (کُلُّ ما جاءَ بِهِ الكتابُ، كلُّ ما جاءَ بِهِ الرسولُ (ص)) ہے۔

وحدت مسلمین کے ارکان

رکن اول ۔ اسلام کے قطعی اصول سے تمسک.

یعنی "حبل اللہ" قرآن سے تمسک کا اصول، دین اور قطعی طور پر مشترک چیزوں سے تمسک یعنی پیغمبر اسلام کی ذات مقدس ایک ہے، سب مسلمان اللہ کی وحدانیت کے قائل ہیں، وہ سب ایک ہی قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں، سب قرآنی قوانین پر عمل کے متعلق متفق ہیں اور سیاست، معاملات، احکام، قضاوت، قصاص و دیات پر سب اتفاق کرتے ہیں، جی ہاں جب بات فقہ تک آتی ہے تو مختلف فرق و مذاہب کے فقہاء کی آراء کے مطابق فرعی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

دوسرا رکن ۔ مشترکہ ذمہ داری:

وحدت مسلمین یعنی حبل اللہ سے متمسک ہونا اور مشترکہ ذمہ داری کو قبول کرنا واجبات میں سے ہے۔ جس طرح ہم پر نماز فرض ہے، اسی طرح امور مسلمین کا اہتمام و انصرام اور قرآن اور اسلام کے سلسلے میں ذمہ داریوں کو قبول کرنا بھی واجبات میں سے ہے، ایسا نہیں کہنا چاہیئے کہ اچھا یہ مسئلہ تو فلاں علاقے کے لوگوں کا ہے، یہ عرب و عجم کا مسئلہ ہے یا عربوں اور یہودیوں کا ہے۔ اس لیے اس سے ہمارا کیا تعلق ہے!

اخوت اسلامی

"سیرت ابن ھشام" سے اخوت اسلامی کی ابتداء کی ایک قوی سند ملتی ہے، سیرت ابن ھشام درحقیقت سیرت محمد ابن اسحاق ہے ——————— ان کی ایک کتاب کا نام "المغازی" ہے جو سیرت رسول اکرمؐ پر لکھی جانے والی قدیم ترین کتاب ہے اس میں لکھا ہے کہ ہجرت کے بعد پہلی نماز جمعہ کا پہلا خطبہ آپؐ نے محلہ بنی مسلمہ میں دیا اس کے بعد یثرب میں تشریف فرما ہوئے، پھر مہاجرین و انصار کے درمیان ایک عہد نامہ تحریر فرمایا جو عالم اسلام کی اہم ترین اور مستند ترین اسناد میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں انہوں نے تحریر فرمایا

"هٰذا كتابٌ عَن مُحمّدٍ النّبِی (ص) بینَ المُؤمنینَ والمسلمینَ مِن قُریشٍ و یَثرِبٍ و مَنْ تَبعَهُم" "سیرت ابن ھشام ۲ ۱۲۹، دار الکتاب العربی ۔ بیروت"

(یہ عہد نامہ ہے پیغمبر محمدؐ کی طرف سے قریش اور یثرب کے مومنین اور مسلمین کے مابین اور جو کوئی بھی ان کے بعد آئے گا اور ان افراد سے ملحق ہو گا ۔)

عہد نامے کا پہلا جملہ یہ ہے ۔ یہ مہاجرین و انصار اور جو کوئی بعد میں ان سے ملحق ہو گا ۔ سب ایک امت واحدہ ہیں ۔ تمام دیگر لوگوں (امتوں) کے مقابلے میں

پس امت واحدہ کا آغاز ہجرت ہی سے ہوا ۔ اس کے بعد سیرت ابن ھشام ہی میں درج ہے کہ اس مرحلے کے بعد آغاز ہجرت ہی میں " مؤاخات " یعنی مہاجرین و انصار کے درمیان براوری اور بھائی چارہ قائم کیا گیا ، اس موقع پر آپؐ نے ایک مہاجر اور ایک انصار کو بھائی قرار دیا ۔

اخوت کی اقسام

اسلام میں اخوت کی متعدد اقسام ہیں ۔

۱ ۔ نسبی یا صلبی اخوت یا ایک ماں باپ کی اولاد ۔ ۲ ۔ رضاعی اخوت ، (دودھ شریک)

۳ ۔ قومی اخوت کسی ایک قوم یا قبیلے کے افراد " وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ — بِالْأَحْقَافِ " اس آیت میں نبی کو قوم کا بھائی قرار دیا گیا ہے ۔

۴ ۔ اسلامی یا ایمانی اخوت ۔ (مومنین آپس میں بھائی ہیں ، پس اپنے بھائیوں کے درمیان اصلاح کرو ۔) " حجرات ۔ آیت ۱۰ "

اخوت کا ذریعہ ۔

قرآن اس الفت و محبت کو اخوت کا ذریعہ قرار دیتا ہے ، جسے وہ مومنین کے دل میں ڈالتا ہے ۔ ارشاد رب العزت ہے

خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم لوگ آپس میں دشمن تھے ، پس اسی نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈالی ۔

کفار کے دلوں میں ایک نوع کی محبت آپس میں قائم ہے مگر مومنین کی محبت اور کفار کی باہمی محبت میں بڑا فرق ہے ، اس فرق کو قرآن یوں بیان کرتا ہے ۔

(قیامت کے دن وہ جو دنیا میں آپس میں دوست ہوں گے آپس میں (ماسوائے متقین کے) ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے ۔) " زخرف ۔ آیت ۶۷

مومنین کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے :

"وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ"

(جو کینہ ان کے دلوں میں تھا، ہم نے ان کے دلوں سے زائل کر دیا اور ان کو مسندوں اور سریروں پر بھائیوں کی طرح قرار دیا) "حجرات - آیت ۴۷"

امت مسلمہ میں اختلاف کی جڑیں

اختلاف کی کئی قسمیں ہیں، بعض اختلافات تو ہمیشہ برے، مذموم اور مردود ہیں، لیکن بعض اختلاف اچھے ہیں یا کم از کم مردود اور مذموم نہیں ہیں - شاید بعض لوگ کہیں گے کہ مسلمانوں کو تو ہر معاملے میں وحدت و اتحاد رکھنا چاہئے - تمام فقہاء کو ایک طرح سے فتویٰ دینا چاہئے، سب مفکرین اور دانشوروں کو ایک انداز فکر و نظر اپنانا چاہئے -

مگر یہ چیز انسانی فطرت اور فطرت اسلام دونوں کے خلاف ہے، بعض اختلافات ایسے ہیں جو فکر، سوچ اور حق تک پہنچنے کا زینہ ہیں، مثلاً "شک" جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر یہ علم کا پیش لفظ اور ابتدائیہ ہو تو اچھا ہے -

۱- جدائی اور گروہ گروہ ہونے سے مانع آیات

"خداوند تبارک تعالیٰ پہلے تو رسولوں کو مخاطب فرماتا ہے کہ پاکیزہ چیزوں سے کھائیں اور عمل صالح انجام دیں، بعد میں فرماتا ہے کہ یہ تمہاری امت، ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں...." "انبیاء ۹۲، ۹۳"

آیت کے دوسرے حصے میں گروہ گروہ ہونے اور ٹکڑوں میں بٹ جانے کی مذمت ہے، پس یہاں اختلاف سے مراد کسی معاشرے یا کسی دین کے پیروکاروں کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ہے، پارٹی بازی کا مطلب یہ ہے کہ کوئی گروہ جان کی آخری رمق تک اپنے مقصد و مسلک کا دفاع کرے، اسی میں سرمست رہے اور فخر کرے اور دوسروں کی فکر کو مردود و مذموم جانے "كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ"

۲- "إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ كُلٌّ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ"

یعنی ہم نے حکم دیا کہ تم سب کے سب وحدت کی رسی سے متمسک رہو اور ایک امت رہو اور صرف ایک خدا کی پرستش کرو یعنی میری (خدا کی)، قرآن اختلاف کی طرف

اشارہ کناں آیات میں لوگوں کو دھمکی دیتا ہے کہ یہ ہمارے پاس آئیں گے تو ہم فیصلہ کریں گے کہ حق پر کون تھے۔

جس مقام پر گروہ بندی اور فرقہ واریت اختلاف کی بنیاد پر ہو وہاں بھی دھمکی دیتا ہے۔ " کُلٌّ اِلَینا رَاجِعُوْنَ " سب ہماری طرف پلٹ کر آئیں گے۔

دوسرا مجموعہ ان آیات کا ہے جو اختلاف سے منع کرتی ہیں اور حبل اللہ اور تقویٰ سے منسلک ہونے کی تلقین کرتی ہیں۔ مثلاً

يَاأَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسلِمُوْنَ وَاعتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعاً وَّلَا تفرّقوا ۔ كَانُوا يَعْتَدُوْنَ

"آل عمران - آیات ۱۰۲ تا ۱۱۲"

ان آیات میں اختلاف سے منع کر کے اس کا علاج بتایا ہے کہ اے مسلمانو! ایسا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ خدا کے لئے سزاوار ہے، وحدت کا حکم دینے سے پہلے قرآن تقویٰ کی بات کرتا ہے، وہ بھی ایسے تقویٰ کی جو خدا کے شایان شان ہو، یعنی جب تک تم لوگوں کے دل پاک نہیں ہو جاتے اور نفس پر قابو حاصل نہ ہو گا وحدت تک نہ پہنچ سکو گے۔

كُنْتُمْ خَيرَ أُمَّةٍ أُخرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ

(آپ بہترین امت تھے جو نیکیوں کا حکم دیتے اور برائیوں سے روکتے ہیں۔)

معروف (نیکی) وہی وحدت واخوت ہے جب کہ منکر (برائی) وہی فرقہ پرستی اور اختلاف اور ایمان سے کفر کی طرف جانا ہے

۳۔ تیسری قسم کی آیات تنازعے، جھگڑے اور دینی امور میں سست و کمزور ہونے اور دنیا پرستی سے منع کرتی اور اطاعت و صبر کا حکم دیتی ہیں:

وَأَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ وَلَا تَنَازَعُواْ فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصبِرُوْا إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِينَ

(خدا و رسولؐ کی اطاعت کرو باہم تنازعہ نہ کرو اور اختلاف کو نزاع کی صورت نہ دو، اس لئے کہ) تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔)

۴ ۔ آیات کریمہ کی چوتھی قسم حق کا علم ہو جانے کے بعد ایک دوسرے پر تجاوز و تعدی سے منع کرتی ہے۔

(ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کھلی نشانیوں کا علم حاصل ہو جانے کے بعد تفرقہ بپا کیا اور اختلاف کیا ۔)

۵ ۔ آیات کی پانچویں قسم گروہوں کے اختلاف کے متعلق ہے

(گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا ۔)

در حقیقت اگر امت گروہ گروہ ہو جائے تو یقیناً اختلاف پیدا ہوتا ہے ، احزاب یا گروہوں کا مسئلہ اہم ہے ، قرآنی نقطۂ نظر سے جس جگہ احزاب استعمال کیا گیا ہے ، وہاں مذمت ہے اور جس جگہ صرف " حزب " ہے وہاں مقصد ایک ہی گروہ اللہ کی جماعت " حزب اللہ " ہے ۔

اختلاف کی اقسام

۱ ۔ اگر مسلمان دین کے اصولی اور قطعی مسائل میں اختلاف کریں تو یہ اختلاف قابل قبول نہ ہوگا ، اگر عالم اسلام میں بعض ایسے لوگ ہوں جو مثلاً نماز کو قبول نہ کرتے ہوں تو ان سے مسلمان والا معاملہ نہیں کیا جائے گا لیکن اگر قبول تو کرتے ہوں مگر اس کی عملی کیفیت اور تفصیلات میں اختلاف کرتے ہوں ، تو یہ اختلاف اول الذکر اختلاف سے مختلف ہوگا اور اس کی قطعی طور پر مذمت نہیں کی جا سکتی ۔

۲ ۔ دوسری راہ خدا اور رسول کی طرف لوٹنا ہے ۔ اگر انسان کسی شئے کو نہ جانتا ہو تو اسے خدا کی طرف لوٹا دینا چاہیئے ۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ " سورۂ شوری ۔ آیت ۱۰ "

ہم جانتے ہیں کہ سارع دین ، خدا ہے ، حاکم حقیقی خدا ہے لہذا دینی اختلافات اور مجہولات کے سلسلے میں اسی سے رجوع کرنا چاہیئے ۔ یعنی کتاب اللہ سے رجوع کرنا ہوگا ۔

۳ ۔ تیسری راہ فقہ اور اجتہاد ہے ؛

(تمام مومن (اپنے مقام سے) ہجرت کر کے (علم کے حصول کے لئے) نہیں جا سکتے لہذا ہر گروہ میں سے لوگوں کی ایک جماعت جائے اور دین میں تفقہ حاصل کرے اور جب وہ پلٹ کر آئیں تو اپنی قوم اور قبیلے کو ڈرائیں ، شاید وہ اجتناب کریں ۔)

" سورۂ توبہ ۔ آیت ۱۲۲ "

تفقہ کے معنی ہیں گہرائی میں جانا اور کسی مسئلے کو سمجھنا۔

۴۔ چوتھی راہ اقوال اور بہترین بات کی پیروی کرنا ہے۔

(خوشخبری دو میرے ان بندوں کو جو بات کو سنتے ہیں اور اس میں سے بہترین کی پیروی کرتے ہیں۔)

"سورۂ زمر، آیات ۱۷، ۱۸"

احسن کے معنی ہیں دلیل، منفعت، مصلحت اور اجتماعی فائدے کے اعتبار سے جو بات بہترین ہو۔

فرقوں کو سیاسی اختلافات سے پاک کرنا

اس سے پہلے یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے مابین اختلافات کی جڑیں سیاسی بھی ہیں، اجتہادی بھی اور علمی بھی۔ تاہم اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم دین اور سیاست کی جدائی پر اعتقاد رکھتے ہیں بلکہ سیاست دو طرح کی ہے: ایک وہ سیاست جو عین اسلام ہے اور جس کا منشاؤ منبع دین، قرآن اور اسلام ہے جبکہ دوسری وہ سیاست ہے جو مختلف اسلامی ممالک کے جابر و غاصب حکام اور سلاطین کرتے ہیں اور صدیوں سے مسلمانوں کے اذہان کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کے لئے استعماری راہوں کو اپنائے ہوئے ہیں۔ اس سیاست نے ایسی گروہ بندی پیدا کی جس نے مسلمانوں کے مابین تعلقات پر منفی اثرات مرتب کئے ہیں اور اسی سیاست سے امت مسلمہ کی نجات مقصود ہے۔

منصف حکومت' اسلام کی ضروریات میں سے ہے۔ اسی طرح ظلم و ستم کی سیاست اسلامی سیاست نہیں ہے۔ جب ہم وحدت و اخوت اسلامی کی بات کرتے ہیں تو ہمیں ذہنوں کو ان منفی سیاستوں سے خالی کرنا چاہئے' یہ نکتہ بھی ذہن میں ہونا چاہئے کہ تقریب مذاہب کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سب ایک ہی فرقہ اختیار کرلیں۔ یہ تو قابل عمل نہیں ہے۔ ہماری ساری کوشش یہ ہے کہ مختلف فرقوں کے پیروکار خود کو گزشتہ تعصبات سے بالاتر کر کے دلیل اور برہان کی حدود میں رہ کر بحث کریں' یہاں تک کہ نازک ترین مسائل پر بھی اختلاف سے دور رہ کر بات کی جاسکتی ہے۔

اسلامی بنیاد پرستی (Islamic Fundamentalism)

مندرجہ بالا حقیقت کا نام انہوں نے اسلامی بنیاد پرستی رکھ دیا ہے ۔ اتفاقاً یہ ایک اچھا نام ہے یعنی وہ مسلمان جو اسلامی اصولوں کے پابند ہیں ۔ وہ لوگ جو اسلامی اصول منجملہ اس اصول کے کہ اسلام میں حکومت اور سیاست کا وجود ہے اس کے معتقد نہیں ہیں انہوں نے اصول پرستی سے دوری اختیار کر لی ہے ۔

اصول پرست یہ کہتے ہیں کہ جیسے کہ اسلام میں روزہ ، نماز ، حج اور جہاد ہے اسی طرح اس میں اسلامی حکومت بھی ہے ، نیز اعلانیہ طور پر کہتے ہیں کہ معاشرتی اور سیاسی نقطۂ نگاہ سے مسلمان ایک امت ہیں ، انہیں ایک دوسرے کی فریاد رسی کو پہنچنا چاہئے

اسلامی مذاہب و فرق پر سیاست کے مثبت اور منفی اثرات

اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں پر ۱۴ صدیوں کے دوران جو سیاستیں حکم فرما رہیں انہوں نے ان پر منفی اور برے اثرات مرتب کئے لیکن معروف جملہ ہے کہ " عیب آن جملہ بگفتی ہنرش نیز بگوی " (اس جملے کا عیب تو بیان کر دیا ، اب اس کی خوبی اور ہنر بھی بیان کرو) ، آیا یہ متضاد سیاستیں ایک لحاظ سے علمی ، ثقافتی ، اعتقادی اور فقہی ترقیوں کا سبب نہیں تھیں ؟

———— جہاں ان اختلافات نے ناگوار نتائج مرتب کئے وہاں مثبت علمی آثار بھی پیدا کئے ۔ لہٰذا ان کے ناگوار نتائج کو فراموش کر دینا بہتر ہے ۔ علم کلام ہمارا عظیم سرمایہ ہے ، اخلاقی بحثیں بھی اسلام کا افتخار ہیں ، یہ تمام عقائد و آراء کے آپس کے ٹکراؤ ہی کا تو نتیجہ ہیں ۔ عقائد و آراء کی بھی بہت سے مواقع پر سیاسی جڑیں تھیں ، لیکن اس کے علمی ثمرات اور نتائج کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے ۔ یہ مثبت علمی آثار ہمیں اندلس کی سرزمین سے لے کر عالم اسلام کے مشرق ، عراق میں بغداد اور مدینہ و عراق کے فقہی مکاتب میں برابر ملتے ہیں ۔

اتحاد اسلامی کی عملی صورتیں

پہلی راہ ۔ مشترکات پر عمل کرنا اور اختلافات ترک کرنا :

بعض مصلحین نے وحدت مسلمین کے لئے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ان مسائل کو

جو مشترک ہوں لے لیں اور دیگر تمام موضوعات، اختلافی کتب وغیرہ کو دور پھینک دیں۔ ان موضوعات پر بات بھی نہ کریں اور صرف مشترکات کو مدنظر رکھیں۔

یہ بات وہ حضرات کرتے ہیں جو تاریخ اور مذاہب و فرق کی روش سے آگاہ نہیں ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ مسلمانوں میں سے ہر ایک کسی ایک فقہ کا پیرو ہے، اور یہ راہ ۱۳۰۰ سال کے عرصہ میں طے ہوئی ہے۔ اب ہر کوئی ایک خاص طرح سے وضو کرتا ہے اور اس کے لئے دلائل بھی دیتا ہے، تو کیا وضو کرنا چھوڑ دیا جائے اور بے وضو نماز پڑھی جائے اسی طرح عقائد میں صفات باری تعالیٰ ہیں (مختلف اسلامی فرقوں میں اختلافی بحث ہے) کہ آیا صفات خدا عین ذات باری ہیں یا زائد بر ذات، ہر مذہب اپنے کلامی مباحث کی رو سے کچھ دلائل دیتا ہے۔ اب کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی کوئی صفت ہی نہیں؟ اس کا کوئی امکان نہیں، ایسی بات توحید کی مخالفت اور اسلام کے تمام مشترکہ اصولوں کے خلاف ہو گی۔ بہر حال ایک گروہ ہے جو جدید تعلیم پا کر اسلام کی طرف بھی رجحان رکھتا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ بھائی اختلافات کو دور پھینکو اور مشترکہ چیزوں کو لے کر متحد ہو جاؤ، مگر وہ نتائج سے بے خبر ہے، ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اختلافات کو زیادہ نہ اچھالو، انہیں میدان جنگ نہ بناؤ۔

دوسری راہ ۔ مکتب سلفیہ۔

دوسری راہ جس پر بحث کی گئی ہے، وہ ایک ہزار سال قدامت رکھتی ہے اور ——— وہ مسلک سلفیہ ہے، یعنی "سلف صالح" یا پچھلوں کی پیروی، اسے شاید امام احمد بن حنبلؒ نے ۲۴۱ھ میں بنایا، وہ یہ چاہتے تھے کہ فرقوں کو اکھاڑ دیں، لیکن ان کی یہ روش خود ایک فرقہ بن گئی اور آج کے دور میں ایک مسلمان ملک اسی روش و مسلک کا حامی بن گیا ہے۔ مسلک سلفیہ کے پیروکاروں اور حامیوں کی طرف سے اسلام کو صرف بعض عبادتوں مثلاً نماز، روزہ، حج و زکوۃ وغیرہ تک محدود کر دیا گیا ہے۔ (وہ سیاست سے لاتعلق رہتے اور سامراج سے مقابلہ نہیں کرتے ہیں، جب کہ اسلام ایک ضابطۂ حیات ہے، اس کے دائرے میں زندگی کے تمام پہلو شامل ہیں، جہاں اسلام عبادتوں کا حکم دیتا ہے وہاں معاشرے میں عدل و انصاف کے قیام، منصف حکومت کی تشکیل، دشمنان اسلام سے جہاد، اسلام کی بالا دستی کے لئے جدوجہد وغیرہ جیسے حیات آفرین احکام بھی رکھتا ہے۔) نیز اس روش کے مطابق اسلاف کی

طرف رجوع کرنا عصری تقاضوں کے مطابق اجتہاد کے راستوں کی بندش کا سبب بنتا ہے۔

تیسری اور چوتھی راہیں۔ ادغام مذاہب یا تخییر بین مذاہب

یہ وہ روش ہے جس پر ماضی کے بعض پیشواؤں اور حال کے علماء کا عمل رہا ہے وہ کہتے ہیں ہماری راہ صواب اور حق ہے، تمام مسلمان اس کو اختیار کریں۔ یہ راستہ اگر نرمی اور عطوفت سے اختیار کیا جائے تو نہ صرف برا نہیں بلکہ اچھا بھی ہے۔

ادغام سے مراد یہ ہے کہ فرق و مذاہب کے مشترکات کے علاوہ ہر مذہب کی مخصوص چیزوں میں سے بعض کو لے لیا جائے تاکہ سب مذاہب و فرق والے راضی ہو جائیں۔

ڈاکٹر محمد العاصی نے جو واشنگٹن میں امام مسجد ہیں، ایک کانفرنس میں یہ تجویز دی کہ اچھا ہے اگر ایک دن سب لوگ شیعہ طریقے سے نماز پڑھیں اور ایک دن سنی طریقے سے۔

یہ طریقہ ادغام مذاہب کا نہیں بلکہ تخییر بین مذاہب ہے۔ بہر حال یہ دونوں تجاویز بھی ناقابل عمل ہیں اور ان کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہے۔

تقریب مذاہب کی دوسری راہیں

ابن ابی الحدید معتزلیؒ (۵۸۶ھ - ۶۵۵ھ) کا نظریہ:

بغداد کے معتزلہ گروہ نے شیعہ اور سنی کا درمیانی راستہ اختیار کیا، بقول احمد امین مصری یہ راہ معتدل شیعوں کی راہ ہے، وہ ابن ابی الحدیدؒ کو معتدل شیعہ سمجھتا تھا، بقول ابن ابی الحدیدؒ ہم حضرت علیؓ کے متعلق آنحضرتؐ نے جو کچھ فرمایا اس کو قبول کرتے ہیں، یعنی "عليٌّ مَعَ الحَقِّ والحَقُّ مَعَ عليٍّ يدورُ معَهُ حيثما دارَ" (علیؓ حق کے ساتھ ہیں اور حق علیؓ کے ساتھ، حق ان کے گرد گھومتا ہے)۔ یعنی پیغمبر اسلامؐ کے بعد میزان اور معیار حق حضرت علیؓ ہیں، جس شے کو وہ قبول کرتے ہیں اسے ہم بھی قبول کرتے ہیں اور جس شے کو وہ رد کریں ہم بھی رد کرتے ہیں۔ معتزلہ کہتے ہیں علیؓ نے اپنے سے پہلے خلفاءؓ کی خلافت کو قبول کیا اور چونکہ انہوں نے قبول کیا ہم بھی قبول کرتے ہیں، اس وجہ سے خلافت کے حامیوں سے کوئی جھگڑا نہیں کرتے، خلفاءؓ نے خلافت کی اور علیؓ نے امامت کی۔

سید امیر علیؒ کا نظریہ:

سید امیر علیؒ ہندوستان کے ایک روشن خیال شیعہ دانشور تھے، انہوں نے اپنی کتاب " مختصر تاریخ اسلام " میں اپنا نظریہ بیان کیا ہے ۔ وہ انگریزوں کے دور میں برطانیہ کی ثقافتی کونسل کے ممبر تھے، وہ یہ کہتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے جو کچھ حضرت علیؓ اور ان کے خاندان کی خلافت کے متعلق فرمایا ہے، اسے قبول کرنا چاہئے ۔ حضرت رسول کریمؐ نے در حقیقت علیؓ کو خلافت کے لئے امیدوار بنایا، لیکن مسلمانوں پر ان کے انتخاب کو لازم قرار نہیں دیا بلکہ انہیں حق انتخاب دیا ۔ چاہتے تو قبول کرتے اور نہ چاہتے تو قبول نہ کرتے لیکن انہوں نے بعض سیاسی وجوہ کی بناء پر قبول نہ کیا ۔

سید امیر علیؒ اپنی اس تجویز سے شیعوں اور سنیوں میں ایک قسم کی صلح قائم کرنا چاہتے تھے، جبکہ ان کی تجویز کو نہ شیعہ قبول کرتے ہیں اور نہ سنی ۔

صوفیاءؒ کا نظریہ:

مشہور ہے کہ صوفیاء کہتے ہیں کہ ہم " صلح کل " ہیں ۔ شاید سارے ایسے نہ ہوں، مگر اکثریت خصوصاً " متصوفہ " ایسے ہی ہیں، وہ حضرت علیؓ اور اہل بیتؓ کو تمام فیوض ربانی کا مبدأ و سرچشمہ سمجھتے ہیں، ______________ اس کے بر عکس مسلمانوں کا ایک گروہ تصوف اور سیر و سلوک کو بدعت سمجھتا ہے ۔

استعمار کا تسلط اور مسلمانوں کی بیداری:

تاریخ کا پہیہ گھومتا ہوا استعماری دور تک پہنچا اور استعمار اسلامی ممالک پر مسلط ہو گیا ۔ یہ تیرھویں صدی ہجری کا زمانہ تھا، جب ایران میں قاجاری حکومت تھی، ۱۲۰۰ھ میں پہلے قاجاری بادشاہ کی تاج پوشی ہوئی، اس کے بعد ایران کئی بار اغیار اور اجانب کے حملات کا نشانہ بنا، لیکن سرکاری طور پر یہ ملک کالونی نہ بن سکا، جب کہ دیگر اسلامی ممالک کالونیاں بن چکے تھے ۔ ان ممالک میں استعمار کے خلاف مختلف تحریکیں شروع ہوئیں، قدرتی طور پر ان تحریکوں میں ایک باہمی نزدیکی کا پہلو بھی تھا اور مسلمہ طور پر ان میں وحدت مسلمین کی دعوت موجود تھی ۔ اکثر اسلامی ممالک میں شیعہ بھی تھے اور سنی بھی اور استعمار سے مقابلے کے لئے وہ ہماہنگ اور متحد ہو گئے ۔ ان ممالک خصوصاً عراق (اور برصغیر) میں اہل سنت اور اہل تشیع ایک ہی صف میں انگریزوں کے خلاف لڑے ۔

اتحاد کے لئے سید جمال الدین اسد آبادی (افغانی) اور شیخ محمد عبدہ کا طرز عمل.

(سید جمال الدین، وحدت مسلمین کے عظیم علمبردار تھے، ایران، برصغیر اور عرب ممالک میں انہوں نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا) ——————

—————— شیخ محمد عبدہ جامعۃ الازہر کے سربراہ اور سید جمال الدین کے شاگرد تھے، انہوں نے سید جمال الدین کا مشن جاری رکھا، وہ مصر میں اسلامی اتحاد کے لئے سرگرم رہے، ایک مدت تک جلاوطن بھی رہے، ان کا کہنا تھا کہ مسلمان حقائق اسلام سے ناآشنا ہیں لہذا جب تک وہ اسلام کی حقیقی معرفت حاصل نہ کریں انہیں ہمہ گیر اسلامی تحریک میں شامل نہیں کیا جاسکتا اسی لئے انہوں نے درس تفسیر کا سلسلہ شروع کر کے مسلمانوں کی فکری بیداری کا سامان فراہم کیا۔

مسلمانوں کو ایک دوسرے سے نزدیک تر کرنے کے لئے چند علمی اور سیاسی منصوبے

پہلا منصوبہ - واحد اسلامی حکومت

یہ ایک ایسا منصوبہ ہے جو آرزوؤں، امنگوں اور تخیلات کی حد تک تو قابل بحث ہے، لیکن کسی عنوان سے قابل عمل اور یہاں تک کہ اسلامی معاشرہ میں منصوبہ بندی کے قابل نہیں وہ یہ ہے کہ تمام اسلامی ممالک کے سیاسی، عدالتی، اقتصادی اور فوجی اداروں کو ملا کر ایک وسیع حکومت بنالی جائے، جس کی چند سرکاری زبانیں، ایک پرچم اور ایک ہی کرنسی ہو۔

—— حقیقت یہ ہے کہ دور رسالتؐ میں اور حضرت علیؓ کے دور کے سوا دیگر خلفائے راشدینؓ کے دور میں اسلامی مملکت متحد تھی۔ حضرت علیؓ کے دور میں شام خلافت کے ڈھانچے سے الگ ہو گیا اور بنو عباس کے آغاز تک یہی کیفیت رہی۔ اس کے بعد مسلمانوں کی مختلف حکومتیں، خلافتیں اور سلطنتیں عالم اسلام کے گوشہ و کنار میں وجود میں آتی رہیں۔ یہاں تک کہ حکومت عثمانیہ کو جنگ عظیم کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا، تو زیادہ تر اہل سنت نے تجدید خلافت کی فکر کی اور ہندوستان اور مصر میں تحریک احیائے خلافت چلائی گئی۔

اگر حکومتوں کو چھوڑ کر مسلمان قومیں دنیا میں ایک متحدہ اسلامی حکومت تشکیل دینے کے لئے آمادہ ہو جائیں، جو کہ بعید ہے تو کیا، مشرق و مغرب کی استعماری طاقتیں جو

مسلمان قوموں کے تفرقے اور حکومتوں کی اس کثیر تعداد سے فائدے اٹھاتی رہی ہیں، اس بات کی اجازت دیں گی؟

دوسرا منصوبہ - ریاستہائے متحدہ اسلامی کی تشکیل

اگر اس منصوبے سے مراد امریکہ یا سابق روس کی طرح کی متحدہ ریاستوں کا نظام ہو، تو یہ فوق الذکر منصوبے کی طرف پلٹتا ہے۔ لیکن اگر مراد یہ ہو کہ ان ریاستوں میں سے ہر ایک آزاد اور خود مختار اسلامی جمہوریہ ہو جس کی اپنی قومیت، زبان، پرچم اور کرنسی ہو اور امور خارجہ، سیاست، اقتصاد، صنعت اور دفاع میں تعاون واشتراک قائم کیا جائے تو یہ پہلے منصوبے سے الگ ایک اور منصوبہ ہوگا اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کر کے اس کے آئین، قواعد وضوابط اور تعاون کے طریقۂ کار کو تدوین کرنا ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی بھی وجہ سے یہ پہلے منصوبے کی طرح صرف خیالی اور آرزومندانہ نہیں بلکہ مسلماً ممکن اور قابل عمل ہے۔

ظاہری طور پر اسلامی کانفرنس کے منصوبہ سازوں کا حقیقی ہدف بھی کوئی ایسی ہی چیز ہوگی، البتہ یہ ماسوائے چند موقعوں کے ناکام رہا ہے چنانچہ مشکل یہ ہے کہ یہ کام کون انجام دے؟ کیا وہ نمائندے انجام دیں جو ظاہراً عالمی سامراج امریکہ اور صیہونزم سے وابستہ ہیں اور یہ کام بہت سی حکومتوں سے سازگار اور موافق نہیں اور نہ بین الاقوامی طاقتوں کے ساتھ ان کے معاہدوں سے ہماہنگ ہوگا۔ یہی بات اسلامی کانفرنس کی ناکامی کا سبب بنی ہے۔

——— اگر اس اسلامی بیداری کو اسلامی ممالک میں اسلام و مسلمین کے لئے مفید نتیجے تک پہنچانا ہے، تو اسلامی تحریکوں کو کلی مسائل میں آپس میں ایک قسم کی ہماہنگی پیدا کرنا اور مشترک اصول پر اتفاق کرنا ہوگا، ورنہ ان تحریکوں کی متضاد فطرتیں ان کی کامیابی کی صورت میں بھی انہیں ایک دوسرے کے مقابل لے آئیں گی۔ افغانستان کی مثال سب کے سامنے ہے، جہاں برادر کشی اور خانہ جنگی جاری ہے۔

تیسرا منصوبہ قیادت و رہبری کی وحدت یا قیادت کی کونسل

اس منصوبے کے دو جزوی اور کلی پہلو ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک دعویٰ یہ ہے کہ مجموعی طور پر ایک رہبر کا ہونا وحدت اسلامی ہے اور ایک دوسری چیز جو اس کلی

حکم کے علاوہ کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک ہی رہبر کی پیروی وحدت اسلامی کی بہترین راہ ہے۔

اس نقطۂ نظر کی دو دلائل سے تائید کی جا سکتی ہے۔ جیسا کے اشارہ کیا گیا یہ منصوبہ فریقین کی اسلامی روایات سے موافقت و مطابقت رکھتا ہے۔ فریقین کی کلامی کتابوں میں ہر زمانے میں وحدت امام اور وحدت خلیفہ کی تاکید کی گئی ہے۔

شیعہ اثنا عشری کے نقطۂ نگاہ سے جو امام کو معصوم اور منصوص من اللہ سمجھتے ہیں، امام کا ہر زمانے میں واحد ہونا ضروریات دین میں سے ہے۔ لیکن زیدیہ شیعہ کا موقف یہ ہے کہ وہ امام کو معصوم اور منصوص نہیں سمجھتے اور صرف شجاعت، علم، عدل کی صفات اور نسل رسول خداؐ سے ہونا نیز تلوار کے ذریعے جہاد کو صحت امامت کی شرائط سمجھتے ہیں۔ یہ مسئلہ زیر بحث رہا ہے کہ آیا ایک زمانے میں ان تمام اوصاف کے ساتھ ایک سے زیادہ امام ہو سکتے ہیں یا نہیں، شروع کے بعض زمانوں میں عملاً زیدیہ کے متعدد امام رہے ہیں، مذہب خوارج بالخصوص اباضیہ کا جو اس دور میں واحد معتدل خارجی فرقہ رہ گیا ہے، رہبر کا واحد ہونا قطعی ہے، ان کا عقیدہ دو قسم کے اماموں کا تھا: امام دعوت جو متعدد ہو سکتے ہیں اور امام جہاد جسے حتماً ایک ہونا چاہئے۔

۲۔ تمام سیاسی تحریکوں میں قائد کا واحد ہونا اور کسی ایسے شخص کا موجود ہونا جس کی بات حرف آخر ہو ایک شرط ہے،

دوسرے نقطۂ نظر کی توجیہ اس طرح سے کی جا سکتی ہے کہ آیت اللہ خمینی کی رہبری میں ایران میں انقلاب بپا ہونے کے بعد رہبر کے انتخاب کے لئے آئین میں ایسی خاص شرائط اور ضوابط کا تعین کیا گیا کہ جو تمام مذاہب و فرق اسلامی میں امام، خلیفہ یا ولی امر سے متعلق شرائط سے ہمآہنگ ہیں۔

رہبر معظم حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای جب صدر اسلامی جمہوریہ تھے اور وہ افریقہ کے سفر پر تشریف لے گئے تو افریقی ممالک کے سربراہوں میں سے ایک نے کہا تھا کہ خدا کا شکر کریں کہ آپ ایسے حالات میں ہیں کہ سپر طاقتوں کے سامنے یوں مضبوطی سے کھڑے ہو کر بات کر سکتے ہیں، میں ایک بار بھی ان سے ایسے لہجے میں بات کروں تو اگلے دن اس مقام پر نہیں ہوں گا۔

بہر حال اگر کسی دن مسلمان یہ چاہیں کہ وحدت قیادت سے اتفاق کریں تو حتمی طور پر وہ ایک قائد منتخب کر لیں گے یا قیادت کی کونسل بنے گی جس میں ان کے اپنے نمائندے ہوں گے لیکن زیادہ تر مشکل تو اس راہ میں اغیار سے وابستہ حکومتیں اور اغیار و اجانب کا اثر و رسوخ ہے ۔ ——————— لیکن اگر یہ قرار پائے کہ قیادت کی کونسل تمام اسلامی ممالک سے متعلق ہو تو لامحالہ اس کونسل میں دوسروں کی شرکت کے لئے راستہ کھل جائے گا تاکہ ہر کوئی اپنے علما اور مذہبی رہنماؤں میں سے ایک قائد کا انتخاب کرے اور کونسل جامع اور وسیع و عریض بن جائے ، جس میں اقوام اور اسلامی حکومتوں کی طرف سے انتخاب شدہ قائدین شامل ہو کر قیادت کے فرائض کو سنبھالیں ۔

چوتھا منصوبہ ۔ تعاون کے معاہدے

بعض اسلامی ممالک مثلاً ایران ، پاکستان اور ترکی کے مابین اکو کا معاہدہ موجود تھا ، اب اس کے اندر کئی اور ممالک شامل ہو گئے ، حقیقت یہ ہے کہ ایسے تعاونی معاہدے اسلام کے متن کے اندر موجود ہیں ۔

آیۂ مبارکہ " تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ " (نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کے ہمراہ تعاون کرو اور گناہ اور ظلم پر تعاون نہ کرو) مسلمانوں کو پابند کرتی ہے کہ تمام اسلامی مسائل میں تعاون اور ہمفکری اختیار کریں اگرچہ کوئی معاہدہ موجود نہ بھی ہو ۔

افسوس یہ ہے کہ جب بھی مسلمان چاہتے ہیں اس قسم کے امور میں آپس میں تعاون کریں تو ان کی بین الاقوامی اداروں یا معاہدوں میں شمولیت اس راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے اور انہیں سیاست کی زنجیروں میں جکڑ دیتی ہے اور وہ اپنے مشن کو عملی جامہ پہنانے میں ناکام ہو جاتے ہیں ، اس طرح کی مثالوں کا فلسطین ، کشمیر ، بوسنیا ، تاجکستان ، افغانستان ، قرہ باغ وغیرہ جیسی اسلامی سرزمینوں پر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے ۔

○

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہٖ الکریم

مجھے یقین ہے کہ

ملتان کا حالیہ دلدوز سانحہ

اصلاً اسلام اور پاکستان کے بیرونی دشمنوں

کی **دہشت گردی** ہے!

لیکن ظاہر ہے کہ دشمن کو ہمارے فرقہ وارانہ اختلافات سے نہایت مؤثر کور حاصل ہو گیا ہے۔ لہٰذا غالباً یہ آخری موقع ہے کہ

اہلِ سنّت اور اہلِ تشیّع کی جملہ جماعتوں

کے ذمہ دار لوگ اس غبارے میں سے ہوا نکالنے کے لیے جمع ہو جائیں جس کا کوئی ذریعہ اس کے سوا نہیں ہے کہ پوری قوم

نفاذِ اسلام کے مثبت نصب العین

پر جمع ہو جائے جو ہمارے جملہ داخلی اور خارجی مسائل و مشکلات کا واحد حل ہے اور اس کی واحد صورت یہ ہے کہ انقلاب کے داعی اور ذمہ دار حضرات کا متفقہ فارمولا جو جمہوریہ ایران کے دستور میں بھی ثبت ہے کو سب قبول کر لیں ۔ یعنی یہ کہ ہر ملک میں قوانینِ ملکی تو قرآن اور سنتِ رسولؐ کی ان تعبیرات کے مطابق بنائے جائیں جو اکثریتی فرقے کے نزدیک معتبر ہوں البتہ جملہ اقلیتوں کو قوانینِ شخصی میں مکمل آزادی کی ضمانت حاصل ہو۔ اگر ہم اب بھی نہ جاگے تو اندیشہ ہے کہ اللہ کی آخری سزا کا کوڑا ہم پر برس جائے اور وہ صورت پیدا ہو جائے کہ

ع "تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں!"

احقر الانام **اسرار احمد** عفی عنہ

داعیٔ تحریکِ خلافت پاکستان

سانحہ ملتان کے حوالے سے ملک کے اہم روزناموں میں امیر تنظیم اسلامی' ڈاکٹر اسرار احمد کی جانب سے ۲۶ ستمبر ۹۶ء کو شائع ہونے والے اشتہار کا عکس جس میں اہل سنت اور اہل تشیع کے ذمہ دار حضرات کے لئے غور و فکر کا وافر سامان موجود ہے۔

مرکزی سالانہ رپورٹ

تنظیم اسلامی

از اکتوبر ۹۵ء تا ستمبر ۹۶ء

مرتب کردہ

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی پاکستان

بموقع

اکیسواں سالانہ اجتماع تنظیم اسلامی

- مرکزی سالانہ رپورٹ
- سالانہ کارکردگی رپورٹ
- سالانہ رپورٹ شعبہ نشرواشاعت
- تربیتی نظام
- سالانہ رپورٹ حلقہ خواتین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرکزی سالانہ رپورٹ
تنظیم اسلامی پاکستان
(از اکتوبر 95ء تا ستمبر 96ء)

مرتب: ڈاکٹر عبدالخالق

تنظیم اسلامی پاکستان کا بیسواں سالانہ اجتماع 20 تا 22ر اکتوبر 95ء مینار پاکستان کے سبزہ زار میں منعقد ہوا تھا۔ اس سالانہ اجتماع کی خاص بات یہ تھی کہ تنظیم اسلامی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہم نے سالانہ اجتماع کا انعقاد کھلے میدان میں کیا۔ الحمدللہ ہمارا یہ پہلا تجربہ کافی کامیاب رہا۔ اس اجتماع کی کامیابی کے مختلف پہلوؤں اور پروگراموں پر مشتمل رپورٹ آپ نے میثاق کے دسمبر 95ء کے شمارہ میں ملاحظہ فرمائی ہو گی۔

گزشتہ سالانہ اجتماع کے فوراً بعد جو مجلس مشاورت نومبر 95ء میں منعقد ہوئی اس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ آئندہ (اکیسواں) سالانہ اجتماع ان شاء اللہ اسلام آباد میں منعقد کیا جائے گا۔ اسلام آباد میں اجتماع کے لئے بروقت اجازت نہ ملنے کے باعث اور اس امید پر کہ لیاقت باغ راولپنڈی زیادہ معروف بھی ہے اور یہاں عوام الناس اور رفقاء واحباب کا پہنچنا نسبتاً آسان ہو گا اکیسویں سالانہ اجتماع کے لئے راولپنڈی کے اس معروف باغ کا فیصلہ کیا گیا۔ ہم سب یقیناً حلقہ پنجاب شمالی کے ذمہ دار حضرات اور رفقاء کے شکر گزار ہیں کہ ان کی انتھک محنت اور جدوجہد کے باعث 4 تا 6ر اکتوبر یہاں پر نظام خلافت کے پروانوں کا جمع ہونا ممکن ہوا۔

مرکزی ٹیم کا تعارف

تنظیم اسلامی پاکستان کا تنظیمی نظم اوپر سے نیچے کی طرف چلتا ہے، چنانچہ تنظیم اسلامی کے مقاصد کے حصول کی جدوجہد کی ذمہ داری امیر محترم کے بعد سب سے زیادہ مرکزی ٹیم پر عائد ہوتی ہے۔ اس وقت مرکزی ٹیم میں پانچ افراد شامل ہیں جن کا تعارف کچھ یوں ہے۔ نائب امیر ڈاکٹر عبدالخالق (ناظم نشرواشاعت کی اضافی ذمہ داری کے ساتھ)، ناظم اعلیٰ عبدالرزاق، معتمد عمومی چودھری غلام محمد، ناظم تربیت

رحمت اللہ بٹراور ناظم بیت المال قمر سعید قریشی۔ تنظیم اسلامی بیرون پاکستان کے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر عبدالسمیع ہیں۔

رپورٹ کے ابتدا میں امیر محترم کی مصروفیت اور اسی کے ذیل میں نائب امیر کی مصروفیات کا تذکرہ کیا جائے گا۔ بعد ازاں آپ حلقہ جات کی رپورٹ مرتبہ ناظم اعلیٰ اور شعبہ تربیت اور شعبہ مالیات کی رپورٹ بالترتیب رحمت اللہ بٹراور قمر سعید قریشی صاحبان کی تیار کردہ ملاحظہ فرمائیں گے۔

امیر محترم کی مصروفیات

تنظیم اسلامی کے قیام کے کافی عرصہ بعد تک امیر محترم کی مصروفیات ہی درحقیقت تنظیم اسلامی کی رپورٹ ہوا کرتی تھی' لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

تنظیم کا پورا تنظیمی ڈھانچہ وجود میں آچکا ہے اور الحمدللہ کہ ہر سطح پر رفقاء وذمہ دار حضرات اپنی اپنی ذمہ داریاں اپنی اپنی استطاعت کے مطابق بھرپور انداز میں ادا کر رہے ہیں۔ لیکن اب بھی صورت حال یہ ہے کہ امیر محترم کی صحت اور عمر کے باوجود انفرادی سطح پر ان کی کارکردگی تنظیم کے فعال ترین حضرات سے کہیں بڑھ کر ہے۔

گزشتہ تنظیمی سال کے دوران انہوں نے بے شمار دعوتی و تنظیمی خطابات اور تقاریر کیں۔ تصنیف وتالیف اور انفرادی ملاقاتوں کا سلسلہ اس کے علاوہ ہے۔ لاہور میں موجودگی کے دوران آپ کے مستقل پروگراموں میں خطاب جمعہ مسجد دار السلام شامل رہا۔ نیز اس سال کے دوران امیر محترم نے ایک سالہ کورس کے شرکاء کو بھی پہلے سے بہت زیادہ وقت دیا' لٹریچر کا مطالعہ بھی خود ہی کرایا' نیز اہم موضوعات پر ان کے خطابات بھی ہوئے جو ریکارڈ کر لئے گئے ہیں اور استفادۂ عام کے لیے دستیاب ہیں۔ ماہ اکتوبر 95ء کے دوران اہم ترین پروگرام سالانہ اجتماع کا تھا جس کے دوران آپ نے خلافت کانفرنس میں اہم خطاب فرمایا۔ اس موقع پر آپ نے مسئلہ کشمیر پر تنظیم اسلامی کے موقف کا کھل کر اظہار کیا۔

یکم تا 5 نومبر کراچی کا دورہ کیا جس کے دوران خطاب جمعہ' پریس کانفرنس سے خطاب اور قرآن مرکز لانڈھی کے افتتاح کے موقع پر خطاب فرمایا۔

22ر نومبر کو صبح جہلم میں پریس کانفرنس سے خطاب کیا' نیز شام کو جلسہ عام سے خطاب فرمایا۔

24ر نومبر کو قرآن اکیڈمی فیصل آباد کے مجوزہ پلاٹ پر اجتماع جمعہ سے خطاب کیا۔ شام

کو انجمن کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی، صدارتی خطبہ دیا۔

25ر نومبر کو فیصل آباد سے بورے والا تشریف لے گئے، جہاں رات کو جلسہ عام سے خطاب فرمایا۔

26ر نومبر کو وہاڑی میں بار ایسوسی ایشن سے خطاب فرمایا۔ اسی روز رات کو خانیوال میں جلسہ عام سے بھی خطاب کیا۔ واضح رہے کہ ان اسفار میں راقم بھی امیر محترم کے ہمراہ رہا۔

30ر نومبر کو امیر محترم کراچی تشریف لے گئے، جہاں سے اگلی منزل سعودی عرب بغرض عمرہ تھی۔ سعودی عرب میں قیام کے دوران ایک چار روزہ تربیت گاہ کا انعقاد ہوا جس میں 36 کے قریب رفقاء و احباب شریک ہوئے۔ ان میں ابو ظبی سے شرکاء کی تعداد 25 تھی۔

مکہ المکرمہ میں قیام کے دوران 70 رفقاء اور 9 رفیقات نے مقام عقبہ پر تجدید بیعت کی۔ 16 تا 19 دسمبر جدہ میں قیام رہا جس کے دوران 4 اجتماعی پروگرام ہوئے۔ انفرادی ملاقاتوں کے علاوہ تنظیم اسلامی جدہ کا خصوصی پروگرام بھی ہوا، 18 رفقاء شریک ہوئے۔ ان پروگراموں میں راقم الحروف بھی شامل رہا۔

29ر دسمبر 95ء کو گوجرانوالہ ڈویژن کا علاقائی اجتماع منعقد ہوا۔ خطاب جمعہ کو عمومی اجتماع کی شکل دی گئی تھی۔ حاضری 700 کے قریب تھی۔ خطاب جمعہ کے بعد سوال جواب کی نشست بھی ہوئی۔ 28ر جنوری کو امیر محترم امریکہ تشریف لے گئے جہاں سے 5ر مارچ کو واپسی ہوئی۔ اس دوران راقم الحروف نے قائم مقام امیر کی ذمہ داری ادا کی۔ نیز رمضان المبارک کے دوران دورۂ ترجمہ القرآن کی ذمہ داری بھی نبھائی۔

امریکہ قیام کے دوران امیر محترم کی معروفیات کا تذکرہ بیرون پاکستان کی رپورٹ میں آئے گا۔

23، 24ر مارچ 96ء حلقہ لاہور کے علاقائی اجتماع میں شرکت کی غرض سے ساہیوال جانا ہوا۔ ایک خصوصی اجتماع کے علاوہ امیر محترم نے ایک بڑے جلسہ عام سے خطاب فرمایا۔

25، 26ر مارچ پنڈی گھیپ میں حلقہ پنجاب شمالی کا علاقائی اجتماع تھا۔ یہ جگہ راولپنڈی سے 120 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہاں پر بھی جلسہ عام سے خطاب کے علاوہ سوال جواب کی نشست بھی ہوئی۔

28 تا 31ر مارچ کراچی کا دورہ کیا، خطاب جمعہ کے علاوہ رفقاء کے اجتماع میں شرکت کی۔ خصوصی ملاقاتوں میں اہم ترین مولانا وصی مظہر ندوی سے ملاقات تھی جو بعد ازاں مزید رابطے اور افہام و تفہیم کا ذریعہ بنی۔

12 تا 14ر اپریل امیر محترم نے ملتان کا دورہ کیا۔ اس دوران قرآن اکیڈمی ملتان میں اجتماع جمعہ نیز ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن ہال ملتان میں خطاب فرمایا۔ چند ایک اہم ملاقاتیں بھی ہوئیں۔

25ر اپریل کو اسلام آباد جانا ہوا۔ موتمر عالم اسلامی کی مسجد میں محفل نکاح سے خطاب فرمایا۔

26ر اپریل کو لاہور میں مرکزی مجلس اقبال کے زیر اہتمام الحمرا ہال میں ایک اجتماع منعقد ہوا۔ اس میں امیر محترم نے اہم خطاب فرمایا۔

30ر اپریل بعد نماز عصر فیصل آباد میں انجمن خدام القرآن فیصل آباد کے اجلاس سے خطاب فرمایا۔ بعد نماز مغرب فیصل آباد میں ہی ایک خصوصی نشست میں ڈاکٹر سیف الرحمٰن (امریکہ سے رفیق تنظیم) کے اعزہ واقارب کے سامنے تنظیم کی دعوت رکھی۔

یکم مئی کو ٹوبہ ٹیک سنگھ (دار السلام) میں بلال مسجد میں اجتماع عام سے خطاب فرمایا۔ بعد نماز عصر سوال وجواب کی نشست بھی ہوئی۔

5ر مئی کو امیر محترم نے "ایوان وقت" میں معروف دینی وسیاسی شخصیات کے ہمراہ شرکت کی۔

9ر مئی کو امیر محترم کوئٹہ تشریف لے گئے' ناظم اعلیٰ ہمراہ تھے۔ گورنمنٹ سائنس کالج کے آڈیٹوریم میں عمومی پروگرام ہوا۔ مسجد طوبیٰ کوئٹہ میں اجتماع جمعہ سے خطاب کیا' سوال جواب کی نشست بھی ہوئی۔ تنظیم اسلامی کوئٹہ کے رفقاء کا اجتماع منعقد ہوا۔ اس دورہ کے دوران چند ایک اہم ملاقاتیں بھی ہوئیں۔

10ر مئی کو راقم الحروف نے دفتر حلقہ پنجاب غربی کے انتظامی مسائل کو نپٹانے کی خاطر فیصل آباد کا دورہ کیا۔

29ر مئی کو امیر محترم 4 روزہ دورہ پر کراچی تشریف لے گئے' ناظم اعلیٰ ہمراہ تھے۔ قرآن اکیڈمی کراچی میں خطاب جمعہ کے علاوہ رفقاء کا خصوصی اجتماع بھی ہوا۔ نیز انفرادی ملاقاتیں بھی ہوئیں۔

14 تا 20ر جون حلقہ آزاد کشمیر وحلقہ پنجاب شمالی کا طویل دورہ ہوا۔ اس دوران 15' 16ر جون حلقہ آزاد کشمیر کے علاقائی اجتماع کے حوالہ سے دھیرکوٹ میں دو جلسہ ہائے عام ہوئے۔ رنگلہ میں سکول کے اساتذہ سے خصوصی نشست ہوئی' نیز اہم انفرادی ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ دھیرکوٹ میں رفقاء کا خصوصی اجتماع بھی ہوا۔

17ر جون کو آزاد کشمیر کے صدر مقام مظفر آباد میں ایک بڑے جلسہ عام سے امیر محترم نے

خطاب فرمایا' صدارت معروف دینی شخصیت مولانا مظفر حسین ندوی مدظلہ نے فرمائی۔ ایک محفل نکاح سے خطاب کا بھی موقع ملا۔ تنظیم اسلامی مظفر آباد کے رفقاء کی ایک خصوصی نشست بھی امیر محترم کے ساتھ ہوئی۔

18ر جون کو بالاکوٹ پہنچے' نماز ظہر کے فوراً بعد مرکزی جامع مسجد سید احمد شہید میں امیر محترم نے سوا گھنٹہ خطاب فرمایا۔ سوال جواب کی نشست بھی ہوئی۔

19ر جون کو بالاکوٹ سے مانسہرہ جاتے ہوئے عطر شیشہ کے مقام پر ایک ہائی سکول کے اساتذہ سے خصوصی خطاب کا موقع ملا۔ اسی روز رات 8 بجے ایبٹ آباد میں عمومی خطاب کا پروگرام تھا جو بہت کامیاب رہا۔ ڈاکٹرز' وکلاء اور اساتذہ کی کثیر تعداد نے یہ خطاب سنا۔

20ر جون کو ایبٹ آباد سے اسلام آباد واپسی ہوئی۔ اسلام آباد میں امیر محترم نے اخوت اکیڈمی کا دورہ کیا۔ اس دوران اکیڈمی کے نوجوانوں سے تبادلہ خیال کا موقع بھی ملا اور سوال جواب کی نشست بھی ہوئی۔

21ر جون کا جمعہ مسجد دار السلام باغ جناح میں پڑھایا اور صرف ایک روز لاہور ٹھہرنے کے بعد 22ر جون کو سانگلہ ہل کے لئے روانگی ہوئی۔ یہاں بعد نماز عصر جلسہ عام کا پروگرام تھا۔ سخت حبس کے موسم کے باوجود کثیر تعداد میں لوگوں نے بڑی دلچسپی سے امیر محترم کا خطاب سنا۔ بعد نماز مغرب سوال جواب کی نشست بھی ہوئی جو 45 منٹ جاری رہی۔

23ر جون ٹوبہ ٹیک سنگھ میں الھدیٰ لائبریری کا افتتاح تھا۔ رفیق محترم عبدالواحد عاصم صاحب کی ذاتی کوششوں سے یہ لائبریری قائم ہوئی ہے۔ اس موقع پر امیر محترم نے ایک گھنٹہ خطاب فرمایا۔ بعد ازاں سوال جواب کی نشست بھی ہوئی۔ قبل از دوپہر عبدالواحد عاصم صاحب کے مکان پر خصوصی ملاقاتوں کی ایک نشست بھی ہوئی۔ شہر کی معروف شخصیات نے ملاقات کی۔ یہ محفل سوال جواب کی نشست کی صورت اختیار کئے رہی۔

26ر جون کو امیر محترم کراچی تشریف لے گئے۔ 28 تا 30ر جون حلقہ سندھ بلوچستان کا علاقائی اجتماع قرآن اکیڈمی کراچی میں منعقد ہوا۔ راقم الحروف کے علاوہ ناظم اعلیٰ نے بھی اس پروگرام میں شرکت کی۔ امیر محترم نے اجتماع جمعہ نیز اجتماع رفقاء سے خطاب فرمایا۔ اس اجتماع سے خطاب کے لئے مولانا وصی مظہر ندوی صاحب کو خصوصی طور پر دعوت دی گئی تھی۔ موصوف نے "فقہی اختلافات میں اعتدال کی راہ" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

19ر جولائی کو امیر محترم ڈیڑھ ماہ کے دورے پر امریکہ تشریف لے گئے' واپسی 5ر ستمبر کو ہوئی۔

5تا9ر ستمبر کراچی واندرون سندھ مختلف پروگرام ہوئے۔ کراچی میں ایک خصوصی دعوتی اجتماع 5ر ستمبر کی رات منعقد ہوا۔ 6ر ستمبر کو اندرون سندھ ہالہ کے قریب ایک دینی مدرسہ میں امیر محترم کا پروگرام تھا۔ خطاب جمعہ کے علاوہ مدرسہ کے اساتذہ وطلبہ سے خطاب میں امیر محترم نے "علم کی حقیقت" کو واضح کیا۔ 7ر ستمبر کو حیدر آباد میں جلسہ عام کا پروگرام تھا۔ رات پونے دس تا پونے بارہ بجے امیر محترم نے تفصیلی خطاب میں امت مسلمہ کی زبوں حالی کا نقشہ بیان کرنے کے بعد اس کی نشاۃ ثانیہ کے لئے تنظیم اسلامی کی جدوجہد کے طریق کو واضح فرمایا۔ حاضری 700 کے قریب تھی۔ حیدر آباد میں قیام کے دوران دیگر اہم پروگراموں میں ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن سے خطاب' مشہور سندھی اخبار "کاوش" کے لئے انٹرویو اور سندھی دانشوروں سے خصوصی خطاب شامل تھا۔ یہ تمام پروگرام الحمدللہ انتہائی کامیاب رہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ امیر محترم نے ذمہ دار حضرات کو یہ عندیہ دیا کہ وہ حیدر آباد میں تین روزہ خطبات خلافت کا اہتمام کریں۔

امیر محترم دین کی دعوت کو لے کر کس طرح قریہ قریہ اور بیرون ملک گھومے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس تنظیمی سال کے دوران 365 دنوں میں امیر محترم کے قریباً 200 دن لاہور سے باہر اندرون وبیرون ملک اسفار اور پروگراموں میں بسر ہوئے۔

خصوصی اسفار کے حوالے سے 23ر جولائی کو راقم الحروف ناظم اعلیٰ کے ہمراہ ایک دن کے دورے پر فیصل آباد گیا۔ نیز 26' 27ر جولائی راولپنڈی جانا ہوا۔ سالانہ اجتماع کے انتظامات کے سلسلہ میں ناظم اجتماع شمس الحق اعوان صاحب سے مشورہ ہوا۔ نیز پنڈی گھیپ میں منعقد ہونے والی مبتدی تربیت گاہ کے شرکاء سے ملاقات وخطاب کا موقع ملا۔

اہم ملاقاتیں

ماہ نومبر 95ء میں دورۂ کراچی کے دوران امیر تنظیم اسلامی نے ایم کیو ایم حقیقی کے رہنما آفاق احمد سے ملاقات کی۔

نیز کراچی کے معروف دانشور رشید احمد قدوائی (اب مرحوم ہو چکے ہیں) قرآن اکیڈمی کراچی میں ملاقات کے لئے تشریف لائے۔

ماہ مارچ میں کراچی میں امیر محترم نے مولانا وصی مظہر ندوی صاحب سے ملاقات کی۔ ماہ اپریل میں ملتزم رفقاء کی مجوزہ تربیت گاہ میں جماعت اسلامی وتحریک اسلامی کے زعماء کو شرکت وخطاب کی دعوت دی گئی۔ دعوت نامہ لے کر راقم الحروف اور ناظم اعلیٰ نے ان جماعتوں کے اکابرین سے ملاقات کی۔

10ر اپریل کو ڈسٹرکٹ جیل کوٹ لکھپت میں سپاہ صحابہ کے زعماء مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی اور مولانا اعظم طارق صاحبان سے راقم الحروف اور ناظم اعلیٰ نے ملاقات کی۔

11ر اپریل کو تحریک اسلامی کے سالانہ اجتماع میں شرکت کی اور مولانا مختار گل صاحب (امیر تحریک اسلامی) سے ملاقات کی۔

25ر اپریل کو اسلام آباد میں ماہانہ "دینی صحافت" کے مدیر جناب سجاول رانجھا صاحب نے امیر محترم سے تفصیلی ملاقات کی۔

5ر مئی کو امیر محترم ایرانی قونصل جنرل کی رہائش گاہ پر تشریف لے گئے۔ اس ملاقات میں محترم جنرل محمد حسین انصاری اور راقم الحروف ہمراہ تھے۔

7ر مئی کو راقم الحروف' ناظم اعلیٰ اور ناظم حلقہ لاہور ڈویژن نے الاخوان کے امیر مولانا اکرم اعوان صاحب سے ملاقات کی' ان کی برپا کردہ نئی "تحریک تبدیلی نظام" کے مقصد پر گفتگو ہوئی۔

10ر مئی کو کوئٹہ میں اسسٹنٹ پروفیسر سائنس کالج امیر تنظیم سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ بلوچستان کے ایک مقام جھٹ پٹ کے اسسٹنٹ کمشنر نے امیر محترم سے تفصیلی ملاقات کی۔

19ر مئی کو مولانا وصی مظہر ندوی امیر محترم کی دعوت پر لاہور تشریف لائے' ان کا قیام ایک ہفتہ تک رہا۔ قریباً روزانہ ہی امیر محترم کے ساتھ نشست رہی۔ مرکزی دفتر تنظیم اسلامی بھی تشریف لائے' نیز اکابرین تنظیم کے ساتھ بھی خصوصی نشستیں ہوئیں۔

14ر جون کو اسلام آباد میں جماعت اسلامی کا ایک وفد ڈاکٹر افضل اعزاز کی قیادت میں امیر محترم سے ملاقات کے لئے آیا۔ اخوت اکیڈمی اسلام آباد کے ایک وفد نے امیر محترم سے ملاقات کی۔

16ر جون کو دھیرکوٹ قیام کے دوران سردار عبدالغفار خان (برادر خورد سردار عبدالقیوم) امیر محترم سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ نیز وائس پرنسپل ڈگری کالج دھیرکوٹ' ایک لیکچرار ایس ایچ او' اے ایس آئی اور دو ڈاکٹر حضرات نے امیر محترم سے خصوصی ملاقات کی۔

17' 18ر جون مظفر آباد قیام کے دوران فرنٹیئر پوسٹ کے نمائندے نے امیر محترم سے انٹرویو لیا۔ چند معززین شہر بھی ملاقات کے لئے تشریف لائے۔

مولانا مظفر حسین ندوی نے امیر محترم سے خصوصی ملاقات کی اور اس موقع پر تنظیم میں شمولیت بھی اختیار کی۔ امید ہے کہ ان کی شمولیت سے آزاد کشمیر میں تنظیم اسلامی کو کافی تقویت

حاصل ہوگی۔

18ر جون کو بالا کوٹ میں قیام کے دوران معززین شہر امیر محترم سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ معروف دینی شخصیت مولانا غلام ربانی صاحب نے امیر محترم سے خصوصی ملاقات کی۔

19ر جون کو مانسہرہ میں Elementary College کے پرنسپل امیر محترم سے ملاقات کے لئے خصوصی طور پر تشریف لائے۔

ایبٹ آباد میں امیر محترم نے اپنے ایم بی بی ایس کے کلاس فیلو اے جے خان صاحب سے ملاقات کی۔ نیز منصب خان صاحب اور ان کے اعزہ سے ملاقات کے لئے ان کے گھر تشریف لے گئے۔ موصوف نے ایبٹ آباد میں ایک قطعہ زمین قرآن کالج کے لئے وقف کرنے کا عزم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہمت و توفیق عطا فرمائے۔

20ر جون کو اسلام آباد سے لاہور واپسی کے دوران سرائے عالمگیر میں امیر محترم نے اپنے کالج کے استاذ پروفیسر اشفاق علی خان صاحب سے ملاقات کی۔ جہلم کے چند رفقاء تنظیم بھی ہمراہ تھے۔

27ر جون کو اپنے قیام کراچی کے دوران' امیر محترم نے سندھی نیشنلسٹ رہنما ممتاز بھٹو صاحب سے خصوصی ملاقات کی۔

16 تا 18ر جولائی کے دوران امیر محترم نے تحریک اسلامی کے زعماء مولانا مختار گل و مولانا نعیم صدیقی صاحبان سے خصوصی ملاقاتیں کیں۔

نظام مشاورت

بیعت کی اساس پر قائم ہیئت تنظیمی میں مشاورت کی اہمیت دستوری و قانونی جماعتوں سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ الحمد للہ کہ اس کی اہمیت کے پیش نظر تنظیم اسلامی میں ہر سطح پر مشاورت کا نظام اپنی اصل روح کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ مقامی تنظیموں اور حلقہ جات کی سطح پر بھی اور مرکزی سطح پر بھی۔

مرکزی دفتر میں مرکزی ناظمین کا اجلاس ہر ہفتہ باقاعدگی سے ہوتا ہے۔ نیز ایک ماہانہ اجلاس امیر محترم کے ساتھ ہوتا ہے۔ ناظمین حلقہ جات کا اجلاس ناظم اعلیٰ کے ساتھ' نیز مرکزی ناظمین کے ہمراہ امیر محترم کے ساتھ ہر دو ماہ بعد منعقد ہوتا ہے' جس میں پورے پاکستان کی تنظیمی و دعوتی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ نیز آئندہ کے اہداف متعین کئے جاتے ہیں۔

مرکزی مجلس مشاورت کا اجلاس ہر چار ماہ کے بعد منعقد ہوتا ہے' جس میں منتخب اراکین شریک ہوتے ہیں' جن کی تعداد اس سال کے دوران 21 ہو گئی ہے۔ (مرکزی مجلس مشاورت کا انتخاب ہر دو سال کے بعد ہوتا ہے' اس سال کے دوران نئے انتخابات منعقد ہوئے)۔ اس اجلاس میں مرکزی و حلقہ جاتی ناظمین بھی شریک ہوتے ہیں۔ اس طرح مرکزی مجلس مشاورت کے اراکین کی کل تعداد لگ بھگ 40 ہو جاتی ہے۔ گزشتہ سال کے دوران مرکزی مجلس مشاورت کے تین اجلاس ہوئے۔ مزید بر آں رفقاء کے وسیع تر حلقہ کی آراء سے استفادہ کی خاطر توسیعی مشاورت کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں تنظیم اسلامی کا کوئی بھی رفیق اظہار خیال کر سکتا ہے۔ حسب معمول گزشتہ سال کے دوران بھی ایسا ایک اجلاس مرکزی دفتر میں منعقد ہوا۔

سالانہ کارکردگی رپورٹ
تنظیم اسلامی پاکستان
(از اکتوبر 95ء تا اگست 96ء)

مرتب: عبدالرزاق

گزشتہ سال کے دوران ناظمین حلقہ جات نے الحمد للہ اپنے اپنے حلقوں میں تنظیم کے مقاصد کے حصول کے لئے اپنے ساتھیوں کے تعاون سے بھرپور جدوجہد کی۔ تنظیم کے انتہائی محدود وسائل کو رفقاء کی محنت اور بہتر منصوبہ بندی کے ذریعے نتیجہ خیز بنانے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ اپنے وسائل کے دائرے میں رہتے ہوئے توسیع دعوت کے لئے مختلف النوع طریقے اختیار کیے گئے۔ رفقاء کی تربیت اور محاسبہ کے عمل کو حکمت و تدبیر سے چلانے کی کوشش کی گئی۔

تنظیم کی پالیسیوں اور لائحہ عمل پر مشورے اور حلقوں کے تنظیمی مسائل پر گفتگو کے لئے دوران سال چار مرتبہ جنوری' اپریل' جولائی اور ستمبر میں مرکز میں توسیعی مجلس عاملہ کے تین روزہ اجلاس ہوئے جن میں پاکستان کے آٹھوں حلقوں کے ناظمین نے شرکت کی۔ راقم نے بھی مختلف مواقع پر حلقہ جات کے دورے کئے اور مقامی تنظیم کے امراء اور دیگر ذمہ دار رفقاء سے ملاقاتیں کر کے مقامی مسائل کو حل کرنے کے لئے مشورے اور ہدایات دیں۔

تنظیم اسلامی پاکستان میں اس وقت رفقاء کی تعداد 2160 ہے جن میں 729 ملتزم اور 1431 مبتدی ہیں۔ نظم کے لحاظ سے تنظیم 10 حلقہ جات میں منقسم ہے جن کے تحت 34 تنظیمیں

اور 146 اسرہ جات قائم ہیں۔ دوران سال 4 تنظیمیں اور 10 اسرہ جات نئے تشکیل دیئے گئے۔ ان کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی۔ علاوہ ازیں سعودی عرب میں تنظیم اسلامی الجبیل اور تنظیم اسلامی الریاض کسی حلقے سے منسلک ہوئے بغیر کام کر رہی ہیں۔ یاد رہے کہ تنظیم اسلامی پاکستان میں تنظیمی اعتبار سے متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب کے رفقاء بھی شامل ہیں۔ رپورٹ کے آغاز میں حلقہ جات کا مختصر تعارف پیش ہے۔

1- حلقہ سندھ وبلوچستان

یہ پاکستان کے دو صوبوں پر مشتمل ہے اور رقبہ کے لحاظ سے تنظیم اسلامی کا سب سے بڑا حلقہ ہے۔ اس حلقے کی نظامت کی ذمہ داری محترم محمد نسیم الدین صاحب کے پاس ہے اور معتمد محمد سمیع صاحب ہیں۔ اس میں کل سات تنظیمیں ہیں جن میں سے چھ کراچی میں اور ایک کوئٹہ میں ہے۔ دوران سال دو منفرد اسرہ جات' اسرہ پرانا شہر کراچی اور اسرہ دادو سندھ کے نام سے بنائے گئے۔ حلقہ کے تحت پانچ منفرد اسرہ جات کراچی ضلع غربی' کراچی پرانا شہر' دادو' حیدر آباد اور سکھر میں قائم ہیں۔ تنظیمیں اور ان کے امراء درج ذیل ہیں۔

تنظیم	امیر
تنظیم اسلامی کراچی وسطی I	جناب رونی جلیس صاحب
تنظیم اسلامی کراچی وسطی II	جناب جلال الدین اکبر صاحب
تنظیم اسلامی کراچی شرقی نمبر 1	جناب محمد عبدالنعیم صاحب
تنظیم اسلامی کراچی شرقی نمبر 2	جناب اعجاز لطیف صاحب
تنظیم اسلامی کراچی شرقی نمبر 3	جناب نوید احمد صاحب
تنظیم اسلامی کراچی جنوبی	جناب زین العابدین صاحب
تنظیم اسلامی کوئٹہ	جناب محبوب سبحانی صاحب

2- تنظیم اسلامی حلقہ پنجاب جنوبی

یہ رقبہ کے لحاظ سے صوبہ پنجاب کا سب سے بڑا حلقہ ہے جس میں ملتان کے علاوہ وہاڑی' بہاولپور' رحیم یار خان' ڈیرہ اسماعیل خان' مظفرگڑھ' ڈیرہ غازی خان اور لیہ وغیرہ کے علاقے شامل ہیں۔ اس حلقہ کی نظامت انجینئر مختار حسین فاروقی صاحب کے سپرد ہے۔ اس حلقے کے تحت 4 تنظیمیں اور چھ اسرہ جات نیو ملتان' صادق آباد' چک سردار پور' بہاولپور' بورے والہ اور میلسی قائم ہیں۔ دوران سال اسرہ بورے والہ نیا تشکیل دیا گیا ہے۔ تنظیموں کے نام اور ان کے امراء کا تعارف حسب ذیل ہے۔

تنظیم	امیر
تنظیم اسلامی ملتان شمالی	ڈاکٹر طاہر خان خاکوانی صاحب
تنظیم اسلامی ملتان وسطی	جناب سعید اظہر عاصم صاحب
تنظیم اسلامی ملتان کینٹ	جناب ڈاکٹر عمر علی خان صاحب
تنظیم اسلامی وہاڑی	جناب راؤ محمد جمیل صاحب

3- تنظیم اسلامی حلقہ لاہور ڈویژن

یہ حلقہ پورے لاہور ڈویژن پر مشتمل ہے جس میں لاہور کے علاوہ قصور' چونکی' اوکاڑہ' ساہیوال کے علاقے شامل ہیں۔ اس حلقہ کے ناظم محمد اشرف وصی صاحب ہیں۔ ان کے ساتھ معتمد کی ذمہ داری حافظ محمد اقبال صاحب کے پاس ہے۔ یہ حلقہ چھ تنظیموں اور پانچ اسرہ جات قرآن کالج' ہیر' ساہیوال' حجرہ شاہ مقیم اور جمبو پر مشتمل ہے۔ تنظیموں کے امراء کے نام درج ذیل ہیں۔

تنظیم	امیر
تنظیم اسلامی لاہور شمالی	جناب اقبال حسین صاحب
تنظیم اسلامی لاہور وسطی	مرزا ایوب بیگ صاحب
تنظیم اسلامی لاہور جنوبی	پروفیسر فیاض حکیم صاحب
تنظیم اسلامی لاہور شرقی	ڈاکٹر عارف رشید صاحب
تنظیم اسلامی لاہور چھاؤنی	حافظ محمد اقبال صاحب
تنظیم اسلامی لاہور غربی	ڈاکٹر اقبال حسین صاحب

4- تنظیم اسلامی حلقہ پنجاب غربی

یہ حلقہ فیصل آباد' جھنگ' سرگودھا اور میانوالی وغیرہ کے علاقوں پر مشتمل ہے۔ حلقہ کے ناظم جناب محمد رشید عمر صاحب ہیں۔ یہ حلقہ دو تنظیموں اور دو اسرہ جات میانوالی اور سانگلہ ہل پر مشتمل ہے۔ امراء تناظوم کے نام درج ذیل ہیں۔

تنظیم	امیر
تنظیم اسلامی فیصل آباد	جناب میاں محمد اسلم صاحب
تنظیم اسلامی سرگودھا	جناب اللہ بخش صاحب

5- تنظیم اسلامی حلقہ گوجرانوالہ ڈویژن

یہ حلقہ گوجرانوالہ ڈویژن میں شامل تمام اضلاع یعنی گوجرانوالہ، گجرات، نارووال، منڈی بہاؤ الدین، حافظ آباد، سیالکوٹ اور شیخوپورہ پر مشتمل ہے۔ جناب شاہد اسلم صاحب اس حلقے کے ناظم ہیں۔ مرزا ندیم بیگ صاحب نائب ناظم کے فرائض سر انجام دے رہے ہیں جب کہ انجینئر طارق خورشید حلقہ کے معتمد ہیں۔ یہ حلقہ تنظیم اسلامی گجرات اور 10 اسرہ جات پر مشتمل ہے۔ تنظیم اسلامی گجرات کے امیر احمد علی بٹ صاحب ہیں۔ اسرہ جات کے نام گوجرانوالہ، ڈسکہ، سیالکوٹ، ہیکڑیوالی، کانیانوالہ، کھاریاں، پھالیہ، ٹانڈہ، ونی، حافظ آباد اور جہبراں ہیں۔

6- تنظیم اسلامی حلقہ پنجاب شمالی

اس حلقے میں پنجاب کا سطح مرتفع پوٹھوہار، جہلم، راولپنڈی، میرپور، کوٹلی اور صوبہ سرحد کے ہزارہ ڈویژن کے علاقے ہری پور، مانسہرہ اور ایبٹ آباد اور کوہستان کا علاقہ شامل ہیں۔ اس حلقہ کے ناظم جناب شمس الحق اعوان صاحب ہیں، جب کہ جناب ریاض حسین اور محمد طفیل گوندل صاحبان نائب ناظمین کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔ یہ حلقہ 6 تنظیموں اور 11 اسرہ جات جہلم شہر، جہلم کینٹ، دیوال شرقی، دیوال غربی، بڑی درویزہ، ہمک، چک شہزاد، ہری پور، پنڈی گھیب، ایبٹ آباد اور مانسہرہ پر مشتمل ہے۔ دوران سال راولپنڈی میں ایک نئی تنظیم راولپنڈی شرقی کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مزید برآں اسلام آباد کی تنظیم کو دو تنظیموں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ضلع میرپور میں ایک نئی تنظیم قائم کر کے اسرہ جاتلاں اور جی کو ختم کر دیا گیا ہے۔ دوران سال گویا تین نئی تنظیمیں اور 4 نئے اسرہ جات جہلم کینٹ، دیوال شرقی، چک شہزاد اور بڑی درویزہ قائم ہوئے ہیں۔ امراء تناظیم کے نام حسب ذیل ہیں۔

تنظیم	امیر
تنظیم اسلامی راولپنڈی شرقی	جناب شمیم اختر صاحب
تنظیم اسلامی راولپنڈی غربی	جناب بی ایس بخاری صاحب
تنظیم اسلامی راولپنڈی کینٹ	جناب رؤف اکبر صاحب
تنظیم اسلامی اسلام آباد غربی	جناب رانا عبدالغفور صاحب
تنظیم اسلامی اسلام آباد شرقی	جناب غلام مرتضیٰ اعوان صاحب
تنظیم اسلامی ضلع میرپور	جناب سید محمد آزاد صاحب

7- تنظیم اسلامی حلقہ سرحد

یہ حلقہ صوبہ سرحد کے بنوں، پشاور، مردان، ملاکنڈ ڈویژن اور قبائلی علاقہ جات پر مشتمل ہے۔ حلقہ کے ناظم جناب میجر (ریٹائرڈ) فتح محمد صاحب ہیں۔ حافظ جمیل اختر بطور معتمد فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ حلقہ ایک تنظیم اسلامی پشاور اور تین اسرہ جات تیمرگرہ، باجوڑ اور دیر پر مشتمل ہے۔ تنظیم اسلامی پشاور کے امیر جناب وارث خان صاحب ہیں۔

8- تنظیم اسلامی حلقہ آزاد کشمیر

یہ حلقہ آزاد کشمیر کے شمالی اضلاع مظفر آباد، باغ اور پونچھ پر مشتمل ہے۔ حلقہ ایک تنظیم اسلامی مظفر آباد اور 4 اسرہ جات بیروٹ / باسیاں، رنگلہ، رنگلہ مرکزی اور سنگولہ پر مشتمل ہے۔ دوران سال نئی تنظیم اسلامی مظفر آباد قائم ہوئی۔ پہلے یہاں دو اسرے تھے۔ مزید برآں اسرہ سنگولہ اور رنگلہ مرکزی بھی نئے قائم ہوئے ہیں۔ تنظیم اسلامی مظفر آباد کے امیر جناب عبدالقیوم قریشی صاحب ہیں۔

9- تنظیم اسلامی حلقہ امارات

اس حلقے میں متحدہ عرب امارات کی تمام ریاستیں شامل ہیں۔ حلقہ کے ناظم جناب محمد خالد صاحب ہیں۔ یہ حلقہ تین تنظیموں اور ایک اسرہ پر مشتمل ہے۔ دوران سال اسرہ العین کو تنظیم کا درجہ دے دیا گیا۔ تنظیموں کے امراء کے نام درج ذیل ہیں۔

تنظیم	امیر
تنظیم اسلامی ابوظبی	حافظ فاروق احمد صاحب
تنظیم اسلامی شارجہ	جناب محمد ناصر بھٹی صاحب
تنظیم اسلامی العین	جناب فرلیس احمد صاحب

10- تنظیم اسلامی حلقہ حجاز سعودی عرب

یہ حلقہ سعودی عرب کے علاقہ حجاز پر مشتمل ہے۔ جناب قیصر جمال فیاضی صاحب حلقہ کے ناظم ہیں۔ معتمد کے فرائض جناب سید افتخار احمد صاحب کے سپرد ہیں۔ یہ حلقہ ایک تنظیم اسلامی جدہ اور ایک اسرہ مکہ پر مشتمل ہے۔ تنظیم اسلامی جدہ کے امیر جناب محمد فہیم الدین صدیقی صاحب ہیں جب کہ اسرہ مکہ المکرمہ کے نقیب قیصر جمال فیاضی صاحب ہیں۔

سعودی عرب میں اس حلقہ کے علاوہ دو تنظیمیں اور دو اسرہ جات الخبر اور الواسع بھی کام کر رہے ہیں جو براہ راست مرکز کو رپورٹ کرتے ہیں۔ تنظیموں کے امراء کے نام درج ذیل ہیں:

تنظیم	امیر
تنظیم اسلامی الریاض	جناب انور مسعود صاحب
تنظیم اسلامی الجبیل	جناب عبدالرزاق خان نیازی صاحب
اسرہ الدمام	نقیب جناب محمد امجد قاضی صاحب
اسرہ الواسع	نقیب جناب غلام مصطفیٰ صاحب

کل تعداد رفقاء تنظیم اسلامی پاکستان اور نئی شمولیت

نام حلقہ	گزشتہ سالانہ اجتماع کے موقع پر تعداد رفقاء	دوران سال اضافہ	موجودہ سالانہ اجتماع کے موقع پر تعداد رفقاء	ملتزم	مبتدی
سندھ و بلوچستان	277	69	304	130	174
پنجاب شمالی	217	126	333	104	229
لاہور ڈویژن	313	68	342	150	192
پنجاب جنوبی	235	61	296	70	226
گوجرانوالہ ڈویژن	111	42	143	40	103
پنجاب غربی	107	46	128	49	79
سرحد	105	32	133	36	97
آزاد کشمیر	44	16	56	11	45
امارات	268	26	273	86	187
حجاز	15	32	47	9	38
الریاض	49	27	66	23	43
الجبیل	32	2	(1)18	13	5
اسرہ الواسیع	8	-	8	4	4
اسرہ الخبر	-	-	(2)13	4	9
کل تعداد	1781	547	2160	729	1431

گزشتہ سال کل تعداد = 1781 گزشتہ سال اضافہ 603
(1) (نیا سرو الغبر تشکیل دے کر علیحدہ کرنے کے باعث تعداد میں کمی ہوئی)
(2) (دوران سال قائم کیا گیا)

مبتدی سے ملتزم قرار پانے والے رفقاء

تنظیم اسلامی میں شامل ہونے والے رفیق پر لازم ہے کہ وہ ابتدائی تین ماہ کے دوران مبتدی تربیت گاہ میں شمولیت اختیار کرے اور جلد از جلد معین شرائط پر پورا اتر کر ملتزم رفیق قرار پائے۔ اس سال اکتوبر 95ء تا اگست 96ء کے دوران 146 رفقاء مبتدی سے ملتزم قرار پائے جب کہ گزشتہ سال 108 رفقاء ملتزم بنے تھے۔ سب سے زیادہ حلقہ پنجاب شمالی کے رفقاء (45) ملتزم قرار پائے۔ دوران سال حلقہ سندھ و بلوچستان کے 29' حلقہ لاہور ڈویژن اور حلقہ پنجاب غربی کے 14' 14 رفقاء' حلقہ پنجاب جنوبی کے 13' حلقہ سرحد کے 10' حلقہ گوجرانوالہ اور حلقہ حجاز کے 6' 6' تنظیم الریاض کے 7 اور الجبیل کے 2 رفقاء ملتزم قرار پائے۔

معذرت کرنے والے' لا تعلق اور معتذر قرار پانے والے رفقاء

ایسے مبتدی رفقاء جو بیعت کرنے کے چھ ماہ کے عرصہ تک بلا عذر تربیت گاہ میں شرکت نہ کریں اور نہ ہی مقامی نظم کے ساتھ رابطہ رکھیں ناظم حلقہ کی سفارش پر لاتعلق قرر دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح وہ ملتزم رفقاء جو نظام العمل میں دی گئی کم سے کم شرائط بھی پوری نہ کرتے ہوں ناظم حلقہ ان کو معتذر قرار دینے کی سفارش کر سکتے ہیں۔ دوران سال کل 127 مبتدی رفقاء کو لاتعلق اور 13 ملتزم رفقاء کو معتذر قرار دیا گیا' جب کہ تین رفقاء انتقال کر گئے۔ 19 رفقاء نے مختلف النوع وجوہات کی بنا پر تنظیم سے معذرت کی۔ حلقوں کے حوالے سے تفصیل درج ذیل ہے۔

حلقہ	لاتعلق	معتذر	انتقال کر گئے	معذرت کرنے والے
سندھ و بلوچستان	35	4	-	2
پنجاب جنوبی	15	4	-	2
لاہور ڈویژن	28	-	فضل اللہ صاحب (انا للہ وانا الیہ راجعون)	5
پنجاب غربی	4	2	-	-
گوجرانوالہ ڈویژن	-	-	-	4

پنجاب شمالی	9	-		راجہ محمد اقبال صاحب (اناللہ وانا الیہ راجعون)	4
حلقہ سرحد	12	2		-	1
آزاد کشمیر	-	-		-	-
امارات	24	1		موسیٰ جان (اناللہ وانا الیہ راجعون)	-
حجاز	-	-		-	-
الجبیل	-	-		-	1
الریاض	-	1		-	-
کل	127	13		3	19

تنظیمی اجتماعات کی کیفیت

تنظیمی اجتماعات میں رفقاء اپنی ذاتی سیرت و کردار کی خامیوں کا جائزہ لے کر اور ایک دوسرے کو توجہ دلا کر انہیں دور کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ مزید بر آں اپنی دعوتی سرگرمیوں اور ذاتی رابطوں کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے پیش آمدہ مشکلات و مسائل کو باہمی مشورے سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نیز ایک دوسرے کے ذاتی مسائل اور مشکلات سمجھنے اور ان کو حل کرنے کے ضمن میں بھی یہ اجتماعات بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ تنظیمی اجتماعات بحمد اللہ تمام حلقوں میں نظام العمل کے مطابق ہوتے رہے۔ اگر کسی مقام پر ہنگامی صورت حال کی بنا پر تعطل واقع ہوا تو اس کو جلد دور کر لیا گیا۔ دوران سال ان اجتماعات میں رفقاء کی عمومی حاضری 45 فیصد سے 80 فیصد تک رہی۔

دعوتی و تربیتی اجتماعات

لوگوں کو تنظیم کی دعوت اور نظام خلافت کے قیام کے لئے انقلابی طریقہ کار سے متعارف کروانے کے لئے یہ پروگرام منعقد کئے جاتے ہیں۔ یہ پروگرام دروس قرآن، عمومی خطابات، مطالعہ لٹریچر، ملکی اور بین الملکی حالات کے تناظر میں اسلام کا مستقبل اور پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام جیسے موضوعات پر مذاکرے کی صورت میں ہوتے ہیں۔ یہ پروگرام ماہانہ بنیادوں پر ہوتے ہیں، البتہ بیشتر جگہوں پر دروس قرآن ہفتہ وار بنیادوں پر ہوتے ہیں۔ یہ پروگرام بھی نظام العمل کے مطابق تمام تنظیموں میں اکثر و بیشتر باقاعدگی سے ہوئے۔ ان اجتماعات میں رفقاء کی حاضری کا تناسب 45 تا 70 فیصد رہا۔ اکثر حلقہ جات میں کافی رفقاء جامع مساجد میں خطاب جمعہ کی ذمہ داری باقاعدگی سے نبھا رہے ہیں جس کے ذریعے عوام الناس تک دینی فرائض کا جامع تصور اور پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کی

ضرورت وطریقہ کار کو پہنچایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں حلقہ لاہور ڈویژن، حلقہ پنجاب جنوبی، حلقہ پنجاب شمالی اور حلقہ سندھ وبلوچستان کافی آگے ہیں۔

دو روزہ پروگرام

دو روزہ پروگراموں کا مقصد جہاں رفقاء کی فکری وعملی تربیت اور سیرت وکردار کا تزکیہ ہوتا ہے وہیں ایسے دور دراز علاقوں کے لوگوں تک دین کی انقلابی دعوت پہنچانا بھی ہوتا ہے جہاں یہ آواز پہلے نہ پہنچائی جا سکی ہو۔ رفقاء دس دس پندرہ پندرہ کی جماعتوں کی صورت میں نکلتے ہیں اور گھر کے آرام وآسائش اور گھریلو کاروباری مصروفیتوں ومحبتوں سے کٹ کر دو دن کسی علاقے کی مسجد میں قیام کرتے ہیں۔ وہاں ذاتی رابطوں، دروس قرآن، مطالعہ لٹریچر وتقسیم لٹریچر اور کارنر میٹنگز کے ذریعے نظام خلافت کے مختلف پہلوؤں کو لوگوں کے سامنے لایا جاتا ہے اور فرائض دینی کے جامع تصور کو بھی اذہان وقلوب میں ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ رفقاء باہمی مذاکروں، مختلف دینی موضوعات پر مختصر تقاریر اور سوال وجواب کی نشستوں میں اپنے علم وعمل میں اضافہ کی کوشش کرتے ہیں۔ دوران سال کل 36 دو روزہ اور 38 یک روزہ لگائے گئے۔

حلقہ ہائے دروس قرآن

رفقاء تنظیم اپنی فکر کی تازگی، ایمان کی آبیاری اور لوگوں کو اسلام کے انقلابی فکر سے متعارف کروانے کے لئے قرآن مجید کے دروس کا باقاعدہ اہتمام کرتے ہیں۔ تنظیم کے نظم کے تحت لازمی دعوتی وتنظیمی اجتماعات کے علاوہ تقریباً 236 مقامات پر تنظیم کے رفقاء روزانہ / ہفتہ وار، پندرہ روزہ یا ماہانہ دروس قرآن کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسی طرح بہت سی مساجد میں رفقاء خطبات جمعہ میں قرآن مجید کی انقلابی تعلیمات کو عام کرنے میں مصروف ہیں۔ حلقہ جات کے کچھ اعداد وشمار درج ذیل ہیں۔

حلقہ	دروس قرآن
پنجاب جنوبی	46 مقامات پر
لاہور ڈویژن	32 〃
امارات	30 〃
سندھ وبلوچستان	18 〃
پنجاب شمالی	18 〃
پنجاب غربی	17 〃
گوجرانوالہ ڈویژن	18 〃
سرحد	13 〃

الریاض	10 "
آزاد کشمیر	5 "

علاقائی اجتماعات گزشتہ سالانہ اجتماع کے فوراً بعد منعقدہ مرکزی مجلس عاملہ کے اجلاس میں توسیع دعوت کے ضمن میں ہر حلقے میں علاقائی اجتماعات منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا۔ علاقائی اجتماعات کے پروگراموں کے واضح طور پر طے نہ ہونے کے باعث یہ پروگرام بعض جگہ صرف ایک دن کی ریلی کی صورت میں منعقد ہوئے اور بعض حلقوں میں باقاعدہ اجتماع کا انتظام کیا گیا۔ چنانچہ پہلا علاقائی اجتماع حلقہ پنجاب غربی کے علاقے فیصل آباد میں 24ر نومبر 95ء کو ریلی کی صورت میں منعقد ہوا۔ اس اجتماع کی تشہیر کے ضمن میں حلقے کے رفقاء نے خصوصی محنت کر کے 150 بینرز اور ساڑھے تین ہزار پوسٹرز لگائے' جبکہ 28 ہزار ہینڈ بلز تقسیم کئے۔ امیر محترم نے نماز جمعہ سے قبل مفصل خطاب فرمایا۔ شرکاء کی تعداد ایک ہزار سے زائد تھی۔ اس اجتماع میں مزید تربیتی و تعارفی پروگرام نہ ہو سکے کیونکہ شام کو مقامی انجمن خدام القرآن کے ایک پروگرام میں امیر محترم کا خطاب طے کر لیا گیا تھا۔

دوسرا علاقائی اجتماع جو ریلی کی صورت ہی میں ہوا حلقہ گوجرانوالہ ڈویژن میں جامع مسجد میاں غلام رسول گوجرانوالہ میں منعقد ہوا جس میں حلقہ کے تمام رفقاء نے شرکت کی۔ رفقاء کی بھرپور تشہیری مہم کے نتیجے میں امیر محترم کے خطاب جمعہ میں چھ سو سے زائد حضرات شریک ہوئے۔ بعد نماز عصر رفقاء کے ساتھ ناظم اعلیٰ کی تعارفی اور تنظیمی مسائل کے حوالے سے نشست ہوئی۔

تیسرا علاقائی اجتماع حلقہ لاہور ڈویژن کے تحت 23ر مارچ کو جامع مسجد العزیز اولڈ سول لائن ساہیوال میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر تربیتی پروگراموں کے علاوہ بلدیہ گراؤنڈ ساہیوال میں بڑے جلسہ عام کا اہتمام کیا گیا۔ حاضری ایک ہزار سے زائد تھی۔ اس جلسے کو ساہیوال کی تاریخ کے کامیاب ترین جلسوں میں سے ایک قرار دیا گیا۔

چوتھا علاقائی اجتماع جو ایک ریلی ہی کی صورت میں ہوا حلقہ پنجاب شمالی کے علاقہ پنڈی گھیب میں 26ر مارچ کو منعقد کیا گیا۔ رفقاء کی غیر معمولی محنت کے نتیجہ میں جلسہ بہت کامیاب رہا۔ شرکاء کی تعداد چھ سو سے زائد تھی۔

پانچواں علاقائی اجتماع 15 تا 17ر جون حلقہ آزاد کشمیر کے دو شہروں دھیرکوٹ اور مظفر آباد میں ہوا۔ اس اجتماع کے دوران تین عوامی جلسے منعقد ہوئے' دو دھیرکوٹ میں اور ایک مظفر آباد میں۔ رنگلہ میں ہائی اسکول کے اساتذہ کے ساتھ بھی ایک نشست ہوئی۔ ناظم حلقہ اور

ان کے ساتھیوں کی غیر معمولی محنت کے نتیجے میں یہ جلسے نہایت کامیاب ہوئے۔ رفقاء کے ساتھ امیر محترم کی دو مفصل نشستیں ہوئیں جن میں تعارف کے علاوہ امیر محترم نے رفقاء کے سوالات کے جواب دیئے۔ مقامی تنظیمی مسائل پر بھی مشورہ ہوا۔ آزاد کشمیر کے معروف عالم دین مولانا مظفر حسین ندوی تنظیم میں شامل ہوئے۔

چھٹا علاقائی اجتماع 28 تا 30ر جون حلقہ سندھ بلوچستان کے مرکزی شہر کراچی میں منعقد ہوا۔ امیر محترم نے نماز جمعہ سے قبل مفصل خطاب فرمایا۔ بعد ازاں متعدد سینئر رفقاء نے دعوتی و تنظیمی موضوعات پر خطاب کیا۔ پورے حلقے سے لگ بھگ پونے تین سو رفقاء شریک ہوئے۔ اندرون سندھ سے رفقاء واحباب کی معتدبہ تعداد کی شرکت پر امیر محترم نے خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ اس اجتماع میں عمدہ تقسیم کار اور بہترین ٹیم ورک کا مظاہرہ کیا گیا۔

حلقہ پنجاب جنوبی میں علاقائی اجتماع بہاولپور میں 8ر جون کو طے تھا لیکن محرم میں شیعہ سنی فساد کے خطرے کے باعث انتہائی کوشش کے باوجود مقامی ڈی سی نے اجتماع کی اجازت نہیں دی جس کے باعث آخری وقت پر اجتماع منسوخ کرنا پڑا۔

حلقہ سرحد کے علاقائی اجتماع کے لئے 21 تا 23ر جون کی تاریخیں طے کی گئی تھیں لیکن مقامی سطح پر اچانک صوبائی اسمبلی کی ایک سیٹ پر ضمنی انتخابات اور کچھ دیگر وجوہات کے باعث اس اجتماع کو آخری دنوں میں ملتوی کرنا پڑا۔ یہ اجتماع ریلی کی صورت میں 27ر ستمبر کو دیر میں منعقد ہوا جہاں امیر محترم نے نماز جمعہ سے قبل "جہاد اور غلبہ دین کی جدوجہد اسوہ رسول ؐ کی روشنی میں" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

رمضان المبارک میں دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام

قرآن مجید کی ہدایات اور انقلابی فکر سے عوام الناس کو روشناس کروانے کے لئے ہر سال رمضان المبارک میں پورے ملک میں نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن حکیم کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس سال مختلف شہروں میں 55 مقامات پر دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام ہوئے' جن میں سے بیشتر مقامات پر تنظیم کے سینئر رفقاء نے خود یہ ذمہ داری ادا کی۔ کچھ مقامات پر ویڈیو کیسٹس کے ذریعے امیر محترم کے دورۂ ترجمہ قرآن سے استفادہ کیا گیا۔ حلقہ سندھ وبلوچستان میں 17 مقامات پر' حلقہ لاہور ڈویژن میں 18 مقامات پر' حلقہ پنجاب شمالی میں 11 مقامات پر' حلقہ پنجاب جنوبی میں 4 مقامات پر' حلقہ گوجرانوالہ ڈویژن اور حلقہ پنجاب غربی میں دو دو مقامات پر اور حلقہ آزاد کشمیر میں ایک مقام پر دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام ہوئے۔

منکرات کے خلاف احتجاجی مظاہرے

تنظیم اسلامی قرآنی حکم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے حوالے سے امر بالمعروف کے بالمقابل ساتھ نہی عن المنکر پر بھی پورا زور دیتی ہے۔ معاشرے میں موجود مختلف منکرات اور حکومت اور دیگر اداروں کے خلاف اسلام اقدامات کے خلاف تنظیم اسلامی وقتاً فوقتاً پرامن احتجاجی مظاہروں کا اہتمام کرتی ہے۔ بڑے شہروں میں مرکزی اور اہم مقامات پر مقامی تنظیمیں اور ناظمین حلقہ جات ان مظاہروں کا انتظام کرتے ہیں۔ رفقاء بینرز اور پلے کارڈز' جن پر منکرات کے خلاف نعرے درج ہوتے ہیں' اٹھا کر منظم انداز میں مقررہ سڑکوں پر گشت کرتے ہیں۔ لاؤڈ سپیکر پر اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی خلاف ورزی کے بھیانک انجام سے متعلقہ اداروں اور عوام کو آگاہ کیا جاتا ہے۔ منکرات کے خلاف رائے عامہ کو تیار کرنے کے لئے مظاہرے کے دوران کثیر تعداد میں ہینڈ بلز تقسیم کئے جاتے ہیں' جن میں منکرات کی مذمت اور ان کو اختیار کرنے والوں کے خوفناک انجام کو بیان کیا جاتا ہے۔

دوران سال حلقہ سندھ و بلوچستان نے 7' لاہور ڈویژن نے 4' پنجاب شمالی نے دو' پنجاب غربی نے دو' پنجاب جنوبی نے دو اور حلقہ سرحد نے ایک مظاہرہ کیا۔ یہ مظاہرے حکومت کے تین خلاف اسلام فیصلوں' اقلیتوں کو دوہرے ووٹ اور مخلوط انتخابات کے فیصلے' عورت کے لئے سزائے موت ختم کرنے کے فیصلے اور حکومت کے بہبود آبادی پروگرام کے مقابلے میں اسلام کے حقیقی بہبود آبادی پروگرام سے حکومت اور عوام کو آگاہ کرنے کے لئے کئے گئے۔ اس کے علاوہ ذرائع ابلاغ خصوصاً ٹیلیویژن کے مخرب اخلاق پروگراموں کے خلاف بھی وقتاً فوقتاً مظاہرے کئے گئے۔

کھپت جرائد

تنظیم اسلامی کا نقیب و ترجمان ماہنامہ میثاق' تحریک خلافت کا ترجمان ہفت روزہ ندائے خلافت اور مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا ماہنامہ حکمت قرآن باقاعدگی سے شائع ہوتے رہے۔ ماہنامہ میثاق اور ندائے خلافت کی اشاعت میں دوران سال کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہو سکا' چنانچہ میثاق حسب معمول قریباً 5 ہزار اور ندائے خلافت تین ہزار فی شمارہ طبع ہوتے رہے۔ حلقہ جات میں ان جرائد کی کھپت کا مجموعی اندازہ میثاق 2194 اور ندائے خلافت 1546 ہے۔ حلقہ جات کے حساب سے کھپت درج ذیل ہے۔

	میثاق	ندائے خلافت	حکمت قرآن
حلقہ سندھ و بلوچستان	722	542	111

حلقہ پنجاب جنوبی	90	35	26
حلقہ لاہور ڈویژن	488	476	75
حلقہ پنجاب غربی	140	90	41
حلقہ گوجرانوالہ ڈویژن	49	56	10
حلقہ پنجاب شمالی	350	138	101
آزاد کشمیر	61	14	4
حلقہ سرحد	177	83	27
امارات	117	258	36
کل تعداد	2194	1702	431

لائبریریاں اور مکتبے

لوگوں کو تنظیم اسلامی کے فکر ومقاصد سے متعارف کروانے کا ایک موثر ذریعہ کتب وکیسٹس کی لائبریریاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ اکثر وبیشتر تنظیموں کی سطح پر قائم ہیں۔ کتب کے مقابلے میں لوگ کیسٹس سننا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کیسٹس میں بھی آڈیو کیسٹس زیادہ موثر ثابت ہو رہی ہیں۔ حلقوں کے دفاتر میں کیسٹ کاپیئر موجود ہیں' جہاں سے مفت یا معمولی معاوضہ پر کیسٹس ریکارڈ کر کے دی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں کتب وکیسٹس فروخت کے لئے بھی موجود ہوتی ہیں۔ ہمارا تمام لٹریچر' ماہنامہ میثاق اور ندائے خلافت وغیرہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے تحت طبع ہوتا ہے۔ اسی طرح آڈیو / ویڈیو کیسٹس کی تیاری کے تمام مراحل بھی مرکزی انجمن کے تحت ہی طے ہوتے ہیں۔ پھر لٹریچر اور کیسٹس کی خرید وفروخت کا بیشتر کام بھی مرکزی مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور اور اس کی ذیلی انجمنوں کے تحت ہی انجام پاتا ہے۔ تمام بڑے شہروں میں یا تو ذیلی انجمنیں قائم ہیں یا مرکزی انجمن کے سب ڈپو موجود ہیں جہاں سے کتب اور کیسٹس کی سپلائی جاری ہے۔ اس طرح انجمنوں کے تحت ہی لائبریریاں بھی قائم ہیں جہاں سے لوگ استفادہ کرتے ہیں۔ کئی ایک مقامی تنظیموں اور حلقہ جات کے دفاتر میں بھی لائبریریاں قائم کی گئی ہیں جہاں تنظیم کا لٹریچر اور کیسٹس افادۂ عام کے لئے موجود ہیں۔

یہاں کچھ ایسے حلقوں اور تنظیموں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جہاں سے دوران سال کتب اور کیسٹس کی غیر معمولی فروخت ہوئی ہے۔ اس معاملے میں سرفہرست حلقہ امارات ہے جہاں سے مجموعی طور پر پانچ لاکھ چھتر ہزار تین سو دو روپے کی کتب اور کیسٹس فروخت ہوئیں' دوسرے

نمبر پر تنظیم اسلامی الریاض ہے جہاں سے چار لاکھ روپے کی کتب اور کیسٹس فروخت ہوئیں اور تقریباً پچاس ہزار روپے کی کتب اور کیسٹس ہدیتاً دی گئیں۔ مزید بر آں تین لاکھ روپے مالیت کے لگ بھگ کتب اور کیسٹس مقامی لائبریری میں افادۂ عام کے لئے موجود ہیں۔ حلقہ سندھ بلوچستان نے دوران سال ایک لاکھ پچاسی ہزار روپے کی کتب و کیسٹس فروخت کیں اور لائبریری سے اٹھارہ سو آڈیو / ویڈیو کیسٹس اور کتب جاری ہوئیں۔ حلقہ حجاز کے تحت جدہ تنظیم نے پچیس ہزار نو سو پچھتر روپے کی کیسٹس فروخت اور تین ہزار چار سو پچاس روپے کی کیسٹس دلچسپی رکھنے والے حضرات کو ہدیتاً پیش کیں۔ الجبیل تنظیم نے چار سو دس ویڈیو اور چار سو اڑتیس آڈیو کیسٹس تیار کر کے فروخت کیں۔

تنظیمی سال 96-95ء کے دوران حلقہ جات میں ہونے والی قابل ذکر دعوتی سرگرمیوں کا اجمالی تذکرہ

حلقہ جات' تنظیموں اور اسرہ جات میں دوران سال توسیع دعوت اور تنظیمی استحکام کے لئے رفقاء نے جو جدوجہد اور محنت کی اس سب کا احاطہ تحریر میں لانا نہ ممکن ہے اور نہ ضروری۔ اس لئے کہ یہ ساری جدوجہد جس ہستی کو راضی کرنے کے لئے کی گئی ہے اس کے علم میں اپنی تمام تر باریکیوں کے ساتھ آچکی ہے۔ یہ جدوجہد کرنے والے اپنی نیتوں اور ارادوں کی پاکیزگی کے تناسب سے اجر کے مستحق قرار پا چکے۔ یہاں دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں کا ایک خلاصہ ہے جو پیش کیا جارہا ہے جس سے اندازہ ہو گا کہ الحمدللہ نظم و ضبط کے ساتھ یہ قافلہ جوش و جذبے سے سرشار اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ چنانچہ ذیل میں حلقوں میں ہونے والی سرگرمیوں کا نہایت اجمالی تذکرہ پیش خدمت ہے۔

حلقہ جات میں ہونے والی مشترک دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں کا تذکرہ مخصوص عنوانات کے تحت پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ کچھ منفرد سرگرمیوں کی تفصیل حلقوں کے حوالے سے ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

حلقہ سرحد

i) ماہ اکتوبر 95ء میں اسرہ تیمرگرہ کے نقیب جناب محمد فہیم صاحب نے علماء' دانشوروں' ڈاکٹروں اور پروفیسروں سے خصوصی ملاقاتیں کر کے امیر محترم کی تین تنظیموں کے وفاق کی تجویز پر گفتگوئیں کیں اور انہیں میثاق کا متعلقہ شمارہ مطالعہ کے لئے دیا۔

ii) ماہ نومبر میں پشاور میں پانچ روزہ جز وقتی تربیتی ورکشاپ میں 50 سے 75 احباب کو دین کے جامع تصور سے روشناس کروایا گیا۔

iii) احسان الودود صاحب نے صوفی محمد صاحب کے علاقے میدان کمبڑ میں اور ڈاکٹر فیض الرحمٰن صاحب نے خار باجوڑ ایجنسی میں لائبریریاں قائم کی ہیں جو روزانہ مقررہ اوقات میں کھل رہی ہیں۔

iv) مقامی ریسٹ ہاؤس دیر میں 23 اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کو "تنظیم اسلامی کی دعوت" کے موضوع پر امیر محترم کے خطاب کی ویڈیو کیسٹ دکھائی گئی۔

v) مولانا حضرت گل صاحب نے دو سو سے زائد مساجد میں خطاب کے دوران نظام خلافت اور انقلاب کے نبوی طریق کار کی وضاحت کی اور تنظیم اسلامی کا تعارف کروایا۔

vi) ماہ مارچ میں ناظم اعلیٰ نے ناظم حلقہ سرحد کے ہمراہ حلقہ کا دورہ کیا' جس کے دوران ناظم حلقہ نے پشاور' تیمرگرہ' دیر' باجوڑ' میدان اور ہیبوڑ وغیرہ میں رفقاء واحباب سے خصوصی ملاقاتیں کروائیں اور کئی ایک مقامات پر تنظیمی اور دعوتی خطابات بھی ہوئے۔ تیمرگرہ میں جماعت اسلامی کے صوبائی امیر ڈاکٹر یعقوب اور تیمرگرہ کے امیر جماعت سے ان کے ایک دارالعلوم میں تفصیلی ملاقات میں "منہج انقلاب نبوی ؐ" پر مفصل تبادلہ خیال ہوا۔

vii) پشاور کی سطح پر اعزہ واقارب کے لئے دعوتی پروگرام میں (6) افراد شریک ہوئے۔

viii) ناظم حلقہ کا تنظیم پشاور' اسرہ جات اور منفرد رفقاء سے مضبوط تحریری وعملی رابطہ رہا اور خطوط اور ذاتی ملاقاتوں کے ذریعے ذمہ دار اور منفرد رفقاء کو متحرک کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔

xi) ماہ اگست میں ناظم حلقہ نے تنظیم اسلامی اور اس کے مقاصد کے تعارف اور تشہیر کے ضمن میں دس روزہ پروگرام تشکیل دیا جس کے دوران گاڑی پر نصب شدہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے مختصر جلسوں میں تنظیم کے نام اور مقاصد کا تعارف کروایا گیا۔ مساجد میں نمازوں کے بعد خطابات کئے گئے اور لٹریچر تقسیم کیا گیا۔ بازاروں اور معروف دکانوں' پبلک کال بوتھ' مساجد اور پبلک مقامات پر اسٹیکرز لگائے گئے اور ذاتی ملاقاتوں کے ذریعے لوگوں کو تنظیم کی انقلابی دعوت سے روشناس کروایا گیا۔ یہ پروگرام تین حصوں میں مکمل کیا گیا۔

پہلے مرحلے میں 8 تا 11 اگست کوہاٹ اور بنوں ڈویژنوں کے درج ذیل علاقوں کا دورہ کیا گیا۔ مسلم آباد' لاچی' کرک' احمد بانڈی' تمر' ڈومیل' نظام بازار' بنوں' سرائے نورنگ' لکی مروت' میر علی' ٹل' درآکبز' ہنگو' کوہاٹ' بلی ٹنگ' توغ۔ اس مرحلے میں سات مساجد میں خطابات

ہوئے۔ 17 قصبوں / شہروں میں کام ہوا۔ 694 کلو میٹر سفر طے کیا گیا۔

دوسرے مرحلے میں 13 تا 15 ر اگست پشاور اور مردان ڈویژنوں کا دورہ ہوا جس کے دوران بھی' مانکی شریف' زیارت کاکا صاحب' جہانگیرہ' زیدہ' پنج پیر' مرغز' کرم خیل' صوابی' نواں کلے' شیوہ اڈا' شہباز گڑھی' ساول ڈھیر' لوند خوڑ' ہاتھیاں' شیر گڑھ' ورگی' منی کوٹ' مردان' عمرزئی' اتمان زئی' تنگی' شبقدر میں کام کیا گیا۔ اس مرحلے میں 9 مساجد میں خطاب ہوا اور 19 قصبات اور شہروں میں دعوت پہنچائی گئی۔ 470 کلو میٹر مسافت طے کی گئی۔

تیسرے مرحلے میں 16 تا 20 ر اگست سوات' دیر' چترال اور باجوڑ ایجنسیوں کا دورہ ہوا جس کے دوران رستم' پیر بابا' ایلا' چھنہ' سواڑی' کاٹ کلہ' سالارزئی' بری کوٹ' گوگدرہ' ڈگر شگوڑ' شاہ پور' میلے بابا' اپوری' خوازہ خیلہ' چار باغ' سیدو شریف' چکدرہ' تیمرگرہ' بی بی یوڑ' دروش' چرکن' چترال' دارووڑہ' واڑی' خال' کمبڑ' باجوڑ' ناواگئی' گنداؤ اور ہلہ ننٹی' یکہ غنڈ میں کام کیا گیا۔ اس مرحلہ میں کل 13 مساجد میں خطاب اور 29 قصبات دیہات اور شہروں میں کام ہوا۔ کل 1102 کلو میٹر سفر کیا گیا۔ اس پورے پروگرام میں 9 رفقاء اور 5 احباب شریک رہے' جن میں سے میجر فتح محمد صاحب' مولانا حضرت گل اور بلال احمد تمام پروگراموں میں شریک ہوئے جب کہ دیگر پروگراموں میں رفقاء جزوی طور پر شرکت کرتے رہے۔

حلقہ پنجاب شمالی

ناظم حلقہ برادرم شمس الحق اعوان صاحب اپنے نائب ناظمین کے ہمراہ بڑی سرگرمی' محنت اور کامیاب منصوبہ بندی کے ساتھ تنظیم کے مشن کو آگے بڑھانے میں ہمہ تن مصروف ہیں جس کے نتیجے میں دوران سال حلقے میں 3 تنظیموں اور 14 اسروں کا اضافہ ہوا۔ دیگر سرگرمیوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

i) اسرہ ماڈل ٹاؤن ہمک میں ماہ اکتوبر 95ء میں ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کے درس قرآن کا اہتمام کیا گیا جس میں رفقاء کی محنت کے نتیجے میں ایک سو سے زائد احباب شریک ہوئے۔

ii) ماہ نومبر میں پنج بھانہ میں "فکر اقبال اور احیائے خلافت" کے موضوع پر جلسہ ہوا۔ دیگر تنظیموں کے مقررین کو بھی بلایا گیا۔ حاضری تین سو افراد سے زائد رہی۔ ماہ نومبر ہی کے دوران جہلم میں امیر محترم نے جلسہ عام اور بار کونسل میں خطاب فرمایا۔ جلسہ میں حاضری 500 سے زائد تھی۔

iii) 7 ر جنوری کو پورے حلقے میں تنظیم کے تعارف کی خصوصی مہم چلائی گئی جس کے دوران

بینرز لگائے گئے' پمفلٹ تقسیم ہوئے اور ذاتی رابطے کے ذریعے دعوت پہنچائی گئی۔

iv) جنوری ہی میں خصوصی تربیتی اجتماع برائے ذمہ داران منعقد کیا گیا جس میں 34 ذمہ دار رفقاء شریک ہوئے۔

v) خواتین اور بچیوں کے لئے ایک خصوصی درس قرآن کا مشترکہ پروگرام مقامی ملال سکول اسلام آباد میں ہوا۔ تین سو خواتین شریک ہوئیں۔ اس سکول میں ہمارے ایک رفیق کی اہلیہ ہفتہ وار درس قرآن دے رہی ہیں۔

vi) دوران رمضان مساجد میں معتکف حضرات سے رابطہ کر کے "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" نامی کتابچہ 1300 کی تعداد میں تقسیم کیا گیا۔

vii) ماہ اپریل و مئی میں برادرم باسط بلال کوشل صاحب کے 8 پروگرام مختلف فورمز پر کروائے گئے۔

viii) ناظم حلقہ نے F-8 میں ایک فاؤنڈیشن کے تحت اسلام کے سیاسی نظام پر متعدد لیکچرز دیئے۔

ix) ماہ اپریل میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے تحت نیشنل بک فیئر میں حلقے کی جانب سے کیسٹس اور کتب کا اسٹال لگایا گیا۔ سیل کے علاوہ تنظیم اور امیر محترم کی کتب اور کیسٹس کا بڑے پیمانے پر تعارف ہوا۔

x) ماہ مئی میں چاروں تنظیموں اور حلقہ سے متعلق اسرہ جات کے رفقاء نے اعزہ و اقارب کے لئے خصوصی دعوتی اجتماعات منعقد کئے۔

xi) ماہ جون میں جامع مسجد بالاکوٹ میں امیر محترم نے خطاب فرمایا۔ اس کے بعد صوبائی اسمبلی ہال ایبٹ آباد میں خطاب فرمایا۔ اخوت اکیڈمی اسلام آباد میں بھی خطاب ہوا۔

xii) ماہ جولائی میں حلقے میں شامل چاروں تنظیموں نے عشرۂ دعوت کے دوران بھرپور دعوتی کام کیا۔ کارنر میٹنگز اور دروس قرآن کا خصوصی اہتمام کیا گیا' مختلف مقامات پر مکتبے لگائے گئے اور کتب فروخت کی گئیں۔ کثیر تعداد میں لوگوں سے ذاتی رابطہ کر کے تنظیم اسلامی اور اس کے فکر سے متعارف کروایا گیا۔

xiii) ناظم حلقہ نے پنڈی گھیب' مانسہرہ' ایبٹ آباد' ہری پور وغیرہ کے مسلسل دورے جاری رکھے۔

xiv) سالانہ اجتماع منعقدہ لیاقت باغ راولپنڈی کے انتظامات کے لئے حلقے کے تمام رفقاء نے جانی و مالی انفاق میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس ضمن میں ناظم حلقہ نے متعدد مشاورتی اجتماعات

کیے جن میں سالانہ اجتماع کے انتظامات کو باہمی مشورے سے آخری شکل دی گئی۔

حلقہ آزاد کشمیر

حلقہ آزاد کشمیر پاکستان کے تمام حلقوں میں سب سے چھوٹا حلقہ ہے۔ گزشتہ تین چار سال محنت ہو رہی تھی لیکن کوئی نتیجہ سامنے نہیں آرہا تھا' لیکن گزشتہ سال کے دوران ناظم حلقہ محترم خالد محمود عباسی نے علاقے کے لوگوں کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے عمدہ حکمت عملی اختیار کر کے تنظیم کے کام کو کافی آگے بڑھایا ہے۔

i) آزاد کشمیر میں زیادہ تر دعوتی کام دروس قرآن کے حلقوں کے تحت ہوتا رہا ہے جن میں رفقاء کم اور احباب زیادہ شریک ہوتے رہے ہیں۔ مظفر آباد میں ہر اتوار کو بعد نماز مغرب درس قرآن ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ نقیب اسرہ عبدالقیوم قریشی جو اب امیر تنظیم ضلع مظفر آباد ہیں' مظفر آباد کے نواح میں ایک جامع مسجد میں خطبہ جمعہ کے ذریعے قرآن مجید کا انقلابی فکر عام کرنے میں مصروف ہیں۔ ناظم حلقہ دھیرکوٹ میں کھلی جگہ پر ہفتہ وار درس قرآن باقاعدگی سے دیتے ہیں۔ ہاسیاں اور بیروٹ میں بھی ہفتہ وار درس قرآن باقاعدگی سے ہوتا رہا۔ ماہ مئی سے ضلع باغ میں بھی ناظم حلقہ نے ایک ہفتہ وار درس کا آغاز کر دیا ہے۔

ii) مظفر آباد کے ایک کامرس کالج میں طلبہ و اساتذہ سے فرائض دینی کے موضوع پر خطاب میں 30 کے لگ بھگ افراد شریک ہوئے۔

iii) ناظم حلقہ نے رفقاء کے تعاون سے دھیرکوٹ اور مظفر آباد میں ماہ جون میں منعقد ہونے والے علاقائی اجتماع اور جلسہ ہائے عام کی تشہیر کے سلسلے میں پورے علاقے میں بھرپور چاکنگ اور ذاتی رابطوں کی کامیاب مہم کا آغاز کیا جس کے ذریعے پورے علاقے میں تنظیم اسلامی کا اچھا خاصا تعارف ہو گیا اور نتیجتاً" دونوں مقامات پر جلسوں میں حاضری غیر معمولی طور پر بہت زیادہ رہی اور صرف دو ماہ جون جولائی میں دس ساتھی تنظیم کو میسر آئے۔

iv) ماہ جولائی میں بیروٹ میں منعقدہ سیرت النبی ؐ کے جلسے میں اتباع رسول ؐ کے حوالے سے فریضہ اقامت دین کے موضوع پر موثر گفتگو کا موقع میسر آیا۔

v) ناظم حلقہ نے باڑیاں میں سیرت النبی ؐ کے جلسے سے خطاب کیا جسے بہت پسند کیا گیا۔

vi) رنگلہ کے ہائر سیکنڈری سکول میں شہادت علی الناس کے موضوع پر اساتذہ سے خطاب کیا گیا۔

vii) دھیرکوٹ پائلٹ سیکنڈری سکول میں دو پروگراموں میں شہادت علی الناس اور حقیقت

نفاق پر خطابات ہوئے۔

viii) باغ میں سرکاری ملازمین کے تین ماہانہ اجتماعات میں درس قرآن دیا۔ نیز جون میں مظفرآباد سیکرٹریٹ میں درس قرآن دیا۔

ix) آزاد کشمیر میں چار مقامات دھیرکوٹ' مظفرآباد' رنگہ' باغ اور بیروٹ باسیاں میں باقاعدہ دفاتر قائم ہو گئے ہیں جہاں ہفتہ وار دروس قرآن کے علاوہ لائبریریاں بھی قائم ہیں جہاں سے کتب اور کیسٹس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

حلقہ گوجرانوالہ ڈویژن

ناظم حلقہ برادرم شاہد اسلم صاحب نہایت محنت سے اپنے حلقے کے مسلسل ماہانہ دوروں کے ذریعے تنظیم کے انقلابی فکر کو پھیلانے میں مصروف ہیں۔ حلقے میں کئی مقامات پر باقاعدہ ہفتہ وار / ماہانہ درس قرآن دیتے ہیں۔

i) ماہ نومبر میں گجرات میں سہ روزہ جز وقتی تربیتی کلاس کا اہتمام کیا گیا جس میں رفقاء واحباب کو منتخب نصاب کا ترجمہ اور مطالعہ لٹریچر کروایا گیا۔

ii) ماہ دسمبر میں جنرل محمد حسین انصاری صاحب نے گجرات بار کونسل سے خطاب کیا اور وکلاء کے سوالوں کے جواب دیئے۔

iii) اسرہ جلالپور جٹاں کے رفقاء نے 50 افراد سے رابطہ کر کے خط وکتابت کورس کے ذریعے تنظیم کی بنیادی دعوت پہنچائی۔

iv) ماہ مارچ میں گوجرانوالہ میں تین مقامات پر حلقہ مطالعہ قرآن کا آغاز کیا گیا۔

v) نقباء کی تربیت کے لئے ایک روزہ پروگرام گوجرانوالہ میں ہوا جس میں 19 اسروں کے نقباء نے شرکت کی۔

vi) ضلع شیخوپورہ میں جھبراں کے کئی مسلسل دوروں کے نتیجے میں وہاں ایک نیا اسرہ تشکیل پا گیا۔

vii) ماہ مئی کے دوران کھاریاں' پھالیہ اور حافظ آباد میں ایک روزہ دعوتی وتعارفی پروگرام منعقد کئے گئے جس کے دوران کثیر تعداد میں تنظیم کی دعوت پر مشتمل فولڈرز تقسیم کئے گئے۔ ہر شہر میں تنظیم کی دعوت پر مشتمل بینگرز بھی لگائے گئے اور احباب سے خصوصی ملاقاتیں کی گئیں۔

viii) گجرات کی امارت کی ذمہ داری عبدالرؤف صاحب کے معذرت کرنے پر جناب احمد علی بٹ صاحب کے سپرد کی گئی۔

ix) اس حلقہ کی خصوصی دعوتی سرگرمی تفہیم دین کورس ہے جو لوگوں کو دین کا انقلابی فکر سمجھانے میں بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ سات دن شام کے اوقات روزانہ دین کے اہم بنیادی موضوعات پر سینئر رفقاء کے لیکچرز ہوتے ہیں۔ آخری دن امتحان ہوتا ہے۔ کامیاب ہونے والوں کو باقاعدہ سندیں دی جاتی ہیں۔ یہ ہفت روزہ کورس ڈسکہ گوجرانوالہ گجرات اور سیالکوٹ میں منعقد کیے گئے۔ ان پروگراموں میں مجموعی طور پر 15 خواتین اور 265 حضرات باقاعدہ شریک ہوئے۔ کئی دیگر مساجد سے بھی اس پروگرام کو منعقد کرنے کی دعوت موصول ہوئی ہے۔

حلقہ لاہور ڈویژن

ناظم حلقہ محمد اشرف وصی صاحب رفقاء کے تعاون سے توسیع دعوت کے کام میں تن دہی سے معروف ہیں۔ دوران سال اہم سرگرمیاں درج ذیل رہیں۔

i) گزشتہ سالانہ اجتماع مینار پاکستان لاہور کے سبزہ زار میں منعقد ہوا۔ تنظیم اسلامی کا یہ پہلا سالانہ اجتماع تھا جو کھلے میدان میں ہوا۔ الحمدللہ رفقاء حلقہ لاہور ڈویژن نے اس اجتماع کے جملہ انتظامات کی ذمہ داری کو احسن طریق پر انجام دیا اور بہترین ٹیم ورک کا مظاہرہ کیا۔

ii) ماہ نومبر میں امیر محترم نے لاہور بار ایسوسی ایشن سے خطاب کیا۔ 200 شریک وکلاء میں دعوتی لٹریچر پر مشتمل پمفلٹس کا سیٹ تقسیم کیا گیا۔

iii) ناظم حلقہ نے حلقے کا دعوتی دورہ کیا جس کے دوران کثیر تعداد میں لٹریچر تقسیم کیا گیا' سٹیکرز لگائے گئے اور بھائی پھیرو' چوکی' حجرہ شاہ مقیم' عارف والا' ساہیوال میں متعدد دعوتی خطابات بھی ہوئے۔

iv) رمضان المبارک کی ستائیسویں شب میں قیام پاکستان کے 50 سال مکمل ہونے کے حوالے سے خصوصی طور پر تیار کردہ دس ہزار پمفلٹس مساجد میں تقسیم کیے گئے۔

v) ماہ فروری میں ناظم حلقہ نے امراء تنظیم لاہور کے ہمراہ پریس کلب لاہور میں پریس کانفرنس سے خطاب کیا جس میں سود کے خلاف سپریم کورٹ میں دائر کردہ پٹیشن پر فیصلہ کرنے کے لئے صدر سے خصوصی بنچ تشکیل دینے کا مطالبہ کیا۔

vi) یکم تا آٹھ مارچ حلقے میں ایک خصوصی دعوتی و تربیتی پروگرام ہوا جس کے دوران مختلف اوقات میں دعوتی مہم میں 30 رفقاء نے شرکت کی۔ 65 مقامات پر دعوتی خطابات ہوئے۔ 2 مقامات پر جلسہ ہائے عام اور 6 مساجد میں دروس قرآن ہوئے۔ تنظیم کی دعوت پر مشتمل چھ ہزار سٹیکرز اور 8 ہزار پمفلٹس اوکاڑہ' قصور اور ساہیوال میں تقسیم کیے گئے۔

vii) حلقہ لاہور ڈویژن کے علاقائی اجتماع کی تشہیر کے حوالے سے اجتماع سے قبل ساہیوال شہر میں تنظیم کے تعارف کے سلسلے میں شہر کو چار حصوں میں تقسیم کر کے لاہور کی تنظیموں کے 30 کے لگ بھگ رفقاء نے دو روزہ پروگراموں کی صورت میں مارکیٹوں اور بازاروں میں کثیر تعداد میں اسٹکرز لگائے اور تنظیم کی دعوت پر مبنی پمفلٹس تقسیم کیے گئے۔

viii) ماہ مئی میں حلقہ لاہور کے سہ ماہی اجتماع میں مولانا وصی مظہر ندوی صاحب نے خطاب فرمایا۔

ix) نقباء کی تربیت کے تین پروگرام ہوئے جن میں نقباء کو ان کی منصبی ذمہ داریوں کی ادائیگی اور ان میں پیش آمدہ مسائل کے حوالے سے ضروری رہنمائی اور ہدایات دی گئیں۔

x) ماہ جولائی 96ء میں حلقہ میں ہفتہ دعوت کے حوالے سے خصوصی مہم کے دوران لاہور میں موجود لوکل اور شہروں کے درمیان چلنے والی ویگنوں، بسوں اور فلائنگ کوچز کے اندر تنظیم اسلامی کی دعوت پر مبنی سٹیکرز چسپاں کیے گئے۔ نیز لاہور ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہونے والی گاڑیوں میں بھی سٹیکرز لگائے گئے۔ اس مہم میں لاہور کی چھ تنظیموں کے رفقاء نے بھرپور حصہ لیا اور اپنے اپنے حصے کا کام احسن طریق پر انجام دیا۔ اس مہم کے دوران 17 ہزار سٹیکرز استعمال ہوئے۔

xi) حلقہ لاہور نے ماہ جولائی میں "حقیقی بہبود آبادی واک" کے عنوان سے مال روڈ پر پرامن جلوس نکالا جس میں بہبود آبادی کے حقیقی مفہوم کو واضح کیا گیا۔ بینرز، پلے کارڈز اور ہینڈبل کے ذریعے لوگوں کو بتایا گیا کہ بہبود آبادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ موجودہ ظالمانہ اور استحصالی نظام ہے۔ بہبود آبادی کا اصل مفہوم یہ ہے کہ لوگوں کی بنیادی ضروریات غذا، لباس، رہائش، علاج اور تعلیم کا انتظام کیا جائے نہ کہ آبادی میں اضافہ کو روک کر لوگوں کا استحصال جاری رکھا جائے۔

حلقہ پنجاب غربی

ناظم حلقہ پنجاب غربی محمد رشید عمر صاحب نہایت سرگرمی سے حلقے میں توسیع دعوت کے لئے کوشاں ہیں۔

i) حلقے کے ذمہ داران کے 5 رکنی وفد نے تبلیغی بھائیوں اور ان کے رکن شوریٰ سے خصوصی ملاقات کر کے انہیں منہج انقلاب نبویؐ کے حوالے سے انقلاب کی ضرورت واہمیت سے آگاہ کیا۔

ii) چک 127 سرگودھا میں جلسہ عام سے ناظم حلقہ اور دیگر مقررین نے خطاب کیا۔

iii) سانگلہ ہل میں توسیع دعوت کے سلسلے میں سہ روزہ کیمپ لگایا گیا۔ اقلیتوں کو دوہرے ووٹ کے حق کے فیصلے کے خلاف پوسٹرز لگائے گئے' مساجد میں خصوصی خطابات اور معززین شہر سے خصوصی دعوتی ملاقاتیں کی گئیں۔

iv) اسرو چک 127 میں خواتین کا ایک خصوصی اجتماع منعقد کیا گیا جس میں 600 سے زائد مقامی خواتین نے شرکت کی۔ بیگم ڈاکٹر خالد حمید ضیغم نے خصوصی دعوتی خطاب کیا۔

v) ناظم و نائب ناظم حلقہ نے سرگودھا کے ساتھی عبدالسمیع کے ہمراہ میانوالی میں پروفیسرز' ہیڈ ماسٹرز' تاجر یونین کے عہدہ دار اور جماعت اسلامی اور تنظیم اساتذہ کے امراء سے خصوصی ملاقاتیں اور گفتگوئیں کیں۔

vi) ٹوبہ ٹیک سنگھ میں حلقہ کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں اسلامی جمہوریت کے عنوان سے مذاکرہ میں جماعت اسلامی' تنظیم الاخوان اور دیگر معروف تنظیموں کے ذمہ داران کے علاوہ ناظم حلقہ نے بھی خطاب کیا۔

vii) سانگلہ میں امیر محترم کے خصوصی خطاب کا اہتمام کیا گیا۔ مقامی رفقاء کی محنت کے نتیجے میں چار سو سے زائد افراد جلسے میں شریک ہوئے۔

viii) ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تنظیم اسلامی کی لائبریری کے افتتاح کے موقع پر امیر محترم نے خطاب فرمایا۔ اس موقع پر چار حضرات تنظیم میں شامل ہوئے۔

ix) ماہ جولائی میں حلقہ کی سطح پر عشرۂ دعوت کے پروگرام کے دوران فیصل آباد' سرگودھا اور ان سے ملحقہ 16 قصبات چک جھمرہ' برنالہ' برجمنڈی' چنیوٹ' پنڈی بھٹیاں' بچہ کلاں' چک بھابڑا' کوٹ مومن' بھلوال' بھیرہ' چک نمبر 7 شمالی' داؤد خیل' سکندر آباد' کالاباغ' واں بھچراں اور قادر آباد میں 10 رفقاء کی جماعت نے بھرپور دعوتی کام کیا۔ مساجد میں دعوتی خطاب ہوئے' دعوتی لٹریچر کثیر تعداد میں لوگوں تک پہنچایا گیا' پوسٹرز کے ذریعے دین کی انقلابی دعوت کو عام کرنے کی کوشش کی گئی اور لوگوں سے خصوصی ملاقاتیں کی گئیں۔ بھیرہ میں پیر کرم شاہ صاحب اور شاہی مسجد بھیرہ کے متولی بگوی خاندان کے ذمہ دار حضرات سے خصوصی طور پر ملاقاتیں کر کے تنظیم کی دعوت اور لٹریچر مہیا کیا گیا۔ الحمد للہ پورے علاقے میں تنظیم کا وسیع پیمانے پر تعارف ہوا اور کئی اہم حضرات تنظیم میں شامل ہوئے۔ اس دورہ میں تقریباً گیارہ سو کلومیٹر کا فاصلہ طے ہوا۔

حلقہ پنجاب جنوبی

حلقے کے ناظم برادرم مختار حسین فاروقی صاحب دروس قرآن' خطابات عام اور ترجمہ القرآن کی نشستوں کے ذریعے حلقے میں دین کا انقلابی فکر عام کرنے میں مصروف ہیں۔

i) ناظم حلقہ نے ماہانہ وہفتہ وار دروس قرآن و ترجمہ القرآن کی نشستوں کے سلسلے میں ماہ مئی 96ء تک قریباً ہر ماہ بورے والا' رحیم یار خان' صادق آباد' وہاڑی' بہاولپور' سکھر' بہاولنگر' عبدالحکیم اور جھنگ کا دورہ کیا اور ملتان میں بھی متعدد مقامات پر دروس قرآن دیئے۔ دروس قرآن اور ترجمہ القرآن کی ان نشستوں سے مجموعی طور پر ہر ماہ لگ بھگ دو ہزار افراد استفادہ کرتے رہے۔

ii) ماہ نومبر 95ء میں امیر محترم نے بورے والا میں جلسہ عام سے خطاب فرمایا۔ نیز خانیوال ڈسٹرکٹ کونسل ہال میں بھی خطاب کیا۔ دونوں پروگراموں کے لئے رفقاء نے خصوصی محنت کی۔

iii) 23ر نومبر کو پورے حلقے میں دعوتی کیمپ لگا کر رفقاء نے تنظیمی لٹریچر لوگوں تک پہنچایا۔

iv) ماہ دسمبر 95ء اور جنوری 96ء کے دوران خصوصی دعوتی پروگرام کے تحت 9 جماعتیں چار چار روز کے لئے حلقے کے دور دراز علاقوں میں دعوت پہنچانے کے لئے گئیں۔ دس ہزار ہینڈ بل اور تعارفی کتب لوگوں تک پہنچائی گئیں۔ حلقے کے 43 رفقاء نے ان پروگراموں میں حصہ لیا۔ 37 مقامات پر خطابات اور 4 مساجد میں خطاب جمعہ کا موقع ملا۔

v) رمضان المبارک میں وہاڑی کے چک WB 24 میں خواتین کا خصوصی اجتماع ہوا۔ 130 کے لگ بھگ خواتین شریک ہوئیں۔

vi) ملتان کی سطح پر ایک خصوصی دعوتی اجتماع' جو عید ملن پارٹی کی صورت میں کیا گیا' میں ناظم حلقہ نے 250 کے لگ بھگ شرکاء کے سامنے تنظیم اسلامی کی دعوت کے موضوع پر خطاب کیا۔

vii) ماہ اپریل میں امیر محترم نے قرآن اکیڈمی ملتان میں خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا۔ رفقاء کی خصوصی تشہیری مہم کے نتیجے میں حاضری گیارہ سو سے متجاوز تھی۔

viii) ماہ مئی میں دولت گیٹ کے علاقے میں ڈاکٹر طاہر خاکوانی نے فرائض دینی کے جامع تصور پر خطاب کیا۔ 90 حضرات شریک تھے۔

ix) خواتین کے لئے عربی کلاس کا اجراء کیا گیا۔ 25 خواتین نے کورس کی تکمیل کی۔

x) تنظیم اسلامی ملتان کینٹ کے امیر ڈاکٹر عمر علی خان نے ملتان کینٹ میں بیس روزہ خصوصی دعوتی پروگرام منعقد کیا جس کے دوران روزانہ کسی ایک محلے میں کسی رفیق یا ہم خیال ساتھی کے گھر پر درس قرآن کی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ دعوتی و تعارفی لٹریچر تقسیم کیا گیا۔ اس دعوتی پروگرام

کے آخر میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا جس میں ناظم حلقہ نے تنظیم اسلامی کی دعوت کے موضوع پر خطاب کیا۔ اس پروگرام میں ان تمام افراد کو مدعو کیا گیا جو بیس روزہ دعوتی پروگراموں میں شریک ہوئے تھے۔ 300 کے لگ بھگ افراد جلسے میں شریک ہوئے۔ بہت سے نوجوان اس پروگرام کے نتیجے میں تنظیم کے فکر سے متاثر ہوئے اور تنظیم میں شمولیت اختیار کی۔

حلقہ سندھ وبلوچستان

ناظم حلقہ محترم محمد نسیم الدین نہایت محنت سے اپنے وسیع وعریض حلقے میں تنظیمی ودعوتی سرگرمیوں کو منظم کرنے میں مصروف ہیں۔

i) ریلوے سکول سکھر میں خصوصی دعوتی اجتماع ہوا جس سے ناظم حلقہ نے خطاب کیا۔

ii) امیر محترم نے دوران سال 4 مرتبہ قرآن اکیڈمی کراچی میں' ایک مرتبہ جامع مسجد طوبیٰ کوئٹہ میں اور ایک مرتبہ مدرسہ علوم الاسلامیہ منصورہ میں خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا۔ نیز مختلف مواقع پر مدیران قومی اخبارات سے ملاقات کی۔

iii) امیر تنظیم کوئٹہ نے کوئٹہ کینٹ ایریا میں آرمی آفیسرز کے ساتھ سات پروگرام کئے جن میں حاضری 50 سے 100 تک رہی۔

iv) ناظم اعلیٰ نے ماہ جنوری 96ء میں کراچی کی تنظیموں کا دورہ کیا۔ ذمہ دار رفقاء سے خصوصی ملاقاتوں میں تنظیمی ودعوتی امور پر گفتگو ہوئی۔ ناظم حلقہ کے ہمراہ حیدر آباد کا بھی دورہ کیا اور تمام رفقاء سے ملاقات اور تنظیمی مسائل پر گفتگو ہوئی۔

v) رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں ناظم حلقہ نے دیگر رفقاء کے ہمراہ قرآن اکیڈمی کراچی کی جامع مسجد میں اعتکاف کیا۔ اعتکاف کے دوران 70 سے زائد معتکف حضرات کے ساتھ خصوصی پروگرام کئے۔ ذاتی ملاقاتوں اور تبادلہ خیالات کے نتیجے میں 16 حضرات تنظیم میں شامل ہوئے جن میں سے اکثریت تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تھی۔

vi) 23 مارچ کو کراچی سے باہر ایک فارم پر ایک ہلکا پھلکا تربیتی وتفریحی پروگرام کیا گیا جس میں رفقاء اپنے اہل خانہ کے ہمراہ شریک ہوئے۔ خواتین کے لئے علیحدہ باپردہ اہتمام کیا گیا تھا۔

vii) 31 مئی کو قرآن اکیڈمی میں کراچی کی تمام تنظیموں کا مشترکہ تربیتی اجتماع ہوا۔ امیر محترم نے خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا۔ راقم نے بھی تربیتی نشستوں میں رفقاء سے خطاب کیا۔

viii) ماہ جون کے دوران حلقہ کی تمام تنظیموں نے عشرۂ دعوت کے تحت دس دنوں پر مشتمل مختلف دعوتی پروگرام ترتیب دیئے۔ عشرۂ دعوت کے دوران مساجد کے باہر اور دیگر اہم

مقامات پر مکتبے لگائے گئے۔ تنظیم کی دعوت پر مشتمل لٹریچر مساجد کے باہر اور گھروں میں لوگوں تک پہنچایا گیا۔ کارنر میٹنگز اور جلسوں کے ذریعے دین کا انقلابی پیغام لوگوں تک پہنچایا گیا۔

ix) ناظم حلقہ نے کوئٹہ اور اندرون سندھ کے متعدد دعوتی و تنظیمی دورے کئے جن کے دوران رفقاء واحباب سے دعوتی و تنظیمی امور پر مفصل گفتگوئیں ہوئیں۔ معتمد حلقہ محمد سمیع صاحب نے بھی حلقے کے بعض مقامات کا دورہ کیا۔

x) اواخر ماہ دسمبر 95ء ناظم حلقہ کے تشکیل کردہ قافلہ تنظیم اسلامی نے اندرون سندھ کا دس روزہ طویل تعارفی اور دعوتی دورہ کیا جس کے دوران 50 سے زائد چھوٹے بڑے قصبات اور شہروں میں تنظیم کی دعوت کا تعارف کروایا گیا۔ دورہ کے دوران تنظیم کے تعارف ودعوت پر مشتمل ساٹھ ہزار ہینڈ بل تقسیم کئے گئے۔ ساڑھے بارہ ہزار اسٹیکرز چسپاں کئے گئے۔ مجموعی طور پر دو سو سندھی کتب کے سیٹ اور 300 اردو کتب چنیدہ افراد کو ہدیتاً دی گئیں۔ پانچ مقامات پر جلسہ ہائے عام کا اہتمام ہوا۔ بہت سی مساجد میں دروس قرآن اور خطابات کے ذریعے قرآن مجید کی انقلابی تعلیمات کو پیش کیا گیا۔ ذاتی رابطے کے ذریعے علماء' دانشور اور دیگر تعلیم یافتہ حضرات تک دعوت پہنچائی گئی۔ اس دورہ کے لئے 1700 کلو میٹر فاصلہ طے کیا گیا۔

حلقہ متحدہ عرب امارات

ناظم حلقہ محمد خالد صاحب اپنے ساتھیوں کے تعاون سے حلقے کی جملہ ذمہ داریوں کو احسن طریق پر ادا کر رہے ہیں۔

i) حلقے میں دعوتی و تنظیمی پروگرام وہاں کے مقامی حالات کے حوالے سے اطمینان بخش طریقے پر منعقد ہو رہے ہیں۔ پورے حلقے میں لازمی تنظیمی و دعوتی اجتماعات کے علاوہ دروس قرآن کے 19 حلقے قائم ہیں جہاں پر زیادہ تر ہفتہ وار اور بعض مقامات پر پندرہ روزہ دروس قرآن کے پروگرام ہوتے ہیں۔

ii) ایک رفیق تنظیم نے اپنے بچے کے عقیقہ مسنونہ کی دعوت کے موقع پر دعوت دین کا بھی اہتمام کیا۔ اسی طرح ایک ساتھی نے اپنی دوکان کے افتتاح کے موقع پر دعوتی پروگرام کا اہتمام کیا جب کہ ایک رفیق نے اپنے گھر پر تنظیم اسلامی کی دعوت کے موضوع پر امیر محترم کے خطاب کی ویڈیو کیسٹ دکھانے کا اہتمام کیا۔ بعد ازاں ناظم حلقہ نے دعوت کا خلاصہ بیان کیا اور احباب کے سوالوں کے جواب دیئے۔

iii) مرکزی ناظم تربیت چودھری رحمت اللہ بٹر صاحب کے امارات کے دورہ کے دوران متعدد دعوتی و تربیتی پروگرام منعقد کئے گئے جن سے رفقاء کے علاوہ کثیر تعداد میں احباب نے بھی استفادہ کیا۔

iv) ماہ جنوری میں حلقہ امارات کے تحت ایک سہ روزہ خصوصی تربیتی پروگرام السالمین ٹرانسپورٹ کمپنی کے کیمپ میں منعقد ہوا جس میں تینوں تنظیموں سے 145 رفقاء شریک ہوئے۔ اسی طرح کے دو اور پروگرام بھی دیگر مقامات پر منعقد کئے گئے۔

v) امیر محترم کے سفر حجاز کے موقع پر ماہ دسمبر 95ء میں حلقہ امارات سے کافی رفقاء قافلے کی صورت میں امیر محترم کی معیت میں عمرہ کی سعادت کے لئے حجاز مقدس روانہ ہوا۔ یہ قافلہ جو ایک کوسٹر اور دو گاڑیوں میں سوار 23 رفقاء اور تین خواتین پر مشتمل تھا بذریعہ سڑک سفر کر کے وہاں پہنچا اور امیر محترم کے ہمراہ عمرہ کے علاوہ وہاں منعقدہ تربیتی پروگراموں میں بھی مکمل طور پر شریک رہا۔

تنظیم اسلامی حلقہ حجاز

حلقہ حجاز کے ناظم برادرم قیصر جمال فیاضی اپنی ملازمت کی شدید مصروفیت کے باعث حلقے کو مطلوبہ وقت نہیں دے سکے تاہم وقتاً فوقتاً موصوف نے اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے کی بہرحال اپنی سی کوشش کی ہے۔

i) الحمدللہ اس حلقے میں شامل ایک تنظیم جدہ میں تنظیمی استحکام پیدا ہوا اور رفقاء نے نئے جوش وجذبے سے کام کا آغاز کیا۔ تنظیمی اور دعوتی اجتماعات میں باقاعدگی اور بہتری پیدا ہوئی۔ کافی عرصہ سے پیدا شدہ جمود ختم ہوا اور کثیر تعداد میں نئے ساتھی شریک سفر ہوئے۔

ii) ماہ دسمبر میں امیر محترم نے دورۂ حجاز اور سفر عمرہ کے موقع پر جدہ میں 3 مقامات پر اور مکہ میں 2 مقامات پر خصوصی دعوتی اجتماعات سے خطاب فرمایا۔ نیز تنظیمی اور تربیتی پروگراموں کا اہتمام کیا گیا۔ محترم سراج الحق سید صاحب نے "منہج انقلاب نبوی ؐ" پر لیکچرز دیئے۔ امیر محترم کے ہمراہ عمرہ کرنے اور دیگر پروگراموں میں شرکت کے لئے کثیر تعداد میں رفقاء دوسرے شہروں ریاض، دمام، القصیم اور متحدہ عرب امارات سے وہاں پہنچے۔ امیر محترم نے رفقاء سے مختلف امور پر مشورہ کیا اور رفقاء کا تعارف حاصل کیا۔ رفقاء نے امیر محترم کے ہمراہ عمرہ کی سعادت حاصل کی اور مسجد عقبہ میں تجدید بیعت کی۔

iii) محترم رحمت اللہ بٹر صاحب نے رمضان المبارک کے دوران عمرہ کی غرض سے جدہ آنے

پر 4 دعوتی اجتماعات سے خطاب فرمایا جس کا بہت خوشگوار اثر ہوا۔ چاروں اجتماعات کے شرکاء میں امیر محترم کی حکمت صوم کے موضوع پر کیسٹ مفت تقسیم کی گئی۔

iv) ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب ماہ اگست میں عمرہ کے لئے جدہ آئے۔ انہوں نے 23 تا 26 اگست جدہ میں منتخب نصاب نمبر2 کا درس دیا جسے رفقاء کے لئے بہت مفید سمجھا گیا۔

v) سعودی اوجیر کیمپ مکہ میں روزانہ بعد نماز عشاء منتخب نصاب کا درس بذریعہ ویڈیو کیسٹ (دورانیہ 45 منٹ) مکمل ہوا۔ اس کے بعد دورۂ ترجمہ قرآن کا ویڈیو دکھانے کا آغاز کر دیا گیا۔

vi) مکہ اور مدینہ میں اسروں کی کارکردگی ابھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ ناظم حلقہ بہتری کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔

تنظیم اسلامی الریاض

تنظیم اسلامی الریاض کے امیر برادرم انور مسعود اور معتمد برادرم رضا علی گجر ساتھیوں کے مشورے سے اپنے حلقے میں بڑی عمدگی کے ساتھ رفقاء کی تربیت اور توسیع دعوت کے کام میں مصروف ہیں۔

i) وہاں کے مخصوص حالات کے حوالے سے تمام اسروں میں دعوتی اجتماعات دروس قرآن کی صورت میں منعقد ہوتے ہیں جن میں رفقاء کے علاوہ احباب بھی شریک ہوتے ہیں۔

ii) ماہ نومبر 95ء میں مکتبہ ولائبریری کو وسعت دے کر شعبہ نشرواشاعت قائم کیا گیا ہے جس کا ناظم ڈاکٹر سید انور علی صاحب کو مقرر کیا گیا ہے۔

iii) ماہ دسمبر میں امیر محترم عمرہ کی غرض سے حجاز مقدس تشریف لائے۔ اس موقع پر 50 کے لگ بھگ رفقاء مکہ مکرمہ گئے اور وہاں مسجد عقبہ میں تجدید بیعت کی اور تربیت گاہ سے بھی استفادہ کیا۔

iv) سال کے دوران 70 ایک روزہ پروگرام منعقد ہوئے جن میں سے کچھ گھروں پر اور زیادہ تر دور دراز مختلف کمپنیوں کے کیمپوں میں رکھے گئے۔ وہاں دروس قرآن اور ذاتی رابطوں کے ذریعے لوگوں کو قرآن کے انقلابی فکر سے متعارف کروایا گیا۔

v) ہر ماہ کل رفقاء کا خصوصی ماہانہ اجتماع ہوتا ہے جس میں درس قرآن کے علاوہ نئے رفقاء کا تعارف اور سوالات کے جواب دیئے جاتے ہیں۔ اسی طرح نقباء اور دیگر ذمہ داران کا بھی ماہانہ خصوصی اجتماع ہوتا ہے جس میں پیش رفت کے لئے باہمی تبادلہ تجاویز ہوتا ہے اور ہدایات دی جاتی ہیں۔

vi) 12 اپریل کو ماہانہ تنظیمی اجتماع میں "اقامت دین کی جدوجہد میں سست روی کے اسباب" کے موضوع پر امیر محترم کا خطاب بذریعہ ویڈیو کیسٹ رفقاء کو سنایا گیا۔
vii) ریاض سے چار سو کلومیٹر دور بریدہ شہر میں متعدد مرتبہ ایک روزہ لگایا اور وہاں تنظیم کو متعارف کروایا۔
viii) خواتین کا لازمی تربیتی پروگرام ہر ماہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہفتہ وار بنیادوں پر عربی گرائمر، تجوید اور درس قرآن کی کلاسیں ہوتی ہیں۔

تنظیم اسلامی الجبیل

تنظیم اسلامی الجبیل کے امیر برادرم عبدالرزاق خان نیازی وہاں کے مخصوص حالات میں دعوت کا بھرپور کام کر رہے ہیں جو زیادہ تر دروس قرآن کے حلقوں کے ذریعے ہو رہا ہے۔ ہر ماہ تنظیم کی رپورٹ باقاعدگی سے مرکز بھجواتے ہیں اور مرکز کی ہدایات کے مطابق اپنے معاملات کو باقاعدگی اور عمدگی سے چلا رہے ہیں۔
i) گزشتہ رمضان المبارک میں اپنے گھر پر نماز تراویح کے بعد دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل کی۔ ماہ دسمبر 95ء میں امیر محترم کے عمرہ اور دورۂ حجاز کے موقع پر الجبیل کے 12 رفقاء نے جزوی طور پر مکہ میں منعقدہ تربیت گاہ میں شرکت کی۔ الجبیل میں شعبہ سمع و بصر قائم کیا گیا ہے جہاں سے آڈیو اور ویڈیو کیسٹس ریکارڈ کر کے لوگوں کو مہیا کی جاتی ہیں۔

اسرہ الواسع

اسرہ الواسع کے نقیب جناب غلام مصطفیٰ صاحب معمول کے دعوتی و تنظیمی پروگراموں کو باقاعدگی سے چلا رہے ہیں جس کی مرکز کو رپورٹ موصول ہوتی رہتی ہے۔ الواسع میں پاکستانیوں کی بہت ہی محدود تعداد کے باعث اس اسرہ کی سرگرمیاں بھی بہت محدود ہیں۔

اسرہ الخبر

اسرہ الخبر کچھ عرصہ قبل تنظیم الجبیل کی کوکھ سے برآمد ہوا ہے۔ اس کے نقیب جناب امجد قاضی صاحب معمول کے دعوتی و تنظیمی پروگراموں کو باقاعدگی سے چلا رہے ہیں۔ مرکز سے ان کا محکم رابطہ قائم ہے۔ رفقاء کی فکری و عملی تربیت اور توسیع دعوت کے لئے وقتاً فوقتاً پروگرام کرتے رہتے ہیں۔

شعبہ نشرواشاعت تنظیم اسلامی پاکستان کی سالانہ رپورٹ
اپریل تا ستمبر 96ء

تنظیم اسلامی کا شعبہ نشرواشاعت دیگر مرکزی شعبہ جات کے مقابلے میں ایک لحاظ سے نوزائیدہ ہے۔ اس شعبہ کا باقاعدہ قیام انیسویں سالانہ اجتماع (اکتوبر 94ء) کے بعد عمل میں آیا۔ یوں شعبہ نشرواشاعت کی عمر اس وقت دو سال ہے۔ نعیم اختر عدنان قبل ازیں ناظم شعبہ کے معاون کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، جب کہ ماہ جولائی 96ء میں انہیں نائب ناظم کی ذمہ داری تفویض کی گئی ہے۔ شعبہ کے تحت ہفت روزہ ندائے خلافت کا اخباری ایڈیشن ہر پندرہ روز کے بعد شائع ہوتا ہے۔ تنظیمی سال کے دوران اخباری ایڈیشن کے 21 شمارے شائع ہوئے جب کہ اشاعتی مواد کی کمی کی وجہ سے 3 شمارے شائع نہ ہو سکے۔ "خبرنامہ" ایڈیشن کا اداریہ محترم جنرل (ر) ایم ایچ انصاری صاحب پوری پابندی کے ساتھ لکھتے رہے۔ دعا ہے کہ ع اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

شعبہ کا دوسرا اہم فرض امیر محترم مدظلہ کے (لاہور میں ہونے والے) خطبہ جمعہ کی پریس ریلیز تیار کرنا اور اسے قومی اخبارات کو جاری کرنا ہے۔ دوران سال شعبہ کی جانب سے یہ کام پہلے کی نسبت زیادہ مربوط انداز میں کیا گیا اور اب تقریباً تمام اخبارات میں پریس ریلیز نمایاں کوریج کے ساتھ شائع ہو رہی ہے۔

دینی اور قومی دنوں کی مناسبت سے مضامین کی تیاری اور اشاعت:

اہم دینی اور قومی دنوں کی مناسبت سے امیر تنظیم اسلامی کے خطابات کو مضامین کی شکل دے کر قومی اخبارات میں شائع کرانے کی کاوش بھی کی گئی جس کے حوصلہ افزا نتائج سامنے آئے ہیں۔ ایسے مضامین کی اشاعت کی تفصیل کچھ یوں ہے:

- ☆ "ایک نیا اور منصفانہ بندوبست اراضی" کے عنوان سے تیار کردہ مضمون روزنامہ "خبریں" میں شائع ہوا۔
- ☆ "سقوط ڈھاکہ۔ ایک تازیانہ عبرت" کے زیر عنوان مضمون روزنامہ "پاکستان" نے مسلسل چار اقساط میں جب کہ روزنامہ نوائے وقت نے 18 دسمبر 95ء کی خصوصی اشاعت میں جلی انداز میں شائع کیا۔
- ☆ "معراج النبی ﷺ" کے زیر عنوان مضمون روزنامہ "خبریں" نے 19 دسمبر کی اشاعت میں

شائع کیا۔

☆ "مذہبی طبقات کا طرز عمل اور پاکستان کی سیاست" کے موضوع پر تیار کردہ مضمون روزنامہ "پاکستان" نے مولانا مودودی مرحوم اور امیر محترم کی تصاویر لگا کر شائع کیا۔

☆ "روزے اور قرآن کا باہمی تعلق" کے موضوع پر تیار کردہ مضمون روزنامہ "جنگ" نے 20ر جنوری 96ء کی رنگین اشاعت میں شائع کیا۔

☆ خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یوم شہادت پر "علی مرتضیٰ" کے عنوان سے تیار کردہ مضمون روزنامہ "خبریں" کی خصوصی اشاعت اور "پاکستان" نے بیک وقت شائع کیا۔

☆ "منہج انقلاب نبوی" سے یوم بدر کے حوالے سے "معرکہ حق و باطل" کے موضوع پر تیار کردہ مضمون "نوائے وقت" کی 19ر جنوری 96ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔

☆ "اسلام کی دو عیدیں" کے عنوان سے امیر تنظیم اسلامی کی تحریر کو روزنامہ پاکستان نے عید کے خصوصی ایڈیشن میں 21ر فروری کو شائع کیا۔

☆ یوم اقبال کے موقع پر "علامہ اقبال اور ہم" کے موضوع پر مضمون روزنامہ "نوائے وقت" میں دو اقساط میں جب کہ یہی مضمون روزنامہ "خبریں" میں بھی خصوصی اشاعت میں شائع ہوا۔

☆ "عید الاضحیٰ اور فلسفہ قربانی" کے موضوع پر تیار کردہ مضمون روزنامہ "جنگ" نے عید الاضحیٰ کی خصوصی اشاعت میں جب کہ روزنامہ "پاکستان" نے عید سے ایک دن قبل شائع کیا۔

☆ "قومی ترانے کے احترام میں قیام اور قومی پرچم کو سلامی" کے موضوع پر امیر محترم کی تحریر جو خبر کے طور پر روزنامہ "خبریں" نے 6ر مئی اور روزنامہ پاکستان نے 8ر مئی کی اشاعت میں صفحہ اول پر جب کہ نوائے وقت نے ادارتی صفحات میں درج کی۔

☆ "شیعہ سنی مفاہمت کی اہمیت اور اس کی ٹھوس اساس" کے زیر عنوان تیار کردہ مضمون روزنامہ "پاکستان" نے 20ر مئی اور روزنامہ "نوائے وقت" نے 28 اور 31ر مئی دو اقساط میں شائع کیا۔

☆ نئے ہجری سال کے موقع پر "ہجری سال نو" کے عنوان سے تیار کردہ مضمون روزنامہ "پاکستان" کی 21ر مئی کی اشاعت میں شائع ہوا۔

☆ "بھارت میں رام راج کی کشمکش اور بھارتی مسلمانوں کے لئے لائحہ عمل" کے موضوع پر

تیار کردہ مضمون روزنامہ "خبریں" نے 14ر جون اور روزنامہ "پاکستان" نے 15 جون کی اشاعت میں شائع کیا۔

☆ "قرون اولیٰ کی عظیم ترین شہادتوں کا تاریخی پس منظر" کے عنوان سے تیار کردہ مضمون روزنامہ "صداقت" نے 21، 22ر جون کو دو اقساط میں شائع کیا۔

☆ "ہم پوری دنیا کا رخ اللہ کی جانب موڑنا چاہتے ہیں" امیر محترم کے خطاب پر مبنی مضمون 24ر جون کی اشاعت میں روزنامہ "پاکستان" نے شائع کیا۔

☆ "اسلام اور عالمی امن" کے موضوع پر تیار کردہ مضمون روزنامہ "صداقت" نے دو اقساط میں، جب کہ روزنامہ "پاکستان" میں 14ر جولائی کو شائع ہوا۔

☆ "اسلام کا اقتصادی نظام" کے زیر عنوان تحریر 25ر جولائی کو روزنامہ "اساس" راولپنڈی میں شائع ہوئی۔

☆ "نبی اکرمؐ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں" کے موضوع پر تیار کردہ مضمون یکم اگست کو "نوائے وقت" میں جب کہ 9ر اگست کو "پاکستان" میں شائع ہوا۔

☆ "اسلام اور پاکستان" کے عنوان سے تیار کردہ تحریر روزنامہ "خبریں" میں 16ر اگست، "پاکستان" میں 18ر اگست اور "صداقت" میں 20، 21، 22ر اگست کو تین اقساط میں شائع ہوئی۔

سیکرٹری اطلاعات کے بیانات، مضامین اور دیگر سرگرمیاں:

تنظیم اسلامی کے سیکریٹری اطلاعات جنرل (ریٹائرڈ) محمد حسین انصاری نے دوران سال قومی اخبارات اور دیگر اداروں کے زیر اہتمام منعقدہ مذاکروں میں شرکت کی۔

☆ "رمضان المبارک کے حوالے سے سالانہ مشق" کے عنوان سے جنرل صاحب کا مضمون "نوائے وقت" نے یکم فروری کو شائع کیا۔

☆ عید الفطر کے موقع پر سیکریٹری اطلاعات کی جانب سے "پیغام عید" سیاسی، سماجی اور دینی جماعتوں کے رہنماؤں کو ارسال کیا گیا۔

☆ آزادیٔ نسواں کے موضوع پر "ندائے خلافت" میں شائع ہونے والی تحریر "نوائے وقت" نے یکم جولائی کو شائع کی۔

دورۂ امریکہ کے دوران جنرل صاحب کی جانب سے ملک کے تازہ ترین حالات پر مبنی مختصر رپورٹ ہر ہفتے امریکہ بھجوائی جاتی رہی۔

وضاحتی بیانات اور مضامین:

حلقہ ملتان کے مظاہرے کی غلط رپورٹنگ پر وضاحتی بیان جاری کیا گیا' مسئلہ کشمیر کے موضوع پر امیر محترم کی پریس کانفرنس کے حوالے سے کیے گئے تبصرہ پر وضاحتی تحریر بھیجی گئی۔

جماعت اسلامی کے سالانہ اجتماع کے حوالے سے امیر محترم کے تبصرہ پر "نوائے وقت" میں چھپنے والے "سرراہے" کے کالم نگار کو وضاحتی بیان بھیجا گیا۔

روزنامہ "خبریں" میں امیر تنظیم کے انٹرویو کی جلی سرخی کے غلط الفاظ کی نشاندہی پر مبنی وضاحت بھیجی گئی۔

روزنامہ "خبریں" کے کالم نگار ہارون رشید کی تحریر "ڈاکٹر اسرار احمد کی ڈور کون ہلا رہا ہے" کے جواب میں نائب ناظم شعبہ کی وضاحتی تحریر یکم جون کو "خبریں" میں شائع ہوئی۔

"امت مسلمہ کا درماندہ مسافر" کے زیر عنوان نعیم اختر عدنان کی تحریر روزنامہ "پاکستان" نے 27 فروری کی اشاعت میں امیر محترم کی تصویر لگا کر شائع کی۔ مجید نظامی اور بشریٰ رحمٰن کو جاگیرداری نظام اور نظام خلافت کے حوالے سے خطوط ارسال کیے گئے۔

متفرق پریس ریلیز:

فیملی لاز' ایرانی وفد کی قرآن کالج آمد' امیر محترم کے دورۂ سعودی عرب وامریکہ' بغاوت کیس میں ملوث فوجی افسروں پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلانے' اقلیتوں کے دوہرے ووٹ' صائمہ لو میرج کیس' حلالہ کی شرعی حیثیت' بنگلہ دیش کے سیاسی حالات' پاک بھارت تعلقات' مقبوضہ کشمیر کے انتخابات جیسے اہم موضوعات پر بیانات کے پریس ریلیز جاری کیے گئے۔

پریس کانفرنس کا انعقاد:

"مسئلہ کشمیر" کے حوالے سے لاہور کے مقامی ہوٹل میں امیر محترم کی پریس کانفرنس منعقد کرانے کا اہتمام کیا گیا۔

***

تنظیم اسلامی کے بیسویں سالانہ اجتماع کے موقع پر خبرنامہ ندائے خلافت کا خصوصی ایڈیشن شائع کیا گیا جس میں مرکزی شعبہ جات' حلقہ جات اور اراکین شوریٰ کا تعارف شامل تھا۔

شعبہ کی جانب سے سال 96ء کا تنظیمی کیلنڈر مرتب کیا گیا جو ندائے خلافت خبرنامہ کی اشاعت میں شائع ہوا۔

دوران سال مختلف بیانات، خبروں اور مضامین کی فائل کٹنگ کا کام باقاعدگی سے ہوتا رہا اور اہم تراشے محفوظ کئے جاتے رہے۔

تربیتی نظام

مرتب: رحمت اللہ بٹر

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مطالعہ سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ انقلاب کے لئے جو افراد کوشش کرتے ہیں وہ اسی قدر کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے جیسی ان کی ابتدائی دور میں تربیت ہوتی ہے۔ اور تربیت میں نظریہ کے ساتھ ساتھ جب تک جان اور مال کا انفاق نہ ہو اس وقت تک کسی کام سے تعلق پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دین کے حقائق سے آگاہی کے لئے تنظیم اسلامی نے اپنے رفقاء کے لئے یہ لازم کیا ہوا ہے کہ وہ تنظیم میں شمولیت کے فوراً بعد اپنے اوقات میں سے ایک ہفتے کی قربانی کریں اور اپنے مال میں سے کم ازکم 5% تنظیم کے اخراجات کے لئے نکالیں۔ یہ ایک ہفتے کا انفاق تربیتی نصاب کا ابتدائی مرحلہ ہے اور اس سے رفیق کا تعلق تنظیم سے استوار ہوتا ہے۔

تنظیمی سال 96-1995ء کے لئے یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ ہر ماہ کم ازکم ایک مبتدی تربیت گاہ منعقد کی جائے۔ لیکن کچھ ناظمین حلقہ جات کی خواہش پر اس پروگرام میں مزید اضافہ کر کے امسال 16 مبتدی تربیت گاہیں منعقد کی گئیں جن سے 296 رفقاء اور 49 احباب نے استفادہ کیا۔ یہ تربیت گاہیں مرکز کے علاوہ کراچی، ملتان، ایبٹ آباد اور پنڈی گھیب میں ہوئیں۔ ملتزم رفقاء کے لئے بھی لازم ہے کہ وہ ملتزم قرار پانے کے بعد ایک تربیت گاہ میں شریک ہوں جس میں جائزہ لیا جاتا ہے کہ انہوں نے تنظیم کے فکر کو کس حد تک سمجھا ہے اور مزید کس حد تک وہ اسے بیان کرنے کی استعداد رکھتے ہیں چنانچہ امسال سات تربیت گاہوں کا بندوبست کیا گیا جو لاہور، ملتان اور کراچی میں منعقد ہوئیں۔ ان تربیت گاہوں میں کل 87 حضرات نے شرکت فرمائی۔

حسب سابق اس سال بھی ملتزم رفقاء کا ایک تربیتی اور مشاورتی اجتماع ماہ اپریل میں رکھا گیا جس میں 325 ملتزم رفقاء شریک ہوئے۔ یہ اجتماع 4 دنوں کے لئے تھا۔ البتہ اس کے ساتھ تنظیم کے مختلف دفاتر اور حلقہ جات میں مختلف عہدوں پر متعین افراد اور نقبائے تناظیم کا بھی ایک روز کے لئے تربیتی اجتماع منعقد کیا گیا جس میں 125 حضرات نے شرکت فرمائی۔

ان شاء اللہ اگلے سال کے لئے تربیت گاہوں کا شیڈول دسمبر 1996 کے میثاق میں دے دیا جائے گا۔ البتہ ماہ نومبر کے لئے رفقاء نوٹ کر لیں کہ مبتدی تربیت گاہ ان شاء اللہ العزیز 8 تا 14ر نومبر مرکزی دفتر تنظیم اسلامی گڑھی شاہو میں منعقد ہو گی۔

تاریخ تربیت گاہ و مقام	کل شرکاء	احباب	
نومبر 1995ء مرکزی دفتر تنظیم اسلامی	14	-	
دسمبر 1995ء واہیوال جہلم	19	2	
جنوری 1996 قرآن اکیڈمی کراچی	23	5	
29ر فروری تا 4ر مارچ 1996ء شارجہ	18	2	(مزید 23 حضرات نے جزوقتی شرکت کی)
3 تا 8ر مارچ العین	18	4	(8 حضرات نے جز وقتی شرکت کی)
9 تا 13ر مارچ ابو ظبی	54	10	(36 حضرات نے جزوی شرکت کی)
15 تا 21ر مارچ 1996ء مرکزی دفتر	19	-	
5 تا 11ر اپریل 1996 مرکزی دفتر	16	-	
24 تا 30ر مئی 1996ء ایبٹ آباد	33	5	
31ر مئی تا 6ر جون 1996ء مرکزی دفتر	15	-	
14 تا 20ر جون 1996ء مرکزی دفتر	7	-	
15 تا 18ر جولائی 1996ء قرآن کالج لاہور	7	-	
19 تا 25ر جولائی 1996ء کراچی	44	13	
9 تا 15ر اگست 1996ء ملتان	33	5	
23 تا 29ر اگست 1996ء	12	2	
6 تا 12ر ستمبر 1996ء مرکزی دفتر	15	1	
	347	49	(رفقاء 296، احباب 49)

ملتزم تربیت گاہیں

جنوری 1996ء قرآن اکیڈمی کراچی	14	-
22تا28، مارچ 1996ء مرکزی دفتر لاہور	7	1 مبتدی
24تا30، مئی 1996ء ایبٹ آباد	20	1 مبتدی
جون 1996ء مرکزی دفتر	7	-
5تا11، جولائی 1996ء قرآن کالج	13	-
15تا18، جولائی 1996ء قرآن اکیڈمی کراچی	9	-
9تا15، اگست 1996ء قرآن اکیڈمی ملتان	17	2
تربیتی و مشاورتی اجتماع ملتزم رفقاء قرآن کالج	325	-
22تا23، اپریل عہدیداران تا ناظمین وحلقہ جات ونقباء حضرات	125	-

☆☆☆

سالانہ رپورٹ

تنظیم اسلامی پاکستان

(حلقہ خواتین)

مرتبہ : بیگم شیخ رحیم الدین

الحمد للہ تنظیم اسلامی کے حلقہ خواتین کو قائم ہوئے تیرہ برس ہو گئے ہیں۔ گزشتہ چھ سال سے یہ حلقہ خاصا فعال اور منظم انداز میں کام کر رہا ہے۔ اب تنظیم اسلامی کے مرد رفقاء کے ساتھ ساتھ رفیقات بھی بقدر استطاعت بڑھ چڑھ کر اقامت دین کی جدوجہد میں مصروف عمل ہیں اور حتی الامکان گھروں میں رہتے ہوئے دروس قرآن اور دروس حدیث کے ذریعے خواتین میں دینی شعور بیدار کرنے اور تنظیم کا پیغام عام کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس سال حلقہ خواتین کی کارکردگی مندرجہ ذیل رہی ہے :

تنظیم اسلامی حلقہ خواتین میں کل رفیقات کی تعداد ۶۴۰ ہے جس میں ۴۴۰ رفیقات اندر [illegible] اور ۱۹۶ بیرون ملک ہیں۔

حلقہ خواتین لاہور

لاہور میں اس وقت رفیقات کی کل تعداد ۲۲۰ ہے۔ یہاں ۱۷ اسرے قائم ہو چکے ہیں۔ پہلے یہاں ۱۵ اسرے قائم تھے لیکن رفیقات کی سہولت کے لئے ایک اسرے کی تقسیم ہوئی جبکہ ایک نیا اسرہ فیروز والہ میں قائم ہوا۔ ۱۷ رفیقات منفرد ہیں، جبکہ ۲۰۳ رفیقات اسروں سے منسلک ہیں۔ ہر اسرے میں دو پروگرام ہر ماہ ہوتے ہیں، ایک عمومی اور دوسرا خصوصی۔ اسروں میں دیئے گئے نصاب کے مطابق پروگرام باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ تمام اسروں میں حاضری تسلی بخش ہے اور رفیقات کا مرکز سے مسلسل رابطہ ہے۔ رفیقات اعانت اور رپورٹ کی بھرپور پابندی کر رہی ہیں۔ منفرد رفیقات میں سے چند ایک کا مرکز سے رابطہ ہے اور وہ باقاعدگی سے اپنی رپورٹ اور اعانت مرکز کو روانہ کرتی ہیں۔

<u>سہ ماہی تربیتی پروگرام</u> : سہ ماہی تربیتی پروگرام بنیادی طور پر رفیقات کی دینی و روحانی تربیت کے لئے منعقد کیا جاتا ہے۔ اس سال یہ پروگرام بوجوہ دو مرتبہ ہی منعقد کیا جا سکا، تاہم دونوں مرتبہ رفیقات نے بھرپور شرکت کی۔ ہر دو پروگراموں میں نقیبات نے اپنے اسروں کی رپورٹس پیش کیں اور اپنی اپنی رفیقات کا انفرادی جائزہ بھی لیا کہ ان کی کارکردگی کیسی رہی۔ اس کے علاوہ رفیقات کو نظام العمل تنظیم اسلامی اور بیعت کی اہمیت کے متعلق معلومات فراہم کی گئیں اور نظم کی پابندی سے متعلق تاکید کی گئی۔ ناظمہ صاحبہ نے مطالبات دین کے موضوع پر رفیقات سے خطاب کیا۔

<u>عمومی دعوتی پروگرام</u> : ہر اسرے کے عمومی و خصوصی پروگراموں کے علاوہ لاہور میں مزید دس مقامات پر دعوتی اجتماعات ہوتے ہیں جن میں رفیقات کے علاوہ دیگر خواتین بھی ذوق و شوق سے شرکت کرتی ہیں۔ مرکزی عمومی اجتماع ہر ماہ کی پہلی اتوار کو قرآن اکیڈمی لاہور میں گزشتہ تیرہ برس سے باقاعدگی سے جاری ہے۔ اس میں درس قرآن، درس منتخب نصاب، درس حدیث کے علاوہ دیگر موضوعات پر دروس کے پروگرام ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ بحمد اللہ کثیر تعداد میں خواتین اس میں شرکت کرتی اور استفادہ کرتی ہیں۔ گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی موسم گرما کی چھٹیوں میں خواتین کے لئے دو ماہ کی قرآن فہمی کی کلاس شروع کی گئی۔

اس میں الحمدللہ ۹۰ خواتین نے داخلہ لیا اور تقریباً ۶۰ خواتین نے باقاعدگی سے کلاسیں اٹینڈ کیں۔ اس کورس میں ان کو عربی گرائمر، منتخب نصاب، مطالعہ احادیث، ارکان اسلام اور تجوید پڑھائی گئی۔ تجوید کی تدریس کے لئے ایک قاریہ صاحبہ کا انتظام بھی کیا گیا۔ کورس کے آخر میں ان مضامین کے ٹیسٹ بھی لئے گئے اور کامیابی سے کورس کی تکمیل کرنے والی خواتین کو اسناد بھی دی گئیں۔

جلسہ استقبال رمضان : حسب سابق اس سال بھی لاہور کے تقریباً ہر اسرے میں استقبال رمضان کے پروگرام منعقد کئے گئے۔ اس سلسلے کا مرکزی پروگرام ۱۷/ جنوری ۹۶ء کو قرآن آڈیٹوریم میں منعقد کیا گیا۔ الحمدللہ یہ پروگرام انتہائی کامیاب رہا۔ اس میں ناظمہ صاحبہ اور نائب ناظمہ صاحبہ کے علاوہ دیگر رفیقات نے بھی رمضان کے متعلق اہم عنوانات پر نہایت جامع تقاریر کیں۔ آخر میں امیر محترم نے خواتین سے خطاب فرمایا جسے تمام خواتین نے پوری دل جمعی کے ساتھ سنا۔ اس پروگرام میں تقریباً ۵۰۰ خواتین نے شرکت کی۔ حلقہ خواتین نے اس کی پبلسٹی کے لئے دو ہزار ہینڈ بل شائع کروا کے تقسیم کئے اور اخبار میں بھی اشتہار دیا گیا۔ امیر محترم کی کتب اور کیسٹس کے سٹال کے علاوہ حجاب بوتیک کا سٹال بھی لگایا گیا جو خواتین میں کافی مقبول ہو گیا ہے۔ اس سٹال سے بڑی تعداد میں برقعے اور چادریں خواتین نے خریدیں۔

مرکزی دفتر حلقہ خواتین

دفتر حلقہ خواتین میں جو قرآن اکیڈمی لاہور میں واقع ہے حسب معمول ہفتے میں دو دن، منگل اور بدھ کو باقاعدگی سے گیارہ تا ڈیڑھ بجے تک کام ہوتا ہے۔ تمام متعلقہ رفیقات ناظمہ صاحبہ کی ہدایات کی روشنی میں کام کرتی ہیں اور اپنی اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے پوری کر رہی ہیں۔

اپریل ۹۶ء سے یہ آفس اکیڈمی میں ایک نئی تعمیر شدہ عمارت میں منتقل ہو گیا ہے۔ یہ نئی عمارت کافی کشادہ ہے جس کی وجہ سے امید ہے کہ مرکزی دفتر کی کارکردگی پر اچھا اثر پڑے گا۔ ان شاء اللہ۔

مرکزی دفتر سے رفیقات سے رابطے کے لئے ۲۶۲ خطوط لکھے گئے۔ ۲۱۰ خطوط سہ ماہی اجتماع کے لئے دعوت نامے کے طور پر روانہ کئے گئے۔ ۵۵ خطوط رفیقات کو ان کی رپورٹس کی پابندی سے متعلق لکھے گئے۔ ۶۰ عدد خطوط عربی گرائمر کورس کے متعلق روانہ کئے گئے۔ جلسہ استقبال رمضان سے متعلق نقیبات اور رفیقات کو ۷۵ خطوط روانہ کئے گئے اور ۳۰۰ دیگر

خواتین کو دعوت نامے بذریعہ ڈاک روانہ کئے گئے۔ اس کے علاوہ گزشتہ سالانہ اجتماع رفقاء میں شرکت کے لئے ۴۰ عدد خطوط نقیبات کو اندرون ملک و بیرون ملک ارسال کئے گئے اور ۳۰ منفرد رفیقات کو بھی اسی سلسلے میں خطوط لکھے گئے۔ جبکہ دفتر میں خطوط کی آمد ۱۵۵ کے لگ بھگ رہی۔

جن رفیقات کا مرکز سے رابطہ بالکل نہیں ہے ان سے رابطے کے لئے خطوط لکھے گئے۔ ناظمہ صاحبہ نے بطور خاص ان اسروں میں جانے کا پروگرام بنایا جنہیں کچھ مسائل درپیش تھے۔ اس سلسلے میں اسرہ نمبر ۱۳' ۱۲' ۷ اور ۱۰ قابل ذکر ہیں جن کے مسائل میں ناظمہ صاحبہ نے خصوصی دلچسپی لی اور ان کے ضمن میں خصوصی ہدایات دیں۔

مرکز کی جانب سے رفیقات کی انفرادی رپورٹس پر محاسبہ کا کام جاری ہے۔ پہلے یہ کام ایک رفیقہ کر رہی تھیں لیکن اب دو اور رفیقات کو بھی یہ ذمہ داری دی گئی ہے تاکہ یہ کام جلد سے جلد مکمل ہو جایا کرے۔ امید ہے کہ اب یہ کام پہلے کی نسبت تیزی سے ہوگا۔

اندرون ملک منفرد رفیقات

اندرون ملک ۳۹ منفرد رفیقات ہیں جن میں سے صرف ۱۰ فعال ہیں اور باقاعدگی سے رپورٹس بھیج رہی ہیں۔ باقی رفیقات کا مرکز سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ انہیں کئی مرتبہ خطوط لکھے گئے لیکن ان کی جانب سے فی الحال کوئی جواب نہیں آیا' سوائے ان کے جن کا پہلے ہی مرکز سے رابطہ ہے۔ منفرد رفیقات کی تفصیل اس طرح سے ہے: راولپنڈی اسلام آباد میں ۹ رفیقات ہیں' ملتان میں ۷ رفیقات ہیں' ڈی جی خان اور میانوالی میں تین تین رفیقات' پشاور' کوئٹہ' وہاڑی' رحیم یار خان اور ہری پور ہزارہ میں دو دو رفیقات' سوات' دیر' باجوڑا یجنسی' گجرات' گوجرانوالہ اور بہاولپور میں ایک ایک رفیقہ ہیں۔

اسرہ سرگودھا : یہاں پہلے ۹ رفیقات تھیں۔ گزشتہ سال کے دوران تین رفیقات کا اضافہ ہوا ہے اور اب یہ تعداد ۱۲ ہو گئی ہے' لیکن یہاں ابھی تک اسرے کے پروگرام شروع نہیں ہو سکے ہیں۔ تاہم نقیبہ صاحبہ اور ایک اور رفیقہ اپنے طور پر دروس قرآن اور ترجمہ قرآن کے پروگرام کر رہی ہیں۔

اسرہ فیصل آباد : بحمد اللہ فیصل آباد میں بھی اسرہ قائم ہو چکا ہے۔ یہاں ۶ رفیقات ہیں۔ مرکز کی جانب سے انہیں نصاب اور رپورٹ بکس وغیرہ فراہم کی گئی ہیں۔ ان کی جانب سے شروع شروع میں رپورٹس اور اعانتیں وغیرہ باقاعدگی سے موصول ہو رہی تھیں لیکن گزشتہ چار ماہ

سے ان کی جانب سے کوئی رپورٹ اور اعانت موصول نہیں ہوئی۔ امید ہے کہ وہ جلد ہی فعال ہوں گی اور مرکز بھی ان سے رابطہ کرے گا۔

حلقہ خواتین کراچی

کراچی میں اس وقت ۱۲۶ رفیقات ہیں۔ پہلے یہ تعداد ۱۳۷ تھی۔ یہاں پہلے آٹھ اسرے قائم ہو چکے تھے لیکن اسرہ نمبر۵ کی نقیبہ کی معروفیت اور دیگر مجبوریوں کی وجہ سے اسرہ نمبر۵ اور اسرہ نمبر۷ کو ضم کر کے ایک اسرہ بنا دیا گیا۔ اسی طرح اسرہ نمبر۱ میں اسرے کی نقیبہ اور نائب نقیبہ کے اپنے عہدوں سے مستعفی ہونے کے بعد یہاں نئی نقیبہ اور ان کی نائب کا تقرر کیا گیا۔ اسرہ نمبر۷ لانڈھی' کورنگی کی نقیبہ نے اپنے اسرہ کو عارضی طور پر ختم کرنے کی درخواست کی تھی کیونکہ یہاں کی رفیقات فاصلے زیادہ ہونے کی وجہ سے اجتماعات میں شرکت نہیں کر سکتی تھیں۔ چنانچہ مقامی ناظمہ کراچی نے اس اسرہ کو ختم کر کے یہاں کی رفیقات کو منفرد قرار دے دیا۔ اب یہاں ۱۰ رفیقات منفرد ہیں۔ باقی تمام رفیقات اسروں سے منسلک ہیں۔ تمام رفیقات' سوائے چند ایک کے' فعال ہیں اور اپنی نقیبات اور ناظمہ صاحبہ سے بھرپور تعاون کرتی ہیں۔ تمام اسروں میں دیئے گئے نصاب کے مطابق پروگرام ہو رہے ہیں اور رفیقات رپورٹس اور اعانت باقاعدگی سے ادا کر رہی ہیں۔

اس سال کے دوران ہر تین ماہ بعد ناظمہ کراچی اور تمام نقیبات کی مشاورت باقاعدگی سے ہوتی رہی۔ پہلی مشاورت ۲۳ دسمبر ۹۵ء کو' دوسری ۹ مارچ کو اور تیسری مشاورت ۲۲ جون ۹۶ء کو ہوئی جن میں آئندہ کے پروگرام اور رفیقات کے مسائل پر گفتگو ہوئی۔

حلقہ خواتین کے سہ ماہی پروگرام ۱۳/ جنوری اور ۱۳/ اپریل کو ہوئے جن میں رفیقات نے بھرپور شرکت کی۔ ان پروگراموں میں رفیقات نے مختلف موضوعات پر تقاریر کیں اور نئی رفیقات و نقیبات کا تعارف ہوا۔ نیز نقیبات نے اپنے اپنے اسرے کی رپورٹس پڑھ کر سنائیں اور اپنے مسائل سے مقامی ناظمہ صاحبہ کو آگاہ کیا۔ بعض مسائل میں مقامی ناظمہ صاحبہ نے اپنی صوابدید کے مطابق فیصلے کئے اور بعض انتظامی معاملات کو امیر محترم اور ناظمہ علیا صاحبہ کے مشورے سے طے کیا گیا۔ تمام اسروں میں تجوید اور ترجمہ قرآن کی کلاسیں ہفتہ وار ہوتی ہیں اور دروس قرآن کے پروگرام امیر محترم کے کیسٹ کے ذریعے بھی کئے جاتے ہیں' نیز عربی گرامر کی کلاسیں بھی باقاعدگی سے ہو رہی ہیں۔

رپورٹ بیرون ملک

تنظیم اسلامی حلقہ خواتین بیرون ملک میں بھی رفیقات کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے لیکن یہاں باقاعدگی سے تنظیمی پروگرام شروع نہیں ہو سکے۔ اس کی ایک وجہ طویل فاصلے ہیں۔ امیر محترم اور ناظمہ صاحبہ کے گزشتہ بیرون ملک دورۂ امریکہ دوران وہاں کے نظم میں تبدیلی کی گئی اور کینیڈا اور امریکہ کے دو اسروں کو ایک دوسرے سے منسلک کر کے مسز عبدالغفور صاحبہ کو ناظمہ بنایا گیا تھا جو ماشاء اللہ بہت فعال اور سرگرم رفیقہ ہیں اور بہت شوق اور جذبہ سے کام کرتی ہیں۔ انہوں نے تمام رفیقات سے فرداً فرداً رابطے کئے، انہیں خطوط لکھے اور بذریعہ ٹیلیفون بھی ان سے رابطہ کیا۔

مرکز سے بھی انہیں بھرپور رہنمائی دی جا رہی ہے۔ امریکہ و کینیڈا کی تمام رفیقات کے بیعت فارم اور کوائف فارم کی فوٹو کاپیاں انہیں روانہ کی گئیں تاکہ وہ ان کا ریکارڈ رکھ سکیں اور ان کے کوائف بھی ان کے پاس رہیں۔ اس وقت کینیڈا میں ۴۲ اور امریکہ میں ۵۵ رفیقات ہیں۔ ان سب سے مقامی ناظمہ رابطہ رکھیں گی، ان کی رپورٹس وصول کریں گی اور ان پر وقتاً فوقتاً محاسبہ بھی کریں گی۔ اعانتوں کا حساب یہاں مرکز کی بجائے وہیں امریکہ کے مقامی امیر عطاء الرحمٰن صاحب کو دیا کریں گی۔ امیر محترم اور ناظمہ صاحبہ کے مشورے سے انہیں اس سلسلے میں تمام ہدایات روانہ کی جا چکی ہیں۔

کینیڈا میں اسرے کے پروگرام دیئے گئے نصاب کے مطابق ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر دروس قرآن کے پروگرام اور ترجمہ قرآن و ناظرہ کی کلاسیں بھی باقاعدگی سے ہو رہی ہیں۔

۲۴/مارچ کو امریکہ اور کینیڈا کی رفیقات کا سالانہ اجتماع منعقد ہوا۔ مقامی ناظمہ صاحبہ اور دیگر رفیقات کی شدید محنت کے باعث یہ پروگرام بہت کامیاب رہا، جس میں ۴۰۰ خواتین نے شرکت کی۔

<u>لندن</u> : لندن میں اس وقت ۴۴ رفیقات ہیں۔ یہاں چھ اسرے قائم ہیں اور ۵ رفیقات منفرد ہیں۔ تمام اسروں میں پروگرام ہو رہے ہیں، لیکن کچھ اسروں میں دیئے گئے نصاب کے مطابق پروگرام ہوتے ہیں جبکہ بعض میں ایسا نہیں ہوتا۔ ان سب میں اسرہ نمبر۱ اور اسرہ نمبر۲ زیادہ فعال ہیں۔ پہلے ان کی رپورٹس وغیرہ بھی موصول ہوتی رہی ہیں لیکن گزشتہ چار پانچ ماہ سے کوئی رپورٹ موصول نہیں ہوئی تھی۔ تاہم اب حال ہی میں ان کی تین تین ماہ کی تمام اسروں کی

رپورٹس اور پروگراموں کی رپورٹس موصول ہوئی ہیں۔

لندن میں خواتین آفس کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔ دو رفیقات نے اعزازی ذمہ داری قبول کرلی ہے اور کام شروع ہو چکا ہے۔ حال ہی میں نقیبات اور ناظمہ صاحبہ کی ایک میٹنگ ہوئی ہے جس میں آئندہ پروگراموں کے بارے میں لائحہ عمل طے کیا گیا ہے۔

یہاں کی نقیبہ مسز حسن صاحبہ اور اسرہ نمبر ۱ کی نقیبہ مسز رشید صاحبہ کی خصوصی محنت کی وجہ سے یہاں بحمد اللہ کام کا منظم آغاز ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی سعی و جہد کو قبول فرمائے۔ آمین!

ابو ظہبی : یہاں پہلے ۲۵ رفیقات تھیں لیکن العین کی چار رفیقات کا الگ اسرہ قائم ہونے کے باعث اب یہاں ۲۱ رفیقات رہ گئی ہیں۔ یہاں کی رفیقات اور نقیبہ بہت ذوق و شوق سے تنظیمی امور سرانجام دیتی ہیں اور دیئے گئے نصاب کے مطابق باقاعدگی سے پروگرام ہو رہے ہیں۔ رفیقات کی انفرادی رپوٹس اور اعانتیں بھی موصول ہو رہی ہیں۔

العین : العین میں پہلے چار رفیقات تھیں اور ان کا رابطہ ابو ظہبی کی نقیبہ سے ہی تھا' وہی ان کے پروگرام کے بارے میں ہدایات دیتی رہتی تھیں۔ اب یہاں چھ رفیقات ہو گئی ہیں' اسی لئے یہاں الگ اسرہ قائم کر دیا گیا ہے۔ یہاں بحمد اللہ نصاب کے مطابق تنظیمی پروگرام ہو رہے ہیں۔ ان کی جانب سے انفرادی رپورٹس' اعانتیں اور پروگرام کی رپورٹس بھی مرکز کو موصول ہو گئی ہیں۔

ریاض : ریاض میں اس وقت ۱۷ رفیقات ہیں۔ تقریباً تمام رفیقات کی فائلیں مکمل ہو چکی ہیں' اور ان کی جانب سے رپورٹس اور اعانت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے۔ تنظیمی پروگراموں کی رپورٹس بھی نقیبہ صاحبہ باقاعدگی سے روانہ کر رہی ہیں اور دیئے گئے نصاب کے مطابق رفیقات کی تربیت کی کوشش جاری ہے۔

جدہ : یہاں ۹ رفیقات ہیں۔ ناظمہ صاحبہ کے گزشتہ دورۂ سعودیہ کے دوران یہاں دو اسرے قائم کئے گئے تھے لیکن تاحال یہاں پروگرام مطلوبہ نہج پر شروع نہیں ہو سکے۔ مرکز کی جانب سے انہیں یاددہانی کے خطوط متعدد بار لکھے گئے لیکن یہاں کی نقیبہ صاحبہ اپنی ذاتی مجبوریوں اور پریشانیوں کی وجہ سے جواب نہیں دے سکیں۔ گزشتہ دنوں وہ لاہور آئی تھیں اور یہاں ناظمہ صاحبہ سے ان کی ملاقات ہو چکی ہے۔ انہوں نے یقین دہانی کرائی ہے کہ اب ان شاء اللہ وہاں جلد ہی پروگرام نصاب کے مطابق شروع ہوں گے۔

شارجہ : شارجہ میں ۶ رفیقات تھیں۔ یہاں کی نقیبہ بیگم فرخ ریاض بہت محنت سے اسرے کے پروگرام' دروس قرآن اور ترجمہ قرآن کی کلاس کے پروگرام چلا رہی تھیں لیکن اب وہ ساؤتھ افریقہ منتقل ہو گئی ہیں۔ ان کی نائب بھی فی الحال کچھ عرصہ کے لئے پاکستان شفٹ ہو چکی ہیں اور ایک اور رفیقہ بھی یہاں سے دبئی جا چکی ہیں' اس لئے فی الحال یہ اسرہ ختم کر دیا گیا ہے۔ یہاں کی بقیہ رفیقات منفرد شمار ہوں گی اور ان کا براہ راست مرکز سے رابطہ رہے گا۔ دعا ہے کہ یہاں جلد دوبارہ اسرہ قائم ہو جائے اور اسرے کے پروگرام دوبارہ شروع ہو جائیں۔

یہ تھی حلقہ خواتین تنظیم اسلامی کی کارکردگی کی مختصر روداد۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پاکستان میں اسلامی انقلاب کے لئے کوشش کرنے والوں کی مدد فرمائے' یہاں اللہ کا نظام غالب یعنی نظام خلافت قائم ہو اور ہم خواتین کو اس میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین !

****

انوار الحدیث

طیبہ یاسمین

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :
"تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں بن سکتا جب تک اپنے (مسلمان) بھائی کے لئے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے"۔ (بخاری)

اس حدیث پاک کو عملی زندگی کے جس پہلو پر بھی منطبق کریں معاشرے کے سارے معاملات کی اصلاح ہو جاتی ہے۔

اگر اسے خاندانی اور گھریلو زندگی میں نافذ کریں تو کوئی رشتہ دار' عزیز' ملازم' آقا کسی کی حق تلفی نہیں کر سکتا' نہ ہی کسی قسم کی کوئی زیادتی کر سکتا ہے' کیونکہ وہ اپنے لئے حق تلفی اور زیادتی کو پسند نہیں کرتا۔ خاندانی جھگڑے' جن میں والدین' اولاد' ساس' بہو' نند بھاوج ملوث ہوتی ہیں' باقی نہیں رہ سکتے' کیونکہ کوئی بھی خود اس طرح کے حالات سے دوچار ہونا پسند نہیں کرتا۔ ہر شخص دوسرے کی مشکلات' الجھنوں اور مجبوریوں کا احساس کرے گا' کیونکہ وہ اپنے لئے یہی چاہتا ہے کہ اس کی مشکلات' الجھنوں اور مجبوریوں کا احساس کیا جائے۔

تاجر اگر اسے پیش نظر رکھے تو وہ چور بازاری اور مہنگائی کا مرتکب نہ ہو گا' کیونکہ وہ خود بھی ضرورت کی ہر چیز با آسانی اور سستی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کوئی کسی کا دل نہ دکھائے گا' کسی پر طعنہ زنی نہ کرے گا' کسی کی عیب جوئی نہیں کرے گا' کسی کی جان' مال آبرو کے لئے خطرہ نہیں بنے گا' کیونکہ کوئی بھی ان باتوں کو اپنے لئے پسند نہیں کرتا۔ مالک اپنے ملازم پر فالتو اور ناروا کام نہیں ڈالے گا۔

اس حدیث کو مدنظر رکھنے کے بعد کسی کو ناکارہ اور بے کار اشیاء خیرات میں دے کر جان نہ چھڑائی جائے گی' کسی پر احسان کر کے بار بار جتایا نہ جائے گا' کسی کی چھوٹی موٹی خطا

کو عوام میں اس کی رسوائی کا ذریعہ نہ بنایا جائے گا۔ اپنے گھر کا کوڑا ہمسایہ کے گھر کے سامنے نہ پھینکا جائے گا' کیونکہ کوئی بھی خود سے ایسا سلوک پسند نہیں کرتا۔ غرضیکہ جس پہلو کی طرف بھی نظر دوڑائیں خیر ہی خیر' امن ہی امن اور سکون ہی سکون چھا جائے گا۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

جلد:	۴۵
شمارہ:	۱۰
جمادی الاخری	۱۴۱۷ھ
نومبر	۱۹۹۶ء
فی شمارہ	۱۰/-
سالانہ زرتعاون	۱۰۰/-

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات، قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان — 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون: 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی 67۔گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

ملک کی داخلی سیاسی فضا پر بے یقینی کے گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ یہ بات اب تقریباً ہر سنجیدہ حلقے کی جانب سے کہی جارہی ہے اور زبان خلق کو بھی اگر نقارۂ خدا سمجھا جائے تو یہی تاثر سامنے آتا ہے کہ موجودہ حکومت اب محض ایک گرتی ہوئی دیوار ہے جسے دھکا دے کر اسے اس کے منطقی انجام تک پہنچانے کی ایک کوشش امیر جماعت اسلامی 'محترم قاضی حسین کے دھرنے کی صورت میں سامنے آئی۔ اس دھرنے کے حوالے سے جماعت اسلامی اور موجودہ حکومت کے درمیان محاذ آرائی بلکہ ضدم ضدا کی جو کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس کے جلو میں آنے والے سنگین خطرات اور اندیشے ہر صاحب بصیرت شخص کو نظر آرہے تھے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ مرحلہ خدشات کے برعکس 'بہت حد تک بخیر و عافیت گزر گیا۔ اس ضمن میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور تنظیم اسلامی کا موقف یکم نومبر کے خطاب جمعہ کے پریس ریلیز کی صورت میں وضاحت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ مذکور پریس ریلیز کا متعلقہ حصہ ملاحظہ کیجئے :

> "ملک کے سیاسی حالات کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ قاضی حسین احمد اور جماعت اسلامی کے کارکن کامیاب دھرنے پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جماعت کے قائدین اور کارکنوں نے تمام تر رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود جرات کی داستان رقم کی ہے۔ انہوں نے قاضی صاحب سے کہا کہ وہ جماعت اسلامی کے مخلص 'منظم اور اسلام پسند کارکنوں کی قیمتی قوت کو سیاسی محاذ آرائی اور پاور پالیٹکس کی نذر کرنے کی بجائے منکرات کے خلاف استعمال کریں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا انتظامیہ بھی مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے دھرنے کو روکنے کے لئے گولی کے استعمال سے گریز کیا اور اس کے باوجود کہ بعض جگہ پتھراؤ کی وجہ سے پولیس کو پسپائی اختیار کرنا پڑی لیکن انہوں نے اس پر تحمل کا مظاہرہ کیا"۔

اہل حدیث حضرات کی حدیث سے بے خبری!

مدیر "الدعوۃ" کا طرز عمل تجاہل عارفانہ ہے یا تغافل مجرمانہ؟

ماہنامہ الدعوۃ اہل حدیث مسلک کے ایک گروہ کا نمائندہ پرچہ ہے جو مرکز الدعوۃ والارشاد کے نام سے جہاد کے آخری مرحلے یعنی "قتال فی سبیل اللہ" کی سطح پر سرگرم عمل

ہے۔اس سوال سے قطع نظر کہ آیا انہوں نے جہاد کے ابتدائی مراحل طے کرنے اور دعوت کا حق ادا کرنے کے بعد قتال فی سبیل اللہ کی وادی میں قدم رکھا ہے یا وہ زقند لگا کر آخری مرحلے تک پہنچے ہیں؟ اور آیا پاکستان میں انہوں نے دعوت و تنظیم کے تمام مراحل طے کر کے ایسی مستحکم سیاسی پوزیشن حاصل کر لی ہے جو نبی اکرم ﷺ کو ہجرت کے بعد مدینہ میں حاصل تھی اور اس کے بعد وہ افغانستان اور کشمیر کے مظلومین کے لئے قتال بالسیف کو سورۃ النساء کی آیت نمبر ۷۵ کے حوالے سے فرض و واجب گردانتے ہیں یا یہاں ابھی وہ دعوت کے ابتدائی مراحل ہی میں ہیں اور کسی ایسے قابل ذکر مرکز کے حصول کے بغیر ہی کہ جہاں وہ سیاسی طور پر غالب و مستحکم ہوں' انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے طریق انقلاب کو پس پشت ڈالتے ہوئے' اپنے طور پر قتال فی سبیل اللہ کے لزوم کا اعلان کر دیا ہے؟' ہم سردست "الدعوۃ" کے اکتوبر کے شمارے میں شائع ہونے والے ایک مضمون کے حوالے سے تاسف اور حیرت کے اظہار پر اکتفا کریں گے۔ اپنے اس پرچے میں "اخبار و آراء" کے مستقل عنوان کے تحت مدیر موصوف نے جلی سرخی کچھ اس طرح باندھی ہے : "ڈاکٹر اسرار نے امام مہدی کے ظہور کا اعلان کر دیا"۔ اور ساتھ ہی ایک ذیلی سرخی بھی چوکھٹے میں نمایاں انداز میں جڑی ہے : "اب دیکھئے! پرِ اسرار حجاب اٹھا کر کب یہ بات ظاہر ہو گی کہ لو! دیکھ لو۔ میں ظاہر ہو چکا!"۔ یہ مضمون ابتذال اور ہرزہ گوئی کا ایک شاہکار ہے کہ اس میں صحافتی دیانت اور ادب و اخلاق کے کسی کمترین معیار کو بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا بلکہ یہ مغالطہ آمیزی' ہجو گوئی اور غلط بیانی کا ایک ایسا مرقع ہے جس کا سوائے اس کے اور کچھ حاصل نہیں کہ اس کے ذریعے صاحب مضمون کی ثقاہت ہی بری طرح مجروح ہوئی ہے۔

اس مضمون کے تفصیلی جواب کا حق ہم محفوظ رکھتے ہیں۔ تاہم سطور ذیل میں ہم صرف اس امر پر حیرت اور رنج کے اظہار پر اکتفا کریں گے کہ خود کو اہلحدیث کہلوانے والے حدیث رسول سے اس درجے بے خبر اور ذہناً اتنے بعید ہیں کہ جس حدیث صحیح کے حوالے سے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب گزشتہ پانچ برسوں سے امت کے پانچ ادوار کا ذکر کر رہے ہیں اور جسے انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے بڑے پیمانے پر عام کیا ہے اور ہر موقع پر اس کا ذکر سند اور حوالے کے ساتھ کیا ہے' اس کے بارے میں مدیر "الدعوۃ" لکھتے ہیں : "اس چیز کی انہوں نے (یعنی ڈاکٹر صاحب نے) وضاحت نہیں کی کہ یہ پانچ ادوار کی باتیں انہوں نے قرآن کی کس آیت سے لی ہیں اور نبی ﷺ کی کس حدیث سے لی ہیں۔ چونکہ ایسی کوئی آیت

اور حدیث ہے ہی نہیں جہاں پانچ ادوار کا ذکر ہو لہٰذا ڈاکٹر صاحب کو الہام ہی ہو سکتا ہے۔ ہوا کہاں سے ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب ہی بتلائیں تو بہتر ہے"۔

اب اسے مدیر الدعوۃ کا تجاہل عارفانہ قرار دیا جائے یا تغافل مجرمانہ، اس کا فیصلہ ہم مدیر موصوف پر چھوڑتے ہیں۔ سطور ذیل میں ہم وہ حدیث مکمل سند کے ساتھ درج کر رہے ہیں۔ تاہم ہمیں حیرت اس بات پر ہے کہ صاحب مضمون کو طنز و استہزاء کے زہر میں بجھا ہوا یہ مضمون لکھنے کی ایسی کیا عجلت تھی کہ اس کی تحریر سے قبل نہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے یا تنظیم اسلامی کے کسی ذمہ دار شخص سے براہ راست یہ معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کی کہ اس حدیث کا حوالہ کیا ہے، حالانکہ یہ کام وہ بہت آسانی سے کر سکتے تھے، اور نہ خود انہوں نے ذخیرۂ حدیث پر نظر ڈالنے کی کوئی حاجت محسوس کی، حالانکہ آجکل ایسے کمپیوٹر سافٹ ویئر عام دستیاب ہیں کہ جن کے ذریعے کسی حدیث کی سند اور حوالہ تلاش کرنا انتہائی سہل ہو چکا ہے اور جس کام کے لئے ہفتہ عشرہ درکار ہوتا تھا وہ اب چند منٹ میں سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ اور اہل حدیث حضرات کے بارے میں ہمارا حسن ظن یہ تھا کہ وہ حدیث رسولؐ میں خصوصی شغف رکھتے ہیں اور اشتغال بالحدیث ان کا طغرائے امتیاز ہے۔ لیجئے حدیث کا متن ملاحظہ فرمائیے :

حدّثنا سليمانُ بنُ دَاوُدَ الطَّيالِسِيُّ حدّثني داودُ بنُ إبراهيمَ الوَاسِطِيُّ حدَّثني حَبِيبُ بنُ سالمٍ عنِ النُّعمانِ بنِ بَشيرٍ قال كنّا قُعودًا في المسجدِ معَ رسولِ الله ﷺ وكانَ بَشيرٌ رجُلاً يَكُفُّ حَديثَهُ فجاءَ أبو ثَعْلَبَةَ الخُشَنِيُّ فقال يا بَشيرُ بنَ سعدٍ أَتحفَظُ حَديثَ رسولِ الله ﷺ في الأُمراءِ فقال حُذَيفةُ أنا أحفَظُ خُطبَتَهُ فجلسَ أبو ثَعلبةَ فقال حُذيفةُ قال رسولُ الله ﷺ : ((تكونُ النُّبُوَّةُ فيكم ما شاءَ اللهُ أَن تَكون، ثُمَّ يَرفعُها إذا شاءَ أن يرفعَها ثمَّ تكونُ خلافةٌ على مِنهاجِ النُّبوةِ فَتكونُ ما شاءَ اللهُ أَن تَكونَ، ثمَّ يَرفعُها إذا شاءَ اللهُ أَن يَرفعَها ثمَّ تكونُ مُلكًا عَاضًّا فَيكونُ ما شاءَ الله أَن يَكونَ، ثمَّ يَرفعُها، إذا شاءَ أَن يرفعَها، ثمَّ تَكونُ مُلكًا جَبْرِيَّةً فَتكونُ ما شاءَ الله أَن تَكونَ، ثمَّ يرفعُها إذا شاءَ أَن يرفعَها، ثمَّ تكونُ خِلافةً على مِنهاجِ النُّبوَّةِ، ثمَّ سَكتَ))۔ (مسند أحمد ، حديث ١٧٦٨٠)

مدیر "الدعوۃ" کا یہ سارا ہی مضمون غلط بیانیوں اور مغالطہ آمیزیوں کا پلندہ ہے اور اس کا اصل سبب یہ ہے کہ مدیر موصوف نے ڈاکٹر صاحب کا موقف جانے اور سمجھے بغیر طنز کے تیر چلائے ہیں۔ بلکہ ان کے اس مضمون کو پڑھ کر یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ نہ وہ "میثاق" اور "ندائے خلافت" کا مطالعہ کرتے ہیں کہ جو محترم ڈاکٹر صاحب کے موقف کے ترجمان پرچے ہیں، نہ انہوں نے کبھی ڈاکٹر صاحب کا ان موضوعات پر کوئی خطاب براہ راست یا بذریعہ کیسٹ سنا ہے، بلکہ یہ بات بھی دعوے کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی جانب منسوب اخباری بیانات بھی غور سے نہیں پڑھے بلکہ ان کے جزوی اور سرسری مطالعے پر اکتفا کرتے ہوئے اپنے قلم کو نشتر کی صورت دے دی ہے۔

ہم نے محترم ڈاکٹر صاحب کے مذکورہ خطاب جمعہ کو زیر نظر شمارے میں شائع کر دیا ہے۔ وہ اگر واقعی محترم ڈاکٹر صاحب کے موقف کو جاننے میں سنجیدہ ہیں تو اس کا مطالعہ کریں اور پھر اگر انہیں کسی بات سے اختلاف ہے تو سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اختلاف کریں۔ جو رویہ انہوں نے اختیار کیا ہے وہ تو کسی ایسے عام اخباری صحافی کو بھی زیب نہیں دیتا جو دینی اقدار و اخلاق سے بیگانہ ہو، چہ جائیکہ ایک دینی تحریک سے وابستہ ذمہ دار صحافی اتنی پست سطح تک اتر آئے۔

ہم مدیر الدعوۃ سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اخلاقی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے "الدعوۃ" کے اگلے شمارے میں حدیث رسول ؐ کے بارے میں اپنی اس غلطی کا اعتراف کریں اور اس حوالے سے انہوں نے محترم ڈاکٹر صاحب پر جو کیچڑ اچھالا ہے اس پر معذرت کریں۔ اگر وہ اس پر تیار نہ ہوں تو انہیں کم از کم اس اخلاقی جرات کا مظاہرہ تو ضرور کرنا چاہئے جس کی طرح محترم ڈاکٹر صاحب بہت پہلے ڈال چکے ہیں۔ وہ اگر بھول رہے ہیں تو ہم انہیں یاد دلاتے ہیں کہ دو سال قبل تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع کے موقع پر امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ان کے قائد اور امیر حافظ سعید صاحب کو دعوت خطاب دی تھی اور اس بات کا پورا موقع فراہم کیا تھا کہ وہ تنظیم اسلامی کے رفقاء کے سامنے اپنا موقف اور غلبہ و اقامت دین کے لئے اپنے طریق کار کو وضاحت سے پیش کریں۔ مرکز الدعوۃ والارشاد کا سالانہ اجتماع بھی آیا ہی چاہتا ہے، مدیر "الدعوۃ" اور ان کے قائد میں اگر اخلاقی جرات ہے تو وہ ڈاکٹر صاحب کو اپنے اجتماع میں شرکت کی دعوت دیں اور اظہار خیال کا موقع عنایت فرمائیں۔ انہیں اگر اپنے موقف اور منہج عمل پر اعتماد ہے تو انہیں محترم ڈاکٹر صاحب کو دعوت خطاب دینے میں ہرگز تامل نہیں ہونا چاہئے!

مہدئ موعودؒ کی شخصیت

قرآن کے فلسفۂ تاریخ اور احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ۱۱/ اکتوبر کا خطاب جمعہ

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہِ الکریم

اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ میرا بیرون ملک اور اندرون ملک سارا سفر طے شدہ پروگرام کے مطابق مکمل ہوا۔ میں نے ۲۰/ ستمبر کا جمعہ نیویارک میں اور ۲۷/ ستمبر کا جمعہ پاکستان کے انتہائی شمالی علاقے دیر میں ادا کیا۔ جبکہ اس کے بعد ۴/ اکتوبر کا جمعہ تنظیم اسلامی پاکستان کے سالانہ اجتماع کے موقع پر راولپنڈی میں ادا کیا' جہاں میرے خطاب جمعہ کی حیثیت سالانہ اجتماع کے افتتاحی خطاب کی تھی۔ اس بار ہمارا سالانہ اجتماع کل پاکستان اجتماع نہیں تھا' بلکہ یہ پنجاب کے اکثر و بیشتر حصے (یعنی جنوبی پنجاب کے ماسوا)' آزاد کشمیر اور صوبہ سرحد کے رفقاء کا اجتماع تھا' جو ۴ سے ۶/ اکتوبر تک لیاقت باغ راولپنڈی میں ہوا۔

اس سفر کے دوران مجھ پر بیماری کے دو شدید حملے بھی ہوئے۔ ایک مرتبہ امریکہ میں جبکہ وہاں پروگرام جاری تھا' فوڈ پائزننگ کی بہت شدید شکایت ہوئی' لیکن الحمد للہ اس کے باوجود وہاں ہمارا پروگرام طے شدہ شیڈول کے مطابق تکمیل کو پہنچا۔ اس پروگرام میں میری تین تقریریں تھیں اور میرے لئے خوش قسمتی کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جس تقریب میں شرکت کے لئے مجھے بھی خصوصی طور پر وہاں مدعو کیا گیا تھا' اس میں مسجد حرام کے ائمہ کرام میں سے ایک امام ڈاکٹر عبداللہ صالح بن عبید مہمان خصوصی تھے' لہٰذا انہوں نے میری یہ تینوں تقریریں سنیں اور اس طرح ہماری اس دعوت کا تعارف سعودی عرب کے دینی حلقے کی ایک چوٹی کی شخصیت کے ساتھ ہوا۔

خود امریکہ میں ایک بہت معروف سکالر عمران این حسین' جن سے میرا تعارف تو

کئی سال سے ہے اور وہ میرے دروس و خطابات میں شرکت کے لئے بڑے ذوق و شوق سے آیا کرتے تھے' اس مرتبہ ہمارے بہت قریب آ گئے۔ عمران این حسین کا اصل تعلق ویسٹ انڈیز سے ہے اور ان کا مقام پیدائش ٹرینیڈاڈ ہے۔ امریکہ میں ان کا شمار ان معدودے چند معروف ترین سکالرز میں ہوتا ہے جو انگریزی زبان میں گفتگو کر کے لوگوں کو دین کی بات سمجھا سکتے ہیں۔ امریکہ میں چونکہ اب ہر شہر میں اسلامک سنٹرز قائم ہو چکے ہیں اور بڑی تعداد میں مساجد تعمیر ہو گئی ہیں' جبکہ اس طرح کے سکالرز کی تعداد وہاں بہت کم ہے' لہٰذا پورے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا میں ان حضرات کی ڈیمانڈ رہتی ہے اور انہیں آئے روز مختلف شہروں میں خطابات کے لئے جانا پڑتا ہے۔ عمران این حسین ان سکالرز میں بہت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور انتہائی ذہین و فطین اور باصلاحیت انسان ہیں۔ اس سفر امریکہ میں یہ ہمارے اس قدر قریب آ گئے ہیں کہ وہ ہمارے سالانہ اجتماع میں شرکت کے لئے پاکستان تشریف لائے اور مجھ سے بیعت کر کے تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کی۔ یہ درحقیقت ان بڑی علامتوں میں سے ایک ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے ہاتھوں کوئی خیر منظور ہے' ورنہ جو شخص جتنا زیادہ مشہور اور نمایاں ہو جائے اور لوگوں کے لئے مطلوب ہو چکا ہو اس کے لئے ایثارِ نفس اتنا ہی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔

اپنی بیماری ہی کی حالت میں امریکہ کا پروگرام نمٹانے کے بعد واپس آیا تو پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق مجھے فوری طور پر دِیر جانا تھا۔ میں کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ مجھے اس علاقے سے اس اعتبار سے خصوصی دلچسپی ہو گئی ہے کہ احادیثِ نبویہؐ میں جس "خراسان" کے بارے میں پیشینگوئیاں موجود ہیں کہ حضرت مہدی کی مدد کے لئے وہاں سے لشکر روانہ ہوں گے اس میں یہ علاقہ بھی شامل ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں "خراسان" کا اطلاق جس ملک پر ہوتا تھا اس میں موجودہ خراسان (ایران) کے علاوہ افغانستان کا تقریباً دو تہائی حصہ اور پاکستان کا کم از کم مالاکنڈ ڈویژن کا علاقہ شامل ہے۔ یہاں کے لئے کئی مرتبہ پروگرام بنے لیکن بوجوہ ملتوی کرنا پڑے۔ اس مرتبہ اگرچہ میں امریکہ سے آ کر صرف ایک دن آرام کر سکا تھا لیکن میں نے پروگرام کے مطابق دیر کا طویل سفر اختیار کیا۔ وہاں پر بحمد اللہ ہمارا ایک بہت ہی کامیاب جلسہ ہوا۔ ایک اور قابل

ذکر بات وہاں پر یہ ہوئی کہ ہمارے ایک نہایت باصلاحیت اور پرانے ساتھی، جو اس علاقے میں خاصے معروف ہیں، انہوں نے اس مرحلے پر طے کر لیا کہ وہ اپنی ملازمت کو خیرباد کہہ کر اپنے آپ کو ہمہ وقت دین اور تنظیم کے کام کے لئے وقف کر دیں گے، حالانکہ اس وقت ان کی تنخواہ تیس ہزار روپے ماہانہ ہے۔ یہ بات بھی یقیناً اچھی علامات میں سے ہے۔

سالانہ اجتماع سے قبل میں بڑی شدت سے اسہال میں مبتلا ہو گیا۔ بہرحال جس طرح بھی ممکن ہوا میں نے اس میں شرکت کی اور خطابات بھی کئے، اگرچہ کیفیت یہ تھی کہ صرف خطاب کے لئے بمشکل اٹھ کر چلا جاتا تھا اور تقریر کے بعد واپس آ کر پھر بے سدھ پڑ جاتا تھا۔ سالانہ اجتماع کے موقع پر اگرچہ موسم کی ناموافقت کے باعث ہمارے عمومی پروگرام اتنے کامیاب نہیں ہو سکے کیونکہ بارش کی وجہ سے لیاقت باغ کیچڑ اور دلدل سے بھر گیا تھا، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ تنظیمی سطح پر ہمیں الحمدللہ بہت فائدہ ہوا۔ اس لئے کہ اجتماع کے مختلف پروگرام مختلف جگہوں پر ہونے کے باعث ہمارے ساتھیوں کی وہاں جو نقل و حرکت ہوئی اس سے راولپنڈی کے لوگوں کو تنظیم اسلامی کو قریب سے دیکھنے کا زیادہ موقع ملا۔ دوسری طرف ہمیں بھی اپنے ساتھیوں کو آزمانے اور جانچنے کا موقع مل گیا کہ نامساعد حالات میں کسی کے ماتھے پر شکن اور کسی کے لب پر کوئی شکوہ و شکایت تو نہیں ہے۔ لیکن ہمارے ساتھیوں نے بڑے صبر اور سکون کے ساتھ اس سارے معاملے کو برداشت کیا۔ اس اعتبار سے ہمارا یہ اجتماع الحمدللہ بہت کامیاب رہا۔

ان دنوں مجھے جو پے در پے سفر اختیار کرنا پڑے ہیں ان میں پشاور کے حالیہ سفر کی مثال بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ پرسوں بدھ کے روز میں نے یہاں قرآن اکیڈمی میں فجر کی نماز کی امامت کرائی، پھر ہوائی سفر سے پشاور گیا، جہاں "IRNUM" (انسٹیٹیوٹ آف ریڈیو تھراپی اینڈ نیوکلیئر میڈیسن) نامی ادارے میں ڈاکٹر حضرات اور وہاں کے دیگر سٹاف کے سامنے دو بجے سے ساڑھے تین بجے تک خطاب کیا۔ نماز عصر کے بعد تنظیم اسلامی حلقہ سرحد کے ناظم میجر (ر) فتح محمد صاحب کی بیٹی کا نکاح تھا۔ ہم نے شادی بیاہ کی تقریبات میں اصلاح کی جو تحریک شروع کی تھی اسے اب بائیس برس ہو چکے ہیں۔ اس

اصلاحی تحریک کے حوالے سے میجر صاحب اور ہمارے پشاور کے ساتھیوں نے اس موقع پر غیر معمولی تشہیر کا اہتمام کیا۔ شہر میں ۵۰۰ پوسٹر چھپوا کر لگائے گئے اور بینرز بھی آویزاں کیے گئے۔ اس طرح میجر صاحب نے اس تحریک کو نہ صرف اپنی پوری برادری میں بلکہ پورے علاقے میں متعارف کرایا۔ نکاح کی یہ تقریب پشاور کی سنہری مسجد میں منعقد ہوئی جو اس موقع پر کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ میں نے وہاں خطبہ نکاح دیا اور شادی بیاہ کے ضمن میں اصلاح رسوم کے حوالے سے مفصل تقریر کی۔ رات کو میں سڑک کے راستے لاہور کے لئے روانہ ہوا اور فجر کی نماز پھر لاہور میں ادا کی۔

علماء کا حالیہ رویّہ اور اس کا سبب

اب میں اپنے آج کے موضوع کی طرف آتا ہوں' جس کا اخباری اشتہار آپ نے ملاحظہ کر لیا ہو گا۔ جناب عمران این حسین صاحب نے قرآن آڈیٹوریم میں جو تین لیکچر دیے ہیں ان میں سے آخری لیکچر کل "سورۂ کہف اور عہد حاضر" کے موضوع پر تھا۔ حسب اعلان مجھے ان کے اسی لیکچر کے تسلسل میں فتنہ دجال اور حضرت مہدیؑ موعود کی شخصیت پر گفتگو کرنا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ راولپنڈی میں اپنے ۴/اکتوبر کے خطاب جمعہ میں میں نے یقین کے درجے کو پہنچے ہوئے اپنے اس گمان غالب کا جو اظہار کیا تھا کہ عالم عرب میں حضرت مہدی کی ولادت ہو چکی ہے اور ان کے منظر عام پر آنے کا وقت اب زیادہ دور نہیں ہے' اس پر مذہبی حلقوں میں بہت لے دے ہوئی ہے اور ایک تہلکہ سا مچ گیا ہے کہ انہوں نے یہ کیا کہہ دیا! کسی نے یہاں تک کہا ہے کہ ان کا دماغی معائنہ کروانا چاہئے۔ مجھے ان صاحب کی اس پیشکش پر کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ میں اسے خوش آمدید کہتا ہوں۔ بہرحال اس سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے کہ ہمارے ہاں علماء کا بھی ایک بہت بڑا طبقہ دین کی بنیادی باتوں سے ذہناً کس قدر دور ہو چکا ہے۔ تحریکِ خلافت کے ضمن میں جب میں نے بنوں میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے وہ احادیث بیان کیں جن میں دنیا کے خاتمے سے قبل پورے کرۂ ارضی پر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کی خوشخبری دی گئی ہے تو وہاں کے ایک جید عالم دین مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

صاحب (جو کافی عرصہ پہلے ہمارے ہاں قرآن اکیڈمی لاہور میں مدرّس کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں) نے گفتگو کے دوران اعتراف کیا کہ یہ احادیث ہمارے علم میں بھی نہیں ہیں، اس لئے کہ دینی مدارس میں کتب حدیث کے شروع کے ابواب تو بڑے اہتمام سے پڑھائے جاتے ہیں اور وضو اور نماز وغیرہ کے مسائل پر بڑی تفصیلی بحثیں کی جاتی ہیں کہ مختلف مسالک و مذاہب میں فقہی اختلافات کے دلائل کیا ہیں اور ان کے ضمن میں ہماری ترجیح کیا ہے اور اس کے کیا دلائل ہیں، لیکن آخر میں کتاب الفتن، کتاب الملاحم اور کتاب اشراط الساعۃ وغیرہ پر پہنچتے پہنچتے سارا زور صرف ہو چکا ہوتا ہے اور ان ابواب کو سرسری طور سے پڑھ لیا جاتا ہے اور ان میں کوئی دلچسپی نہیں لی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے ہاں علماء کے نام سے جو لوگ جانے پہچانے جاتے ہیں وہ بھی ان چیزوں سے بڑا ذہنی بُعد رکھتے ہیں اور مستند علماء دین کی اکثریت بھی ان سے بڑی حد تک ناواقف ہے۔ چنانچہ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس ضمن میں جو مغالطے پیدا ہوئے ہیں اور لوگوں کو جو اشکالات پیدا ہو رہے ہیں ان کے ازالے کے لئے میں اس موضوع پر ذرا مفصل گفتگو کروں۔

قرآن کا فلسفہ تاریخ

آج کی گفتگو کے لئے میں قرآن حکیم کی اس آیت کو بطور عنوان اختیار کر رہا ہوں جس میں قرآن کا فلسفہ تاریخ بیان ہوا ہے :

﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ، وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ ۝﴾ (الانبیاء : ۱۸)

"مگر ہم تو حق کو باطل پر دے مارتے ہیں، جو اس کا بھیجا نکال دیتا ہے، اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے نابود ہو جاتا ہے۔ اور تمہارے لئے تباہی ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو۔"

یعنی اللہ تعالیٰ باطل کی سرکوبی کے لئے حق کا کوڑا اس کے سر پر مارتا ہے، جس سے باطل کا سر پاش پاش ہو جاتا ہے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر باطل کے لئے "فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ" کے الفاظ آئے ہیں۔ یہی لفظ (زھق) سورۃ الاسراء (آیت ۸۱) میں بایں طور آیا ہے :

﴿جَاۗءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝﴾

"حق آ گیا اور باطل مٹ گیا' باطل تو یقیناً مٹنے ہی والا ہے۔"

باطل میں یہ طاقت اور مقاومت نہیں ہے کہ وہ حق کے مقابل کھڑا ہو سکے۔ البتہ اگر اہل حق ہی بے یقینی کا شکار ہو جائیں' ان میں منافقت پیدا ہو جائے اور وہ بزدل' بے حمیت اور بے غیرت ہو کر اندر سے کھوکھلے ہو جائیں تو بات دوسری ہے۔ پھر تو "راج کرے گا خالصہ' ہور کرے نہ کوئی" کے مصداق باطل ہی ناچے گا بلکہ ننگا ناچ ناچے گا۔ اس بھیانک صورت حال کی عکاسی نبی اکرم ﷺ کی اس لرزا دینے والی حدیث میں ملتی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور جسے امام بیہقی "شعب الایمان" میں لائے ہیں۔ حدیث کے الفاظ ہیں :

((يُوشِكُ اَن يَأْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقٰى مِنَ الاسلام اِلَّا اسْمُهُ' وَلَا يبقٰى مِنَ القُرآنِ اِلَّا رَسْمُهُ' مَسَاجِدُهُم عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الهُدٰى' عُلَمَاؤُهُم شَرُّ مَنْ تَحْتَ اَدِيمِ السَّمَاءِ' مِنْ عِندِهِم تَخرُجُ الفِتنَةُ وفيهم تَعُودُ))

(مشکوٰۃ' کتاب العلم)

"قریب ہے کہ لوگوں پر یہ وقت آ جائے کہ اسلام میں سے اس کے نام کے سوا کچھ نہیں بچے گا اور قرآن میں سے اس کے حروف کے سوا کچھ باقی نہیں رہے گا۔ ان کی مساجد بظاہر بڑی آباد ہوں گی (اور بہت عالیشان ہوں گی) لیکن وہ ہدایت سے خالی ہوں گی۔ ان کے علماء آسمان کی چھت کے نیچے کے بدترین لوگ ہوں گے' جو فتنوں کو جنم دیں گے اور یہ فتنے واپس انہی میں لوٹ جائیں گے۔"

آج ہمیں اس صورت حال کی جھلک اپنے ان علماء میں نظر آتی ہے جنہوں نے دین کو پیشہ بنا لیا ہے۔ ان کی ساری دلچسپی امت میں فتنے پیدا کرنے اور اس میں تفرقہ پیدا کر کے اپنی دوکان چمکانے سے ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ امت میں جتنا زیادہ اختلاف ابھرے گا' لوگوں کو مناظروں کے لئے مولویوں کی اتنی ہی زیادہ ضرورت ہو گی۔

تو اگر حق اس درجے کمزور اور کھوکھلا ہو چکا ہو تو پھر باطل کا بول بالا رہے گا' لیکن اگر کچھ بھی باصلاحیت' اعلیٰ کردار کے حامل لوگ' جنہیں خریدا نہ جا سکتا ہو' جو دین کو پیشہ نہ

سمجھیں بلکہ اس کے ساتھ مخلصانہ تعلق رکھتے ہوں' معتدبہ تعداد میں تیار ہو جائیں تو پھر وہ دیکھیں گے کہ باطل میں مقابلہ کرنے کی قوت نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے اس فارسی شعر میں متذکرہ بالا آیت (بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ......) والا انداز ہی اختیار کیا ہے ؎

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن!
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!!

پہلے درویشی اختیار کرو۔ یعنی تربیت و تزکیہ کے مراحل سے خود کو گزارو' اپنے سیرت و کردار کو تزکیۂ نفس کے ذریعے ایک خاص سطح تک لے کر جاؤ' پھر دعوت کے تقاضے پورے کرو' لوگوں پر اتمامِ حجت کرو' ان کے طعنے اور گالیاں سنو اور صبر کرو۔ اس طرح "تو خاک میں مِل اور آگ میں جل' جب خشت بنے تب کام چلے" کے مصداق جب پختہ ہو جاؤ تو باطل سے ٹکرا جاؤ۔ سمندر کے کنارے سے کچی ریت اٹھا کر اس کا گولہ بنا کر کہیں مارو گے تو ریت بکھر جائے گی' اس سے کسی کا بھی کچھ نہیں بگڑے گا' یہاں تک کہ یہ شیشے کو بھی نہ توڑ سکے گی' لیکن اسی ریت کو اگر بھٹی میں پکا کر روڑا بنا لو گے تو یہ کارآمد ثابت ہو گا۔ محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے پہلے اپنے ساتھیوں کی تربیت اور ان کا تزکیہ کیا۔ جب وہ آزمائشوں کی بھٹیوں سے گزر کر کندن بن گئے تو انہیں باطل کے مقابل لا کھڑا کیا اور ان کا کوڑا بنا کر باطل کے سر پر دے مارا جس سے باطل نابود ہو گیا اور حق کا بول بالا ہو گیا اس طرح "مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهٗ (صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ عنہم اجمعین) نے جزیرہ نمائے عرب میں اسلامی انقلاب برپا کر دکھایا۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ نے حق کا کوڑا باطل پر برسایا اور اس کا بھیجا نکال دیا۔ یہ محض تعبیر کا فرق ہے کہ ہم اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں کی طرف کریں یا اللہ تعالیٰ کی طرف کریں' اس لئے کہ فاعلِ حقیقی تو اللہ کے سوا کوئی نہیں' اور اس کائنات میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اذنِ رب ہی سے ہوتا ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے وصایا میں یہ جملہ حرزِ جان بنانے کے قابل ہے کہ "لَا فَاعِلَ فِي الْحَقِيقَةِ وَلَا مُؤَثِّرَ إِلَّا اللّٰهُ" یعنی فی الحقیقت اللہ کے سوا کوئی فاعل اور کوئی مؤثر ہے ہی نہیں۔

سورۃ الانبیاء کی متذکرہ بالا آیت کا آخری ٹکڑا بھی بہت اہم ہے کہ "وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ" یعنی "تمہارے لئے تباہی و بربادی ہے ان باتوں سے جو تم بناتے ہو"۔ اس میں بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے حضرات کے لئے لمحہ فکریہ ہے ان الفاظ کا اطلاق ان پر بھی ہو سکتا ہے۔

زیر نظر آیت میں دراصل قرآن کا فلسفۂ تاریخ بیان ہوا ہے کہ حق و باطل کی کشاکش روزِ اول سے چلی آ رہی ہے، جس میں اگرچہ اکثر و بیشتر باطل کا پلڑا بھاری دکھائی دیتا ہے، لیکن جب کبھی حق کو باکردار صاحبِ حق مل جائیں تو اس کا منطقی نتیجہ باطل کے نیست و نابود ہو جانے اور حق کے غالب ہو جانے کی صورت میں نکلتا ہے۔ قرآن کے اس فلسفۂ تاریخ کو اقبال نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے ؂

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی!

محمد رسول اللہ ﷺ اور ابولہب کے درمیان تصادم صرف مکہ کی سرزمین ہی پر نہیں ہوا، بلکہ یہ ہمیشہ سے موجود دو کردار ہیں جو حق اور باطل کی علامت ہیں اور ان کے درمیان کشاکش، تصادم اور معرکہ آرائی روزِ ازل سے جاری ہے۔ کبھی وہ چراغِ مصطفویؐ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صورت میں جلوہ گر ہوا تھا اور شرار بولہبی فرعون کی شکل میں آیا تھا۔ کبھی وہی چراغ مصطفویؐ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صورت میں ظہور کر رہا تھا اور نمرود اس وقت شرار بولہبی کا مظہر تھا۔ ازل سے جاری حق و باطل کی یہ معرکہ آرائی بتدریج اپنے نقطۂ عروج کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہ قانون فطرت ہے کہ ہر چیز ارتقاء کے مراحل طے کرتے ہوئے اپنے نقطۂ کمال کو پہنچتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ انسان کا طبعی سائنس کا علم ارتقاء کر کے کہاں پہنچ گیا ہے کہ ؂

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے!

انسان چاند پر تو قدم رکھ آیا ہے، جبکہ مریخ کا طواف ہو رہا ہے اور اسے وہاں اترنے میں کیا دیر لگے گی!! اسی طرح حق و باطل کی کشمکش بھی ارتقاء کے مراحل طے کرتے کرتے

اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ رہی ہے اور یوں سمجھئے کہ اب فائنل شوڈاؤن ہونے والا ہے۔ حق و باطل کا آخری مقابلہ بڑا ہی خون ریز اور تباہ کن ہو گا' جس کی تفاصیل ہمیں "کتاب الملاحم" کی احادیث میں ملتی ہیں۔ مَلاحِم 'مَلْحَمَة کی جمع ہے' یعنی ایسی گھمسان کی جنگ کا موقع جہاں گوشت کے ٹکڑے اڑ رہے ہوں۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ "لحم" گوشت کو کہتے ہیں اور "مُلحَم" قصاب کی دوکان کو۔

لفظ "مَلْحَمَة" کے حوالے سے مجھے فتح مکہ کا یہ واقعہ یاد آ گیا ہے کہ اس روز حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ہاتھ میں علم تھامے یہ رجز پڑھ رہے تھے "اَلْيَوْمَ يَوْمُ الْمَلْحَمَة" یعنی آج ٹکڑے اڑانے کا دن ہے' آج ہم کفارِ قریش سے ان کی زیادتیوں کے گن گن کر بدلے لیں گے۔ جب یہ بات رسول اللہ ﷺ کے علم میں آئی تو آپؐ نے حضرت سعدؓ کو بلا کر فرمایا کہ نہیں' بلکہ "اَلْيَوْمَ يَوْمُ الْمَرْحَمَة" یعنی آج تو رحمتِ خداوندی کے ظہور کا دن ہے۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد آپؐ نے سردارانِ قریش کو جمع کر کے پوچھا کہ آج تمہارے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہئے؟ اس پر انہوں نے انتہائی لجاجت کے ساتھ خوشامد کرتے ہوئے عرض کیا: کریمٌ ابنُ کریمٍ ---- یعنی آپ خود بھی ایک نہایت شریف انسان ہیں اور ایک نہایت شریف انسان کے بیٹے ہیں! مطلب یہ کہ ہم آپ سے اس طرز عمل کی توقع رکھتے ہیں جو آپؐ کی شرافت و نجابت کے شایانِ شان ہو۔ آپؐ نے فرمایا: تم نے ٹھیک کہا' آج میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے کہی تھی: "لَاتَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ' اِذْهَبُوا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ" آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ جاؤ' تم سب آزاد ہو!

تو کتاب الملاحم میں ان جنگوں کی تفاصیل پر مشتمل احادیث ہیں جو بعد میں آنے والی ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا' حق و باطل کی کشاکش ازل سے جاری ہے اور اپنے نقطۂ عروج کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اب یہ اس مرحلے پر پہنچ چکی ہے جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے ؎

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

اس کشاکشِ حق و باطل کا نقطۂ عروج (Climax) وہ جنگ عظیم ہوگی جسے احادیث میں "المَلحمۃ العظمٰی" کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی یہ تاریخ انسانی کی عظیم ترین جنگ ہوگی' جس کی ہلاکت آفرینی کا نقشہ ایک حدیث میں بایں طور کھینچا گیا ہے کہ زمین لاشوں سے اس طرح اٹی پڑی ہوگی کہ ایک پرندہ مسلسل اڑتا چلا جائے گا لیکن اسے زمین پر اترنے کے لئے جگہ نہیں ملے گی۔

عظیم جنگوں پر مشتمل اس دورِ فتن کا اختتام کس طور سے ہوگا؟ اس کے ضمن میں پیشینگوئیوں پر مشتمل احادیث میں بارہا بیان کر چکا ہوں۔ گویا پھر "جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ" کا نقشہ سامنے آئے گا اور آیتِ قرآنی "بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ" بتمام و کمال ظاہر ہوگی۔ پورے عالمِ انسانی پر اللہ کے دین کا غلبہ ہوگا اور توحید کا پرچم لہرائے گا۔ نورِ توحید سے یہ کرۂ ارضی منور ہو جائے گا۔ گویا "وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا"۔ زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ اس کی پیشینگوئیاں جہاں احادیثِ نبویہ میں موجود ہیں وہاں علامہ اقبال نے بھی اپنے اشعار میں جابجا کی ہیں۔ اس ضمن میں ان کی ایک نظم تو میرے نزدیک الہامی نظم ہے۔ واضح رہے کہ وحیِ نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد ہم رؤیائے صادقہ (سچے خواب) کے علاوہ کشف اور الہام کے قائل ہیں' کیونکہ ان کا ثبوت احادیثِ نبویہ سے ملتا ہے۔ اقبال کی اس نظم کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی!
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!!

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہوگا نغمہ توحید سے!!

بہرحال یہ تو ہونا ہے۔ لیکن اس سے پہلے جو کچھ ہونا ہے اس کا بھی میں بارہا تذکرہ کرچکا ہوں اور اس کے بارے میں اپنی کتاب "سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی، حال اور مستقبل" نامی کتاب میں قدرے تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔

دورِ فتن میں ایک بہت بڑا کردار جو ابھرے گا وہ دجال ہوگا، جس کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ اس سے بڑا فتنہ پہلے کبھی ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا۔ اس دجال کو حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ زمین پر آکر قتل کریں گے۔ اس دورِ فتن میں اہل ایمان میں سے بھی ایک نمایاں شخصیت ابھرے گی، جس کا نام مہدیٔ موعود ہے۔ علامہ اقبال کا ایک بڑا پیارا شعر ہے ؎

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری!

"اسرائیل" حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے، جن سے ان کی نسل بنی اسرائیل چلی۔ ان کے تایا حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے، جن کی نسل سے محمدؐ رسول اللہ ﷺ تھے۔ چنانچہ مہدیٔ موعود کے بارے میں یہ کہنا چاہئے کہ "خونِ اسماعیل آجائے گا آخر جوش میں!" اس لئے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی آل سے ہوں گے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی نسل سے ہوں گے۔ اس بحر سے نکلنے والے ایک نہایت قیمتی موتی ہوں گے۔

ختمِ نبوت سے پیدا ہونے والا خلا کیسے پُر کیا گیا؟

مہدیٔ موعود کے بارے میں جاننے کے لئے پہلے یہ بات جان لیجئے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہونے سے رحمتِ خداوندی کا جو باب بند ہوا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تلافی کس طور سے کی گئی؟ اللہ تعالیٰ نے اس خلا کو تین چیزوں سے پُر کیا:

۱۔ حفاظتِ متنِ قرآن: اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے متن کی حفاظت کا خود ذمہ لے لیا کہ اس میں تحریف نہیں کی جا سکتی۔ انتہائی پُر فتن دور میں جبکہ قرآن کی تعلیمات کو

فراموش کر دیا جائے گا، اس وقت بھی اس کا متن محفوظ رہے گا۔ میں آپ کو حدیث سنا چکا ہوں: "لایبقٰی من القرآن الا رَسمُہ" ۔ شیطانِ لعین اور اس کی ساری صلبی و [illegible] خواہ جتنا چاہے زور لگالے، قرآن مجید محفوظ رہے گا، تاکہ طالب ہدایت کے لئے منارۂ ہدایت ہمیشہ موجود رہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے پہلے تورات اور انجیل بھی اللہ کی نازل کردہ کتابیں تھیں، لیکن اللہ نے ان کی حفاظت کا کوئی ذمہ نہیں لیا۔ یہ معاملہ صرف قرآن مجید کے ساتھ مخصوص ہے کہ "اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰـفِظُوۡنَ" (الحجر : ۹) "یقیناً ہم ہی نے اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔" اس آیۂ مبارکہ کا پہلا حصہ (اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ) کا اطلاق تو دیگر کتب سماویہ پر بھی ہوتا ہے، لیکن دوسرا حصہ (وَاِنَّا لَهٗ لَحٰـفِظُوۡنَ) صرف قرآن حکیم پر منطبق ہوتا ہے۔

۲۔ مجددینِ اُمت کا سلسلہ : ختم نبوت سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرنے کے ضمن میں دوسری چیز مجددینِ امت کا سلسلہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((اِنَّ اللّٰہَ یَبۡعَثُ لِھٰذِہِ الۡاُمَّۃِ عَلٰی رَاۡسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنۡ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیۡنَھَا)) (ابوداؤد)

"یقیناً اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر صدی کے سرے پر ایک ایسی شخصیت کو اٹھاتا رہے گا جو اس (امت) کے لئے اس کے دین کو تازہ کردے گی۔"

مطلب یہ کہ دین پر جب سو برس کی مدت گزر جاتی ہے تو اس پر کچھ خارجی اثرات آجاتے ہیں۔ کچھ خارجی فلسفوں کا غبار اور کوئی بدعات کا طوفان اس کی اصل ہیئت کو تبدیل کر سکتا ہے۔ یہ سب کچھ دشمنی میں اور بدنیتی سے بھی ہو سکتا ہے اور دوستی میں اور نیک نیتی سے بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً حضرت مسیحؑ کے پیروکاروں سے نیکی میں غلو ہو گیا تو رہبانیت ایجاد ہو گئی۔ چنانچہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو یہ وضاحت کرنا پڑی کہ "لَا رَھۡبَانِیَّۃَ فِی الۡاِسۡلَامِ" (اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے) اور یہ کہ "اَلنِّکَاحُ مِنۡ سُنَّتِیۡ" (نکاح میری سنت میں سے ہے) اور "مَنۡ رَغِبَ عَنۡ سُنَّتِیۡ فَلَیۡسَ مِنِّیۡ" (جسے میرا

طریقہ پسند نہیں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں)۔ تجدید کا مطلب تازہ (renew) کر دینا ہے اور مجدد کا کام یہ ہوتا ہے کہ دین پر جو بھی خارجی اثرات اور گرد و غبار آ جائے اسے ہٹا کر دین کا اصل رخِ روشن، جیسا کہ وہ ہے، دنیا کے سامنے پیش کر دے۔ مجددینِ امت کے بارے میں مَیں مزید چند باتیں بعد میں عرض کروں گا۔

۳۔ حق پر قائم جماعت : اس امت کے لئے تیسری ضمانت یہ دی گئی ہے کہ اس میں ہمیشہ ایک گروہ ضرور حق پر قائم رہے گا۔ یعنی اگر ایک طرف ہدایتِ نظری قرآن مجید میں محفوظ رہے گی تو دوسری طرف ہدایتِ عملی کے نمونے بھی ضرور موجود رہیں گے، خواہ وہ قدرے قلیل ہوں، آٹے میں نمک کے برابر ہوں۔ چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، جسے بخاریؒ و مسلمؒ دونوں نے روایت کیا ہے کہ

سَمِعتُ النَّبِیَّ ﷺ : ((لَا یَزَالُ مِنْ اُمَّتِی اُمَّۃٌ قَائِمَۃٌ بِاَمْرِ اللّٰہِ --- وفی روایۃٍ : قَائِمِینَ بِالحقِّ -- لَا یَضُرُّھُمْ مَنْ خَذَلَھُمْ وَلَا مَن خَالَفَھُمْ، حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰہِ وَھُم علٰی ذٰلِکَ)) (متفق علیہ)

(حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ) میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا : "میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت اللہ کے امر پر قائم رہے گی (ایک دوسری روایت میں "حق پر قائم" کے الفاظ ہیں --- ان کو نہ تو وہ لوگ نقصان پہنچا سکیں گے (جو ان کے اعوان و انصار بننے کے بعد) ان کا ساتھ چھوڑ جائیں اور نہ ہی وہ لوگ جو ان کی مخالفت پر اتر آئیں۔ یہاں تک کہ اللہ کی بات پوری ہو جائے اور وہ اسی پر قائم رہیں گے"۔

یہ تیسری ضمانت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ختمِ نبوت سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرنے کے لئے دی ہے کہ اہل حق کی ایک جماعت ہمیشہ موجود رہے گی۔ البتہ ہر زمانے میں اس کا نام اور عنوان بدلتا رہے گا۔

مجددینِ امت کے سلسلے اور اہل حق کی اس جماعت کے مابین ربط و تعلق کو اس طرح سمجھئے کہ ایک وقت میں ایک مجدد کھڑا ہوا اور اس نے تجدید کا کام کیا تو کچھ لوگ اس کے ساتھی بن گئے۔ جیسے حدیث نبویؐ کی رُو سے ہر نبی کے کچھ ساتھی اور کچھ حواری

ہوتے تھے۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث وارد ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((مَا مِنْ نبيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِي اُمَّةٍ قَبلي اِلّا كان لهُ مِن اُمَّتِهٖ حَوارِيُّونَ واَصحابٌ يَأخُذونَ بِسُنَّتِهٖ وَيَقتَدُونَ بِاَمرِهٖ......))

"کوئی نبی ایسے نہیں گزرے جنہیں اللہ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں مبعوث کیا ہو' مگر یہ کہ اس کے لئے اس کی امت میں سے کچھ (لوگ نکلتے تھے جو اس کے) حواری اور اصحاب ہوتے تھے۔ وہ اس کی سنت کو مضبوطی سے پکڑتے تھے اور اس کے حکم کے مطابق چلتے تھے....."

اسی طرح کا معاملہ مجددین کا ہے کہ جب بھی کوئی مجدد اٹھتے تھے تو ان کی تجدیدی مساعی اور جدوجہد میں کچھ لوگ ضرور ان کے ساتھ ہو جاتے تھے' جو ان کی بات سنتے تھے' ان کے پیغام کو لوگوں تک پہنچاتے تھے' ان کے اعوان و انصار اور مددگار بنتے تھے' دامے درمے اور سخنے ان کے ساتھ بھرپور تعاون کرتے تھے' چنانچہ ان سے ایک جماعت وجود میں آ جاتی تھی' لیکن ایک مدت گزرنے کے بعد یہ جماعت اخلاقی و عملی انحطاط کا شکار ہو جاتی تھی۔ ایسا ہمیشہ ہوتا رہا ہے' بلکہ انبیاء کرام (علیہم السلام) کی بنائی ہوئی جماعتیں بھی ان کے بعد اضمحلال کا شکار ہو جاتی رہی ہیں۔ خود محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے جو جماعت بنائی وہ بھی تین چار نسلوں کے بعد زوال و انحطاط میں مبتلا ہو گئی تو تابہ دیگراں چہ رسد! چنانچہ یہی معاملہ مجددینِ امت کا ہوتا ہے۔ ایک صدی میں قریباً تین یا چار نسلیں گزرتی ہیں' اس کے بعد پھر نئے مجدد کی ضرورت پیش آ جاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک شخص حق کو حق سمجھ کر Face Value پر اسے قبول کرتا ہے۔ اس کے لئے اسے کچھ چھوڑنا بھی پڑتا ہے' کچھ لوگوں کی ناراضی بھی مول لینا پڑتی ہے۔ لیکن اس کی آئندہ نسل یہ سمجھتی ہے کہ یہ چونکہ ہمارے باپ کا مسلک تھا اس لئے اب ہمیں بھی یہی اختیار کرنا ہے۔ ان کا اسے اختیار کرنا Face Value پر نہیں بلکہ عصبیت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ جب یہ گروہ کچھ منظم ہو جاتا ہے تو ان کی آپس کی دوستیاں' رشتہ داریاں' کاروبار' ادارے اور مشترکہ

مفادات انہیں باہم قریب رکھتے ہیں، جبکہ تیسری نسل محض ان مفادات کی خاطر اس جماعت سے وابستہ رہتی ہے اور پھر یوں سمجھ لیجئے کہ بیڑا غرق ہو جاتا ہے۔ اب اس جماعت کی حیثیت محض ایک فرقے کی رہ جاتی ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ پھر کسی کو اٹھاتا ہے تو ان میں سے جن کے اندر بھی کچھ جان ہوتی ہے وہ اس کے پاس آجاتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ نئے لوگ آتے ہیں اور ایک نئے عنوان سے کام پھر شروع ہو جاتا ہے۔

یہ سلسلہ اسی انداز سے چلتا رہتا ہے جیسے اولمپک ٹارچ لے کر ایک کھلاڑی دوڑتا ہے اور کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد دوسرے کھلاڑی کو دے دیتا ہے۔ دوسرا کھلاڑی یہ ٹارچ تیسرے کھلاڑی کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس طرح کھلاڑی اگرچہ بدلتے رہتے ہیں لیکن وہی ٹارچ آگے بڑھتی رہتی ہے۔ اسی طرح کا معاملہ شیر شاہ سوری کے بنائے ہوئے ڈاک کے نظام کا تھا۔ آپ اندازہ کیجئے کہ آج سے پانچ سو برس پہلے اس نے ڈھاکہ سے پشاور تک جرنیلی سڑک (جی ٹی روڈ) تعمیر کروائی اور ڈاک کا نظام قائم کیا۔ ہر تیس میل کے فاصلے پر ایک چوکی ہوتی تھی جہاں تازہ دم گھوڑے اور سوار موجود ہوتے۔ ایک گھڑ سوار ڈاک کا تھیلا لے کر ایک چوکی سے دوسری چوکی تک سرپٹ دوڑتا اور اگلی چوکی سے دوسرا سوار اسی تھیلے کو لے کر برق رفتاری سے روانہ ہو جاتا۔ اس طرح ہر چوکی پر گھوڑا اور سوار تبدیل ہو جاتے لیکن ڈاک کا تھیلا وہی رہتا جو ڈھاکہ سے چلا تھا۔ اسی انداز سے جماعتیں اگرچہ بدلتی رہتی ہیں لیکن دین کا اصل پیغام اور اس کی اصل روح اگلی نسلوں کو منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا، ہر تین چار نسلوں کے بعد اس عمل میں تجدید کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی صرف تین نسلوں کی ضمانت دی ہے، جنہیں ہم "قرونٌ مشھودٌ لھا بالخیر" کہتے ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ کی مشہور حدیث ہے: ((خَيْرُ أُمَّتِي قَرْنِي ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ الخ)) یعنی میری امت کا بہترین دور میرا دور ہے، پھر وہ لوگ جو ان سے قریب کے دور میں ہوں گے، اور پھر وہ جو اُن سے قریب ہوں گے۔ (یہ حدیث متفق علیہ ہے اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے)

مجددین کے بارے میں بعض اہم باتیں

مجددین کے بارے میں بعض باتیں ایسی ہیں جن پر امت کا اتفاق ہے۔ مثلاً :

(i) حدیث مبارک میں جو یہ فرمایا گیا کہ "علٰی رأسِ کلِّ مائۃِ سنۃٍ" تو ان الفاظ سے صدی کا شروع یا صدی کا آخر مراد نہیں ہے' بلکہ یہ محاورہ ہے اور اس سے مراد "ہر صدی کے دوران" ہے۔

(ii) یہ ضروری نہیں کہ ایک وقت میں کوئی ایک شخصیت ہی تجدیدی مساعی میں معروف ہو' بلکہ ہو سکتا ہے کہ یہ جدوجہد بیک وقت کئی لوگ کر رہے ہوں۔

(iii) کسی مجدد کو مجدد تسلیم کرنا یا نہ کرنا ایمان اور کفر کا معاملہ نہیں ہے۔ ایمان اور کفر کا معاملہ کسی نبی کی نبوت کو ماننے یا نہ ماننے سے متعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ غلام احمد قادیانی نے اگر صرف مجدد ہونے کا دعویٰ کیا ہوتا اور وہ نبوت کا دعویٰ نہ کرتا تو اس کی اور اس کی امت کی تکفیر نہ ہوتی۔ لاہوری مرزائی اگرچہ یہ کہتے ہیں کہ ہم مرزا کو نبی نہیں بلکہ صرف مجدد مانتے ہیں' لیکن جب یہ بات ثابت ہے کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا تو وہ کافر ہو گیا اور کافر کو مجدد ماننے والا بھی کافر ہے۔ نبوت تو حدِ فاصل ہے۔ سچے نبی کا انکار کرنے والا کافر ہے اور جھوٹے نبی پر ایمان لانے والا کافر ہے۔ اس معاملے میں "Give the devil his due" کے مصداق قادیانیوں کی ہمت اور جرأت کی داد دینی چاہئے کہ وہ اپنے تئیں ہمیشہ ہمیں کافر قرار دیتے رہے ہیں' کیونکہ ہم ان کے نبی کو نہیں مانتے۔ سر ظفر اللہ پاکستان کا وزیر خارجہ تھا اور اس نے قائداعظم کا جنازہ نہیں پڑھا' بلکہ ایک طرف بیٹھا رہا۔ جب اس سے وجہ دریافت کی گئی تو اس نے کہا تھا کہ "یا تو مجھے ایک مسلمان حکومت کا کافر وزیر سمجھ لو یا کافر حکومت کا مسلمان وزیر!" مجدد کو ماننے کا معاملہ نبوت سے مختلف ہوتا ہے۔ کسی کو مجدد ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

(iv) اکثر مجددین مجدد ہونے کا دعویٰ کئے بغیر اپنی تجدیدی مساعی میں مصروف رہے اور بعد میں لوگوں نے سمجھا کہ یہ مجددِ وقت تھے جنہوں نے بہت بڑا کام کیا اور دین کو

واقعتاً تازہ کر دیا۔ البتہ بعض مجددین ایسے بھی تھے جنہیں خود بھی اس کا ادراک و شعور تھا کہ وہ مجدد ہیں اور انہوں نے اپنی زندگی میں اس طرح کی باتیں بھی کیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ وقت کے مجدد ہیں۔ مثلاً شیخ احمد سرہندیؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ہاں ایسی باتیں ملتی ہیں۔ لیکن ان کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ جو ان کو مجدد نہیں مانے گا وہ کافر ہو جائے گا۔ معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ!

(۷) مجددینِ امت کے بارے میں ایک اہم بات میں نے بارہا عرض کی ہے کہ امتِ مسلمہ کی تاریخ میں پہلے ایک ہزار برس تک سارے کے سارے مجددین عالمِ عرب میں پیدا ہوئے۔ پہلی صدی کے مجدد حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ہیں۔ ان کے بعد امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، شیخ عبد القادر جیلانیؒ، امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ اپنے اپنے وقت کے مجددین تھے۔ لیکن جیسے ہی دوسرا ہزار سال شروع ہوا تو اس امتِ مسلمہ کا روحانی اور علمی مرکزِ ثقل برعظیم پاک و ہند میں منتقل کر دیا گیا۔ چنانچہ گیارہویں صدی ہجری میں ہندوستان میں دو مجدد ہوئے ہیں۔ ایک تو مجددِ اعظم ہیں، یعنی مجددِ الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اور دوسرے شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ ۔ بارہویں صدی کے مجددِ اعظم شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ہوئے ہیں، لیکن ان کے ساتھ ہی عالمِ عرب میں شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدیؒ بھی تھے، اگرچہ ان دونوں کا تقابل کیا جائے تو شاہ ولی اللہؒ کے مقابلے میں شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدیؒ بالکل بونے نظر آتے ہیں۔ لیکن بہرحال وہ بھی مجدد تھے، انہوں نے مشرکانہ عقائد، غلط روایات، غلط رسومات اور بدعات کے انبار کو صاف کیا۔ تیرہویں صدی ہجری کے مجددین وہ تھے جنہوں نے مغربی استعمار کے خلاف تلوار اٹھائی۔ ان میں سوڈان کے مہدی سوڈانی اور لیبیا کے سنوسی بھی تھے، لیکن عظیم ترین مجدد اس خطۂ ہند سے سید احمد شہید بریلویؒ تھے، ان کے ساتھ شاہ اسماعیل شہیدؒ بھی تھے۔ یہ پہلے پنجاب کو سکھوں سے پاک کرنے کے بعد پھر انگریز سے نبرد آزمائی چاہتے تھے، لیکن اللہ کو کچھ اور منظور تھا۔ ان کی تحریک "تحریکِ شہیدین" اگرچہ دنیوی اعتبار سے ناکامی سے دوچار ہوئی لیکن اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، وہ تو مرتبۂ شہادت سے سرفراز ہو کر کامیاب ہو گئے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ بہت سے نبی ایسے گزرے

ہیں جو دنیوی اعتبار سے بظاہر ناکام چلے گئے، مجدد تو پھر مجدد ہیں۔

میرے نزدیک چودھویں صدی کے مجددِ اعظم شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ تھے، البتہ ان کے ساتھ ساتھ بعض دیگر حضرات کی تجدیدی مساعی بھی بہت اہم ہیں۔ ان میں ایک شخصیت علامہ اقبال کی ہے جو اگرچہ داڑھی منڈے تھے اور ان کا عمل کا پلڑا (ان کے فکر کے مقابلے میں) بہت ہلکا تھا، لیکن ع "اگرچہ سرنہ تراشد قلندری داندا" کے مصداق انہوں نے فکرِ اسلامی کی تجدید کا عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔ اسی طرح ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء کے دوران لوگوں کو قرآن کی طرف راغب کرنے کے لئے جتنی زوردار دعوت دی اس کی پوری اسلامی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ اس اعتبار سے انہیں دعوتِ قرآنی کا مجدد قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں وہ علماء کے طرزِ عمل سے مایوس اور بددل ہو کر کانگریس میں شامل ہو گئے کہ یہ مولوی نہ خود کچھ کریں گے نہ کسی دوسرے کو کچھ کرنے دیں گے۔ انہی میں ایک شخصیت سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ہے جو میرے نزدیک تحریک اسلامی کے مجدد ہیں۔ انہوں نے جماعت اسلامی کے نام سے ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت قائم کی جس میں ایسے پاکباز لوگ شامل ہوتے جو پہلے اپنی معاش اور معاشرت کو حرام سے پاک کر کے آتے۔ یہ نہیں تھا کہ اپنے وجود پر تو اسلام کا نفاذ نہ ہو، اپنے گھر میں اسلامی معاشرت کا نقشہ نظر نہ آئے، معاش میں حرام کی آمیزش بھی ہو، لیکن اسلام کا نعرہ بھی لگا رہے ہوں۔ مولانا مودودی کی قائم کردہ جماعت آج کی جماعت اسلامی سے بہت مختلف تھی۔ آج شبابِ ملی اور پاسبان کے نام سے جو کچھ ہو رہا ہے اس کا تو اس وقت تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اسی طرح تبلیغ دین کے ضمن میں مولانا الیاس کی تجدیدی مساعی اس قدر اہم ہیں کہ میں انہیں مجددِ تبلیغ قرار دیتا ہوں۔ ورنہ تبلیغ تو ایک پیشہ بن چکی تھی۔ پیشہ ور مبلغ اجرت لے کر فرقہ وارانہ تقریریں کرتے اور مختلف فرقوں کے مبلغ دوسرے فرقوں پر کفر کے فتوے لگاتے۔ اس طرح کی "تبلیغ" کا نقشہ ہمیں آج بھی کہیں کسی "عظیم الشان تبلیغی کانفرنس" میں نظر آجاتا ہے جہاں رفع یدین کے حق میں یا اس کے خلاف دلائل دیئے جا رہے ہوتے ہیں یا تعدادِ تراویح کا مسئلہ زیر بحث ہوتا ہے۔ اُس دور میں "تبلیغ" کا یہ

انداز بہت عام تھا اور مولوی مرغوں کی طرح لڑتے تھے اور پیسے لیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ گڈا چلتے چلتے دلدل میں کسی کھانچ کے اندر جا کر پھنس جائے تو اسے نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن مولانا الیاس جیسے نحیف الجثہ انسان نے تبلیغ کے اس گڈے کو دلدل سے نکالا اور ایسے مبلغینِ دین کی جماعت تیار کی جو بغیر کسی تنخواہ کے 'اپنا راشن اور اپنا کرایہ خرچ کر کے تبلیغ کے لئے نکلتے۔ آج اس انداز پر تبلیغ کے عنوان سے دنیا میں لاکھوں آدمی گردش میں ہیں۔ مولانا الیاس نے اس عظیم کام کا آغاز تن تنہا کیا تھا۔ ہندوستان میں جبکہ شدی کی تحریک چلی تو جو علاقے اس سے شدید متأثر ہوئے ان میں میوات کا علاقہ بھی تھا۔ دراصل بہت سے ایسے لوگ جن کے آباء و اجداد کسی صوفی بزرگ کی کرامات دیکھ کر ایمان لے آئے تھے لیکن ان کی تعلیم و تربیت اسلام کے مطابق نہ ہو سکی' ان کا حال یہ تھا کہ وہ اسلامی تعلیمات سے بالکل بیگانہ تھے' بلکہ ان میں سے بہت سوں کو تو کلمہ بھی نہیں آتا تھا' ان کے نام بھی کچھ مسلمانوں کے سے تھے اور کچھ ہندوؤں کے سے۔ ہندوؤں کے لئے ایسے مسلمانوں کا شکار کرنا اور انہیں شدی کر لینا بہت آسان تھا۔ جب ایسے لوگ دھڑا دھڑ شدی ہونے لگے تو ہندوستان میں تہلکہ مچ گیا اور مسلمانوں میں شدید تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ ان علاقوں میں تنخواہ دار مبلغ بھجوائے گئے' لیکن وہ بھلا کہاں دیہات کی خاک چھانتے۔ ملازم آدمی کی ایک اپنی ذہنیت ہوتی ہے' اسے تو بس اپنے ٹی اے' ڈی اے سے غرض ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ ایک گاؤں میں تقریر کر کے رپورٹ میں دس دیہات کا دورہ لکھ دیتے۔ چنانچہ اس تبلیغ کا کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا تھا۔

ان حالات میں مولانا الیاسؒ کو ایک عجیب احساس ہوا' اور یہ اس طرح کا احساس تھا جو سیب کو اوپر سے نیچے کی طرف گرتے دیکھ کر نیوٹن کو ہوا تھا اور اس نے زمین کی کشش ثقل کا راز معلوم کر لیا تھا' یا چولہے پر رکھی دیگچی کا ڈھکنا ہلتے دیکھ کر جارج سٹیفن کے ذہن میں پیدا ہوا تھا اور اس نے بھاپ کی طاقت کا اندازہ کر کے سٹیم انجن ایجاد کر لیا تھا۔ ہوا یوں کہ مولانا الیاس ایک روز مسلمانوں کی حالت زار پر متفکر بیٹھے تھے کہ انہیں چند میواتی اپنے گاؤں سے مزدوری کے لئے آتے دکھائی دیئے۔ مولانا نے ان سے پوچھا کہ بھائی تمہیں کتنی مزدوری ملے گی؟ انہوں نے بتایا کہ دو آنے روزانہ۔ اس پر مولانا

نے ان سے کہا کہ اچھا بھائی، دو دو آنے تم مجھ سے لے لینا اور آج کا دن تم میرے پاس رہو۔ مولانا نے ان میواتیوں کو وضو کرنا سکھایا، نماز سکھائی، ان کا کلمہ درست کیا اور شام کو انہیں دو دو آنے دے دیئے۔ پھر یہ مولانا کا روز کا معمول بن گیا۔ پھر ان میں سے کچھ لوگ نکل آئے جنہوں نے اپنا وقت فارغ کیا اور اب وہ کلمے کی تحریک بن گئی۔ یہ لوگ بستی بستی جاتے، جنہیں کلمہ نہیں آتا تھا انہیں کلمہ سکھاتے، لوگوں کو نماز سکھاتے اور نماز پڑھنے کی تلقین کرتے، غیر آباد مسجدوں کو صاف کر کے انہیں آباد کرنے کی کوشش کرتے۔

یہ وہ عظیم شخصیتیں ہیں جو چودھویں صدی میں ہندوستان کی سرزمین پر پیدا ہوئیں، جبکہ پوری دنیا میں ان کا کوئی پاسنگ بھی نظر نہیں آتا۔ ایک استثناء حسن البناء شہید کا ضرور ہے جو تحریک اسلامی کے مجدد کی حیثیت سے عالم عرب میں ابھرے، لیکن میرے نزدیک مولانا مودودی کی شخصیت اور حسن البناء کی شخصیت کے مابین وہی نسبت ہے جو شاہ ولی اللہ اور محمد بن عبدالوہاب کی شخصیتوں کے مابین ہے۔ حسن البناء اگرچہ جوش اور جذبے میں تو مولانا مودودی سے بہت آگے ہیں، لیکن وہ نہ مصنف ہیں، نہ صاحب تفسیر ہیں، اور نہ ہی مفکر ہیں۔

اس کے بعد اب پندرہویں صدی کے مجددین کا معاملہ سمجھ لیجئے۔ میرے گمان میں اس صدی کا مجددِ اعظم وہی شخص ہو گا جس کے بارے میں احادیث نبویہؐ میں "مہدی" کا لفظ آیا ہے۔ آج زمانہ چلتے چلتے جس مقام پر پہنچ چکا ہے اور دنیا کے حالات جو رخ اختیار کر رہے ہیں ان کے پیش نظر مجھے امید ہے کہ عنقریب جزیرہ نمائے عرب میں ان کے منظرعام پر آنے کا معاملہ ہو جائے گا۔ اس ضمن میں مَیں چند احادیث پیش کروں گا، لیکن پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ اہل تشیع اور اہل سنت کے نزدیک مہدی کے تصور میں بہت فرق ہے۔

اہلِ تشیّع اور اہلِ سنّت کا تصورِ مہدی

اہل تشیع کا تصور یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد "امامتِ معصومہ" کا سلسلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے شروع ہوا ہے اور ان کے بعد تمام "ائمۂ معصومین" حضرت فاطمہؓ

ﷺ کی نسل سے ہیں۔ یعنی پہلے امام معصوم حضرت علیؓ، پھر حضرت حسنؓ، پھر حضرت حسینؓ، پھر علی ابن حسین زین العابدینؒ، پھر محمد باقرؒ اور پھر جعفر صادقؒ ہیں۔ امامتِ معصومہ کا تصور رکھنے والے تمام امامیہ کے نزدیک یہ چھ ائمہ متفق علیہ ہیں۔ ان کے بعد حضرت جعفر صادقؒ کے چھوٹے بیٹے موسیٰ کاظمؒ کی نسل سے ہونے والے پانچ ائمہ کو ماننے والے موسوی کہلاتے ہیں، جو ہمارے ہاں کے اہل تشیع ہیں، جبکہ جعفر صادقؒ کے بڑے بیٹے اسماعیلؒ کو امام معصوم قرار دے کر ان سے چلنے والی شاخ کو ماننے والے اسماعیلی کہلاتے ہیں۔ موسوی شاخ کے پانچ ائمہ کے بعد چھٹا، جبکہ آغاز سے شمار کریں تو بارھواں امام، اہلِ تشیع کے عقیدے کے مطابق امام غائب ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اندیشہ تھا کہ خلفائے بنو عباس بارھویں امام کو شہید کر دیں گے لہٰذا انہیں کسی غار میں چھپا دیا گیا۔ تقریباً دو سو برس تک تو وہ "غیبوبتِ صغریٰ" کی حالت میں رہے، یعنی اگرچہ وہ منظرِ عام پر نہیں رہے، لیکن ان کی امامت بالفعل قائم تھی، ان کے معتقدین ان کے پاس جا کر ان سے ہدایات لے لیتے تھے، لیکن اس کے بعد ان کا "غیبوبتِ کبریٰ" کا دور شروع ہوا جس میں ان کے ساتھ کسی کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اہل تشیع کے نزدیک یہی امام غائب امام مہدی ہیں جو قیامت سے قبل ظاہر ہوں گے۔

دوسری طرف اسماعیلیوں میں آگے چل کر پھر دو شاخیں ہو جاتی ہیں، جن میں سے ایک شاخ امام حاضر کا عقیدہ رکھتی ہے۔ پرنس کریم آغا خان ان کا امام حاضر ہے جو انکے نزدیک (معاذ اللہ) نبی کی طرح معصوم ہے اور اس سے خطا کا صدور نہیں ہو سکتا۔ جبکہ اسماعیلیوں ہی کی دوسری شاخ میں ایک امام غائب ہو گئے تھے، لہٰذا ان کے پیشوا کو امام نہیں بلکہ داعی کہا جاتا ہے۔ اسماعیلیوں کا یہ فرقہ بوہری کہلاتا ہے اور آج کل ان کے داعی برہان الدین ہیں۔

اہلِ تشیع کے برعکس اہل سُنّت کا عقیدہ یہ ہے کہ معصومیت خاصۂ نبوت ہے اور ختمِ نبوت کے بعد معصومیت ختم ہو گئی۔ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی معصوم نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) بھی معصوم نہیں تھے۔ ہمارے نزدیک مجددین

کا جو سلسلہ چودہ سو سالوں سے چلا آرہا ہے' حضرت مہدی کو بھی اسی کی ایک کڑی قرار دینا درست ہو گا۔ البتہ احادیث نبویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت فاطمہ ؓ کی نسل سے ہوں گے' بلکہ حضرت فاطمہ ؓ کی نسل کی حسنی شاخ سے ان کا تعلق ہو گا۔ ان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کا نام میرے نام پر ہو گا یعنی محمد۔ اور ان کے باپ کا نام بھی میرے باپ کے نام پر ہو گا یعنی عبدآللہ۔ اور وہ شخص عرب میں ایک صحیح اسلامی حکومت قائم کرے گا۔ آنحضور ؐ نے پورے عالم اسلام کا ذکر نہیں کیا بلکہ صرف عرب کے بارے میں یہ بات فرمائی۔ اس شخص کو ہم مہدی کے نام سے جانتے ہیں۔

مہدی کے معنی کیا ہیں؟ ہدایت یافتہ شخص۔ ہادی کا مطلب ہے ہدایت دینے والا (یہ اسم فاعل ہے) اور مہدی وہ ہے جس کی ہدایت ہو گئی ہو' جو ہدایت یافتہ ہو۔ مہدی ان کا صفاتی نام ہے' اصل نام محمد ہو گا۔ ان کے والد کا نام عبداللہ ہو گا اور وہ حضرت حسن ؓ کی نسل سے ہوں گے' حضرت فاطمہ ؓ کی اولاد میں سے ہوں گے۔

حضرت مہدیؒ کی آمد؟

یہ تو وہ چیزیں ہیں جو اہل سنت کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔ رہا یہ سوال کہ وہ کب آئیں گے؟ اور آیا ان کی پیدائش ہو چکی ہے؟ اس بارے میں قیاس آرائی تو ہو سکتی ہے' یقین کی بنیاد پر کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔ تاہم میرا قیاس ہے بلکہ گمان غالب ہے کہ ان کی پیدائش ہو چکی ہے۔ اس لئے کہ میں حالات کو دیکھ رہا ہوں۔ گزشتہ چار سو سال کی تاریخ میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ کتاب الفتن' کتاب الملاحم اور کتاب علاماتِ قیامت (اشراط الساعۃ) میں شامل احادیث میرے سامنے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے بارے میں کہا تھا کہ "سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف"۔ میں نے اپنے لئے علامہ کے اس شعر میں کچھ ترمیم کی ہے۔ علامہ خاکِ نجف سے حضرت علی ؓ مراد لیتے ہیں جبکہ میرے نزدیک حضرت علی ؓ بھی اصلاً خاکِ مدینہ ہی میں شامل ہیں۔ میں اسے خاکِ حجاز سے تعبیر کرتا ہوں۔ میں اسے یوں پڑھوں گا: "سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ حجاز و حولِ قدس"۔ حولِ

قدس کیا ہے؟ بیت المقدس کا ماحول' جس کے بارے میں فرمایا گیا : ﴿سُبْحٰنَ الَّذِی اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِی بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ' اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ○﴾ یہ علاقہ اڑھائی ہزار برس تک نبیوں کا مسکن رہا' سینکڑوں نبی یہاں پیدا ہوئے' سینکڑوں نبیوں نے یہاں وحدت کا گیت گایا اور توحید کا نعرہ بلند کیا۔ مجھے اقبال کا ایک مصرع یاد آگیا : "چشتی نے جس زمیں میں وحدت کا گیت گایا"۔ بہرکیف یہی وہ سرزمین ہے جس میں حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ کی حمد کے ترانے الاپے تھے۔ پہاڑ اور پرندے ان ترانوں کو سن کر وجد میں آجاتے تھے۔ اسی زمین میں حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ دفن ہیں۔ اسی زمین میں بنی اسرائیل کے سینکڑوں انبیاء دفن ہوئے۔ یہی وہ سرزمین ہے جو حضرت عیسٰیؑ کے مواعظ کی امین ہے۔ اسی سرزمین کے بارے میں قرآن نے کہا : "اَلَّذِی بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ" سرزمین حجاز ہو یا ارض فلسطین دونوں کی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے۔

حضرت ابراہیمؑ سے ایک شاخ ان کے بڑے بیٹے اسماعیلؑ کے ذریعے چلی۔ وہ حجاز میں آباد ہوئے۔ اسی سرزمین میں آنحضور ﷺ کی پیدائش ہوئی اور حضرت علیؓ کا تعلق بھی اسی علاقے اور حضرات ابراہیمؑ کی اسی شاخ سے ہے۔ اسی اعتبار سے میں اس ترمیم شدہ شعر میں حضرت علیؓ کو حضورؐ سے علیحدہ نہیں سمجھتا کہ "حجاز" کا لفظ دونوں کو شامل ہے۔ اسی سرزمین میں آنحضور ﷺ پر قرآن حکیم کا نزول ہوا۔ "حولِ قدس" سے مراد فلسطین کا وہ علاقہ ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے حضرت اسحاق آباد ہوئے اور جو سینکڑوں انبیاء کا مسکن اور سابقہ امت کا مرکز بنا۔ متعدد آسمانی کتابیں اس علاقے میں اتریں۔ میں نے اسی حوالے سے اس مصرعے میں "حجاز" کے ساتھ "حولِ قدس" کو شامل کیا ہے کہ "سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ حجاز و حولِ قدس!"

بہرکیف قرآن و حدیث ہی نہیں سابقہ آسمانی کتابوں کے مطالعے کی بنیاد پر اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کو دیکھتے ہوئے میں یہ بات تقریباً یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ دن زیادہ دور نہیں جب حضرت مہدی کے زیرِ قیادت عرب مسلمان یہودیوں کے خلاف صف آراء ہوں گے۔ دیکھئے' اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہمارا یقین ہے' لیکن اسے دیکھا تو کسی نے

نہیں ہاں قرائن سے اسے پہچانا ہے' آیات سے پہچانا ہے ﴿اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِی تَجْرِی فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا الخ﴾ آیاتِ آفاقی ہیں جو ہمارے گردوپیش پھیلی ہوئی ہیں' ان کے ذریعے اللہ کو پہچانا ہے۔ تو موجودہ حالات پر اگر نگاہ ہو اور جو علامات احادیث کے اندر بیان ہوئی ہیں' ان پر اگر نظر دوڑائیں تو محسوس ہوتا ہے کہ قیامت سے قبل حق و باطل کا جو آخری معرکہ (Final Show down) ہونے والا ہے' جو درحقیقت یہود اور مسلمانوں کے درمیان ہوگا' وہ اب بہت قریب آچکا ہے۔ آج ہی کے نوائے وقت میں ایک مضمون شائع ہوا ہے کہ اسرائیلی وزیر اعظم نتن یاھو نے امریکہ کی جانب سے کی جانے والی قیام امن کی کوششوں کو خاک میں ملا دیا ہے۔ امریکہ کے انتہائی سخت دباؤ کے باوجود وہ قیامِ امن کے لئے ایک قدم بھی آگے بڑھانے کو تیار نہیں۔ یاسر عرفات سے رسمی ملاقات اس نے ضرور کرلی ہے لیکن مزید ایک انچ آگے بڑھنے کو وہ تیار نہیں۔ کھلم کھلا کہہ رہا ہے کہ اس رخ پر کوئی پیش رفت نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے' اور میں جانتا ہوں کہ وہ مجبور ہے' کہ مذہبی یہودیوں کا اب وہاں اتنا غلبہ ہو چکا ہے کہ سیکولر قسم کے یہودی ان کے سامنے بے بس ہو گئے ہیں۔ مذہبی عناصر کا شدید دباؤ ہے کہ یہودیوں کی ریاست کے قیام کے بعد اب فی الفور تھرڈ ٹمپل تعمیر ہونا چاہئے۔ یعنی ہیکل سلیمانی کو اس کی بنیادوں پر تیسری بار تعمیر کیا جائے' جس کے لئے لازم ہے کہ مسجد اقصیٰ گرائی جائے۔ اس کے نیچے جو سرنگ ہے وہ اب اسرائیلی ریاست نے کھول دی ہے' ہفتے میں پانچ دن کھلی رہے گی اور دو دن یعنی سبت اور سنڈے کو بند رہے گی۔ گویا مسجد کو گرانے کا سامان کرلیا گیا ہے۔ اب کسی دن مذہبی یہودیوں میں سے کوئی جنونی جائے گا جیسا کہ اس سے قبل ایک موقع پر مسجد خلیل میں جا کر ایک یہودی نے کتنے ہی مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا اور پھر خودکشی کرلی تھی' اسی طرح کا کوئی جنونی جائے گا' اور اس سرنگ میں کوئی بڑا دھماکہ کر دے گا' خود بھی ختم ہو جائے گا اور مسجد اقصیٰ بھی منہدم ہو جائے گی۔ اسرائیلی حکومت یہ موقف اختیار کرے گی کہ اب بھئی ہم کیا کر سکتے ہیں' یہ جنونی آدمی تھا' اس طرح کے پاگل

ہر جگہ ہوتے ہیں، عیسائیوں میں بھی، مسلمانوں میں بھی اور یہودیوں میں بھی، ہمارے ہاں کا بھی ایک پاگل تھا جس نے یہ حرکت کی۔ اب جبکہ یہ مسجد منہدم ہو گئی ہے تو ہمیں اپنا ٹمپل تعمیر کرنے دو۔ اس کا ریہرسل اس سے قبل ہندوستان میں ہو چکا ہے کہ بابری مسجد جب کچھ مذہبی جنونیوں نے گرا ہی دی تو بابا اب رام مندر ہی بنانے دو۔ یہی معاملہ اب یروشلم میں ہونے والا ہے۔ اس کے بعد جو طوفان اٹھے گا اور عالم عرب کے مخلص مسلمان جس طرح ایک دم اٹھ کھڑے ہوں گے، چشم تصور سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں خلافت کانفرنس میں نیویارک سے جو مہمان مقرر تشریف لائے تھے، عمران این حسین، جنہوں نے بحمد اللہ تنظیم اسلامی میں بھی شمولیت اختیار کر لی ہے، اللہ تعالیٰ انہیں استقامت عطا فرمائے، انہوں نے گزشتہ رات قرآن آڈیٹوریم میں اپنی تقریر کے دوران بعض بہت پتے کی باتیں کی ہیں۔

انہوں نے فتنہ دجال پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ قربِ قیامت کے واقعات کے ضمن میں بعض احادیث میں حج کے موقوف ہونے کا ذکر بھی ملتا ہے کہ حج بند ہو جائے گا، اور اس کے آثار موجود ہیں، اس لئے کہ سعودی عرب کے اندر حالات اب خاصے مخدوش ہیں۔ ماضی قریب میں دو بم دھماکے امریکیوں کے خلاف ہو چکے ہیں اور دوسرے دھماکہ میں تو بیس افراد مارے گئے۔ اس کے بارے میں امریکہ کی سی۔ آئی۔ اے کی رپورٹ یہ ہے کہ یہ کسی باہر کے آدمی کا کام نہیں ہے بلکہ سعودی فوج کے اندر کے بعض عناصر نے یہ کام کیا ہے۔ آخر سعودی فوجی بھی مسلمان ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی وہاں موجودگی انہیں یقیناً کھلتی ہوگی۔ اگر ان میں سے اکثر بے غیرت ہو گئے ہوں تب بھی ان میں کچھ افراد تو غیرت مند بھی ہوں گے۔ لہٰذا اندیشہ ہے کہ کوئی بہت بڑا طوفان وہاں آنے والا ہے۔ اور فرض کیجئے، جیسا کہ گمان غالب ہے، شدید اندیشہ ہے کہ اگلے سال ۹۷ء میں مسجد اقصیٰ شہید کر دی جائے گی۔ اس کے لئے فضا ہموار کی جا رہی ہے۔ امریکہ میں ایک فلم دکھائی جا رہی ہے جس میں وہ سرنگ (tunnel) دکھائی گئی ہے جو مسجد اقصیٰ کے نیچے کھولی گئی ہے، کہ یہاں پہلے ان کا ان کا ٹمپل ہوتا تھا جس کے انہدام کے بعد اس جگہ مسلمانوں نے مسجد تعمیر کر لی۔ اس طرح رائے عامہ کو ہموار کیا جا رہا ہے۔ اور یہ بات تو

ہم بھی مانتے ہیں کہ اسی جگہ پر تھا' اسے سب سے پہلے گرایا تھا بخت نصر نے' پھر اسے حضرت عزیر نے تعمیر کیا' پھر دوبارہ گرایا ٹائٹس رومی نے ۷۰ء میں' اس کے بعد سے آج تک وہ گرا پڑا ہے۔ مسلمانوں نے اگرچہ اسے نہیں گرایا لیکن یہ کہ اس جگہ پر مسجد ضرور تعمیر کی ہے۔ بہرحال اس حوالے سے اب جو کچھ ہو رہا ہے اس کے نتیجے میں عالم عرب کے اندر ایک زبردست خلفشار پیدا ہوگا۔ یہ حدیث میرے سامنے پہلے بھی تھی' کئی دفعہ میں نے اپنی تقاریر میں اس کا حوالہ بھی دیا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک دفعہ خواب کی کیفیت میں کچھ دیکھا اور پھر آپ چونک کر اٹھے اور آپ نے فرمایا: وَيْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ "ہلاکت اور بربادی ہے عربوں کے لئے اس شر سے کہ جو قریب آچکا ہے"۔ تو ابھی تک کوئی خاص ایسا شر عربوں کے لئے مجموعی طور پر نہیں آیا جس پر اس حدیث کا اطلاق کیا جا سکے۔ میرے نزدیک اس حدیث میں اسی "الملحمة العظمٰى" کی طرف اشارہ ہے جس میں سب سے بڑی تباہی عربوں پر آئے گی۔ (واللہ اعلم)۔ بعض اور احادیث سے بھی اسی جانب رہنمائی ملتی ہے۔

میری اس قیاس آرائی کی کہ حضرت مہدیؑ موعود کی آمد اب زیادہ دیر کی بات نہیں' تائید سعودی عرب میں سعودی شاہی خاندان کی موجودہ صورتحال سے بھی ہوتی ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ آل سعود کی حکومت میں جو تسلسل اور استحکام ہے اس کا راز اس میں مضمر ہے کہ ان کے ہاں جانشینی کا معاملہ ابھی تک طے شدہ اصولوں کے مطابق چل رہا ہے۔ ملک عبدالعزیز بن سعود کے بیٹوں میں سے ولی عہدی کی ترتیب پہلے سے طے شدہ ہے' ایک بھائی کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا عنانِ حکومت سنبھالتا چلا آرہا ہے۔ بھائیوں کی قطار ماشاء اللہ خاصی لمبی ہے لہٰذا اگلی نسل میں ابھی یہ معاملہ منتقل ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ جیسے ہی کوئی نیا بادشاہ تخت نشین ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کے ولی عہد کا اعلان بھی اسی وقت کر دیا جاتا ہے تاکہ اگر شاہ کی اچانک موت واقع ہو جائے تو ولی عہد فوراً چارج سنبھال لے اور کوئی بحرانی صورتحال پیدا نہ ہونے پائے۔

یہ ان کی خاندانی روایت ہے اور ان کے ہاں اب تک یہی معاملہ ہوتا رہا ہے لیکن یہ

ایک کھلی حقیقت ہے کہ شاہ فہد کا جو ولی عہد ہے وہ امریکہ کو پسند نہیں ہے۔ پرنس عبداللہ کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ کچھ مذہبی مزاج کا آدمی ہے اور اسے فنڈا منٹلسٹ سمجھا جاتا ہے۔ امریکہ چاہتا ہے کہ فہد کے بعد اس کی بجائے کسی اور کو تاج و تخت سونپا جائے جو امریکی مفادات اور عزائم کے راستے کی رکاوٹ ثابت نہ ہو۔ اگر طاقت کے نشے میں امریکہ نے یہ حماقت کی اور اپنے دباؤ کے ذریعے سعودی روایات کے برعکس موجودہ ولی عہد کے بجائے کسی اور کو فہد کی جگہ تخت پر بٹھایا تو شدید اندیشہ ہے کہ وہاں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ اور اس خانہ جنگی کے دوران ایک شخصیت ابھرے گی اور وہ مہدی ہوں گے۔

مہدئ موعود، احادیث کے آئینے میں

اب ہم حضرت مہدی کے بارے میں چند احادیث نبویہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔

عن عبداللّٰہ بن مسعود ﷛ قال قال رسولُ اللّٰہ ﷺ :

((لَا تَذْهَبُ الدُّنیا حتیٰ یَمْلِکَ العربَ رجلٌ مِن اھلِ بَیتِی یُواطِئُ اسْمُہٗ اسْمِی)) (رواہ الترمذی وابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن مسعود ﷛ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "دنیا اس وقت تک ختم نہ ہو گی جب تک کہ میرے اہل بیت میں سے ایک شخص عرب کا بادشاہ نہ بن جائے۔ اس کا نام میرے نام کے موافق ہو گا۔"

اب دیکھئے حضور ﷺ کے بعد آج تک تو آپ ؐ کے اہل بیت میں سے کسی کی بادشاہت عرب پر قائم نہیں ہوئی۔ خلفائے راشدہ میں سے حضرت علیؓ آپ ؐ کے اہل بیت میں سے تھے، لیکن ان کی حکومت بھی پورے عرب پر قائم نہیں ہو سکی۔ بنو امیّہ اور بنو عباس بھی آپ ؐ کے اہل بیت میں سے نہ تھے۔ تو یوں سمجھئے کہ اہل بیت کا لفظ نسل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور جس بادشاہ کا ذکر اس حدیث میں ہے وہ آپ ؐ کی نسل سے ہو گا۔ پھر آپ ؐ نے فرمایا کہ اس کا نام میرے نام پر ہو گا۔ یہ روایت جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں موجود ہے۔ جبکہ ابو داؤد کی ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں :

((لَوْلَمْ یَبْقَ مِنَ الدُّنیا اِلَّا یومٌ لَطَوَّلَ اللّٰہُ ذٰلِکَ الیومَ حتّٰی

يَبعثُ اللّٰهُ فيه رجلاً مِنّي ---اواهلِ بَيتِي ---يُواطئُ اسمُهُ اسْمِي وَاسْمُ اَبيهِ اسْمُ اَبِي 'يَمْلاُالارضَ قِسطاً وعَدلاً كما مُلِئتْ ظُلماً وجوراً))

"اگر دنیا (کی عمر) میں سے صرف ایک دن بھی باقی رہ گیا ہو تو اللہ تعالیٰ اس دن کو لمبا کر دے گا' یہاں تک کہ اس میں اللہ تعالیٰ مجھ سے (یا فرمایا : میرے اہل میں سے) ایک آدمی کو اٹھائے گا' جس کا نام میرے نام کے موافق اور اس کے باپ کا نام میرے باپ کے نام کے موافق ہو گا۔ وہ زمین کو انصاف اور عدل سے بھر دے گا جیسا کہ اس سے پہلے وہ ظلم اور جور سے بھری ہوئی ہو گی"۔

متذکرہ بالا دونوں احادیث میں جس بادشاہ کا ذکر ہے یہ وہی شخصیت ہے جسے اہل سنت مہدی مانتے ہیں۔

عن امّ سلمة رضی اللہ عنہا قالت : سمعتُ رسولَ اللّٰه ﷺ يقول : ((اَلمَهدِيُّ مِنْ عِترَتِي 'مِنْ اَولَادِ فَاطِمَةَ))

(رواه ابوداؤد)

(ام المومنین) امّ سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا : "مہدی میری عترت سے' اولادِ فاطمہ رضی اللہ عنہا میں سے ہو گا"۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا)

اس حدیث میں ان کا ذکر مہدی کے نام سے آ گیا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی احادیث میں مہدی کا تذکرہ ملتا ہے' لیکن میں اب سعودی عرب کے خاص حالات کے حوالے سے ایک حدیث بیان کر رہا ہوں۔ جہاں تک میرا احساس ہے سعودی عرب میں اس وقت حالات یہی رخ اختیار کر رہے ہیں جن کا ذکر اس حدیث میں آیا ہے۔ واللہ اعلم! اس وقت شاہ فہد کی صحت تقریباً جواب دے چکی ہے اور ان کے انتقال کے بعد وہاں ولی عہد شہزادہ عبداللہ کی تخت نشینی کے مسئلہ پر شدید اختلاف کا اندیشہ ہے۔ مجھے تو ایک صاحب نے یہ بھی بتایا تھا کہ جب شاہ فہد نے زمامِ حکومت سنبھالی تو اس وقت بھی وہ عبداللہ کو اپنا ولی عہد بنانا پسند نہیں کر رہے تھے اور اس مسئلے پر اس قدر جھگڑا ہوا تھا کہ عبداللہ نے فہد پر گولی چلا دی تھی' لیکن وہ بچ گئے تھے۔ گویا کہ یہ چپقلش آغاز سے موجود ہے۔ اگرچہ فہد

کو عبداللہ کا ولی عہد بننا پسند نہیں تھا لیکن خاندان کے بڑوں نے یہ طے کیا کہ فہد کے بعد عبداللہ کی باری ہے۔ اب یہ بھی ممکن ہے کہ عبداللہ کو روکنے کے لئے اسے قتل کرا دیا جائے۔ سی آئی اے سے یہ بعید نہیں ہے۔ کوئی اور صورت بھی پیش آسکتی ہے، لیکن اس کا جو نتیجہ نکلے گا اس کا نقشہ اس حدیث کے اندر دیکھئے۔

عن ام سلمة رضی اللہ عنہا عن النبیّ ﷺ قال : ((یَکُوْنُ اخْتِلافٌ عِندَ موتِ خلیفةٍ فیَخرُجُ رجلٌ مِن اهلِ المدینةِ هاربًا الٰی مکةَ، فیأتیهِ ناسٌ مِن اهلِ مکةَ، فیُخرِجُونَهُ وهُو کارهٌ، فیُبایِعُونَهُ بَیْنَ الرُّکْنِ وَالمُقامِ))

(ام المومنین) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "ایک خلیفہ (یعنی بادشاہ) کی موت پر اختلاف واقع ہو جائے گا۔ چنانچہ اہل مدینہ میں سے ایک شخص بھاگ کر (پناہ لینے کے لئے) مکہ چلا جائے گا۔ اہل مکہ میں سے کچھ لوگ اس کے پاس آئیں گے اور وہ اسے نکالیں گے (بعض روایات میں آتا ہے کہ وہ کعبے کے پردے کے پیچھے چھپا ہو گا) اور وہ اسے ناپسند کرتا ہو گا (کہ اس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے) پھر وہ رکن (خانہ کعبہ کا وہ کونہ جس میں حجرِ اسود نصب ہے) اور مقام ابراہیم کے درمیان اس کے ہاتھ پر بیعت کریں گے........"

ظاہر ہے کہ جب بھی کہیں اس طرح کا انتشار پیدا ہوتا ہے تو جو لوگ اپنی سیاسی آراء کے حوالے سے نمایاں ہوتے ہیں ان کی جان کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اس حدیث میں جس شخصیت کا ذکر ہے وہ بھی کوئی نمایاں شخصیت ہو گی جو اپنی جان بچانے کے لئے مدینے سے جا کر مکہ میں پناہ لے گی۔ اہل مکہ انہیں پہچان لیں گے کہ یہی مہدیٔ موعود ہیں۔ چنانچہ انہیں ان کی پناہ گاہ سے (یعنی بیت اللہ کے پردوں کے پیچھے سے) نکال کر ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ زیر نظر حدیث میں اس کے بعد کچھ جنگوں کا تذکرہ ہے کہ شام سے ان کے خلاف جنگ کے لئے جو لشکر روانہ ہو گا اسے مکہ اور مدینہ کے درمیان مقام بیداء پر دھنسا دیا جائے گا۔ جب لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ یہی مہدی ہیں تو پھر شام، عراق اور عرب

کے کونے کونے سے لوگ آکر ان کے ساتھ جمع ہو جائیں گے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرلیں گے۔ پھر کچھ جنگیں ہوں گی جن کے بعد مہدی کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ حدیث کے آخری الفاظ کے مطابق:

((وَیُعْمَلُ فِی النَّاسِ بِسُنَّۃِ نَبِیِّھِمْ وَیُلْقِی الْاِسلامُ بِجِرَانِہٖ فِی الأَرْضِ، فَیَلبَثُ سبعَ سِنِین ثُمَّ یُتَوَفّٰی وَیُصَلِّی علیہِ المُسْلِمُون)) (رواہ ابو داود)

"(پھر وقت آجائے گا کہ) لوگوں پر ان کے نبیؐ کی سنت کے مطابق حکومت ہو گی اور اسلام زمین پر اپنا جھنڈا نصب کردے گا۔ پھر وہ (مہدی) سات سال تک رہیں گے، پھر ان کا انتقال ہو جائے گا اور مسلمان ان کی نماز جنازہ ادا کریں گے"۔

تو یہ ہیں حضرت مہدی جو عرب کے دورِ خلفشار میں ایک نیک شخصیت کی حیثیت سے ابھریں گے۔ اہل حق ان کے گرد جمع ہوں گے اور اہل باطل کے ساتھ ان کی جنگیں ہوں گی۔ بالآخر انہیں کامیابی حاصل ہو گی اور یہ عرب میں ایک اسلامی حکومت قائم کر لیں گے۔

اب اس کے ساتھ ان احادیث کو جوڑیئے جو میں قبل ازیں کئی بار بیان کر چکا ہوں۔ امام مہدی کو جو مدد ملے گی اس کے ضمن میں ابن ماجہ کی یہ حدیث بہت اہم ہے :

عن عبدِاللّٰہ بن الحارث ﷛ قال قال رسولُ اللّٰہ ﷺ :

((یخرجُ ناسٌ مِنَ المشرقِ فیوَطِّئُون لِلمَھْدِی یعنی سُلطانَہٗ))

عبداللہ بن الحارث ﷛ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا : "مشرق سے لوگ نکلیں گے جو مہدی کی مدد یعنی ان کی حکومت کے تمکن کے لئے زمین کو روندتے ہوئے بڑھتے چلے جائیں گے"۔

اس حدیث کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ مشرق کے کسی علاقے میں پہلے سے اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہو گی۔ اور دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "خراسان" کا علاقہ ہے، جس کے بارے میں میں بتا چکا ہوں کہ اس میں افغانستان اور پاکستان کے بعض

علاقے شامل ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((یَخْرُجُ مِنْ خُرَاسَانَ رَأَیَاتٌ سُوْدٌ، فَلَا یَرُدُّھَا شَیْءٌ حَتّٰی تُنْصَبَ بِاِیْلِیَاءَ)) (رواہ الترمذی)

"خراسان سے سیاہ جھنڈے نکلیں گے، جنہیں کوئی شے واپس نہیں کر سکے گی، یہاں تک کہ وہ ایلیاء (بیت المقدس) میں نصب کر دے جائیں گے"۔

اس دور میں ہم نے جن حدیثوں کو بحمد اللہ بہت عام کیا ہے ان میں سے حضور ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث بھی ہے جو سنن النسائی میں وارد ہوئی ہے:

((عِصَابَتَانِ مِنْ اُمَّتِی اَحْرَزَھُمَا اللّٰہُ مِنَ النَّارِ، عِصَابَۃٌ تَغْزُو الْھِنْدَ وَعِصَابَۃٌ تَکُوْنُ مَعَ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ عَلَیْھِمَا السَّلَامُ))

"میری امت میں سے دو گروہ ایسے ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ آگ سے بچا لے گا۔ ایک گروہ جو ہندوستان سے جہاد کرے گا اور دوسرا گروہ جو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا ساتھ دے گا۔"

ان دو لشکروں کے بارے میں دنیا ہی میں فیصلہ کر دیا گیا کہ جو ان میں شریک ہو گا وہ جہنم کی آگ سے بچ جائے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دجال سے جو جنگ ہونی ہے اس میں یہاں سے جانے والے لشکر شریک ہوں گے اور ظاہر ہے کہ اس سے پہلے یہاں اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہو گی اور اس کی توسیع مشرق میں بھی ہو گی اور مغرب میں بھی۔ چنانچہ ہندوستان پر حملہ آور ہونے والے لشکر کا تعلق بھی یہیں سے ہو گا۔

ہمارے کرنے کا اصل کام؟

احادیثِ نبویہؐ کی روشنی میں حضرت مہدی کی شخصیت کے بارے میں مَیں نے اپنا موقف بیان کر دیا ہے۔ اب یہ سمجھ لیجئے کہ میرے اور آپ کے کرنے کا اصل کام کیا ہے؟ ہمیں اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ کیا ہم اس جماعت میں شامل ہیں جو دین کی تجدید کے لئے اور

صحیح دین کو دنیا کے سامنے پیش کرنے اور اسے دنیا میں قائم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہی ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں بلاخوفِ تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ نظامِ خلافت بالآخر قائم ہو کر رہے گا اور قیامت سے قبل پورے کرۂ ارضی پر اللہ کا دین غالب ہو کر رہے گا۔ ہمیں اپنے بارے میں طے کرنا ہے کہ ہمارا اس میں کردار کیا ہو گا۔ ابولہب اور حضرت حمزہؓ دونوں حضور ﷺ کے سگے چچا تھے لیکن غلبۂ دین کی جدوجہد میں دونوں کا کردار ایک دوسرے کے بالکل مخالف تھا۔ ایک انتہائی محروم ٹھہرا اور سورۂ لہب میں اسے بدترین نمائندہ کردار کے طور پر پیش کیا گیا جبکہ دوسرا سیّد الشہداء قرار پایا۔ ہمیں سوچنا چاہئے کہ ہم کس فہرست میں اپنا نام لکھوانا چاہتے ہیں۔ آنحضور ﷺ کا تیسرا چچا کچھ بین بین تھا، وہ ایمان تو نہیں لایا لیکن آپؐ کی سرپرستی کرتا رہا، یعنی ابوطالب۔ چوتھے چچا وہ تھے جو ایمان لائے لیکن وہ "سابقون الاولون" میں شامل نہیں تھے اور اس عظیم انقلابی جدوجہد میں ان کا کوئی نمایاں رول سامنے نہیں آتا۔ شاید اسی لئے جمعہ کے خطبوں میں ان کے لئے یہ الفاظ آتے ہیں: "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِلْعَبَّاسِ وَوَلَدِہٖ مَغْفِرَۃً ظَاھِرَۃً وَّبَاطِنَۃً لَا تُغَادِرُ ذَنْبًا"۔ سید الشہداء حضرت حمزہؓ سے اگر ان کا تقابل کریں تو وہ بہت پیچھے نظر آتے ہیں۔ تو آنحضور ﷺ کے یہ چار چچا ہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے چاروں کا معاملہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ایک انتہا پر سید الشہداء حضرت حمزہؓ ہیں جو "اَسَدُ اللّٰہِ وَاَسَدُ رَسُوْلِہٖ" قرار پائے، دوسری انتہا پر ابولہب ہے جو آپؐ کا بدترین دشمن تھا۔ درمیان میں ایک طرف ابوطالب ہیں جو اگرچہ ایمان تو نہیں لائے لیکن آپؐ کی مدد اور تعاون کرتے رہے۔ ان کے بالمقابل دوسری طرف درمیان میں حضرت عباس ہیں جو ایمان تو لائے اور فتح مکہ کے بعد محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بھی رہے لیکن آنحضور ﷺ کی انقلابی جدوجہد میں ان سے منسوب کوئی قابل ذکر کارنامہ ہمارے علم میں نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ تو اصل بات ہمارے سوچنے کی یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو کن لوگوں کے ساتھ شامل کرنا چاہتے ہیں اور اپنے بارے میں کیا رول طے کرتے ہیں۔

میں اس ضمن میں ایک اور حدیث آپ کو سنانا چاہتا ہوں کہ وہ جماعت جو آخری

دور میں حق کے لئے میدان میں نکلے گی اس کا مقام و مرتبہ کیا ہو گا! اس حدیث کو امام بیہقیؒ نے "دلائل النبوۃ" میں درج کیا ہے۔ ملاحظہ ہو :

عن عبدالرحمٰن بن العلاء الحضرمی ؒ قال حدَّثنی مَن سمِعَ النبیَّ ﷺ یقولُ : ((اِنَّہ سیکون فی آخرِ ھٰذہِ الامۃِ قومٌ لھم مثلُ اجرِ اوَّلِھِمْ یَامُرُونَ بِالمعروفِ ویَنھَون عَنِ المُنکَرِ وَیُقاتِلُونَ اَھْلَ الْفِتَنِ))

"حضرت عبدالرحمٰن بن العلاء الحضرمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ بات مجھ سے اس شخص نے بیان کی جس نے خود براہ راست آنحضور ﷺ سے سنی ' کہ یقیناً میری امت کے آخری دور میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے کہ جو اپنے اجر و ثواب کے اعتبار سے بالکل ابتدائی زمانے کے اہل ایمان کے مساوی ہوں گے۔ (یعنی جیسے آنحضورؐ کے دور میں حالات انتہائی نامساعد تھے اسی طرح آخری دور میں بھی مسلمانوں کو انتہائی مشکل حالات اور آزمائشوں سے سابقہ پیش آئے گا اور اسی وجہ سے ان کا اجر بھی سابقون الاولون کے مثل ہو گا۔ لیکن یہ اجر کن لوگوں کے لئے ہو گا؟ اس کا جواب حدیث کے اگلے الفاظ میں آ رہا ہے) وہ لوگ نیکی کا حکم دیں گے اور برائیوں سے روکیں گے اور فتنہ برپا کرنے والوں سے جنگ کریں گے"۔

یہ اجر و ثواب اور مقام و مرتبہ ان لوگوں کے لئے ہو گا جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیں گے اور دشمنانِ دین کے خلاف منظم جہاد کریں گے۔ دیکھئے 'اسلامی انقلاب کے آخری مراحل کے بیان کے لئے میں ہمیشہ "نہی عن المنکر" کا عنوان اختیار کرتا ہوں کہ "نہی عن المنکر" کا عمل جب "زبان" سے بڑھ کر بازو اور قوت کے استعمال کے مرحلے میں داخل ہو گا تو یہی وہ آخری مرحلہ ہو گا جو فیصلہ کن ثابت ہو گا۔ تاہم یہ کام ایک منظم اجتماعی جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ بہرکیف جو لوگ اس رخ پر جدوجہد کریں گے' اس حدیث میں انہی کے لئے بشارت وارد ہوئی ہے۔

مشکوٰۃ شریف کے آخری باب کا عنوان ہے : "ثوابُ ھٰذہِ الامۃ"۔ یہ حدیث مشکوٰۃ کے اسی باب میں شامل ہے۔ لہٰذا یہ نہ سمجھئے کہ وہ مقامات بلند تو اب ہمیں کسی درجے میں بھی حاصل ہی نہیں ہو سکتے۔ ابھی موقع ہے' آؤ ہمت کرو! دنیا کو چھوڑو'

رہبانیت کے انداز میں نہیں، مجاہدین کے انداز میں۔ اسی لئے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہمارے دین میں رہبانیت نہیں ہے سوائے دو صورتوں کے، ایک صوم اور دوسرا جہاد۔ دیکھئے روزہ میں بھی کچھ پابندیاں ہوتی ہیں۔ کھانے پینے کی اور بیویوں کے ساتھ تعلقات کی۔ یہ گویا چودہ پندرہ گھنٹے کی رہبانیت ہے۔ اور جہاد میں کیا ہے؟ آدمی اپنے گھر سے نکلتا ہے، تکلیفیں اٹھاتا اور مشقتیں جھیلتا ہے۔ گویا یہ بھی عارضی طور پر ترکِ دنیا کی ایک صورت ہے۔ یہ وہ رہبانیت نہیں کہ دنیا سے بالکل کٹ کر غاروں میں چھپ جاؤ، بلکہ یہ تو ع "نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری!" والی بات ہے۔ یہ تصوف کی ایک مختلف صورت ہے۔ یہ وہ فعال تصوف ہے جو سید احمد بریلوی شہیدؒ کا تھا کہ جو انسان کو جہاد و قتال پر آمادہ کرتا ہے۔ اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ سلسلہ محمدیہ ہے جس میں سید احمد بریلویؒ نے بیعت لی تھی۔ ہمارے ہاں دیگر تمام سلاسل موجود ہیں۔ سلسلۂ قادریہ بھی ہے اور سلسلہ چشتیہ بھی۔ اسی طرح سلسلہ صابریہ، سلسلہ مجددیہ، نقشبندیہ اور سلسلہ سہروردیہ سب موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ "سلسلہ محمدیہ" کہاں گیا؟ سید احمد بریلوی شہید پہلے معروف سلاسل میں کچھ سلوک طے کرانے کے بعد پھر بیعت لیتے تھے سلسلہ محمدیہ میں، کہ اب آؤ جہاد کی بیعت کرو! نَحنُ الَّذِین بَایَعُوا مُحَمَّدًا!! عَلَی الجِھَادِ مَا بَقِینَا اَبَدًا!!! (ہم وہ ہیں جنہوں نے محمد ﷺ سے جہاد کی بیعت کی ہے، اب یہ جہاد جاری رہے گا جب تک جان میں جان ہے۔) تنظیم اسلامی اسی دعوت کو لے کر اٹھی ہے۔ اَللّٰھُمَّ وَفِّقنَا لِھٰذَا۔

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○

جواب آں غزل

بدگمانی یا غلط بیانی؟

اجتماع ماچھی گوٹھ کے بارے میں سابق امیر جماعت میاں طفیل محمد صاحب کے ایک مغالطہ آمیز بیان کے جواب میں مولانا عبدالغفار حسن کی وضاحت

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ہفت روزہ تکبیر کراچی ۱۶ نومبر ۱۹۹۵ء نمبر ۴۶، صفحہ ۱۶-۱۵ پر میاں طفیل محمد صاحب کی ایک گفتگو شائع ہوئی ہے، جس کا عنوان ہے "جماعت اسلامی کے کُل پاکستان اجتماعات"۔ اس گفتگو کے آخر میں جناب میاں صاحب نے حسب ذیل گوہر افشانی فرمائی ہے:

"واقعاتی اعتبار سے ماچھی گوٹھ کا اجتماع اہمیت رکھتا ہے، جب جماعت اسلامی کے متعدد اکابر رہنماؤں نے جماعت سے علیحدگی اختیار کرلی۔ یہ اجتماع صرف ارکان کا تھا۔ کیونکہ جماعت اسلامی میں یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ "جماعت کو سیاست میں حصہ لینا چاہئے یا نہیں"۔ مولانا مودودی اور ان کے ساتھ اتفاق رائے رکھنے والوں کی رائے تھی "جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی" اس لئے جماعت کو سیاست میں حصہ لینا چاہئے جو پورے دین کا ایک حصہ ہے۔ سیاست کو چنگیزیت کے حوالے کر دینا دین نہیں ہے۔ یہ معاملہ طے کرنے کے لئے ارکان کا اجتماع منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مولانا مودودی نے اجتماع سے پہلے امارت سے استعفاء دے دیا۔ ان کی جگہ امیر جماعت اسلامی کراچی، چوہدری غلام محمد کو امیر جماعت مقرر کیا گیا۔ ان کی زیر صدارت، ماچھی گوٹھ میں ایک بھرپور مباحثہ ہوا جس میں کم و بیش ایک ہزار ارکان شریک ہوئے۔ مولانا مودودی کے نقطہ نظر کی حمایت میں ۹۰ اور ان کے مخالفین کے حق میں صرف پندرہ ووٹ ڈالے گئے۔
اس سارے قضیہ میں شامل ایک اہم شخصیت ڈاکٹر اسرار احمد کی تھی۔ مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا وصی مظہر ندوی اور مولانا عبدالغفار حسن جیسی

شخصیات کو یہ تیس بتیس سالہ {۱} جوان غچہ دینے میں کامیاب ہو گیا۔ اگرچہ یہ تمام اکابرین آج ڈاکٹر اسرار احمد کے بارے میں ایک بالکل الٹ رائے رکھتے ہیں"۔

یہ عبارت غلط بیانیوں کا مجموعہ ہے' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نادانستہ 'غیر شعوری طور پر غلط بیانی کی گئی ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ وہی نکل سکتا ہے جو دانستہ غلط بیانی کا نکلتا ہے۔

محترم میاں صاحب کی پہلی غلط بیانی یہ ہے کہ "جماعت اسلامی میں یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ جماعت کو سیاست میں حصہ لینا چاہئے یا نہیں"۔ یہ بات اصل واقعہ کے خلاف ہے۔ اصل اختلاف اس بات پر ہوا تھا کہ انتخابی سیاست میں 'موجودہ حالات میں' حصہ لینا مفید ہو گا یا نہیں۔ اور یہ اختلاف اسی وقت ہو گیا تھا جب ۱۹۵۱ء میں پنجاب کے صوبائی انتخابات کا مایوس کن نتیجہ نکلا۔ یعنی جماعت اسلامی کے ۵۳ پنجابی نمائندوں میں سے صرف ایک کامیاب ہو سکا۔ اور وہ بھی اس بناء پر کہ وہ اپنے علاقہ میں انتہائی محترم اور پیر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس میں جماعت اسلامی کی مقبولیت کا کوئی اثر نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے ہر ووٹر کے لئے دو ووٹ دینے کا حق تھا' ایک مقامی اور دوسرا مہاجر۔ لوگوں نے کہا ایک ووٹ ہم رحمان کو دیتے ہیں اور دوسرا شیطان کو۔

راقم الحروف اس وقت سیالکوٹ میں امیر حلقہ تھا۔ پورے ضلع سیالکوٹ سے ۱۳ حلقوں میں سے آٹھ میں امیدوار کھڑے کئے گئے' جن میں سے کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکا' بلکہ سوائے دو حلقوں کے' سب کی ضمانت بھی ضبط ہو گئی۔ اسی طرح خود میاں طفیل محمد صاحب دو حلقوں سے کھڑے ہوئے تھے' دونوں میں ناکام ہوئے۔ انتخابات کے بعد اس شرمناک شکست پر غور کیا گیا۔ اس وقت رائے یہ تھی کہ الیکشن کے موقع پر بہت زیادہ دھاندلی ہوئی ہے' اگر صاف و شفاف الیکشن ہوتا تو ہم ضرور کامیاب ہوتے۔ دوسری رائے یہ تھی کہ معاشرے میں ابھی تک اسلامی نظام کے لئے سچی تڑپ ہی پیدا نہیں ہوئی۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے معاشرے کو تیار کیا جائے اور اس کے دینی شعور کو بیدار کیا جائے اور اس میں کافی وقت لگے گا۔ اور یہ کوئی نئی رائے نہیں تھی بلکہ خود بانی جماعت اسلامی نے اپنی تحریر میں وضاحت کی ہے جس کا عنوان ہے "اسلامی حکومت کس

{۱} واضح رہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب کی عمر اس وقت چوبیس سال تھی۔

طرح قائم ہوتی ہے"۔ اس کے بعد ایک ذیلی عنوان ہے "اسلامی انقلاب کی واحد سبیل"۔

اسی طرح مولانا مرحوم نے اپنی تحریر "اسلام کا نظریہ سیاسی" میں جمہوریت کا پوسٹ مارٹم کیا ہے اور اس کو قرآن و حدیث کے خلاف قرار دیا ہے۔ اور یہ آیت پیش کی ہے "قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ" یعنی "(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجئے کہ خبیث اور طیب برابر نہیں ہو سکتے خواہ خبیث کی کثرت تم کو بھلی (ہی کیوں نہ) لگے"۔ اسی طرح مولانا مرحوم (بانی جماعت) نے اپنی تالیف "تجدید و احیاء دین" میں سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے ناکامی کے اسباب پر تبصرہ کرتے ہوئے بھی اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے اور یہی بات مرکزی شوریٰ کے بعض ارکان نے بھی بار بار بیان کی تھی۔

خلاصہ یہ ہے، اختلاف اس امر پر تھا کہ انتخابی سیاست کے دنگل میں فی الفور کود جانا چاہئے یا پہلے معاشرے کی اصلاح اور فکری انقلاب کے لئے اپنی توانائیاں صرف کی جائیں۔

جائزہ کمیٹی کی رپورٹ، جو دسمبر ۵۶ء کے مرکزی شوریٰ کے اجلاس میں پیش ہوئی تھی اس میں جماعت کے دو سو ارکان نے حسب ذیل تین آراء کا اظہار کیا تھا:

۱ ۔ جماعت نے الیکشن میں قبل از وقت حصہ لیا ہے۔

۲ ۔ دینی مزاج اور سیاسی رنگ کے درمیان توازن باقی نہیں رہا۔ یعنی سیاسی رنگ غالب آگیا ہے اور دینی مزاج اس کے مقابلہ میں مغلوب ہو گیا ہے۔

۳ ۔ تیسری رائے۔ جماعت کی قیادت نے کلی طور پر اپنے سابقہ موقف سے انحراف کیا ہے۔

اس تیسری رائے کی تائید میں مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف نے پوری وضاحت کے ساتھ مدلل طور پر نو گھنٹے کی تقریر کی اور راقم الحروف نے تقریباً دو گھنٹے اس رائے کی تائید میں دلائل و شواہد پیش کئے۔

لہٰذا اب یہ بات واضح ہو گئی کہ اختلاف مطلق سیاست میں نہیں تھا بلکہ انتخابی

سیاست کے بارے میں تھا۔ معلوم نہیں میاں طفیل صاحب کو یہ مغالطہ کہاں سے ہوا' کہ وہ اپنے پرانے رفقاء کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔

محترم میاں صاحب نے علامہ اقبال مرحوم کے شعر کا ایک مصرعہ نقل کیا ہے اور پہلا مصرعہ گول کر گئے جس میں انہوں نے کہا ہے :

"جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو"
جدا ہوں دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ایک دوسرے شعر میں علامہ مرحوم نے جمہوریت کا تعارف اس طرح کروایا ہے ۔

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

یہی تو جائزہ کمیٹی کے ارکان کا موقف رہا ہے جسے دوسرے رفقاء نے غلط انداز سے پیش کیا۔

دسمبر ۱۹۵۶ء کی مرکزی مجلس شوریٰ میں جو ۱۰ دن تک جاری رہی' طویل بحث مباحثہ کے بعد' بالاتفاق یہ قرارداد پاس ہوئی کہ سردست جماعت الیکشن میں حصہ نہیں لے گی بلکہ اپنی ساری قوت فکری اور اخلاقی اصلاح کے لئے صرف کرے گی۔ لیکن اس قرارداد کے پاس ہونے کے باوجود معلوم نہیں وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر امیر جماعت اسلامی نے جائزہ کمیٹیوں کے ارکان پر تین بے بنیاد الزام لگائے۔

۱۔ نادانستہ سازش' ۲۔ دھڑے بندی' ۳۔ ہوس اقتدار

اور اس بنا پر جائزہ کمیٹی کے ارکان سے مرکزی شوریٰ کی رکنیت سے استعفےٰ طلب کر لئے گئے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ اور جائزہ کمیٹی کیوں بنی تھی؟ اور کیسے تشکیل پائی؟ اس کی تفصیل کسی دوسرے موقع پر عرض کی جائے گی' ان شاء اللہ۔ {۱}

اس تحریر کا اصل مقصد یہ ہے کہ جماعت اسلامی اور دوسری دینی جماعتیں اب بھی انتخابی سیاست کی دلدل سے اپنے آپ کو نکال لیں اور فکری و اخلاقی اصلاح کے لئے اپنی

{۱} اس تفصیل کے لئے دیکھئے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تالیف "تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب"

تمام توانائیاں صرف کر ڈالیں' جیسے ۱۹۵۱ء سے پہلے ہوتا رہا ہے' ورنہ صورتحال یہی رہے گی۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی پیش کردہ سیاست اور مروجہ انتخابی سیاست دونوں میں بڑا فرق ہے۔ یہ فرق ملحوظ رہنا چاہئے۔ اس بارے میں فرق نہ کرنے پر محترم میاں صاحب کو مغالطہ ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

دوسری غلط بیانی یہ ہے کہ میاں صاحب نے تحریر فرمایا ہے "یہ معاملہ طے کرنے کے لئے (سیاست دین میں داخل ہے یا نہیں) ارکان کا اجتماع منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مولانا مودودی نے اجتماع سے پہلے امارت سے استعفاء دے دیا"۔

بظاہر اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ماچھی گوٹھ کے اجتماع کی بنا پر مولانا مودودی نے امارت سے استعفاء دیا تھا حالانکہ معاملہ دوسرا ہے۔ مولانا نے یہ استعفاء اس خط کے جواب میں دیا تھا جو مولانا مودودی نے جائزہ کمیٹی کے نام تحریر فرمایا تھا' جس میں تین الزام لگائے گئے تھے۔ اس کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ جب امیر جماعت نے جائزہ کمیٹی کے ارکان کے نام خط (نوٹ) ارسال فرمایا اس میں مذکورہ بالا تین الزامات تھے' تو مولانا اصلاحی صاحب نے یہ نوٹ پڑھ کر بڑے افسوس کا اظہار کیا اور اس خط پر مفصل تبصرہ اور تنقید بھی کی۔ اور اس تحریر سے قبل مولانا اصلاحی صاحب دو مرتبہ مولانا مودودی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ اس نوٹ کو آپ واپس لے لیں اور مرکزی شوریٰ کو بلا کر اس کے سامنے ساری صورتحال رکھ دی جائے اور شوریٰ جو فیصلہ کرے اس پر عمل کیا جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس تجویز پر عمل نہ ہو سکا اور بحران بڑھتا ہی چلا گیا۔ مزید تفصیل کسی دوسرے موقع پر عرض کی جائے گی۔

تیسری غلط بیانی یہ ہے کہ محترم میاں طفیل صاحب لکھتے ہیں "مولانا امین احسن اصلاحی' مولانا وصی مظہر ندوی اور مولانا عبدالغفار حسن جیسی شخصیات کو' تیس بتیس سالہ جوان (اسرار احمد) غچہ دینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس سے ان کی قابلیت کا اندازہ لگایا جا

سکتا ہے"۔

میاں صاحب کا یہ انداز بیان انتہائی افسوسناک ہے۔ ابتداء میں جماعت اسلامی ایک داعی کی حیثیت سے ابھری تھی۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی الی اللہ کا دل مدعو کے لئے سوز و گداز سے پر ہوتا ہے اور طعن و تشنیع سے پاک۔ یہاں صورتحال اس کے برعکس ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کی قیادت انتخابی سیاست میں حصہ لینے کے بعد داعی الی اللہ کی بجائے ایک مسلم قومی جماعت بن کر رہ گئی ہے۔ اس لحاظ سے اس میں اور مسلم لیگ میں بہت تھوڑا فرق رہ گیا ہے۔ اندیشہ ہے کہ رفتہ رفتہ یہ جماعت اخلاقی لحاظ سے مسلم لیگ سے بھی بڑھ جائے گی۔ (خدا کرے ایسا نہ ہو)

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ محترم میاں صاحب نے کس بنیاد پر غچہ دینے یا غچہ کھانے کا الزام لگایا ہے۔ جب تک میاں صاحب اس الزام کو دلائل و شواہد کے ساتھ ثابت نہیں کریں گے اسے کیسے باور کیا جاسکتا ہے۔

جن تین اکابرین کے نام میاں صاحب نے بتائے ہیں ان کے بارے میں یہ بات باور نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی کے فریب میں آئے ہوں' بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں نے جو بھی اختلاف کیا ہے وہ اپنی بصیرت اور مشاہدے کی بناء پر کیا۔ اسی طرح ڈاکٹر اسرار صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی ان کی اپنی تحقیق و مطالعہ کا نتیجہ ہے اور انہوں نے جو شواہد پیش کئے ہیں اور جماعت کی قیادت کے بارے میں جس تضاد کی نشاندہی کی ہے وہ اپنی جگہ ناقابل تردید ہے۔ اسی طرح مولانا وصی مظہر ندوی پر بھی غچہ کھانے کا الزام درست نہیں ہے۔ اصل صورتحال یہ ہے کہ جائزہ کمیٹی کے ارکان اور مولانا اصلاحی صاحب ۵۷ء ہی میں جماعت سے علیحدہ ہو گئے تھے' لیکن وصی مظہر ندوی صاحب مزید تلخ تجربوں سے الگ ہوئے۔ ان سب رفقاء کی جماعت سے علیحدگی کی بنیادیں دو تھیں :

۱ ۔ انتخابی سیاست سے اختلاف

۲ ۔ جماعت کی قیادت کا استبداد

یہی وجہ ہے کہ مولانا مودودی مرحوم کے نوٹ کے موصول ہونے کے بعد جائزہ کمیٹی کے

کنوینر مولانا عبدالرحیم اشرف نے المنبر کا جو اداریہ لکھا تھا اس کا عنوان تھا "جماعتوں کا سفاک قاتل۔ استبداد"۔

اسی طرح مولانا اصلاحی صاحب کے بارے میں یہ باور کرنا غلط ہے کہ وہ ڈاکٹر اسرار احمد کے چکر میں آگئے۔ میاں صاحب کا فرض ہے کہ یا تو وہ اس الزام کو دلائل و شواہد سے ثابت کریں یا اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ و استغفار کریں تاکہ وہ آخرت میں اس بہتان تراشی کی پاداش میں سزا سے محفوظ رہیں۔

عربی کا ایک شعر ہے ؎

جراحات السنان لها التیام
ولا یلتام ما جرح اللسان

"تلوار وغیرہ کے زخم تو مندمل ہو سکتے ہیں لیکن زبان کے لگائے ہوئے زخم نہیں بھرے جا سکتے۔"

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ○○

(بشکریہ : پندرہ روزہ المنبر' ۲۱ مارچ ۱۹۹۶ء' فیصل آباد)

ضرورت رشتہ

۲۴ اور ۲۸ سالہ دو' دوشیزاؤں' لودھی خاندان' سنی مسلک' تعلیم بی۔ اے' نیک سیرت کے لئے دو برسرروزگار نوجوانوں کا رشتہ درکار ہے۔ ذات کی کوئی قید نہیں ہے۔

رابطہ : میجر ساجد یعقوب' ۱۳۔ انجینئر بٹالین گوجرانوالہ کینٹ' فون : ۲۶۹۵۱۷۵

☆ ☆ ☆

تنظیم اسلامی کے رفیق کی ہمشیرہ جن کی عمر ۳۲ سال' تعلیم بی۔ اے اور خط و کتابت کورس بعنوان قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی' امور خانہ داری میں ماہر کے لئے دینی ذہن رکھنے والے خاندان سے رشتہ مطلوب ہے۔

رابطہ : محمد نسیم الدین' فلیٹ نمبر ا' حق اسکوائر'
عقب اشفاق میموریل ہسپتال' یونیورسٹی روڈ' گلشن اقبال' کراچی

رفتارکار

سالانہ رپورٹ
تنظیم اسلامی بیرون پاکستان

(اکتوبر ۹۵ء تا اگست ۹۶ء)

—— مرتب : ڈاکٹر عبدالسمیع ' ناظم اعلیٰ بیرون پاکستان ——

تنظیم اسلامی کے اس شعبے کا دائرہ کار نارتھ امریکہ اور یورپ ہے اور اس میں یو ایس اے ' کینیڈا ' برطانیہ ' فرانس اور ناروے کے ممالک شامل ہیں۔ اس کا مرکزی نظم امیر محترم کو رپورٹ کرنے والے ایک ناظم اعلیٰ پر مشتمل ہے۔ اس کے تحت نارتھ امریکہ کا ایک حلقہ ' فرانس اور لندن کی دو تنظیمیں اور ناروے کا ایک اسرہ شامل ہے۔

عرصہ زیر رپورٹ کے دوران امیر تنظیم اور ناظم اعلیٰ کے امریکہ کے دو دو دورے ہوئے۔ امیر محترم کا پہلا دورۂ امریکہ ۲۳/ جنوری کا ۳/ مارچ ۹۶ء اور دوسرا ۱۹/ جولائی تا ۳/ دسمبر ۹۶ء تھا ' جبکہ اس خاکسار کا پہلا سفر دسمبر ۹۵ء اور دوسرا ۱۹/ مئی تا ۲۰/ اگست ۹۶ء ہوا۔

<u>امیر محترم کا پہلا دورۂ امریکہ (۲۳ جنوری ۹۶ء تا ۳ مارچ ۹۶ء)</u> : رمضان المبارک کے مہینے میں مسلم سینٹر آف نیویارک اور مسجد دارالقرآن لانگ آئی لینڈ کے دو مراکز کی دعوت پر امیر محترم ۲ رمضان کو نیویارک پہنچے۔ مسلم سینٹر میں دورۂ ترجمہ کا آغاز رمضان کی چوتھی شب سے ہوا اور ۲۰ ویں شب تک سورۃ النساء سے سورۃ الحجر تک کا ترجمہ مکمل ہوا۔ اوسط حاضری ۸۰ تا ۱۰۰ رہی۔ یاد رہے کہ سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران کا ترجمہ گزشتہ سال مکمل ہو گیا تھا۔ ۲۱ ویں شب طے شدہ پروگرام کے مطابق ترجمہ کا پروگرام Bay Shore کے مقام پر مسجد دارالقرآن میں منتقل ہوا۔ یہاں پر آخری دو پاروں کا ترجمہ مکمل ہوا۔ مسجد اگرچہ چھوٹی تھی لیکن پروگرام زیادہ کامیاب رہا۔ یہاں یہ ذکر مناسب ہے کہ جناب عاکف سعید صاحب ناظم مکتبہ تنظیم اسلامی پاکستان امریکہ کے پورے سفر میں امیر محترم کی معیت میں تھے اور دونوں مساجد میں دورۂ ترجمہ کے ساتھ تراویح انہوں نے ہی پڑھائی۔

نماز عید لانگ آئی لینڈ کے ایک مرکزی مقام Hungtington Town میں امیر محترم نے پڑھائی، جس کے ایک وسیع و عریض اور خوبصورت ہال میں نماز عید کا انتظام کیا گیا تھا۔ حاضری آٹھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ امیر محترم کے قیام کے دوران چھ جمعے آئے۔ انہوں نے تین جمعے تو مسلم سینٹر آف نیویارک ہی میں پڑھائے اور جہاد بالقرآن کو موضوع بنایا، جبکہ چوتھا جمعہ جو رمضان المبارک کا جمعۃ الوداع تھا دارالقرآن میں پڑھایا۔ شدید برف باری کے باوجود بہت رش تھا۔ پانچواں جمعہ امیر محترم نے مین ہیٹن میں پڑھایا اور چھٹا اور آخری جمعہ ٹریسٹن کی مسجد میں پڑھایا۔ اس پورے سفر کے دوران صرف دو خطاب اردو میں ہوئے ایک مسلم سینٹر اور دوسرا دارالقرآن میں۔

<u>امیر محترم کا دوسرا دورۂ امریکہ (۱۹ جولائی تا ۳ ستمبر ۹۶ء)</u> : اس سفر میں چونکہ پاکستان سے امیر محترم کے ہمراہ کوئی نہ جا سکا لہٰذا نیو جرسی کے ایک نوجوان رفیق الماں چوہدری اس پورے سفر میں امیر محترم کے خادم خاص کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہے، اللہ تعالیٰ موصوف کو اجر عطا فرمائے۔ امیر محترم نیویارک کو مرکز بنا کر پہلے شکاگو گئے، پھر وہیں سے کیلی فورنیا تشریف لے گئے۔ اس سفر کے دوران امیر محترم نے Sacremento اور Santakalara میں بھرپور پروگرام کئے، جس کے نتیجے میں دونوں مقامات پر علی الترتیب ۱۱ اور ۷ افراد تنظیم میں شامل ہوئے۔ آپ نے لاس اینجلس میں ہونے والے صوفی کنونشن میں بھی شرکت فرمائی۔ دوبارہ نیویارک آنے کے بعد آپ ہوسٹن (ٹیکساس) گئے۔ یہاں بھی تین نئے حضرات نے تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کی۔ ہوسٹن سے میمفس (ٹینی سی) گئے جہاں چار نئے رفقاء شامل ہوئے۔ واپس آکر امیر محترم نے چند روز نیویارک ہی میں قیام فرمایا۔ اس دوران آپ نے ۱۶/اگست کو مسلم سینٹر آف نیویارک میں خطبہ جمعہ دیا اور اسی شام "Response to the call of Allah" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ آپ نیو جرسی بھی تشریف لے گئے اور اس پورے قیام کے دوران محترم ڈاکٹر صاحب نے مختلف لوگوں سے ملاقات کی۔ اس کے بعد آپ ۳۱/اگست اور یکم ستمبر کو منعقد ہونے والے تنظیم اسلامی نارتھ امریکہ کی پہلی منتخب شوریٰ کے پہلے اجلاس کی صدارت کے لئے کولمبس (اوہائیو) تشریف لے گئے۔ کولمبس سے ہی بذریعہ سڑک آپ ڈیٹرائٹ بھی گئے اور وہاں پر تنظیمی امور نمٹائے۔

<u>ناظم اعلیٰ کا پہلا سفر</u> : اگست ستمبر ۹۵ء میں منعقد ہونے والے پہلے ٹینا کنونشن میں امیر محترم نے اعلان فرما دیا تھا کہ دسمبر کے آخری عشرے میں ایک تربیت گاہ منعقد ہوگی اور اس مقصد کے

لئے وہ راقم الحروف کو بطور خاص امریکہ بھیجیں گے۔ نیوجرسی کے شہر ٹرینٹن کی جامع مسجد کے Basement میں مجوزہ تربیت گاہ پروگرام کے مطابق ۲۴ تا ۳۱ دسمبر ۹۵ء منعقد ہوئی۔ اس تربیت گاہ میں مانٹریال کے چار اور کیلی فورنیا کے ایک رفیق سمیت کل ۳۰ رفقاء شریک ہوئے، جن میں سے ۲۰ رفقاء اجتماعی طور پر سات منٹ کی ڈرائیو پر ایک ہوٹل میں مقیم رہے۔ پروگرام نماز فجر سے شروع ہوتا۔ راقم خود فجر کی امامت کرواتا، بعدہ ۴۵ منٹ کا درس حدیث دیتا۔ اس میں اربعین نووی کی ۳۰ احادیث کا درس انگریزی زبان میں مکمل ہوا۔ ناشتے کے بعد ۸ بجے راقم منتخب نصاب نمبر۲ کا درس بزبان انگریزی دیتا۔ اس کے بعد معتمد ٹینا (Tina) جناب تنویر عظمت "منہج انقلاب نبوی" پر لیکچر دیتے۔ اس کے بعد متعین موضوعات پر لیکچر اور مطالعہ خاکسار کرواتا۔ عصر اور عشاء کے درمیان شرکاء تربیت گاہ نے "اسلام کی نشاۃ ثانیہ" امیر محترم اور Modern organization and its management محترم سراج الحق سید صاحب کے ویڈیوز کے ذریعے پڑھی۔ عشاء کی نماز کے بعد ایک Optional عربی کلاس بھی پڑھائی گئی جس کا دورانیہ اولاً تین گھنٹے اور بعدہ، ایک گھنٹہ رہا۔

<u>ناظم اعلیٰ کا دوسرا سفر</u>: محترم امیر تنظیم اسلامی کے حکم پر یہ ناچیز ۱۹ مئی کو نیویارک پہنچا، تین روز قیام کے بعد مانٹریال روانہ ہوگیا۔ مانٹریال میں ہفتہ بھر قیام کے دوران ایک خطبہ جمعہ اور دو خطابات ہوئے۔ واپس نیویارک آکر دو ماہ اور بائیس دن نیویارک کے Tristate ایریا ہی میں رہا۔ اس دوران اولاً مسلم سینٹر آف نیویارک میں ایک عربی کلاس صبح اور دوسری شام کو مکمل کی۔ بعد ازاں ایک کلاس دارالقرآن Bay Shore میں صبح کے وقت اور دوسرے جامع مسجد ویسٹ بری میں شام کے وقت پڑھائی۔ انگریزی میں پڑھائی گئی ایک عربی کلاس کے ویڈیوز بھی تیار کیے گئے۔ اس قیام کے دوران مین ہیٹن کی مسجد الرحمن اور وارن سٹریٹ نیویارک میں مسلم سینٹر، کی مسجد، ICNA سینٹر، مسجد فاطمہ، مسجد عابدین، لانگ آئی لینڈ میں دارالقرآن اور سیلڈن کی مساجد، نیوجرسی میں ٹرینٹن اور Kenerticut کی ایک مسجد میں خطابات جمعہ دیئے اور اس علاقے کی مختلف مساجد میں جہاں موقع ملا خطابات کیے۔ خطبات جمعہ اور خطابات کا موضوع اکثر و بیشتر اسلام کا معاشرتی نظام تھا۔ اسی قیام کے دوران Weekend یعنی ہفتہ اور اتوار کی چھٹیوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چار چار Weekends کی دو تربیت گاہیں رفقاء تنظیم اسلامی کی تربیت کی غرض سے منعقد کی گئیں، ان سے کل ۱۳ رفقاء نے استفادہ کیا۔ ان تربیت گاہوں میں منتخب نصاب نمبر۲ اور اربعین نووی کی کچھ احادیث کا

درس دیا گیا اور "اسلام کی نشاۃ ثانیہ" اور "اسلام کا انقلابی فکر" نامی کتابچوں اور تنظیم کے عقائد کا مطالعہ کروانے کے علاوہ کچھ موضوعات پر لیکچرز بھی دیئے گئے۔

لندن : امیر محترم پچھلے سال ستمبر میں برطانیہ تشریف لے گئے تھے اور وہاں دوبارہ نظم قائم فرمادیا تھا۔ ڈاکٹر عظیم اللہ خان صاحب کو امیر نامزد فرمایا تھا۔ سال زیر رپورٹ کے دوران امیر تنظیم کے لندن سے [illegible] اور معتمد کے صرف دو خط موصول ہوئے۔ وہاں تنظیم کی حالت تسلی بخش نہیں ہے۔ رفقاء کی صحیح تعداد بھی واضح نہیں ہے۔

پیرس : امیر حاجی محمد اشرف صاحب ہیں۔ رفقاء کی تعداد ۱۲ ہے۔ پیرس کے رفقاء نے جنوری میں ایک ہفت روزہ تربیت گاہ کا پروگرام بنایا تھا لیکن اولاً اسلام آباد اور ثانیاً نیویارک سے ویزا کے حصول میں راقم ناکامی کے باعث اس تربیت گاہ کا انعقاد نہ ہو سکا۔

ناروے : ناروے میں ہمارے تین رفیق ہیں جو اپنے نقیب جناب عبدالرحمٰن غوث صاحب کی رہنمائی میں مستعدی سے کام کر رہے ہیں۔

TINA : بیرون پاکستان تنظیم اسلامی کا سب سے بڑا نظم تنظیم اسلامی نارتھ امریکہ یعنی TINA کے نام سے ہے۔ اس حلقے کے امیر جناب محمد عطاء الرحمٰن صاحب ہیں جو شکاگو میں مقیم ہیں۔ اس حلقے میں آٹھ تنظیمیں اور چار اسرے ہیں۔

رفقاء کی کل تعداد : ۳۰ ستمبر ۹۵ء کو ۱۸۵ تھی۔ ۳۱/ اگست ۹۶ء کو ۲۵۲ ہے۔ ان میں سے ملتزم ۸۵ ہیں۔

MAKTABA STATISTICS (Oct. 1995 to Aug. 1996)

Country	No of Meesaq	No of Hikmat	No of Nida	No of Quranic Horizons	Sale Amount of Books	Sale Amount of Cassettes
U.S.A	704	606	1075	73	52475	60758
CANADA	288	140	313	85	13930	1500
U.K	299	130	315	21	32553	6700
FRANCE	45	28	88	x	135	1475
NORWAY	176	22	352	6	7110	1070

****

تنظیم اسلامی کا اکیسواں سالانہ اجتماع

۴/ تا ۶/ اکتوبر ۹۶ء

مرتب : محبوب الحق عاجز

تنظیموں اور تحریکوں کی زندگی میں اجتماعات بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کیونکہ ان اجتماعات میں ایک فکر' ایک نظریہ' ایک راستے اور ایک منزل کے مسافر اکٹھے ہو کر اپنی کارگزاری کا جائزہ لیتے ہیں اور اپنے ماضی کے گہرے تجزیئے اور حال کے جائزے کی روشنی میں اپنے مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے اجتماعات اور میل ملاپ کی اہمیت اور افادیت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ تنظیم اسلامی کو قائم ہوئے اکیس برس بیت چکے ہیں اور بائیسویں سال کے آغاز میں ۴' ۵' ۶/ اکتوبر ۹۶ء کو راولپنڈی میں تنظیم اسلامی کا اکیسواں سالانہ اجتماع منعقد ہوا۔ لیکن اس بار یہ اجتماع پنجاب کے حلقہ جات (ماسوائے جنوبی پنجاب کے) اور حلقہ آزاد کشمیر و حلقہ سرحد کے رفقاء پر مشتمل تھا۔ واضح رہے کہ حلقہ جات جنوبی پنجاب اور سندھ و بلوچستان کا سالانہ اجتماع ۲۲' ۲۳' ۲۴/ نومبر کو سکھر میں منعقد ہو گا۔

اس بار سالانہ اجتماع کی ایک خاص بات تو یہی تھی کہ اس میں پورے پاکستان کے رفقاء شریک نہ تھے' اور دوسرے یہ کہ یہ پہلا سالانہ اجتماع تھا جو بیرون لاہور کسی بڑے شہر میں منعقد ہوا۔ اجتماع کے لئے راولپنڈی کے مشہور زمانہ سیاسی اہمیت کے حامل "لیاقت باغ" کا انتخاب کیا گیا تھا۔ ناظم اجتماع محترم شمس الحق اعوان اور مقامی رفقائے تنظیم اسلامی کی انتھک محنت اور کوششوں سے اجتماع گاہ کے جملہ انتظامات احسن انداز میں مکمل کر لئے گئے تھے' لیکن رب حکیم کی حکمت کچھ اور تھی کہ اجتماع کے آغاز سے قبل دو راتیں موسلا دھار بارش ہوئی' جس کے نتیجے میں تمام تر انتظامات دھرے کے دھرے

رہ گئے اور جلسہ گاہ کی تمام زمین کیچڑ کی وجہ سے قابل استعمال نہ رہی۔ تاہم مقامی رفقاء کی محنت شاقہ کی بدولت متبادل انتظام کر لیا گیا تھا۔

سالانہ اجتماع کے لئے رفقائے تنظیم اسلامی اور معاونین تحریک خلافت کو "میثاق" اور "ندائے خلافت" میں اشتہارات کے ذریعے مطلع کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ قومی اخبارات کے ذریعے بھی اس کی پبلسٹی کی گئی تھی۔ چنانچہ ۳/۱ اکتوبر کی شام سے ہی پاکستان کے طول و عرض سے کارواں راولپنڈی کی طرف روانہ ہونے شروع ہو گئے تھے۔ لاہور کی تنظیموں کے اکثر رفقاء رات بارہ بجے والی ریل کار سے روانہ ہو کر نماز فجر سے قبل راولپنڈی پہنچے۔ اس طرح ۴/۱ اکتوبر کی صبح رفقاء کی آمد سے لیاقت باغ میں گہما گہمی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے باوجود کہ انتظامات کافی متاثر ہو چکے تھے' ناظم اجتماع جناب شمس الحق اعوان صاحب کی اللہ پر توکل اور استغناء کی کیفیت بڑی مسرور کن تھی جو لیاقت باغ کے گیٹ پر کھڑے خندہ پیشانی کے ساتھ خلافت کے پروانوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

اس اجتماع کی حیثیت بنیادی طور پر تو تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع کی تھی لیکن اس کا دوسرا اہم پہلو یہ تھا کہ اس موقع پر "احیاء خلافت کانفرنس" کا انعقاد بھی کیا گیا' جس کے پروگرام عمومی دلچسپی کے حامل تھے۔ اس کانفرنس کے تین اجلاس منعقد ہوئے' جن میں امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے دو جامع خطابات کے علاوہ مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے نمایاں اہل علم و دانش کی تقاریر و خطابات کے پروگرام شامل تھے۔

امیر محترم کا خطاب جمعہ

سالانہ اجتماع اور احیاء خلافت کانفرنس کا افتتاحی اجلاس امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے خطاب جمعہ پر مشتمل تھا' جس کا عنوان "عالمی خلافت کی نوید" تھا۔ اس خطاب جمعہ کی خصوصی طور پر بہت تشہیر کی گئی تھی اور پروگرام کے مطابق یہ لیاقت باغ میں تیار کی گئی جلسہ گاہ ہی میں ہونا تھا' لیکن جلسہ گاہ میں کیچڑ ہو جانے کے باعث اس کا

انتظام لیاقت ہال کے باہر پختہ فرش پر کیا گیا۔ رفقاء تنظیم کے علاوہ کثیر تعداد میں لوگ محترم ڈاکٹر صاحب کا خطاب سننے کے لئے آئے تھے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کی روشنی میں فرمایا کہ عنقریب دنیا میں کفر و اسلام کا فیصلہ کن معرکہ ہونے والا ہے جس کے نتیجے میں اسلام کو عالمی غلبہ حاصل ہو گا اور قیامت سے قبل پورے کرۂ ارضی پر نظام خلافت قائم ہو کر رہے گا۔ بعض روایات سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اس عمل کا آغاز سرزمین پاکستان اور افغانستان سے ہو گا جس کے واضح آثار اب نظر آنے لگے ہیں۔ لہٰذا اہل پاکستان کو خاص طور پر منظم ہو کر جہاد کی تیاری کرنی چاہئے۔ دینی جماعتوں کے کردار پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے محترم ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ان جماعتوں کے انتخابی راستے کو اختیار کرنے سے پاکستان میں نفاذ اسلام کی منزل مزید دور ہوتی جارہی ہے۔ عالمی حالات پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ موجودہ امریکی نیو ورلڈ آرڈر دراصل یہودی ورلڈ آرڈر ہے جس کا بنیادی مقصد دنیا میں اسلامی تحریکوں اور دینی قوتوں کو کچلنا اور مسلمانوں کو اپنے زیر نگیں کرنا ہے۔ وطن عزیز میں انتشار و بدامنی اور قتل و غارت کے واقعات کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ اس کے پیچھے یہودی سازش کارفرما ہے، جو فرقہ وارانہ شیعہ سنی تصادم کے ذریعے مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہودی پوری دنیا میں اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے عالم اسلام کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اب حق و باطل کے مابین آخری اور فیصلہ کن جنگ کے لئے سٹیج تیار ہو چکا ہے۔ انہوں نے اپنے اس گمان غالب کا اظہار بھی کیا کہ عالم عرب میں مہدی کی ولادت ہو چکی ہے اور ان کی قیادت میں کفر کے خلاف جنگ ہو گی جو اسلام کے عالمی غلبے پر منتج ہو گی۔ حدیث نبویؐ کے مطابق مہدی کی مدد کے لئے خراسان سے فوجیں روانہ ہوں گی --- اور دور نبویؐ کا خراسان آج کے ایران، افغانستان اور پاکستان کے کچھ علاقوں پر مشتمل ہے۔

امیر محترم کے خطاب جمعہ کے بعد مولانا مظفر حسین ندوی صاحب نے عربی خطبہ پڑھا اور نماز جمعہ کی امامت کرائی۔

خلافت کانفرنس کا دوسرا اجلاس

خلافت کانفرنس کا دوسرا اجلاس نماز مغرب کے بعد سیٹلائٹ ٹاؤن میں واقع جناب قاری خوشی محمد صاحب کی انٹرنیشنل قرآن اکیڈمی میں جنرل (ر) محمد حسین انصاری صاحب ناظم اعلیٰ تحریک خلافت پاکستان کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ حاضرین کی کثیر تعداد کے سامنے قرآن اکیڈمی کا وسیع ہال تنگی داماں کا نقشہ پیش کر رہا تھا اور حاضرین و سامعین کی ایک بڑی تعداد ہال کی سیڑھیوں پر' ہال کے باہر بچھائی گئی دریوں پر اور سڑک کے کنارے موجود تھی۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے مختصر خطبہ افتتاحیہ کے بعد مردان سے تشریف لائے ہوئے جماعت اسلامی کے راہنما مولانا گوہر رحمٰن صاحب' حیدر آباد سندھ سے ممتاز عالم دین مولانا وصی مظہر ندوی صاحب' اخوت اکیڈمی اسلام آباد کے ریسرچ ڈائریکٹر جناب اکبر ثاقب صاحب' لاہور سے مولانا خورشید احمد گنگوہی صاحب' تحریک اسلامی کے امیر مولانا مختار گل صاحب' ممتاز شیعہ راہنما سید ہادی علی نقوی صاحب اور نیویارک اور نیو جرسی کی مسلم تنظیموں کی مشترکہ کمیٹی کے ڈائریکٹر برائے علوم اسلامی جناب عمران این حسین صاحب نے باری باری خطاب فرمایا۔ آخر میں صدر مجلس جنرل (ر) ایم ایچ انصاری صاحب نے صدارتی خطاب فرمایا۔ (اختصار کے پیش نظر تمام مقررین حضرات کے صرف اسماء گرامی درج کئے گئے ہیں۔ ان کے خطابات کے اہم نکات احیاء خلافت کانفرنس کی رپورٹ میں شامل کئے جا رہے ہیں جو ہفت روزہ ندائے خلافت کی ۳/ نومبر کی اشاعت میں شائع کی جا رہی ہے۔) خلافت کانفرنس کا یہ دوسرا اجلاس رات گئے اجتماعی دعا کے ساتھ اختتام کو پہنچا جس کے بعد رفقاء تنظیم واپس لیاقت باغ پہنچے۔ رہائش کے لئے متبادل انتظام قریب ہی ایک زیر تعمیر پلازا میں کیا گیا تھا۔ چنانچہ نماز عشاء اور کھانے سے فراغت کے بعد تمام رفقاء اپنی رہائش گاہوں میں پہنچ گئے۔

سالانہ اجتماع کا دوسرا روز

اگلے روز یعنی ۵/ اکتوبر کی صبح نماز فجر اسی پلازا کے کشادہ بیسمنٹ میں ادا کی گئی۔ نماز کے بعد حلقہ گوجرانوالہ ڈویژن کے ناظم جناب شاہد اسلم نے قرآن حکیم کا درس دیا۔

اس کے بعد ناشتہ اور دوسری ضروریات کے لئے وقفہ تھا۔ سوا نو بجے اسی جگہ سالانہ اجتماع کی اگلی نشست کا آغاز ہوا۔ پروگرام کے مطابق پہلے سالانہ رپورٹس کے اہم نکات پیش کئے گئے۔ نائب امیر ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے مرکزی رپورٹ کی Highlights پیش کیں اور ناظم اعلیٰ جناب عبدالرزاق صاحب نے سالانہ کارکردگی رپورٹ کے اہم حصے پیش کئے، جس میں تنظیم اسلامی کے شعبہ نشرو اشاعت کی رپورٹ بھی شامل تھی۔ بعد ازاں تربیتی نظام پر مشتمل رپورٹ ناظم تربیت جناب رحمت اللہ بٹر صاحب نے، جبکہ حلقہ خواتین کی رپورٹ حافظ عاکف سعید صاحب نے پیش کی۔ تنظیم اسلامی بیرون پاکستان کی رپورٹ ناظم اعلیٰ برائے بیرون پاکستان ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے پیش کی۔

خطاب جناب مختار حسین فاروقی صاحب : دوسرے مرحلے میں تنظیم اسلامی کے علاقائی قائدین کے مختلف موضوعات پر خطاب ہوئے۔ سب سے پہلے حلقہ جنوبی پنجاب کے امیر انجینئر مختار حسین فاروقی صاحب نے "دین اور مذہب کا فرق" کے موضوع پر انتہائی مدلل اور پر مغز گفتگو کی۔

خالد محمود عباسی صاحب : اگلے مقرر حلقہ آزاد کشمیر کے ناظم خالد محمود عباسی تھے۔ ان کی تقریر کا موضوع "اسلام اور تہذیب جدید کے افکار" تھا۔ انہوں نے کہا کہ آج تہذیب مغرب کے متعلق ہماری عمومی رائے یہ ہے کہ یہ غیر فطری، غیر قرآنی اور کافرانہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ایسا ہی ہے تو اس تہذیب نے ترقی کیونکر کرلی؟ جبکہ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کے بغیر دنیا میں کہیں بھی ترقی ممکن نہیں۔ انہوں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ بلاشبہ یہ تہذیب مشرکانہ اور خرابیوں سے بھرپور ہے، لیکن اس کی کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بطن البطون میں خالص قرآنی فکر کارفرما ہے، جو انسانی مساوات، انسانی حقوق اور حصول دولت کے یکساں مواقع کے اسلامی اور قرآنی تصورات سے عبارت ہے۔ جناب خالد عباسی نے کہا کہ اس تہذیب کے بھیانک نتائج کی وجہ صرف یہ ہے کہ شیطان نے انسان کو جنسی خواہش کی تکمیل کے ناجائز اور غلط راستوں

پر ڈال دیا ہے۔ انسانیت کو شیطان کے شکنجے سے نکالنے کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیا کے کسی ایک خطے پر اسلام کا نظام عدل اجتماعی قائم کیا جائے جو پوری دنیا کے لئے مشعل راہ ہو۔ اس کا اولین تقاضا ایک زبردست علمی تحریک برپا کرنا ہے۔

ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب : خالد محمود عباسی کے خطاب کے بعد ناظم اعلیٰ برائے بیرون پاکستان ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کا خطاب تھا۔ آپ کا موضوع "اسلام کا معاشرتی نظام" تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف فرمارہے تھے کہ اسلام میں معاشرتی نظام کے ضمن میں پہلی چیز مساوات کا تصور ہے لیکن اس میں "عدل" کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ عدل سے مراد محض عدالتی عدل ہی نہیں بلکہ پوری زندگی میں اعتدال و توازن ہے۔ اور یہ توازن باہمی رشتوں میں بھی قائم کیا گیا ہے۔ دیکھئے، والدین کے حقوق کے سلسلہ میں قرآن نے ان سے حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور بڑھاپے کی عمر میں انہیں اف تک کہنے سے سختی کے ساتھ روکا ہے اور یہ عین تعلیم عدل ہے۔ اس لئے کہ جب بچہ بیمار ہوتا ہے والدین تڑپتے ہیں، وہ اس کی خوراک اور تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے ہیں۔ اور اس میں بھی والدہ کا حق زیادہ رکھا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کی ولادت میں زیادہ رول اسی کا ہوتا ہے۔ اولاد کے حقوق کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالسمیع نے کہا کہ چونکہ اولاد کی پرورش اور تربیت ہر جاندار کی جبلت میں شامل ہے لہٰذا قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

شوہر اور بیوی کے مقام و مرتبے پر گفتگو کرتے ہوئے جناب عبدالسمیع صاحب کہہ رہے تھے کہ اگرچہ انسان ہونے کے ناطے دونوں برابر ہیں لیکن جیسے انتظام چلانے کے لئے ہر ادارہ میں ایک مینیجر ہوتا ہے، اسی طرح خاندان کے ادارے کا سربراہ مرد ہوتا ہے، اسی لئے اسے قرآن میں "قوام" کہا گیا ہے۔ اس حیثیت سے اہل خانہ پر اس کی اطاعت لازم ہے۔ لیکن جس طرح ہر اچھا مینیجر اچھی پیداوار تیار کرتا ہے اسی طرح سربراہ خاندان بھی اچھی تربیت کے ذریعے اچھی اولاد کو پروان چڑھاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بدقسمتی سے اہل مغرب نے ہر ادارے میں ڈسپلن کے لئے سربراہ ادارہ کو ضروری قرار دیا ہے لیکن خاندان جیسے اہم ادارے کو اس سے مستثنیٰ رکھا ہے۔

وارث خان صاحب : وارث خان صاحب تنظیم اسلامی پشاور کے امیر ہیں۔ آپ کا

موضوع گفتگو "اسلام کا سیاسی نظام" تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس میں انفرادیت اور اجتماعیت کے متعلق جامع احکامات دیئے گئے ہیں۔ اسی لئے قرآن حکیم میں کہا گیا ہے کہ دین کی تکمیل ہو گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بدقسمتی سے کچھ لوگوں نے تصور دین کو محض عبادات، رسومات اور معاملات تک محدود کر لیا ہے اور اسلام کا سیاسی پہلو ان کے ذہنوں میں موجود نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کے صرف جامع اصول دیئے گئے ہیں تفصیلی احکام نہیں۔ موجودہ جمہوریت اور خلافت کا موازنہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ جمہوریت میں حاکمیت عوام کی ہوتی ہے جبکہ خلافت میں حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی تسلیم کی جاتی ہے اور عوام اللہ کے خلیفہ ہیں۔ اس لئے اکیاون فی صد کی اکثریت تو کیا سو فیصد بھی اللہ کے حکم کے خلاف قانون نہیں بنا سکتے۔ نیز یہ نظام شورائی ہوتا ہے۔ جناب وارث خان فرما رہے تھے کہ ہم لوگوں کے سامنے اسلام کے سیاسی نظام کو پیش نہیں کر سکے۔ لہٰذا آج ضرورت اس بات کی ہے کہ نظام خلافت اور اس کی برکات کو عام کیا جائے اور جمہوریت کے تصور کی نفی کی جائے۔

چوہدری رحمت اللہ بٹر صاحب : پروگرام کے آخری مقرر مرکزی ناظم تربیت چوہدری رحمت اللہ بٹر تھے۔ انہوں نے "اخلاص نیت اور اتباع سنت" کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ انسانی اعمال دو چیزوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان میں پہلی چیز ارادہ اور دوسری عمل کا ڈھانچہ ہے۔ دین میں ایمان کا تعلق ارادہ سے اور عمل کا سنت سے ہے۔ انہوں نے کہا کہ انسان کا اللہ پر ایمان جتنا پختہ ہو گا، اتنا ہی خلوص پیدا ہو گا اور جتنا نبی ﷺ سے لگاؤ اور محبت ہو گی اتنا ہی عمل سنت سے قریب تر ہوتا چلا جائے گا۔ یہ سوال کہ عمل ڈھانچہ کیا ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ عمل کے لئے قالب اور ڈھانچہ سنت نبیؐ ہے اور تمام انبیاء کو بھیجا ہی اس لئے گیا تھا کہ ان کی اطاعت کی جائے۔ نبی ﷺ کی اطاعت محبت خداوندی کا وسیلہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب ہم سنت رسول کے راستے کو اختیار کر لیں گے تب ہی ہمارا ہر عمل اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہو گا اور سنت کے راستے کے علاوہ نیا کام بدعت اور گمراہی ہے۔

رحمت اللہ بٹر صاحب کے خطاب کے بعد نائب امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر

عبدالخالق کو "پاکستان کی مروجہ سیاست اور تنظیم اسلامی" کے حوالے سے خطاب کرنا تھا' لیکن ایک بج چکا تھا' اس لئے ان کے خطاب کو منسوخ کرنا پڑا۔ پروگرام کے اختتام پر نماز ظہر ادا کی گئی اور اس کے بعد رفقاء نے لیاقت باغ میں طعام گاہ میں کھانا کھایا۔ اس کے بعد عصر تک وقفہ تھا۔

عصر سے مغرب کے درمیان کا وقت بیرون ملک سے آئے ہوئے رفقاء کے تعارف کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔

خلافت کانفرنس کا تیسرا اجلاس

نماز مغرب کے بعد احیاء خلافت کانفرنس کا تیسرا اجلاس لیاقت ہال کے باہر پختہ فرش پر منعقد ہوا جہاں گزشتہ روز نماز جمعہ ادا کی گئی تھی۔ اس جگہ پر شامیانے لگا کر اسے باقاعدہ اجتماع گاہ کی صورت دے دی گئی تھی۔ یہ اجلاس امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خطاب پر مشتمل تھا۔ اپنے اصل موضوع پر گفتگو سے قبل محترم ڈاکٹر صاحب نے گزشتہ روز کے خطاب جمعہ سے متعلق بعض تشنہ امور کی وضاحت فرمائی اور پھر گزشتہ رات خلافت کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں ہونے والے مختلف مقررین کے خطابات کے حوالے سے کچھ گفتگو کی اور مقررین حضرات کے بعض خیالات سے اپنے اختلاف کو واضح کیا۔ بعد ازاں محترم ڈاکٹر صاحب نے آج کے موضوع "نظام خلافت کے قیام کا مسنون طریق کار" پر مفصل گفتگو فرمائی۔۔۔ (محترم ڈاکٹر صاحب کے اس خطاب کی قدرے مفصل رپورٹنگ ندائے خلافت کے حالیہ شمارے میں ملاحظہ فرمائی جائے) آج کے اجلاس کے صدر مجلس امیر تنظیم اسلامی آزاد کشمیر مولانا مظفر حسین ندوی تھے' جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کے خطاب کے بعد صدارتی خطاب فرمایا۔

سالانہ اجتماع کا تیسرا روز

اتوار ۶/ اکتوبر کی صبح نماز فجر لیاقت باغ میں اجتماع گاہ میں ادا کی گئی۔ نماز کی امامت امیر محترم نے خود فرمائی۔ نماز کے بعد تجمل حسن میر صاحب نے درس قرآن دیا۔ اس کے

بعد ناشتہ وغیرہ کے لئے وقفہ تھا۔

ساڑھے نو بجے خلافت کانفرنس کا چوتھا اجلاس شروع ہوا جس کی حیثیت سوال و جواب کی نشست کی تھی۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے حاضرین کی طرف سے پوچھے گئے سوالات کے مفصل جواب ارشاد فرمائے۔

اختتامی خطاب امیر محترم

سالانہ اجتماع کے جملہ پروگراموں کے خاتمے پر امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کا اختتامی خطاب تھا، جو ساڑھے گیارہ بجے شروع ہوا۔ امیر محترم فرما رہے تھے کہ اگرچہ بارش کی وجہ سے انتظامات میں کافی خلل پڑا ہے لیکن اس پر پریشان نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اتنی مشکلات کے باوجود ہمارا یہ پروگرام پایہ تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔ یہ خاص اللہ کا فضل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ اگرچہ میری جسمانی صحت جواب دے رہی ہے لیکن میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک ذہنی صلاحیت موجود ہے کام جاری رکھوں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں اختتامی خطاب میں اپنے رفقاء کو قرآنی آیات کے تحفے دیا کرتا ہوں، آج بھی مجھے چار تحفے دینے ہیں۔

پہلی چیز سورۃ المائدہ کی آیت ۱۰۵ (یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ، لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ) کے حوالے سے یہ ہے کہ انسان پر اصل ذمہ داری اپنی ذات کی ہے۔ دوسروں کو ہدایت پر لے آنا ہمارا فریضہ نہیں، البتہ دوسروں کو دین کی راہنمائی کے ضمن میں تن من دھن لگا دینا ہم پر فرض ہے۔ لہٰذا اس سعی وجہد اور انفاق مال میں کمی نہیں ہونی چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اس کام کے حوالے سے شیطان انسان کو دھوکہ دیتا ہے کہ مجھ میں صلاحیت کم ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو بہت صلاحیت دے رکھی ہے لیکن وہ اسے دین کی بجائے دنیا کے لئے استعمال کرتا ہے۔ دنیا میں انسان نفسانفسی اور خود غرضی کا مظاہرہ کرتے ہیں، لیکن اس "خود غرضی" کا ظہور دین کے معاملے میں اس طرح ہونا چاہئے کہ انسان کہے کہ کم از کم "میں" آخرت میں کامیاب ہو جاؤں۔

ڈاکٹر اسرار احمد فرما رہے تھے کہ دوسری چیز سورۃ التحریم کی آیت "قُوا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيكُمْ نَارًا" کے حوالے سے ہم پر اپنے اہل خانہ، اولاد، باپ، بھائی وغیرہ کی ذمہ داری ہے۔ اگر ہم خلوص کے ساتھ دین پر عمل پیرا ہیں تو ممکن ہی نہیں کہ ہم ان کے لئے بھی بھلائی نہ چاہیں۔ اس لئے کہ آگ میں اگر حرارت ہے تو محسوس ہو جائے گی اور اگر حرارت نہیں ہے تو وہ آگ نہیں بلکہ محض آگ کی صورت ہے۔ اسی بات کو منفی اسلوب سے واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اگر کوششوں کے باوجود اہل خانہ سیدھے راستے پر نہ آئیں تو ان سے کٹ جانا ضروری ہے، لیکن اس کا مطلب گالم گلوچ نہیں بلکہ ایسا طرز عمل اختیار کرنا ہے جس سے انہیں معلوم ہو جائے کہ ہمارے دل میں ان کی محبت نہیں ہے۔ ورنہ اگر غلط طور اطوار کے باوجود ان سے ہماری محبتیں قائم رہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل میں اللہ کی حمیت نہیں ہے یا اہل خانہ کی محبت اللہ سے زیادہ ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بنی اسرائیل کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ بنی اسرائیل کے علماء لوگوں کو برائیوں سے روکا تو کرتے تھے لیکن جب لوگ باز نہیں آتے تھے تب بھی وہ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا جاری رکھتے تھے، نتیجتاً ان کا طرز عمل بھی انہی کی طرح ہو جاتا۔ اب وہ اللہ سے دعائیں کرتے لیکن دعائیں قبول نہیں ہوتی تھیں۔ اگر ہمارا بھی یہی طرز عمل رہا تو ہم بھی دوسرے لوگوں کے رنگ میں رنگتے چلے جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اسی طرح کفر کے نظام کا ساتھی بننا اور اس کی نوکری کرنا بھی اللہ سے دشمنی ہے۔ اس کی رعایت ضرور رکھی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص اس احساس کے تحت جیسے ایک مضطر کے لئے خنزیر کھانا جائز ہے، نوکری کرتا ہے تو صحیح ہے، لیکن اس رزق اور کمائی کو "حَلٰلًا طَيِّبًا" سمجھتے ہوئے ساری توانائیاں اسی میں کھپا دینا کسی طور صحیح نہیں ہے۔

امیر تنظیم فرما رہے تھے کہ تیسری چیز یہ ہے کہ اللہ نے جو ہدایت دی ہے، اس پونجی کے کھو جانے کا خطرہ ہر وقت دامن گیر رہتا ہے۔ والدین، اہل خانہ اور دوست احباب بڑی "خیر خواہی" سے انسان کو دین سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا اسے مضبوطی

(باقی صفحہ ۸۸ پر)

امیر تنظیم اسلامی کا

چھ روزہ دورۂ ایران

(۱۶/ تا ۲۳/ اکتوبر ۹۶ء)

——— از قلم : ڈاکٹر عبدالخالق ———

گزشتہ سال (۱۹۹۵ء) نومبر میں جماعت اسلامی کے سالانہ اجتماع میں شرکت کی خاطر آیت اللہ واعظ زادہ خراسانی (رئیس المجمع العالمی للتقریب بین المذاھب الاسلامیہ) جب پاکستان تشریف لائے تو امیر تنظیم اسلامی و صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور محترم ڈاکٹر اسرار احمد سے ملاقات کے لئے قرآن اکیڈمی بھی تشریف لائے۔ امیر محترم نے انہیں دعوت دی کہ وہ قرآن کالج میں طلبہ سے خطاب فرمائیں۔ اپنے اس خطاب میں انہوں نے جو باتیں فرمائیں وہ کافی حد امیر محترم کی ان باتوں سے مماثلت رکھتی تھیں جو وہ شیعہ سنی مفاہمت کی ٹھوس اور مؤثر اساس کے حوالے سے قبل ازیں بیان فرما چکے تھے۔ چنانچہ ع "متفق گردید رائے بوعلی با رائے من" کے مصداق امیر محترم کی ان سے ذاتی دلچسپی قدرتی امر تھا۔ دوسری جانب جناب آیت اللہ واعظ زادہ بھی اس دلچسپی کو محسوس کر رہے تھے لہٰذا یہی دراصل امیر محترم کے موجودہ دورۂ ایران کا اصل سبب بنا۔ ورنہ تو اس سے قبل بھی متعدد بار مختلف فنکشن یا سیمیناروں میں شرکت کے حوالے سے دورۂ ایران کی دعوت مل چکی تھی، لیکن امیر محترم نے ہر بار یہی فرمایا کہ میں اس قسم کی محافل کا آدمی نہیں ہوں، مجھے تو آپ کبھی شخصی اور انفرادی حیثیت سے انقلاب ایران کے بعد کے "ایران" کو دیکھنے کی دعوت دیں گے تو جاؤں گا۔

چنانچہ اسی قسم کی دعوت پر ایک ہفتہ کا یہ دورہ طے ہوا۔ امیر محترم کے ہمراہ ہم تین افراد تھے۔ راقم الحروف، ڈاکٹر نجیب الرحمن جو تنظیم اسلامی کے دیرینہ رفیق ہیں اور آجکل اگرچہ ملائشیا میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں لیکن ۱۳ سال تک ایران میں رہے ہیں۔ انہوں نے قبل از انقلاب اور بعد از انقلاب کے ایران کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، فارسی میں بے

تکلف [illegible] ہیں۔ ابھی دو روز قبل ہی ملائشیا سے پاکستان چھٹی گزارنے آئے تھے کہ امیر محترم کے [illegible] پر ہمارے ساتھ ہو لئے۔ تیسرے ہم سفر عزیزم رشید ارشد (جناب اقتدار احمد مرحوم کے سب سے چھوٹے بیٹے) تھے' جو اپنے ذاتی خرچ پر اس مختصر قافلے میں شریک ہوئے تھے۔

۱۶/اکتوبر کو چار افراد کا یہ قافلہ کراچی سے ایرانی ایئرلائن کی فلائٹ سے مقامی وقت کے مطابق ۵ بجے شام روانہ ہوا۔ کسی بھی ملک کی ثقافت کو سمجھنے کے لئے اس ملک کی ایئرلائن کا سفر ابتدائی تعارف کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایرانی ایئرلائن میں عورتوں کو سکارف اوڑھنے کی ترغیب دلائی جاتی ہے اور اس کی "میزبان خواتین" (ایئر ہوسٹس) ان کے تصورات کے مطابق حجاب میں ہوتی ہیں' جس میں چہرے کی ٹکیہ اور ہاتھ کے علاوہ جسم پوری طرح سے ڈھکا ہوتا ہے اور وہ ایئر ہوسٹس کی بجائے "راہبائیں" نظر آتی ہیں۔ تین گھنٹے کی فلائٹ کے بعد ایران کے مقامی وقت کے مطابق (جو پاکستان کے وقت سے ڈیڑھ گھنٹہ پیچھے ہے) ساڑھے چھ بجے ہم تہران کے مہر آباد ایئرپورٹ پر اتر گئے' جہاں ہوائی جہاز کی سیڑھیوں ہی پر عبدالحمید طالبی استقبال کے لئے موجود تھے۔ یہ نوجوان اس ادارے میں ملازم ہیں جس نے ہمیں مدعو کیا تھا۔ ایران میں ہماری مصروفیات کا پروگرام انہی کے حوالے تھا۔ ہمیں V.I.P. لاؤنج لے جایا گیا جہاں دو مزید افراد ابوالقاسم اور حجتہ الاسلام غفاری استقبال کے لئے موجود تھے۔ سامان کی وصولی میں کافی وقت لگ گیا' محسوس ہوا کہ اس لحاظ سے ایرانی ایئرلائن بھی پاکستانی ایئرلائن جیسی ہی ہے۔ سامان کے انتظار کے دوران غفاری صاحب سے گفتگو جاری رہی۔ موصوف خاصی انگریزی بول لیتے ہیں اور اس سے قبل بعض ممالک میں سفیر کے عہدہ پر بھی فائز رہے ہیں (ایران میں علماء فارسی اور عربی پر تو کافی دسترس رکھتے ہیں لیکن انگریزی شاذ ہی کوئی سمجھ یا بول سکتا ہے) امیر محترم نے ان کے سامنے اپنے دورۂ ایران کا پس منظر بیان کیا' نیز بین الاقوامی حالات کے تناظر میں شیعہ سنی مفاہمت کی اہمیت اور اس کے لئے ٹھوس اور موثر اساس پر اپنا موقف بیان کیا۔ امیر محترم اگرچہ کافی تھک چکے تھے لیکن سامان کی آمد کا انتظار ایک مجبوری تھا۔ خدا خدا کر کے ایئرپورٹ سے روانہ ہوئے اور قریباً پینتالیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد ہوٹل آزادی پہنچے جس کی کل چھتیس منزلوں میں سے انیسویں منزل پر ہمیں ایک ہفتہ رہنا تھا۔ ہم تو ذہناً اس کے لئے بھی تیار تھے کہ ایک ہی کمرے میں گزارہ کر لیں لیکن یہ ہمارے میزبانوں کو گوارا نہ ہوا اور انہوں نے امیر محترم کو ایک بڑا کمرہ علیحدہ دیا۔ البتہ باوجود مطالبے کے ہمیں ہماری مصروفیات کے بارے میں

کوئی ٹائم ٹیبل نہیں دیا گیا' صرف اتنا بتایا گیا کہ صبح ساڑھے آٹھ بجے تیار رہئے گا۔

۱۷/اکتوبر صبح ۹ بجے آیت اللہ تسخیری صاحب سے ملاقات تھی۔ موصوف رئیس ثقافت و علاقات اسلامیہ ہیں۔ اور ہمارا میزبان ادارہ "المجمع العالمی للتقریب بین المذاهب الاسلامیہ" انہی کے ماتحت کام کرتا ہے۔ ان سے یہ ملاقات کوئی پون گھنٹے تک جاری رہی۔ جناب آیت اللہ نے فارسی زبان میں گفتگو کی جس کے اکثر مفہوم کو امیر محترم نے سمجھ لیا اور پھر اپنی گفتگو میں جو انگریزی زبان میں ہوئی اس کا جواب دیا۔ آیت اللہ تسخیری بہت ہی خندہ پیشانی سے ملے۔ موصوف کے چہرے پر ہروقت مسکراہٹ رہتی ہے جس نے ان کی شخصیت کو بہت دل آویز بنا رکھا ہے۔ امیر محترم نے یہاں بھی شیعہ سنی مفاہمت کے حوالے سے اپنی تجاویز کا اعادہ کیا۔ آیت اللہ تسخیری نے انقلاب ایران کا ایک واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ ایرانی فوجیوں کو انقلابیوں کا ایک ایک ہجوم منتشر کرنے کے لئے ٹینک دے کر روانہ کیا گیا۔ جب شاہ کے ٹینک جلوس کے قریب پہنچے تو مظاہرین کے رہنما نے لوگوں کو اللہ کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ اب سپاہی ٹینک چھوڑ کر کھڑے ہو گئے کہ اس صورت حال میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ (نیشنل آرمی اپنے عوام پر ناروا ظلم نہیں کر سکتی۔ گویا یہ واقعہ اس کا ثبوت تھا)۔ جناب آیت اللہ تسخیری نے ایک قرآنی آیت کا خوبصورت فریم امیر محترم کو ہدیتاً پیش کیا۔ جواباً امیر محترم نے انہیں اپنی انگریزی و فارسی کتب کا سیٹ ہدیہ کیا۔

یہاں سے فارغ ہو کر ہمیں "مرکز دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی" لے جایا گیا۔ اس ادارے کے تحت اسلامی انسائیکلو پیڈیا کی تیاری کا کام جاری ہے۔ یہ فارسی زبان میں ہے۔ ۳۰۰ سکالر اس کام کو سرانجام دے رہے ہیں۔ اب تک اس کی ۱۹ جلدیں چھپ چکی ہیں' ساتھ ساتھ اس کا عربی ترجمہ بھی ہو رہا ہے جس کی چھ جلدیں چھپ چکی ہیں۔ عربی زبان کی پہلی دو جلدیں امیر محترم کو ہدیتاً پیش کی گئیں۔ اس ادارے کی اپنی لائبریری ہے جس میں ۳۵ ہزار کتابیں موجود ہیں۔ اس ادارے کے سربراہ ڈاکٹر بجنوردی ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنے ادارے کا تفصیلی تعارف کروایا۔ اس ادارے کے تحت ہر سال ایک جلد ۷۶۰ صفحات پر مشتمل انسائیکلو پیڈیا کی تیار ہو رہی ہے۔

امیر محترم نے اس انسائیکلو پیڈیا کے اردو زبان میں ترجمہ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ پوری دنیا کی ۱۲۰ کروڑ مسلمان آبادی میں سے ۴۰ کروڑ کے قریب آبادی برعظیم پاک و ہند میں بستی ہے جو تقریباً سب کی سب اردو زبان سمجھتی ہے' لہٰذا اس انسائیکلو پیڈیا کا اردو ترجمہ

بہت مفید رہے گا اور بڑی تعداد میں مسلمان اس سے استفادہ کر سکیں گے۔ ڈاکٹر موصوف نے بتایا کہ ایرانی حکومت نے فلسطین کے بارے میں ایک خصوصی انسائیکلوپیڈیا ترتیب دینے کا منصوبہ بنایا ہے۔

ڈاکٹر بجنوردی بہت اہم شخصیت ہیں۔ ان کے والد آیت اللہ عضروی "مرجع" تھے۔ ڈاکٹر موصوف خود سیاسی شخصیت رہے ہیں۔ شاہ کے زمانے میں انہوں نے ۱۴ سال قید میں گزارے۔ یہ ملائی اسلامی پارٹی کے صدر تھے۔ اس پارٹی کے کئی رہنما موجودہ حکومت میں وزیر ہیں۔ انقلاب ایران کے بعد ڈاکٹر موصوف اصفہان کے گورنر رہے۔ انہیں وزیر اعظم بھی نامزد کیا گیا لیکن انہوں نے اپنی خدمات اس ادارے کے لئے وقف کر دیں اور تحقیقی کام کو ترجیح دی۔

ظہر کے وقت ہم ہوٹل پہنچ گئے۔ امیر محترم نے ہوٹل میں آرام کیا، لیکن ہمارا ارادہ تھا کہ ہم اپنے طور پر بھی کچھ گھومیں پھریں تا کہ کچھ معلومات آزادانہ طور پر بھی حاصل ہوں، لیکن مجبوری یہ تھی کہ ہمیں جس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا وہ مرکز شہر سے ۱۵ کلومیٹر دور تھا اور کوئی براہ راست پبلک ٹرانسپورٹ بھی ادھر نہیں آتی تھی۔ چنانچہ سرکاری انتظام میں ہی سہ پہر ہم نے شہر کا چکر لگایا۔ تہران شہر خوب صاف ستھرا ہے۔ فٹ پاتھ واقعتاً پیدل چلنے والوں کے لئے ہی استعمال ہوتے ہیں۔ شہر میں خوب چہل پہل تھی۔ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعداد قریباً برابر ہی کی ہوتی ہے گویا عورت مرد کے شانہ بشانہ کام کرتی ہے لیکن "حجاب" میں (ایرانی تصور کے مطابق)۔ کسی بھی عورت کو ہم نے حجاب کے بغیر نہیں دیکھا۔ انقلاب کے بعد معاشرتی سطح پر یہ تبدیلی بہت نمایاں ہے، البتہ معاشی سطح پر کوئی بڑی تبدیلی نہیں آسکی۔ مہنگائی بہت زیادہ ہے اور عوام الناس اس سے خاصے پریشان ہیں۔ گویا اگر یوں کہا جائے کہ انقلاب کے بعد، ان کے اسلامی تصورات کے مطابق ہی سہی، یہ کہا جا سکتا ہے کہ کچھ پابندیاں تو لگ گئی ہیں لیکن لوگوں کی معاشی حالت بہتر ہونے کی بجائے دگرگوں ہو گئی ہے۔ اگرچہ اس معاشی ابتری کا بڑا سبب آٹھ سالہ ایران عراق جنگ کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو عوام کو بنیادی ضروریات کی بہ سہولت فراہمی حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس سے لمبے عرصے تک صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے ہی اسباب Counter Revolution کا باعث بن جایا کرتے ہیں، اگرچہ، بحمد اللہ، اس کے کم از کم فی الحال ایران میں کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

ہم نے کچھ خریداری بھی کی۔ رقم کا حساب کرنا نسبتاً آسان تھا، ایک روپے کے ۱۰ تمن

اور ۱۰ تمن کے ۱۰۰ ریال گویا ۱۰۰ روپے کے مساوی ادائگی کے لئے دس ہزار ریال ادا کرنے پڑتے۔ روپوں کے ریال حاصل کر کے جیب ایک دفعہ تو خوب بھاری ہو جاتی لیکن پھر ہلکی بھی اسی سرعت سے ہوتی۔ ایک عام سویٹر کی قیمت قریباً چالیس ہزار ریال ہے۔

۱۸/ اکتوبر ہمیں انقلاب ایران کے رہنما آیت اللہ خمینی کے مقبرے پر لے جایا گیا۔ یہ تہران سے قریباً ۱۵ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ عمارت باہر سے بہت خوبصورت لیکن اندر سے سادہ ہے، شاید اس لئے کہ ابھی زیر تعمیر ہے۔ مقبرے کے ساتھ ایک بہت بڑا کمپلکس بنایا گیا ہے جس میں ایک دانش گاہ (یونیورسٹی) اور ایک لائبریری بنانے کا منصوبہ ہے۔ اگرچہ تعطیل کا روز تھا لیکن لوگوں کی کوئی بڑی تعداد ہم نے وہاں نہیں پائی۔ لوگ قبر کے پاس جا کر دعائیہ کلمات ادا کرتے۔ بظاہر کسی قسم کی شرکیہ حرکات بھی ہم نے نہیں دیکھیں۔ مقبرے کے باہر ایک بہت بڑے سائن بورڈ کے دو اطراف مرحوم آیت اللہ خمینی کے یہ اقوال درج تھے :

"ماتا آخرین نفس تاآخرین منزل و آخرین قطره خون برای اعلاء کلمة الله ایستاده ایم"۔ "من در میان شما باشم یا نباشم به همه شما وصیت و سفارش میکنم که نگذارید انقلاب بدست نا اهلان و نامحرامان بفید"۔ یعنی: "ہم اپنے آخری سانس، آخری منزل، اور آخری قطرۂ خون تک اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے لئے کھڑے رہیں گے!" اور "میں تمہارے درمیان موجود رہوں یا نہ رہوں لیکن سب کو وصیت اور تاکید کرتا ہوں کہ انقلاب کو نااہل اور ناواقف لوگوں کے حوالے نہ کر دینا!"

آج جمعہ کا روز تھا۔ پورے تہران میں صرف ایک جگہ یونیورسٹی گراؤنڈ آزادی چوک میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے۔ جس میں وہاں کے لوگوں کے قول کے مطابق تو ۱۰ لاکھ کے قریب افراد نماز جمعہ ادا کرتے ہیں جو وسیع گراؤنڈ کے علاوہ آس پاس کی سڑکوں اور گلیوں میں بھی پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ویسے گراؤنڈ میں بھی جہاں تک نگاہ جا سکتی تھی کم از کم ڈیڑھ دو لاکھ انسان تو نظر آ ہی رہے تھے۔ خطیب ایرانی حکومت کا کوئی اہم نمائندہ ہوتا ہے۔ آج کے خطیب چیف جسٹس آیت اللہ یزدی تھے۔

ہمارے اس دورے کے دوران آیت اللہ واعظ زادہ کے پرسنل سیکرٹری حجتہ الاسلام میر آقائی مسلسل ہمارے ساتھ رہے۔ موصوف بہت خوش اخلاق پختہ عالم دین ہیں، قم سے فارغ التحصیل ہیں، انگریزی بول اور سمجھ لیتے ہیں۔ ان سے ہمیں بہت مفید معلومات حاصل ہوئیں۔

علماء کے مابین درجہ بندی کا کیا معیار ہے۔ ۴ سال کی مذہبی تعلیم کے بعد ایک شخص ثقۃ الاسلام کہلاتا ہے۔ ۱۰ سال کے بعد یہ شخص حجتہ الاسلام کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ ۱۵ تا ۲۰ سال اور کوئی اہم علمی کارنامہ سرانجام دینے کے بعد آیت اللہ مجتہد کا درجہ ہوتا ہے۔ سب سے اونچا درجہ آیت اللہ العظمٰی کا ہے جو مرجع بھی کہلاتے ہیں۔ اس وقت ایران میں کل ۱۰ مرجع ہیں۔ اس درجہ بندی کو "قم" کے علماء کا ایک بورڈ طے کرتا ہے۔

۱۹/۱۰ اکتوبر صبح ۸ بجے ہم "قم" کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ تہران سے قریباً ۱۶۰ کلومیٹر دور ہے۔ قم جو ایران کا سب سے بڑا مذہبی علمی مرکز ہے' یہاں نسبتاً چھوٹے علمی مدارس تو بہت ہیں لیکن دو اہم اور بڑے علمی مراکز حوضہ علمیہ اور رفیضیہ ہیں۔ ہم نے ان دونوں مراکز کو دیکھا۔ قم شہر میں خوب چہل پہل دیکھی۔ خیال تھا کہ یہاں صرف علماء اور طلبہ ہی ہوں گے لیکن اس شہر میں عوام الناس کی بھی خوب آبادی ہے۔ یہاں پر ایک پبلک لائبریری نے کافی متاثر کیا اور بڑی بات یہ ہے یہ لائبریری شخص واحد کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ یہ لائبریری ۱۹۶۸ء میں قائم کی گئی تھی۔ آیت اللہ العظمٰی المرعشی نجفی نے ذاتی دلچسپی اور محنت سے ایک لائبریری کو علم کے متلاشی افراد کا مرجع بنا دیا ہے۔ اس وقت ان کے بیٹے السید محمود المرعشی ان کے اس مشن کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں لائبریری کے اہم شعبے دکھلائے۔ سب سے اہم شعبہ قلمی نسخوں کا ہے جس میں ۲۶۳۰۰ مخطوطات ہیں۔ نادر مخطوطات کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ایک پانچ انچ چوڑی اور قریباً ایک میٹر لمبی پٹی پر مکمل قرآن مجید ہاتھ سے لکھا ہوا دیکھا۔ لاطینی زبان میں ایک کتاب چمڑے پر لکھی ہوئی یہاں موجود ہے۔ ان کتابوں کو خراب ہونے سے بچانے کا مکمل جدید نظام یہاں موجود ہے۔ کتابوں کی مائیکروفلمز بنانے کا شعبہ بھی موجود ہے' جس میں تمام جدید سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ ایک پورا شعبہ انسائیکلوپیڈیا کا ہے جس میں دنیا کی تمام زبانوں (سوائے اردو کے) میں انسائیکلوپیڈیا موجود ہیں۔ ایک دارالمطالعہ بھی ہے جہاں بیٹھ کر علم کے پیاسے اپنی پیاس بجھاسکتے ہیں۔ روزانہ ۱۲۰۰ افراد اس لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں۔ ہفتے میں دو دن صرف خواتین کے لئے مخصوص ہیں۔

ادارہ "المجمع العالمی للتقریب بین المذاھب الاسلامیہ" کی قم برانچ جانا ہوا۔ اس کے انچارج محمد مہدی نجف ہیں۔ بہت ہی خوش اخلاق آدمی ہیں۔ یہاں پر قم کے علماء سے ملاقات کا پروگرام تھا۔ پانچ علماء تشریف لائے جو سب کے سب آیت اللہ کے منصب پر فائز اور اپنے اپنے فیلڈ کے ماہر تھے۔ آیت اللہ معرفتی' آیت اللہ جنّاتی' آیت اللہ

ربانی وغیرھم۔ اس محفل میں خالص علمی موضوعات زیر بحث رہے۔ قرآن میں مذکور یاجوج ماجوج کے بارے میں رائے دی گئی کہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ واقعہ گزر چکا ہے۔ ذوالقرنین کے حوالے سے بتایا گیا کہ ہم مولانا ابوالکلام آزاد کی تحقیق کو صحیح سمجھتے ہیں۔ چہرے کے پردے کے حوالے سے بھی گفتگو ہوئی۔ نیز موجودہ بین الاقوامی صورت حال یہود کے کردار اور حزب الشیطان کے کردار اور اس کی چالوں پر گفتگو ہوئی۔ احادیث میں وارد فتنہ دجال اور الملحمۃ العظمٰی پر امیر محترم نے اپنی رائے پیش کی۔ تمام علماء نے بڑی دلچسپی سے امیر محترم کی گفتگو سنی۔ محسوس ہوا کہ شاید پہلی مرتبہ ان کے سامنے یہ ساری باتیں آرہی ہیں۔ قیامت کے بارے میں ایک عالم دین کا خیال تو یہ تھا کہ یہ ابھی کافی دور کی بات ہے اور یہ کہ جب تک انسان تمام کائنات (Forces of nature) پر قابو یافتہ نہیں ہو جاتا قیامت نہیں آئے گی۔ توجیہہ اس کی یہ بیان کی گئی کہ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے اور نائب کے پاس بھی اصل مالک کے اختیارات کا ہونا ضروری ہے۔ اس پر امیر محترم نے برجستہ کہا کہ ایسا شخص تو "دجال" ہوگا۔ جس پر ایک قہقہہ لگا۔ امیر محترم نے اپنی شیعہ سنی مفاہمت والی تجویز یہاں بھی دہرائی۔ اس پر تمام حضرات نے خاموشی اختیار کی اور مثبت یا منفی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔

۲۰/اکتوبر کے روز ہمیں تہران کی دو یونیورسٹیوں میں لے جایا گیا۔ یونیورسٹی کو دانش گاہ کہا جاتا ہے۔ دانش گاہ امام صادقؒ اصل میں پوسٹ گریجویٹ یونیورسٹی ہے اور صرف لڑکوں کے لئے مخصوص ہے۔ اس دانش گاہ میں ۸۰۰ طلبہ اور ۸ فیکلٹیز ہیں۔ رئیس دانش گاہ آیت اللہ مہدوی ہیں موصوف قبل ازیں وزیر اعظم و وزیر داخلہ بھی رہ چکے ہیں۔ ان کے معاون حجۃ الاسلام سید احمد علم الہدیٰ ہیں۔ ان سے خاصی طویل گفتگو رہی۔ یونیورسٹی کا تعارف کرواتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس یونیورسٹی میں علوم اسلامی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے' چنانچہ یہاں مختلف فیکلٹیز کے نام کچھ یوں ہے : علوم اسلامی و سیاسیات' علوم اسلامی و اقتصادیات' علوم اسلامی و تاریخ' وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ امیر محترم نے فرمایا کہ ایسی ہی ایک یونیورسٹی کا قیام ان کا ایک خواب تھا جو انہوں نے ۱۹۶۸ء میں دیکھا تھا' جس کی ایک جھلک انہیں یہاں نظر آئی ہے۔ ان کا اشارہ اس قرآن یونیورسٹی کی جانب تھا جس کا نقشہ انہوں نے اپنے کتابچے "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" میں پیش کیا ہے' یعنی ایک ایسی یونیورسٹی ہو جس میں قرآن کو مرکزی حیثیت حاصل ہو اور اس کے ساتھ ساتھ جدید علوم کے شعبہ جات ہوں۔ امام صادق یونیورسٹی کا تعلیمی معیار خاصا بلند ہے۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ پاکستان سے بھی کچھ

طلبہ نے اس یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا لیکن اس کے سخت تعلیمی ڈسپلن کی وجہ سے وہ یہاں چل نہیں سکے۔

نماز ظہر ہم نے اس یونیورسٹی کے Paryer Hall میں ادا کی۔ نماز ظہر کے بعد امیر محترم کو ۱۵ منٹ اظہار خیال کا موقع دیا گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امیر محترم نے دو احادیث کے حوالے سے گفتگو کی۔ حضرت نعمان ابن بشیرؓ سے مروی حدیث : "تکون النبوۃ فیکم ماشاء اللہ ان تکون........." اور حضرت ثوبانؓ سے مروی حدیث "ان اللّٰہ زوٰی لی الارض..............."۔ امیر محترم کی گفتگو انگریزی زبان میں تھی جس کو اگرچہ پوری طرح تو بہت کم حضرات ہی سمجھ سکے، تاہم ان کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اصل مضمون سب کی سمجھ میں آرہا ہے۔ ایران میں فارسی زبان کے بعد سب سے زیادہ سمجھی جانے والی زبان عربی ہے۔ خصوصاً علماء فارسی کے علاوہ اکثر و بیشتر صرف عربی جانتے ہیں اور اس پر خوب دسترس رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس دانش گاہ کے تمام طلبہ عربی سمجھ اور بول سکتے ہیں۔ بعد میں یونیورسٹی کے ایک استاد نے کہا بھی کہ کاش آپ عربی زبان میں گفتگو کرتے تو بہت اچھا ہوتا۔ بہرحال بعد میں بہت سے حضرات نے امیر محترم کی گفتگو کی تحسین کی۔ چند ایک طلبہ کو فارسی زبان میں "قرآن مجید کے حقوق" بھی پیش کئے گئے۔ اپنی اس گفتگو کے حوالے سے امیر محترم نے فرمایا کہ ہم نے یہاں بھی "اذانِ خلافت" دے دی ہے۔ امیر محترم کا یہ خطاب ظہر اور عصر کی نمازوں کے مابین ہوا جو اہل تشیع کے یہاں "ظہرین" کے نام کے ساتھ ہی ادا کی جاتی ہیں۔ چنانچہ ۱۵ منٹ کا یہ خطاب نماز ظہر کے بعد شروع ہوا اور عصر سے قبل ختم ہو گیا۔

یہاں سے فارغ ہو کر ہم دانش گاہ الزھراءؓ پہنچے۔ یہ یونیورسٹی صرف طالبات کے لئے ہے۔ البتہ اساتذہ میں مرد حضرات بھی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالکریم شیرازی نے ہمارا استقبال کیا۔ یہاں ہمارے لئے ایک استقبالیہ بینر بھی لگایا گیا تھا۔ ڈاکٹر شیرازی Head of Theology Deptt. ہیں۔

امیر محترم نے خواتین کے لئے علیحدہ یونیورسٹی کے قیام پر انہیں مبارکباد پیش کی۔ پاکستان میں لڑکیوں کے لئے علیحدہ یونیورسٹی کا قیام اہل پاکستان کا ایک دیرینہ مطالبہ ہے، کئی مرتبہ اس کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔ ضیاء الحق مرحوم نے بھی اس کا عزم کیا تھا لیکن افسوس کہ تاحال یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ الزہراء یونیورسٹی میں .B.A.,B.Sc اور .M.A.,M.Sc کے علاوہ کچھ مضامین میں .Ph.D بھی کروائی جاتی ہے۔ بتایا گیا کہ اس وقت ۵۰۰۰ کے قریب طالبات یہاں

زیر تعلیم ہیں، جن سے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ ہوسٹل میں رہائش کا بھی کوئی خرچہ نہیں لیا جاتا۔ صرف طعام کا خرچہ لیا جاتا ہے اور وہ بھی subsidised ہے۔ کل وقتی ۲۵۰ اساتذہ میں سے ۱۵۰ خواتین ہیں۔ اس کے علاوہ ۳۰۰ اساتذہ جزو وقتی یعنی visiting professors ہیں۔ یونیورسٹی کے اندر بھی تمام طالبات ایرانی حجاب میں تھیں۔ ہمیں کانفرنس روم میں بٹھایا گیا۔ تھوڑی دیر میں وائس چانسلر جناب ڈاکٹر کومیان بھی تشریف لے آئے۔ دوپہر کے کھانے کا انتظام یہیں تھا۔ کھانے کے دوران اس یونیورسٹی کے بارے میں معلومات کے علاوہ مزید موضوعات پر بھی گفتگو جاری رہی۔ انقلاب کے بعد ایران کے معاشی نظام کے حوالے سے ڈاکٹر موصوف نے تسلیم کیا کہ ہم معاشی نظام میں اسلام کے حوالے سے کوئی بڑی تبدیلی نہیں لا سکے۔ وائس چانسلر نے کہا کہ ہم اس کے لئے کوشاں ہیں۔

امیر محترم نے فرمایا کہ شیعہ سنی کے مابین بعد کو دور کرنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ جو شیعوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنے لئے الاٹ کر لیا ہے اور سنیوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو، تو اگر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی شخصیت کو اجاگر کریں کہ وہ حضرت فاطمہؓ کی والدہ بھی تھیں اور بالاتفاق "الصدیقہ الکبریٰ" بھی، اور اسلام قبول کرنے میں بھی اول تھیں، جنہوں نے اپنا سارا سرمایہ بھی حضورؐ کے قدموں میں نچھاور کر دیا اور اس وقت حضورؐ کی انتہائی دلجوئی فرمائی جب خود حضورؐ پر اس نئے اور انوکھے تجربہ (وحی الٰہی کے نزول) کی وجہ سے گھبراہٹ کے آثار تھے۔ چنانچہ دونوں حلقوں کی جانب سے ام المومنین حضرت خدیجہؓ کی شخصیت کو اجاگر کیا جائے تو تفرقہ کی موجودہ فضا کو ختم کرنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ حاضرین نے امیر محترم کی اس رائے سے اتفاق کیا۔

سہ پہر ۴ بجے پاکستانی سفارت خانہ جانا ہوا۔ انفرمیشن سیکرٹری جنرل جناب فضل الرحمٰن صاحب نے استقبال کیا۔ پاکستانی سفیر جناب خالد محمود صاحب سے ایران میں موجود پاکستانیوں کے مسائل پر بھی گفتگو ہوئی۔ تہران میں پاکستانی سکول کرایہ کی ایک عمارت میں ہے جو کافی شکستہ بھی ہے۔ یہاں پر موجود پاکستانی سکول کے لئے نئی اور وسیع تر عمارت خریدنا چاہتے ہیں لیکن نامعلوم وجوہات ہی کی بنا پر اجازت نہیں مل رہی۔ دیگر باہمی دلچسپی کے موضوعات بھی زیر بحث آئے۔

رات کا کھانا دانش گاہ مذاہب الاسلامی کے رئیس ڈاکٹر تہریان کے ہاں تھا۔ یہ دانش گاہ ابھی حال ہی میں قائم کی گئی ہے۔ ڈاکٹر موصوف کی رہائش بھی اسی عمارت میں ہے۔

Comparative Study کے اس پوسٹ گریجویٹ کالج میں طلبہ کی تعداد ۱۰۰ ہے۔ طلبہ سے کوئی فیس نہیں لی جاتی بلکہ چیدہ طلبہ کو وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔ کھانے کے موقع پر چند مزید شخصیات سے بھی ملاقات ہوئی جیسے ڈاکٹر سید مصطفیٰ میر داماد جو تہران یونیورسٹی میں visiting professor ہیں۔ مولانا اسحاق مدنی سے بھی یہیں ملاقات ہوئی۔ مولانا اسحاق مدنی کا تعلق ایرانی بلوچستان سے ہے۔ کراچی سے فارغ التحصیل ہیں اور اس وقت صدر ایران رفسنجانی کے مذہبی مشیر برائے سُنّی امور ہیں۔ مولانا اسحاق مدنی جب آیت اللہ واعظ زادہ خراسانی کے ہمراہ دورۂ پاکستان کے موقع پر ان کے ہمراہ قرآن اکیڈمی تشریف لائے تھے' ان سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی۔

کھانے کے اس اجتماع کے موقع پر بھی مختلف موضوعات پر گفتگو جاری رہی۔ امیر محترم نے انجمن و تنظیم کا تعارف اور ان کے دائرہ کار کو واضح کیا۔ سیرت نبویؐ کی روشنی میں اپنے منہج انقلاب کو واضح کیا اور اس بات کا اعتراف کیا کہ انقلاب کے آخری مرحلہ کے لئے جناب خمینی کی سربراہی میں برپا کیا گیا انقلاب ایران مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ افغانستان کی صورتحال اور اس میں طالبان کا کردار بھی زیر بحث آیا۔ امیر محترم نے سوال کیا کہ کیا انقلاب ایران کے بعد اب عوام الناس کی جانب سے اس انقلاب کی حمایت میں اضافہ ہو رہا ہے یا کمی ہو رہی ہے؟ یہ سوال چونکہ بالکل غیر متوقع تھا اس لئے پہلے تو گول مول سا جواب ملا کہ عوام حکومتی اجتماعات میں کثیر تعداد میں شریک ہوتے ہیں' نیز یہ کہ انقلاب مخالف لوگ اگرچہ موجود ہیں لیکن بہت قلیل تعداد میں اور دبے ہوئے ہیں۔ لیکن بعد ازاں جناب غفاری نے تسلیم کیا کہ انقلاب کے بعد لوگوں کے لئے معاشی مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ اس میں کچھ تو بین الاقوامی مہنگائی اور بہت سے ممالک کی جانب سے تجارتی بائیکاٹ بھی ایک عامل ہے۔ نیز ۸ سال کی ایران عراق جنگ نے معیشت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ تاہم جناب غفاری نے کہا کہ حکومت ایران نے بہت سے ترقیاتی منصوبے شروع کر رکھے ہیں' مثلاً بیسیوں کی تعداد میں ڈیم تعمیر ہو رہے ہیں' سینکڑوں فیکٹریاں زیر تعمیر ہیں' ظاہر ہے کہ حکومت کو ان منصوبوں پر کثیر رقم خرچ کرنا پڑ رہی ہے' لہٰذا عوام کے لئے معاشی مسائل تو یقیناً ہیں' لیکن جناب غفاری نے کہا کہ عوام اس بات کو سمجھتے ہیں اور بقول ان کے انقلاب کی حمایت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایران میں بعض اداروں میں تو مردوں اور عورتوں کے دائرہ کار کو علیحدہ کیا گیا ہے لیکن بعض مقامات پر اس کا اہتمام نہیں ہے' مثلاً مردوں کے ہسپتال میں خواتین نرسیں کام کرتی ہیں۔ ایئر ہوسٹس کسی محرم کے

بغیر دور دراز کا سفر کرتی ہیں جو دینی تعلیمات کے خلاف ہے۔ جناب غفاری نے اس ضمن میں بھی حکومت کی کوتاہی کا اعتراف کیا۔

۲۱/اکتوبر۔ آج صبح ۹ بجے پاکستانی سکول میں اساتذہ اور طلبہ سے ملاقات اور خطاب کا پروگرام تھا، لیکن امیر محترم کی طبیعت اچانک بہت ناساز ہو گئی جس کی بنا پر یہ پروگرام ملتوی کرنا پڑا۔ ساڑھے دس بجے رہبر انقلاب جناب آیت اللہ خامنہ ای سے ملاقات کا وقت طے کیا گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ پیر کا روز علماء اور اہم شخصیات سے ملاقات اور بدھ کا دن عوام الناس کے لئے مختص ہے۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ ہماری ان سے ملاقات اسی اجتماعی ملاقات کے حوالے سے تھی، خصوصی نہ تھی۔ تاہم یہ اجتماعی ملاقات ایک لحاظ سے ہمارے حق میں بہتر ہی ثابت ہوئی، جس کا ذکر ابھی آئے گا۔ رہبر انقلاب کے لئے سیکورٹی کے بہت سخت انتظامات کئے جاتے ہیں۔ ملاقاتی کو کوئی چیز اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں۔ ہماری گھڑیاں، پین، بٹوے، ڈائریاں وغیرہ سب رکھوا لی گئیں۔ کسی کیمرے یا ٹیپ ریکارڈر کے لے جانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ اس سب کے باوجود دو مرتبہ ایک خاص دروازے (غالباً Metal Detector) سے بھی گزارا جاتا ہے اور تلاشی بھی لی جاتی ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ عین اس موقع پر آیت اللہ تسخیری تشریف لے آئے جن کی وجہ سے امیر محترم کے لئے بہت آسانی پیدا ہو گئی۔ رہبر انقلاب جناب خامنہ ای سے اجتماعی ملاقات میں قریباً ۵۰ کے قریب حضرات موجود تھے۔ کچھ لوگ اپنے مسائل بھی بیان کر رہے تھے جو فارسی زبان میں بیان کئے جانے کے سبب ہمارے لئے ناقابل فہم تھے۔ تھوڑی دیر بعد جناب خامنہ ای ہماری جانب متوجہ ہوئے اور مختصر سی گفتگو میں ہمارے (امیر محترم + وفد) لئے استقبالی اور خیر سگالی کے کلمات کہے۔ امیر محترم نے اپنی جوابی تقریر میں شکریہ کے بعد اپنا اور اپنے مشن کا تعارف کروایا۔ تنظیم اسلامی کے ہدف اور اس کے طریق کار خاص طور پر انقلاب کے آخری مرحلہ کے لئے انقلاب ایران سے رہنمائی حاصل کرنے کا تذکرہ کیا۔ نیز پاکستان میں اسلامی انقلاب کے لئے شیعہ سنی مفاہمت کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرنے کے بعد اس مفاہمت کے لئے اپنے فارمولے کا ذکر کیا۔ گویا امیر محترم نے مختصر الفاظ میں تنظیم اسلامی کی دعوت اور اس وقت کے بین الاقوامی حالات کے بارے میں اپنا نقطہ نظر واضح کیا۔ یہ ملاقات اس لحاظ سے اہم تھی کہ ساری باتیں ایران کی اس وقت کی سب سے بڑی شخصیت کے ساتھ ساتھ بہت سے اہم حضرات کے سامنے بھی آ گئیں اور اس طرح یہ "اجتماعی ملاقات" ایک اعتبار سے مفید تر ہو گئی۔ جناب خامنہ ای نے بعد میں فرمایا کہ آپ کی باتیں بڑی قیمتی اور قابل

فور ہیں۔

چار بجے سہ پہر پریس کانفرنس سے خطاب تھا۔ بتایا تو یہی گیا تھا کہ یہ پریس کانفرنس انگریزی ہو گی لیکن وہاں موجود اکثر صحافی انگریزی سے ناواقف نکلے' لہٰذا دو طرفہ ترجمانی کی [illegible]ائی وقت صرف ہو گیا۔ امیر محترم نے قریباً ۲۰۔ ۲۵ منٹ خطاب کیا۔ امیر محترم نے تفصیلاً اپنا اور اپنے مشن کا تعارف کروایا۔ تنظیم اسلامی کے اہداف' اس کے طریق کار اور تنظیمی اساس کا ذکر کیا۔ گویا بیعت کا تذکرہ یہاں بھی تفصیل سے ہو گیا۔ نظام خلافت کی بات بھی ہوئی اور یہ کہ تنظیم اسلامی اولاً پاکستان اور بالآخر پوری دنیا پر نظام خلافت کی جدوجہد کے لئے قائم کی گئی ہے۔ امیر محترم نے فرمایا کہ ہمارا ہدف اگرچہ بہت بلند ہے لیکن ہماری تعداد ابھی بہت تھوڑی ہے۔ لیکن ہمارے لئے یہ بات باعث اطمینان ہے کہ ہم اپنی فہم اور سوچ کے مطابق سیرت کی روشنی میں صحیح سمت میں گامزن ہیں۔

امیر محترم نے فرمایا کہ پاکستان اور ایران میں حقیقی دوستی اور تعاون کی شکل تبھی پیدا ہو سکتی ہے جب پاکستان میں بھی اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ پاکستان میں نظام خلافت کے لئے شیعہ سنی مفاہمت ضروری ہے اور اس کے لئے واحد قابل عمل فارمولا وہی ہے جس کا تذکرہ ایران کے آئین میں کر دیا گیا کہ چونکہ اکثریت شیعہ مسلمانوں کی ہے لہٰذا یہاں پبلک لاء فقہ جعفریہ کے مطابق ہو گا ہاں البتہ پرسنل لاء میں سنیوں کو آزادی ہو گی کہ وہ اپنی عبادات اور نکاح' طلاق کے معاملات کو اپنی فقہ کے مطابق طے کر لیں۔ جناب آیت اللہ واعظ زادہ کے حوالے سے امیر محترم نے فرمایا کہ جناب خمینی کا موقف یہی تھا کہ مسلمان ممالک میں جس فقہ کو ماننے والوں کی اکثریت ہو وہاں پبلک لاء وہی ہو گا' تاہم دوسرے لوگوں کو پرسنل لاء میں مکمل آزادی ہو گی۔ اسی اصول کو اگر پاکستان میں ہمارے شیعہ بھائی تسلیم کر لیں تو یہاں نفاذ اسلام میں بڑی سہولت پیدا ہو جائے گی۔ اسی صورت میں پاکستان' ایران' افغانستان اور روسی ترکستان کی نو آزاد مسلم ریاستوں پر مشتمل مضبوط اسلامی بلاک نیو ورلڈ آرڈر کا مقابلہ کر سکتا ہے ورنہ ہمارا دشمن ہمیں ایک ایک کر کے اپنا ٹارگٹ بنا کر اپنا مقصد حاصل کر لے گا اور ہم کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ امیر محترم نے فرمایا کہ میں ایران کے عوام اور حکومت سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنے تعلقات کو جو ان کے پاکستان میں شیعہ حضرات کے ساتھ ہیں استعمال کرتے ہوئے انہیں اس فارمولا کو قبول کرنے پر آمادہ کریں۔

امیر محترم کے بیان کے بعد چند ایک سوالات بھی کئے گئے' مثلاً ایک سوال یہ تھا کہ کیا

پاکستان میں جو انقلاب پیش نظر ہے وہ نظریاتی ہو گا یا سیاسی؟ امیر محترم نے فرمایا کہ سیاست اسلام کا جزو ہے اس لئے یہ ایک مکمل انقلاب ہو گا' لیکن یہ الیکشن کی سیاست سے نہیں آئے گا۔ کیا خمینی الیکشن کے ذریعے ایران میں انقلاب لا سکتے تھے؟ ہرگز نہیں! اسی طرح ہم پاکستان میں الیکشن کے ذریعے اسلامی انقلاب نہیں لا سکتے۔ ایک سوال یہ تھا کہ کیا باہر کی حکومتیں پاکستان میں شیعہ سنی فرقہ بندی کو ہوا دے رہی ہیں؟ امیر محترم نے جواب دیا یقیناً! چنانچہ امریکی دانشور Huntington کے مقالے The Clash of civilizations? کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ۔ "نیش عقرب نہ از پئے کین است۔ اقتضائے طبیعتش این است" کے مصداق ہمارے دشمن کی دشمنی کا تقاضا ہے کہ وہ ہمیں کمزور کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کرے۔ یہ تو ہمارے سوچنے کی بات ہے کہ ہم اس کا توڑ کیسے کر سکتے ہیں۔

یہ پریس کانفرنس بہت سے اعتبارات سے بڑی اہم رہی' لیکن افسوس کہ میڈیا نے اس کو زیادہ نمایاں نہیں کیا' بلکہ محسوس ہوا کہ ذرائع ابلاغ کی جانب سے ہمارے دورے سے صرف نظر کی پالیسی اپنائی گئی تھی۔ مثلاً رات کو ٹیلی ویژن کی خبروں میں جناب خامنہ ای کی آج کی اجتماعی ملاقات کو ٹیلی کاسٹ کیا گیا جس میں بقیہ حاضرین کو تو دکھایا گیا ہماری کوئی جھلک نہیں آنے پائی۔ ٹیلی ویژن کا تذکرہ آیا ہے تو ایرانی ٹیلی ویژن کی جو بات قابل تعریف ہے اس کو بیان نہ کرنا زیادتی ہو گی کہ ایرانی ٹیلی ویژن عریانی اور فحاشی سے مکمل طور پر پاک ہے۔ پروگرام عموماً بامقصد ہوتے ہیں۔ عورت کو دکھایا بھی جاتا ہے تو "حجاب" میں اور میک اپ کے بغیر۔ جو تھوڑے بہت ڈرامے دکھائے جاتے ہیں ان میں بھی عورت "حجاب" میں ہوتی ہے۔ غرضیکہ آپ ایرانی ٹیلی ویژن کو بلا جھجک اپنے اہل خانہ کے ساتھ بیٹھ کر دیکھ سکتے ہیں' جو پاکستان میں تو ناممکن ہے۔

پریس کانفرنس کے بعد ریڈیو کی عربی سروس والوں نے امیر محترم کا ۱۵ منٹ کا انٹرویو ریکارڈ کیا جبکہ اردو سروس کے نمائندے سید امیر علی ہوٹل میں انٹرویو ریکارڈ کرنے کے لئے آئے۔ یہ انٹرویو قریباً ایک گھنٹہ پر مشتمل تھا۔ ریڈیو کی اردو سروس کو امیر محترم نے اپنی کتابوں کا مکمل سیٹ ہدیتاً پیش کیا۔ اردو سروس کے عملے کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ اگلے ہی روز انہوں نے اس انٹرویو کی آڈیو کیسٹ ہمیں فراہم کر دی۔

۲۲/اکتوبر۔ آج کا دن مشہد کے لئے مختص تھا۔ اہل تشیع کے نزدیک یہ نہایت مقدس شہر ہے جس میں ان کے آٹھویں امام جناب علی رضاؒ مدفون ہیں۔ شیعہ حضرات ان کے مزار کو حرم

کہتے ہیں یہ شہر تہران سے قریباً ۹۵۰ کلومیٹر دور ہے۔ فلائٹ نے ایک گھنٹہ دس منٹ لئے۔ ہمارے لئے یہاں کا visit اس لئے بھی اہم تھا کہ ہمارے اصل میزبان جناب آیت اللہ واعظ زادہ خراسانی سے ملاقات یہیں ہونا تھی۔ یاد رہے کہ مشہد ایران کے موجودہ صوبہ خراسان کا ایک اہم شہر ہے۔ جبکہ وہ خراسان جو کہ حضور ﷺ کے وقت میں تھا اور جس کو اہل ایران کی اصطلاح میں "خراسانِ بزرگ" کہا جاتا ہے' ایران کے اس حصے کے علاوہ قریباً پورے افغانستان' روسی ترکستان اور پاکستان کے شمالی علاقے کے ایک اہم حصے پر مشتمل ایک بہت بڑا ملک تھا۔ اسی "خراسانِ بزرگ" کے بارے میں حضور کی پیشین گوئی موجود ہے کہ یہاں سے سیاہ پرچم چلیں گے (یعنی اسلامی افواج) جنہیں کوئی شے واپس نہیں کر سکے گی یہاں تک کہ وہ ایلیا (بیت المقدس) میں نصب کر دیئے جائیں گے۔

مشہد میں ہمیں ایک بہت بڑی لائبریری دکھائی گئی جو اپنی نوعیت کی منفرد لائبریری ہے۔ اپنی خوبصورتی' وسعت' اور جدید سہولیات کے حوالے سے اس کا visit ہمارے لئے ایک خوشگوار حیرت کا سبب بنا۔ لائبریری کی عمارت تین منزلہ ہے۔ ایک بہت بڑا میوزیم اور دو وسیع و عریض دار المطالعہ ہیں۔ کتابوں کی تعداد ۵ لاکھ ہے۔ Cataloging کا نظام پوری طرح سے کمپیوٹرائزڈ ہے۔ لائبریری کی اپنی ایک خوبصورت مسجد ہے جس کے درمیان میں ایک ستون نبی اکرم ﷺ کے ورودِ یثرب کے موقع پر تعمیر ہونے والی مسجد یعنی مسجد قبا کی اولین تعمیر کی طرز پر بنایا گیا ہے جس کے درمیان کھجور کے تنے کا واحد ستون تھا۔ چھت پر لکڑی کا کام بہت عمدہ انداز میں کیا گیا ہے۔ چاروں کونوں میں "اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کے الفاظ روشنی پھیلاتے ہیں۔ غرضیکہ یہ جگہ دیکھنے کے لائق ہے۔ اسی کے ساتھ ایک کمپلیکس میں "دانش گاہ" بھی ہے۔ اسی دانش گاہ میں ہماری ملاقات جناب آیت اللہ واعظ زادہ خراسانی سے ہوئی۔ جناب واعظ زادہ انگریزی زبان نہیں سمجھ سکتے لہٰذا مترجم کے ذریعے گفتگو ہوئی۔ "دانش گاہ" کا تعارف کروایا گیا۔ اس وقت ۲۰۰ طالب علم یہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں جن کے لئے تعلیم' رہائش' کھانا اور دیگر روزمرہ کی ضروریات بالکل مفت مہیا کی جاتی ہیں۔

لائبریری اور دانش گاہ ایک بہت بڑے کمپلیکس پر محیط ہیں۔ امیر محترم نے اگرچہ اکثر و بیشتر وہیل چیئر کی سہولت سے استفادہ کیا جو ہم پاکستان سے ہی ساتھ لے گئے تھے لیکن بعض جگہوں پر سیڑھیاں بھی تھیں اور کچھ پیدل چلنے کی وجہ سے امیر محترم تکان محسوس کر رہے تھے لہٰذا دوپہر امیر محترم نے ہوٹل میں آرام کیا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم اس دوران بازار کا ایک چکر

لگالیں گے لیکن معلوم ہوا کہ یہاں "قیلولہ" کے لئے دوپہر کے اوقات میں تمام بازار بند رہتے ہیں۔ ناچار ہمیں بھی آرام کرنا پڑا۔

شام کو جناب علی تقی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ لاہور میں ۵ سال تک قونصل جنرل کے عہدہ پر فائز رہے ہیں۔ آج کل وزارت خارجہ سے منسلک ہیں اور مشہد میں قیام پذیر ہیں۔ رات کی فلائٹ سے ہم واپس تہران کے لئے عازم سفر ہوئے۔ اس سفر میں جناب آیت اللہ واعظ زادہ بھی ہمارے ساتھ تھے۔

۲۳/اکتوبر ہماری پاکستان واپسی کا دن تھا۔ جناب واعظ زادہ نے ناشتہ ہمارے ساتھ ہوٹل ہی میں کیا جہاں قریباً ایک گھنٹہ تک امیر محترم کی ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو جاری رہی۔ مثلاً اسلامی حکومت میں تنازعات کے حل کے لئے کس سے رجوع کیا جائے۔ جناب واعظ زادہ نے تسلیم کیا کہ ہمارے ہاں اس قسم کے ادارے ابھی پوری طرح مستحکم نہیں ہوئے، ابھی تو شخص واحد (رہبر انقلاب) کی طرف ہی رجوع کیا جاتا ہے۔ ریاستی سطح پر ابھی بہت سی باتیں یہاں طے کرنا باقی ہیں۔ امیر محترم نے اپنا فکر پیش کیا کہ آج کے حالات میں تمدنی ارتقاء کے نتیجے میں قابل عمل صورت یہ ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کی طرف رجوع کیا جائے اور وہ اس کا فیصلہ کریں جبکہ علماء اور اہل علم اپنے دلائل کے ذریعے عدالتوں کی رہنمائی کریں۔ اس ضمن میں اگر شخص واحد یا علماء کے بورڈ کے حوالے یہ کام کر دیا جائے تو یہ روح عصر کے منافی ہو گا۔ امیر محترم نے محسوس کیا کہ اگر خطبات خلافت کا فارسی ترجمہ کر کے ہم ان حضرات تک پہنچا سکیں تو شاید ہمارا نقطۂ نظر ان حضرات پر اچھی طرح واضح ہو جائے!

اس کے علاوہ بھی بہت سے علمی مسائل زیر بحث آئے جن سب کا تذکرہ یہاں ممکن نہیں ہے۔ مقامی وقت کے مطابق ۹ بجے میزبان جناب آیت اللہ واعظ زادہ خراسانی سے رخصت ہو کر ہم "فرودگاہ" یعنی ایئرپورٹ کی جانب روانہ ہوئے۔ رخصت کرتے وقت جناب آیت اللہ واعظ زادہ خراسانی نے ایک طغرہ اور مختلف کتابیں ہدیتاً پیش کیں۔

اس پورے سفر کے دوران جناب واعظ زادہ کے پرسنل اسسٹنٹ میر آقائی، جناب عبدالحمید طالبی اور جناب انصاری نے ہر وقت ہماری ضروریات کا خیال رکھا اور حق میزبانی ادا کر دیا۔ عربی زبان میں "سفر" کے معنی روشنی کے بھی ہیں اور یقیناً سفر سے حقائق و واقعات کے ضمن میں روشنی حاصل ہوتی ہے۔ بہرحال اس سفر سے جو روشنی ہمیں حاصل ہوئی اس کا کچھ حصہ میں نے آپ تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ع گر قبول افتد زہے عزّ و شرف!

بقیہ : سنگ میل

سے تھامے رکھئے اور اس خطرے سے نمٹنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم طے کرلیں کہ ہم نے ترجیح دنیا کو دینی ہے یا آخرت کو!

ڈاکٹر صاحب نے چوتھی چیز یہ بیان فرمائی کہ ہدایت کا تھامے رکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ زندگی میں کئی موڑ ایسے آتے ہیں کہ بڑے سے بڑے لوگ بھٹک جاتے ہیں اور انسان اور جہنم کے درمیان محض بالشت بھر فاصلہ رہ جاتا ہے' لہٰذا ہمیں اس کے لئے ہمیشہ "رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً' اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ" کی دعا کثرت سے کرتے رہنا چاہئے' اور اس ضمن میں اس بات کا بھی خاص خیال رکھنا چاہئے کہ ہمیں جو ہدایت ملی ہے وہ ہماری اپنی یافت نہیں' اللہ کا فضل ہے۔

امیر محترم کے خطاب کے بعد قافلہ تنظیم میں شامل ہونے والے نئے ہم سفروں نے امیر تنظیم اسلامی کے ہاتھ پر سمع وطاعت فی المعروف کی بیعت کی۔ اس کے بعد نماز ظہر ادا کی گئی جس کے فوری بعد اجتماع کے شرکاء نے کھانا کھایا اور پھر مختلف علاقوں سے آئے ہوئے یہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہونے لگے۔

تنظیم اسلامی کا یہ اجتماع چونکہ پہلی دفعہ بیرون لاہور کسی بڑے شہر میں منعقد کیا گیا تھا' اس لئے کسی نئے مقام پر اجتماع کا یہ پہلا تجربہ تھا۔۔۔ اس کے لئے انتظامات بھی واقعتاً ایک سخت محنت طلب کام تھا۔ لیکن جس محنت اور جانفشانی کے ساتھ حلقہ شمالی پنجاب کے رفقاء نے کام کیا' وہ سب رفقاء کے لئے قابل تقلید ہے' اور خاص طور پر اس پہلو سے کہ بارش کے باعث مقامی رفقاء کو بالکلیہ متبادل انتظامات کرنے پڑے' اور اس کے لئے ظاہر ہے کہ انہیں ذہنی و جسمانی ہر دو صعوبتوں سے سابقہ پڑا' لیکن انہوں نے ہر مرحلے پر صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا' دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور ہم سب کو اپنی زندگیاں اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کے مطابق بسر کرنے اور دین کے نظام عدل اجتماعی کے قیام کی جدوجہد میں اپنی تمام ذہنی و جسمانی توانائیاں صرف کرنے کی توفیق اور ہمت عطا فرمائے۔ آمین OO

حسن کا راز

——— طیبہ یاسمین ———

میرا مشاہدہ ہے کہ چالیس برس کی عمر کے بعد بہت سی خواتین کو اپنے حسن کے ڈھلنے کا بہت احساس ہوتا ہے۔ کبھی وہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کے بالوں میں سفیدی کو ڈھونڈتی' کبھی جسم اور چہرے کی ڈھلکتی ہوئی جلد کو ٹٹولتی ہیں تو کبھی چہرے کی نرم جلد اور ماتھے کی لکیروں پر غور کر کے یاد ماضی یعنی ایام جوانی اور حسن کو یاد کر کے خود بھی افسردہ ہوتی اور دوسروں کو بھی اس غم میں مبتلا کرنے کی کوشش میں دانستہ و نادانستہ مبتلا ہو جاتی ہیں۔ ماہرین حسن و زیبائش سے کریمیں' لوشن اور مساج کے مختلف طریقے پوچھ پوچھ کر اور استعمال کر کے وقت اور پیسے کا ضیاع کرتی ہیں۔ جو صاحب حیثیت و اختیار ہوں وہ پلاسٹک سرجری کے ذریعے صرف چہرے کی جلد کو تنا ہوا بنا کر اور بھی مضحکہ خیز لگتی ہیں اور اس طرح قدرت سے جنگ کرنے کے بعد شکست کھا کر اور بھی بددل' مایوس اور نفسیاتی مریض بنتی ہیں۔

آخر بڑھتی ہوئی عمر سے خوف زدہ کیوں ہوا جائے۔ زندگی تو اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ وہ ایک مقصد کے لئے ہمیں عطا کی گئی ہے۔ اگر احساس زندہ ہو اور مقصد تخلیق واضح ہو اور سامنے ہو تو پھر ہر آتے ہوئے دن پر شکر کرنا چاہئے کہ نیکی اور توبہ کا در ابھی کھلا ہے۔ زندگی کی مہلت ملتے رہنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا مقام ہے کہ اس نے ابھی آپ کو اپنے پیاروں اور جن کی ذمہ داریاں آپ کے کاندھوں پر ہیں ان کو پوری کرنے کی مہلت دی ہوئی ہے۔ فرمان نبویؐ کے مطابق ہر آنے والا دن پچھلے دن سے عمل میں بہتر ہونا چاہئے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ایک ہی سال پیدائش کے لوگ بڑے ہو کر چار پانچ برس کے وقفہ کے شکار ہو جاتے ہیں۔

خوبصورتی کے کم ہونے یا ختم ہونے سے انسان کیوں گھبراتا ہے۔ اس لئے کہ اس طرح وہ محفلوں اور لوگوں میں غیراہم اور غیر مقبول ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ نگاہوں کا مرکز نہیں رہتا۔ لیکن ہر چیز کو ایک زوال ہے۔ جسمانی حسن ایک حد تک جا کر زوال پذیر ہو کر انسان کو مبتلائے اذیت کر دیتا ہے۔ مگر انسانی روح اور ذہن مسلسل ترقی پذیر رہتے ہیں۔ باطنی اور ذہنی خوبصورتی مسلسل نشوونما پاتی اور انسان کو لازوال بناتی ہے۔ اس لئے اگر ظاہر خوبصورت نہیں رہا تو غم کیا ہے' باطن کو خوبصورت بنا کر آپ زیادہ پیاری لگیں گی۔ اسی افزائش حسن کے نسخہ کی طرف میں آپ کو متوجہ کر رہی ہوں۔

کیا آپ نے کبھی ایسے پیارے پیارے' شفیق نورانی چہروں والے بوڑھے نہیں دیکھے کہ جن کو دیکھتے ہی ان سے مارے محبت کے لپٹ جانے کو دل چاہے۔ ان کی زندگی کے تجربوں سے بھرپور دلائل اور باتیں' ان کے علم و تجربہ کی روشنی' ان کی محبت' ان کی مثبت سوچ' تحمل' رواداری' ان کی رہنمائی' ان کے دیئے گئے احساس تحفظ کی کشش کے آگے کیا حسین سے حسین نوجوان ٹھہر سکتے ہیں؟ حسن کیا ہے؟ کشش ہی تو ہے۔ تو ایسے ہی حسین بوڑھے بنئے اور سب کو عزیز ہو جایئے کہ انسان کی ذہنی' باطنی اور روحانی خوبیاں اور حسن ہر چیز پر حاوی ہو جاتے ہیں اور اس لحاظ سے انسان جتنا خوبصورت ہو گا اتنا ہی ابدی ہو گا۔ جسمانی حسن ناپائیدار ہے اور روحانی حسن و ترقی لازوال۔

اہم اطلاع

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے قرآن اکیڈمی میں الیکٹرانک میل کی سہولت حاصل کرلی ہے' رابطے کا پتہ حسب ذیل ہے :

anjuman@paknet1.ptc.pk

نیز تنظیم اسلامی شمالی امریکہ کا Home page مندرجہ ذیل پتے پر دیکھا جاسکتا ہے :

http://gramercy.ios.com/~tina

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

جلد: ۴۵
شمارہ: ۱۱
رجب، شعبان ۱۴۱۷ھ
دسمبر ۱۹۹۶ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زرِ تعاون ۱۰۵/-

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

○ ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر	10 امریکی ڈالر
○ سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات، قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان	17 امریکی ڈالر
○ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ	22 امریکی ڈالر

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت: 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون: 03-02-5869501
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110
پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرض احوال

پاکستان کے جنوبی علاقوں میں بسنے والے رفقاء تنظیم کے لئے سالانہ اجتماع حسب پروگرام ۲۲ تا ۲۴ نومبر سکھر شہر میں منعقد ہوا۔ حلقہ سندھ و بلوچستان کے علاوہ حلقہ پنجاب جنوبی کے رفقاء نے بھی اس اجتماع میں شرکت کی۔ اس اجتماع کی مفصل رپورٹ تو قارئین اسی شمارے میں ملاحظہ فرما ہی لیں گے' سطور ذیل میں ہم امیر تنظیم اسلامی کے ان خیالات و افکار کو ہدیہ قارئین کر رہے ہیں جو انہوں نے سکھر میں پریس کانفرنس کے موقع پر صحافیوں کے سامنے بیان کی صورت میں پیش کئے یا ان کے سوالات کے جوابات کی شکل میں ان کا اظہار کیا۔ امیر تنظیم نے اس پریس کانفرنس میں نہ صرف یہ کہ پاکستان کے استحکام کے ضمن میں اپنے مستقل موقف کا اعادہ کیا بلکہ موجودہ سیاسی صورتحال اور ملکی و بین الاقوامی حالات کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بھی نہایت جامعیت کے ساتھ پیش کیا۔ گویا حالات حاضرہ کے بارے میں تنظیم اسلامی کا جو موقف ہے اس کا عمدگی کے ساتھ احاطہ اس پریس کانفرنس کے ذریعے ہو جاتا ہے۔ اس پریس کانفرنس کا بھرپور خلاصہ برادرم محترم نعیم اختر عدنان نے جو اس پریس کانفرنس میں شریک تھے' نکات کی صورت میں مرتب کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے!

" ○ اس ملک کا اصل مسئلہ رائج الوقت نظام کی تبدیلی ہے۔ میں مروجہ سیاست میں شریک نہیں ہوں بلکہ انقلابی نظریات اور نظام کی تبدیلی کا علمبردار ہوں۔ رائج الوقت نظام کو درست سمجھنے والے اگر انتخابی سیاست میں حصہ لیں تو درست ہے۔ ہماری قومی بقاء کا ایک المیہ یہ ہے کہ ملک کے جواز کی کوئی بنیاد سوائے اسلام کے اور کوئی نہیں۔ لیکن ہم بحیثیت قوم اسلام کی طرف آنے کو تیار نہیں!

○ تحریک پاکستان کی پشت پر دو قومی نظریہ اور ایک مثالی اسلامی ریاست کے قیام کا جذبہ کارفرما تھا۔ استحکام پاکستان کی واحد بنیاد اسلام کے عادلانہ نظام کا حقیقی نفاذ ہے۔

○ پاکستان کا قیام تاریخ اور جغرافئے کے تمام اصولوں کے خلاف مذہب کی بنیاد پر عمل میں آیا۔ قیام پاکستان میں نسلی اور لسانی قومیت کا فیکٹر سرے سے موجود نہیں تھا۔ عرب ممالک نے عرب قومیت کی بنیاد پر آزادی حاصل کی۔ پاکستانی قومیت اب تک وجود میں آئی ہے نہ قیامت تک وجود میں آسکتی ہے' اس لئے کہ ہم نے وطنی قومیت کے خلاف مذہب کی بنیاد پر جنگ لڑی تھی۔

○ اگر ملک کو اسلامی ریاست نہ بنایا گیا تو اس کا قائم رہنا ناممکن ہے۔ البتہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی ایک آسامی کے طور پر یہ باقی رہ سکتا ہے۔

○ نعروں والا اسلام اب کار آمد نہیں ہو گا بلکہ ملک میں اسلام کے آفاقی اصولوں کا نفاذ کرنا ہو گا جسے خلافت کا نظام کہا جاتا ہے۔ خلافت کے نظام میں حاکم اور محکوم کی تقسیم کا کوئی تصور نہیں۔ اسلام میں حکمرانوں تک کو نہ تو وی آئی پی درجہ حاصل ہے اور نہ کوئی استحقاق اور خصوصی امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ خلیفہ سے لے کر عام شہری تک قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔

○ قرار داد مقاصد کی منظوری انسانی حاکمیت کے خلاف بغاوت ہے۔ تمام مکاتب فکر کے ۳۱ علماء نے ۲۲ نکات پر مشتمل متفقہ موقف پیش کر دیا تھا۔ مگر مولانا مودودی نے انتخابات میں حصہ لے کر بہت عظیم غلطی کا ارتکاب کیا جس سے نفاذ اسلام کا مطالبہ پارٹی ایشو بن گیا اور اسے پوری قوم کی تائید حاصل نہ رہی۔

○ نیو ورلڈ آرڈر در حقیقت یہودی مالیاتی استعمار ہے۔ ملک کا عدم استحکام اور معاشی بحران دو قومی نظریئے سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ پاکستانی قوم آج کئی قومیتوں میں منقسم ہو چکی ہے اور اب پاکستان عملاً آئی ایم ایف کا غلام بن چکا ہے اور عالمی مالیاتی اداروں کے نمائندے "قرق امین" بن کر معین قریشی اور شاہد برکی کی شکل میں ہم پر مسلط کئے جا رہے ہیں۔

○ ان تمام ملکی مسائل کا حل نظام خلافت کے نفاذ میں مضمر ہے۔ اس کا نفاذ اسلامی انقلاب کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ جان دیئے بغیر دنیا میں کوئی انقلاب نہیں آیا۔

○ بھٹو کی طرح لغاری بھی ایک جاگیردار ہے۔ نظام مصطفیٰ تحریک بھٹو مخالف تحریک تھی۔

○ ملک عالمی اداروں کے ہاتھوں میں گروی رکھ دیا گیا ہے۔

○ پارلیمانی نظام نامعقول نظام ہے، جبکہ صدارتی نظام معقول اور فطرت کے قریب تر ہے۔ نیز صدارتی نظام کے ذریعے ہی جاگیرداروں کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

○ کافرانہ نظام چاہے صدارتی ہو یا پارلیمانی دونوں کفر ہیں۔

○ پوری عرب دنیا اسرائیل کے سامنے سرنگوں ہو چکی ہے، عراق کی تباہی کے بعد ایران کا گھیراؤ کیا جا رہا ہے۔

○ پاکستان کے معاشرتی نظام میں دراڑیں ڈالنے اور معاشرتی اقدار کو تلپٹ کرنے کے لئے بیجنگ اور قاہرہ کانفرنس کے فیصلوں پر عمل ہو رہا ہے اور پاکستان کی آزادی اور خود مختاری کو شدید خطرات لاحق ہو چکے ہیں۔

○ الیکشن مقررہ مدت کے اندر ہی کرانا چاہئیں اگرچہ احتساب بھی ضروری ہے۔ چند مگرمچھ بھی اگر پکڑ لئے جائیں اور ان سے قومی دولت اگلوالی جائے تو صورتحال میں بہتری آ سکتی ہے"۔

دورہ ایران

مشاہدات و تأثرات

امیر تنظیم اسلامی کا یکم نومبر ۹۶ء کا خطاب جمعہ

مرتّب : محبوب الحق عاجز

خطبہ مسنونہ اور تلاوتِ آیات کے بعد فرمایا :

مجھے آج اپنے "دورۂ ایران کے تاثرات و مشاہدات" کے موضوع پر گفتگو کرنا ہے۔ یہ موضوع جہاں طوالت طلب ہے' وہاں نہایت نازک اور حساس بھی ہے' کیونکہ اس معاملے میں ذرا سا بھی ادھر ادھر ہو جانے سے بہت سے فتنے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اس حوالے سے میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ اپنے خیالات کو مرتب کر لوں۔ پھر یہ کہ اس دورے کے تاثرات و مشاہدات کے بیان سے قبل مجھے اس کا کچھ پس منظر بھی بیان کرنا ہے تاکہ پوری بات یکجا اور واضح ہو کر سامنے آ جائے۔ وقت محدود ہے' تاہم ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ "ماقلَّ ودَلَّ" کی کیفیت عطا فرما دے اور میں اپنے موضوع کو کم وقت میں سمیٹ لوں۔

سب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ سنی مسئلہ کے بارے میں اپنا ذاتی موقف ترتیب وار نکات کی صورت میں واضح کر دوں تاکہ بات سمجھنے میں آسانی رہے۔

پہلا نکتہ : حقیقی فرقے دو ہیں

میں نے بارہا کہا ہے اور اب بھی اس موقف پر قائم ہوں کہ مسلمانوں میں حقیقی فرقے صرف دو ہیں۔ ایک شیعہ اور دوسرا سنی! باقی تقسیمیں بھی اگرچہ موجود ہیں اور ان کے درمیان شاید محاذ آرائی بھی پائی جاتی ہے' تاہم وہ فرقے نہیں بلکہ مختلف

مکاتب فکر، مسالک اور فقہی مذاہب ہیں، جیسے حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی اور سلفی وغیرہ۔
اس کے بعد احناف میں دیوبندی اور بریلوی کی ذیلی تقسیم بھی ہے اور ان دونوں کے مابین شدید تلخی اور کشیدگی موجود ہے، لیکن یہ دونوں اصلاً ایک ہی فقہ اور مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں اور دونوں کے بنیادی تصورات تقریباً ایک جیسے ہیں۔ اہل تسنن کی طرح اہل تشیع میں بھی ذیلی تقسیم موجود ہے۔ مثلاً اسماعیلی اور اثنا عشری وغیرہ۔

دوسرا نکتہ : میرا تعلق اہل سنت سے ہے

جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں زور دے کر کہہ رہا ہوں کہ میں سنی مسلمان ہوں اور اہل سنت کی ذیلی تقسیموں سے قطع نظر اپنے نام کے ساتھ "اہل سنت" کا سابقہ برقرار رکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ فقہی معاملات میں اکثر و بیشتر میرا طرز عمل وہی ہے جو بڑے بڑے مسلم فلاسفہ اور متکلمین کا رہا ہے، جیسے امام رازی نے اپنے انتقال کے وقت کہا تھا : "اموتُ علٰی عقیدۃِ اُمّی" (میں اپنی والدہ کے عقیدہ پر جان دے رہا ہوں) یعنی مختلف کلامی بحثیں، ان کی تفاصیل اور دلائل اپنی جگہ لیکن ان کا بنیادی عقیدہ بقول ان کے وہی تھا جو ان کی والدہ کا تھا۔ بعینہٖ یہی معاملہ میرا ہے۔ فقہی معاملات میں اکثر و بیشتر میرا طرز عمل وہی ہے جو میرے والدین کا تھا۔ وہ حنفی المسلک تھے (غفراللہ لہم) میں بھی اکثر و بیشتر احناف کی پیروی کرتا ہوں۔

لیکن جن معاملات میں کسی وجہ سے تحقیق و تفتیش کی ضرورت پیش آجائے تو میں نے ان کے ضمن میں اپنے لئے دو باتیں طے کی ہیں۔

اولاً : یہ کہ اگر کوئی ایسا مسئلہ ہو جس پر اہل سنت کے چاروں مکاتب فکر حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی متفق ہوں تو وہ معاملہ اگرچہ عقلاً میری ذاتی رائے میں نہ آئے تب بھی اس میں تقلید کا پابند ہوں اور ان مسالک سے باہر نکلنے کو جائز نہیں سمجھتا، کیونکہ ایسا تو صرف مجتہد مطلق ہی کر سکتا ہے جبکہ میں تو "مجتہد" ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کرتا۔

ثانیاً : اگر کوئی ایسا معاملہ ہو جس کے متعلق ہمارے مکاتب فکر کے درمیان اختلاف رائے پایا جائے تو اس میں ترجیح کا معاملہ کر لیتا ہوں۔ جدید فقہی اصطلاح میں اسے

"تلفیق بین المذاہب" کہا جاتا ہے۔ اسے اگرچہ بعض لوگ جرم سمجھتے ہیں' لیکن حقیقت یہ ہے کہ عہد حاضر میں اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

اس اعتبار سے جس موقف پر میں ایران گیا تھا' اسی پر واپس آیا ہوں' میرے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اگرچہ میرے بعض تاثرات بہت گہرے ہیں اور ان سے میں نے اثر بھی قبول کیا ہے (جن کا تذکرہ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا) لیکن ان کا نتیجہ یہ نہیں کہ اہل تشیع کی طرف میرا کوئی میلان ہو گیا ہو یا ان کے ضمن میں میرے سابقہ موقف میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہو۔

جہاں تک تنظیم اسلامی کا تعلق ہے' مجھے اس کے اظہار میں کوئی باک نہیں ہے کہ یہ سنی مسلمانوں کی تنظیم ہے' البتہ یہ حنفی' شافعی' مالکی' حنبلی اور سلفی مسالک کے اختلافات سے بالاتر ہے۔ چنانچہ کوئی بھی مسلمان خواہ وہ کسی بھی مسلک سے تعلق رکھتا ہو' تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کر سکتا ہے۔

تیسرا نکتہ : من حیث الجماعت اہل تشیّع کی تکفیر جائز نہیں

اہل تشیع کی من حیث الجماعت تکفیر کا میں قائل نہیں ہوں اور نہ ہی میرا ماضی کا کبھی یہ موقف رہا ہے' بلکہ میں انہیں مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ سمجھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ سپاہ صحابہ پاکستان کے بانی مولانا حق نواز جھنگوی مرحوم کے جوش و جذبے اور خلوص و اخلاص کا میں بہت معترف اور قائل رہا ہوں لیکن اہل تشیع کی تکفیر کے بارے میں ان کے موقف سے مجھے کبھی اتفاق نہیں رہا۔ چنانچہ میں نے کبھی ان کے موقف کی تائید و حمایت نہیں کی۔ ان کی وفات کے بعد ایک تعزیتی جلسہ میں تقریر کے لئے مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن میں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں نے جب ان کی زندگی میں ان کے موقف کی تائید نہیں کی تو ان کے انتقال پر اپنی "سیاسی دوکان" چمکانے کے لئے جلسہ میں تقریر کرنا مجھے پسند نہیں ہے۔

جہاں تک انفرادی طور پر کسی شخص واحد کی تکفیر کا سوال ہے تو اس میں بنیادی اصول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی رائے کا قائل ہے جو خلاف اسلام ہے' لیکن وہ

۔ہیں کا اظہار نہیں کرتا بلکہ اسے چھپاتا ہے تو اس کی تکفیر بھی نہیں کی جا سکتی۔ البتہ کوئی شخص کسی خلاف اسلام عقیدہ کا قائل ہو' اور اس کا برملا اظہار بھی کرتا ہو تو اسے بلاریب کافر قرار دے کر دائرۂ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا۔ قادیانیوں کو اگرچہ من حیث الجماعت کافر قرار دیا گیا ہے لیکن ان کا معاملہ اہل تشیع سے بالکل مختلف ہے' اس لئے کہ انہوں نے برملا کہا تھا کہ ہم مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی مانتے ہیں۔

چوتھا نکتہ : شیعہ اور سُنّی مذاہب میں فرق

اب آیئے' اس سوال کا جائزہ لیتے ہیں کہ شیعہ اور سنی مذاہب میں کیا فرق ہے اور یہ فرق کس اعتبار سے ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے جہاں تک ایمانیات ثلاثہ یعنی ایمان باللہ' ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرۃ جیسے بنیادی عقائد کا تعلق ہے' ان میں اہل تشیع اور اہل سنت میں کوئی فرق نہیں ہے' البتہ بعض کلامی بحثوں میں اختلافات ضرور موجود ہیں۔ مثلاً ذات و صفات باری تعالیٰ کا مسئلہ' کہ آیا صفاتِ الٰہی اللہ تعالیٰ کا عین ہیں یا اللہ تعالیٰ سے جدا ہیں؟ بقول اقبال ؎

ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جدا یا عینِ ذات؟
امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

ذات و صفاتِ الٰہی کا یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ اور لاینحل ہے۔ اس حوالے سے ہمارے ہاں تین مکاتبِ فکر وجود میں آئے ہیں۔ ایک انتہا پر معتزلہ ہیں جن کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے الگ صفات الٰہی کا وجود ہے ہی نہیں' دوسری انتہا پر اشاعرہ ہیں اور درمیان میں ماتریدیہ ہیں۔ احناف زیادہ تر اسی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان تینوں مکاتب فکر کے نقطہ نظر میں اختلاف کے باوجود اشاعرہ اور ماتریدیہ نے معتزلہ کو گمراہ تو قرار دیا لیکن کبھی بھی ان کی تکفیر نہیں کی گئی۔ اسی طرح ایمانیات ثلاثہ کے ضمن میں اہل تشیع کے نقطہ نظر میں جزوی یا ثانوی اختلافات کی بنا پر انہیں کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

البتہ جہاں تک اہل تشیع کے "امامتِ معصومہ" کے عقیدہ کا تعلق ہے' وہ میرے نزدیک بالکل بے بنیاد اور سراسر غلط ہے۔ اس لئے کہ میرے نزدیک معصومیت صرف

خاصۂ نبوت و رسالت ہے۔ اب چونکہ نبوت و رسالت کا دروازہ ابدالآباد تک بند ہو چکا ہے اس لئے معصومیت کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ چنانچہ حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی اور علی رضوان اللہ علیہم اجمعین اگرچہ انتہائی برگزیدہ اور قابل احترام ہستیاں تھیں، لیکن اس کے باوجود ان میں سے کسی کو بھی "معصومیت" کی صفت سے متصف قرار نہیں دیا جا سکتا' ان سے بھی "اجتہادی" خطائیں ہو سکتی تھیں۔ اس عقیدہ کے حوالے سے تین باتیں قابل غور ہیں :

پہلی بات یہ کہ اگرچہ اہل تشیع امامت معصومہ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور اپنے ائمہ کو بعض ایسے خصائص اور صفات سے متصف قرار دیتے ہیں جو صرف نبوت کا خاصہ ہیں، تاہم وہ ائمہ کو نبی کے ہم پلہ نہیں کہتے۔ چنانچہ امامت معصومہ کا تصور بہرحال نبوت سے کم تر درجے کی چیز ہے۔ اس لئے اس بنا پر ان کی تکفیر نہیں کی جا سکتی۔ دیکھئے، قانونی اعتبار سے اصول یہ ہے کہ کسی جرم پر سزا دینے کے لئے اس جرم کی کوئی مقدار معین ہوتی ہے۔ مثلاً اسلام میں چوری کی سزا "قطع ید" ہے، لیکن اس کے لئے وضاحت کی گئی ہے کہ کتنی بڑی چوری پر اس سزا کا اطلاق ہو گا اور کون کون سی چوریاں اس سزا سے مستثنیٰ ہوں گی۔ مثال کے طور پر مشترکہ مال میں سے چوری پر ہاتھ نہیں کٹے گا۔ اگر کوئی شخص سڑک پر مال ڈال دیتا ہے، وہ غیر محفوظ ہے، اگر اسے کوئی شخص اٹھا کر لے جاتا ہے تو اس پر بھی ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، اس سے کم تر سزا دی جائے گی۔ کچھ اسی طرح کا معاملہ امامت معصومہ کا ہے کہ اس میں نبوت کی کچھ خصوصیات تو یقیناً مانی جاتی ہیں لیکن اسے نبوت تو نہیں مانا جاتا۔ لہٰذا اس سے شدید اختلاف کیا جا سکتا ہے، اسے انتہائی ضلالت و گمراہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس بنا پر کسی کی تکفیر نہیں کی جا سکتی۔

دوسرے یہ کہ امامت معصومہ کا وہ تصور جس کی بنا پر امام کو نبی کا مقام دیا جاتا ہے، وہ صرف "آغا خانیوں" کے ساتھ مخصوص ہے، جن کے امام حاضر پرنس کریم آغا خان ہیں۔ وہ جب پاکستان آتے ہیں تو انہیں ایک صدر مملکت کی طرح پروٹوکول دیا جاتا ہے، انہیں C130 جہاز دیا جاتا ہے جس کے ذریعے وہ لاہور سے گلگت اور چترال جاتے ہیں، انہیں معصوم عن الخطا سمجھا جاتا ہے، احکام شریعت میں کمی بیشی اور حلال و حرام کے بارے میں

انہیں صاحب اختیار تسلیم کیا جاتا ہے اور ان کی ہر بات قابل اتباع سمجھی جاتی ہے۔ امامتِ معصومہ کا یہ عقیدہ تو بلاشبہ بدترین گمراہی ہے، لیکن یہ صرف آغا خانیوں کے ساتھ خاص ہے۔

تیسرے یہ کہ ہمارے ہاں کے اثنا عشری شیعہ اور اہل سنت کے درمیان اس اعتبار سے تھوڑا سا فرق رہ جاتا ہے کہ ان کے پہلے گیارہ امام تو اسلام کے ابتدائی اڑھائی سو برسوں کے دوران آگئے، لیکن ان کا بارھواں امام معصوم ابھی تک "غائب" ہے۔ گویا وہ ساڑھے بارہ سو برس سے کسی ایسے امام کے بغیر زندگی گزار رہے ہیں جو معصوم عن الخطا ہو، جس کا حکم ماننا لازم ہو، جس کو مامور من اللہ سمجھا جائے، اور جو قرآن کی تشریح و توضیح کر سکے۔ چنانچہ اب ان کے لئے صرف ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ وہ اجتہاد کریں۔ یہ اجتہاد ہمارے اور ان کے مابین مشترک ہے۔ ہم بھی کتاب و سنت سے اجتہاد کریں گے اور وہ بھی کتاب و سنت سے اجتہاد کریں گے۔ البتہ ان کے سنت کے ذرائع (Sources) ہم سے مختلف ہے۔

اجتہاد کے ضمن میں اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا جانا چاہئے کہ اجتہاد کے ادارے (Institution) کو فی الواقع صرف اہل تشیع نے زندہ رکھا ہے۔ اہل سنت نے تو عرصہ دراز سے اپنے اوپر اس کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔

پانچواں نکتہ : مہدی کے بارے میں دونوں فرقوں کا عقیدہ

جہاں تک "الامام المہدی" کی شخصیت کا تعلق ہے، اس پر اہل سنت اور اہل تشیع دونوں کا اس اعتبار سے اتفاق ہے کہ قیامت سے قبل ایک بڑی شخصیت ظاہر ہوگی۔ البتہ اس بارے میں ہمارے اور اہل تشیع کے نقطہ نظر میں یہ فرق ہے کہ ہم "مہدی" کو مجدد مانتے ہیں، میرے نزدیک وہ آخری اور کامل مجدد ہوں گے، جبکہ اہل تشیع سمجھتے ہیں کہ یہ وہ بارہ سو برس سے روپوش رہنے والے "امام غائب" ہیں، جو ظاہر ہوں گے۔ گویا وہ انہیں معصوم بھی سمجھتے ہیں لیکن ہم معصوم نہیں سمجھتے۔

امام مہدی کی آمد کے حوالے سے ایک واقعہ لطیفہ کے طور پر ملاحظہ کیجئے۔ میں نے

ایک شیعہ عالم دین سے پوچھا کہ اگر آپ کے عقیدے کے مطابق وہی امام غائب حاضر ہو جائیں اور دعویٰ کریں کہ میں مہدی ہوں تو کیا سارے شیعہ انہیں تسلیم کرلیں گے؟ انہوں نے ہنس کر کہا: "نہیں! بہت سے یہ کہہ دیں گے کہ ہمیں تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے"۔ (گویا "امام غائب" کے نام سے اپنی دوکان چمکانے کی بات اور ہے اور ان کے "ظہور" پر انہیں فی الواقع مان لینا دوسری بات ہے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل یہودی حضورؐ کی آمد کے منتظر تھے لیکن چونکہ آپؐ پر ایمان لانے سے ان کی چودھراہٹیں اور قیادتیں داؤ پر لگ رہی تھیں' اس لئے ایمان نہیں لائے۔)

اہل تشیع اور اہل سنت میں یہ بات بھی مشترک ہے کہ مہدی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی نسل سے ہوں گے۔ پھر یہ کہ عرب کے مقدس شہر مکہ مکرمہ میں ان کا ظہور ہوگا۔ گویا عملی اعتبار سے امامت معصومہ کے بارے میں کوئی بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ عقیدے کے اعتبار سے دونوں فرقوں میں اگرچہ کچھ فرق ضرور ہے تاہم بالفعل وہ بھی نظر نہیں آتا۔

اس ضمن میں یہ بات بھی اہم ہے کہ جہاں تک قرآن حکیم کی محفوظیت کا تعلق ہے اس پر کم از کم اہل تشیع کے وہ علماء جو اس وقت ایران میں برسراقتدار ہیں قطعاً کسی شک و شبہ کا اظہار نہیں کرتے۔ ان کے علاوہ کسی کے ذہن میں کوئی اشکال ہو تو دوسری بات ہے۔

چھٹا نکتہ: خلفائے راشدین کے بارے میں دونوں فرقوں کا نقطۂ نظر

اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین اصل بنائے نزاع صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بالخصوص خلفائے راشدین کی حیثیت کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر ہے۔ اور اس ضمن میں دونوں فرقوں کے مابین شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یہ گویا شخصیات کے بارے میں تاریخی نزاع ہے۔ یہ ایسا ہی اختلاف ہے جیسے دیوبندیت اور بریلویت کا سارا اختلاف' جو گزشتہ صدی کی دو شخصیات شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا فضل حق خیر آبادی اور موجودہ صدی کی دو شخصیات مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا احمد رضا خان بریلوی کی وجہ

سے پیدا ہوا ہے۔ ورنہ دونوں گروہوں کے عقائد و نظریات میں کوئی قابل ذکر فرق موجود نہیں ہے' بلکہ شخصیات کے اس نزاع سے پہلے بریلویت کا کہیں نام و نشان تک موجود نہیں تھا۔ اسی طرح اس بار راولپنڈی میں ہمارے سالانہ اجتماع کے موقع پر ایک ممتاز شیعہ عالم دین نے واضح کیا کہ ان کے نزدیک امامت اور خلافت میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے' بلکہ امامت' خلافت اور امارت ایک ہی شے کے تین نام ہیں۔ لیکن شخصیات کے بارے میں اختلاف بہرحال موجود ہے۔

خلفائے راشدین کی خلافت کے بارے میں تمام مسلمانوں میں تین قسم کے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ ایک انتہا پر غالی شیعہ ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ حضرت علیؓ پہلے امام بھی ہیں اور اصلاً پہلے خلیفہ بھی' حضورؐ کے بعد آپؐ کی خلافت بلافصل انہی کا حق تھا' لیکن ابوبکر' عمر اور عثمان (رضی اللہ عنہم) نے ہر بار ان کا حق غصب کر کے خلافت حاصل کر لی۔ اس طرح یہ تینوں خلفاء (معاذ اللہ) غاصب تھے اور ان کی خلافت باطل تھی۔ رہا معاملہ حضرت علیؓ کا ان اصحاب کی بیعت کرنے کا' تو آپؓ نے محض تقیہ کے طور پر' ایک وقتی مجبوری اور مصلحت کے تحت بیعت کی' ورنہ انہوں نے کبھی دل سے اصحابِ ثلاثہ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا۔ اہل تشیع کے عوام کی اکثریت اسی موقف پر قائم ہے۔ اور یہی دونوں فرقوں کے درمیان بنیادی وجہ نزاع ہے۔

اس کے مقابلے میں دوسری انتہا پر وہ متشدد مکتب فکر ہے جو ماضی قریب میں اہل سنت میں پیدا ہو گیا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ اقتدار کے بھوکے تھے' حضرت حسینؓ بھی اقتدار کے حریص اور باغی تھے' لہٰذا وہ واجب القتل تھے۔ یہ لوگ تعداد میں بہت کم ہیں۔ ایسے دریدہ دہن لوگ چاہے ناصبی ہوں یا کوئی اور ہوں' میرے نزدیک یہ دراصل غالی شیعہ کے موقف کا ایک ردعمل ہے۔

اس ردعمل کا خاص تاریخی پس منظر ہے۔ ۱۹۷۹ء میں جب ایران میں انقلاب آیا تو اس کے نتیجے میں پاکستان میں اہل تشیع کے حوصلے بہت بلند ہو گئے اور انہوں نے بڑے جارحانہ انداز میں کوششیں شروع کر دیں کہ پاکستان میں بھی ایرانی طرز کا انقلاب لایا جائے۔ اہل سنت میں اس کا سخت ردعمل پیدا ہوا۔ اس ردعمل کا ایک مظہر سپاہ صحابہ کا

قیام ہے اور اس کا دوسرا ردعمل ان لوگوں کی صورت میں ظاہر ہوا جن کی اکثریت حدیث اور سنت کی منکر ہے' لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو سنی کہلواتے ہیں۔ یہ حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کی توہین کرتے ہیں اور انہیں اقتدار کے حریص گردانتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر بھی انتہائی گھناؤنا اور اہل سنت کے اجماعی موقف کے خلاف ہے۔

صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدین (رضی اللہ عنہم اجمعین) کے بارے میں تیسرا نقطۂ نظر اہل سنت کی اکثریت کا ہے۔ مذکورہ بالا دو انتہاؤں کے مابین نقطہ ہائے نظر کے بہت سے shades ہیں' لیکن ان کے درمیان یہ بات متفق علیہ ہے کہ نہ تو اصحاب ثلاثہؓ غاصب تھے اور نہ ہی حضرت علیؓ اقتدار کے حریص تھے' بلکہ چاروں خلفاء "راشد" اور برحق تھے۔ اہل سنت کی اکثریت حضرت علی' حضرت فاطمہ اور حضرات حسنین (رضی اللہ عنہم) سے محبت رکھتی ہے' ان کی عظمت اور زہد و تقویٰ کی قائل ہے اور ان کی محبت کو جزو ایمان سمجھتی ہے۔ چنانچہ ہمارے عوام کے ہاں تو جمعہ کے خطبوں میں بھی اکثر یہی چیزیں ملتی ہیں : "وفاطمةُ سیدةُ نساءِ اهلِ الجنة' وسیدا شبابِ اهل الجنة الحسن والحسین" چنانچہ اس میں شک نہیں کہ اہل سنت کے عوام کی اکثریت معتدل نقطہ نظر کی حامل ہے۔

ہمارے اسلاف میں سے بعض بڑی علمی شخصیات بھی معتدل نقطہ نظر کی حامل رہی ہیں۔ مثلاً شاہ ولی اللہ دہلویؒ برعظیم پاک و ہند کی ممتاز علمی شخصیت ہیں' میری نگاہ میں ان کا جو مقام و مرتبہ ہے اس سے آپ حضرات بخوبی واقف ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگر میری طبیعت کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تو میں صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت علیؓ کی افضلیت کا قائل ہوتا' لیکن مجھے حکم ہوا ہے کہ صاحبین (حضرت ابوبکر و عمرؓ) کی افضلیت کا اقرار کروں' اس لئے اگرچہ میلان طبع حضرت علی کی طرف ہے لیکن صاحبین کی افضلیت کا اقرار کر رہا ہوں۔ اس طرح سے شاہ صاحبؒ نے اپنا میلان طبع بھی ظاہر کر دیا اور "تفضیلی" کہلانے سے بھی بچ گئے۔

پھر علامہ اقبال کا معاملہ اس بھی آگے کا ہے۔ انہوں نے "اہل بیت" کی (واضح

رہے کہ میں یہاں اہل بیت کی اصطلاح اہل تشیع کے مفہوم میں استعمال کر رہا ہوں) جس قدر مدح و ثنا کی ہے اس نسبت سے دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی نہیں۔ چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق کہتے ہیں ؎

مریم از یک نسبتِ عیسیٰؑ عزیز
از سہ نسبت حضرتِ زہرا عزیز

یعنی حضرت مریمؑ تو ہمیں ایک نسبت سے عزیز ہیں کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ ہیں، جبکہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ ہمیں تین نسبتوں سے عزیز ہیں (یعنی وہ محمد ﷺ کی بیٹی، حضرت علیؓ کی بیوی اور حضرات حسنینؓ کی والدہ ہیں)۔ اسی طرح ایک اور مقام پر کہتے ہیں ؎

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ

اور ؎

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری!

ایسے اشعار کی وجہ سے بعض لوگ اقبال پر بھی "تفضیلی شیعہ" ہونے کا لیبل لگاتے ہیں۔ مجھے بھی ان کے بعض اشعار سے اختلاف ہے۔ تاہم انہوں نے صرف حضرات اہل بیت ہی کی مدح نہیں کی بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مدح میں بھی اشعار کہے ہیں۔ یہ اشعار تعداد میں اگرچہ کم ہیں لیکن وزن میں کئی اشعار پر بھاری ہیں۔ مثلاً ایک شعر ملاحظہ کیجئے ؎

ہمّتِ او کشتِ ملت را چوں ابر
ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر

بلاشبہ حضور ﷺ کے انتقال کے بعد اسلام کی کھیتی مردہ ہو رہی تھی۔ جھوٹی نبوت کے دعویدار کھڑے ہو گئے تھے، مانعینِ زکوٰۃ کا فتنہ زور پکڑ گیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حجاز کے چند شہروں کے سوا پورا جزیرہ نمائے عرب ارتداد کا شکار ہو گیا ہو۔ اسلام کی اس

کسمپرسی کے دور میں کس کی ہمت تھی کہ اسلام کا دفاع اور تحفظ کرتا۔ یہ حضرت ابو بکرؓ ہی تھے جنہوں نے جوانمردی سے ان فتنوں کا مقابلہ کیا اور ملت کی کھیتی کو اس طرح سیراب کیا جس طرح بادل کے برسنے سے مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے مصرعے میں علامہ اقبال نے آپؓ کے لئے چار الفاظ "ثانی اسلام و غار و بدر و قبر" استعمال کئے ہیں۔ یعنی آپؓ اسلام میں داخل ہونے والے بھی آنحضورؐ کے بعد پہلے شخص ہیں۔ آپؓ نے حضرت خدیجہؓ اور حضرت علیؓ سے بھی پہلے اسلام قبول کیا۔ غار ثور میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ "ثانی اثنین" ہونے کا شرف آپؓ کو ہی حاصل ہے۔ غزوۂ بدر کی رات جب حضورؐ اپنی جھونپڑی میں سجدہ ریز تھے تو باہر تلوار لے کر ابو بکرؓ ہی پہرہ دے رہے تھے۔ پھر آنحضور ﷺ کے بعد روضہ اطہر میں تدفین کا شرف بھی سب سے پہلے ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی کو حاصل ہوا۔ اس طرح یہ چار نسبتیں ہیں جن میں ابو بکرؓ کو رسول اللہ ﷺ کا "ثانی" ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

اہل تشیع کے ہاں جو مختلف ذیلی فرقے ہیں ان میں ایک زیدی شیعہ کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ بھی معتدل رائے کے قائل ہیں۔ یہ لوگ تفضیلی ہیں۔ یعنی ان کی رائے یہ ہے کہ اگرچہ خلافت حضرت علیؓ کا حق تھا، لیکن جب انہوں نے حضرت ابو بکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ اور عثمان غنیؓ کی خلافت قبول کر لی تو اب اصحاب ثلاثہؓ کی خلافت بھی برحق ہے۔ چنانچہ وہ ان خلفاء راشدین کو غاصب نہیں کہتے، صرف حضرت علیؓ کی افضلیت کے قائل ہیں۔

اس وقت موجودہ ایران میں جدید دانشوروں کی اکثریت کو میں نے اس ضمن میں معتدل پایا ہے۔ علماء میں سے بھی بعض معتدل ہیں، البتہ بعض ابھی تک غالی ہیں۔ عوام کی غالب اکثریت غالی شیعوں پر مشتمل ہے۔ معتدل شیعہ کے حوالے سے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہمارے محدثین نے ان کی روایات کو قبول کیا ہے۔ خاص طور پر امام بخاریؒ کے بارے میں کتب تاریخ میں آتا ہے کہ انہوں نے بہت سے معتدل شیعہ راویوں سے روایات قبول کی ہیں اور بخاری شریف میں درج کی ہیں۔ یہ طرز عمل ہمارے محدثین کے اعتدال کی علامت ہے۔ اسی بنا پر اہل سنت کا ایک متشدد گروہ جو حضرت علیؓ اور

حضرت حسینؓ کو حریص اقتدار قرار دیتا ہے، صحیح بخاری کی روایات پر اعتراض کر رہا ہے۔

ساتواں نکتہ : مقام صحابہؓ اور تنظیم اسلامی

جہاں تک خلفاء اربعہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں تنظیم اسلامی کے موقف کا تعلق ہے، تو ہم بلاخوف لومۃ لائم کہتے ہیں کہ تنظیم اسلامی سنی مسلمانوں کی تنظیم ہے، اس لئے اس معاملے میں اس کے عقائد و نظریات وہی ہیں جو جمہور اہل سنت کے ہیں۔ ان سب کا تذکرہ "تعارف تنظیم اسلامی" نامی کتاب میں کر دیا گیا ہے۔ کتاب ہذا میں ایمانیات پر مفصل بحث کی گئی ہے اور یہ چیز بہت اہم ہے، اس لئے کہ اگرچہ ہر مسلمان "ایمان" کا بنیادی اور اساسی مفہوم تو سمجھتا ہے لیکن ایمانیات کی تفصیلات اور جزئیات کے حوالے سے بہت سی باتیں عام لوگوں کے علم میں نہیں ہیں۔ مثلاً ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن ایمان باللہ کے معنی کیا ہیں؟ ہم ملائکہ پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن اس کا کیا مفہوم ہے؟ ہم آخرت کو مانتے ہیں، لیکن اس کا کیا مطلب ہے؟ ہم نبوت و رسالت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن اس کے تقاضے کیا ہے؟ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے لوازم کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان چیزوں سے عام مسلمان آگاہ نہیں ہیں۔ ہم نے ان چیزوں کو مرتب کرتے ہوئے جماعت اسلامی کے دستور سے بھی راہنمائی لی ہے، اس لئے کہ "الحکمۃ ضالۃ المومن" کے مصداق خیر اور بھلائی جہاں سے بھی ملے اسے لے لینا چاہئے۔ لیکن جماعت اسلامی کے دستور میں یہ ایک بہت بڑا خلا ہے کہ وہاں ایمانیات کی بحث سرے سے وجود ہی نہیں۔ چنانچہ ہم نے اپنے ہاں اس بحث کو شامل کیا ہے۔ باقی کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت کے معانی کیا ہیں، اللہ کو الٰہ ماننے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اللہ تسلیم کرنے کے معنی کیا ہیں، اس ضمن میں واقعتاً وہاں بڑی اچھی تعبیر و تشریح موجود ہے۔

ایمان بالرسالت کے متضمنات میں ہم نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ یہ تسلیم کیا جانا بھی ضروری ہے کہ آپؐ نے جو نظام عدل اجتماعی قائم فرمایا اور جو بعد میں خلافت راشدہ کے دوران قائم رہا، وہی دین حق کی صحیح ترین اور واحد مسلمہ تعبیر ہے۔ یعنی خلافت راشدہ

فی الواقع خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تھی اور رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے فیضیاب ہونے والے ان خلفاء الراشدین المہدیین کی سنت بھی آنحضورؐ کے بعد دین میں حجت کا درجہ رکھتی ہے۔ جیسے کہ حضورؐ نے خود فرمایا :

((علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین))

"تم پر میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء کی سنت کی پیروی لازم ہے"۔

ایمان بالرسالت کا دوسرا تقاضا یہ بھی ہے کہ یہ یقین رکھا جائے کہ آنحضورؐ کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ سے براہ راست فیضیاب ہونے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم من حیث الجماعت پوری امت میں افضلیت مطلقہ کے حامل ہیں اور کوئی غیر صحابی' خواہ وہ تقویٰ و تدین میں کتنے ہی بلند مقام پر فائز ہو' کسی صحابی سے افضل نہیں ہو سکتا۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ہوں' شیخ علی ہجویریؒ ہوں یا معین الدین اجمیریؒ' کسی بھی بزرگ ہستی کو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی سے افضل قرار نہیں دیا سکتا۔ صحابہ کی محبت ہمارا جزوِ ایمان ہے۔ ان کی تعظیم و توقیر حضورؐ کی تعظیم ہے' اور ان سے بغض و عداوت اور ان کی تحقیر نبی ﷺ سے بغض عداوت اور آپؐ کی توہین ہے۔ چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں حضورؐ کا فرمان ہے :

((من احبھم فبحبی احبھم' ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم))

یعنی "جس کسی نے ان سے محبت رکھی تو میری محبت کی وجہ سے محبت رکھی' اور جس کسی نے ان سے عداوت رکھی تو میری عداوت کی وجہ سے عداوت رکھی۔"

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ صحابہ کرامؓ کے درمیان جزوی فضیلت کے بہت سے پہلو ہو سکتے ہیں' لیکن ان کے پاس کلی فضیلت متعین طور پر اس طرح ہے کہ عام صحابہؓ پر ایک اضافی درجہ فضیلت ان پندرہ سو یا اٹھارہ سو اصحاب بیعت رضوان کو حاصل ہے' جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ لینے کے لئے آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اس بیعت کو تاریخ میں "بیعت رضوان" یا "بیعت علی الموت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان اصحاب پر ایک مزید درجہ فضیلت ۳۱۳ اصحاب بدر

کو حاصل ہے۔ پھر "عشرہ مبشرہ" سے موسوم دس صحابہؓ اصحاب بدر پر ایک درجہ فضیلت رکھتے ہیں۔ اور عشرہ مبشرہ میں سے ایک خاص درجہ فضیلت خلفاء اربعہ کو حاصل ہے۔ خلفاء کے مابین افضلیت ترتیب خلافت کے لحاظ سے ہے۔ یعنی افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں' ان کے بعد حضرت عمر فاروق اعظم ہے' پھر حضرت عثمان ذوالنورینؓ اور پھر حضرت علیؓ ہیں۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم اجمعین!)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ تمام عدول ہیں۔ ان کے مابین جو اختلافات اور نزاعات پیدا ہوئے وہ نفسانیت اور حرص اقتدار کی بنا پر نہیں' بلکہ اجتہادی خطا کی بنا پر ہوئے تھے۔ چنانچہ نہ تو حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ حریص اقتدار تھے اور نہ ہی امیر معاویہؓ ۔ اس لئے ہمارے نزدیک کسی کو بھی سب و شتم اور الزام و اتہام کا نشانہ بنانا جائز نہیں۔ کسی واقعی یا حقیقی ضرورت کے تحت ان اصحاب کے نزاعات کو زیر بحث لاتے ہوئے اگرچہ ان میں کسی ایک کو مصیب (یعنی صحیح رائے پر) اور دوسرے کو مخطی (یعنی غلطی پر) قرار دیا جا سکتا ہے' مگر یہ خطا اجتہادی ہو گی۔ تاہم ہمارے نزدیک محتاط ترین طرز عمل یہ ہے کہ ان اصحاب کے باہمی اختلافات اور جنگوں کے حوالے سے کف لسان سے کام لیا جائے اور زبان کھولنے کی بجائے کامل سکوت اختیار کیا جائے۔

آٹھواں نکتہ : فقہ جعفریہ اور فقہ اہل سنت میں اختلاف کی حقیقت

جہاں تک فقہ کا تعلق ہے میری رائے میں' میرے علم کی حد تک فقہ جعفریہ میں ایک "متعہ" کے مسئلہ کے علاوہ کوئی ایسی شے نہیں ہے جو کسی نہ کسی سنی فقہ میں موجود نہ ہو۔ اگر کوئی فرق ہے تو وہ اسی نوعیت کا ہے جو حنفی' حنبلی' مالکی اور شافعی فقہوں کے درمیان ہے۔ یہ موقف میرا پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔

ضیاء الحق صاحب کی مجلس شوریٰ کا ایک واقعہ لطیفے کے درجے میں پیش کر رہا ہوں۔ وہاں پر حق شفعہ کا بل زیر غور تھا۔ ایک موقع پر سید محمد رضی مجتہد نے' جو اہل تشیع کے

بہت بڑے عالم ہیں' اپنی تقریر میں یہ کہا چار فقہیں سنیوں کی ہیں اور ایک شیعوں کی۔ اور مسئلہ زیر بحث میں ساڑھے تین کا موقف ایک طرف ہے اور ڈیڑھ کا موقف دوسری طرف ہے۔ یعنی اس مسئلے میں جو رائے حنفی فقہ کی تھی اس کی تائید میں صرف نصف رائے اور تھی' جبکہ جو رائے فقہ جعفریہ کی تھی اس کی تائید میں سنی فقہوں میں سے اڑھائی آراء موجود تھیں۔ تو انہوں نے اسے اس طرح پیش کرتے ہوئے کہا کہ ساڑھے تین ایک طرف ہیں اور صرف ڈیڑھ دوسری طرف ہے' لہذا اکثریت کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے۔ اس پر میں نے کہا کہ لیجئے صاحب آج مسئلہ حل ہو گیا! میرے نزدیک پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ فقہی اختلافات ہیں اور ان میں بھی خاص طور پر شیعہ اور سنی کا اختلاف۔ اگر اہل تشیع یہ بات مستقل طور پر مان لیں کہ جس مسئلے میں پانچ فقہوں میں سے تین متفق ہوں اس کا فیصلہ ان تین کے مطابق کر دیا جائے تو مجھے ان کا استدلال قبول ہے۔ لیکن وہ عالم فوراً کہنے لگے کہ نہیں نہیں' ہمیں یہ بات مستقل طور پر منظور نہیں۔ اس پر وہاں ایک زبردست قہقہہ لگا۔ اس لئے کہ یہ تو پھر موقع پرستی ہوئی تاکہ ایک مسئلے میں آپ خود جو دلیل دے رہے ہیں اسے مستقل طور پر ماننے کے لئے تیار نہیں۔

نواں نکتہ : شیعہ سنی مفاہمت کی اہمیت

جیسا کہ بارہا واضح کیا گیا ہے کہ میرے نزدیک پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر نیو ورلڈ آرڈر یعنی نئے عالمی یہودی مالیاتی استعمار کا سدباب اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ اہل تشیع اور اہل تسنن کے مابین مفاہمت نہ ہو جائے۔ چنانچہ میرے نزدیک شیعہ سنی مفاہمت وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ قرآن کریم میں نبی اکرم ﷺ کو اہل کتاب کے ساتھ مفاہمت کے لئے یہ اصول دیا گیا ہے:

﴿قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ ۚ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا

مُّسۡلِمُوۡنَ۝﴾ (آل عمران:۶۴)

"(اے پیغمبرﷺ) تم کہہ دو کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا اپنا رب نہ مانے، پھر اگر (یہ لوگ اس بات سے) روگردانی کریں تو (مسلمانو! ان سے) کہہ دو کہ گواہ رہنا کہ (انکار تمہاری طرف سے ہے) ہم تو اللہ کے فرماں بردار ہیں"۔

اندازہ کیجئے کہ اگر اہل کتاب سے مفاہمت ممکن ہے بلکہ اس کا حکم دیا جا رہا ہے تو ان لوگوں کے ساتھ اشتراک و اتحاد کیونکر نا ممکن ہے جو مسلمان ہیں اور رسالت محمدیؐ میں ہمارے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا رخ کیا ہے اور قرآن مسلمانوں میں کس چیز کو فروغ دینا چاہتا ہے۔

سورۂ آل عمران ہی کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ میں امت مسلمہ کے لئے ایک سہ نکاتی لائحہ عمل بیان کیا گیا ہے جن میں سے درمیانی آیت میں اعتصام بحبل اللہ یعنی تمسک بالقرآن اور باہم اتحاد و اتفاق کا حکم بایں الفاظ دیا گیا ہے:

﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ۚ وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ كُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا ۚ وَكُنۡتُمۡ عَلٰى شَفَا حُفۡرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَكُمۡ مِّنۡهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ۝﴾

"اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے، پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کے فضل (و کرم) سے بھائی بھائی بن گئے۔ (تمہارا حال تو یہ تھا کہ) تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے لیکن اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اپنی نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاجاؤ"۔

یہ آیت جس پس منظر میں نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ قبول اسلام سے قبل اہل عرب میں

شدید اختلافات ' انتشار اور جنگ و جدال پایا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دولت اسلام سے مالا مال کر کے جہنم کے گڑھے میں گرنے سے بچالیا۔ آج اگر ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیں تو یہ آیت ہم پر صادق آتی ہے۔ شیعہ سنی اختلافات انتہائی گمبھیر ہوتے جا رہے ہیں۔ پاکستان کے علاوہ افغانستان میں بھی یہ مسئلہ جنگ و جدال کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے اور اس اختلاف کی خلیج مزید گہری ہوتی جا رہی ہے۔ اسی کا مظہر مسئلہ افغانستان پر تہران میں منعقدہ کانفرنس میں ایرانی فارن پالیسی کمیشن کے وائس چیئرمین محمد جواد کا وہ بیان ہے جس میں انہوں نے مسئلہ کشمیر پر کھل کر بھارتی موقف کی حمایت کی ہے۔ بھارتی وفد سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہمارا موقف یہ ہے کہ کشمیری مسلمانوں کو مکمل مذہبی اور سیاسی آزادی ہونی چاہئے' لیکن انہیں ہندوستان کی بڑی فیملی کے اندر ہی رہنا چاہئے۔

درحقیقت اس وقت عالمی مالیاتی یہودی استعمار کی سوچی سمجھی سکیم یہ ہے کہ :

اولاً : مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کو ہوا دی جائے تاکہ یہ کبھی بھی واحد قوت نہ بن سکیں اور ہمیں چیلنج نہ کر سکیں۔

ثانیاً : مسلمان ممالک سے چین کے تعلقات ختم کر دیئے جائیں۔

یہودی رفتہ رفتہ اپنی اس سکیم میں کامیاب ہو رہے ہیں' کیونکہ ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اس کا ایک مشاہدہ افغانستان کی موجودہ سیاسی صورتحال کے تناظر میں کیا جا سکتا ہے۔ دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اگر افغانستان میں طالبان کوئی مستقل' پائیدار اور مستحکم حکومت قائم کر لیں تو وہ ایک کٹر سنی حنفی علماء کی حکومت ہوگی۔ اس کے مقابلے میں ایران میں پہلے سے شیعہ علماء کی حکومت قائم ہے۔ گویا اب ایک طرف شیعہ علماء کی اور دوسری طرف کٹر سنی علماء کی حکومت ہوگی اور اس کا لامحالہ نتیجہ دونوں ممالک کے درمیان شدید اختلافات اور کشیدگی کی صورت میں برآمد ہو سکتا ہے۔ اور یہی چیز عالمی قوتوں کو مطلوب ہے۔

بہرحال احیائے اسلام اور غلبہ دین حق کے لئے شیعہ سنی مفاہمت اور اتحاد کا میں سختی سے پہلے بھی قائل تھا اور اب مزید قائل ہوتا جا رہا ہوں' اس لئے کہ اس کے بغیر نہ

یہاں اسلام آسکتا ہے اور نہ ہی نیو ورلڈ آرڈر کے زیر عنوان نئے عالمی یہودی مالیاتی استعمار کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا راستہ روکا جاسکتا ہے۔

شیعہ سنی مفاہمت کی اہمیت کے پیش نظر میرا ایک "خیال" ہے کہ تنظیم اسلامی تو اگرچہ ایک خالصتاً سنی المسلک تنظیم ہے' اس کے عقائد وہی ہیں جو اہل سنت کے ہیں لیکن تحریک خلافت میں شیعہ حضرات کو بھی جمع کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ تاحال ایک خیال اور رائے ہے' اسے فیصلہ کی شکل نہیں دی گئی' تاہم اس پر جزوی طور پر عمل ہو رہا ہے۔ چنانچہ ہم خلافت کے جلسوں میں اہل تشیع مقررین کو بھی بلا رہے ہیں۔

آخری نکتہ : پاکستان میں اہل تشیع کی حیثیت

آخری نکتہ یہ ہے کہ پاکستان میں اہل تشیع کو وہی حیثیت دستوری اور قانونی طور پر تسلیم کرلینی چاہئے جو حکومت ایران نے وہاں اہل سنت کو دی ہے۔ یعنی پاکستانی اہل تشیع کو بھی یہاں اکثریتی فقہ کے نفاذ کے ایرانی فارمولا کو برضاو رغبت قبول کرلینا چاہئے۔ میں نے علامہ ساجد نقوی صاحب سے اپنی ایک گزشتہ ملاقات میں بھی اپنے اس موقف کا اعادہ کیا ہے اور ایران میں بھی وہاں کی سب سے بڑی مذہبی شخصیت آیت اللہ خامنہ ای سمیت جس سے بھی ملا ہوں اس کے سامنے کھل کر اپنے موقف کا اظہار کیا ہے۔ میں نے آیت اللہ خامنہ ای سے اپیل کی کہ وہ اپنے اثر رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے پاکستان کے شیعہ حضرات کو بھی اسی بات پر آمادہ کریں۔

سفر ایران کا پس منظر

میرے حالیہ دورۂ ایران کا مختصر سا پس منظر یہ ہے کہ اگرچہ ایک زمانے میں میرا شمار بھی غالی اور متشدد سنیوں میں کیا جاتا تھا' تاہم یہ بات پہلے بھی غلط تھی اور رفتہ رفتہ اس کی غلطی مزید واضح ہوتی گئی۔ خاص طور پر جب مسئلہ کشمیر کے بارے میں اخبارات میں میرے یہ بیانات سامنے آئے کہ ہمیں چاہئے کہ اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم کی بجائے چین کے بہتر تعلقات کو استعمال کرکے بھارت سے دو طرفہ مذاکرات کے ذریعے یہ مسئلہ حل

کریں اور پاکستان' ایران' افغانستان اور روسی ترکستان پر مشتمل ایک مضبوط اسلامی بلاک بنائیں' تو اس کے بعد اہل تشیع کے دلوں میں میرے لئے مزید نرم گوشہ پیدا ہوا ہے۔ اس کے نتیجے میں خاص طور پر لاہور میں ایرانی قونصلیٹ کی طرف سے مجھے متعدد بار اپنے ہاں منعقد ہونے والی تقاریب میں شرکت کی دعوت موصول ہوتی رہی۔ براہ راست ایران سے بھی دعوت نامے آئے' آیت اللہ خمینی کی برسی کی تقریب میں شرکت کی دعوت بھی آئی' لیکن میں نے اس موقع پر صاف کہہ دیا کہ چونکہ میں برسی منانے کو بدعت سمجھتا ہوں اس لئے پاکستان میں بھی کسی کی برسی میں شریک نہیں ہوتا' لہٰذا آپ کے پروگرام میں بھی شرکت نہیں کر سکتا۔ دیگر تقریبات اور کانفرنسوں میں شرکت سے بھی معذرت کرتا رہا ہوں کہ میں تقریبات اور کانفرنسوں کا آدمی نہیں ہوں' اس لئے کہ میں عالم دین ہوں نہ دانشور' بلکہ ایک خادم دین اور طالب قرآن ہوں' تاہم میں انقلاب ایران کے بعد کے ایران کو دیکھنا ضرور چاہتا ہوں کہ انقلاب کے بعد کیا ہوا اور کیسے ہوا؟ چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ آپ مجھے علیحدہ کبھی بلائیں گے تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔

گزشتہ سال ہمارے ہاں آیت اللہ واعظ زادہ خراسانی تشریف لائے' ان کی شخصیت سے میں بہت متاثر ہوا۔ انہوں نے قرآن کالج کے طلبہ سے خطاب بھی کیا۔ ان کی تقریر کے دوران شیعہ سنی مسئلہ کے بارے میں ان کا بھی وہی موقف سامنے آیا جو میں یہاں عرصے سے پیش کر رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ آیت اللہ خمینی صاحب کا بھی یہی موقف تھا کہ ہر ملک میں قانون عامہ (Public Law) اکثریت کے فقہی تصورات اور تعبیرات کے مطابق ہونا چاہئے' البتہ نجی قانون (Personal Law) میں سب کو آزادی دی جائے۔

اس کے بعد ایرانی قونصل کی طرف سے آمد و رفت کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں بھی ان کی ایک تقریب میں گیا اور ایک بار کھانے کی دعوت پر بھی گیا اور آخر کار مجھے حالیہ دورۂ ایران کی دعوت بھی موصول ہو گئی۔ دورۂ ایران کی یہ دعوت سرکاری نہیں بلکہ نیم سرکاری تھی۔ ایران میں اسلامی ثقافت کو فروغ دینے اور دوسرے ممالک میں مسلمانوں سے تعلقات مضبوط بنانے کے لئے "سازمان ثقافت علاقات خارجہ" کے نام

سے ایک ادارہ یا محکمہ بنایا گیا ہے۔ اس محکمہ کا ایک ذیلی ادارہ "المجمع العالمی للتقریب بین المذاهب الاسلامیہ" ہے جس کا مقصد مختلف فقہی مذاہب کو آپس میں قریب تر لانے کی کوشش کرنا ہے۔ آیت اللہ واعظ زادہ خراسانی اس ادارے کے ڈائریکٹر ہیں۔ یہ دعوت مجھے ان کی طرف سے ملی تھی۔ میں ایران گیا تو میرا اور میرے ساتھیوں کا قابل قدر اعزاز و اکرام کیا گیا اور خاطر تواضع اور مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ فائیو سٹار ہوٹل میں ہمارے قیام و طعام کا انتظام کیا گیا۔ اس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔ البتہ چونکہ یہ سرکاری دعوت نہیں تھی اس لئے ذرائع ابلاغ نے ہمارے دورے کو زیادہ کوریج نہیں دی گئی۔ میرے ساتھ عزیزم ڈاکٹر عبدالخالق بھی تھے۔ انہوں نے دورۂ ایران کی تفصیلی رپورٹ قلمبند کی ہے (مذکورہ رپورٹ نومبر ۹۶ء میثاق کے میں شائع ہو چکی ہے)

مشاہدات و تأثرات

مشاہدات اور تاثرات کے حوالے سے مجھے جو نکات بیان کرنے ہیں، ان میں سے اکثر مثبت ہیں، البتہ کچھ منفی بھی ہیں۔

مثبت تاثرات

☆ علماء کا وقار : مثبت تاثرات میں پہلی قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایران میں جا کر واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ وہاں علماء کا ایک وقار اور عزت ہے، جبکہ ہمارے ہاں صورتحال اس کے برعکس ہے۔ شہروں میں یقیناً ہمارے ہاں بھی کچھ دبنگ قسم کے علماء ایسے ضرور موجود ہیں جو اپنی حیثیت بنا لیتے ہیں اور اسے منوا لیتے ہیں، ان کی عزت بھی ہوتی ہے اور مساجد پر بھی وہ اپنا "اقتدار" قائم کر لیتے ہیں، لیکن دیہات میں، سب جانتے ہیں کہ علماء کو "کمی کاری" سے زیادہ کی حیثیت نہیں دی جاتی۔ اقبال نے بھی کہا تھا ؎

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام!

☆ **نماز جمعہ کا روح پرور منظر :** دوسرا تاثر بھی اقبال کے شعر کے حوالے سے ملاحظہ کیجئے -

عیدِ آزاداں شکوہ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجوم مومنین

جمعہ مسلمانوں کے لئے عید کا دن ہے' جیسا کہ حضور ؐ نے فرمایا "الجمعۃ عید المسلمین" اس حوالے سے نماز جمعہ کا جو منظر ہم نے وہاں دیکھا ہے وہ پوری دنیا میں شاید کہیں اور نظر نہ آئے۔ صرف تہران میں ان کے کہنے کے مطابق دس لاکھ افراد جمعہ ادا کرتے ہیں۔ ہم نے جہاں نماز جمعہ ادا کی وہ یونیورسٹی کا ایک بہت بڑا جمنیزیم ہے' جس کی مزید توسیع کی گئی ہے۔ اس کے اردگرد باہر سڑکوں اور گلیوں میں بقول ان کے دس لاکھ افراد ہوتے ہیں۔ جہاں تک ہماری نگاہ جا رہی تھی وہ بھی ایک لاکھ سے کسی درجہ کم نہیں تھے۔ ان کی فقہ میں شاید ایک فرسنگ سے کم فاصلہ پر جمعہ ہو ہی نہیں سکتا۔ فرسنگ غالباً ساڑھے تین میل کا ہوتا ہے۔ گویا ساڑھے تین میل کا دائرہ کھینچا جائے گا تو سات میل کے حلقے کے اندر ایک ہی جمعہ ہو سکتا ہے' دوسرا نہیں۔ اس کے مقابلے میں ہمارا حال یہ ہے کہ اگر ایک گلی میں تین مساجد ہیں تو ہر مسجد میں چند آدمی بیٹھے ہوتے ہیں اور جمعہ ہو رہا ہوتا ہے۔

☆ **اعلیٰ تعلیم کے لئے معیاری یونیورسٹیاں :** میں نے ایران میں دو یونیورسٹیوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک "تہران یونیورسٹی" ہے اور دوسری "دانش گاہ امام جعفر صادقؒ"۔ جہاں تک تہران یونیورسٹی کا تعلق ہے وہ تو پہلے سے چل رہی ہے۔ البتہ دانش گاہ امام جعفر صادقؒ ایک نئی یونیورسٹی ہے جو کچھ عرصہ قبل قائم ہوئی ہے۔ ان یونیورسٹیوں سے مجھے اتنی دلچسپی اس لئے ہے کہ میں نے ۱۹۶۸ء میں ایک خواب دیکھا تھا کہ عالم اسلام میں جا بجا ایسی یونیورسٹیاں قائم ہونی چاہئیں جن کا مرکزی شعبہ تو قرآن حکیم اور عربی زبان ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ سائنس' مینجمنٹ' معاشیات' اقتصادیات اور تاریخ وغیرہ کے دوسرے شعبے بھی ہوں۔ قرآن اور عربی زبان کی تحصیل لازمی ہو اور باقی مضامین میں سے جسے طالب علم پسند کرے اس میں تخصص (specialization) کر

لے۔ یہ خواب پاکستان میں تو ہنوز تشنہ تعبیر ہے۔ اگرچہ میں نے قرآن کالج اسی قرآن یونیورسٹی کی طرز پر شروع کیا ہے' جیسے کبھی سرسید احمد خان نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی تھی اور بعد میں اسے یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ لیکن ہم نے کالج میں فزیکل سائنسز نہیں رکھیں۔ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی یونیورسٹی کے قیام کی توفیق مرحمت فرمادے جس کا مرکز و محور قرآن اور عربی زبان ہو۔ بہرحال میں نے ایران میں اپنے خواب کی کسی درجے میں تعبیر دیکھی ہے۔ گویا بقول اقبال ؎

یارانِ تیزگام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے!

☆ <u>خواتین یونیورسٹی کا قیام</u> : حکومت ایران نے خواتین کے لئے علیحدہ یونیورسٹی بنائی ہے۔ یہ بہت بڑی یونیورسٹی ہے' جس میں پانچ ہزار طالبات اس وقت زیر تعلیم ہیں۔ اڑھائی سو اساتذہ ہیں' جن میں سے ڈیڑھ سو خواتین اساتذہ اور ایک سو مرد ہیں۔ مرد اساتذہ کی تعیناتی بقول ان کے وقتی مجبوری ہے۔ تمام طالبات اور خواتین اساتذہ باپردہ نظر آتی ہیں۔ البتہ ان کے ہاں حجاب میں چہرہ شامل نہیں ہے۔ لہٰذا خواتین کا پورا جسم اور سر اچھی طرح ڈھکا ہوتا ہے لیکن چہرہ کھلا رہتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں خواتین یونیورسٹی کا پرزور مطالبہ کیا جاتا رہا ہے۔ جنرل ضیاء الحق صاحب کے گیارہ سالہ دورِ اقتدار میں اسلامی جمعیت طلبہ اور جماعت اسلامی نے ویمن یونیورسٹی کے لئے سرتوڑ کوششیں کیں لیکن حکومت کی طرف سے سوائے سبز باغ دکھانے کے اس جانب عملاً کوئی پیش رفت نہ ہو سکی اور ہنوز یہ معاملہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ لیکن ایران میں خواتین یونیورسٹی بالفعل قائم ہے۔

مجھے خواتین یونیورسٹی جانے کا بھی موقع ملا۔ وہاں پر وائس چانسلر اور اہم سینئر اساتذہ سے میری گفتگو بھی ہوئی۔ میں نے ان سے کہا کہ شیعہ سنی مسئلہ میں ایک وجہ اختلاف یہ بھی کہ آپ (شیعہ) حضرات خواتین میں سے سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کی شخصیت پر بہت زور دیتے ہیں' جبکہ سنی حضرات بالخصوص غالی اور متشدد سنی سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شخصیت پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس طرح دونوں گروہوں نے ایک

ایک شخصیت کو اپنے لئے الاٹ کر لیا ہے اور ان دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل لے آئے ہیں، حالانکہ ہمارے نزدیک سیدہ فاطمہ کبریٰ رضی اللہ عنہا اور سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا دونوں محترم ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ حضرت فاطمہؓ کے بجائے ان کی والدہ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو مرکزی شخصیت کا درجہ دیں، جو حضور ﷺ کی بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ آپؐ کی محسنہ بھی ہیں تو ان کی شخصیت دونوں گروہوں کے لئے یکساں طور پر قابل قبول ہو سکتی ہے۔ ہمارے نزدیک مَردوں میں "الصدیق الاکبر" کا مقام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے جبکہ خواتین میں "الصدیقہ الکبریٰ" کا مقام یقینی طور پر سیدہ خدیجہ الکبری کا ہے۔ ان حضرات نے میری بات کے وزن کو محسوس کیا اور اس سے اتفاق کیا۔

☆ تعلیم و تعلم سے دلچسپی : ایران میں واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ایرانیوں کی ترجیحات میں علم تعلیم کو اساسی اہمیت دی گئی ہے۔ یونیورسٹیوں اور لائبریریوں پر زرِ کثیر خرچ کیا جا رہا ہے۔ نئے تعلیمی ادارے اور تحقیق و تفتیشی مراکز کھل رہے ہیں۔ فارسی زبان میں ایک بہت بڑا انسائیکلوپیڈیا "دائرہ المعارف الاسلامیہ الکبری" کے نام سے تیار ہو رہا ہے۔ اس کی اب تک تیس جلدیں چھپ چکی ہیں۔ ساتھ ساتھ اس کا عربی ترجمہ بھی کیا جا رہا ہے، جس کی چھ جلدیں مکمل ہو چکی ہیں۔ انہوں نے ہمیں اس کی پہلی دو جلدیں ہدیہ کی ہیں۔ اہل ایران کی علم دوستی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں اعلیٰ ترین عمارتیں یونیورسٹیوں، لائبریریوں، کتب خانوں اور دیگر تعلیمی اداروں کی ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے شعبوں میں اتنی دلچسپی نہیں ہے۔ چنانچہ اگرچہ تہران کراچی سے زیادہ جدید شہر ہے لیکن اس کے باوجود اس کا ایئرپورٹ کراچی ایئرپورٹ سے اچھا نہیں ہے، بلکہ لاہور کے ایئرپورٹ کی طرح ہے۔ کسی بھی قوم کی زندگی میں ترجیحات کا تعین بہت اہم ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک ترجیح اول کسے حاصل ہے اور ترجیح ثانوی کس شے کو حاصل ہے۔

☆ قرآن حکیم کی عمدہ طباعت : قرآن مجید کی محفوظیت اور اس کے صحیح ہونے پر

مجھے اپنے اس پورے سفر میں کہیں بھی کسی شک و شبہ کے آثار نظر نہیں آئے۔ اس کے علاوہ قرآن حکیم پر بہت کام ہو رہا ہے۔ اس کی نہایت عمدہ طباعت ہو رہی ہے۔ انہوں نے کچھ عرصہ قبل علامہ طباطبائی کی ۲۰ جلدوں پر مشتمل تفسیر شائع کی ہے۔ یہ تفسیر مجھے بھی ہدیہ کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مقدار (quantity) کے معاملے میں سعودی عرب سے آگے نہیں جا سکتے' اس لئے کہ سعودی عرب معاشی اعتبار سے ایک مضبوط اور مستحکم ملک ہے۔ سعودی حکومت نے قرآن حکیم کی نہایت عمدہ طباعت کر کے وسیع پیانے پر پوری دنیا میں مفت تقسیم کیا ہے۔ بہرحال پھر بھی سعودی عرب کے بعد اپنے وسائل کے اعتبار سے قرآن حکیم کی جس قدر عمدہ طباعت ایران نے کی ہے' اس کی نظیر کوئی دوسرا مسلمان ملک پیش نہیں کر سکتا۔

☆ <u>مزاروں پر خرافات نہیں</u> : ہمیں اندیشہ تھا کہ آیت اللہ خمینی کے مزار پر ہمارے ہاں کے مزارات سے بھی زیادہ خرافات اور بدعات ہوں گی' لیکن ہم وہاں گئے تو اس قسم کی کوئی چیز وہاں ہمیں دیکھنے کو نہیں ملی۔ میں نے وہاں جا کر مسنون طریقہ سے سلام کیا :
"السلام علیکم یا اھل القبور من المومنین والمسلمین' یغفر اللہ لنا ولکم' انتم سلفنا ونحن بالاثر" پھر مزار کی طرف پیٹھ کر کے قبلہ رو ہو کر دعا کی۔ اس پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

میں قم بھی گیا' اس لئے کہ وہ ایران کا بہت بڑا علمی مرکز ہے۔ وہاں حوضہ علمیہ اور فیضیہ دو بہت بڑے علمی مراکز ہیں۔ میں مشہد بھی گیا کیونکہ وہ خراسان کا دارالخلافہ ہے۔ خراسان سے جو مجھے دلچسپی ہے وہ آپ حضرات کو معلوم ہے۔ ان دونوں مقامات پر دو مزارات ہیں جو ان کے نزدیک مقدس ترین مقامات ہیں اور انہیں وہاں "حرم" کہا جاتا ہے۔ مشہد میں ان کے نزدیک آٹھویں امام معصوم امام رضاؒ اور ان کی ہمشیرہ حضرت معصومہؒ کے مزارات ہیں۔ قم سے ہمیں وہاں لے جایا گیا' لیکن ہم مزاروں کے اندر نہیں گئے بلکہ باہر ہی سے مسنون دعا کی' لیکن مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ ہمارے اس عمل سے کسی کے چہرے پر ناراضی کے آثار نظر نہیں آئے اور کسی نے ہمیں یہ نہیں کہا کہ ہم اندر جا کر مزار پر حاضری دے آئیں۔

ویسے اپنے بارے میں یہ وضاحت بھی کردوں کہ میں جو مزارات کے اندر نہیں گیا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں اسے کفر یا شرک سمجھتا ہوں۔ میں تو یہاں بھی شیخ علی ہجویری کی قبر پر جانا چاہتا ہوں لیکن صرف اس لئے نہیں جا رہا کہ اس سے عوام میں پائے جانے والے قبر پرستی کے مروجہ خیالات اور مشرکانہ تصورات کو تقویت ملے گی۔ ماضی میں اس طرح کی ایک غلطی مجھ سے ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ ایک مرتبہ میں کھاریاں میں پیر صاحب موہری شریف کی دعوت پر ان کی خانقاہ میں گیا۔ وہ مجھے اپنے پیر صاحب کی قبر پر لے گئے۔ پھر اس بات کا بتنگڑ اس طرح بنایا گیا کہ انہوں نے وہاں پر فوٹو کھینچ کر اخبارات میں شائع کروا دیا اور یہ تاثر دیا گیا کہ ڈاکٹر اسرار احمد بریلوی اور پیر پرست بن گئے ہیں اور یہ بھی کہا گیا کہ انہوں نے پیر صاحب کی بیعت کر لی ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو اس طرح کے فتنوں کے سدباب کی وجہ سے میں نے مزارات پر نہ جانے کا فیصلہ کیا ہے۔

☆ سرکاری سطح پر سادگی : ایک مثبت تبدیلی یہ ہے کہ اگرچہ آیت اللہ خامنہ ای کو ایران میں بے تاج بادشاہ کی حیثیت حاصل ہے لیکن ان میں ہمیں کوئی بات "شاہانہ" نظر نہیں آئی۔ ہماری بھی ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہمیں سادگی، شرافت، متانت، تحمل و بردباری اور وجاہت کا عظیم مرقع اور مجسمہ نظر آئے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے آج تک ایسی شخصیت نہیں دیکھی۔ اتنا بلند مرتبہ حاصل ہو جانے کے باوجود ابھی تک وہ فرشی نشست پر دوزانو ہو کر بیٹھتے ہیں اور عوام اور دیگر ملاقاتی بھی دوزانو ہو کر ان کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی طرح محکمہ "سازمان ثقافت و علاقات خارجی" کے انچارج آیت اللہ تسخیری بھی حلم و تواضع میں اپنی مثال آپ ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ "مرکز دائرہ المعارف بزرگ اسلامی" کے سربراہ ڈاکٹر بجنوردی کا ہے۔ وہ علماء میں سے نہیں۔ انہوں نے شاہ کے دور میں چودہ سال جیل کاٹی ہے۔ ان کو وزارت عظمیٰ کی پیشکش بھی کی جاتی رہی ہے لیکن انہوں نے اپنے آپ کو علمی کام کے لئے وقف کیا ہے۔ وہ بہت ہی شریف انسان ہیں۔ ہمیں قم پبلک لائبریری دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ یہ لائبریری تنہا ایک شخص آیت اللہ المرعشی نے نجف میں بیٹھ کر بنائی ہے۔ اس لائبریری میں پچیس ہزار سے زائد تو مخطوطات جمع کئے گئے ہیں۔ ان کے بیٹے سید محمود المرعشی سے مل کر بھی طبیعت بہت خوش ہوئی۔

ایسی لائبریری میرے علم کی حد تک پورے پاکستان میں موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ آیت اللہ واعظ زادہ خراسانی کی شرافت، متانت اور وجاہت کا تو میں پہلے سے ہی قائل تھا۔

☆ **مضبوط معیشت کے لئے کوششیں :** ایران اپنی معیشت کو مضبوط بنیادوں پر تعمیر کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہے۔ صنعتوں کو فروغ دینے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ مغربی طاقتوں کی جانب سے ایران کے بائیکاٹ اور مخالفت نے مزید تحریک پیدا کر دی ہے۔ ایسے حالات میں ایران کی کوشش ہے کہ انڈسٹری کے میدان میں مغرب کا مقابلہ کرے۔ گویا بقول اقبال ؎

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے!

☆ **عربی زبان سے گہرا شغف :** عربی زبان سے جو شغف مجھے ایران میں نظر آیا کسی اور عجمی ملک کے بارے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اور پاکستان میں تو اس کا دسواں حصہ بھی موجود نہیں ہے۔ یہاں تو علماء بھی عربی میں گفتگو کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ اس معاملے میں افغان ہم سے بہت بہتر ہیں۔ بہرحال عربی زبان سے اہل ایران کی دلچسپی خوشگوار حیرت کا باعث بنی کہ شاہ ایران کے دور میں عربی کے خلاف مہم چل رہی تھی اور فارسی میں سے عربی الفاظ نکال کر ان کے مترادف جدید فارسی الفاظ شامل کئے جا رہے تھے۔ لیکن اب دوبارہ عربی کی طرف مراجعت وہاں نمایاں طور پر نظر آ رہی ہے۔

☆ **اقبال سے محبت :** ایران میں علامہ اقبال سے گہری محبت اور عقیدت پائی جاتی ہے۔ پورے ایران میں دانشور اور علماء ان کے فکر سے متفق اور متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال کو وہاں اقبال "لاہوری" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جس طرح ہمارے دلوں میں سعدی کا مقام ہے اور ہم انہیں سعدی "شیرازی" کہتے ہیں اسی طرح اقبال کو وہ اقبال "لاہوری" کہتے ہیں اور ان کے انقلابی پیغام سے گہرا شغف اور لگاؤ رکھتے ہیں۔

منفی تأثرات

میں چاہتا ہوں کہ مثبت تأثرات کے ساتھ ساتھ منفی نکات بھی بیان کر دیئے جائیں

تا کہ بات یک رخی نہ رہ جائے۔ میرے تاثرات میں مثبتی نکات درج ذیل ہیں :

☆ عمومی افسردگی کی فضا : ایرانی عوام میں بشاشت، امنگ اور ولولہ نظر نہیں آتا اور عام طور پر پورے ماحول پر افسردگی اور کچھ خوف زدگی کی سی کیفیت طاری ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہل تشیع کے نزدیک حضرت فاطمہؓ کو جن مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، حضرت علیؓ پر ان کے مطابق جو زیادتیاں ہوئیں اور مقام کربلا میں حضرت حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کا جو واقعہ ہوا، ان واقعات کے زیر اثر اہل تشیع کا یہ ایک عمومی مزاج بن چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ افسردہ مزاجی اسی کا عمومی اثر ہو۔

دوسری اور اہم وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ وہاں علماء کی حکومت ہے اور پاسداران انقلاب کا وہاں دبدبہ اور غلغلہ ہے جبکہ عوام کے احساسات کے اندر بنیادی طور پر اتنی گہری تبدیلی تاحال نہیں آسکی کہ وہ مثبت طور پر اس سے ہم آہنگ ہو سکیں، اس بنا پر ایک جبر کی سی فضا طاری نظر آتی ہے۔

تیسرے یہ کہ جہاں تک ہم نے معلوم کیا ہے تو ہمیں اندازہ ہوا ہے کہ انقلاب ایران کی حمایت یا اس کے حق میں جذبات عام ایرانیوں میں نفوذ نہیں کر رہے، بڑھ نہیں رہے بلکہ یہ جذبات گھٹ رہے ہیں۔ ہماری وہاں پر بعض عہدیداروں سے بات چیت ہوئی تو میں نے براہ راست ان سے یہ سوال کیا کہ کیا انقلاب ایران کی حمایت بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے؟ تو پہلے تو وہ بھونچکے سے رہ گئے کہ یہ کیسا سوال کر دیا۔ کہ اس کا جواب بڑا مشکل ہے، لیکن پھر کچھ گول مول جواب یہ دیا کہ ہم ترقیاتی کاموں پر بہت زیادہ خرچ کر رہے ہیں، اس لئے مہنگائی بڑھ گئی ہے، جبکہ انقلاب سے پہلے شاہ ایران عوام کی بہبود پر ہی خرچ کرتا تھا، تو کچھ اس کے اثرات ہیں، تاہم عوامی سطح پر ہمارے خیال میں انقلاب کی تائید بڑھ رہی ہے۔ یعنی وہ ساری باتیں کہنے کے بعد آخری بات یہ کہتے تھے کہ "تائید بڑھ رہی ہے" جبکہ میرا ذاتی خیال ہے کہ گھٹ رہی ہے۔

☆ شیعہ سنی عدم مفاہمت : شیعیت اور سنیت کے مابین اعتدال و توازن وہاں بہت

کم ہے، اگرچہ "لا شیعیہ لا سنیہ، اسلامیہ اسلامیہ" اور "لا شرقیہ لا غربیہ، اسلامیہ اسلامیہ" کے نعرے خوب لگ رہے ہیں۔ لیکن میرا تجزیہ یہ ہے کہ اگرچہ جدید دانشوروں میں جن سے ہماری ملاقات ہوئی، کافی حد تک اعتدال موجود ہے، اس لئے کہ ان کی پرورش کٹر مولویانہ ماحول میں نہیں ہوئی، اسی طرح علماء میں سے بھی بعض معتدل مزاج کے حامل ہیں، لیکن عوام میں کٹر شیعہ عقائد پوری پختگی کے ساتھ موجود ہیں اور ان میں اعتدال کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کرچکا ہوں کہ عوام کی اکثریت غالی شیعوں پر مشتمل ہے۔ جن کا موقف یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام امام اول بھی ہیں، وصی رسول اللہ بھی ہیں اور خلیفہ رسول اللہ بلافصل بھی ہیں، جبکہ حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی خلافتیں غاصبانہ خلافتیں تھیں (نعوذ باللہ من ذلک) اور حضرت علیؓ نے صرف تقیہ کے تحت ان اصحاب کی بیعت کی تھی، دل سے نہیں کی۔ آج کل بعض علماء اور جدید شیعہ دانشور اس سطح سے اوپر آ گئے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ جب حضرت علیؓ نے ان اصحاب کی بیعت کرلی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے خود خلافت حضرت ابوبکر، عمر، عثمان رضوان اللہ علیہم کو تفویض کر دی، لہٰذا ان کی خلافت کو ہم صحیح مانتے ہیں۔ یہ "زیدیہ" کا موقف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کا موقف تقیہ کے تحت نہیں بلکہ مبنی بر حکمت اور اپنی آزادانہ رائے سے تھا۔ اس ضمن میں ایک خاص واقعہ میرے ساتھ اس دورۂ ایران کے دوران پیش آیا۔ ایک عالم دین جن کی میرے دل میں بڑی قدر ہے، ان سے ایک رات میری گفتگو ہو رہی تھی تو میں نے براہ راست ان سے خلافت راشدہ کے متعلق سوال کر دیا۔ وہ اس کے لئے ذہناً تیار نہیں تھے۔ انہوں نے فوراً کہا وہ تو غاصب تھے، خلافت حضرت علی کا حق تھا، جسے غصب کیا گیا۔ اب دوبارہ صبح بھی ان سے میری ملاقات ہونا تھی۔ وہ رات بھر سوچتے رہے ہوں گے کہ میں نے یہ کیا کہہ دیا، یہ سنی ہیں اور پاکستان سے آئے ہیں، یہ کیا تاثر لے کر جائیں گے۔ چنانچہ صبح جب ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے تفصیل کے ساتھ اپنی بات بیان کی جو بڑی ذہانت پر مبنی تھی۔ کہنے لگے کہ ہم اس بات پر جمع ہو سکتے ہیں کہ امامت اور ولایت تو روز اول سے حضرت علیؓ ہی کی ہے،

لیکن جیسے ہم نے جدید ایران میں کیا ہے کہ ایک طرف حکومت ہے' پارلیمنٹ ہے' صدر' وزراء اور حکومتی مشینری ہے' جبکہ دوسری طرف ہمارا ولایت فقیہ کا معاملہ ہے کہ علماء کی ایک باڈی ہے جس میں خامنہ ای ہیں' جو رہبر ہیں۔ تو اسی طرح کا معاملہ خلفائے ثلاثہؓ اور حضرت علیؓ کا ہے۔ گویا (ان کی تعبیر کے مطابق) حضرت علیؓ کو خامنہ ای کی جگہ پر سمجھا جائے گا اور ابوبکرؓ و عمرؓ کو رفسنجانی کی جگہ پر۔ اب ظاہر ہے کہ ان کے مابین مفاہمت موجود ہے' تب ہی تو نظام حکومت چل رہا ہے۔ واضح رہے کہ یہ میں نے ان کی رائے بیان کی ہے' میری یہ رائے نہیں ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ وہاں اذان اور اقامت میں حضرت علیؓ کے لئے جو اضافی الفاظ آتے ہیں ان میں "ولی اللہ" اور "حجتہ اللہ" کے الفاظ تو ضرور ہیں' لیکن "خلیفہ بلا فصل" کے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ ایک اہم مثبت نکتہ ہے اور اعتدال کی طرف ایک قدم ہو سکتا ہے۔ اس بات کا امکان بھی ہے کہ یہ ترمیم ابھی کی گئی ہو۔ اگر ایسا فی الواقع ہے تو بہت مثبت ہے کہ ایرانی اہل تشیع اعتدال کی طرف کچھ نہ کچھ پیش قدمی کر رہے ہیں۔ لیکن اگر یہ پہلے سے تھی تو بھی یہ ایک مثبت نکتہ (positive point) ہے۔ اس اعتبار سے ہو ناکہ اس سے معلوم ہوا ہے کہ عوامی سطح پر بھی ایرانی شیعیت کچھ اور ہے اور پاکستانی شیعیت کچھ اور۔

☆ <u>فقہ پر زور</u> : تیسرا منفی تاثر فقہ کے معاملے میں ہے۔ چونکہ یہ حکومت علماء کی ہے اور روایتی علماء کے ہاں فقہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس لئے جیسے ہمارے ہاں فقہ پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے اسی طرح وہاں بھی فقہ کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ حالانکہ فقہ اہل سنت اور فقہ جعفریہ دونوں دور ملوکیت میں مرتب ہوئی ہیں' اس لئے ان کے اندر ملوکیت کے اثرات موجود ہیں۔ مثلاً امام اعظم ابوحنیفہؒ' امام مالکؒ اور امام شافعیؒ تینوں حضرات نے مزارعت کی حرمت کا فتویٰ دیا تھا' لیکن بعد میں جب ملوکیت کی چھاپ پڑی تو صاحبین نے مزارعت کے جواز کا فتویٰ دے دیا۔ اسے آپ چاہے مجبوری کہیں یا کچھ اور کہیں' بہرحال جب ملوکیت آگئی تو اس کے اثرات تو پڑنے ہی تھے' جیسے مارشل لاء آجاتا ہے تو پھر سپریم کورٹ کیا کر سکتی ہے۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی مزارعت اور

مضاربت جیسے معاملات کو اسی طرح سے "اسلامی" بنایا گیا تھا جس طرح ضیاء الحق صاحب کے زمانے میں ہمارے نظام بینکاری اور معاشی و اقتصادی نظام کو "اسلامی" بنایا گیا، ورنہ نظام اسلامی کا اصل حصہ یعنی سیاسی، سماجی اور معاشی انصاف کا عنصر تو موجود نہیں ہے۔

☆ <u>سنی مساجد کی تعمیر پر پابندی</u> :جہاں تک دستور کا معاملہ ہے وہ ایک فقہ 'فقہ جعفریہ پر استوار ہے اور یہی پبلک لاء ہے' البتہ دستور کے مطابق پرسنل لاء میں تمام لوگوں کو اپنی اپنی فقہ کے مطابق عمل کرنے کی آزادی حاصل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس پر تو عمل درآمد بھی ہوتا ہے۔ ہم نے خود شیعہ حضرات کے ساتھ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھی ہے' اسی طرح نماز سے قبل ہم نے اپنے سامنے رکھی ہوئی خاک کربلا کی ٹکیاں ہٹائی ہیں' لیکن کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا' اس لئے کہ مذہبی آزادی ہے۔ البتہ تعمیر مساجد کے بارے میں گورنمنٹ کا موقف یہ ہے کہ ہم شیعہ اکثریت کے علاقے میں سنی مسجد نہیں بننے دیتے بلکہ سنیوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ شیعہ کے ساتھ اپنے طریقے کے مطابق نماز پڑھیں اور سنی اکثریت کے علاقے میں شیعہ مسجد نہیں بننے دیتے بلکہ شیعوں کو مجبور کرتے ہیں کہ سنیوں کے پیچھے اپنے طریقے کے مطابق نماز پڑھیں۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ شیعہ اور سنی نماز میں اتنا فرق نہیں جو اکٹھے نماز پڑھنے میں مانع ہو' کیونکہ قیام' رکوع و سجود اور جلسہ وغیرہ کی ترتیب ساری یکساں ہے۔ لیکن یہ کہ اس "اصول" پر عمل درآمد نہیں ہوتا' بلکہ دوہرا معیار اپنایا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے تحقیق بھی کی اور وہاں کے ایک سنی عالم دین سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بھی اس کی تصدیق کی اور کہا کہ ایرانی بلوچستان میں پہلے سے بھی شیعہ مساجد قائم ہیں اور اب نئی بھی بن رہی ہیں' کیونکہ وہاں کے شیعہ سنیوں کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے' لیکن تہران میں گورنمنٹ کوئی سنی مسجد بنانے کی اجازت نہیں دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ تہران میں سنی بشمول پاکستانی سفارت خانے کے عملے کے ایک سکول میں نماز جمعہ ادا کرتے ہیں۔ سکول کی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اس کے لئے پاکستان بڑی عمارت خریدنا چاہتا ہے لیکن کسی وجہ سے اجازت نہیں مل رہی ہے۔ بہرحال مساجد کی تعمیر کے حوالے سے یہ رویہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر سنیوں کو شیعہ اکثریت کے

علاقوں میں مسجد تعمیر کرنے کی اجازت نہیں تو پھر شیعوں کو ایرانی بلوچستان میں مساجد تعمیر کرنے کی اجازت کیونکر ہے؟

اس ضمن میں میں حسن ظن سے کام لے رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ شاید شیعہ عوام میں ابھی تک اعتدال پیدا نہیں ہو سکا۔ اس لئے شاید ان کا لحاظ کیا جا رہا ہے' لیکن بہرحال میرے نزدیک ایران کے دستور میں پرسنل لاء کے معاملے میں جو آزادی دی گئی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ سنی مساجد بنانے کی آزادی بھی لازماً دینی چاہئے۔

☆ **تھیوکریسی اور وحدانی طرز حکومت** : میرے نزدیک جو جدید اسلامی ریاست خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی بنیاد پر قائم ہو گی اس کا تصور (جو میں نے خطبات خلافت میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے) یہ ہے کہ ایک تو یہاں تھیاکریسی نہیں ہو گی' اور دوسرے یہ کہ وہ وحدانی نہیں بلکہ وفاقی طرز کی ہو گی' لیکن ایران میں یہ دونوں چیزیں اس کے برعکس ہیں۔ ایک یہ کہ بنیادی طور پر وہاں تھیوکریسی (علماء کی حکومت) ہے' دوسرے یہ کہ وہاں طرز حکومت وحدانی (unitary) ہے۔ گویا تمام اختیارات مرکز کو حاصل ہیں' صوبوں میں صوبائی اسمبلیاں تک نہیں ہیں' صرف گورنر ہیں' جو مرکز کی جانب سے نامزد کئے جاتے ہیں۔

میں ان دونوں چیزوں کو صحیح نہیں سمجھتا' اس لئے کہ میرے نزدیک تھیوکریسی بھی روح عصر کے منافی ہے اور وحدانی طرز حکومت بھی روح عصر سے مطابقت نہیں رکھتی۔ روح عصر سے ہم آہنگ ہونے کے لئے وفاقی طرز کی حکومت ہو اور صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دی جائے۔

اس حوالے سے وہاں بعض علماء سے میری گفتگو ہوئی اور دوران گفتگو مجھے شدید ضرورت محسوس ہوئی کہ ہمیں "خطبات خلافت" کا فارسی ترجمہ جلد از جلد شائع کرا دینا چاہئے تاکہ یہ وہاں پہنچ جائے اور وہ ہمارے نظریات سے واقف ہو سکیں کہ ہم مستقبل کی اسلامی ریاست کے بارے میں کیا تصور رکھتے ہیں۔ یعنی خلافت اسلامی قائم ہوئی تو وہ کس طرز پر ہو گی۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات ○○

قرآن حکیم کا بنیادی پیغام

اور اس کے چار لوازم

قرآن کالج میں تقریب تقسیم اسناد سے خطاب

مولانا گوہر رحمٰن صاحب (مردان)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ○ بسم اللہ الرحمن الرحیم ○

﴿ وننزل من القران ما ھو شفاء ورحمۃ للمومنین ولا یزید الظالمین الا خسارا ○ ﴾ (الاسراء : ۸۲)

قرآن کالج کا یہ جلسہ تقسیم اسناد دراصل قرآن حکیم ہی کی تقریب ہے اور دعوت رجوع الی القرآن کی تحریک کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس تحریک کو کامیابی عطا فرمائے۔ میں اس سلسلے میں سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا مقصد بیان کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تمام باتیں پہلے سے آپ کے علم میں ہیں لیکن تذکیر او ریاد دہانی اور ایک دوسرے کے سامنے سبق دہرانے کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا مقصد اور اصل ہدف یہ ہے کہ اس دنیا میں اللہ کی عبادت کا نظام قائم ہو جائے اور اللہ سے بغاوت پر مبنی تمام نظام ختم ہو جائیں۔ اس لئے کہ خود انسان کی تخلیق کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : ﴿ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ○ ﴾ (الذاریات : ۵۶) "میں نے جنات اور انسانوں کو اسی مقصد کے لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں"۔ اور ﴿ وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین ○ ﴾ (البینہ : ۵) "انہیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، دین کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے"۔ تمام انبیاء کی نبوت اور رسالت کا بھی یہی مقصد تھا۔ ارشاد الٰہی ہے : ﴿ وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الہ الا انا فاعبدون ○ ﴾ (الانبیاء : ۲۵) "ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کی کہ کوئی معبود نہیں ہے سوائے میرے، پس میری ہی عبادت کرو"۔ ﴿ ولقد

بعثنا فی کل امة رسولا ان اعبدوا الله واجتنبوا الطاغوت ﴾ (النحل : ۳۶) "بے شک ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا (اس حکم کے ساتھ) کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو"۔ اسی طرح قرآن مجید کی رو سے تمام رسولوں نے اپنی اپنی قوموں کو یہی نصیحت کی کہ ﴿ یقوم اعبدوا الله مالکم من الٰه غیره ﴾ (الاعراف : ۶۰' ۶۵' ۷۳ وغیرہ) "اے میری قوم' اللہ کی عبادت کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے"۔

ان آیات کا مفہوم یہی ہے کہ سارے انبیاء اسی مقصد کے لئے بھیجے گئے تھے کہ دنیا سے طاغوتی نظام کا خاتمہ ہو اور اللہ کی عبادت کا نظام قائم کر دیا جائے۔ حضور ﷺ کا مقصد بعثت بھی یہی تھا' اور آپ ﷺ کے عظیم کام کا آغاز رجوع الی القرآن ہی سے ہوا تھا۔ اوامر قرآنی میں سب سے پہلا امر اور اللہ کے احکام میں سب سے پہلا حکم یہی نازل ہوا تھا کہ قرآن پڑھو : ﴿ اقرا باسم ربک الذی خلق ○ ﴾ (العلق : ۱) "پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا"۔ قرآن پڑھو اور پڑھاؤ۔ لہٰذا اسلامی نظام کے قیام کے لئے اور اللہ کی عبادت کے نظام کو غالب کرنے کے لئے شرط لازم رجوع الی القرآن ہے۔ اس کے بغیر دوسرے بہت سے نظام آئیں گے اور جائیں گے' لیکن اسلام کا نظام قائم نہیں ہو سکتا۔

قرآن کا اصل پیغام تین بنیادی ایمانیات پر مبنی ہے' یعنی توحید' رسالت اور آخرت۔ توحید کا حاصل یہ ہے کہ اس کائنات کا بادشاہ اور حاکم ایک ہی ہے۔ رسالت کا مطلب یہ ہے کہ اس بادشاہ حقیقی کے مستند نمائندے انبیاء علیہم السلام ہیں اور (ختم نبوت کے بعد) انسانیت کے حقیقی رہنما اب محمد ﷺ ہیں جن کی تعلیمات ہمارے پاس (محفوظ حالت میں) موجود ہیں۔ سوائے انبیائے کرام اور خاتم النبیین کے کسی اور سے رہنمائی نہیں لی جا سکتی۔ آخرت پر ایمان کا حاصل یہ ہے کہ یہ دنیا ہمارا اصل وطن نہیں ہے' یہ دنیا ہماری مستقل قیام گاہ نہیں ہے۔ یہ دنیا فانی ہے اور اصل زندگی موت کے بعد آنے والی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا میں ترقی نہ کرو۔ دین کی یہ تعلیم یقیناً نہیں ہے۔ قرآن نے تو یہ کہا ہے کہ ﴿ هو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا ○ ﴾ (التوبہ : ۲۹) "وہی ہے جس نے تمہارے لئے پیدا کیا ہے جو کچھ زمین میں ہے"۔ دین کی تعلیم تو یہ ہے کہ دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے' اس دنیا کو سمجھو' اس دنیا کو ترقی دو' اس دنیا کو آباد رکھو' اس دنیا کی چیزوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿ قل من حرم زینة الله التی اخرج لعباده ﴾ (الاعراف : ۳۲) "آپ ﷺ کہئے کہ کس نے اللہ کی پیدا کردہ زینت کو حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لئے نکالی ہے؟" کوئی بھی اسے حرام نہیں کر سکتا۔ اس سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں۔ ﴿ لم تحرم ما احل الله لک ﴾ (التحریم : ۱) "آپ ﷺ کیوں حرام کرتے ہیں اپنے لئے جسے اللہ نے حلال کیا ہے؟"

دین کی تعلیم تو یہ ہے کہ دنیا کو آباد رکھو۔ قرآن مجید کا ایک فقرہ ہے ﴿ هو انشا کم من الارض واستعمر کم فیها ﴾ (ہود : ۶۱) "اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور اس میں

بسایا"۔ اس کی تفسیر میں امام جصاص نے لکھا ہے کہ اس کا مفہوم اور اس میں ہدایت یہی ہے کہ دنیا کو آباد رکھو۔ لیکن دنیا کی کامیابی زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ دراصل دنیا تو زندگی کا ذریعہ ہے۔ یہ اسلام کی تعلیم ہے کہ دنیا کو زندگی کا ذریعہ سمجھو مگر زندگی کا مقصد نہ بناؤ۔ یہ ہے توحید' رسالت اور آخرت کا مفہوم۔ یہ قرآن کا بنیادی پیغام ہے۔ اس بنیادی پیغام کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنی انفرادی زندگی میں بھی اللہ کا بندہ ہو کر رہے اور اللہ کی زمین پر اللہ کی بندگی کا اجتماعی نظام قائم کرے جس کو اسلامی نظام بھی کہا جا سکتا ہے۔

قرآن کے اس بنیادی پیغام کو عملی شکل دینے کے لئے لائحہ عمل کیا ہے؟ میں جہاں تک سمجھا ہوں تو اس لائحہ عمل کے چار مراحل معلوم ہوتے ہیں۔ پہلی بات ہے علم کا حصول۔ قرآن و سنت اور دین کا علم حاصل کئے بغیر نہ اجتماعی نظام تبدیل ہو سکتا ہے اور نہ انفرادی زندگی کو اسلام کے مطابق بنایا جا سکتا ہے۔ قرآن و سنت کے پختہ علم کے بغیر اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((انما بعثت معلما)) کہ میں دین کا معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ قرآن حکیم میں رسول اللہ ﷺ کے فرائض بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلوا علیھم ایتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ﴾ (آل عمران : ۱۶۴) "بے شک اللہ نے مومنوں پر بڑا انعام فرمایا جب اس نے بھیجا ان میں سے ان ہی میں ایک رسول' جو ان پر اس کی آیات تلاوت کرتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں تعلیم دیتا ہے کتاب اور حکمت کی۔ ﴿وان کانوا من قبل لفی ضلل مبین ۝﴾ (آل عمران : ۱۶۴) "اور اس سے پہلے تو وہ صریح گمراہی میں تھے"۔ مفہوم بالکل واضح ہے کہ قرآن و سنت کی تعلیم کے ذریعے گمراہی کا ازالہ ہو گا' قرآن و سنت کی تعلیم کے ذریعے نفوس کا تزکیہ ہو گا۔ قرآن و سنت کی تعلیم کے ذریعے فکری انقلاب آئے گا جس کے نتیجے میں اسلامی انقلاب آئے گا۔ لہٰذا پہلی بات ہے دین کا سیکھنا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ((خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ)) یہ بخاریؒ اور مسلمؒ کی متفق علیہ روایت ہے' یعنی سند کے لحاظ سے سب سے اعلیٰ پایہ کی روایت ہے۔ اس کے راوی حضرت عثمانؓ بھی ہیں اور حضرت علیؓ بھی۔ "خیر" کے معنی ہیں "ماکثر نفعہ" اس حدیث کا مطلب جو ہم نے علماء سے سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ انسانیت کو سب سے زیادہ نفع پہنچانے والا انسان وہ ہے جس نے قرآن سیکھا اور اسے اوروں کو سکھا رہا ہے۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی : "اللھم ارحم خلفائی" "اے اللہ میرے خلفاء پر رحم فرما۔ پوچھا گیا کہ آپؐ کے وہ خلفاء کون ہیں جن کے لئے اتنے اخلاص سے آپؐ نے دعا کی۔ ظاہر ہے کہ حضور کے خلفاء تو اسلامی ریاست اور حکومت کو چلانے والے ہیں' لیکن یہاں حضورؐ کی مراد کچھ اور تھی۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو لوگ قرآن سیکھتے ہیں اور دوسروں کو سکھاتے ہیں وہ میرے خلفاء ہیں۔ یہ لوگ میرا کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح ایک اور روایت کے مطابق حضورؐ نے فرمایا : ((من یرد اللہ بہ خیرا یفقہ فی الدین)) "جس شخص کے بارے میں اللہ نے خیر کا ارادہ کر لیا ہو (یعنی جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا ہو کہ اس کو بڑا رتبہ اور فضیلت دوں گا' اور اسے

انسانیت کے لئے نفع بخش بناؤں گا) تو وہ اسے دین کی سمجھ اور تفقہ عطا فرماتا ہے"۔

دوسری بات ہے دین پر عمل کرنا۔ اس کی تشریح ہو گئی کہ جو شخص دین کا علم ہی نہیں رکھتا اس کا عمل صحیح نہیں ہو گا' اور جو شخص جانتا ہے لیکن عمل نہیں کرتا تو اس بے عمل انسان کے ذریعے اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ دین پر عمل نہ کرنے والا شخص نہ اپنے گھر اور خاندان کو متاثر کر سکتا ہے اور نہ ماحول اور معاشرے کو۔

تیسری بات ہے "دعوت الی الدین" یعنی جو کچھ تم نے سیکھا اور جس پر عمل کیا اسی کی طرف لوگوں کو بلاتے رہو۔ دین کی طرف دعوت دینا نبی کا بھی کام ہے اور امتیوں کا بھی۔ اور کل دین کی طرف دعوت دینا ضروری ہے۔ شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہ سے کسی نے پوچھا کہ عبادت کے معنی کیا ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ "العبادہ هی اسم جامع لکل ما یحبه الله و یرضاہ" یعنی عبادت کا لفظ ان تمام امور پر حاوی ہے جو اللہ کو پسند ہیں اور جن سے وہ راضی ہوتا ہے۔ پھر شیخ الاسلام نے مثالیں دے کر فرمایا "الدین کله داخل فی العبادہ"۔ کل کا کل دین لفظ عبادت میں داخل ہے۔

یہ نکتہ اصل میں تو قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے لیکن ہم علماء کا حوالہ اس لئے دیتے ہیں تاکہ بات آسانی سے اور جلدی سمجھ میں آجائے۔ پورے دین پر عمل کرنے کا نام اللہ کی عبادت ہے' لہٰذا دعوت الی الدین کا مطلب یہ ہوا کہ پورے دین کی طرف لوگوں کو بلانا ہے۔ دین میں نماز اور زکوٰۃ کا نظام بھی ہے اور اقتصادی و معاشی نظام بھی۔ معاشرتی نظام بھی ہے اور شادی و غمی سے متعلق ہدایات بھی۔ سیاست و حکومت کا نظام بھی ہے اور عدالت کا بھی۔ زندگی کے ہر شعبے کے متعلق دین کے احکام موجود ہیں۔ ان کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اس پورے دین کی طرف بلانا بھی ضروری ہے۔ جیسے جیسے دین کی تعلیمات لوگوں کی سمجھ میں آتی جائیں گی اسی تناسب سے ہم اسلامی نظام کے قریب ہوتے جائیں گے۔

چوتھی بات کیا ہے؟ دین کی راہ میں' دین کے دشمنوں کے شر سے خود دین کو اور مسلمانوں کو خطرات و مشکلات پیش آئیں تو ثابت قدمی اور صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا جائے اسے استقامت کہتے ہیں۔ لہٰذا دین کو سیکھنا' اس کی تعلیمات پر عمل کرنا' دین کی طرف دعوت دیتے رہنا' اور اس راستے میں ہر سختی کا صبر کے ساتھ مقابلہ کرنا--- یہ وہ چار نکات ہیں جو ہم نے سمجھے ہیں کہ ان کے مطابق ہم سب کو کام کرنا چاہئے۔

اللہ نے چاہا تو قرآن اکیڈمی اور قرآنی تعلیم کے دوسرے مراکز کی بدولت ملک میں قرآنی نظام آجائے گا۔ دعا ہے کہ اللہ رب العالمین جلد وہ دن لائے کہ ہمارا ملک قرآن اور اسلام کے نور سے روشن ہو جائے اور محمد مصطفیٰ ﷺ کے دین اور شریعت پر مبنی اجتماعی نظام یہاں قائم ہو جائے۔

میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ہم جیسے طالب علموں کو بلایا اور بات کرنے کا موقع دیا۔ ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ درحقیقت اختلاف تین اقسام کا

ہوتا ہے۔ ایک اختلاف اصول اسلام میں ہوتا ہے' یعنی مسلمان اور کافر کے درمیان اختلاف' کفار کے ساتھ بھی ہم مسلمانوں کی ذاتی دشمنی نہیں ہے' ہم ان تک دین کا پیغام پہنچاتے ہیں لیکن ان سے اتحاد اس لئے ممکن نہیں کہ یہاں اصول اسلام میں اختلاف سامنے آجاتا ہے۔ دوسری قسم کا اختلاف ہے اصول اہل سنت میں اختلاف۔ اہل سنت کس کو کہتے ہیں؟ "ماانا علیہ واصحابی" کی رو سے سنت رسول اللہ ﷺ اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کے تابعداروں کو اہل سنت کہتے ہیں۔ یہاں بھی ہمارا کوئی اختلاف نہیں کیونکہ ہم سب اہل سنت ہیں۔ تیسری قسم کا اختلاف فروعی اور اجتہادی مسائل میں ہوتا ہے۔ ان معاملات میں اگر علمی اور تحقیقی اختلاف ہو' بشرطیکہ اجماع امت کے خلاف نہ ہو' نفسانیت پر مبنی نہ ہو' ایک دوسرے کی تذلیل اور تفسیق کا ذریعہ نہ بنے' تو ایسا اختلاف امت کے اتحاد کے منافی نہیں۔ اس نوعیت کا اختلاف صحابہؓ میں بھی تھا لیکن وہ پھر بھی امت واحدہ تھے۔ ہمارا دین ایک ہے اور یہ امت' امت واحدہ ہے۔

چوتھی قسم کا اختلاف وہ ہے جو تعصبات پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ امت کو نقصان پہنچانے والا اور پارہ پارہ کرنے والا اختلاف ہے۔ نسلی تعصب' علاقائی تعصب' قبیلے کا تعصب' زبان اور فرقے کا تعصب اس کی اقسام ہیں۔ یا پارٹی یا حزب کا تعصب کہ میری ہی پارٹی حق پر ہے' باقی سب کافر ہیں۔ یہ موقف سراسر غلط ہے۔ حکومت تو محمد مصطفیٰ ﷺ کے تابعداروں کی ہونا چاہئے خواہ وہ کسی بھی پارٹی سے ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاص کی دولت سے نوازے تو ان شاء اللہ کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔

باقی رہا تدبیر اور حکمت عملی کا اختلاف تو ایسا اختلاف نہ ضلالت ہے نہ کفر' نہ فسق ہے اور نہ فجور۔ اگر تدبیر کے معاملے میں کوئی غلطی بھی کر بیٹھے جبکہ نیت اور اخلاص درست ہو تو ایسے شخص کو تدبیر کی غلطی کے باوجود اللہ تعالیٰ اجر دے گا۔ ممکن ہے کہ اسلام کے کام کے لئے کوئی ایک تدبیر کو زیادہ مفید سمجھتا ہو اور دوسرا کسی اور تدبیر کو بہتر سمجھتا ہو۔ اس معاملے میں باہمی تبادلہ خیال اور افہام و تفہیم جاری رہنا چاہئے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین OO

مذہبی جماعتوں کے باہمی تعاون

کے ضمن میں تنظیم اسلامی کی مساعی

مرتبہ : (حافظ) عاکف سعید
ناظم مکتبہ تنظیم اسلامی پاکستان

تنظیم اسلامی کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ یہ ایک انقلابی جماعت ہے جو مسلکی و گروہی تعصبات سے بلند تر رہتے ہوئے نفاذ دین کے لئے جدوجہد کر رہی ہے۔ دینی جماعتوں کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ ہر جماعت اپنے ہی خول میں بند ہے اور ان کے قائدین باہم اتحاد و اتفاق کی فضا قائم کرنے اور آپس کے اختلافات کو کم کرنے کی بجائے باہم دگر برسرپیکار رہتے ہیں۔ یہ تاثر کچھ اتنا غلط بھی نہیں ہے، لیکن بحمد اللہ تنظیم اسلامی اور اس کے امیر کا یہ امتیازی وصف ہے کہ انہوں نے دیگر دینی جماعتوں اور شخصیات کے باہمی اختلافات کو سمجھنے، انہیں کم کرنے اور ان کے ساتھ اشتراک عمل کی خصوصی طور پر کوششیں کی ہیں۔ ان کوششوں اور مساعی کی کسی قدر تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ تنظیم اسلامی کے امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب پر یہ اللہ کا خصوصی فضل رہا کہ انہوں نے ابتداء ہی سے مختلف مکاتب فکر کے علماء و اکابرین سے ربط ضبط رکھا اور ان سے نہ صرف یہ کہ علمی و نظری استفادہ کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی بلکہ ان کے مابین فکری و عملی سطح پر ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوششیں بھی مسلسل جاری رکھیں۔ تنظیم اسلامی کی تاسیس سے تین سال قبل ۱۹۷۲ء میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مرکزی انجمن خدام القرآن کے نام سے خدمت قرآنی کا ادارہ تشکیل دیا تھا۔ احباب جانتے ہیں کہ ۱۹۷۲ء سے لے کر سال رواں یعنی ۱۹۹۶ء تک، مرکزی انجمن خدام القرآن کے تحت ہر سال منعقد ہونے والی قرآن کانفرنسوں / محاضرات قرآنی میں محترم ڈاکٹر

صاحب مختلف مسالک اور مکتبہ ہائے فکر کے علماء و دانشور حضرات کو مدعو کر کے انہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا اہتمام کرتے اور قرآن حکیم کی بنیاد پر ان کے درمیان فکری فاصلوں کو کم کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ قرآن کورس کی کسی نشست کے صدر اگر دیو بندی مکتبہ فکر کے جید عالم ہیں تو مہمان خصوصی بریلوی مسلک کے چوٹی کے علماء میں سے ہیں اور ان کی موجودگی میں تقریر کرنے والے کوئی فاضل مقرر اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے ہیں' یا اس کے برعکس بھی معاملہ دیکھنے میں آیا کہ صدارت بریلوی مکتبہ فکر کے عالم کر رہے ہیں اور مہمان خصوصی کسی دوسرے مسلک سے متعلق ہیں۔ علی ھذا القیاس---ڈاکٹر صاحب محترم مختلف مکتبہ ہائے فکر کے جن علماء کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے استفادہ کرتے رہے ان میں مولانا سید حامد میاں''، مولانا مفتی محمد حسین نعیمی''، مولانا محمد مالک کاندھلوی'' اور مولانا محمد حنیف ندوی'' کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ طالب علمی کے دور میں موصوف کا بڑا قریبی رابطہ مولانا داؤد غزنوی'' اور ان کے خانوادے سے بھی رہا۔

۲ - جون ۱۹۸۲ء میں جب محترم ڈاکٹر صاحب کے ٹیلیویژن پروگرام الہدیٰ کو بند کرنے کے سلسلے میں مغربی تہذیب کی دلدادہ خواتین نے مظاہرہ کیا تو میاں طفیل صاحب نے جو ان دنوں جماعت اسلامی کے امیر تھے' ڈاکٹر صاحب کے موقف کی حمایت کرتے ہوئے مغرب زدہ خواتین پر تنقید کی تھی اور حکومت وقت سے الہدیٰ پروگرام کو جاری رکھنے کا مطالبہ کیا۔ انہی دنوں لاہور میں تعلیم القرآن کے نام سے منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں میاں طفیل محمد صاحب نے جملہ مسلمانان پاکستان کو دعوت دی تھی کہ وہ اسلام اور قرآن کی اساس پر متحد ہو جائیں۔ اس پر محترم ڈاکٹر صاحب نے فوری طور پر میاں طفیل صاحب کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے انہیں ایک مراسلہ بھیجا جس میں اتحاد کے لئے موصوف سے شرائط اور طریقہ کار کی وضاحت چاہی۔ میاں صاحب کی جانب سے جلد ہی ''صاف'' جواب موصول ہو گیا کہ آپ سے (یعنی ڈاکٹر اسرار احمد سے) کسی قسم کا اتحاد نہیں ہو سکتا۔ تاہم ان کی جانب سے یہ مشورہ دیا گیا کہ دونوں تحریکیں اپنے اپنے

طریقہ کار اور پالیسی کے مطابق اقامت دین کا کام مثبت انداز میں جاری رکھیں اور ایک دوسرے کے کام کو پبلک پلیٹ فارم یا پریس میں ہدف ملامت و نکتہ چینی نہ بنائیں۔

بعد میں جماعت اسلامی کے موجودہ امیر محترم قاضی حسین احمد صاحب کی اسی طرح کی عوامی پیشکش کے نتیجے میں ڈاکٹر صاحب محترم دو مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے مفصل تبادلہ خیال کیا لیکن امیر جماعت اسلامی کی جانب سے اس ضمن میں کوئی قابل ذکر مثبت پیش رفت سامنے نہیں آئی۔

۳ ۔ فروری ۸۵ء میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے تصور فرائض دینی پر مشتمل ایک مختصر تحریر اہل سنت کے تمام معروف مکاتب فکر کے ۶۰ سے زائد جید علماء کرام اور دیگر صاحبان علم و فضل کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ بھجوائی کہ اگر وہ اس میں کسی اعتبار سے کوئی کجی یا خامی محسوس فرمائیں تو اس پر متنبہ کریں۔ یہی تحریر ماہنامہ میثاق کے مارچ ۸۵ء کے شمارے میں بھی شائع کر دی گئی اور ان علماء کرام کے اسماء گرامی کی مکمل فہرست بھی شائع کی گئی جن کو یہ تحریر بڑے اہتمام کے ساتھ بھجوائی گئی تھی۔ اس مقصد کے لئے ڈاکٹر صاحب محترم نے ۲۳ تا ۲۸ مارچ ۸۵ء چھ روزہ سیمینار کا بھی اہتمام کیا جس میں تنظیم اسلامی اور انجمن خدام القرآن لاہور سے وابستہ پانچ صد سے زائد رفقاء و احباب شریک ہوئے۔

یہ ایک نہایت منفرد قسم کا اجتماع تھا۔ دینی جماعتوں کی تاریخ میں اس سے قبل اس قسم کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی انقلابی جماعت کے قائد نے تمام قابل ذکر مکاتب فکر کے علماء کرام کو اپنے پلیٹ فارم پر دعوت دی ہو کہ وہ آکر اس جماعت کے ارکان کے سامنے اس کے قائد کے افکار اور تصور دین کو تنقید کا نشانہ بنائیں۔ چھ روزہ سیمینار میں مختلف مکاتب فکر کے ۲۱ علماء کرام اور اہل علم و فضل حضرات نے مجوزہ تحریر کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔ یہ بڑا اہم موقع تھا جہاں مختلف الخیال اور مختلف مسالک سے متعلق اہل علم حضرات مل بیٹھے اور انہوں نے غلبہ دین کی جدوجہد کے حوالے سے باہم ایک دوسرے سے استفادہ کیا۔ اس سیمینار میں شرکت کرنے والے نمایاں علماء کرام میں مولانا

محمد مالک کاندھلوی، مفتی سیاح الدین کاکاخیل، مفتی محمد حسین نعیمی، حافظ عبد القادر روپڑی، سید عنایت اللہ شاہ بخاری اور مولانا وحید الدین خان (انڈیا) شامل تھے۔ سیمینار میں تشریف لا کر اظہار خیال فرمانے والے اہل علم و دانش کی مکمل فہرست حسب ذیل ہے :

لاہور سے

(۱) مولانا محمد مالک کاندھلوی	(۲) مفتی محمد حسین نعیمی
(۳) حافظ عبدالقادر روپڑی	(۴) سید محمد متین ہاشمی
(۵) پروفیسر حافظ احمد یار	(۶) ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی
(۷) حافظ عبدالرحمٰن مدنی	(۸) قاری سعید الرحمٰن علوی
(۹) ڈاکٹر خالد علوی	(۱۰) حافظ نذر احمد

بیرون لاہور سے

(۱) مفتی سیاح الدین کاکاخیل (اسلام آباد)	(۲) سید مظفر حسین ندوی (مظفر آباد)
(۳) سید عنایت اللہ شاہ بخاری (گجرات)	(۴) مولانا عبدالغفار حسن (فیصل آباد)
(۵) مولانا عبدالوکیل خطیب (کراچی)	(۶) مولانا محمد اسحٰق روپڑی (کراچی)
(۷) مولانا الطاف الرحمٰن (بنوں)	(۸) مولانا شبیر احمد نورانی (کراچی)

ہندوستان سے

(۱) مولانا وحید الدین خان (دہلی)	(۲) قاری عبدالعلیم (حیدر آباد)
(۳) میر قطب الدین علی چشتی (حیدر آباد)	

قارئین کی دلچسپی کے پیش نظر اور اس اہم معاملے کو ریکارڈ پر لانے کے لئے ان معزز اہل علم و دانش کے نام بھی ذیل میں دیئے جا رہے ہیں جنہیں اس سیمینار میں شرکت کا دعوت نامہ بھیجا گیا تھا لیکن وہ کسی سبب سے تشریف نہ لا سکے۔ ان میں سے بعض قابل احترام علماء نے اپنے خیالات تحریری طور پر ارسال فرما دیئے تھے (ان علماء کرام میں سے کئی بزرگ اس عرصے میں انتقال فرما چکے ہیں۔ اللھم اغفر لھم وارحمھم) :

مولانا سید حامد میاں، لاہور	مولانا عبید اللہ انور، لاہور
مولانا عطاء اللہ بھوجیانی، لاہور	علامہ احسان الٰہی ظہیر، لاہور
مفتی غلام سرور قادری، لاہور	علامہ محمود احمد رضوی، لاہور
نعیم صدیقی، لاہور	علامہ طاہر القادری، لاہور
مولانا اسعد گیلانی، لاہور	جسٹس ملک غلام علی، لاہور
جسٹس محمد تقی عثمانی، کراچی	جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن، کراچی
مولانا محمد یوسف، کراچی	مولانا محمد اسحٰق سندیلوی، کراچی
مولانا محمد طاسین، کراچی	ڈاکٹر غلام محمد، کراچی
مولانا منتخب الحق قادری، کراچی	مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی، کراچی
مفتی ولی حسن، کراچی	مولانا سلیم اللہ خان، کراچی
شاہ بدیع الدین پیر آف جھنڈا، سندھ	مولانا سعید احمد کاظمی، ملتان
مولانا محمد ازہر، ملتان	مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی، ملتان
مفتی زین العابدین، فیصل آباد	حکیم عبد الرحیم اشرف، فیصل آباد
مولانا اسحاق چیمہ، فیصل آباد	ڈاکٹر محمد نذیر مسلم، رحیم یار خان
مولانا محمد طاہر، پنج پیر	مولانا محی الدین لکھوی، اوکاڑہ
مولانا گوہر رحمٰن، مردان	مولانا خان محمد، میانوالی
جسٹس پیر کرم شاہ، سرگودھا	مولانا سمیع الحق، اکوڑہ خٹک
مولانا محمد عبد اللہ، اسلام آباد	مولانا عبد القیوم حقانی، اکوڑہ خٹک
مولانا ابو الحسن علی ندوی، لکھنؤ	مولانا محمد منظور نعمانی، لکھنؤ
مولانا تقی امینی، علی گڑھ	مولانا سعید احمد اکبر آبادی، انڈیا
مولانا اخلاق حسین قاسمی، دہلی	مولانا عبد الکریم پاریکھ، ناگ پور
جناب شمس پیرزادہ، بمبئی	قاری تقی الدین، حیدر آباد

۴ ـ گزشتہ تین سالوں (۹۳ء تا ۹۵ء) کے دوران ان کوششوں میں مزید اضافہ ہوا۔ تنظیم اسلامی کے اٹھارویں سالانہ اجتماع منعقدہ اکتوبر ۱۹۹۶ء کے موقع پر مختلف معاصر دینی جماعتوں کے سربراہوں کو قرآن آڈیٹوریم میں تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم پر

جمع کرنے کا پروگرام ترتیب دیا گیا اور پاکستان میں نفاذ دین کے طریق کار پر باہم تبادلہ خیال اور ایک دوسرے کے منہج عمل کو سمجھنے کی غرض سے ایسی اہم دینی جماعتوں کے سربراہوں کو مفصل خطاب کی دعوت دی گئی جو انتخابات کی بجائے انقلابی طریقے سے پاکستان میں نفاذ دین کے لئے کوشاں ہیں۔ اس ضمن میں بریلوی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والوں میں تحریک اسلامی انقلاب کے امیر مولانا مفتی سید جمال الدین کاظمی، سلاسل تصوف سے تعلق رکھنے والی ایک اہم شخصیت اور تنظیم الاخوان کے امیر مولانا محمد اکرم اعوان، تحریک فہم القرآن کے بانی میجر امین منہاس اور اہلحدیث مکتبہ فکر کی ایک اہم شاخ کے قائد پروفیسر محمد سعید نے اپنی اپنی تنظیم کے طریق کار کو بیان کیا۔ تبلیغی جماعت کے رہنما مولانا محمد احمد صاحب سے بھی بہاولپور میں رابطہ کیا گیا لیکن علالت کے باعث ان کا آنا ممکن نہ ہو سکا۔

بعد ازاں جنوری ۹۵ء میں اسی سلسلے کے تحت تحریک منہاج القرآن کے بانی و قائد پروفیسر طاہر القادری، ملتان کی معروف علمی شخصیت جناب عطاء المحسن اور لاہور کے معروف سکالر ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک کو دعوت خطاب دی گئی۔ ان حضرات نے رفقائے تنظیم کے سامنے نفاذ دین کے طریق کار کے ضمن میں اپنے اپنے موقف کو واضح کیا۔ ان تمام پروگراموں میں (بشمول ۸۵ء کے تاریخی سمینار کے) امیر تنظیم اسلامی نے میزبان کی حیثیت سے محض سامع کے طور پر شرکت کی اور مہمان مقررین کو اظہار خیال کا بھرپور موقع دیا۔ اس طرح کی کوئی اور مثال کسی دوسری جماعت کی جانب سے ہمارے علم کی حد تک تاحال سامنے نہیں آئی۔

۵ ۔ الاخوان کے امیر مولانا محمد اکرم اعوان سے ڈاکٹر صاحب نے اسی حوالے سے کئی خصوصی ملاقاتیں بھی کیں۔ ایک خصوصی ملاقات کے لئے ڈاکٹر صاحب ان کے مرکز منارہ (چکوال) بھی تشریف لے گئے۔ بعد ازاں مولانا محمد اکرم اعوان کو اپنے ہاں قرآن اکیڈمی بھی مدعو کیا اور پاکستان میں نفاذ دین کے لئے کسی مشترکہ پلیٹ فارم کی تشکیل پر تبادلہ خیال ہوا۔ اس ضمن میں اس تجویز پر اتفاق ہوا کہ ابتدائی قدم کے طور پر دونوں

تنظیموں کی صف دوم کے اکابر پر مشتمل ایک مذاکراتی ٹیم تشکیل دی جائے جو اشتراک عمل کی مختلف تجاویز پر غور کرے اور کوئی قابل عمل لائحہ عمل تجویز کرے۔ چنانچہ دونوں جانب سے ایک بااختیار کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کی متعدد نشستیں قرآن اکیڈمی لاہور میں منعقد ہوئیں۔ کارکنوں کے درمیان باہمی ربط ضبط بڑھانے اور مشترکہ پلیٹ فارم پر عوامی جلسے کرنے کے حوالے سے تجاویز پر مفصل گفتگو ہوئی جس کے نتیجے میں درج ذیل امور پر اتفاق ہوا :

i) موجودہ استحصالی اور ظالمانہ نظام جو کہ اللہ تعالیٰ سے بغاوت پر مبنی ہے' کو ختم کرکے نظام خلافت یعنی رب کی دھرتی پر رب کا نظام نافذ کرنے کے لئے جدوجہد کی ضرورت ہے۔

ii) نظام کی تبدیلی ملک میں مروجہ انتخابات کے ذریعے ناممکن ہے۔ اس کے لئے انقلابی طریقہ کار اختیار کرنا ہوگا۔

وہ طریقہ کیا ہو' اس سلسلے میں بات کو آگے بڑھانے کے لئے اور مشترکہ حکمت عملی کے لئے متفق نکات تک پہنچنے کی خاطر ابتدائی قدم کے طور پر مندرجہ ذیل اقدامات کئے جائیں گے :

ا) اپنی اپنی جماعت کے ممبران کو ہدایات جاری کی جائیں کہ وہ ایک دوسرے کے پروگراموں اور اجتماعات میں شرکت کریں۔

ب) اپنے اپنے زیر انتظام تعلیمی اداروں کے طلباء کو آپس میں visit کرنے' تقریری مقابلوں' کھیلوں اور دوسری سرگرمیوں میں حصہ لینے کے مواقع فراہم کئے جائیں۔

ج) لٹریچر کا تبادلہ کیا جائے۔ فری تقسیم کا لٹریچر بھی ایک دوسرے کو مہیا کیا جائے۔

د) مشترکہ عوامی جلسوں کا انتظام جن میں مشترک نکات بیان ہوں اور مختلف فیہ نکات زیر بحث نہ لائے جائیں۔

ہ) دونوں تنظیموں سے چند ذمہ دار افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو اس بات کا اہتمام کرتی رہے کہ آپس میں طے شدہ امور پر مناسب طریق سے عمل کا اہتمام کرایا جائے۔

چنانچہ اس ضمن میں تنظیم اسلامی کی جانب سے پیش قدمی کرتے ہوئے مئی ۹۵ء میں تنظیم اسلامی کے تحت منعقدہ والٹن روڈ پر ایک بڑے عوامی جلسے میں مولانا محمد اکرم اعوان صاحب کو دعوت خطاب دی گئی جو انہوں نے کمال مہربانی سے منظور فرمائی۔ اس موقع پر

تنظیموں کے رہنماؤں یعنی امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور تنظیم الاخوان جناب محمد اکرم اعوان صاحب نے ایک دوسرے کی موجودگی میں خطاب کیا ----- تاہم بعد میں تنظیم "الاخوان" کی جانب سے کسی واضح لائحہ عمل کے سامنے نہ آنے کے سبب مذکورہ بالا بااختیار کمیٹی کی بات چیت آگے نہ بڑھ سکی۔

دوسری جانب یہ صورتحال نہایت ہی افسوسناک ہے کہ تنظیم اسلامی کی جانب سے کی گئی ان قابل قدر مساعی کے باوجود کسی ایک جماعت کی طرف سے بھی امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر صاحب کو اپنے پلیٹ فارم پر اظہار خیال کی بھی دعوت نہیں دی گئی' اور نہ ہی اس مشن کو آگے بڑھانے کے لئے کسی دوسری جماعت نے مشاورتی میٹنگ کا کبھی اہتمام کیا۔ بعض جماعتوں کے قائدین کی جانب سے تنظیم اسلامی کی ان مساعی کے جواب میں بعض مواقع پر اس عزم کا اظہار بھی ہوا کہ مجوزہ مقاصد کے حصول کے لئے آئندہ وہ بھی اپنے ہاں ایسے پروگرام کریں گے' لیکن "اے بسا آرزو خاک شدہ" کے مصداق تاحال اس قسم کی کوئی کوشش کسی دوسری جماعت کی طرف سے سامنے نہیں آئی۔ محترم ڈاکٹر صاحب بحمد اللہ اس ناموافق صورتحال کے باوجود بددل اور مایوس نہیں ہوئے بلکہ

اک طرز تغافل ہے' سو وہ ان کو مبارک
اک عرض تمنا ہے' سو ہم کرتے رہیں گے

کے مصداق انہوں نے اپنی مساعی جاری رکھیں۔

۶ - ڈاکٹر صاحب محترم اس حقیقت سے پورے طور پر آگاہ ہیں کہ مختلف مسلکوں کے فروعی اختلافات میں موجود غیر معمولی شدت اس راہ کی بڑی رکاوٹ ہے' جسے جماعتوں کے سربراہان کو عبور کرنے میں دقت کا سامنا ہے۔ چنانچہ گزشتہ برس محترم ڈاکٹر صاحب نے مذہبی جماعتوں کے اتحاد کے ضمن میں ان کے تاریخی اور نظریاتی پس منظر کے حوالے سے ایک نئی عملی تجویز پیش کی۔ یہ پرخلوص تجویز محترم ڈاکٹر صاحب نے پہلے اپنے ۲۵ ستمبر ۹۵ء کے خطاب جمعہ بمقام دارالسلام باغ جناح میں وضاحت کے ساتھ پیش

کی۔ اور بعد ازاں اسے پوری تفصیل کے ساتھ ماہنامہ میثاق کے ماہ اکتوبر ۹۵ء کے شمارے میں شائع بھی کر دیا گیا۔ اس میں انہوں نے دیوبندی' بریلوی اور اہلحدیث مسالک کے مختلف پارٹیوں میں تقسیم رہنماؤں کو اپنے اپنے مسالک کی بنیاد پر اپنے فروعی اختلافات کو بھلا کر اکٹھا ہونے کی طرف توجہ دلائی۔ مزید برآں امیر تنظیم نے اس مبارک عمل کا آغاز خود کرتے ہوئے مشترک تاریخی اور نظریاتی پس منظر رکھنے والی تین جماعتوں یعنی تنظیم اسلامی' جماعت اسلامی اور تحریک اسلامی کے وفاق کی نہ صرف تجویز پیش کی بلکہ اس ضمن میں خود آگے بڑھ کر جماعت اسلامی اور تحریک اسلامی کے ساتھ اشتراک عمل کی پیشکش بھی کی۔ اس تجویز پر تحریک اسلامی کی جانب سے تو کسی قدر مثبت رد عمل سامنے آیا لیکن جماعت اسلامی نے اس تجویز کو در خور اعتناء نہیں سمجھا۔

۷ ۔ یہاں اس امر کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہو گا کہ گزشتہ تین چار برسوں کے دوران تحریک خلافت پاکستان جس کے "داعی" محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہی ہیں' اور جسے تنظیم اسلامی ہی کا ایک شعبہ قرار دیا جا سکتا ہے' کے زیر اہتمام وقتاً فوقتاً منعقد ہونے والے خلافت سیمینار ز اور خلافت کانفرنسوں میں بھی تمام مکاتب فکر کے علماء کرام اور دانشوروں کو اظہار خیال کی دعوت دی جاتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ ایک شیعہ عالم دین جناب ہادی علی نقوی بھی محترم ڈاکٹر صاحب کی دعوت پر تحریک خلافت کے ایک پروگرام میں تشریف لا کر اظہار خیال فرما چکے ہیں۔

قارئین کو یاد ہو گا کہ گزشتہ سال سالانہ اجتماع کے موقع پر منعقد ہونے والی دوسری عالمی خلافت کانفرنس کے مقررین میں دیگر مقررین کے علاوہ جماعت اسلامی کے مولانا گوہر رحمن صاحب اور تحریک اسلامی کے حکیم سرو سہارنپوری بھی شامل تھے ------ اور ابھی دو ماہ قبل ۱۸ / اگست کو قرآن کالج کی تقسیم اسناد کی تقریب میں محترم ڈاکٹر صاحب کی دعوت پر تحریک اسلامی کے دونوں دھڑوں کے قائدین یعنی جناب نعیم صدیقی اور مولانا مختار گل ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے۔ محترم نعیم صدیقی صاحب اگرچہ اپنی علالت کے باعث تقریر نہ فرما سکے تاہم وہ شدید علالت اور ضعف کے باوصف محترم ڈاکٹر صاحب سے

کئے گئے وعدے کو نبھانے جلسہ گاہ تک تشریف لائے۔ اس تقریب میں بھی جماعت اسلامی کی نمائندگی مولانا گوہر رحمان صاحب نے کی۔

اس طرح ایک سٹیج پر تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد، تحریک اسلامی کے امیر مولانا مختار گل اور جماعت اسلامی کے ایک اہم رہنما مولانا گوہر رحمان کے بیک وقت جمع ہو جانے سے تینوں جماعتوں کے وفاق کا جو خواب امیر تنظیم اسلامی نے دیکھا تھا اس کی ایک ابتدائی جھلک عملاً دیکھنے کو ملی۔ یہ سب کچھ اللہ کی تائید و توفیق سے ہوا جس نے محترم ڈاکٹر صاحب کی ان مساعی کو شرف قبول سے نوازا ہے۔ فللہ الحمد والمنہ

بحمد اللہ، تنظیم اسلامی کامل یکسوئی کے ساتھ منہج انقلاب نبوی ؐ کی رہنمائی میں پاکستان میں اللہ کے دین یعنی نظام خلافت کے قیام کے لئے جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہے اور پورے خلوص اور وسعت قلبی کے ساتھ اشتراک عمل کی ہر معقول تجویز پر غور کرنے اور اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے پہلے بھی آمادہ رہی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی رہے گی۔ OO

بحث و نظر

مسلمانوں کی ہر حکومت "الجماعت" ہے؟

سید وصی مظہر ندوی

مذکورہ بالا عنوان کے تحت جناب ڈاکٹر محمد فاروق خان کا ایک شاہکار مضمون ماہنامہ "فاران" کے ستمبر ۹۶ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ جناب محمد فاروق کے بارے میں میری جو سنی سنائی معلومات ہیں ان کے مطابق وہ اچھے ڈاکٹر (معالج) اور طب جدید کے ڈاکٹر ہیں، لیکن چونکہ انہوں نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"چونکہ یہ معاملہ قانون سے تعلق رکھتا ہے اس لئے ہم ہر معاملے میں دین کے قانونی پہلو ہی کو مد نظر رکھیں گے"۔

اس لئے خیال ہوا کہ وہ ڈاکٹر آف لاء بلکہ ڈاکٹر آف شریعہ لاء ہیں، چنانچہ انہوں نے اپنے کسی بیان یا دعوے کی دلیل دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی، کیونکہ ع "مستند ہے ان کا فرمایا ہوا"

○--- وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ذخیرۂ حدیث میں "السلطان" اور "الجماعت" مترادف المعنی ہیں، مگر جو شخص ذخیرۂ احادیث اور روایات تک خود رسائی حاصل کر سکتا ہے وہ فاران کے مضمون سے تو رہنمائی حاصل نہ کرے گا۔ فاران کا قاری تو اس قسم کے دعوے کے لئے علمی دلیل کا طالب ہوگا۔

○--- اسی طرح موصوف کا دعویٰ ہے کہ:

"امیر کا لفظ ہمیشہ اسلامی حکومت کے سربراہ یا دوسرے ذمہ دار افراد کے لئے آیا ہے"۔

لیکن اپنے دعوے کے ثبوت کے لئے انہوں نے احادیث میں اس لفظ کے استعمال کا حوالہ دینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جبکہ قرآن اور حدیث میں کم از کم مجھے تو مجرد لفظ "امیر" اسلامی حکومت کے سربراہ کے لئے کہیں نہیں ملا۔ امیر اور امراء کے الفاظ بالعموم

سربراہ کے ماتحت حکام کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔ سربراہ کے لئے یا تو "خلیفہ" کا لفظ استعمال ہوا ہے یا "امام" کا لفظ۔

۵--- انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ :

"جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں' آزاد ہوں اور ان کے اندر ایک بااختیار سیاسی تنظیم موجود ہو تو یہ مسلمانوں کی حکومت ہوتی ہے۔ یہ حکومت مسلمانوں سے مل کر بنتی ہے اس لئے یہ مسلمان ہی ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی ہر حکومت الجماعت ہوتی ہے"۔

اس عبارت سے درج ذیل دعاوی کا اظہار ہوتا ہے :

۱۔ جو حکومت مسلمانوں سے مل کر بنے وہ مسلمان ہی ہوتی ہے۔

گویا مسلمانوں کے انفرادی عقائد و اعمال میں تو کئی چیزیں اسلام کے خلاف ہو سکتی ہیں لیکن مسلمان اجتماعی طور پر جب بھی کوئی کام کریں' مثلاً حکومت بنائیں' تو وہ کام اور وہ حکومت مسلمان رہے گی۔ فرض کیجئے کہ مسلمان مل کر ایک سودی بینک قائم کرتے ہیں تو وہ سودی بینک مسلمان ہی سمجھا جائے گا' یا مثلاً ترکی کی حکومت' جہاں حکومت کے معاملات میں اسلام کا نام لینا بھی جرم اور خلاف دستور ہے' یہ حکومت بھی مسلمان ہے کیونکہ اس کے بنانے والے مسلمان ہیں! یا روس سے آزاد ہونے والی مسلمانوں کی وہ آزاد ریاستیں' جنھوں نے اب تک کمیونزم کی بنیاد پر اپنا اجتماعی نظام قائم کر رکھا ہے' وہ بھی مسلمان حکومتیں ہیں۔ گویا مسلمان جو کچھ بھی کرتے رہیں وہ بہرحال مسلمان ہی رہیں گے اور ان کے تمام کام بھی "مسلمان" ہی سمجھے جائیں گے' خواہ وہ کام صریحاً اسلام کے احکام کی مخالفت پر مبنی ہوں۔

۲۔ دوسرا دعویٰ یہ سامنے آتا ہے : "مسلمانوں کی ہر حکومت الجماعت ہوتی ہے۔" اس دعویٰ کو یکسر بلا دلیل پیش کر دیا گیا ہے' نہ کتاب و سنت کے حوالوں سے واضح کیا گیا ہے کہ "الجماعت" کا اطلاق کن خصوصیات کی حامل جماعت پر ہو سکتا ہے' نہ مسلمانوں کی ہر حکومت میں ان خصوصیات کی موجودگی کو ثابت کیا گیا ہے۔

کاش ایسا ہوتا کہ جملہ قارئین فاران محترم ڈاکٹر صاحب کے حلقہ ارادت میں

داخل ہوتے اور یہ مریدان باسعادت ہرماہ ڈاکٹر صاحب کے ملفوظات سے رشد وہدایت حاصل کر کے اپنے علمی اور روحانی مدارج بلند کرتے۔ مگر افسوس ابھی تک یہ صورت حال پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ البتہ جناب ڈاکٹر صاحب کے مضامین اگر اسی شان سے فاران میں چھپتے رہے تو جملہ قارئین فاران اس حلقہ ارادت میں شامل ہو جائیں گے یا قارئین کی صف سے باہر کھڑے نظر آئیں گے۔

جناب ڈاکٹر صاحب نے اپنے مدعا کے اثبات کے لئے احادیث میں حسب ضرورت "اصلاح" بھی فرمائی ہے جس کو تحریف معنوی قرار دینا کہیں گستاخی پر محمول نہ کیا جائے۔

(الف) مثلاً ایک مشہور حدیث جس کے الفاظ اس طرح ہیں :

((علی المرء المسلم السمع والطاعة فیما احب وکرہ' الا ان یؤمر بمعصیة' فان امر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة))۔ (مسلم عن ابن عمرؓ)

"مسلمان پر لازم ہے کہ اسے کوئی حکم پسند ہو یا ناپسند وہ اس کو سنے اور مانے' بجز اس صورت کے جب اسے کسی معصیت کا حکم دیا جائے پھر اگر اسے کسی معصیت کا حکم دیا جائے' تو نہ سننا ہے اور نہ ماننا ہے"۔

مگر ڈاکٹر صاحب اس حدیث کے ترجمے میں تصرف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"پھر اگر گناہ کا حکم دیا گیا تو ان کے لئے سننا اور ماننا ضروری نہیں"۔

گویا اگر سنیں اور مانیں تو ایسا کرنا بھی جائز ہے۔ دل چاہے تو نہ مانیں کیونکہ ماننا ضروری نہیں ہے۔

(ب) اسی طرح محترم ڈاکٹر صاحب نے ایک اور حدیث میں بھی "تصرف" فرمایا ہے۔ لیکن یہ تصرف ترجمے میں نہیں تشریح و تفسیر میں جائز رکھا گیا ہے۔

یہ حدیث بھی مسلم شریف کی ہے' حضرت عبادہؓ بن الصامت اس کے راوی ہیں۔ حدیث کا جو ترجمہ ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے وہ ایک حد تک درست ہے تاہم عربی محاورے کے مطابق وہ بھی مکمل طور پر درست نہیں۔ حدیث کے الفاظ مبارکہ اس طرح پر ہیں :

((وان لا ننازع الامر اھلہ الا ان تروا کفرًا بواحًا عندکم فیہ من اللہ برھان))۔

"اور یہ کہ ہم امر (حکومت) والوں سے امر (حکومت) چھیننے کی کوشش نہ کریں مگر جب تم ان کی طرف سے کوئی کھلا کفر دیکھ لو جس کے کفر ہونے کی کوئی برہان اللہ کی طرف سے تمہارے پاس موجود ہو۔"

ڈاکٹر صاحب نے ترجمہ اس طرح پر کیا ہے :

"ہم اپنے حکمرانوں سے نہ جھگڑیں گے سوائے اس صورت میں کہ تم ان کی طرف سے کسی کھلے کفر کا ارتکاب ہوتا دیکھ لو اور کفر بھی ایسا جس کے بارے میں اللہ کی طرف سے واضح دلیل ہو۔"

اردو میں "نزاع" صرف جھگڑنے کے معنی میں آتا ہے' لیکن عربی زبان میں خاصمہ' غالبہ اور جاذبہ کے معنی میں مستعمل ہے' یعنی کسی کو مغلوب کرنے اور کسی چیز کو اس سے کھینچ لینے یا چھین لینے کے معنی میں مستعمل ہے۔ اور "الامر" حکومت کے معنی میں مستعمل ہے۔

ترجمے میں اس تسامح کو تو خیر نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی تشریح میں جو تصرف کیا گیا ہے وہ بہت افسوسناک ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں :

"وہ گناہ یا کفر کا حکم دیں تو اس خصوصی معاملے میں ان کی بات نہ مانی جائے"۔

پھر حدیث کا مذکورہ ترجمہ لکھنے کے بعد تشریح فرماتے ہیں :

"گویا ایسے حکمرانوں کی عام معاملات میں تو اطاعت کی جائے گی' تاہم وہ جس معاملے میں گناہ یا کفر کا حکم دیں گے وہاں ان کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔"

افسوس ڈاکٹر صاحب نے گناہ اور کفر بواح کو ہم پلہ قرار دے دیا۔ حالانکہ کفر کا حکم دینا تو بہت سنگین بات ہے۔ محض کسی حکمران کی طرف سے کھلے کفر کے اظہار سے بھی وہ نہ صرف سمع و طاعت کا حق کھو دیتا ہے بلکہ اس سے حکومت چھیننے کی جدوجہد کرنے کا حق بھی حاصل ہو جاتا ہے' اور حدیث میں اسی نزاع کے حق کو بیان کیا گیا ہے۔ مگر کفر کا حکم دینے کے بعد بھی حکم دینے والے کی اطاعت کا لازم رہنا حدیث سے صریح انحراف ہے۔ ڈاکٹر صاحب تشریح و تفسیر میں مزید حد درجہ تجاوز کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اس سے ضمنی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایسے مسلمان حکمران اور مسلمان

حکومتیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو اپنی رعایا کو معصیت کا حکم دیں یا واضح کفر کا ارتکاب کریں۔"

حالانکہ احادیث میں معصیت کا ارتکاب کرنے والے حکمران یا معصیت کا حکم دینے والے حکمرانوں اور کفر بواح کا ارتکاب کرنے والے حکمرانوں کے درمیان واضح فرق کیا گیا ہے۔ پہلی قسم کے حکمرانوں کے لئے صرف یہ ہدایت ہے کہ معصیت میں ان کی اطاعت نہ کی جائے لیکن دوسری قسم کے حکمرانوں سے نزاع کرنے اور حکومت کو ان سے چھیننے کا حق بھی دیا گیا ہے۔ کفر کے مرتکب نام نہاد مسلمان حکمرانوں اور کافر حکمرانوں کے درمیان در حقیقت کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں اللہ کی زمین پر اور اللہ کے بندوں پر حکم چلانے کا حق کھو دیتے ہیں۔ ان کے خلاف نہ صرف نزاع جائز بلکہ مطلوب بن جاتا ہے۔ البتہ اس نزاع کے سلسلہ میں عملی اقدام کے لئے کچھ شرائط ہیں۔ یہ شرائط اگر پوری نہ ہوں تو کافر حکمرانوں کے خلاف جس طرح کوئی اقدام نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ان نام نہاد مسلمانوں کے خلاف بھی کوئی اقدام نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر یہ شرائط پوری ہو جائیں تو جس طرح طاغوت (اللہ کے باغیوں) سے جنگ کرنا اور اللہ کے بول کو بالا کرنا واجب ہے، اسی طرح ایسے نام نہاد مسلمان حکمرانوں کے خلاف بھی جنگ کرنا واجب ہے جو کھلے کفر کے مرتکب ہوں۔

جناب ڈاکٹر صاحب نے ایک بے بنیاد دعویٰ کو مسلمہ اصول کی حیثیت سے بیان کر کے اس پر لمبی چوڑی عمارت کھڑی کی ہے جو پوری عمارت بناء فاسد علی الفاسد ہے۔ وہ فرماتے ہیں :

"واضح کفر کا ارتکاب کرنے والے حکمرانوں کو اتنے بڑے جرم کے بعد بھی الجماعت کیوں کہا جاتا ہے؟"

جناب ڈاکٹر صاحب! کون عقل مند ان کو "الجماعت" کہتا ہے۔ یہ تو آپ کی ایک انوکھی بات ہے کہ کفر کی مرتکب حکومت بھی الجماعت ہے۔ سبحان اللہ! ؏ پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی۔ اس بے بنیاد مفروضے کو تسلیم کر کے اس کے درست ہونے کے جو اسباب آپ نے بیان کئے ہیں وہ سب خود ساختہ، مفروضہ اور مہمل ہیں۔

جناب ڈاکٹر صاحب "بیان قانون" میں بڑے غیر محتاط ہیں۔ چنانچہ وہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ : "کیا یہ مسلح جدوجہد کسی وقت لازمی بھی ہو جاتی ہے؟" لکھتے ہیں:

"عام حالات میں یہ مسلح جدوجہد صرف جائز ہے لیکن اگر باقی شرائط پوری ہوں اور اسلحہ اور فوجی طاقت بھی کفر کا ارتکاب کرنے والی حکومت سے زیادہ ہو تو پھر مسلح جدوجہد لازم ہو جاتی ہے"۔

لیکن محترم ڈاکٹر صاحب کی دونوں باتیں قانونی طور پر غلط ہیں، کیونکہ :

۱۔ اگر شرائط پوری نہ ہوں تو مسلح جدوجہد جائز بھی نہیں ہے۔

۲۔ اسی طرح شرائط میں اس شرط کا اضافہ کہ اسلحہ اور فوجی طاقت کفر کا ارتکاب کرنے والی حکومت سے زیادہ ہو تب مسلح جدوجہد لازم ہے۔ یعنی مادی طاقت میں خروج کرنے والے فرد کے پاس بگڑی ہوئی حکومت سے زیادہ اسلحہ اور فوج موجود ہو۔ یہ ایک خود ساختہ شرط ہے جو فقہاء میں سے کسی نے بھی نہیں بیان کی اور قرآن و سنت کی کسی دلیل سے بھی یہ شرط ثابت نہیں ہوتی بلکہ قرآن تو کہتا ہے : "كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ"۔ اور یہ بھی کہتا ہے کہ قوی الایمان مسلمان اپنے سے دس گنا کفر کی طاقت کو شکست دے سکتے ہیں اور نسبتاً کمزور ایمان والے بھی اپنے سے دوگنی طاقت سے ٹکرا کر اسے شکست دے سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس شرط کو اگر درست مان لیا جائے تو پھر بدر، احد، حنین، خندق اور تبوک وغیرہ کے تمام جہاد و قتال اصولاً غلط ثابت ہو جاتے ہیں۔

۳۔ اسی طرح محترم ڈاکٹر صاحب نے کفر بواح کی مرتکب حکومت کے خلاف عملی اقدام کے جواز کے لئے یہ شرط جو عائد کی ہے کہ وہ : "حکومت استبدادی اور غاصبانہ ہو اور اس کے بننے میں مسلمانوں کی مرضی کو دخل نہ ہو"۔ بالکل خود ساختہ شرط ہے۔ کفر کی مرتکب حکومت خواہ کافروں کی ہو اور ان کی اکثریت کی تائید سے بنی ہو خواہ نام نہاد مسلمانوں کی ہو اور بظاہر اس کو مسلمانوں کی اکثریت کی تائید حاصل ہو، اسے اللہ کی زمین پر اور اللہ کے بندوں پر اصولاً حکمرانی کا حق نہیں پہنچتا۔ اس لئے ایسی ہر حکومت کو ختم

کرنے کے لئے جدوجہد کرنا اور جب دیگر ضروری شرائط پوری ہو جائیں تو ایسی حکومت کے خلاف مسلح کارروائی کرنا نہ صرف جائز بلکہ مطلوب اور پسندیدہ ہے اور بعض حالات میں واجب اور لازم ہے۔

اس باب میں اسلام کی اصولی تعلیمات بالکل واضح ہیں۔ مثلاً :

(۱) انبیاءؑ کی بعثت کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ان کو کتاب اور میزان کے ساتھ اس لئے بھیجا گیا اور بڑی قوت رکھنے والے فولاد کو اس لئے اتارا گیا تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہو جائیں۔

(۲) اظہارِ دین حق کو نبی کریم ﷺ کی بعثت کا مقصد قرار دیا گیا۔

(۳) اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے قتال کرنے کو اللہ کی راہ میں قتال کرنا بتایا گیا

(۴) وہ ظالم اور جابر حکمران جن کو بظاہر ان کی قوم کی اکثریت کی تائید و حمایت حاصل تھی' اہل ایمان کو ان کے خلاف قتال کرنے کی دعوت دی گئی۔

(۵) قیصرو کسریٰ کو رسالتمآب کی طرف سے جو خطوط بھیجے گئے ان میں واضح طور پر ان کو اقتدار سے محروم کرنے کی دھمکی تھی۔ اَسْلِمْ تَسْلَمْ (فرمانبردار بن جا تو سلامت رہے گا)

(۶) خلفائے راشدین کے دور میں جو مسلمان لشکر کفار پر حملہ آور ہوتے تھے وہ کافر حکومتوں کے سامنے' قطع نظر اس کے کہ ان کو اپنے عوام کی تائید حاصل تھی یا نہیں' صرف تین متبادل رکھتے تھے : (الف) اسلام لے آؤ' (ب) جزیہ ادا کر کے ماتحت بن کر رہنا قبول کرو' (ج) یا جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔

آج کل کے جمہوری تماشے کے ذریعے جو حکومتیں بر سر اقتدار آتی ہیں ان کو عوام کی حمایت حقیقتاً جس حد تک حاصل ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ تائید و حمایت اس دور کے انصاف پسند بادشاہوں کو حاصل ہوا کرتی تھی۔ مگر جو لوگ اللہ تعالیٰ کو کائنات کا مقتدر اعلیٰ نہ مانتے ہوں' اور اس کے احکام کے مطابق دنیا میں بندوں کے معاملات کو انصاف کے مطابق چلانے کے اصول کو نہ تسلیم کرتے ہوں' انفرادی طور پر تو کفر کی راہ اختیار کرنے کا اختیار تو ان کو حاصل ہے' لیکن اجتماعی طور پر بندوں کے معاملات کو اللہ کے

احکام سے آزاد ہو کر اپنی مرضی سے چلانے والے دراصل طاغوت ہیں۔ چنانچہ ان کے خلاف جدوجہد کرنا فرض ہے۔

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾

"اور تم ان سے قتال کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور "دین" سارے کا سارا اللہ کے لئے ہو جائے"۔

بہرحال یہ موضوع بہت وسیع ہے' اس کی تفصیل میں جانا اس وقت مناسب نہیں۔ تاہم بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے بعض سرپرست خود اپنے طرز عمل کو سند جواز فراہم کرنے کے لئے دین کے بنیادی حقائق تبدیل کرنے کی جس کوشش میں لگے ہوئے ہیں وہ علامہ اقبال کے ارشاد کے مطابق خود کو بدلنے کے بجائے قرآن کو بدلنے کے ناپسندیدہ مشغلے کے سوا کچھ نہیں ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

آخر میں محترم ڈاکٹر صاحب سے یہ پوچھنا ہے کہ وہ غیر معیاری مسلمان حکومتوں کی اصلاح اور غیر مسلم حکومتوں کی اصلاح کے لئے اجتماعی جدوجہد کے تو قائل ہیں تاہم وہ سمع و طاعت کی بنیاد پر کسی اجتماعی نظام کو قائم کرنا درست نہیں سمجھتے' کیونکہ ان کے خیال میں سمع و طاعت کی بنیاد پر نظام صرف اصحاب اقتدار کے لئے مخصوص ہے۔ اور ان کے دعوے کے مطابق نبی ﷺ نے مکی زندگی میں سمع و طاعت کی بیعت نہیں لی تھی' تو ازراہ کرم وہ یہ بھی بتا دیں کہ پھر اجتماعی جدوجہد کا نظام کیا ہونا چاہئے؟ کیا انجمن اور جماعت سازی کا وہ نظام جو مغرب سے درآمد ہوا ہے؟ اگر ان کا یہی خیال ہے تو مکی زندگی میں کیا اس طرح کی انجمن سازی ثابت ہے؟

سیدھی سی بات یہ ہے کہ اصحاب اقتدار جب سمع و طاعت کی بیعت لیتے ہیں تو ان کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ لیکن غیر اسلامی اقتدار میں رہتے ہوئے جو اجتماعی جدوجہد کی جائے گی اس میں سمع و طاعت کا دائرہ ان امور تک ہی محدود رہے گا جن معاملات میں "امر" کا اختیار سربراہ تنظیم کو غیر اسلامی اقتدار کے اندر رہتے ہوئے حاصل ہو گا۔

مکی زندگی میں بھی نبی ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والے اصحاب اسی طرح کی سمع و طاعت کے نظام میں بندھے ہوئے تھے خواہ اس سلسلہ میں کسی قسم کی بیعت کا ثبوت ملے یا نہ ملے' بلکہ ان کی بیعت ایمان ہی اس سمع و طاعت کی اساس ہے۔ چنانچہ :

۱۔ كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز کو قائم کرو)

۲۔ آلِ یاسر کو صبر کی ہدایت

۳۔ حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت

۴۔ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت

۵۔ دارِ ارقم میں محصور ہونے کا فیصلہ وغیرہ

یہ سب اجتماعی امور ہیں جن کے بارے میں سمع و طاعت کے نظام کی موجودگی ثابت ہے' لیکن ان کے علاوہ بے شمار انفرادی معاملات روزمرہ پیش آتے ہوں گے جن میں اہل ایمان نبی ﷺ کے حکم و ہدایت پر عمل کرتے ہوں گے۔

حضرت ابو جندل اور ان کے بعض ساتھیوں کو عارضی طور پر قریش کی تجارتی شاہراہ پر مجبوراً رہنے اور قریش کے قافلوں کے لئے خطرہ بننے کا جو فیصلہ کرنا پڑا وہ قطعی طور پر کسی علیحدہ ریاست کے قیام کا فیصلہ نہ تھا اور حضرت ابو جندل کی ٹولی میں ایک "ریاست" کے خصائص موجود نہ تھے۔ تاہم بنو امیہ کی حکومت کے خاتمے کے بعد اندلس میں ان کی علیحدہ ریاست کا قیام اور پھر بنو عباس کے زوال کے دور میں بے شمار ایسی حکومتوں کا قیام جو آزاد یا نیم آزاد تھیں ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے انکار ممکن نہیں ہے!

اس طرح دورِ حاضر میں مسلمانوں کی پچاس سے زائد آزاد اور خود مختار حکومتوں کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس صورت حال کی موجودگی سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ بس وہی ہے جس کا تذکرہ میں نے اپنے مضمون میں کیا تھا' جس مضمون کا تذکرہ جناب ڈاکٹر صاحب نے بھی فرما دیا ہے' یعنی یہ کہ وہ "الجماعت" جس کے بارے میں احادیث صحیحہ میں واضح احکام وارد ہوئے ہیں اور جس کو نبی ﷺ نے قائم کیا تھا وہ "الجماعت" آج قائم نہیں ہے' اس لئے اس "الجماعت" سے متعلق تمام احکام اس

وقت تک معطل رہیں گے جب تک وہ "الجماعت" قائم نہ ہو جائے۔ الجماعت سے متعلق بعض احکام یہ ہیں :

(۱) الجماعت سے چمٹے رہنا (علیکم بالجماعۃ)، (۲) اس سے علیحدگی جہنم کی طرف لے جانے کا سبب ہے (من شذ شذ فی النار)، (۳) الجماعت سے بغاوت کرنے والا واجب القتل ہے (فاضربوا عنقہ کائناً من کان)، (۴) اطاعت سے نکلنا اور الجماعت سے الگ ہو کر مرنا جاہلیت کی موت ہے۔ وغیرہ وغیرہ

یہ سارے احکام اس وقت تک معطل ہیں جب تک "الجماعت" قائم نہ ہو جائے، البتہ اس "الجماعت" کے قائم کرنے کی تمنا کرنا اور اس کے لئے جدوجہد کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ یہ بات سراسر مہمل ہے کہ مسلمانوں کی جتنی حکومتیں قائم ہوتی چلی جائیں، خواہ وہ معیاری ہوں یا غیر معیاری، بلکہ ڈاکٹر صاحب کے دعویٰ کے مطابق خواہ وہ کفر بواح کی مرتکب ہوں، سب کی سب الجماعت ہیں اور ان تمام حقوق کی مستحق ہیں جو احادیث صحیحہ میں الجماعت کے لئے بیان ہوئے ہیں۔ یہ دعویٰ "الجماعت" قائم کرنے کی جدوجہد کی ذمہ داری سے بچنے کا بہانہ ہے۔ تاہم اس قسم کا دعویٰ کرنا سراسر مہمل اور بے سند دعویٰ ہے۔

مجھے اکثر خیال آتا ہے

طیبہ یاسمین

مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ سچائی کی راہ بڑی کٹھن ہے' اس پر چلنا بڑا مشکل ہے' سچی بات کہو تو لوگ جھگڑا کرنے لگتے ہیں۔ کیا اس طرح کی باتیں کہتے ہوئے ہم سچائی کے خلاف پروپیگنڈا نہیں کرتے؟ کیا اس طرح سچ کی حوصلہ شکنی اور جھوٹ کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی؟۔ اسلام اور سچائی تو فطرت کے عین مطابق ہیں۔ پھر ان پر عمل سے تکلیف کیسی؟ بلکہ اس تکلیف میں اور بھی راحت ہوتی ہے۔

کیا جھوٹ کی راہ بڑی آسان ہے؟ کیا اس راہ پر چلنے والے کو مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا؟ کیا اسے زندگی میں تکلیفوں اور جھوٹ کی وجہ سے پیدا شدہ الجھنوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا؟ اور کیا جھوٹے اور سچے آدمی کی معاشرہ میں عزت اور ساکھ ایک جیسی ہوتی ہے؟ دنیا کے جتنے بھی جھگڑے اور فساد ہیں کیا وہ جھوٹ کی وجہ سے نہیں؟ کیا اللہ کی مدد جھوٹے اور سچے انسان کے لئے ایک جیسی ہوتی ہے؟ کیا دل کا سکون جھوٹے اور سچے انسان کے لئے ایک ہوتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر ہم کیوں کہتے ہیں کہ سچ کی راہ بڑی کٹھن ہے۔ نہیں! باطل کی راہ بڑی دشوار ہے کہ یہ فطرت کے خلاف ہے اور خلاف فطرت کام بہت مشکل ہوتے ہیں کہ ان میں خدا کی مدد کی بجائے ہمارے ازلی دشمن شیطان کی مدد شامل ہوتی ہے۔

مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ ایسا انسان جو کسی کے کام نہیں آتا' نہ ہی اس سے کسی کی امیدیں یا توقعات وابستہ ہوتی ہیں' وہ بنی نوع انسان کو اپنی ذات سے کسی قسم کا نفع نہیں پہنچاتا' کیا وہ زندہ کہلانے کا مستحق ہے؟ کیا اس میں اور ایک مردہ لاش میں سوائے حاضر اور غائب کے کوئی فرق ہے؟

انسان کو دولت سے بہت محبت ہوتی ہے اور وہ اسے سینت سینت کر رکھتا ہے۔ خود اپنی زندگی میں بہت سے لوگ اپنی جائز ضروریات پورا کرنے کے لئے بھی اس سے جدائی برداشت نہیں کرتے اور یوں ڈھیروں دولت جمع کر کے خود قبر کی آغوش میں پہنچ کر مجبوراً اس سے جدا ہوتے ہیں۔ مگر وہ دولت وہاں دشمن بن کر انہیں عذاب میں مبتلا کرتی ہے۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ دولت سے محبت ہو تو اسے دنیا کے بنک میں جمع کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر کے آخرت کے بنک میں جمع کرانا چاہئے تا کہ وہ کئی گنا بھی ہو اور نفع بخش بھی ہو۔

بہت سے انسان جب اپنی زبان کے تیر و نشتر سے دوسرے کے کلیجہ کو زخمی کرتے اور بجائے شرمندہ ہونے کے علی الاعلان اپنے اس فعل کو صاف گوئی اور مخاطب کے احتجاج کو اس کی زود حسی اور تنگ مزاجی سے تعبیر کرتے ہیں تو مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ یہ کیسی صاف گوئی ہے جو دوسرے پر گندگی بن کر اچھلتی اور اس کے احساسات کو زخموں سے چور چور کر دیتی ہے؟ کیا ایک صاف دل اور صاف زبان سے صرف طنز و تشنیع کی بارش ہی ہو سکتی ہے۔ کیا وہاں سے مہر و محبت اور خلوص کے چشموں کی پرسکون پھوار نہیں پڑ سکتی؟

مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ ہم خرید و فروخت کے معاملات طے کرتے وقت کم سے کم قیمت، اور تنخواہ یا اجرت طے کرتے وقت کم سے کم اجرت اور تنخواہ طے کرنا چاہتے ہیں۔ فریق ثانی اپنی لاعلمی یا کسی مجبوری کی وجہ سے ہماری بات مان لیتا ہے تو کیا دراصل ہم اس کی حق تلفی نہیں کرتے؟ کیا وہ حق تلفی ہمارے لئے جائز ہو گی اور آخرت میں اس کے بدلے میں نیکیاں نہ دینی پڑیں گی؟ کیا انصاف اور احسان کا تقاضا یہ نہیں کہ ہم اس کا پورا حق دیں اور اس طرح اس پر بھی رحم کریں اور خود پر بھی؟

مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ جب کوئی ہم سے زیادتی کرتا ہے اور ہم اسے اس زیادتی کا جواب اسی انداز میں دے کر خود کو مطمئن کرنے کے لئے ان لوگوں کا طرزِ عمل ذہن میں لاتے ہیں جو سخت مزاج اور برائی کا بدلہ برائی سے دینے والے اور کسی کی بات کا ادھار نہ رکھنے والے ہوں، تو آخر ایسے وقت میں ہمیں ان فرشتہ صفت اور نیک سیرت لوگوں کا عمل کیوں مشعل راہ دکھائی نہیں دیتا اور قابل تقلید محسوس نہیں ہوتا جن کی زندگی عفو و

درگزر، حسن معاملات اور شفقت و محبت سے پیش آنے کے واقعات سے بھرپور ہوتی ہے؟ ان لوگوں کے سکون قلب اور اطمینان نفس کی مثال سامنے ہوتے ہوئے بھی ہم پریشانی اور کوفت کی راہ کیوں اپناتے ہیں؟

جب ہم سے کوئی شخص بھلائی کرتا ہے تو ہم اسے اچھا کہتے ہیں اور جب کوئی برا سلوک کرے تو اسے برا کہتے ہیں۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ آخر ہم دوسروں کو اچھا یا برا کہنے یا سمجھنے کے لئے اپنی ہی ذات کو کیوں معیار قرار دیتے ہیں؟ ہمارا معیار یہ کیوں نہیں ہوتا کہ اس کا رویہ عوام الناس سے کیسا ہے؟

ہم اپنی گفتگو میں اکثر ایسے فیصلہ کن الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ فلاں میں جتنا صبر ہے کسی دوسرے میں ہو ہی نہیں سکتا۔ فلاں جتنا اچھا ہے اتنا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ جتنا فیاض اور متواضع ہے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ ایسے فیصلے کرتے وقت کیا ہم نے سب لوگوں کا طرز عمل پرکھ لیا ہوتا ہے؟ اور اگر ایسے الفاظ یا جملے مبالغے کے طور پر یا محاورتاً بولے جاتے ہیں تو سوچنے کی بات ہے کہ جس کی تعریف میں ہم زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں اس کی سچائی اور حقیقت میں کیا کمی ہے کہ ہمیں مبالغے کا سہارا لینا اور دوسروں کو کم ظاہر کرنا پڑ رہا ہے؟

مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ دنیا کی ہر ترقی اور آسائش ہمیں اپنا پیدائشی حق دکھائی دیتا ہے، مگر جب کوئی غریب آدمی یا ہمارا ماتحت بہتر زندگی گزارنا چاہے اور زندگی کی آسائشوں سے فائدہ اٹھانا چاہے تو ہم اسے طنز کا نشانہ کیوں بناتے ہیں؟۔ ہم اسے اس کی غربت کا احساس دلاتے اور اس کو اس کی کم تر حیثیت پر قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ کیوں ہوتی ہے کہ وہ جس طرز زندگی کو اختیار کرنے پر مجبور ہے اس میں بہتری نہ ہو۔ آخر ہم دوسروں کو پستی اور خود کو بلندی کے مقام پر دیکھنے کی خواہش کرنے کے کیسے حقدار ہوتے ہیں؟

ہم اپنی ذات سے محبت کے حصار میں قید ہیں، مگر یہ کیسی محبت ہے جو اسے بہتر نہیں بناتی۔ دنیا میں جس سے بھی محبت ہو ہم اس کے لئے تمام بھلائیاں، خیر خواہیاں اور ترقیاں چاہتے ہیں، مگر اپنی ذات کے لئے یہ کیسی محبت ہے جو اس سے آشنا نہیں ہونے دیتی۔ ہم

اس کی بہتری اور ترقی کیوں نہیں چاہتے؟۔ ہمارا فریب نظر اس میں خوبیاں دکھاتا تو ہے مگر پیدا نہیں کرتا۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ کیا یہ جھوٹی محبت نہیں ہے؟ کیا ہم اپنی ذات سے اتنی بھی محبت بھی نہیں کرسکتے کہ اسے فریب نظر اور فریب نفس سے بچائیں؟

مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ ہم اللہ اور پیارے نبی ﷺ سے اتنی زیادہ محبت کیوں نہیں کرتے کہ ان کا وجود ہر وقت اپنے پاس محسوس کریں اور اپنے خیالات اور اعمال کو اس طرح پرکھیں کہ کیا اس وقت یہ خیال یا کام جیسے اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے اسے پسند آرہا ہے؟ اگر آج اس وقت پیارے نبی ﷺ ہم میں بیٹھے ہوں اور ہم یہ طرز عمل اپنائیں تو کیا ان کو اچھا لگے گا؟

تنظیم اسلامی کا اکیسواں سالانہ اجتماع

مرتب : نعیم اختر عدنان

تنظیم اسلامی کی بیس سالہ تاریخ میں پہلی بار سالانہ اجتماع کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا۔ چنانچہ تنظیم اسلامی کا اکیسواں سالانہ اجتماع نومبر کے پہلے ہفتے میں لیاقت باغ راولپنڈی میں منعقد ہوا۔ راولپنڈی میں منعقدہ اجتماع میں آزاد کشمیر' سرحد' پنجاب شمالی' پنجاب جنوبی' گوجرانوالہ ڈویژن' لاہور ڈویژن' عرب امارات اور حلقہ حجاز اور امریکہ سے رفقاء کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ حلقہ سندھ و بلوچستان اور حلقہ پنجاب جنوبی کے رفقاء کے اکیسویں سالانہ اجتماع کے لئے سندھ کے مشہور شہر سکھر کا انتخاب کیا گیا تھا۔ یہ اجتماع میونسپل سٹیڈیم سکھر میں نومبر کے آخری عشرے یعنی ۲۲ تا ۲۴ کی تاریخوں میں منعقد ہوا۔ نرم دم گفتگو' گرم دم جستجو کی منہ بولتی تصویر سید محمد نسیم الدین اس اجتماع کے ناظم تھے۔ استقبالیہ' اجتماع گاہ اور قیام و طعام گاہوں کے تمام تر انتظامات زبان حال سے یہ گواہی دے رہے تھے کہ یہ "سب کچھ" باصلاحیت رفقاء اور باتدبیر قائد کی شبانہ روز کی انتھک کاوشوں کا حاصل ہے۔

تنظیم اسلامی کا قافلہ اگرچہ بہت زیادہ وسعت کا حامل نہیں ہے مگر اس قافلے سے وابستہ و پیوستہ "رفقاء" کو نظم کے کڑے سانچے سے ہر لمحے گزرنا پڑتا ہے اور گاہے گاہے ان کی صلاحیتوں اور قوتوں' جذبوں اور امنگوں کا امتحان ہوتا رہتا ہے۔ آزمائش اور امتحان' جانچ اور پرکھ ہی تو اصل شے ہے جو افراد' تنظیموں اور ملتوں کے لئے ایک پیمانے اور معیار کا کام دیتی ہے۔ تنظیم اسلامی کے رفقاء نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ جیسے "امام برحق" کے ہاتھ پر سمع و طاعت اور ہجرت و جہاد کے کٹھن اور جاں گسل مراحل طے کرنے کے لئے بیعت کر رکھی ہے۔ امیر محترم مدظلہ "ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن' نئی شان" کے مصداق ساری دنیا کو عالم کفر کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے "نیو ورلڈ آرڈر" کے اہداف و مقاصد سے "خبردار" کرتے رہتے ہیں۔ امیر محترم مدظلہ اپنے ساتھیوں کو روایتی سیاسی لیڈروں کی طرح نہ تو "سبز باغ" دکھاتے ہیں اور نہ ہی انہیں معاصر دینی جماعتوں کے سربراہوں کی طرح ہر لحظہ منزل سے دور لیجاتے ہوئے "سراب" میں غلطاں و پیچاں رکھتے ہیں۔ میرے قائد نے قرآن کی مضبوط

رسی اور سیرت کے مضبوط سہارے کو خود بھی مضبوطی سے تھام رکھا ہے اور اپنے ساتھیوں کو بھی یہی سبق ازبر کراتے رہتے ہیں۔ تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماعات ہوں یا تربیتی و دعوتی پروگرام، ان [illegible] کا "حاصل" امت کو اس کا بھولا ہوا سبق اور فراموش کردہ نصب العین یاد کر[illegible] اسلامی کے امیر کی زندگی، ان کے شب و روز، ان کے جذبات و احساسات، ان کا قول و عمل ۔

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں میں اسی لئے نمازی

کا "شاہد عادل" ہے۔ میرے قائد محترم کی زندگی ایک ایسی شمع کی مانند ہے، جو دونوں طرف سے جل کر راہ حق کے متلاشیوں کو منزل کا پتہ دیتی ہے۔

تنظیم اسلامی سے وابستہ راہ حق کے مسافروں کے پڑاؤ کے لئے اس دفعہ سندھ کی سرزمین کا انتخاب کیا گیا۔ وہ سندھ جو "باب الاسلام" کے شرف سے "مشرف" ہے۔ اسی سندھ کے شہر سکھر کے میونسپل سٹیڈیم میں اکیسویں سالانہ اجتماع کا آغاز نماز جمعہ سے قبل امیر محترم کے خطاب سے ہوا۔ ڈاکٹر صاحب مدظلہ نے فرمایا : ماضی قریب میں اسی سرزمین میں واقع کراچی شہر کے خالق دینا ہال میں کی گئی تقریر کی پاداش میں جو عثمانی خلافت کی تائید و حمایت میں اٹھنے والی "تحریک خلافت" کے زعماء نے کی تھی، مقدمہ بغاوت قائم ہوا تھا۔ اسی خالق دینا ہال سے آج سے چند سال قبل ہم نے تحریک خلافت پاکستان کا آغاز کیا تھا۔ سکھر کی "روحانی تاریخ اور اس کے ماحول" کو تاریخ کے اوراق سے اجاگر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ایک جانب سکھر سے متصل ضلع شکار پور میں واقع گاؤں امروٹ شریف بھی قریب ہی ہے جبکہ دوسری جانب میٹرھ شریف کی روحانی درگاہ بھی یہاں سے زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے۔ حافظ محمد صدیق بھرچونڈوی شریف کے ہاتھ پر مولانا عبیداللہ سندھی نے اسلام قبول کیا تھا، جبکہ تاج محمد امروٹی وہ شخصیت ہیں جن سے ملنے کے لئے چودھویں صدی کے مجدد اعظم، مجاہد حریت اور شیخ دیوبند مولانا محمود حسن دیوبندی اسی سرزمین پر تشریف لاتے تھے۔ میرا تعلق بھی اسی مبارک اور عظیم اسلامی جہادی تحریک سے ہے۔ میں اپنے آپ کو اس سلسلے کی ایک کڑی سمجھتا ہوں۔ چنانچہ اسی لئے ہم سکھر شہر میں خلافت کی اذان دینے کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ خلافت کے قیام ہی سے جہاد کا فریضہ بھی مشروط ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ملک میں سیاست کو محض بطور کھیل کھیلا جا رہا ہے اور ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اقتدار کے اس کھیل میں دینی عناصر اور

مذہبی جماعتیں بھی شریک ہیں۔ ہمارے نزدیک سیاست دین سے کوئی علیحدہ شے نہیں بلکہ دین کا جزو ہے اور کوئی باشعور مسلمان خالص غیر سیاسی نہیں ہو سکتا۔ تاہم انتخابی سیاست کی بجائے ہم نے اپنے لئے انقلابی سیاست کے راستے کا انتخاب کیا ہے۔

انہوں نے کہا کہ ذوالفقار علی بھٹو اسی سرزمین کا فرزند تھا۔ بھٹو نے انتھک محنت اور جدوجہد کی جس کے جواب میں قوم نے بھی اس کی آواز پر لبیک کہا اور بھٹو کو ملک کا حکمران بنا دیا۔ وہ ملک سے جاگیرداری نظام کا خاتمہ کر کے ماؤزے تنگ بن سکتا تھا مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ چنانچہ جاگیرداری کا طوق آج تک ہمارے گلے میں پڑا ہوا ہے۔ امیر محترم نے فرمایا نظام مصطفیٰ کی تحریک جوش و خروش کے اعتبار سے خلافت کی تحریک کے ہم پلہ تھی۔ اس جذبے سے فائدہ اٹھانے کی بجائے ضیاء الحق نفاذ اسلام کے حوالے سے "تدریج" کے چکر میں پڑ گئے۔ یوں عمر بن عبدالعزیز بننے کی بجائے ضیاء الحق مرحوم نے اسلام کے "کاز" کو نقصان پہنچایا۔ ہماری یہ موجودہ حکومت سابقہ حکومت کو مطعون کرتی اور موردِ الزام ٹھہراتی ہے جبکہ عوام کے اجتماعی کردار کا نمونہ "بڑے حکمرانوں" کی شکل میں ملک پر مسلط ہے۔ انہوں نے کہا کہ افراد قوم کے فکر و عمل کو تبدیل کئے بغیر ملک و قوم کی تقدیر نہیں بدل سکتی۔ اس لئے کہ افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر' ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ!

نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد سے نماز مغرب تک کھانے' آرام اور نماز عصر کی ادائیگی کے لئے وقفہ تھا۔ بعد نماز مغرب' اجتماع کے دوسرے اجلاس سے ملتان کے امیر جناب سعید اظہر عاصم نے خطاب کیا۔ انہوں نے رفقاء و احباب سے مخاطب ہو کر کہا جو نظام انسانیت کو دنیا و آخرت میں کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے دیا گیا ہے اسی نظام کا نام خلافت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کی دولت سے سرفراز فرمایا' یہ ہمارے لئے خوش نصیبی کا مقام ہے۔ آج سے پہلے دنیا کی دھرتی پر مسلمانوں کی اتنی کثیر تعداد کبھی نہ تھی' اس قدر آزاد مسلمان ممالک نہ تھے' اتنے وسائل مسلمانوں کو میسا نہ تھے جتنے آج ہیں' مگر اس کے باوجود کافر اقوام جب چاہتی ہیں مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بناتی ہیں۔ اللہ ہمارا رب اور آنحضورؐ ہمارے رسول ہیں اور اس کے باوجود سب سے زیادہ ذلیل و رسوا بھی آج مسلمان ہی ہیں۔ وہ اس لئے کہ ہم نے اللہ اور اس کے دین کو اپنے گھروں سے' شہروں سے اور ملکوں سے عملاً دیس نکالا دے رکھا ہے۔ آج ہمارا معاشرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ہم اللہ اور رسولؐ کے فرمانبردار نہیں ہیں۔ ہم نے اپنے قول و فعل سے قرآن کو فریادی بنا دیا ہے۔ جس کی وجہ ہمارا رب ہم سے روٹھ چکا ہے۔ انہوں

نے کہا راہ حق کے ساتھیو اور سندھ کے باسیو! آؤ کہ اپنی جوانیاں، اپنا بڑھاپا، اپنے وسائل اپنی ذہنی قوتیں سب کچھ دین کی سربلندی کے لئے لگانے کا عہد و پیمان کریں۔ اس پر ثمر مگر خطرات سے گھرے ہوئے راستے میں اپنا تن اور دھن وارے بغیر کامیابی اور فوز و فلاح کا تصور محض ذہنی فتور اور دھوکہ ہے۔ امیر ملتان کا ہر لفظ درد و کرب کی داستان اور جذبہ جہاد کا نشان بن کر کانوں سے ٹکرا رہا تھا گویا وہ یوں کہہ رہے تھے کہ ؎

سحر ہونے کو آئی ہے ستارے ڈوب جائیں گے
وہ طوفاں آنے والا ہے کنارے ٹوٹ جائیں گے

اسلام اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بازیابی کے متلاشیوں کے سامنے وادی مہران ہی کے نوجوان سپوت احمد صادق سومرو نے اپنی مادری زبان میں دین کا جامع تصور نہایت جامعیت اور خوبی کے ساتھ پیش کیا۔ سومرو خاندان کا یہ قابل فخر نوجوان قرآن کالج لاہور سے دین کے انقلابی تصورات کی پختہ بنیادوں پر تحصیل کر کے دین کی اس نایاب جنس کو "باب الاسلام" میں عام کر رہا ہے، سندھی نوجوان کہہ رہا تھا کہ ہم نے اہم کاموں کو غیر اہم اور غیر اہم کاموں کو اہم بنا رکھا ہے۔ اسلام کی حقیقت محض نیکی کی دعوت ہی سے عبارت نہیں ہے بلکہ نیکیوں اور حسنات کا حکم دینا اور برائیوں اور منکرات کا طاقت و قوت سے استیصال کرنا اصل دین ہے، مگر عوام و خواص کی اکثریت غلبہ دین کے فرض عین سے غافل ہے۔ انہوں نے کہا آج اللہ کا دین بالادست نہیں رہا، بلکہ گھر میں ٹی وی اور بیوی کا راج قائم ہے، ملک میں قومی اسمبلی کو بڑائی حاصل ہے، گویا ہر جگہ اللہ کا دین بڑا نہیں ہے، ہمیں اللہ تعالی کی بڑائی اور کبریائی کو تسلیم کرنے اور تسلیم کرانے والے نظام کو برپا کرنے کے لئے محنت و کوشش کرنا ہوگی۔ انہوں نے کہا قرآن و حدیث کے الفاظ اور تعلیمات محض قول کی بجائے عملاً نافذ بھی کئے جائیں، محض تبلیغ دین سے اسلام کو غلبہ و سربلندی حاصل نہیں ہوتی اس کے لئے سرکش نفس، شیطان ابلیس، بگڑے ہوئے معاشرے اور باطل نظام کے خلاف مسلسل جہاد کرنا ہوگا۔

احمد صادق سومرو کے سندھی زبان میں خطاب سے شرکاء اجتماع بہت محظوظ ہوئے۔ نماز عشاء کی ادائیگی کے لئے وقفہ ہوا۔ داعی تحریک خلافت اہل سندھ کو خلافت کی نوید سنانے کے لئے سٹیج پر تشریف لا چکے تھے۔ تنظیم اسلامی کوئٹہ کے رفیق قاری شاہد اسلام بٹ نے پرسوز تلاوت سے قریبی ماحول کی سماعت کے ذوق کو جلا بخشی۔ جبل نور پر نازل ہونے والا یہ وہی کلام ربانی ہے جس کے ذریعے نبی اکرمؐ نے پوری کائنات کی کایا پلٹ کر رکھ دی تھی، یہ تو وہی پیغام

ہے جس کے بارے میں مولانا حالی نے کہہ رکھا ہے کہ

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا
وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

امیر تنظیم اسلامی کا طغرائے امتیاز یہی قرآنی دعوت ہے جو تنظیم اسلامی کی دعوت کی اساس و بنیاد' مبنی و مدار اور مرکز و محور ہے۔

"نغمہ مشروع" کی تلاوت کے بعد امیر محترم نے اہل سندھ کو خلافت کی نوید دینے کے لئے اپنے خطاب کا آغاز کیا۔ آپ نے فرمایا یہود اسلام کے نور توحید کو بجھانے کے در پے ہیں۔ اس کائنات کی غیر مرئی طاقت ابلیس لعین شر و فساد کا سرچشمہ ہے جبکہ مرئی اور نظر آنے والا شیطانی لشکر انسانوں پر مشتمل ہے اور گزشتہ دو ہزار سال سے شیطان کے سب سے بڑے ایجنٹ کا رول یہودی ادا کر رہے ہیں۔ امیر تنظیم اسلامی نے نبی اکرم ﷺ کی امتیازی شان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آنحضور ﷺ کے علاوہ کوئی پیغمبر دین کو غالب نہ کر سکا جبکہ آنحضورؐ صرف داعی و مبلغ ہی نہیں تھے بلکہ بدر و حنین میں فوجوں کی سپہ سالاری بھی فرماتے تھے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک کوئی رسول ایسا نہیں جسے پوری نوع انسانی کے لئے مبعوث کیا گیا ہو۔ یہ شان صرف آنحضور ﷺ کی ہے کہ آپ پوری نوع انسانی کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے۔ یہی وجہ کہ حضورؐ کی بعثت کا مقصد ہی اسلام کا عالمی غلبہ ہے۔ اس کے بغیر آپ کی بعثت کا مقصد شرمندہ تکمیل نہیں ہو سکتا... بقول شاعر

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

امیر تنظیم اسلامی نے کہا عوام کی اکثریت دین کی طرف پیش قدمی کرنے کے لئے تیار نہیں ہے' جبکہ حکمرانوں نے الیکشن اور کرکٹ کے کھیل کے ذریعے پوری قوم کو غفلت سے دوچار کیا ہوا ہے۔ کرکٹ کی طرح پارلیمانی جمہوریت بھی انگریزوں کی وراثت ہے' جبکہ امریکہ میں رائج صدارتی نظام نہ صرف اسلام کے سیاسی نظام کے قریب تر ہے بلکہ انسانی عقل و فطرت سے بھی قریب تر ہے۔ انہوں نے کہا صدارتی نظام کے قیام کی دو بڑی رکاوٹیں ہیں یعنی موجودہ صوبے اور جاگیرداری نظام۔ جاگیرداری نظام کے خاتمے کے ذریعے بڑے بڑے مگرمچھوں کا احتساب خود بخود ہو جائے گا۔

رات ۸ بجے شروع ہونے والا خطاب گیارہ بجے کے بعد ختم ہوا تو میں سوچ میں پڑ گیا کہ خدایا کیسا جذبہ، کتنی تڑپ اور کس قدر گہری وابستگی حاصل ہے ڈاکٹر صاحب کو اپنے مقصد اور [illegible] انقلابی [illegible] پر مشتمل نظریئے کی اشاعت سے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کا بڑھاپا اور [illegible] اس لائق ہے کہ میرے جیسے سینکڑوں نہیں ہزاروں نوجوانوں کی جوانیاں اور تندرستیاں بھی ایسے بوڑھے باغبان پر فدا ہو جائیں تو بھی کوئی نسبت و تناسب قائم نہیں ہو سکے گا۔ امیر محترم کے خطاب کے بعد رفقاء و احباب کو کھانے کی دعوت عام دی گئی۔ ظہر کا کھانا بھی "محمود و ایاز" کی تفریق کے بغیر صلائے عام کی شان کا حامل تھا۔ یہ دعوت عام جناب غلام محمد سومرو کے جذبہ مہمانی کا پر خلوص مظاہرہ تھا۔ اللھم زد فزد۔ آمین۔

دوسرے دن کے پروگرام کا آغاز ڈاکٹر طاہر خان خاکوانی کے درس قرآن سے ہوا۔ ملتان کے زمیندار خاندان کا جدید تعلیم سے آراستہ و پیراستہ یہ نوجوان بھی ڈاکٹر اسرار کا ایک خوبصورت "شکار" ہے۔ امیر محترم دروس قرآن مجید کے چمن کے اس پھول کی خوشبو سے محظوظ ہونے کے لئے خود تشریف فرما تھے۔ قرب قیامت اور امام مہدی کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب مدظلہ کی آراء پر مختلف حلقوں میں اک شور سا مچا ہوا ہے۔ محترم خاکوانی صاحب نے سورہ انبیاء کی ابتدائی آیات کے حوالے سے اس بے معنی و لایعنی شور و غوغے کی خوب خبر لی۔ انہوں نے علامہ اقبال کے اشعار کو جس خوبصورتی اور سلیقے سے اپنے درس قرآن میں سجا کر پیش کیا اس کی صدائے بازگشت خود امیر محترم کے خطاب میں کئی بار سنائی دی۔ ایسے ہی جسور و غیور جوانوں کے بارے میں علامہ نے کہا تھا کہ "محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پر جو ڈالتے ہیں کمند۔" امیر محترم کے شاگردوں میں ڈاکٹر طاہر خاکوانی، ڈاکٹر عبدالسمیع، مختار حسین فاروقی، رحمت اللہ بٹر، انجینئر نوید احمد، ڈاکٹر عارف رشید، محترم عبدالرزاق اور ڈاکٹر عبدالخالق جیسے کئی نوجوان شامل ہیں جو اگرچہ اب بڑھاپے کی دہلیز کو چھو رہے ہیں اس خوبصورت و خوشنما چمن کو دیکھ کر چمن کا باغبان کہہ سکتا ہے اور اسے یہ کہنے کا حق ہے کہ ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

درس قرآن کے بعد ناشتے اور دیگر ضروریات سے فراغت اور تیاری کے لئے وقفہ ہوا۔ محترم اعجاز لطیف صاحب نے سٹیج سیکرٹری کے فرائض انتہائی دلچسپ انداز میں ادا کئے۔ قرآنی آیات، احادیث رسول ﷺ، عربی مقولات اور اردو اشعار سے مزین حکمت کے موتی بکھیرنے کا

انہیں خوب ڈھنگ آتا ہے۔

اجتماع کے دوسرے دن کے پروگراموں میں مرکزی رپورٹ کے اہم اور ضروری نکات تنظیم اسلامی کے نائب امیر ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے پیش کئے۔ علاوہ ازیں انہوں نے مرکزی ٹیم کا مختصر سا تعارفی جائزہ پیش کیا' نظام مشاورت کے خدوخال واضح کئے اور توسیعی مشاورت کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ ڈاکٹر عبدالخالق نے رفقاء پر زور دیا کہ وہ توسیعی مشاورت کی افادیت و اہمیت کا احساس کرتے ہوئے اس ضمن میں اپنی عدم دلچسپی کو دور کرنے کی شعوری کوشش کریں۔ امیر محترم کی دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں سے رفقاء کو آگاہ کیا اور کہا کہ اس سال امیر محترم کے ۲۰۰ دن لاہور سے باہر صرف ہوئے۔ ناظم نشرو اشاعت کی حیثیت سے شعبہ کی کارکردگی رپورٹ بھی رفقاء کے سامنے رکھی۔ بعد ازاں ناظم اعلیٰ جناب عبدالرزاق صاحب نے مرکزی حلقہ جات کی رپورٹ کے اہم نکات کا اجمالی جائزہ رفقاء کے سامنے رکھا۔ اعداد و شمار بتا رہے تھے کہ ہمارے قدم سست رفتاری سے سہی مگر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کے بعد ناظم تربیت جناب رحمت اللہ بٹر نے اپنے شعبہ کی نہایت ہی مختصر مگر مکمل رپورٹ پیش کی۔ ناظم اعلیٰ بیرون پاکستان ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے امریکہ' کینیڈا' فرانس اور دیگر علاقوں پر مشتمل بیرون پاکستان کی رپورٹ پیش کی جبکہ حلقہ خواتین کی رپورٹ محترم ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے پڑھ کر سنائی۔ آدھ گھنٹے کے لئے چائے کا وقفہ ہوا اور وقفے کے خاتمے کے بعد رفقاء پھر سے اجتماع گاہ میں جمع ہوئے۔

وقفے کے بعد کی نشست میں سب سے پہلے حلقہ پنجاب جنوبی کے ناظم جناب مختار حسین فاروقی نے دین و مذہب کے فرق کو انتہائی مدلل اور خطیبانہ انداز میں بڑی روانی کے ساتھ واضح کیا۔ انہوں نے کہا مذہب ایک جزوی جبکہ دین کلی حقیقت کا نام ہے۔ اسلام کے علاوہ دنیا کے کسی اور مذہب کے پاس اجتماعی زندگی کا نظام سرے سے موجود نہیں ہے' بلکہ ان مذاہب کی تعلیمات تو انسان کی انفرادی زندگی کا بھی پوری طرح احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ محترم فاروقی صاحب نے کہا کہ دنیا کو ایک عالمگیر دین یعنی نظام کی ضرورت تھی اور ہے جسے یہود اور عیسائی دنیا کے گٹھ جوڑ نے "سیکولرازم" کی شکل میں پوری دنیا میں رائج کر رکھا ہے۔ اس یہودی بلکہ شیطانی نظام کو ختم کر کے ہی دین اسلام کا غلبہ ہو سکتا ہے۔ فاروقی صاحب کے بعد اگلے مقرر جناب قاری شاہد اسلام بٹ تھے۔ عشق رسولؐ کے تقاضے' ان کا موضوع تھا۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم سے اللہ محبت کرے تو بھی اور اگر ہم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہیں

تب بھی حضور اکرم ﷺ کی پیروی اور اتباع کے بغیر چارۂ کار نہیں ہے۔ حضورؐ کے مقصد زندگی کو اپنا نصب العین بنانا ہی عشق رسول ﷺ کا حقیقی تقاضا ہے۔ اگر ہمارا ہدف اور مقصد ... نبویؐ کا اتباع نہیں تو پھر محض چھوٹی چھوٹی سنتوں پر عمل کر کے مطمئن ہو جانا کفایت نہیں کرے گا۔ دنیا و آخرت میں کامیابی و فلاح کا راستہ تو یہ ہے کہ ؂

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

پاکستان کی مروجہ سیاست اور تنظیم اسلامی' کے موضوع پر گفتگو کے لئے نائب امیر تنظیم جناب ڈاکٹر عبد الخالق تشریف لائے۔ انہوں نے کہا کہ سیاست کا لفظ انتہائی بدنام ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس کے ساتھ دغابازی' فریب کاری کے تصورات لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ہماری سیاست جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا ایک مشغلہ اور کھیل بن کر رہ گئی ہے۔ انہوں نے کہا سیاست صرف انتخابات میں حصہ لینے کا نام ہی نہیں ہے بلکہ نظام کی تبدیلی کی جدوجہد ہی حقیقی سیاست ہے جسے ہم انقلابی سیاست سے تعبیر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عبد الخالق نے دو ٹوک الفاظ میں کہا کہ مفادات کی حامل انتخابی سیاست اور اقتدار کی جنگ میں تنظیم اسلامی کبھی شریک نہیں ہو گی۔ محض رہنماؤں اور قائدین کو مطعون کرتے رہنے کی بجائے عوام کی اصلاح اور بھلائی کی فکر بھی ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ عامۃ الناس اور قائدین دونوں کی خیر خواہی ہی میں بھلائی پوشیدہ ہے۔ نماز ظہر کی ادائیگی اور کھانے کے لئے نماز مغرب سے قبل تک وقفہ رہا۔ مگر یہ بات تو اجتماع گاہ کی حد تک محدود تھی۔ امیر تنظیم اسلامی نے اس دوران گورنمنٹ کالج سکھر میں طلباء و اساتذہ کے مشترک اجتماع سے خطاب فرمایا۔ خطاب کا دورانیہ تقریباً ایک گھنٹہ تھا۔

ساڑھے تین بجے سہ پہر مقامی ہوٹل میں پریس کانفرنس منعقد ہوئی جس میں امیر محترم مدظلہ کے ہمراہ نائب امیر ڈاکٹر عبد الخالق' ناظم حلقہ جناب سید نسیم الدین' جناب عبد المجید شیخ' محمد رضوان نور اور راقم نے شرکت کی۔ امیر محترم نے ملکی اور بین الاقوامی صورت حال کا تجزیہ کیا اور صحافیوں کے پوچھتے ہوئے سوالوں کے مسکت و مدلل جوابات دیئے۔ بعد نماز عصر جناب نسیم الدین نے جو کہ اجتماع کے ناظم بھی تھے' شرکاء اجتماع سے مختصر خطاب کیا۔ بعد نماز مغرب جناب غلام محمد سومرو نے امیر محترم کے تین گھنٹے پر مشتمل خطاب کا جامع خلاصہ سندھی زبان میں بڑی مہارت کے ساتھ پیش کیا۔ اسرہ دادو کے نقیب جناب ڈاکٹر علی خان لغاری نے

اپنا ایمان افروز اور دلچسپ تعارف کرایا۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر اسرار احمد کے انقلابی فکر نے مجھے اپنی جانب کھینچ لیا اور بالآخر میں تنظیم اسلامی کے قافلے میں شریک ہو گیا۔ انہوں نے بڑی اہم اور کانٹے کی بات بھی برسر محفل صاف الفاظ میں کہہ دی کہ اسلام پر چلنے کے لئے رزق حلال کا حصول بہت ضروری ہے۔ لغاری صاحب نے کہا "وہ آدمی جو رزق حلال پر قناعت نہ کر سکے وہ اللہ ' اس کے رسول ﷺ اور دین اسلام کی کیا خدمت کر سکتا ہے۔ گورنمنٹ کی ملازمت کے ساتھ پرائیویٹ میڈیکل پریکٹس بھی جاری رہے اور لوگوں کو دین کی طرف دعوت بھی دی جاتی رہے ' ایسا کرنا درست نہ تھا لہٰذا میں نے سرکاری ملازمت کو خیرباد کہہ دیا ' مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے رزق کے دروازے اسی طرح کھول رکھے ہیں جیسے پہلے تھے۔ میرے رزق میں کوئی کمی نہیں آئی "۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ؎

نہ دنیا سے نہ دولت سے نہ گھر آباد کرنے سے
تسلی دل کو ہوتی ہے خدا کو یاد کرنے سے

بعد ازاں جناب عبدالرحمٰن غوث نے اپنا تعارف کروایا۔ موصوف ناروے میں اسلام کے انقلابی فکر کی اشاعت کے لئے اپنی سی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ نماز عشاء کی ادائیگی کے لئے وقفے کا اعلان کیا گیا۔

نماز کی ادائیگی کے بعد رفقاء و احباب امیر محترم کا خطاب سننے کے لئے ذہنی اور قلبی ہر دو لحاظ سے پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔ حسب معمول قاری شاہد اسلام نے قرآن مجید کی آیات بینات کی تلاوت سے محفل کو چار چاند لگا دیئے۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے دوسرے روز کے خطبات خلافت کا آغاز فرماتے ہوئے کہا کہ ووٹوں کی بھیک اور میٹھی میٹھی تبلیغ سے دین کا غلبہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ حرام مال کو قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ پاک نفوس کا پاکیزہ خون ہی اللہ کے راستے میں قبول ہو گا۔ انہوں نے کہا مادی مفاد اور دنیاوی لالچ کے بغیر نظم کی پابندی اختیار کرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہمت زیادہ ہو تو کم قوت سے بھی مشکل کام کیا جا سکتا ہے ' لیکن اگر ہمت کم ہو تو زیادہ قوت سے بھی کوئی کام سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ دین کے قیام کے لئے نظم جماعت اور طریق کار کی وضاحت امیر تنظیم نے بھرپور طریقے سے کی۔

تیسرے اور آخری دن کے پروگراموں کا آغاز بعد نماز فجر اعجاز لطیف صاحب کے درس قرآن سے ہوا ' جس کے بعد حسب معمول وقفہ ہوا۔ ۹ بجے رفقاء اجتماع گاہ میں جمع ہوئے۔

جناب عبدالمجید شیخ نے اپنی پرسوز اور مدھم سروں والی آواز کے ساتھ ایک درد بھری نظم سنائی۔

قوموں نے ابھرنا سیکھ لیا' ہم ہوش میں آنا بھول گئے
اپنوں کو مٹانا سیکھ لیا' باطل کو مٹانا بھول گئے
جو درس شہ بطحا نے دیا وہ پڑھنا پڑھانا بھول گئے

بعدازاں سوال و جواب پر مبنی نشست ہوئی۔ امیر محترم نے تمام سوالوں کے خوبی سے جوابات دیئے۔ چائے کے وقفہ کے بعد حسب پروگرام ناظم اعلیٰ جناب عبدالرزاق نے "آئندہ تنظیمی سال کے اہداف کا تعین" کے موضوع پر ایمان افروز خطاب کیا۔ انہوں نے رفقاء کو یاد دلایا کہ ہماری ذمہ داری بڑی اہم مگر کٹھن ہے۔ ایک جانب دین کی دعوت ایک اعزاز ہے تو دوسری جانب ایک بھاری ذمہ داری۔ لہٰذا ہمیں یہ بات ہر وقت اپنے سامنے رکھنی چاہئے کہ ع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

انہوں نے کہا اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے قدم آگے بڑھائیں اور ضلعی سطح پر ہر حلقہ کم از کم تین اضلاع تک دعوتی پیغام کو عام کرے۔ اہداف و مقاصد کی وضاحت کے بعد رفقاء سے ہفت روزہ بنیادوں پر دعوتی کام کے لئے وقت دینے کا مطالبہ کیا گیا' جسے رفقاء نے بھرپور طریقے سے پورا کر دیا۔ اور اپنے ارادوں سے اپنے ذمہ دار حضرات کو آگاہ کر دیا۔ گویا سب کہہ رہے تھے کہ ساتھیو! مشعلوں کو تیز کرو۔

سکھر میونسپل سٹیڈیم میں منعقدہ اجتماع کا اختتامی لمحہ آن پہنچا۔ امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد' رفقاء سے اختتامی خطاب کے لئے تشریف لائے۔ ڈاکٹر صاحب نے حسب پروگرام اجتماع منعقد ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ہمیں تنظیم کے استحکام کو اولیت دینا ہوگی جبکہ اس کی توسیع کا کام اس کے بعد کی شے ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی مدد کے حصول کا یقینی طریقہ اس کے دین کی مدد و نصرت ہے۔ ہر ساتھی ایمان' "توکل" انفاق مال اور وقت کے ضمن میں کمی اور کوتاہی کا جائزہ لے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی اس کوتاہی پر استغفار کرے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا سکھر شہر ایک دور میں میری کافی آمد و رفت رہی ہے۔ یہاں میں میری محنتوں کا "دفینہ" دفن ہے۔ اس دفینے کو نکالنے کے لئے مقامی رفقاء کی سخت محنت درکار ہے۔ اسی خطاب پر یہ اجتماع ختم ہو گیا اور رفقاء و احباب نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔

اشاریہ ماہنامہ "میثاق"

جنوری ۱۹۹۶ء تا دسمبر ۱۹۹۶ء (جلد ۴۵)

مرتب : محبوب الحق عاجز

○

حقیقت و حکمت دین

اسلامی نظام حیات

دعوت و تحریک

ملکی و ملی اور سیاسی امور

اقبالیات

افکار و آراء

کتابیات

اسرار احمد، ڈاکٹر

تاریخ پاکستان

اسرار احمد، ڈاکٹر

تذکرو تدبر

اسرار احمد، ڈاکٹر

وصی مظہر ندوی، مولانا سید

اتحاد بین المسلمین

رفتار کار

170697
16.10.97

روداد سفر

عبدالخالق، ڈاکٹر

تعلیم و تعلم

محمد رفیع الدین (مرحوم)، ڈاکٹر

عرض احوال

ادارتی صفحہ پر ہر ماہ حافظ عاکف سعید صاحب کی تحریر "عرض احوال" کے عنوان سے شائع ہوتی رہی ہے۔

Reg. No. L 7360
Vol. 45 No.12
Dec. - 1996

Quarterly Journal of the Qur'an Academy

The Qur'anic Horizons

Patron: Dr. Israr Ahmad

October-December issue is now available!

CONTENTS

- **Understanding *Jihad* (Editorial)**
- **Historical Overview of the Execution of Iqbal's Thought *(By Dr. Israr Ahmad)***
- **Importance of the Prohibition of *Riba* in Islam *(By Imran N. Hosein)***
- **The Concept of Organization in Islam with Special Reference to the Institution of *Baiy'ah* *(By Dr. Israr Ahmad)***

Send Orders to:

Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an Lahore
36-K, Model Town, Lahore-54700
Phone: 5869501-3 Fax:5834000 E-Mail: anjuman@paknet1.ptc.pk